وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر:۲۲)

# تفسیرِ کبیر

مُصنّفہٗ

## حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود

رضی اللہ عنہ

جلد ہشتم

سورتہائے النبا، النّٰزعات، عبس، التکویر، الانفطار، المطففین

الانشقاق، البروج، الطارق، الاعلیٰ، الغاشیہ، الفجر، البلد

نظارت نشر و اشاعت قادیان

# سُورَۃُ النَّبَا مَکِّیَّۃٌ

سورۃ نبا - یہ سورۃ مکی ہے

## وَھِیَ اَرْبَعُوْنَ اٰیَۃً دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَفِیْھَا رُکُوْعَانِ

اور بسم اللہ کے علاوہ اس کی چالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع ہیں [1]

## بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

[1] یہ سورۃ النَّبَا کہلاتی ہے کیونکہ اس میں اصل ذکر ایک نبأ عظیم کا ہے۔ اس سورۃ میں بعث[1] بعد الموت۔ قرآن کریم یا غلبۂ[2] اسلام کا ذکر ہے یا یوں کہو کہ ان تینوں کا ذکر ہے۔ اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں یوم فصل کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی گئی ہے چنانچہ سورۃ الْمُرْسَلٰت کے پہلے رکوع میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ لِیَوْمِ الْفَصْلِ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ یعنے کس دن کے لئے وعدہ دئے گئے ہیں فیصلے کے دن کے واسطے اور تو کیا جانے کہ وہ فیصلے کا دن کیا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے ھٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِیْنَ یعنے یہ فیصلے کا دن ہے کہ جس کے لئے ہم نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو جمع کیا ہے۔ گویا ایک یوم فصل کا اس جگہ پر ذکر تھا اس سورۃ میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِیْقَاتًا۔ یعنی یقیناً یہ فیصلے کا دن ایک مقرر وقت پر آنے والا ہے۔ تو گویا سورۃ الْمُرْسَلٰت اور سورۃ اَلنَّبَا دونوں کا باہمی تعلق یوم فصل کے ذریعہ سے ہے پہلی سورۃ میں دو دفعہ یوم فصل کا بیان ہے اور اس سورۃ میں ایک دفعہ یوم فصل کے ذکر کو دہرایا گیا ہے یہ بتلانے کے لئے کہ ان دونوں میں اشتراکِ مضمون پایا جاتا ہے۔ اُس سورۃ میں بھی یوم فصل کا بیان تھا اور اس سورۃ میں بھی یوم فصل کا بیان ہے۔

سورۃ النبا کی وجہ تسمیہ

سورۃ النَّبَا ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے۔ اس سورۃ کی ترتیب کے متعلق نولڈک NOLDEKE جو مشرقی علوم کے متعلق جرمنی کا مشہور پروفیسر ہے لکھتا ہے کہ اس سورۃ کے مضمون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورۃ الْمُرْسَلٰت کے ساتھ ہی اتری ہے (ریورنڈ ویریز کمنٹری آن دی قرآن) یہ رد ہے اُن مستشرقین یورپ کا جو کہا کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی سورتوں میں کوئی خاص ترتیب نہیں۔ لمبی سورتیں پہلے رکھ دی گئی ہیں اور چھوٹی سورتیں آخر میں رکھ دی گئی ہیں۔ ان لوگوں کی سمجھ میں بھی جہاں جہاں کوئی بات آجاتی ہے وہاں انہیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سورتوں کا مضمون آپس میں ملتا ہے۔ اور گو وہ ہمارے قرآن کو ایک باترتیب کلام نہ مانیں مگر کسی کسی جگہ انہیں بھی یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ سورتوں کا جوڑ ایک دوسری سے ملتا ہے۔

سورۃ نبا کا پہلی سورۃ سے تعلق

---

# عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝

یہ (لوگ) کس (چیز) کے بارے میں ایک دوسرے سے (بطریق انکار) سوال کر رہے ہیں ۲

عَمَّ — ۲ **حل لغات**۔ عَمَّ اصل میں عَنْ مَا ہے نون چونکہ میم میں مدغم ہو جاتا ہے اس لئے عَمَّا ہو گیا۔ عربی زبان کا یہ محاورہ ہے کہ حروف جارہ کے بعد بالعموم مَا استفہامیہ کے الف کو حذف کر دیتے ہیں اور آخر میم پر فتحہ بطور علامت کے رکھ دیتے ہیں (اقرب) مثلاً کہتے ہیں۔ فِیْمَ۔ لِمَ۔ بِمَ۔ اِلَامَ۔ عَلٰمَ۔ عَمَّ۔ بلکہ عام قاعدہ یہ ہے کہ وزن کے لحاظ سے جہاں الف ظاہر کرنے کا فائدہ ہو وہاں الف لاتے ہیں ورنہ بالعموم اس کو حذف کر دیتے ہیں۔ یعنی جہاں توازن میں یا بولنے میں زیادہ سہولت الف کے لانے میں ہو اُسی جگہ الف ظاہر کرتے ہیں ورنہ نہیں۔

یَتَسَآءَلُوْنَ — اَلتَّسَاءُلُ کے معنے ہوتے ہیں ایک دوسرے سے پوچھنا۔ اور جب تَسَآءَلَ الْقَوْمُ کہیں تو معنے ہوں گے سَأَلَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا (اقرب) یعنی آپس میں ایک دوسرے سے انہوں نے پوچھا۔ اور یَتَسَآءَلُوْنَ کے معنے ہوں گے آپس میں وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔ پس عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ کے معنے ہوں گے آپس میں ایک دوسرے سے وہ کس کے بارے میں پوچھتے ہیں یا کس کے بارے میں وہ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں۔

سوال کی مختلف اغراض — **تفسیر**۔ ایک دوسرے سے سوال مختلف وجوہ کی بناء پر کئے جاتے ہیں۔ کبھی سوال زیادتی علم کے لئے ہوا کرتا ہے یعنی ایک انسان دوسرے انسان سے علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً کسی کو راستہ معلوم نہیں تو وہ دوسرے سے پوچھتا ہے فلاں رستہ کدھر کو جاتا ہے یا پوچھتا ہے فلاں شہر کی طرف کونسا رستہ جاتا ہے۔ یا کسی لفظ کے معنے معلوم نہ ہوں

عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ کے فقرہ میں سوال کی وجہ — تو وہ دوسرے سے پوچھتا ہے فلاں لفظ کے کیا معنے ہیں۔ اور یا پھر سوال امتحان کے لئے ہوا کرتا ہے یعنی سوال کرنیوالا جانتا تو ہے کہ جس لفظ کے متعلق وہ پوچھ رہا ہے اس کے کیا معنے ہیں مگر وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آیا دوسرے کو بھی وہ معنے معلوم ہیں یا نہیں۔ یہ سوال بھی بلاواسطہ عدم علم پر ہی دلالت کرتا ہے کیونکہ گو اس کو ان معنوں کا علم تو ہوتا ہے مگر اُسے یہ علم نہیں ہوتا کہ دوسرے کو بھی اس کا علم ہے یا نہیں لیکن کبھی سوال اظہارِ تعجب کے لئے بھی ہوا کرتا ہے جیسے بعض دفعہ بیٹا اپنے باپ کی گستاخی کرے تو باپ اُسے کہتا ہے تمہیں پتہ ہے میں کون ہوں؟ یعنی تمہیں اتنی سمجھ تو ہونی چاہیئے کہ میں تمہارا باپ ہوں اور باپ کا ادب کرنا ضروری ہوتا ہے یا آقا اپنے غلام کو یا افسر اپنے ماتحت کو کہتا ہے تم جانتے ہو میں کون ہوں؟ اب اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اُسے علم نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے۔ پھر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہوتا کہ تم نہیں جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ بلکہ اس موقعہ پر سوال کرنے والا یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کون ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ جس سے سوال کیا گیا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ جس سے سوال کیا جاتا ہے وہ بھی جانتا ہے اور باوجود اس کے کہ جو سوال کرنے والا ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میرا مخاطب اس سوال کا جواب جانتا ہے پھر بھی وہ سوال کرتا ہے۔ تو درحقیقت یہ سوال ایک قسم کے تعجب کے اظہار کے لئے ہوتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم کو پتہ ہے کہ حقیقت کیا ہے پھر باوجود علم ہونے کے تم کیوں غفلت کر رہے ہو یا باوجود پتہ ہونے کے تم پوچھ کیوں رہے ہو یا اختلاف کیوں کر رہے ہو۔ اور کبھی اسی تعجب کی صورت میں تفخیم کے لئے یعنی اس چیز کی عظمت کے اظہار کے لئے بھی سوال کیا جاتا ہے۔

یہاں بھی درحقیقت مخفی معنے تعجب کے ہی ہیں گو یہاں تفخیم کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ جیسے میں نے ابھی ایک مثال دی ہے کہ بعض دفعہ سوال کرتے ہوئے کہا جاتا ہے تم جانتے ہو میں کون ہوں اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ میری جو کچھ

# عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ ۝

اس (مذکورہ بالا یَوْمُ الْفَصْلِ والی) عظیم (الشان) خبر کے متعلق (سوال کر رہے ہیں) ۳؎

شان اور عظمت ہے اُس سے تم بخوبی واقف ہو۔

قرآن کریم چونکہ خدا کا کلام ہے اس لئے یہاں نہ تو یہ معنے ہوسکتے ہیں کہ خدا نہیں جانتا۔ نہ دوسرے معنے ہوسکتے ہیں کہ خدا کو یہ شک ہے کہ میرا مخاطب جانتا ہے یا نہیں جانتا پس تیسرے ہی معنے ہیں جو خدا کے متعلق چسپاں ہوسکتے ہیں اور وہی معنے اس جگہ پر لئے جائیں گے جیسا کہ اگلی آیت نے اس کو ظاہر بھی کر دیا ہے۔ پس عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ کے یہ معنے ہیں کہ ہمیں تعجب ہے کہ بغیر کافی غور اور فکر کے یہ لوگ ایک ایسے امر کے متعلق سوال کرتے ہیں جس کے حقائق ظاہر ہیں۔ گویا ایک طرف تو اس سوال میں مسئلہ کی بڑائی پر زور ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ مسئلہ بہت ہی اہم ہے اور اس کے حقائق بالکل ظاہر ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ جن کے متعلق یہ نقرہ کہا گیا ہے اُن کی عقل پر اظہار تعجب کیا گیا ہے کہ باوجود اس مسئلہ کے دلائل موجود ہونے کے پھر بھی وہ شبہات میں پڑے ہوئے ہیں۔

**۳؎ حل لغات۔** نَبَاٌ کے معنے خبر کے ہوتے ہیں لیکن علامہ ابوالبقاء اپنی کتاب کلیات میں لکھتے ہیں کہ اَلنَّبَاُ وَالْاِنْبَاءُ لَمْ یَرِدَا فِی الْقُرْاٰنِ اِلَّا لِمَا لَهٗ وَقْعٌ وَشَاْنٌ عَظِیْمٌ (بحالہ اقرب) یعنی نَبَاٌ اور اِنْبَاء کے الفاظ قرآن کریم میں کسی جگہ بھی سوائے ایسے امر کے جس کی بہت بڑی شان اور اہمیت ہو استعمال نہیں ہوتے۔ وَقْعٌ تاثیر اور اہمیت کو کہتے ہیں۔

امام راغب اپنی کتاب مفردات میں لکھتے ہیں اَلنَّبَاُ خَبَرٌ ذُوْ فَائِدَةٍ عَظِیْمَةٍ یَحْصُلُ بِهٖ عِلْمٌ اَوْ غَلَبَةُ ظَنٍّ وَلَا یُقَالُ لِلْخَبَرِ فِی الْاَصْلِ نَبَاٌ حَتّٰی یَتَضَمَّنَ هٰذِهِ الْاَشْیَاءَ الثَّلٰثَةَ یعنی نبأ اس خبر کو کہتے ہیں جس میں اول فائدہ ہو۔ دوسرے بڑا فائدہ ہو۔ تیسرے اُس کے ذریعے یا تو علم یقین حاصل ہوتا ہو یا علم غالب حاصل ہوتا ہو۔ پھر وہ کہتے ہیں خبر کو کبھی اس کے حقیقی معنوں میں نَبَاٌ نہیں کہتے جب تک یہ تینوں باتیں اُس میں نہ پائی جاتی ہوں۔ گویا اس طرح انہوں نے مزید زور اس بات پر دیا کہ نبأ کے یہ تین معنے ہیں اور جب تک یہ تینوں معنے کسی خبر میں نہ پائے جائیں ہم اُسے نبأ نہیں کہہ سکتے سوائے اس کے کہ کوئی سرسری طور پر اس لفظ کا استعمال کر دے یا غلط طور پر استعمال کر دے۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کسی لفظ کا غلط استعمال نہیں ہوسکتا اس لئے ابوالبقاء نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں ان معنوں کے سوا کہیں بھی نبأ کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ جب بھی قرآن کریم میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وَقْعٌ وَشَاْنٌ عَظِیْمٌ کے الفاظ بھی درحقیقت یہی تینوں معنے ظاہر کرتے ہیں کیونکہ وَقْعٌ کے معنے وہی ہیں جو امام راغب نے خَبَرٌ ذُوْ فَائِدَةٍ کے الفاظ میں بیان کئے ہیں۔ اور عَظِیْمٌ کا لفظ فَائِدَةٌ عَظِیْمَةٌ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور شَاْنٌ کے معنے وہی ہیں جو یَحْصُلُ بِهٖ عِلْمٌ اَوْ غَلَبَةُ ظَنٍّ کے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (الرحمٰن ع ۲) پس وَقْعٌ وَشَاْنٌ عَظِیْمٌ کے الفاظ میں درحقیقت وہی مفہوم پایا جاتا ہے جو مفردات والے نے بیان کیا۔ مفردات والے نے بتا دیا کہ نبأ کا لفظ جب بھی صحیح طور پر استعمال کیا جائے گا اُس میں یہ تین باتیں ضرور پائی جائیں گی اور ابوالبقاء نے کہہ دیا کہ اَلنَّبَاُ وَالْاِنْبَاءُ لَمْ یَرِدَا فِی الْقُرْاٰنِ اِلَّا لِمَا لَهٗ وَقْعٌ وَشَاْنٌ عَظِیْمٌ۔ قرآن کریم میں نبأ اور انباء کا لفظ کہیں بھی استعمال نہیں ہوا مگر اسی صورت میں جب اُس خبر کی بہت بڑی شان اور اہمیت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن چونکہ الفاظ کا صحیح استعمال کرتا ہے۔ اس لئے

نبأ

نوٹ:- ۳؎ دیکھئے اگلا صفحہ پہلا کالم

جب بھی قرآن کریم میں یہ لفظ استعمال ہو گا ان تین معنوں پر مشتمل ہو گا۔ اسی بناء پر میں غیر مبایعین کے مقابلہ میں کہا کرتا ہوں کہ تم جو کہتے ہو کہ ہر وہ شخص جس پر الہام الٰہی نازل ہو اسے لغوی طور پر ہم نبی کہہ سکتے ہیں یہ بالکل غلط ہے۔ لغوی طور پر نبوت کے معنوں میں صرف الہام کے نزول کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔ بلکہ لغت کے لحاظ سے نبی وہ ہوتا ہے جس پر خدا تعالیٰ کا کلام نازل ہوتا ہو اور اس کلام میں یہ تین شرطیں پائی جاتی ہوں۔ اوّل وہ ذُوْ فَائِدَۃٍ ہو دوم وہ ذُوْ فَائِدَۃٍ عَظِیْمَۃٍ ہو۔ سوم وہ ایسا الہام ہو یَحْصُلُ بِہٖ عِلْمٌ اَوْ غَلَبَۃُ ظَنٍّ۔ اور پھر زائد بات بوجہ نبی کے صیغہ کے یہ پائی جائیگی کہ اس پر کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہوتا ہو۔ گویا نَبَأٌ کو جب ہم نبی کے صیغہ میں تبدیل کر دیں تو اس کے معنے ہونگے ایسا شخص جس پر کثرت سے کلام الٰہی نازل ہوتا ہے اور پھر وہ کلام ایسا ہوتا ہے جو ذُوْ فَائِدَۃٍ عَظِیْمَۃٍ یَحْصُلُ بِہٖ عِلْمٌ اَوْ غَلَبَۃُ ظَنٍّ کا مصداق ہوتا ہے۔ گویا نبی وہ ہے جو اللہ کی طرف سے کثرت کے ساتھ لوگوں کو خبریں دیتا ہے اور ایسی خبریں دیتا ہے جو فائدہ پر مشتمل ہوتی ہیں اور نہ صرف فائدہ پر بلکہ فائدہ عظیمہ پر مشتمل ہوتی ہیں اور یَحْصُلُ بِہٖ عِلْمٌ اُن سے زائد علم حاصل ہوتا ہے پس جب ہم کسی کو نبی اللہ کہتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ نبی اللہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سنکر لوگوں کو کثرت سے خبریں دیتا ہے۔ (۲) ایسی خبریں دیتا ہے جن میں فائدہ ہوتا ہے اور فائدہ بھی عظیم الشان ہوتا ہے اور (۳) پھر اُن سے علم زائد حاصل ہوتا ہے۔ ان معنوں کے رُو سے کسی صورت میں بھی غیر مبایعین یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ اس پہلو میں اُمتِ محمدیہ کا کوئی اور فرد بھی شریک ہے اور نہ درحقیقت وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ان معنوں کے رُو سے کوئی غیر نبی کسی نبی کا شریک ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ باتیں کسی غیر نبی میں پائی ہی نہیں جاتیں۔

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ کا تعلق پہلی آیت سے

نبی کے لغوی معنے

ع۵ اس یَوْمُ الْفَصْلِ سے مراد وہ یَوْمُ الْفَصْلِ ہے جس کا ذکر سورۃ النبأ سے پہلی سورۃ الْمُرْسَلَاتِ میں آ چکا ہے۔

**تفسیر** عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ جملہ مستانفہ بھی ہو سکتا ہے اور عَنْ عَمَّ کا بدل بھی ہو سکتا ہے یعنی یہ بھی اس کے معنے ہو سکتے ہیں کہ کس بارے میں سوال کر رہے ہیں۔ کیا اس عظیم الشان نَبَأ کے متعلق جس کا آگے ذکر ہو گا اور یا پھر یہ جملہ مستانفہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ پہلی آیت میں تو یہ کہا گیا تھا کہ کس بارے میں یہ لوگ آپس میں سوال کر رہے ہیں۔ اب اس کا خود ہی جواب دیتا ہے کہ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ۔ یہ لوگ سوال کر رہے ہیں ایک عظیم الشان نَبَأ کے متعلق۔ اس دوسری آیت نے بتا دیا کہ عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ میں جو عَمَّ تھا وہ سوال جہالت کی وجہ سے نہیں تھا یا عدم علم کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ کہنے والی ہستی جانتی تھی کہ وہ کس چیز کے بارے میں آپس میں بحث کر رہے ہیں کیونکہ وہ خود بتاتی ہے کہ اُنکا آپس میں تسَاءُل نبأ عظیم کے متعلق تھا۔

اس جگہ پر اللہ تعالیٰ نے ایک زائد بات بیان فرمائی ہے جو نہایت غور کے قابل ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ یہ لوگ کس کے بارے میں سوال کر رہے ہیں آیا ایک عظیم الشان نبأ کے متعلق یا جملہ مستانفہ کی صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ یہ لوگ سوال کر رہے ہیں ایک عظیم الشان نَبَأ کے متعلق۔ جیسا کہ لغت سے ظاہر ہے نَبَأ کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اَلنَّبَأُ خَبَرٌ ذُوْ فَائِدَۃٍ عَظِیْمَۃٍ اور بقول کلیات کے نَبَأ وہ ہے مَا لَہٗ وَقْعٌ وَ شَاْنٌ عَظِیْمٌ گویا عظیم کا لفظ خود نبأ میں شامل ہے۔ مگر یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ۔ یعنی نَبَأ کی حیثیت اور شان والی جو خبریں ہیں اُن میں سے بھی یہ عظیم الشان خبر ہے گویا بڑیوں میں سے بڑی اور عظیموں میں سے عظیم ہے۔ جب نَبَأ خود اپنے اندر ایک عظمت اور شان رکھتی ہے تو اس کے ساتھ عظیم کے لفظ کا لایا جانا بتاتا ہے کہ اس کے معنے یہی ہیں کہ بڑیوں میں سے بڑی۔ عظیموں میں سے عظیم اور شانداروں میں سے شاندار خبر۔ اب نَبَأ کے اصل معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم اس آیت کا تفسیری طور پر ترجمہ کریں تو وہ یوں ہو گا کہ کیا یہ لوگ سوال کرتے ہیں اس خبر کے متعلق جو شاندار خبروں میں سے بھی بڑی شاندار

خبر ہے۔ اس جگہ نَبَاٌ سے مراد بعض نے قرآن کریم لیا ہے اور بعض نے بعث بعد الموت۔ چنانچہ ابن کثیر میں ہے کہ قتادہ اور ابن زید کہتے ہیں اَلنَّبَاُ الْعَظِیْمُ، اَلْبَعْثُ بَعْدَ الْمَوْتِ کہ نبأ عظیم سے مراد مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا ہے۔ پھر ابن کثیر میں ہی لکھا ہے کہ مجاہد کہتے ہیں ھُوَ الْقُرْاٰنُ یعنی نبأ عظیم سے مراد قرآن ہے لیکن اس سے پہلی سورۃ یعنی سورۃ المرسلات میں صرف قرآن کا ہی ذکر نہیں بلکہ قرآن کے غلبہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے چنانچہ قرآن کا تو سورۃ المرسلات کی اس آخری آیت میں ذکر ہے کہ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ۔ اور غلبۂ قرآن کا اس آیت میں ذکر ہے کہ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِیْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ۔ وَیْلٌ یَّوْمَىٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ اور پھر یوم الفصل کا جو ذکر کیا گیا ہے اُس میں بھی غلبۂ اسلام کی پیشگوئی ہے پس صرف قرآن کا ہی نہیں بلکہ غلبۂ اسلام کا بھی اس سورۃ میں ذکر ہے اور یہ دونوں ذکر اس سورۃ نَبَا سے بھی ظاہر ہیں اور اس سے پہلی سورۃ سے بھی۔

اس موقع پر یہ شبہ دل میں پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ ان تینوں چیزوں میں سے کونسی چیز یہاں مراد ہے کیونکہ قرآن کریم کے کئی بطن ہوتے ہیں اور قرآن کریم بعض دفعہ ایک ہی دلیل سے کئی کئی مضمون ثابت کرتا ہے۔ مثلاً اگر کسی جگہ یہ ذکر ہو کہ زید فلاں ملک میں گیا ہے یا نہیں اور دوسری جماعت میں یہ بحث ہو کہ زید ایک مغلوب شخص تھا یا غالب۔ تو اگر ہم یہ فقرہ کہہ دیں کہ زید اس ملک میں گیا اور اُس نے فتح پائی۔ تو یہ فقرہ ان دونوں سوالوں کو حل کر دے گا۔ اس فقرہ میں اُس پارٹی کا بھی جواب آ جائے گا جو یہ بحث کرتی تھی کہ زید اس ملک میں گیا تھا یا نہیں اور اُس پارٹی کا بھی جواب آ جائے گا جو یہ بحث کرتی تھی کہ زید مغلوب شخص تھا یا غالب۔ اسی طرح بعض دلائل کا مجموعہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک نتیجہ پیدا نہیں کرتا بلکہ کئی نتائج اُس سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس جب ہم کوئی دلیل بیان کریں تو جتنے پہلو اس دلیل میں سے نکل سکتے ہوں وہ سارے ہی ثابت ہو جائیں گے۔ بعث بعد الموت درحقیقت اُس بعثِ روحانی کے مشابہ چیز ہے جو اس دنیا میں ہوتی ہے۔ اس لئے ایک دلیل دوسری دلیل کو ثابت کر دیتی ہے

اَلنَّبَاُ الْعَظِیْمُ سے مراد تینوں امور

بعثِ روحانی اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ بعث بعد الموت بھی ہوگی اور بعث بعد الموت اس بات کا ثبوت ہے کہ بعثِ روحانی بھی ضرور ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی روح کو مدارجِ عالیہ پر پہنچاتا ہے تو ایسی روح کا کوئی عظیم الشان مقصد اور مدعا ہونا چاہیئے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مدارجِ عالیہ پر پہنچا کر اللہ تعالیٰ روح کو فنا کر دے گا اور آگے اس کا کوئی کام نہیں ہوگا۔ اور اگر مرنے کے بعد انسان کے لئے کوئی زندگی ہے تو پھر لازماً اس دنیا میں احیاء روح بھی ہونا چاہیئے کیونکہ ایک انسان کو دائمی چکر میں ڈال دینا اور اس ابدی زندگی میں جو خلود والی ہے اللہ تعالیٰ کے انعامات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ بتانا یہ بھی ایک ظلم ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو مرنے کے بعد خلود والی زندگی بخشے گا تو لازماً اس زندگی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا سامان بھی اس دنیا میں ہونا چاہیئے۔ گویا ان دونوں سوالوں کا انحصار ایک دوسرے پر ہے اگر ایک ہے تو لازماً دوسری بھی ہے اور اگر دوسری ہے تو لازماً پہلی بھی ہے۔ اور چونکہ وہ روحانی زندگی جو اس دنیا میں حاصل ہوتی ہے اُس کے متعلق قرآن کریم یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس زمانہ میں روحانی زندگی بخشنے والا میں ہی ہوں اس لئے یہ بھی پہلے دونوں سوالوں کے ساتھ شریک ہو گیا یعنی جس دلیل سے یہ ثابت ہوگا کہ اس دنیا میں احیاء روح کے کوئی سامان ہونے چاہئیں وہ قرآن کریم کے دعویٰ کے مطابق یہ بھی ثابت کرے گی کہ قرآن کریم سچا ہے کیونکہ قرآن کریم ہی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس زمانہ میں روحانی زندگی بخشنے کے لئے وہ مقرر ہے۔ پس ایک ہی دلیل سے یہ تینوں امر ثابت ہو جائیں گے۔ اگر کسی دلیل سے یہ ثابت ہوگا کہ مرنے کے بعد کی زندگی ایک یقینی چیز ہے اور وہ ضرور آنے والی ہے تو اُسی دلیل سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ اس دنیا میں احیاء روح کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سامان رکھے گئے ہیں اور پھر ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ کہ میں ہی اس کام کو سرانجام دیتا ہوں بالکل صحیح اور درست ہے۔ کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے گا کہ روحانی مدارج جو نہایت

نبأ عظیم کے تین امور مراد لینے کے متعلق ایک شبہ کا ازالہ

اعلیٰ درجہ کے ہیں انسان کو اس دنیا میں ملتے ہیں تو ساتھ ہی یہ ثابت ہو جائے گا کہ قرآن کریم ہی یہ درجے دینے والا ہے۔ اس لئے کہ یہ درجے قرآن کریم کو ماننے والوں کو ہی حاصل ہوتے ہیں اَور لوگوں کو حاصل نہیں ہوتے۔ اسی طرح جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ قرآن کریم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں بڑے سے بڑے روحانی مدارج انسان کو اس دنیا میں حاصل ہو سکتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ مرنے کے بعد بھی زندگی ہے کیونکہ ان مدارجِ روحانیہ کے حصول کو ہم لغو اور فضول نہیں کہہ سکتے۔ گویا اگر یہ ثابت ہو گا کہ قرآن کریم روحانی مدارج عطا کرتا ہے تو اس کے لازماً یہ معنے ہوں گے کہ قرآن کریم پر عمل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے بڑے مدارج عطا ہوں گے۔ اور اگر یہ ثابت ہو گا کہ قرآن کریم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں انسان کو روحانی مدارج حاصل ہوتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو جائیگا کہ مرنے کے بعد ضرور کوئی زندگی ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ انسان کو اعلیٰ قابلیتیں دے کر اُن کے ظہور کا موقعہ ملنے سے پہلے اُسے فنا کر دیا جائے۔ پس یہ تینوں چیزیں آپس میں لازم ملزوم ہیں اور ان میں سے ایک کے ثابت ہونے سے باقی دو چیزیں خود بخود ثابت ہو جاتی ہیں۔

بعث بعد الموت اور احیاء روحانی کا آپس میں لازم و ملزوم ہونا

غرض اگر ہم نبأِ عظیم کے معنے قرآن کریم کے لیں اور پھر ساتھ ہی بعث بعد الموت اور غلبۂ اسلام کے بھی تو یہ کوئی شبہ والی بات نہیں ہو گی بلکہ تینوں معنے آپس میں لازم ملزوم ہوں گے۔ بعض چیزوں کا تعدد شک پر دلالت کرتا ہے اور بعض چیزوں کا تعدد لزوم پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں تعددِ لزومی ہے تعددِ شکّی نہیں۔ نبأِ عظیم کا لفظ جو اس موقعہ پر استعمال ہوا ہے وہ درحقیقت ان تینوں معنوں پر ہی استعمال ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مرنے کے بعد کی جو زندگی ہے وہ بھی ایک ایسی خبر ہے جو بڑی خبروں کی سرتاج ہے۔ یہ کہدینا کہ فلاں کے ہاں بیٹا پیدا ہو جائیگا یا فلاں ملک میں لڑائی ہو جائیگی اس خبر کے مقابلہ میں بہت ہی ادنیٰ اور معمولی ہیں۔ بے شک یہ خبریں بھی اپنی ذات میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں مگر یہ خبریں اُس قدر اہمیت نہیں رکھتیں جتنا یہ کہنا کہ ایک زمانہ میں ساری دنیا زندہ کی جائیگی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو گی۔ پس نبأِ عظیم کا لفظ قیامت کے بالکل مطابق ہے اور یہ لفظ اُس پر بخوبی چسپاں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نبأِ عظیم کا لفظ قرآن کریم پر بھی چسپاں ہو جاتا ہے اس لئے کہ قرآن کریم یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ میں ساری خوبیوں کا جامع ہوں بلکہ گذشتہ تمام انبیاء کی کتابیں میرے اندر جمع ہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البیّنۃ) پس اگر نوحؑ کے صحف نبأ تھے۔ اگر ابراہیمؑ کے صحف نبأ تھے۔ اگر موسیٰؑ کے صحف نبأ تھے۔ اسی طرح اگر عیسیٰؑ کا کلام نبأ تھا۔ اگر کرشنؑ کا کلام نبأ تھا۔ اگر رامچندرؑ کا کلام نبأ تھا۔ اگر زرتشتؑ کا کلام نبأ تھا۔ تو جس کلام میں یہ سارے ہی جمع کر لئے گئے ہوں وہ یقیناً نبأِ عظیم کہلائے گا۔

اسی طرح غلبۂ اسلام بھی ایک ایسی چیز ہے جو تمام انبیاء کے غلبوں میں سے عظیم الشان رنگ رکھتی ہے اور درحقیقت یہ غلبہ ایسا ہے جس نے تمام انبیاء کے غلبوں کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کا طوفان لے لو۔ نوحؑ کی قوم نے غرق ہو کر نوحؑ کی صداقت کا ثبوت دیا اور نوحؑ اپنی قوم پر غالب آگیا۔ مگر اس کا کیا نتیجہ ہوا یہی کہ قوم غرق ہو گئی اور وہ نوحؑ پر ایمان لانے سے محروم رہی۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوم اس طرح غرق کی گئی کہ وہ پھر آپ پر ایمان بھی لے آئی۔ موسیٰؑ کو اپنے دشمنوں پر اس طرح غلبہ دیا گیا کہ موسیٰؑ کا دشمن سمندر میں ڈبو دیا گیا مگر محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دشمن سمندر کی بجائے خشکی میں ڈبو دیا گیا اور پھر خدا نے یہ سامان کئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس ملک کا وعدہ دیا گیا تھا اُس ملک پر غلبہ دئے جانے کا وعدہ ان کی زندگی میں پورا نہ ہوا۔ اس کے مقابلہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح غلبہ کا وعدہ دیا گیا مگر انہوں نے اپنی زندگی میں ہی مکہ کو فتح کر لیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے اس طرح غلبہ دیا کہ وہ اپنے دشمن سے بھاگے اور ایک غیر ملک میں اس کے حملہ سے محفوظ ہو گئے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

# اَلَّذِیۡ ھُمۡ فِیۡہِ مُخۡتَلِفُوۡنَ ؕ

جس کے بارے میں یہ لوگ (قرآن کی بتائی ہوئی حقیقت سے) اختلاف رکھتے ہیں ۵

کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس رنگ میں غلبہ دیا کہ آپ دشمن سے بھاگے اور ایک دوسرے شہر میں جا کر اُس کے حملہ سے محفوظ ہو گئے۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر اپنے ملک میں واپس نہیں آئے اور نہ انہوں نے اپنی قوم کو مغلوب کیا مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر مکہ میں واپس آئے اور انہوں نے اپنی قوم کو مغلوب کر لیا۔ غرض جس جس رنگ میں پہلے انبیاء کو غلبہ ملا اُن میں سے ہر رنگ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غلبہ حاصل ہوا اور نہ صرف غلبہ حاصل ہوا بلکہ اُن سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اُسکی تائید آپؐ کے شامل حال رہی۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کو تین سو سال میں غلبہ حاصل ہوا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی زندگی میں ہی غلبہ مل گیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسے ساتھی ملے جنہوں نے قربانی کے موقعہ پر کمزوری دکھائی اور وہ ثابت قدم ثابت نہ ہوئے لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وہ ساتھی عطا فرمائے جنہوں نے نہ موسیٰؑ کے ساتھیوں جیسی کمزوری دکھائی اور نہ عیسیٰؑ کے ساتھیوں جیسی کمزوری دکھائی۔ موسیٰؑ کے ساتھیوں نے جنگ کے موقعہ پر کمزوری دکھائی تھی اور عیسیٰؑ کے ساتھیوں نے اُس وقت کمزوری دکھائی جب اُنکی اپنی جان خطرے میں تھی۔

درحقیقت دنیا میں دو قسم کے جذبات لوگوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قوم کی خاطر قربانی کرنے کے لئے تو تیار رہتے ہیں لیکن اپنے لیڈر کے لئے قربانی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو اپنے لیڈر کی خاطر تو ہر وقت قربانی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں لیکن اپنی قوم کے لئے قربانی کرنے کی روح اُن میں موجود نہیں ہوتی۔ اُنہیں صرف عشق ذاتی ہوتا ہے عشق قومی نہیں ہوتا مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے وہ ساتھی عطا فرمائے جو یہ دونوں جذبات اپنے دلوں میں رکھتے تھے جہاں قوم کے لئے انہیں قربانی کرنی پڑی وہاں آپ کے صحابہؓ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں جیسا نمونہ نہ دکھایا بلکہ اپنی قوم کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور جہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کا سوال پیدا ہوا وہاں انہوں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اُس عشق کا ثبوت دیا جو ان کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے ساتھ تھا اور حضرت مسیحؑ کے حواریوں کی طرح بُزدلی نہیں دکھائی۔ چنانچہ مکہ کے لوگ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادہ سے ایک دفعہ رات کو آپؐ کے مکان کے اردگرد اکٹھے ہو گئے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہجرت کے ارادہ سے گھر سے نکل پڑے تو اُس وقت آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹا دیا۔ اور اس طرح حضرت علیؓ نے اس امر کا ثبوت دے دیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ آپ کی جگہ خود صلیب پر لٹکنے کو تیار رہتے تھے تو عشق ذاتی میں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوم دوسرے نبیوں کی قوموں سے بڑھ گئی اور عشق قومی میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم دوسرے نبیوں کی قوموں سے بڑھ گئی۔ اس لئے آپ کا جو غلبہ تھا یعنی غلبۂ اسلام وہ بھی نبأ عظیم تھا کیونکہ یہ غلبہ پہلے انبیاء کے غلبوں کے مقابلہ میں نہایت ہی شاندار تھا اور آپ کی جو کتاب تھی وہ بھی نبأ عظیم تھی کیونکہ وہ گذشتہ تمام الہامی کتابوں سے بہت زیادہ شاندار تھی۔ اور قیامت بھی نبأ عظیم ہے کیونکہ وہ اور تمام خبروں سے بہت زیادہ شان اور عظمت اپنے اندر رکھتی ہے۔

(حاشیہ: ۲۱ ۱/ غلبۂ اسلام کے مختلف نظارے)

**۴۵۴ حل لغات** ۔ مُخۡتَلِفُوۡنَ مُخۡتَلِفٌ کی جمع ہے اور مُخۡتَلِفٌ اِخۡتَلَفَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔

(حاشیہ: ۲ مُخۡتَلِفُوۡنَ)

جس کے معنے آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف کرنے کے ہیں (اقرب) پس مُخْتَلِفُوْنَ کے معنے ہونگے اختلاف کرنے والے۔ اور اَلَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ کے معنے ہوں گے جس میں وہ اختلاف ظاہر کر رہے ہیں۔

**تفسیر۔** یہاں تفخیم اور استعجاب کا پہلو زیادہ نمایاں ہے کیونکہ پہلے ایک خبر کو نبأ عظیم قرار دیتا ہے اور پھر فرماتا ہے اَلَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ یعنی وہ نبأ عظیم جس میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ گویا اول تو نَبَأٌ میں اختلاف نہیں ہونا چاہیئے تھا اور پھر نبأ عظیم میں تو کسی صورت میں بھی اختلاف نہیں ہوسکتا تھا مگر یہ وہ لوگ ہیں جو نبأ عظیم میں بھی اختلاف کر رہے ہیں۔ گویا ادھر ایک ایسی عظیم الشان خبر موجود ہے اور اُدھر یہ لوگ ایسے ذلیل ہیں کہ اس عظیم الشان خبر میں بھی اختلاف کرتے ہیں۔

بعث بعد الموت قرآن اور غلبہ اسلام کے متعلق کفار کا اختلاف اور اس کا مطلب

بعض لوگوں نے اس موقع پر اعتراض کیا ہے کہ اَلَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس جگہ نبأ عظیم سے مراد قرآن نہیں اور نہ بعث بعد الموت مراد ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفار ان امور میں اختلاف کرتے تھے حالانکہ وہ بعث بعد الموت کے منکر تھے اور وہ تسلیم ہی نہیں کرتے تھے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے۔ پس جب وہ اس عقیدہ کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے تو اس میں وہ اختلاف کیونکر کر سکتے تھے۔ اسی طرح قرآن کریم پر بھی وہ ایمان نہیں رکھتے تھے پس قرآن کریم کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کفار اس کے متعلق اختلاف کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ اعتراض درست نہیں۔ اس لئے کہ سب کے سب کفار بعث بعد الموت کے منکر نہیں تھے بلکہ اُن میں بھی اس بارہ میں اختلاف تھا گو وہ اس بعث کی شکل اَور سمجھتے ہوں۔ گویا اوّل تو سب کفار اس عقیدہ کے منکر نہیں تھے اور پھر جو لوگ اس کے قائل تھے اُن میں سے بعض کو صرف بعث کی شکل میں اختلاف تھا اسی وجہ سے عربوں میں یہ روایات پائی جاتی تھیں کہ جب کوئی شخص مارا جاتا ہے اور پھر اس مقتول کا بدلہ نہیں لیا جاتا تو اس کی رُوح اُلّو کی شکل میں آکر چیختی چلاتی ہے۔ اگر وہ مرنے کے بعد کسی حیات کے قائل نہیں تھے تو اُلّو کی شکل میں مقتول کی رُوح کے آنے کے وہ کس طرح قائل ہو سکتے تھے۔ پس درحقیقت وہ کسی حقیقی علم پر قائم نہیں تھے بلکہ خود اس بارہ میں اُن میں اختلاف موجود تھا کوئی کچھ کہتا تھا اور کوئی کچھ کہتا تھا۔

قرآن کریم کی صورت میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اَلَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ اس پر کس طرح چسپاں ہو سکتا ہے اور وہ اس بارہ میں کیا اختلاف کیا کرتے تھے وہ تو قرآن کریم کی صداقت کے قائل ہی نہیں تھے بلکہ کہتے تھے کہ یہ محض جھوٹ ہے اس میں سچائی کا کوئی شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ مگر میرے نزدیک یہ سوال بھی درست نہیں اس لئے کہ قرآن کریم کے متعلق بھی ان کو اختلاف تھا۔ بعض اس کا نام سحر رکھتے تھے بعض اُسے کذب قرار دیتے تھے اور بعض اس کا نام اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (الانفال ع ۴) رکھتے تھے یہ سیدھی بات ہے کہ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ کہنے والوں کے نزدیک قرآن کریم جھوٹا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اگر قرآن کریم اُن کے نزدیک جھوٹا ہوتا تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ وہ اپنے باپ دادا کو بھی جھوٹا قرار دیا کرتے تھے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ پس ان کا قرآن کریم کو اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ قرار دینا ہی بتا رہا ہے کہ اُن میں سے بعض کو قرآن کریم کے متعلق یہ اعتراض نہیں تھا کہ یہ کلام جھوٹا ہے بلکہ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اس میں اُن کے باپ دادا کی باتوں کو ہی نقل کر دیا گیا ہے اس لئے ہم اس کو بطور خدا کی کلام کے نہیں مان سکتے۔ پس عربوں میں قرآن کریم کو اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ کہنے والے بھی موجود تھے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں قرآن کریم کے متعلق اختلاف تھا۔ اسی طرح قرآن کریم کو سحر کہنے والے بھی اُن میں موجود تھے۔ اور قرآن کریم کو جھوٹا قرار دینے والے بھی اُن میں موجود تھے۔ پس قرآن کریم کی صورت میں بھی یہ آیت پوری طرح چسپاں ہو جاتی ہے کہ اَلَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ یعنی وہ نبأ عظیم ہے جس میں کفار اختلاف کرتے ہیں۔ تیسرا پہلو

غلبۂ اسلام کا ہے ممکن ہے کوئی شخص کہہ دے کہ اس کے متعلق ان کو کہاں اختلاف تھا تو اس کے متعلق بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ غلبۂ اسلام کے متعلق بھی کفار میں اختلاف موجود تھا کفار جانتے تھے کہ مسلمانوں کے اندر ایک ایسی روح کام کر رہی ہے جو ایک دن ان کو ہم پر غالب کر دے گی چنانچہ اُن کا اسلام کی شدید ترین مخالفت کرنا اور اس کی ترقی کو روکنے کے لئے اپنی انتہائی کوشش صرف کرنا خود اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ وہ ڈرتے تھے کہ اسلام اُن پر غالب آجائے گا اور وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے اندر ایسی چیز موجود ہے جو اُن کے مقابلہ میں ہم کو مغلوب کر دے گی۔ اور یہی سچے نبی کی علامت ہوا کرتی ہے کہ مخالفوں کے دلوں میں پہلے سے یہ ڈر پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ ایک دن یہ لوگ ہم کو کھا جائیں گے اور ہماری طاقت کو توڑ کر رکھ دیں گے۔ وہ ایک طرف یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ ہم ان کو مار دیں گے۔ ہم انکو تباہ کر دیں گے۔ ہم ان کو دنیا سے مٹا دیں گے۔ مگر ساتھ ہی ان کے دلوں میں یہ خطرہ بھی موجود ہوتا ہے کہ یہ شخص ہم کو کھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نبیوں کی دنیا میں شدید مخالفت ہوتی ہے ورنہ سب جانتے ہیں کہ وہ اکیلے ہوتے ہیں نہ اُن کے پاس جتھا ہوتا ہے نہ اُن کے پاس طاقت ہوتی ہے نہ اُن کے پاس مال ہوتا ہے نہ اُن کے پاس ظاہری شان و شوکت کا کوئی اور سامان ہوتا ہے۔ وہ اکیلے اُٹھتے اور بے سروسامانی کی حالت میں دنیا کے مقابلہ میں کھڑے ہوتے ہیں مگر پھر ساری دنیا اُن کی مخالفت کرنے لگ جاتی ہے اور وہ پورا زور اس بات پر صرف کر دیتی ہے کہ اُن کو کچل دے اُن کے نام کو مٹا دے اور اُن کو اپنے مشن میں کامیاب نہ ہونے دے کیونکہ اُن کے دلوں میں یہ خیال موجود ہوتا ہے کہ یہ شخص گو اکیلا ہے مگر اس میں ایسی ترقی کی قابلیت پائی جاتی ہے اور ایسی رُوح اس کے اندر نظر آتی ہے جو ایک دن ہم کو کھا جائے گی اور ہمیں اس کے مقابلہ میں پسپا کر دے گی۔ ہمارے اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد بھی کئی لوگوں نے دعوے کئے مگر لوگ اُن کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتے جس پر وہ چڑتے ہیں کہ ہماری مخالفت کیوں نہیں کی جاتی۔ بلکہ بعض اُن میں سے ہمیں گالیاں دیتے ہیں کہ ہم اُن کی باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ مگر باوجود اس کے کہ اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اُن کی مخالفت کریں۔ اُن کی باتوں کی طرف توجہ کریں پھر بھی کوئی شخص اُن کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اسی لئے کہ اُن میں وہ کوئی ایسی چیز نہیں دیکھتے جس سے اُن کے دلوں میں ڈر محسوس ہو اور وہ یہ خیال کرنے لگ جائیں کہ یہ ایک دن ہم پر غالب آجائیں گے۔ لوگ اُن کی باتوں کو سنتے ہیں تو ہنس کر گذر جاتے ہیں کوئی مخالفت نہیں کرتے یا معتدبہ مخالفت نہیں کرتے۔ اتفاقیہ طور پر اُن کے متعلق مُنہ سے کچھ نکل جائے تو اور بات ہے ورنہ یُوں سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ آپ ہی تباہ ہو جائیں گے ہمیں ان کی مخالفت کرنے کی ضرورت نہیں۔ تو اَلَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ میں غلبۂ اسلام کے معنوں کی طرف بھی اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کفار میں سے جو سمجھدار لوگ ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ چیز ایک دن غالب آنے والی ہے عوام الناس بے شک اپنے علماء کی باتیں سُن کر کہتے ہیں کہ یہ لوگ ہمارے مقابلہ میں فنا ہو جائیں گے مگر اُن کے علماء جانتے ہیں کہ آخر اسلام ہی جیتے گا اور وُہی اس میدان میں شکست کھائیں گے بلکہ انہیں اپنی شکست کے ابھی سے آثار نظر آنے شروع ہو گئے ہیں۔ گویا پہلے دن سے ہی اسلام کی برتری اور اُس کے غلبہ کا اقرار ان لوگوں کو تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اس مذہب کے مقابلہ میں ہم ٹھہر نہیں سکیں گے۔ اس زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں جماعت احمدیہ کی برتری کا احساس لوگوں کے قلوب میں موجود ہے اور وہ ڈرتے ہیں کہ اگر جماعت احمدیہ اسی طرح بڑھتی چلی گئی تو معلوم نہیں کیا ہو جائے گا۔ اس لئے وہ مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کر دیتے ہیں اور اس شدید مخالفت کی وجہ سے کسی کسی وقت یہ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ لوگ تباہ ہو جائیں گے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ اتنی مخالفتوں کے بعد بھلا یہ کہاں پنپ سکیں گے پس هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ

## كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۙ

(خوب یاد رکھو کہ بات) یوں نہیں (جس طرح یہ کہتے ہیں بلکہ) یہ لوگ (قرآن کریم کی بتائی ہوئی حقیقت کو) عنقریب جان لیں گے۔

## ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝

پھر (ہم کہتے ہیں کہ بات) یوں نہیں (جس طرح یہ کہتے ہیں بلکہ) یہ لوگ (قرآن کریم کی بتائی ہوئی حقیقت کو) عنقریب جان لیں گے۔ ۵۵

كَلَّا

کے اس صورت میں یہ معنے نہیں ہوں گے کہ وہ آپس میں اختلاف رکھتے ہیں بلکہ جب ہم غلبۂ اسلام کے معنے لیں گے تو اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان لوگوں کی حالتیں مختلف وقتوں میں مختلف ہوتی ہیں گویا اس صورت میں اختلاف یا تو عوام الناس اور اُن کے علماء میں سمجھا جائے گا اور یا پھر علماء کا آپس میں اختلاف اس سے مراد لیا جائے گا یعنی یا تو اس کا یہ مفہوم ہوگا کہ اس بارہ میں عوام الناس اور اُن کے علماء اور لیڈروں میں اختلاف ہے عوام الناس یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان تباہ ہو جائیں گے مگر علماء اور لیڈر یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان تباہ نہیں ہو سکتے اور یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بارہ میں علماء کی حالتیں بدلتی رہتی ہیں ایک حالت پر وہ قائم نہیں رہتے۔ کبھی وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو مار لینگے اور کبھی یہ خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہم ان کو کہاں مار سکتے ہیں ہم خود ہی ان کے مقابلہ میں پس جائینگے جب وہ مسلمانوں کی اندرونی خوبیوں اور اُن کی اعلیٰ درجہ کی صفات پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ ان مسلمانوں کے مقابلہ میں ہم مارے جائیں گے اور جب وہ اپنے جتھوں اور اپنی قوتوں پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو سمجھتے ہیں ہم مسلمانوں کو مار لیں گے۔

سَيَعْلَمُوْنَ

هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ کی دوسری تشریح

اسی طرح هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ مومن اور کافر آپس میں اختلاف رکھتے ہیں اور مومنوں اور کافروں کا یہ اختلاف بھی تین چیزوں کے متعلق سمجھا جائے گا۔ بعث بعد الموت کے متعلق۔ غلبۂ قرآن کے متعلق اور غلبۂ اسلام کے متعلق۔ یعنی بعث بعد الموت کے متعلق مومن کچھ کہتے ہیں اور کافر کچھ کہتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کے متعلق مومن کچھ کہتے ہیں اور کافر کچھ کہتے ہیں اور غلبۂ اسلام کے متعلق بھی مومنوں کا کچھ قول ہے اور کافروں کا کچھ قول ہے۔

**۵۵ حل لغات۔** كَلَّا حرف ہے جو بات غلط ہو اُس سے ہوشیار کرنے کے لئے تنبیہ کے طور پر اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی یوں بات نہیں جس طرح کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ علامہ ابوالبقاء اپنی کتاب کلیات میں لکھتے ہیں قَدْ تَجِيْءُ بَعْدَ الطَّلَبِ لِنَفْيِ إِجَابَةِ الطَّالِبِ كَقَوْلِكَ لِمَنْ قَالَ لَكَ اِفْعَلْ كَذَا۔ كَلَّا۔ أَيْ لَا يُجَابُ إِلٰى ذَالِكَ یعنی لفظ كَلَّا کسی مطالبہ کے جواب میں آتا ہے یہ بتانے کے لئے کہ مطالبہ کرنیوالے کی بات ماننے کے لئے ہم تیار نہیں۔ چنانچہ جب ہمیں کوئی کسی امر کے کرنے کے لئے کہے۔ اور ہم سمجھیں کہ یہ بات ایسی نہیں کہ کوئی مان سکے تو ہم کہیں گے كَلَّا۔ پھر علامہ ابوالبقاء لکھتے ہیں وَقَدْ جَاءَ بِمَعْنَى حَقًّا۔ یعنی کبھی لفظ كَلَّا۔ حَقًّا کے معنے میں آتا ہے یعنی اس کے بعد بیان کی جانے والی بات کی تاکید کرتا ہے کہ یہ بات درست ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغٰى یعنی یہ بات درست ہے کہ انسان سرکشی کرتا ہے (اقرب)

سَيَعْلَمُوْنَ۔ وہ ضرور جان لیں گے۔ سَ تاکید کے معنوں میں یہاں آیا ہے ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ یہاں ثُمَّ کا لفظ تکرار مضمون کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی پھر ہم کہتے ہیں کہ وہ بات اُس طرح ہرگز نہیں جس طرح وہ خیال کرتے ہیں۔

**تفسیر۔** سَيَعْلَمُوْنَ وہ ضرور

# اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝

(سوچیں تو سہی کہ) کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا ۵۶ اور پہاڑوں کو میخوں کے طور پر ۵۷

جان لیں گے یعنی قیامت کے دن ان کے یہ خیالات بالکل غلط ثابت ہوں گے اور اُن پر واضح ہو جائے گا کہ وہ کیسی کھلی غلطی میں مبتلا رہے۔ یا قرآن کریم مراد لیتے ہوئے اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ایک دن آئے گا جب قرآن کریم کی صداقت اُن پر کھل جائے گی۔ اور غلبۂ اسلام پر جب ان آیات کو چسپاں کیا جائے گا تو مفہوم یہ ہوگا کہ آخر اسلام ایک دن غالب آ جائے گا اور وہ سمجھ لیں گے کہ اسلام کی مخالفت کر کے انہوں نے کیسا غلط طریق اختیار کیا تھا۔

اب اگلی آیتوں میں اللہ تعالےٰ اپنے اس دعوےٰ کی دلیل دیتا ہے اور وہ دلیل ایسی ہے جو مذکورہ بالا تینوں معنوں پر چسپاں ہو سکتی ہے۔ یعنی اس دلیل سے نہ صرف قیامت کا وجود ثابت ہوتا ہے بلکہ غلبۂ قرآن اور غلبۂ اسلام کا بھی اسی سے ثبوت مل جاتا ہے۔

## ۵۶ حل لغات۔ اَلْمِهَادُ: اَلْفِرَاشُ وَالْاَرْضُ (اقرب)

یعنی مِهَاد کا لفظ فراش کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور زمین کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ زمین کو جو مِهَاد کہتے ہیں اس کا بھی درحقیقت یہی مفہوم ہے کہ اس میں فراش والی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

**تفسیر۔** اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهَادًا کے معنے یہ ہیں کہ کیا ہم نے زمین کو ایسا نہیں بنایا جیسے فراش ہوا کرتا ہے۔ فراش پر انسان کیا کرتا ہے۔ یہی کہ لیٹتا ہے۔ آرام کرتا ہے۔ سوتا ہے اور اس طرح اُسے راحت حاصل ہوتی ہے۔ فرماتا ہے ہم نے زمین کو تمہارے لئے ایسا ہی بنایا ہے کہ تم اس میں ہر قسم کے آرام پاتے ہو۔ ہر قسم کی سہولتیں اس سے حاصل کرتے ہو اور تمہاری راحت کے تمام سامان اس میں موجود ہیں۔ فرماتا ہے تم زمین کی اس حالت پر غور کرو اور سوچو کہ کیا واقع میں ہم نے زمین کو تمہارے لئے ایسا بنایا ہے یا نہیں بنایا (اس آیت اور اگلی آیات کی تفسیر یکجائی طور پر نوٹ ۵۸ یعنی وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا کی آیت کے نیچے دی گئی ہے کیونکہ ان آیات کا مضمون اکٹھا ہے)

## ۵۷ حل لغات۔ اَوْتَادٌ وَتَدٌ کی جمع ہے

اَوْتَادٌ

اور وَتَدٌ کے معنے اُس چیز کے ہوتے ہیں جسے زمین یا مکان کی دیوار میں گاڑا جائے۔ گویا یہ لفظ کیل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لغت میں بھی پہاڑوں کو اَوْتَادُ الْاَرْضِ کہتے ہیں چنانچہ لکھا ہے اَوْتَادُ الْاَرْضِ جِبَالُهَا وَاَوْتَادُ الْبِلَادِ رُءُوْسَاءُ هَا وَاَوْتَادُ الْفَمِ اَسْنَانُهُ (اقرب) یعنی جب اَوْتَادُ الْاَرْضِ کہا جائے تو اس سے مراد پہاڑ ہوں گے۔ جب اَوْتَادُ الْبِلَادِ کہا جائے تو اس سے مراد مختلف ممالک کے رؤساء ہوں گے اور جب اَوْتَادُ الْفَمِ کہا جائے یعنی مُنہ کے اوتاد۔ تو اس سے مراد دانت ہوں گے کیونکہ جس طرح رؤساء سے ملکی نظام قائم ہوتا ہے اسی طرح دانتوں سے مُنہ کا نظام قائم ہے۔ دانتوں سے انسان کھانا کھاتا ہے اور دانتوں سے ہی چہرے کا حُسن قائم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ دانتوں کو اَوْتَادُ الْفَمِ قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح پہاڑوں سے چونکہ زمین میں حُسن پیدا ہوتا ہے اور اس کی مضبوطی اور پختگی کا بھی وہ باعث ہوتے ہیں اس لئے پہاڑوں کو اَوْتَادُ الْاَرْضِ کہا جاتا ہے۔ کیل کی بھی یہی غرض ہوتی ہے کہ وہ ایک طرف مضبوطی کا باعث ہوتا ہے اور دوسری طرف بعض چیزوں کے لئے سہارے کا موجب ہوتا ہے۔ مثلاً دیوار میں اگر کوئی کیل گاڑا جائے تو اس کی غرض کسی چیز کو وہاں لٹکانا ہوگی۔ گویا وہ کیل دوسرے کے لئے سہارے کا موجب ہوگا۔ اسی طرح زمین میں جو کیلے گاڑے جاتے ہیں اُن کی غرض اُس کیلے سے کسی دوسری چیز کو باندھنا ہوتی ہے جیسے کسی جگہ خیمہ نصب کرنا ہو تو زمین میں کیلے گاڑ دیتے ہیں تاکہ اس کے ساتھ خیمے کی رسیاں مضبوطی سے

اَلْمِهَادُ

# وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ

اور (پھر) ہم نے تم (سب لوگوں) کو جوڑا (جوڑا) بنایا ہے ۹؎

باندھ دی جائیں اور خیمہ کھڑا ہو جاتے - یا بعض دفعہ گھوڑا یا کوئی اور جانور بھی اُس سے باندھ دیتے ہیں - گویا وَتَدٌ کا لفظ کسی چیز کو محفوظ کرنے یا سہارا دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے - پس جب خدا نے کہا کہ ہم نے جِبَال کو اَوْتَاد بنایا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے جِبَال کو ایسا بنایا ہے کہ وہ سہارے کا بھی موجب ہیں اور جِبَال زمین کی حرکتِ مُضرہ کو بھی روکنے کا موجب ہیں اور درحقیقت یہی دونوں چیزیں جِبَال کی اغراض میں شامل ہیں -

اَزْوَاجًا

پہاڑوں کے فوائد

**تفسیر** - جہاں تک جِبَال کے فوائد کا سوال ہے یہ امر علوم موجودہ کی رُو سے مسلّم ہے کہ جِبَال کی وجہ سے ہی زلازل کا آنا بند ہوا - علوم موجودہ کا فیصلہ ہے کہ ہماری زمین کے نیچے بہت بڑی آگ ہے - جب زمین کا چھلکا ابھی پتلا تھا جب بھی اس آگ میں جوش پیدا ہوتا تھا زمین میں سے لاوا نکلنا شروع ہو جاتا - جب وہ لاوا ٹھنڈا ہو جاتا تو پہاڑی کی صورت میں قائم ہو جاتا - پھر اور لاوا نکلتا اور وہ بھی ٹھنڈا ہو کر پہاڑی بن جاتا - اسی طرح لاوا زمین کے نیچے سے نکلتا چلا گیا اور ٹھنڈا ہو کر بڑے بڑے پہاڑوں کی صورت میں تبدیل ہو گیا - جب زمین کا جوش کافی حد تک نکل گیا تو زمین کا چھلکا موٹا ہو گیا اور زمین آبادی کے قابل ہوئی - پس جِبَال کیا ہیں وہ زمین کی حرکتِ مضرہ کو روکنے کا ایک ذریعہ ہیں جیسے گھوڑے کو کِیلے کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور وہ اِدھر اُدھر دوڑ نہیں سکتا اسی طرح پہاڑوں کی وجہ سے زمین کی حرکتِ مضرہ بند ہوئی اور زلازل کا کثرت کے ساتھ آنا دُور ہوا - اسی طرح پہاڑ لوگوں کے لئے سہارے کا بھی موجب ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملک انہی پہاڑوں کے سہارے پر بسے ہوئے ہیں - پہاڑوں پر برف پڑتی ہے اور لوگوں کے لئے بڑے بڑے فوائد کا موجب ہوتی ہے جب برف پگھلتی ہے تو زمین میں نالے بہ نکلتے ہیں - دریا جاری ہو جاتے ہیں اور پھر اُن دریاؤں میں سے نہریں نکالی جاتی ہیں اور اس طرح تمام ملک سیراب ہو جاتا ہے - اسی طرح پہاڑی چشمے لوگوں کی سیرابی کا موجب بنتے ہیں - گویا پہاڑ ان دونوں اغراض کو پورا کرتے ہیں وہ زمین کی حرکتِ مضرہ کو بھی روکتے ہیں اور اُن کے ذریعہ تمام ملکوں کو ایک سہارا بھی مل جاتا ہے چنانچہ پہاڑوں سے ہی پانی میسر آتا ہے جو ملکوں کی سیرابی اور بنی نوع انسان کی زندگی کے کام آتا ہے -

**۹؎ حل لغات** - اَزْوَاجًا: اَزْوَاجٌ زَوْجٌ کی جمع ہے اور زَوْجٌ کے معنے ہیں کُلُّ وَاحِدٍ مَعَهُ اٰخَرُ مِنْ جِنْسِهٖ - ہر ایک وہ چیز جس کے ساتھ اس کی جنس میں سے ایک اور چیز بھی ہو - اَلصِّنْفُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ - ہر چیز کی قسم - صنف - اَلْبَعْلُ - خاوند - اَلزَّوْجَۃُ - بیوی - (اقرب)

وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا کی پہلی تشریح

**تفسیر** - فرماتا ہے اِدھر ہم نے یہ سامان پیدا کر دیا کہ زمین کو ہم نے ایسا بنایا جسے تم بستر کے طور پر استعمال کرتے ہو - پھر ہم نے پہاڑوں کو بنایا جو تمہارے لئے سہارے کا بھی موجب ہیں اور وہ زمین کی حرکتِ مُضرہ کو بھی روکنے کا ذریعہ ہیں دوسری طرف ہم نے تمہارے اندر یہ بات رکھ دی ہے کہ خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا - ہم نے تم کو زَوْج بنایا ہے - زَوْجٌ کے معنے جوڑے کے ہوتے ہیں چنانچہ نر کو بھی زوج کہتے ہیں اور مادہ کو بھی زوج کہتے ہیں - ہمارے ملک میں جس کو زوجہ کہتے ہیں عربی زبان میں اُسے زَوْج بھی کہہ سکتے ہیں اور زَوْجَۃ بھی کہہ سکتے ہیں - ایک انسان اپنی بیوی کے متعلق یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ھِیَ زَوْجِیْ یہ میری بیوی ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ ھِیَ زَوْجَتِیْ کہے - اسی طرح زوج کا لفظ مرد کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے چنانچہ ایک عورت اپنے خاوند کے متعلق بھی کہہ سکتی ہے کہ ھُوَ زَوْجِیْ پس خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا کے معنے یہ ہوئے کہ خدا نے تم کو جوڑا بنایا ہے یعنی نر و مادہ

کی صورت میں اس نے تم کو پیدا کیا ہے گویا ایک طرف زمین میں یہ قابلیت رکھی ہے کہ تم اسکی طرف اسی طرح لوٹتے ہو جیسے بستر کی طرف جس طرح انسانی جسم میں جب تھکان پیدا ہو جائے تو وہ آرام کیلئے اپنے بستر کی طرف جاتا ہے اسی طرح جب بھی تمہیں کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے یا تمہیں کسی تکلیف کا احساس ہوتا ہے تم زمین کی طرف توجہ کرتے ہو اور تمہیں اپنی تمام ضروریات زمین میں ہی حاصل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً غذا ہے انسان کو کھانے کے لئے جس چیز کی بھی ضرورت ہو زمین سے وہ مہیا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح لباس ہے اللہ تعالیٰ انسان کی اس ضرورت کو بھی زمین سے ہی پورا کرتا ہے۔ غرض انسان جب بھی کوئی ضرورت محسوس کرتا ہے زمین سے اللہ تعالیٰ اس کی وہ ضرورت پوری کر دیتا ہے اور وہ اسی طرح زمین سے آرام حاصل کرتا ہے جس طرح بستر سے انسانی جسم راحت حاصل کرتا ہے۔ پھر جبال بھی زمین کے لئے تقویت اور سہارے کا موجب ہیں۔ درحقیقت زمین میں بعض نقائص ایسے تھے جن کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین کئی فوائد سے محروم رہ جاتی۔ مثلاً پہاڑوں کا یہ بہت بڑا فائدہ ہے کہ وہ اس پانی کو جو زمین کی زندگی کا ذریعہ ہے جمع رکھتے ہیں کیونکہ برف پہاڑ کی چوٹیوں پر ہی پڑتی ہے اور پھر وہ برف پگھل کر زمین کیلئے سال بھر کے لئے پانی مہیا کر دیتی ہے۔ اسی طرح قسم قسم کی بوٹیاں ہیں جو پہاڑوں پر پیدا ہوتی اور بنی نوع انسان کے کام آتی ہیں۔ زمین کو انسان چونکہ اپنی رہائش کے لئے آباد کرتا ہے اس لئے وہ پروا نہیں کرتا کہ زمین کو قابل رہائش بنانے کے لئے وہ کون کون سی چیزیں تلف کر رہا ہے۔ جب بھی اُسے اپنی رہائش کے لئے یا اپنے اور کاموں کے لئے زمین کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ بلا دریغ اُن سب چیزوں کو تلف کر دیتا ہے جو زمین پر موجود ہوتی ہیں۔ اگر درخت اُگے ہوئے ہوں تو ان کو کاٹ دیتا ہے بوٹیاں موجود ہوں تو اُن کو اکھیڑ دیتا ہے کیونکہ اُسے ضرورت ہوتی ہے کہ اپنی رہائش کے لئے زمین کو صاف کرے۔ پس چونکہ زمین کو انسان نے آباد کرنا تھا اس میں اپنی رہائش کیلئے اُس نے مکان بنانے تھے۔ سڑکیں بنانی تھیں۔ کھیت بونے تھے۔ رستے تیار کرنے تھے اور یہ چیزیں تقاضا کرتی تھیں کہ زمین صاف ہو اس لئے انسانی عادت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ زمین کو بالکل صاف کر دیتا ہے اور تمام روئیدگیوں وغیرہ کو لغو سمجھ کر کاٹ دیتا ہے۔ حالانکہ ان بوٹیوں میں جن کو کاٹ رہا ہوتا ہے اور جن کو وہ بالکل لغو اور بے کار سمجھ رہا ہوتا ہے ہزاروں بوٹیاں ایسی ہوتی ہیں جو نہایت ہی مفید ہوتی ہیں اور کئی قسم کی بیماریوں کو دُور کرنے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ پس اگر میدان ہی میدان ہوتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ انسان ساری چیزیں اُکھیڑ دیتا۔ حالانکہ اُن میں بیسیوں چیزیں ایسی ہو سکتی تھیں جو اس کے لئے نہایت مفید ہوتیں۔ اس نقص کو دُور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہاڑ بنا دئے ہیں۔ وہاں جس طرح پانی محفوظ ہوتا ہے (کیونکہ برف پہاڑوں پر ہی پڑتی ہے) اسی طرح ہزاروں قسم کی بوٹیاں جو انسانی صحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں اور جو اگر ہموار زمین پر ہوتیں تو انسان اُن کو کاٹ کر فنا کر چکا ہوتا وہاں محفوظ رہتی ہیں اس طرح پہاڑ زمین کیلئے سہارے کا موجب بن جاتے ہیں۔ ان امور کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا۔ ہم نے تمہیں نر و مادہ بنایا ہے جس کی وجہ سے تمہاری نسل چلتی ہے۔ یعنی ایک طرف زمین میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے بے انتہا فوائد جو زمینی قوتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہ ختم ہونیوالے ہیں رکھے ہیں اور دوسری طرف اُس نے جبال بنائے ہیں جن سے یہ فوائد عملی صورت میں بھی مستقل ہو جاتے ہیں۔ گویا زمین بھی فائدے کا موجب ہے اور جبال بھی فائدے کا موجب ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جبال زمین کے فوائد کو مستقل حیثیت دیدیتے ہیں پس ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم الشان سلسلہ تمہارے لئے جاری کیا ہوا ہے دوسری طرف تمہاری نسل قائم کرنے کے لئے اس نے تمہیں اَزْوَاج یعنی نر و مادہ بنا دیا ہے۔ اب کیا یہ عجیب بات نہیں کہ خدا نے تمہارے لئے ایک طرف تو زمین کو پیدا کیا جس سے تم اپنے کھانے کا سامان حاصل کرتے ہو اپنے پینے کا سامان

حاصل کرتے ہو۔ اپنے لباس کا سامان حاصل کرتے ہو۔ اپنی رہائش کا سامان حاصل کرتے ہو۔ اور دوسری طرف اُس نے پہاڑ بنا دئے جن سے یہ فوائد ایک مستقل صورت اختیار کر گئے ہیں تیسری طرف اُس نے تمہیں نر و مادہ بنا دیا تاکہ تمہاری نسل قائم رہے اور مستقل صورت اختیار کرے اور تم ان چیزوں سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے رہو۔ مگر تمہاری یہ حالت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس لمبے سلسلۂ پیدائش کے متعلق تم یہ کہہ رہے ہو کہ یہ سب لغو اور فضول ہے ان کی پیدائش کسی حکمت پر مبنی نہیں۔

**خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا کی دوسری تشریح**

زَوْج کے ایک معنے صنف کے بھی ہوتے ہیں اس لحاظ سے خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا کا یہ مفہوم ہوگا کہ ہم نے تم کو مختلف اقسام میں پیدا کیا ہے یعنی کوئی شخص تم میں سے ایسا ہے جو تصویر کشی کی رغبت رکھتا ہے۔ کوئی ایسا ہے جو نجار بننے کی قابلیت رکھتا ہے۔ کوئی ایسا ہے جسے سائنس میں انہماک ہے۔ کوئی ایسا ہے جو حساب سے دلچسپی لیتا ہے کوئی ایسا ہے جو تاریخ کی طرف مائل ہے۔ غرض ہم نے تم کو مختلف اقسام میں تقسیم کر دیا ہے۔ اگر سب طبائع یکساں ہوتیں تو دنیا ایک ہی حالت میں چلتی چلی جاتی اور اُس میں کسی قسم کی ترقی نہ ہوتی۔ مگر ہم نے انسانی دماغ کو اتنا متنوع بنایا ہے اور اس قدر اقسام در اقسام صورت میں ترقیات کا میدان اس کے لئے کھولا ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے مذاق اور اپنی اپنی طبیعت کے مطابق جس لائن کو چاہتا ہے [illegible] کر لیتا ہے۔ کوئی دنیا میں مشغول ہے۔ کوئی دین میں مشغول ہے کوئی سائنس کی طرف توجہ کر رہا ہے کوئی علم الاخلاق میں ترقی کر رہا ہے۔ کوئی علم ہندسہ میں سبقت لے [illegible] ہے۔ کوئی تاریخ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کر رہا ہے۔ غرض اپنے اپنے رنگ میں انسانی فطرت اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

**انسانوں کو مختلف الطبائع پیدا کرنا بعث بعد الموت پر دال ہے**

یہ تنوع اس بات کی دلیل ہے کہ انسان میں خدا تعالےٰ نے کسی غیر مرئی چیز کو پا لینے کی رغبت پیدا کی ہے اور اس کے اندر یہ تڑپ رکھی ہے کہ وہ اس مخفی اور غیر مرئی چیز کو حاصل کرنے کی جد وجہد کرے۔ چنانچہ اس کوشش اور تلاش میں کوئی کسی طرف دوڑ رہا ہے اور کوئی کسی طرف دوڑ رہا ہے جیسے پانی جب بہایا جاتا ہے تو وہ نشیب کی طرف بہہ پڑتا ہے اسی طرح انسانی طبیعت اپنے اپنے مذاق کے مطابق مختلف رستوں پر دوڑ رہی ہے۔ کوئی کسی رستہ سے اس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور کوئی کسی رستہ سے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کسی خاندان کا بچہ کھو یا جائے تو اس خاندان کے کچھ افراد مشرق کو چل پڑینگے۔ کچھ مغرب کی طرف چلے جائیں گے۔ کچھ شمال کی طرف دوڑ پڑینگے اور کچھ جنوب کی سمت اختیار کر لینگے مگر مقصد سب کا ایک ہی ہوگا کہ کسی طرح اُس بچہ کو ڈھونڈا جائے۔ اسی طرح انسانی فطرت مختلف رستوں پر مختلف جہات کی طرف بھاگ رہی ہے جو ثبوت ہے اس بات کا کہ کوئی چیز ایسی ہے جس کے متعلق فطرت یہ محسوس کرتی ہے کہ اُسے حاصل کرنا چاہئے۔ مگر چونکہ اُسے علم نہیں کہ وہ کہاں ہے اس لئے مختلف جہات سے وہ اس چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہے یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ انسانی فطرت اپنے لئے کسی ایسے مقصود کی طالب ہے جس کے مقام کا علم خود اُسے اپنی ذات کے اندر سے نہیں حاصل ہوتا اور چونکہ اُسے اپنی ذات سے اس کے مقام کا علم حاصل نہیں ہوتا اس لئے وہ مختلف جہات سے اسکو تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے اور یہ حالت چلتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ خدا تعالےٰ اپنا کلام نازل کر کے اس مقصد کو ظاہر کر دیتا ہے پھر انسان کی تسلی ہو جاتی ہے اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ مقصد میں نے پا لیا جس کے لئے میں کوشش کر رہا تھا اور جس کیلئے خدا نے مختلف قسم کے مادے انسانی فطرت میں پیدا کئے تھے گویا ایک طرف زمین اور جبال کی پیدائش کا سلسلہ اور دوسری طرف انسانی فطرت میں تنوع کا پایا جانا اور مختلف الطبائع انسانوں کا مختلف جہات کی طرف اپنے مقصد کے حصول کیلئے دوڑنا یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ انسان کے سامنے کوئی بہت بڑا مقصد ہے جس کے حصول کے لئے اُس نے کوشش کرنی ہے۔ پس انسانی فطرت کی یہ کشمکش ایک طرف کلام الٰہی کی ضرورت پر دلالت کرتی ہے دوسری طرف بعث بعد الموت پر دلالت کرتی ہے اور تیسری طرف کلام الٰہی کے نزول کے بعد اس کے غلبہ پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ اگر کلام الٰہی کا غلبہ نہیں ہونا تھا تو پھر اُس کے نزول کا کوئی فائدہ نہ تھا پس یہ امر کلام الٰہی کے غالب آنے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ

# وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا

اور ہم نے تمہاری نیند کو موجب راحت بنایا ہے ۹

زمین جس پر انسان بستا ہے اس میں بے انتہا اشیاء اور قوتیں پیدا کر کے اور پہاڑوں کے ذریعہ سے تور و نوش اور سائنٹفک ترقیات کے سامانوں کو مستقل رنگ دے کر اور انسانوں کو اس صورت میں پیدا کر کے کہ وہ مختلف مزاجوں کے مطابق زمین کی مختلف قابلیتوں کو ترقی دیں اور ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اور پھر انسان کو بھی مرد و زن بنا کر اور ایک مستقل قائم رہنے والے وجود کی شکل دے کر اللہ تعالیٰ نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان غیر محدود ترقیات کے لئے اور دائمی زندگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اگر یہ بات ثابت ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس دنیا میں فنا ہونیوالے انسان کے لئے کسی اور دنیا میں دائمی زندگی کا سامان مہیا ہونا چاہیئے اور اس دائمی زندگی کے لئے کوئی ہدایت نامہ اور اس ہدایت نامہ پر چلنے والوں کے لئے کامیابی کی ضمانت بھی ہونی چاہیئے۔ ورنہ کارخانہ عالم بیکار محض ثابت ہوتا ہے۔

**۹ حل لغات**۔ سُبَات سَبْتٌ سے ہے اور سَبْتٌ کے اصل معنے کسی چیز کو کاٹنے کے ہیں چنانچہ کہتے ہیں سَبَتَ السَّيْرَ چمڑے کے ٹکڑے کو لمبے رنگ میں کاٹا۔ وَ سَبَتَ شَعْرَهُ: حَلَقَهُ اُس نے بالوں کو کاٹا۔ اور ہفتہ کو یوم سبت اس لئے کہا گیا کہ اُس دن یہودی اپنے کام کاج چھوڑ دیتے تھے (مفردات) انہی معنوں کے پیش نظر وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا کے معنے صاحب مفردات نے کئے ہیں قَطْعًا لِلْعَمَلِ کہ ہم نے تمہاری نیند کو ایسا بنایا ہے کہ اُس سے تم اپنے کاموں سے کٹ جاتے ہو اور پھر تازہ دم ہو جاتے ہو (مفردات)

اقرب الموارد میں ہے اَلسُّبَاتُ: اَلدَّهْرُ یعنی زمانہ۔ اَلدَّاهِيَةُ مِنَ الرِّجَالِ۔ آدمیوں میں سے بڑا لائق آدمی۔ اَلنَّوْمُ۔ نیند۔ وَقِيْلَ خِفَّتُهُ وَقِيْلَ اِبْتِدَاءُهُ فِي الرَّأْسِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْقَلْبَ بعض کے نزدیک سُبَات کے معنے ہلکی سی نیند کے ہیں اور بعض نے اس کے معنے اُونگھ کے کئے ہیں لیکن اقرب الموارد کے مصنف لکھتے ہیں وَ اَصْلُهُ الرَّاحَةُ کہ اس کے اصل معنے آرام اور راحت کے ہیں (اقرب)

**تفسیر**۔ فرماتا ہے ہم نے تمہاری نیند کو سُبَات بنایا یعنی اگر کوئی شخص کہے کہ اسلام کے ذریعہ کفر پر ایک نئے غلبہ کی کیا ضرورت ہے اگر کفر پر غلبہ ہی منشاء ہے تو آدمؑ کے وقت یہ غلبہ ہو گیا۔ نوحؑ کے وقت یہ غلبہ ہو گیا۔ اب کسی نئے غلبہ کی کیا ضرورت ہے؟ تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا۔ کیا زندگی میں تم دیکھتے نہیں کہ ایک جاگنے کا وقت ہوتا ہے اور ایک سونے کا وقت ہوتا ہے۔ اسی طرح قوموں میں بیداری اور نیند کا ایک تسلسل چلا جاتا ہے تاکہ نئی قوتیں لیکر انسان اُٹھے اور کفر کو شکست دینے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ اس طرح لوگ ایک لمبے عرصہ تک کوشش کرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر جب وہ اپنی ان کوششوں میں تھک جاتے ہیں جب انکی تمام رغبتیں دنیا میں محدود ہو جاتی ہیں جب دین کی طرف سے وہ بے رغبتی کا اظہار کرنے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو چھوڑ دیتا ہے اُن کی حالت بدل جاتی ہے اور وہ خرابیوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں تب اللہ تعالیٰ ایک نیا فضل نازل کرتا اور لوگوں کی ہدایت کے لئے ایک نئے رُوحانی سورج کا طلوع کرتا ہے۔

سُبَات[1]

اس آیت میں چونکہ نَوْم کا لفظ مذکور ہے اس لئے سُبَاتًا سے مراد نیند تو نہیں ہو سکتی جو اس کے معروف معنے ہیں اور حل لغات میں بیان ہو چکے ہیں پس لازماً اس کے کوئی اور معنے ہوں گے اور وہ معنے یہی ہیں کہ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ رَاحَةً ہم نے تمہاری نیند کو ایک راحت کا ذریعہ بنایا ہے اور چونکہ سُبَات کے ایک معنے دَهْر کے بھی ہوتے ہیں اس لئے جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا کے معنے جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ دَهْرًا کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی تمہاری نیند کے زمانہ کو ایک لمبا زمانہ بنایا ہے۔ اس صورت میں نیند سے مراد وہ زمانہ ہو گا جب روحانی سورج کا طلوع

جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا کے معنے[2]

# وَّجَعَلۡنَا الَّيۡلَ لِبَاسًا ۙ﴿۱۱﴾

اور ہم نے رات کو پردہ پوش بنایا ہے ﴿۱۱﴾

نہیں ہوتا اور قوم غفلت کی حالت میں سو رہی ہوتی ہے گویا مراد یہ ہے کہ جب کوئی قوم سوتی ہے تو پھر ایک لمبے عرصہ تک سوتی چلی جاتی ہے۔

لِبَاس

**۱۱؎ حل لغات** - لِبَاس کے معنے مفردات میں یوں لکھے ہیں وَجُعِلَ اللِّبَاسُ لِكُلِّ مَا يُغَطِّيْ مِنَ الْاِنْسَانِ عَنْ قَبِيْحٍ یعنی لباس کا لفظ ہر ایسی چیز پر بولا جاتا ہے جو انسانی عیوب اور نقائص کو چھپا دیتی ہے پس جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے رات کو تمہارا ننگ ڈھانکنے والی چیز بنایا ہے اور اسی لحاظ سے رات کو لباس قرار دیا گیا ہے

رات کو لباس بنانیکا مطلب

کیونکہ عربی زبان میں ہر وہ چیز جو عیوب ڈھانکنے کا کام دے وہ لباس کہلاتی ہے جیسے قرآن کریم میں ہی ایک دوسرے مقام پر لِبَاسُ التَّقْوٰی (الاعراف ع۳) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ تقوے کو بھی لباس انہی معنوں میں کہا گیا ہے کہ تقویٰ انسانی عیوب کو ڈھانکتا ہے پس اللہ فرماتا ہے ہم نے رات کو تمہارے عیوب ڈھانکنے والی چیز بنایا ہے۔

اقرب میں ہے اَللِّبَاسُ : اَلْاِخْتِلَاطُ وَالْاِجْتِمَاعُ يُقَالُ "بَيْنَهُمْ لِبَاسٌ" اَيْ اِخْتِلَاطٌ وَّاِجْتِمَاعٌ (اقرب) یعنی اختلاط اور اجتماع کو بھی لباس سے تعبیر کرتے ہیں چنانچہ عرب کہتے ہیں بَيْنَهُمْ لِبَاسٌ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اُن کے درمیان اختلاط اور اجتماع ہے۔

رات عیوب کے ڈھک جانے کا ایک ذریعہ

لسان میں ہے لِبَاسُ كُلِّ شَيْءٍ غِشَاءُهٗ۔ ہر چیز کا پردہ اُس کا لباس کہلاتا ہے۔

**تفسیر** - اگر رات نہ آئے اور انسان ہر وقت جاگتا رہے تو دو چار دن میں ہی وہ پاگل ہو جائے مگر رات آنے کی وجہ سے انسان کا یہ نقص ظاہر نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رات کو بنی نوع انسان کا لباس بنایا ہے اور وہ انسان کی محدود طاقت کے نقائص کو چھپا دیتی ہے۔ اس طرح رات کے اندھیرے میں جب کوئی شخص سویا ہوا ہو تو اس کے سونے وقت کے نقائص دوسروں کو معلوم نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ بھی سوتے ہوتے ہیں اور کوئی دوسرا شخص ان نقائص کو دیکھ نہیں سکتا لیکن اگر دن کے وقت کوئی شخص سوئے تو دوسرے شخص کو فوراً اس قسم کے عیوب نظر آجائیں۔ سونے وقت انسان کی عجیب عجیب حالتیں ہوتی ہیں اور بعض تو یقیناً ایسی ہوتی ہیں جن کو اگر دوسرا شخص دیکھ لے تو اُسے سخت کراہت آئے بعض دفعہ ایک بڑا شخص ہوتا ہے لیکن اُس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ سوتا ہے تو اُس کا مُنہ کھلا رہتا ہے اور اُس پر مکھیاں بیٹھتی ہیں۔ لیکن اگر وہ رات کو سوتا ہے تو اُس کا یہ نقص پوشیدہ رہتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ سوتے وقت خراٹے شروع کر دیتے ہیں بعض نہایت قابلِ نفرت طریق پر سوتے ہیں۔ کوئی بلی کی طرح سوتا ہے۔ کوئی مچھلی کی طرح سوتا ہے اور کوئی کسی طرح سوتا ہے۔ غرض سونے کی ایسی ایسی حالتیں ہوتی ہیں جنکو دیکھ کر گھن پیدا ہوتی ہے پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ہم نے رات کو لباس بنایا ہے یعنی سونے کا عام وقت رات ہوتا ہے اور رات میں سونے والوں کے جسمانی عیوب ڈھک جاتے ہیں۔ اگر انسان عام طور پر دن کو سوتا تو اُس کے عیب ظاہر ہو جاتے لیکن چونکہ وہ رات کے اندھیرے میں سوتا ہے اس لئے اُس کے سوتے وقت کے عیوب کا پتہ نہیں لگتا اور رات اُن پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اسی طرح روحانی لَیل بھی ایک لباس ہوتی ہے کیونکہ رات اُسی کو کہتے ہیں جب سارے لوگ سوئے ہوئے ہوں جس طرح جسمانی لَیل لباس کا کام دیتی ہے اسی طرح روحانی لَیل بھی لباس کا کام دیتی ہے کیونکہ ساری قوم مُردہ ہوتی ہے کوئی شخص کسی دوسرے کا کوئی عیب نہیں دیکھتا جیسے کہتے ہیں حمام میں سارے ننگے۔ اُس زمانہ میں بھی روحانی لحاظ سے سب ننگے ہوتے ہیں۔ ہر شخص میں بدی ہوتی ہے۔ ہر شخص میں عیب ہوتا ہے اور چونکہ ہر شخص گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے اس لئے کسی دوسرے کا

# وَّجَعَلۡنَا النَّهَارَ مَعَاشًا

اور ہم نے دن کو زندگی (کے اظہار) کا ذریعہ بنایا ہے ؎۱۱۵

گناہ اُسے نظر نہیں آتا۔ جیسے اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں ہر شخص شرک میں مبتلا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کوئی بڑا مشرک تھا اور کوئی چھوٹا مشرک تھا لیکن باوجود اس کے کہ ہر شخص شرک میں مبتلا تھا کوئی شخص دوسرے کے نقص کا اظہار نہیں کرتا تھا جب نبی آتا ہے اور اللہ تعالےٰ اپنے روحانی سورج کا طلوع کر دیتا ہے تو پھر لوگوں کو ایک دوسرے کے نقائص نظر آنے لگ جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں فلاں ایسا ہے اور فلاں ایسا ہے مگر جب تک سب قوم سوئی ہوئی ہو کوئی شخص دوسرے کے عیب کو نہیں دیکھ سکتا۔ جیسے یورپ میں ننگے ناچ ہوتے ہیں مگر کسی کے دل میں یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ یہ بھی کوئی گندی چیز ہے کیونکہ روحانی تنزل اُن پر چھائی ہوئی ہے اور رات کی تاریکی کی وجہ سے اُنہیں یہ نقائص نظر نہیں آتے۔ بڑے سے بڑا آدمی بھی ان نظاروں کو دیکھیگا تو خاموشی سے گذر جائے گا اور اُسے یہ خیال نہیں آئے گا کہ ان باتوں کے خلاف نفرت کا اظہار کرے۔ مگر جب نبی کا زمانہ آتا ہے تو پھر لوگ شرمانے لگتے ہیں اور وہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ یہ بھی بُری بات ہے اور وہ بھی بُری بات ہے۔

پھر لباس زینت کا موجب بھی ہوتا ہے اور کام کرنیوالوں کے لئے ایک رنگ میں رات ہی زینت کا باعث ہوتی ہے۔ عرب میں رواج ہے کہ غریب سے غریب آدمی بھی روزانہ اپنے کپڑے دھوتا ہے یا بعض امیر لوگ رات کو اور کپڑے پہنتے ہیں اور دن کو اور۔ دن میں تو کام کاج کرنے کی وجہ سے لباس خراب ہو جاتا ہے لوگ اچھا لباس نہیں پہن سکتے مگر رات کو فارغ ہو کر پہنتے ہیں اور آرام سے بیٹھتے ہیں۔ بعض ممالک یعنی یورپ وغیرہ میں جاکر دیکھو امیر سے امیر آدمی دن کے وقت کارخانوں وغیرہ میں کام کر رہے ہوتے ہیں اور چار چار سو پانچ پانچ سو تنخواہ پر ملازم ہوتے ہیں لیکن لباس خراب ہوتا ہے۔ لیکن جہاں چار بجے اور کام سے فارغ ہوئے غسل کر کے صاف ستھرے کپڑے پہن لیتے اور آرام سے اپنے گھر بچوں اور بیوی کے پاس بیٹھتے ہیں۔

؎۱۱۵ **حل لغات** - مَعَاشٌ عَاشَ کا مصدر ہے۔ اور عَاشَ يَعِيْشُ مَعَاشًا کے معنے ہوتے ہیں صَارَ ذَا حَيَاةٍ (اقرب) یعنی وہ زندہ ہوا۔ پس مَعَاشٌ کے معنے ہوئے زندگی والا ہونا۔ اور جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا کا یہ مطلب ہُوا۔ کہ ہم نے دن کو حیات کے اظہار کا ایک موقع بنایا ہے۔ اسی طرح لغت میں مَعَاشًا کے ایک معنے یہ بھی لکھے ہیں کہ مُلْتَمَسًا لِلْعَيْشِ (اقرب) اس صورت میں جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا کے معنے یہ ہونگے کہ ہم نے دن کو ایسا بنایا ہے کہ اُس میں انسان اپنے عیش کے سامان تلاش کرتا ہے گویا جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا کے ایک معنے ہوئے دن کو ذوحیات بنایا ہے اور دوسرے معنے ہوئے مُلْتَمَسًا لِلْعَيْشِ یعنی دن ایک ذریعہ سامانِ معیشت کے تلاش کا ہوتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالےٰ یہ بیان فرماتا ہے کہ ہم نے دن کو ایک حیات کی چیز بنایا ہے یعنی دن اپنی ذات میں حیات کو ظاہر کرنے والا ہے اور وہ زندہ چیز نظر آتی ہے۔ دوسرے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے نہار کو ذریعہ عیش بنایا ہے یعنی وہ انسان کے لئے زندگی کے سامان تلاش کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ اگر مَعَاشًا کو مبالغہ کے معنوں میں لیا جائے تو یہ جَعَلَ کا مفعول بہ بن جاتا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہوگی جیسے کہتے ہیں زَيْدٌ عَدْلٌ پس علاوہ مفعول فیہ ہونے کے یہ اس کے مفعول بہ کے طور پر بھی استعمال ہو سکتا ہے کہ ہم نے نہار کو معاش بنا دیا یعنی نہار اور معاش کا آپس میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ معاش نہار ہے اور نہار معاش ہے تو یہ بالکل جائز ہے جیسے کہتے ہیں زَيْدٌ عَدْلٌ یعنی زید کا عدل سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ زید عدل ہے اور عدل زید ہے تو یہ جائز ہوگا۔ قرآن کریم میں بھی

مَعَاشًا

روحانی تنزل لوگوں کے لئے بطور لباس کے

نَهَارٌ کو معاش بنانے کا مطلب

اس کی مثال پائی جاتی ہے سورۂ عنکبوت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (عنکبوت ع ۷) حیوان کا لفظ یہاں حیات کے مبالغہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور مطلب یہ ہے کہ دارِ آخرت ہی اصل زندگی ہے۔ اب دارِ آخرت ایک جگہ کا نام ہے اور کوئی خاص جگہ زندگی نہیں کہلا سکتی مگر چونکہ انسان دارِ آخرت میں ہی حقیقی طور پر زندہ ہوگا اور اصل زندگی وہی ہے جو انسان کو اگلے جہان میں حاصل ہوگی اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ دارِ آخرت ہی زندگی ہے۔ یعنی اگر ہم یہ کہیں کہ دارِ آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے تو یہ بالکل جائز ہے۔ پس جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا کے یہ معنے ہوں گے کہ معاش کا دن کے ساتھ اتنا بھاری تعلق ہے اور رات کے ساتھ معاش کا اتنا کم تعلق ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ خدا تعالیٰ نے دن کو معاش بنا دیا ہے یعنی دن میں اُس نے اتنے سامان معاش کمانے کے پیدا کر دیئے ہیں کہ اور کسی وقت وہ سامان میسّر نہیں آسکتے تو یہ بالکل درست ہوگا۔ یہ معنے مَعَاشًا کے مفعول بہ ہونے کی صورت میں ہیں لیکن اگر اسے مفعول فیہ سمجھا جائے تو اس کے معنے وقتِ معاش کے ہوں گے یعنی دن کو ہم نے ایک ذریعۂ معاش بنا دیا ہے۔ دوسرے اوقات میں انسان معاش کو تلاش نہیں کرسکتا لیکن دن اُس کے حصولِ معاش کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔

آیت جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا سے بعث بعد الموت پر ثبوت

نہار اور معاش کا گہرا تعلق

مَعَاشًا درحقیقت عَاشَ کا مصدر ہے اور مَعَاش کے معنے ایک تو محض حیاۃٌ کے ہوتے ہیں اور دوسرے معنے حیوانی حیات کے ہوتے ہیں۔ عام معنے اس کے حیوانی حیات کے ہی ہوتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کے کوئی بُرے معنے ہیں بلکہ حیوانی حیات سے مراد صرف وہ زندگی ہے جو کھانے پینے سے تعلق رکھتی ہے۔

مَعَاشًا کے دو معنے

**تفسیر** - ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ جس طرح دن کے بعد رات آتی ہے اسی طرح قوموں پر بھی بعض دفعہ تاریکی کا دَور آجاتا ہے اور وہ تاریکی کا دَور اُن کے لئے ایسا ہی ہوتا ہے جیسے نہار کے بعد لیل کی ظلمت دنیا پر چھا جاتی ہے میں نے بتایا تھا کہ اس سورۃ میں تین مضامین کا ذکر ہو رہا ہے قیامت کا، غلبۂ قرآن کا اور غلبۂ اسلام کا۔ پس اگر یہاں بعث بعد الموت مراد ہو تو اس صورت میں وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے رات کو تمہارے نقائص دور کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ تمہاری روح میں یہ قابلیت نہیں تھی کہ وہ ہمیشہ نہار سے فائدہ حاصل کرسکتی بلکہ ضروری تھا کہ اُس پر رات بھی آتی تاکہ دن سے فائدہ اٹھانے کے لئے اُس میں نئی طاقتیں پیدا ہو جاتیں یہی تمہارا روحانی حال ہے۔ جس طرح خدا نے تمہارے لئے رات کو لباس اور زینت کا سُبَات بنایا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے دنیا کی پیدائش کا سلسلہ جو لَیل اور سُبَات کا قائم مقام ہے اس لئے جاری کیا ہے تاکہ تم اس جہان میں رہ کر اپنے اندر وہ نئی طاقتیں پیدا کرو جن سے اگلے جہان میں تمہیں رؤیتِ الٰہی نصیب ہوسکے۔ پس جس طرح لیل کا نہار سے پہلے آنا ضروری ہے اسی طرح تمہاری ترقی کے لئے ایک اور عالم کا ہونا بھی ضروری ہے تم اس جہان میں رہ کر اپنے اندر وہ قابلیتیں پیدا کرو تاکہ اگلے جہان میں رؤیتِ الٰہی سے حصہ لے سکو۔ اور اگر قرآن یا اسلام کا غلبہ مراد ہو تو اس صورت میں مذکورہ بالا آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ تمہاری قوم سو رہی تھی مگر اللہ تعالیٰ اسی لَیل میں تمہارے اندر نئی قوتیں پیدا کر رہا تھا۔ جب بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے کلام نازل ہوتا ہے اُسی قوم میں نازل ہوتا ہے جو مردہ اور ذلیل ہوچکی ہوتی ہے تاکہ وہ اُس کلام کے ذریعہ نئی طاقتیں لے کر کھڑی ہو جائے اور دنیا پر غالب آجائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی خدا تعالیٰ کا کلام کسی قوم میں نازل ہوتا ہے اُس کی قوتوں میں نشو و نما پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور آخر ایک دن وہ قوم اُن قوتوں سے کام لے کر دنیا میں پھیل جاتی ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کو دیکھ لو۔ عرب صدیوں سے ذلیل اور مردہ چلے آرہے تھے اُن کا دنیا میں کہیں غلبہ نہ تھا۔ اُن کی ترقی کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ دنیا سے الگ ایک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے جب اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہوا تو بے شک وہ قرآن کریم کی مخالفت کرتے تھے۔ وہ اسلام کو مٹانے کی کوششیں کرتے تھے مگر ساتھ ہی اُن کے

## وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝

اور ہم نے تمہارے اوپر سات (بلند اور) مضبوط (آسمان) بنائے ہیں ۱۲ ؎

دلوں میں یہ حسرت بھی موجود تھی کہ ہر قوم نے ترقی کی۔ ہر قوم نے عروج حاصل کیا۔ ہر قوم نے غلبہ پایا۔ مگر ہمیں کوئی ترقی حاصل نہیں ہوئی پس اُن کے دلوں میں ترقی کی تڑپ پائی جاتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ غلبہ حاصل کریں اور ان کی ذاتی خواہش تھی کہ ہماری قوم کو بھی عزت ملنی چاہیئے اور اُسے بھی دنیا میں غلبہ حاصل ہونا چاہیئے اور اس خواہش نے اسلام لانے پر انہیں ترقی میں بڑی مدد دی۔ پس جب بھی کلام الٰہی نازل ہوتا ہے اسی قوم میں نازل ہوتا ہے جو مدتوں سے مردہ ہوتی ہے اس زمانہ میں بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰة والسلام کو اللہ تعالیٰ نے ہندوستان میں مبعوث فرمایا جہاں کے رہنے والے مدتوں سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور جن کے دلوں میں یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ ہم بھی بڑھیں اور ترقی کریں۔ اور گو وہ لوگ احمدیت کی مخالفت کرتے ہیں جس طرح عرب کے رہنے والے اسلام کی مخالفت کیا کرتے تھے مگر جس دن اُن کو پتہ لگا کہ احمدیت ہی اُن کی ترقی کا ذریعہ ہے اُسی دن اُن کے اندر بیداری پیدا ہو جائے گی اور وہ اس غرض کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔

وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا میں اللہ تعالیٰ نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ درحقیقت زندگی کا ثبوت صرف دن سے ہی ملتا ہے رات سے نہیں ملتا۔ یہاں ایک عجیب لفظی لطیفہ ہے۔ انسان عام طور پر راحت اور آرام کے سامانوں میں اپنی زندگی بسر کرنا ہی عیش سمجھتے ہیں مگر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے جس کو تم عیش سمجھتے ہو وہ عیش نہیں بلکہ ایک نیند ہے جو تم پر مسلط ہوتی ہے تم سمجھتے ہو کہ کھانا پینا سیر و سیاحت کرنا۔ راحت و آرام کے سامانوں میں چسکہ لگانا انسان کے لئے عیش ہوتا ہے حالانکہ عیش کا زمانہ صرف نبی کا زمانہ ہوتا ہے جب حقیقی کام کا وقت ہوتا ہے اور جب حقیقی عزت حاصل کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ کھانا پینا اور مادی راحت و آرام کے سامانوں سے لطف اٹھانا یہ عیش نہیں بلکہ سونا ہے۔ گویا جس کو تم عیش کہتے ہو وہ تمہارا سونے کا زمانہ ہے اور جس کو تم تکلیف کا زمانہ کہتے ہو وہ حقیقی معنوں میں عیش کا زمانہ ہے جس طرح دن کو انسان چلتا پھرتا ہے اور رات کو آرام کرتا ہے اسی طرح کام کا وقت عیش کا وقت کہلاتا ہے اور آرام کا وقت لَیل کا وقت کہلاتا ہے دنیا میں جس چیز کو عیش سمجھا جاتا ہے وہ سکون کا زمانہ ہوتا ہے۔ اور جس چیز کو تکلیف سمجھا جاتا ہے وہ کام کا زمانہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ تم سکون والی چیز کا نام عیش رکھتے ہو حالانکہ عیش کا زمانہ وہ ہے جس میں انسانی طاقتیں متحرک ہوں اور اس کے لئے لیل کا وقت نہیں بلکہ نہار کا وقت مقرر ہے اور درحقیقت وہی زمانہ عیش کا ہوتا ہے جب قوم میں قربانی کی رُوح پائی جاتی ہو۔ جب اُس کے تمام افراد میں بیداری نظر آتی ہو۔ جب اُس کے ہر فرد میں یہ احساس پایا جاتا ہو کہ جان کو قربان کر دینا اور مال کو خدا تعالیٰ کی راہ میں لٹا دینا ہی کلید کامیابی ہے۔ کیونکہ زندگی حرکت کا نام ہے سکون کا نام نہیں۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے جس کو تم عیش کہتے ہو وہ سکون ہے اور تباہی کی علامت۔ اور جس کو تم تکلیف کا وقت کہتے ہو وہی عیش ہے۔ تم سکون والی زندگی کو عیش کی زندگی قرار دیتے ہو حالانکہ وہ عیش نہیں بلکہ ایک نیند ہے جو تم پر طاری ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں جس چیز کو تم عیش قرار دینے کے لئے تیار نہیں وہی حقیقی معنوں میں عیش ہے۔ گویا ان الفاظ کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے اُن کی ایک غلطی کا ازالہ کیا کہ عیش نام ہے حرکت کا جیسے انسان دن میں حرکت کرتا ہے۔ مگر تم عدمِ حرکت کا نام عیش رکھتے ہو حالانکہ وہ عیش نہیں بلکہ تمہارے حواس کا بطلان ہے۔

۱۲ ؎ **حل لغات**۔ شِدَادٌ شَدِيْدٌ کی جمع ہے اور الشَّدِيْدُ کے معنے ہیں اَلشُّجَاعُ وَالْبَخِيْلُ وَالْاَسَدُ

شِدَادًا

وَالْقَوِيُّ وَالرَّفِيعُ وَالْوَثِيقُ (اقرب) یعنی شَدِیْدٌ کے معنے شجاع کے بھی ہیں۔ بخیل کے بھی ہیں۔ شریر کے بھی ہیں۔ قوی کے بھی ہیں۔ بلند کے بھی ہیں اور مضبوط کے بھی ہیں۔ شَدِیْدٌ کی جمع شِدَادٌ بھی آتی ہے اور اَشِدَّاءُ بھی آتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہی اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر صحابہؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح ع۴) یہاں سَبْعًا شِدَادًا کے معنے ہوں گے سَبْعًا رِفَاعًا یعنی سات اونچی چیزیں ہم نے پیدا کی ہیں۔ اسی طرح قَوِيٌّ کے معنے بھی ہو سکتے ہیں اور وَثِيقٌ کے معنے بھی ہو سکتے ہیں۔ گویا اس آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے سات وہ چیزیں پیدا کی ہیں جو بلند ہیں یا ہم نے سات وہ چیزیں پیدا کی ہیں جو قوی ہیں یا ہم نے سات وہ چیزیں پیدا کی ہیں جو بندھی ہوئی ہیں اپنی جگہ سے ہلتی نہیں ہیں۔

سَبْعًا شِدَادًا سے نظامِ سماوی کی تین خصوصیات کی طرف اشارہ

**تفسیر**۔ یہ سات کیا چیزیں ہیں؟ قرآن کریم میں دوسری جگہ آسمانوں کے لئے چونکہ سات کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس لئے یہاں بھی سات سے مراد سات آسمان ہی ہوں گے اور بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے تمہارے اوپر سات جسمانی اور مادی بلندیاں پیدا کی ہیں جو بڑی قوی ہیں یعنی اُن میں کوئی تزلزل واقعہ نہیں ہوتا۔ ایک مضبوط قانون اُن میں چلتا چلا جاتا ہے جو کسی حالت میں بھی ٹوٹتا نہیں اور اس وجہ سے نظامِ عالم میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔

سَبْعًا شِدَادًا سے مراد سات آسمان

شِدَادٌ کے معنے اگر ہم رَفِيعٌ کے لیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے ایک ایسا وسیع اور بلند و بالا نظام تمہارے لئے قائم کیا ہے جس کا رفعت میں کوئی خاتمہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح یہاں وَثِيقٌ کے معنے بھی لئے جا سکتے ہیں یعنی وہ نظام جسے ہم نے قائم کیا ہے اُس میں یکرنگی پائی جاتی ہے ایک قانون جس رنگ میں ظاہر ہوتا ہے اُسی رنگ میں چلتا چلا جاتا ہے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ یکرنگی اور نہ ٹوٹنے میں فرق ہوتا ہے۔ نہ ٹوٹنے میں صرف ایک چیز قائم رہتی ہے لیکن یکرنگی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ قانون بالکل یکساں رہتا ہے اُس میں کوئی تغیر واقعہ نہیں ہوتا۔ دنیا میں بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جن میں عدمِ استقلال پایا جاتا ہے وہ آج کچھ کہتے ہیں تو کل کچھ کہہ دیتے ہیں ایسے لوگوں کو یک رنگ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جو سَبْعًا شِدَادًا بنائے ہیں اُن میں یہ تینوں خوبیاں پائی جاتی ہیں قَوِيٌّ کے لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ ان کے اندر ثبات پایا جاتا ہے رَفِيعٌ کے لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ اُن میں وسعت اور بلندی پائی جاتی ہے اور وَثِيقٌ کے لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ اُن میں یکرنگی پائی جاتی ہے گویا بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا کے یہ معنے ہوئے کہ ہم نے تمہارے اوپر جو سات بلندیاں پیدا کی ہیں وہ یکرنگ بھی ہیں وہ قائم رہنے والی بھی ہیں اور وہ اپنی ذات میں رفعت بھی رکھتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سَبْعًا شِدَادًا کا ذکر کرتے ہوئے یہاں اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ تین خصوصیات جو نظامِ سماوی کی ہم نے بیان کی ہیں یہ بھی اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہیں کہ دنیا کی پیدائش کا کوئی بہت بڑا مقصد ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کو پیدا کر کے بلا وجہ اور بغیر کسی مقصد کے اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر ایک بہت بڑا وسیع اور مضبوط نظام بنا دیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فعل کو عبث قرار دیتا اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ گویا یہ تمام نظام نعوذ باللہ بالکل لغو و فضول ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم ہمارے اس قانون کو دیکھو کہ وہ نہ ٹوٹنے والا ہے۔ تم اس قانون کی یکرنگی کو دیکھو کہ کس طرح وہ ایک ہی رنگ میں چلتا چلا جا رہا ہے اور پھر اس نظام کی رفعت اور اس کی وسعت کا اندازہ لگاؤ۔ سائنس دان اس نظام کو دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں اور باوجود بہت بڑی علمی ترقی کے اس نظام کی وسعت کا اندازہ لگانے سے اُن کی عقلیں قاصر ہیں۔ تم غور کرو اور سوچو کہ کیا یہ تمام نظام ایک ایسی دنیا کے لئے اور

# وَجَعَلۡنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿۱۴﴾

اور ہم نے ایک چمکتا ہوا سورج (بھی) بنایا ہے ۱۳؎

پھر اس دنیا کی ایک ایسی مخلوق کے لئے کیا جا سکتا تھا جس کی پیدائش کا کوئی مقصد نہ تھا اور جس نے کچھ عرصہ کے بعد فنا ہو کر مٹی ہو جانا تھا۔ یہ انتظام خود اس بات کی دلیل ہے کہ انسانی پیدائش کا کوئی بہت بڑا مقصد اور مدعا ہے۔ اگر اس مقصد کو تسلیم نہ کیا جائے تو یہ تمام نظام نعوذ باللہ لغو تسلیم کرنا پڑتا ہے گویا اس رنگ میں نظام سماوی کو اللہ تعالیٰ نے بعث بعد الموت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالےٰ کا یہ وسیع اور پُر حکمت نظام جاری کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ انسانی پیدائش صرف اس لئے نہیں ہوئی کہ وہ چند روز کھائے اور پیئے اور فنا ہو جائے بلکہ کسی بہت بڑے مقصد اور مدعا کو پورا کرنے کے لئے اس کی پیدائش ہوئی ہے۔ اور اگر یہاں قرآن مجید مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنی فطرت کو دیکھو اور غور کرو کہ کھانے پینے کے سوا اعلیٰ درجہ کے اخلاق کے حصول کی کتنی عظیم الشان تڑپ تمہارے دلوں میں رکھی گئی ہے تمہارے اندر شوق پایا جاتا ہے کہ تم نیکی میں ترقی کرو۔ تمہارے اندر خواہش پائی جاتی ہے کہ تم اعلیٰ درجہ کے روحانی مدارج حاصل کرو۔ کیا یہ شوق اور خواہش بلا وجہ ہے اور کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو تمہاری ادنیٰ خواہشیں تھیں اُن کو پورا کرنے کے سامان تو اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دئے مگر جو اعلیٰ درجہ کی روحانی خواہشات تمہارے اندر رکھی گئی تھیں ان کو پورا کرنے کا خدا نے کوئی سامان پیدا نہیں کیا۔ اس صورت میں سَبۡعًا شِدَادًا سے مراد وہ سات روحانی مدارج ہوں گے جن کا سورۂ مومنون میں ذکر آتا ہے اور جن کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب مومن ترقی کرتے کرتے ان ساتوں بلندیوں کو طے کر لیتا ہے۔

**۱۳؎ حل لغات** ۔ سِرَاجٌ کے معنے عام طور پر دِیئے کے ہوتے ہیں اور سُرُجٌ اس کی جمع ہے۔ سورج کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی خدا کا ایک دیا ہے جو دنیا کو روشن کرنے کے لئے اُس نے بنایا ہے۔

وَهَّاجًا

وَهَّاجًا۔ کہتے ہیں وَهَجَتِ النَّارُ والشَّمْسُ وَهْجًا وَ وَهَجَانًا: اِتَّقَدَتْ (اقرب) یعنی وَهَجَتِ النَّارُ کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ آگ بھڑک اُٹھی۔ وَهَّاج مبالغے کا صیغہ ہے یعنی اَلشَّدِيْدُ الْوَهَجِ (اقرب) سخت گرمی والا یا سخت بھڑکنے والا۔ اور وَهَجٌ کے معنے اس گرمی کے بھی ہوتے ہیں جس کو دور سے محسوس کیا جائے گویا وَهَج کے معنے ہوئے حَرُّ الشَّمْسِ مِنْ بَعِيْدٍ سورج کی گرمی جو دُور سے آرہی ہو۔ پس اس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ ہم نے ایک سورج بنایا ہے جس کی صفت یہ ہے کہ وہ بڑا گرم ہے اور اُس کی گرمی دور دور تک محسوس ہوتی ہے۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ وَجَعَلْنَا السِّرَاجَ وَهَّاجًا بلکہ فرمایا ہے وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں تنوین تفخیم کے لئے آئی ہے اگر جَعَلْنَا السِّرَاجَ وَهَّاجًا ہوتا تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ ہم نے سورج کو وَهَّاج بنایا ہے مگر جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا کہہ کر بتا دیا کہ ہم نے ایک عظیم الشان سورج بنایا ہے جس کی صفت ذاتی یہ ہے کہ وہ وَهَّاج ہے۔

مفردات میں ہے اَلْوَهَجُ: حُصُوْلُ الضَّوْءِ وَالْحَرِّ مِنَ النَّارِ یعنی آگ سے روشنی حاصل کرنے اور گرمی حاصل کرنے کو وَهَجٌ کہتے ہیں۔ اور جب تَوَهَّجَ الْجَوْهَرُ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں تَلَأْلَأَ یعنی جوہر چمک اٹھا۔ اور جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا کے معنے ہیں مُضِيْئًا یعنی ہم نے سورج کو ایسا بنایا ہے کہ دنیا اس سے روشنی حاصل کرتی ہے (مفردات)

پس دوسرے معنے جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا کے یہ ہوئے کہ ہم نے سورج بنایا ہے جس کی ذاتی صفت یہ ہے کہ وہ بہت روشنی دینے والا ہے۔

**تفسیر** ۔ سورج کی صفت وَهَّاج بتا کر اُس طرف اشارہ

نظامِ سماوی کا ذکر بعث بعد الموت کے ثبوت کیلئے ایک دلیل

سَبْعًا شِدَادًا سے مراد سات روحانی مدارج

سِرَاجٌ

کہا گیا ہے کہ سورج کی روشنی اور گرمی ذاتی ہے۔ چاند وَھَّاج نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے کہ اس میں اتقاد نہیں ہے۔ آگ کی طرح جلنے والا سورج ہی ہے۔ سورج کے اندر خدا تعالیٰ نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اس میں ریڈیم موجود ہے کشش ثقل کے ماتحت جب اس کے ذرّے اندر کی طرف کھنچتے ہیں تو تیز روشنی اور گرمی پیدا ہوتی ہے اور ان ذرّوں کے اندر کی کشش کی وجہ سے اس سے مستقل آگ پیدا ہوتی رہتی ہے۔

لفظ وھاج سے سورج کی ذاتی گرمی کی طرف اشارہ

سورج کی صفت وَھَّاج بھی کتنی ظاہر ہے۔ کروڑوں کروڑ میل پر سورج ہے یعنی نو کروڑ میل کے قریب دنیا سے اس کا فاصلہ ہے مگر اس کی گرمی جب یہاں پہنچتی ہے تو گرمیوں کے موسم میں کئی لوگ اس کو برداشت نہیں کر سکتے اور وہ مر جاتے ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے لاہور کے متعلق یہ خبر آئی تھی کہ وہاں گرمی کی شدت کی وجہ سے گھوڑے چلتے چلتے گر کر مر جاتے تھے۔ نیز امریکہ سے خبر آئی تھی کہ گرمی کی وجہ سے درجنوں آدمی پاگل ہوئے اور بلند مکانوں پر سے چھلانگ مارنے پر تیار ہو گئے۔ گویا سورج کو اللہ تعالیٰ نے وَھَّاج بنایا ہے یعنی دور دور تک اس کی گرمی پہنچتی ہے۔ لغت میں اَلْوَھَجُ مِنَ النَّارِ وَالشَّمْسِ کے معنوں میں لکھا ہے کہ حَرُّھُمَا مِنْ بَعِیْدٍ یعنی سورج یا آگ کی گرمی جو بہت دور سے محسوس ہوتی ہو۔ گویا سِرَاجًا وَّھَّاجًا میں دو اشارے کئے گئے ہیں۔ اوّل یہ کہ سورج کی روشنی اور گرمی ذاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی گرمی بہت دور سے محسوس ہوتی ہے

عَلَیْنَا سَبْعًا شِدَادًا۔ وَّجَعَلْنَا میں الفاظ سے قیامت کی طرف لطیف اشارہ

سورج کے جہاں اور بہت سے فوائد ہیں وہاں اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ سورج کی روشنی اور اس کی تپش سے زمین کے اندر روئیدگی کا مادہ پیدا ہوتا ہے چنانچہ ہل چلانے سے محض یہ غرض نہیں ہوتی کہ زمین کو نرم کر دیا جائے بلکہ آج کل جو نئے ہل بنائے گئے ہیں وہ ایسی طرز پر بنائے گئے ہیں کہ زمین کے نچلے حصہ کو اکھاڑ کر باہر پھینک دیتے ہیں یعنی وہ ہل زمین کو صرف نرم ہی نہیں کرتے بلکہ اوپر کی زمین کو نیچے اور نیچے کی زمین کو اوپر کر دیتے ہیں اور اس کی غرض یہ ہوا کرتی ہے کہ زمین میں اُگانے والے بعض مادے ایسے ہوتے ہیں جن کو فصل کھا جاتی ہے اور اگر پھر اُسے اُٹھا کر سورج کے سامنے نہ کیا جائے تو آئندہ فصل ناقص پیدا ہونے لگتی ہے لیکن جب نچلے حصہ کو اُلٹا کر اوپر کر دیا جائے تو سورج کی شعاعوں سے طاقت حاصل کر کے زمین کے اس نقص کی کمی پوری ہو جاتی ہے غرض سورج کا تعلق فصلوں کے اُگانے میں بہت بڑا ہے اگر سورج کی گرمی اور اُس کی شعاعیں نہ پہنچیں تو زمین کے بعض ایسے مادے جن سے فصلیں اُگتی ہیں بالکل ختم ہو جائیں۔

آیت سِرَاجًا وَّھَّاجًا میں غلبہ اسلام کی پیشگوئی

جہاں تک سِرَاجًا وَّھَّاجًا کا تعلق ہے اس میں تو میں سمجھتا ہوں قیامت کی طرف اس رنگ میں اشارہ ہے کہ ایک چیز جو اپنی ذات میں جل رہی ہو وہ آخر ایک وقت ختم ہو جائیگی اور جب وہ ختم ہو جائیگی تو نظام شمسی میں ضرور کوئی اہم تبدیلی رُونما ہوگی۔ چنانچہ علم ہیئت کے جو بڑے بڑے ماہرین ہیں وہ قیامت کے قائل ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں سورج چھوٹا ہوتا جا رہا ہے اور اسی طرح یہ چھوٹا ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ ایک دن اس کا وجود نظامِ عالم میں بالکل بے کار ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی باقی تمام ستارے فنا ہو جائیں گے۔ گو اس کے ساتھ ہی علم ہیئت والوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جہاں تک گرمی کا تعلق ہے سورج کی گرمی گھٹ نہیں رہی بلکہ بڑھ رہی ہے اور جوں جوں وہ اپنے مرکز کے قریب آتا جاتا ہے اس کی گرمی تیز ہوتی چلی جاتی ہے۔ احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب قیامت آئے گی تو شدید گرمی پیدا ہو جائے گی۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلبہ یا قرآن کریم کے غلبہ کے مفہوم کو اگر ہم لیں تو میرے نزدیک اس میں ایک مخفی اشارہ ہجرت کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان الفاظ کے ذریعہ کفارِ مکہ کو توجہ دلاتا ہے کہ اب تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے پاس بیٹھے ہیں اور تم کہتے ہو یہ ہمیں دق کرتے ہیں۔ یہ ہمارے بتوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ یہ ہمیں تبلیغ کرتے ہیں۔ یہ ہمیں آباؤ اجداد کی اتباع کرنے سے روکتے ہیں۔ اور جب یہ تمہیں کوئی نیک بات بتلاتے اور تمہیں وعظ و نصیحت

# وَّاَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۙ

اور ہم نے گھنے بادلوں سے کثرت سے بہنے والا پانی (بھی) اتارا ہے ۱۴ٍ

کرتے ہیں تو تم شور مچانے لگ جاتے ہو اور چاہتے ہو کہ کسی طرح ان کو اپنے شہر سے نکال دو اور اس طرح امن میں آجاؤ مگر تمہیں پتہ نہیں ہم نے اپنے اس رسول کو سِرَاجًا وَّهَّاجًا بنایا ہے ایک دن یہ تم سے دُور چلا جائے گا مگر پھر بھی تم اسکی گرمی سے نہیں بچو گے بلکہ برابر اس کی گرمی تمہارے پاس پہنچتی رہیگی اور اسکی روشنی تم میں سے سعید روحوں کی تاریکی کو دور کرتی رہیگی۔ اگر قرآن مراد لے لو تب بھی یہ معنے ہونگے کہ ایک دن قرآن کا مرکز تم سے دور ہو جائیگا مگر تم یہ نہ سمجھو کہ دور ہو جانے کی وجہ سے تم اسکے اثر سے بچ سکو گے بلکہ پھر بھی قرآن کریم کی تعلیم کا اثر تم تک پہنچیگا اور وہ تمہیں اپنا شکار بنالے گا۔۔

انبیاء کے زمانہ میں کچھ ایسا شور ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ مومنوں کے دلوں میں کچھ اس قسم کا اخلاص پیدا کر دیتا ہے کہ انہیں تبلیغ کرنے اور دوسروں تک اپنی باتیں پہنچانے کے سوا چین ہی نہیں آتا۔ اُنہیں لاکھ گالیاں دی جائیں وہ اپنے کام سے نہیں رُکتے اور لوگوں کی ہدایت کے لئے ان کے پیچھے ہی پڑے رہتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں بھی ہم مخالفوں کے مُنہ سے یہ فقرہ سنا کرتے تھے کہ احمدی تو ہمارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَعَلۡنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ہم نے ایک ایسا سورج بنا دیا ہے جو وَهَّاج ہے اور جس کی گرمی اور روشنی دور دور تک جاتی ہے۔ دوسرے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عالمگیر تعلیم کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے اور اللہ تعالیٰ یہ بیان فرماتا ہے کہ جس طرح سورج کا نور ساری دنیا پر پھیل جاتا ہے اسی طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم ایک دن ساری دنیا میں پھیل جائے گی۔ تم مکّے کا رونا رو رہے ہو اور کہہ رہے ہو کہ مکّہ میں اسلام پھیل گیا دس بیس پچاس برس کے بعد ایک دن آئے گا جب تم دیکھو گے کہ یہ سِرَاج وَهَّاج بن جائیگا اور اس کی روشنی ساری دنیا پر چھا جائے گی۔ تیسرے دُور تک گرمی اور روشنی کے پھیلنے میں اس طرف بھی اشارہ ہے۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ افادہ زمانہ کے لحاظ سے بھی بہت ممتد ہے اور جس طرح یہ دنیوی سورج قیامت تک مادی دنیا کی ضرورتوں کو پورا کرتا رہیگا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا افاضۂ روحانی بھی دنیا کے اختتام تک چلتا چلا جائیگا۔

آیت جَعَلۡنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا میں اسلام کے عالمگیر ہونے کا ثبوت

## ۱۴ٍ حل لغات۔

مُعۡصِرَةٌ

مُعۡصِرَةٌ کے معنے ہوتے ہیں وہ بدلی جس میں نمی کی بہت زیادتی ہو اور اُس میں سے بارش کے قطرات گرتے ہوں۔ اَلۡمُعۡصِرَةُ۔ اَلسَّحَابَةُ تُعۡتَصَرُ بِالۡمَطَرِ یعنی مُعۡصِرَةٌ اُس بدلی کو کہتے ہیں جس میں سے پانی کے قطرے ٹپکے پڑتے ہوں۔ پس مُعۡصِرَات کے معنے ہوئے اَلسَّحَائِبُ تُعۡتَصَرُ بِالۡمَطَرِ (اقرب) وہ بادل جن میں سے پانی کی کثرت کی وجہ سے قطرے ٹپک پڑتے ہیں اور مُعۡصِرَةٌ اُس ہوا کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ بگولہ آتا ہے چنانچہ اَعۡصَرَتِ الرِّيۡحُ کے معنے ہیں جَاءَتۡ بِالۡاِعۡصَارِ (اقرب) ہوا کے ساتھ بگولہ آیا۔ لیکن محاورہ کے رو سے اَلۡمُعۡصِرَات:۔ اَلسَّحَائِبُ تُعۡتَصَرُ بِالۡمَطَرِ کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ گو مُعۡصِرَة کے معنے ہوا کے بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ بعض صحابہ رضؓ نے کئے ہیں لیکن چونکہ عام محاورہ میں مُعۡصِرَة اُس ہوا کو کہتے ہیں جس کے ساتھ بگولہ ہو اور یہ معنے یہاں پوری طرح چسپاں نہیں ہوتے اس لئے یہاں زیادہ مناسب معنے ایسے بادل کے ہی ہوں گے جس میں پانی کی کثرت ہو اور اس میں سے پانی ٹپک رہا ہو۔ ہاں وضعِ لُغت کے لحاظ سے اِعۡصَار کے معنے چونکہ نچوڑنے کے ہوتے ہیں اس لئے مُعۡصِرَات اُن ہواؤں کو بھی کہہ سکتے ہیں جن کے تیزی سے چلنے کی وجہ سے بادلوں کے بخارات جلد مجتمع ہو کر پانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بہرحال بعض صحابہؓ نے

مُعْصِرَات کے معنے ہواؤں کے کئے ہیں اور بعض نے اس کے معنے بادلوں کے کئے ہیں۔ اکثر مفسرین نے ترجیح بادلوں کے معنوں کو ہی دی ہے کیونکہ لُغت کے استعمال میں یہی معنے رائج ہیں۔

ثَجَّاجًا

ثَجَّاجًا۔ ثَجَّ سے ہے اور ثَجَّ الْمَاءُ کے معنے ہوتے ہیں سَالَ بِكَثْرَةٍ (اقرب) یعنی کثرت کے ساتھ پانی بہنا شروع ہوا۔ اور ثَجَّاج کے معنے ہیں اَلثَّجَّاجُ مِنَ الْمَطَرِ: اَلسَّيَّالُ الشَّدِيْدُ الْاِنْصِبَابِ (اقرب) یعنی ثَجَّاج اُس بارش کو کہتے ہیں جو بڑی تیزی سے برستی ہے۔ پس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ ہم نے بڑی بارش والی بدلیوں میں سے جن سے پانی کی کثرت کی وجہ سے قطرات ٹپکے پڑتے ہیں ایک ایسا پانی اُتارا ہے جو کثرت سے بہنے والا ہے۔

آیت اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ سے قیامت کی طرف اشارہ

**تفسیر**۔ اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے پہلے سورج کا ذکر کیا اور پھر بدلیوں کا ذکر کر کے بتایا کہ ان دو چیزوں سے مل کر زمین تیار ہوتی ہے یعنی جب سِرَاج وَهَّاج سے زمین تیار ہوتی ہے تو مُعْصِرَات سے پانی برستا ہے جس سے زمین کی روئیدگیاں نشوونما حاصل کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ دوسرے ان آیات میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جہاں وَهَّاج سے زمین تیار ہوتی ہے وہاں وَهَّاج سے ہی بادل اُٹھتے ہیں۔ کیونکہ بادل کیا چیز ہیں۔ بادل سمندروں اور دریاؤں اور نالوں وغیرہ کے پانی کے ابخرے ہیں جو سورج کی گرمی سے اُڑ کر فضاء میں جاتے اور پھر فضاء کی سردی میں سیّال بن کر زمین پر ہی واپس آ جاتے ہیں جب سورج کی گرمی ان پانیوں پر پڑتی ہے تو جس طرح

آیت اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ میں ظہورِ اسلام کی پیشگوئی

آگ پر ہم پانی رکھیں تو اُس میں سے دھُواں اُٹھنا شروع ہو جاتا ہے اور اگر زیادہ دیر تک آگ پر رکھا جائے تو تمام پانی بخارات بن کر اُڑ جاتا ہے اسی طرح سورج کی گرمی سے بخارات اُٹھتے اور آہستہ آہستہ جَوّ میں جمع ہوتے رہتے ہیں پھر ہوائیں اُن کو زمین پر لا کر برسا دیتی ہیں۔ تو ایک طرف سِرَاج وَهَّاج سے زمین تیار ہوتی ہے اور دوسری طرف سِرَاج وَهَّاج ہی پانی لاتا ہے گویا وہی گرمی جو انسان کو بے چین کر رہی ہوتی ہے اُس کو ٹھنڈک پہنچانے کے سامان بھی مہیا کر رہی ہوتی ہے۔

اِن آیات میں قیامت کی طرف اس رنگ میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ ہر چیز کے لئے خدا نے کوئی جواب رکھا ہے۔ سورج آسمان پر گرم ہے زمین پر اُس کا اثر پڑتا ہے تو وہ نشوونما اور روئیدگی کے لئے تیار ہوتی ہے پھر وہی سورج جو ایک طرف زمین کو روئیدگی کے لئے تیار کرتا ہے اپنی گرمی سے زمین کے بخارات کو اوپر اُٹھاتا ہے اور اس طرح سورج کے وَهَّاج کے نتیجہ میں وہ بخارات بادل بن کر زمین پر برسنا شروع ہو جاتے ہیں۔ سبب اور مسبّب کا یہ سلسلہ جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات عالم میں جاری کیا ہوا ہے بیہودہ اور لغو نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہے کہ اس کا کوئی عظیم الشان نتیجہ نکلے مگر وہ نتیجہ اس دنیا میں نہیں نکل رہا اس لئے لازماً کسی اور زندگی کو ماننا پڑے گا جہاں ان عظیم الشان کاموں کا کوئی نتیجہ نکلے اور انسان کہہ سکے کہ اللہ تعالیٰ نے جس سلسلۂ کائنات کی بنیاد رکھی تھی وہ لغو نہیں تھا۔

قرآن مجید اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف اِن آیات میں اس رنگ میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی باتیں تم کو بُری لگتی ہیں تم کہتے ہو کہ انہوں نے دنیا میں آکر فساد مچا دیا۔ تم کہتے ہو کہ جب سے یہ ظاہر ہوئے ہیں جھگڑے اور لڑائیاں شروع ہو گئی ہیں ایک شور ہے جو اس کی وجہ سے مچ رہا ہے۔ باپ بیٹے سے جدا ہو گیا ہے۔ بیٹا باپ سے جدا ہو گیا ہے۔ ماں لڑکی سے علیحدہ ہو گئی ہے اور لڑکی ماں سے علیحدہ ہو گئی ہے۔ بھائی بھائی سے علیحدہ ہو گیا ہے اور دوست دوست سے جدا ہو گیا ہے گویا تمہیں اس کے آنے کی وجہ سے ایک گرمی سی محسوس ہونے لگی ہے جیسے سورج کے نکلنے سے ایک گرمی سی محسوس ہونے لگتی ہے مگر فرماتا ہے بیشک تمہیں آج اس کی وجہ سے گرمی محسوس ہونے لگی ہے مگر یہی گرمی ایک دن تمہارے لئے رحمت کا بادل ثابت ہوگی۔ اس گرمی سے تمہاری اندرونی قابلیتوں کو اُبھارا جا رہا ہے۔ تمہارے اندر نئی قابلیتیں پیدا کی جا رہی ہیں مگر تم ابھی اس کو محسوس

# لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ﴿۱۵﴾ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ﴿۱۶﴾

تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم دانے اور سبزیاں نکالیں - اور گھنے باغ (اُگائیں) ۱۵

نہیں کرسکتے بلکہ تم اس تغیر پر تکلیف محسوس کرتے ہو جیسے ڈاکٹر جب اپریشن کرنے لگتا ہے تو اُس کا چاقو انسان کو چبھتا ہے لیکن آخر وہی چاقو جس سے اُس نے تکلیف محسوس کی تھی اُسکی صحت اور آرام کا موجب بن جاتا ہے - اسی طرح فرماتا ہے بے شک محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وجہ سے تم ایک بے چینی اور تکلیف سی محسوس کر رہے ہو مگر یہی وھّاج اور یہی گرمی اور یہی تپش اور یہی روشنی تمہاری راحت اور آرام کا موجب ہوگی جس طرح سورج کی گرمی بادلوں کو اُٹھا کر لاتی اور زمین پر پانی کی صورت میں اُنکو برسا دیتی ہے اسی طرح ایک دن اسی وَھّاج سے تمہارے دلوں میں ایمان اور عرفان کی بدلیاں اُٹھنے لگیں گی اور تمہارے دلوں سے علم و عرفان کے وہ سوتے پھوٹ پڑیں گے جن کا پانی ساری دنیا میں پھیل جائے گا - مجھے یہاں مَآءً ثَجَّاجًا کے الفاظ سے اپنا وہ خواب یاد آگیا جو تھوڑے ہی دن ہوئے میں نے دیکھا تھا اور جس میں مجھے انسانی قلب ایک تنور کی شکل میں دکھایا گیا اور مجھے یہ نظارہ نظر آیا کہ اُس تنور میں سے اللہ تعالےٰ کے عرفان کا پانی پھوٹنا شروع ہوا اور وہ دنیا کے کناروں تک پھیل گیا - میں نے جب اُس پانی کو پھیلتے دیکھا تو اُس وقت میں نے کہا یہ پانی پھیلے گا اور پھیلتا چلا جائے گا یہاں تک کہ دنیا کا ایک انچ بھی ایسا باقی نہ رہیگا جہاں خدا کے عرفان کا یہ پانی نہ پہنچے - یہی مضمون اللہ تعالےٰ نے اس جگہ بیان فرمایا ہے کہ وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا - اس شمس روحانی کی گرمی سے تمہارے دل کی زمینیں تیار ہوں گی پھر اسی گرمی کے نتیجہ میں وہاں سے ایسے بخارات اٹھنے شروع ہوں گے جو بادلوں کی صورت اختیار کرلیں گے اور پھر وہی بادل تمہارے دلوں کی زمین پر برسیں گے اور اُن کا پانی ساری دنیا میں پھیل جائے گا -

## ۱۵ حل لغات - حَبًّا

حَبًّا: اَلْحَبُّ وَالْحَبَّةُ يُقَالُ فِي الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ وَنَحْوِهِمَا مِنَ الْمَطْعُوْمَاتِ یعنی گندم اور جو اور ایسے ہی وہ تمام غلہ جات اور اناج جن سے خوراک کا کام لیا جاتا ہے اُن کے دانوں کو حب کہتے ہیں (مفردات)

لسان میں ہے - اَلْحَبُّ: اَلزَّرْعُ صَغِيْرًا كَانَ اَوْ كَبِيْرًا یعنی حبّ نباتاتی پیداوار کو کہتے ہیں خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی -

نَبَاتًا: اَلنَّبْتُ وَالنَّبَاتُ مَا يَخْرُجُ مِنَ الْاَرْضِ مِنَ النَّامِيَاتِ سَوَاءٌ كَانَ لَهٗ سَاقٌ كَالشَّجَرِ اَوْ لَمْ يَكُنْ لَهٗ سَاقٌ كَالنَّجْمِ لٰكِنِ اخْتَصَّ فِي التَّعَارُفِ بِمَا لَا سَاقَ لَهٗ بَلْ قَدِ اخْتَصَّ عِنْدَ الْعَامَّةِ بِمَا يَاْكُلُهُ الْحَيَوَانُ (مفردات) یعنی نبات زمین سے پیدا ہو کر بڑھنے والی ہر چیز پر بولتے ہیں خواہ وہ درختوں کی قسم سے ہو یا چھوٹی چھوٹی بوٹیوں کی قسم سے - لیکن عرف عام میں نبات صرف اس کو کہتے ہیں جس کا تنا نہ ہو یعنی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں ہوں - بلکہ عوام کے نزدیک صرف اُنکو نبات کہتے ہیں جس کو حیوان کھاتے ہیں - گویا حَبٌّ انسانوں کی خوراک ہوئی اور نبات حیوانوں کی خوراک -

جَنّٰتٍ

جَنّٰتٌ: جَنَّةٌ کی جمع ہے اور اَلْجَنَّةُ کے معنے ہیں كُلُّ بُسْتَانٍ ذِيْ شَجَرٍ يَسْتُرُ بِاَشْجَارِهِ الْاَرْضَ ہر وہ باغ جس میں درخت ہوں اور وہ درختوں کے ذریعے اپنی زمین کو ڈھانپ لے (مفردات)

اَلْفَافًا

اَلْفَافًا: اَلْفَافٌ لِفٌّ کی جمع ہے اور اَللِّفُّ کے معنے ہیں اَلصِّنْفُ مِنَ النَّاسِ مختلف طرز کے لوگوں میں سے ایک طرز کے لوگ - چنانچہ کہتے ہیں عِنْدَهٗ اَلْفَافٌ مِنَ النَّاسِ کہ اسکے پاس مختلف اصناف کے لوگ بیٹھے ہیں نیز اَللِّفُّ کے معنے ہیں اَلرَّوْضَةُ الْمُلْتَفَّةُ النَّبَاتِ وہ باغیچہ جس کی نباتات کثیر ہونے کی وجہ سے آپس میں لپٹی

ہوتی ہو وَالْبُسْتَانُ الْمُجْتَمِعُ الشَّجَرِ اور ایسے باغ کو بھی لِفّ کہتے ہیں جو گھنے درختوں والا ہو۔ پس جَنّٰتٍ اَلْفَافًا کے معنے ہوں گے ایسے گھنے باغات جو کثرت اشجار کی وجہ سے آپس میں لپٹے ہوئے ہوں۔

**تفسیر۔** پانی جب آسمان سے اترتا ہے تو اسکے بعد لِنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا کا وقت آجاتا ہے یعنی اُس بارش کے نتائج پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور زمین میں سے دانے نکلتے ہیں۔ سبزیاں نکلتی ہیں قسم قسم کی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں اور ایسے باغات نکلتے ہیں جو بڑے گھنے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب سورج نکلتا ہے تو تم جانتے ہو اُس کا ظاہری نتیجہ کیا پیدا ہوتا ہے۔ ظاہری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سورج زمین تیار کرتا ہے اور اپنی روشنی کی شعاعیں وہاں تک پہنچاتا ہے اور پھر اپنی گرمی کے ذریعہ زمین کا پانی کھینچ کر اوپر لے جاتا ہے گویا ایک چیز سورج دے جاتا ہے اور ایک چیز سورج لے جاتا ہے پھر جو چیز لے جاتا ہے اُسے بادلوں کی صورت میں پھر زمین کی طرف واپس کر دیتا ہے اور اس طرح سورج لوگوں کے لئے رحمت اور برکت کا سامان پیدا کر دیتا ہے چنانچہ بارش سے بڑے بڑے باغ نکلتے ہیں۔ سبزیاں نکلتی ہیں۔ کھیتی باڑی ہوتی ہے اور انسانی زندگی کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب مہیا ہو جاتی ہیں۔ اتنا بڑا کارخانہ جو خدا نے بنایا ہے کہ کروڑوں کروڑ میل پر ایک سورج بنایا ہے۔ کروڑوں کروڑ میل پر ایک زمین ہے۔ زمین میں یہ قابلیت رکھی گئی ہے کہ وہ سورج کی شعاعوں کو اپنے اندر جذب کرے اور سورج میں یہ قابلیت رکھی گئی ہے کہ اُس کی گرمی پانی کو اُٹھا کر اوپر لے جائے۔ پھر ہوائیں چلتی ہیں جو بادلوں کو زمین پر برسا دیتی ہیں اور زمین میں سے کھیت اُگتے ہیں غلہ پیدا ہوتا ہے۔ باغات تیار ہوتے ہیں پھل پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک ایک چیز انسان کے کام آتی ہے۔ ان میں سے کچھ چیزیں ایسی ہیں جنکے فوائد دیرپا نہیں ہوتے اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جنکے فوائد دیرپا ہوتے ہیں مثلاً غلہ ہے ادھر غلہ پیدا ہوتا ہے اور اُدھر انسان اسکو استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرے سال پھر غلہ بوتا ہے اور پھر استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کو بار بار بونے کی ضرورت نہیں ہوتی جیسے پھلدار بوٹیاں ہیں یعنی جانوروں کے کھانے کی جھاڑیاں ہیں اُن کے پھلوں سے انسان زیادہ دیر تک فائدہ اٹھاتا ہے اور جانور کئی سال تک اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر کچھ چیزیں ایسی ہیں جو اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کام آتی ہیں مثلاً باغات ہیں کہ وہ بعض دفعہ سَو سَو دو دو سو تین تین سو سال تک کام دیتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے تم غور کرو اور سوچو کہ کیا یہ سارا سلسلہ لغو اور فضول ہے۔ اگر تم سوچو تو تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ کارخانۂ عالم کی پیدائش لغو اور فضول نہیں ہو سکتی بلکہ کوئی نہ کوئی اہم غرض ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ تمام سلسلہ جاری فرمایا ہے اور کوئی نہ کوئی مقصد ہے جس کو پورا کرنے کے لئے اس قدر وسیع کارخانہ کام کر رہا ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان کی پیدائش بالکل عبث ہے اور وہ کسی خاص مقصد کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ اور اگر ہم ان آیات کو روحانی معنوں میں لیں تو اس کے معنے یہ بن جائیں گے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور قرآن کریم دونوں سِرَاجٌ وَّهَّاجٌ ہیں اُن کی گرمی تپش اور تیز روشنی آج تمہیں بُری لگتی ہے مگر ایک دن یہی گرمی اور تپش اور روشنی تمہارے دل کے چھپے ہوئے گند دور کرنے کے لئے بادلوں اور روشنی کا کام دے گی۔ سورج آخر کیا کرتا ہے یہی کہ وہ گندے پانی کو بخارات کی صورت میں اڑاتا اور پھر ایک مصفّٰی پانی کی صورت میں اُسے زمین کی طرف لوٹا دیتا ہے اور اُس کی روشنی قسم قسم کے زہروں کو مارتی اور نئی طاقتیں بخشتی ہے۔ اسی طرح تمہارے پاس جو کلام الٰہی کا پانی پہلے سے موجود ہے وہ ایسا ہے جو گدلا ہو چکا ہے جس کا استعمال تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ بےشک تمہارے پاس ابراہیمؑ کی تعلیم بھی موجود ہے۔ تمہارے پاس موسیٰؑ کی تعلیم بھی موجود ہے۔ تمہارے پاس عیسیٰؑ کی تعلیم بھی موجود ہے۔ تمہارے پاس اور انبیاء کی تعلیم بھی موجود ہے مگر اُن سب تعلیموں کا پانی گدلا ہو چکا ہے۔ اب یہ سِرَاجٌ وَّهَّاجٌ جس کی گرمی اور تپش اور تیز روشنی تمہیں بُری معلوم ہوتی ہے اُن

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝ يَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ

یقیناً یہ فیصلے کا دن ایک مقرر وقت (پر آنے والا) ہے۔ جس دن کہ صور میں پھونکا جائے گا۔

فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ۝ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۝

پھر تم گروہ در گروہ ہو کر (ہمارے حضور میں) آؤ گے۔ اور آسمان کھولا جائیگا یہانتک کہ وہ دروازے (دروازے) ہو جائے گا۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝

اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) چلائے جائینگے یہاں تک کہ وہ سراب (کی مانند) ہو جائیں گے ؁۱۶

چھیپڑوں پر سے بخارات اٹھائے گا اور پھر اُن بخارات کو بادلوں کی صورت میں تمہارے دلوں پر برسائے گا جس سے تمہارے دلوں کے سوتے پھوٹ نکلیں گے اور وہ ساری دنیا کو سیراب کر دیں گے اسی طرح اُس کی روشنی تمہارے دلوں کی تاریکیوں کو پھاڑ کر نورِ بصیرت تم کو بخشے گی۔ گویا کلام الٰہی کا وہ پانی جس کو آج تم رد کر رہے ہو ایک دن تمہارے دلوں سے خود بخود پھوٹنے لگے گا اور مَآءً ثَجَّاجًا بن کر ایک عالم کو سیراب کر دے گا پھر اس کے ذریعے تمہارے دلوں میں سے اناج بھی نکلیں گے بوٹیاں بھی نکلیں گی اور باغات بھی نکلیں گے۔ گویا تمہیں کچھ ایسے فوائد حاصل ہوں گے جو قریب کے ہوں گے اور کچھ ایسے فوائد حاصل ہوں گے جو بعید کے ہوں گے یا کچھ ایسے علوم تم سے ظاہر ہوں گے جو عارف لوگوں کے کام آئیں گے جیسے علمِ تصوّف ہے یا علمِ قرآن ہے اور کچھ ایسے علوم ظاہر ہوں گے جو عوام الناس کے کام آئیں گے جیسے سائنس ہے یا جغرافیہ ہے یا حساب ہے یا ہندسہ ہے۔ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا اور ایسے باغ بھی نکلیں گے جو مدتوں تک کام دیں گے جیسے علمِ تحریر میں مسلمانوں نے بڑی ترقی کی اور سے دنیا میں انہوں نے پھیلا دیا۔

**؁۱۶ حل لغات** - یَوْمٌ :- اس کے معنے مطلق وقت کے ہوتے ہیں چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؏ یَوْمَاهُ يَوْمُ نَدًى وَيَوْمُ طِعَانٍ یعنی میرے ممدوح پر دو ہی قسم کے وقت آتے ہیں۔ یا تو وہ سخاوت میں مشغول ہوتا ہے یا دشمنوں کے قتل کرنے میں۔ اسی طرح عرب کہتے ہیں يَوْمَاهُ يَوْمُ نَعِيمٍ وَيَوْمُ بُؤْسٍ اى الدَّهْرُ یعنی زمانہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو انسان کے لئے نعمتیں لاتا ہے یا تکالیف لاتا ہے (لسان العرب) اسی طرح سیبویہ کا قول ہے کہ عرب کہتے ہیں أَنَا الْيَوْمَ أَفْعَلُ كَذَا لَا يُرِيدُونَ يَوْمًا بِعَيْنِهِ وَلٰكِنَّهُمْ يُرِيدُونَ الْوَقْتَ الْحَاضِرَ (لسان العرب) یعنی جب کہتے ہیں کہ میں آج کے دن اِس یا اس طرح کروں گا تو اس سے مراد چوبیس گھنٹے کا دن نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے مراد صرف موجودہ وقت ہوتا ہے۔ اسی طرح اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ جو قرآن کریم میں آتا ہے اس سے بھی مراد معروف دن نہیں بلکہ زمانہ اور وقت مراد ہے (لسان) پھر لکھا ہے وَقَدْ يُرَادُ بِالْيَوْمِ الْوَقْتُ مُطْلَقًا وَمِنْهُ الْحَدِيثُ تِلْكَ أَيَّامُ الْهَرَجِ أَيْ وَقْتُهُ (لسان) یعنی کبھی یوم سے مطلق وقت مراد ہوتا ہے۔ جیسے حدیث میں ہے کہ یہ دن فتنہ اور لڑائی کے دن ہیں۔ مراد یہ کہ یہ فتنہ اور لڑائی کا زمانہ ہے۔

اَلْفَصْلُ :- اَلْفَصْلُ فَصَلَ کا مصدر ہے۔ اور فَصَلَ الشَّيْءَ فَصْلًا کے معنے ہیں قَطَعَهُ وَأَبَانَهُ کسی چیز کے حصے کو کاٹ کر اس سے علیحدہ کر دیا اور اَلْفَصْلُ کے معنے ہیں اَلْحَاجِزُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ دو چیزوں کے درمیان روک اور پردہ۔ اَلْحَدُّ بَيْنَ الْأَرْضَيْنِ دو زمینوں کے درمیان حد۔ اَلْحَقُّ مِنَ الْقَوْلِ پکی اور مضبوط بات۔ اَلْفَصْلُ أَيْضًا اَلْقَضَاءُ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ نیز فصل

(حاشیہ: ۱۷ اَلْفَصْلِ ۔ ۱ يَوْمٌ)

کے معنے حق اور باطل کے درمیان فیصلہ ہو جانے کے بھی ہیں (اقرب) پس یَوْمُ الْفَصْلِ کے معنے ہوں گے۔ ایسا وقت جبکہ حق اور باطل کے درمیان فیصلہ ہو جائے گا۔

**مِیْقَاتًا**

مِیْقَاتًا:۔ مِیْقَات کے معنے ہیں اَلْوَقْتُ مطلقاً وقت۔ وَقِیْلَ اَلْوَقْتُ الْمَضْرُوْبُ لِلشَّیْءِ کسی چیز کے لئے مقرر شدہ وقت اَلْوَعْدُ الَّذِیْ جُعِلَ لَہٗ وَقْتٌ نیز اس وعدہ کو بھی مِیْقَات کہہ دیتے ہیں جس کے لئے وقت مقرر کیا جائے۔ اس کی جمع مَوَاقِیْت آتی ہے (اقرب)

**یُنْفَخُ**

یُنْفَخُ:۔ نَفَخَ سے مضارع مجہول واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَلنَّفْخُ کے معنے ہیں نَفْخُ الرِّیْحِ فِی الشَّیْءِ کسی چیز میں ہوا پھونکنا (مفردات) پس یُنْفَخُ کے معنے ہوں گے کہ پھونکا جائے گا۔

**اَلصُّوْر**

اَلصُّوْرُ:۔ صَارَ الرَّجُلُ یَصُوْرُ صَوْرًا کے معنے ہیں صَوَّتَ یعنی آواز دی۔ اور صُوْر اس سینگ کو کہتے ہیں جس میں پھونک مار کر اسکو بجایا جاتا ہے (اقرب) بعض نے اسکو اَلصُّوْرَۃُ کی جمع بھی قرار دیا ہے اور اَلصُّوْرَۃُ کے معنے ہیں۔ اَلشَّکْلُ۔ شکل۔ کُلُّ مَا یُصَوَّرُ مُشَبَّہًا بِخَلْقِ اللّٰہِ مِنْ ذَوَاتِ الْاَرْوَاحِ وَغَیْرِھَا۔ کسی جاندار یا غیر جاندار کی تصویر۔ اَلنَّوْعُ۔ قسم۔ اَلصِّفَۃُ۔ صفت (اقرب) پس یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ کے معنے ہوں گے جبکہ صُوْر میں پھونکا جائے گا۔

**اَفْوَاجًا**

اَفْوَاجًا:۔ فَوْجٌ کی جمع ہے۔ اور فَوْج کے معنے انسانوں کی جماعت کے ہیں یا انسانوں کی وہ جماعت جو تیزی سے گزر رہی ہو (اقرب)

**سُیِّرَتْ**

سُیِّرَتْ:۔ سَیَّرَ سے مؤنث مجہول کا صیغہ ہے اور سَیَّرَہٗ کے معنے ہیں جَعَلَہٗ سَائِرًا اس کو چلایا۔ اور جب سَیَّرَہٗ مِنْ بَلَدِہٖ کہیں تو معنے ہونگے اَخْرَجَہٗ وَاَجْلَاہٗ اس کو وطن سے جلاوطن کر دیا (اقرب)

**اَلْجِبَالُ**

اَلْجِبَالُ:۔ اَلْجَبَلُ کی جمع ہے اور اَلْجَبَلُ کے معنے ہیں کُلُّ وَتَدٍ لِلْاَرْضِ عَظُمَ وَطَالَ زمین پر اونچے ٹیلے کو جَبَل کہتے ہیں۔ خِلَافُ السَّاحِلِ ساحل کے مخالف مفہوم ادا کرنے کیلئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے یعنی خشکی کا علاقہ۔ سَیِّدُ الْقَوْمِ وَعَالِمُھُمْ نیز قوم کے سردار اور عالم کو بھی جَبَل کہتے ہیں (اقرب) پس سُیِّرَتِ الْجِبَالُ کے معنے ہوں گے (۱) جب پہاڑ چلائے جائیں گے (۲) جب قوموں کے سردار اور عالموں کو گھروں سے نکالا جائے گا۔

**سَرَابًا**

سَرَابًا:۔ مَا تَرَاہُ نِصْفَ النَّھَارِ مِنِ اشْتِدَادِ الْحَرِّ کَالْمَاءِ یَلْصِقُ بِالْاَرْضِ (اقرب) یعنی سَرَاب اس ریتلے میدان کو کہتے ہیں جو دوپہر کے وقت سورج کی شعاعوں میں پانی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ کلیات میں لکھا ہے وَالسَّرَابُ فِیْ مَا لَا حَقِیْقَۃَ لَہٗ کہ سراب اسکو بھی کہتے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

**تفسیر**۔ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ۔ یَوْمُ الْفَصْلِ کا بدل ہے یعنی یَوْمُ الْفَصْلِ سے کونسا یوم مراد ہے؟ یَوْمُ الْفَصْلِ سے مراد وہ دن ہے کہ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ جس دن صور میں پھونکا جائے گا فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا اور تم فوج در فوج آؤ گے وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ اور آسمان کھولا جائے گا فَکَانَتْ اَبْوَابًا پس وہ دروازے ہی دروازے ہو جائے گا۔

**آسمان کے دروازے دروازے ہو جانے کے معنے**

آسمان کے دروازے ہو جانے کے معنے عام طور پر عذاب نازل ہونے کے ہوتے ہیں سوائے اس کے کہ کوئی قرینہ ایسا ہو جو ظاہر کر رہا ہو کہ وہاں عذاب مراد نہیں بلکہ کچھ اور مراد ہے۔ ورنہ اگر کوئی رؤیا میں دیکھے کہ آسمان پھٹ گیا ہے یا وہ چھید چھید ہو گیا ہے اور ساتھ کوئی قرینہ ایسا نہ ہو جو بتا رہا ہو کہ یہاں عذاب مراد نہیں بلکہ کچھ اور ہے تو اس سے مراد عذاب ہی ہو گا۔ لیکن اگر کوئی شخص دیکھے کہ آسمان مثلاً پھٹ گیا ہے اور ملائکہ خدا تعالیٰ کی تسبیحیں کر رہے اور خوشیاں منا رہے ہیں تو اس سے مراد یہ ہو گا کہ اب کسی نبی کی بعثت کا وقت ہے۔ بہرحال عام طور پر فتح سماء کے معنے عذاب کے ہی ہوتے ہیں اور جب سماء سے مراد ظاہری سماء ہو تو اُس وقت فُتِحَتِ السَّمَاءُ کا یہی مفہوم ہوتا ہے کہ عذاب کا وقت آ گیا ہے۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ۔ اور پہاڑ اپنی جگہ سے چلائے جائیں گے فَكَانَتْ سَرَابًا پس وہ سراب کی طرح ہو جائیں گے۔ سراب وہ ریتلا میدان ہوتا ہے جو دوپہر کے وقت سورج کی شعاعوں کے نیچے پانی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ پہاڑ چونکہ زمین میں سے نکلتے ہیں اور ریت بھی زمین سے ہی پیدا ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک وقت زمین پر ایسی تباہی آئے گی کہ پہاڑ گر جائیں گے اور چونکہ پہاڑ اَوْتَادُ الْاَرْضِ ہوتے ہیں اس لئے جب اَوْتَاد گر جائیں گے تو ساری زمین تباہ ہو جائے گی معلوم ہوتا ہے قیامت کے دن پھر زمین میں ایسی گرمی پیدا ہو گی جو نہایت ہی شدید ہو گی اور وہ ایسی تیز ہو گی کہ بجائے اس کے کہ اُس گرمی سے پہاڑ بنیں موجودہ پہاڑ بھی اس کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور باقی زمین بھی تباہ ہو جائے گی

یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا اور میں نے بتایا ہے کہ یَوْمُ الْفَصْل سے مراد قیامت بھی ہے اور یَوْمُ الْفَصْل سے قرآن کریم یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلبہ کا ظہور بھی مراد ہے اور درحقیقت یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں گو نام مختلف رکھ دیا گیا ہے۔ چاہے نبوت کے کمالات کا ظہور ہو یا کلام الٰہی کا ظہور ہو بات ایک ہی ہے۔ بہرحال اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ کے معنے ہوئے جدائی کا دن اور اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا کے معنے ہوئے یَوْمُ الْفَصْل کا ایک وقت مقرر ہے اس یَوْمُ الْفَصْل سے جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں غلبۂ اسلام بھی مراد ہے مگر اس میں ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کفار مکہ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمہارے ظلموں کی وجہ سے تم سے جدا ہونا پڑا ہے اسی طرح خدا ایک دن محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غلبہ دے کر تم کو بھی جدا کر دے گا اور وہ دن تمہارے لئے یَوْمُ الْفَصْل ہو گا چنانچہ اسی کی طرف سورۃ توبہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جو درحقیقت سورۂ انفال کا دوسرا باب ہے۔ یہ سورۃ شروع ہی اس طرح ہوتی ہے کہ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ؕ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ○ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

قیامت کے دن پہاڑوں کی تباہی

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ چار مہینے کفار کو یہاں رہنے کی اجازت ہے جب چار مہینے گذر جائیں تو پھر کفار یہاں سے چلے جائیں۔ یہ وہ یَوْمُ الْفَصْل ہے جو کفار پر آیا اور جس کا فتح مکہ کے بعد اعلان کیا گیا گویا فتح مکہ کا نتیجہ ہی یَوْمُ الْفَصْل تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا۔ وہ موعود دن تم پر آنے والا ہے جب تم کو اپنے گھروں اور وطن سے جدا ہونا پڑے گا۔ یعنی ایک دن ایسا آنے والا ہے جب مسلمان نہ صرف غالب آ جائیں گے بلکہ وہ اتنے غالب ہوں گے کہ مشرکوں کو وہ کھلے بندوں یہ سُنا دیں گے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ ہمارا تمہارا کوئی جوڑ نہیں۔ ایسا غلبہ عام حالات میں نہیں ہوتا بلکہ غیر معمولی حالات میں ہی ہو سکتا ہے۔ سپین پر مسلمانوں کو ایک لمبے عرصہ تک غلبہ حاصل رہا مگر باوجود غلبہ کے وہ عیسائیوں کو سپین میں سے نکال نہ سکے۔ اسی طرح اور کئی ممالک ایسے ہیں جہاں مسلمان حکمران ہوئے

یَوْمُ الْفَصْل سے مراد قیامت یا غلبۂ اسلام

مگر وہ غیر مذہب والوں کو اپنے ملکوں سے نکال نہیں سکے۔ ہندوستان میں ہی مسلمانوں کی ایک لمبے عرصہ تک حکومت رہی مگر وہ ہندوؤں کو نہ نکال سکے۔ آج کل ہندوستان میں ہندو بہت طاقتور ہیں مگر وہ مسلمانوں کو نہیں نکال سکتے بلکہ انگریز جن کے ماتحت ہندوستانی ہیں وہ بھی ہندوستانیوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم ہندوستان سے چلے جاؤ۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا۔ ایک ایسے عظیم الشان فیصلے کا دن آنیوالا ہے جو یَوْمُ الْفَصْلِ ہوگا۔ وہ نہ صرف عام فیصلے کا دن ہوگا بلکہ یَوْمُ الْفَصْلِ ہوگا یعنی وہ فَصْلٌ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ ہی نہ ہوگا بلکہ فَصْلٌ بَيْنَ الْمُشْرِكِينَ وَالْمُؤْمِنِينَ بھی ہوگا۔ چنانچہ سورۂ بَرَآءَةٌ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهٖٓ اِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ۔ مشرکوں میں سے جن سے عہد کیا گیا تھا کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب مسلمانوں کو تم پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تم اُن کے مقابلہ میں بالکل ذلیل اور حقیر ہو جاؤ گے تمہیں وہ مکہ میں بھی نہیں رہنے دیں گے بلکہ کہیں گے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور اُس وقت تم ذلّت اور رسوائی کی حالت میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہوگے۔

سورۂ نبأ کے موعود یَوْمُ الْفَصْلِ کا ذکر سورۂ توبہ میں

اُن مشرکوں کو کہو کہ اب اُس پیشگوئی کے پورا ہونے کا وقت آگیا ہے گویا اس صورت میں بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهٖٓ اِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ کی طرف سے براءت ہے اور اس کے رسول کی طرف سے بھی براءت ہے اُن مشرکین کے مقابلہ میں جن سے تم نے عہد کیا تھا۔ ان معنوں کے رُو سے میں یہ نہیں کہوں گا کہ یہاں صلح حدیبیہ والے معاہدے کا ذکر آتا ہے بلکہ ان معنوں کے رُو سے عَاهَدْتُّمْ سے مراد وہ معاہدہ ہوگا جس کا سورۂ نبا میں ذکر آتا ہے یعنی سورۂ نبا میں تم سے کہا گیا تھا کہ اے کافرو ایک دن ایسا آنے والا ہے جب تم مکہ میں سے نکال دئے جاؤ گے۔ یہی وہ عہد ہے جس کا سورۂ توبہ میں عَاهَدْتُّمْ کے الفاظ میں ذکر آتا ہے۔ اس پیشگوئی کو عہد کے نام سے اس لئے پکارا گیا ہے کہ نبی جب کوئی ایسی پیشگوئی کرتا ہے جس کا کفار پر بھی اثر پڑتا ہو تو مومنوں کو ہی یہ شوق نہیں ہوتا کہ وہ اُس پیشگوئی کو پورا ہوتا دیکھیں بلکہ اگر وہ پیشگوئی کسی وجہ سے پوری نہ ہو تو دشمن بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ پیشگوئی کیوں پوری نہیں ہوئی اس لئے وہ عہد کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ پس عَاهَدْتُّمْ میں سورۂ نبا والی پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ اب خدا اور اس کے رسول کی براءت ہو گئی یعنی اب تم یہ الزام نہیں دے سکتے کہ وہ پیشگوئی پوری نہیں ہوئی بلکہ ہم نے جو تم سے کہا تھا کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب مسلمانوں کو تم پر غلبہ حاصل ہو جائے گا اور تم مکہ میں نہیں ٹھہر سکو گے ہماری وہ بات پوری ہو گئی ہے۔

فَسِيحُوا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ۔ ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے گا اور ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن تمہیں اپنے ملک سے نکال دیا جائے گا اب ہم نے اپنے اس عہد کو پورا کر دیا ہے مگر چونکہ غلبۂ اسلام دیکھنے کے لئے تمہارا ٹھہرنا ضروری ہے اور پیشگوئی کے پورا ہونے کے لئے تمہاری وطن سے جدائی ضروری ہے اس لئے ہم نے تمہارے رہنے کے لئے چار مہینے مقرر کر دئے ہیں تاکہ تم اس عرصہ میں سارے عرب میں پھرو اور دیکھو کہ خدا کی باتیں کس طرح پوری ہوئیں۔ وَاعْلَمُوٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ اور تم دیکھ لو کہ خدا کا حکم جو اسلام کے غلبہ کے متعلق تھا وہ پورا ہو گیا ہے یا نہیں۔ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِينَ اور اللہ کافروں کو ذلیل کرنے والا ہے وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهٖٓ اِلَى النَّاسِ اور اعلان ہے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ حج اکبر کے دن۔ یعنی خدا نے اس اعلان کے لئے حج اکبر کے دن کو مخصوص کیا ہے تاکہ سارے عرب کو یہ اعلان سُنایا جا سکے۔ یُوں اگر اعلان کر دیا جاتا تو چار ماہ میں بھی سارے عرب میں نہ پہنچ سکتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس اعلان کے لئے حج اکبر کا دن تجویز فرما دیا۔ اس فیصلہ سے فَسِيحُوا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ کا حکم بھی پورا ہو گیا

کیونکہ حج کے موقعہ پر عرب کے ہر علاقہ سے لوگ آتے ہیں پس اللہ تعالیٰ نے حج کے دن کا انتخاب اسی حکمت کے ماتحت فرمایا کہ جب لوگ حج سے واپس جائیں گے تو اس اعلان کے ساتھ ہی وہ اپنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھتے چلے جائیں گے کہ اسلام کا ہر علاقہ میں غلبہ ہو گیا ہے۔ درحقیقت یہ بھی اسلامی تعلیم میں رحم کے غلبے کا ثبوت ہے کہ اعلان اُس وقت کیا گیا جب سارے لوگ موجود تھے۔ اور اعلان یہ کیا گیا کہ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ اللہ مشرکوں کے الزام سے پاک ہے۔ وہ اس عظیم الشان غلبہ کے بعد جس کا ظہور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اللہ تعالیٰ پر یہ الزام نہیں لگا سکتے کہ سورۃ نبا میں جو پیشگوئی کی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوئی وَرَسُوْلُهٗ اور رسول بھی اِس الزام سے بری ہے فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ وَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ اور اگر تم پھر جاؤ تو یاد رکھو جب تم پہلے ہمیں عاجز نہیں کر سکے تو آئندہ کس طرح کر سکو گے۔ اس کے بعد فرماتا ہے اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْئًا وَّلَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ۔ سوائے اُن لوگوں کے جن سے مشرکوں میں سے تم نے عہد کیا ہے پھر انہوں نے تم سے معاہدہ میں خلاف ورزی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی دشمن کی مدد نہیں کی پس اُن سے جو عہد کیا ہے اُسے مقررہ میعاد تک نباہو اللہ تعالیٰ متقیوں کو پسند فرماتا ہے۔ یہ دلیل ہے میرے اُن معنوں کے درست ہونے کی جو ابھی میں نے بیان کئے ہیں۔ وہاں خدا تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِی الْكٰفِرِیْنَ گویا عہد کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مشرکوں سے کہا تھا کہ مکہ میں سے نکل جاؤ مگر

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا ہوا ہے اور انہوں نے اِس معاہدے کو توڑا نہیں اُن کے معاہدہ کو دیانتداری کے ساتھ پورا کرو۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ وہ معاہدہ اَور ہے اور یہ معاہدہ اَور ہے۔ اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ میں جس معاہدے کا ذکر ہے وہ دُنیوی معاہدہ ہے اور پہلی آیت میں جس معاہدے کا ذکر آتا ہے اس سے الہامی معاہدہ مراد ہے یعنی وہ معاہدہ جس کا الہامی طور پر ذکر کیا گیا تھا اور جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ اگر وہ جھوٹا نکلے تو تمہارا حق ہے کہ گرفت کرو اور کہو کہ تمہاری یہ بات کیوں پوری نہیں ہوئی۔ ایک عہد یکطرفہ ہوتا ہے جس میں انسان خود اپنے نفس سے کوئی عہد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مَیں ایسا کروں گا۔ اُس کے متعلق کوئی دوسرا شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ لیکن وہ معاہدہ جو فریقین میں ہو یا وہ وعدہ جو دو جماعتوں سے تعلق رکھتا ہو اُس میں دوسرے کو پکڑنے اور گرفت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور اگر وہ بات پوری نہ ہو تو دوسرا کہہ سکتا ہے کہ تم تو کہتے تھے فلاں بات اس طرح ہوگی مگر پھر وہ اُس طرح ہوئی نہیں۔ اس قسم کے معاہدات میں پیشگوئیاں بھی شامل ہیں کیونکہ اُن کے متعلق بھی کفار یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھیں تو پھر وہ پوری کیوں نہ ہوئیں۔ پس ایک ہی رکوع میں دو جگہ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ کے الفاظ استعمال کرنا اور ایک جگہ تو یہ کہنا کہ جن مشرکوں سے یہ عہد تھا اُن کو چار ماہ کا نوٹس دے کر مکہ سے نکال دو اور دوسروں کے متعلق یہ کہنا کہ اُن سے جو معاہدہ ہو چکا ہے اُس کو پورا کرو بتا رہا ہے کہ پہلے روحانی معاہدے کا ذکر تھا اور اب جسمانی معاہدے کا ذکر ہے۔ اس جسمانی معاہدہ کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ ہدایت دیتا ہے کہ تم نے اِسے نہیں توڑنا ہاں اگر کفار توڑ دیں تو اَور بات ہے۔ لیکن اگر اُن کی طرف سے نقضِ عہد نہ ہو تو پھر معاہدہ کی جو بھی میعاد ہے اُس میعاد تک تمہاری طرف سے یہ پوری کوشش ہونی چاہیئے کہ اُس کا احترام کرو۔ چنانچہ فرماتا ہے فَاَتِمُّوْٓا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ۔ اس میں چار ماہ کی

کوئی شرط نہیں اگر دو سال کا معاہدہ ہے تو دو سال پورے کرو اگر چار سال کا معاہدہ ہے تو چار سال پورے کرو اور اگر چھ سال کا معاہدہ ہے تو چھ سال پورے کرو۔ غرض جتنی مدت مقرر ہے اُس مدت تک معاہدے کو پورا کرو۔ غرض اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا میں قرآن اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلبہ کی پیشگوئی کی گئی ہے اور کفار کو بتایا گیا ہے کہ ایک دن ایسا آئیگا جب نہ صرف مسلمانوں کو تم پر غلبہ حاصل ہو جائے گا بلکہ اس غلبہ کے ساتھ ہی تم کو مکہ سے نکال دیا جائے گا۔ اب اگلی آیات میں اس غلبہ کا وقت بتایا گیا ہے فرماتا ہے يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ اَفْوَاجًا۔ جس دن صور پھونکا جائے گا اور تم فوج درفوج کی صورت میں آؤ گے وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ اور آسمان کھول دیا جائے گا۔ فوج درفوج اور گروہ درگروہ لوگوں کے آنیکی خبر اُس وقت پوری ہوئی جب مکہ فتح ہوا بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی سارے عرب میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی اور فتح مکہ کی جنگ درحقیقت اسی ہلچل کا نتیجہ تھی کیونکہ عربوں میں یہ احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا کہ اب اُن کے لئے دو ہی صورتیں ہیں یا تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مل جائیں اور یا مکہ والوں کے ساتھ مل جائیں چنانچہ کچھ لوگ اِدھر آ گئے اور کچھ لوگ اُدھر چلے گئے۔ وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ اور آسمان پر سے عذاب نازل ہونا شروع ہو جائے گا۔

نفخ صور سے مراد

نفخ صور سے اگر صلح حدیبیہ مراد لے لو تو ان آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک ایسا واقع رونما ہوگا جس سے عرب قبائل میں بے چینی پیدا ہو جائے گی اور اُن کے لئے انہیں یہ خیال پیدا ہونا شروع ہو جائے گا کہ اب اُنہیں کھلے طور پر یا اسلام میں شامل ہونا چاہیئے یا مکہ والوں کے ساتھ مل جانا چاہیئے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے وقت سے لوگوں میں یہ احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا کہ اب معاملہ اس قدر بڑھ چکا ہے کہ ہم یا محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہکر بچ سکتے ہیں یا مکہ والوں کے ساتھ رہ کر بچ سکتے ہیں چنانچہ اسی خیال کے زیر اثر کچھ قبائل رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مل گئے اور کچھ قبائل کفار کے ساتھ مل گئے گویا يَوْمُ الْفَصْلِ کی بنیاد صلح حدیبیہ نے رکھ دی۔

وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ اور آسمان کھولا جائے گا فَكَانَتْ اَبْوَابًا اور وہ دروازے دروازے بن جائے گا۔ ان معنوں کے لحاظ سے فَكَانَتْ اَبْوَابًا کا یہ مفہوم ہوگا کہ آسمان سے کفار پر عذاب نازل ہوں گے اور مومنوں پر اُس کی رحمت کی بارش برسیگی گویا آسمان ابواب ابواب ہو جائیگا کچھ دروازے ایسے ہونگے جن سے خیر نازل ہوگی اور کچھ دروازے ایسے ہوں گے جن سے عذاب نازل ہوگا پہلے بھی مسلمانوں پر آسمان سے خیر نازل ہوتی تھی مگر وہ ایسی ہی تھی جیسے چھیدوں میں سے کوئی چیز گرائی جاتی ہے لیکن صلح حدیبیہ کے بعد یہ خیر اس طرح مسلمانوں پر گرنے لگی جیسے بڑے بڑے دروازوں میں سے کوئی چیز گرتی ہے۔ اسی طرح کفار پر کثرت سے عذاب آنے شروع ہو گئے۔ گویا آسمان سے رحمت کے سامان بھی نازل ہونے لگ گئے اور عذاب کے سامان بھی نازل ہونے شروع ہو گئے۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ۔ جبال کے معنے سردارانِ قوم کے بھی ہوتے ہیں۔ پس سُيِّرَتِ الْجِبَالُ کے یہ معنے ہوئے کہ بڑے بڑے صنادید عرب اور وہ بڑے بڑے سردار جن پر اہلِ عرب کو ناز ہے اپنے گھروں سے نکالے جائیں گے۔ فَكَانَتْ سَرَابًا اور وہ سراب کی طرح ہو جائیں گے یعنی ثابت ہو جائیگا کہ اُن میں کوئی ایسا لیڈر نہیں جو قوم کی صحیح راہنمائی کرنے والا ہو۔ بلکہ سب کے سب لیڈر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں ناکام رہیں گے۔ سَرَابًا کا لفظ جو اس جگہ رکھا گیا ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ سَرَاب نصف النہار میں نظر آیا کرتا ہے۔ اس لفظ میں اس امر کی طرف بھی اشارہ تھا کہ جب محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سورج نصف النہار پر پہنچے گا اور اُس کی چمک لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دے گی اُس وقت اُنہیں معلوم ہو جائے گا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اُن کے لیڈر کیسے ناکام اور کس قدر عقل وخرد سے عاری ہیں۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی اسلام کی اس فتح کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے اور فتح مکہ نے اس کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ پس

# اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝ لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۝

یقیناً جہنم ایک راستہ ہے (مگر مذکورہ بالا) سرکشوں کے لئے وہ ٹھہرنے کی جگہ (بھی) ہے ٹلہ

فرماتا ہے اُس وقت لوگوں پر یہ ثابت ہو جائے گا کہ ان کے سارے لیڈر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں ایک سراب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ قوم کو تباہ کرنے والے اور اُسے ذلت کے گڑھوں میں گرانے والے ہیں۔ اُس کو ترقی تک پہنچانے کی اُن میں کوئی قابلیت نہیں چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔

سُیِّرتِ الجبال سے بڑو صنادیدِ عرب کا تباہ ہو۔

**ٹلہ حل لغات** - جَهَنَّم :- کہتے ہیں بِئْرٌ جَهَنَّمٌ اور مراد ہوتی ہے بَعِيْدَةُ الْقَعْرِ گہری تہ والا کنواں (لسان) لسان کے مصنف کہتے ہیں وَبِهٖ سُمِّيَ جَهَنَّمُ لِبُعْدِ قَعْرِهَا کہ جہنم کو اس لئے جَهَنَّم کہا جاتا ہے کہ اسکی تہ گہری ہوگی۔

مِرْصَادًا :- کے معنے ہیں اَلْمَكَانُ يُرْصَدُ فِيْهِ الْعَدُوُّ وہ جگہ جہاں دشمن کی انتظار کی جاتی ہے جس کو اردو میں گھات کہتے ہیں۔ نیز مِرْصَادٌ کے معنے اَلطَّرِيْقُ کے بھی ہیں یعنی راستہ (اقرب)

مَاٰبٌ :- اٰبَ کا مصدر بھی ہے اور اسم زمان اور مکان بھی۔ اٰبَ مَاٰبًا کے معنے ہیں رَجَعَ۔ لوٹا (اقرب) اور اَلْمَاٰبُ کے معنے ہیں اَلْمَرْجِعُ وَالْمُنْقَلَبُ لوٹنے کی جگہ (اقرب)

صاحب مفردات کہتے ہیں اَلْاَوْبُ ضَرْبٌ مِّنَ الرُّجُوْعِ وَذَالِكَ اَنَّ الْاَوْبَ لَا يُقَالُ اِلَّا فِي الْحَيَوَانِ الَّذِيْ لَهٗ اِرَادَةٌ وَالرُّجُوْعُ يُقَالُ فِيْهِ وَفِيْ غَيْرِهٖ (مفردات) یعنی عربی زبان میں اردو زبان کے لفظ "لوٹنے" کا مفہوم ادا کرنے کے لئے دو لفظ آتے ہیں (۱) رُجُوْعٌ (۲) اَوْبٌ۔ لیکن اَوْبٌ۔ رُجُوْعٌ سے خاص ہے اس لئے کہ اَوْبٌ اس کے لوٹنے کو کہیں گے جو ذی ارادہ ہو اور رُجُوْعٌ ذوارادہ اور غیر ذی ارادہ ہر دو کے لوٹنے کو کہتے ہیں۔

**تفسیر** - قتادہ کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ جہنم گھات میں رہتی ہے جو اُس پر سے گذرتا ہے اگر اُس کے پاس جواز کا پروانہ ہو تو اُسے گذرنے دیتی ہے ورنہ اُسے وہیں گرا لیتی ہے (کثیر) گویا انہوں نے اس کے معنوں میں جسر صراط کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن اگر اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا سے وہی جہنم مراد لیا جائے جو اگلے جہان میں ہوگا تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ اس کا سلسلہ اِسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے اِسی کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ (صحیح البخاری کتاب الصوم باب زیارۃ المرأۃ زوجها فی اعتکافه جلد ۱ ص۲۳۷ مطبوعہ مصر) کہ شیطان انسان کے مجری الدم میں چلتا ہے۔ گویا شیطانی تحریکیں دنیا میں اس قدر ہوتی ہیں کہ انسان اگر ذرا بھی غافل ہو تو وہ نفس پر غالب آجاتی ہیں۔ مگر ساتھ ہی اللہ تعالےٰ نے یہ بھی فرما دیا کہ لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا یعنی یہ سرکشوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ نے ایک دوسری جگہ فرمایا ہے اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ - اِنَّمَا سُلْطَانُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ (النحل ع۱۳) کہ شیطان کو مومنوں پر اور خدا تعالےٰ پر توکل رکھنے والوں پر غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اُس کا غلبہ انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو خود شیطان سے دوستی رکھتے ہیں اور اس کی محبت کا دم بھرتے اور شرک کرتے ہیں۔

مآب

لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے گویا اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا کے مضمون میں وہ حدیث آگئی جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ شیطان انسان کے مَجْرَى الدَّمِ میں چلتا ہے اور لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا نے بتا دیا کہ گو جہنم کا حملہ مومنوں کا فروں پر ہوتا ہے کسی پر کسی رنگ میں اور کسی پر کسی رنگ میں۔ لیکن جہنم ٹھکانہ کے طور پر صرف طاغین کے لئے ہے۔ دوسری آیات سے بھی اس مضمون کی تصدیق ہوتی ہے کہ شیطان کو کفار پر ہی غلبہ ملتا ہے مومنوں پر

جہنم کے گھات پر ہونے سے مراد۔

# لّٰبِثِیْنَ فِیْھَآ اَحْقَابًاؕ

درآنحالیکہ وہ برسوں اس میں رہتے چلے جائیں گے ؀۱۸

اُسے غلبہ حاصل نہیں ہوتا۔ غرض جہنم کو راستہ قرار دیا جائے یا گھات دونوں صورتوں میں اس کے یہ معنے ہیں کہ انسان کو خدا تعالیٰ تک پہنچانے کے لئے جہنم بھی ایک ضروری شے ہے جب تک انسان اپنے لئے جہنم یعنی تکلیف کا راستہ قبول نہ کرے خدا تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور اگر گناہ کر چکا ہو تو پھر بطور سزا کے اس تکلیف کے راستہ پر ایک عرصہ تک چلنا پڑتا ہے خواہ اسی دنیا میں یا اگلے جہان میں۔ اس کے بعد لقاء الٰہی نصیب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے جہنم بھی ضروری ہے

لِلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا کا حال ہے یعنی اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا وَّ مَاٰبًا حَالَ كَوْنِهَا لِلطّٰغِيْنَ یا یہ جملہ مِرْصَادًا کی صفت بھی ہو سکتا ہے۔

اَحْقَاب

**؀۱۸ حل لغات۔** اَحْقَابًا: اَحْقَاب حُقُبٌ کی جمع ہے اور حُقُبٌ کے معنے ہیں ثَمَانُوْنَ سَنَةً اَسّی سال کا عرصہ۔ وَيُقَالُ اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ اور بعض نے کہا ہے کہ اَسّی سال سے زیادہ عرصہ پر بھی حُقُبٌ کا لفظ بولیں گے۔ اَلدَّهْرُ زمانہ۔ اَلسَّنَةُ وَقِيْلَ السِّنُوْنَ مطلق ایک سال کے عرصہ کیلئے بھی عربی میں لفظ حُقُب استعمال ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ کئی سال کا عرصہ حُقُب کہلاتا ہے (اقرب)

احقاب کے معنے مفسرین کے نزدیک

**تفسیر۔** لٰبِثِيْنَ طَاغِيْنَ کی ضمیر کا حال ہے۔ یعنی طاغیوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ جہنم میں سالوں یا زمانوں یا صدیوں رہیں گے۔ اُخروی لحاظ سے تو بعد میں بحث کیجائیگی دنیوی لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جب اسلام کو غلبہ حاصل ہوا تو وہ صدیوں تک ہی رہا۔ بعض قومیں دنیا میں فوراً پھیل جاتی ہیں لیکن اس کے بعد جلدی ہی مٹ جاتی ہیں مگر مسلمانوں کا صدیوں تک غلبہ رہا چنانچہ مسلمان قریباً سات سو سال تک غالب رہے اُن میں کمزوری بے شک چوتھی صدی میں ہی پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی مگر مختلف صورتوں میں اُن کا غلبہ سات سو سال تک رہا ہے بلکہ وہ زمانہ جس میں مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی شخص اُٹھ نہیں سکتا تھا اور کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے سامنے کھڑا ہو سکے اُس کو بھی شامل کر کے یہ ایک ہزار سال کا عرصہ بن جاتا ہے۔ اب قریباً ساڑھے تین سو سال سے مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر اقوام کو کھڑا ہونے کی جرأت ہوئی ہے اور انہوں نے سمجھا ہے کہ ہم بھی مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ یعنی سترھویں صدی کے شروع سے مسلمان ایسے گرنے شروع ہوئے کہ دشمن اُنکے مقابلہ میں کھڑا ہو گیا لیکن اس سے پہلے ایک ہزار سال کے لمبے عرصہ میں کسی کو یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کھڑا ہو سکے اور یہ زمانہ دنیوی لحاظ سے گویا دشمنان اسلام کیلئے دوزخ حسد میں جلنے کا زمانہ تھا۔

اَحْقَاب حُقُبٌ کی جمع ہے اس کے لغوی معنے حل لغات میں لکھے جا چکے ہیں اب اس کے تفسیری معنے لکھے جاتے ہیں۔ ابن جریر حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں (عن سالم بن ابی الجعد) کہ حضرت علیؓ نے ہلال الہجری سے کہا کہ حُقُب کے معنے تم کیا کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ حُقُب کے معنے ہیں اَسّی سال۔ ہر سال بارہ مہینے کا۔ ہر مہینہ تیس دن کا اور ہر دن ایک ہزار سال کا۔ گویا یہ دو کروڑ اٹھاسی لاکھ سال ہوئے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ کہ حُقُب کے معنے ہیں چالیس سال جس کا ہر دن ہزار سال کا ہے گویا ایک کروڑ چوالیس لاکھ سال۔ اسی قسم کی روایت ابن ابی حاتم نے ابن عباسؓ سعید بن جبیر اور کئی تابعین سے بھی نقل کی ہے مگر حُقُب کو ستر سال کا قرار دیا ہے (جملہ روایات منقول از ابن کثیر ہیں) گویا ان روایات کے مطابق ایک کروڑ چوالیس لاکھ یا دو کروڑ اٹھاسی لاکھ یا دو کروڑ ساٹھ لاکھ سال کو اتنے عدد سے ضرب دی جائے گی جتنے عدد اَحْقَاب کی جمع سے مراد لئے جائیں گے مگر یہ تعداد خواہ کچھ بھی ہو۔ بیس کروڑ ہو چالیس کروڑ ہو

یا ایک سال رب ہو۔ بہرحال یہ ایک معیّن عدد ہے اور ان روایات سے اتنا ضرور ثابت ہو گیا کہ دوزخ کا عذاب محدود ہے اور وہ آخر ایک دن ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ احساس مفسّرین کے دلوں میں بھی پیدا ہوا ہے اور اسی وجہ سے مقاتل ابن حیان کہتے ہیں کہ یہ آیت فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا کی آیت سے منسوخ ہے جو اسی رکوع کے آخر میں آتی ہے۔ حالانکہ مفسّرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ساری آیتیں اکٹھی نازل ہوئی تھیں یعنی اس سورۃ کا دو ٹکڑوں میں اُترنا ثابت نہیں پس یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ ایک ہی وقت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں اکٹھی نازل ہوئیں اور پھر ان میں سے ایک آیت نے دوسری آیت کو منسوخ کر دیا۔ خالد بن معدان بھی کہتے ہیں (عن ابن جریر بحوالہ ابن کثیر) کہ یہ منسوخ ہے۔ ان کی روایات لکھ کر ابن جریر کہتے ہیں کہ شاید یہ عبارت لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا سے متعلق ہے یعنی لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا سے مراد محض دوزخ میں رہنا نہیں بلکہ اس قسم کا رہنا ہے جس کے متعلق اگلی آیت میں لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا آیا ہے اور مراد یہ ہے کہ دوزخی دوزخ میں صدیوں ایسی حالت میں رہیں گے کہ نہ انہیں کوئی راحت ملے گی اور نہ پینے کو کچھ ملے گا اس کے بعد بھی وہ رہیں گے تو دوزخ میں ہی مگر عذاب کی نوعیت بدل دی جائیگی پھر وہ کہتے ہیں وَالْاَصَحُّ اَنَّهَا لَا انْقِضَاءَ لَهَا یعنی صحیح بات تو یہ ہے کہ دوزخ کبھی مٹ ہی نہیں سکتا۔ پھر ابن جریر نے سالم سے اور انہوں نے حسن بصری سے یہ روایت نقل کی ہے۔ کہ اَمَّا الْاَحْقَابُ فَلَيْسَ لَهَا عِدَّةٌ اِلَّا الْخُلُوْدُ فِي النَّارِ۔ یعنی اَحْقَاب جمع کا لفظ اللہ تعالیٰ نے بولا ہے اس کی گنتی بیان نہیں کی اس لئے اَحْقَاب کی گنتی غیر محدود ہے اور اس سے مراد دوزخیوں کا ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو ہر ایک کے دل میں خیال پیدا ہوا ہے کہ اس آیت کے ظاہری معنے عذاب جہنم کے ختم ہونے پہ دلالت کرتے ہیں لیکن پھر ان معنوں کی اپنے عقیدہ کے مطابق تاویل کرنے کی کوشش کی ہے اور یا تو اس

تفسیر احقاب سے دوزخ کے عذاب کے محدود ہونے کا احساس مفسّرین کو۔

آیت کو لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا سے متعلق بتایا ہے اور یا اَحْقَاب کی جمع کو اَنْ گِنت جمع قرار دے دیا ہے۔ جہاں تک اَحْقَاب کی جمع کا سوال ہے یہ امر یاد رکھنا چاہئیے کہ اَحْقَاب اوزانِ جمع قلت میں سے ہے یعنی ان اوزان میں سے ہے جن کے معنے تین سے دس تک کے ہوتے ہیں اور گو ضروری نہیں کہ ہر جمع قلت کے لفظ سے قلت ہی مراد لی جائے مگر بہرحال وضع لفظ کو اہمیت ضرور دی جائے گی اور جس غرض کے لئے لغت نے لفظ مقرر کیا ہو اُس سے بدلنے کے لئے کوئی قرینہ ضرور ہونا چاہیئے۔ بغیر کسی قرینہ کی موجودگی کے اُس کے دوسرے معنے کرنے جائز نہیں ہوں گے ورنہ تاویل کا ایسا دروازہ کھل جائیگا جو حقیقت سے بہت دور لے جائے گا ایسے قرینے بعض دفعہ معنوی ہوتے ہیں یعنی دوسری آیات بھی یہ دلالت کرتی ہیں یا دوسرے شواہد اُس پر دلالت کرتے ہیں اور بعض دفعہ ظاہری ہوتے ہیں جیسے ال استغراقی آجائے تو اس کے معنے جمع کثرت کے ہو جاتے ہیں یا کسی ایسے لفظ کی طرف اضافت ہو جو اُس کے ایسے معنے کر دے جو کثرت پر دلالت کرتے ہوں۔ مگر بغیر کسی قرینے کے کسی لفظ کو اُن معنوں سے پھرا دینا جو وضع لغت کے لحاظ سے صحیح ہوں جائز نہیں ہو سکتا اور وضع لغت کے لحاظ سے اَحْقَاب کے معنے تین سے دس تک کے ہو سکتے ہیں۔ پس اگر ہم اس کی آخری حد تو سمجھ لیں تو ہم دو کروڑ اٹھاسی لاکھ کو اس سے ضرب دے لیں گے بشرطیکہ ہم اَحْقَاب کے وہ معنے کریں جو تفاسیر میں کئے گئے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس ایک اور حدیث ایسی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ روایت کہ وہاں ہر دن ہزار سال کا ہو گا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نہیں بلکہ غالباً یہود وغیرہ سے سُنی ہوئی ہے۔ بزّاز نے ایک روایت ابو مسلم بن العلاء سے نقل کی ہے کہ انہوں نے سلیمان التیمی سے پوچھا کہ کیا جہنم میں سے کوئی نکلے گا بھی یا نہیں؟ سلیمان التیمی نے جواب دیا کہ حَدَّثَنِيْ نَافِعٌ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ وَاللّٰهِ لَا يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ اَحَدٌ حَتّٰى يَمْكُثَ فِيْهَا اَحْقَابًا قَالَ الْحُقْبُ

بِضۡعٌ وَّثَمَانُوۡنَ سَنَةً كُلُّ سَنَةٍ ثَلَاثُ مِائَةٍ وَّسِتُّوۡنَ يَوۡمًا مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ یعنی مجھ سے بیان کیا نافعؓ نے انہوں نے سُنا عبد اللہ بن عمرؓ سے اور عبد اللہ بن عمرؓ نے براہ راست رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا خدا کی قسم آگ میں سے کوئی نہ نکلیگا جب تک اُس میں اَحۡقَاب یعنی کئی حُقب نہ رہ لے۔

دوزخ کے غیر ابدی ہونے کا ثبوت حدیث سے

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوزخ میں اَحۡقَاب رہنے کے بعد وہاں سے نکلنے کے قائل ہیں مگر جن لوگوں کا عقیدہ اوپر بیان کیا گیا ہے اُن کے نزدیک اَحۡقَاب سے مراد یہ ہے کہ دوزخ میں سے کوئی آدمی کبھی نہیں نکلے گا۔ پس اس روایت نے اُن کے خیلات کی تردید کردی اور یہ ظاہر ہوگیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کے معنے یہی لئے ہیں کہ اَحۡقَاب کے بعد لوگ دوزخ میں سے نکل آئیں گے پھر آگے جو فرمایا گیا ہے کہ قَالَ اَلۡحُقُبُ بِضۡعٌ وَّثَمَانُوۡنَ سَنَةً كُلُّ سَنَةٍ ثَلَاثُ مِائَةٍ وَّسِتُّوۡنَ يَوۡمًا مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ یہ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ ہیں تب بھی ان کا یہ نتیجہ نکلیگا کہ جنہوں نے یہ معنے کئے ہیں کہ حُقب کا ہر دن ایک ایک ہزار سال کا ہوگا انہوں نے غلطی کی ہے اور یہ معنے انہوں نے یہود وغیرہ سے سُن کر نقل کر دئے ہیں اور اگر قَالَ سے مراد حضرت عبد اللہ بن عمرؓ ہیں تب بھی مِمَّا تَعُدُّوۡنَ کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ وہ ان الفاظ کے ذریعہ ایک ہزار سال کا ایک دن ہونے کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔ پس اگر یہ قول رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہو تب بھی وہ معنے غلط ثابت ہوتے ہیں اور اگر یہ قول حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا ہو تب بھی یہ اُن معنوں کے غلط ہونے کی دلیل ہوگی کیونکہ ایک جلیل القدر صحابی ان معنوں کی تردید کر رہا ہے۔ تیسرا قرینہ ان معنوں کے غلط ہونے کا حضرت علیؓ کی وہ روایت ہے جو سالم بن ابی الجعد سے منقول ہے اُس میں حضرت علیؓ ہلال الھجری سے پوچھتے ہیں کہ تم حُقب کے کیا معنے کرتے ہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حُقب کے کوئی

لَّابِثِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَحۡقَابًا کے الفاظ میں اسلام کے دشمنوں کے مغلوب ہونے کے زمانہ کی طرف اشارہ۔

خاص معنے مروی نہیں تھے اگر کوئی خاص معنے مروی ہوتے تو حضرت علیؓ ہلال الھجری کو وہ معنے بتاتے نہ یہ کہ ہلال الھجری سے اس لفظ کے معنے پوچھتے۔ پس ان تمام استدلالات اور روایتوں سے یہ معلوم ہُوا کہ اس جگہ دوزخ میں سے دوزخیوں کے نکلنے کا جواز بلکہ اُس کی خبر پائی جاتی ہے گو یہ بھی ضرور ہے کہ دوزخ میں رہنے کا ایک لمبا عرصہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ اگر اَحۡقَاب سے مراد دس اَحۡقَاب لئے جائیں اور حقب کے معنے اسّی سال کے لئے جائیں تب بھی آٹھ سو سال بن جاتے ہیں۔ یہ زمانہ بھی کوئی چھوٹا نہیں کیونکہ عذاب کی ایک گھڑی بھی بہت بڑی ہوتی ہے جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے حُقب کے معنے ایک لمبے زمانہ کے بھی ہوتے ہیں اور صدی کے بھی ہوتے ہیں۔ اگر صدی کے معنے لئے جائیں تو ایک ہزار سال کا زمانہ بن جاتا ہے اور اگر حُقب سے مُراد لمبا زمانہ لیا جائے تو اَحۡقَاب سے مراد دس لمبے زمانے ہوں گے۔ اس صورت میں یہ عذاب بہت لمبا بھی ہوسکتا ہے کیونکہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ اِنَّ يَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّكَ كَاَلۡفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ (الحج ع ۶) کہ بعض دفعہ اللہ تعالےٰ کا ایک زمانہ ہزار برس کا ہوتا ہے۔ اس صورت میں اَحۡقَاب سے مراد دس ہزار سال بن جائیں گے لیکن بہرحال کوئی معنے ہوں دوزخ کے عذاب کا غیر منتہی ہونا کہیں سے ثابت نہیں ہوتا۔ خدا تعالےٰ نے قرآن کریم میں ایک اور جگہ پچاس ہزار سال کا بھی دن قرار دیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ اِلَيۡهِ فِيۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ (المعارج ع ۱) اگر ایک حُقب کو پچاس ہزار سال کا قرار دو تب بھی جہنّم کا عذاب محدود ہی رہے گا غیر محدود ثابت نہیں ہوسکتا۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں کے دنیوی عذاب کے معنے کرنے کی صورت میں اس آیت میں یہ پیشگوئی نکلتی ہے کہ اسلام کے دشمن دوسو چالیس یا تین سو سے لے کر آٹھ سو یا ہزار سال تک مغلوب رہیں گے۔ اگر اسّی سال کا حُقب مانا جائے تو چونکہ جمع قلت تین سے دس تک ہوتی ہے تین سے اسّی کو ضرب دیجائے تو دوسو چالیس اور دس سے ضرب دی جائے تو آٹھ سو سال کا زمانہ بنتا ہے اور سو سال کا حُقب مانا جائے تو تین سو سے

ہزار سال تک کا زمانہ ہوتا ہے) اگر کہو کہ اس طرح دو مُدتیں بتانے میں تو شک پیدا ہوتا ہے اور خدا تعالےٰ کے کلام میں شک نہیں ہوتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس حد تک کلام میں ابہام کا ہونا کسی نئے فائدہ کو پیدا کرتا ہے اُسی حد تک خدا تعالیٰ کے کلام میں ابہام ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ اس جگہ تین صدی سے دس صدی تک اسلام کے غلبہ کی خبر دینے میں دو فوائد تھے اس لئے یہ ابہام قبیح نہیں بلکہ حسن اور مفید ہے۔ اور وُہ دو فائدے یہ تھے (۱) کہ دو سو چالیس سال یا تین صدیوں تک اسلام کا غلبہ نہایت مکمل اور اعلیٰ تھا یعنی اندرونی اتحاد اور بیرونی دشمن کی کمزوری دونوں باتیں پائی جاتی تھیں اور اسی عرصہ میں دشمن مکمل طور پر حسد کی آگ میں جل رہا تھا۔ کیونکہ نہ مسلمانوں کی کمزوری اُسے اپنی ترقی کی امید دلاتی تھی نہ اپنی طاقت کوئی امید کی صورت پیدا کرتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سو سال کے بعد مسلمانوں میں ایک اختلاف رُونما ہُوا تھا یعنی شیعین اور بغداد الگ ہوئے مگر دو سو ستّر سال تک یہ اختلاف ایسا نمایاں نہیں ہُوا کہ اس کا اثر اسلام کی ترقی پر پڑتا۔ اس کے بعد دو سو چالیس یا تین سو سال سے آٹھ سو یا ہزار سال تک کا زمانہ وہ ہے کہ اس میں ایک طرف مسیحیت کو طاقت ملنی شروع ہوئی دوسری طرف مسلمانوں میں کمزوری نمایاں طور پر پیدا ہونی شروع ہوئی۔ مگر مسیحیوں کی بیداری اور مسلمانوں کی کمزوری ایسی نہ تھی کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے غلبہ کو نقصان پہنچے خصوصاً اسی زمانہ کا متمدن علاقہ یعنے ایشیا اور شمالی افریقہ پوری طرح مسلمانوں کے تسلّط میں رہا۔ پس لَابِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا کی پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور ان دونوں زمانوں کے لحاظ سے اَحْقَاب کا لفظ جو مُبہم عدد پر دلالت کرتا ہے استعمال کیا گیا ہے۔ اَحْقَاب کی ابتدائی مدت مکمل غلبہ پر دلالت کرتی ہے اور اس کی انتہائی مدت اس غلبہ پر دلالت کرتی ہے جس میں کسی قدر ضعف کے آثار ظاہر ہونے لگ گئے تھے مگر غلبہ پھر بھی تھا۔

اس کے علاوہ اس ابہام کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ پہلی تین صدیوں اور آخری سات صدیوں کے غلبہ میں ایک اور امتیاز بھی تھا۔ پہلی صدیوں میں اسلامی احکام پر کم و بیش عمل ہوتا تھا اور کفار سے حُسنِ سلوک کا خیال رکھا جاتا تھا مگر تین سو سال کے بعد ملوکیت نے زور پکڑ لیا اور کفار سے نسبتاً سختی شروع ہو گئی جو غیر مذاہب والوں کے سلوک سے تو بہتر تھی مگر اسلامی معیار کے مطابق نہ تھی اس وجہ سے بھی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے دو قسم کے سلوکوں کے الگ الگ زمانوں پر دلالت ہو یعنی تین سو اور ہزار سال کے زمانوں پر۔ ان معنوں کے رُو سے فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا کی آیت بھی خوب حل ہوتی ہے کیونکہ اس آیت میں زمانہ کے ساتھ ساتھ عذاب کی زیادتی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہی حال کفار کا ہُوا۔ ابتداءً اسلام میں اسلامی تعلیم کے ماتحت ان پر سختی نہ کی جاتی تھی لیکن جوں جوں اسلامی تعلیم کا اثر مسلمانوں کے دلوں سے کم ہوتا گیا مسلمانوں میں سختی پیدا ہوتی گئی اور اسلامی حکومتوں کے دشمنوں پر تعذیب بڑھتی گئی۔

غرض اس آیت کا جہاں تک غلبۂ اسلام سے تعلق ہے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ مسلمانوں کا غلبہ تین سو سال سے ایک ہزار سال تک رہیگا اور ایسا ہی ہُوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ درمیان میں عارضی طور پر ترکوں کی ایک رَو آئی جس نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا مگر وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد مسلمان ہو کر دب گئے اور اسلام کو ہی غلبہ حاصل رہا۔ اس صورت میں یہی نہیں کہ اسلام کی ترقی اور کفر کی بربادی کی اس آیت میں خبر دی گئی ہے بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام کو جو غلبہ حاصل ہوگا وہ ایک ہزار سال تک چلتا چلا جائے گا۔ ایک ہزار سال کے غلبہ کے بعد کفر پھر سر اُٹھائے گا اور مسلمانوں کا تنزل شروع ہو جائیگا۔ چونکہ ہر مضمون کے لحاظ سے آیتوں کے معنے کئے جاتے ہیں اس لئے اسلام اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے غلبہ کے لحاظ سے اس کے یہی معنے ہوں گے۔ لیکن جب ہم ان آیات کو عذاب دوزخ کے متعلق قرار دیں گے تو اس صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ حُقب سے مراد زمانہ ہے اور اَحْقاب سے مراد بہت لمبا زمانہ ہے۔

علاوہ ازیں قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب

عذاب جہنم کے منقطع ہونے کے پانچ ثبوت قرآن مجید سے

نیز منقطع نہیں اس لئے بھی اَحْقَاب کو اس کے معنوں سے پھرانے کی اجازت نہ ہوگی چنانچہ فرماتا ہے (۱) اُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (قارعہ ع) دوزخ دوزخیوں کی ماں کی طرح ہوگی جس طرح ماں کے رحم میں انسان کی تکمیل ہوتی ہے اسی طرح دوزخ میں دوزخیوں کی روحوں کی تکمیل کی جائے گی اور ظلماتِ ثلاثہ میں سے گزر کر آخر ایک دن وہ نئی روحانی پیدائش حاصل کر لیں گے (۲) دوسرے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف ع۱۹) میری رحمت نے ہر چیز کو ڈھانپا ہوا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت نے ہر چیز کو ڈھانپا ہوا ہے تو دوزخیوں کو بھی اُسے اپنی رحمت سے ڈھانپنا چاہیئے اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آخر انسان نجات پا جائے گا (۳) تیسرے فرماتا ہے رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (المومن ع۱) اے ہمارے رب ہر چیز کا تو نے رحمت اور علم سے احاطہ کیا ہوا ہے۔ اگر اس آیت کی موجودگی میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی چیز بھی مخلوق میں سے ایسی ہے جس کا خدا کو علم نہیں تو یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی چیز ایسی ہے جس کو خدا کی رحمت ڈھانپ نہیں لے گی (۴) چوتھے فرماتا ہے۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (هود ع۹) وہ اُس میں اُس وقت تک رہیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین ہیں اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ مگر جو تیرا رب چاہے یعنی تیرا رب جس کو بخشنا چاہے بخش دے۔ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ تیرا رب وہ بات ضرور کرے گا جس کا وہ ارادہ رکھتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا ہے بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ اُسکی طرف سے بخشش ہوگی بھی۔ (۵) اسی طرح سورۂ ہود میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (هود ع۱۰) سوائے ان کے جن پر تیرے رب نے رحم کیا وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق کو پیدا کیا ہے تاکہ اُن پر رحم کرے۔ جب ہر مخلوق کو خدا تعالیٰ نے رحم کے لئے پیدا کیا ہے تو یہ خیال کر لینا کہ وہ کسی کو ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہنے دے گا اس آیت کے بالکل خلاف ہے۔ ابن کثیر میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت آتی ہے کہ لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ يَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو اپنی رحمت کے لئے پیدا کیا ہے عذاب کے لئے پیدا نہیں کیا۔ اور یہ ایک لازمی بات ہے کہ جس چیز کے لئے کسی کو پیدا کیا گیا ہے وہ اس کو ضرور مل جانی چاہیئے۔ (۶) پھر فرماتا ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (زلزال) جو شخص ایک ذرہ بھر نیکی میں بھی حصہ لے گا اللہ تعالیٰ اسکی نیکی کے ایک ذرہ کو بھی ضائع نہیں کرے گا اور وہ ضرور اس کا انجام دیکھے گا۔ یہ انجام وہ اسی طرح دیکھ سکتا ہے کہ پہلے اُسے گناہوں کی سزا دیدی جائے اور بعد میں اُسے معاف کر دیا جائے (۷) حدیث میں بھی آتا ہے اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اِذَا اَرَادَ عَبْدِيْ اَنْ يَّعْمَلَ سَيِّئَةً فَلَا تَكْتُبُوْهَا عَلَيْهِ حَتّٰى يَعْمَلَهَا فَاِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا بِمِثْلِهَا وَاِنْ تَرَكَهَا مِنْ اَجْلِيْ فَاكْتُبُوْهَا لَهٗ حَسَنَةً وَاِذَا اَرَادَ اَنْ يَّعْمَلَ حَسَنَةً فَلَمْ يَعْمَلْهَا فَاكْتُبُوْهَا لَهٗ حَسَنَةً فَاِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا لَهٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ (بخاری مصری جلد رابع کتاب التوحید) یعنی ہر بدی کی سزا اُس کے برابر ہے اور ہر بدی جس کا خیال چھوڑ دیا جائے اس کے بدلہ میں نیکی لکھی جاتی ہے اور ہر نیکی جس کا انسان خیال کرے خواہ عمل نہ کرے اس کے بدلہ میں نیکی ہے۔ اور ہر نیکی کا بدلہ دس سے سات سو گنے تک ہے۔ قرآن کریم میں بھی نیکی کا دس گنے سے زیادہ ثواب دئے جانے کا وعدہ کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ ع۳۶) یعنی جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُن کے اس فعل کی حالت ایسے دانہ

# لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۙ

(وہاں ان لوگوں کی یہ حالت ہوگی) کہ وہ نہ تو اس میں کسی قسم کی ٹھنڈک (محسوس کریں گے) اور نہ کوئی پینے کی چیز چکھیں گے

# اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۙ جَزَآءً وِّفَاقًا ۙ

سوائے (انتہائی) گرم پانی اور (ناقابل برداشت) ٹھنڈے پانی کے (اس طرح انہیں ان کے اعمال کے) مطابق بدلہ (دیا جائیگا) ۱۹ــــہ

کی حالت کے مشابہ ہے جو سات بالیں اگاتے اور ہر بال میں سو دانہ ہو اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے اس سے بھی بڑھا بڑھا کر دیتا ہے اور اللہ وسعت والا ہے اور بہت جاننے والا ہے۔ اس آیت سے پتہ لگتا ہے کہ بعض نیکیوں کا بدلہ سات سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چونکہ انسان میں کچھ نیکی بھی پائی جاتی ہے اس لئے نیکیوں کا شمار اگر اس حدیث اور قرآن کریم کی آیت کے مطابق کیا جائے تو عقل اس بات کو جائز قرار نہیں دیتی کہ کوئی انسان دائمی طور پر نجات سے محروم ہو جائے (نیز دیکھو تفسیر کبیر حصہ سوم ہود ع ۹ صفحہ ۲۵۳ سے ۲۵۹ تک)

**۱۹ــــہ حل لغات۔** اَلْبَرْدُ: نَقِيْضُ الْحَرِّ۔ بَرْد کے معنے ٹھنڈک کے ہیں اَلْبَرْدُ اَيْضًا اَلنَّوْمُ۔ بَرْد کے ایک معنے نیند کے بھی ہیں چنانچہ عرب کہتے ہیں اَلْبَرْدُ يَمْنَعُ الْبَرْدَ یعنی ٹھنڈک نیند کو روک دیتی ہے (اقرب) فتح البیان میں ہے کہ حسن۔ عطا اور ابن زید کے نزدیک بَرْد سے مراد راحت ہے۔

حَمِيْمًا:۔ اَلْحَمِيْمُ: اَلْمَآءُ الْحَارُّ۔ حمیم گرم پانی کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اضداد میں سے ہے یعنی اپنے مخالف معنے بھی ادا کرتا ہے چنانچہ اس کے معنے ٹھنڈے پانی کے بھی ہیں۔ نیز اَلْحَمِيْمُ کے معنے ہیں اَلْقَيْظُ گرمی۔ اَلْعَرَقُ پسینہ (اقرب)

غَسَّاق: اَلْغَسَّاقُ کے معنے ہیں اَلْمُنْتِنُ اَلْبَارِدُ الشَّدِيْدُ الْبَرْدِ الَّذِيْ يُحْرِقُ مِنْ بَرْدِهٖ كَاِحْرَاقِ الْحَمِيْمِ۔ سخت ٹھنڈی بدبودار چیز جو اپنی ٹھنڈک سے ایسی ہی تکلیف دے جیسے کہ گرم پانی گرمی سے جلا دیتا ہے (لسان) مَا يَقْطُرُ مِنْ جُلُوْدِ اَهْلِ النَّارِ وَصَدِيْدُهُمْ مِنْ قَيْحٍ وَّنَحْوِهٖ۔ وہ پیپ جو دوزخیوں کے اجسام سے نکلے گی اس کو بھی غَسَّاق کہتے ہیں (اقرب)

وِفَاقًا:۔ وِفَاق وَافَقَ کا مصدر ہے اور وَافَقَ عَلَى الشَّيْءِ کے معنے ہیں ضِدُّ خَالَفَ کسی چیز کے مطابق آیا۔ اَلْوَفْقُ کے معنے ہیں اَلْمُطَابَقَةُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ دو اشیاء کے درمیان پوری مطابقت (مفردات) پس جَزَآءً وِّفَاقًا کے معنے ہوں گے اعمال کے مطابق جزاء۔

**تفسیر۔** لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا یہ طاغین کا دوسرا حال ہے۔ پہلا حال آیت لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا میں بیان ہے۔ یعنی طاغیوں کا یہ حال بھی ہوگا کہ وہ نہیں چکھیں گے بَرْد اور نہ ہی شَرَاب اس حالت میں کہ وہ جہنم میں ہونگے۔ جو ابن جریر نے معنے کئے ہیں کہ لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا والی آیت لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا سے متعلق ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ پھر عذاب کی نوعیت بدل جائیگی مگر یہ معنے بالبداہت باطل ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں آیت کے معنے یہ بنتے ہیں کہ اَحْقَاب کے بعد انہیں راحت بھی میسر آجائیگی اور پینے کے لئے پانی بھی ملنا شروع ہو جائے گا۔ جب انہیں پانی بھی مل جائے گا اور راحت بھی میسر آجائے گی تو پھر عذاب کس بات کا ہوگا۔ اگر خالی پینے کا ذکر ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ صرف پانی پینے کے بعد بھی دکھ رہ سکتا ہے مگر یہاں تو شَرَابًا کے ساتھ ہی بَرْدًا کا بھی ذکر آتا ہے اور بَرْدًا کے معنے نیند اور راحت کے بھی ہوتے ہیں۔ پس لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا کے معنے یہ ہوں گے کہ اَحْقَاب تک تو انہیں راحت نہیں ملے گی اور نہ پینے کے لئے پانی ملیگا مگر جب

اَلْبَرْدُ

حَمِيْمٌ

غَسَّاق

اَحْقَابًا گذر جائیں گے تو پھر اُنہیں پینے کے لئے پانی بھی مل جائے گا اور نیند اور راحت کے سامان بھی میسر آجائیں گے لیکن وہ رہیں گے دوزخ میں ہی۔ پس یہ معنے بالبداہت غلط اور باطل ہیں۔

**لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا سے ابن جریر کا غلط استدلال**

دوسرے بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا میں بَرْدًا کو الگ بیان کیا گیا ہے اور شَرَابًا کو الگ بیان کیا گیا ہے جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہاں بَرْدًا سے ٹھنڈا پانی مراد نہیں بلکہ کچھ اور مراد ہے اور وہ معنے یہی ہو سکتے ہیں کہ انہیں راحت کے سامان بھی میسر نہیں آئیں گے۔ چنانچہ بَرْد کے ایک معنے راحت کے بھی آتے ہیں چنانچہ لکھا ہے اَلْبَرْدُ :- اَلرَّوْحُ وَالرَّاحَةُ (فتح البیان)

**جَزَآءً وِّفَاقًا سے اسلامی تعلیم کے تفوق کا ثبوت**

جہاں تک قیامت کا تعلق ہے لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا کے معنے ظاہری بھی کئے جا سکتے ہیں کہ وہاں اُن کے لئے کوئی راحت کا سامان نہ ہوگا اور نہ انہیں پینے کے لئے کوئی چیز ملے گی سوائے گرم پانی اور غَسَّاق کے۔ غَسَّاق کے معنے ہوتے ہیں سخت سرد پانی یا بدبودار پانی کے یا وہ پیپ جو زخموں میں سے بہتی ہے۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے اَلْغَسَّاقُ اَلْمُنْتِنُ - اَلْبَارِدُ الشَّدِيْدُ الْبَرْدِ۔ وَ مَا يَقْطُرُ مِنْ جُلُوْدِ اَهْلِ النَّارِ وَصَدِيْدُهُمْ مِنْ قَيْحٍ وَ نَحْوِهٖ (اقرب) غَسَّاق کا لفظ بھی بتا رہا ہے کہ یہاں بَرْد کے معنے راحت کے ہی ہیں کیونکہ غَسَّاق کے معنے ہیں سخت سرد۔ پس یہ کہنا کہ انہیں وہاں سردی نہیں لگے گی بالبداہت باطل ہو گیا کیونکہ غَسَّاق کے معنے ہی سخت سرد کے ہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دوزخیوں کو جو پانی ملیگا وہ سخت گرم ہوگا۔ اسی طرح انہیں زخموں کا دھوون یا انکی پیپ دی جائے گی یا سخت بدبودار اور سڑا ہوا پانی ملے گا۔ یا اتنا ٹھنڈا پانی دیا جائے گا جس سے ان کے دانت گرنے لگیں گے۔

**جَزَآءً وِّفَاقًا کا مطلب**

جَزَآءً وِّفَاقًا یعنی یہ جزا ہے جو اُن کے مناسب حال ہے۔ وِفَاقًا کے معنے ہوتے ہیں مُوَافِقًا لِلْاَعْمَالِ۔ وہ جزاء جو اُن کے اعمال سے مطابقت رکھتی ہے یعنی اس دُنیا میں بھی اُن کے اندر میانہ روی نہیں تھی اور چونکہ دنیا میں میانہ روی کا وصف اُن کے اندر نہیں پایا جاتا تھا اس لئے اگلے جہان میں بھی انہیں ایسی ہی چیزیں ملیں گی جو حد درجہ گرم ہونگی یا حد درجہ سرد ہونگی یا چونکہ دنیا میں وہ سخت غصہ میں آجاتے تھے یا نکمے اور سست ہو کر بیٹھ رہتے تھے۔ میانہ روی کی عادت جو انسان کو کامیاب کرتی ہے ان کے اندر نہیں تھی اس لئے جہنم کا عذاب بھی انہیں اسی صورت میں ہی ملے گا۔ کہیں سخت گرم پانی اُن کو پینے کے لئے ملے گا کہیں سخت سرد پانی اُن کو پینے کے لئے ملے گا۔ درمیانی پانی جو راحت بخشتا ہے انہیں جہنم میں نظر ہی نہیں آئیگا۔ اسلام اور کفر کے اخلاق میں یہی فرق ہے کہ اسلام میں میانہ روی کی تعلیم ہے لیکن اسلام کے علاوہ اور کسی مذہب میں میانہ روی کی تعلیم نہیں پائی جاتی۔ یہودیت کہتی ہے "جان کے بدلے جان لے اور آنکھ کے بدلے آنکھ۔ دانت کے بدلے دانت اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ۔ پاؤں کے بدلے پاؤں۔ جلانے کے بدلے جلانا۔ زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ" (خروج باب ۲۱ آیت ۲۴ تا ۲۵) عیسائیت کہتی ہے "جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اسکی طرف پھیر دے" (متی باب ۵ آیت ۳۸) گویا ایک میں گرمی ہی گرمی چلتی چلی جاتی ہے اور دوسرے میں سردی ہی سردی چلی جاتی ہے۔ پس ایسے اعمال کے بدلہ میں جزا بھی ایسی ہی ہوگی کہ کسی کو گرمی ہی گرمی پہنچے گی اور کسی کو سردی ہی سردی پہنچے گی لیکن اسلام اپنے تمام احکام میں میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ فرماتا ہے۔ تم رحم کے موقعہ پر رحم کرو اور سزا کے موقعہ پر سزا دو۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (الشوریٰ ع ۴) یعنی بدی کی سزا اُسی حد تک دینی جائز ہے جس حد تک کہ ظالم نے ظلم کیا تھا مگر جو ظلم کے مقابل پر عفو سے کام لے بشرطیکہ اس عفو سے اصلاح ہوتی ہو تو اُسے اپنے اس عفو کا بدلہ اللہ تعالیٰ سے ملیگا اور ضرور ملے گا۔

# إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ۝

وہ یقیناً (کسی) محاسبہ کا ڈر (اپنے دلوں میں) نہیں رکھتے تھے۔ ۵۲۰

قرآن مجید اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق اگر ان آیتوں کو لیا جاتے تو پھر ان سے روحانی معنے مراد ہوں گے جیسا کہ پہلے ہم روحانی معنے کرتے چلے آتے ہیں۔ یعنی اسلام کے دشمنوں کو کبھی راحت نہیں ملے گی۔ اُن کے دلوں کو کبھی چین نصیب نہیں ہوگا وہ اسلام کے مقابلہ میں جب اپنی ناکامی دیکھیں گے تو اس بے چینی اور اضطراب کی حالت میں کبھی وہ اسلام کے مقابلہ میں بالکل مایوس ہو کر بیٹھ جائیں گے اور کبھی پاگلوں کی طرح اُٹھ کر حملہ کرنا شروع کر دیں گے۔ حَمِيمًا وَّغَسَّاقًا والی حالت یہی ہوتی ہے کہ کبھی انسان جوش میں آ کر پاگلوں کی طرح کام کرنے لگ جائے اور کبھی ہمت ہار کر بیٹھ جائے۔ یہ دونوں حالتیں ایسی ہیں جو انسان کو کامیابی سے دُور رکھتی ہیں۔ نہ پاگلوں کی طرح حملہ کرنے والا جیت سکتا ہے اور نہ مایوسی کی حالت میں قوتِ عمل سے کام نہ لینے والا کبھی کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن فرماتا ہے جب اس حالت پر اَحْقَاب گزر جائیں گے تو اس کے بعد ان کو ہوش آ جائے گی اور وہ منظم طور پر مسلمانوں پر حملہ کرنا شروع کر دیں گے اُس وقت چونکہ مسلمان بھی اپنے بُرے اعمال کی وجہ سے اللہ تعالےٰ کے غضب کو بھڑکا چکے ہوں گے اس لئے ایک طرف اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور دوسری طرف کفر کا منظم حملہ۔ جب یہ دو چیزیں مل جائیں گی تو پھر کفار جیت جائیں گے۔

**۵۲۰ حل لغات** - لَا يَرْجُونَ :- رَجَا سے مضارع منفی کا جمع مذکر کا صیغہ ہے اور رَجَا الشَّيْءَ کے معنے ہیں أَمَّلَ بِهٖ - اس کی امید رکھی۔ خَافَ - کسی چیز سے ڈرا (اقرب) پس كَانُوا لَا يَرْجُونَ کے معنے ہوں گے (۱) وہ امید نہیں رکھتے تھے (۲) وہ ڈرتے نہ تھے۔

اَلْحِسَابُ : کے معنے ہیں اَلْعَدُّ : شمار کرنا۔ گننا۔ (اقرب)

**تفسیر** - آخرت کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہونگے کہ بعث بعد الموت پر چونکہ ان کو یقین نہیں تھا اس لئے وہ ایسے کام بھی نہیں کرتے تھے جو ان کو اگلی زندگی میں فائدہ پہنچانے والے ہوتے۔ اُن کے کاموں کی اصل غرض دنیوی حالات ہوا کرتے تھے صحیح محرّک اُن کے قلب میں نہیں تھا اس لئے وہ نیکی کو نہیں پا سکتے تھے۔ يَرْجُونَ کے معنے خوف کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور امید رکھنے کے بھی۔ اور آخرت کے لحاظ سے یہ دونوں معنے چسپاں ہو سکتے ہیں یعنی لَا يَرْجُونَ حِسَابًا وہ خوف نہیں کرتے تھے کہ ہمارے اعمال کی سزا ہم کو ملے گی یا وہ امید نہیں کرتے تھے کہ اگر ہم نیک اعمال کریں گے تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے اُن کا کوئی بدلہ ملے گا۔ اس لئے رَجَاء کا لفظ یہاں استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو ایک ہی وقت میں کئی کئی معنوں میں مستعمل ہو جاتے ہیں۔ یہاں بھی رَجَاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو دو معنوں کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی امید اور خوف۔ درحقیقت انسانی اعمال میں دو وجوہ سے ہی خرابی پیدا ہوتی ہے یا تو اس وجہ سے خرابی پیدا ہوتی ہے کہ بد اعمال کی سزا کا اُسے کوئی ڈر نہیں ہوتا اور یا اس وجہ سے خرابی پیدا ہوتی ہے کہ نیک اعمال کی جزاء کا اُسے کوئی یقین نہیں ہوتا۔ اِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا میں یہ دونوں باتیں بیان کر دی گئی ہیں یہ بھی کہ وہ اس بات سے نہیں ڈرتے تھے کہ اُن کے اعمال کا محاسبہ ہوگا اور یہ بھی کہ وہ امید نہیں رکھتے تھے کہ اگر وہ نیکی کریں گے تو انہیں اس کا کچھ بدلہ ملیگا۔ دنیوی زندگی کے متعلق اس آیت کو سمجھا جائے تب بھی یہ دونوں معنے چسپاں ہوتے ہیں یعنی قرآن مجید اور محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انہوں نے اس لئے تعلق پیدا نہیں کیا اور اس لئے وہ مغلوب اور مقہور بن گئے کہ انہیں اس امر کا ڈر نہ تھا کہ ان کو اُن کی

يَرْجُونَ کے دو معنے

لَا يَرْجُونَ حِسَابًا کے معنے آخرت کے لحاظ سے۔

رَجَا

اَلْحِسَابُ

## وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۝ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۝

اور ہمارے نشانات کو سختی کے ساتھ جھٹلاتے تھے ۲۱ اور ہم نے (تو) ہر ایک چیز کو (پوری) پوری طرح گن رکھا ہے ۲۲

بدیوں کی سزا ملے گی۔ وہ کہتے تھے کہ ہم کیوں میاں چھوڑیں ہمیں کسی کا ڈر نہیں ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی وہ اس امر کی بھی امید نہیں رکھتے تھے کہ انہیں نیک اعمال کا اچھا بدلہ ملے گا۔ اور اس وجہ سے نماز، روزہ اور دوسری اسلامی قیود کی طرف اُن کا دل مائل نہیں ہوتا تھا۔

لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا میں دشمنانِ اسلام کے اندر مایوسی پیدا ہو جانے کی طرف اشارہ۔

اسلام کے مقابلہ کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان آیات کا یہ مطلب ہے کہ اُن کے دلوں میں سخت بُغض اور کینہ ہوگا وہ پوری کوشش کریں گے کہ اسلام مٹ جائے اور وہ کسی خطرہ کی پروا نہیں کریں گے مگر ساتھ ہی لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا وہ کامیابی کی پوری امید نہیں رکھیں گے۔ اُن کے دلوں میں مایوسی پیدا ہو جائے گی اور وہ خیال کریں گے کہ اب کفر کو فتح حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور جس شخص کے اندر مایوسی پیدا ہو جائے اس کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو وہ پاگلوں کی طرح حملہ کرتا ہے یا پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے

كَذَّبُوْا

**۲۱ حل لغات۔** كَذَّبُوْا: كَذَّبَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور كَذَّبَ الْاَمْرَ تَكْذِيْبًا وَكِذَّابًا کے معنے ہیں اَنْكَرَهٗ وَجَحَدَهٗ کسی چیز کا شدت سے انکار کیا۔ جھٹلایا (اقرب) پس كَذَّبُوْا کے معنے ہوں گے۔ انہوں نے جھٹلایا۔ انکار کیا۔

كِذَّاب:۔ كَذَّبَ کا مصدر ہے جس کے معنے جھٹلانے کے ہوتے ہیں۔

**تفسیر۔** اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ ہمارے نشانوں کو سخت جھٹلایا کرتے تھے یعنی نشانوں کے جھٹلانے کی وجہ ایمان لانے کی طرف اُن کو کوئی توجہ نہیں تھی

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا کے دو معنے۔

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا۔ اگر شروع زمانہ کے کافروں کے متعلق سمجھا جائے تو اس لحاظ سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ چونکہ یہ لوگ ہماری ان پیشگوئیوں کو کہ اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا اور قیامت آئے گی نہیں مانتے تھے اس لئے گمراہ ہو گئے۔ قیامت پر یہ معنے اس طرح چسپاں ہو سکتے ہیں کہ چونکہ وہ قیامت کے منکر تھے اس لئے اُن کی یہ حالت ہوئی اور اگر کلام الٰہی یا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد لئے جائیں تو پھر یہ مطلب بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اُن نشانات کو نہ مانتے تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے۔ اسی طرح آیات سے مراد کلام الٰہی بھی ہو سکتا ہے۔ پس كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا کا یہ مطلب ہوگا کہ چونکہ کلام الٰہی سے ان کی فطرت کا جوڑ نہیں اس لئے وہ اس کا قطعی طور پر انکار کرتے ہیں۔

اَحْصٰی

**۲۲ حل لغات۔** اَحْصَيْنٰهُ: اَحْصٰی سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے۔ اور اَحْصَى الشَّيْءَ اِحْصَاءً کے معنے ہیں عَدَّهٗ کسی چیز کو گنا اور شمار کیا (اقرب) پس اَحْصَيْنٰهُ کے معنے ہوں گے۔ ہم نے اس کو گن لیا۔

كِتٰبًا: اَحْصٰی کا مفعول مطلق بھی ہو سکتا ہے اور حال بھی۔ مفعول مطلق ہونے کی صورت میں اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے ہر چیز کو پوری طرح گن رکھا ہے۔ اور حال ہونے کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اَحْصَيْنٰهُ حَالَ كَوْنِهَا كِتٰبًا اَيْ مَكْتُوْبًا۔ یعنی ہم نے ہر چیز کو اس حال میں گن چھوڑا ہے کہ وہ لکھی ہوئی ہے۔ کیونکہ کِتَاب بمعنے مَكْتُوْب بھی آتا ہے

کتاب کے معنے ہیں۔ مَا يُكْتَبُ فِيْهِ۔ وہ اوراق جن میں لکھا جاتا ہے۔ اَلْقَدْرُ۔ قدر۔ اَلْحُكْمُ۔ حکم۔ اَلْفَرْضُ۔ فرض اَلدَّوَاةُ۔ دوات (اقرب)

ــــــــــ

۵ اصل لفظی ترجمہ اس آیت کا یوں ہوگا کہ ہم نے ہر ایک شے کو گن رکھا ہے گن رکھنے پوری طرح۔ چونکہ "گن رکھا ہے" کا جملہ پہلے محذوف ہے اس لئے اردو میں اسکو ادا کرنے کے لئے پوری پوری طرح گن رکھا ہے ترجمہ کیا گیا ہے۔

# فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۝

پس (اپنے اپنے اعمال کے مطابق) عذاب چکھو۔ اور ہم تم کو (عذاب کے بعد)[ع۵] عذاب ہی دیتے چلے جائیں گے۔ ۵۲۳

**تفسیر**۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے ہر چیز کا اچھی طرح اندازہ کر رکھا ہے یا ہر چیز کو ہم نے ایک اندازہ کی جگہ میں محفوظ کر رکھا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ ایسی جگہ محفوظ ہیں جہاں سے کوئی چیز ضائع نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کوئی انسانی عمل ایسا نہیں جو ضائع ہو جاتا ہو بلکہ وہ ضرور کسی نہ کسی شکل میں محفوظ ہوتا ہے۔ ریڈیو کی ایجاد نے اس صداقت کا بہت بڑا ثبوت مہیا کر دیا ہے ہزاروں ہزار میل پر ایک شخص اپنی زبان سے کوئی لفظ نکالتا ہے تو فوراً ہم تک پہنچ جاتا ہے اور ہم گھر بیٹھے ہزاروں ہزار میل دور کی آواز اس طرح سُن لیتے ہیں جیسے وہ ہمارے پاس بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ مجھے خیال آیا کرتا ہے کہ کوئی تعجب نہیں اگر یہ علوم ترقی کرتے کرتے اس حالت کو پہنچ جائیں کہ گذشتہ زمانہ کی آوازوں کو بھی ریکارڈ کیا جا سکے۔ اگر کوئی ایسا آلہ نکل آئے تو ہو سکتا ہے ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وہ حدیثیں جو آج کتابوں میں پڑھتے ہیں خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبان سے سُن لیں۔ یہ بات موجودہ زمانہ کی ایجادات کو دیکھتے ہوئے اب ناممکن نظر نہیں آتی۔ زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے ممکن ہے آئندہ چل کر کوئی ایسا آلہ ایجاد ہو جائے اور گذشتہ زمانہ کو بھی اپنے کنٹرول میں لایا جا سکے۔ اس صورت میں ہمیں گذشتہ زمانہ کی آوازیں آسانی سے سُنائی دینے لگیں گی۔ ہم جس صدی کے جس سال کی کوئی بات سُننا چاہیں گے اُس صدی کے اُس سال پر اُس آلہ کو نصب کر دیں گے اور آوازوں کو سُننا شروع کر دیں گے کاش دنیا اس ترقی سے صداقت کی طرف آئے۔

کوئی انسانی عمل ضائع نہیں ہوتا

**۵۲۳ حل لغات**۔ اَلْعَذَابُ: اَلْعَذَابُ كُلُّ مَا شَقَّ عَلَى الْاِنْسَانِ وَمَنَعَهُ عَنْ مُرَادِهٖ۔ عذاب کے معنے ہیں ہر وہ چیز جو انسان پر شاق گزرے اور حصولِ مراد سے اُسے روک دے۔ وَفِي الْكُلِّيَّاتِ كُلُّ عَذَابٍ فِي الْقُرْاٰنِ فَهُوَ التَّعْذِيْبُ اِلَّا وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ فَاِنَّ الْمُرَادَ الضَّرْبُ اور کلیات میں لکھا ہے کہ لفظ عَذَاب سے مراد قرآن مجید میں "عذاب دینا" ہوتا ہے سوائے وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا کی آیت کے وہاں ظاہری سزا مراد ہے۔ (اقرب)

اَلْعَذَاب

اَلْعَذَابُ هُوَ الْاِيْجَاعُ الشَّدِيْدُ۔ عذاب کے معنے ہیں سخت تکلیف دینا۔ فَالتَّعْذِيْبُ فِي الْاَصْلِ هُوَ حَمْلُ الْاِنْسَانِ اَنْ يَّعْذِبَ اَيْ يَجُوْعَ وَيَسْهَرَ یعنی اگر مادہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کے معنے ہیں کسی کو بھوکا اور بیدار رکھنا۔ کیونکہ عَذَبَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں۔ اُس نے کھانا پینا ترک کر دیا۔ وَقِيْلَ اَصْلُهٗ مِنَ الْعَذْبِ: فَعَذَّبْتُهٗ اَيْ اَزَلْتُ عَذْبَ حَيٰوتِهٖ۔ بعض نے کہا ہے کہ عَذَاب عَذْبٌ سے نکلا ہے۔ جس کے معنے میٹھے پانی کے ہیں اور تَعْذِيْب کے معنے اور عَذَّبَ کے معنے ہیں کہ اُسے زندگی کی حلاوت سے محروم کر دیا (مفردات) پس عَذَاب کے معنے ہوئے (۱) تکلیف (۲) ایسی چیز جو زندگی کی حلاوت سے محروم کر دے (۳) جو مقصودِ حیات سے محروم کر دے۔

ع۵ یہ مراد نہیں کہ عذاب بڑھتا چلا جائے گا بلکہ مراد یہ ہے کہ جب ایک قسم کا عذاب ختم ہو گا تو پھر دوسرا عذاب شروع ہو جائیگا یعنی جب تک کامل بخشش نہ ہوگی عذاب میں وقفہ نہ ہو گا۔ اس مضمون کو ادا کرنے کے لئے ہم نے اوپر کا ترجمہ کیا ہے۔

**تفسیر**۔ مقہور قوموں کا دنیا میں یہی نقشہ ہوتا ہے جو اس آیت میں کھینچا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عذاب اُن سے ٹلیگا نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ مقہور قومیں جب اپنی آزادی کے لئے کوشش کرتی ہیں تو وہ اور زیادہ عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور جب تک اُن کے غلبہ کا زمانہ نہیں آتا

# اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ۝

یقیناً متقیوں کے لئے کامیابی مقدر ہے ۲۴؎

ان کی ہر کوشش اپنے مقصد سے اور زیادہ دور کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جنگ میں انگریز بار بار بلجیم اور فرانس والوں سے کہہ رہے ہیں کہ تم جلدی اُٹھنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تم جلدی اُٹھنے کی کوشش کرو گے تو اَور زیادہ مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے چنانچہ جب بھی وہ اپنی آزادی کے لئے کوشش کرتے ہیں جرمن اُنہیں اور زیادہ تکلیفیں دینی شروع کر دیتے ہیں۔ پس فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا کا یہ مطلب ہے کہ جب تک اسلام کے غلبہ کا زمانہ ہے تمہاری کوششیں بیکار رہیں جب تک خاموشی سے بیٹھے رہو گے بیٹھے رہو گے لیکن جب تھوڑے کام لے کر مسلمانوں کے مقابلہ میں اُٹھو گے اُس وقت تم اپنا ہی نقصان کرو گے اسلام اور مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکو گے

مَفَاز

فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ میں اسلام کے دشمنوں کی ناکامی کی طرف اشارہ۔

قیامت کے لحاظ سے بھی یہ معنے ٹھیک ہیں۔ انسان پر جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے اس کی تکلیف بڑھتی جاتی ہے پہلے دن بخار کی حالت اَور ہوتی ہے دوسرے دن اَور۔ اور جب بخار لمبا ہو جائے تو مریض کی بالکل اَور حالت ہو جاتی ہے۔ پس عذاب کا زمانہ جتنا لمبا ہوتا چلا جائے گا اُن کی تعذیب بھی بڑھتی چلی جائے گی۔

پس اس آیت سے یہ مراد نہیں کہ اُن کی نجات نہیں ہوگی بلکہ مراد یہ ہے کہ عذاب کے وقت وہ عذاب میں ہی ترقی کریں گے جوں جوں مرض بڑھتی ہے تکلیف بھی بڑھتی جاتی ہے اور ضعف بھی زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے لیکن اس کے خلاف کبھی عذاب برداشت کرنے کی عادت بھی بڑھ جاتی ہے مگر اُس کا علاج اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ بتا دیا کہ جب اُنہیں عذاب کی عادت ہو جائے گی تو اُن کو نئی جلدیں دے دی جائیں گی۔

فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا کے دنیوی لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ مسلمان روز بروز ترقی کرتے چلے جائیں گے اور جوں جوں وہ ترقی کریں گے کفار و مشرکین اُن کے مقابلہ میں روز بروز دبتے چلے جائیں گے۔

**۲۴؎ حل لغات۔** مَفَازٌ فَازَ کا مصدر بھی ہو سکتا ہے اور ظرف مکان کا صیغہ بھی۔ اور فَازَ (يَفُوْزُ فَوْزًا) کے دو معنے ہوتے ہیں۔ ایک فَازَ مِنْ مَكْرُوْهٍ اور ایک فَازَ بِخَيْرٍ۔ فَازَ مِنْ مَكْرُوْهٍ کے معنے ہوتے ہیں نَجَا یعنی وہ بُری بات سے بچ گیا اور فَازَ بِخَيْرٍ کے معنے ہوتے ہیں ظَفَرَ بِهٖ اچھی بات اس کو حاصل ہو گئی۔ (اقرب) مفردات میں ہے اَلْفَوْزُ: اَلظَّفَرُ بِالْخَيْرِ مَعَ حُصُوْلِ السَّلَامَةِ۔ یعنی کسی کا بہترین مقصود کو اس طور پر پا لینا کہ وہ ہر قسم کے نقصان سے بھی محفوظ رہے فَوْز کہلاتا ہے۔ (مفردات) پس اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا کے معنے ہوئے (۱) کہ متقیوں کو کامیابی حاصل ہو گی یعنی وہ تمام قسم کی بھلائیوں کو پا لیں گے اور تمام مصائب سے اُنکو نجات مل جائے گی (۲) یہ کہ متقیوں کو یقیناً خدا ایک ایسا مقام عطا فرمانے والا ہے جہاں وہ مصائب سے نجات پا جائیں گے اور تمام قسم کی برکات اور کامیابیوں کو حاصل کر لیں گے۔ ایک مقام تو اُخروی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ اس مقام میں نہ کسی قسم کا شر ہے اور نہ وہاں خیر کی کوئی کمی ہے بلکہ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ (الشوریٰ ع ۲) یعنی جو کچھ وہ چاہیں گے اس میں انکو حاصل ہو جائے گا۔ پس ایک تو وہ مقام ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی بعث بعد الموت والی زندگی۔ دوسرے اس دنیا میں بھی مومنوں سے یہ وعدہ ہوتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن ع ۳) کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے مقام سے ڈرتا ہے اُس کے لئے اِس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ جنت کے سامان پیدا کر دیتا ہے اور اگلے جہان میں بھی وہ اس کیلئے جنت کے سامان پیدا کرے گا۔

**تفسیر۔** میں بتا چکا ہوں کہ اس سورۃ میں غلبۂ اسلام

کا بھی ذکر ہے اور قرآن کریم کے غلبہ کا بھی اس میں ذکر ہے۔ پس اس میں پیشگوئی کی گئی ہے کہ مومنوں کے لئے مکروہات سے نجات حاصل کرنیکے سامان پیدا ہو جائینگے اور ان کو ایسی جگہیں عنایت ہوں گی جو مقامِ نجات یا مقامِ کامیابی کہلانے کی مستحق ہوں گی۔ یہ پیشگوئی ایسے وقت کی گئی تھی جب مسلمانوں کے لئے کسی قسم کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے یہ سورۃ مکی ہے اور مکی بھی ابتدائی زمانہ کی ہے۔ اُس وقت اسلام میں صرف دس بارہ آدمی شامل تھے اور ان کو کفار کی طرف سے ایسی ایسی تکالیف دی جاتی تھیں جن کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ غلام جو ابتدائی زمانہ میں مسلمان ہو گئے تھے کفارِ مکہ اُن کو تپتی ریت پر عرب جیسے گرم علاقہ میں لٹا دیتے اور جب اس کے نتیجہ میں بھی وہ اسلام سے بیزاری کا اظہار نہ کرتے تو تپتے ہوئے پتھر اُن کے سینہ پر رکھ دیتے بلکہ بعض دفعہ کوئی آدمی اُن کے سینہ پر چڑھ جاتا۔ پھر بعض کے پاؤں میں رسی باندھ کر انہیں مکہ کی گلیوں میں گھسیٹا جاتا۔ وہاں عام طور پر بارشوں کے اثر سے اپنے مکانات کو بچانے کیلئے دروازوں کے آگے بڑے بڑے پتھر رکھ دیتے تھے۔ جن کو کھنگر کہتے ہیں تاکہ بارش کی وجہ سے دیواریں خراب نہ ہوں۔ کفارِ مکہ کی عادت تھی کہ وہ مسلمانوں کو جب دکھ دیتے اور ان کی ٹانگوں میں رسی باندھ کر مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے تو ان کھنگروں پر سے بھی اُن کو گھسیٹتے ہوئے چلے جاتے اور اُن کے جسم لہولہان ہو جاتے۔ ایک صحابی خباب بن ارتؓ نے جو پہلے غلام تھے اور غلامی کی حالت میں اسلام قبول کرنے کی وجہ سے انہیں بڑی بڑی تکالیف دی گئی تھیں آئندہ فتوحات کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن سے مشرکوں کی ایذا دہی کے متعلق دریافت کیا تب انہوں نے اپنی پیٹھ پر سے کپڑا اٹھایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ انکی پیٹھ کی کھال ایسی تھی جو عام انسانوں کی نہیں ہوتی۔ وہ دیکھ کر حیران ہوئے اور کہنے لگے کیا آپ کو یہ کوئی بیماری ہے؟ وہ کہنے لگے بیماری نہیں بلکہ پتھروں پر ہمیں جو گھسیٹا جاتا تھا اس کی وجہ سے زخم و خراش ہو ہو کر میری پیٹھ کا چمڑا ایسا ہو گیا۔ (اسد الغابہ)

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ۔ میں مسلمانوں کو مصائب سے نجات ملنے کی پیشگوئی۔

یہ حالات تھے جو مسلمانوں پر وارد ہو رہے تھے اُدھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ حالت تھی کہ آپؐ باہر نکل کر نماز بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ حضرت اُمِ ہانی رضؓ کے مکان میں آپ چند ساتھیوں کو لے کر جمع ہوتے۔ نماز پڑھتے اور دین کی باتیں کرتے۔ کھلے میدان میں آپ کا نمازیں پڑھنا یا دین کی باتیں کرنا بالکل ناممکن تھا۔ اسی طرح قرآن کریم کو باہر نکل کر پڑھنا یا اپنے صحن میں ہی بلند آواز سے پڑھنا۔ یہ بھی جرم سمجھا جاتا تھا جب مصائب حد سے بڑھ گئے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہؓ آپ سے اجازت لے کر مکہ مکرمہ سے باہر جانے شروع ہو گئے۔ ایک دفعہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی ہجرت کا ارادہ کیا۔ وہ اپنا سامان لے کر جا رہے تھے کہ مکہ کا ایک رئیس ابن الدغنہ انہیں ملا۔ اُس نے آپ سے پوچھا کہ آپ اسباب باندھکر کہاں جا رہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ چونکہ اس جگہ دین کی آزادی نہیں ہے اور میری قوم دشمنی کرتی ہے اس لئے میں مکہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اُس نے کہا وہ شہر کس طرح آباد رہ سکتا ہے جس میں سے آپ جیسا آدمی نکل جائے۔ میں آپ کا ضامن ہوں آپ باہر نہ جائیں۔ چنانچہ اُس نے اعلان کر دیا کہ (حضرت) ابو بکر رضؓ میری حفاظت میں ہیں۔ اہلِ عرب میں بہت بڑی خودسری پائی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود ان میں یہ خوبی تھی کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کو اپنی حفاظت اور پناہ میں لے لیتا تو پھر اُسے کوئی شخص تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا اور اگر کوئی پہنچانا چاہتا تو دوسرے اُسے روک دیتے کہ تم ایسا مت کرو یہ فلاں شخص کی حفاظت میں ہے۔ اُس نے بھی جب اعلان کر دیا کہ ابو بکر رضؓ میری حفاظت میں ہے تو حضرت ابو بکر رضؓ اطمینان کے ساتھ مکہ میں رہنے لگ گئے۔ ایک دن وہ اپنے صحن میں باہر نکل کر قرآن شریف پڑھ رہے تھے کہ ان پر رقت غالب آگئی اور ان کے آنسو بہنے شروع ہو گئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے کَانَ رَجُلًا بَکَّاءً یعنی اُن کو قرآن شریف پڑھتے وقت بہت رقت آجایا کرتی تھی اور وہ رو پڑتے تھے۔ اُن کے قرآن شریف پڑھنے کی آواز سن کر بچے اور عورتیں اردگرد کے گھروں سے نکل کر وہاں جمع ہو جایا کرتی تھیں۔

ابتدائی مسلمانوں پر تکالیف کا زمانہ

بچوں اور عورتوں میں خصوصیت سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ جب انہیں کوئی نئی چیز نظر آئے تو دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ اُن کے لئے بھی قرآن شریف بالکل نیا کلام تھا اور پھر جب کوئی بڑا آدمی رو رہا ہو تو لازماً دوسروں کو توجہ پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے دروازوں سے لگ کر قرآن شریف سُننا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ جب قرآن کریم کی آواز اُن کے کانوں میں گئی اُدھر حضرت ابو بکرؓ کی رقت اور اُن کے گریہ کو دیکھا تو محلہ کی عورتیں بھی متاثر ہونے لگیں اور اس طرح اس محلہ میں جس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ رہتے تھے اسلام کا چرچا شروع ہو گیا اور عورتوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو بڑی اچھی باتیں ہیں جب اُن کے خاوندوں کو علم ہُوا کہ ہماری عورتیں اس طرح متاثر ہو رہی ہیں تو وہ اس رئیس کے پاس گئے جس نے انہیں اپنی حفاظت میں لیا تھا اور کہا کہ آپ نے ابو بکرؓ کو اپنی حفاظت میں لے کر یہ کیا مصیبت پیدا کر دی ہے کہ ہماری عورتیں اور بچے قرآن سے متاثر ہوتے جا رہے ہیں اگر یہی حالت جاری رہی تو تمام محلہ مسلمان ہو جائے گا۔ پس یا تو اُسے سمجھائیں کہ وہ قرآن شریف بلند آواز سے نہ پڑھا کرے اور یا اپنی حفاظت واپس لے لیں۔ وہ رئیس حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ آپ اِس اِس طرح کیتے ہیں جس پر محلہ والے سخت شکوہ کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہی طریق جاری رہا تو ہماری عورتیں اور بچے مسلمان ہو جائیں گے۔ اس لئے آپ یہ کام چھوڑ دیں اور اندر بیٹھ کر قرآن شریف پڑھا کریں ورنہ مجھے اپنی حفاظت کو واپس لینا پڑے گا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ اپنی حفاظت بے شک واپس لے لیں میں اللہ اور اس کے رسول کی حفاظت میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ (تاریخ خمیس جلد اول و بخاری مصری جلد دوم کتاب مناقب الانصار باب الہجرت) چنانچہ ابن الدغنہ وہاں سے آیا اور اُس نے اپنی حفاظت واپس لینے کا اعلان کر دیا۔ بعد میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے بھی ہجرت کے متعلق بدل گئی اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ جب آپ کو ہجرت کی اجازت ہو اُسوقت مجھے بھی آپ اپنے ساتھ لے چلیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کو منظور فرما لیا۔ ان حالات میں مسلمان مکہ کے اندر اپنی زندگی کے دن بسر کیا کرتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اگر مکہ والوں کے مظالم کی مثالیں جمع کی جائیں تو وہ سینکڑوں کی تعداد میں نکل آئینگی جن سے نہ صرف اُن مظالم کا پتہ لگ سکتا ہے جو اہل مکہ مسلمانوں پر کیا کرتے تھے بلکہ لوگوں کو یہ سبق بھی مل سکتا ہے کہ انہیں دین کی خاطر کس طرح قربانیوں سے کام لینا چاہیئے۔ اس زمانہ میں جب مسلمان انتہائی تکلیف میں اپنی زندگی بسر کر رہے تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا۔ یقیناً یقیناً جو مسلمان اور متقی ہیں اُن کی مکروہات ایک دن دُور ہو جائیں گی اور وہ تکلیف دہ باتیں جو آج پیدا ہو رہی ہیں خدا اُن سب کو مٹا دے گا اور وہ جگہیں اُن کو حاصل ہوں گی جہاں مکروہات اُن کے قریب بھی نہیں پھٹکیں گی۔ جہاں کامیابی اُن کے پاؤں چُومیگی اور جہاں آرام اور آسائش کے دروازے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کیلئے کھول دئے جائیں گے۔ چنانچہ پہلے خدا نے حبشہ کو مَفَاز بنایا۔ مسلمان وہاں ہجرت کر کے گئے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے ہر قسم کے سامانِ راحت بہم پہنچا دئے۔ یہ سورۃ چونکہ ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے اس لئے حبشہ کی ہجرت سے بھی پہلے کی ہے۔ حبشہ کی ہجرت ۵ نبوی کے نصف میں ہوئی (کامل ابن اثیر) اور یہ سورۃ پہلے دو تین سال کی ہے۔ پس اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا کے مطابق پہلا مقامِ فوز جو مسلمانوں کے لئے ظاہر ہُوا وہ حبشہ ہے۔ چنانچہ حبشہ میں خدا تعالیٰ کی نصرت اور اس کی تائید کا کیسا زبردست نشان ظاہر ہُوا۔ دشمن نے چاہا کہ حبشہ پہنچکر بھی مسلمانوں کو مبتلائے آلام کرے اور انہیں اس ملک میں بھی آرام اور چین سے نہ رہنے دے۔ مگر وہ خدا جس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ متقیوں کو ہر قسم کی مکروہات سے بچا کر ایسے مقام پر لے جائیگا جو اُن کے آرام اور سکون کا موجب ہو گا اُس نے کفارِ مکہ کو اپنی اس کوشش میں ناکام کیا اور مسلمان اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق حبشہ میں نہایت آرام اور عزت کے ساتھ رہے۔ چنانچہ تاریخوں میں آتا ہے جب مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گئے

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا کی پیشگوئی کے مطابق مسلمانوں کی ہجرت کا پہلا مقام۔

تو عمرو بن العاص اور مکہ کا ایک اور رئیس عبداللہ ابن ابی ربیعہ دونوں حبشہ گئے۔ ان کو مکہ والوں نے اس غرض کے لئے مقرر کیا تھا کہ تم جاؤ اور حبشہ کے بادشاہ سے یہ عرض کرو کہ یہ لوگ ہمارے بھاگے ہوئے غلام ہیں اگر آپ ان کو پناہ دیں گے تو ہمارے تعلقات آپ سے اچھے نہیں رہیں گے۔ یہ لوگ حبشہ گئے اور اپنے ساتھ وہ بڑے بڑے تحفے بھی لے گئے جو اُن کی قوم کے لوگوں نے بادشاہ اور اس کے وزراء اور پادریوں وغیرہ کے لئے دئے تھے اور کہا تھا کہ یہ تحفے بادشاہ کو دینا۔ یہ وزراء کے سامنے پیش کرنا اور یہ پادریوں وغیرہ کو دینا۔ چنانچہ یہ لوگ بڑی شان کے ساتھ حبشہ پہنچے اور ہر ایک کے سامنے انہوں نے تحائف پیش کئے پہلے تو بادشاہ نے بڑا اعزاز کیا مگر جب انہوں نے تجویز پیش کی کہ یہ لوگ ہمارے ملک میں سے بھاگے ہوئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ واپس بھیج دیا جائے اور اس کی سفارش بادشاہ کے وزراء نے بھی کی۔ مگر بادشاہ نے کہا۔ کہ جب تک وہ مسلمانوں کو بلا کر ان کے حالات دریافت نہ کر لے وہ کسی کو اپنے ملک سے نہیں نکال سکتا۔ چنانچہ بادشاہ نے مسلمانوں کو بلوایا اور پوچھا کہ آپ لوگوں کے کیا عقائد ہیں؟ تب مسلمانوں کے نمائندہ جعفر بن ابی طالب نے قرآن کریم کی چند آیات پڑھیں جن میں اسلامی عقائد کا ذکر آتا تھا اور یہ بھی کہ مسلمان حضرت مسیحؑ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں بادشاہ نے وہ آیات سُن کر کہا کہ میں تو ان عقائد میں کوئی بُری بات نہیں دیکھتا۔ دوسرے دن پھر دونوں سردار قریش دربار میں آئے اور کہا۔ کہ اے بادشاہ! یہ مسلمان مسیح کی ہتک کرتے ہیں تب اُس نے مسلمانوں کو طلب کیا اور اُن کا جواب سننے پر دربار میں اُس نے ایک تنکا اٹھایا اور اُسے اٹھا کر کہنے لگا جو کچھ ان لوگوں نے حضرت مسیحؑ کے متعلق بیان کیا ہے میں اُس سے ایک تنکے کے برابر بھی مسیحؑ کو زیادہ نہیں سمجھتا اُن کا وہی رتبہ سمجھتا ہوں جو انہوں نے بیان کیا ہے۔ اس پر اُس کے درباری بہت چیں بجبیں ہوئے لیکن بادشاہ نے کہا جب میرا باپ مرا تھا میں بچہ رہ گیا تھا تم لوگوں نے میرے چچا کے ساتھ مل کر چاہا کہ اس حکومت پر قبضہ کر لو۔ تب خدا نے اپنے فضل سے مجھے طاقت بخشی اور اُس نے تم کو شکست دے کر مجھے اس تخت پر بٹھا دیا۔ جس خدا نے مجھ کو اس بیکسی کی حالت میں بادشاہت کے تخت پر بٹھا دیا اور میرے دشمنوں کو ناکام و نامراد کیا اُس خدا کی نصرت پر مجھے آج بھی یقین ہے اور آج جب مجھے اُس نے طاقت بخشی ہے میں یہ بے شرمی نہیں کر سکتا کہ اُس کے مظلوم بندوں کی مدد نہ کروں۔ اگر تم سارے اس کو بُرا بھی مناؤ تب بھی میں اُن کو یہاں سے نہیں نکالوں گا۔ چنانچہ سرداران قریش جو تحفے تحائف لائے تھے ان کو وہ واپس کر دئے گئے اور وہ ناکام و نامراد واپس لوٹے (تاریخ خمیس جلد اوّل) غرض اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا (یعنی متقیوں کو کامیابی اور نجات کا مقام ملنے والا ہے) کا نہایت ہی شاندار نظارہ صحابہؓ نے وہاں دیکھا اور انہوں نے اس خدائی وعدہ کو پورا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کو ایسی جگہ دیگا جہاں مکہ والوں سے یہ لوگ نجات پا جائیں گے اور آرام اور راحت کو دیکھیں گے۔ پھر دوسرا نظارہ اس کا مدینہ میں نظر آیا جبکہ مسلمان وہاں گئے اور اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے لوگوں کی توجہ مسلمانوں کی طرف پھیر دی۔ ابتدا میں صرف چند لوگ مکہ میں حج کے لئے آئے تھے کہ انہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر پہنچی اور وہ آپ پر ایمان لے آئے۔ دوسرے سال بعض اور لوگ مدینہ کے حاجیوں میں سے ایمان لے آئے۔ اور انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں تیسرے سال ایک وفد ۷۲ آدمیوں پر مشتمل بھیجا جس نے یہ اقرار کیا کہ مدینہ میں آپؐ پر اور آپ کے ساتھیوں پر اگر کوئی دشمن حملہ کرے گا تو ہم اُس سے لڑیں گے اور آپ کی حفاظت کریں گے۔ چنانچہ اس معاہدہ کے مطابق رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ مدینہ تشریف لے گئے (ابن ہشام) حبشہ میں جو مسلمان ہجرت کر کے گئے تھے وہ بھی اس دوران میں واپس آ کر مدینہ پہنچ گئے۔ اسی لئے وہ اصحاب الہجرتین کہلاتے ہیں یعنی دو ہجرتیں کرنے والے۔ کیونکہ انہوں نے حبشہ کی طرف بھی ہجرت کی اور مدینہ کی طرف بھی۔ پھر مدینہ کے لوگوں نے جس جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین کی حفاظت کی یہ تاریخ کا ایک شاندار ورق ہے اور

قرآن کریم کی اس پیشگوئی کی صداقت کا ایک زبردست ثبوت ہے کہ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا یقیناً ہم متقیوں کو وہ جگہ دیں گے جہاں وہ مکروہات سے بچ جائیں گے اور کامیابیوں کا مونہہ دیکھیں گے۔ چنانچہ پہلا مَفَازًا اللہ تعالیٰ نے حبشہ کو بنایا اور دوسرا مَفَازًا اللہ تعالیٰ نے مدینہ کو بنایا۔ ابتدائی سالوں کی تمام اسلامی تاریخ اسی آیت کی تشریح ہے۔ حبشہ کا سفر اور مدینہ کے ابتدائی ایام کی تاریخ سب کی سب اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا والی پیشگوئی کے پورا ہونے کا ایک نہایت ہی روشن اور زبردست ثبوت ہے۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا میں کہ جو پیشگوئی کے مطابق مسلمانوں کے لئے دوسرا نجات کا مقام۔

دوسرے معنے اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا کے یہ ہیں کہ متقیوں کو ہم کامیاب و بامراد کریں گے۔ یہ معنے بھی مدینہ منورہ میں پورے ہوئے۔ اور پھر صرف مدینہ منورہ ہی نہیں بلکہ مدینہ منورہ کے بعد سارا عرب اور پھر ساری وسطی دنیا اس پیشگوئی کی صداقت کا ایک نشان تھی کہ کس کس طرح یہ لوگ بامراد ہوئے اور کس کس طرح انہوں نے کامیابیاں حاصل کیں۔ ہر قوم جو ان کے مقابلہ میں اٹھی اُسے شکست ہوئی۔ ہر طاقت جو مسلمانوں سے ٹکرائی وہ ذلیل ہوئی۔ قیصر و کسریٰ کے خزانے فتح ہوئے اور وہ ان مسلمانوں کو ملے۔ مدینہ منورہ ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں گھر میں بھی باامن طور پر رہنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ چنانچہ اسی لئے مسلمان یہود سے مختلف معاہدات کرتے رہے تاکہ وہ غداری نہ کریں اور مسلمانوں کے ضعف کا موجب نہ بنیں۔ مگر وہ چھوٹی سی بستی ایک دن ساری دنیا کا مرکز بن گئی۔ اگر مدینہ منورہ سے کوئی حکم نکلتا تھا تو ساری دنیا کانپ اٹھتی تھی۔ اور وہ سمجھتی تھی کہ اس حکم کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر مدینہ منورہ ہی وہ بستی تھی جہاں ایک دن قیصر و کسریٰ کے خزانے آئے اور مسلمانوں میں تقسیم ہوئے یہاں تک کہ اسی مدینہ میں کسریٰ کے سونے کے کنگن ایک صحابی سراقہ بن مالکؓ کے ہاتھوں میں پہنائے گئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ ہجرت کے سفر میں اُن سے کہا تھا میں تمہارے ہاتھ میں سونے کے کنگن دیکھتا ہوں۔ جب کسریٰ کی حکومت تباہ ہوئی اور اس کے سونے کے کنگن مدینہ میں آئے تو حضرت عمرؓ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے جبری طور پر اس صحابی کے ہاتھ میں سونے کے کنگن ڈالے (اصابہ جلد ۳) اب کجا مدینہ منورہ جو ایک چھوٹی سی بستی تھی اور کجا کسریٰ کے سونے کے کنگن جو ایک غریب صحابی کے ہاتھوں میں پہنائے گئے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے مَفَازٌ کا لفظ ہلاکت سے نجات کی جگہ کے معنوں کے رُو سے تو حبشہ اور مدینہ پر صادق آتا ہے لیکن دوسرے معنوں یعنی کامیابی کے معنوں کے رُو سے مدینہ ہی مَفَازٌ ثابت ہوا۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا تو اس کے معنے یہ تھے کہ میں تم کو مدینہ منورہ دینے والا ہوں جو مقام فوز ہے سو اس آیت میں گو ہجرت اُولیٰ کی بھی پیشگوئی تھی مگر زیادہ وضاحت اور شان سے ہجرت ثانیہ کی پیشگوئی تھی۔

ایک یورپین مصنف مدینہ کی اس حالت کو دیکھ کر ایسا متاثر ہوا ہے کہ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے تم کچھ کہہ لو محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں کو۔ لیکن میں تو جب یہ بات دیکھتا ہوں کہ مدینہ میں ایک چھوٹی سی مسجد میں جس پر کھجور کی ٹہنیوں کی چھت پڑی ہوئی ہے جب بارش ہوتی ہے تو اُس میں سے پانی ٹپک پڑتا ہے نماز پڑھتے ہیں تو اُن لوگوں کے گھٹنے اور ماتھے کیچڑ سے لت پت ہو جاتے ہیں۔ اُس مسجد میں ننگی زمین پر بیٹھے ہوئے ایسے آدمی جن کے نہ سروں پر ٹوپیاں ہیں نہ اُن کے تن پر پورا لباس ہے دنیا کو فتح کرنے کا مشورہ کر رہے ہیں اور وہ اس یقین اور وثوق کے ساتھ یہ باتیں کرتے ہیں کہ گویا دنیا کو فتح کرنا ان کے لئے معمولی بات ہے کیونکہ اُن کے نزدیک یہ خدا کا وعدہ ہے جو کبھی ٹل نہیں سکتا۔ اور پھر وہ ایسا ہی کر کے دکھا دیتے ہیں۔ تو اس بات کو دیکھکر میرا دل یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میں ان کو جھوٹا اور فریبی کہوں۔ تو اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا میں جو پیشگوئی کی گئی تھی کہ مسلمانوں کو وہ مقام ملے گا جو ان کی کامیابیوں اور فتوحات کا مرکز ہوگا۔ پہلے وہ انہیں مکروہات سے نجات دلائے گا اور پھر اُن کو کامیابیوں اور فتوحات سے حصہ دیگا۔ اس پیشگوئی کا نظارہ مدینہ منورہ سے بڑھ کر اور کہیں نظر نہیں

# حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ۙ

(یعنی) باغات اور انگور ۲۵

آسکتا۔ مدینہ منورہ سے بڑھ کر اور کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جو ایسا مرکز بنا ہو جیسے مدینہ اسلام کا مرکز بنا کوئی کہہ سکتا ہے کہ لنڈن اور برلن اور پیٹرس برگ وغیرہ بھی بڑے بڑے مرکز ہیں ان کے مقابلہ میں مدینہ کی مرکزی حیثیت کس طرح پیش کی جاسکتی ہے مگر وہ کہنے والا یہ نہیں سمجھتا کہ یہ مقامات وہ ہیں جنہیں پہلے سے طاقت حاصل تھی۔ مگر مدینہ وہ مقام تھا جسے کوئی طاقت حاصل نہیں تھی مگر پھر بھی وہ ساری کامیابیوں کا مرکز بن گیا اور اس زمانہ کی پیشگوئی کے مطابق بنا جب مسلمانوں کیلئے سر چھپانے کی جگہ بھی نہ تھی۔

**۲۵ حل لغات۔** حَدَآئِق: حَدِیْقَةٌ کی جمع ہے اور اَلْحَدِیْقَةُ کے معنے ہیں اَلْبُسْتَانُ یَکُوْنُ عَلَیْهِ حَائِطٌ۔ وہ باغ جس کے اردگرد دیوار ہو (اقرب)

اَعْنَاب: عِنَبٌ کی جمع ہے اور عِنَبٌ کے معنے انگور کے ہوتے ہیں یعنی انگور کے پھل کو عربی زبان میں عِنَبٌ کہتے ہیں اور کَرْمٌ انگور کی بیل کو کہا جاتا ہے لیکن عِنَبٌ انگور کو اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ وہ تازہ ہو اگر وہ خشک ہو جائے تو اُسے زَبِیْب کہتے ہیں (اقرب) نیز عِنَبٌ شراب کو بھی کہتے ہیں (اقرب) کیونکہ عِنَب سے ہی شراب بنتی ہے۔ دراصل کسی چیز کا جب کسی دوسری چیز میں کوئی غالب اثر آجائے تو اس کا نام بعض دفعہ اُسی کے نام پر رکھ دیتے ہیں۔ عِنَب سے چونکہ خَمْر بنتی ہے اس لئے عربی زبان میں عِنَب کے ایک معنے خَمْر کے بھی کئے جاتے ہیں۔

**تفسیر۔** حَدَآئِق بدل ہے مَفَازًا کا۔ لیکن میرے نزدیک یہ بدلِ کل نہیں بلکہ بدلِ اشتمال ہے یعنے کچھ جزئیات اس کی بتائی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ متقیوں کو جو مَفَازًا حاصل ہوگا اس کی کچھ تشریحات ہم تم کو بتلاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ متقیوں کو حَدَآئِق یعنی باغات ملیں گے۔ حَدَآئِق حَدِیْقَة کی جمع ہے اور یہ حدیقے گھر میں نہیں ہوتے مدینہ میں ہی ہوتے ہیں گویا ان الفاظ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا نقشہ کھینچ دیا کیونکہ حَدَآئِق مدینہ میں ہُوا کرتے ہیں۔ بعد میں بے شک ساری دنیا ہی مسلمانوں کے لئے حَدِیقہ بن گئی لیکن جہاں تک ظاہری الفاظ کا سوال ہے یہ نقشہ مدینہ پر ہی چسپاں ہوتا ہے۔ لغت کے لحاظ سے حَدِیْقہ اُس باغ کو کہا جاتا ہے جس کے اردگرد دیوار ہو (اقرب) اور مدینہ میں اس کا عام رواج تھا۔ چنانچہ حدیثوں میں آتا ہے۔ کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران ع) تو ابو طلحہ رضؓ انصاری نے سب سے پہلے اپنا حَدِیْقہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے اَحَبُّ المال یہ حَدِیْقہ ہے (بخاری مصری جلد سوم کتاب التفسیر و ترمذی جلد دوم کتاب التفسیر) اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضؓ کی ایک روایت میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دفعہ بعض اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک حضورؐ اُٹھ کر چلے گئے جب آپ کو واپس آنے میں دیر ہوگئی تو میرے دل میں سخت گھبراہٹ پیدا ہوئی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنی دیر کیوں لگادی ہے ایسا نہ ہو کہ کسی دشمن نے آپ کو نقصان پہنچا دیا ہو۔ چنانچہ میں آپ کی تلاش میں انصار کے ایک حَدِیْقہ کی طرف چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس حَدِیْقہ کا پھاٹک بند کر لیا تھا کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں جب مجھے اس باغ کے اندر جانے کا اور کوئی راستہ نہ ملا تو میں اُس کی نالی میں سے اندر داخل ہُوا جیسے لومڑ کسی تنگ جگہ میں سے اندر داخل ہوتا ہے (مسلم کتاب الایمان) غرض حَدَآئِق کا رواج مدینہ والوں میں بہت زیادہ تھا۔ پس اللہ فرماتا ہے کہ اس پیشگوئی

حَدَآئِق

اَعْنَاب

حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا کے الفاظ سے مدینہ کی تعیین

کے مطابق جو مقامِ فوز مسلمانوں کو ملنے والا ہے اسکی علامت یہ ہے کہ اس میں حَدَائِق ہوں گے اور اس میں اَعْنَاب ہوں گے۔

حَدَائِق سے مراد مسلمانوں کی منظم حکومت

حَدَائِق کہہ کر بتایا کہ اُن کا اپنا اپنا علاقہ ہوگا اور اُس پر انہیں قبضۂ تامہ حاصل ہوگا۔ کیونکہ حدیقہ وہی ہوتا ہے جو دوسروں سے الگ ہو اگر حَدِیْقَہ کے ارد گرد دیوار نہو تو یہ شبہ رہتا ہے کہ اِس کی سرحد کونسی ہے اور اُس کی سرحد کونسی ہے۔ پس جب مومنوں کے لئے اللہ تعالےٰ نے حَدَائِق کے لفظ کا استعمال فرمایا تو اگر اس سے وہ ساری حکومت مراد لی جائے جو مسلمانوں کو ملنے والی تھی اور یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی آئندہ حکومت کا نام اس جگہ حَدِیْقَہ رکھا ہے تب اس کے یہ معنے ہوں گے کہ مسلمانوں کی حکومت نہایت منظم ہوگی اور اس کی سرحدیں مضبوط ہوں گی جیسے باغ کے ارد گرد دیواریں ہوتی ہیں۔ اور وہ ان دیواروں کی وجہ سے محفوظ ہوتا ہے اسی طرح مسلمانوں کی حکومت منظم ہوگی اور اس کی سرحدیں مضبوط ہوں گی۔ اسی کے متعلق قرآن کریم نے دوسری جگہ ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا (آل عمران ع ۲۰) کہ اے ایمان دارو صبر سے کام لو۔ اور دشمن سے بڑھ کر صبر دکھاؤ اور سرحدوں کی نگرانی رکھو یعنی مسلمان حکومت کو چاہیئے کہ وہ اپنی سرحدوں کو مضبوط رکھے اور وہاں حفاظت اور نگرانی کے لئے اپنی فوجوں کو مقرر کرے تا کہ اسلامی علاقہ محفوظ رہے اور غیر اسلامی حکومت کو یہ جرأت نہ ہو کہ وہ اسلامی حکومت پر حملہ کرے۔

حَدَائِق کے لحاظ سے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اِنَّ لِکُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا وَاِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ کہ ہر بادشاہ کی ایک رکھ ہوتی ہے اور اللہ تعالےٰ کی رکھ اُس کے محارم ہیں۔ آپ نے فرمایا جو شخص بادشاہ کی رکھ کے قریب اپنے جانور کو چراتا ہے وہ بھی غلطی کرتا ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت اُس کا جانور بادشاہ کی رکھ میں چلا جائے اور وہ نقصان اٹھائے (بخاری کتاب الایمان باب فضل من استبرأ لدینہ)

پس ایک معنے اس کے یہ ہوں گے کہ مومن اپنے اعمال کی حدبندی کرتا ہے وہ حرام اور حلال میں امتیاز کرتا ہے اور چونکہ متقی کا کام یہ ہوتا ہے کہ حلال اور حرام میں تمیز کرے اس لئے اللہ تعالےٰ نے اپنی اُن نعمتوں کا نام جو وہ مومنوں کو دیگا حَدِیْقَہ رکھ دیا۔ یعنی جس طرح اُس نے فرق کیا اور خدا کی رضا کے لئے حلال اور حرام میں امتیاز روا رکھا اسی طرح خدا مومن اور غیر مومن میں امتیاز کرے گا اور اُسے انعام کے طور پر حَدَائِق عطا فرمائے گا اور اس نسبت سے کہ سچا تقویٰ انسان کے لئے غذا کا بھی کام دیتا ہے اور پھل کا کام بھی دیتا ہے اور نشۂ محبتِ الٰہی بھی پیدا کرتا ہے اس کا نام اَعْنَاب رکھ دیا کیونکہ اِتقا میں یہ ساری شرطیں ہوتی ہیں۔ ایک طرف وہ مومن کی روحانی غذا ہوتا ہے جس سے وہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہے۔ دوسرے جسے سچا تقویٰ میسر آجاتا ہے وہ آئندہ ایک لمبے زمانہ تک دنیا میں نیک تبدیلی پیدا کرنیکا موجب بن جاتا ہے جیسے ذخیرہ خور غذا دیر تک رہتی اور انسان کے کام آتی ہے اسی طرح تقویٰ ایک لمبے زمانہ تک دنیا کے کام آتا ہے گویا ایک طرف وہ انسان کو اپنی ذات کیلئے تازہ بتازہ پھل کا کام دیتا ہے اور دوسری طرف آئندہ کیلئے بھی ذخیرہ کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہیں میں نے صادق کو ترک کئے ہوئے اور اس کی نسل میں سے کسی کو ٹکڑے مانگتے نہیں دیکھا (زبور ۳۷ آیت ۲۵) گویا اِتقا کیا ہے ایک ذخیرہ خور غذا ہے جو نہ صرف اس کو فائدہ پہنچاتی ہے بلکہ اس کی آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی فائدہ پہنچاتی ہے۔ پھر تقویٰ محبت الٰہی پیدا کرنے کا بھی موجب ہے جیسے عِنَب میں سے شراب نکلتی ہے اسی طرح تقویٰ کے ذریعہ محبتِ الٰہی پیدا ہوتی ہے جیسے شراب پی کر انسان مست ہو جاتا ہے اور اُسے کسی خیر و شر کی پرواہ نہیں رہتی۔ نہ اسے کسی نقصان سے ڈر آتا ہے اور نہ کسی خیر کے حصول کی خواہش اُس کے دل میں رہتی ہے محض ایک مستی ہوتی ہے جو شراب کی وجہ سے اُس کے دماغ میں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ نہ کسی خوف سے کام کرتا ہے اور نہ کسی لالچ سے۔ ایک رستہ ہوتا ہے جس پر وہ اس نشہ کی حالت میں چل پڑتا ہے۔ اسی طرح جب کسی شخص کے دل پر محبتِ الٰہی غالب آجائے تو اس نشہ میں وہ ایسا چُور ہو جاتا ہے کہ وہ نہ دوزخ کے ڈر کے مارے خدا سے تعلق رکھتا ہے

## وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًاۙ

اور ہم عمر نوجوان عورتیں ۞۲۶

اور نہ جنت کی لالچ اُسے نیکیوں پر آمادہ کرتی ہے۔ ڈر اور لالچ کی قسم کے تمام احساسات اُس کے دل سے مٹ جاتے ہیں اور وہ خدا سے محض خدا کی رضاء کے لئے محبت کرتا ہے گویا وُہ یہ نہیں چاہتا کہ میں دوزخ سے بچ جاؤں، وہ یہ نہیں چاہتا کہ میں جنت میں داخل ہو جاؤں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ مجھے اللہ تعالٰے کی محبت حاصل ہو جائے۔ پس تقویٰ بھی ایک مستی پیدا کر دیتا ہے جیسے اَعْنَاب سے جو خمر تیار ہوتی ہے وہ انسان کو مست بنا دیتی ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ سے ایک دفعہ سوال کیا گیا کہ آپ جب اللہ تعالٰے سے ملیں گے تو اُسے کیا کہیں گے انہوں نے کہا میں تو قیامت کے دن اللہ تعالٰے سے یہ کہوں گا کہ خدایا مجھے نہ جنت کی خواہش ہے نہ دوزخ کا خوف ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تُو مجھے جہاں رکھنا چاہتا ہے وہاں رکھ دے۔ اگر دوزخ میں ڈالنا چاہتا ہے تو دوزخ میں ڈال دے اور اگر جنت میں لے جانا چاہتا ہے تو جنت میں لے جا۔ مجھے تو تیری رضا کی ضرورت ہے (تذکرۃ الاولیاء) یہ مستی کی ہی علامت ہے کہ نہ اچھی بات کی خواہش رہے اور نہ بُری بات کا ڈر رہے۔ ایک ہی غرض سامنے رہے کہ میرا محبوب مجھ سے راضی ہو جائے۔ غرض اَعْنَابًا کا ذکر اس لحاظ سے کیا گیا ہے کہ اَعْنَاب ہی وہ پھل ہے کہ پینے کے کام بھی آتا ہے اور میوہ کے کام بھی آتا ہے اور خشک کر کے غذا کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ پس اسے خاص طور پر قرآن کریم نے مثال کے طور پر چُنا ہے یہ بتانے کے لئے کہ ایمان کی بھی یہی مثال ہوتی ہے کہ وہ بشاشت بھی بخشتا ہے وہ لذت بھی بخشتا ہے اور وہ طاقت بھی بخشتا ہے۔ اسی طرح یہ تینوں چیزیں تقویٰ میں بھی پائی جاتی ہیں کہ وہ غذا بھی ہے۔ وہ ذخیرہ خور غذا بھی ہے اور وہ عشقِ الٰہی بھی پیدا کرتی ہے یعنی خمر والی حالت بھی اس میں پائی جاتی ہے مگر خمر تو انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے یہ وہ نشہ ہے جو عقل کو تیز کرتا ہے۔ البتہ یہ مشابہت ضرور پائی جاتی ہے کہ جس طرح خمر انسان کو مست بنا دیتی ہے اسی طرح تقویٰ اور ایمان کی وجہ سے انسان اللہ تعالٰی کی محبت میں مست ہو جاتا ہے

جنت میں حدائق و اَعْنَاب ملنے میں حکمت

## ۞۲۶ حل لغات۔

كَوَاعِبَ

كَوَاعِب: كَاعِبَةٌ کی جمع ہے اور كَاعِبَةٌ کے معنے ہوتے ہیں اَلنَّاهِدَةُ جوان لڑکی۔ (اقرب)

اَتْرَاب

اَتْرَابٌ: تِرْبٌ کی جمع ہے اور تِرْبٌ اس کو کہتے ہیں جو کسی کا ہم عمر ہو۔ اکثر استعمال اس کا مؤنث میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں هٰذِهٖ تِرْبُ فُلَانَةٍ اِذَا كَانَتْ عَلٰى سِنِّهَا (اقرب) یہ فلاں عورت کی تِرْب ہے جبکہ وہ اس عورت کی ہم عمر ہو۔ پس كَوَاعِب کے معنے ہوئے۔ نوجوان عورتیں۔ اور اَتْرَاب کے معنے ہوئے۔ ہم عمر عورتیں۔ کیونکہ عربی زبان کے لحاظ سے اَتْرَابًا میں مرد اور عورت کا مقابلہ نہیں ہوتا یعنی یہ مطلب نہیں ہوتا کہ فلاں مرد کے ہم عمر عورت۔ بلکہ اَتْرَاب کے معنے ہوتے ہیں آپس میں ہم عمر عورتیں یعنی اَتْرَاب میں ہم عمر ہونے کے جو معنے ہیں اُن کی نسبت عورتوں کے لحاظ سے ہے یعنی عورت عورت کی ہم عمر ہو۔ مردوں اور عورتوں میں یہ نسبت نہیں۔ چنانچہ تاج العروس میں سیوطی کا قول درج ہے:۔

" اَلْاَتْرَابُ: اَلْاَسْنَانُ۔ لَا يُقَالُ اِلَّا لِلْاِنَاثِ وَيُقَالُ لِلذُّكُوْرِ اَلْاَسْنَانُ وَالْاَقْرَانُ وَ اَمَّا اللِّدَاتُ فَاِنَّهٗ يَكُوْنُ لِلذُّكُوْرِ وَالْاِنَاثِ وَقَدْ اَقَرَّهٗ اَئِمَّةُ اللِّسَانِ عَلٰى ذَالِكَ" (تاج)۔

یعنی عربی زبان میں جب مردوں کی ہم عمری کا ذکر ہو تو اَقْرَان اور اَسْنَان کا ذکر کرتے ہیں۔ اور جب عورتوں کے آپس میں ہم عمری کا ذکر ہو تو اَتْرَاب کہتے ہیں اور مؤنث و مذکر دونوں کا ہو تو لِدَات۔ چنانچہ تمام ائمہ لغت اسی بات کی تائید کرتے ہیں۔ پس كَوَاعِبَ اَتْرَابًا کے معنے ہوئے آپس میں ہم عمر جوان عورتیں۔

**تفسیر**۔ اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قوم میں کام کی حقیقی روح تبھی پیدا ہوتی ہے جب ایک حد تک اُن میں خیالات کا اور جوش کا اور ہمت کا توازن قائم ہو۔ کسی قوم میں اگر بعض لوگ بہت بڑے شاندار کارنامے سرانجام دینے والے ہوں اور باقی لوگ اس معیار کے نہ ہوں تو وہ قوم کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کرسکتی۔ بڑی کامیابی کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ قوم کا عام معیارِ اخلاق ایک ہو۔ اگر قوم کا ایک فردِ آسمان پر ہو اور دوسرا زمین پر تو وہ کبھی اپنی قوم کے لئے اتنے مفید ثابت نہیں ہوسکتے جتنے مفید وہ ساٹھ ستر فی صدی افراد ہوسکتے ہیں جو مثلاً ایک ایک گز زمین سے اونچے ہوں کیونکہ گو وہ آسمان والے کے مقابلہ میں بہت نیچے ہوں گے مگر سب کا معیار یکساں ہوگا۔ اگر دس افراد دو دو فٹ بھی اونچے ہوں تو وہ اُن دس افراد سے زیادہ مفید ہوں گے جن میں سے ایک آسمان پر ہو اور نو زمین پر۔ پس کَوَاعِبَ اَتْرَابًا میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ ایسی برکتیں دیگا کہ جب وہ مقام مفاز میں پہنچیں گے تو ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہوگی کہ انکی عورتوں کا دینی معیار بھی اونچا ہوجائے گا اور پھر وہ اس معیار میں ایک دوسری کے برابر ہوں گی۔ غرض کَوَاعِب میں اُن کے معیار کے اونچا ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی عورتوں کا دینی معیار بلند ہوگا اور سب میں جوش اور جوانی اور بلندی پائی جائے گی۔ اور اَتْرَابٌ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اُن کی ترقی قومی ترقی ہوگی انفرادی نہیں، یعنی سب میں یہ جوش ایک دوسرے سے ملتا جلتا پایا جائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ چند عورتوں میں تو جوش و خروش بے انتہاء ہو اور باقی اپنے فرض سے غافل ہوں بلکہ سب عورتوں میں ملتا جلتا دینی جوش پایا جائے گا اور وہ سب کی سب دین کی ترقی کے لئے ایک جیسی قربانی کرنے کے لئے تیار رہیں گی چنانچہ اسلامی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو کثرت سے ایسی عورتوں کی مثالیں نظر آتی ہیں جنہوں نے جنگوں میں بہت بڑی جرأت اور ہمت کا ثبوت دیا۔ مہاجرین کی بیویوں کو ہم دیکھتے ہیں تو اُن میں بھی ہمیں یہ شان نظر آتی ہے اور انصار کی بیویوں کو دیکھتے ہیں تو اُن میں بھی ہمیں یہ شان نظر آتی ہے۔ ہزارہا عورتیں ایسی ہیں جن کا تاریخوں میں ذکر آتا ہے اور جنہوں نے مختلف مواقع پر کَوَاعِبَ اَتْرَابًا ہونے کی ایسی شان دکھائی کہ آج کل کے مرد بھی اُن کے مقابلہ میں ہیچ نظر آتے ہیں۔

مومنوں کو کواعب واتراب ملنے کا مطلب

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کَوَاعِب کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو جسمانی اور روحانی دونوں حالتوں پر دلالت کرتا ہے مگر ایسے لفظ کے لانے میں حکمت یہ تھی کہ یہاں دو مضمون بیان کئے جارہے تھے ایک وہ مضمون تھا جس کا قیامت سے تعلق تھا اور ایک وہ مضمون تھا جس کا اس دنیا سے تعلق تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا لفظ استعمال فرمایا جو دونوں مقامات پر چسپاں ہوسکتا ہے۔ قیامت کے معنے اگر لئے جائیں تب بھی یہ لفظ ٹھیک ہے کیونکہ جنت میں ہر آدمی جوان ہونے کی حالت میں داخل کیا جائے گا۔ حدیثوں میں آتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک بوڑھی عورت آئی۔ معلوم ہوتا ہے اُسے بے وقت بات کرنے کی عادت تھی اُس نے آتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غالبًا اور گفتگو میں معروف تھے اس لئے اُسے مذاقًا مختصر طور پر جواب دیا۔ کہ جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہیں جائے گی۔ وہ یہ سنتے ہی رونے اور چیخنے چلّانے لگی اور اسی حالت میں واپس ہوگئی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ میں سے کسی کو بُلا کر فرمایا کہ جاؤ اس کو کہو میرا وہ مطلب نہیں تھا جو اُس نے سمجھا ہے بلکہ میرا مطلب تو یہ تھا کہ جنت میں جو بھی داخل کئے جائیں گے سب جوان ہوکر جائیں گے۔ بڑھاپے کی حالت میں نہیں جائیں گے۔

(شمائل ترمذی)

اور واقعہ میں وہ مقام جو دائمی سرور کا ہے وہاں اگر بڑھاپے کی حالت میں کوئی شخص چلا جائے تو جنت دوزخ سے بدتر بن جائے۔

آدمی تو ساٹھ اسّی سو سال تک بوڑھا ہو جاتا ہے اگر اسی طرح اس کا بڑھاپا بڑھتا چلا جائے تو دس بیس ہزار سال میں تو وہ ایسی ذلیل چیز بن جائے گا کہ اس کا لذت اٹھانا تو الگ رہا۔ وہ شاید ایک گیند کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ پس جنت کی یہ ایک ضروری شرط ہے کہ وہاں سب جوان کر کے داخل کئے جائیں گے اور ہمیشہ اسی حالت میں رکھے جائیں گے۔ اسی طرح جنت کے لحاظ سے انسان کے جو ساتھی ہوں گے یعنی بیوی بچے وہ بھی سب جوان ہوں گے لیکن جب ہم اس آیت کو دنیا پر چسپاں کریں تو پھر کَوَاعِب کے معنے ایسی ہی عورتوں کے ہوں گے جو حوصلہ اور جرأت اور بہادری کے لحاظ سے جوان ہوں۔ کَوَاعِب کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ وہ جسمانی لحاظ سے جوان ہوں گی کیونکہ اگر یہ معنے لئے جائیں تو پھر اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ كَوَاعِبَ کے یہ معنے ہوں گے کہ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ كَوَاعِبَ فِي الْاِبْتِدَاءِ یعنی متقیوں کو شروع میں جوان بیویاں ملیں گی لیکن بعد میں بوڑھی ہو جائیں گی اور یا پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ متقیوں کا فرض ہے کہ وہ جوان عورتوں سے شادیاں کریں اور جب وہ بوڑھی ہونے لگیں تو انہیں طلاق دے دیا کریں کیونکہ اُس وقت وہ کَوَاعِب نہیں رہ سکتیں اور یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ متقیوں کو جو عورتیں ملیں گی وہ کبھی بوڑھی ہی نہیں ہوں گی مگر یہ تینوں صورتیں غلط ہیں اور انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ اس جگہ روحانی معنے مراد لے جسمانی معنے مراد نہ لے کیونکہ یہاں زمانہ نہیں بتایا گیا کہ وہ فلاں عمر میں جوان ہوں گی اور فلاں میں نہیں بلکہ بتایا یہ گیا ہے کہ وہ ہمیشہ کَوَاعِب رہیں گی۔ پس لازماً اس کے معنے جوان عمر ہونے کے نہیں بلکہ حوصلہ و ہمت کے لحاظ سے جوان ہونے کے ہیں۔ پھر بتایا کہ وہ نہ صرف ہمت اور عزم اور ارادہ کے لحاظ سے جوان ہوں گی بلکہ وہ اَتْرَاب بھی ہوں گی یعنی ساری عورتیں یکساں جوان ہوں گی۔ ساری عورتیں یکساں بلند ہمت ہوں گی اور ساری عورتیں یکساں حوصلہ مند ہوں گی۔ یہ ایک بہترین انعام ہے جو کسی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے کہ جیسے اُس قوم کے مردوں میں جوش ہو ویسا ہی اُس قوم کی عورتوں میں جوش ہو۔ جیسی چند عورتیں بہادر اور دلیر اور قوم کے لئے قربانی کا مادہ اپنے اندر رکھنے والی ہوں ویسی ہی تمام عورتیں بہادر اور دلیر اور قربانی کا مادہ رکھنے والی ہوں بلکہ ایک سے ایک بڑھ کر ہو۔ یہ حقیقی انعام ہے جس سے قومیں ترقی کیا کرتی ہیں۔ دنیا میں انسان کو بزدلی کی طرف لے جانے والی عورت ہی ہوتی ہے۔ مرد دین کے لئے باہر جانا چاہتا ہے تو عورت اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے تم مجھے کہاں چھوڑے جا رہے ہو تمہارے بغیر میرا کون سہارا ہے۔ پھر کبھی وہ بچوں کو اس کے سامنے لاتی ہے اور کہتی ہے ان بچوں کو کون پوچھے گا۔ اس پر مرد کا دل بھی بے چین ہو جاتا ہے اور اس کے ارادہ میں تزلزل پیدا ہو جاتا ہے لیکن جب عورت اس کی ہمت بندھاتی ہے۔ جب وہ اسے جرأت اور دلیری کا سبق دیتی ہے۔ جب وہ کہتی ہے کہ خوش باش جاؤ اور خدا کے دین کا کام کرو تو مرد کا دل بڑھ جاتا ہے اور وہ پوری بے فکری سے دینی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ عورتیں دینی لحاظ سے بلند معیار پر قائم ہوں اور سب میں دین کا یکساں جوش اور قربانی کی یکساں روح پائی جاتی ہو۔

کَوَاعِب و اَتْرَاب سے مراد مسلمان عورتیں [۲۰۱]

اس جرأت اور بہادری کا نمونہ جن عورتوں نے دکھایا انکی مثالوں سے اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے۔ انہوں نے اسی رُوح سے کام لیتے ہوئے بعض دفعہ اپنے مردوں سے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر تم میدان جنگ سے بھاگو گے تو پھر ہمارے پاس نہ آنا۔ تاریخوں میں آتا ہے کہ جب جنگ یرموک میں یکدم عیسائی لشکر نے کثیر تعداد اور بھاری سامان کے ساتھ حملہ کیا تو اسلامی لشکر مقابلہ کی تاب نہ لا کر وقتی طور پر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوا۔ اُس وقت مسلمان عورتوں نے خیمے توڑ کر اُن کی لکڑیاں ہاتھوں میں سنبھال لیں اور مسلمان سپاہیوں کے گھوڑوں کے مونہوں پر مار مار کر ان کو واپس دشمن کے لشکر کی طرف لوٹا دیا۔ ان عورتوں میں سے ایک ہند بنت عتبہ بن ربیعہ بھی تھی جو کسی زمانہ میں اسلام کی شدید ترین دشمن رہ چکی تھی۔ مسلمان پیچھے ہٹنے والے سپاہیوں میں ابوسفیان اس کا خاوند بھی شامل تھا اور معاویہ اس کا بیٹا بھی۔ چنانچہ جب لشکر بھاگتا ہوا واپس پہنچا تو ابوسفیان جو لشکر کے اس حصہ کا سردار تھا اُس کی بیوی ہند نے

مسلمانوں کی عورتوں کے کواعب و اتراب ہونیکے ثبوت [۲]

اس کے گھوڑے کو خیمے کی لکڑی سے مار کر واپس کیا اور کہا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت میں تو پیش پیش ہوتا تھا اب اسلام قبول کرکے میدان جنگ سے کیوں بھاگتا ہے تمہارا تو یہ فرض ہونا چاہئے کہ تم نے جو اسلام کی ترک کی حالت میں مخالفت کی تھی اس کو دھو ڈالو اور اپنی جان پر کھیل جاؤ۔ چنانچہ اُس نے اور باقی سپاہیوں نے جب یہ نظارہ دیکھا تو کہا کہ واپس لوٹو۔ دشمن کی تلواروں سے مسلمان عورتوں کے ڈنڈے زیادہ سخت ہیں۔ یہ سن کر لشکر واپس لوٹا اور آخر دشمن پر فتح پائی۔
(فتوح الشام حالات جنگ یرموک)

پس کَوَاعِبَ اَتْرَابًا کے مطابق اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عورتوں کا ایسا لشکر دیا جو دوسری قوموں کے مردوں سے بھی بالا تھا اور پھر اُن عورتوں میں سے بھی ایک سے ایک بڑھ کر تھی۔ یہ نہیں کہ حضرت عائشہؓ تو بہادر ہوں اور حضرت زینبؓ نہ ہوں یا حضرت زینبؓ تو بہادر ہوں مگر اسماء بنت ابی بکرؓ بہادر نہ ہوں بلکہ حضرت عائشہؓ بھی کَوَاعِبَ اَتْرَابًا کا مصداق تھیں اور حضرت زینبؓ بھی کَوَاعِبَ اَتْرَابًا کا مصداق تھیں اور اسماء بنت ابی بکر بھی کَوَاعِبَ اَتْرَابًا کا مصداق تھیں۔ بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں ہندؔ جیسی عورت جو کسی زمانہ میں شدید دشمن اسلام رہ چکی تھی اس میں بھی یہ روح کام کر رہی تھی اور انہوں نے ایسی قربانیاں کیں جن کی کوئی حد ہی نہیں۔

کواعب کے لفظ سے مسلمان عورتوں کی ذاتی جوانی اور لفظ اَتْرَاب سے قومی جوانی کی طرف اشارہ

اسی جنگ کا یہ واقعہ ہے کہ عیسائی لشکر کی طرف سے جب مسلمانوں پر بہت زیادہ دباؤ پڑا تو مقابلہ کرتے کرتے اسلامی لشکر بالکل تھک گیا۔ ایک رات اسلامی لشکر کے کمانڈر انچیف جو حضرت ابو عبیدہ تھے چکر لگانے کے لئے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ اسلامی لشکر کے ارد گرد دو آدمی پھر رہے ہیں انہیں شبہ پیدا ہوا کہ دشمن کے آدمی جاسوس کے طور پر نہ آئے ہوں چنانچہ وہ آگے بڑھے اور انہوں نے آواز دی کہ تم کون ہو! اس پر حضرت زبیرؓ آگے بڑھے اُن کے ساتھ اُنکی بیوی اسماء بنت ابی بکر بھی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ آج مسلمان چونکہ سخت تھکے ہوئے تھے اس لئے میں اور میری بیوی دونوں پہرہ کیلئے نکل کھڑے ہوئے (فتوح الشام۔ حالات جنگ یرموک) یہ کَوَاعِبَ اَتْرَابًا کی کیسی شاندار مثال ہے اور کس طرح ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابیہؓ کی عورتوں میں بھی وہی جذبہ فداکاری پایا جاتا تھا جو خود صحابہ کے اندر موجود تھا۔ پھر یہ نہیں کہ یہ جذبہ کسی خاص خاندان کی عورتوں سے مخصوص ہو بلکہ ہر عورت اسی جذبہ سے سرشار تھی اور یہی روح اُس میں کام کرتی دکھائی دیتی تھی ورنہ دنیا کے لحاظ سے کَوَاعِبَ کے کوئی اور معنے بنتے ہی نہیں۔ جوان لڑکی پانچ سات سال میں ہی جوانی کی عمر گزار دیتی ہے اور پھر وہ کَوَاعِب میں شامل نہیں رہتی۔ مگر یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ متقیوں کو ایسی عورتیں ملیں گی جو کَوَاعِب ہی رہیں گی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں روحانی معنے مراد ہیں جسمانی نہیں۔ بے شک اگلے جہان کے لحاظ سے جسمانی معنے ہی ٹھیک ہیں کیونکہ جنت میں اگر بوڑھے داخل ہوں یا بڑھاپا آجائے تو پھر جنت جنت نہیں رہتی لیکن جب ہم اس آیت کو دنیا پر چسپاں کریں گے تو اس کے معنے ایسی عورتوں کے ہوں گے جو جوانی والی طاقتیں اپنے اندر رکھتی ہوں کیونکہ دنیا میں انسانی جسم بہرحال نڈھال ہو جاتا ہے اور عمر کی زیادتی کے ساتھ بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن روحانی طاقتیں اگر انسان انکو ترقی دینا چاہے تو کمزور نہیں ہو سکتیں۔ پس بڑی بات یہ ہے کہ قوم کی عورتیں کَوَاعِبَ اَتْرَابًا کی مصداق ہوں۔ کَوَاعِب کا لفظ ذاتی جوانی پر دلالت کرتا ہے اور اَتْرَاب کا لفظ قومی جوانی پر دلالت کرتا ہے۔ اَتْرَاب کا لفظ بھی بتا رہا ہے کہ اس جگہ روحانی معنے ہی زیادہ موزوں ہیں کیونکہ جنت کے متعلق اَتْرَاب کے لفظ میں کوئی حکمت نہیں ہو سکتی۔ یہ لفظ دنیا سے ہی تعلق رکھتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہی قوم ترقی کر سکتی ہے جس کی ساری عورتوں کا دینی معیار بلند ہو۔ وہ جواں ہمت اور حوصلہ مند ہوں۔ وہ مصائب و مشکلات کی پرواہ کرنے والی نہ ہوں۔ وہ دین کے لئے ہر قسم کی قربانی پر تیار رہنے والی ہوں

وَّكَاْسًا دِهَاقًا ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ۝

اور چھلکتے ہوئے پیالے ۲۷؎ نہ تو وہ ان (جنتوں) میں لغو باتیں سنیں گے اور نہ (ایک دوسرے کو) جھٹلانیوالا کلام ۲۸؎

وہ جرأت اور بہادری کی پیکر ہوں اور وہ اپنے اخلاص اور اپنے جوش اور اپنی محبت میں مردوں سے پیچھے نہ ہوں۔ یہ معنے ایسے لطیف ہیں کہ میرے نزدیک اپنی ذات میں اس بات کے مستحق ہیں کہ ان معنوں کو بار بار بیان کیا جائے۔ ان پر زور دیا جائے اور انہیں اپنی تقریر و تحریر میں بتکرار لایا جائے تاکہ معلوم ہو کہ اسلام عورتوں کو کس بلند مقام پر پہنچانا چاہتا ہے اور عورتوں میں بھی دینی روح ترقی کرے۔ اگلے جہان میں اگر ساری عورتیں ایک ہی عمر کی ہوں تو اس میں کوئی خاص لطف کی بات نہیں۔ وہ غرض کَوَاعِب کہہ کر ہی پوری ہو سکتی تھی اَتْرَاب کا لفظ زائد طور پر لانا بتا رہا ہے کہ یہ بات خصوصیت سے اس دنیا سے تعلق رکھنے والی ہے۔

**۲۷؎ حل لغات۔** اَلْكَاْسُ:۔ اَلْاِنَاءُ يُشْرَبُ فِيْهِ۔ وہ برتن جس میں کوئی چیز پی جاتی ہے وَقِيْلَ مَادَامَ الشَّرَابُ فِيْهِ وَاِلَّا فَهِيَ زُجَاجَةٌ وَاِنَاءٌ وَقَدَحٌ اور بعض کہتے ہیں کہ کَاْسٌ پینے کے برتن کو اس وقت کہیں گے جبکہ اس میں پینے کی چیز بھی موجود ہو ورنہ خالی برتن عربی زبان میں زُجَاجَة اور اِنَاء اور قَدَح کہلاتا ہے۔ لفظ کَاْسٌ مؤنث ہے (اقرب)

دِهَاق کا لفظ جب کَاْس کے لئے آئے تو اس کے معنے بھرے ہوئے کے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں اَلدِّهَاقُ مِنَ الْكُؤُوْسِ: اَلْمُمْتَلِئَةُ (اقرب) تو كَاْسًا دِهَاقًا کے معنے ہوئے انہیں ایسے پیالے ملینگے جو لبالب بھرے ہوئے ہونگے۔

**تفسیر۔** پہلے اللہ تعالیٰ نے اَعْنَاب کا ذکر فرمایا تھا جن سے شراب بنتی ہے۔ اب یہ بتایا کہ وہ مذکورہ بالا شراب معرفت میں اتنے متوالے ہوں گے کہ ان کا نشہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا اور ان کی طبیعتوں میں کہیں سیری حاصل نہیں ہوگی۔ ایک پیالہ ختم ہوگا تو دوسرا پینا شروع کر دینگے دوسرا پیالہ ختم ہوگا تو تیسرا پیالہ شروع کر دیں گے یعنی ایک قربانی کر لینگے تو دوسری کے لئے تیار ہو جائیں گے دوسری قربانی کریں گے تو تیسری کے لئے تیار ہو جائیں گے گویا محبت الٰہی کا پیالہ وہ سیر ہو کر زمین پر رکھیں گے ہی نہیں۔ ہر وقت ان کا پیالہ بھرا ہوا رہے گا اور عشق الٰہی کے نشہ میں انہیں قربانی کی ایسی عادت پڑ جائے گی کہ کسی موقعہ پر بھی اُن کی طبیعت میں سیری نہیں ہوگی اور چونکہ اگلے جہان کی لذتیں روحانی ہوں گی گو یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی ایک جسمانی شکل بھی ہوگی مگر بہرحال چونکہ اصلی لذت روحانی ہوگی اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ان کو ایسے پیالے ملیں گے جو ہمیشہ بھرے رہیں گے اُن میں کبھی کوئی کمی نہیں آئیگی تو ان الفاظ کو جہاں اگلے جہان پر چسپاں کیا جا سکتا ہے وہاں اس کے یہ معنے بھی ہوں گے کہ ان کے دل محبت الٰہی سے ہمیشہ لبریز رہیں گے۔ قربانی ان کے قدم کو پیچھے نہیں ہٹائے گی بلکہ ہر قربانی کے بعد ان کا دل چاہے گا کہ ہم اور قربانی کریں اور اپنے عشق کا مظاہرہ کریں اور جب وہ دوبارہ اپنے عشق کا مظاہرہ کرینگے تو ان کے دلوں میں خواہش پیدا ہوگی کہ ہم اپنے عشق کا اب تیسرا مظاہرہ کریں اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا چلا جائے گا۔

**۲۸؎ تفسیر۔** چونکہ اللہ تعالیٰ نے محبت الٰہی کی شابہت شراب سے دی تھی اور شراب میں بعض نقائص ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی ذکر فرما دیا کہ گو وہ شراب کی طرح محبت الٰہی کے نشہ میں سرشار ہوں گے مگر ہمارا اس سے یہ مطلب نہیں کہ شراب کے نقائص بھی ان میں پائے جاتے ہونگے۔ شراب کی خرابی یہ ہے کہ اُس میں لغو بات ہوتا ہے اسی طرح اُس میں تکذیب ہوتی ہے یعنی شرابی لغو اور فضول باتیں بھی کرتے ہیں اور آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی ہیں مگر فرمایا لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا۔ وہ نہ اس میں کوئی لغو بات سنیں گے اور نہ تکذیب کی کوئی بات سنیں گے۔ لَغْو سے مراد بکواس اور

شقیوں کو بالبالب بھرے ہوئے پیالے ملنے کا مطلب

اَلْكَاْس

دِهَاق

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا کے الفاظ بیان کرنے کی حکمت

بیہودہ باتیں ہیں۔ مجھے یاد ہے میں ایک دفعہ اپنے گھر میں ٹہل رہا تھا جب میں ٹہلتے ٹہلتے اس دیوار کے پاس پہنچا جو گلی کی طرف ہے تو مجھے اس وقت ایک آدمی کی آواز سُنائی دی جو دوسرے شخص کا نام لے کر کہہ رہا تھا سندر سنگھا پکوڑے کھانے اِین یعنی سندر سنگھ کیا پکوڑے کھاؤ گے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پھر یہی فقرہ کہا۔ کچھ دیر گذری تو پھر مجھے یہی آواز آئی مگر دوسری طرف سے کوئی جواب ہی نہیں ملتا تھا۔ میں نے دیوار پر سے جھانکا تو مجھے نظر آیا کہ مسجد اقصیٰ کے پاس جو موڑ ہے جہاں نظارتوں کے دفاتر ہیں وہ ایک شخص ٹیک لگائے شراب کے نشہ کی حالت میں یہ فقرہ دوہراتا چلا جا رہا ہے اور اس کا مخاطب ساتھی اُس وقت وہاں تک پہنچ چکا تھا جہاں اُم طاہر کا مکان ہے یعنی کہنے والے سے کوئی پچاس گز کے فاصلہ پر۔ مگر وہ یہی کہتا جا رہا تھا کہ سندر سنگھ پکوڑے کھانے ہیں۔ اس طرح وہ کتنی ہی دیر وہاں پر بیٹھا یہ فقرہ دُہراتا رہا حالانکہ دوسرا شخص اُس وقت تک غالباً دوسرے گاؤں تک پہنچ چکا ہوگا۔

غرض شراب میں یہ ایک بہت بڑا نقص ہے کہ انسان لغو باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔ دوسرا نقص اس میں یہ ہے کہ اس کا پینے والا دوسرے سے لڑنے جھگڑنے اور اُسے گالیاں دینے لگ جاتا ہے۔ کِذَّابًا کَذَّبَ کا مصدر ہے اور اس کے معنے ایک دوسرے کو جھٹلانے کے ہوتے ہیں۔ ایک کہتا ہے تُو نے یہ کہا تھا۔ دوسرا کہتا ہے میں نے یہ تو نہیں کہا تھا میں نے تو وہ بات کہی تھی۔ اس وجہ سے اُسی شراب کا ذکر کرکے قرآن کریم فرماتا ہے لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّ لَا کِذّٰبًا

جنت کی نعماء کو لغو اور کذاب سے پاک رکھے جانے سے ان کے تین فوائد کی طرف اشارہ

جنت کی نعماء خواہ شراب کے پیالوں کی شکل میں ملیں۔ خواہ عشق الٰہی کی شراب کے پیالے ان کو پلائے جائیں۔ اس شراب کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں لغو نہیں ہوگا اور نہ کِذّاب ہوگا۔ لغو سے انسان کا وقت ضائع ہوتا ہے اسی لئے شراب پی کر انسان ایسی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو وقت کو ضائع کرنیوالی ہوتی ہیں۔ مثلاً جُوا عام طور پر شراب پی کر ہی کھیلا جاتا ہے۔ لیکن لغو نہ ہونے سے اوّل وقت ضائع نہیں ہوتا۔ دوم ذہن کام کے سوا دوسرے امور کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور توجہ کے قیام سے ترقی جلد جلد ہوتی ہے۔ جب انسان لغو امور کی طرف توجہ کرتا ہے تو چھوٹی چھوٹی باتوں میں اپنے وقت کو ضائع کر دیتا ہے اور توجہ کا اجتماع پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں لغو نہ ہو وہاں اجتماعِ توجہ خوب ہوتا ہے اور کام کی چیزوں کی طرف توجہ رہتی ہے۔ اور چونکہ اس کی عادت میں یہ بات داخل ہو جاتی ہے کہ وہ کام کی طرف توجہ کرے۔ لغو کاموں میں حصہ نہ لے۔ اس لئے اس کے اندر غور اور فکر کی قوت بڑھ جاتی ہے اور ہر بات کی طرف توجہ کرنے کی اُسے عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ تیسرا فائدہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں ہر حصہ کام اور ہر حصہ قوم مفید ضرورت میں لگ رہا ہوتا ہے۔ جب انسان لغو نہیں کرے گا تو لازماً وہی کام کرے گا جو ضروری ہوگا اور جس کا مفید نتیجہ نکل سکے گا۔ اور جب ساری قوم ایسے ہی کاموں میں حصہ لیگی جن کے مفید نتائج نکل سکتے ہوں تو قومی ترقی جلد جلد ہوگی۔ پس لغو کی طرف توجہ نہ کرنے کے تین فوائد ہیں۔ اوّل اس کے نتیجہ میں وقت ضائع نہیں ہوتا دوم ذہنوں میں مقاصد کی طرف توجہ پیدا کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے سوم اُوپر کی دو باتوں کے نتیجہ میں قوم جلد جلد ترقی کی طرف قدم اُٹھاتی ہے۔

وَلَا کِذّٰبًا۔ پھر شراب سے لڑائی جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے مگر یہ وہ نشۂ محبت ہے جس میں کِذّاب نہیں جس میں لڑائی اور جھگڑے کی کوئی صورت نہیں بلکہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی تائید اور تصدیق کرنے والا ہی ہوگا۔ کِذّاب اور تکذیب بھی قومی ترقی کی جڑ کو لغو کی طرح کاٹنے والی چیز ہے جو شخص دوسرے کی تکذیب نہیں کرتا لازمی بات ہے کہ وہ حسن ظنی کریگا کیونکہ تکذیب نہ کرنیکا لازمی نتیجہ حسن ظنی ہے اور جب وہ حسن ظنی کریگا تو لازمی بات ہے کہ اسکے نتیجہ میں لوگوں کو اطمینان حاصل ہوگا۔ ساری خرابی بدظنی سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان بدظنی سے کام لینے لگے تو وہ یہ بھی خیال کر سکتا ہے کہ میری بیوی نے کہیں کھانے میں زہر نہ ملا دیا ہو۔ لیکن اگر اس طرح انسان خیال کرنے لگے تو یہ دنیا ہی دوزخ بن جائے۔ اسی طرح اور بیسیوں معاملات ہیں

# جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۝

انہیں تیرے رب کی طرف سے بدلہ دیا جائیگا جو مناسب حال انعام ہوگا۔ ۲۹

جن میں حسن ظنی سے کام لینا پڑتا ہے اور اگر انسان شکوک و شبہات میں مبتلا رہے تو اس کے معاملات میں بیسیوں خرابیاں پیدا ہو جائیں۔ لیکن جب لڑائی جھگڑا نہ ہو اور کاموں کی بنیاد حسن ظنی پر ہو تو دلوں کو اطمینان رہتا ہے اور یہ ایک بہت بڑی قومی نعمت ہے جو حسن ظنی سے حاصل ہوتی ہے۔ پھر اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قومی تعاون حاصل ہوتا ہے جب انسان حسن ظنی سے کام لے گا تو نیکی کے کاموں میں وہ دوسروں کی مدد بھی کرے گا اور ان کے تعاون کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیگا اور اس طرح ایک دوسرے کے تعاون سے قوم میں ترقی کی روح پیدا ہوگی اگر انسان یہ خیال کرے کہ فلاں شخص تو میرا دشمن ہے تو اس کے بعد وہ اس کی مدد کے لئے کھڑا نہیں ہو سکتا لیکن اگر وہ یہ بدظنی نہ کرے اور یہی سمجھے کہ وہ میرا دوست ہے تو مشکلات کے وقت وہ اس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ پس حسن ظنی کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قومی تعاون کی روح اس سے ترقی کرتی ہے۔ تیسرے حسن ظنی کے نتیجہ میں اقدام عمل کیوقت یہ خوف نہیں ہوتا کہ دوسرے الزام لگا کر میری سکیم کو ناکام بنا دیں گے۔ بلکہ وہ دوسروں پر حسن ظنی کرتے ہوئے ہر خطرہ کو برداشت کرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے مثلاً کوئی شخص مصیبت میں مبتلا ہو اور یہ سمجھے کہ اس کے ہمسائے فوراً اس کی مصیبت دور کرنے کے لئے خطرہ میں کود پڑیں گے تو جس دلیری سے وہ مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑا ہوگا اس دلیری سے وہ شخص نہیں کھڑا ہو سکتا جو سمجھتا ہے کہ نہ معلوم میرے ہمسائے اور دوست میری مدد کریں گے یا نہیں پس حسن ظنی کی وجہ سے اقدام عمل کے وقت زیادہ دلیری پیدا ہو جاتی ہے اور انسان قوم کی خاطر ہر بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔

غرض یہ تین فوائد ہیں جو حسن ظنی سے حاصل ہوتے ہیں دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَأْثِيْمٌ۔ نہ جنت میں لغو ہوگا نہ ایک دوسرے پر گناہ کا الزام لگانا (الطور ع ۱) اس جگہ تَأْثِيْمٌ کی جگہ كِذَّاب کا لفظ رکھ دیا ہے یہ بتانے کیلئے کہ كِذَّاب اور تَأْثِيْم ایک ہی چیز ہیں۔ كِذَّاب کے معنے ہوتے ہیں ایک دوسرے کی تکذیب کرنا اور تَأْثِيْم کے معنے ہوتے ہیں ایک دوسرے پر الزام لگانا۔ پس یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں۔

**۲۹ حل لغات۔** اَلْحِسَابُ: اَلْعَدُّ۔ گِنتا۔ اَلْكَافِيْ۔ کافی (اقرب)۔ پس عَطَآءً حِسَابًا کے معنے ہوں گے (۱) ایسی عطا جو کافی ہوگی (۲) ایسی عطا جو حساب میں ہو۔

عہ حِسَابًا صفت ہے عَطَآءً کی اور عَطَآءً مفعول مطلق ہے جَزَآءً کا جو کہ ...

**تفسیر۔** یہ تیرے رب کی طرف سے بطور جزاء کے ہوگا اور یہ عَطَآءً حِسَابًا ہوگی عَطَآءً کا لفظ جَزَآءً کے لئے مفعول مطلق کے طور پر استعمال ہوا ہے یعنی یہ ایسی جزاء ہوگی جو حساب کے مطابق ہوگی۔ حساب کے مطابق جزاء ہونے سے بظاہر اس امر پر زور معلوم ہوتا ہے کہ وہاں حساب سے زیادہ جزاء نہیں ہوگی حالانکہ قرآن کریم کی بعض دوسری آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا رحیم ہے اور انسانی اعمال سے بہت زیادہ جزاء دیتا ہے۔ پس بظاہر یہ بات اُن آیات کے خلاف نظر آتی ہے کہ ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ ہم مومنوں کو ان کے کام سے زیادہ جزاء دیں گے اور دوسری جگہ یہ فرما دیا کہ حساب کے مطابق جزاء ہوگی۔

اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ حساب کے معنے حساب کے مطابق کے علاوہ اور بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ حساب کے ایک معنے گننے کے بھی ہوتے ہیں اور کافی کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) یعنی ایسی چیز جس سے ضرورت پوری ہو جائے۔ پس عَطَآءً حِسَابًا کا یہ مطلب ہوا کہ ایسی عطا جس سے

اَلْحِسَاب

حساباً کے معنوں کی وضاحت

حساب کے مطابق جزاء دئے جانیکا مطلب

## رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا

(تیرے اس رب کی طرف سے جو) آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے ان سب کا رب ہے (اور) بے حد کرم کرنیوالا ہے۔

## يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ۝

وہ اس کے حضور میں (بلا اجازت) بات کرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے ۳۰ٓ

انسان کی ہر ضرورت پوری ہو جائے۔ چنانچہ ابن کثیر لکھتے ہیں کَافِيًا وَافِيًا سَالِمًا كَثِيْرًا کہ حِسَابًا کے معنے یہ ہیں کہ جو کچھ ملے گا وہ کافی ہوگا بلکہ ضرورت سے زیادہ ہوگا اور سالم ہوگا یعنی کسی قسم کا نقص اُس میں نہیں ہوگا۔ كَثِيْرًا اور وہ پھر بہت ہوگا۔ چنانچہ وہ مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں تَقُوْلُ الْعَرَبُ اَعْطَانِيْ فَاَحْسَبَنِيْ اَيْ كَفَانِيْ یعنی اہل عرب کہتے ہیں اَعْطَانِيْ فَاَحْسَبَنِيْ اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس شخص نے مجھے اتنا دیا کہ میری سب ضرورتوں کو پورا کر دیا۔ پھر کہتے ہیں وَمِنْهُ حَسْبِيَ اللّٰهُ اَيِ اللّٰهُ كَافِيَّ اسی سے حَسْبِيَ اللّٰهُ نکلا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ میرے لئے کافی ہے۔ لیکن حِسَابًا کے اس جگہ ایک اور معنے بھی ہیں اور وہ یہ کہ انہیں ایسی عطا ملے گی جو حساب میں پہلے ہی موجود تھی یعنی مومن جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو یہ یہ جزا ملے گی کیونکہ خدا نے مجھے بتایا ہُوا ہے کہ اس کی طرف سے فلاں فلاں نعمتیں ملیں گی۔ گویا یہاں حِسَابًا کے معنے یہ ہوں گے کہ ایسی عطاء جو پہلے ہی حساب میں آئی ہوئی تھی جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی پیشگوئیوں میں ذکر کیا ہُوا تھا اور جس کے متعلق مومن یہ امید رکھتا تھا کہ چونکہ خدا نے اپنی پیشگوئیوں میں اس کا ذکر کیا ہُوا ہے اس لئے ضروری ہے کہ یہ باتیں ایک دن پوری ہوں اور کافر بھی علم رکھتا تھا کہ مسلمانوں کے متعلق یہ یہ باتیں بیان کی گئی ہیں۔ پس چونکہ اس عطاء کے ساتھ ایک پیشگوئی کا بھی تعلق تھا جس پر مومن بھی ایمان رکھتا تھا اور کافر کو بھی اس کا علم تھا اسلئے عَطَاءً کے ساتھ حِسَابًا کا لفظ بڑھا دیا۔ میرے نزدیک عَطَاءً حِسَابًا سے مراد وہی عطاء ہے جو حساب میں آچکی تھی یعنی جس کا ذکر ہو چکا تھا جس کا مومن کو بھی علم تھا اور کافر کو بھی علم تھا یہاں عَطَاء کی تعداد مراد نہیں بلکہ اس سے عَطَاء کے ملنے کا وعدہ مراد ہے جیسے کہتے ہیں فلاں چیز تو محسوب ہو چکی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز ہمارے ریکارڈ میں آچکی ہے۔ اسی طرح عَطَاءً حِسَابًا کا یہ مطلب ہے کہ وہ سرکاری دیوان میں لکھی ہوئی عطاء ہوگی جس کی پہلے سے پیشگوئی موجود تھی اور جس کا دوست کو بھی علم تھا اور دشمن کو بھی علم تھا۔

حسابًا کے مطابق ضرورت کے مطابق ملنے کے

خِطَابًا

عَطَاءً حِسَابًا سے مراد پہلے سے وعدہ دی گئی عطاء

## ۳۰ٓ حل لغات۔ خِطَابًا: خِطَاب خَاطَبَ

کا مصدر ہے۔ کہتے ہیں خَاطَبَهٗ بِالْكَلَامِ مُخَاطَبَةً وَخِطَابًا۔ كَالَمَهٗ۔ یعنی اس سے آمنے سامنے ہو کر بات کی (اقرب) پس خِطَاب کے معنے ہوں گے آمنے سامنے ہو کر بات کرنا۔

**تفسیر**۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ کہ یہ تیرے رب کی طرف سے جزاء ہے اور جزاء رحیمیت کی علامت ہوتی ہے یعنی جزاء اُسی کو ملتی ہے جو کام کرتا ہے پس پہلے تو فرمایا تھا کہ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ مگر آگے اَلرَّحْمٰن کا لفظ استعمال فرما دیا جو صفت رحمانیت پر زور دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُس ذات کی طرف سے تمہیں یہ جزاء ملے گی جو رحمٰن ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ رحمٰن اس کو کہتے ہیں جو بغیر کام کے بدلہ دے اور جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جزاء کام کے بدلہ میں ہوگی کیونکہ جزاء صفت رحیمیت کے تابع ہے صفتِ رحمانیت کے تابع نہیں۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ

پہلے صفتِ رحیمیت کے نتیجہ میں جزاء قرار دے کر آگے صفتِ رحمانیت کا کیوں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق یہ امر سمجھ لینا چاہیئے کہ یہاں اَلرَّحْمٰن کا لفظ لانے میں دو حکمتیں ہیں ایک تو یہ کہ رحمٰن کا لفظ لا کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو کچھ دیا ہے صفتِ رحیمیت کے تحت دیا ہے مگر وہ صرف رحیم ہی نہیں بلکہ رحمٰن بھی ہے۔ جب صفتِ رحیمیت کے ماتحت اس نے تمہیں یہ یہ کچھ دے دیا تو تم خود ہی سمجھ لو کہ وہ کیا انعام ہوگا جو صفت رحمانیت کے ماتحت تمہیں ملے گا وہ تو لازماً اس سے بہت بڑا انعام ہوگا کیونکہ وہ کسی کام کے بدلہ میں استحقاق کے طور پر نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی صفت رحمانیت کے ماتحت تمہیں اپنے اس انعام سے حصہ دے گا۔ گویا وہ خدا جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے جس نے اپنی صفت رحیمیت کے ماتحت تمہیں اپنی نعمتوں سے حصہ دیا اُس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ رحمٰن ہے جب رحیمیت کے ماتحت اس نے تمہیں ایسی عطا دے دی جو تمہاری تمام ضروریات پر حاوی ہے بلکہ تمہاری ضرورتوں سے بھی زائد ہے تو تم اس کی صفت رحمانیت کے ماتحت آنے والے انعامات کا اندازہ بھی کب کر سکتے ہو۔ گویا یہ نہ سمجھو کہ یہ ہمارا آخری انعام ہے بلکہ یہ انعام تو صرف صفتِ رحیمیت کے نتیجہ میں تمہیں حاصل ہوا ہے صفتِ رحمانیت کے ماتحت جو انعام ملے گا وہ تو بہت ہی زیادہ ہوگا۔

دوسرے رحمٰن کا لفظ لا کر اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ گو ہم اس کے لئے جزاء کا لفظ بولتے ہیں مگر درحقیقت بات وہی ہے جو غالبؔ نے اپنے شعر میں کہی کہ

؎ جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

فرمایا ہمارا یہ احسان ہے کہ ہم اس کے لئے جزاء کا لفظ استعمال کر رہے ہیں ورنہ تم نے جو کچھ کیا وہ تو ہمارے فضلوں کا ایک طبعی نتیجہ تھا اس میں تمہاری کونسی قابلیت تھی اگر ہم قرآن کریم نازل نہ کرتے۔ اگر ہم اپنے کلام میں تمہیں اپنی ہدایت کی راہیں نہ بتاتے تو تم کس طرح وہ مقامات حاصل کر سکتے جو آج تمہیں حاصل ہیں۔ یہ قرآن ہی تھا جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیا۔ یہ قرآن ہی تھا جس نے ابوبکر کو ابوبکر رضؓ۔ عمر کو عمر رضؓ۔ عثمان کو عثمان رضؓ اور علی کو علی رضؓ بنایا۔ بے شک ان لوگوں نے بڑی قربانیاں کیں بیشک ان لوگوں نے دین کی بڑی خدمتیں کیں مگر یہ سب ہماری صفتِ رحمانیت کا نتیجہ تھا۔ یہ سب قرآن کا نتیجہ تھا۔ پس گو ہم تمہارے لئے جزاء کا لفظ استعمال کر رہے ہیں مگر اس بات کو بھول نہ جانا کہ یہ محض ہماری صفتِ رحمانیت کا نتیجہ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (الرحمٰن ع) کہ اگر رحمٰن خدا کی طرف سے قرآن نازل نہ ہوتا۔ اگر اس کی طرف سے تم پر یہ علوم اور معارف کھولے نہ جاتے تو تم کو وہ مقام کبھی حاصل نہ ہو سکتا جس پر آج تم پہنچے ہوئے ہو۔

جزاء کا لفظ بیان کرنے کے بعد رحمٰن کا لفظ بیان کرنے کی دو حکمتیں

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جس رب کی طرف سے تم کو یہ جزاء ملے گی وہ آسمان و زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے ان سب کا رب ہے پس وہ جس پر مہربان ہو یہ سب کچھ اُسے بخش سکتا ہے گویا بخشش کی وسعت کے امکان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا۔ ان کو اختیار نہیں ہے اُس سے خطاب کرنے کا۔ یا اُس سے خطاب کرنے کی وہ طاقت نہیں پاتے۔ دنیا میں بعض کام ایسے ہوتے ہیں جن میں ایک شخص دوسرے پر زور دے کر اُس سے اپنی بات منوا لیتا ہے یا اگر بات نہ منوائے تو اس پر زور ضرور ڈالتا ہے مثلاً زید بکر سے بات کرتا ہے۔ اب خواہ بکر زید کی بات کو مانے یا نہ مانے زید اس سے خطاب کر لیتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ہستی ایسی ہے کہ اس جہان میں بھی اور اگلے جہان میں بھی وہ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا کی شان رکھتی ہے یعنی اُس سے خطاب کرنے پر کوئی انسان قدرت نہیں رکھتا۔ دنیا میں تو انسان کو خدا تعالیٰ پر جو ایمان ہوتا ہے وہ ہوتا ہی ایمان بالغیب ہے اس لئے

# یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا ۗ لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ

(یہ اس دن ہوگا) جس دن کہ روح کامل اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے (اور) وہ بات نہ کر سکیں گے

# اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝

سوائے اس کے جسے رحمان (خدا) نے اجازت دی ہوگی۔ اور وہ (مناسب موقعہ) ٹھیک ٹھیک بات کہیگا ۳۱

اس میں خطاب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن آخرت میں بھی یہی کیفیت ہوگی کہ کوئی انسان اس کی اجازت کے بغیر اس سے گفتگو کرنے کی مقدرت نہیں رکھیگا۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ سے دعا کرنا خطاب نہیں کہلاتا کیونکہ خطاب کے معنے ہوتے ہیں آمنے سامنے ہوکر بات کرنا اور اس طرح خدا تعالےٰ سے بالمشافہ گفتگو کرنے کی کسی انسان میں طاقت نہیں ہے اگلے جہان میں بھی ایسا ہی ہوگا جس کو اجازت ہوگی بولے گا اور جس کو اجازت نہیں ہوگی نہیں بولے گا۔ اور درحقیقت لَا یَمْلِکُوْنَ مِنْہُ خِطَابًا سے مراد ہی یہ ہے کہ یہ چیز اختیاری نہیں ہوگی ورنہ یہ مراد نہیں کہ ایسا ہوگا ہی نہیں۔ لَا یَمْلِکُوْنَ مِنْہُ خِطَابًا میں اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحمانیت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اس سے پہلے الرَّحْمٰن کا لفظ اللہ تعالےٰ نے استعمال کیا تھا جس میں اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ یہ ہمارا احسان ہے کہ ہم نے تم پر اپنا کلام نازل کیا ورنہ کسی انسانی عمل کے نتیجہ میں کلامِ الٰہی نازل نہیں ہوا کرتا۔ پس رحمٰن کے لفظ میں جو اشارہ تھا کہ ہماری صفتِ رحمانیت کے نتیجہ میں ہی محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آئے ہیں اگر ہم محمد صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نہ بھیجتے اور اگر قرآن ہماری طرف سے نازل نہ ہوتا تو تمہیں یہ ترقیات بھی نصیب نہ ہوتیں اور نہ ہماری طرف سے تمہیں کوئی جزا ملتی پس یہ جزا جو تمہیں مل رہی ہے درحقیقت نتیجہ ہے خدائی کلام کا۔ مگر لَا یَمْلِکُوْنَ مِنْہُ خِطَابًا کسی انسان میں اس سے خطاب کرنے کی طاقت نہیں وہ آپ جب فضل نازل کرنا چاہے نازل کر دیتا ہے انسانی مقدرت اور کوشش کا اس میں دخل نہیں ہوتا۔ گویا رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَہُمَا الرَّحْمٰنِ لَا یَمْلِکُوْنَ مِنْہُ خِطَابًا میں رحمٰن کا لفظ جو بطاہر زائد لایا گیا تھا اس کی وجہ بیان کر دی کہ تمہارے بس اور طاقت کی یہ بات نہیں تھی کہ تم اس قدر ترقی کر جاتے۔ تم نے جو کچھ ترقی کی ہے کلامِ الٰہی پر عمل کے نتیجہ میں کی ہے اور کلامِ الٰہی اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحمانیت کا نتیجہ ہوتا ہے زور سے اُسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

الرُّوْح ²

لَا یَمْلِکُوْنَ مِنْہُ خِطَابًا میں صفتِ رحمانیت کی طرف اشارہ

الصَّوَاب

## ۳۱ حل لغات

اَلرُّوْحُ :۔ اَلرُّوْحُ اَلْ اور رُوْح کا مجموعہ ہے۔ اَلْ مختلف اغراض کے لئے کسی لفظ پر داخل کیا جاتا ہے۔ اِن اغراض میں سے ایک یہ غرض بھی ہے کہ یہ بتایا جائے کہ جس لفظ پر اَلْ داخل ہوا ہے وہ فرد اپنے افراد میں سے کامل ہے چنانچہ کہتے ہیں اَنْتَ الرَّجُلُ یعنی مرد کے کمالات کو اگر دیکھا جائے تو اُن کی تعریف تجھ پر ہی صادق آتی ہے۔ باقی مردوں میں کچھ نہ کچھ نقص ہیں۔ یہاں الرُّوْحُ میں بھی اَلْ کمال کے اظہار کے لئے لایا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ ارواح میں سے کامل روح۔

اَلصَّوَابُ :۔ اَللَّائِقُ۔ مناسب۔ اَلْحَقُّ یعنی بات ضِدُّ الْخَطَاءِ۔ درست بات (اقرب)

## تفسیر

یَوْمَ یَقُوْمُ ظرف ہو سکتا ہے لَا یَمْلِکُوْنَ کا بھی اور لَا یَتَکَلَّمُوْنَ کا بھی۔ یعنی لَا یَمْلِکُوْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا یا لَا یَتَکَلَّمُوْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا۔ میں نے جو معنے کئے ہیں اس کے لحاظ سے یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ والی آیت لَا یَتَکَلَّمُوْنَ سے زیادہ تعلق رکھتی ہے گو لَا یَمْلِکُوْنَ سے بھی اس کا تعلق ثابت ہے۔ بہرحال میرے معنوں کے رُو سے

اگر اس آیت کو لَا یَتَکَلَّمُوْنَ کے ساتھ لگایا جائے تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا جس دن روح بھی اور ملائکہ بھی صف باندھ کر کھڑے ہوں گے۔ یہاں روح کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس سے ارواح بنی آدم مراد ہیں۔ حسنؓ اور قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے بنو آدم مراد ہیں۔ شعبی اور سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ اس سے مراد جبریل ہے اور وہ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ (الشعراء ع ۱۱) سے استدلال کرتے ہیں گویا مفسرین کے نزدیک روح سے مراد ارواح بنی آدم۔ بنو آدم یا جبریل ہے۔ بعض نے یہ معنے بھی کئے ہیں گویہ بالکل لغو ہیں کہ اس سے مراد انسانوں کے سوا کوئی اور جنس ہے مگر یہ بالکل لغو بات ہے۔ جب تک قرآن سے ایسی بات ثابت نہ ہو اُسے پیش کرنا خلاف عقل ہے۔ لیکن باقی معنے ایسے ہیں جو اس آیت پر چسپاں کئے جا سکتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کے قول سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ وہ اگلے جہان کی زندگی کو اسی جسم کے ساتھ نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ انسانی جسم فنا ہو جاتے ہیں اور ارواح انسانی کو اگلے جہان میں زندگی دی جاتی ہے اسی لئے انہوں نے معنے یہ کئے ہیں کہ اس سے ارواح بنی آدم مراد ہیں۔ لیکن حسن اور قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے بنو آدم مراد ہیں گویا وہ اس بات کے قائل تھے کہ زندگی اسی مادی جسم کے ساتھ ہوگی۔ یہ بھی ایک اختلاف ہے جو مسلمانوں میں دیر سے چلا آرہا ہے کہ یہی جسم دوبارہ زندہ ہوگا یا کوئی اور جسم ہوگا۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہاں جسم تو ضرور ہوگا مگر وہ ایک روحانی جسم ہوگا یہ موجودہ جسم نہیں ہوگا۔ یہ جسم مٹی میں مل کر فنا ہو جائے گا البتہ اس کے کسی باریک حصہ کو جسے درحقیقت روحانی حصہ ہی کہنا چاہئے اللہ تعالیٰ اُسے نشوونما دینا شروع کر دے گا اور اُسے انسان کا جسم بنا دے گا۔ انسان اپنے ذہن میں اس جسم کو اسی جسم کا ایک تسلسل سمجھے گا اور یہی یقین رکھیگا کہ میں وہی آدمی ہوں جو دنیا میں ہوا کرتا تھا گو وہ جسم اور ہوگا۔

حضرت ابن عباسؓ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہی سمجھتے تھے کہ اگلے جہان میں ہر انسان کو روحانی جسم ملیگا کیونکہ وہ روح سے ارواح بنی آدم مراد لیتے ہیں صرف بنو آدم مراد نہیں لیتے۔ معلوم ہوتا ہے خود قتادہ کو جو اُن کے شاگرد تھے یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ میرے اُستاد تو ارواح بنی آدم مراد لے رہے ہیں اور اس طرح اُن کے اپنے عقیدے سے وہ اختلاف رکھتے ہیں۔ چنانچہ قتادہ کہتے ہیں هٰذَا مَا كَانَ يُخْفِيْهِ ابْنُ عَبَّاسٍ کہ ابن عباس کا مطلب درحقیقت بنو آدم سے ہی تھا مگر انہوں نے اسے لفظوں میں چھپا دیا۔ حالانکہ اُن کو اخفا کی کیا ضرورت تھی۔ معلوم ہوتا ہے ابن عباس کا یہی عقیدہ تھا کہ جو شخص مرجاتا ہے اس کا جسم فنا ہو جاتا ہے زندگی صرف روح کو ہی ملتی ہے۔ بہرحال یہ سارے معنے وہ ہیں جو اگلے جہان پر ہی چسپاں ہوتے ہیں اس جہان پر چسپاں نہیں ہوتے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اس سورۃ میں غلبۂ قرآن۔ غلبۂ اسلام اور قیامت تینوں چیزوں کا ذکر ہے اور تینوں چیزیں مراد لی جا سکتی ہیں لیکن یہ معنے تینوں مقامات پر چسپاں نہیں ہوتے۔ بیشک قیامت پر چسپاں ہو جائیں گے مگر غلبۂ قرآن یا غلبۂ اسلام پر چسپاں نہیں ہو سکیں گے۔ اس لئے اب میں وہ معنے بتاتا ہوں جو اس دنیا پر بھی چسپاں ہو جاتے ہیں اور اگلے جہان پر بھی چسپاں ہو جاتے ہیں اور وہ معنے یہ ہیں کہ میں اَلرُّوْحُ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کامل مراد لیتا ہوں اور یَوْمَ سے مراد قیامت کا وہ دن لیتا ہوں جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم شفاعت فرمائیں گے اور یہ معنے ایسے ہیں جن کی قرآن اور حدیث دونوں سے تصدیق ہوتی ہے۔ حدیثوں سے صاف پتہ لگتا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں پر سخت گھبراہٹ طاری ہوگی اُس وقت آپ فرماتے ہیں کہ میں خدا کے سامنے جا کر لوگوں کی شفاعت کروں گا پس روح سے مراد اس جگہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح کامل ہے۔ تو آیت یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا کے معنے ہوں گے جس دن کھڑی ہوگی روح کامل اور کھڑے ہوں گے ملائکہ صف باندھ کر۔ لَا یَتَکَلَّمُوْنَ اس وقت کوئی نہیں بولے گا اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ

(حاشیہ: يَقُوْمُ الرُّوْحُ کے فقرہ میں ارواح سے مراد مفسرین کے نزدیک۔)

(حاشیہ: الرُّوْحُ سے مراد آنحضرت کی روح)

سوائے اس کے جسے خدا اجازت دے گا اور کہے گا کہ تو لوگوں کی شفاعت کرسکتا ہے۔ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ کے الفاظ بھی بتا رہے ہیں کہ یہاں شفاعت کا ہی ذکر ہو رہا ہے کیونکہ شفاعت ہی ایک ایسی چیز ہے جو اذن سے ہوگی اور وہی لوگ شفاعت کرینگے جنہیں اللہ تعالٰے کی طرف سے اس کی اجازت ملیگی چنانچہ حدیثوں میں آتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں جب قیامت کا دن آئے گا فَيَشْفَعُ النَّبِيُّوْنَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ فَيَقُوْلُ الْجَبَّارُ بَقِيَتْ شَفَاعَتِيْ (بخاری کتاب التوحید) کہ انبیاء بھی شفاعت کرینگے اور ملائکہ بھی اور مومن بھی اس کے بعد اللہ تعالٰے فرمائیگا کہ انبیاء نے بھی شفاعت کرلی۔ ملائکہ نے بھی شفاعت کرلی مومنوں نے بھی شفاعت کرلی۔ اب صرف میں باقی رہ گیا ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد اللہ تعالٰے کی رحمت جوش میں آئے گی اور بہت سے لوگ دوزخ سے نجات پا جائیں گے۔

لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا میں حضرت کے تیار رہنے اور شفاعت کرنے کی طرف اشارہ

یہ اعتراض کرنا کہ اگر یہاں شفاعت کا ذکر ہے تو پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا اور لوگوں کی شفاعت کا کیوں ذکر نہیں۔ درست نہ ہوگا۔ کیونکہ جب بادشاہ کا ذکر کر دیا جائے تو اس کے وزراء اور سکرٹریوں وغیرہ کا ذکر اس میں شامل ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کے تابع ہوتے ہیں۔ جب یہ کہہ دیا گیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کے دن لوگوں کی شفاعت فرمائیں گے تو باقی انبیاء اور شہداء اور صلحاء وغیرہ کا اسی میں ذکر آگیا کیونکہ جب روح کامل کا ذکر کر دیا گیا تو دوسری ارواح جو اس سے نیچے درجہ کی ہیں ان کا ذکر اسی میں خود آگیا اسی طرح گذشتہ انبیاء کی روحیں بھی اَلرُّوْحُ میں شامل سمجھی جائیں گی۔ پس لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ نے صاف بتا دیا کہ یہاں شفاعت کا ہی ذکر ہے اور شفاعت جس روح نے کرنی ہے وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی روح ہے اور اَلرُّوْحُ سے مراد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی نہیں۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ کا اظہار دنیا میں

اس دنیا میں بھی ایسا ہی ہوا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح جب کھڑی ہوئی تو ملائکہ آپ کے ساتھ تھے۔ اس لحاظ سے اس آیت کو اسلامی جنگوں کے متعلق بھی سمجھا جائے گا اور مراد یہ ہوگی کہ جب دشمنوں کے مقابلہ کیلئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نکلیں گے تو فرشتوں کی فوج صف باندھ کر آپ کے ساتھ ہوگی اور وہ آپ کی مدد کریں گے چنانچہ قرآن کریم میں يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ (آل عمران ع ۱۳) کے الفاظ آتے ہیں یعنی اللہ تعالٰے نے بعض جنگوں میں پانچ پانچ ہزار ملائکہ کے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کی۔ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا سے خاص طور پر فتح مکہ کی طرف اشارہ سمجھا جائے گا۔ وہ وقت ایسا تھا کہ جیسے ایک غالب بادشاہ سے مغلوب قوم ڈرتی ہے اسی طرح مشرکین مکہ ڈرتے اور کانپتے ہوئے آپ کے سامنے پیش ہوئے ان کے اندر یہ طاقت ہی نہیں تھی کہ وہ بول سکیں۔ سوائے اس کے کہ رحمٰن خدا کے حکم سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے انہیں بولنے کی اجازت ملتی۔ اس میں کیا شک ہے کہ جہاں تک انسانی انصاف کا سوال ہے کفار مکہ سخت سزا کے مستحق تھے مگر رحمٰن خدا نے ان کے لئے بخشش کا فیصلہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سنا دیا تھا پس جب کفار مکہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ ہم سے وہی سلوک کرو جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کیا تو انہوں نے اسی سبق کو دہرایا جو رحمٰن نے قرآن کریم میں ان کو دیا تھا کہ ہم نے محمدؐ کو مثیل یوسف بنایا ہے اور جب محمد رسول اللہ صلعم نے معاف فرمایا تب بھی رحمٰن کے حکم ہی کو دہرایا۔

پھر تیسرے معنوں کے لحاظ سے اسمیں غلبۂ اسلام کیطرف بھی اشارہ ہے اور مراد یہ ہے کہ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ جس دن ہمارا رسول محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تم پر فتح حاصل کرکے کھڑا ہوگا وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا اور ملائکہ اس کے ساتھ صف باندھے کھڑے ہوں گے۔ یہاں ملائکہ سے ہم فرشتے مراد نہیں لیں گے بلکہ مراد یہ لیں گے کہ ایسے لوگوں کی جماعت آپ کے ساتھ ہوگی جو ملائکہ صفت ہوں گے۔ اسلام کی منظم حکومت دنیا میں قائم ہو جائیگی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست دنیا سے خطاب کرینگے

لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ - اُس وقت وہی بولے گا جسے خدا کی طرف سے بولنے کی اجازت ہوگی یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار میں بولنے والے ایسے ہی ہوں گے جن کو خدا نے اجازت دی ہوگی کہ وہ بولیں - وَقَالَ صَوَابًا اور وہ جو بھی مشورہ دیں گے بالکل صحیح ہوگا - گویا محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی جماعت ملے گی جس کی بڑی خوبی یہ ہوگی کہ وہ تب بولے گی جب خدا اُسے حکم دے گا وہ کوئی کام خدا کے حکم کے بغیر نہیں کرے گی - جو کچھ کہے گی خدا کے حکم کے مطابق کہے گی اور جو کچھ کرے گی خدا کے حکم کے مطابق کرے گی - باقی لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ خدا کی اجازت کی طرف نہیں دیکھتے بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں - خدا نے نہیں کہا کہ رنڈیوں کا ناچ دیکھو مگر وہ رنڈیوں کا ناچ دیکھتے ہیں - خدا نے نہیں کہا کہ تم بیہودہ اور گندے گانے سنو مگر وہ اپنی ساری لذت انہی گندے گانوں میں سمجھتے ہیں - خدا نے نہیں کہا کہ لغو قصے کہانیوں میں اپنا وقت گذارو - مگر وہ اپنا اکثر وقت ایسی ہی گندی کتابوں اور ناولوں کے پڑھنے میں صرف کر دیتے ہیں - گویا وہ جو کچھ کہتے ہیں خدا کے اذن کے بغیر اور اس کے منشاء کے خلاف کرتے ہیں - مگر محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ ایسی جماعت دے گا جس کے افراد اُسی وقت بولیں گے جب خدا اُن سے کہیگا کہ بولو - اس کے بغیر وہ کوئی بات نہیں کرینگے وَقَالَ صَوَابًا اور پھر وہ سچے مشورے دینے والے ہوں گے جھوٹے مشورے دینے والے اور خوشامدی نہیں ہونگے گویا ان آیات میں دربار محمدیؐ کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ اس اس طرح ہوگا -

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس دن ہمارے رسول کی روح کھڑی ہوئی اور روح کے کھڑے ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ دنیا پر غالب آ گئی - گویا قیام سے مراد ظاہری قیام نہیں بلکہ دنیا پر غالب آنا اور اُسے اپنے زیر نگیں کر لینا ہے - فرمایا جس دن یہ کامل روح کھڑی ہو جائے گی اور ملائکہ اس کے ساتھ صف باندھے کھڑے ہوں گے تو لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا وہ لوگ جو اس کے ساتھی ہوں گے اُن کی یہ خصوصیت ہوگی کہ وہ نہیں بولیں گے جب تک خدا ان کو بولنے کے لئے نہ کہے - وہ اُسی وقت بولیں گے جب خدا کی طرف سے ان کو بولنے کا حکم ہوگا اور اُسی قدر بولیں گے جس قدر بولنے کا خدا انہیں حکم دے گا - وہ لغو اور بیہودہ باتیں محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں نہیں کریں گے بلکہ ہر بات خدا تعالیٰ کے احکام اور اس کی ہدایت کے مطابق کرینگے

يَقُوْمُ الرُّوْحُ سے مراد علیہ السلام

قرآن کریم میں بعض اور جگہ بھی اس کے متعلق اشارے پائے جاتے ہیں - مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (المائدہ ع ۱۴) اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے لغو سوالات سے صحابہ کو روک دیا کہ یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس کے آداب کے خلاف ہے - اور فرمایا کہ ایسی باتیں نہ پوچھو جن کا پوچھنا تمہارا خدا پسند نہیں کرتا بلکہ ایسی ہی باتیں پوچھو جن کا پوچھنا تمہارا خدا پسند کرتا ہے - یہی بات اس آیت میں بیان کر دی گئی کہ لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا صحابہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں وہی باتیں کریں گے جن باتوں کی انہیں خدا کی طرف سے اجازت ہے - اور جب بھی بولیں گے صحیح اور درست مشورہ دیں گے - اُن کے مشوروں میں منافقت نہیں ہوگی - وہ کسی سے ڈر کر بات نہیں کریں گے - وہ کسی خود غرضی کے ماتحت کوئی مشورہ پیش نہیں کریں گے بلکہ وہ جو کچھ کہیں گے بالکل درست اور صحیح ہوگا اور جو مشورہ دیں گے وہ سچا مشورہ ہوگا - اُن کے نفس کی کسی خواہش کا اس میں دخل نہیں ہوگا ؛

لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ میں دربار محمدیؐ کا نقشہ

---

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ○

یہ دن ہو کر رہنے والا ہے۔ پس (تم میں سے) جو شخص چاہے اپنے رب کے پاس (اپنا) ٹھکانہ بنا لے ۵۳۲

اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ ۖ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا

ہم نے تم کو ایک قریب زمانہ میں آنیوالے عذاب سے یقیناً ہوشیار کر دیا ہے۔ جس دن کہ انسان اُس کو دیکھ لے گا جو

ع ۲

قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ○

۲

اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہوگا اور کافر (اس دن) کہہ اُٹھے گا اے کاش! (کاش) میں مٹی ہوتا ۵۳۳

مَاٰبٌ **۵۳۲ حل لغات**۔ مَاٰب کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ النّبا ۵۳

اَلْحَقُّ اَلْحَقُّ کے معنے ہیں اَلْاَمْرُ الْمَقْضِیُّ فیصلہ شدہ بات۔ اَلْمَوْجُوْدُ الثَّابِتُ ایسی چیز جو موجود اور ثابت ہو (اقرب)

**تفسیر**۔ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ۔ یہ دن آکر رہنے والا ہے۔ حَقّ کے معنے ہوتے ہیں وَاقِع۔ ثَابِت۔ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا۔ پس جو چاہے اپنے رب کو مَاٰب بنالے۔ مَاٰب کے معنے ہوتے ہیں وہ چیز جس کی طرف انسان بار بار لوٹ کر جاتا ہے چونکہ اسلام خدا کو مومن کا معشوق قرار دیتا ہے اس لئے فرماتا ہے اگر تم اپنے دعویٰ عشق میں صادق ہو تو پھر تمہارا کام یہ ہے کہ جب بھی تم دنیا کے کاموں سے فارغ ہو جاؤ خدا کو مَاٰب بناؤ اور اُسی سے اپنی محبت اور عشق کا اظہار کرو۔ دوسری جگہ اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ (الانشراح) کہ جب تم دنیا کے دھندوں سے فارغ ہو جاؤ تو پھر خدا کی طرف ہی رغبت کرو اور اُسی کو اپنا مَاٰب بناؤ۔ اُسی کی طرف جاؤ اور بار بار جاؤ۔ مثلاً انسان کوئی کتاب لکھ رہا ہو تو اِدھر فقرہ ختم ہو اور اُدھر اس کی زبان سے نکلے سُبْحَانَ اللّٰہ۔ یا ایک شخص کھانا کھا رہا ہو تو اِدھر لقمہ چبانا جائے اور اُدھر سبحان اللہ سبحان اللہ کہتا جائے گویا اُس کا مَاٰب صرف خدا ہی ہو اور کسی طرف اُس کی حقیقی توجہ نہ ہو۔

اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ چونکہ وہ دن آنیوالا ہے جس میں اسلام کو چاروں اطراف میں غلبہ حاصل ہو جائیگا اس لئے کئی لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوگی کہ ہم کو بھی اس عزت میں سے کچھ حصہ مل جائے ایسے لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے کہ اگر تمہاری سچے دل سے یہ خواہش ہو کہ تم بھی ان کامیابیوں میں حصہ لو اور تمہیں بھی کوئی مقام حاصل ہو جائے تو تمہاری نصیحت ہے کہ تم اپنے رب کو مَاٰب بنالو۔ اور لوٹ لوٹ کر خدا کی طرف جاؤ۔ تمہیں کام سے ذرا بھی فراغت نصیب ہو۔ تو تمہارا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو جاؤ۔ اُس سے اپنی محبت بڑھاؤ۔ اُس کی طرف دوڑ دوڑ کر جاؤ اور اُس کو اپنی جائے پناہ قرار دو۔ صرف پانچ وقت کی نمازیں اور تیس دن کے روزے انسان کے کام نہیں آتے بلکہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا اور انسان کا بار بار اس کی طرف لوٹنا۔ یہ چیز ہے جو انسان کے کام آیا کرتی ہے۔

اَنْذَرْنٰكُمْ **۵۳۳ حل لغات**۔ اَنْذَرْنٰكُمْ اَنْذَرَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اور اَنْذَرَهٗ بِالْاَمْرِ کے معنے ہوتے ہیں اَعْلَمَهٗ وَحَذَّرَهٗ مِنْ عَوَاقِبِهٖ قَبْلَ حُلُوْلِهٖ کسی خطرے سے اس کو آگاہ کیا اور خطرے کے آنے سے پیشتر ہی اُس کے بُرے انجاموں سے خبردار کر دیا (اقرب) پس اَنْذَرْنٰكُمْ کے معنے ہوں گے کہ ہم نے عذاب قریب کے آنے سے پیشتر ہی اس سے اور اس کے انجاموں سے خبردار کر دیا ہے۔

**تفسیر**۔ فرماتا ہے ہم نے تمہیں عذابِ قریب سے ڈرا دیا ہے۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہاں اسلام اور قرآن کا غلبہ بھی مراد ہے صرف اگلا جہان مراد نہیں کیونکہ یہاں ایک بات سے دوسری بات کا نتیجہ نکالا گیا ہے۔ فرماتا ہے ہم نے عذابِ قریب سے تمہیں ڈرا دیا ہے۔ جو ثبوت ہوگا اس بات کا کہ عذابِ بعید بھی آنے والا ہے۔

يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ:۔ يَوْمَ عَذَابًا کا بدل ہے۔ پس اس جملہ کے یہ معنے ہیں کہ ہماری مراد اس سے وہ عذاب ہے جس دن انسان اپنے کاموں کے نتائج کو دیکھ لے گا۔ دیکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اتفاقی طور پر دیکھ لیگا بلکہ مراد یہ ہے کہ اُس پر اپنی ناکامی واضح ہو جائے گی۔ وہ دیکھ لے گا کہ اس نے اپنے کئے کا بدلہ پا لیا۔ مسلمان جیت گئے اور اُن کے دشمن ذلیل اور رُسوا ہو گئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غالب آنے کے ساتھ کفّار نے بھی اپنا انجام دیکھ لیا اور مومنوں نے بھی اپنے انعامات دیکھ لئے۔ یہاں تک کہ ابو قحافہ کے بیٹے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسی کے نتیجہ میں بادشاہت کا مقام حاصل کر لیا ورنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حیثیت کیا تھی۔ مکّہ کے ایک تاجر سے بڑھکر ان کی کوئی حیثیت نہ تھی مگر گجا مکّہ کا ایک تاجر جسے مکّہ کی ریاست بھی حاصل نہیں تھی اور گجا یہ کہ وہ ساری وسطی دنیا کے بادشاہ بن گئے۔ جب وہ بادشاہ ہوئے تو ایک شخص اُن کے والد ابو قحافہ کے پاس دوڑا دوڑا گیا۔ ابو قحافہ اُن کے والد کی کنیت تھی اور وہ اُن دنوں مکّہ میں تھے۔ چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فوت ہو چکے تھے اِس لئے تمام مسلمانوں میں سخت گھبراہٹ تھی کہ اب نہ معلوم کون مسلمانوں کا بادشاہ بنتا ہے۔ وہ دوڑا دوڑا وہاں پہنچا اور کہنے لگا ابوبکر بادشاہ ہو گئے ہیں۔ اُن کے والد نے یہ بات سُنی تو کہنے لگے کون ابوبکر؟ گویا اُن کو یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ بادشاہ بننے والا اُن کا بیٹا ہو سکتا ہے۔ اُس نے کہا وہی جو تمہارا بیٹا ہے اور کون۔ انہوں نے سوال کرنا شروع کیا۔ کیا فلاں قبیلہ نے مان لیا؟ کیا فلاں قبیلہ نے مان لیا؟ کیا فلاں قبیلہ نے مان لیا؟ جب اُس نے سب سوالوں کا جواب اثبات میں دیا تو وہ کہنے لگے کیا بنو ہاشم نے بھی مان لیا ہے؟ وہ کہنے لگا بنو ہاشم نے بھی مان لیا ہے۔ اِس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد کہنے لگے اللہ! اللہ! محمد صلے اللہ علیہ وسلم سچے رسول تھے جن کے اثر کے نیچے ابو قحافہ کے بیٹے کو عرب کے قبائل اور سرداروں نے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔

غرض يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ سے اِسی طرف اشارہ تھا کہ ہر اِک اپنے اپنے کام کے مطابق نتیجہ دیکھ لے گا۔ چنانچہ لوگوں نے دیکھ لیا کہ رؤساءِ عرب ذلیل و رسوا ہو گئے اور ابو قحافہ کے بیٹے کی بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب نے بھی اطاعت اختیار کر لی۔

اگلے جہان کے لحاظ سے وَيَقُوْلُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا کے یہ معنے ہوں گے کہ کافر عذاب کو دیکھکر حسرت کے ساتھ کہیگا کہ کاش میں مٹی ہوتا اور اس عذاب کو نہ دیکھتا۔ اور اس جہان کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہیں کہ کاش میں مٹی ہوتا اور اس ندامت اور شرمندگی کی ذلت سے بچ جاتا جو مجھے دیکھنی نصیب ہوئی چنانچہ مسلمانوں کی شوکت کے زمانہ میں کفّار کی یہی حالت ہوئی۔ مکّہ کے وہ بڑے بڑے رؤساء اور سردار جو نہایت حقارت کے ساتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو مکّہ کی گلیوں میں گھسیٹا کرتے تھے جب دیکھتے ہوں گے کہ وہ معمولی غلام جن کو ہم خاطر میں بھی نہ لاتے تھے جن کی تحقیر ہمارا دن رات کام تھا اور جن کو مٹانے کی ہم نے بڑی کوششیں کیں وہ ہم پر غالب آ چکے ہیں اور ہم اُن کے سامنے معمولی غلاموں کی طرح کھڑے ہیں تو اُن کے دلوں میں کیا کیا حسرتیں پیدا ہوتی ہوں گی اور کس طرح وہ اپنے دلوں میں بار بار کہتے ہوں گے کہ کاش ہم اس سے پہلے مر کر فنا ہو چکے ہوتے اور اس شرمندگی اور ذلت کو دیکھنے سے بچ جاتے۔ حضرت عمرؓ ایک دفعہ اپنے زمانۂ خلافت میں مکّہ تشریف لائے تو شہر کے بڑے بڑے رؤساء جو مشہور خاندانوں میں سے تھے اُن کے

---

(حاشیہ)

۱؎ إِنَّا أَنْذَرْنَاكُمْ کے فقرہ میں غلبہ اسلام کی طرف اشارہ

۲؎ إِنَّا أَنْذَرْنَاكُمْ کے فقرہ میں موعود عذاب کے آنے کا وقت

۳؎ مسلمانوں کی شوکت کے ایام میں کافر کا حسرت سے يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا کہنا۔

ملنے کے لئے آئے۔ انہیں خیال پیدا ہوا کہ حضرت عمرؓ ہمارے خاندانوں سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے جبکہ وہ خود بلند ہیں ہمارے خاندانوں کا بھی پوری طرح اعزاز کریں گے اور ہم پھر اپنی گم گشتہ عزت کو حاصل کرسکیں گے۔ چنانچہ وہ آئے اور انہوں نے آپ سے باتیں شروع کر دیں ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ حضرت عمرؓ کی مجلس میں بلالؓ آ گئے۔ تھوڑی دیر گذری تو حضرت خبابؓ آ گئے اور اسی طرح یکے بعد دیگرے اولیں الایماؔ غلام آتے چلے گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ان رؤسا یا اُن کے آباء کے غلام رہ چکے تھے اور جن پر وہ اپنی طاقت کے زمانہ میں شدید ترین مظالم کیا کرتے تھے حضرت عمرؓ نے ہر غلام کی آمد پر اُس کا استقبال کیا اور رؤسا سے کہا کہ آپ ذرا پیچھے ہو جائیں اور ان کو آگے بیٹھنے کے لئے جگہ دے دیں حتیٰ کہ وہ نوجوان رؤسا جو آپ سے ملنے آئے تھے ہٹتے ہٹتے دروازہ تک جا پہنچے۔ اُس زمانہ میں کوئی بڑے بڑے ہال تو ہوتے نہیں تھے ایک چھوٹا سا کمرہ ہوگا اور چونکہ وہ سب اس میں سما نہیں سکتے تھے اس لئے اُن کو پیچھے ہٹتے ہٹتے جوتیوں میں بیٹھنا پڑا۔ جب کہ وہ رؤسا جوتیوں میں جا پہنچے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح ایک کے بعد ایک مسلمان غلام آیا اور اُس کو آگے بٹھانے کے لئے اُن کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا گیا تو اُن کے دل کو سخت چوٹ لگی۔ خدا تعالیٰ نے بھی اُس وقت کچھ ایسے سامان پیدا کر دئے کہ یکے بعد دیگرے کئی ایسے مسلمان آ گئے جو کسی زمانہ میں کفار کے غلام رہ چکے تھے۔ اگر ایک بار ہی وہ رؤسا پیچھے ہٹتے تو اُن کو احساس بھی نہ ہوتا مگر چونکہ بار بار اُن کو پیچھے ہٹنا پڑا اس لئے وہ اس بات کو برداشت نہ کرسکے اور اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ باہر نکل کر وہ ایک دوسرے سے شکایت کرنے لگے کہ دیکھو آج ہماری کیسی ذلت اور رسوائی ہوئی ہے۔ ایک ایک غلام کے آنے پر ہم کو پیچھے ہٹایا گیا۔ یہاں تک کہ ہم جوتیوں میں جا پہنچے۔ اس پر اُن میں سے ایک نوجوان بولا اس میں کس کا قصور ہے عمرؓ کا ہے یا ہمارے باپ دادا کا؟ اگر تم سوچو تو معلوم ہوگا کہ اس میں عمرؓ کا

آنحضرت صلعم کو کم پر قبول نہ کرنے کی وجہ جو کفار مکہ کے دلوں میں حسرت

کوئی قصور نہیں۔ یہ ہمارے باپ دادا کا ہی قصور تھا جس کی آج ہمیں سزا ملی۔ کیونکہ خدا نے جب اپنا رسول مبعوث فرمایا تو ہمارے باپ دادا نے مخالفت کی مگر ان غلاموں نے اُس کو قبول کیا اور ہر قسم کی تکالیف کو خوشی سے برداشت کیا اس لئے آج اگر ہمیں مجلس میں ذلیل ہونا پڑا ہے تو اس میں عمرؓ کا کوئی قصور نہیں ہمارا اپنا قصور ہے۔ اس کی یہ بات سُن کر دوسرے کہنے لگے ہم نے یہ تو مان لیا کہ یہ ہمارے باپ دادا کے قصور کا نتیجہ ہے مگر کیا اس ذلت کے داغ کو دور کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں؟ اس پر سب نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہماری سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آتی چلو حضرت عمرؓ سے ہی پوچھیں کہ اس کا کیا علاج ہے۔ چنانچہ وہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے آج جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے اُس کو آپ بھی خوب جانتے ہیں اور ہم بھی خوب جانتے ہیں۔ حضرت عمرؓ فرمانے لگے معاف کرنا میں مجبور تھا کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی مجلس میں معزز تھے۔ اس لئے میرا بھی فرض تھا کہ میں اُن کی عزت کرتا۔ انہوں نے کہا ہم جانتے ہیں یہ ہمارے ہی قصور کا نتیجہ ہے لیکن آیا اس عار کو مٹانے کا کوئی بھی ذریعہ ہے؟ ہم لوگ تو اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ اُنہیں مکہ میں کس قدر رسوخ حاصل تھا لیکن حضرت عمرؓ اُن کے خاندانی حالات کو خوب جانتے تھے۔ آپ مکہ میں پیدا ہوئے اور مکہ میں ہی بڑے ہوئے اس لئے آپ جانتے تھے کہ ان نوجوانوں کے باپ دادا کس قدر عزت رکھتے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ کوئی شخص ان کے سامنے آنکھ اٹھانے کی بھی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اور آپ جانتے تھے کہ اُنہیں کس قدر رعب اور دبدبہ حاصل تھا۔ جب انہوں نے یہ بات کہی تو حضرت عمرؓ کے سامنے ایک ایک کر کے یہ تمام واقعات آ گئے اور آپ پر رقت طاری ہو گئی۔ اُس وقت آپ غلبۂ رقت کی وجہ سے بول بھی نہ سکے صرف آپ نے ہاتھ اُٹھایا اور شمال کی طرف انگلی سے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ شمال میں یعنی شام میں بعض اسلامی جنگیں ہو رہی ہیں اگر تم اُن

جنگوں میں شامل ہو جاؤ تو ممکن ہے اس کا کفارہ ہو جائے چنانچہ وہ وہاں سے اٹھے اور جلد ہی ان جنگوں میں شامل ہونے کے لئے چل پڑے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اُن میں سے ایک شخص بھی زندہ واپس نہیں آیا سب اسی جگہ شہید ہو گئے اور اس طرح انہوں نے اپنے خاندانوں کے نام پر سے داغِ ذلّت کو مٹا دیا۔ یہ لوگ تو مخلص تھے رسول کریم صلے اللہ علیہ آلہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے جب اُن کا یہ حال تھا تو سمجھ لو کہ کفار کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ وہ کس طرح ان حالات کو دیکھ دیکھ کر کُڑھتے ہوں گے اور کہتے ہوں گے ہائے ہم مٹ جاتے۔ ہم مر کر فنا ہو چکے ہوتے مگر یہ دن ہمیں دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ جب وہی لوگ جن کو وہ گلیوں میں گھسیٹا کرتے تھے جن کے سینوں پر وہ بڑے بڑے گرم پتھر رکھ کر انہیں اسلام سے پھرانے کی کوشش کرتے تھے۔ جن کو مارتے اور گالیاں دیتے اور ہر قسم کے دُکھ پہنچایا کرتے تھے فتح مکہ کے دن گھوڑے دوڑاتے ہوئے آتے ہوں گے اور یہ لوگ اپنے گھروں میں چھپکر بیٹھ رہے ہوں گے کہ کہیں ان لوگوں کی ہم پر نظر نہ پڑ جائے۔ تو کس طرح اُن کو اپنی عزتیں خاک میں ملتی ہوئی نظر آتی ہونگی۔ کس طرح بار بار اُن کی زبان سے یہ نکلتا ہوگا کہ کاش ہم اس سے پہلے ہی مر کر فنا ہو چکے ہوتے اور اپنی ذلّت کا یہ دن نہ دیکھتے۔ غرض ابتدائی ایام اسلام میں ہی اللہ تعالیٰ نے وہ سارا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا جو آئندہ زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کا ہونے والا تھا۔ ابھی وہ بہت سے لوگ زندہ تھے۔ جنہوں نے اس نقشہ کو ایک مجنون کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ دی تھی کہ خدا کی بات پوری ہو گئی اور ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس نقشہ کے مطابق پیدا ہوتے ہوئے حالات دیکھ لئے ؛

۲۱۔ پیشگوئیوں کے مطابق اسلامی غلبہ

# سُوْرَۃُ النّٰزِعٰتِ مَکِّیَّۃٌ وَّہِیَ سِتٌّ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰیَۃً دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ وَفِیْہَا رُکُوْعَانِ

سورۃ نازعات۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ اور اس کی بسم اللہ کے علاوہ چھیالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع ہیں۔ ۵۱

**سورۃ نازعات مکی ہے**

۵۱ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا قول ہے کہ یہ مکی سورۃ ہے۔ اور اس کے متعلق کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا سب مفسرین کا اس سورۃ کے مکی ہونے پر اتفاق ہے۔

**سورۃ نازعات کا سورۃ نبأ سے تعلق**

میرے نزدیک اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے یہ جوڑ ہے کہ پہلی سورۃ میں بیان کیا گیا تھا کہ مسلمان جو آج تمہیں حقیر نظر آتے ہیں جن کی تعداد دیکھ کر تم ہنستے ہو اور جن کے متعلق تم یہ خیال کرتے ہو کہ انہوں نے دنیا میں کیا تغیر پیدا کرنا ہے یہ ایک دن تم پر غالب آجائیں گے اور تم ان کے مقابلہ میں بالکل ذلیل ہو جاؤ گے۔ چنانچہ سورۃ نبأ میں جو اس وقت نازل ہوئی جب سارے مکہ میں مسلمانوں کی کل تعداد زیادہ سے زیادہ چالیس تھی بڑے زور سے یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ وہ دن آنیوالا ہے جب مسلمان غالب آجائیں گے اور مشرکین کو حکم دیدیا جائے گا کہ وہ مکہ سے نکل جائیں۔

**سورۃ نازعات کے مضمون کا خلاصہ**

جب انبیاء کی طرف سے پیشگوئیاں کی جاتی ہیں تو دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ ہوتے ہیں جو ہر چیز کو روحانی نظر سے دیکھتے ہیں جب انہیں کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایسا کہا ہے تو وہ صرف اس امر کی تحقیق کرتے ہیں کہ آیا خدا تعالیٰ نے ایسا کہا ہے یا نہیں کہا۔ جب انہیں معلوم ہوجاتا ہے کہ فلاں بات خدا تعالیٰ نے ہی کہی ہے تو انکو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ نے ایسا کہا ہے تو لازماً ایک نہ ایک دن ویسا ہی ہو بھی جائے گا اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی تسلی محض اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ خدا تعالیٰ ایسا کہتا ہے بلکہ وہ اس کے شواہد اور آثار بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ گویا ایک خبر کے متعلق باوجود یہ سن لینے کے کہ وہ خدا تعالیٰ نے دی ہے کسی انسان نے وہ خبر نہیں دی پھر بھی اُن کا دل تسلی نہیں پاتا۔ بلکہ وہ مادی دنیا میں اس کی صداقت کے کچھ آثار بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں خدا تعالیٰ بھی جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اسباب اور ذرائع سے کام لیتا ہے بغیر اسباب اور ذرائع کے کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن ہمیں اس دنیا میں وہ سامان نظر نہیں آتے۔ وہ ذرائع اور وہ اسباب دکھائی نہیں دیتے جن سے یہ کام ہوگا۔ انکی فطرتیں تب تسلی پاتی ہیں جب اُن پیشگوئیوں کی صداقت کے متعلق اس مادی دنیا میں آثار ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر اس قسم کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو جائیں تب وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہی اسباب اور ذرائع ایک دن اس کام کے پورا کرنے کا ذریعہ بن جائیں گے۔ پس چونکہ دنیا میں بعض طبائع اس قسم کی ہوتی ہیں جن کا اطمینان اُس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ پیشگوئی کی صداقت کے آثار دیکھنا شروع نہ کر دیں اس لئے جب یہ پیشگوئی کی گئی کہ مسلمان ایک دن غالب آجائیں گے اور نہ صرف غالب آئیں گے بلکہ اُن کا غلبہ اس قدر بڑھ جائے گا کہ وہ مشرکین کو مکہ میں سے نکال دیں گے تو ایسے لوگ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے تھے اور کہتے تھے یہ تیس چالیس آدمی ہیں۔ دشمن ان کو مارتا ہے۔ پیٹتا ہے۔ دُکھ دیتا ہے۔ گرم گرم پتھروں پر لٹاتا ہے۔ مکہ کی گلیوں میں ان کی ٹانگوں میں رسیاں باندھ کر گھسیٹا جاتا ہے اور ان کی طرف سے کہا یہ جا رہا ہے کہ ہم ایک دن ساری دنیا پر غالب آجائیں گے اور مشرکین کو اس سرزمین سے نکال دیں گے آخر یہ ہوگا کس طرح؟ ہمیں تو اس مادی دنیا میں اس غلبہ کے ظہور کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ پس وہ سوال کرتے تھے کہ یہ غلبہ کیونکر ہوگا؟ سورۃ نازعات میں اُن کے اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے اور مستقبل کا وہ مَفَازٌ جس کا سورۃ نبأ میں ذکر کیا گیا تھا اُسکی تفصیل بتائی گئی ہے کہ مومن کس طرح اس دنیا میں ترقی کرنا شروع کریں گے۔ کس طرح انہیں غلبہ حاصل ہوگا اور کونسے

# بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

## وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ○

(مجھے) قسم ہے ان ہستیوں کی جو کھینچتی ہیں پوری طرح [۲]

وہ آثار رونما ہوں گے جن سے تم بھی یہ اندازہ لگا سکو گے کہ یہ قوم ایک دن غالب آ جائے گی۔ اگلے جہان میں مسلمانوں کو جو کچھ حاصل ہوگا وہ تو ہوگا ہی۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ ہم اسی دنیا میں مسلمانوں کی ترقی کے سامان کریں گے اور مسلمانوں کی یہ ترقی اس بات کا ثبوت ہوگی کہ اگلے جہان کے متعلق اللہ تعالیٰ کے جو وعدے ہیں وہ بھی ایک دن پورے ہو کر رہیں گے چنانچہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اس دورِ ترقی کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں اور پھر جنگوں کی بھی خبر دی ہے گویا بتایا کہ تم جو پوچھتے ہو کہ مسلمانوں کو کس طرح ترقی حاصل ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ جنگیں ہوں گی اور یہ لوگ تم پر غلبہ و اقتدار حاصل کریں گے۔ گویا بتایا کہ مسلمان اپنی اندرونی اصلاح کے بعد اُسی ہتھیار کی طرف توجہ کریں گے جو آج اُن کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔ اب تو تم ان پر تلوار سے حملہ کر رہے ہو۔ انہیں دُکھوں پر دُکھ اور تکلیفوں پر تکلیف دیتے چلے جاتے ہو اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت صبر سے کام لے رہے ہیں تمہارے خلاف اپنا ہاتھ نہیں اٹھاتے مگر ایک دن آئے گا جبکہ یہ دیکھتے ہوئے کہ تم مسلمانوں پر حملہ کرنے سے باز نہیں آ رہے تلوار کا تلوار سے مقابلہ کرنے کا حکم دیا جائے گا اور تمہیں ان مظالم کا مزہ چکھایا جائے گا۔ جیسے سویا ہوا آدمی بیدار ہو جاتا ہے اسی طرح مسلمانوں کی اندرونی اصلاح اور اُن کی روحانی تربیت کے بعد ایک دن ہم اُن کو بیدار کر دیں گے اور انہیں اجازت دے دیں گے کہ اب کھڑے ہو جاؤ اور تلوار کا تلوار سے مقابلہ کرو۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے سوئے شیر کے جسم پر ایک چوہا بھی دوڑ سکتا ہے مگر جب وہ جاگتا ہے تو ایک مسلح انسان کے لئے بھی اس کا مقابلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اس سورۃ میں یہی مضمون بیان فرماتا ہے کہ پہلے وہ مسلمانوں کو سُلائے رکھیگا۔ کفار اُن پر ظلم پر ظلم کرتے چلے جائیں گے اور وُہ اُن کے مقابلہ میں زبان تک نہیں ہلائیں گے یہاں تک کہ وہ خیال کرنے لگ جائیں گے کہ مسلمان کیا ہیں مٹی کی مُورتیں ہیں انہیں جس طرح چاہو تکلیف دے لو مگر ایک دن ہم اپنے اس سوئے ہوئے شیر کو جگا دیں گے اور جب سویا ہوا شیر اُٹھتا ہے تو اس کا جسم کانپتا ہے اور پھر بدی لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اُس وقت اس شیر کا مقابلہ کرنا کوئی آسان بات نہیں ہوتا۔ پس اللہ تعالیٰ اس سورۃ میں یہ ذکر فرماتا ہے کہ ایک دن ایسا ہوگا جب ہمارا یہ شیر ہمارے حکم کے مطابق اُٹھے گا اُس وقت لڑائیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جائے گا ایک کے بعد دوسری۔ دوسری کے بعد تیسری اور تیسری کے بعد چوتھی تبدیلی رونما ہوگی اور اس طرح مسلمانوں کی ترقی کے لئے مادی تدابیر بھی اختیار کی جائیں گی۔

سورۃ نازعات میں مسلمانوں کی ترقی کے ذرائع کی طرف اشارہ

گو یہ بھی ایک آئندہ کی ہی خبر ہے مگر جب کسی چیز کی مادی شکل بتا دی جائے تو انسان کو کچھ تسلی ہو جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو بات پوری ہو جائے گی۔ پہلے تو منکر خیال کرتا تھا کہ شاید قرآن کریم نے سورۃ نبأ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ فرشتے اُتریں گے اور لوگوں کی گردنیں مروڑ کر انہیں اسلام میں داخل کر دیں گے مگر جب مادی شکل بتا دی گئی تو انسانی نفس جو مادیات کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے اس کے لئے تسلی پانے کے زیادہ قریبی دلائل پیدا ہو گئے اور اُسکے اطمینان کی مزید صورت پیدا ہو گئی۔

[۲] حل لغات۔ نَازِعَات: نَازِعَةٌ سے جمع کا نَازِعَات

صیغہ ہے جو نَزَعَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے۔ نَزَعَ کے کئی مصدر آتے ہیں اس لئے جب نَزَعَ کا مصدر نَزْعًا ہو تو اُس وقت نَزَعَ الشَّیْءَ عَنْ مَکَانِہٖ کے معنے ہوتے ہیں قَلَعَہٗ۔ کسی چیز کو جڑ سے اُکھیڑ دیا۔ اور جب نَزَعَ الْاَمِیْرُ الْعَامِلَ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں عَزَلَہٗ۔ امیر نے عامل کو معزول کر دیا۔ نیز کہتے ہیں نَزَعَ بِالسَّھْمِ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ رَمٰی بِہٖ اُس نے تیر پھینکا۔ اسی طرح کہتے ہیں نَزَعَ فِی الْقَوْسِ اَیْ مَدَّھَا اَیْ جَذَبَ وَتَرَھَا یعنی اُس نے کمان کا چلّہ خوب زور سے کھینچا۔ اور نَزَعَ عَنِ الْقَوْسِ کے معنے ہوتے ہیں رَمٰی عَنْھَا کمان سے تیر کو پھینکا یعنی تیر اندازی کی۔ اور نَزَعَ الدَّلْوَ کے معنے ہوتے ہیں جَذَبَھَا وَاسْتَقٰی بِھَا۔ کنوئیں سے ڈول کے ذریعہ پانی کھینچا اور لوگوں کو پلایا۔ اور جب نَزَعَ کا لفظ مریض کے لئے استعمال کریں اور نَزَعَ الْمَرِیْضُ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَشْرَفَ عَلَی الْمَوْتِ۔ مریض موت کے قریب پہنچ گیا۔ چنانچہ اُردو میں بھی کہتے ہیں فلاں شخص کا تو اب نَزْع کا وقت ہے۔

اور جب نَزَعَ کا مصدر نُزُوْعًا ہو۔ تو نَزَعَ عَنْ کَذَا کے معنے ہوتے ہیں کَفَّ وَانْتَھٰی عَنْہُ وہ کوئی کام کرنے سے رُک گیا اور باز آگیا۔ اِسی مصدر میں جب کہیں گے نَزَعَ الْوَلَدُ اَبَاہُ یا نَزَعَ الْوَلَدُ اِلٰی اُمِّہٖ تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَشْبَہَ بیٹا اپنے باپ یا اپنی ماں کے مشابہ ہو گیا۔ اور جب نَزَعَ کا نَزَاعَۃً وَنِزَاعًا وَنُزُوْعًا مصدر ہو تو نَزَعَ اِلَی الشَّیْءِ کے معنے ہوں گے اِشْتَھَاہُ۔ اُس نے فلاں چیز کی خواہش کی اور جب کہیں نَزَعَ اِلٰی اَھْلِہٖ تو اس کے معنے ہوتے ہیں اِشْتَاقَ اس کے دل میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ یا انگریزی محاورہ کے مطابق کہیں گے فلاں شخص ہوم سِک HOME SICK ہو گیا۔ اس مصدر کے ماتحت جب نَزَعَ بِفُلَانٍ اِلٰی کَذَا کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں دَعَاہُ اِلَیْہِ۔ اُس نے کسی آدمی کو کسی کام کی دعوت دی (اقرب)

۲

غَرْقًا

نَازِعَات کے بعد غَرْقًا کا لفظ آتا ہے اس کے متعلق بھی یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اُردو میں غرق کا لفظ جو ڈوبنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے عربی زبان میں اُس کا مصدر غَرْقًا نہیں بلکہ غَرَقًا استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں غَرِقَ غَرَقًا۔ مگر یہاں غَرْقًا اَغْرَقَ ثلاثی مزید کا مصدر استعمال ہوا ہے۔ گویا غَرْقًا بمعنے اِغْرَاقًا استعمال ہوا ہے اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے پہلے پارہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنَّ مِنْھَا لَمَا یَھْبِطُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ (ع) کہ پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں جو خشیۃ اللہ سے گر جاتے ہیں۔ یہاں سب تسلیم کرتے ہیں کہ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ کے الفاظ مِنْ اِخْشَاءِ اللّٰہِ کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں یعنی ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ ڈرانے کی وجہ سے۔ اسی طرح یہاں غَرْقًا قائم مقام اِغْرَاقً کا ہے جو اَغْرَقَ کا مصدر ہے۔ اور اَغْرَقَ فِی الْمَاءِ کے معنے ہوتے ہیں غَرَّقَہٗ اُس کو پانی میں ڈبو دیا۔ اور جب کہیں اَغْرَقَ الْاِنَاءَ تو اس کے معنے ہوتے ہیں مَلَأَھَا اُس کو بھر دیا۔ اور جب کہیں اَغْرَقَ النَّازِعُ فِی الْقَوْسِ تو اس کے معنے ہوتے ہیں مَدَّھَا اُس کو خوب کھینچا اور جب کہیں کہ اَغْرَقَ النَّبْلَ تو اس کے معنے ہوتے ہیں اِذَا بَلَغَ بِہٖ غَایَۃَ الْمَدِّ فِی الْقَوْسِ یعنی اُس نے تیر کو اتنے زور سے کھینچا کہ اُس کی نوک کمان کے ڈنڈے سے آملی۔ اور جب کہیں اَغْرَقَ فُلَانٌ فِی الشَّیْءِ تو اس کے معنے ہوتے ہیں بَالَغَ فِیْہِ وَاَطْنَبَ اُس نے کام کو حد تک پہنچا دیا اور اُس میں اطناب اور طوالت سے کام لیا۔ مثلاً کوئی شخص بات شروع کرے اور وہ لمبی گفتگو کرتا چلا جائے تو اُس موقعہ پر یہ فقرہ استعمال کریں گے۔ اسی طرح جب کہیں اَغْرَقَ النَّاسُ فُلَانًا تو اس کے معنے ہوتے ہیں کَثُرُوْا عَلَیْہِ فَغَلَبُوْہُ (اقرب) لوگوں نے

جمع ہوکر اُس پر حملہ کر دیا اور اُسے مغلوب کر لیا۔ گویا وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے معنے ہو جائیں گے کہ (۱) کسی چیز کو اس کی جڑ سے خوب اچھی طرح اُکھیڑنے والی ہستیاں (۲) یا وہ گروہ جو اپنے کام کو اُس کی پوری انتہا تک پہنچا دیتے ہیں (۳) یا حکامِ وقت کو معزول کر دینے والے گروہ جو اپنی تدبیر کو کمال تک پہنچا دیتے ہیں (۴) یا تیروں کو کھینچنے والی جماعتیں جو لڑائی میں تیروں کو اس قدر زور اور جوش سے کھینچتی ہیں کہ تیر کمانوں کی لکڑی تک پہنچ جاتے ہیں (۵) یا وہ جماعتیں جو کنوؤں میں سے پانی نکال نکال کر پانی پلاتی ہیں اور پورے زور سے پانی کھینچتی ہیں (۶) یا وہ جماعتیں جو بعض کاموں کے پوری طرح رُک جاتی ہیں (۷) یا وہ جماعتیں جو اپنے روحانی یا جسمانی باپوں سے انتہائی طور پر مشابہت اختیار کر لیتی ہیں (۸) یا وہ جماعتیں جن کے دلوں میں اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کی زبردست خواہش ہوتی ہے (۹) یا وہ جماعتیں جو لوگوں کو کسی کام کی نہایت ہی جوش و خروش سے دعوت دیتی ہیں۔

**تفسیر۔** اَلنّٰزِعٰت کے شروع میں جو واؤ آتا ہے یہ قسم کا ہے اور بعد کے واؤ عطف کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم قسم کھاتے ہیں نٰزِعٰت کی جو غرق ہو کر نزع کرتی ہیں۔

عربی زبان میں قسم کے لئے واؤ۔ با۔ تا تین حروف آتے ہیں۔ ان میں سے واؤ کا زیادہ استعمال ہوتا ہے لیکن عربی زبان میں اصل حرفِ قسم با کو سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے اُقْسِمُ بِاللّٰہِ یعنی اُقْسِمُ کے ساتھ باء کو بھی ظاہر کر دیا جاتا ہے مگر یہ کبھی نہیں کہا جاتا کہ اُقْسِمُ وَاللّٰہِ یا اُقْسِمُ تَاللّٰہِ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قسم کے لئے اصل حرف باء ہے۔ لیکن کبھی باء کے بدلہ میں واؤ بھی آجاتی ہے اور واؤ کے بدلہ میں تاء آجاتی ہے گویا واؤ اور تاء یہ دونوں باء کے تابع ہیں۔ قرآن مجید میں تمام اقسام جو شہادت کے رنگ میں آتی ہیں ان سے پہلے واؤ استعمال ہوا ہے باء یا تاء استعمال نہیں ہوئے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ واؤ کا حرف ایسی قسم شہادت کے لئے جو اپنے سے ادنیٰ ہستی کی کھائی جائے زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ آیت زیر بحث میں بھی وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا آتا ہے نہ کہ تَالنّٰزِعٰتِ۔

## قرآنی قسموں کی فلاسفی

قرآنی قسموں کی فلاسفی

اگرچہ اس بحث کی جگہ نہیں کہ یہاں موقع کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ قسمیں کیوں کھاتا ہے۔ اس سے پہلے بہت سی سورتیں ایسی گذر چکی ہیں جہاں یہ بحث آنی چاہئے تھی مگر چونکہ آخری پارے کی تفسیر پہلے شائع ہو رہی ہے۔ اس لئے جیسے سورۃ یونس سے پہلے مقطعات کے متعلق بحث کی گئی ہے کیونکہ اس حصہ کی تفسیر سورۃ بقرہ سے پہلے شائع ہوئی ہے۔ یہاں بھی اس امر پر بحث کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قسم کیوں کھاتا ہے یا پھر یہ کہ اگر یہ قسم خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں تو کیا بندے کی طرف سے ہے؟ ادنیٰ تدبر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ قسم بندے کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کے بعد جو مضمون بیان ہوا ہے وہ انسان کی طرف سے نہیں کہا جا سکتا۔ ان قسموں کے بعد فرمایا گیا ہے یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَۃُ اور یہ ایک پیشگوئی ہے اور پیشگوئی علم غیب سے ناواقف انسان کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے لغوی معنے

عالم الغیب ہستی ہی کی طرف سے ہو سکتی ہے پس ان قسموں کو خدا تعالیٰ کی قسمیں ہی قرار دینا پڑے گا اور اس پر سوال پیدا ہوگا کہ خدا نے قسم کیوں کھائی یا کیوں وہ متعدد مقامات پر قسم کھاتا ہے؟ انسان تو اس لئے خدا تعالیٰ کی قسم کھایا کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ ایک بالا ہستی ہے اور انسان اس کے مقابلہ میں بالکل بے بس ہے وہ خدا تعالیٰ کو اپنے دعویٰ کی تائید میں گواہ کے طور پر پیش کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اگر میں اس کا نام گواہی کے طور پر یوں ہی لیتا ہوں تو وہ طاقت رکھتا ہے کہ مجھے تباہ کر دے اور اگر وہ باوجود اس کا نام جھوٹے طور پر لے دینے کے مجھے تباہ نہ کرے تو سمجھ لو کہ وہ میرے سچے ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ لیکن خدا کے اوپر تو کوئی اور ہستی نہیں جسے وہ اپنے دعویٰ کی سچائی کے ثبوت میں پیش کر سکتا ہو اور جب تمام چیزیں خدا تعالیٰ سے شان اور طاقت میں چھوٹی ہیں تو چھوٹی چیز کی قسم کھانے سے کیا فائدہ۔

اَلنّٰزِعٰت سے پہلے واؤ قسم کی ہے۔

ایسی قسم کے تو کوئی معنے ہی نہیں ہو سکتے۔ انسان اگر قسم کھاتا ہے تو بڑی چیز کی کھاتا ہے لیکن خدا تعالیٰ سے بڑی تو اور کوئی ہستی نہیں پھر خدا تعالیٰ نے قسم کیوں کھائی ہے

قسم کھانے کی مختلف حکمتیں

## قسم کھانے کا مطلب

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے انسان جب قسم کھاتا ہے تو اُس کی قسم کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا حکم سچ بولنے کا ہے اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو اُس کا حکم توڑتا ہوں اور اُس کے غضب کو اپنے اوپر بھڑکاتا ہوں۔ اِس لئے میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں سچ بول رہا ہوں تا کہ اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ میرے جھوٹ اور نافرمانی کی وجہ سے مجھے سزا دے۔ گویا انسان جب اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جھوٹ کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کا غضب بھڑکا کرتا ہے کیونکہ خدا جھوٹ کو ناپسند کرتا ہے ایسی حالت میں جب میں خدا کی قسم کھا کر کوئی جھوٹی بات کہتا ہوں تو گویا اُس کے غضب کو میں اَور بھی بھڑکاتا ہوں۔ کیونکہ اوّل خدا کا حکم تھا کہ میں سچ بولوں مگر میں نے خدا کے حکم کو توڑا اور سچ بولنے کی بجائے جھوٹ سے کام لیا۔ دوسرے ایک زائد بات یہ کی کہ میں نے یہ کہا کہ خدا اس بات کا گواہ ہے کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ گویا ایک تو خدا تعالیٰ کا حکم توڑا کیونکہ خدا تعالیٰ کا حکم تھا کہ ہمیشہ سچ بولو مگر میں نے اس حکم کے خلاف جھوٹ بولا اور اس کی نافرمانی کی۔ دوسرے نہ صرف میں نے جھوٹ بولا بلکہ اس میں خدا تعالیٰ کو بھی شریک کرنا چاہا کہ وہ بھی گواہ ہے کہ میں سچ بول رہا ہوں

قسم کے معنے خدا تعالیٰ کو اپنے فعل میں شریک کرنے کے ہیں۔

قسم ذریعہ تسلی

یہ بات ظاہر ہے کہ اگر انسان سے کوئی عام گناہ صادر ہوگا تو خدا تعالیٰ کی غیرت اُس کے خلاف اتنی نہیں بھڑکیگی جتنی اُس صورت میں بھڑکے گی جب وہ خدا تعالیٰ کو بھی اپنے گندے فعل میں شریک کرنا چاہے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر گناہ کے خلاف خدا تعالیٰ کی غیرت بھڑکتی ہے مگر گناہ گناہ میں فرق ہوتا ہے کسی پر اُس کی غیرت کم بھڑکتی ہے اور کسی پر اُس کی غیرت زیادہ بھڑکتی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے گناہ میں خدا تعالیٰ کو بھی شریک کرنا چاہیگا تو یہ لازمی بات ہے کہ اس پر خدا تعالیٰ کی غیرت زیادہ بھڑکے گی۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے اگر کوئی شخص شراب پیئے تو ہم کہیں گے کہ وہ بہت بُرا کرتا ہے لیکن اگر اُسے شراب سے منع کیا جائے اور وہ کہے کہ فلاں بزرگ بھی شراب پیتا ہے اور وہ بزرگ ایسا ہو جس کی عزت لوگوں کے دلوں میں ہو تو اس کے خلاف لوگوں کو اور زیادہ غصّہ آئے گا کہ ایک تو تم شراب پیتے ہو اور دوسرے شراب کے گناہ میں ایک بزرگ کو بھی ملوّث کرنا چاہتے ہو۔ اسی طرح ہر گناہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہوتا ہے مگر جب کوئی جھوٹی قسم کھاتا ہے تو وہ اُس کی ناراضگی کو اور بھی بھڑکاتا ہے کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کو بھی اپنے جھوٹ میں شریک کرتا ہے۔

قسم کے معنے درحقیقت خدا تعالیٰ کو اپنے فعل میں شریک کرنے کے ہوتے ہیں۔ پس اگر وہ سچی بات ہے جس پر کوئی شخص قسم کھاتا ہے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ مثلاً وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں اور واقعہ بھی یہی ہو کہ وہ نماز پڑھا کرتا ہو تو اس میں خدا تعالیٰ کی غیرت بھڑکنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ خدا تعالیٰ بہرحال جانتا ہے کہ وہ نماز پڑھا کرتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے سچ کہہ رہا ہے لیکن اگر وہ نماز نہیں پڑھتا اور کہتا ہے کہ خدا کی قسم! میں نماز پڑھا کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے فریب اور دغا میں خدا تعالیٰ کو بھی شامل کرتا ہے اور جب وہ ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی غیرت اُس کے خلاف بھڑک اٹھتی ہے۔ گویا قسم کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ سننے والوں کی تسلی ہو جائے۔ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایسا فعل کیا ہے تو خدا تعالیٰ تو اُس کی سچائی کی شہادت اپنی زبان سے نہیں دیتا اور نہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قسم کے بعد اللہ تعالیٰ یوں کہے کہ ہاں میرا یہ بندہ سچ بول رہا ہے۔ لیکن باوجود اس کے جو شخص قسم کھاتا ہے وہ بھی سمجھ رہا ہوتا ہے کہ اگر میں نے جھوٹی قسم کھائی تو خدا تعالیٰ کی گرفت میں آ جاؤں گا اور سننے والا بھی سمجھتا ہے کہ اگر اس نے جھوٹ بولا تو چونکہ اس نے اپنے جھوٹ میں خدا تعالیٰ کو بھی شریک کر لیا ہے اس لئے وہ اسے سزا

دئے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ پس قسم میں ایک تو دوسروں کو اس بات کا یقین دلانا مدنظر ہوتا ہے کہ مجھے اپنی بات کی سچائی پر اس قدر کامل یقین ہے کہ میں خدا تعالیٰ کو بھی اپنے بیان کا گواہ بناتا ہوں گویا میرے علم اور خدا تعالیٰ کے علم میں جہاں تک اس بات کا تعلق ہے بالکل مطابقت ہے کوئی بات خلاف حقیقت میں نے بیان نہیں کی۔ دوسرے سننے والوں کو تسلی ہو جاتی ہے کہ اگر قسم کھانے والے نے خدا کو اپنے جھوٹ میں شریک کیا تو ہمیں گھبرانے کی ضرورت نہیں خدا تعالیٰ خود اُسے سزا دے گا۔

غرض یہ حکمت ہے جو قسموں میں پائی جاتی ہے ایک طرف انسان خدا تعالیٰ سے اپنے اتحاد کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس بارہ میں میرا علم اور خدا کا علم ایک ہی ہے مثلاً جب وہ کہتا ہے میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زید لاہور گیا ہے تو اس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنے ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ جو علیم و خبیر ہے جو زمین و آسمان کے ذرہ ذرہ کے حالات کو جاننے والا ہے جس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں اس بارہ میں اُس کا علم اور میرا علم ایک ہی ہے۔ دوسرے سننے والوں کی تسلی ہو جاتی ہے کہ اگر اُس نے افتراء سے کام لیا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے خود پکڑے گا اور جب پکڑے گا اُس وقت ہمیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس شخص نے جھوٹ اور افتراء سے کام لیا تھا۔ گویا قسم میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک خدا تعالیٰ کے علم کے ساتھ اپنے علم کو شریک کرنا اور کہنا کہ میرا علم اور خدا تعالیٰ کا علم اس بارہ میں ایک ہی ہے۔ دوسرے خدا تعالیٰ کی سزا کو چیلنج کرنا کہ اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو میں اس بات کے لئے تیار ہوں کہ وہ مجھے پکڑے اور اپنے عذاب میں گرفتار کرے۔ مگر خدا تعالیٰ پر تو نہ کوئی حاکم ہے نہ اُس پر کسی کا حکم جاری ہے نہ اُسے کوئی سزا دے سکتا ہے اور جب نہ خدا تعالیٰ پر کوئی حاکم ہے نہ اُس پر کسی کا حکم جاری ہے اور نہ اُسے کوئی سزا دے سکتا ہے تو سوال یہ ہے کہ پھر اُس کے قسم کھانے میں کیا فائدہ مدنظر ہو سکتا ہے۔ جب کوئی انسان قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں نے ایسا کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چونکہ میں نے خدا تعالیٰ کو بھی اپنے فعل میں شریک کر لیا ہے اس لئے اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو وہ مجھے سزا دے گا۔ لیکن خدا تعالیٰ کو تو کوئی سزا نہیں دے سکتا۔ پھر قسم میں اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ اس بارہ میں میرا علم اور خدا تعالیٰ کا علم یکساں ہے۔ مگر خدا تعالیٰ قسم کھاتا ہے تو اُس میں یہ حکمت بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ خدا تعالیٰ کا علم ہر علم پر غالب ہے دوسرے کے علم کو یکساں قرار دینے سے اُس کے بیان کو کوئی تقویت حاصل نہیں ہوتی۔ پس وہ کسی دوسرے علم کو اپنے علم کی شہادت کے طور پر پیش نہیں کر سکتا۔ پھر ایسی قسم کا نتیجہ ہی کیا نکلے گا جبکہ جس کی قسم کھائی گئی ہے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بے اختیار ہے اور اس کا علم خدا تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ ایک طالب علم تو کہہ سکتا ہے کہ جو مسئلہ میں نے بتایا ہے درست ہے جاؤ اُستاد سے پوچھ لو لیکن کبھی کوئی اُستاد یہ نہیں کہتا کہ جو مسئلہ میں نے بتایا ہے وہ درست ہے جاؤ میرے شاگرد سے پوچھ لو۔ پس مخالف کہتا ہے کہ ایسی قسمیں بالکل فضول ہیں۔ ان کا وجود کلام الٰہی میں پایا جانا خلاف عقل ہے۔

قسم کا مفہوم [illegible] زبان میں

## قسم کا مفہوم عربی زبان میں

اس اعتراض کا جواب دینے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قسم کا مفہوم کیا ہے۔ عربی زبان میں قسم کے لئے تین الفاظ استعمال ہوتے ہیں (۱) حلف (۲) یمین (۳) قسم۔

جو معنے قسم کے اوپر بیان کئے گئے ہیں وہ وہی ہیں جو عرف عام میں لئے جاتے ہیں لیکن قرآن مجید چونکہ عربی زبان میں ہے اس لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ عربی زبان میں حلف یمین اور قسم کا کیا مفہوم ہوتا ہے اور اُس مفہوم کے مطابق اللہ تعالیٰ کے قسم کھانے میں کیا حکمت ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ

قسم کا مفہوم ادا کرنے کے [illegible] الفاظ

عربی زبان میں قسم کے لئے تین الفاظ پائے جاتے ہیں حلف۔ یمین اور قسم۔ چنانچہ عربی زبان میں کہتے ہیں حَلَفَ بِاللّٰہِ حَلْفًا اور اس کے معنے وہ یہ کرتے ہیں اَقْسَمَ بِہٖ (اقرب) اُس نے خدا تعالیٰ کی قسم کھائی۔ جہاں تک ان معنوں کا تعلق ہے یہ کوئی زائد بات نہیں بتاتے صرف عرف عام میں قسم کا جو مفہوم سمجھا جاتا ہے اُسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس لئے ہم حلف کے

لفظ کو یا اُس کے اشتقاق صغیر و کبیر کے معنوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ کیا ہیں تاکہ ہمیں پتہ لگے کہ حلف کے معنوں میں کون کون سی بات پائی جاتی ہے۔

۲۶۱ عربی زبان میں قسم کیلئے مختلف الفاظ کا استعمال اور ان کا اشتقاق کے لحاظ سے آپس میں تعلق

جہاں تک لفظِ حلف کا تعلق ہے اُس کے قریباً سارے اشتقاق خواہ وہ اشتقاق صغیر ہوں یا اشتقاق کبیر قسم کے معنے دیتے ہیں سوائے اَلْحَلْفَاءُ کے جس کے معنے قسم کے نہیں۔ بلکہ حَلْفَاء ایک ایسی بوٹی کو کہتے ہیں جو پانی میں اُگتی ہے اور جس کے پتوں کے کونے نوکدار اور تیز ہوتے ہیں (اقرب) اسی طرح حَلِيف کا لفظ عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے جس کے معنے ہر اُس چیز کے ہوتے ہیں جو دوسری سے جدا نہ ہو چنانچہ لکھا ہے اَلْحَلِيفُ كُلُّ شَيْءٍ لَزِمَ شَيْئًا فَلَمْ يُفَارِقْهُ (اقرب) حَلِيف کے دوسرے معنے اَلْحَدِيدُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ کے ہوتے ہیں (اقرب) یعنی ہر ایسی چیز جو تیز اور دھار دار ہو۔ گویا حَلْفَاء وہ بوٹی ہوتی ہے جس کے پتوں کے کونے نوکدار اور تیز ہوتے ہیں۔ حَلِيف وہ چیز ہوتی ہے جو کسی دوسری چیز سے چمٹی رہے اور حَلِيف اُس چیز کو بھی کہتے ہیں جو تیز اور دھار دار ہو۔ اس تشریح سے دو معنے ایسے نکل آئے جن سے حلف کے مفہوم میں فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے اوّل تیز اور دھار دار ہونا دوم کسی چیز کا کسی دوسری چیز سے چمٹا ہوا ہونا۔ گویا جہاں بھی حاء۔ لام اور فاء اکٹھے ہونگے وہاں یہ دو معنے ضرور پائے جائیں گے (اول) کسی چیز کا دوسری چیز سے چمٹ جانا (دوم) اُس کا تیز اور دھار دار ہونا۔

اس کے بعد ہم حاء۔ لام اور فاء کے دوسرے مرکبات کو لیتے ہیں جو پانچ ہیں یعنی حَفَل۔ لَحَفَ۔ لَفَحَ۔ فَحَلَ۔ فَلَحَ۔ گویا حاء۔ فاء اور لام اکٹھے ہو جائیں تو حَفَلَ بن جائے گا۔ لام۔ حاء اور فاء اکٹھے ہو جائیں تو لَحَفَ بن جائے گا۔ لام۔ فاء اور حاء اکٹھے ہو جائیں تو لَفَحَ بن جائیگا۔ فاء۔ حاء اور لام اکٹھے ہو جائیں تو فَحَلَ بن جائے گا۔ اور فاء۔ لام۔ حاء اکٹھے ہو جائیں تو فَلَحَ بن جائے گا۔ یہ پانچوں قسم کے اشتقاق عربی زبان میں مستعمل ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان حروف کے تغیر سے معنے کیا بنتے ہیں۔ یعنی جب حاء فاء اور لام اکٹھے ہوں تو اس کے کیا معنے ہوتے ہیں اور جب لام حاء اور فاء اکٹھے ہوں تو اس کے کیا معنے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم حَفْلٌ کو لیتے ہیں حَفْلٌ کے تمام مشتقات اجتماع اور کثرت پر دلالت کرتے ہیں چنانچہ حَفْلَةٌ جلسہ اور اجتماع کو کہتے ہیں۔ اور اجتماع میں ایک دوسرے سے مل کر بیٹھا جاتا ہے یہی مفہوم حَلِيف کا بھی تھا کیونکہ اس کے بھی یہی معنے تھے کہ كُلُّ شَيْءٍ لَزِمَ شَيْئًا فَلَمْ يُفَارِقْهُ (اقرب) ایک چیز جو دوسرے کے ساتھ مل گئی اور پھر اُس سے جدا نہ ہوئی۔ حَفْلٌ کے معنے بھی اکٹھے ہونے اور آپس میں جُڑ جانے کے ہیں (اقرب) اسی لئے جلسہ کو حَفْلَةٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہاں بھی ایک دوسرے سے مل کر بیٹھا جاتا ہے۔ اسی طرح حَفْلٌ کسی کام کو اس کی حد تک پہنچا دینے کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے اِحْتَفَلَ فِيهِ اَیْ بَالَغَ (اقرب) یعنی اس نے اس کام کو اسکی حد تک پہنچا دیا۔ نیز کہتے ہیں اِحْتَفَلَ بِالْاَمْرِ اَیْ اَحْسَنَ الْقِيَامَ بِهٖ یعنی کسی معاملہ کی پوری نگہداشت کی۔ اس میں بھی جُڑنے اور دوسری چیز سے جدا نہ ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ کیونکہ کسی کام کو اسکی حد تک وہی شخص پہنچا سکتا ہے جو اس کام کے ساتھ چمٹا رہے اور اُس سے الگ نہ ہو۔ گویا اس میں بھی جُڑنے کے معنے آگئے۔ اسی طرح اَحْسَنَ الْقِيَامَ بِهٖ کے بھی یہ معنے ہیں کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے اِدھر وہ کوئی کام شروع کرتے ہیں اور اُدھر اس کو چھوڑ دیتے ہیں گویا استقلال کا مادہ اُن میں نہیں ہوتا لیکن بعض ایسے ہوتے ہیں جو استقلال کے ساتھ اُس کام میں لگے رہتے ہیں گویا وہ اپنے کام کے ساتھ جُڑے رہتے ہیں اُس سے الگ نہیں ہوتے۔ اس میں بھی جُڑنے اور دوسری چیز سے الگ نہ ہونے کا مفہوم آگیا۔

دوسرا اشتقاق لَحَفَ ہے۔ یہ بھی ایک دوسری چیز کو لپٹانے یا ملانے یا لگانے کے معنے دیتا ہے۔ اسی سے ہماری اردو زبان کا لحاف نکلا ہے کیونکہ ہم اُس کو اوڑھ لیتے ہیں اور وہ ساری رات ہمارے جسم سے چمٹا رہتا ہے۔

تیسرا اشتقاق لَفْحٌ ہے۔ اس کے معنے بھی چھونے کے ہوتے ہیں کہتے ہیں لَفَحَهُ بِالسَّيْفِ : ضَرَبَهُ بِهِ (اقرب) یعنی اس کو تلوار سے مارا۔ اس میں دوسرے معنے بھی پائے جاتے ہیں یعنی وہ معنے جو نقصان اور ضرر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں لَفَحَتْهُ النَّارُ : اَحْرَقَتْهُ (اقرب) یعنی آگ نے اُس کو جلا دیا۔ لسان العرب والے کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ اَصَابَتْ وَجْهَهُ یعنی آگ لگی اور اُس نے دوسرے کے مُنہ کو جُھلسا دیا۔ گویا اس میں چھونے کے معنے بھی پائے جاتے ہیں اور ضرر کے معنے بھی پائے جاتے ہیں۔ لُفَّاحٌ ایک خوشبودار بُوٹی ہوتی ہے جس کو سونگھا جاتا ہے (اقرب) گویا اس اشتقاق میں بھی لگنے اور چھونے اور ضرر پہنچانے کے معنے شامل ہیں۔

چوتھا اشتقاق فَحْلٌ ہے اور فَحْلٌ عربی زبان میں سانڈ کو کہا جاتا ہے جس سے بچہ لیا جاتا ہے (اقرب) اس میں بھی چھونے کے معنے پائے جاتے ہیں کیونکہ اُسے بچہ لینے کے لئے مادہ پر ڈالا جاتا ہے۔ راوی کو بھی فَحْل کہتے ہیں جس سے دوسرے لوگ روایتیں نقل کرتے ہیں کیونکہ وہ بھی ساتھ رہتا اور دوسرے کو چمٹا رہتا ہے۔ فَحْلَةٌ اُس عورت کو کہتے ہیں جو زبان دراز ہو جسے ذرا بھی کوئی بات کہہ دی جائے تو وہ پیچھے پڑ جائے۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں کہ پیچھا ہی چھوڑ۔ یعنی تُو تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے اپنی بات کو ختم ہی نہیں کرتا۔ پس فَحْلَةٌ اس عورت کو کہتے ہیں جو دوسرے کے پیچھے پڑ جائے اور ساتھ ہی وہ زبان دراز ہو۔ گویا اس میں بھی چمٹنے اور ضرر پہنچانے کے معنے پائے جاتے ہیں۔ ف ل ح اس کا آخری اشتقاق ہے جس سے ایک لفظ فَلَاح بنتا ہے۔ اس کے معنے کامیابی اور بامراد ہونے کے ہیں۔ ان معنوں میں بھی ایک چیز کو اپنے ساتھ چمٹانے اور لگائے رکھنے کا مفہوم پایا جاتا ہے کیونکہ جو شخص اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ اُس کو اپنے پاس ہی رکھ لیتا ہے دوسرے کے پاس وہ اُس کو جانے نہیں دیتا پھر فلح کے اشتقاق میں علاوہ کامیابی کے پھاڑنے کے بھی معنے پائے جاتے ہیں چنانچہ اسی اشتقاق سے فَلَّاح کا لفظ نکلا ہے جس کے معنے زمیندار کے ہیں جو زمین کو پھاڑتا ہے۔ مَلّاح جو چپّو سے کشتی کو چلاتا ہے اُسکو بھی اسی لئے فَلَّاح کہہ لیتے ہیں کہ وہ پانی کو پھاڑ کر کشتی چلاتا ہے اور یہ لفظ بھی اشتقاق اکبر کے طور پر ف ل ح کے معنوں پر دلالت کرتا ہے (اقرب)

ان سب معنوں کو جب اکٹھا ملا کر دیکھا جائے تو ان میں دو باتیں پائی جاتی ہیں۔ اوّل ایک چیز کا کسی دوسری چیز سے چمٹ جانا یا ایک چیز کو دوسری سے جوڑنا جیسے حَلِيف اُس کو کہتے ہیں جو دوسرے سے جدا نہ ہو۔ حَفْلَةٌ اجتماع اور اکٹھے ہونے کو کہتے ہیں۔ لِحَافٌ اُس کو کہتے ہیں جو اُوپر آ کر لپٹ جاتا ہے۔ لَفْحٌ شعلہ کے آ چمٹنے کو کہتے ہیں۔ لُفَّاحٌ وہ بُوٹی ہے جسے سونگھا جاتا یعنی ناک سے لگایا جاتا ہے۔ فَحْلٌ سانڈ کو کہتے ہیں جو مادہ پر سوار ہوتا ہے۔ فَحْلَةٌ اس عورت کو کہتے ہیں جو پیچھے پڑ جائے اور راوی بھی فَحْلٌ کہلاتا ہے کہ روایات یاد رکھنے کے لئے وہ ساتھ رہتا ہے۔ فَلَاح یعنی کامیابی کے بھی یہی معنے ہیں کہ انسان اپنے مطلب کو پا لیتا ہے۔ گویا یہ سب معنے اکٹھا کرنے۔ جوڑنے اور ساتھ ملانے پر دلالت کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ایک اور معنے بھی پائے جاتے ہیں اور وہ آگ کے جلانے۔ تلوار مارنے اور زمین اور پانی کو پھاڑنے کے ہیں۔ گویا بعض اوقات کسی چیز کا دُکھ دینا۔ جلانا یا چبھنا بھی اسی کے مفہوم میں شامل ہے۔

یہ دونوں معنے قسم کے اُس عام مفہوم سے ملتے ہیں جو ہمارے ملک میں سمجھا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں جہاں بھی حاء اور لام اور فاء اکٹھے ہوں گے وہاں دو معنے ضرور پائے جائیں گے۔ ایک یہ کہ کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے جوڑنا۔ اور دوسرے یہ کہ کسی چیز کو پھاڑنا۔ جلانا اور نقصان پہنچانا۔ ان دونوں معنوں کو اگر مدنظر رکھا جائے تو حلف کے یہ معنے ہوں گے کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ ملانا۔ مگر اس طرح کہ بعض صورتوں میں قطع تعلق اور مخالفت کا بھی خطرہ ہو اور یہی غرض حلف کی ہوتی ہے۔ انسان قسم اس لئے کھاتا ہے کہ جس کی حلف اُٹھاتا ہے اُسے اپنا گواہ اور ساتھی قرار

دیتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ اگر اُس کا نام میں غلط طور پر لیتا ہوں تو وہ مجھے سزا دے یا میرے جھوٹ پر گواہ ہو۔ پس حلف کا مفہوم یہ ہوا کہ بندہ ایک طرف خدا کو اپنے ساتھ ملاتا ہے اور کہتا ہے خدا میرے ساتھ ہے اور اُس کا علم میری اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر میں نے جھوٹ بولا ہے تو میں پھاڑا جاؤں۔ جلایا جاؤں۔ تباہ کر دیا جاؤں۔

دوسرا لفظ قسم کے لئے عربی زبان میں قَسَم ہی ہے کہتے ہیں اَقْسَمَ بِاللّٰہِ اُس نے اللہ کی قسم کھائی یا اُقْسِمُ بِاللّٰہِ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں اِس کا ثلاثی قَسَمَ ہے اور اس کے تین معنے ہیں قَسَمَ الرَّجُلُ الْمَالَ: جَزَّاَہٗ اَوْ فَرَّزَہٗ اَجْزَاءً (اقرب) اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے یا اُسے تقسیم کیا۔ نیز کہتے ہیں قَسَمَ الدَّھْرُ الْقَوْمَ: فَرَّقَھُمْ (اقرب) قوم کو گردشِ زمانہ نے بکھیر دیا یا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پھر کہتے ہیں قَسَمَ فُلَانٌ اَمْرَہٗ، قَدَّرَہٗ وَنَظَرَ فِیْہِ کَیْفَ یَفْعَلُ اَوْ لَمْ یَدْرِ مَا یَصْنَعُ فِیْہِ (اقرب) یعنی جب یہ کہیں کہ قَسَمَ فُلَانٌ اَمْرَہٗ تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اُس نے اپنے کام کی تقسیم کی۔ اُس کا اندازہ کیا اور اس کے متعلق غور کیا کہ اُسے وہ کس طرح کرے یا وہ شک میں پڑ گیا کہ اس کام کو کس طرح سرانجام دے۔

۲۰۱
عربی زبان میں قسم کے لئے
استعمال ہونیوالے الفاظ
کی بحث میں ایک حکمت

میرے نزدیک اَقْسَمَ بِاللّٰہِ کے معنے حَلَفَ بِہٖ کے ہی ہیں اور چونکہ اَقْسَمَ کے اور کوئی معنے عربی میں استعمال نہیں اس لئے ثلاثی مجرد سے ہی اس کے معنوں کی حقیقت معلوم کرنی پڑے گی اور چونکہ اس کا فعل ثلاثی مجرد متعدی ہے اس لئے باب افعال کا ہمزہ سلب کے معنوں کے لئے زیادہ موزوں ہوگا جو اس باب کے ہمزہ کے مختلف معانی میں سے ایک معنے ہیں یعنی جو قَسَمَ کے معنے تھے وہ اَقْسَمَ بِاللّٰہِ میں آکر سلبی صورت اختیار کر لیں گے وہاں اُس کے معنے تھے ٹکڑے کر دیا یا بکھیر دیا۔ اور یہاں یہ معنے ہوں گے کہ اختلاف دور کر دیا اور ٹکڑوں کو ملا دیا۔ گویا ملانے کے معنے آ گئے جو حلف کے معنوں سے مل جاتے ہیں۔ اسی طرح قَسَمَ فُلَانٌ اَمْرَہٗ کے معنے یہ تھے کہ وہ شک اور تردد میں پڑ گیا۔ ایسے شک اور تردد میں کہ لَمْ یَدْرِ مَا یَصْنَعُ فِیْہِ اُسے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اس بارہ میں کیا کرے۔ لیکن اَقْسَمَ کے معنے ہوں گے اُس نے شک کو دُور کر دیا گویا ازالۂ شک کرنے والی چیز بن گئی۔ یہ معنے بھی حلف والے معنوں سے مل جاتے ہیں کیونکہ حلف کے ذریعہ انسان دوسرے کے تردد کو دُور کرتا اور یقین دلاتا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بالکل درست ہے اور میری اس بات پر خدا بھی گواہ ہے۔ گویا ہمزہ کو اگر ہم سلبیہ مانیں تو حلف کے معنوں سے اس کے معنے بالکل مل جاتے ہیں۔ حلف میں بھی ملانے اور اکٹھا کر دینے کے معنے تھے اور اس میں بھی ٹکڑوں کو ملانے اور اختلاف کو دُور کرنے کا مفہوم شامل ہے اسی طرح وہاں بھی تردد کو دُور کرنے کا مفہوم تھا اور یہاں بھی یہی مفہوم ہے کہ اُس نے تردد دُور کر دیا۔

تیسرا لفظ قسم کے لئے عربی زبان میں یَمِیْن ہے لیکن اس لفظ کو قسم کے لئے اس لئے استعمال نہیں کرتے کہ اس میں قسم کی طرف کوئی معنوی اشارہ پایا جاتا ہے بلکہ یَمِیْن کا لفظ اس لئے قسم کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے کہ عرب لوگ قسم کھا کر جب معاہدہ کرتے تھے تو ایک دوسرے کے دائیں ہاتھ کو چھوتے تھے۔ پس چونکہ ایسے موقعہ پر اَیْمَان (یَمِیْن کی جمع ہے) ملائے جاتے تھے اس لئے قسم کے لئے بھی یَمِیْن کا لفظ استعمال ہونے لگا گویا یمین کا لفظ صرف قسم کے ایک ذریعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اس کے لئے لغت موضوع نہیں ہے۔

پس قسم کے بارہ میں لغت کی شہادت صرف حلف اور قَسَم کے لفظوں سے ملتی ہے اور جیسا کہ میں اُوپر بتا آیا ہوں اِن دونوں لفظوں سے یہ شہادت ملتی ہے کہ حلف اور قسم کے لفظوں کی غرض مشترک اتحاد پیدا کرنا۔ شک کو دُور کرنا سزا دینا اور قطع کرنا ہے۔ یعنی ایک طرف قسم کے ذریعہ انسان اللہ تعالیٰ سے اتحاد پیدا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس معاملہ میں میرا علم اور خدا تعالیٰ کا علم ایک ہی ہے اور دوسری طرف وہ یہ بات پیش کرتا ہے کہ اگر میں نے یہ بات غلط کہی ہے تو اللہ تعالیٰ کی سزا مجھ پر نازل ہو۔ پس حلف کی غرض عربوں کے نزدیک یہ ٹھہری

کہ جس سے ایک وجود دوسرے وجود سے اپنا اتحاد ثابت کر کے اُسے اپنے سچے ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے اور اُس میں غلط ہونے کی صورت میں قطع وعذاب کا مطالبہ کرتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا ان معنوں کے رُو سے خدا تعالیٰ کے لئے حلف اٹھانی جائز ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اور کیا جب خدا تعالیٰ کسی چیز کی قسم کھائے تو یہ معنے وہاں چسپاں ہو سکتے ہیں؟ سو ہم دیکھتے ہیں کہ گو جو کچھ خدا تعالیٰ کہے اس کے انکار کی کسی انسان کو گنجائش نہیں ہو سکتی کیونکہ ہم مانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہے اور جب وہ ہمیں کہتا ہے کہ بات یوں ہے تو ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے لازماً ہمیں ماننا پڑیگا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک ہے۔ لیکن ایک اور سوال ہے جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ اس مقام پر ٹھوکر کھا جاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ وراء الوراء ہے وہ ہمیں اپنی آنکھوں سے نظر نہیں آ سکتا۔ یہ نہیں ہوا کہ آسمان پھٹا ہو اور خدا تعالیٰ نے یہ کہا ہو کہ فلاں بات میں نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے کہی تھی یا فلاں بات میں نے موسیٰؑ سے کہی تھی یا فلاں بات میں نے عیسیٰؑ سے کہی تھی یا فلاں بات میں نے زرتشت سے کہی تھی یا فلاں بات کرشنؑ سے کہی تھی۔ حضرت نوحؑ آئے تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے ایسا کہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ آئے تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ خدا نے مجھ سے ایسا کہا ہے۔ حضرت موسیٰؑ آئے تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ خدا نے مجھ سے ایسا کہا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ آئے تو انہوں نے بھی یہی کہا اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ سے ایسا کہا ہے مگر اُن کے مخاطبین نے اپنی آنکھوں سے خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ اُن کے سامنے بات کرنے والا انسان ہی ہوتا تھا خدا تعالیٰ نہیں ہوتا تھا اور چونکہ خدا تعالیٰ نظر نہیں آتا اس لئے گو خدا تعالیٰ کی بات کا انکار نہیں ہو سکتا مگر اس کی طرف سے بھیجا ہوا کلام ضرور ثبوت کا محتاج ہوتا ہے۔ پس بے شک خدا تعالیٰ کو اپنی بات منوانے کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں مگر اُس کے کلام کو ایسے ثبوت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ لوگ اس کلام کو براہ راست اللہ تعالیٰ کے منہ سے نہیں سنتے بلکہ ایک اپنے جیسے انسان کے منہ سے سنتے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ خدا تعالیٰ کو قسم کی کیا ضرورت ہے محض ایک دھوکا ہے اگر مخاطب یہ بھی مان لیں کہ اس کلام کو سننے والا مانتا ہے کہ وہ خدا کا کلام ہے تو بھی اُس مدعی کا یہ یقین ہر سننے والے کو تو یقین نہیں دلا سکتا۔ مثلاً میں قرآن مجید پر کامل ایمان رکھتا ہوں میرے سامنے اگر بغیر قسم کے بھی قرآن مجید کوئی بات پیش کرے تو میں کہوں گا کہ ہاں بالکل درست ہے مجھے اس کی صداقت پر پورا ایمان ہے لیکن جو شخص قرآن مجید کو نہیں مانتا اُس کو تو ثبوت کی ضرورت ہے وہ بغیر کسی ثبوت کے کس طرح تسلیم کرے گا کہ جو بات اُس کے سامنے پیش کی جا رہی ہے وہ خدا تعالیٰ نے ہی کہی ہے کسی انسان نے اپنے پاس سے نہیں بنائی۔ اگر اس قسم کا ثبوت خدائی کلام میں موجود نہ ہو تو اس کا ایک بہت بڑا نقصان یہ ہو کہ صادق اور کاذب مدعی میں کوئی مابہ الامتیاز نہ رہے گا اور لوگ اسی دھوکا میں گرفتار رہیں گے کہ ہمارے سامنے جو مدعی کھڑا ہے اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے کلام نازل ہوتا ہے یا یہ اپنے پاس سے بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ پس اس قسم کا ثبوت صرف اسی لئے ضروری نہیں کہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جو بغیر اس امر پر تسلی پانے کے کہ اس کلام کے پیش کرنے والے کو خود بھی اپنے الہام پر کامل یقین ہوتا ہے ایمان لانے کے لئے تیار نہیں ہوتیں بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ یہ خدا کا ہی کلام ہے اور اس کے متعلق جھوٹ سے کام نہیں لیا گیا۔ اگر بغیر دلیل اور ثبوت کے الٰہی کلام پیش کر دیا جائے اور جب کوئی ثبوت مانگے تو اُسے کہہ دیا جائے کہ خدائی کلام کے متعلق کسی ثبوت کی کیا ضرورت ہے کیا یہ بات کم ہے کہ میں کہہ رہا ہوں خدا تعالیٰ نے یہ کلام نازل کیا ہے تو کل کوئی جھوٹا مدعی کھڑا ہو جائے گا اور وہ بھی کہنا شروع کر دے گا کہ مجھے خدا تعالیٰ نے اس طرح کہا ہے۔ تب لوگ گھبرائیں گے کہ ہم کیا کریں کس کو مانیں اور کس کو رد کریں یہ بھی کہتا ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے کھڑا کیا ہے اور وہ بھی کہتا ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے کھڑا کیا ہے ہم اس کی بات مانیں یا اس کی بات مانیں۔ پس چونکہ صادق اور

۲۷۱
قسم خدا کی طرف سے نازل ہونے والے کلام کے لئے خدائی کلام ہونے کا ایک ثبوت

کاذب مدعیان میں اس طرح کوئی ما بہ الامتیاز نہیں رہ سکتا تھا اس لئے خدا تعالےٰ نے جھوٹے مدعیانِ نبوت کے فتنوں کو باطل کرنے اور دنیا پر ان کا جھوٹ ظاہر کرنے کے لئے اپنے اُوپر یہ واجب کرلیا ہے کہ وہ خود اپنے کلام کی سچائی کا ثبوت پیش کیا کریگا۔ اگر حضرت ابراہیم یہ کہتے کہ جب میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ایسا کہہ رہا ہے تو تم کیوں نہیں مانتے۔ یا حضرت موسیٰؑ کہتے کہ تمہیں کسی ثبوت کی کیا ضرورت ہے میں جو کہہ رہا ہوں کہ خدا تعالےٰ مجھ سے ہمکلام ہوا اور اُس نے مجھ سے یہ یہ بات کی یا حضرت عیسیٰؑ کہتے کہ مجھ سے کسی ثبوت مانگنے کی کیا ضرورت ہے میں جو کہہ رہا ہوں کہ خدا مجھ سے بولا اور اُس نے مجھے یہ پیغام دیا۔ یا اگر یہی طریق حضرت زرتشتؑ اختیار کرتے یہی طریق حضرت کرشنؑ اختیار کرتے یہی طریق حضرت رامچندر اختیار کرتے تو لوگ اس قدر ڈر جاتے کہ جو شخص بھی ان کے زمانہ میں مدعی بن جاتا اُسے مان لیتے اور اُس سے کسی ثبوت کا مطالبہ نہ کرتے اور چونکہ جھوٹے مدعی بہرحال میں ہو سکتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جھوٹ پھیل جاتا اور صداقت مشتبہ ہو جاتی۔ پس خدا تعالےٰ نے اس فتنہ کو روکنے کے لئے اپنے کلام کی صداقت کا ثبوت مہیا کرنا اپنے اوپر واجب کرلیا ہے تا کہ جب کوئی کہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ کلام خدا تعالےٰ نے نازل کیا ہے تو فوراً اس کے سامنے ثبوت پیش کر دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ یہ یہ ثبوت ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ خدا تعالےٰ کا کلام ہے کسی انسان کا بنایا ہوا کلام نہیں۔ پس چونکہ کاذب اور صادق میں امتیاز کرنا ضروری تھا اس لئے خدا تعالےٰ کا کوئی ایسا ثبوت پیش کرنا جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ کلام جو اس کی طرف منسوب کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے درست ہے یا نہیں اس کی شان کے خلاف نہیں بلکہ اُس کی شانِ رحیمیت کا عین تقاضا ہے۔ وہ شخص جو خدا تعالےٰ کی طرف سے ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اگر وہ اپنے اُس کلام کی صداقت کا کوئی ثبوت پیش نہ کرے جسے وہ خدا تعالےٰ کی طرف منسوب کرتا ہے بلکہ اگر اُسے کہا جائے کہ کوئی ثبوت اپنی سچائی میں پیش کرو تو وہ اس بات کو خدا تعالےٰ کی ہتک قرار دینے لگے تو نظامِ عالم پر تباہی آجائے۔ روز کوئی نہ کوئی مدعی کھڑا ہو جائے اور خدا تعالےٰ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنا شروع کر دے اِسی لئے خدا تعالےٰ نے یہ واجب کرلیا ہے کہ وہ اپنے کلام کی سچائی کے ثبوت میں تائیدی شہادات پیش کیا کرے ورنہ کمزور لوگوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہے۔ پس اللہ تعالےٰ کا ایسے ثبوت پیش کرنا اس کی شان کے خلاف نہیں بلکہ اسکی گواہی اپنے کلام کی سچائی کے لئے نہایت ہی ضروری ہے۔ اس لئے بھی کہ بندوں پر ثابت ہو جائے کہ وہ خدا کا کلام تھا اور اس لئے بھی کہ کوئی جھوٹا آدمی یہ جرأت نہ کرے کہ وہ بغیر کسی ثبوت کے خدا تعالےٰ کی طرف باتیں منسوب کرنے لگ جائے۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی تو اب اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی روک نہیں ہوسکتی۔ کہ کوئی ایسا ثبوت جو حلف کے مشابہ ہو یقیناً ایک بہت بڑا ثبوت کلام الٰہی کی صداقت کا ہوگا۔ اور خدا تعالےٰ کا اپنے کلام کی تائید میں کسی ایسی دلیل کا پیش کرنا اس کی شان کے خلاف نہ سمجھا جائے گا بلکہ عین ضروری ہوگا۔

کسی کلام کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت حلف ہی ہوتا ہے

جب ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ اپنے کلام کی صداقت کا ثبوت خدا تعالےٰ کو بھی پیش کرنا چاہیئے تو اب سوال یہ ہے کہ صداقت کا ثبوت سب سے بڑا کونسا ہوتا ہے؟ دنیا میں صداقت کا سب سے بڑا ثبوت حلف کو سمجھا جاتا ہے بلکہ آخری فیصلہ حلف پر ہی قرار پاتا ہے کیونکہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جنہیں حلف کے بغیر اور کسی بات سے اطمینان ہی نہیں ہوتا۔ وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ فلاں شخص نیک ہے وہ یہ بھی یقین رکھتے ہوں گے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا مگر ساتھ ہی اُن کے دلوں میں یہ شبہ بھی ہوگا کہ کہیں یہ سب کچھ ڈھکوسلہ ہی نہ ہو کہ آسمان سے فرشتے اُترتے اور اللہ تعالےٰ کا کلام لاتے ہیں یا اللہ تعالےٰ بالمشافہ کسی شخص سے گفتگو کرسکتا ہے لیکن جب کوئی قسم کھا لیتا ہے تو انکو تسلی ہو جاتی ہے اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ صرف ڈھکوسلہ نہیں بلکہ مشاہدہ اس کی تائید میں ہے۔ اگر مشاہدہ اس کی تائید میں نہ ہوتا تو یہ قسم کیوں کھاتا۔ پس شبہ کو دُور کرنے والی آخری چیز حلف ہی ہے۔ اور جب شبہات کو دُور کرنے کا خدا تعالےٰ نے

قرآن کی صداقت کو ثابت کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کا قسم کھانا

حلف کو ایک قطعی اور یقینی ذریعہ قرار دیا ہوا ہے تو خدا تعالیٰ کا کلام جو سب سے زیادہ دلائل کا حقدار ہوتا ہے اگر اس دلیل کو ترک کر دے اور یہ ثبوت اپنی تائید میں پیش نہ کرے تو وہ یقیناً ایک مفید اور ضروری پہلو کو ترک کرنے والا قرار پائے گا اور دنیا کے ایک حصہ کو جس کا حلف کے بغیر اور کسی بات سے اطمینان نہیں ہوتا غیر مطمئن رکھنے والا سمجھا جائے گا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گو حلف خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئی ہو مگر قسم کھانے والا تو وہ انسان ہی ہوگا جو اس کلام کو پیش کرتا ہے اس صورت میں اُسے کلام الٰہی کی سچائی کا ثبوت کس طرح سمجھا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بے شک حلف کو خدا تعالیٰ کی طرح منسوب کیا گیا ہوگا اور بیشک حلف کھانیوالا بھی ایک انسان ہی ہوگا جو اس کلام کو پیش کرتا ہے لیکن اگر وہ جھوٹا ثابت ہوگا تو وہ قسم کس کے خلاف پڑے گی یقیناً اسی انسان کے خلاف پڑے گی جس نے اس قسم کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ مثلاً زید کہتا ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے ایسا کہا اور زید یہ بھی کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ قسم کھا کر کہتا ہے کہ یہ بات سچی ہے۔ اب اگر وہ اپنی اس بات میں جھوٹا ہے اور اُسے خدا تعالیٰ نے کوئی بات نہیں کہی تو اُس قسم کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟ اُسی پر ہوگی جس نے خدا تعالیٰ پر جھوٹ بولا اور جھوٹی قسم کھا کر لوگوں کو دھوکا دیتا رہا اور جب اُسی پر اس کی ذمہ داری ہوگی تو جب وہ الٰہی گرفت میں آئے گا سب لوگوں کو پتہ لگ جائیگا کہ وہ ایک جھوٹا انسان تھا جس نے افتراء سے کام لیا اور جس کے نتیجہ میں وہ الٰہی عذاب میں گرفتار ہو گیا۔ پس بنی نوع انسان کے دلوں کو یقین دلانے اور اُن کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لئے ضرور کوئی ایسا طریق ہونا چاہئے تھا جس سے اُنکی تسلی ہو جاتی اور اسی وجہ سے قرآن کریم میں قسمیں کھائی گئی ہیں اِن قسموں کے متعلق دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) یا تو کوئی شخص یہ تسلیم کریگا کہ یہ قسمیں خدا تعالیٰ نے ہی کھائی ہیں کسی انسان نے نہیں کھائیں۔ اور جب وہ ان قسموں کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کریگا تو یہ لازمی بات ہے کہ وہ کلام الٰہی کی صداقت پر بھی ایمان رکھیگا

(۲) یا پھر اس کا یہ عقیدہ ہوگا کہ یہ قسمیں خدا نے نہیں کھائیں بلکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھائی ہیں تب بھی وہ یقین رکھیگا کہ اگر انہوں نے نعوذ باللہ جھوٹی قسمیں کھائی ہیں تو خدا تعالیٰ اُن کو سزا دے گا۔ گویا اس دلیل کی جو غرض تھی وہ بہرحال پوری ہو جائے گی۔ اگر کسی شخص نے قرآن کریم کو خدا تعالیٰ کا کلام مان لیا تو اُس کے لئے کسی حلف یا تائیدی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ وہ یقین رکھے گا کہ جس قدر قسمیں کھائی ہیں خدا تعالیٰ نے ہی کھائی ہیں اور اگر وہ سمجھے گا کہ یہ قسمیں خدا تعالیٰ نے نہیں کھائیں بلکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نعوذ باللہ خدا تعالیٰ پر افتراء کیا ہے تب بھی اس کا دل مطمئن ہو جائے گا۔ اور وہ سمجھے گا کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چونکہ (نعوذ باللہ من ذالک) جھوٹی قسمیں کھائی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں پکڑے اور سزا دے۔ اس کے بعد ان قسموں کے نتائج اُس پر خود ظاہر کر دیں گے کہ حقیقت کیا ہے۔ بہرحال حلف کلام الٰہی کی صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ اور گو حلف کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہو مگر چونکہ جھوٹے کلام کی صورت میں قسم کھانے والا وہی انسان ہوگا جو اس کلام کو پیش کرتا ہے۔ اس لئے وہ قسم اس کے خلاف پڑے گی اور اس طرح ظاہر ہو جائے گا کہ حقیقت کیا تھی۔ صداقت کس طرف تھی اور دھوکا و فریب کس طرف تھا۔

اس اعتراض کا جواب کہ گو حلف قرآن مجید خدا کی طرف منسوب ہے لیکن اس کے کھانیوالے تو آنحضرت صلعم ہی ہیں

دوسرے وہی حلف حلف کہلا سکے گی جو حلف کی غرض پوری کرتی ہو۔ اور حلف کی غرض یہی ہوتی ہے کہ دوسرے وجود سے اپنا تعلق بتا کر اُسے بطور شاہد پیش کیا جاتا ہے اور ان معنوں سے خدا تعالیٰ بھی حلف اٹھا سکتا ہے کیونکہ حلف کی ایک غرض یہ ہوتی ہے کہ قسم کھا کر دوسرے کو یقین دلایا جاتا ہے کہ [illegible] فلاں اور میں دونوں ایک ہی بات کہتے ہیں۔ جب کوئی کہتا ہے خدا تعالیٰ کی قسم! فلاں بات اس طرح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ بھی جانتا ہے کہ یہ بات اس طرح ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ یہ بات اس طرح ہے اور اگر کسی اور چیز کی گواہی اپنی تائید میں پیش کی جائے

تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز بھی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بالکل درست ہے۔ اس طرح اُس چیز کی گواہی بتا دیتی ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ غلط ہے یا درست۔ خدا تعالیٰ چونکہ لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے اس لئے جب وہ کسی چیز کو بطور گواہ پیش کرے گا تو اُس چیز کی گواہی صداقت یا عدم صداقت کو بالکل ظاہر کر دے گی۔ اگر وہ چیز گواہی دے دیگی تو ثابت ہو جائے گا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ کہا گیا ہے واقعہ میں وہ اُسی نے کہا ہے اور اگر وہ چیز گواہی نہیں دے گی تو ثابت ہو جائے گا کہ خدا تعالیٰ کی طرف غلط بات منسوب کی گئی ہے پس خدا تعالیٰ کے قسم کھانے کے معنے یہ ہونگے کہ وہ اس چیز یا چیزوں کو جن کی وہ حلف اٹھاتا ہے اپنے دعویٰ کی صداقت کے لئے بطور گواہ پیش کرتا ہے اگر وہ اشیاء گواہی دے دیں گی تو معلوم ہو جائے گا کہ خدا تعالیٰ کی طرف وہ کلام سچے طور پر منسوب کیا گیا ہے اور اگر وہ گواہی نہیں دینگی تو ثابت ہو جائے گا کہ وہ کلام جھوٹے طور پر خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہُوا ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ کے کلام میں اگر یہ آ جائے کہ فلاں بات کی صداقت پر پہاڑ گواہی پیش کریں گے تو یہ بات بالکل صاف ہو جائیگی اگر پہاڑ گواہی دے دیں گے تو ثابت ہو جائیگا کہ یہ بات خدا تعالیٰ نے ہی کہی تھی کیونکہ پہاڑوں سے گواہی دلانا کسی انسان کے اختیار میں نہیں خدا ہی اُن سے گواہی دلوا سکتا ہے۔ اور اگر وہ گواہی نہیں دیں گے تو کلام کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کے کلام میں آ جائے کہ فلاں بات کی صداقت پر دریا گواہی دیں گے تو ہم دیکھیں گے کہ دریا اُس بات کی صداقت میں اپنی گواہی پیش کرتے ہیں یا نہیں اگر وہ گواہی دیدیں گے تو ثابت ہو جائے گا کہ خدا تعالیٰ نے ہی وہ بات کہی تھی اور اگر وہ گواہی نہیں دیں گے تو ثابت ہو جائے گا کہ وہ خدا تعالیٰ کا کلام نہیں تھا بلکہ جھوٹے طور پر اس کی طرف منسوب کیا گیا تھا کیونکہ کوئی انسان یہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ کسی پہاڑ سے گواہی دلوا سکے یا کسی دریا کو گواہ بنا سکے۔ یہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کے قبضہ و تصرف میں ہیں اور وہی طاقت رکھتا ہے کہ اُن سے گواہی لے کر دنیا کے سامنے پیش کرے۔

خدا تعالیٰ کے پہاڑوں کے ذریعے صداقت کی گواہی دینے کا مطلب

اگر کہا جائے کہ خدا تعالیٰ کی بات کو مخلوق کی گواہی سے کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے تو اس کا جواب وہی ہے جو اُوپر بیان ہو چکا ہے کہ الٰہی کلام کے بارہ میں یہ سوال نہیں ہُوا کرتا کہ آیا خدا تعالیٰ نے سچ کہا ہے یا نہیں بلکہ سوال یہ ہُوا کرتا ہے کہ جو بندہ اُس کلام کو پیش کر رہا ہے وہ خدا تعالیٰ پر سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔ پس یہ بحث ہی نہیں ہوتی کہ خدا تعالیٰ سچ کہہ رہا ہے یا نہیں۔ بلکہ بحث یہ ہُوا کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ کا نمائندہ ہونے کا مدعی انسان جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سچ ہے یا نہیں۔ پس وہ دلیل جو مخلوق کی شہادت کی خدا تعالیٰ کی طرف سے پیش کی جائے گی۔ وہ اس امر کو ثابت کر دے گی کہ مدعی جو کچھ کہہ رہا تھا سچ کہہ رہا تھا اور اس کا پیش کردہ کلام فی الواقع خدا تعالیٰ کی طرف سے تھا اور اس لئے وہ شخص سچا ہے۔ پس مخلوق نے خدا تعالیٰ کو سچا ثابت نہیں کیا بلکہ اس انسان مدعی کو سچا ثابت کیا جو خدا تعالیٰ کی طرف ایک کلام منسوب کر رہا تھا۔ جب کسی پیشگوئی کے مطابق دریا گواہی دینے لگ جائیں یا پہاڑ گواہی دینے لگ جائیں یا سورج اور چاند گواہی دینے لگ جائیں اور فرض کرو کہ ان پیشگوئیوں کا ذکر کرشنؑ کے کلام میں آتا ہو تو دریاؤں اور پہاڑوں اور سورج اور چاند کی گواہی اس بات کو ثابت نہیں کریگی کہ خدا تعالیٰ سچا ہے بلکہ اس بات کو ثابت کرے گی کہ کرشن جی نے جھوٹ نہیں بولا بلکہ اُس نے خدا تعالیٰ کی طرف جس کلام کو منسوب کیا تھا وہ خدا تعالیٰ کا ہی کلام تھا۔ یا اگر حضرت ابراہیمؑ کی صداقت میں پہاڑ اور دریا گواہی دینے لگ جائیں تو اس کا یہ نتیجہ نہیں نکالا جائے گا کہ چونکہ ان چیزوں نے گواہی دیدی ہے اس لئے خدا تعالیٰ سچا ہے بلکہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ ابراہیمؑ سچ کہہ رہا تھا کہ اُسے خدا تعالیٰ نے یہ یہ باتیں کہی ہیں یا جب حضرت موسیٰؑ کی پیشگوئی میں ذکر آ جائے کہ پہاڑ اور دریا گواہی دیں گے اور وہ واقعہ میں گواہی دے دیں تو اُن کی گواہی سے یہ ثابت نہیں ہو گا کہ خدا تعالیٰ سچا ہے بلکہ یہ ثابت ہو گا کہ موسیٰؑ نے اپنے خدا پر جھوٹ نہیں بولا بلکہ جو کچھ کہا سچ کہا۔ یا

اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تائید میں پہاڑ اور دریا اور دنیا کی اور چیزیں گواہی دینے لگ جائیں تو اس کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ خدا تعالےٰ ان چیزوں کی گواہی کا محتاج تھا بلکہ اس کے صرف یہ معنے ہوں گے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دعویٰ اپنی صداقت کے لئے ان گواہیوں کا محتاج تھا جب ان چیزوں نے گواہی دیدی تو ثابت ہو گیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کہا تھا کہ پہاڑ گواہی دیں گے یا دریا گواہی دیں گے تو انہوں نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی تھی بلکہ خدا کی طرف سے کہی تھی۔ پس مخلوق نے خدا تعالےٰ کو سچا ثابت نہیں کیا بلکہ اُس انسان مدعی کو سچا ثابت کیا جو خدا تعالےٰ کی طرف ایک کلام منسوب کر رہا تھا۔

اگر کہا جائے کہ جب سوال صرف اُس انسان کی سچائی کا ہوتا ہے جو خدا کا کلام پیش کر رہا ہوتا ہے تو اُسے خود قسم کھانی چاہیئے نہ کہ خدا تعالےٰ کو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل وہ انسان بھی الگ قسم کھایا کرتا ہے لیکن چونکہ الٰہی کلام بھی مکمل ہوتا ہے اس لئے اُس کے اندر بھی حلف کا ثبوت جو دنیا میں اکثر لوگوں کے نزدیک سب سے کامل ہوتا ہے ہونا چاہیئے تا اندرونی شہادت اس امر پر موجود ہو کہ وہ کلام مکمل ہے ورنہ وہ مکمل نہیں رہے گا۔ اگر کلام الٰہی میں حلف موجود نہ ہو بلکہ نبی اپنے دعویٰ کی صداقت میں علیحدہ طور پر قسم کھائے تو اس کی حلف اوّل مستقل نہیں ہوگی جیسے حدیثوں میں اس قسم کی حلف کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ مگر حدیثوں کے متعلق لوگ شبہ کرتے ہیں کہ نہ معلوم وہ صحیح ہیں یا نہیں۔ اُن کا یہ شبہ صحیح ہو یا غلط یہ الگ بحث ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں کو اس قسم کے شبہ کی گنجائش ہے اور ہم بھی دعوے سے نہیں کہہ سکتے کہ ہر حدیث صحیح ہے یا ہر حدیث انہی الفاظ میں ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائے۔ یقینی اور قطعی کلام جس کے ایک ایک لفظ پر ہم حلف اُٹھا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا تعالےٰ نے نازل فرمایا ہے اور اسی طرح ہے جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے بیان فرمایا وہ صرف قرآن کریم ہی ہے۔ چنانچہ میور اور نولڈکے جیسے دشمنانِ اسلام بھی یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ جس طرح محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے بتایا اُسی طرح آج تک موجود ہے اُس میں ذرا بھی تغیّر و تبدّل نہیں ہوا۔ پس اگر اس کلام میں قسم موجود ہوگی تو یہ اس بات کا ایک قطعی اور یقینی ثبوت ہوگا۔ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قسم کھائی ہے۔ اگر اس کلام میں قسم موجود نہ ہوتی تو دوسری قسمیں جو حدیثوں وغیرہ میں آتی ہیں وہ اس قسم کی قطعی اور یقینی نہیں ہو سکتی تھیں۔ پس الٰہی کلام میں بھی حلف کا ثبوت موجود ہونا چاہیئے تھا تا کہ یہ اندرونی شہادت دوسری شہادتوں کی تکمیل کرتی۔

۲۷۱ — اس سوال کا جواب کہ اگر قرآن مجید کی صداقت کیلئے حلف کی ضرورت تھی تو آنحضرت صلعم کو حلف اٹھانا چاہیئے تھا نہ کہ خدا کو

دوسرے کلام الٰہی میں کلام لانے والے کی حلف نہیں ہو سکتی بلکہ خدا تعالےٰ کی ہی ہوگی۔ اگر نبی کی حلف ہوگی تو کلام اللہ میں انسانی کلام مل جائے گا۔ مثلاً اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ کہتے کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے خدا تعالےٰ نے بھیجا ہے اور یہ الفاظ قرآن کریم میں موجود ہوتے تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ کلام اللہ میں غیر کا کلام بھی شامل ہو گیا حالانکہ قرآن کریم وہ کتاب ہے جو بسم اللہ کی باء سے لے کر والناس کے س تک تمام کا تمام خدا تعالےٰ کا کلام ہے یا اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فقرہ اس میں موجود ہوتا کہ اے لوگو سنو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں تو اس صورت میں بھی انسانی کلام اللہ تعالےٰ کے کلام میں شامل ہو جاتا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کے کلام میں یہ آجاتا کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہم تجھے کہتے ہیں کہ تو اپنے دعویٰ کی صداقت کے متعلق لوگوں کے سامنے قسم کھا تب بھی شبہ کی گنجائش رہتی کہ نہ معلوم انہوں نے قسم کھائی ہے یا نہیں کھائی۔ جیسے قرآن کریم میں کئی مقامات پر آتا ہے کہ قُلْ یعنی اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم تو لوگوں سے ایسا کہہ دے۔ اب گو ہمارا یقین ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وہ تمام باتیں لوگوں سے کہہ دیں مگر پھر بھی لفظ قُلْ سے ایک دشمن کی نگاہ میں تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہہ بھی دیا تھا۔ اسی طرح اگر قرآن کریم میں ہوتا اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم تو قسم کھا تو دشمن کہہ سکتے تھے کہ کیا معلوم انہوں نے قسم کھائی تھی یا نہیں بہرحال دونوں صورتوں میں قسم کی غرض فوت ہو جاتی۔ اگر کلام الٰہی

میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی قسم آجاتی تو کلام اللہ میں انسانی کلام مل جاتا اور اگر خدا تعالیٰ اپنے کلام میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو قسم کھانے کی ہدایت فرماتا تو پھر بھی لوگوں کو یہ شبہ رہتا کہ نہ معلوم انہوں نے اس کے مطابق قسم کھائی تھی یا نہیں اور اگر الگ قسم کھا لیتے تب بھی کلام الٰہی اس زبردست ثبوت کی عدم موجودگی کی وجہ سے نامکمل رہتا۔

دوسری بات یہ مدنظر رکھنی چاہیئے کہ قرآن کریم نے جن امور پر قسم کھائی ہے یا جن امور کو اپنی صداقت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے اُن میں سے کم سے کم ایک حصہ تو ضرور ایسے علوم سے تعلق رکھتا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے علم اور قبضہ سے بالا تھے (میرے نزدیک سب قسمیں ہی ایسے امور پر مشتمل ہیں) اُن کو شہادت کے طور پر وہ پیش ہی کس طرح کر سکتے تھے نہیں تو خدا تعالےٰ جو علیم و خبیر ہے وہی پیش کر سکتا تھا اور اُسی نے پیش کیا پس یہ سوال کہ قسم اُس انسان کو کھانی چاہیئے تھی جس پر خدا کا کلام نازل ہو رہا تھا نہ کہ خدا تعالےٰ کو۔ بالکل غلط ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تو ان چیزوں کا علم ہی نہیں تھا اور نہ یہ چیزیں اُن کے قبضہ اور اختیار میں تھیں پھر وہ اُن کی قسم کس طرح کھا سکتے تھے پس قسمیں چونکہ علوم غیبیہ پر مشتمل ہوتی ہیں اس لئے کوئی نبی وہ قسمیں کھا ہی نہیں سکتا کیونکہ اُسے معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ آئندہ کیا کچھ ہونیوالا ہے خدا تعالےٰ ہی ہے جو ان چیزوں کو شہادت کے طور پر پیش کر سکتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ قسم کی ضرورت ہی کیا ہے بہت سے لوگ قسم کو وقعت ہی نہیں دیتے اور وہ کہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کی قسم کا کیا سوال ہے قسم تو بندے کو بھی نہیں کھانی چاہیئے چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب پادری آتھم کے مقابلہ میں یہ بات پیش کی کہ اگر پیشگوئی کی ہیبت اس کے دل پر طاری نہیں ہوئی تو وہ قسم کھا کر اعلان کر دے تو عیسائیوں نے یہی کہا کہ قسم کھانا کوئی اچھی بات نہیں ہم اس طریق فیصلہ کو قبول نہیں کر سکتے۔ تو بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قسم کی کوئی قیمت ہی نہیں سمجھتے اور اس وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ الٰہی کلام میں بھی قسمیں نہیں آنی چاہئیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بیشک بعض لوگ قسم کو وقعت نہیں دیتے مگر کسی کے وقعت نہ دینے سے کیا بنتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ قسم اپنی ذات میں وقعت رکھتی ہے یا نہیں؟ اگر رکھتی ہے تو بے شک بعض لوگ اُسے وقعت نہ دیں ان کی وجہ سے ایک سچائی کو چھوڑا نہیں جا سکتا اگر کوئی خدا ہے تو اُس کی جھوٹی قسم کھانا یقیناً سخت عذاب کا موجب ہونا چاہیئے بشرطیکہ دنیا کو اُس سے کوئی بڑا نقصان پہنچتا ہو لغو قسم نہ ہو۔ پس قسم اپنی ذات میں ایک بہت بڑا ثبوت ہے اور بعض کے نہ ماننے کی وجہ سے اُسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر بعض اُسے مفید نہیں سمجھتے تو بعض دوسرے اُسے ایک اہم دلیل قرار دیتے ہیں۔ بے شک کچھ حصہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو کہتے ہیں کہ قسم ایک لغو اور فضول چیز ہے مگر کچھ حصہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جن کی قسم کھانے کے بغیر تسلی ہی نہیں ہوتی۔ جو کلام ساری دنیا کے لئے آئیگا اُس کے لئے ضروری ہوگا کہ اگر کسی ایک گروہ کا مطالبہ بھی جائز اور درست ہو تو اُس کو پورا کرے۔ کیونکہ قرآن کریم صرف اُن لوگوں کے لئے نہیں جو قسم کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ بلکہ ساری دنیا کے لئے ہے جس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کا قسم کے بغیر اطمینان ہی نہیں ہوتا۔ پس جہاں جہاں قسمیں نہیں کھائی گئیں اُس حصۂ قرآن سے وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو قسموں کو ضروری نہیں سمجھتے اور جہاں قسمیں کھائی گئی ہیں اُس حصہ سے وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو قسموں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر صرف ایک گروہ کا مطالبہ پورا کر دیا جاتا اور دوسرے گروہ کا جائز مطالبہ رد کر دیا جاتا تو قرآن کریم سب لوگوں کے لئے نہیں ہو سکتا تھا پھر وہ ایک محدود طبقہ کے لئے رہ جاتا۔ غرض چونکہ دنیا میں ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو قسموں پر اعتبار کرتا ہے بلکہ اسے ضروری سمجھتا ہے اس لئے قرآن کریم کا فرض تھا کہ وہ اور دلائل کے ساتھ اس دلیل کو بھی پیش کر دیتا اور اُس ثبوت کو ترک نہ کرتا جو ایک طبقہ کے اطمینان کے لئے ضروری تھا۔ حدیثوں میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک شخص آیا اور اُس نے کہا میں آپ سے

یہ بات دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ آپ جو باتیں کہہ رہے ہیں اُن کے کہنے کا آپ کو خدا نے حکم دیا ہے؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا بلکہ اللہ تعالٰے کی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ اس پر وہ اُسی وقت آپ پر ایمان لے آیا (صحیح مسلم جلد اول کتاب الایمان) گویا اور دلیلوں سے تو اس کی تسلی نہ ہوئی لیکن جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قسم کھالی تو اس کی تسلی ہوگئی۔

تو جب ایک گروہ دنیا میں ایسا ہے جس کی قسم سے ہی تسلی ہو سکتی ہے تو اگر اللہ تعالٰے کے کلام میں قسم موجود نہ ہوتی تو ایسا گروہ صداقت کے قبول کرنے سے محروم رہ جاتا اور کلام الٰہی پر یہ اعتراض عائد ہوتا کہ وہ دعوٰی تو یہ کر رہا ہے کہ تمام لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے نازل ہوا مگر ایک طبقہ کے جائز مطالبہ کو اس میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں بھی بعض ایسے واقعات ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ کے پاس ایک شخص آیا اور آکر کہنے لگا کیا آپ قسم کھا کر مجھے لکھکر دے سکتے ہیں کہ اللہ تعالٰے نے آپ کو مسیح موعود بنایا ہے؟ آپ نے فرمایا ایک ہفتہ کے بعد آنا۔ جب وہ ہفتہ کے بعد آیا تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُسے ایک تحریر لکھ کر دی جس کا مضمون یہ تھا کہ میں خدا تعالٰے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اپنی کتابوں میں لکھا ہے یا اپنی تقریروں وغیرہ میں بیان کرتا ہوں یہ تمام علوم مجھے خدا نے عطا فرمائے ہیں اور خدا نے ہی مجھے حکم دیا ہے کہ میں ان باتوں کو لوگوں کے سامنے پیش کروں اور اُسی کے حکم سے میں نے مسیح موعود اور مہدی معہود ہونے کا دعوٰی کیا ہے (ایک ہفتہ بعد آنے کی شرط غالبًا آپ نے اس لئے لگائی تا اُس شخص کی سنجیدگی کا ثبوت مل جائے۔ ورنہ بعض لوگ تماشہ کے طور پر سوال کر دیتے ہیں آپ نے ایک ہفتہ کے بعد آنے کی شرط لگا کر امتحان کر لیا کہ وہ شخص سنجیدہ ہے اور وقت مقررہ پر پھر تکلیف اٹھا کر آیا ہے جب یہ امتحان ہو گیا تو آپ نے قسم تحریر فرما دی) تو ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جو اور کسی دلیل کا متلاشی نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے اگر یہ بات سچ ہے تو پھر اس پر قسم کھا جاؤ۔ اس قسم کی فطرت والوں کی اصلاح اور ہدایت کے لئے ضروری تھا کہ قرآن کریم میں قسمیں ہوتیں تاکہ یہ گروہ قبولِ ہدایت سے محروم نہ رہ جاتا۔

تیسرے قرآن کریم کی قسمیں خود اپنی ذات میں ایک ثبوت ہیں چنانچہ قرآن کریم میں جہاں جہاں قسمیں کھائی گئی ہیں اللہ تعالٰے نے اُن چیزوں کو شہادت کے طور پر پیش کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر یہ چیزیں شہادت دے دیں تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ کلام خدا تعالٰے کا ہی تھا اور اگر شہادت نہ دیں تو بے شک اس کے الٹ نتیجہ نکالنا۔ پس وہ قسمیں خود اپنی ذات میں قرآن کریم کی سچائی کا ایک بہت بڑا ثبوت ہیں۔ اُن کا نام حلف رکھو یا شہادت بات ایک ہی ہے بلکہ اگر وہ شہادتِ محضہ کے رنگ میں بھی بیان ہوں تب بھی قرآن کریم کی صداقت کا ایک ثبوت ہیں پس جو لوگ حلف کو وقعت نہیں دیتے وہ اُن کو شہادت سمجھ کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور جو حلف کو وقعت دیتے ہیں وہ اسے شہادت مؤکد بہ حلف سمجھ کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں گویا ایک ہی وقت میں دو مختلف طبائع کے لوگوں کی تسلی کا وہ موجب ہو سکتی ہیں اور اس لئے وہ قابلِ قدر رہتے ہیں نہ کہ قابلِ اعتراض۔ کیونکہ ان قسموں نے دونوں قسم کی ضرورتوں کو پورا کر دیا۔

(قرآنی قسموں کے متعلق ایک مکمل مگر اجمالی بحث انشاء اللہ پہلی قسم کے ماتحت لکھی جائے گی اور تفصیلی بحث تو ہر قسم کے نیچے آجائے گی۔ امام ابن قیم کی اقسام القرآن کتاب بھی اس بارہ میں مطالعہ کے قابل ہے اور بہت سی مفید باتیں اُس میں بیان ہوئی ہیں۔ جزاہ اللہ خیراً عن المسلمین)

جن چیزوں کی اس آیت اور اگلی آیتوں میں قسم کھائی گئی ہے وہ کیا ہیں۔ اس کی مفصل بحث فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کی آیت کے آخر میں آئے گی۔

---

قرآن مجید میں ہر قسم کے لوگوں کے لئے دلائل

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اپنی صداقت کے لئے قسم کھانا

# وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ

اور اُن (ہستیوں) کی جو گرہ باندھتی ہیں خوب اچھی طرح ۳ اور اُن (ہستیوں) کی جو دُور دُور نکل جاتی ہیں ۴

# فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ

پھر (مقابلہ کرکے اپنے مدمقابل سے) خوب آگے نکل جاتی ہیں۔ ۵

نَاشِطَات

**۳ حل لغات۔** نَاشِطَات نَشَطَ سے اسم فاعل کا جمع مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور نَشِطَ يَنْشَطُ نَشَاطًا کے معنے ہوتے ہیں طَابَتْ نَفْسُهٗ لِلْعَمَلِ اُس نے کام کے متعلق اپنے اندر رغبت اور خوشی پیدا کی۔ اور نَشَطَ يَنْشُطُ نَشْطًا الْحَبْلَ کے معنے ہوتے ہیں عَقَدَهٗ رسّے کو اُس نے گرہ دی۔ اور نَشَطَ الْعُقْدَةَ کے معنے ہوتے ہیں اَشَدَّهَا گرہ کو اس نے زیادہ سخت باندھا اور جب کہیں نَشَطَ الدَّلْوَ مِنَ الْبِئْرِ تو اس کے معنے ہوتے ہیں نَزَعَهَا بِغَيْرِ قَامَةٍ وَانْتَشَلَهَا بِلَا بَكَرَةٍ اُس نے ڈول کو بغیر چرخی کے ہاتھوں سے کھینچا۔ اور جب یہ لفظ ان معنوں میں استعارۃً استعمال ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس نے بہت زور لگایا کیونکہ جب پانی بغیر چرخی کے نکالا جائے تو بہت زور لگتا ہے۔ اِسی طرح کہتے ہیں نَشَطَ زَيْدًا اور اس کے معنے ہوتے ہیں طَعَنَهٗ اُس کو نیزہ مارا۔ اور جب کہیں نَشَطَتْهُ الْحَيَّةُ تو اس کے معنے ہوتے ہیں عَضَّتْهُ اس کو سانپ نے کاٹ لیا (اقرب) اور نَشَطَتِ الْاِبِلُ کے معنے ہوتے ہیں مَضَتْ عَلٰى هُدًى اَوْ غَيْرِ هُدًى اونٹ کسی خاص راستہ پر یا یونہی جنگل میں اِدھر اُدھر چل پڑا (اقرب) پس نَاشِطَات کے معنے ہوں گے (۱) ایک چیز کو دوسری سے باندھنے والی ہستیاں (۲) کام کو کرتے وقت بہت زور لگانے والے گروہ (۳) نیزہ زنی کرنیوالے گروہ۔

**تفسیر۔** اس آیت کی تشریح فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا کی آیت کے بعد آئے گی۔

سَابِحَات

**۴ حل لغات۔** اَلسَّابِحَات سَبَحَ سے اسم فاعل جمع مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور جب سَبَحَ الرَّجُلُ کا فقرہ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں تَصَرَّفَ فِيْ مَعَاشِهٖ انسان اپنے معاش کے کاموں میں لگ گیا اسی طرح اس کے معنے ہوتے ہیں نَامَ۔ سو گیا سَكَنَ۔ ٹھہر گیا۔ اَبْعَدَ فِي السَّيْرِ دور نکل گیا۔ اور سَبَحَ فِي الْكَلَامِ کے معنے ہوتے ہیں اَكْثَرَ فِيْهِ۔ اُس نے لمبی گفتگو کی اور سَبَحَ فِي الْاَرْضِ کے معنے ہوتے ہیں حَفَرَ فِيْهَا۔ اُس نے زمین میں گڑھا کھودا۔ اور سَبَحَ فِي النَّهْرِ وَبِالنَّهْرِ کے معنے ہوتے ہیں عَامَ وَانْبَسَطَ فِيْهِ پانی میں تیرا اور تیرتے تیرتے دور نکل گیا۔ اور سَبَحَ سُبْحَانًا کے معنے ہوتے ہیں قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ۔ اُس نے سبحان اللہ کہا (اقرب) پس اَلسَّابِحَات کے ایک معنے ہوں گے۔ وہ گروہ جو دُور دُور نکل جاتے ہیں (۲) وہ گروہ جو قادر الکلام ہیں۔ (۳) وہ گروہ جو خوب تیرنے والے ہیں (۴) وہ گروہ جو اپنے معاش کو خود پیدا کرتے ہیں۔

**تفسیر۔** اس آیت کی تشریح فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا کی آیت کے بعد آئے گی۔

سَابِقَات

**۵ حل لغات۔** اَلسَّابِقَات سَبَقَ سے اسم فاعل کا جمع مؤنث کا صیغہ ہے اور سَبَقَ يَسْبِقُ سَبْقًا کے معنے ہوتے ہیں تَقَدَّمَهٗ وَجَازَهٗ وَخَلَّفَهٗ کسی کے آگے نکل گیا اور اس کو پیچھے چھوڑ گیا۔ اور سَبَقَ عَلَى الشَّيْءِ کے معنے ہوتے ہیں غَلَبَهٗ اس پر غالب آگیا۔ (اقرب) پس اَلسَّابِقَات کے معنے ہوں گے۔ وہ گروہ جو دوسروں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ (۲) وہ ہستیاں جو دوسروں پر غالب آجاتی ہیں۔

**تفسیر۔** اس آیت کی تشریح اگلی آیت کے بعد آئے گی۔

وقف لازم

# فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا۝

پھر جو (دنیا کا) کام (چلانے) کی تدبیروں میں لگ جاتی ہیں۔ ؎۵۶

**؎۵۶ حل لغات۔** تَدْبِیْر کے معنے آگے پیچھے کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں دَبَّرَالْاَمْرَ اَیْ رَتَّبَہٗ وَنَظَّمَہٗ کسی چیز کے کسی حصہ کو پہلے رکھا اور کسی کو بعد میں رکھا اور اس طرح اس کی ترتیب دی۔ نیز کہتے ہیں دَبَّرَالْاَمْرَ اَیْ نَظَرَ فِیْ عَاقِبَتِہٖ وَتَفَکَّرَ۔ کسی امر کے تمام پہلوؤں پر غور کرکے اس کا انتظام کیا اور جب دَبَّرَ الْوَالِیْ اَقْطَاعَہٗ کہیں تو معنے ہوتے ہیں اَحْسَنَ سِیَاسَتَہٗ یعنی منتظم نے اپنی جاگیر کا اچھا انتظام کیا (اقرب) مُدَبِّرَات اسم فاعل کا جمع مؤنث کا صیغہ ہے پس فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا کے معنے ہونگے کسی بات کے تمام پہلوؤں کو دیکھ کر معاملہ کا انتظام کرنیوالے گروہ۔ گویا مدبر کے لفظ میں منتظم کا فرض بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ وہ تمام پہلوؤں کو دیکھ کر انتظام کرتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک بات کو تو دیکھے اور دوسری باتوں کو نظرانداز کر دے۔

**تفسیر۔** ان آیات کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے سے پہلے میں مفسرین کے مختلف اقوال کو پیش کرتا ہوں اسی میں یہ بھی ذکر آجائے گا کہ ہمارے پُرانے بزرگوں نے ان آیات کے کیا معنے کئے ہیں۔ پہلے میں وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا اور وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا کو لیتا ہوں۔ نَازِعَات اور نَاشِطَات کے متعلق اکثر مفسرین اور صحابہؓ اور اُمت محمدیہ کے بزرگوں کے جو اقوال ملتے ہیں وہ خلاصۃً یہ ہیں۔

صاحب کشاف لکھتے ہیں نَازِعَات اور نَاشِطَات فرشتوں کے وہ گروہ ہیں جو جسم کی گہرائیوں میں جاکر جان نکالتے ہیں اور پھر اُسے باہر نکالتے ہیں (جو نَشْطًا کے معنے ہیں) اور پھر اُس گروہ کی قسم کھائی جو خدا تعالےٰ کے احکام کے پورا کرنے میں تیزی سے کام کرتا ہے اور اس کے حکم کے ماتحت امورِ عالم کی تدبیر کرتا ہے۔

فتح البیان میں اُوپر کے معنوں کو بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ قول اکثر صحابہؓ اور تابعین اور اُن کے بعد کے لوگوں کا ہے۔ پھر لکھا ہے سدی کہتے ہیں کہ نَازِعَات سے مراد نفوس ہیں جب وہ سینہ میں غرق ہو جاتے ہیں یعنی موت کے وقت۔ اور مجاہد کہتے ہیں کہ نَازِعَات سے مراد موتیں ہیں جو روحوں کو نکالتی ہیں اور قتادہ کہتے ہیں کہ ان سے مراد ستارے ہیں جو ایک افق سے دوسرے افق کی طرف جاتے ہیں اور پھر دوسرے افق سے نکل آتے ہیں اور ابوعبیدہ اور اخفش اور ابن کیسان کا بھی یہی قول ہے۔ اور اس حد تک یہ معنے درست ہیں کہ لغت میں لکھا ہے نَزَعَ اِلَی الشَّیْءِ نِزَاعًا: ذَھَبَ اِلَیْہِ یُقَالُ "لَہٗ نَزْعَۃٌ اِلٰی کَذَا" یعنی نَزَعَ اِلَی الشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں۔ وہ اس طرف جاتا ہے اسی طرح کہتے ہیں نَزَعَ بِفُلَانٍ اِلٰی کَذَا: دَعَاہُ اِلَیْہِ یعنی اس شخص کو فلاں کام کی طرف بلایا (اقرب) اور نَزَعْتُ بِالْحَبْلِ کے معنے ہوتے ہیں میں نے رسہ سے کھینچا۔ گویا لغت کے لحاظ سے ایک طرف سے جانا اور دوسری طرف سے نکل آنا اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ چونکہ ستارے بھی ایک طرف سے جاکر دوسری طرف سے نکل آتے ہیں اس لئے انہیں نَازِعَاتِ غَرْقًا کہا گیا۔ عطاء اور عکرمہ کا قول ہے کہ نَازِعَات کمانیں ہیں کہ تیر پھینکتی ہیں اور غَرْقًا سے مراد اِغْرَاقٌ ہے کہ تیرانداز تیر کو اس قدر کھینچتا ہے کہ تانت کے ساتھ تیر کا نوک آلگتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ نَازِعَات سے مراد وہ غازی ہیں جو تیراندازی کرتے ہیں۔ گویا اُنکے نزدیک غَرْقًا پر نصب بطور مصدر ہے اور مراد اِغْرَاقًا ہے چنانچہ کہتے ہیں اَغْرَقَ فِیْہِ: (یُغْرِقُ) اِذَا بَالَغَ غَایَتَہٗ یعنی کام کو اس کی انتہائی حد تک پہنچایا۔ (فتح البیان) اور مراد یہ ہے کہ وَالنّٰزِعٰتِ وَالْمُغْرِقَاتِ غَرْقًا یا اِغْرَاقًا۔ ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں تیروں کو کھینچنے والے نفوس کو جو اتنا کھینچتے ہیں کہ تیر کا اگلا سرا کھنچ کر



۲۰۱ سورۃ نَازِعَات کی پہلی پانچ آیتوں کی تفسیر مختلف مفسرین کے نزدیک

تاانتک آجاتا ہے۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ یہ ارواح کفار ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ کفار کی ارواح پہلے کھینچی جاتی ہیں پھر نکالی جاتی ہیں پھر آگ میں پھینک دی جاتی ہیں۔

سابق مفسرین کے نزدیک نَاشِطَاتِ نَشْطًا کا مطلب

وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا۔ ابن عباس اور سدی کہتے ہیں کہ اس سے مراد نفوس ہیں جو قدموں سے نکالے جاتے ہیں۔ گویا جان تمام جسم میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے لیکن جب قدموں کے پاس سے نکالی جائے تو اُن جانوں کو نَاشِطَات کہتے ہیں۔ مجاہد کہتے ہیں اس سے مراد موت ہے جو نفوس انسانی کو نکالتی ہے قتادہ حسن اور اخفش کہتے ہیں کہ ستارے ہیں کہ ایک افق سے دوسرے افق کی طرف جاتے ہیں۔ صاحب الصحاح کہتے ہیں کہ ستارے ہیں جو ایک برج سے دوسرے برج کیطرف جاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نَاشِطَات کا لفظ ارواح مومنین کی طرف اشارہ کرتا ہے اور نَازِعَات سے ارواح کفار کی طرف اشارہ ہے مگر حضرت علیؓ نَاشِطَات کو کفار کی ارواح نکالنے کی طرف اشارہ بتاتے ہیں اسی کے مطابق معاذ ابن جبلؓ سے ابن مردویہ نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے کہ نَاشِطَات دوزخ کے کُتّے ہیں جو گوشت نوچیں گے۔ جس کا مطلب یہ نکلا کہ نَاشِطَات میں مومنوں کی روح کا ذکر نہیں بلکہ کفار کا ذکر ہے کیونکہ دوزخ کے کُتّے تو کفار پر ہی حملہ آور ہوں گے۔ (فتح البیان)

مفسرین کے نزدیک سَابِحَات کے معنے

وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں جو مومنوں کی جان نرمی سے نکالتے ہیں۔ مجاہد اور ابو صالح کا قول ہے کہ اس سے ملائکہ مراد ہیں جو آسمان سے خدا تعالیٰ کا حکم پورا کرنے کے لئے دوڑتے ہوئے اُترتے ہیں۔ مجاہد کا یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد موت ہے جو جسموں میں تیرتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ گھوڑے ہیں جو غزوات میں دوڑتے ہیں۔ قتادہ اور حسن کہتے ہیں کہ یہ ستارے ہیں جو افلاک میں پھرتے ہیں جیسے فرمایا كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (الانبیاء ع) عطاء کہتے ہیں کہ کشتیاں ہیں کہ پانی میں تیرتی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مومنوں کی ارواح ہیں کہ لقاء الٰہی کے شوق میں تیرتی ہیں۔ حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا یہ ملائکہ ہیں جو مومنوں کی ارواح کو لے کر آسمان میں دوڑتے ہیں۔

سابقات سَبْقًا کے متعلق مفسرین کی رائے۔

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا۔ مجاہد اور مسروق کہتے ہیں کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں کہ وحی لے کر شیطانوں سے آگے پہنچتے ہیں اور ابو روق کہتے ہیں کہ ملائکہ ہیں کہ انسانوں سے عمل اور خیر میں آگے نکل گئے۔ مجاہد کا بھی ایسا ہی قول ہے اور مقاتل کہتے ہیں کہ ملائکہ ہیں جو ارواح مومنین کو لے کر آگے نکل جاتے ہیں۔ ربیع کا قول ہے کہ ارواح مومنین ہیں کہ لقاء الٰہی کے شوق میں ملائکہ کی طرح دوڑتی ہیں۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ ملائکہ ہیں کہ مومنوں کی ارواح لے کر ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہیں۔ مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے مراد موت ہے کہ انسان کو دوڑ کر جا پکڑتی ہے۔ قتادہ اور حسن اور معمر کہتے ہیں کہ ستارے ہیں کہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (فتح البیان)

(یہاں ضمنی طور پر میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ بات قرآن کریم کے خلاف ہے کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رات اور دن کا آنا جانا ہمارے ایک قانون کے مطابق ہو رہا ہے اور تمام سیارے اور ستارے اسی قانون کے ماتحت گردش کر رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے سباق کی کوشش نہیں کر سکتے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ (یٰسٓ ع) کہ نہ سورج چاند کو پکڑ سکتا ہے اور نہ رات دن سے بڑھ سکتی ہے پس قرآن کریم کی یہ آیات قتادہ اور حسن اور معمر کی مذکورہ بالا بات کو رد کرتی ہیں کہ ستارے ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں)

عطاء کہتے ہیں کہ اس سے مراد گھوڑے ہیں کہ جہاد میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس جگہ پر جرجانی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ پہلے تو ان آیات میں واؤ واؤ آئی تھی مگر یہاں فا آ گیا ہے پس سَابِقَات پر جو عطف آیا ہے یہ دلیل ہے اس بات کی کہ سَابِحَات سَابِقَات کا سبب ہے اور سَابِقَات نتیجہ ہے جو سَابِحَات کے بعد بیان کیا گیا ہے

یعنی بوجہ تیرنے کے آگے نکل جاتے ہیں۔ مگر واحدی کہتے ہیں یہ دلیل باطل ہے اس لئے کہ آگے مُدَبِّرَات پر بھی فاء ہے اور آگے نکل جانا کسی کام کی تدبیر کرنے کا سبب نہیں ہو سکتا یعنی اگر واؤ کی جگہ فَالسَّابِقَاتِ پر فاء آنے کے سبب سے سَابِحَات کو سَابِقَات کا سبب قرار دیا جائے تو ماننا پڑیگا کہ چونکہ مُدَبِّرَات سے پہلے بھی فاء آیا ہے اس لئے تدبیر کا سبب آگے نکل جانا ہے مگر یہ درست نہیں کیونکہ آگے نکل جانے کا فعل تدبیر کرنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ پس مُدَبِّرَات کے لفظ سے پہلے بھی فاء کا آنا بتاتا ہے کہ یہ دلیل غلط ہے۔ امام رازی کہتے ہیں کہ واحدی کا یہ اعتراض درست نہیں کیونکہ سَبْحٌ اور پھر سِبَاقٌ اور پھر تَدْبِیرُ امرِ فی الواقع ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور اسی وجہ سے ایک ترتیب میں سب کا ذکر آتا ہے اس پر مؤلف فتح البیان کہتے ہیں کہ اتصال اور سبب میں فرق ہے اس لئے رازی کا یہ جواب غلط ہے فاء محض عطف کے لئے بھی آتی ہے اس لئے اس سے کسی نکتہ کے نکالنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے یہ مضمون اس لئے نقل کر دیا ہے کہ بعض لوگ فاء کے استعمال سے لازماً سبب کے معنے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کیلئے یہ بحث ہدایت کا موجب ہو مگر یہ کہنا کہ فاء یونہی لایا گیا ہے یہ بھی درست نہیں اس جگہ واؤ استعمال کرتے ہوئے فاء کا لانا بتاتا ہے کہ مضمون بدل گیا ہے ورنہ جب پہلی دو آیتوں پر واؤ عطف لایا گیا تھا تو کیوں آخری دو آیتوں پر واؤ عطف نہ لایا گیا (پہلی آیت پر جو واؤ ہے وہ واؤ قسم ہے) اصل بات یہ ہے کہ اس جگہ فاء ضرور دوسرے معنے دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ واؤ کو ترک کر کے فاء کو استعمال کیا گیا ہے۔ اگر دوسرے معنے پیدا کرنے مقصود نہ ہوتے تو واؤ عطف کا استعمال جاری رکھا جاتا سو وہ دوسرے معنے کیا ہیں؟ وہ معنے میرے نزدیک ترتیب کے ہیں ان دو آیتوں میں ضرور ایسے معنے بھی پائے جاتے ہیں جو ترتیب پر دلالت کرتے ہیں۔ اور جو پہلی آیتوں کے مضمون کے ثابت ہونے کے بعد ہی حاصل ہو سکتے ہیں چنانچہ ان معنوں کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا حضرت علیؓ فرماتے ہیں اس سے مراد ملائکہ ہیں جو امرِ عبادت کی تدبیر سال کے شروع سے لیکر آخر تک کرتے ہیں۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں ملائکہ ہیں جو ملک الموت کے ساتھ آتے ہیں کوئی روح اوپر لے جاتا ہے۔ کوئی دعا پر آمین کہتا ہے۔ کوئی استغفار کرتا ہے۔ قشیری کہتے ہیں کہ اس پر اجماع ہے کہ یہاں ملائکہ کا ذکر ہے مگر ماوردی کہتے ہیں کہ نہیں دو تفسیریں ہیں بعض نے ملائکہ مراد لئے ہیں اور بعض نے سات ستارے قرار دئے ہیں اور تدبیر امر سے بھی دو امر مراد لئے گئے ہیں ایک اُن کی حرکات کی تدبیر اور دوسرے امورِ قضاء کی تدبیر جو ان کے بارہ میں ہوں۔ تدبیرِ ملائکہ سے بعض نے یہ مراد لیا ہے کہ الٰہی احکام کی تنفیذ جو ملائکہ پر نازل ہوتے ہیں اس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے (فتح البیان)

یہ قرآن کریم کی ان پانچ جملوں کی اس تفسیر کا خلاصہ ہے جو گذشتہ مفسرین نے کی ہے۔ جہاں تک ان الفاظ کے معنوں کا سوال ہے ہمیں کسی ایسے معنے پر اعتراض نہیں ہو سکتا جو لغتاً صحیح ہوں جو معنے لغتاً جائز اور درست ہیں اُن میں سے ہر معنے اپنی اپنی جگہ پر چسپاں ہو سکتے ہیں مگر جب کسی کلام کی تفسیر کی جاتی ہے تو اس کلام کی صحیح تفسیر اور تشریح کرنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کلام کا قرینہ کیا تھا یا اس کلام کا محل کیا تھا۔ اگر اس کلام کا محل ہم سمجھ لیں تو سب سے پہلے اس کے محل کو دیکھیں گے اور اگر محل نہ ملے تو قرینہ سے اس کلام کی تشریح کی جائیگی۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے دوڑ کر بازار سے سودا خرید لاؤ اور ہم بھی اُس کے اس فقرہ کو سُن لیتے ہیں تو اگر اُس وقت اس کا نوکر موجود تھا تو چونکہ کلام کے محل کا ہمیں علم ہو گیا اسلئے ہم کہینگے کہ اُس نے اس فقرہ کے ذریعہ اپنے نوکر سے کہا تھا کہ جاؤ اور دوڑ کر بازار سے سودا لے آؤ لیکن اگر ہم کلام کے اس محل کو تو نہ دیکھیں اور یہ فقرہ سُن کر کہ دوڑ جاؤ یہ نتائج اخذ کرنا شروع کر دیں کہ اس سے نوکر کہاں مراد ہو سکتا ہے اس سے تو ہر انسان مراد ہے کیونکہ ہر انسان آخر دوڑ سکتا ہے یا یہ کہنا شروع کر دیں کہ اس سے مراد فلاں بادشاہ ہوگا اور جب اس سے پوچھا جائے کہ اس کا ثبوت کیا ہے تو وہ کہہ دے کہ کیا بادشاہ دوڑ نہیں سکتا یا بادشاہ بازار سے سودا خرید کر نہیں لا سکتا یا یہ کہنا شروع کر دیں کہ اُس کے اِس فقرہ کا مطلب یہ تھا

سورۃ نازعات کی پہلی پانچ آیات کی تفسیر علما مفسرین کے ایک گروہ کے

کہ فلاں مشہور فلاسفر دوڑ کر جائے اور سودا خرید لائے یا فلاں کروڑپتی دوڑ کر جائے اور سودا خرید لائے تو ہر شخص ہمیں پاگل اور احمق قرار دے گا اور کہے گا کہ تم موقع اور محل کو بھی تو دیکھو اور یہ بھی تو سوچو کہ اس نے جس وقت یہ بات کہی ہے اس کا نوکر سامنے کھڑا تھا بے شک بادشاہ بھی دوڑ سکتا ہے۔ فلاسفر بھی دوڑ سکتا ہے کروڑپتی بھی دوڑ سکتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ جب اُس نے یہ بات کہی تو اس کے کلام کا محل کیا تھا۔ اگر ہم محل کو تو نہ دیکھیں اگر ہم اس امر کو تو نظر انداز کر دیں کہ اُس کا نوکر اُس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اُسے مخاطب کر کے کہہ رہا تھا کہ جاؤ اور بازار سے سودا خرید لاؤ اور خود ہی قیاس آرائی شروع کر دیں کہ یہ فقرہ کس کے متعلق ہے ایک کہے بادشاہ کے متعلق ہے۔ دوسرا کہے میرا خیال ہے کہ فلاں فلاسفر کے متعلق ہے۔ تیسرا کہے میرا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ یہ فلاں کروڑپتی کے متعلق ہے تو سب لوگ ہنسیں گے اور کہیں گے کہ تم کو کیا ہو گیا ہے کہ اتنی بات بھی نہیں سوچتے کہ یہ فقرہ کہا کس کو گیا تھا۔ بے شک بادشاہ بھی دوڑ سکتا ہے اور سودا خرید کرلا سکتا ہے۔ بے شک ایک فلاسفر بھی دوڑ سکتا ہے اور سودا خرید کرلا سکتا ہے۔ بے شک ایک کروڑپتی بھی دوڑ سکتا ہے اور سودا خرید کرلا سکتا ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ اس بات کا محل کیا تھا؟ نوکر اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اُسے کہہ رہا تھا کہ دوڑ کر بازار سے سودا خرید لاؤ پس لازماً اس سے مراد اُس کا نوکر ہی ہوگا کوئی اور شخص نہیں ہوگا۔ پس کسی کلام کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اُس کلام کے محل کو دیکھا جائے اور پھر اُس کلام کے کوئی معنے کئے جائیں۔ محل کو نہ دیکھنا اور یونہی قیاس آرائی شروع کر دینا دانائی نہیں ہوتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی بات کا محل ہمیں معلوم نہ ہوسکے تو قرینہ دیکھنا چاہیئے۔ مثلاً ایک شخص گھر میں آتا ہے نوکر اُس کے سامنے نہیں مگر وہ یہی سمجھتا ہے کہ نوکر گھر پر ہوگا۔ اُس وقت اتفاقاً اُسے کوئی ضروری کام پیش آجاتا ہے اور وہ کہتا ہے جلدی دوڑو اور فلاں کام کر آؤ۔ اب بیشک نوکر ہمارے سامنے نہیں ہوگا مگر یہ قرینہ تو ہوگا کہ آقا نے اپنے گھر میں یہ فقرہ کہا پس لازماً اس سے مراد اس کا نوکر ہی ہوگا لیکن اگر قرینہ کو نہ دیکھا جائے اور یہ فقرہ لے کر ایک شخص کہے کہ دوڑ جاؤ جو کہا گیا ہے تو یہ فلاں دوکاندار سے کہا گیا ہے۔ دوسرا کہے یہ بالکل غلط ہے میرا خیال ہے کہ فلاں کو نہیں فلاں سے کہا گیا ہے۔ تیسرا کہے کہ میرا قیاس کچھ اور کہتا ہے میرے نزدیک تو فلاں سے کہا گیا ہے کہ دوڑ جاؤ۔ تو یہ ساری باتیں لغو اور بیہودہ ہوں گی۔ ہم کہیں گے کہ پہلے قرینہ کو بھی تو دیکھو کہ وہ کس امر کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ قرینہ بتا رہا ہے کہ ایک شخص نے یہ بات اپنے گھر میں کہی۔ پس پہلا قیاس یہ ہوسکتا ہے کہ اُس نے یہ بات اپنے نوکر سے کہی ہو۔ دوسرا قیاس یہ ہوسکتا ہے کہ اُس نے یہ بات اپنے بیٹے سے کہی ہو کیونکہ بیٹا بھی خادم کی حیثیت رکھتا ہے یا اگر اُس نے بیٹے کو نہیں کہا تو ممکن ہے اُس نے اپنے کسی اور عزیز رشتہ دار کو یہ بات کہہ دی ہو مثلاً بھتیجے کو یہ بات کہہ دی ہو یا بھانجے کو یہ بات کہہ دی ہو لیکن اگر ہم قرینہ کو تو نہیں دیکھتے اور ایک فقرہ کو لے کر یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اس سے فلاں مراد ہوگا یا فلاں مراد ہوگا یا فلاں اس سے مراد ہوگا تو یہ بات ہماری معقول نہ کہلا سکیگی۔ اسی طرح یہاں محض یہ سوال نہیں کہ نَازِعَات کے کیا معنے ہیں یہ سوال نہیں کہ نَاشِطَات کے لغت میں کیا معنے ہیں۔ یہ سوال نہیں کہ سَابِحَات کے کیا معنے ہیں۔ یہ سوال نہیں کہ سَابِقَات کے کیا معنے ہیں۔ یہ سوال نہیں کہ مُدَبِّرَات کے کیا معنے ہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ اس مقام اور اس جگہ پر ان الفاظ کے موقع و محل اور قرائن کے اعتبار سے کون سے معنے ہوسکتے ہیں۔ پس ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس جگہ پر وہ معنے چسپاں ہوسکتے ہیں جو مفسرین نے لئے ہیں۔ اس غرض کے لئے اوّل ہم ترتیبِ الفاظ کو دیکھیں گے کہ آیا ترتیب الفاظ کے لحاظ سے وہ معنی چسپاں ہوسکتے ہیں یا نہیں۔ پھر آیتوں کے باہمی جوڑ کو دیکھیں گے کہ ان کے لحاظ سے وہ معنے کہاں تک موزون ہیں پھر سیاق دیکھیں گے کہ اس کے مطابق وہ بنتے ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد اگلی آیتوں کو دیکھیں گے کہ اُن کے ساتھ ان معنوں کی مناسبت

سے پچھلی آیتوں کا کوئی جوڑ ثابت ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ غرض کئی باتوں کو دیکھا جائے گا اور کئی پہلوؤں سے ان معنوں پر غور کیا جائیگا اگر یہ معنے مطابقت کھائیں گے تو انہیں لے لیا جائے گا ورنہ ان کو رد کر دیا جائے گا۔ مثلاً یہی دیکھ لو وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا سے مراد بعض نے وہ ستارے لئے ہیں جو ایک افق سے دوسرے افق کی طرف جاتے اور پھر دوسرے افق میں سے نکل آتے ہیں۔ اب یہ ایک معنے نَازِعَات کے نکال لئے جاتے ہیں مگر جب وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا کے الفاظ آتے ہیں تو پھر بھی یہی معنے کئے جاتے ہیں کہ یہ ستارے ہیں جو ایک افق سے دوسرے افق کی طرف جاتے ہیں۔ اول تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں دو آیتیں بیان کی گئی ہیں مگر ان کے دو معنے نہیں کئے جاتے بلکہ ایک ہی معنے کئے جاتے ہیں۔ نَازِعَات سے بھی ستاروں کا جانا اور واپس آنا مراد لیا جاتا ہے اور نَاشِطَات سے بھی ستاروں کا جانا اور واپس آنا مراد لیا جاتا ہے۔ اب یہ کیسی عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بات نَازِعَات میں بیان کی تھی وہی اس نے نَاشِطَات میں بیان کر دی کوئی زائد بات اس نے بیان نہیں کی یہ بات تو نہایت ردی اور فصاحت سے گرے ہوئے کلام میں پائی جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی کتاب تو ہر قسم کے نقائص سے منزّہ اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے دنیا کی تمام کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے اس میں ایسی بات کس طرح آ سکتی ہے کہ نَازِعَات میں بھی وہ ستاروں کے آنے جانے کا ذکر کرے اور نَاشِطَات میں بھی وہ ستاروں کے آنے جانے کا ذکر کرے۔ یہ پہلا ثبوت ہمیں اس بات کا ملتا ہے کہ جو معنے ان الفاظ کے کئے گئے ہیں گو وہ لغت کے لحاظ سے تو درست ہوں مگر ان آیات میں وہ معنے مراد نہیں۔ ستاروں کا ذکر اس جگہ اسی صورت میں مراد لیا جا سکتا تھا کہ دونوں آیتوں کا الگ الگ مضمون ہوتا۔ ان مفسرین کا اس بات پر مجبور ہونا کہ دونوں آیتوں کے ایک ہی معنے کریں بتاتا ہے کہ یہ معنے ہی غلط ہیں ورنہ ان معنوں کے رو سے اگر وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا کو بالکل الگ کر دیا جاتے تو وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا سے ہی وہ معنے نکل آتے ہیں جنکو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا کے الفاظ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

اسی طرح وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا کے یہ معنے کئے گئے ہیں کہ یہ ستارے ہیں جو افلاک میں دوڑتے پھرتے ہیں اور اس کا استدلال كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ والی آیت سے کیا جاتا ہے۔ پھر فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا کے بھی یہی معنے کر لئے جاتے ہیں کہ یہ ستارے ہیں جو ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ قرآن کریم میں بڑا زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ہر چیز اپنے اپنے دائرہ میں گردش کر رہی ہے یہ نہیں کہ سورج بھاگا بھاگا جا رہا ہو کہ کہیں چاند مجھے نہ پکڑ لے اور چاند اس ڈر سے دوڑ رہا ہو کہ کہیں مریخ مجھ پر قبضہ نہ پا لے۔ مگر ہمیں فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا کے ایسے معنے بتائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا سورج اور چاند اور ستارے سب جاندار چیزیں ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں حالانکہ اگر سورج چاند کو پکڑ لے تو اس میں کیا فائدہ ہے نقصان ہی نقصان ہے کہ نظام شمسی تباہ و برباد ہو جائے گا۔ ہمیں سیاق ان باتوں میں تلاش کرنا چاہیئے جن میں دنیا کا نفع ہے نہ کہ ان باتوں میں جن میں نقصان اور تباہی ہے۔

پھر فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد نجوم ہیں حالانکہ قرآن کریم اور احادیث سے بالصراحت ثابت ہے کہ تدبیر امر خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے ستارے مدبرات امر نہیں کہلا سکتے چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں يَقُوْلُ اللّٰهُ (عَزَّ وَجَلَّ) مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِيْ وَمُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ (بخاری مصری جلد اول ابواب الاستسقاء) یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص کہتا ہے فلاں فلاں ستارہ کے اثر کی وجہ سے بارش ہوئی ہے وہ میرا کافر ہے اور ستاروں کا مومن۔ گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بفرمان خداوندی ستاروں کی طرف تدبیر امر کی نفی کرتے ہیں مگر بعض مفسرین یہ بتلاتے ہیں کہ ان سے ستارے مراد ہیں۔ غرض ان آیتوں کے جس قدر

معنے کئے جاتے ہیں اُن میں سے بعض کو قرآن کریم بالنص رد کرتا ہے اور بعض ایسے ہیں جو استدلال کی روشنی میں قابل قبول نہیں رہتے۔ اور بعض ایسے ہیں جن کو تسلیم کرنے کے نتیجہ میں بعض قرآنی الفاظ کو زائد قرار دینا پڑتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ پہلے فقرہ کے جو معنے ہیں وہی دوسرے فقرہ کے ہیں حالانکہ قرآن کریم خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کا ہر لفظ حکمت پر مبنی ہے۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ نَازِعَات کے یہ معنے کئے جاتے ہیں کہ اس سے فرشتوں کے وہ گروہ مراد ہیں جو جسم کی گہرائیوں میں جا کر جان نکالتے اور پھر اُسے باہر نکالتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد موتیں ہیں جو جان کو نکالتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس سے مراد نفوس ہیں جو سینہ میں غرق ہو جاتے ہیں یہ تو وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے معنے تھے جب وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا کے الفاظ آتے ہیں تو پھر یہ معنے کر لئے جاتے ہیں کہ اس سے مراد وہ نفوس ہیں جو قدموں سے نکالے جاتے ہیں۔ کوئی کہہ دیتا ہے یہ موت ہے جو نفوس انسانی کو نکالتی ہے۔ اس کے بعد وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا کا ذکر آتا ہے تو پھر کہہ دیتے ہیں یہ ملائکہ ہیں جو مومنوں کی نرمی سے جان نکالتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس سے مراد موت ہے جو جسم میں تیرتی ہے۔ چوتھے نمبر پر فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا کا ذکر آتا تھا اس کے بھی یہ معنے کر لئے گئے ہیں کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں جو مومنوں کی ارواح لے کر آگے نکل جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس سے مراد موت ہے جو انسان کو دوڑ کر جا پکڑتی ہے۔ آخر میں فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا کا ذکر آیا تھا اس کے متعلق بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ ملائکہ ہیں جو ملک الموت کے ساتھ آتے ہیں۔ گویا پانچ فقرے خدا تعالیٰ نے استعمال کئے مگر ہر جگہ انہوں نے یہی معنے کر لئے کہ اس سے مراد موت ہے۔ کوئی کہتا ہے قدموں میں سے جان نکالی جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے وہ تیر کی طرح انسانی جسم میں تیرتی ہے۔ کوئی کہتا ہے وہ انسان کو دوڑ کر آ پکڑتی ہے حالانکہ وہ خواہ تیر کی طرح

نازعات اور ناشطات سے مراد فرشتوں کے گروہ تیرے یا قدموں میں سے نکلے پھر ہوا کیا۔ اور بات کیا بنی کہ ہر جگہ موت کا ذکر شروع ہو گیا اور وہ بھی بالکل بے معنی۔ ایک فقرہ

آتا ہے تو اس کے معنے بھی روح کے نکالے جانے کے کئے جاتے ہیں۔ دوسرا فقرہ آتا ہے تو اس کے معنے بھی روح کے نکالے جانے کے کئے جاتے ہیں۔ تیسرا فقرہ آتا ہے تو اس کے معنے بھی روح کے نکالے جانے کے کئے جاتے ہیں۔ یہ بات کیا ہوئی اور قرآن کا مقصد کیا ہوا کہ بار بار روح کے قبض کا ذکر بغیر کسی مزید مقصد اور فائدہ کے کرتا ہے۔ آخر اس سے بنی نوع انسان کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے یا اُن کے علم میں اس سے کیا اضافہ ہو سکتا ہے یا کونسی پیشگوئی ہے جو ان معنوں میں نظر آتی ہے۔ کونسا غیب ہے جو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے یا کونسی ترقی ہے جو ان معنوں میں علم سائنس میں ہوتی ہے یا علم الاخلاق میں ہوتی ہے یا علم روحانیت میں ہوتی ہے۔ آخر ہوا کیا؟ جان قدموں میں سے نکلے یا ہاتھ پاؤں میں سے نکلے بہرحال جو مر گیا وہ مر گیا ہمیں اس سے کیا بحث ہے کہ اس کی جان قدموں سے نکلی تھی یا سر میں سے نکلی تھی۔ مگر کوئی حکمت نہیں بتائی جاتی اور اندھا دھند خدائی کلام کے پانچ فقروں کے مسلسل یہ معنے کئے جاتے ہیں کہ اس سے موت ہی مراد ہے اور کچھ مراد نہیں۔

پھر خود ایک ایک آیت کے جو معنے کئے گئے ہیں اُن میں بڑا اختلاف ہے۔ معاذ بن جبل سے ابن مردویہ نے جو حدیث نقل کی ہے اُس میں یہ بتایا گیا ہے کہ نَاشِطَات دوزخ کے وہ کتے ہیں جو دوزخیوں کا گوشت نوچیں گے اور دوسرے کہتے ہیں اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مومنوں کی جان نکالتے ہیں۔ یہ کتنے متضاد معنے ہیں کہ ایک شخص کہتا ہے یہ دوزخ کے وہ کتے ہیں جو دوزخیوں کا گوشت نوچیں گے اور دوسرا کہتا ہے اس سے وہ ملائکہ مراد ہیں جو مومنوں کی جان نکالتے ہیں۔ ان ساری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک امر پر مفسرین کا اتفاق نہیں ہوا بلکہ ہر بات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ صرف ایک معنے ہیں جس پر اتفاق پایا جاتا ہے اور وہ معنے فرشتوں کے ہیں۔ اکثر صحابہ اور تابعین اور اُن کے بعد آنے والے مسلمان زیادہ تر اسی امر پر متفق نظر آتے ہیں کہ نَازِعَات اور نَاشِطَات سے مراد فرشتوں کے گروہ ہیں لیکن اس میں ایک دِقّت ضرور ہے اور وہ یہ کہ ان معنوں کے

لحاظ سے بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جو بات نَازِعَات میں بیان کی گئی تھی وہی نَاشِطَات میں بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں نَازِعَات سے مراد بھی فرشتوں کے گروہ ہیں جو جان نکالتے ہیں اور نَاشِطَات سے مراد بھی فرشتوں کے گروہ ہیں جو جان نکالتے ہیں گویا ان معنوں کو تسلیم کر لینے کی صورت میں پھر بھی یہ دِقت باقی رہے گی کہ جو بات ایک آیت کے ذریعہ ادا کی جا سکتی تھی اس کے لئے دو آیتیں کیوں لائی گئی ہیں پس یہ ایک دقت ضرور ہے لیکن جہاں تک محل کا سوال ہے ان آیات کے معنوں میں فرشتوں کا تسلیم کرنا کوئی بعید بات نہیں بلکہ قرینِ قیاس ہے اور آیتوں کا مضمون اس کی تائید کرتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ نقص ضرور ہے کہ اس کی تفاصیل میں مفسرین نے بعض ایسی باتیں بیان کی ہیں جن کے متعلق یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اُن میں بلا وجہ تکرار سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم میں بعض مقامات میں تکرار بھی پایا جاتا ہے مگر وہی تکرار مفید ہوتا ہے جو زائد معنے دیتا ہو۔ اور اگر اُس تکرار کو اُڑا دیا جائے تو ساتھ ہی مضمون کے وہ زائد معنے بھی اُڑ جاتے ہوں لیکن جہاں ایسے معنے نہ ہو سکیں وہاں کلام الٰہی میں تکرار ایک عیب کی چیز ہے۔ بہر حال اگر اس نقص کو دُور کر کے اِن معنوں کو قرآن کریم کی اِن آیات پر چسپاں کیا جا سکے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ معنے بالکل قرینِ قیاس اور آیات کے مضمون کے مطابق ہوں گے۔

تیسرے معنے جن کی طرف سب سے کم توجہ کی گئی ہے مگر درحقیقت وہ سب سے زیادہ اِن آیات پر چسپاں ہوتے ہیں اور جن کی طرف تفاسیر میں اشارہ بھی پایا جاتا ہے وہ یہ ہیں کہ ان میں نَازِعَات سے مراد وہ غازی ہیں جو تیر اندازی کرتے اور غزوات میں اپنے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ یہ معنے سب سے زیادہ قرینِ قیاس ہیں لیکن انہی معنوں کی طرف سب سے کم مفسرین نے توجہ کی ہے پس اگر ان کے اس خزانہ پر ہم کوئی عمارت کھڑی کر سکیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کچھ حصہ پُرانے مفسرین کا بھی ہے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہی اس کے موجد ہیں بلکہ ہمیں اس بارہ میں پُرانے مفسرین کی راہنمائی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ ان آیات پر ملائکہ کے معنے بھی چسپاں ہو سکتے ہیں جس کی طرف اکثر صحابہ اور تابعین اور بڑے بڑے مسلمانوں کا خیال گیا ہے اسی طرح ان آیات میں غازی بھی مراد لئے جا سکتے ہیں اور گو ہم نہیں کہہ سکتے کہ تابعین سے یہ معنے مروی ہیں مگر بہر حال مفسرین نے اس خیال کا اظہار کیا ہے اور یہ معنے بھی یقیناً ایسے ہیں جو اس مقام پر چسپاں ہو سکتے ہیں اور اُن کا اس پہلو کے متعلق خیال پیدا کر دینا بھی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ بیشک بعض دفعہ عمارت بنانی بھی بڑی مشکل ہوتی ہے مگر عام طور پر عمارت بنانی اتنی مشکل نہیں ہوتی جتنی راہنمائی مشکل ہوتی ہے۔ پس یہ دو معنے ایسے ہیں جو قرینِ قیاس اور موقعہ و محل کے مطابق ہیں۔ گو ان معنوں کو آیات پر چسپاں کرتے ہوئے مفسرین سے بہت کچھ غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ مثلاً فرشتوں کے معنے تو انہوں نے لے لئے ہیں مگر اُن معنوں کو ایسے رنگ میں چسپاں کیا ہے جس میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ کہیں آیتوں کا باہمی جوڑ نہیں ملتا۔ کہیں ترتیب میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ کہیں بلا وجہ تکرار تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال اگر ہم ان معنوں کو پسند کرتے ہیں تو ان مشکلات کو حل کرنا ہمارا کام ہے۔

اب پیشتر اس کے کہ میں اِن آیات کے متعلق اپنی تشریح بیان کروں یہ امر واضح کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جگہ چار فقروں میں مفعول مطلق استعمال ہوئے ہیں اور پانچویں فقرہ میں مفعول بہٖ آیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالنَّازِعَاتِ غَرْقًا۔ وَالنَّاشِطَاتِ نَشْطًا۔ وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا۔ فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا۔ فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا۔ اِن میں سے پہلے چار فقروں میں غَرْقًا۔ نَشْطًا۔ سَبْحًا اور سَبْقًا مفعول مطلق کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اور اَمْرًا مُدَبِّرَات کا مفعول بہٖ کے طور پر۔ جہاں تک فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا کا تعلق ہے وہ تو زیرِ بحث نہیں لیکن باقی چار جگہوں میں مصدر آئے ہیں اُن کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہی مصدر تو انہی افعال سے آئے ہیں جو پہلے آ چکے ہیں مثلاً نَاشِطَات کا نَشْطًا ہے

آیت ۲ تا ۶
نَازِعَات سے مراد غازیوں کے گروہ

سَابِحَات کا سَبۡحًا ہے اور سَابِقَات کا سَبۡقًا ہے مگر نَازِعَات کے مقابلہ میں غَرۡقًا رکھ دیا گیا ہے حالانکہ نَزَعَ کا مصدر نَزۡعًا ہے یا نُزُوۡعًا ہے یا نَزَاعَةً وَنِزَاعًا ہے مگر بجائے اس کے کہ ان میں سے کوئی ایک مصدر رکھا جاتا ان کی بجائے باہر سے ایک اَور لفظ لے لیا گیا ہے اور نَازِعَات کے ساتھ غَرۡقًا کا لفظ رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بہت بڑی حکمت کی بات ہے عربی زبان میں صرف فعل سے معنے متعیّن نہیں ہوتے بلکہ فعل کو اس کے مصدر سے باندھ کر معنے پیدا ہوتے ہیں مثلاً اگر ہم صرف نَزَعَ کہہ دیں تو خالی نَزَعَ کے معنے یہ بھی ہوں گے کہ کسی چیز کو اُکھیڑ دیا۔ یہ معنے بھی ہوں گے کہ فلاں شخص ایک بات سے رُک گیا۔ یہ معنے بھی ہوں گے کہ اُس نے کسی چیز کی خواہش کی۔ لیکن جب اس کو کسی مصدر سے باندھ دیا جائے گا تو اسکے وہی معنے ہوں گے جو اس مصدر سے ظاہر ہوتے ہوں گے۔ مثلاً اگر ہم نَزَعَ نَزۡعًا کہیں گے تو اس کے معنے مشابہ ہو جانے کے نہیں ہونگے کیونکہ مشابہ ہونے کے معنے نُزُوۡعًا مصدر سے پیدا ہوتے ہیں یا اس کے معنے شوق اور خواہش پیدا ہونے کے نہیں ہوں گے کیونکہ یہ معنے اُس وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب نَزَاعَةً وَنِزَاعًا وَنُزُوۡعًا مصدر ہو بلکہ نَزَعَ نَزۡعًا کے معنے کسی چیز کو اُکھیڑ دینے یا کسی کو معزول کر دینے کے ہوں گے یا اَور دوسرے معنے ہوں گے جو اس مصدر سے پیدا ہوتے ہیں۔ تو مصدر معنوں کی تعیین کر دیا کرتا ہے۔ فعل کی شکل ایک ہوتی ہے لیکن مصدر مختلف ہونے سے اس کے معنے بدلتے چلے جائیں گے۔ اب اگر قرآن کریم میں وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا کی بجائے وَالنّٰزِعٰتِ نَزۡعًا ہوتا تو اس کے معنے صرف اتنے ہوتے جو نَزۡعًا مصدر کی صورت میں نَزَعَ کو حاصل ہوتے ہیں یا اگر وَالنّٰزِعٰتِ نَزۡعًا کی بجائے وَالنّٰزِعٰتِ نُزُوۡعًا ہوتا تو پھر نَازِعَات کے وہ معنے ہوتے جن پر نُزُوۡعًا کا مصدر دلالت کرتا ہے یا اگر نَازِعَات کے ساتھ نِزَاعًا آجاتا تو پھر وہ معنے ہوتے جو نَزَعَ نَزَاعَةً وَ نِزَاعًا سے ظاہر ہوتے ہیں تو عربی زبان میں مصدر کا دہرانا محض تاکید کے لئے نہیں ہوتا بلکہ معنوں کی تعیین کے لئے بھی ہوتا ہے لیکن جب کسی فعل کا مصدر نہ آئے بلکہ باہر سے کوئی لفظ آجائے جیسے وَالنّٰزِعٰتِ کے ساتھ غَرۡقًا رکھ دیا گیا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تمام مصدروں کے معنوں میں سے جو بھی اس جگہ چسپاں ہو سکتے ہوں مراد لئے جا سکتے ہیں۔ اگر نَازِعَات کے ساتھ نَزۡعًا مصدر ہوتا تو ہم صرف وہ معنے کرتے جو نَزۡعًا سے ظاہر ہوتے ہیں اگر نُزُوۡعًا مصدر ہوتا تو ہم صرف وہ معنے کرتے جو نُزُوۡعًا سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر نَزَاعَةً یا نِزَاعًا مصدر ہوتا تو ہم صرف وہ معنے کرتے جو نَزَاعَةً یا نِزَاعًا سے ظاہر ہوتے ہیں اور اس طرح آیت کے معنے محدود ہو جاتے لیکن جب وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا کہہ دیا گیا تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ نَزَعَ کے سارے مصادر کے معنے اس مقام پر چسپاں ہو سکتے ہیں گویا اِس طریق سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم سب معنوں کو دیکھو اور پھر غور کرو کہ اس آیت کے کیا معنے ہیں۔ اسی طرح آگے آتا ہے وَالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا اس کے بھی دو مصدر ہیں ایک نَشَطَ یَنۡشُطُ نَشَاطًا اور ایک نَشَطَ یَنۡشُطُ نَشۡطًا یہاں نَشۡطًا کہہ کر معنوں کو وسیع نہیں کیا بلکہ ان کو محدود کر دیا گیا ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ اس آیت کے وہی معنے ہو سکتے ہیں جن پر نَشۡطًا مصدر دلالت کرتا ہے نَشَاطًا مصدر والے معنے اس مقام پر چسپاں نہیں ہو سکتے پس ہم اس آیت کے جب بھی معنے کریں گے نَشۡطًا مصدر کو مدنظر رکھیں گے۔ اور اُن معنوں کی طرف نہیں جائیں گے جو نَشَاطًا سے ظاہر ہوتے ہیں۔

۲۱ قرآن مجید کی بعض آیات کے صحیح معنے سمجھنے کا ایک گر

۷ سورۃ نازعات کی پہلی پانچ آیتوں کی صحیح تفسیر

اب میں پانچوں آیتوں کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا ہوں۔ میں بتا چکا ہوں کہ ایک معنے جو میرے نزدیک معقول ہیں اور جن پر اکثر صحابہؓ کا اور تابعین اور تبع تابعین کا اتفاق ہے اور جو اکثر مفسرین سے بھی مروی ہیں وہ یہ ہیں کہ اس جگہ ملائکہ مراد ہیں۔ مگر یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ملائکہ کیطرف تو مذکر کی ضمیر جانی چاہیئے تھی جیسے قرآن کریم میں ایک اور جگہ

يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (النحل ع ۱۲) کہ کر ملائکہ کی طرف مذکر کی ضمیر پھیری گئی ہے مگر یہاں مذکر کی بجائے مؤنث کی ضمیر آتی ہے حالانکہ ملائکہ مونث نہیں ہیں ۔اس کے متعلق صحابہؓ کے کسی جواب کا تو مفسرین ذکر نہیں کرتے مگر انہوں نے خود اس اشکال کو دور کرنے کی کوشش کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ گو فرشتوں کے لئے ضمیر مذکر آنی چاہیئے تھی مگر اسجگہ فرشتوں سے مراد طوائف الملائکہ یعنی فرشتوں کے گروہ ہیں اور چونکہ ضمیر طوائف کی طرف جاتی تھی اس لئے یہاں مؤنث کی ضمیر لائی گئی ہے مذکر کی ضمیر نہیں لائی گئی ۔ چنانچہ تمام مفسرین اور ادیب اس امر پر اتفاق رکھتے ہیں کہ وَالنَّازِعَاتِ غَرْقًا اور وَالنَّاشِطَاتِ نَشْطًا سے طوائف الملائکہ یعنی فرشتوں کے بہت سے گروہ مراد ہیں اور چونکہ نَازِعَات میں جمع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس لئے معنے یہ ہوں گے کہ فرشتوں کے گروہ در گروہ ۔ پس چونکہ اکثر صحابہؓ اور تابعین اور تبع تابعین اور پھر مفسرین بھی اس بات پر متفق ہیں کہ اس جگہ ملائکہ کی طرف اشارہ ہے اس لئے لازماً وہ اس امر پر بھی متفق سمجھے جائیں گے کہ ضمیر مؤنث طائفہ کی وجہ سے لائی گئی ہے یعنی نَازِعَات سے مراد طَوَائِفُ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ ہیں ۔ جہاں تک اس نقطۂ نگاہ والوں کا سوال ہے جن میں اکثر صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین شامل ہیں یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ یہ خیال کہ کوئی ایک فرشتہ جسمانی طور پر اتر کر دنیا کے سب کام کرتا ہے خلاف شریعت اور خلاف عقیدۂ قرآن ہے اگر عزرائیل ہر شخص کے پاس جا کر اس کی جان نکالتا ہے تو پھر جان نکالنے کے لئے کسی طائفہ کی کیا ضرورت ہے طائفہ کی تو اُسی جگہ ضرورت ہوتی ہے جہاں کام ایک کی طاقت کا نہیں ہوتا یا متعدد کام ہونے کی وجہ سے متعدد کام کرنے والوں کی ضرورت ہو ۔ پس یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ عزرائیل میں لوگوں کی جان نکالنے کی طاقت نہیں اسی لئے وہ لوگوں کی جان نکالنے کے لئے اپنے ساتھ ایک جتھہ لے کر جاتا ہے اور یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ جان نکالنے والا طائفہ مختلف انسانوں کی اپنے اپنے رنگ میں جان نکالتا ہے ۔ اسی طرح باقی کاموں کے متعلق سمجھا جائیگا ورنہ اگر یہی خیال کیا جائے کہ ایک فرشتہ ہی زمین پر اتر کر تمام کام کرتا ہے تو یہ عقیدہ اسلام کے خلاف ہوگا کیونکہ اول تو ہبوطِ جسمانی ہر جگہ پر ایک شرک کے مشابہ عقیدہ ہے گویا اس طرح ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک ہی فرشتہ ایک ہی وقت میں حاضر بھی ہے اور غائب بھی ہے یہاں بھی ہے اور وہاں بھی ہے اور ہر جگہ ہے ۔ گویا محیطِ کل ہونے اور ایک ہی وقت میں عرش و فرش پر ہونے میں وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا شریک ہے نعوذ باللہ من ذالک ۔ دوم ہبوطِ جسمانی کی ضرورت تو مادی اجسام میں ہوتی ہے ملائکہ تو روحانی اجسام ہیں اور ارواح لطیفہ اپنی شعاعوں سے زیادہ کام کرتی ہیں بہ نسبت اپنے جسم کے بدلنے کے ۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جتنی جتنی کوئی چیز لطیف ہوتی چلی جاتی ہے وہ بجائے اپنا مقام بدلنے کے شعاعوں سے کام لیتی ہے پس جیسا کہ ان آیات سے (جن کے ملائکہ کی نسبت ہونے پر سب متفق ہیں) ظاہر ہے ایک ایک کام پر ایک گروہ ملائکہ مقرر ہے جس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنی ہیں کہ ملائکہ کا کام محدود ہوتا ہے اور پھر دائرہ عمل بھی محدود ہوتا ہے ایک کام جو ایک گروہ کے سپرد ہوتا اُسے ایک گروہ کرتا ہے نہ کہ کوئی ایک فرشتہ اور جب یہ حالت ہے تو ماننا پڑے گا کہ ہر گروہ کا کوئی مرکز بھی ہے اور اُس مرکز کے ساتھ اس کے افراد کے تعلقات ہیں اور وہاں وہ اپنے افسر کو رپورٹ دیتے ہیں بیشک انسانوں کی طرح نہیں بلکہ اسی طریق پر جو ملائکہ کے شایان شان اور مناسب حال ہے[1] ۔

اَلنَّازِعَاتِ غَرْقًا کا صحیح حل ۔

اس تمہید کے بعد میں پہلے نَازِعَات کو لیتا ہوں اور اس کی تشریح کرتے ہوئے فرشتوں والے معنوں کو مقدم کر لیتا ہوں کیونکہ اس پر اکثر صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین اور مفسرین کا اتفاق ہے ۔ نَازِعَات کے ایک معنے اُکھیڑنے والی جماعتوں کے ہیں کہتے ہیں نَزَعَ الشَّيْءَ عَنْ مَكَانِهٖ اَيْ قَلَعَهٗ ۔ یعنی کسی چیز کو اپنی جگہ سے اُکھیڑا ۔ پس ان معنوں کے رُو سے نَازِعَات کے معنے ہوں گے اپنی اپنی جگہ سے بعض چیزوں کو اکھیڑنے والے فرشتوں کے متعدد گروہوں کو ہم بطور شہادت پیش کرتے ہیں ۔ اوّل تو اس ترجمہ سے اُس تمہید پر جسے میں بیان کر چکا ہوں مزید روشنی پڑتی ہے اور

[1] ملائکہ کے انتظام اور کام کے متعلق تفصیل کیلئے دیکھئے توضیح مرام طبع نجم و ثنا تا آخر

معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ایک گروہ فرشتوں کا نَزْعُ کے کام پر مقرر ہے بلکہ خود نَزْعُ کا کام مختلف اقسام کا ہے اور ہر کام پر الگ قسم کا گروہ مقرر ہے گویا یہاں سے فرشتوں کے گروہ در گروہ ہونے کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے اور پتہ لگتا ہے کہ نَزْعُ کے کام کے لئے کئی گروہ مقرر ہیں اور نَزْعُ کی ہر قسم پر ایک ایک گروہ مقرر ہے اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت ہر سبب کا مسبّب ایک فرشتہ ہوتا ہے اور چونکہ اسباب بے انتہا اور لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی ہیں اس لئے فرشتے بھی اَن گنت ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (المدثر ع ۲) فرشتوں کی تعداد کا اندازہ انسان نہیں لگا سکتا جس طرح دنیا کے کاموں میں باریک در باریک اسباب کا سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے جن کا کوئی انسان اندازہ بھی نہیں لگا سکتا اسی طرح اُن پر جو ملائکہ مقرر ہیں ان کا بھی کوئی انسان اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اس آیت میں جو فرمایا کہ اپنی جگہ سے اکھیڑنے والے متعدد گروہ۔ تو اس میں اکھیڑنے سے مراد کفار کے اُن دلوں کا اکھیڑنا ہے جو بظاہر کافر لیکن بباطن اسلام سے مناسبت رکھتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس سے پہلی سورۃ میں غلبۂ اسلام اور غلبۂ قرآن کا ذکر تھا اور اس غلبہ کو قیامت کا ثبوت قرار دیا گیا تھا پس اس ترتیب کے مطابق یہ ضروری تھا کہ اس سورۃ میں یہ بتایا جاتا کہ یہ غلبہ کس طرح ہوگا۔ اسلام کس طرح ترقی کرے گا اور کفر کی بنیادوں کو کس طرح اکھیڑا جائیگا اسی لئے اس کو وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا سے شروع کیا گیا اور بتایا گیا کہ کفار کے دل جو بظاہر اسلام سے عناد رکھتے ہیں لیکن بباطن اسلام کی خوبیوں کے قائل ہیں انکو اکھیڑنے کیلئے فرشتوں کے متعدد گروہ کام کرینگے چنانچہ واقعہ بھی کہ اُن میں سے کوئی شخص کسی وجہ سے مخفی طور پر کفر سے بیزار تھا اور کوئی کسی وجہ سے۔ کوئی ان کی وحشت کی وجہ سے بیزار تھا اور کوئی بدانتظامی کی وجہ سے۔ کوئی ظلم کی وجہ سے بیزار تھا اور کوئی شریعت نہ ہونے کی وجہ سے۔ اور اس طرح گو کچھ لوگ کفر کے باغ کے درخت تھے مگر اُن کی جڑیں اس زمین میں کھوکھلی ہو چکی تھیں اور اب اُن کی کفر کی سرزمین سے مناسبت نہیں رہی تھی

نَازِعَاتٌ سے مراد طوائف الملائکہ

جب محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی تو ہر خُلق پر مقرر فرشتے نے اپنے اپنے دائرہ کے باغ کو چُننا اور اُن کے نیک جذبات کو ابھارنا شروع کیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کامل تعلیم لائے تھے اُس میں شرک نہ تھا۔ توحید تھی۔ جہالت نہ تھی۔ علم تھا۔ ظلم نہ تھا۔ انصاف تھا۔ وحشت نہ تھی۔ رأفت تھی۔ مادر پدر آزادی نہ تھی۔ ایک باقاعدہ اور مفید قانون تھا۔ بدانتظامی نہ تھی۔ انتظام تھا۔ غرض ہر قسم کی ضرورت جو انسانی فطرت کو پیش آ سکتی تھی اس کا سامان آپ کی تعلیم میں موجود تھا اور ہر غلطی جو کفر میں موجود تھی اس کی اصلاح کا سامان بھی موجود تھا۔ پس ہر فرشتہ جو کسی خُلق پر مقرر تھا اُس نے ہر دل میں جو اس کے مطابق حال تھا اپنے دائرہ کے مطابق نیک جذبات کو اُبھار کر اس نیکی کو نمایاں کرنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے کفر کا وُہ نقص اُسے بہت ہی بھیانک نظر آنے لگا۔ مثلاً ایک شخص اگر شرک کو ناپسند کرتا تھا تو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے بعد توحید کے قیام کے لئے جو فرشتے مقرر تھے انہوں نے اِن تھوڑی نفرت رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں مزید نفرت پیدا کرنی شروع کر دی اور شرک کی خرابی اُن پر اور زیادہ واضح کر دی۔ دوسری طرف انہوں نے اپنے اپنے دائرہ کی نیک تعلیم جو اسلام میں تھی اسے ان لوگوں کے قریب الفہم بنا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے باغ سے دل برداشتہ ہوگئے اور جس زمین میں وہ لگے ہوئے تھے اُس سے اور بھی نفرت کرنے لگے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ زمین ہمارے مناسب حال نہیں اور وہ باغِ محمدی میں جانے کے بے انتہا مشتاق ہو گئے۔ جب یہ حالت پیدا ہو گئی۔ پہلا قدم فرشتوں نے اٹھا لیا اور لوگوں کے دلوں میں کفر سے نفرت پیدا کر دی اور جو شخص جس نیکی کی طرف مائل تھا اُسے اُس نیکی کی طرف انہوں نے اور زیادہ مائل کر لیا اور اس طرح اسلام کی محبت اُن کے دلوں میں پیدا کر دی۔ تو اس کے بعد ہر گروہ کے فرشتوں نے دوسرا کام شروع کیا جس کا وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا میں ذکر آتا ہے۔

ملائکہ کی مدد سے مسلمانوں کی ترقی

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا قسم ہے اُن طوائف ملائکہ کی جو گرہیں باندھتے ہیں یعنی وہ وہاں سے

اُن ارواح کو کاٹ کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دامن سے باندھنا شروع کر دیں گے۔ پہلے اُن فرشتوں کا ذکر کرنے سے جو قلع کرتے ہیں یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرا گروہ پہلا عمل نہیں کرتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب وہ پہلا عمل کریں گے تو پھر یہ دوسرا کام شروع کر دیں گے۔ یعنی کفر سے بیزار کرنے کے مرحلہ کے بعد انکے اندر ایمان کی محبت پیدا کرینگے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لاکر وابستہ کر دیں گے۔ بیعت بھی باندھنا ہی کہلاتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَكُنْ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ فَمَاتَ مِيتَةَ الْجَاهِلِيَّةِ (مسلم جلد دوم کتاب الفتن) اور نَشْطٌ کے معنے بھی ہیں عَقْدُ الْحَبْلِ یعنی باندھنا۔ پس وَالنَّاشِطَاتِ نَشْطًا کے معنے یہ ہوتے کہ اُن لوگوں کو جو پہلے کفر سے بیزار ہو جائیں گے انکے متعلق فرشتے اسلام کی طرف راغب کرکے آخر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی رسّی میں لاکر باندھ دیں گے۔

پھر فرمایا وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا اور قسم ہے اُن ملائکہ کے گروہوں کی جو تیرتے ہیں اور تیرتے تیرتے دُور نکل جاتے ہیں اِس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی ترقی کے لئے ملائکہ صرف مکہ میں کوشش نہ کریں گے بلکہ جو مستعد روحیں مکہ میں ہوں گی ان کو اسلام کی طرف لاکر وہ دوسرے علاقوں میں نکل جائیں گے اور وہاں جو مستعد روحیں ہوں گی انہیں اسلام کی طرف لائیں گے چنانچہ ملائکہ کی اس پرواز کا ہی نتیجہ تھا کہ ابوذر غفاری قبیلہ غفار سے اور وفد انصار مدینہ سے اسلام لایا۔ ابوموسیٰ اشعری اور اُن کے ساتھ تعلق رکھنے والا گروہ یمن سے آیا اور سلمان فارسی فارس سے آئے اور اس طرح ایک وقت میں اسلام کے مختلف اکناف میں پھیلنے کا سامان ہو گیا۔

اس کے بعد فرمایا فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا۔ پھر انہوں نے مقابلہ شروع کیا کہ کون بڑھتا ہے یعنی جب مختلف علاقوں میں ملائکہ قلوب مومنین فتح کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو ہر علاقہ میں مسابقت کی رُوح پیدا ہو جائے گی اور ہر طبقہ اور ہر علاقہ کے ملائکہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے چنانچہ ملائکہ کے اظلال مومنین کے کاموں سے ہم دیکھتے ہیں کہ اُن میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی بے انتہا تڑپ تھی اور ہر قوم دوسروں سے آگے نکلنے کی خواہشمند تھی چنانچہ زمانۂ خلافتِ اولیٰ اور ثانیہ میں اس کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ خود زمانۂ نبویؐ میں جب مسلمانوں کی جماعت نہایت چھوٹی سی تھی۔ اس مسابقت کی رُوح کا کئی مثالوں سے اچھی طرح پتہ لگ جاتا ہے قوموں کے لحاظ سے مہاجر اور انصار گو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور بھائیوں سے بھی زیادہ وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے مگر دین کی خدمت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ ان میں شدید طور پر پایا جاتا تھا۔ پھر انصار کے خود دو قبیلے تھے اوس اور خزرج۔ وہ آپس کی لڑائی کو بھول چکے تھے۔ وہ اسلام میں داخل ہو کر بھائی بھائی بن گئے تھے۔ مگر دین میں مسابقت کی رُوح اُن میں ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ کون ہے جو مجھے میرے دشمن کی تکلیف سے بچانے کیلئے آگے بڑھے اور آپکا مطلب اس سے کعب بن اشرف شدید دشمنِ اسلام تھا تو اوس میں سے ایک جماعت کھڑی ہو گئی اور اُس نے کہا یا رسول اللہ ہم اس کام کے لئے تیار ہیں چنانچہ آپ نے وہ کام اُن کے سپرد کیا اور انہوں نے اس دشمنِ اسلام کو عام جنگی قواعد کے مطابق (نہ کہ ظلم سے) مار دیا (یہ تفصیل کا موقعہ نہیں۔ دشمنانِ اسلام اعتراض کیا کرتے ہیں کہ آپ نے ناجائز طور پر اس کو قتل کرایا تھا لیکن اُن کا یہ الزام خلافِ تاریخ ہے۔ تفصیلی بحث کے لئے دیکھو تفسیر کبیر جلد اول حصہ اول صفحہ ۵۱۸ تا ۵۲۳) جب کعب مارا گیا تو وہی مسابقت کی روح کہ اسلام میں ہم ایک دوسرے سے بڑھ کر رہیں دوسرے گروہ کے دل میں پیدا ہوئی چنانچہ قبیلہ خزرج کے لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ اب ہمیں بھی کوئی ایسا ہی کام دیجئے تاکہ ہم بھی اپنے بھائیوں سے پیچھے نہ رہیں اور آخر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ابو رافع کو قتل کرنیکا کام اُن کے سپرد کیا۔ وہ اس قبیلہ نے اس دشمنِ اسلام کو جاکر مارا (ابن ہشام حالات قتل ابی رافع سلام ابن ابی الحقیق)

۲۵۱
مختلف فرشتوں کے گروہوں کا اثر صحابہ پر

پھر یہ مسابقت کی روح قبائل میں ہی نہ تھی قبیلوں سے جو چھوٹے چھوٹے خاندان تھے اُن میں بھی یہ روح پائی جاتی تھی چنانچہ انصار کے دونوں قبائل کے مختلف خاندان باری باری رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رات کو پہرہ دیا کرتے تھے مگر وہ عام طور پر بغیر ہتھیار لگائے پہرہ دیا کرتے تھے۔ایک دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر ہتھیاروں کی آواز سنی اور پوچھا کہ یہ شور کیسا ہے کسی نے دریافت کرکے بتایا کہ فلاں خاندان کے لوگ ہتھیار بند ہوکر پہرہ دینے آئے ہیں۔رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی اس روح مسابقت کو دیکھ کر پسند فرمایا۔

۲۷۱
سابقات سبقًا کے ماتحت مسلمانوں میں مسابقت کی روح

پھر غریبوں اور امیروں میں مسابقت کی روح اس قدر پائی جاتی تھی کہ ایک دفعہ غرباء رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ امیر لوگ زکوٰۃ دیتے ہیں مگر ہم بوجہ مال نہ ہونے کے زکوٰۃ کے ثواب سے محروم ہیں۔اسی طرح امراء صدقہ وخیرات کرتے ہیں مگر ہم یہ بھی نہیں کرسکتے کیونکہ ہمارے پاس مال نہیں ہے۔ یا رسول اللہ ہمیں کوئی ایسی نیکی بتائیں جس پر عمل کرکے ہم اُن سے پیچھے نہ رہیں۔رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ہر نماز کے بعد تینتیس ۳۳ دفعہ سُبْحَانَ اللہِ۔ تینتیس ۳۳ دفعہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور چونتیس ۳۴ دفعہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ لیا کرو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پھر شکایت کی کہ یا رسول اللہ اس بات کا کسی طرح امیروں کو بھی علم ہوگیا ہے اور وہ بھی ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس دفعہ سُبْحَانَ اللہِ و اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور چونتیس دفعہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہنے لگ گئے ہیں یا رسول اللہ آپ ان کو روکیں کہ وہ ایسا نہ کریں۔آپ نے فرمایا میں اُن کو نیکی سے نہیں روک سکتا (مسلم جلد اول کتاب الصلوٰۃ) پھر یہ مسابقت کی روح صرف مردوں میں ہی نہیں پائی جاتی تھی بلکہ عورتوں میں بھی یہ روح کام کرتی نظر آتی تھی چنانچہ عورتوں نے ایک دفعہ احتجاج کیا کہ یا رسول اللہ مردوں میں تو آپ وعظ ونصیحت کرتے رہتے ہیں لیکن عورتوں کو یہ موقعہ نہیں ملتا اس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے لئے بھی ایک دن مقرر فرمادیا (بخاری جلد اول کتاب العلم) غرض مسلمانوں میں کام کے متعلق یہ روح نہیں تھی کہ شکر ہے فلاں شخص نے کام کر لیا اور میرا بوجھ اُتر گیا بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ملنے والے تمام افراد میں یہ جوش پایا جاتا تھا کہ ہم دوسروں سے زیادہ ذمہ واری اپنے اوپر لیں۔اور یہی قومی ترقی کا راز ہے۔جب قوم کے افراد ذمہ واری کے مواقع پر دوسروں پر اس بوجھ کو ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔لیکن جب قوم کے ہر فرد میں یہ احساس ہو کہ زیادہ کام کرنے کا موقع مجھ کو ہی ملے تو وہ قوم ترقی کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے صحابہؓ میں یہی مادہ پایا جاتا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ ان کے دلوں میں نیک تحریکیں کرنے والے ملائکہ میں بھی یہی روح پائی جاتی تھی۔جب اسلام اور پھیلا تو یہ مسابقت کی روح ایسی بڑھی کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے خلافتِ اُولیٰ اور خلافتِ ثانیہ کے زمانہ میں بعض قبائل نے اپنی ساری آبادی ہی جنگ میں فنا کر دی۔وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اسلام کے لئے اس موت کے قبول کرنے میں ہمارے ساتھ دوسرے بھی شریک ہوں۔وہ ظاہری انعام واکرام میں تو دوسروں کو شریک بنانا چاہتے تھے مگر ملی اور قومی قربانیوں میں انکی خواہش یہی ہوتی تھی کہ موت کا پیالہ صرف ہم کو ہی ملے دوسروں کو نہ ملے۔ یہ اتنا لمبا مضمون ہے کہ تفسیر اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ بہر حال فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا کا یہ بیّن اور روشن ثبوت تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب مسابقت والا کام ملائکہ کرلیں گے تو پھر ملائکہ مُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ہو جائیں گے یعنی زمین پر انہی کی حکومت ہو جائے گی۔کیونکہ ملائکہ نیک تحریکیں کرنے والے ہیں۔جب زمین پر نیک لوگوں کی حکومت ہو جائے گی تو ہر محکمہ پر اُن لوگوں کا قبضہ ہوگا جو ملائکہ کی باتیں ماننے والے ہیں۔نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا پر ملائکہ کی حکومت ہو جائے گی یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ خدا کی بادشاہت دنیا میں قائم ہو جائے گی کیونکہ ملائکہ کے متعلق

آتا ہے یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ (النحل ع ۶ [۱۲]) وہ وہی کرتے ہیں جو خدا کہتا ہے۔ پس ایسے انسانوں کی حکومت کی وجہ سے جو ملائکہ کی بات مانتے ہیں دنیا پر ملائکہ کی حکومت ہوگی اور ان ملائکہ کی وجہ سے جو خدا کی ہر بات مانتے ہیں خدا کی بادشاہت دنیا میں قائم ہو جائے گی یا تیسرے لفظوں میں یہ کہہ لو کہ وہ دعا جو مسیحؑ نے کی تھی کہ اے خدا "تیری بادشاہت آوے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی بر آوے" (متی باب ۶ آیت ۱۰) وہ حضرت مسیحؑ کے ذریعہ سے تو پوری نہ ہوئی کیونکہ جب تک اُن کی قوم نیک تھی بادشاہت نہ ملی اور جب بادشاہت ملی تو قوم مشرک ہو چکی تھی۔ مگر یہ دعا محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ پوری ہو گئی۔ انکو اسی وقت حکومت ملی جب اُنکے اتباع کے دل فرشتوں کے ہاتھ میں تھے اور وہ وہی کچھ دنیا میں کرتے تھے جو فرشتے اُن سے کہتے تھے اور فرشتے وہی کچھ کہتے جو خدا تعالےٰ اُن سے کہتا تھا۔ اس طرح اُن کے زمانہ میں خدا تعالےٰ کی بادشاہت آسمان پر ہی نہ رہی بلکہ زمین پر بھی آ گئی۔ کیسی شاندار اور زبردست یہ پیشگوئی ہے اور کس طرح دشمن بھی یہ اقرار کرنے پر مجبور رہے کہ خلفاء اسلام کی بادشاہت انسانی بادشاہت نہیں تھی بلکہ اخلاق کی حکومت تھی اور یہ الفاظ غیر مسلموں کے ہاں اسی حکومت کے لئے بولے جاتے ہیں جسے اسلامی اصطلاح میں فرشتوں کی حکومت کہتے ہیں اور کیوں نہ ہم اسے فرشتوں کی حکومت کہیں کیا یوسفؑ کو اِنۡ ھٰذَاۤ اِلَّا مَلَکٌ کَرِیۡمٌ (یوسف ع ۴ [۱۲]) نہیں کہا گیا تھا۔ اس جگہ دو ضمنی باتیں بھی بیان کرنے کے قابل ہیں جو بطور قانونی سبق کے ان آیات سے نکلتی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

اوّل۔ اس جگہ اسلامی ترقی کے لئے وَالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا فرمایا یعنی ابتداء میں ہی دور دور تک اس کی اشاعت ہو جائے گی۔ اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام کی تحریک عالمگیر کشش رکھنے والی ہے کسی ایک ملک یا قوم سے اس کو وابستگی نہیں۔ قومی یا ملکی روایات کی زمین میں اس کی جڑیں نہیں گاڑی گئیں بلکہ اخلاقِ انسانی اور جذباتِ انسانی کی زمین میں اس کی بنیادیں رکھی گئی ہیں اس لئے وہ جلد دُور دُور پھیل جائے گا۔ خواہ شروع میں تھوڑے لوگ ماننے والے ہوں مگر جلد ہی سب قوموں کی توجہ کو اسلام کھینچ لے گا۔ جہاں اس میں اسلام کی ایک زبردست فضیلت کا اظہار ہے جس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں وہاں اس میں سب ایسی تحریکوں کیلئے جو عالمگیر ہونا چاہتی ہوں ایک نکتہ معرفت بھی بیان کیا گیا ہے۔ جبتک انسان اپنے قومی تعصب سے بالا نہیں ہو جاتا وہ کوئی عالمگیر تحریک بھی نہیں کر سکتا۔ مثلاً ہندوستان صرف ایک ملک ہے دنیا نہیں۔ مگر یہاں کے سیاسی لیڈر ابھی تک وطنی فضا بھی پیدا نہیں کر سکے کیونکہ انہوں نے اپنی تحریکوں کی جڑیں قومی دباؤ کی وجہ سے یا اپنے نسبی میلانوں سے مجبور ہو کر ملکی نہیں بلکہ قبائلی میلانات کی زمین میں گاڑی ہیں اس وجہ سے وہ درخت جو ان تحریکوں سے پیدا ہوتے ہیں ایک وقت تک نشو و نما پا کر یا کلی طور پر یا جزوی طور پر خشک ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور سارے ملک کو سایہ دینے والا درخت اُن سے پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام نے شدید قومی تعصبات کے زمانہ میں جب مدینہ جیسے معمولی قصبہ کے دو قبیلے اوس اور خزرج بھی آپس میں لڑ رہے تھے مکہ سے اوس و خزرج کو کھینچا۔ یمن جو عرب میں سیاسی برتری کا مدعی تھا اُسے اپنے تابع کیا۔ یہود سے عبداللہ بن سلام اور ایران سے سلمان فارسی دوڑتے ہوئے آئے گر یہ صرف اپنی قوموں کے نمائندے تھے۔ بعد میں قومیں آئیں اور پروانوں کی طرح آئیں کیونکہ اسلام ایک تالاب کا پانی نہ تھا وہ بارش تھی جو ٹیلے پر برستی ہے اور وہ وہیں جمع نہیں ہو جاتی بلکہ دُور دُور پھیل جاتی ہے۔ اس کے حامل قومی کارکن نہ تھے وہ بنی نوع انسان کے خادم تھے۔ ہر اک نے سمجھا میں ہی اس دولت کا وارث نہیں دوسرے ملک بھی اس میں حصہ دار ہیں چنانچہ وہ اس تعلیم کو لے کر دوڑا اور سب جہان میں اُس کی تعلیم پھیل گئی۔ اگر وہ تعلیم قومی اور ملکی روایات سے متاثر ہوتی یا اس کے ماننے والے مخصوص قوم و ملک کی برتری کے خواہشمند ہوتے تو یہ کبھی نہ ہوتا۔ اب بھی جو قوم انہی مقصود حدود کے مطابق اپنی تعلیم اور اپنے اخلاق کو وسیع نہ کریگی کبھی بھی اپنی مقصود حدود کو نہ پہنچ سکے گی۔

صحابہ کرامؓ کے ذریعہ اس دنیا میں خدا کی بادشاہت کا قیام

اَلسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا میں عالمگیر ترقی کرنے کے [۲۱۱] اصولوں کی طرف اشارہ

اسلامی تعلیم ہر قسم کی فطرت کے لئے

دوسرا سبق اس آیت میں یہ دیا گیا ہے کہ اسلام کی تعلیم حدود کے لحاظ سے ہی وسیع نہیں بلکہ طبائع کے لحاظ سے بھی وسیع ہے اور اسی کی طرف نَازِعَات اور نَاشِطَات کے جمع کے صیغوں سے اشارہ کیا گیا ہے یعنی ملائکہ کے کئی کئی طوائف اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے مخاطب کسی ایک فطرت کے آدمی نہیں بلکہ ہر فطرت تک وہ پہنچتی ہے۔ اس مضمون کی تفصیل کی بھی تفسیر حامل نہیں ہو سکتی مگر یہ موٹی موٹی باتیں ذہن میں رکھو تو یہ امر سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اسلام میں سیاسی، تمدنی، معاشرتی، تجارتی، اقتصادی سب ہی قسم کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ پھر آقا اور ماتحت، بیوی اور میاں، باپ اور اولاد، بھائی اور بھائی، استاد اور شاگرد، غریب اور امیر، بادشاہ اور رعایا، دوست اور دوست سب ہی کے متعلق غیر جانبدارانہ تعلیم موجود ہے۔ اس کے علاوہ عبادت گذار، سپاہی، قاضی، جہاد کی طرف میلان رکھنے والا، انصاف کا دلدادہ، تعلیم کا شیدا، صدقہ و خیرات کا شائق اور تنظیم کا خواہشمند غرض کونسا طبعی مادہ ہے جس کے ابھارنے کی اسکیم پیدا نہیں کی گئی۔ پس جہاں یہ کہکر کہ اسلام کی تبلیغ کیلئے ہر ملک اور ہر طبیعت کے مؤکل ملائکہ مقرر کئے گئے ہیں کیونکہ اس میں ہر ملک کی طرف اور ہر طبیعت کی طرف توجہ کی گئی ہے۔ اسلام کی برتری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہاں عالمگیر تحریکوں کو اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ جہانگیر تحریکوں کے لئے ہر طبیعت اور ہر قوم کے لوگوں کا لحاظ رکھنا اس حد تک کہ اُن کا لحاظ قومی اور ملی کاموں میں روک نہ ہو ضروری ہے بلکہ ہر فرد کی مخصوص قابلیت کو اُبھارنا قومی ترقی کا ایک اہم اور قیمتی جزو ہے۔ انہی معنوں کے رو سے یہ آیات طوائفِ ملائکہ کی جگہ طوائف مومنین کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں لیکن اس تشریح کی ضرورت نہیں کیونکہ اوپر کی تشریح کے مطابق اسے خود ہی حل کیا جا سکتا ہے۔

۲۶۱ سورۃ نازعات کی پہلی پانچ آیتوں کی تفسیر اس لحاظ سے کہ ان آیات میں فوج انسانی مراد ہیں

اب میں ان آیات کی ایک دوسری تشریح بیان کرتا ہوں اور یہ تشریح اس امر کو فرض کر کے ہے کہ اس جگہ طوائفِ ملائکہ مراد نہیں بلکہ طوائفِ انسانی مراد ہیں۔ نَزَعَ کے ایک معنے تیر اندازی کے ہیں اور نَشَطَ کے معنے رسیوں سے باندھنے کے ہیں۔ سَبَحَ کے معنے تیرنے یا دُور دُور نکل جانے کے ہیں۔ سِبَاق کے معنے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کے اور غالب آ جانے کے ہیں اور تدبیر امر کے معنے نظامِ حکومت کے ہاتھ میں آ جانے کے ہیں۔ ان معنوں کے رو سے یہ ایک پیشگوئی ہے اسلامی فتوحات کی۔ سورۂ نبأ میں یوم الفصل کی طرف اشارہ کیا تھا اور اُس دن کی طرف توجہ دلائی گئی تھی جب اسلام کا غلبہ ایسے رنگ میں ہو جائے گا کہ کافر کہے گا یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا کہ اُف! اسلام اس قدر غالب آ گیا کاش میں اس سے پہلے مٹی ہو چکا ہوتا۔ اسی مضمون کی تفصیل سورۂ نازعات میں بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس غلبہ کا آغاز کس طرح ہوگا اور انتہا کیا ہوگی۔

فرماتا ہے وَالنَّازِعَاتِ غَرْقًا ہم مسلمانوں کے اُن گروہوں کو اپنے دعویٰ کی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو تیر انداز ہونگے اور ایسے تیر انداز ہوں گے کہ اِغْرَاق کی کیفیت ان کو حاصل ہوگی یعنی جب وہ اس کام میں لگیں گے تو انہیں تن بدن کا ہوش نہ رہیگا اور وہ اس کام اور مقصد کو اس کی انتہا تک پہنچا دیں گے یہ صحابہؓ کے گروہ ہیں۔ وہ صحابہؓ جو اس سورۃ کے نزول کے وقت صرف چند آدمی تھے اور ابھی وہ ایک گروہ بھی نہیں کہلا سکتے تھے اور مظالم کا شکار تھے۔ تلوار تو الگ رہی اپنے دشمن کے سامنے ہاتھ بھی نہ اٹھا سکتے تھے۔ فرماتا ہے وہ غلبۂ اسلام کا دن جب کفار میں سے بعض کہینگے کہ کاش ہم مٹی ہوتے اس طرح آئے گا کہ ہم اسلام کو ملک میں پھیلا دیں گے۔ مختلف اقوام اس میں داخل ہو جائیں گی۔ لڑائی کی اجازت اُن کو مل جائے گی اور یہ اپنے جہاد کے فرض کو اس طرح ادا کریں گے کہ کسی نے اس طرح ادا نہ کیا ہوگا کیونکہ اِغْرَاق کے معنے ہیں کسی کام کو اس کی حد تک پہنچا دینا۔ اب دیکھو کس طرح آئندہ زمانہ نے اس پیشگوئی کو پورا کیا۔ اسلام مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچا اور ایک قوم سے دو قوم بن گیا۔ آگے مدینہ میں دو قومیں بستی تھیں اوس اور خزرج۔ اور وہ بھی ایک نہ تھے دونوں میں شدید رقابت تھی اس طرح وہ دو سے تین قوم بن گیا اور جمع کے صیغہ کا ان پر اطلاق جائز ہو گیا۔ چنانچہ جس دن سے مسلمانوں کو جنگ میں آنے کی اجازت ملی اُسی دن سے وہ تین گروہ تھے اور وہ نَازِعَات اور نَاشِطَات کہلانے کے مستحق تھے۔ جب یہ تین گروہ اسلام کے

جھنڈے کے نیچے آگئے تو وہ وقت آگیا جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج ع ۶) یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جا رہی تھی لڑائی کی اجازت دی گئی ہے اور اس لئے دی گئی ہے کہ اُن پر ظلم کیا گیا تھا اور اس لئے اجازت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے اگر اس جنگ کے نتیجہ میں انہوں نے فنا ہو جانا ہوتا تو وہ ان کو کبھی جنگ کی اجازت نہ دیتا اس کی اجازت دینا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا ان کی مدد کا ذمہ دار ہو گیا ہے۔ وہ لوگ ایسے ہیں جو اپنے گھروں سے نکالے گئے بغیر اس کے کہ کوئی وجہ ہوتی۔ صرف اس بناء پر کہ انہوں نے کہا اللہ ہمارا رب ہے اور اگر اللہ تعالیٰ بعض قوموں سے بعض کا شر دور نہ کرے تو یہودیوں اور عیسائیوں اور مسلمانوں سب کی عبادت گاہیں تباہ ہو جائیں جن میں خدا تعالیٰ کا بڑی کثرت سے ذکر ہوتا ہے۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اس کے دین کی تائید کے لئے کھڑا ہو گا اور اللہ بڑا قوی اور غالب ہے۔ وہ لوگ جن کو اب بادشاہت ملنے والی ہے ایسے ہیں کہ جب ہم ان کے ہاتھ میں نظامِ حکومت دیں گے تو وہ نمازوں کو قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیک باتوں کا حکم دیں گے اور بُری باتوں سے روکیں گے اور دنیا میں اپنی نہیں خدا کی بادشاہت قائم کریں گے۔ چنانچہ بدر کے موقع پر یہ بات پوری ہوئی۔ صحابہؓ کو لڑائی کی اجازت ملی اور وہ اپنے سے تین گُنے سے بھی زیادہ دشمن کے مقابل پر جا کھڑے ہوئے اور یہ جنگ زیادہ تر تیروں کی جنگ تھی اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال ع ۲) گو اس میں مُٹھی بھر کنکروں کی طرف بھی اشارہ ہے مگر اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس مٹھی کے پھینکنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے پیچھے کی طرف سے ہوا چلا دی (زرقانی ) اور نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمانوں کے تیر نشانہ پر اور زور سے لگتے اور کفار کے ہوا کے دباؤ سے یا تو رستہ میں رہ جاتے یا بے اثر ہو جاتے۔

اُن کے غَرْقًا ہونے کا ثبوت کہ بس ایک ہی مقصد اُن کے سامنے تھا کچھ ہو۔ کتنا عرصہ لگے وہ جنگ کرتے ہی چلے جائیں گے۔ پیچھے نہ ہٹیں گے کفار کے ایک سردار عمیر بن وہب کے واقعہ سے ملتا ہے۔ اُسے مکہ والوں نے جنگ بدر کے موقعہ پر مسلمانوں کا اندازہ لگانے کے لئے بھجوایا اُس نے واپس آکر کہا کہ مسلمان تین سو یا اس کے لگ بھگ ہوں گے اور یہ اندازہ صحیح تھا مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ تھی۔ مگر اس کے بعد اُس نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم گو وہ تھوڑے ہیں مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ اُن سے جنگ نہ کرو کیونکہ میں نے اونٹنیوں پر آدمی نہیں بلکہ موتیں سوار دیکھی ہیں (ابن ہشام) یعنی اُن میں سے ہر شخص کے چہرہ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لڑتے لڑتے مر جانے کے لئے آیا ہے اس لئے نہیں آیا کہ یہاں سے زندہ واپس جائے۔ پہلے تو کفارِ مکہ اُس کی بات سے متاثر ہوئے مگر ابوجہل کی ایک تدبیر سے لڑائی شروع ہو گئی۔

دوسری شہادت اس کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ سے ملتی ہے۔ بدر کی جنگ کے کچھ عرصہ بعد جب اُنکے لڑکے عبدالرحمٰن بھی مسلمان ہو کر مدینہ آگئے تو ایک دفعہ کسی مجلس میں باپ بیٹا دونوں آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ پُرانی باتوں کا تذکرہ جاری تھا کہ باتوں باتوں میں جنگ بدر کا ذکر آگیا عبدالرحمٰن نے کہا ابّا جان کئی دفعہ آپ لڑتے لڑتے ایسی جگہ پر پہنچے جہاں آپ میری زد میں ہوتے تھے۔ لیکن ہر دفعہ میں نے حملہ سے گریز کیا اور میں نے کہا کہ میں اپنے باپ کو تو نہیں مار سکتا۔ تب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ بیٹا میری نظر تم پر نہ پڑی

۲۰۰ زنفہ جنگ کی ابتدا کرنے میں مسلمانوں کی حیرت انگیز قربانیاں

ورنہ اگر میری نظر پڑ جاتی تو میں نے کوئی لحاظ نہیں کرنا تھا کہ یہ میرا بیٹا ہے بلکہ میں نے اسی وقت تم کو قتل کر دینا تھا (روض الانف جلد دوم شرح ابن ہشام) حالانکہ عام طور پر بیٹوں کو اپنے باپ سے جو محبت ہوتی ہے اس سے بہت زیادہ باپ کو اپنے بیٹوں سے محبت ہوتی ہے۔ مگر یہ اسلام ہی کی روح تھی جس نے ہر باپ اور ہر بیٹے۔ ہر خاوند اور ہر بیوی کو اس بات پر آمادہ کر دیا تھا کہ سچائی کے راستہ میں کوئی چیز بھی روک ہو ہم نے اس کی پروا نہیں کرنی۔ غرض مومنین و کفار کی شہادتوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ صحابہ رضی کی جماعتیں وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کی مصداق تھیں۔ پہلے وہ صلح سے رہے اور صبر دکھایا تو حد تک دکھایا اور جب نَازِعَات بنے اور تیر کمان ہاتھ میں پکڑ لئے تو غَرْقًا ہونے کا ایسا ثبوت دیا کہ جب تک تن سے جان نہیں نکل گئی کمان کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اَصْحٰبِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

چنانچہ اس اخلاص کا نتیجہ یہ نکلا کہ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا کا نظارہ کفار نے اسی دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ابوجہل

۲۰۱ کفار کو اسی دنیا میں یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا کا نظارہ

جو مکہ کے تمام گھرانوں کا سردار اور کفار کی فوج کا کمانڈر تھا جب بدر کی جنگ کے موقعہ پر وہ فوج کی ترتیب کر رہا تھا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جیسا تجربہ کار جرنیل کہتا ہے کہ میں نے اپنے دائیں بائیں دو انصاری لڑکوں کو دیکھا جو پندرہ پندرہ سال کی عمر کے تھے میں نے ان کو دیکھ کر کہا آج دل کی حسرتیں نکالنے کا موقعہ نہیں بدقسمتی سے میرے ارد گرد ناتجربہ کار بچے اور وہ بھی انصاری بچے کھڑے ہیں جن کو جنگ سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔ میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ دائیں طرف سے میرے پہلو میں کہنی لگی میں نے سمجھا کہ دائیں طرف کا بچہ کچھ کہنا چاہتا ہے اور میں نے اس کی طرف اپنا مُنہ موڑا اس نے کہا چچا ذرا جھک کر بات سنو میں آپ کے کان میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں تاکہ میرا ساتھی اس بات کو نہ سُن لے۔ وہ کہتے ہیں جب میں نے اپنا کان اس کی طرف جھکایا تو اس نے کہا چچا وہ ابوجہل کونسا ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس قدر دکھ دیا کرتا تھا۔ چچا میرا دل چاہتا ہے کہ میں اُس کو ماروں۔ وہ کہتے ہیں ابھی اُس کی یہ بات ختم نہ ہوئی تھی کہ میرے بائیں پہلو میں کہنی لگی اور میں اپنے بائیں طرف کے بچہ کی طرف جھک گیا اور اس بائیں طرف والے بچے نے بھی یہی کہا کہ چچا وہ ابوجہل کونسا ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اتنا دکھ دیا کرتا تھا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں آج اس کو ماروں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں باوجود تجربہ کار سپاہی ہونے کے میرے دل میں یہ خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ ابوجہل جو فوج کا کمانڈر تھا جو تجربہ کار سپاہیوں کے حلقہ میں کھڑا تھا اس کو میں مار سکتا ہوں۔ میں نے انگلی اٹھائی اور ایک ہی وقت میں اُن دونوں لڑکوں کو بتایا کہ وہ سامنے جو شخص خَود پہنے زرہ میں چھپا ہُوا کھڑا ہے جس کے سامنے مضبوط اور بہادر جرنیل ننگی تلواریں اپنے ہاتھوں میں لئے کھڑے ہیں وُہ ابوجہل ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ میں اُن کو بتاؤں کہ تمہارے جیسے ناتجربہ کار بچوں کے اختیار سے یہ بات باہر ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں میری وہ انگلی جو اشارہ کر رہی تھی ابھی نیچے نہیں جھکی تھی کہ جیسے باز چڑیا پر حملہ کرتا ہے اسی طرح وہ دونوں انصاری بچے کفار کی صفوں کو چیرتے ہوئے ابوجہل کی طرف دوڑنا شروع ہوئے۔ ابوجہل کے آگے عکرمہ اس کا بیٹا کھڑا تھا جو بڑا بہادر اور تجربہ کار جرنیل تھا مگر یہ انصاری بچے اس تیزی سے گئے کہ کسی کو وہم و گمان بھی نہ ہوسکا تھا کہ کس مقصد کے لئے یہ آگے بڑھے ہیں اور دیکھتے دیکھتے ابوجہل پر حملہ کرنے کے لئے کفار کی صفوں کو چیرتے ہوئے عین پہرہ داروں تک جا پہنچے۔ ننگی تلواریں اپنے ہاتھ میں لئے جو پہرے دار کھڑے تھے وہ وقت پر اپنی تلواریں بھی نیچے نہ لا سکے صرف ایک پہرے دار کی تلوار نیچے جھک سکی اور ایک انصاری لڑکے کا بازو کٹ گیا مگر جن کو جان دینا آسان معلوم ہوتا تھا ان کے لئے بازو کا کٹنا کیا روک بن سکتا تھا۔ جس طرح پہاڑ پر سے پتھر گرتا ہے اسی طرح وہ دونوں لڑکے پہرہ داروں پر دباؤ ڈالتے ہوئے ابوجہل پر جا گرے اور جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی کفار کے کمانڈر کو جا گرایا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں جنگ کے آخری وقت میں وہاں پہنچا جہاں ابوجہل جان کندنی کی حالت میں پڑا ہُوا تھا میں نے کہا سناؤ کیا حال ہے اُس نے کہا مرد ہاتھوں پر حسرت سے

مر رہا ہوں۔ کیونکہ مرنا تو کوئی بڑی بات نہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ دل کی حسرت نکالنے سے پہلے انصار کے دو چھوکروں نے مجھے مار گرایا۔ مکہ کے لوگ انصار کو بہت حقیر سمجھا کرتے تھے اسی لئے اُس نے افسوس کے ساتھ اس کا ذکر کیا اور کہا یہی حسرت ہے جو اپنے دل میں لئے مر رہا ہوں کہ انصار کے دو چھوکروں نے مجھے مار ڈالا۔ پھر وہ ان سے کہنے لگا میں اس قدر شدید تکلیف میں ہوں کہ تم مجھ پر احسان کرو گے اگر تلوار کے ایک وار سے میرا خاتمہ کر دو مگر دیکھنا میری گردن ذرا لمبی کاٹنا کہ جرنیل کی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس کی گردن لمبی کاٹی جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کی یہ بات تو مان لی کہ مجھے قتل کر دو اور اس دُکھ سے بچاؤ مگر انہوں نے ٹھوڑی کے پاس سے اس کی گردن کو کاٹا۔ گویا مرتے وقت اس کی یہ حسرت بھی پوری نہ ہوئی کہ اس کی گردن لمبی کاٹی جائے (سیرت نبویہ) دیکھو کس واضح طور پر یہ پیشگوئی پوری ہوئی کہ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا۔ اس کو ہم معہود ذہنی کے طور پر بھی لے سکتے ہیں اور کمال کے معنوں میں بھی لے سکتے ہیں اس صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا میں الکافر سے مراد کفر کا مجسمہ یا کافروں کا سردار ابوجہل تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ اُس دن یہ کافر کہے گا اے کاش میں اس سے پہلے مٹی ہو چکا ہوتا چنانچہ واقعات پر غور کرو اور سوچو کیا ابوجہل نے اس دن نہیں کہا کہ اے کاش میں اس سے پہلے مٹی ہو چکا ہوتا اُس نے اپنی ذلت کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس طرح وہ پیشگوئی بڑی شان کے ساتھ پوری ہو گئی جو سورۃ نبأ میں بیان کی گئی تھی۔

اس کے بعد کی آیت ہے وَالنَّاشِطَاتِ نَشْطًا۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس جنگ کا نتیجہ یہ نہ ہوگا کہ مسلمان مارے جائیں۔ پہلی آیت نے شکست کا سوال حل کر دیا تھا اور بتا دیا تھا کہ اُن کے سامنے شکست و فتح کا کوئی سوال نہیں ہوگا اُن کے سامنے سوال صرف یہ ہوگا کہ اسلام پر پروانہ وار فدا ہو جائیں۔ اب اس آیت میں دوسرے سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ کیا اس طرح اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کے نتیجہ میں وہ تباہ ہو جائیں گے فرماتا ہے نہیں ایسا نہ ہوگا اس جنگ کے نتیجہ میں مسلمان مارے نہیں جائیں گے بلکہ جیتیں گے اور رسیوں سے اپنے دشمنوں کو باندھیں گے اور قید کریں گے چنانچہ بدر کی جنگ میں بہت سے قیدی ہاتھ آئے اور اور رسیوں سے ہی باندھے گئے۔

اَلسَّابِحَاتِ سَبْحًا
مسلمانوں کے دور دور جاکر جنگیں کرنے کی پیشگوئی

وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ وہ فنونِ جنگ کے بڑے ماہر اور تیراک ہو جائیں گے۔ کیونکہ جو شخص کسی فن میں ماہر ہو جاتا ہے اُس کے متعلق یہی کہتے ہیں کہ وہ اُس فن میں تیرتا ہے یعنی سہولت سے اپنے فرائض کو بجا لاتا ہے۔ یہ نظارہ بھی صحابہؓ نے دکھایا وہ فنونِ جنگ کے ایسے ماہر ہو گئے کہ بعد میں جب قیصر و کسریٰ کی تجربہ کار اور تنخواہ دار فوجوں سے اُن کا مقابلہ ہوا تب بھی یہ لوگ اُن پر غالب رہے۔ دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اُن کی جنگیں مدینہ سے دُور دُور چلی جائیں گی اور جس طرح تیرنے والا کنارہ سے دُور چلا جاتا ہے اسی طرح مدینہ سے شروع ہو کر دشمن کو دباتے ہوئے وہ دُور دُور تک نکل جائیں گے چنانچہ جنگ کے بعد جنگ ہوئی اور آخر اطرافِ عرب تک جنگیں جا پہنچیں

اَلسَّابِقَاتِ سَبْقًا
مسلمانوں کی پے در پے جنگیں کرنے کی پیشگوئی

پھر فرمایا فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا۔ ہم اُن گروہ مسلمین کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔ جب جنگ دُور دُور تک پھیل جاتی ہے اور ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری جنگ شروع ہو کر اُس کا سلسلہ لمبا ہوتا چلا جاتا ہے تو عام طور پر قومیں تھک جاتی ہیں مگر فرماتا ہے مسلمانوں میں ایسے آدمی موجود ہوں گے جو اپنے اندر یہ روح رکھتے ہوں گے کہ جنگ کی لمبائی اور اس کی وسعت اُن کو تھکائے گی نہیں۔ اُن کے حوصلے بڑھتے جائیں گے اور ان کے ایمان زیادہ ہی ہوتے جائیں گے یہاں تک کہ وہ جان دینے کو ایک کھیل سمجھنے لگیں گے اور ایک دوسرے سے اس میدان میں بڑھنے کی کوشش کریں گے جس طرح فٹ بال اور کرکٹ کی ٹیموں میں کھلاڑی ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح وہ جان دینے میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کریں گے اور آخر فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا کا زمانہ آجائے گا اور زمامِ حکومت

اَلنَّاشِطَاتِ نَشْطًا
میں مسلمانوں کے کفار پر غالب آنے کی پیشگوئی

اُن کے ہاتھ میں آجائے گی اور جن قوموں میں اوپر والے اخلاق پیدا ہو جائیں حکومت اُنہی کے ہاتھ میں آیا کرتی ہے حکومت کو اُن کے ہاتھ میں آنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ دشمن کے مقابلہ میں اِغْرَاق کی کیفیت کا پیدا ہو جانا اور اس قدر اپنے اندر انہماک پیدا کر لینا کہ اُس فن میں ایک سہولت اور لذت محسوس ہونے لگے اور پھر قومی قربانی کے مقابلہ میں آپس میں مسابقت کی روح کا پیدا ہو جانا یہ قوم کو غالب بنا دیا کرتا ہے۔ اور یہی پیشگوئی مسلمانوں کے متعلق ان آیات میں کی گئی ہے چنانچہ ایسا ہی نظارہ صحابہؓ نے بعد میں دکھایا۔

سورۃ نازعات کی پہلی آیات کے تیسرے معنے[1]

تیسرا سلسلۂ مضامین ایک اور بھی اس سے نکلتا ہے اور وہ روحانی قابلیت کا ہے نَزَعَ يَنْزِعُ نُزُوْعًا عَنْ كَذَا کے معنے ہوتے ہیں كَفَّ عَنْهُ اس سے رُک گیا اور نَشَطَ الدَّلْوَ مِنَ الْبِئْرِ کے معنے ہیں نَزَعَهَا وَانْتَشَلَهَا بِلَا بَكَرَةٍ یعنی بغیر چرخی کے ہاتھ سے پانی نکالا جو مشقت کا کام ہوتا ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے قرآن کریم نے غلبۂ اسلام اور قیامت دونوں کو ملا کر بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ تم اسلام کے غلبہ اور قیامت دونوں کے منکر ہو مگر یہ دونوں باتیں ہو کر رہیں گی اور ان میں سے ایک چیز دوسری کا ثبوت ہوگی یہی مضمون سورۂ نباء میں تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے کفار کے ایک اعتراض کے پہلو کو لیا ہے۔ انسانی فطرت میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ مان لیا خدا ایسا کر دے گا اگر دنیا میں خدا جو کچھ کرتا ہے اس کے کچھ آثار اور شواہد بھی پہلے سے ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں خدا تعالیٰ بچہ پیدا کرتا ہے اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا مگر اس کے لئے خدا تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں میں بچہ کی قابلیت رکھی ہے جب ایک مرد اور عورت کا آپس میں نکاح ہو جاتا ہے تو ہمیں نظر آجاتا ہے کہ اب دونوں میں ہیجان پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ پھر میاں بیوی اکٹھے رہتے ہیں تو ہمیں اور زیادہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اب بچہ پیدا ہونے کے آثار شروع ہو گئے ہیں چند دنوں کے بعد اُن آثار کا ظاہر میں بھی علم ہو جاتا ہے اور ہر شخص کہنے لگ جاتا ہے کہ اب اُن کے ہاں بچہ پیدا ہو جائے گا۔ گو بچہ پیدا ہونے میں ابھی دیر ہوتی ہے مگر بہرحال انسان سمجھ لیتا ہے کہ چند ماہ کے بعد بچہ ضرور پیدا ہو جائے گا کیونکہ آثار نظر آنے لگ گئے ہیں۔ یا ایک لڑکا علم حاصل کرنے کے لئے کالج میں جاتا ہے تو ہم جانتے ہیں یہ ایک دن پڑھ جائے گا یا اگر کوئی شخص کہے فلاں آدمی نے محل بنانا ہے اور ہمیں یہ بھی نظر آتا ہو کہ اُس کے پاس مال ہے دولت ہے طاقت ہے تو گو ہمیں ظاہر میں محل کے آثار نظر نہ آتے ہوں مگر ہم سمجھ لیتے ہیں کہ چونکہ محل کے سامان موجود ہیں۔ ارادہ موجود ہے۔ بنانے والے موجود ہیں۔ اس لئے ایک دن محل بھی بن جائے گا۔ تو دنیا میں کسی چیز کے متعلق لوگوں کو اُس وقت تک یقین نہیں آتا جب تک اس کے کچھ نہ کچھ آثار وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھنے لگ جائیں۔ اسی اصول کے مطابق کفار مسلمانوں پر اعتراض کرتے تھے کہ تم کہتے ہو قیامت آئے گی اور جب تم سے پوچھا جاتا ہے کہ قیامت کا ثبوت کیا ہے تو تم کہتے ہو اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسلام غالب آجائے گا اور کفر مٹ جائے گا اور اسلام کا غلبہ اس بات کی دلیل ہو گا کہ جو دوسری بات بتائی گئی ہے وہ بھی ایک دن پوری ہو جائے گی مگر یہ غلبۂ اسلام جسے قیامت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے خود ابھی ثبوت کا محتاج ہے اور ہمیں اُس کے کوئی آثار ظاہر میں نظر نہیں آتے۔ آٹھ دس آدمی ہیں جو ابھی ایمان لائے ہیں مگر اُن میں دنیا پر غالب آنے کی کوئی روح نظر نہیں آتی۔ انسان دنیا پر غالب آتا ہے اپنے علم کے زور سے مگر ان میں کونسا عالم ہے۔ ان کی مراد عالم روحانی سے نہیں تھی بلکہ کہانت وغیرہ کی طرف ان کا اشارہ تھا کہ اس قسم کے علوم کا انہیں کچھ پتہ نہیں۔ اسی طرح دنیا پر صنعت کے ذریعہ سے غلبہ حاصل ہوتا ہے مگر ان میں کوئی ایسے صناع بھی نہیں ہیں جن کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ دنیا کو یہ لوگ مغلوب کر لیں گے۔ اتنے بڑے جرنیل بھی نہیں ہیں کہ ان کے متعلق خیال کیا جا سکے کہ یہ دنیا کو فتح کر لیں گے۔ اتنا بڑا رعب اور دبدبہ رکھنے والے بھی یہ لوگ نہیں ہیں کہ دنیا مرعوب ہو کر ان کے پیچھے چل پڑے گی۔ چند غریب آدمی ہیں جو ایمان لائے ہیں اور اُن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ساری دنیا پر غالب آجائیں گے حالانکہ

۲۷۱ اس سوال کا جواب کہ کمزور مسلمان کیونکر دنیا پر غالب آئیں گے

نہ اُن میں کوئی قابلیت پائی جاتی ہے نہ اُن کے اندر ذاتی جوہر ایسے نظر آتے ہیں کہ گو آج یہ قابل نہیں ہیں مگر کچھ عرصہ کے بعد اپنی قابلیت کا سکہ بٹھالیں گے۔ صرف نماز پڑھ لینا یا کلمہ پڑھ لینا اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ یہ دنیا کو بھی مغلوب کرلیں گے۔ دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے مخصوص قابلیتوں کا پایا جانا ضروری ہے اور وہ قابلیتیں ہمیں ان میں دکھائی نہیں دیتیں بلکہ اُن قابلیتوں کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔ گویا نہ بالفعل انہیں یہ کمالات حاصل ہیں اور نہ بالقوۃ انہیں یہ کمالات حاصل ہیں۔ اگر ایک کارخانہ قائم ہورہا ہو تو اس کے متعلق امید کی جاسکتی ہے کہ اگر آج نہیں تو کل اس کارخانہ کے ذریعہ لاکھوں روپے آجائیں گے مگر یہ تو وہ لوگ ہیں کہ نہ بالفعل انہیں کوئی کمال حاصل ہے اور نہ بالقوۃ انہیں کوئی کمال حاصل ہے اور جب حالت یہ ہے تو اس قسم کے لوگوں کے ذریعہ کسی آئندہ زمانہ میں ظاہر ہونے والے ایک موہوم غلبہ کو قیامت کے وجود کی دلیل کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے ؟

یہ اعتراض ہے جو سورۃ نبا کے مضامین پر پیدا ہوتا تھا اور سورۃ نازعات میں اسی کا جواب دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا۔ آج مومن تم کو ذلیل نظر آتے ہیں اُن میں کوئی لیاقت نہیں۔ یہ اپنی قوم کے سب سے کم تعلیمیافتہ سب سے کم تجربہ کار۔ اور سب سے کم فنون کے جاننے والے ہیں ہر پیشہ اور علم میں پیچھے ہیں۔ تم ان کو ذلیل سمجھتے ہو۔ ناکارہ خیال کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ کہاں جہانداری اور سیادت کے قابل ہوسکتے ہیں لیکن یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر وہ قابلیتیں پیدا کردی ہیں اور پیدا کردے گا جن سے انسانوں کو سیادت اور کامیابی حاصل ہوا کرتی ہے اور یہ اپنے عمل سے وہ سب باتیں دکھادیں گے۔ چنانچہ فرماتا ہے یہ تم کو بے کار وجود نظر آتے ہیں لیکن ہم شہادت کے طور پر پانچ صفات پیش کرتے ہیں جن کے متعلق تم دیکھو گے کہ وہ آہستہ آہستہ مسلمانوں میں پیدا ہوتی چلی جائیں گی اور جس قوم میں یہ پانچ صفات پیدا ہوجائیں وہ کبھی ہار نہیں سکتی۔ تمہارا بڑا اعتراض یہی ہے کہ یہ لوگ علم میں دولت میں، قوت میں، لڑائی کے فنون اور تجربہ وغیرہ میں بہت پیچھے ہیں بلکہ یہ چیزیں ان کو حاصل ہی نہیں حالانکہ علم اور دولت اور قوت اور فنون وغیرہ آسمان سے گرا نہیں کرتے اور نہ یہ چیزیں ایسی ہیں جو دنیا پر یقینی طور پر غلبہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ سب میں سے اعلیٰ اور فائق بننے کے لئے مندرجہ ذیل قابلیتوں کا ہونا ضروری ہے اور اگر تم غور کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ان کے مسلمان ہوتے ہی یہ قابلیتیں پیدا ہوچکی ہیں اور اب روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہیں اور اسی میں ان کی کامیابی کا راز ہے چنانچہ فرماتا ہے وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا۔ نَزَعَ کے دو معنے ہوسکتے ہیں۔ اوّل كَفَّ عَنْهُ اُس سے رُک گیا اور دوسرے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ وہ کسی چیز کا مشتاق ہوا۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے نَزَعَ نِزَاعًا اِلَى الشَّيْءِ ذَهَبَ اِلَيْهِ یعنی نَزَعَ اِلَى الشَّيْءِ کے معنے ہوتے ہیں اُس چیز کی خواہش دل میں پیدا ہوئی اور جب نَزَعَ اِلٰى اَهْلِهٖ کہیں تو اس کے معنے ہوں گے اِشْتَاقَ اس کے دل میں اپنے اہل سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا یا اس کے دل میں اپنے اہل کی طرف رغبت پیدا ہوئی (اقرب) ان دو معنوں کو ملحوظ کرتے ہوئے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترقی کے لئے مندرجہ ذیل قابلیتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

اوّل ترقی کرنے والی قوم کے اندر مادۂ صبر کا پایا جانا ضروری ہے یعنی اُس میں یہ قابلیت ہونی چاہیئے کہ اُسے جس بات سے بھی روکا جائے رُک جائے تاکہ جب بھی بدیوں کے مواقع آئیں خرابیوں اور تباہیوں کے اوقات آئیں وہ اپنے نفس کو روک لے اور اُن بدیوں میں ملوّث ہونے سے اپنے آپ کو بچالے یہی وہ خوبی ہوتی ہے جس کو پیدا کرنے کی وجہ سے ایک قوم جیت جاتی ہے اور دوسری قوم اس سے محروم ہونے کی وجہ سے شکست کھا جاتی ہے۔ ورنہ جہاں تک آنکھ، کان، دل اور دماغ وغیرہ کا سوال ہے وہ سب میں یکساں ہوتے ہیں فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنے آپ کو موقعہ پڑنے پر بُری باتوں سے روک نہیں سکتے اور بعض روک لیتے ہیں۔ روکنے والے جیت جاتے ہیں اور دوسرے لوگ ہار جاتے ہیں۔

دوسری چیز جس کا ترقی کرنے والی قوم کے اندر پایا جانا

نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی اچھی چیز اس کے سامنے آئے اُس کے دل میں یہ شدید شوق پیدا ہو جائے کہ کسی طرح میں اس چیز کو حاصل کر لوں گویا صفتِ صبر اور صفتِ اشتیاق شدید یا رغبتِ شدید یہ دو خوبیاں جس قوم کے اندر پائی جائیں وہ یقیناً دنیا پر غالب آجاتی ہے۔ اور یہی دو چیزیں ہیں جن پر ترقیات کا مدار ہے۔ ایک بڑا ڈاکٹر، ایک بڑا انجنیئر یا ایک بڑا سیاستدان کیوں مشہور ہوتا ہے؟ اسی لئے کہ اس ڈاکٹر کو اپنے ڈاکٹری کے فن میں اشتیاق ہوتا ہے۔ اس انجنیئر کو اپنے انجنیئرنگ کے کام کیطرف رغبت ہوتی ہے اور وہ سیاستدان اپنے ملک کی سیاسی ترقی کی تدابیر میں منہمک رہتا ہے۔ گاندھی جی کو ہی دیکھ لو وہ کس طرح دن رات ملکی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ اُن میں اور دوسرے لوگوں میں کیا فرق ہے یہی کہ گاندھی جی اس کام میں تن من سے لگ گئے اور دوسروں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی - ورنہ جہاں تک آنکھ، کان، ناک اور مُنہ وغیرہ کا سوال ہے جس طرح دوسروں کی آنکھیں ہیں اسی طرح گاندھی جی کی آنکھیں ہیں جس طرح دوسروں کے کان ناک اور مُنہ ہیں اسی طرح اُن کے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ اور لوگ تو جوئے بازی کرتے رہے یا سینما اور میوزک وغیرہ میں مشغول رہے اور وہ اس کام میں لگے رہے اگر وہ بھی اسی کام میں لگ جاتے تو آج وہ بھی بڑے بڑے کام کرنیوالے سمجھے جاتے۔ یا ایک ڈاکٹر سے مریض کیوں اچھے ہوتے ہیں اور دوسرے سے کیوں اچھے نہیں ہوتے؟ اسی لئے کہ ایک شخص نے ڈاکٹری کے مطالعہ میں اور معالجہ میں انہماک پیدا کر لیا اور اس فن کے متعلق اُس نے رغبت اور اشتیاق کا اظہار کیا اور دوسرے نے رغبت سے کام نہ لیا۔ تو ترقی کرنے کے لئے دو قابلیتوں کا پایا جانا نہایت ضروری ہوتا ہے اوّل یہ کہ جب کسی بُری بات سے اُسے روکا جائے تو وہ رُک جائے دوسرے یہ کہ جس قدر مفید اور کارآمد چیزیں ہوں اُن کے حصول کی اُس کے دل میں شدید رغبت پائی جاتی ہو۔ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کہکر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی انہی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جتنی چیزیں انسانی ترقی میں حائل ہو سکتی ہیں اُن سب سے یہ لوگ بچتے ہیں۔ تم میں اور ان میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ تم بعض چیزوں کے متعلق سمجھتے ہو کہ وہ بُری ہیں مگر پھر بھی اُن سے بچتے نہیں لیکن مسلمانوں کو جس چیز کے متعلق یہ علم ہو جائے کہ وہ بُری ہے اُس کے قریب بھی وہ نہیں پھٹکتے۔ اس ایک بات سے ہی اندازہ لگا لو کہ ترقی کون کر سکتا ہے تم ترقی کر سکتے ہو یا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں۔ تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تم مانتے ہو شراب بُری چیز ہے۔ تم مانتے ہو جوا بُری چیز ہے مگر پھر نہ تم شراب سے بچتے ہو نہ جوئے سے رُکتے ہو مگر مسلمان چونکہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ بُری چیزیں ہیں اس لئے نہ وہ شراب کے قریب جاتے ہیں نہ وہ جوئے کے قریب جاتے ہیں۔ یہ علامت ہے اِس بات کی کہ مسلمانوں کے اندر بڑھنے اور ترقی کرنے کا مادہ پایا جاتا ہے۔ مگر تمہارے اندر وہ مادہ نہیں پایا جاتا۔ تم بھی کہتے ہو کہ سچ بڑی اچھی چیز ہے اور مسلمان بھی کہتے ہیں کہ سچ بڑی اچھی چیز ہے مگر تم سب جھوٹ بولتے ہو اور مسلمان سب سچ بولتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ انسان کو وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے مگر باوجود یہ تسلیم کرنے کے کہ وقت ضائع کرنا بُری بات ہے تم اپنے وقت کو ضائع کر دیتے ہو۔ تم مانتے ہو کہ دوسروں پر ظلم نہیں کرنا چاہیئے مگر پھر تمہاری یہ حالت ہے کہ تم دن رات ظلم سے کام لیتے رہتے ہو۔ تم مانتے ہو کہ امانت بڑی اچھی چیز ہے مگر تمہاری عملی حالت یہ ہے کہ جب تمہارے پاس کوئی شخص امانتاً روپیہ رکھواتا ہے تو تم کھا جاتے ہو۔ اب بتاؤ جب تم اپنے نفوس کو بُری باتوں سے نہیں روک سکتے اور مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ ہر بُری بات سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں تو تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ مسلمانوں میں ترقی کرنے کی قابلیت نہیں ہے۔

نَزَعَ کے دوسرے معنے رغبت کے ہیں چنانچہ نَزَعَ اِلَی الشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں اِشْتَھَاہُ اس چیز کی خواہش کی اور نَزَعَ اِلٰی اَھْلِہٖ کے معنے ہوتے ہیں اِشْتَاقَ اُسے اپنے اہل سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ گویا اس میں صرف رغبت کے معنی ہی نہیں پائے جاتے بلکہ اس رغبت کے معنے پائے جاتے ہیں جو انسان کو اپنے اہل کے متعلق ہوتی ہے اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ اہل کیطرف رغبت عام رغبت سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایک واقف سے ملنے کی خواہش اور قسم کی ہو گی لیکن ایک بچہ جب اپنی ماں سے ملتا ہے یا

ماں اپنے بچہ سے ملتی ہے تو وہ خواہش اور وہ رغبت بہت زیادہ ہوتی ہے تو وَالنّٰزِعٰتِ کہہ کر اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ گو تم میں سے بھی بعض کو نیکی کے حصول کا معمولی اشتیاق ہے لیکن مسلمان ایسے ہیں کہ جب انہیں نیک باتوں کا علم ہوتا ہے تو وہ ان کی طرف اس رغبت اور شوق سے دوڑتے ہیں جس رغبت اور شوق سے ایک بچہ اپنی ماں کی طرف جاتا ہے گویا دونوں قسم کے کمالات اُن میں نظر آتے ہیں۔ غرض پہلا قدم قومی ترقی کے لئے یہ ہوتا ہے کہ قوم اُن اعمال سے بچتی ہے جو ترقی میں روک ہوتے ہیں مثلاً سستی ہے، جہالت ہے، غفلت ہے، ضد ہے، نافرمانی ہے، ظلم ہے، لڑائی جھگڑا ہے، بدسلوکی ہے، تلخی ہے، جھوٹ ہے، فریب ہے، خیانت ہے، فسق و فجور ہے یا اسی طرح کی اور خرابیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ لوگ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ہیں کہ اپنے نفوس کو ایسی تمام باتوں سے روکتے ہیں جن سے رُکنا چاہیئے اور ان میں یہ مادہ پایا جاتا ہے کہ جب انہیں کہا جاتا ہے فلاں بات بُری ہے اس سے بچو تو یہ فوراً اُس سے رُک جاتے ہیں اور اس حد تک اپنے نفوس کو روکتے ہیں کہ غَرْقًا ہو جاتے ہیں یعنی اپنے نفوس پر غالب آجاتے ہیں مگر تمہاری یہ حالت ہے کہ تم جانتے ہو کہ فلاں فلاں باتیں بُری ہیں مگر تم اُن سے بچتے نہیں۔ پھر یہ صرف اپنے نفوس پر ہی غالب نہیں آتے بلکہ دوسروں کی بھی اصلاح کرتے ہیں گویا ان میں خالی اپنے نفس کو روکنے کا ہی مادہ نہیں بلکہ دوسروں کی اصلاح کا مادہ بھی اُن کے اندر پایا جاتا ہے چنانچہ اِغْرَاق کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ لوگ ایک شخص پر حملہ آور ہوئے اور اُسے مغلوب کر لیا گویا جب وہ اپنے کسی ساتھی میں کوئی عیب دیکھتے ہیں تو وہ صرف اس بات پر راضی نہیں ہو جاتے کہ ہم نے اپنے آپ کو اس بدی سے روکا ہوا ہے بلکہ وہ سارے اکٹھے ہو کر اس پر حملہ آور ہو جاتے اور پھر اُسے مغلوب کر لیتے ہیں یعنی یا تو وہ اُس کا عیب دُور کر دیتے ہیں اور اُسے نیک بنا لیتے ہیں اور یا پھر وہ اُس کو اپنی قوم میں سے باہر نکال دیتے ہیں۔ بدی کا وجود وہ اپنے اندر برداشت نہیں کر سکتے گر یہ اوپر کا درجہ ہے۔ پہلا درجہ یہی ہے کہ جتنی چیزیں انسان کی ترقی میں روک بننے والی ہیں وہ اُن سب سے بچتے ہیں اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ بدی کو اپنی قوم میں دیکھ ہی نہیں سکتے۔ جہاں بدی ان کو نظر آتی ہے فوراً اس پر حملہ کر دیتے ہیں اور بدی کرنے والے کو مغلوب کر لیتے ہیں یعنی یا تو اُسے باہر نکال دیں گے یا اسے جیت لیں گے اور اس کی اصلاح کر لیں گے۔ بہرحال وہ اُس شکل میں اس کو نہیں رہنے دیں گے جس شکل میں وہ پہلے دکھائی دیتا تھا۔ یہ دو قابلیتیں ہیں جو قوم کو ترقی کی طرف لے جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ دونوں قابلیتیں مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں پس وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے یہ معنے ہوئے کہ وہ رُوحیں جو رکنے والی ہیں بُری باتوں سے اور بد رُوحیں جو اُن میں آجائیں اُن کو دبا لینے والی ہیں۔

وَالنّٰزِعٰتِ کے دوسرے معنے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اشتیاق کے ہوتے ہیں اس لحاظ سے وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے یہ معنے ہونگے کہ وہ نیکیوں کی طرف اس طرح رغبت کرتے ہیں جیسے انسان اپنے اہل و عیال کی طرف رغبت کرتا ہے گویا وہ صرف بدیوں سے ہی نہیں رُکتے بلکہ اُن کے اندر امانت اور انصاف اور رحم اور خوش خلقی اور محنت اور علم اور غربا پروری اور اقرار احسان اور جراءت اور سخاوت اور ہمسایہ کی خبر گیری، مسافروں کا خیال، یتیموں کا خیال اور بیواؤں کا خیال، صفائی کا خیال، عفت اور ایسی ہی سب نیکیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ نہ صرف ان کے حصول کی کوشش کرتے ہیں بلکہ بعض کو یہ نیکیاں ایسی پیاری لگتی ہیں جیسے بچہ کو اپنی ماں سے یا ماں کو اپنے بچہ سے پیار ہوتا ہے۔

وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا پھر فرماتا ہے ان نیکیوں کے حصول میں عاداتِ قومی کی وجہ سے انہیں محنت تو کرنی پڑتی ہے مگر وہ محنت کر کے یہ کام کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کام میں جو صعوبتیں آئیں اُن سب کو برداشت کرتے ہیں۔ نَشَطَ کے ایک معنے ڈول کو بغیر چرخی کے نکالنے کے ہوتے ہیں گویا محنت اور مشقت کرنا اس کے مفہوم میں شامل ہے کیونکہ چرخی ہو تو پانی آسانی سے نکل آتا ہے اور اگر چرخی نہ ہو تو بہت زور لگانا پڑتا ہے پس عربی میں یہ محاورہ ہے کہ جب کسی کے متعلق اس امر کا اظہار کرنا ہو کہ اس نے بڑی محنت اور مشقت سے کام لیا تو کہتے ہیں اِنْتَشَلَهَا بِلَا بَكَرَةٍ اس نے پانی بغیر

چنخ کے نکلا۔ پس وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا میں صحابہؓ کی یہ خوبی بیان فرمائی کہ اُن کو نیکیوں میں ترقی کرنے کا اس قدر خیال ہے کہ اس راستہ میں انہیں کوئی بھی قربانی کرنی پڑے وہ اس سے دریغ نہیں کرتے بعض لوگوں کو نیکیوں سے رغبت بھی ہوتی ہے مگر جب کام کا وقت آئے تو اُن کا دل ڈر جاتا ہے اور وہ نیکی میں حصہ نہیں لے سکتے کیونکہ انہیں قربانی سے کام لینا پڑتا ہے لیکن اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر نہ صرف یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ انہیں نیکیوں کے حصول کا شوق ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ دوسری خوبی بھی اُن کے اندر پائی جاتی ہے کہ وہ نَاشِطَات ہیں یعنی ہر قسم کی محنت برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اُن کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ کوئی نیکیوں پر اُکسانے والا نہیں ہوتا۔ کوئی پیٹھ ٹھونکنے والا اور قومی خدمات پر شاباش کہنے والا نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی وہ قومی خدمت کرتے چلے جاتے ہیں اور اس سے رکتے نہیں ہیں۔

وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا۔ یہ لازمی بات ہے کہ جو شخص محنت سے کام لیتا ہے وہ آخر فن کا ماہر ہو جاتا ہے اور جب کوئی شخص فن کا ماہر ہو جائے تو اس کے لئے کام میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہی کام جو ایک پیشہ ور لوہار کرتا ہے اگر ہمیں اس کی جگہ کرنا پڑے تو ہم بڑی محنت سے آہستہ آہستہ اس کام کو کر سکیں گے اور پھر بھی وہ کام خراب ہو جائے گا۔ مجھے یاد ہے بچپن میں ایک دفعہ بڑھئی ہمارے گھر میں کام کر رہے تھے مجھے ان کا کام بڑا پسند آیا اور میں نے سمجھا کہ یہ معمولی بات ہے اس کام کو تو میں بھی کر لوں گا۔ میری عمر اُس وقت نو دس سال کی تھی جب وہ کھانا کھانے چلے گئے تو میں نے تیشہ اٹھایا اور ایک لکڑی کو چھیلنے کے لئے اُس پر مارا مگر وہ بجائے لکڑی پر پڑنے کے سیدھا میرے ہاتھ کے انگوٹھے پر لگا جس سے گہرا زخم ہو گیا اور اس کا نشان آج تک موجود ہے۔ دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ بڑھئی جو کچھ کر رہا ہے معمولی بات ہے اور اسی طرح میں بھی کر سکتا ہوں مگر جب کام کا وقت آتا ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام کتنا مشکل ہے۔ مگر بڑھئیوں کو اس کام کے کرتے وقت کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ایک لمبے عرصہ کی مشق کی وجہ سے وہ اس کام میں تیراکوں کی طرح ہو جاتے ہیں یہی خوبی اللہ تعالےٰ نے صحابہؓ کی اس آیت میں بیان فرمائی ہے۔ کہ اب تو انہیں نیکیوں کے حصول میں بڑی محنت اور مشقت سے کام لینا پڑتا ہے لیکن ایک زمانہ آئے گا جب یہ ان کاموں میں تیراکوں کی طرح ہو جائیں گے اور ایک طبعی رغبت اور نشاط ان میں پیدا ہو جائے گا اور ایک دن یہ روحانی سمندر کے تیراک ہو جائیں گے جس طرح ایک ماہر تیراک دُور دُور تک تیرتا چلا جاتا ہے اور اُسے کوئی مشکل محسوس نہیں ہوتی اسی طرح وہ نیکیوں پر ایسا غلبہ حاصل کر لیں گے کہ ایک طبعی رغبت اور نشاط ان میں پیدا ہو جائیگا اور نیکیوں کے بجا لانے میں انہیں سرور محسوس ہو گا۔ لوگوں کو جھوٹ سے بچنے کے لئے بڑی بڑی کوششیں کرنی پڑتی ہیں مگر اُن کے لئے جھوٹ چھوڑ دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ لوگوں کو صداقت پر قائم رہنا بڑا مشکل ہوتا ہے مگر اُن کے لئے صداقت سے کام لینا ایسا ہی ہے جیسے صداقت کی طرف ایک طبعی میلان اُن کے اندر پایا جاتا ہے۔ یہی حال دوسری نیکیوں کا ہے کہ اُنکے کرتے وقت انہیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے نیکیوں سے ان کی فطرت کو طبعی مناسبت پیدا ہو چکی ہے اور اب سوائے کسی اور طرف جا ہی نہیں سکتے۔ گویا ہر نیکی انہیں یوں معلوم ہوتی ہے جیسے ماں کا دودھ ہے جس طرح بچہ اُس دودھ کو آسانی سے پی لیتا ہے اور اُسے کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوتا اسی طرح کسی نیک بات پر بھی عمل کرنا اُن کے لئے بوجھ نہیں رہے گا۔ بلکہ وہ دلی شوق اور نشاطِ خاطر سے اس میں حصہ لیں گے۔

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا۔ جب اُن میں نشاط پیدا ہو جائے گا تو اس کے بعد نیکی کی طرف ان کا ایک اور قدم اٹھیگا اور اُن میں یہ شوق پیدا ہو جائے گا کہ ہم اس میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ گویا وہ صرف یہ نہیں دیکھیں گے کہ وہ اچھی طرح اور نشاطِ خاطر سے کام کر رہے ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی بھی کوشش کریں گے اور قوتِ مسابقت کو حرکت میں لائیں گے۔ سخاوت ہر ایک کو آسان معلوم ہوگی مگر اس کے بعد وہ یہ کوشش کریں گے کہ ہم

دوسروں سے زیادہ سخاوت کریں۔ عفّت ہر ایک کو آسان معلوم ہوگی مگر اس کے بعد ہر شخص کے اندر یہ جوش پیدا ہوگا کہ میں دوسروں سے زیادہ عفیف بنوں۔ خوش خلقی ہر ایک کو آسان معلوم ہوگی مگر اس کے بعد ہر شخص کے اندر یہ جذبہ موجزن ہوگا کہ میں دوسروں سے زیادہ خوش خلق بنوں۔ رحم کرنا ہر ایک کو آسان معلوم ہوگا مگر اس کے بعد ہر شخص کے دل میں یہ جوش پیدا ہوگا کہ میں دوسروں سے زیادہ رحم کا نمونہ دکھاؤں۔ گویا نیکیوں کے میدان میں اُن کا مقابلہ شروع ہو جائے گا اور ہر شخص کوشش کرے گا کہ میں دوسروں سے بڑھ جاؤں۔ جب وہ اس مقام پر پہنچیں گے تو فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا بہ زائد بات بھی اُن میں پیدا ہو جائے گی کہ ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو قوم کا ذمہ وار سمجھے گا۔ یہ نہیں دیکھے گا کہ یہ کام فلاں کا ہے اور یہ کام فلاں کا۔ بلکہ ہر شخص سمجھے گا کہ میں ہی ساری جماعت کا ذمہ وار ہوں۔ ہندوستان میں ہٹے کی مثال مشہور ہے جو ایک چھوٹا سا جانور ہوتا ہے بعض یہی بات ہدہد کے متعلق کہتے ہیں کہ رات کو وہ اُلٹا سوتا ہے ایک دفعہ اس سے کسی نے پوچھا کہ تو اُلٹا کیوں سوتا ہے تو اُس نے جواب دیا کہ رات کو ساری دنیا سو رہی ہوتی ہے اگر آسمان گر پڑے تو اُسے کون سنبھالے گا میں اس لئے اُلٹا سوتا ہوں کہ اگر آسمان گرا تو دنیا کو بچا لوں گا۔ یہ بظاہر ایک مضحکہ خیز مثال ہے لیکن انسانوں کے متعلق واقعہ یہی ہے کہ جو شخص کمال نیکی کو پہنچ جاتا ہے وہ ساری دنیا کی ذمہ واری اپنے اوپر لے لیتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ اس کی ذمہ واری فلاں پر ہے اور اس کی ذمہ واری فلاں پر۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو ہی واحد ذمہ وار سمجھتا ہے جب یہ خیال کسی قوم کے افراد میں پیدا ہو جاتے تو وہ قوم کبھی تباہ نہیں ہو سکتی۔ ایک سو جائے گا تو دوسرا اُس کو جگانے کے لئے موجود رہے گا۔ آخر تمام لوگ ایک وقت میں تو سو نہیں سکتے لازماً کچھ حصہ سوئے گا اور کچھ حصہ بیدار رہے گا اور جب کچھ حصہ بیدار رہے گا تو اس کے یہ معنے ہیں کہ قوم کو بچانے والے افراد موجود رہیں گے اور وہ تباہی سے اُسے محفوظ رکھیں گے۔ غرض جس قوم میں بھی یہ نیکیاں پیدا ہو جائیں اس قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا وہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور ساری دنیا پر غالب آجاتی ہے۔

سورۃ نازعات کی پہلی آیات کے چوتھے معنے

ان آیات کے ایک چوتھے معنے بھی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ نَزَعَ کے معنے مشابہ ہو جانے کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ نَزَعَ الْوَلَدُ اَبَاهُ اَوْ اِلٰی اُمِّہٖ کے معنے ہوتے ہیں اَشْبَہَ وہ اپنی ماں یا اپنے باپ کے مشابہ ہو گیا۔ اس لحاظ سے وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے یہ معنے ہوں گے کہ مسلمان محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کا سوال ہے مکّہ والے اُن کو ذلیل سمجھا کرتے تھے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق وہ یہ کبھی نہیں کہتے تھے کہ آپ نعوذ باللہ ذلیل ہیں بے شک ایک منافق نے ایک دفعہ آپ کو ذلیل کہہ دیا تھا مگر مکّہ والے تسلیم کرتے تھے کہ آپ کے اندر وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جو ایک کامیاب لیڈر کے اندر پائے جانے چاہئیں۔ اور وہ آپ کی قابلیت کے منکر نہیں تھے۔ بے شک وہ سمجھتے تھے کہ آپ غریب ہیں۔ آپ کے پاس مال و دولت نہیں ہے مگر جہاں تک ذاتی قابلیت کا سوال ہے وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قائل تھے آپ کو امین اور صدوق سمجھتے تھے اور اپنی قوم کے جھگڑوں میں آپ سے فیصلہ کرانے پر تیار ہو جایا کرتے تھے۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے تم آج مسلمانوں کو ذلیل سمجھتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ اُن میں کوئی قابلیت نہیں مگر تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ قابلیتیں کس طرح پیدا ہوا کرتی ہیں۔ قابلیت حاصل ہونے کا صرف ایک ہی طریق ہے کہ اچھا اُستاد مل جائے اور شاگرد اس کا کامل طور پر تتبع کرے۔ یہ واحد ذریعہ ہے اعلیٰ درجہ کی قابلیتیں اپنے اندر پیدا کرنے کا کہ کسی کو اچھا اُستاد مل جائے اور وہ اس اُستاد کی پوری پوری نقل کرے۔ پس فرماتا ہے وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا یہ مسلمان تو وہ ہیں جو اپنے باپ کے مشابہ ہیں کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم وہ ہیں جن کی قابلیت کا تم میں سے

کسی کو بھی انکار نہیں۔ تم اُسے دعویٰ سے پہلے ہی صدوق اور امین تسلیم کرتے تھے جیسا کہ نبیوں کے متعلق یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ انہیں بعثت سے قبل قوم میں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور ان کی قابلیتوں کا اعتراف کیا جاتا ہے چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن کریم میں آتا ہے کہ لوگوں نے اُن سے کہا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ (هود ع۶) کہ اے صالح ہم تو تجھ پر امید لگائے بیٹھے تھے کہ تو ایک دن ہماری قوم کا لیڈر بنے گا مگر تُو نے تو ہماری امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ تو جہاں تک انبیاء کا تعلق ہے بعثت سے قبل ہی لوگ انکی قابلیتوں کو تسلیم کرنا شروع کر دیتے ہیں مگر یہ کہیں قانون نظر نہیں آتا کہ انبیاء پر ایمان لانے والوں کو دشمن ذلیل قرار نہ دیتے ہوں۔ ابتداً میں انبیاء پر ایمان لانے والے چونکہ زیادہ تر غرباء اور ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے لوگ انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ایمان لانیوالے چونکہ زیادہ تر غرباء تھے اس لئے مکہ والے انہیں سخت حقارت سے دیکھتے تھے۔ اسی طرح ظاہری علوم کے لحاظ سے مسلمان بہت پیچھے تھے چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے نوجوانوں میں سے صرف حضرت زبیرؓ ہی لکھ سکتے تھے باقی صحابہؓ لکھنا بھی نہ جانتے تھے۔ لیکن اللہ تعالےٰ فرماتا ہے یہ مسلمان اپنے باپ کی مشابہت اختیار کر رہے ہیں۔ اور جب یہ اپنے باپ کے مشابہ ہو جائیں گے تو جو قابلیتیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی ہیں وہی ان میں پیدا ہو جائیں گی۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم امین ہیں۔ جب تم اس خوبی کو تسلیم کرتے ہو اور دوسری طرف مسلمان محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ لازمی بات ہے کہ وہ بھی امین بن جائیں گے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صدوق ہیں اور تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ مسلمان آپ کی اقتداء کی کامل کوشش کر رہے ہیں تو اس کا یہ ایک لازمی نتیجہ نکلنے والا ہے کہ جس طرح آپ صدوق ہیں اسی طرح مسلمان بھی راستبازی اور صداقت شعار بنا

مسلمانوں کا آنحضرت صلعم کے مشابہ ہو جانا

کا ایک نمونہ بن جائیں گے پس گو نہیں آج مسلمانوں میں کوئی قابلیت نظر نہیں آ رہی لیکن حصولِ علم کی خواہش اور اچھے نمونہ کی موجودگی کی وجہ سے ایک دن خود بخود ان میں بھی قابلیت پیدا ہو جائیگی۔

غَرْقًا کے معنے یہ ہیں کہ انہوں نے اتباعِ رسول کو حد تک پہنچا دیا ہے چنانچہ دیکھ لو مشابہتِ رسول کو مسلمانوں نے کس حد تک پہنچا دیا کہ سوائے اسلام کے اور کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں سُنّت کا لفظ پایا جاتا ہو باقی مذاہب میں یا حدیث کا ذکر آتا ہے یا الہام کا۔ یا تو وہ کہیں گے قَالَ مُوْسٰی یعنی موسیٰ نے یوں کہا۔ قَالَ عِیْسٰی یعنی عیسیٰ نے یوں کہا۔ اور یا کہیں گے اُوْحِیَ اِلٰی مُوْسٰی موسیٰ کی طرف یہ وحی کی گئی یا اُوْحِیَ اِلٰی عِیْسٰی عیسیٰ کی طرف یہ وحی کی گئی۔ یہ کبھی نہیں کہیں گے کہ یہ موسیٰؑ کی سنت ہے یا عیسیٰؑ کی سنت ہے یا کرشنؑ کی سنت ہے یا رامچندرؑ کی سنت ہے۔ سنت کی اصطلاح سوائے اسلام کے اور کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ یہ اصطلاح اسلام سے مخصوص ہے اور ہر مسلمان معلوم کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اعمال کو کس طرح بجالاتے تھے۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا۔ یہ مسلمان محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی نقل کو انتہا تک پہنچا دیں گے۔ اور جب آپ کی وہ کامل طور پر نقل کریں گے تو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی قابلیتوں کے بھی وہ حامل ہو جائیں گے۔ پھر ان کی خوبیوں اور کمالات میں کیا شبہ ہو سکے گا جب کہ ہر شخص ان میں سے اپنے اپنے دائرہ میں ایک چھوٹا محمد بن جائے گا چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متابعت صحابہؓ جس طرح کیا کرتے تھے اس کا ثبوت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ سے مل سکتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب بعض قبائلِ عرب نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ان کے خلاف جنگ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اُس وقت حالت ایسی نازک تھی کہ حضرت عمرؓ جیسے انسان نے مشورہ دیا کہ ان لوگوں سے نرمی کرنی چاہیئے مگر حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا ابو قحافہ کے بیٹے کی کیا طاقت ہے کہ وہ اس حکم کو منسوخ کر دے جو

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا ہے خدا کی قسم اگر یہ لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اُونٹ کا گھٹنا باندھنے کی ایک رسّی بھی زکوٰۃ میں دیا کرتے تھے تو میں وہ رسّی بھی اُن سے لے کر رہوں گا اور اس وقت تک دم نہیں لوں گا جب تک وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے (بخاری کتاب الزکوٰۃ) اگر تم اس معاملہ میں میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو بیشک نہ دو میں اکیلا ہی اُن سے مقابلہ کروں گا۔ کس قدر اتباعِ رسول ہے کہ نہایت خطرناک حالات میں باوجود اس کے کہ اکابر صحابہ لڑائی کے خلاف مشورہ دیتے ہیں پھر بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کو پورا کرنے لئے وہ ہر قسم کا خطرہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح لشکرِ اُسامہ کو روک لینے کے متعلق صحابہؓ نے بہت زور لگایا مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر دشمن اتنا طاقتور ہو جائے کہ وہ مدینہ پر فتح پائے اور مسلمان عورتوں کی لاشیں کُتّے گھسیٹتے پھریں تب بھی میں اس لشکر کو جسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھجوانے کے لئے تیار کیا تھا روک نہیں سکتا (تاریخ الخلفاء) اسی طرح کی ایک نقل کا واقعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بھی ہے اُن کے متعلق لکھا ہے کہ وہ جب حج کے لئے جاتے تو ایک جگہ پیشاب کرنے کی طرز پر بیٹھ جاتے چونکہ ہر بار حج کو جاتے ہوئے اس طرح کیا کرتے تھے اس لئے ایک دفعہ اُن کے کسی دوست نے اُن سے کہا کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں کہ ہر دفعہ اس مقام پر آکر بیٹھ جاتے ہیں ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ بعض دفعہ پیشاب نہیں کرتے یونہی بیٹھ کر آجاتے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے اور آپ کیوں ایسا کرتے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جواب دیا کہ میں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک دفعہ یہاں پیشاب کرتے دیکھا تھا اس لئے میں جب بھی یہاں سے گذرتا ہوں میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی آپ کے فعل کی نقل کروں چنانچہ میں اس جگہ پیشاب کرنے کی طرز پر بیٹھ جایا کرتا ہوں۔

جس قوم نے اس حد تک نقل کو پہنچا دیا ہو اس کے متعلق ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ اخلاقی اور روحانی امور میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نقل کرنے کی کس حد تک کوشش کرتی ہوگی۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا بے شک مسلمان تمہاری نگاہ میں ذلیل ہیں لیکن ایک شخص جس کی قابلیت کے تم بھی معترف ہو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور تم دیکھ رہے ہو کہ مسلمان اُن کی کامل اقتداء کر رہے ہیں پس بے شک آج اُن میں قابلیت نہ ہو لیکن اس نقل کے نتیجہ میں ایک دن آئے گا جب یہ سارے اپنے اپنے درجہ کے مطابق محمد صلے اللہ علیہ وسلم بنے ہوئے ہونگے اور وہی کمالات جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم میں پائے جاتے ہیں ان میں بھی پیدا ہو جائیں گے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تم بھی مانتے ہو کہ اُن جیسا سوار اور لیڈر سارے عرب میں اور کوئی نہیں۔ جب یہ لوگ ایسے شخص کی مشابہت اختیار کر رہے ہیں تو یہ ایک لازمی امر ہے کہ اس کے نتیجہ میں وہ خود بھی تمام خوبیوں کے حامل ہو جائیں گے۔

اَلنّٰشِطٰتِ نَشْطًا میں مسلمانوں کے دور دور پھیل جانے کی پیشگوئی

وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا۔ پھر دوسری خوبی ان میں یہ ہے کہ یہ دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ نَشَطَ کے ایک معنے پھیل جانے کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں نَشَطَ مِنَ الْمَکَانِ: خَرَجَ۔ وَمِنْ بَلَدٍ اِلٰی بَلَدٍ: قَطَعَ یعنی نَشْطٌ کے معنے سفر کرنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا بھی ہوتا ہے پس وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا کے یہ معنے ہوئے کہ یہ لوگ دنیا میں پھیل جانے والے ہیں۔ ان کے دلوں میں اپنے وطن کی جھوٹی محبت نہیں بلکہ تم دیکھوگے کہ یہ اپنے وطن چھوڑنے کے لئے بھی تیار ہو جائیں گے مگر تمہارے ظلموں کو برداشت نہیں کریں گے۔ درحقیقت اسلام نے ہی سب سے پہلے اس مسئلہ کو پیش کیا ہے کہ وطن بے شک اچھی چیز ہے لیکن وطن سے زیادہ قیمتی چیز صداقت ہے۔ اگر وطن میں رہنے سے صداقت کو چھوڑنا پڑتا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ وطن کو چھوڑ دو اور صداقت کو قائم رکھو۔ اسی کی طرف اللہ ایک دوسری جگہ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا کَثِیْرًا وَّسَعَةً وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (النساء ع ۱۴) گویا بتایا

۲۷۱ صحابہ کے آنحضرت صلعم کی کامل اقتدا کرنیکے بعض واقعات

کہ وطن بے شک اچھی چیز ہے جیسا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
نے بھی فرمایا ہے کہ حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ (تفسیر البیان)
مگر جب اس محبت کے مقابلہ میں صداقت اور ایمان کی محبت آجائے
اور تمہیں مظالم کا تختہ مشق بنایا جائے تو وطن بے شک چھوڑ دو
اور صداقت کی حفاظت کو مقدم رکھو بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں
کہ ان کے دلوں پر وطن کی محبت اس قدر غالب ہوتی ہے کہ خواہ
انہیں کس قدر دکھ دئے جائیں وہ وطن کو چھوڑنے کی طاقت اپنے
اندر نہیں پاتے۔ مگر فرمایا یہ مسلمان وہ ہیں جنہیں ہم نے نَاشِطَات
بنایا ہے جو خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں اپنے وطن کی کوئی حقیقت
نہیں سمجھتے اور وقت آنے پر اس کو قربان کر دیں گے چنانچہ اس
پیشگوئی کے بعد مسلمانوں نے دو دفعہ ہجرت کی۔ ایک دفعہ حبشہ
کی طرف اور دوسری دفعہ مدینہ کی طرف پس مسلمانوں کو نَاشِطَات
کہہ کر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وطن کی جھوٹی محبت جو ایک جگہ سے
باندھ دیتی ہے اُن کے دلوں میں نہیں ہے اگر انہیں اپنا وطن
قربان کرنا پڑا تو یہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اسکو قربان کر دینگے۔

۱ نَازِعَاتِ غَرْقًا میں مسلمانوں کی جسمانی قربانی کی طرف اشارہ

نَازِعَات میں مسلمانوں کی جسمانی قربانی کی طرف بھی
اشارہ کیا گیا تھا کیونکہ جسمانی قربانی اُس وقت تک نہیں ہو سکتی
جب تک محنت و مشقت برداشت کرنے کی عادت انسان میں
پیدا نہ ہو۔ اور بتایا گیا تھا کہ مسلمان اس بارہ میں اعلیٰ درجہ کی
صفات اپنے اندر رکھتے ہیں وہ بدیوں سے رُک بھی سکتے ہیں
اور نیکیوں کے حصول کی بھی تڑپ رکھتے ہیں۔ بیشک قومی عادات
کی وجہ سے بدیوں کے ترک کرنے میں انہیں محنت کرنی پڑتی ہے
مگر وہ اس محنت کو برداشت کرتے چلے جاتے ہیں اور پھر صرف
اسی حد تک نہیں بلکہ نیکیوں کے میدان میں بھی ترقی کرنے کی قابلیت
رکھتے ہیں۔ اب نَاشِطَات میں یہ بتایا کہ وہ نہ صرف جسمانی قربانی
کرنے کا مادہ اپنے اندر رکھتے ہیں بلکہ وطن کو قربان کرنے کا مادہ
بھی اُن کے اندر پایا جاتا ہے تم یہ نہ سمجھو کہ خواہ تمہاری طرف سے
کس قدر مظالم ہوتے گئے وہ اُن کو برداشت کرتے چلے جائینگے
ہم تمہاری توجہ مسلمانوں کے اُن گروہوں کی طرف مبذول کرتے
ہیں جو اپنے وطنوں کو چھوڑ کر باہر نکل جائیں گے۔ درحقیقت وطن کو
چھوڑنا بھی قومی ترقی کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔

۲ اَلسَّابِحَاتِ سَبْحًا میں مسلمانوں کے مفت طور پر قومی کام کرنے کی طرف اشارہ

پھر فرماتا ہے وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا۔ سَبَحَ الرَّجُلُ
کے معنے ہوتے ہیں تَصَرَّفَ فِیْ مَعَاشِہٖ یعنی آدمی اپنی روزی
کمانے میں لگا ہوا ہے۔ پس اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ وہ لوگ
ہیں جن کی تنخواہ کا قوم پر کوئی بار نہیں۔ اپنے دنیوی کام کر کے اپنا
گذارہ کرتے ہیں اور اس وجہ سے قوم کو آنریری کارکن مل رہے
ہیں۔ درحقیقت قومی ترقی کے راستہ میں ایک بڑی روک یہ ہوتی
ہے کہ مفت کام کرنے والے نہیں ملتے۔ اسی وجہ سے حکومتیں
تنخواہ دار فوجیں رکھتی ہیں۔ تنخواہ دار مدرس رکھتی ہیں۔ تنخواہ دار
کام کرنے والے رکھتی ہیں۔ اگر اسلام کی بھی یہی حالت ہوتی تو مسلمان
کس طرح ترقی کر سکتے۔ مسلمانوں کے پاس نہ مال تھا کہ وہ تنخواہیں
دے سکتے۔ نہ اتنی وسعت تھی کہ اس بار کو برداشت کر سکتے۔ اس
لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں یہ جذبہ ودیعت کر دیا
کہ وہ قومی کاموں کے لئے مفت خدمات پیش کرتے تھے۔ وہ گھر
سے کھانا کھاتے اور ملک اور قوم کے لئے اپنے اوقات کو صرف
کرتے گویا وہ ایسے وجود تھے جن کا جماعت پر کوئی بار نہیں تھا۔
بلکہ وہ مفت کے کارکن تھے پس اللہ تعالیٰ ان آیات میں صحابہؓ
کا نقشہ کھینچتا ہے کہ ایک طرف وہ تمام بدیوں سے بچتے ہیں۔
دوسری طرف تمام نیکیوں کے میدان میں بڑھنے کی کوشش کرتے
ہیں تیسری طرف وطن کی قربانی اُن کی نگاہوں میں بالکل ہیچ ہے
اور چوتھی طرف ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کوئی پیسہ نہیں مانگتے۔
وہ یہ نہیں کہتے کہ جب ہم اس قدر کام کرتے ہیں تو ہمیں کچھ معاوضہ
بھی ملنا چاہیئے بلکہ وہ جس طرح ہو سکے اپنے گھر سے گذارہ کرتے
اور قوم کا کام کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کو آنریری
کام کرنے والے مل رہے ہیں اور پھر یہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے
نقش قدم پر کامل طور پر چلنے والے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
انہیں لڑنے کے لئے کہتے ہیں تو یہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں
صلح کے لئے کہتے ہیں تو صلح کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ صدقہ و
خیرات کا حکم دیتے ہیں تو وہ اپنا سارا مال صدقہ و خیرات میں
لٹانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے وہی کچھ کرنا ہے

# يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝

(ان کا ظہور اس دن ہوگا) جس دن جنگ (کی تیاری) کرنے والی (قوم) جنگ کی تیاری کرے گی ؎۵

جس کا محمد صلے اللہ علیہ وسلم انہیں حکم دیں اور پھر انہوں نے معاوضہ کے طور پر کوئی پیسہ نہیں مانگنا اس کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ کفارِ مکّہ کو بتاتا ہے تم غور کرو اور سوچو کہ تم ان مسلمانوں کا کہاں مقابلہ کرسکتے ہو۔ ہر مسلمان قومی خادم ہے۔ ہر مسلمان قومی سپاہی ہے۔ ہر مسلمان اپنا مال ٹیکس میں دینے کے لئے تیار رہے اور جب حالت یہ ہے تو تم ان کا مقابلہ کہاں کرسکتے ہو۔ فرض کرو مکّہ والوں میں سے پچاس فیصدی لوگ کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تب بھی وہ مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے کیونکہ مسلمان سو فیصدی کام کرنیوالے تھے اور سَو کا پچاس مقابلہ نہیں کرسکتے۔ پھر صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ وہ مفت کام کرتے تھے مگر مکّہ والوں میں یہ روح نہیں تھی۔ اسی طرح صحابہؓ جس شوق سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکام کی تعمیل کرتے تھے اس شوق سے مکّہ والے اپنے سرداروں کے احکام کی کہاں اطاعت کرسکتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بیشک مسلمانوں کی تعداد تمہارے مقابلہ میں تھوڑی ہے مگر دُنیا میں تعداد سے فتح نہیں ہوتی بلکہ کام کرنے والوں سے فتح حاصل ہوتی ہے اور کام کرنے والے مسلمانوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ تم میں نہیں پائے جاتے۔

اس کے بعد فرماتا ہے فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا۔ یہاں فاء کا استعمال لازمی نتیجہ کے معنوں میں ہوا ہے یعنی جب مسلمانوں کی حالت یہ ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس مفت خدمت کی وجہ سے اسلام کو ان گنت کام کرنیوالے مل جائینگے اور لازماً یہ اُن لوگوں اور قوموں پر فتح پا جائیں گے جن میں مفت خدمت نہیں ہے۔ فرماتا ہے جب یہ سارے کے سارے اپنے گھر سے روٹی کھا کر خدمت کریں گے تو تم ان کا کس طرح مقابلہ کرسکوگے بےشک تعداد کے لحاظ سے تم زیادہ ہو مگر کام کرنے والوں کے لحاظ سے وہ زیادہ ہیں۔ اگر ایک قوم کی دس لاکھ تعداد ہو اور اس میں سے سپاہی صرف چند سو ہوں اور دوسری قوم کی تعداد اگرچہ چند سَو ہو مگر وہ ساری کی ساری سپاہی ہو تو یہ لازمی بات ہے کہ جب مقابلہ ہوگا زیادہ تعداد رکھنے والی قوم ہار جائے گی اور دوسری قوم جیت جائے گی۔ تو فرماتا ہے تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ تم جیت جاؤگے کام کرنے والوں کے لحاظ سے قوم زیادہ ہوا کرتی ہے نہ کہ افراد کی تعداد کے لحاظ سے قوم بڑی ہوتی ہے۔ اور جب دوسری اقوام کے کارکنوں پر یہ شوق اور خدمت میں غالب آجائیں گے تو لازماً حکومت بھی اُن کے قبضہ میں آجائے گی۔ چنانچہ فرماتا ہے فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا جب یہ کام کے لحاظ سے تم پر غالب آگئے ہیں تو لازماً ایک دن حکومت اُن کے ہاتھ میں آجائے گی تمہارے ہاتھ میں نہیں رہ سکتی۔

اَلسَّابِقَاتُ سَبْقًا میں مسلمانوں کے سبقت لے جانے کی وجہ کا ذکر

یہ چار معنے ہیں جو میں نے ان آیات کے بتائے ہیں اور ان چاروں معنوں کے لحاظ سے آیات میں ایک ترتیب نظر آتی ہے اور جو اضطراب گذشتہ مفسرین کے معنوں میں پایا جاتا ہے کہ کبھی نَازِعَات سے ستارے مراد لے لئے اور کبھی فرشتے اور پھر اگلی آیات کے متعلق کہنا کہ ان میں بھی یہی مضمون پایا جاتا ہے وہ اضطراب ان معنوں میں سے کسی میں بھی نہیں ہے اور یہ سب کے سب ایسے معنے ہیں جو ترتیب کے ساتھ سب آیات پر چسپاں ہو جاتے ہیں۔

**؎۵ حل لغات۔** تَرْجُفُ رَجَفَ سے مضارع مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور رَجَفَ (يَرْجُفُ) رَجْفًا کے معنے ہیں حَرَّكَهُ فَرَجَفَ هُوَ اَیْ تَحَرَّكَ وَاضْطَرَبَ شَدِيْدًا کسی چیز کو زور سے حرکت دی اور وہ حرکت میں آگئی اور زور سے ہلنے لگی۔ اور جب رَجَفَ الرَّجُلُ کہیں تو معنے ہونگے اِضْطَرَبَ شَدِيْدًا کانپنے لگا۔ اور رَجَفَتِ الْاَرْضُ کے معنے ہیں زُلْزِلَتْ۔ زمین ہلا دی گئی یعنی بھونچال آگیا۔ اور رَجَفَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں تَهَيَّئُوْا لِلْحَرْبِ۔ قوم لڑائی کے لئے تیار ہوگئی (اقرب)

تَرْجُفُ

# تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝

اس (جنگ کی تیاری) کے بعد (اس قسم کی) پیچھے آنیوالی (ایک اور) گھڑی آئیگی ۝ ۵

سورہ نازعات کی پہلی پانچ آیات میں مکہ والوں کی شکستوں کے ظہور کا وقت

**تفسیر۔** اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ یعنی اوپر کی باتیں اُس دن سے کامل طور پر ظاہر ہونی شروع ہوں گی جب کانپنے والی کانپے گی یا یہ کہ جب اوپر کی تمام باتیں ہو جائیں گی تو پھر (وہ دن آئے گا جسے ہم خصوصیت کے ساتھ تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ دن ایسا ہوگا کہ کانپنے والی کانپے گی۔ گویا ایک صورت میں يَوْمَ جو ظرف واقعہ ہوا ہے ان باتوں کے شروع ہونے سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری صورت میں اُن کے ختم ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ سے مراد یہ ہے کہ ایک دن آئے گا جب مسلمان قوم جنگ کے لئے تیار ہو جائے گی۔ تم آج ان مسلمانوں پر پے در پے ظلم کر رہے ہو اور وہ تمہارے مقابلہ میں بالکل خاموش ہیں۔ تم خیال کرتے ہو کہ ان مسلمانوں میں شاید مظالم برداشت کرتے کرتے مقابلہ کی حس ہی باقی نہیں رہی اُن کے دل مردہ ہو چکے ہیں اور اُن کے احساسات مٹ چکے ہیں لیکن تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے مسلمانوں کے دل مُردہ نہیں ہوئے بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اُن کے دل ان تکالیف کو دیکھ دیکھ کر جو تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پہنچا رہے ہو تڑپ رہے ہیں۔ صرف ہم نے روکا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ تمہیں ان مظالم کا مزہ نہیں چکھا سکتے اور پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے ہیں۔ گویا رَاجِفَةٌ کہہ کر بتا دیا کہ مسلمانوں کے دل زندہ ہیں یہ نہ سمجھو کہ مظالم نے اُن کے احساسات کو مٹا ڈالا ہے۔ وہ صرف ہماری اجازت کے منتظر بیٹھے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ تمہارے مقابلہ میں ہاتھ نہیں اٹھاتے لیکن یاد رکھو يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ جس دن یہ بڑے حساس دل اپنے جوش و اضطراب کا اظہار کریں گے اُس دن یہ تمام باتیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ظاہر ہونی شروع ہو جائیں گی۔ ابھی ہم ان کے اخلاق کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں اگر آج ہی اُن کو لڑائی کی اجازت دے دیں تو وہ اعلیٰ اخلاق جو ہم اُن میں پیدا کرنا چاہتے ہیں کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہم ابھی اُن پر ظلم کروائیں گے تاکہ اُن میں مادۂ صبر پیدا ہو جائے۔ اسی طرح وہ اخلاق پیدا ہو جائیں جو ظلم کے نتیجہ میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ پس تم اُن کی موجودہ حالت پر قیاس مت کرو۔ تم اُس دن کو یاد کرو جب اُن کے حساس دل اپنے زندہ ہونے کا ثبوت پیش کر دیں گے۔

نَازِعَات کے معنے اگر تیر اندازی کرنے والوں کے کئے جائیں تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تیر اندازی اُس دن شروع ہوگی جب اُن کے حساس دل اضطراب شدید کا اظہار کرنا شروع کر دیں گے۔ اور چونکہ رَجْفٌ کے ایک معنے قوم کے لڑائی کے لئے تیار ہونے کے بھی ہیں اس لئے يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ قوم جس کے دل لڑائی کے لئے مستعد ہیں مگر ہماری طرف سے اجازت نہ ہونے کی وجہ سے رُکے ہوئے ہیں ایک دن جنگ کے لئے تیار ہو جائے گی یعنی امن اور صلح کے شیدائی آخر ظلموں کو دین کے لئے نقصان دہ دیکھ کر خدا تعالیٰ کے حکم سے جنگ پر آمادہ ہو جائیں گے یا جب اوپر کی باتیں ہو جائیں گی اُس کے بعد ہم اس دن کو لائیں گے۔

الرَّادِفَةُ

**۵ حل لغات۔** اَلرَّادِفَةُ۔ رَدِفَ سے اسم فاعل کا مؤنث کا صیغہ ہے اور رَدِفَ (يَرْدُفُ وَرَدِفَ يَرْدَفُ) رَدَفًا کے معنے ہیں تَبِعَهٗ اس کے پیچھے پیچھے آیا (اقرب) پس رَادِفَةٌ کے معنے ہوئے پیچھے آنے والی۔

**تفسیر۔** بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کے اندر بظاہر لڑائی کا بڑا جوش نظر آتا ہے اور وہ کہتا ہے میں یوں کر دونگا ووں کر دوں گا۔ مگر اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگر اُسے ایک تھپیڑ بھی لگ جائے تو اس کا سارا جوش و خروش جاتا رہتا ہے اور وہ خاموش ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اسی طرح بعض لوگ اپنے آپ کو

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ وقف لازم

اُس دن کچھ (لوگوں کے) دل دھڑک رہے ہوں گے ۹؎ اور ان کی نظریں خوف سے جھکی ہوئی ہونگی ۱۰؎

بڑا بہادر سمجھتے ہیں مگر وقت آنے پر اُن کی حقیقت کھل جاتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی بہادری کے دعوے سب غلط تھے۔ میں نے کئی دفعہ اس شخص کی مثال سنائی ہے جو ایک گودنے والے کے پاس گیا اور اُسے کہنے لگا میرے بازو پر شیر کی تصویر گود دو۔ اُسے بھی یہ وہم تھا کہ میں بہت بہادر ہوں۔ جب جراح نے سُوئی چبھوئی تو جھٹ چونک کر کہنے لگا کیا بنانے لگے ہو؟ وہ کہنے لگا شیر کا کان۔ کہنے لگا اگر شیر کا کان نہ ہو تو آیا شیر رہتا ہے یا نہیں رہتا؟ اس نے کہا کیوں نہیں رہتا۔ وہ کہنے لگا تو پھر کان چھوڑ دو اور کوئی اور حصہ بناؤ۔ پھر اُس نے سوئی ماری تو اُس نے دوبارہ شور مچا دیا اور کہنے لگا اب کیا کرنے لگے ہو؟ وہ کہنے لگا شیر کا دوسرا کان بنانے لگا ہوں۔ اُس نے کہا اگر یہ کان نہ ہو تو پھر بھی شیر رہتا ہے یا نہیں رہتا؟ وہ کہنے لگا رہتا کیوں نہیں۔ کہنے لگا اچھا تو پھر اس کو بھی چھوڑو اور آگے چلو۔ اسی طرح وہ ہر دفعہ یہی کہتا چلا گیا۔ آخر گودنے والے نے سُوئی رکھ دی اور کہنے لگا اب تو کچھ بھی نہیں بن سکتا۔ تو بعض فطرتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بہادری کا دعویٰ تو بہت کرتی ہیں مگر وقت پر بُزدل ثابت ہوتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ یہ نہیں ہوگا کہ مسلمان پھر اپنے ہاتھ سے تلوار چھوڑ دیں بلکہ ایک دفعہ تلوار اُٹھے گی تو پھر پے در پے جنگیں ہوتی ہی چلی جائیں گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ مسلمان ڈر جائیں یا ایک حملہ کے بعد دوسرا حملہ نہ کریں بلکہ متواتر اور مسلسل جنگیں ہونگی اور وہ اُس وقت تک تلوار ہاتھ سے نہ رکھیں گے جب تک فتح نہ پائیں۔

**۹؎ حل لغات۔** وَاجِفَةٌ وَجَفَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے۔ وَجَفَ (يَجِفُ) وَجْفًا وَوَجِيفًا وَوُجُوْفًا کے معنے ہوتے ہیں۔ اِضْطَرَبَ وہ کانپنے لگا اور جب قلب کے لئے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے خفقان کے ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں وَجَفَ الْقَلْبُ وَجِيفًا اَیْ خَفَقَ یعنی دل دھڑکنے لگا۔ اور جب گھوڑے یا اونٹ کے متعلق یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں عَدَا وَسَارَ الْعَنَقَ۔ وہ تیز دوڑا اور عنق (تیز چال) چال چلا (اقرب)

پس قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ کے معنے ہوں گے اس دن کچھ دل ایسے ہوں گے جو دھڑک رہے ہونگے۔

**تفسیر۔** جیسا کہ سورۃ نبأ کی تفسیر میں بیان کیا جاچکا ہے اللہ تعالیٰ ایک ہی وقت میں قرآن اور اسلام کے غلبہ اور قیامت کا ذکر کرتا ہے اور اسلام کے غلبہ کو قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے کہ جو خدا اتنا عظیم الشان تغیر پیدا کر سکتا ہے تمہیں یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ مرنے کے بعد بھی زندگی بخش سکتا ہے۔ اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ جب یہ حالات رونما ہوں گے بڑے بڑے صنادید مارے جائیں گے اور مسلمان کفار کو مغلوب کر لیں گے تو اُن کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہونا شروع ہو جائے گا کہ کہیں سچ مچ قیامت بھی تو نہیں آنے والی۔ جب ایک بات پوری ہونی شروع ہو گئی ہے تو دوسری بات جس کا اسی کے ساتھ تعلق تھا وہ بھی پوری ہو سکتی ہے۔ پس اُس دن کفار گھبرا جائیں گے اور آثار شکست ظاہر ہو جائیں گے یہاں تک کہ کفار کے دل میں اپنے عقیدۂ قیامت کے انکار کے متعلق بھی شبہات پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے اور وہ کہیں گے ارے کہیں قیامت بھی تو نہیں آنے والی جس کا مسلمانوں کی طرف سے ذکر کیا جا رہا تھا۔

غلبۂ اسلام کے ظہور سے قیامت کے برپا ہونے کے متعلق کفار کے دلوں میں خیالات

**۱۰؎ حل لغات۔** اَلْخَاشِعَةُ خَشَعَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے اور خَشَعَ بِبَصَرِهٖ کے معنے ہوتے ہیں غَضَّهٗ آنکھ کو نیچا کیا۔ وَغَضَّ بَصَرَهٗ: اِنْكَسَرَ

وَاجِفَةٌ
اَلْخَاشِعَةُ

# يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِى الْحَافِرَةِ ۝

(اور) وہ کہیں گے کیا ہمیں اپنے رستے پر اُلٹے پاؤں لوٹایا جائے گا ۝۱۱

اس کی آنکھ انکسار سے جھک گئی۔ وَفِى النِّهَايَةِ اَلْخُشُوْعُ فِى الصَّوْتِ وَالْبَصَرِ كَالْخُضُوْعِ فِى الْبَدَنِ۔ نہایہ کے مصنف لکھتے ہیں کہ جس طرح بدن کی عاجزی اور انکساری کے اظہار کے لئے خضوع کا لفظ استعمال کرتے ہیں اسی طرح آنکھ اور آواز سے عجز کے اظہار کو خشوع کہتے ہیں (اقرب)

اَبْصَارُهَا خَاشِعَة میں ھا کی ضمیر کا مرجع

**تفسیر۔** اَبْصَارُهَا کی ضمیر قلوب کی طرف جاتی ہے اور اَبْصَار کے معنے آنکھوں کے ہوتے ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ دلوں کی تو آنکھیں نہیں ہوتیں پھر اَبْصَارُهَا کیوں کہا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اَبْصَارُهَا میں ھا سے مراد اہل قلوب ہیں جیسا کہ يَقُوْلُوْنَ سے ظاہر ہے فرماتا ہے يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِى الْحَافِرَةِ

اَلْحَافِرَةُ

اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر اہل قلوب مراد ہیں تو پھر ضمیر مؤنث کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ یہاں اہل قلوب مراد ہیں اس لئے قلوب کی طرف اضافت کے باعث ضمیر مؤنث آسکتی ہے جیسے تَسُرُّ النَّاظِرِيْنَ (البقرة) میں ہے یہ عربی کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی لفظ مؤنث یا مذکر کی طرف مضاف ہو تو مضاف الیہ کی مطابقت میں اسے بھی مؤنث یا مذکر قرار دے دیتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اَبْصَار۔ بَصَرٌ کی جمع ہے اور بَصَرٌ کا لفظ حَاسَّةُ الرُّؤْيَةِ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اَلْعَيْنُ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اَلْعِلْمُ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے (اقرب) اور علوم کی ضمیر قلوب کی طرف پھیری جا سکتی ہے یعنی انکے قلوب میں عقل اور فہم کی جو حس ہے وہ منکسر ہو جائے گی اور انہیں معلوم ہوگا کہ ان کے دلوں میں جو علم کے دعوے تھے سب غلط تھے۔ اور اگر اَبْصَار سے ظاہری آنکھیں مراد لیں تو جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ اس دن کچھ دل دھڑک رہے ہوں گے اور اُن اہل قلوب کی آنکھیں ذلت اور ندامت سے جھکی ہوئی ہونگی وہ شرمندہ ہونگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہو گیا۔ اس مشاہدہ اور معائنہ کے بعد اُن کی آنکھیں شرمندگی اور ذلت اور انکسار سے جھک جائینگی یعنی يٰلَيْتَنِىْ كُنْتُ تُرَابًا والا نظارہ دیکھ کر کسی کے سامنے آنکھ نہ اٹھا سکیں گے اور دل میں قیامت کے انکار کے متعلق بھی شبہ پیدا ہو جائے گا کہ جس طرح یہ بات پوری ہوئی کیا وہ بھی تو پوری نہ ہو جائے گی۔ دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ اُس دن کچھ دل دھڑک رہے ہوں گے۔ اُن کی بصیرتیں اور علوم سب باطل ہو جائیں گے اور انہیں معلوم ہو جائیگا کہ اُن کے علم و فہم کے دعوے سب غلط تھے۔

**۱۱ حل لغات۔** اَلْحَافِرَةُ مؤنث ہے اَلْحَافِرُ کی اور اس کے معنے ہیں اَلْخِلْقَةُ الْاُوْلٰى۔ پہلی پیدائش۔ کہتے ہیں رَجَعَ عَلٰى حَافِرَتِهٖ وَفِىْ حَافِرَتِهٖ اَىْ فِىْ طَرِيْقِهِ الَّتِىْ جَاءَ فِيْهَا یعنی جب رَجَعَ عَلٰى حَافِرَتِهٖ کہیں تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ اُسی طرف چلا گیا جس طرف سے آیا تھا۔ نیز کہتے ہیں فُلَانٌ رَجَعَ فِىْ حَافِرَتِهٖ : شَاخَ وَهَرِمَ یعنی وہ بڈھا ہو گیا۔ وَرَجَعَ عَلٰى حَافِرَتِهٖ يُقَالُ اَيْضًا لِمَنْ كَانَ فِىْ اَمْرٍ فَخَرَجَ مِنْهُ ثُمَّ عَادَ اِلَيْهِ (اقرب) جو شخص کوئی کام کرتا ہوا چھوڑ دے اور پھر اُسے کرنے لگ جائے اس کے متعلق کہتے ہیں کہ رَجَعَ عَلٰى حَافِرَتِهٖ

**تفسیر۔** يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِى الْحَافِرَةِ سے مراد یہ ہے کہ جب کفار ایک پیشگوئی کو پورا ہوتے دیکھیں گے تو اُن کے دل دھڑکیں گے اور وہ کہیں گے کیوں جی ایک بات تو پوری ہو گئی۔ کیا دوبارہ زندہ ہونیوالی بات بھی پوری ہو جائے گی یعنی خود بخود اُن کے دل میں سوال اُٹھنا

ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝ وقف لازم

کیا (اس حالت میں بھی کہ) جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے (ایسا ہوگا) ؁۱۲ وہ کہتے ہیں (اگر ایسا ہوا) تب تو یہ بڑی گھاٹے والی واپسی ہوگی

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝

پس (حقیقت میں) یہ (جنگ کی تیاری) ایک (الٰہی) ڈانٹ (ڈپٹ کا نتیجہ) ہوگی ؁۱۳

شروع ہو جائے گا یا وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہیں گے کہ ایک بات تو ہو گئی کیا اس سے ہم یہ نتیجہ نکال لیں کہ قیامت کا مسئلہ بھی سچ مچ صحیح ہے اور کیا اب اس طرح ہو کر رہیگا اگر ایسا ہوا تو ہمیں بڑا نقصان پہنچے گا۔

**؁۱۲ حل لغات۔** نَخِرَ الْعَظْمُ کے معنے ہوتے ہیں بَلِيَ وَتَفَتَّتَ۔ ہڈیاں گل سڑ گئیں اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں (اقرب) اَلْعِظَامُ النَّخِرَةُ: اَلْبَالِيَةُ الْمُتَفَتِّتَةُ بوسیدہ اور گلی سڑی ہڈیاں (اقرب)

اَلْكَرَّةُ کے معنے ہیں لوٹنا۔ اور اَلْكَرَّةُ الْخَاسِرَةُ کے معنے ہیں نقصان دہ لوٹنا۔

نَخِرَةً

**تفسیر۔** ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً میں سوال انکاری نہیں بلکہ استعجاب کا سوال ہے یعنی کفار تعجب سے کہتے ہیں کہ ایک بات تو مسلمانوں کی پوری ہو گئی۔ دوسری بات جو مسلمان کہا کرتے تھے کہ جب ہڈیاں گل سڑ جائیں گی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی تو پھر دوبارہ اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے زندہ کر دیا جائیگا۔ پس جبکہ ایک بات پوری ہوتی نظر آ گئی ہے تو دوسری بات بھی پوری ہو سکتی ہے گویا وہ جو کہا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ کیا جائے گا یہ بات تو ٹھیک ہوتی نظر آتی ہے

قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ۔ کفار کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہو گیا تو یہ ہمارا لوٹنا بڑا نقصان دہ ہوگا اس لئے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی تھی کہ دو قیامتیں آنے والی ہیں۔ ایک قیامت میرا غلبہ ہے اور ایک قیامت وہ ہے جب مرنے کے بعد ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اُسے اپنے اعمال کا جواب دینا پڑے گا۔ ہم نے ان دونوں قیامتوں کا انکار کیا اور کہا کہ ہم کسی بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ چنانچہ ہم نے اس کا مقابلہ کیا اور اس کو مٹانے کے لئے اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں مگر جب بھی ہم نے اُس کے مقابلہ میں سر اٹھایا ہم کچلے گئے اور ہمیں ذلّت کے ساتھ ناکام ہونا پڑا۔ اس کے بعد ساری قوم نے مل کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو گرانے اور آپ کو اپنے مقصد میں ناکام کرنے کی کوشش کی مگر پھر بھی ہم مارے گئے۔ پس جب ہم تیاری کرکے مارے گئے تو جہاں ہم بے تیاری کے جائیں گے وہاں ہمارا کیا حال ہوگا۔ اُس دن کے لئے تو ہم نے کوئی بھی تیاری نہیں کی۔ پس اگر وہ بات بھی پوری ہوئی تو پھر تو ہمارا بُرا حال ہوگا کیونکہ اس کے لئے ہم نے کوئی تیاری نہیں کی۔ اس دنیوی دن کے لئے تو تیاری کی تھی پھر بھی ذلیل ہو گئے وہ دن جس کے لئے تیاری نہیں کی اُس دن کیا حال ہوگا۔ وہ ہمارا لوٹنا تو بڑا نقصان دہ ہوگا۔

اس جگہ دوزخ کا ذکر یہ بتانے کے لئے کیا گیا ہے کہ یہاں قیامت اور غلبۂ رسول دونوں کا اکٹھا ذکر ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ جب ان میں سے ایک بات پوری ہو جائیگی تو کفار خود بخود اس سے یہ استدلال کرنا شروع کر دیں گے کہ جو دوسری بات کہی گئی تھی معلوم ہوتا ہے وہ بھی پوری ہو جائے گی اور اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں بڑا نقصان ہوگا کیونکہ ہم نے تو اُس دن کے لئے کوئی تیاری نہیں کی۔ اس کے بعد پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے۔

زَجْرَةٌ

**؁۱۳ حل لغات۔** زَجْرَةٌ زَجَرَ سے ہے اور زَجَرَهٗ عَنْ كَذَا زَجْرًا کے معنے ہوتے ہیں مَنَعَهٗ وَنَهَاهُ۔ اُسکو

کسی چیز سے سختی سے روکا اور منع کیا وَيُقَالُ اَصْلُ الزَّجْرِ اَلطَّرْدُ مَعَ الصَّوْتِ یعنی زجر کے اصل معنے آواز کے ساتھ دوڑانے کے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں زَجَرَا لْبَعِيْرَ : صَاحَ بِهٖ لِيَسُوْقَهٗ ۔ زور زور سے آوازیں دے کر اونٹ کو ہانکا اور جب زَجَرَتِ النَّاقَةَ بِمَا فِيْ بَطْنِهَا کہیں تو معنے ہوں گے رَمَتْ بِهٖ اونٹنی نے اپنا بچہ پھینک دیا اور زَجَرَ الطَّيْرَ کے معنے ہوتے ہیں تَفَاءَلَ بِهٖ فَتَطَيَّرَ فَنَفَّرَهٗ یعنی طیر سے تفاؤل لیا اور پھر منحوس فال نکلنے پر پرندے کو اڑا دیا۔ اسی طرح کہتے ہیں فُلَانٌ يَزْجُرُ الطَّيْرَ یعنی اس نے پرندہ اڑا دیا۔ دائیں طرف گیا تو نیک فال لی۔ بائیں طرف گیا تو بری فال لی (اقرب) گویا زجر کے اور معنوں کے علاوہ ایک معنے روکنے اور منع کرنے کے بھی ہیں اور ایک معنے اونٹوں کو شور کے ساتھ ہنکا کر لے جانے کے ہیں۔ پس زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ کے معنے ہوئے ایک دفعہ دھکیل کر لے جانا یا ہنکا کر لے جانا۔

۲۱۱ اِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ میں جنگ بدر کا نقشہ

**تفسیر۔** فرماتا ہے فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ارے میاں ابھی سے تمہارے دل دھڑکنے لگ گئے۔ یہ درحقیقت جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے اور فرماتا ہے کہ یہ جو ہم نے کہا تھا کہ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ اس کا تو ابھی ہم نے صرف پہلا نمونہ دکھایا ہے اور ابھی سے تم حواس باختہ ہو گئے اور تمہارے دل دھڑکنے لگ گئے حالانکہ ابھی تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ والی پیشگوئی پوری ہونی باقی ہے اور تمہیں ہم نے کئی دفعہ ان میدانوں میں ہنکا کر لے جانا ہے۔ یہ ویسا ہی فقرہ ہے جیسے ایک شاعر نے کہا کہ ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیو ہوتا ہے کیا

فرماتا ہے فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۔ یہ عذاب جس کا ہم نے ذکر کیا ہے عذابوں کے لمبے سلسلہ میں سے پہلا عذاب ہوگا اور اسی کے دیکھنے سے تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے حالانکہ ہم تمہیں اور تمہاری قوم کے سرداروں کو بار بار جمع کریں گے اور بار بار مسلمانوں کے مقابلہ میں تم شکست کھاؤ گے۔

ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے بدر کی جنگ کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ بدر کی جنگ میں نہ مسلمان لڑنے کی نیت سے نکلے تھے اور نہ کفار لڑنے کی نیت سے نکلے تھے مسلمان مدینہ سے صرف اس لئے نکلے تھے کہ انہیں معلوم ہوا کہ شام سے کفار کا ایک قافلہ آرہا ہے اور چونکہ یہ ایک غیر معمولی قافلہ تھا جس میں قریش کے ہر مرد و عورت کا تجارتی حصہ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق رؤسائے قریش کی یہ نیت تھی کہ اس کا منافع مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے میں استعمال کیا جائے گا چنانچہ تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ یہی منافع جنگ اُحد کی تیاری میں صرف کیا گیا (ابن سعد جلد ۱) پس علاوہ اس کے کہ وہ قوم کی قوم مسلمانوں سے برسرپیکار رہتی تھی اپنے روپیہ اور مال کے ذریعہ سے بھی مسلمانوں کے خلاف مختلف قسم کے منصوبے سوچتی رہتی تھی اور یہ مال انہیں زیادہ تر تجارت سے حاصل ہوتا تھا۔ دوسرے مسلمانوں کو علم تھا کہ کفار مکہ بھی اسی قافلہ کی پیشوائی کو ایک لشکر لے کر نکلے ہیں پس مسلمان یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہم تم سے ڈرتے نہیں لیکن ان کو قطعی طور پر یہ علم نہ تھا کہ کفار سے جنگ ضرور ہو جائے گی۔ پس چونکہ اس روپیہ کا استعمال مسلمانوں کے خلاف ہونے والا تھا۔ اور دوسرے کفار مکہ ایک لشکر کے ذریعہ سے مسلمانوں کے رعب کو مٹانے کے لئے نکلے تھے اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو لے کر نکلے کہ تا علاقہ پر کفار کا رعب نہ پڑے گو پہلے بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے اشارات ہو رہے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ کفار سے جنگ ہونے والی ہے مگر یہ امر واضح نہ تھا کہ ابھی ایسا ہونے والا ہے لیکن جب آپ لشکر لے کر نکلے تو آپ کو وحی سے بتایا گیا کہ دراصل کفار سے لڑائی ہونی ہے قافلہ سے مقابلہ نہیں ہوگا۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ابھی یہ بات بتائیں نہیں جس وقت آپ بدر کے قریب پہنچے تو اس وقت آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے کہ قافلہ سامنے آجائے

یا دشمن کے لشکر سے ہی مقابلہ ہو جائے اُس وقت صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ! جو صورتِ حالات بھی پیدا ہو ہم اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں مگر اب بھی اُن کے ذہن میں یہی تھا کہ لشکر سے کہاں مقابلہ ہونا ہے قافلہ والوں سے ہی مقابلہ ہو گا۔ مگر جب آپ بدر کے مقام پر پہنچے تو وہاں کفار کا لشکر موجود تھا اُس وقت آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ بولو اب کیا رائے ہے؟ صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ ہم لڑائی کے لئے تیار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس جنگ میں صرف تین سو تیرہ صحابہ شامل ہوئے ورنہ مسلمانوں کی تعداد اس سے زیادہ تھی۔ اس قدر تھوڑی تعداد میں مسلمان اسی لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئے تھے کہ ان کا خیال تھا کہ غالباً مقابلہ کوئی نہ ہوگا اس لئے زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں مگر جب قافلہ کی بجائے لشکر سے مقابلہ ہو گیا تو بعض صحابہؓ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم آپ کے لئے مقامِ حفاظت بنا دیتے ہیں تاکہ آپ محفوظ رہیں۔ اور آپ کے پاس ایسی تیز رفتار اونٹنیاں باندھ دیتے ہیں جو نہایت مضبوط ہوں۔ یا رسول اللہ! اگر ہم سب کے سب اس جنگ میں مارے جائیں تو ہماری درخواست ہے کہ آپ ان تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو کر مدینہ تشریف لے جائیں وہاں ہمارے بھائی موجود ہیں جن کے دلوں میں ویسا ہی اخلاص موجود ہے جیسا ہمارے دلوں میں ہے اور جو دین کے لئے قربانی کی ویسی ہی روح رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں مگر انہیں معلوم نہ تھا کہ جنگ ہونے والی ہے ان کا یہی خیال تھا کہ شاید جنگ نہ ہو اور اسی لئے وہ ساتھ نہیں آئے۔ آپ ہمارے اُن بھائیوں کو ساتھ لے کر پھر ان کفار کا مقابلہ کر سکتے ہیں (سیرۃ حلبیہ) دوسری طرف کفار کا یہ حال تھا کہ جب انہوں نے سنا کہ قافلہ بچ کر نکل آیا ہے تو ابوجہل اور دوسرے بڑے بڑے سرداروں نے کہا چلو ہم ذرا عیش کر آئیں اور خوشی منائیں کہ مسلمان ہمارے قافلہ کو روک نہیں سکے۔ پس وہ بھی لڑائی کے ارادہ سے نہیں نکلے تھے بلکہ اُن کا منشا یہ تھا کہ ہم تین دن دعوتیں کریں گے شرابیں پئیں گے اور خوب عیش منائیں گے اور علاقہ پر رعب ڈالیں گے۔ پس اپنی طرف سے وہ عیش منانے کے لئے آئے تھے اور سمجھتے تھے کہ مسلمانوں میں یہ جرأت کہاں ہو سکتی ہے کہ وہ ہمارے مقابلہ میں آئیں۔ ادھر مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ہم کسی یقینی لڑائی کے لئے نہیں جا رہے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے اپنی خاص حکمت سے دونوں کو ایک مقام پر لڑائی کے لئے جمع کر دیا۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (الانفال ع۵) یعنی ہم اپنے حکم سے تم دونوں کو نکال کر لائے تھے ورنہ نہ وہ آتے نہ تم آتے۔ اُن کے لئے بھی کوئی جنگ کا موقع نہ تھا کیونکہ اس وقت اُن کے مدنظر یہ بات تھی کہ قافلہ اپنے ساتھ جو چیزیں لایا اُسے ہم بیچیں اور روپیہ کمائیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کے دلوں میں بھی لڑائی کی کوئی خواہش نہ تھی یہ اللہ تعالیٰ کا ہی فیصلہ تھا جس نے دونوں کو لڑائی کے لئے جمع کر دیا ؛

---

وقف لازم

فَاِذَا هُمۡ بِالسَّاهِرَةِ ؕ هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى ۘ

چنانچہ وہ یکدم (جنگ کے) میدان میں آموجود ہوں گے ۱۴؎ کیا تجھے موسٰے کی بات (بھی) پہنچی ہے۔

اِذۡ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًى ۚ

جبکہ اُسے اس کے رب نے (اس) مقدس وادی یعنی طوٰی میں پکارا ۱۵؎

اَلسَّاهِرَةُ

**۱۴؎ حل لغات۔** اَلسَّاهِرَةُ قِيۡلَ وَجۡهُ الۡاَرۡضِ (مفردات) یعنی سَاهِرَة کے معنے سطح زمین کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اقرب الموارد میں لکھا ہے اَلسَّاهِرَةُ وَجۡهُ الۡاَرۡضِ۔ سطح زمین۔ وَقِيۡلَ اَلۡفَلَاةُ جنگل۔ (اقرب)

**تفسیر۔** فرماتا ہے صرف ایک دفعہ تمہیں ہنکاکر لانے پر کفار مسلمانوں کے مقابل پر بالکل ننگے ہو جائیں گے اب آگے آگے دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ جب اس ایک واقعہ سے قیامت کے متعلق اُن کے دلوں میں خیالات پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے تو آئندہ کیا ہوگا جب تَتۡبَعُهَا الرَّادِفَةُ کا وقت آئے گا اور پے درپے اُنہیں مسلمانوں کے مقابلہ میں جنگ کے لئے ہنکا کر لایا جائیگا۔

حضرت موسٰی علیہ السلام کے خدا کو دیکھنے اور آنحضرتؐ کے خدا تعالیٰ کو دیکھنے میں فرق

**۱۵؎ تفسیر۔** فرماتا ہے جب یہ واقعات ظہور میں آئیں گے تو تم اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے کہو گے کہ یہ محض اتفاق ہے حالانکہ تم اسے اتفاق نہیں کہہ سکتے۔ پہلے نبیوں کے زمانہ میں بھی ایسا ہوتا چلا آیا ہے اور تمہارے سامنے اس کی مثالیں موجود ہیں۔ تم کس کس شہادت کو اتفاق قرار دے کر اُس کا انکار کروگے۔ اول تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہارے سامنے صرف یہ پہلی پیشگوئی نہیں کی بلکہ اور بھی کئی پیشگوئیاں کی ہیں اور تم اُن نشانات کو پورا ہوتے دیکھ چکے ہو لیکن اگر پھر بھی تم اس کو اتفاق قرار دوگے تو ہم تمہارے سامنے دوسری مثال پیش کرتے ہیں۔

آنحضرتؐ کے غلبہ کیلئے حضرت موسٰی علیہ السلام کے حالات کا ذکر

هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى۔ کیا تمہیں کچھ موسیٰ کی بھی خبر ہے اِذۡ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًى جب خدا نے اُس کو طوٰی کی مقدس وادی میں پکارا۔ طوٰی شام میں ایک وادی بھی ہے اور طُوًى کے معنے ہیں اَلشَّیۡءُ الۡمُثَنّٰى (اقرب) ایسی چیز جو ٹیڑھی ہو سیدھی نہ ہو۔

اس آیت میں ایک زبردست لطیفہ ہے اور وُہ یہ کہ حضرت موسٰے علیہ السلام جب خدا تعالےٰ سے ملے تو وُہ وادیٔ طوٰی میں تھے جس کے معنے ٹیڑھی وادی کے ہیں لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اللہ تعالےٰ سے ملے تو اُس وقت کا نقشہ اللہ تعالےٰ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوۡسَيۡنِ اَوۡ اَدۡنٰى (النجم ع۱) آپ اللہ تعالےٰ کے سامنے اس طرح جا کھڑے ہوئے جس طرح دو قوسوں میں وتر ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ نزدیک ہو کر آپ نے اللہ تعالےٰ کو دیکھا۔ اب یہ سیدھی بات ہے کہ وادیٔ طوٰی میں جو شخص کھڑا ہوگا وہ خدا تعالےٰ کو اُس طرح نہیں دیکھ سکیگا جس طرح قَابَ قَوۡسَيۡنِ والا دیکھ سکے گا۔ مثلاً جب یہ شکل بنائی جائے (...) تو اس میں الف مقام کو ب مقام والا نہیں دیکھ سکتا لیکن اس دوسری شکل میں (...) مقام الف کو ب مقام والا دیکھ سکتا ہے۔ اس میں درحقیقت اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کی قوم خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھے گی لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متبع روحانیت میں درجۂ کمال حاصل کریں گے اور وُہ خدا تعالیٰ کو اپنے سامنے دیکھ سکیں گے کیونکہ قَابَ قَوۡسَيۡنِ والی

اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۞ فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰٓى

(اور فرمایا) فرعون کی طرف جا کیونکہ وہ باغی ہو رہا ہے۔ اور (اسے) کہو کہ کیا تجھے (اس بات کی بھی کچھ) خواہش

اَنۡ تَزَكّٰى ۞ وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخۡشٰى ۞

ہے کہ تو پاک ہو جائے ۱۶؎ اور (اس کے نتیجہ میں) میں تجھے تیرے رب کی طرف راستہ دکھاؤں پس تو (خدا سے) ڈرنے لگے

فَاَرٰٮهُ الۡاٰيَةَ الۡكُبۡرٰى ۞

چنانچہ (موسیٰ گئے اور انہوں نے) اُسے ایک بڑا نشان دکھلایا ۱۷؎

حالت میں آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا جا سکتا ہے لیکن دوسری صورت میں آمنے سامنے ہو کر نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ خدا ایک زاویہ پر رہتا ہے اور بندہ دوسرے زاویہ پر۔

۱۶؎ **حل لغات**۔ تَزَكّٰى اصل میں تَتَزَكّٰى ہے جو تَزَكّٰى سے مضارع مخاطب کا صیغہ ہے اور تَزَكّٰى کے معنے ہیں صَارَ زَكِيًّا۔ پاک ہو گیا (اقرب) اور تَتَزَكّٰى کے معنے ہوں گے۔ پاک ہوتا ہے۔ اور هَلۡ لَّكَ اِلٰٓى اَنۡ تَزَكّٰى کے معنے ہوں گے۔ کیا تیری اس طرف رغبت ہے کہ تو پاک ہو۔

**تفسیر**۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى تو فرعون کی طرف جا کیونکہ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰٓى اَنۡ تَزَكّٰى اور اُسے کہہ ارے میاں کچھ پاکیزگی کا بھی دل میں شوق ہے۔ هَلۡ لَّكَ اِلٰٓى اَنۡ تَزَكّٰى کے معنے یہ ہیں کہ هَلۡ لَّكَ رَغۡبَةٌ اِلٰٓى اَنۡ تَزَكّٰى کیا تزکیہ کی طرف بھی تجھے کچھ رغبت اور شوق ہے۔ یہ بھی گفتگو کا ایک طریق ہوتا ہے جیسے ہمارے ہندوستان میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ پان کا شوق فرمائیں گے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ فرعون سے جا کر کہو کہ ارے میاں کچھ پاکیزگی کا بھی شوق ہے؟ اگر تزکیہ کا شوق ہو تو میں کچھ باتیں بتاؤں وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ اور میں تجھے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ بتاؤں فَتَخۡشٰى جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا کا خوف تمہارے دل میں پیدا ہو جائے گا۔

۱۷؎ **تفسیر**۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم زائد باتیں حذف کر دیتا ہے۔ پہلے فرمایا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ اگر تمہیں پاکیزگی کا شوق ہو تو میں تمہیں کچھ ہدایت کی باتیں بتلاؤں۔ اس کے بعد یہ مضمون آنا تھا کہ جب فرعون کو یہ کہا گیا تو اُس نے بے رغبتی کا اظہار کیا اور کہا میں ایسی باتوں کی خواہش نہیں رکھتا تم میرے سامنے ایسی باتیں مت پیش کرو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان زوائد کو حذف کر دیا۔ کیونکہ یہ باتیں خود بخود سمجھی جا سکتی ہیں۔ بہرحال فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان لمبی بحث ہوئی جس کے نتیجہ میں فرعون کو آیت کبریٰ دکھائی گئی۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وہ کونسی آیت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آیت کبریٰ قرار دیا ہے۔ نشانات تو بہت سے دکھائے گئے تھے چنانچہ قرآن کریم میں بھی دوسری جگہ تِسۡعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ (بنی اسرائیل ع ۱۲) کے الفاظ آتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے نو نشانات دیئے جو بہت روشن اور واضح تھے۔ اسی طرح فرماتا ہے وَلَقَدۡ اَرَيۡنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى (طٰہٰ ع ۳) کہ ہم نے فرعون کو اپنی تمام آیات دکھائیں مگر پھر بھی اُس نے تکذیب کی اور انکار سے کام لیا۔ پس سوال یہ ہے کہ جب فرعون کو بہت سے نشانات دکھائے گئے تو پھر آیت کبریٰ سے

(حاشیہ: ۱ تَزَكّٰى — ۲ آیت کبریٰ سے مراد معجزۂ عصا ہے)

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝

جس پر اس نے (موسیٰ کو) جھٹلایا اور نافرمانی کی۔ مزید براں (اُس نے) فساد کی تدبیریں کرتے ہوئے حق سے پیٹھ پھیر لی

فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝

چنانچہ (اس نے درباریوں کو) جمع کیا اور (ملک میں عام) منادی (بھی) کرائی اور (لوگوں کو جمع کرکے) کہا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں ؎۱۸

کونسا نشان مراد ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جیساکہ سورۂ طٰہٰ سے ہی ظاہر ہے پہلے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا کا معجزہ دکھایا تھا۔ یہاں بھی چونکہ فرعون سے پہلی ملاقات کا ہی ذکر ہے اس لئے آیت کبریٰ سے مراد عصا والا معجزہ ہی۔ قرآن کریم نے بھی بار بار عصا کے معجزہ کا ذکر کیا ہے۔ بیشک ید بیضا کا معجزہ بھی کئی دفعہ ظاہر ہوا مگر ید بیضا کا معجزہ ہمیشہ عصا والے معجزہ کے بعد ظاہر ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کے مقام پر کھڑا کیا گیا تو اُس وقت بھی پہلے عصا کا معجزہ ظاہر ہوا اور بعد میں ید بیضا کا۔ فرعون کے سامنے ساحروں کے مقابلہ میں بھی عصا کا معجزہ ہی دکھایا گیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ساتھ دریا کو پار کیا تو اُس وقت بھی عصا ہی سمندر پر مارا گیا اور جب پانی کی سخت ضرورت تھی تو اُس وقت بھی عصا ہی چٹان پر مارا گیا۔ پس عصا کے ساتھ خصوصیت سے کئی نشانات وابستہ تھے اسی لئے اِس معجزہ کو آیتِ کبریٰ قرار دیا گیا ہے خروج باب ۷ آیت ۸ تا ۱۰ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا کا معجزہ ہی دکھایا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے۔" اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون کو کہا کہ جب فرعون تمہیں کہے کہ اپنا معجزہ دکھاؤ تو ہارون کو کہیو کہ اپنا عصا لے اور فرعون کے آگے پھینک دے وہ ایک سانپ بن جائیگا تب موسیٰ اور ہارون فرعون کے آگے گئے اور انہوں نے وہ جو خداوند نے انہیں فرمایا تھا۔ کیا۔ ہارون نے اپنا عصا فرعون اور اس کے خادموں کے آگے پھینکا اور وہ سانپ ہو گیا۔

قرآن کریم کے رُو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ساحروں نے بھی یہی معجزہ دکھانا چاہا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن بھی اس معجزہ کی اہمیت کو تسلیم کرتا تھا۔ بائیبل نے بیان کیا ہے کہ خون بنانے کا معجزہ بھی ساحروں نے دکھایا مگر قرآن کریم نے اُس کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ اصل معجزہ جو فرعون اور اس کے ساتھیوں کو دکھایا گیا عصا کا ہی تھا باقی جس قدر معجزات تھے وہ اس کے تابع تھے۔

؎۱۸ **تفسیر**۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے باوجود اس کے کہ فرعون کو آیت کبریٰ دکھائی گئی پھر بھی اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور نافرمانی کی ثُمَّ اَدْبَرَ پھر پیٹھ پھیری۔ يَسْعٰى اور مخالفت میں لگ گیا۔ يَسْعٰى کے معنے سعی اور کوشش کے بھی ہوتے ہیں اور دوڑنے کے بھی۔ یہاں يَسْعٰى سے مراد عملی کوشش کے ہیں نہ کہ قدموں سے بھاگنے کی کوشش کے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اُس نے پورا زور مخالفت میں لگایا اور اپنی تمام کوششیں موسیٰؑ کو برباد کرنے میں صرف کر دیں۔ فَحَشَرَ فَنَادٰى پھر اس نے تمام لوگوں کو اکٹھا کیا۔ اور انہیں بُلانے کے لئے منادی کی۔ اکٹھا کرنے سے یہ مراد ہے کہ اُس کی طرف سے بڑے بڑے لوگوں کو چٹھیاں بھیجی گئیں کہ وہ فلاں دن جمع ہو جائیں۔ دنیا میں بُلانے کے دو ہی طریق ہیں۔ معزز لوگوں کی طرف چٹھیاں بھیج دی جاتی ہیں اور عوام کو بلانے کے لئے منادی کر دی جاتی ہے۔ اُس نے بھی بڑے بڑے اُمراء اور سرداروں کو خاص طور پر چٹھیاں بھجوا دیں یا اُن کی طرف آدمی بھیج دئے کہ وہ فلاں دن پہنچ جائیں۔ اور پھر عام منادی بھی کرا دی تا کہ سب لوگ جمع ہو جائیں۔ جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو وہ اُن سے کہنے لگا

فَحَشَرَ فَنَادٰى میں علماء اور عوام ہر دو قسم کے لوگوں کو بلانے کی طرف اشارہ

# فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ۝

اس پر اللہ (تعالیٰ) نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں مبتلا کرنے کے لئے پکڑ لیا ۱۹

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى یعنی تمہارا بڑا رب ہوں مگر یہ شخص تمہارے خلاف منصوبہ بازیاں کرتا رہتا ہے تم سب کو اس کے خلاف اکٹھے ہو جانا چاہیئے۔

**۱۹ حل لغات۔** نَكَال نَكَّلَ سے اسم ہے اور نَكَّلَ بِفُلَانٍ کے معنے ہیں صَنَعَ بِهٖ صَنِيْعًا يَحْذَرُ غَيْرُهٗ اِذَا رَاٰهُ کسی امر کے مرتکب ہونے پر کسی سے ایسا سلوک کیا کہ دوسرا شخص اس سلوک کو دیکھ کر عبرت پکڑے اور وہ ویسے کام کا مرتکب نہ ہو (اقرب) پس اَلنَّكَالُ کے معنے ہیں ایسی سزا جو عبرت دلادے۔

**تفسیر۔** اللہ تعالیٰ نے اُس کو موسیٰ کی پیشگوئی کے ماتحت نکالِ آخرت کے ذریعہ سے تباہ کر دیا۔ یہاں نَكَالَ الْاٰخِرَةِ یا تو مفعول لہٗ ہے اور یا مفعول مطلق ہے کیونکہ نَكَّلَ بِهٖ کے معنے بھی اَخَذَهٗ کے ہی ہوتے ہیں۔ پس اس کے یا تو یہ معنے ہو جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو عذابِ آخرت اور عذابِ اُولیٰ میں مبتلا کرنے کے لئے پکڑا یا بُری طرح پکڑا۔ آخرت کے لحاظ سے بھی اور اُولیٰ کے لحاظ سے بھی۔

یہاں بھی وہی نتیجہ نکالا گیا ہے جو اسلامی غلبہ کی پیشگوئی سے نکالا گیا تھا کہ موسیٰؑ کی جیت سے نہ صرف وہ پیشگوئی پوری ہوگئی جو موسیٰؑ کے غلبہ کے متعلق تھی بلکہ اس پیشگوئی کے ظہور سے قیامت کا ثبوت بھی مل گیا کیونکہ یہ دونوں پیشگوئیاں آپس میں وابستہ و پیوستہ تھیں جب ایک ناممکن بات مخالف حالات کے باوجود پوری ہوگئی تو اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دوسری بات بھی ایک دن پوری ہو جائیگی۔ درحقیقت ہر نبی جو اس دنیا میں آیا ہے اُس کا خدا تعالیٰ پر ایمان پیدا کرنے کے بعد مقدم کام یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں قیامت کے متعلق ایمان اور یقین پیدا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے غلبہ اور اپنی کامیابی کی پیشگوئی کو قیامت کے ساتھ جوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں مخالف حالات کے باوجود ایک دن تم پر غالب آؤں گا اور میرا یہ غلبہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ قیامت کے متعلق میں جو کچھ کہتا ہوں وہ بھی ایک دن پورا ہو جائے گا کیونکہ میرا کام مُردہ روحوں کو زندہ کرنا ہے جو بظاہر حالات بالکل ناممکن دکھائی دیتا ہے اگر یہ زندگی ایک دن پیدا ہو گئی۔ اگر یہ روحانی مُردے ایک دن زندہ ہو گئے اور اگر یہ ناممکن حالات ایک دن ممکن نظر آنے لگے تو تمہیں یقین کر لینا چاہیئے کہ اگلے جہان کی زندگی کے متعلق جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ بھی بالکل صحیح اور درست ہے۔ کیونکہ اگر مُردہ روحیں اس جہان میں زندہ ہو سکتی ہیں تو اگلے جہان میں بھی مُردے زندہ ہو سکتے ہیں۔ اس نظارہ کو دیکھنے کے بعد قیامت پر یقین لانا بالکل آسان ہو جاتا ہے اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس خدا کی قدرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اس جہان میں بعث روحانی کر دے وہ اگلے جہان میں بھی مُردہ کو زندہ کر سکتا ہے۔ پس فرماتا ہے فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو آخرت کے عذاب سے بھی پکڑا اور دنیا کے عذاب سے بھی پکڑا۔ یہاں خدا تعالیٰ نے يَاْخُذُهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُس کو آخرت کے عذاب سے پکڑے گا بلکہ اَخَذَهُ اللّٰهُ فرمایا یعنی اللہ تعالیٰ نے اُسے نکالِ آخرۃ دینے کے لئے پکڑا جس کے معنے درحقیقت یہی ہیں کہ اس عذابِ اُولیٰ نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ مرنے کے بعد زندہ بھی ہوگا اور اُسے آخرت کا عذاب بھی دیا جائے گا۔ ماضی کے لفظ سے قیامت کی موجودگی کی دلیل بیان کی گئی ہے اسی لئے آخرۃ کو پہلے رکھا اور اُولیٰ کو بعد میں رکھا جس میں یہی اشارہ ہے کہ اس عذابِ اُولیٰ نے ثابت کر دیا ہے کہ فرعون زندہ بھی ہوگا اور اُسے عذابِ آخرت میں بھی

نَكَالٌ

فرعون کا موسیٰ علیہ السلام کے مقابل اس دنیا میں عذاب میں گرفتار ہونا اس کے آخرت میں عذاب میں مبتلا ہونے کی ایک دلیل

گرفتار کیا جائے گا۔

گویا بتایا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کی یہ پہلی مثال نہیں کہ تم اسے اتفاق قرار دے دو بلکہ ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ جب بھی خدا تعالےٰ کی طرف سے کوئی نبی آیا ہے ناممکن حالات میں اُس نے غلبہ حاصل کیا ہے غلبہ کے سامان اُسے حاصل نہیں ہوتے۔ طاقت اُس کے پاس نہیں ہوتی۔ مال اُس کے پاس نہیں ہوتا۔ جمعیت اس کے پاس نہیں ہوتی مگر پھر بھی خدا تعالےٰ اُسے غالب کر دیتا ہے اور اس کے ہاتھ سے قوموں کا احیاء کرتا ہے۔ یہ دلیل ہوتی ہے اس بات کی کہ جب مخالف حالات میں اِس جگہ روحانی اِحیاء ہو گیا تو موت کے بعد بھی اِحیاء ہو جائیگا اور اللہ تعالےٰ سب کو زندہ کر دے گا۔ جس خدا نے مردہ دلوں اور مردہ روحوں کو اس جہان میں ناممکن حالات میں زندہ کر دیا کیا وہ خدا یہ طاقت نہیں رکھتا کہ مردہ جسموں کو بظاہر ناممکن حالات میں زندہ کر دے۔

ملے قیامت کے ثبوت کے لئے تین ثبوت

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو آج کل کے مفکّر کیا کرتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ سوال نہایت اہم ہے۔ وہ سوال یہ کیا کرتے ہیں کہ کسی ایک چیز سے دوسری چیز کا نتیجہ نکال لینا منطقی طور پر درست نہیں ہے۔ اگر ہم کسی کے متعلق یہ کہیں کہ وہ بہت بڑا عالم ہے تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکل آئے گا کہ وہ کرسی بھی بنا سکتا ہے یا کوچ بھی تیار کر سکتا ہے؟ وہ کہتے ہیں اگر تم ثابت بھی کر دو کہ خدا تعالیٰ نے بعض غیب کی خبریں دیں اور وہ پوری ہو گئیں تو اس سے اتنا ہی نتیجہ نکلیگا کہ جو خبریں دی گئی تھیں وہ پوری ہو گئیں یہ کس طرح نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قیامت بھی آ جائے گی اِن دو باتوں کا تو آپس میں کوئی جوڑ اور تعلق ہی نہیں ہے۔ اُن کی یہ دلیل واقعہ میں اہم ہے اور جس حد تک وہ بات بیان کرتے ہیں اُس حد تک ہمیں اُسکی صحت تسلیم کرنے سے کوئی انکار نہیں۔ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کسی ایک صفت سے دوسری صفت کا نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا جب تک وہ دونوں آپس میں لازم ملزوم نہ ہوں یا سابق مسبوق کی حیثیت اُن میں نہ پائی جاتی ہو یا سبب اور مسبب کے طور پر وہ دونوں اکٹھی نہ ہوں یعنی یا تو یہ ہو کہ جہاں ایک بات پائی جاتی ہو وہاں لازماً دوسری بات بھی پائی جانی چاہیئے تب بے شک ایک بات کو دوسری بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور یا پھر دونوں باتیں آپس میں ایسی مشابہ ہوں کہ ایک بات کی موجودگی دوسری بات کا یقین دلانے کے لئے بالکل کافی ہو۔ مثلاً یہ کہنا کہ جب ایک شخص عالم ہے تو وہ کرسی بھی بنا سکتا ہے یا کوچ بھی تیار کر سکتا ہے بیشک بیوقوفی ہے کیونکہ ان دونوں باتوں میں ایسی کوئی نسبت نہیں پائی جاتی۔ لیکن اگر ایک شخص ہم کو ایک انگریزی کتاب پڑھ کر سنائے اور ہم اس کے متعلق کہہ دیں کہ وہ دوسری انگریزی کتاب بھی پڑھ سکتا ہے اور وہ آگے سے کہہ دے کہ تم یہ نتیجہ کس طرح نکال سکتے ہو تو سب لوگ ہنس پڑیں گے کہ جب اُس نے ایک انگریزی کتاب کو پڑھ لیا تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ دوسری کتاب بھی پڑھ سکیگا بالکل درست اور طبعی نتیجہ ہے اس میں خلاف عقل کونسی بات ہے۔ یا اگر کوئی شخص اُردو کی کوئی کتاب پڑھ سکتا ہے اور ہم اس کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ وہ دوسری کتاب بھی جو اردو میں ہے پڑھ سکتا ہے تو یہ بالکل جائز ہوگا کیونکہ دونوں چیزوں میں آپس میں ایسی مشابہت پائی جاتی ہے کہ ایک بات کی موجودگی کی وجہ سے دوسری بات کا انکار ہی نہیں ہو سکتا۔

ملے قیامت کیلئے پہلی اور دوسری دلیل یعنی خدا تعالےٰ کی صفت خلق

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قیامت کے مشابہ کون کون سی چیز ہے۔ سو اس بارہ میں سب سے پہلی چیز جو قیامت سے مشابہت رکھتی ہے صفتِ خلق ہے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خدا تعالےٰ خلق کرتا ہے خواہ اُس نے سابق میں خلق کیا ہو یا اب خلق کیا ہو تو بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ جو ہستی ایک دفعہ خلق کر سکتی ہے وہ دوسری دفعہ بھی کر سکتی ہے۔ سوال صرف یہ رہ جائے گا کہ آیا اُس نے کہا بھی ہے یا نہیں کہ میں دوبارہ خلق کروں گا۔ اگر اُس نے کہہ دیا ہو کہ میں دوبارہ بھی خلق کروں گا تو بات ختم ہو جاتی ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ جو خدا ایک دفعہ پیدا کر سکتا ہے وہ دوسری دفعہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ پس اگر ہم ثابت کر دیں کہ خدا تعالیٰ اس جہان میں خلق کرتا ہے تو چونکہ خلق قیامت کے مشابہ چیز ہے اس لئے

یہ دلیل اس بات کو ثابت کریگی کہ قیامت کا عقیدہ بھی درست ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس خلق کے مشابہ کوئی اور خلق ہو جو ویسی ہی مستبعد اور تعجب انگیز ہو جیسے یہ خلق مستبعد اور تعجب انگیز ہے تو جو خدا اس خلق کے مشابہ خلق کر سکیگا اس کے متعلق ہمیں ماننا پڑے گا کہ اگر وہ دعویٰ کرے تو وہ قیامت کے دن بھی ایک نئی خلق پر قدرت رکھتا ہے کیونکہ اُس نے دکھا دیا کہ وہ ویسی ہی خلق اس دنیا میں کر سکتا ہے اور جب اُس نے اپنی قدرت اور طاقت اور جلال کا ثبوت اسی دنیا میں اُس خلق کے مشابہ ایک اَور خلق سے دے دیا ہے تو ہمیں ایمان لانا پڑے گا کہ اتنی بڑی طاقت رکھنے والے خدا نے جب کہا ہے کہ میں اگلے جہان میں بھی ایک خلق کروں گا تو ضرور اُس نے سچ کہا ہے اتنی بڑی طاقت اور قوت رکھنے کے بعد اُسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

تیسری چیز علم تام ہے۔ اگر ثابت ہو جائے کہ خدا تعالےٰ کو علم تام حاصل ہے تب بھی مسئلہ بالکل حل ہو جائے گا کیونکہ جو ہستی کسی چیز کے متعلق علم تام رکھتی ہو وہ اُسے ہر وقت بنا سکتی ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتب میں تحریر فرمایا ہے کہ لوگ پوچھتے ہیں خدا تعالےٰ نے دنیا کس طرح بنائی ہے؟ آپ فرماتے ہیں اگر تمہیں دنیا کی پیدائش کے متعلق علم تام حاصل ہو جائے تو پھر تم میں اور خدا میں فرق کیا رہ جائے۔ پھر تم بھی آسمان اور زمین اور چاند اور سورج اور ستارے بنانے لگ جاؤ۔ جس شخص کو پتہ ہو کہ میز اس طرح بنتا ہے۔ کرسی اس طرح تیار ہوتی ہے۔ ہتھوڑا اس طرح چلایا جاتا ہے۔ تیشے کا اس طرح استعمال کیا جاتا ہے وہ بہر حال میز اور کرسی کو بنائے گا اور اُس کے لئے یہ کام کرنا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ پس اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خدا تعالےٰ کو مخلوق کے متعلق علم تام حاصل ہے تو اس کے بعد یہ کہنا کہ وہ دوبارہ لوگوں کو زندہ نہیں کر سکتا یا دوبارہ انکو پیدا نہیں کر سکتا ایک پاگل پن کی بات ہوگی۔ یہ تین چیزیں ہیں جو قیامت کے ثبوت کے لئے ضروری ہیں اور یہ تینوں چیزیں ملکر قیامت کا ثبوت بنتی ہیں۔ یعنی یا تو یہ ثابت ہو جائے کہ دنیا میں جس قدر مخلوق ہے سب خدا تعالےٰ نے پیدا کی ہے تو پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے گا کہ جو خدا اس جہان میں پیدا کر سکتا ہے وہ اگلے جہان میں بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اور یا پھر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اِسی قسم کا مشابہ اِحیاء اس دنیا میں بھی کیا کرتا ہے۔ جب یہ ثابت ہو جائے گا کہ اللہ تعالےٰ ایک قسم کا اِحیاء اس دنیا میں بھی کیا کرتا ہے تو اگلے جہان کے متعلق بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہاں اللہ تعالےٰ اِحیاء کر سکتا ہے اور پھر تیسری بات یہ ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خدا تعالیٰ کو مخلوق کے متعلق علم تام حاصل ہے تو اس کے بعد بھی قیامت پر ایمان لانا پڑے گا۔ کیونکہ جسے مخلوق کا علم تام حاصل ہو۔ جو اُس کی جزئیات تک سے واقف ہو۔ جو اُس کی باریکیوں سے آگاہ ہو وہ یقیناً دوبارہ بھی مخلوق کو پیدا کر سکتا ہے۔

یہ تین چیزیں ہیں جو مل کر قیامت کا ثبوت بنتی ہیں۔

قیامت کے ثبوت کیلئے تیسری دلیل یعنی خدا تعالیٰ کا علم تام

اور یہی تینوں چیزیں قرآن کریم میں ہمیشہ اکٹھی پیش کی جاتی ہیں تاکہ قیامت کا انکار نہ ہو سکے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ چونکہ خدا تعالےٰ نے فلاں بات کہی تھی اور وہ بات پوری ہو گئی اس لئے قیامت بھی آجائے گی۔ اگر صرف اتنی بات کہی جائے تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ دلیل ناکافی ہوگی۔ یا اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ پیشگوئی کے مطابق فلاں مقدمہ میں فتح ہو گئی یا فلاں شخص کے گھر لڑکا پیدا ہو گیا اس لئے یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ قیامت بھی ہوگی تو تسلیم کریں گے کہ یہ قیامت کی کوئی دلیل نہیں اور یقیناً زید کے گھر لڑکا ہونے یا کسی مقدمہ میں کامیابی حاصل ہو جانے کا منطقی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا ہے کہ قیامت بھی آنیوالی ہے کیونکہ یہ باتیں آپس میں لازم ملزوم نہیں ہیں اور نہ ان کا قیامت سے کوئی براہِ راست تعلق ہے۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ تو بالکل اور ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے مخلوق کو پیدا کیا ہے اور جو خدا ایک دفعہ پیدا کر سکتا ہے وہ دوسری دفعہ بھی کر سکتا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اس اِحیاء کے بالکل مشابہ اس دنیا میں ایک روحانی اِحیاء بھی کیا کرتا ہے پس جو خدا ایک مشابہ خلق کر سکتا ہے وہ اگلے جہان میں بھی نئی خلق پر قدرت رکھتا ہے۔ پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو

علم تام حاصل ہے اور مخلوق کے تمام اسرار کو وہ جانتا ہے۔ اور جب یہ کیفیت ہے تو مخلوق کا پیدا کرنا اس کے لئے کونسا مشکل کام ہے۔ قرآن کریم نے قیامت کے ثبوت میں یہی طریق اختیار کیا ہے۔ بے شک دوسری کتابوں پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ وہ قیامت کا ثبوت پیش نہیں کرتیں مگر قرآن کریم پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم جہاں بھی قیامت کا ذکر کرتا ہے وہاں پہلی خلق کو اس کے ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے چنانچہ سورۂ یٰسٓ میں ہی جب اس سوال کا ذکر کیا گیا کہ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ قُلْ یُحْیِیْھَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَھَآ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُ ۙ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْہُ تُوْقِدُوْنَ ○ اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَھُمْ ؕ بَلٰی ۗ وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ (یٰس ع ۵) یہاں بھی پہلی خلق اور علم تام سے قیامت کا نتیجہ نکالا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو خدا ایک دفعہ پیدا کر سکتا ہے اور کل علم مخلوق کا رکھتا ہے کیا اُس کی طاقت اور قدرت میں یہ بات نہیں کہ وہ دوبارہ بھی پیدا کر دے۔ گویا قیامت کی ایک دلیل اللہ تعالیٰ یہ دیتا ہے کہ وہ کہتا ہے تمہاری آنکھوں کے سامنے مخلوق موجود ہے تم بتاؤ یہ کس نے پیدا کی ہے۔ جب خدا نے اس تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے تو تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا۔

قیامت کی دوسری دلیل کے طور پر اللہ تعالیٰ اُس نشاۃ روحانیہ کو پیش کرتا ہے جو انبیاء کے ذریعہ اس دنیا میں ہوتی ہے اور بتاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مخالف بلکہ ناممکن قرار دینے والے حالات میں مُردہ روحوں کو اس دنیا میں زندہ کر دیتا ہے تو تم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگلے جہان میں بھی وہ زندگی بخش سکتا ہے۔ اُس کے لئے یہ کام ناممکن نہیں ہے۔

تیسری دلیل علم کامل کی ہے۔ علم کامل کے بعد بھی کسی چیز کا بنانا کوئی مشکل امر نہیں رہتا۔ جس شخص کو پتہ ہو کہ حلوا اس طرح بنتا ہے کہ پہلے سُوجی لی جائے پھر اُسے گھی میں بُھونا جائے پھر اُس میں میٹھا ملایا جائے اور پانی ملا کر آگ پر اُسے دم دیا جائے وہ جب چاہیگا حلوا بنا لیگا اُسے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اسی طرح جب خدا تعالیٰ کو مخلوق کے متعلق علم تام حاصل ہے اور وہ کائنات کے تمام اسرار جانتا ہے تو اس کے لئے مُردوں کو زندہ کر دینا کونسا مشکل کام ہے جس نے یہ کام ایک دفعہ کر لیا وہ اُسے دوسری دفعہ بھی کر لیگا۔

غرض یہ تین دلیلیں ہیں جو اللہ تعالیٰ قیامت کے ثبوت میں دیا کرتا ہے اس لئے لوگوں کا یہ اعتراض کرنا کہ ایک غیب کی خبر پوری ہونے سے دوسری خبر کی صداقت کا ہم کس طرح نتیجہ نکال سکتے ہیں صحیح نہیں۔ اگر صرف ایک غیب کی خبر سے دوسری غیب کی خبر کو سچا قرار دیا جاتا تو بے شک یہ اعتراض ہو سکتا مگر ہمارا تو یہ دعویٰ ہی نہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا خلق پر قادر ہونا۔ اُس کا اسی دنیا میں احیاءِ موتٰی کر دینا اور پھر مخلوق کے متعلق علم تام رکھنا یہ قیامت کی دلیل ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ چونکہ لیکھرام پیشگوئی کے مطابق مر گیا اس لئے یہ ثبوت ہو گا اس بات کا کہ قیامت بھی آنے والی ہے یا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے فلاں بیٹے کے متعلق پیشگوئی کی تھی اور وہ پوری ہو گئی ہے اِس لئے یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ قیامت بھی آنے والی ہے۔ ہم قیامت کے ثبوت میں اِن تین باتوں کو پیش کرتے ہیں جن کو تفصیل کے ساتھ میں بیان کر چکا ہوں۔ اِن پیشگوئیوں کے پورا ہونے سے اللہ تعالیٰ کا صرف جزئیات کے متعلق علم ثابت ہوتا ہے علمِ کامل ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب اِحیاءِ موتٰی کی صفت ظاہر ہو تو وہ بے شک قیامت کا ثبوت ہوتی ہے کیونکہ لوگوں کے سامنے ایک نمونہ موجود ہوتا ہے کہ مُردہ روحیں نبی کے فیضِ صحبت اور اُس کی قوتِ قدسیہ سے زندہ ہو گئیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس خدا نے اس دنیا میں مردہ روحوں کو زندہ کر دیا ہے وہ اگلے جہان میں بھی زندہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یا پھر دوسری دلیل خلق کی ہے جو خدا ایک دفعہ مخلوق کو پیدا کر سکتا ہے

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّمَنْ یَّخْشٰی ؕ ءَاَنْتُمْ

یقیناً اس (واقعہ) میں اس کے لئے جو خدا سے ڈرتا ہے ایک بڑی عبرت (کا سامان) ہے ۲۰ کیا تمہیں

ع ۳

اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ۟

پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کو جسے اس (خدا) نے بنایا ہے ۲۱

اس کے لئے یہ کونسی مشکل بات ہے کہ وہ دوبارہ اُسی مخلوق کو پیدا کر دے۔ تیسری چیز علم کامل ہے۔ جس خدا کو تمام کائنات کا علم تام حاصل ہے اور وہ کائنات کے اسرار کو جانتا ہے اس کے لئے بھی مخلوق کا دوبارہ پیدا کرنا کوئی مشکل نہیں غرض یہ تین دلیلیں ہیں جو قرآن کریم قیامت کے ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہے اور جن کو کوئی شخص ردّ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ پس بے شک آج کل تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے جو سوال کیا جاتا ہے وہ درست ہے مگر جہاں تک اُن کا یہ خیال ہے کہ قرآن کریم نے بھی اسی رنگ کو اختیار کیا ہے وہ غلط ہے۔ ہم اس بات سے کلیۃً متفق ہیں کہ بعض پیشگوئیاں یقیناً ایسی ہوتی ہیں جنکو قیامت کے ثبوت کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہم اس امر کے اظہار سے بھی نہیں رہ سکتے کہ جہاں یہ تین باتیں مل جائیں یا ان تین باتوں میں سے کوئی ایک بات ہی بیان کر دی جائے وہاں یقینی اور قطعی طور پر یہ قیامت کی دلیل بن جاتی ہیں کیونکہ یہ تینوں دلیلیں ایسی ہیں جو قیامت کے ساتھ لازم ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے جو بات بھی ثابت ہو جائے وہ قیامت کو ضرور ثابت کر دے گی پس یہ اعتراض جو آج کل کے مفکرین کی طرف سے کیا جاتا ہے بالکل غلط ہے اور قرآن کریم کی حقیقت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

**۲۰ حل لغات**۔ اَلْعِبْرَۃُ کے معنے ہیں (۱) اَلْاَصْلُ الَّذِیْ تُرَدُّ اِلَیْهِ النَّظَائِرُ۔ ایسا اصل جس کی طرف اس کے امثال کو لوٹا کر ان کی حقیقت و اصلیت معلوم کی جا سکے (۲) اَلنَّظَرُ فِی الْاَحْوَالِ۔ حالات میں غور و فکر کر کے اُن کی حقیقت کو پانا (۳) اَلْعِظَۃُ یُتَّعَظُ بِهَا ایسی بات جس سے نصیحت حاصل کی جا سکے (اقرب) اس کی جمع عِبَرٌ آتی ہے۔

**تفسیر**۔ عبرت سے مراد یہ ہے کہ اِس سے اُخروی زندگی کی دلیل لی جا سکتی ہے۔ ایک نہیں متعدد مثالیں ایسی پائی جاتی ہیں کہ اُخروی زندگی کو دنیوی روحانی اِحیاء سے ملا کر خدا تعالےٰ کے انبیاء نے پیش کیا ہے اور ناممکن حالات میں اِحیاء کر کے اُخروی زندگی کا ثبوت دیا ہے پس اگر کوئی شخص خدا تعالےٰ کا خوف اپنے دِل میں رکھتا ہو اور ضد اور تعصب کا مادہ اُس میں نہ ہو تو وہ اِس سے اُخروی زندگی پہ یقین اور ایمان اپنے دل میں پیدا کر سکتا ہے۔ عِبْرَۃٌ عُبُوْرٌ سے نکلا ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو کہتے ہیں پس عِبْرَۃٌ کے معنے ہوتے ہیں ایک بات سے دوسری کا نتیجہ نکالنا۔ گویا وہ پُل کی طرح ایک طرف سے دوسری طرف عبور کا سامان پیدا کر دیتی ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ یہ دلیل بھی ایسی ہے جو انسانی دماغ کو ضرور اس طرف لے جاتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی ایک قیامت ہونے والی ہے۔

عبرۃ سے مراد

**۲۱ تفسیر**۔ فرماتا ہے کیا تمہاری پیدائش زیادہ مشکل اور سخت ہے اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا یا آسمان و زمین کی پیدائش زیادہ مشکل ہے۔

اَلْعِبْرَۃُ

یہاں اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا سے مراد صرف آسمان ہی نہیں جیسا کہ اگلی آیات سے ظاہر ہے کہ ایک طرف تو اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا کہا اور دوسری طرف تشریح کرتے ہوئے اس میں زمین کو بھی شامل کر لیا۔ پس درحقیقت یہاں سماء سے مراد نظامِ سماوی ہے اور

أَمِ السَّمَاءُ بَنٰهَا سے مراد اجرام فلکی

اس کی پیدائش کی اہمیت کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا۔ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا۔ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا۔ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا۔ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا۔ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ۔ گویا جو تشریح کی گئی ہے اُس میں اجرام فلکی۔ بلندی۔ جَو اور زمین وغیرہ سب شامل ہیں۔ پس یہاں سماء سے مراد نظام سماوی ہے خالی وہ سماء مراد نہیں جو زمین کے مقابلہ میں ہوتا ہے بلکہ وہ سماء مراد ہے جس میں زمین بھی شامل ہے۔

فرماتا ہے کارخانۂ عالم جس کا ہم اب ذکر کرنے والے ہیں تم سے بہت زیادہ اہم اور پیچیدہ ہے۔ انسان درحقیقت اپنے متعلق ایک دھوکا کھا جاتا ہے اور وہ یہ کہ بظاہر وہ یہ خیال کرتا ہے کہ نظام عالم اور انسان کو آپس میں مشابہ کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے اور ان میں ایک دوسرے کی دلیل کس طرح بن سکتا ہے۔ انسان تو بڑا عقلمند۔ سمجھدار اور غور و فکر کا ملکہ اپنے اندر رکھنے والا ہے اور سورج چاند وغیرہ میں کوئی سوچ سمجھ نہیں۔ اس طرح وہ خیال کرتا ہے کہ یہ دلیل ایسی ہے جس میں ایک ادنیٰ چیز کو اعلیٰ چیز سے مشابہت دی جاتی ہے اور ادنیٰ چیز کو ثابت کرکے اعلیٰ چیز کے وجود کا استدلال کیا جاتا ہے مگر یہ غلط ہے درحقیقت پیدائشِ عالم کے سلسلہ سے استدلال اعلیٰ سے ادنیٰ کا استدلال ہے نہ کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کا استدلال۔ اس میں استدلال بالاولیٰ ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان کو اپنی ذات کے متعلق یہ دھوکا لگ جاتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے میں بڑا سوچنے والا اور سمجھنے والا اور تدبر کرنے والا انسان ہوں اس لئے اپنی ذات کی ابتداء کی طرف اُس کا ذہن نہیں جاتا۔ انسان اپنے آپ کو مکمل سمجھتا اور دنیا میں خدا تعالیٰ کا قائم مقام سمجھتا ہے اس لئے سبب اور مسبب کی جو دلیل ہے اس کی طرف اپنی پیدائش کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا ذہن نہیں جاتا۔ اسو جہ سے اللہ تعالیٰ ہمیشہ نظام عالم کو اپنی ہستی کے ثبوت میں پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ دیکھو کیا تمہیں اس عظیم الشان نظام سے یہ نظر نہیں آتا کہ اس میں ایک خالق کا ہاتھ کام کر رہا ہے اور ہر ٹکڑہ دوسرے ٹکڑے کا محتاج ہے کوئی چیز اپنی ذات میں منفرد نہیں ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ دنیا اس طرح بنی ہے کہ ذرّے آپس میں جُڑ گئے اور اُن ذرّوں کے آپس میں ملنے سے آہستہ آہستہ یہ عظیم الشان دنیا تیار ہو گئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم نے مان لیا دنیا مختلف ذرّات کے مجموعہ سے بنی ہے مگر اُن ذرّوں کے آپس میں ملنے سے یہ کس طرح ہو گیا کہ ہمیں آج یہاں ضرورت پیش آتی ہے تو میلوں میل پر اُس ضرورت کو پورا کرنے کا سامان موجود ہوتا ہے بیشک ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ ایٹمز ATOMS کے ملنے سے یہ دنیا بنی لیکن اگر اس دنیا کا کوئی خدا نہیں تو یہ کسطرح ہو گیا کہ وہ ذرّے اسی طرح آپس میں ملے جس طرح بنی نوع انسان کو ضرورت تھی اور اُسی جگہ ملے جہاں انسان کو کوئی ضرورت پیش آنے والی تھی۔ ذرّوں کا آپس میں ملنا اتفاق ہو سکتا ہے لیکن اُن ذرّوں کا آپس میں مل کر ہر انسانی ضرورت کو پورا کرنے کا سامان مہیا کر دینا یہ اتفاق نہیں ہو سکتا بلکہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کارخانۂ عالم کے پیچھے کوئی اور ہستی کام کر رہی ہے۔ ہم اگر ایک چمڑا پڑا ہوا دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ چمڑا یہاں اتفاقی طور پر آ گیا لیکن اگر ہمیں ایک بُوٹ دکھائی دیتا ہو جو اس چمڑے سے بنا ہوا ہو۔ پھر ہمیں وہی چمڑا کہیں صوفوں پر لگا ہوا نظر آئے۔ کہیں کرسیوں اور زینوں پر لگا ہوا دکھائی دے تو ان ساری چیزوں کو ہم اتفاق نہیں کہہ سکتے۔ پس نظام کلی اتفاقی نہیں ہوتا جزئی چیز کو بے شک اتفاقی کہا جا سکتا ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں خدا تعالیٰ نے ایک طرف آنکھ بنائی اور اُس آنکھ میں یہ مادہ رکھا کہ وہ بغیر روشنی کے نہیں دیکھ سکتی تو دوسری طرف کروڑوں کروڑ میل پر سورج بنا دیا تاکہ آنکھ اس روشنی کے ذریعہ اردگرد کی چیزوں کو دیکھ سکے۔ اب بھلا اس کو کون اتفاق کہہ سکتا ہے یہی حال اور ضروریاتِ انسانی کا ہے کوئی انسانی ضرورت ایسی نہیں جو طبعی ہو اور اُس کو پورا کرنے کے سامان اللہ تعالیٰ نے پیدا نہ فرمائے ہوں بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کو پورا کرنے کے سامان اللہ تعالیٰ نے انسانی نفس میں ہی رکھ دئے ہیں۔ بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کو پورا کرنے کے سامان اللہ تعالیٰ نے انسان کے اردگرد

رکھ دئے ہیں اور بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کو پورا کرنے کے سامان اللہ تعالےٰ نے کروڑوں کروڑ میل پر پیدا کر دئے ہیں۔ بہرحال ہر انسانی ضرورت کو پورا کرنے کے سامان اللہ تعالےٰ نے اس دنیا میں پیدا کئے ہوئے ہیں اور یہ نظام اپنی ذات میں ایسا مکمل ہے کہ اس ساری تصویر کو ملا کر کوئی شخص یہ خیال تک بھی نہیں کر سکتا کہ یہ سب کچھ اتفاقی ہو گیا ہے۔ پس فرماتا ہے تم اس نظام سماوی اور ارضی کو دیکھو جو خلق میں تمہاری اپنی پیدائش سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ تم کسی ایک چیز کے متعلق کہہ سکتے ہو کہ وہ اتفاقی ہو گئی۔ تم دو کے متعلق کہہ سکتے ہو کہ وہ اتفاقی ہو گئیں لیکن تم اس سارے نظام کو کس طرح اتفاقی کہہ سکتے ہو کہ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا۔ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا۔ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا۔ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا۔ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ نظام کی یہ ساری تصویر جو ہم تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں اس پر غور کرو اور بتاؤ کہ کیا یہ سب چیزیں اتفاقی ہو سکتی ہیں؟ میں سمجھتا ہوں دنیا کے عجیب سے عجیب فلسفہ پر بھی اگر کوئی شخص اپنے علم کی بنیاد رکھتا ہو تو وہ اسے اتفاقی نہیں کہہ سکتا بلکہ اُسے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کارخانۂ عالم کے پیچھے ضرور کوئی اور ہستی کام کر رہی ہے جو تمام ضروریات انسانی کو جانتی اور پھر انکو پورا کرنے کے سامان بھی مہیا کرتی ہے۔

پس فرماتا ہے تم اس نظام پر غور کرو۔ تم اپنے متعلق خیال کر سکتے ہو کہ ہم اپنے آپ خالق ہیں مگر تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نظام کا خالق اور کوئی نہیں۔ اس لئے ہم اپنی خالقیت منوانے کے لئے تمہارے سامنے اسی نظام کو پیش کرتے ہیں تم اس کو اچھی طرح دیکھو اور پھر سوچو کہ کیا تمہارا بھی کوئی خالق ہے یا نہیں۔ گویا ایک نہایت ہی لطیف پیرایہ میں انسان کو اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ کیا گیا۔ اگر انسان کو اپنی ذات کیطرف توجہ دلائی جاتی اور کہا جاتا کہ خدا نے تمہیں زبان دی ہے۔ کان دئے ہیں۔ آنکھیں دی ہیں۔ دل دیا ہے۔ دماغ دیا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ تمہارا کوئی خالق ہے تو وہ انکار کر دیتا اور کہتا اِس کا فلاں سبب ہے اور اُس کا فلاں سبب ہے۔ بیشک ہم گفتگو کرتے ہوئے عام طور پر یہی مثال دیا کرتے ہیں مگر قرآن کریم چونکہ مکمل بات کرتا ہے اس لئے اُس نے کارخانۂ عالم کو اپنی خالقیت کے ثبوت میں پیش کیا ہے کیونکہ دوسری چیز کے متعلق سوچنا اور غور کرنا آسان ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سِرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اپنے متعلق سوچنا اور غور کرنا اُتنا آسان نہیں ہوتا جتنا دوسری چیز کے متعلق غور کرنا آسان ہوتا ہے یہی حکمت ہے جس کی بناء پر قرآن کریم نے بجائے یہ طریق اختیار کرنے کے کہ تم غور کرو خدا نے تمہیں آنکھیں دی ہیں۔ دل دیا ہے۔ دماغ دیا ہے۔ کان دئے ہیں۔ ہاتھ اور پاؤں دئے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ تمہارا کوئی خالق ہے یہ طریق اختیار کیا ہے کہ وہ انسان کے سامنے نظامِ عالم کی گواہی پیش کرتا ہے تاکہ اس کے متعلق سوچنا آسان ہو اور وہ لوگ جو ہستی باری تعالیٰ کے قائل نہیں ٹھنڈے دل سے اِس معاملہ پر غور کر سکیں۔

خدا تعالیٰ کے خالق ہونے پر نظامِ عالم کی شہادت

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات تو بے شک ہے مگر نکلا اسی نظام سے ہے اور وہ اس سارے نظام کا ایک ادنیٰ پُرزہ ہے۔ وہ اشرف ہو گیا ہے اپنی دماغی ترقی کی وجہ سے ورنہ جہاں تک اُس کی پیدائش کا سوال ہے وہ اپنی پیدائش کے لحاظ سے اس سارے نظام کا ایک جُزو اور پُرزہ ہے اور خلقت کے لحاظ سے زمین و آسمان کی پیدائش کے سامنے بالکل غیر اہم ہے۔ پس جہاں تک خلقِ پیدائش کا سوال ہے پیدائشِ عالم زیادہ اہم ہے اور پیدائشِ انسان اُس کے مقابلہ میں بہت حقیر چیز ہے۔ بعد میں کوئی چیز ارتقاء حاصل کر کے بڑی ہو جائے تو اِس سے نفسِ مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ پس چونکہ پیدائشِ عالم پیدائشِ انسانی کی نسبت زیادہ اہم ہے اس لئے اللہ تعالیٰ پیدائشِ عالم کو پیش کر کے بتاتا ہے کہ جس نے اتنا بڑا کارخانہ بنا لیا وہ تم کو کیوں نہیں بنا سکتا۔ یہ دلیل پیش کر کے اللہ تعالےٰ نے ضمنی طور پر

# رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا

(اور اس کی بلندی کو اونچا کیا ہے پھر اُسے بے عیب بنایا ہے ۲۲ھ)

۲ۓ دو آور اہم مسائل کا بھی فیصلہ کر دیا ہے ایک حیات بعد الممات کا اور دوسرے اسی عالم میں اُس احیاء روحانی کا جو انبیاء کے ذریعہ ہوتا ہے۔

پیدائش عالم کا مسئلہ حیات بعد الموت کے لئے ایک دلیل

حیات بعد الممات کا تو اس رنگ میں ثبوت دیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا کارخانۂ عالم بنا دیا ہے جو تمہاری پیدائش سے بھی زیادہ اہم ہے اور جس نظام کا تم بھی ایک جزو ہو تو بہرحال تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ دوسرے عالم میں بھی پیدائش کر سکتا ہے۔ گویا یا تو یہ تسلیم کرو کہ یہ نظام خود بخود ہے اس کے پیچھے کوئی اور ہستی کام نہیں کر رہی اور اگر تم اس نظام کو دیکھ کر اور اس کی باریک در باریک حکمتوں پر غور کر کے یہ ماننے پر مجبور ہو کہ یہ نظام اتفاقی نہیں ہو سکتا بلکہ ایک اور ہستی اس نظام کی خالق ہے تو تمہیں ماننا پڑے گا کہ جس خدا نے ایک دفعہ یہ سب کچھ بنا لیا وہ دوسری دفعہ بھی تم کو بنا سکتا ہے گویا ایک ہی دلیل سے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اپنی ہستی کا ثبوت پیش کر دیا بلکہ حیات بعد الموت کا مسئلہ بھی واضح کر دیا۔ آخر بعض لوگ مرنے کے بعد کسی اور زندگی کے کیوں قائل نہیں؟ اسی لئے کہ وہ خیال کرتے ہیں ایسا کب ہو سکتا ہے کہ مر کر انسان زندہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ بتاتا ہے تم تو اس نظام کا ایک حقیر سا پُرزہ ہو۔ تم غور کرو کہ اتنا بڑا کارخانہ کس نے بنایا ہے۔ تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سب کارخانہ خدا نے بنایا ہے۔ جب خدا نے اس دنیا کو بنایا ہے تو جو خدا اتنا بڑا کارخانہ جاری کر سکتا ہے کیا وہ یہ طاقت نہیں رکھتا کہ دوبارہ تم کو پیدا کر دے۔ گویا جس طرح فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى میں عذابِ دنیا کو عذابِ آخرت کا ثبوت قرار دیا گیا تھا اسی طرح اِس جہان کی پیدائش کو اگلے جہان کی پیدائش کا ثبوت قرار دیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ جو خدا اس جہان میں تمہیں پیدا کر سکتا ہے وہ تمہیں اگلے جہان میں بھی پیدا کر سکتا ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اُس نے دوبارہ پیدا کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے یا نہیں؟ اگر وعدہ کیا ہے تو بات ختم ہو جاتی ہے اور یہ سوال نہیں رہتا کہ وہ کس طرح کرے گا جب اُس نے اِس جہان میں اتنا بڑا نظام پیدا کر کے دکھا دیا ہے تو وہ اگلے جہان میں بھی پیدا کر سکتا ہے اُس کے لئے یہ ناممکن بات نہیں۔ گویا پیدائش عالم کا مسئلہ حیات بعد الموت کا بھی ایک رنگ میں ثبوت ہے۔

اسی طرح یہاں روحانی اِحیاء کا مسئلہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ جس خدا نے تمہاری ادنیٰ ادنیٰ ضرورتوں کو پورا کرنے کا اس قدر سامان کیا ہے کیا اُس خدا کے متعلق تم یہ خیال بھی کر سکتے ہو کہ اُس نے تمہارے روحانی اِحیاء کا کوئی سامان نہیں کیا ہوگا۔ جب تمہارے جسم کی حفاظت کے لئے جو بہرحال ایک دن فنا ہو جانیوالا ہے اللہ تعالیٰ نے اس قدر سامان پیدا کر دیئے ہیں جن میں سے بعض کروڑوں میل پر ہیں تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری روح کی حفاظت کے لئے کیوں سامان نہیں کئے ہوں گے۔ وہ خدا جو عالم کبیر کا نظام ہر جہت سے مکمل رکھتا ہے عالم صغیر کی ضروریات پوری کرنے سے خواہ وہ روحانی ہوں یا جسمانی کس طرح اغماض کر سکتا تھا۔

## ۲۲ھ حل لغات

۲ۓ اَلسَّمْكُ

اَلسَّمْكُ مصدر ہے سَمَكَ کا اور اس کے معنے بلند کرنے یا بلند ہونے کے ہوتے ہیں اور سَمْكٌ اسم بھی ہے اس صورت میں اس کے معنے چھت کے یا چھت سے تہ زمین تک کے فاصلہ کے ہوتے ہیں اور اس کے معنے کسی چیز کی اونچائی کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) کہتے ہیں سَنَامٌ سَامِكٌ۔ اونٹ کا اونچا کوہان (تاج) اور موٹاپے کو بھی کہتے ہیں کہتے ہیں سَمَكَ الْمَنَارَةِ یعنی منارہ کی گولائی (اقرب) گویا اس کے معنوں میں دو چیزیں پائی جاتی ہیں یا تو فاصلہ ہو اور وہ چیز بہت اونچی ہو اور یا پھر خود وہ چیز نفس میں اونچی ہو یا دَل میں موٹی ہو۔ ابن جزی کہتے ہیں اَلسَّمْكُ غِلَظُ السَّمَاءِ وَهُوَ الْاِرْتِفَاعُ الَّذِيْ بَيْنَ سَطْحِ السَّفْلِ الْاَسْفَلِ

اَلَّذِی یَلِیْنَا وَ سَطْحُهَا الْاَعْلَی اَلَّذِیْ یَلِیْ مَا فَوْقَهَا یعنی سَمْك کے معنے آسمان کا دَل ہے اور اس سے مراد آسمان کی وہ بلندی ہے جو آسمان کی نچلی سطح اور اوپر کی سطح کے درمیان ہے (فتح البیان) اس کے معنوں میں ایک اختلاف بھی ہے اور وہ یہ کہ بعض لُغت والے کہتے ہیں سَمْكٌ کا لفظ خالی بلندی کی طرف اشارہ نہیں کرتا بلکہ اعلیٰ سے اسفل کی طرف جانے کو سَمْكٌ کہتے ہیں۔ اقرب والے نے بھی یہی لکھا ہے کہ مِنْ اَعْلَی الْبَیْتِ اِلٰی اَسْفَلِهٖ لیکن بعض دوسرے ادیب اس کے خلاف نیچے سے اوپر کے معنے کرتے ہیں صاحب کشاف لکھتے ہیں رَفَعَ سَمْکَهَا اَیْ جَعَلَ مِقْدَارَ ذِهَابِهَا فِیْ سَمْتِ الْعُلُوِّ مَدِیْدًا رَفِیْعًا۔ یعنی نیچے سے اوپر تک اس کا دَل لمبا اور اونچا ہے۔ پس سَمْكٌ نام ہے نیچے سے اوپر کی طرف جانے کا گویا مِنْ اَعْلَی الْبَیْتِ اِلٰی اَسْفَلِهٖ کی بجائے مِنْ اَسْفَلِ الْبَیْتِ اِلٰی اَعْلَاهُ کو سَمْكٌ کہتے ہیں۔ بعض ادیب اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اعلیٰ سے اسفل کی طرف نسبت بتانے کے لئے عربی زبان میں عُمْق کا لفظ پایا جاتا ہے چنانچہ جب عُمْق کا لفظ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد اوپر سے نیچے کی نسبت ہی ہوتی ہے لیکن جب ہم سَمْك کہتے ہیں تو اس سے مراد نیچے سے اوپر کی طرف جانا ہوتا ہے مگر قرآن کریم سَمْك کا لفظ بیان کرنے کے بعد نیچے سے اوپر کی طرف جانے کی بجائے اُوپر سے نیچے کی طرف آیا ہے چنانچہ آسمان کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے اَغْطَشَ لَیْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا۔ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰهَا وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا۔ مَتَاعًا لَّکُمْ وَ لِاَنْعَامِکُمْ۔ یہاں بلندی کی چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے پہلے بیان کیا ہے اور زمین کی چیزوں کو بعد میں بیان کیا ہے۔ پس قرآنی ترتیب کے مطابق ان لوگوں کے معنے زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں جو کہ سَمْك اوپر سے نیچے کی طرف نسبت رکھنے کو کہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ درحقیقت یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہو۔

فَسَوّٰىهَا۔ پھر ہم نے اُس کو بے عیب بنایا ۔ کہتے ہیں سَوَّی الشَّیْءَ: جَعَلَهٗ سَوِیًّا اَیْ لَا دَآءَ بِهٖ وَ لَا عَیْبَ (اقرب) کسی چیز کو ایسا بنایا کہ اس میں کوئی عیب نہ رہے۔

**تفسیر**۔ فرماتا ہے اگر تم نظامِ عالم پر نظر دوڑاؤ تو تمہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ ساری چیزیں نامکمل رہتیں اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلندیاں نہ بنائی جاتیں۔ یہاں بلندیوں نے زمین کے نقائص اور اُس کے عیوب کو ڈھانک دیا ہے اور تمام چیزیں ایک مکمل صورت میں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند اور ستارے اور دوسرے بڑے بڑے ستارے نہ بنا تا تو زمین کا قیام بالکل ناممکن ہوتا۔ درحقیقت سورج چاند اور ستاروں کی کشش کی وجہ سے ہی زمین رہنے کے قابل ہوئی ہے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلندی پر ان اجرامِ فلکی کو پیدا نہ کیا جاتا تو وہی زمین جو آج تمہیں بے عیب دکھائی دیتی ہے وہی زمین جو تمہارے کھانے کا سامان پیدا کرتی ہے۔ وہی زمین جو تمہارے لئے پینے کا سامان مہیا کرتی ہے۔ اُسی زمین میں تمہیں سَو سَو خرابیاں نظر آتیں بلکہ درحقیقت یہ زمین بنی نوعِ انسان کے رہنے کے قابل نہ ہوتی۔ آسمان ہی ہے جس نے زمین کے عیوب کو ڈھانکا۔ اور وہی بلندیاں ہیں جن سے دن پیدا ہوا جس میں تم کسبِ معاش کے ذرائع اختیار کرتے ہو۔ اور انہی بلندیوں کے نتیجہ میں رات پیدا ہوئی جس میں تم آرام کرتے ہو اور اپنی کھوئی ہوئی طاقتوں کو دوبارہ حاصل کرتے ہو پس اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے آسمان بنایا اور اُس آسمان کو بلندی کی نسبت وسیع کیا۔

فَسَوّٰىهَا میں فاء نتیجہ اور ترتیب کے لئے ہے مراد یہ ہے کہ اُس نے بلندی کو بہت اونچا کیا اور پھر اُسے اُونچا کر کے اُس کے نتیجہ میں زمین کو بے عیب بنایا۔ گویا فَسَوّٰىهَا کی فاء اس مضمون کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ دنیا کا نظام کبھی مکمل نہ ہوتا اگر اس کے اوپر ایک اور نظام قائم نہ ہوتا۔

اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کا بے عیب ہونا بھی اُس کی بلندی اور وصول الی اللہ سے تعلق رکھتا ہے۔ دنیا میں خواہ بڑے بڑے صنّاع ہوں، بڑے بڑے انجنیئر ہوں۔ بڑے بڑے مہندس ہوں یہ دنیا یوں معلوم ہوتی ہے

# وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ○

اور اس کی رات کو (تو) تاریک بنایا ہے اور اس کی دوپہر کو (روشن کرکے) نکالا ہے ۵۲۳

جیسے وحشیوں سے بھری ہوئی ہے نہ انہیں اخلاق کا خیال ہوتا ہے نہ انہیں روحانیت کیطرف توجہ ہوتی ہے نہ انہیں خدا تعالیٰ کی محبت کا احساس ہوتا ہے وہ مادی دنیا اور اس کے لذائذ کی طرف اسی طرح جھکے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح جانور کھانے پینے کی طرف متوجہ رہتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء آتے ہیں تو پھر وہی دنیا جو وحشت و بربریت کا منظر پیش کر رہی ہوتی ہے حسین صورت میں نظر آنے لگتی ہے۔ دلوں میں اخلاص پیدا ہو جاتا ہے۔ آنکھوں میں محبت کی چمک ظاہر ہونے لگتی ہے۔ وہ دل جو کبھی خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے اب انہیں بھی محبت کی ٹیسیں اٹھنی شروع ہو جاتی ہیں اور دنیا رہنے کے قابل نظر آنے لگتی ہے۔ اُس وقت وہی فلسفی جو خدا سے دُور ہوتا ہے

انسان کا بے عیب ہونا اس کی بلندی اور وصول الی اللہ سے تعلق رکھتا ہے۔

انبیاء کے نور کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے بڑے بڑے انجنیئر اور صناع اور موجد جن کی طاقتیں ضائع ہو رہی ہوتی ہیں پھر صحیح راستوں پر چلنے لگ جاتے ہیں اور اُن کے سارے عیب اور اُن کی ساری کمزوریاں جاتی رہتی ہیں پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر تم دنیا کو بے عیب دیکھنا چاہتے ہو تو آسمان کی ضرورت سے کبھی انکار مت کرو۔ جس طرح عالمِ کبیر میں کوئی زمین آسمان کے بغیر نہیں رہ سکتی اسی طرح

اَغْطَشَ لَيْلَهَا میں لَيْلَهَا کی ضمیر کا مرجع

عالمِ صغیر کا حُسن اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتا جب تک آسمان سے وحی نازل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا کلام نازل نہ ہو اور انبیاء اس کے حسن کو نمایاں کرنے والے مبعوث نہ ہوں اگر تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ خدا تعالیٰ نے زمین کے قیام کے لئے آسمان بنایا اور آسمان کے قیام کے نتیجہ میں ہی زمین بے عیب بنی تو پھر تمہیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کا الہام بھی ضروری ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے کلام نہ اُترے اگر اس کی طرف سے انبیاء مبعوث نہ ہوں تو پھر دنیا میں عیب ہی عیب نظر آئیں۔ کمزوریاں ہی کمزوریاں دکھائی دیں۔

گناہ ہی گناہ چھائے رہیں۔ خدا تعالیٰ کا تازہ کلام اور اُس کے انبیاء کی بعثت ہی ہے جو دنیا کے عیوب کو ڈھانکتی ہے اور جس کے بعد وہ ایک حسین صورت میں دکھائی دینے لگتی ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تفصیل بتائی ہے کہ اُس نے کس طرح تسویہ کیا اور اس کے کیا کیا نتائج ظاہر ہوئے۔

**۵۲۳ تفسیر۔** اَغْطَشَ لَيْلَهَا۔ خدا نے اسکی رات کو تاریک بنایا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا اور اس کے دن کو نکالا یا اُس کی دھوپ یا دوپہر کو ظاہر کیا۔ یہ مراد نہیں کہ ایک چیز کو اُس نے دوسری شکل دے دی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کی رات اندھیری ہے اور اُس کا دن روشن ہے۔ اَغْطَشَ لَيْلَهَا میں هَا کی ضمیر آسمان کی طرف پھیری گئی ہے اور ضُحٰی میں بھی ضمیر اُسی کی طرف لوٹائی گئی ہے۔ حالانکہ زمین پر رات سورج کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے آتی ہے آسمان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے وہ رات ہماری رات ہوتی ہے آسمان کی رات نہیں ہوتی۔ اسی طرح ضُحٰی بھی ہماری ہوتی ہے آسمان کی نہیں ہوتی۔ پس یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں ضمیریں آسمان کی طرف کیوں پھیری گئی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند چونکہ آسمان کا حصہ ہیں اور رات ہمیشہ سورج کے غروب ہونے سے آتی ہے جو بلندی پر واقعہ ہے اس لئے لَيْل کو سماء کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ رات آسمان پر آتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ رات جو اس نظام کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اس نظام کا کام دنیا کو روشنی پہنچانا ہے مگر جب دنیا سورج کے سامنے نہیں ہوتی تو روشنی نہیں آسکتی اور اندھیرا چھا جاتا ہے۔ پس رات کو آسمان کی طرف اس لئے منسوب کیا گیا ہے کہ یہ رات نظامِ سماوی سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح ہم ضُحٰی کو ضُحَى السَّمَآءِ بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہماری ضُحٰی بھی نظامِ سماوی سے تعلق رکھتی ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ سماء سے مراد کوئی مادی شئے نہیں بلکہ بالائی جوف ہے اس لئے رات اور دن اس کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں۔

فرماتا ہے رات اور دن میں سے ایک کو ہم نے تاریک بنایا ہے اور دوسرے کو روشن بنایا ہے۔ اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ رات گمنامی کا زمانہ ہوتا ہے جس میں انسانی طاقتیں پوشیدہ رہتی ہیں اور اُن طاقتوں کا ظہور اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک دن کی روشنی رات کی ظلمت کو دور نہیں کر دیتی۔ اسی طرح جب تک نبی کا ظہور نہ ہو لوگوں کی قابلیتیں مخفی رہتی ہیں ان کی استعدادوں کا ظہور نہیں ہوتا وہ خواہ طبعی طور پر اپنے اندر بعض اوصاف رکھتے ہوں اُن سے دنیا ناواقف رہتی ہے جب تک نبوت کا سورج ان کی حقیقت کو ظاہر نہیں کر دیتا اور ان کی چھپی ہوئی استعدادوں کو اُبھار نہیں دیتا۔ یہ ایک قانون ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عالمِ روحانی اور عالمِ جسمانی دونوں میں کام کرتا دکھائی دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسی قانون کا اس جگہ ذکر کرتے ہوئے اہلِ عرب کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے تم اپنے متعلق یہ خیال کرتے ہو کہ تمہارے اندر بہت بڑی قابلیتیں پائی جاتی ہیں تم بہادری میں یکتا ہو۔ تم سخاوت میں نامور ہو۔ تم پابندیٔ عہد میں ایک نمایاں خصوصیت اپنے اندر رکھتے ہو لیکن تمہیں علم ہونا چاہیئے کہ جب تک نبی نہیں آتا اُس وقت تک ان طاقتوں کا مکمل ظہور نہیں ہو سکتا۔ نبی کے آنے سے پہلے بیشک قوم میں یہ استعدادیں موجود ہوتی ہیں مگر لوگوں کا دائرہ عمل نہایت محدود ہوتا ہے۔ اور بوجہ اس کے کہ کوئی نظام اُن میں نہیں ہوتا ان خوبیوں سے اجتماعی طور پر قوم کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا لیکن جب نبی آجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُس کے ذریعہ ایک نیا نظام قائم فرماتا ہے تو اس وقت افراد قوم کی استعدادیں اُبھرنی شروع ہو جاتی ہیں اور ہر شخص کا وصف نمایاں ہو کر قوم کے سامنے آنا شروع ہو جاتا ہے۔ سخاوت وہ پہلے بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ بہادری وہ پہلے بھی دکھا رہے ہوتے ہیں۔ مہمان نوازی کا وصف اُن میں پہلے بھی موجود ہوتا ہے۔ پابندیٔ عہد کی عادت اُن میں پہلے بھی پائی جاتی ہے مگر ان کا دائرہ ایسا محدود ہوتا ہے کہ دنیا کی نگاہ ان خوبیوں کی طرف نہیں اُٹھتی۔ مگر جب انبیاء کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایک نیا نظام قائم کر دیتا ہے اور تمام لوگوں کو ایک سلک میں منسلک کر دیتا ہے تو پھر ہر ایک کی قابلیت نمایاں طور پر دنیا کے سامنے آجاتی ہے اور اُسے اس امر کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ یہ لوگ اپنے اندر ترقی کی حیرت انگیز قابلیت رکھتے ہیں۔ اُس وقت اُنکی سخاوت بھی ایک تنظیم میں آجاتی ہے۔ اُن کی جرأت اور بہادری کی رُوح بھی منظم رنگ میں ظاہر ہوتی ہے اور اُن کی ذاتی اور اخلاقی خوبیاں بھی قوم کے لئے ایک نمونہ قرار پا جاتی ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ خوبیاں لوگوں میں پہلے بھی موجود ہوتی ہیں مگر اُس وقت رات کی ظلمت نے ان خوبیوں پر پردہ ڈالا ہوا ہوتا ہے جب دن چڑھتا ہے۔ جب نبوت کا سورج اُن پر طلوع کرتا ہے تو ہر شخص کی آنکھ ان کی طرف اُٹھنی شروع ہو جاتی ہے۔ اُن کی وہی خوبیاں جو پہلے کسی کو نظر نہیں آتی تھیں اب ہر ایک کو دکھائی دینے لگتی ہیں اور تحسین و آفرین کی آوازیں ان کے متعلق سنائی دینے لگتی ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو۔ تاریخی شہادت اس امر پر موجود ہے کہ عربوں میں بہادری کی روح پہلے بھی پائی جاتی تھی۔ کفر کی حالت میں بھی وہ نڈر تھے۔ وہ دلیر اور بہادر تھے۔ مگر ان کا یہ وصف دنیا کی نگاہوں سے بالکل اوجھل تھا۔ عرب کے لوگ بے شک اپنے اس ذاتی جوہر سے آگاہ ہوں مگر دنیا کا اَور کونسا ملک تھا جو عربوں کی اس بہادری سے واقف تھا؟ پس بے شک عربوں میں بہادری تھی مگر رات کی ظلمت نے اُن کی اس خوبی کو ڈھانکا ہوا تھا جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نور کی روشنی اُن پر پڑی تو جیسے پالش زنگ کو چمکا دیتی ہے اسی طرح ان کا رنگ چمک گیا۔ اُن کی بہادری کی رُوح اُبھری اور ایسے جوش اور ایسی شان سے اُبھری کہ آج دنیا کی تاریخیں عربوں کی بہادری کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ اسی طرح سخاوت کو لو۔ اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ عربوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی سخاوت کی روح موجود تھی مگر اسلام کے ظہور نے اہلِ عرب کو یہ سبق دیا کہ

وہ اِحتساباً اس خُلق سے کام لیں اور اللہ تعالیٰ کی رضاء اور اُس کی محبت کے حصول کے لئے سخاوت کیا کریں۔

پھر دوسرا فائدہ اہلِ عرب کو یہ ہُوا کہ گو پہلے بھی سخاوت کی روح اُن میں موجود تھی مگر دنیا اُن کی اس خوبی سے ناواقف تھی اسلام کی روشنی جب اُن کے چہرہ پر پڑی۔ جب اُس آفتاب نے رات کی ظلمت کا پردہ چاک کر دیا تو دنیا پر اہل عرب کی سخاوت کا ایسا شہرہ ہُوا کہ آج تک اُن کی سخاوت کی داستانیں اوراقِ تاریخ پر نظر آتی ہیں۔

۲۷۱
آنحضرت صلعم کی بعثت کا اثر اہل عرب کی عادات پر

اسی طرح انسانی اخلاق میں سے ایک نمایاں خُلق پابندیٔ عہد ہے جس پر اسلام نے خاص طور پر زور دیا ہے مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ عربوں میں اسلام سے پہلے بھی یہ خوبی موجود تھی۔ فرق تھا تو یہ کہ اُن کی اس خوبی کو جِلا حاصل نہیں تھی اسلام کا ظہور اُن کی اس خوبی کو نمایاں کرنے کا موجب بن گیا۔ اسلام سے قبل ہر شخص اس وصف کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھتا تھا قومی معاملات میں اس کی پروا نہیں کی جاتی تھی مگر اسلام نے ذاتی اور قومی ہر دو امور میں پابندیٔ عہد کو ایک ضروری امر قرار دیا۔ اور اس کی خلاف ورزی کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب بتایا۔ اسی طرح جب اسلام کا سورج چڑھا تو اہلِ عرب کو مزید فائدہ یہ ہُوا کہ اُن کے اس حُسن کی طرف دنیا کی توجہ کھنچ گئی۔ جس طرح رات کو کچھ پتہ نہیں لگتا کہ خوبصورت چیز کونسی ہے اور بدصورت کونسی۔ لیکن جب دن چڑھتا ہے تو حسن والے کا حُسن نمایاں ہو جاتا ہے اور نقص والے کا نقص نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بیشک اہل عرب میں یہ خوبی موجود تھی مگر اسلام نے اُن کی اس خوبی کو ایسی جِلا بخشی کہ تاریخیں اہل عرب کی پابندیٔ عہد کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔

ہم بچے تھے کہ ہمیں انگریزی ریڈروں میں یہ واقعہ پڑھایا جاتا کہ سپین میں ایک یوسف نامی تاجر گذرا ہے ایک دفعہ اُس کے لڑکے کو کسی شخص نے قتل کر دیا اور پھر وہ قاتل بھاگ کر اُسی مقتول کے باپ کے پاس گیا اور کہنے لگا مجھے پناہ دو اُسے علم نہیں تھا کہ میں اُسی کے لڑکے کو قتل کر کے آرہا ہوں اور یوسف کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا لڑکا اسی کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے مگر جب اُس نے کہا کہ مجھے پناہ دی جائے سپاہی میرے تعاقب میں آرہے ہیں تو یوسف نے کہا بہت اچھا اور یہ کہکر اُس نے اُسے اپنے ایک کمرہ میں چھپا دیا۔ تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ سپاہی اُس کے بیٹے کی لاش اٹھائے وہاں آنکلے اور انہوں نے کہا کہ ابھی ابھی ایک شخص نے تمہارے اس بیٹے کو قتل کر دیا ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ قاتل بھاگ کر اسی طرف آیا ہے کیا تمہیں اس کا کچھ پتہ ہے؟ یوسف تاجر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اُس کا بیٹا قتل ہو چکا ہے اور اُس وقت اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ شخص جو میرے پاس پناہ کے لئے آیا ہے وہی میرے بیٹے کا قاتل ہے مگر عہد کی خلاف ورزی کو اُس نے برداشت نہ کیا اور اُس نے سپاہیوں کو کچھ ایسا جواب دیا کہ وہ مایوس ہو کر وہاں سے چلے گئے اور انہوں نے سمجھا کہ قاتل کسی اور طرف بھاگ گیا ہے۔ جب سپاہی چلے گئے تو اُس نے اپنے پچھواڑے کا دروازہ کھولا اور قاتل سے کہا کہ سپاہی چلے گئے ہیں تم اب بھاگ جاؤ۔

یہ پابندیٔ عہد کا ایسا شاندار نمونہ ہے کہ یوروپین لوگوں کو سارے یورپ میں اس قسم کی کوئی مثال نظر نہیں آئی اور اسلام سے شدید دشمنی رکھنے کے باوجود وہ اس بات پر مجبور ہوئے ہیں کہ اس واقعہ کو پیش کریں چنانچہ وفائے عہد کی مثال میں یہ قصہ اب تک اُن کی کتابوں میں لکھا ہُوا ہے حالانکہ یہ ایک مسلمان کا واقعہ ہے۔

پس گو یہ چیز پہلے بھی عربوں میں پائی جاتی تھی اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ مگر اسلام کے آنے پر وہ حُسن بہت نمایاں ہو گیا اور دوسرے اس سے پہلے وہ خوبی اس طرح ظاہر نہ ہوتی تھی کہ دنیا کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ سکے مگر جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی روشنی اُن پر پڑی تو اُن کا حُسن دنیا کے سامنے آگیا اور جس طرح سورج کی روشنی کے بعد کوئی چیز مخفی نہیں رہ سکتی اسی طرح اُن کی مخفی قابلیتیں اُبھرنی شروع ہو گئیں اور لوگوں کی نظریں اُن پر جم گئیں۔ پس اللہ تعالیٰ اہل عرب کو

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا ۝

اور اس کے ساتھ (یعنی اسی زمانہ میں) زمین کو بھی بچھایا ہے    پھر (اس میں سے) اس کا پانی اور اس کا چارہ نکالا ہے۔

وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ۝

اور پہاڑوں کو بھی اس نے اس میں گاڑا ہے ۵۲۴

توجہ دلاتا ہے اور فرماتا ہے ہم نے دن بنایا تمہارے اندر فطری طور پر بعض قابلیتیں پائی جاتی ہیں مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ان قابلیتوں کے ظہور کے لئے دن کی روشنی بھی ضروری ہے اگر تم اس روشنی میں نہیں رہوگے تو تمہاری قابلیتیں دنیا کی نگاہ سے بالکل مخفی رہیں گی لیکن اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور تم پر پڑنے لگا تو یہ روشنی تمہاری استعدادوں کو ایسی جلا بخشے گی کہ ہر شخص کی نگاہ تمہاری طرف اٹھنے لگے گی اور باہر کی اقوام بھی تمہارے حسن کو دیکھنے لگیں گی۔

## ۵۲۴ حل لغات۔

بَعْد:۔ یہ قَبْل کے مقابل معنے ادا کرنے کے لئے لایا جاتا ہے اور کبھی اس کے معنے مَعَ (یعنی ساتھ) کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) پس وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا کے دونوں معنے ہوسکیں گے (۱) زمین کو اس کے بعد بچھایا (۲) زمین کو اس کے بننے کے ساتھ ساتھ ہی بچھایا

دَحٰی کے معنے ہوتے ہیں بَسَطَ یعنی اس نے پھیلایا (اقرب) دَحَی الْاَرْضَ۔ اَوْسَعَهَا۔ زمین کو وسیع بنایا (لسان)

**تفسیر**۔ یہاں بَعْدَ ذٰلِكَ کے دونوں معنے ہوسکتے ہیں بعد کے بھی اور ساتھ کے بھی۔ یعنی یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ نظام شمسی کے بعد زمین کو پھیلایا گیا اور یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ نظام شمسی کے ساتھ ہی زمین کو پھیلانے کا کام کیا گیا۔ زیادہ صحیح معنے یہاں ساتھ کے ہی ہیں کہ ہم نے زمین کو اس نظام شمسی کے بنانے کے ساتھ ہی بچھایا۔

یہاں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نظام شمسی کے پیدا ہونے پر زمین کو پھیلایا گیا ہے۔ پھیلانے سے یہ مراد نہیں کہ اسے بستر کے طور پر پھیلایا گیا بلکہ یہ مراد ہے کہ اس کے بعد زمین رہنے کے قابل ہوئی۔ جہاں تک جیالوجی کا تعلق ہے گو ہم اس کے پابند نہیں مگر اس کی تحقیق قرآن کریم کی اس آیت کی پوری طرح تصدیق کرتی ہے۔ علم طبقات الارض کے ماہرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پہلے زمین میں شدید گرمی تھی گرمی کے ابخرات سے پانی بنا اور پھر لاوا نکل نکل کر پہاڑوں کی صورت میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ یہ لازمی بات ہے کہ جب زمین میں سے کچھ مادہ نکل کر ایک بلند پہاڑ کی شکل اختیار کرے گا تو دوسری طرف سے زمین نیچے دھنس جائے گی چنانچہ زلزلوں سے ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک طرف سے زمین اوپر کو نکل کر آتی ہے اور دوسری طرف سے زمین نیچے چلی جاتی ہے۔ جب زمین کا گرم مادہ نکل کر ایک طرف اونچا ہوگیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دوسری طرف گڑھا پڑ جاتا۔ چنانچہ جوں جوں پہاڑ بنتے چلے گئے زمین کا ایک حصہ نیچے کی طرف دبتا چلا گیا اور چونکہ پانی ہمیشہ ڈھلوان کی طرف جاتا ہے اس لئے جب زمین کا ایک حصہ نیچا ہوگیا تو پانی وہاں جمع ہوکر سمندر بن گیا۔ سمندر درحقیقت قائم مقام ہیں اس مادہ کے جو زمین میں سے نکلا اور پہاڑوں کی شکل اختیار کرگیا۔ جب ایک طرف پہاڑ بلند ہوگئے اور دوسری طرف پانی سمٹ کر نیچے کی طرف چلا گیا تو زمین کی سطح ہموار ہوگئی اور وہ انسانی آبادی کے قابل بن گئی۔ مگر بہرحال یہ ایک قیاسی بات ہے ممکن ہے بعد میں کوئی اور تحقیقات اس کو غلط ثابت کردے۔ اسی طرح زمین کی پیدائش کے متعلق سائنس والوں کا نظریہ یہ ہے کہ زمین اور دوسرے اجرام نظام شمسی ایک کرہ کے جو ابھی ٹھوس نہ ہوا تھا حصہ تھے جو اس کی تیز گردش کی وجہ سے اس سے کٹ کر الگ ہوگئے۔

بَعْد

دَحٰی

۲۱۱
زمین کے پھیلائے جانے کے دو معنے

# مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝

(یہ سب کچھ) تمہارے اور تمہارے جانوروں کے فائدہ کیلئے (اس نے کیا ہے) ۲۵

وہ کہتے ہیں جس طرح بچے بعض دفعہ آٹا لے کر زور سے گھماتے ہیں اور اس کے ٹکڑے اِدھر اُدھر جا پڑتے ہیں اسی طرح اس نیم سیّال کرہ نے جب تیز گردش کی تو اُس کے ٹکڑے اڑکر اِدھر اُدھر جا پڑے اور وہ سرد ہو کر مختلف کرّوں کی شکل اختیار کر گئے۔ بہرحال نظامِ شمسی کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات بھی پیدا کئے جن سے یہ زمین رہائش کے قابل ہوئی۔ اگر نظامِ شمسی نہ ہوتا تو زمین کا قیام بھی نہ ہوتا۔ اسی طرح نظامِ جسمانی بھی نظامِ شمسی روحانی کے قیام کے بعد قابلِ قدر ہوتا ہے۔ جس طرح نظامِ ارضی میں نظامِ شمسی کا وجود نہایت ضروری ہے اگر وہ نظام نہ ہوتا تو نہ پہاڑ بنتے نہ گڑھے پیدا ہوتے نہ سمندر تیار ہوتے۔ نہ انسان اس میں رہائش اختیار نہ کر سکتے۔ اسی طرح جب تک نظامِ شمسی روحانی قائم نہ ہو جو انسان کے اندرونی آتش فشاں مادوں کو نکال کر باہر پھینک دے اور اس کی طبیعت میں یکسانیت پیدا کر دے اس وقت تک نظامِ جسمانی بھی اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ نظامِ شمسی روحانی ہی ہے جو ایک طرف غصہ کو دباتا ہے دوسری طرف انتہائی نرمی اور بے حیائی سے بچاتا ہے اور اس طرح اعتدال کی تعلیم دے کر اُسے بنی نوع انسان کے لئے مفید اور کارآمد وجود بناتا ہے گویا جس طرح زمین کے لاوا کو اللہ تعالیٰ پہاڑوں کی صورت میں زمین سے باہر نکال دیتا ہے اسی طرح مذہب ایک طرف انسان کے غضب اور جوش اور انتقام کی رُوح کو بعض پابندیوں کے نیچے لا کر ٹھنڈا کرتا ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ آگ بالکل ختم ہو جائے اور گرمی کا مادہ بالکل نہ رہے چنانچہ وُہ ایسی تعلیم بھی دیتا ہے جو بے حیائیوں سے بچانے والی بے غیرتیوں سے محفوظ رکھنے والی اور سستی اور کاہلی سے نفرت دلانے والی ہوتی ہے جب ہر قسم کے خراب مادے دور ہو جاتے ہیں اور جب ہر قسم کے نیک مادے فطرتِ انسانی میں پیدا ہو جاتے ہیں تب یہ نظامِ جسمانی قابلِ قدر ہوتا ہے اگر اس نظام پر ایک روحانی آسمان نہ ہو اور اگر یہ نظامِ روحانی ایک طرف انسان کے حیوانی جذبات کو نہ دبائے اور دوسری طرف سستی اور غفلت کے جذبات کو دُور نہ کرے تو یہ نظام اپنے اندر کسی قسم کی جاذبیت اور کشش نہیں رکھ سکتا۔ یہ آسمانی نظام ہی ہے جس کے بعد روحانی غذا اور شرب کے سامان پیدا ہوتے ہیں اور پہاڑوں کی طرح زمین کو قائم رکھنے والے وجود پیدا ہوتے ہیں۔

اَنْعَام

**۲۵ حل لغات۔** اَنْعَام: نَعَمٌ کی جمع ہے اور اَلنَّعَمُ کے معنے ہیں اَلْاِبِلُ وَالشَّاءُ وَقِیْلَ خَاصٌّ بِالْاِبِلِ یعنی نَعَم کا لفظ اونٹ اور بکریوں پر بولا جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ لفظ صرف اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔ اور کتاب مصباح میں لکھا ہے اَلنَّعَمُ: اَلْمَالُ الرَّاعِیْ وَھُوَ جَمْعٌ لَا وَاحِدَ لَهٗ مِنْ لَفْظِهٖ وَاَكْثَرُ مَا يَقَعُ عَلَى الْاِبِلِ کہ نَعَم تمام چرنے والے جانوروں کو کہتے ہیں ہاں کثرت سے اس لفظ کا استعمال اونٹوں کے لئے ہی کرتے ہیں اور لفظ نَعَم جمع ہے اس کے مادہ (ن ع م) سے اس کا کوئی مفرد نہیں (جیسے عربی میں نِسْوَۃٌ کا لفظ ہے جس کے معنے عورتوں کے ہیں اس کا مفرد اس کے مادہ سے نہیں آتا بلکہ مفرد کے لئے اِمْرَاَۃٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے)

بعض ائمہ لغت کا قول ہے کہ نَعَم کا لفظ اونٹوں کیلئے خاص ہے لیکن اَنْعَام میں اونٹ۔ بھیڑ۔ گائے سبھی شامل ہیں پھر لکھتے ہیں کہ اَنْعَام کا لفظ بھیڑ۔ اونٹ اور گائے کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے لیکن اگر اونٹوں کو ان سے علیحدہ کیا جائے تو اونٹوں کے لئے نَعَم کا لفظ بولا جائے گا مگر صرف گائے بھیڑ بکریوں کو نَعَم نہیں کہیں گے (اقرب)

**تفسیر۔** نظامِ عالم کو پیش کر کے اس جگہ جسمانی طور پر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ یہ نظام نہ صرف تمہارے فائدہ کے لئے ہے بلکہ تمہارے چوپاؤں کا بھی اس نظام میں خیال رکھا گیا ہے

# فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝ۖ

پس جب وہ بڑی آفت آئے گی۔ ۵۲۶

اور اُن کی رہائش اور حیات کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی اُن کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہیا کیا گیا ہے۔ اس جسمانی نظام کو پیش کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہمارا یہ طریق صرف اس ظاہری نظام میں ہی نہیں بلکہ روحانی عالم میں بھی جانوروں کا خیال رکھا جاتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں اس مضمون پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے اور مومنوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ہر ایک کو اُس کا حق ادا کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات ع۱) کہ مومن کے اموال میں سائل اور محروم دونوں کا حق ہے ان کا بھی جو مانگ سکتے ہیں اور ان کا بھی جو مانگ نہیں سکتے۔ جیسے کم گو اور گری ہوئی اقوام یا جانور وغیرہ ہیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں بھی اس امر کا خیال رکھنے کی تاکید فرمائی ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں ایک عورت کو محض اس لئے جنت میں داخل کیا گیا کہ اُس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا (مسلم جلد ثانی باب فضل سقی البھائم) اسی طرح آپ نے فرمایا ہے جانوروں پر رحم کیا کرو کیونکہ خدا نے ان کو تمہارے سپرد کیا ہے تو روحانی تعلیم صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ جانوروں کیلئے بھی امن پیدا کرتی ہے جسمانی نظام میں بھی خدا تعالیٰ کے نظام کے ماتحت ہی جانور پلتے ہیں۔ اس مادی عالم میں غلہ انسانوں کے کام آتا ہے اور بھوسہ جانوروں کے کام آتا ہے۔ مجھے ہمیشہ خیال آتا ہے کہ اگر غلہ ہی غلہ پیدا ہوتا تو لوگ جانوروں کو بھوکا مار دیتے مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو دیکھو کہ اُس نے آدمی کا پیٹ چھوٹا بنایا اور جانور کا بڑا بنایا۔ دوسری طرف اسی مناسبت سے غلہ تھوڑا ہوتا ہے اور بھوسہ بہت زیادہ ہوتا ہے اگر غلہ ہی غلہ ہوتا تو سب کچھ انسان کھا جاتے اور جانور بھوکے مر جاتے۔ یہی روحانی نظام کی کیفیت ہے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی نظام قائم نہ کیا جاتا تو بڑے بڑے لوگ ساری دنیا کے حقوق دبا کر بیٹھ رہتے اور غریبوں کو لوٹ لیتے۔ جیسے آج کل ہو رہا ہے کہ جرمنی چاہتا ہے کہ ساری دنیا کی دولت میں کھینچ لوں۔ انگلستان اور امریکہ والے چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاتھوں میں سب دنیا کی دولت ہو وہ دوسروں کو اُن کے حقوق تو دیتے ہیں مگر اپنا ساتھی یا دوست ہونے کی وجہ سے دیتے ہیں انسان ہونے کی حیثیت سے نہیں دیتے مگر اللہ تعالیٰ جس نظام کو قائم کرتا ہے اس میں چھوٹے بڑے۔ امیر غریب ماتحت اور افسر سب کے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے اور ہر ایک کو اُس کا جائز حق دلایا جاتا ہے۔

جسمانی اور روحانی نظاموں میں چوپایوں کی ضرورت کا امر

۲۱۱

## ۵۲۶ حل لغات

اَلطَّآمَّۃُ:۔ طَمَّ سے ہے اور طَمَّ السَّمَآءُ کے معنے ہوتے ہیں غَمَرَ یعنی کسی چیز کو پانی نے ڈھانپ لیا۔ طَمَّ فُلَانٌ اَلْاِنَاءَ کے معنے ہوتے ہیں مَلَأَہٗ اُس نے برتن کو پانی سے بھر دیا۔ طَمَّ الشَّیْءُ کے معنے ہوتے ہیں عَلَا وَغَلَبَ وہ چیز اونچی ہوگئی اور غالب آگئی۔ اور طَمَّ الْاَمْرُ کے معنے ہوتے ہیں تَفَاخَمَ وہ کام بہت زیادہ اور عظیم الشان صورت اختیار کر گیا (اقرب)

اَلطَّآمَّۃُ: اَلدَّاهِیَۃُ تَغْلِبُ مَاسِوَاهَا قِیْلَ لَهَا ذٰلِکَ لِاَنَّهَا تَطِمُّ کُلَّ شَیْءٍ اَیْ تَعْلُوْهُ وَ تُغَطِّیْهِ یعنی طَآمَّۃ اس سخت مصیبت کو کہتے ہیں جو باقی تمام مصیبتوں پر غالب آجائے اور جس کی وجہ سے اور تمام مصیبتیں انسان کو بھول جائیں۔ (اقرب)

۲

اَلطَّآمَّۃ

**تفسیر**۔ یہاں خدا تعالیٰ نے احیاء روحانی اور بعث بعد الموت کے متعلق ایک اور دلیل پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ جو خدا اس دنیا میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کر سکتا ہے جو کسی انسانی قیاس اور واہمہ میں بھی نہیں آسکتا تھا وہ تمہیں مرنے کے بعد کیوں زندہ نہیں کر سکتا یا کیوں تم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکال لیتے کہ اسلام کے غلبہ کے متعلق جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ بھی بالکل صحیح اور درست ہے۔

# يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝

جس دن انسان اپنے کئے کو یاد کرے گا ۲۷؎

پہلے فرمایا تھا فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ۔ کہ ایک دن اچانک ہم کفار کو میدانِ جنگ کی طرف ہنکا کرلے جائیں گے اور یہ سب کے سب وہاں ننگے ہو جائیں گے اس میں جنگِ بدر کی طرف اشارہ تھا اور بتایا گیا تھا کہ ابھی تو تمہیں ایک ہی دھکا لگا ہے۔ آگے آگے دیکھو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ کے مطابق پے درپے کئی جنگیں ہوئیں اور رادفہ کے بعد رادفہ آئی۔ اب فرماتا ہے ان متواتر اور مسلسل جنگوں کے بعد ایک طامۃ کبریٰ کا دن آنے والا ہے۔ اس طامۃ کبریٰ سے مراد فتح مکہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب وہ طامۃ کبریٰ آئے گی تو اُس دن تمہیں اپنے اعمال کی حقیقت خوب اچھی طرح معلوم ہو جائے گی۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہاں دنیا کے عذاب کا ہی ذکر ہو رہا ہے اگلے جہان کی قیامت اس سے مراد نہیں۔ کیونکہ یہ وہ عذاب ہیں جن کے آہستہ آہستہ آنے کا ذکر ہو رہا ہے کہ پہلے یوں ہوگا۔ پھر یوں ہوگا اور پھر طامۃ کبریٰ کا دن آئے گا۔ مگر اُخروی قیامت تو وہ ہے جو اچانک آجائے گی پس یہاں راجفہ اور رادفہ اور طامۃ کبریٰ وغیرہ سے مراد وہ عذاب ہیں جو کفار پر آنے والے تھے۔ چنانچہ پہلے بدر کی جنگ ہوئی اور پھر رادفہ کے بعد رادفہ آئی اور آخر مکہ فتح ہوا اور اسلام کا غلبہ ہو گیا۔

طامۃ کبریٰ سے مراد اس دنیا کا عذاب

اگر ان آیات کو اگلے جہان پر چسپاں کیا جائے تو پھر ہم یہ معنے کریں گے کہ مضمون کو یہاں دہرایا گیا ہے اور مختلف عذابوں کے نزول کے بعد فیصلے کا جو آخری دن آنے والا تھا اور جس میں عذاب نے اپنے کمال کو پہنچ جانا تھا اُس کو طامۃ کبریٰ قرار دیا گیا ہے لیکن بہرحال پہلا اشارہ دنیوی عذابوں کی طرف ہی ہے۔

۲۷؎ **تفسیر** - جس دن انسان یاد کرے گا اُس کو جو اُس نے کوشش کی تھی یعنی انسان کو اپنے اعمال نظر کے سامنے رکھتے ہوئے یاد آجائے گا کہ اُس نے یہ کچھ کیا تھا اور اُسے یہ کچھ کرنا چاہیئے تھا۔ جب بھی انسان کے کسی بُرے فعل کا کوئی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اب مجھے اُس کام کی وجہ سے سزا ملنے لگی ہے تو اُس وقت اُس کے دل میں یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں فلاں وقت یوں کرتا تو یوں ہو جاتا۔ اگر اس طرح کام کرنے کی بجائے اُس طرح کرتا تو اور نتیجہ نکلتا۔ یہ بات انسانی فطرت میں داخل ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی انسانی فطرت کا اس جگہ نقشہ کھینچا ہے۔

طامۃ کبریٰ کے آنے کا وقت

میں سمجھتا ہوں دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آسکتا جو اپنے کاموں کے اچھے یا بُرے نتیجہ کے وقت یہ سوچتا نہ ہو کہ اگر میں اس طرح کرتا تو یہ نتیجہ نکلتا۔ بچوں کو دیکھ لو جب وہ امتحان میں فیل ہو جائیں تو وہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر ہم کھیل کود میں اپنے دن ضائع نہ کرتے تو کبھی فیل نہ ہوتے اور اگر پاس ہو جائیں تو پھر وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم فلاں فلاں کھیل میں اپنا وقت ضائع نہ کرتے تو موجودہ نمبروں سے بہت زیادہ نمبر حاصل کرتے۔ غرض آخری نتیجہ کے وقت انسان ضرور اپنے گذشتہ اعمال پر نظر دوڑاتا اور اُن کو یاد کر کے سوچتا ہے۔ اگر اُسے ناکامی ہو تو وہ حسرت کرتا ہے کہ میں نے کیوں ایسے کام کئے جن سے مجھے ناکامی ہوئی۔ اور اگر اُسے کامیابی ہو تو پھر وہ یہ سوچنے لگ جاتا ہے کہ اگر میں اس سے بھی زیادہ کام کرتا تو نتیجہ اور بھی شاندار نکلتا اللہ تعالیٰ اسی انسانی فطرت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس جگہ فرماتا ہے کہ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى۔ اسلام اور کفر کا آخری فیصلہ جب فتح مکہ کے دن ہوگا تو اُس دن انسان اپنے کاموں کو یاد کرے گا اور جیسا جیسا کسی نے اسلام سے سلوک کیا ہوگا وہ اُس کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیگا۔

فتح مکہ کے بعد کفار و مشرکین کے دل میں کس طرح بار بار یہ خیال آتا ہوگا کہ اگر ہم رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مخالفت نہ کرتے تو کیا اچھا ہوتا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے مکہ میں داخلہ کے وقت یہ اعلان کیا ہوگا کہ جو شخص اپنے گھر کے
دروازے بند کر کے اندر بیٹھا رہے گا اُسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔
اُس وقت وہ لوگ جو مسلمانوں کو بڑی بڑی سخت اذیتیں پہنچایا
کرتے تھے کس طرح اندر گھروں میں بیٹھے ہوئے سوچتے ہوں گے
کہ اگر ہم اسلام کی مخالفت نہ کرتے تو آج ہم بھی گھوڑے دوڑاتے
ہوئے مکہ کی گلیوں میں پھر رہے ہوتے اور مکانوں کے اندر چھپ کر
نہ بیٹھے ہوتے۔

حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے ایام میں ایک دفعہ حج کرنے کے
لئے مکہ میں آئے تو مکہ کے بڑے بڑے رؤساء آپ کے ملنے کے لئے
گئے۔ خاندانی لحاظ سے حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ سے بڑے تھے اور
مکہ میں اُن کا خاندان بہت مشہور تھا جب آپ حج کے لئے آئے تو مکہ
کے رؤساء نے سمجھا کہ اب چونکہ ایسا شخص خلیفہ ہے جو ہمارے خاندانوں
کی عظمت سے خوب واقف ہے اس لئے اب ہمارا خاص طور پر اعزاز
کیا جائے گا اور ہماری خاندانی روایات کو قائم رکھا جائے گا۔
چنانچہ وہ حضرت عمرؓ سے ملنے کے لئے آئے اور آپ نے اُن سے
باتیں شروع کر دیں۔ وہ ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک حبشی
اور غلام مسلمان جس کو قریش کے بڑے بڑے سردار مکہ کی گلیوں میں
گھسیٹا کرتے تھے آپہنچا اور اُس نے حضرت عمرؓ کو السلام علیکم
کہا۔ حضرت عمرؓ رؤساء مکہ سے کہنے لگے ان کو ذرا جگہ دے دو۔
اور خود پیچھے ہٹ جاؤ چنانچہ وہ پیچھے ہٹ گئے اور حضرت عمرؓ
نے اُن سے باتیں شروع کر دیں۔ اتنے میں ایک دوسرا مسلمان
سابق غلام آگیا۔ پھر تیسرا اور پھر چوتھا آیا۔ خدا تعالیٰ کی
قدرت ہے کہ یکے بعد دیگرے سات مسلمان جو کسی زمانہ میں کفار مکہ
کے غلام ہوا کرتے تھے آپہنچے۔ شاید اللہ تعالیٰ اس ذریعہ سے
اُن کو سبق دینا چاہتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک جب مکان میں
داخل ہوتا تو حضرت عمرؓ اُن سے فرماتے ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور انکو
بیٹھنے کے لئے جگہ دو۔ چنانچہ ہر مسلمان غلام کے آنے پر وہ پیچھے
ہٹتے چلے گئے یہاں تک کہ جوتیوں میں جا پہنچے اور تھوڑی دیر
کے بعد وہاں سے اُٹھ کر باہر آگئے۔ باہر نکل کر انہوں نے ایک
دوسرے سے کہا کہ کچھ دیکھا آج ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے
اور مجلس میں ہماری کتنی بڑی ذلت کی گئی ہے۔ ہم وہ ہیں جو بادشاہوں
کے درباروں میں بھی عزت کی جگہ حاصل کرتے تھے مگر آج ایک ایک
حبشی غلام کو جو ہمارے باپ دادا کی خدمتیں کیا کرتے تھے ہمارے
مقابلہ میں عزت دی گئی اور ہمیں ہر دفعہ پیچھے ہٹایا گیا یہاں تک کہ
ہم جوتیوں میں جا بیٹھے۔ یہ کتنی بڑی ذلت ہے جو آج ہماری ہوئی
ہے۔ اِس پر اُنہی میں سے ایک شخص جو زیادہ سمجھدار تھا بولا
کہ تم جو کچھ کہتے ہو ٹھیک ہے مگر تم یہ بھی تو سوچو کہ اس میں
کس کا قصور ہے عمرؓ کا قصور ہے یا ہمارا اپنا قصور ہے؟
جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دعویٰ فرمایا تو اُس وقت
یہی حبشی غلام تھے جو آپ پر ایمان لائے مگر ہمارے باپ دادا
نے آپ کی مخالفت کی اور شدید مخالفت کی۔ پس اگر اُن کو زیادہ عزت
سے بٹھایا گیا ہے اور ہمیں ان کے آنے پر پیچھے ہٹایا گیا ہے تو یہ بالکل درست
ہوا ہے وہ اسی بات کے مستحق تھے کہ انکو عزت کا مقام دیا جاتا اور ہم اس
بات کے مستحق تھے کہ ہمکو پیچھے ہٹایا جاتا کیونکہ ہمارے باپ دادا نے اسلام کی مخالفت
کی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے محروم رہے۔
انہوں نے کہا یہ تو درست ہے مگر کیا اس ذلت کو دور کرنے کا
کوئی ذریعہ نہیں۔ اور کیا ایسا کوئی طریق نہیں ہے جس سے اس
رسوائی کا ازالہ ہو سکے؟ آخر سب نے سوچنے کے بعد فیصلہ کیا کہ
ہمیں تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی چلو حضرت عمرؓ سے ہی دریافت
کریں کہ اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ حضرت عمرؓ کے
پاس آئے اُس وقت تک مجلس برخاست ہو چکی تھی اور دوسرے
لوگ واپس جا چکے تھے۔ وہ السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے اور انہوں
نے حضرت عمرؓ سے کہا آج ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ آپ نے
دیکھ لیا ہم اُسی کے متعلق کچھ کہنے کیلئے حاضر ہوئے ہیں۔ حضرت عمرؓ
نے فرمایا میں معذرت کرتا ہوں کیونکہ میرے لئے سخت مجبوری تھی۔
یہ وہ لوگ تھے جن کا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ادب کیا کرتے تھے
اور جن کا ادب میرا آقا کرتا رہا میرا بھی فرض ہے کہ میں اُن کا لحاظ
کروں اور اُنہیں دوسروں پر ترجیح دوں مجھے افسوس ہے کہ اس
سے آپ کو تکلیف ہوئی مگر میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ
نہیں تھا۔ انہوں نے کہا ہم سمجھ گئے ہیں کہ آپ نے جو کچھ کیا درست کیا

# وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ○

اور جہنم اس کے لئے جو اُسے دیکھے گا ظاہر کر دی جائے گی ۵۲۵

ہم صرف یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اس ذلّت کو دُور کرنے کا کوئی طریق نہیں؟ اگر کوئی علاج ہو تو بتایا جائے کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ یہ ذلّت کا داغ ہم پر رہے۔

وہ رؤسا جو حضرت عمرؓ کے پاس آئے تھے اُن میں سے کسی کا باپ حضرت عمرؓ کا دوست تھا کسی کے چچا سے اُن کے تعلقات تھے۔ کوئی اُن سے رشتہ داری کے تعلقات رکھتا تھا اور کسی سے اُنہیں ذاتی طور پر اُنس اور تعلق تھا۔ حضرت عمرؓ جانتے تھے کہ ان کا خاندانی لحاظ سے کس قدر شہرہ تھا۔ کس قدر رُعب اور شوکت یہ لوگ رکھتے تھے اور کس طرح مسلمانوں کو تحقیر کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ جب انہی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے حضرت عمرؓ سے یہ کہا کہ ہمیں کوئی ایسا طریق بتایا جائے جس سے یہ ذلّت کا داغ ہم سے دُور ہو جائے تو حضرت عمرؓ کو اُن کی پُرانی حشمت یاد آ گئی اور اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور غلبۂ رقّت کی وجہ سے وہ کوئی جواب نہ دے سکے صرف انہوں نے انگلی اٹھائی اور شام کی طرف اشارہ کر دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ادھر اسلام کی فتح کے لئے ایک جنگ ہو رہی ہے اگر تم اس ذلّت کے داغ کو دور کرنا چاہتے ہو تو جاؤ اس جنگ میں شامل ہو کر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دو۔ وہ اس جواب کو سمجھ گئے چنانچہ وہ وہاں سے اٹھے اور بغیر اس کے کہ اپنے گھروں کو واپس جاتے سب کے سب شام کی طرف چلے گئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ پھر اُن میں سے ایک شخص بھی زندہ واپس نہ آیا بلکہ سب کے سب اسی جگہ شہید ہو گئے۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى۔ اس دن ہر انسان سوچے گا کہ وہ کیا کچھ کرتا رہا ہے صحابہؓ نے بھی جب ان ترقیات اور انعامات کو دیکھا ہو گا تو اُن کے دلوں میں بار بار یہ خیال آتا ہو گا کہ کاش ہم زیادہ قربانیاں کرتے۔ کاش ہم زیادہ اپنے اخلاص کا ثبوت دیتے۔ وہی قربانیاں جن کو وہ پہلے بڑا سمجھا کرتے تھے۔ وہی چندے جن کو وہ پہلے غیر معمولی قرار دیا کرتے تھے۔ انہی قربانیوں اور انہی چندوں کے متعلق اُن کو خیال آتا ہو گا کہ ہم نے تو کچھ بھی نہ کیا کاش ہم اس سے زیادہ قربانیاں کرتے اور زیادہ انعامات حاصل کرتے اسی طرح کفار کے دل میں حسرت پیدا ہوتی ہو گی کہ کاش ہم اسلام کی مخالفت نہ کرتے اور ان ترقیات میں ہم بھی حصہ دار بنتے۔ پس يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى کا یہ مطلب ہے کہ اُس دن ہر انسان کہیگا کہ کاش میں نے جو فلاں کام کیا ہے میں نہ کرتا یا کاش میں نے جو کچھ کیا ہے اس سے بڑھ کر کام کرتا۔ قیامت کی صورت میں اس کی مراد ہو گی کہ دنیا کے اعمال کو یاد کر کے انسان حسرت کریگا کہ کاش میں ایسا نہ کرتا۔ یا خوش ہو گا کہ میں نے بہت اچھا کیا۔

جَحِیْم

**۵۲۵ حل لغات۔** جَحِیْم۔ جَحَمَ میں سے ہے۔ جَحَمَ النَّارَ کے معنے ہیں اَوْقَدَهَا۔ آگ کو جلایا اور اَلْجَحِيْمُ کے معنے ہیں اَلنَّارُ الشَّدِيْدَةُ التَّاَجُّجِ۔ سخت بھڑکنے والی آگ۔ اَلْمَكَانُ الشَّدِيْدُ الْحَرِّ۔ سخت گرمی والی جگہ۔ كُلُّ نَارٍ عَظِيْمَةٍ فِيْ مَهْوَاةٍ۔ ہر بڑی آگ جو گہری جگہ میں جل رہی ہو۔ اِسْمٌ مِّنْ اَسْمَآءِ جَهَنَّمَ۔ نیز جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے (اقرب)

**تفسیر۔** لِمَنْ يَّرٰى اصل میں لِمَنْ يَّرَاهُ ہے یعنی جہنم اس شخص کے قریب کی جائے گی جو اس کو دیکھیگا۔ اس کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ بینا ہی جہنم کا عذاب پائے گا اندھا شخص جہنم میں داخل نہیں کیا جائے گا اور جب اس کا یہ مفہوم نہیں تو لازماً ہمیں کوئی اور مفہوم لینا پڑے گا۔ میرے نزدیک وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى کے دو معنے ہیں۔

اوّل یہ کہ جہنم اس کے قریب کی جائیگی جس نے اُسے دیکھنا ہے یعنی اس میں پڑنے کا مستحق ہے۔ مومن اُسے دیکھیں گے بھی نہیں۔ آخر جو جہنم کفار کو نظر آ رہی تھی وہ صحابہؓ کو کس طرح

نظر آسکتی تھی وہ اسی میں اپنے لئے جنت دیکھ رہے تھے. گویا ایک ہی فعل کے نتیجہ میں کفار کو جہنم نظر آرہی تھی اور مومن اپنے لئے جنت دیکھ رہے تھے. صحابہؓ جب گھوڑے دوڑاتے ہوئے مکہ میں پھرتے ہونگے تو انہیں اس جہنم کا خیال بھی کس طرح آسکتا تھا جس میں کفار مبتلا تھے۔ واقعہ ایک ہی تھا مگر کفار کے لئے وہ دوزخ بنا ہُوا تھا اور صحابہؓ کیلئے جنت بن رہا تھا پس اس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ دوزخ اُسی شخص کے قریب کی جائیگی جو اس میں پڑنے کا مستحق ہے دوسرا شخص اُس دوزخ کو نہیں دیکھ سکیگا۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ لِمَنْ يَّرٰى سے مراد قلبی رویت ہے. ظاہری چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے مثلاً آگ ہے جب جل رہی ہو تو کسی شخص کے اندر بصیرت کا مادہ ہو یا نہ ہو وہ اُسے دیکھے گا لیکن روحانی جہنم بسا اوقات موجود تو ہوتی ہے مگر نظر نہیں آتی۔ پس اس صورت میں دنیوی لحاظ کر لِمَنْ يَّرٰى کے یہ معنے ہونگے کہ جہنم جس کی آنکھیں ہوں گی اُسے نظر آجائے گی اور جس کی آنکھیں نہیں ہوں گی اُسے نظر نہیں آئیگی کیونکہ یہ وہ جہنم ہے جس کے دیکھنے کے لئے بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے گویا اس رویت سے مراد ظاہری رویت نہیں بلکہ قلبی رویت ہوگی. مثلاً جب اللہ تعالےٰ اپنے انبیاء کو بھیجتا ہے تو اُن کے آنے پر ایمان لانے والے آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہو جاتے ہیں اور انکار کرنے والے آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اب جس کی بصیرت ہوتی ہے وہ تو جانتا ہے کہ ایک قوم کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی تائید کا ہاتھ کام کرتا نظر آتا ہے اور دوسری قوم اس کی نصرت و مدد سے محروم ہو رہی ہے مگر جسے بصیرتِ روحانی حاصل نہیں ہوتی وہ کہہ دیتا ہے کہ یہ بھی کوئی بڑی بات ہے دنیا میں ہمیشہ قومیں گھٹتی بڑھتی ہیں یہ کوئی معجزہ نہیں کہ ایک قوم بڑھ رہی ہے اور دوسری گھٹ رہی ہے۔ گویا ایک قوم کو نظر آرہا ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ جہنم کی طرف جا رہے ہیں مگر انہیں اپنا جہنم نظر ہی نہیں آتا۔ اسی طرح یہاں بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى میں دیکھنے سے مراد قلبی رویت بھی لی جا سکتی ہے کہ جس کے اندر بصیرت پائی جاتی ہوگی صرف وہ اس جہنم کو قبل از وقت دیکھ سکے گا۔

چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق تاریخوں میں ذکر آتا ہے کہ آپ جب مکہ فتح کرنے کے لئے تشریف لائے تو اس وقت آپ نے صحابہؓ کو خاص طور پر ہدایت دے دی کہ اس موقعہ پر اپنی کسی شان کا اظہار نہیں کرنا. بلکہ جب ایک مسلمان افسر نے کہا کہ آج ہم مکہ کی حرمت کو چاک کر کے رکھ دینگے اور ان کفار کو بتا دیں گے کہ انہوں نے ہم پر جو مظالم کئے تھے اُن کا کیا انجام نکلا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فوراً اُسے اپنے عہدہ سے برطرف کر دیا اور اس کے بیٹے کو اس کی جگہ مقرر کر دیا (سیرت نبویہ جلد ۲ مصنفہ احمد زینی) اسکی یہی وجہ تھی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم دیکھ رہے تھے کہ آج کفار کیلئے جو جہنم پیدا ہوگئی ہے وہ اُن کی طاقتِ برداشت سے بالکل باہر ہے اور آپ چاہتے تھے کہ اُن کی تکلیف کو جتنا بھی ہو سکے کم کیا جائے چنانچہ آپ نے حکم دیدیا کہ جو لوگ اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ جائیں گے انکو کچھ نہیں کہا جائیگا۔ اس میں بھی دراصل یہی حکمت تھی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اگر کفار اپنے گھروں سے باہر نکلے اور انہوں نے مسلمانوں کے ایک عظیم الشان لشکر کو مکہ کی گلیوں میں پھرتے دیکھا تو انکو سخت تکلیف ہوگی پس آپ نے چاہا کہ ان کے اس عذاب کو جس قدر ہلکا کیا جا سکے ہلکا کر دیا جائے۔ اسی لئے آپ نے یہ احکام دئے۔ ان معنوں کے لحاظ سے لِمَنْ يَّرٰى میں مومن بھی شامل ہیں لیکن پہلے معنوں کے لحاظ سے لِمَنْ يَّرٰى میں صرف کافر ہی شامل ہیں۔

درحقیقت رویت کئی قسم کی ہوتی ہے ایک رویت جسمانی ہوتی ہے۔ ایک رویت حسّی ہوتی ہے۔ ایک رویت عرفانی ہوتی ہے۔ ایک رویت علمی ہوتی ہے۔ ایک رویت قلبی ہوتی ہے۔ رویتِ حسّی یا رویتِ جسمانی کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ صرف کافر ہی اس جہنم کو دیکھے گا کیونکہ وہی اس میں پڑنے کا مستحق ہے۔ اور رویتِ عرفانی یا رویتِ قلبی کے لحاظ سے مومن بھی اس رویت میں شامل ہوگا اور اُسے کفار کے اس دُکھ اور عذاب کا علم ہوگا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى کے یہ معنے بھی ہیں کہ جہنم اس شخص کے لئے ظاہر کر دی جائیگی

فَاَمَّا مَنْ طَغٰىۙ۝ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَاۙ۝ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ

پس جس نے سرکشی اختیار کی اور ورلی زندگی کو (آخرت پر) ترجیح دی تو یقیناً جہنم (ہی)

هِيَ الْمَاْوٰىؕ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى

اس کا ٹھکانا ہے ۲۹؎ اور جس نے اپنے رب کے درجہ سے خوف کیا اور (اپنے) نفس

النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰىۙ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰىؕ۝

کو گری ہوئی خواہشوں سے روکا تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے ۳۰؎

یا اُس شخص کو دکھا دی جائے گی جو اُسے دیکھنے کا مستحق ہے پس اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دنیوی دوزخ کا ہی ذکر ہو رہا ہے کیونکہ اگلا دوزخ تو ہر ایک کو نظر آجائے گا اُس میں ایسی کسی شرط کی ضرورت نہیں ہے۔

اَلْمَاْوٰی

**۲۹؎ حل لغات۔** اَلْمَاْوٰی۔ اِسْمٌ لِلْمَکَانِ الَّذِیْ یَاْوِیْ اِلَیْهِ۔ پناہ لینے کی جگہ (مفردات)

**تفسیر:** پس وہ جس نے سرکشی کی اور ورلی زندگی کو اختیار کیا۔ اُخروی زندگی کا اُس نے کوئی خیال نہ رکھا وہ اُس دن کو دیکھ لیگا جب جہنم اُس کا ٹھکانہ ہوگی۔ هِيَ الْمَاْوٰی سے مراد هِيَ الْمَاْوٰی لَهٗ ہے کہ جہنم اُس کا مَاْوٰی یعنی ٹھکانہ ہوگی۔

**۳۰؎ تفسیر:** خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ کے دو معنے ہیں یہ بھی معنے ہیں کہ وہ اپنے رب کی شان اور رُتبہ سے ڈرتا ہے اور یہ معنے بھی ہیں کہ وہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے۔ گویا مَقَامَ رَبِّهٖ کے معنے مَقَامَهٗ اَمَامَ رَبِّهٖ کے بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتے کہ وہ اُس کی شان اور عظمت کا خوف رکھتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو انسان کو گناہ سے بچاتی ہیں۔ خدا تعالےٰ کی شان اور عظمت کا خوف اعلیٰ مقام رکھنے والے مومن کو گناہوں سے بچاتا ہے اور مجرم کے طور پر اُس کے سامنے پیش ہونے کا خوف ادنیٰ درجہ کے انسان کیلئے نجات کا موجب ہوتا ہے۔ بڑا مجرم تو کسی بات کی بھی پروا نہیں کرتا لیکن چھوٹا مجرم ڈرتا ہے کہ اگر وہ اسی جرم کی حالت میں خدا تعالیٰ کے سامنے پیش ہُوا تو اُس کو کیا جواب دے گا۔ لیکن بڑا مومن خدا تعالےٰ کے درجہ اور اُس کی شان کو دیکھ کر ڈرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اور بھی ترقی کرنی چاہیئے میرا رب چھوٹے مقام پر رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ وہ یہی چاہتا ہے کہ اس کا بندہ اُس کی محبت اور قرب کے مراتب میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرے۔

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی۔ هَوٰی کے معنے ہوا و ہوس اور خواہشاتِ نفسانی کے بھی ہوتے ہیں اور هَوٰی کے معنے گرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ خدا تعالےٰ چونکہ بلند ہے اور ہوا و ہوس کی پیروی انسان کو نیچے کی طرف لے جاتی ہے اس لئے جو شخص خواہشات نفسانی کے پیچھے چلتا ہے وہ گرجاتا ہے اور گرنے کی وجہ سے خدا تعالےٰ سے بہت دور چلا جاتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ خدا تعالےٰ نے یہاں تلازم کے طور پر ایک ایسا لفظ لایا ہے جو خدا تعالےٰ سے دُور جانے کی حقیقت کو بھی واضح کر رہا ہے کیونکہ ہوٰی صرف خواہشاتِ نفسانی کو ہی نہیں کہتے بلکہ گرنے کو بھی کہتے ہیں اس میں درحقیقت اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ خواہشات نفسانی کی پیروی انسان کو گرا دیتی ہے اور چونکہ اللہ تعالےٰ بہت بلند ہے اس لئے ایسا انسان اللہ تعالےٰ کے قرب کے راستوں سے دُور چلا جاتا ہے۔

---

## يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَاۗ

وہ تجھ سے اس گھڑی کے متعلق پوچھتے ہیں (کہ) اس کا آنا کب ہوگا

## فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَاۗ

تجھے اس کے (آنے کے) ذکر سے کیا تعلق ۴۳

**۴۳ حل لغات۔** اَلسَّاعَةُ۔ اَلْقِيَامَةُ وَقِيْلَ اَلْوَقْتُ الَّذِىْ تَقُوْمُ فِيْهِ الْقِيَامَةُ اَلسَّاعَة کے معنے قیامت کے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں اس وقت کا نام ساعت ہے جس میں قیامت برپا ہوگی۔ اَلْبُعْدُ دوری اَلْمُشَقَّةُ تکلیف۔ اَلْهَالِكُوْنَ۔ ہلاک ہونے والے لوگ۔ اس معنے میں سَاعَةٌ سَائِع کی جمع سمجھی جائے گی۔ نیز اَلسَّاعَةُ کے معنے ہیں دن یا رات کا کوئی حصہ جس کو اُردو میں ایک گھڑی سے تعبیر کرتے ہیں (اقرب)

اَلْمُرْسٰى۔ اَرْسٰى سے اسم مفعول یا ظرف ہے اور اَرْسَى السَّفِيْنَةَ کے معنے ہیں اَوْقَفَهَا عَلَى الْاَنْجَرِ کشتی یا جہاز کو ان کی بندرگاہ پر لنگر انداز کر دیا۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ اَيَّانَ مُرْسٰهَا اَىْ مَتٰى وُقُوْعُهَا۔ یعنی کب یہ پیشگوئیاں پوری ہوں گی۔ (اقرب)

فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا اس کے ذکر سے تجھے کیا۔ فِيْمَ اَنْتَ ایک محاورہ ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ تجھے اس سے کیا واسطہ۔ یعنی اس ذکر سے تیرا کیا تعلق کہ ایسا کب ہوگا اور کب یہ باتیں وقوع میں آئیں گی۔

**تفسیر۔** اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیشگوئیوں میں وقت کا بتانا ضروری نہیں ہوتا اور نہ اس سے اصل معاملہ کا کوئی تعلق ہوتا ہے جب تم پر عذاب ہی آنا ہے تو وہ دو دن پہلے آگیا یا دو دن بعد میں آگیا۔ اس سے اصل پیشگوئی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پیشگوئیوں کے التواء میں بعض حکمتیں بھی ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو دوسری جگہ بیان بھی کیا ہے لیکن دشمن کا ہمیشہ یہ سوال رہتا ہے کہ جب ایک پیشگوئی کی گئی ہے تو اس کے پورا ہونے کی تاریخ بھی بتا دی جائے اور اس امر کا بھی اظہار کر دیا جائے کہ ایسا کب ہوگا۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمہیں اس سے کیا واسطہ۔ جب پیشگوئی پوری ہو گئی تم میں سے ہر شخص کو نظر آجائے گا کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔ تمہیں اس کی تاریخ اور وقت اگر بتا بھی دیا جائے تو تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ حیرت آتی ہے کہ باوجود اس کے کہ قرآن کریم میں یہ ذکر آتا ہے کہ کفار یہ کہا کرتے تھے کہ جو پیشگوئیاں ہمارے سامنے کی جارہی ہیں وہ کب پوری ہوں گی۔ اور باوجود اس کے کہ قرآن کریم میں یہ جواب دیا گیا ہے کہ پیشگوئیوں کے پورا ہونے کا وقت بتانا ضروری نہیں تم اگر ایک سال پہلے مرے یا ایک سال پیچھے مرے تمہارے لئے پیشگوئی کا وقت معلوم ہو جانے میں کوئی فائدہ نہیں تم نے تو بہرحال ہلاک اور تباہ ہونا ہے۔ مگر پھر بھی یہی اعتراض مخالفین کی طرف سے بار بار کیا جاتا ہے کہ جس عذاب کے آنے کی خبر دی گئی ہے وہ عذاب آئے گا کب چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر مخالفین سلسلہ کی طرف سے بار بار یہی اعتراض کیا جاتا رہا کہ پیشگوئیاں مبہم رنگ میں کی جاتی ہیں ان کے پورا ہونے کا وقت نہیں بتایا جاتا۔ حالانکہ یہ ایسا سوال ہے جس کے جواب سے مخالفین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ نبی کی اصل پیشگوئی تو یہ ہوتی ہے کہ میں کامیاب ہوں گا اور دنیا میرے مقابلہ میں ناکام رہے گی۔ یہ پیشگوئی ایسی ہے جس کے لئے کسی خاص وقت کی تعیین کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ اس میں کوئی ابہام ہوتا ہے۔ مخالف اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ وہ تباہ ہوتے جارہے ہیں اور نبی کو ماننے والے غالب آتے جارہے ہیں مگر

اَلسَّاعَةُ

اَلْمُرْسٰى

فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا

۲۷
پیشگوئیوں کے ظہور کا وقت بتایا جانا ضروری نہیں

# اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا ؕ

اس (کے وقت) کی انتہاء (کی تعیین) تو تیرے رب سے تعلق رکھتی ہے ۳۲

پھر بھی ان کی طرف سے یہ سوال جاری رہتا ہے کہ ہمیں وقت بتایا جائے ایسا کب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہیں اس سے کیا واسطہ۔ تم نے تو بہرحال تباہ ہونا ہے تمہیں اگر بتا بھی دیا جائے کہ تم مثلاً چار سال کے بعد تباہ ہو گے تو تمہیں کیا فائدہ ہوگا جب تباہی آئے گی اس وقت خود بخود پیشگوئی کی صداقت واضح ہو جائے گی۔

فرماتا ہے يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ یہ لوگ تجھ سے تیری اُن پیشگوئیوں کے بارہ میں جو اسلام کی ترقی اور کفر کے نابود ہونے کے متعلق ہیں سوال کرتے ہیں اور کہتے ہیں اَيَّانَ مُرْسٰهَا ذرا یہ تو بتائیے کہ آپ کا جو بڑا بھاری جہاز کفار کی تباہی کے لئے آنے والا ہے وہ کب لنگر انداز ہوگا؟ اَيَّانَ مُرْسٰهَا میں بظاہر تفخیم ہے لیکن حقیقت اس سے مراد اُن کی تحقیر ہے کہ یہ بُلبلہ پھوٹے گا کب؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا تجھے اس سے کیا واسطہ اس ساعت نے تو تمہیں خدا تک پہنچانا ہے پھر تمہیں اس سے کیا کہ وہ تمہیں چند دن آگے پہنچا دیتی ہے یا پیچھے پہنچا دیتی ہے۔ ساعت کے متعلق تمہارا اس قدر اصرار کرنا اور کہنا کہ اس کی تاریخ بتلا دی جائے بالکل غلط ہے۔ یہ ساعت تو ایسی ہے جو لوگوں کو ایک دن خدا تک لے جائیگی۔ کسی کو مجرم بنا کر اور کسی کو مومن بنا کر۔ پس جب ایسا عظیم الشان تغیر پیدا ہونا ہے کہ خدا تعالیٰ کے سامنے کسی نے مجرم ہونے کی حیثیت میں پیش ہونا ہے اور کسی نے مومن ہونے کی حیثیت میں پیش ہونا ہے تو پھر اس میں ابہام کون سا رہا اور تاریخ پوچھنے کی ضرورت ہی کیا رہی ہم تو تمہارے سامنے یہ خبر پیش کر رہے ہیں کہ ایک دن ایسا آنیوالا ہے جب ہر شخص خدا تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوگا کہ کچھ لوگ مجرموں کی حیثیت میں اس کے سامنے کھڑے ہوں گے اور کچھ لوگ مومنوں کی حیثیت میں اس کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ کچھ لوگ انعام حاصل کریں گے اور کچھ لوگ عذاب کے مورد بنیں گے۔ اتنی بڑی خبر کے لئے کسی تاریخ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جب یہ بات وقوع میں آئی تمہیں خود بخود اس کی صداقت معلوم ہو جائے گی۔

**۳۲ تفسیر**۔ اس آیت میں پیشگوئیوں کے وقوع کی تاریخ معلوم کرنے کی لغویت بتائی ہے اور بتایا ہے کہ وقت معلوم کرنے سے فائدہ کیا۔ اصل غرض تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا جلال ظاہر ہو جائے سو وہ ایک دن ظاہر ہو جائے گا اور وہ گھڑی انسانوں کو خدا تعالیٰ تک لے جائے گی۔ اصل اہمیت تو اسی امر کی ہے سو یہ ہم نے بتا دیا ہے۔ چنانچہ دیکھو مکہ کے متعلق جب یہ پیشگوئی کی گئی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک دن اس کو فتح کریں گے مسلمان غالب آئیں گے۔ کفار تباہ ہوں گے اور وہ جن کو غلام سمجھ کر بتلا ئے آلام کیا جاتا تھا بڑی بڑی عزتیں حاصل کریں گے تو اس کے بعد بھلا یہ کیا سوال رہ جاتا ہے کہ یہ بات جمعہ کو ہوگی یا ہفتہ کو۔ اس سال ہوگی یا اگلے سال ہوگی؟

دوسری صورت میں جب ان آیات کو اُخروی زندگی کے متعلق سمجھا جائے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ تقدیر کے دھاگے تو اس کے ہاتھ میں ہیں اور تمام اسباب اسی کے قبضہ و تصرف میں ہیں اس لئے وہ جب چاہے گا اس کا ظہور کرے گا یعنی جو کچھ ہوتا ہے الٰہی منشاء اور اس کے ارادہ کے ماتحت ہوتا ہے بندوں کا اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ پس جبکہ اس نے تمام تقدیریں اپنے قبضہ میں رکھی ہوئی ہیں تو پھر جب چاہیگا اس ساعت کو ظاہر کر دے گا چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (لقمان ۳۵) قیامت کے دن کا علم

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا ۝ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا

تو تو صرف اُس کو جو اس (آفت) سے ڈرتا ہے ہوشیار کرنے والا ہے۔ وہ جس دن اُسے دیکھیں گے (اُن کی حالت ایسی ہوگی کہ)

لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا ۝

گویا وہ صرف ایک شام یا اس کی صبح (اس دنیا میں) رہے ہیں ۵۳۳

ع ۲

سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں یہی بات اس جگہ بیان کی گئی ہے کہ اِلٰی رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا سارے تغیرات تو ہم نے کرنے ہیں تمہارا اس سے کیا واسطہ ہے۔

**۵۳۳ حل لغات۔** مُنْذِرٌ اَنْذَرَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اَنْذَرَہٗ کے معنے ہوتے ہیں کسی امر کی حقیقت سے اُسے آگاہ کیا اور اس امر کے نتائج کے ظاہر ہونے سے پہلے اُسے ہوشیار کر دیا۔ نیز اس کے معنے یہ بھی ہوتے ہیں کہ خبر پہنچاتے ہوئے خوب ہوشیار کر دیا (اقرب) پس مُنْذِرٌ کے معنے ہوں گے۔ خبر دار کرنیوالا خطرے سے خوب ہوشیار کرنے والا۔

اَلْعَشِيُّ: اٰخِرُ النَّهَارِ۔ دن کا آخری حصہ۔ وَقِيْلَ مِنْ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ اِلَى الْعَتَمَةِ اور بعض کے نزدیک مغرب سے لے کر عشاء تک کا وقت عَشِيٌّ کہلاتا ہے۔ (اقرب)

**تفسیر۔** فرماتا ہے تُو تو صرف ایک منذر ہے اُس شخص کے لئے جو آنے والے عذاب سے ڈرتا ہے ہاں ہم صرف ایک بات بتا دیتے ہیں اور وہ یہ کہ جب وہ عذاب آئے گا تو لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا۔ وہ اتنے شدید عذاب کا دن ہوگا کہ انہیں اپنی ساری گذشتہ ترقی یوں معلوم ہوگی جیسے صرف چند گھنٹے رہی۔ یہ عذاب کی شدت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب انسان کو کوئی شدید تکلیف پہنچے تو اُسے اپنے آرام اور راحت کی گھڑیاں بالکل چھوٹی معلوم ہوتی ہیں اور انسان یوں سمجھتا ہے کہ وہ ہمیشہ دکھ میں ہی مبتلا چلا آرہا ہے آرام اُسے کبھی نصیب نہیں ہوا۔

پس فرماتا ہے جب وہ عذاب آئے گا تو کفار اپنی ساری گذشتہ شان و شوکت کو بھول جائیں گے اور انہیں اپنی ترقی کا دَور یوں معلوم ہوگا جیسے وہ چند گھنٹے کا تھا چنانچہ دیکھ لو جب عرب کی تاریخ بیان کی جاتی ہے تو پانچ دس صفحوں میں عرب کی تمام پہلی تاریخ آجاتی ہے اور باقی دس ہزار صفحوں میں اسلامی حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے حالانکہ پُرانی تاریخ کا زمانہ بہت لمبا تھا مگر جب اسلام کا ظہور ہوا تو وہ واقعات ہی مٹ گئے۔ وہ حالات ہی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ اب جس کی بھی نظر پڑتی ہے اسلامی دَور پر ہی پڑتی ہے پہلے زمانہ کے حالات پر نہیں پڑتی چنانچہ تاریخ کی کتابیں لکھنے والے چند صفحوں میں سارے عرب کی تاریخ لکھ دیتے ہیں اور پھر ہزاروں صفحات رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے حالات کے لئے وقف کر دیتے ہیں پس جس طرح انسانی زندگی کے مقابلہ میں عشیّہ اور ضحٰی کا نہایت قلیل حصہ ہوتا ہے اسی طرح فرماتا ہے اسلام کے مقابلہ میں تمہاری تاریخیں مٹ جائیں گی۔ تمہاری عظمتیں جاتی رہیں گی۔ تمہاری شان و شوکت کی داستانیں دنیا سے محو ہو جائیں گی اور کوئی شخص تمہارے باپ دادا کے کارناموں بلکہ اُن کے ناموں تک سے بھی واقف نہیں رہے گا۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے الہاماً فرمایا کہ يَنْقَطِعُ مِنْ اٰبَآءِكَ وَيُبْدَاُ مِنْكَ (تذکرہ صفحہ ۶۵) یعنی تیرے آباد کا ذکر منقطع کر دیا جائے گا اور تجھ سے آئندہ تاریخ کا ابتداء کیا جائے گا چنانچہ دیکھ لو اگر کوئی تاریخ لکھنا چاہے تو وہ چند صفحوں میں ہی

مُنْذِرٌ

اَلْعَشِيُّ

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تمام آباؤاجداد کے حالات ختم کردیگا اور اصل تاریخ اس وقت سے شروع کریگا جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر آئے گا۔ حالانکہ دنیوی لحاظ سے وہ بہت بڑی شان رکھتے تھے مگر باوجود اسکے کہ اپنے زمانہ میں وہ بہت بڑی عظمت رکھتے تھے اللہ تعالیٰ نے یہی فیصلہ کیا کہ آئندہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تاریخ کی ابتدا کرے اور آپ کے آباء کے ذکر کو منقطع کردیا جائے۔ اسی طرح فرمایا لَمْ يَلْبَثُوٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا ہم انکی تاریخ کو اتنا چھوٹا کردیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے مقابلہ میں اتنی عظمت دیں گے کہ عرب کی ساری تاریخ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عشیہ یا ضحیٰ جتنی رہ جائے گی۔

عَشِيَّةً کو پہلے اور ضحیٰ کو بعد میں بیان کرنے کی حکمت۔

ضُحٰهَا کی ضمیر عَشِيَّةً کی طرف جاتی ہے اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوپہر تو پہلے آتی ہے اور شام بعد کو پھر اس جگہ عَشِيَّةً کو پہلے اور ضحیٰ کو بعد میں کیوں بیان کیا گیا ہے؟ وہ لوگ جو قرآن کریم کی حکمت کاملہ اور فصاحت فوق البشریّہ پر پوری آگاہی نہیں رکھتے کہہ دینگے کہ قافیہ کے لئے ایسا کر دیا گیا ہے چونکہ پہلی آیتوں کا خاتمہ مُرْسٰهَا۔ ذِكْرٰىهَا مُنْتَهٰىهَا۔ يَخْشٰىهَا کے الفاظ پر ہُوا تھا وزن ملانے کے لئے یہاں بھی عَشِيَّةً کو پہلے کردیا گیا ہے اور ضُحٰهَا کو بعد میں رکھ دیا گیا ہے مگر فصاحت قرآنیہ اور اس کے معجزہ بیان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ جواب صحیح نہ ہوگا۔ قرآن کریم صرف لفظی رعایت کی وجہ سے مضمون کو کبھی نہیں بگاڑتا۔

اصل بات یہ ہے کہ دن یا بعض حصۂ دن تھوڑے وقت کے بیان کرنے کے لئے قرآن کریم میں آتا ہے جیسے کہ سورہ مومنون ع۶ میں کفار کی نسبت آیا ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ دنیا میں رہے۔ وہی محاورہ دوسرے الفاظ میں اس جگہ بیان ہوا ہے دن کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے چوبیس گھنٹوں کے وقت کو بھی دن کہتے ہیں اور صبح سے شام تک کے وقت کو بھی دن کہتے ہیں ان آیات میں صبح سے شام تک کے وقت کا نام دن رکھا گیا ہے اور صبح سے شام تک کے وقت میں لمبا وقت وہ ہے جو شام کو ختم ہو اور چھوٹا وقت وہ ہے جو دوپہر کو ختم ہو۔ چونکہ اس جگہ یہ امر بتانا مقصود ہے کہ کفار کی سب ترقیات ہیچ اور لغو تھیں کیونکہ انجام سزا اور عذاب کی صورت میں ہُوا۔ اس لئے عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا کہہ کر بتایا گیا ہے کہ منکرین اسلام کا انجام دو طرح کا ہوگا بعض دشمن تو وہ ہیں جنکی مثال ایسی ہوگی کہ وہ اپنی دنیوی ترقیات کا زمانہ ختم کرچکے ہیں اور اپنی عمر کی شام کو پہنچ چکے ہیں اور وہ اب اسلام سے ٹکرا کر تباہ ہوجائینگے لیکن بعض ایسے ہیں کہ جنہوں نے اپنی دنیوی ترقی کا زمانہ دیکھا بھی نہیں اب اُن پر جوانی کا زمانہ آیا ہے وہ بھی بوجہ اسلام سے ٹکرانے کے تباہ ہوجائیں گے گویا یہ لوگ شام کا منہ بھی دیکھنے نہ پائیں گے اپنی قومی زندگی کی دوپہر کو ہی ہلاک ہوکر عبرت بنجائینگے۔ یہ وہی مضمون ہے جو کسی شاعر نے ان الفاظ میں باندھا ہے ؎

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

غرض جب تباہی کا ذکر کرنا ہو تو بلاغت کا مطالبہ ہوتا ہے کہ پہلے لمبے زمانہ کا ذکر کیا جائے پھر چھوٹے کا۔ اس لئے یوں فرمایا کہ ان لوگوں میں سے بعض تو شام تک پہنچے اور بعض دوپہر تک ہی پہنچے تھے کہ ہلاک ہوگئے۔ اسی مناسبت سے جہاں یوم اور بعض یوم کے الفاظ استعمال کئے ہیں وہاں بھی یوم کا ذکر پہلے کیا ہے اور بعض یوم کا بعد میں۔ پس ضُحٰهَا کو بعد میں قافیہ کی غرض سے بیان نہیں کیا۔ بلکہ اس لئے بعد میں بیان کیا ہے کہ ضحیٰ چھوٹے عرصہ پر دلالت کرتا ہے اور اس مقام پر لمبے عرصہ کا ذکر پہلے اور چھوٹے کا بعد میں ہی مناسب ہے کیونکہ لمبا عرصہ گذارنا چھوٹے عذاب پر دلالت کرتا ہے اور تھوڑا عرصہ گذارنا بڑے عذاب پر۔ اور ترتیب مناسب یہی ہے کہ جب عذاب کا ذکر ہو تو پہلے چھوٹے عذاب کا ذکر کیا جائے اور بعد میں بڑے عذاب کا۔ تا تدریج و ترتیب مدنظر رہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اسلام کی عظمت اور اسکی ترقی کیطرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کفر کا زمانہ بالکل سکڑ جائیگا اور اسلام کا زمانہ اتنا پھیلے گا۔ اتنا پھیلے گا کہ اسلامی ترقی کے زمانہ کے مقابلہ میں کفار کو اپنا زمانہ ایسا ہی نظر آئے گا جیسے انسانی عمر کے مقابلہ میں ایک عشیہ یا ضحیٰ کی حیثیت ہوتی ہے۔

# سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ

سورۃ عبس - یہ سورۃ مکی ہے

## وَهِيَ اثْنَتَانِ وَأَرْبَعُونَ آيَةً دُونَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيهَا رُكُوعٌ وَاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے بغیر بیالیس آیتیں ہیں اور ایک رکوع ہے ؏۱

؏۱ سورۃ عبس مکی سورۃ ہے اور بہت ہی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ یوروپین مصنفین بھی اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ابتدائی مکی سورۃ ہے چنانچہ نولڈکے NOLDEKE جرمن مستشرق ابتدائی زمانہ کی بھی ابتدائی سورتوں میں اسکو شامل کرتا ہے۔ میور MUIR بھی اِسے اُن پہلی سورتوں میں سے قرار دیتا ہے جنہیں کفار پر ظاہر کیا گیا یعنی پہلی چند سورتیں کے متعلق مستشرقین کا خیال ہے کہ اُن کا اعلان اُن سورتوں کے نزول کے وقت ہی نہیں ہُوا بلکہ کچھ عرصہ بعد ہُوا۔ پس میور کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائی چند سورتوں کے بعد یہ نازل ہوئی۔

اس سورۃ کا پہلی سورۃ کے ساتھ ایک تو قریبی تعلق ہے اور ایک سارے مضمون کے لحاظ سے۔ قریبی تعلق تو یہ ہے کہ پچھلی سورۃ کی آخری آیت سے پہلی آیت میں یہ مضمون تھا کہ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا۔ کہ ڈرانا اُسی کو مفید ہو سکتا ہے جو يَوْمُ الْحِسَاب یا انجام اعمال کو ڈرتا ہو۔ يَخْشٰهَا کی ضمیر سَاعَةٌ کی طرف جاتی ہے اور ہم سَاعَةٌ کے دونوں معنے کرتے ہیں۔ حیات بعد الموت بھی اور غلبۂ اسلام یا غلبۂ قرآن بھی۔ پس اس میں ان دونوں باتوں کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا۔ جو شخص حیات بعد الموت سے خوف رکھتا ہو یا اپنے اعمال کے انجام سے ڈرتا ہو کہ جو اعمال میں کر رہا ہوں اُن کے نتیجہ میں تو اسلام جیتتا نظر آتا ہے اور میں ہارتا دکھائی دیتا ہوں اُس شخص کو یہ انذار مفید ہو سکتا ہے چنانچہ اسی لحاظ سے اب اس سورۃ میں ذکر فرماتا ہے کہ اُن لوگوں کی طرف زیادہ توجہ کرو جو حق کو غور سے سُننے کے شائق ہیں اور حق کی قبولیت کا استحقاق اپنے اندر رکھتے ہیں۔

*سورۃ عبس کی ۂ* حق کی قبولیت کا استحقاق کئی طرح سے ہوتا ہے۔ اوّل اعمال سے یعنی ایک شخص کے اندر جہاں تک اُس کا ایمان ہے خشیۃ اللہ پائی جاتی ہے یا سنجیدگی پائی جاتی ہے اور وہ دین کی باتوں کو غور سے سُنتا ہے اور یا پھر قومی استحقاق ہوتا ہے قومی استحقاق اس طرح ہوتا ہے کہ جب بھی خدا تعالےٰ کی طرف سے انبیاء آتے ہیں بالعموم ادنیٰ اور غریب طبقہ کے لوگ اُن کی طرف آتے ہیں گویا انبیاء کی بعثت پر نوّے فی صدی احتمال یہ ہوگا کہ غرباء جلدی دین کو سیکھیں گے۔ اگر کسی نبی کی جماعت زیادہ تر امراء کی طرف توجہ رکھے گی تو وہ اپنے دائرہ ترقی کو محدود کر دے گی۔ بے شک امراء بھی آتے ہیں مگر نسبت سے کم۔ اس فرق کو بھی قرآن کریم نے کئی جگہ بیان فرمایا ہے۔

*سورۃ عبس کا پہلی سورۃ سے تعلق*

مضمون کے لحاظ سے اس کا پہلی سورۃ سے یہ تعلق ہے کہ پہلی سورۃ میں اور اس سے بھی پہلی سورۃ میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ خدا تعالےٰ نے اسلام کی ترقی مقدر کی ہے اور اس کے ذرائع بھی بتائے گئے تھے جو یہ تھے۔ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا۔ اب یہ بتاتا ہے کہ جس طرح ساعت کا علم اللہ تعالےٰ نے اپنے پاس رکھا ہُوا ہے کہ وہ کب ظاہر ہوگی۔ اسی طرح اس بات کا علم بھی اللہ تعالےٰ نے اپنے پاس رکھا ہُوا ہے کہ وہ کن لوگوں کے ہاتھ سے ظاہر ہوگی اور وہ نَازِعَات اور نَاشِطَات اور سَابِحَات اور سَابِقَات اور مُدَبِّرَات بننے والے کون ہونگے مطلب یہ کہ وہ لوگ جو قوم میں بظاہر بڑے نظر آتے ہیں بظاہر بڑے ہوشیار اور کام کرنے والے دکھائی دیتے ہیں۔ ہماری

یہ مراد نہیں کہ تمہیں وہ لوگ مل جائیں گے کیونکہ ہو سکتا تھا کہ
یہ خیال کر لیا جاتا کہ اَلنّٰزِعٰتِ سے فلاں فلاں آدمی مراد
ہیں یا فلاں فلاں کام کرنے والے مراد ہیں یا فلاں فلاں بڑے آدمی
مراد ہیں اور اس طرح قیاس کر لیا جاتا کہ یہ شخص اس کو مراد ہونگے۔ اللہ تعالےٰ
فرماتا ہے ایسا نہیں ہے جس طرح خدا تعالیٰ نے ساعت کا علم اپنے پاس رکھا ہوا ہے
اسی طرح نَازِعَات بننے والی روحیں اور نَاشِطَات اور سَابِحَات
اور سَابِقَات اور مُدَبِّرَات بننے والی روحیں بھی
خدا تعالےٰ کے علم میں ہی ہیں تم اُن کے متعلق کوئی قیاس
نہیں کر سکتے۔ تم ظاہر میں سمجھو گے کہ فلاں فلاں شخص قابل ہیں
لیکن درحقیقت وہ اندرونی طور پر قابل نہیں ہوں گے یہ علم
بھی سَاعَة کی طرح خدا تعالےٰ نے اپنے پاس ہی رکھا
ہوا ہے گویا اَلنّٰزِعٰت کے مستحق لوگ خدا تعالےٰ کے
علم میں ہیں وقت پر وہ اُن کو لاتا جائے گا خود اُن کی جستجو
کرنا مفید نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالےٰ کی سُنّت ہے کہ وہ اپنے
سلسلہ کو اُن لوگوں کی معرفت ترقی نہیں دیتا جو پہلے سے جانے
بوجھے ہوتے ہیں بلکہ اُن کے ذریعہ سے ترقی دیتا ہے جو کلّی طور
پر اُس دین سے عزت پاتے ہیں جن کی نسبت یہ کہا جائے کہ
دین نے اُن سے عزت پائی وہ سچے دین کے قابل نہیں۔ سچے
دین کے قابل وہی ہوتا ہے جس کے متعلق کہا جائے کہ دین سے
اُس نے عزت پائی۔ نبی کے زمانہ میں اُس کے اَتباع خدا تعالےٰ
کی طرف اشارہ نہیں کرتے کہ اے لوگو! اُس کو مان لو۔ بلکہ
خدا تعالےٰ ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ لوگو یہ وُہ
ہیں جن کو میں خدمتِ دین کے لئے چُنتا ہوں۔ پس اس سورۃ
میں اَلنّٰزِعٰت کی جماعت کی تشریح کی گئی ہے اور اُن کے انتخاب
کا طریق بتایا گیا ہے جو یہ ہے کہ وقت پر اللہ تعالےٰ اُن کو
خود ظاہر کرے گا۔ چنانچہ اسلام کی تاریخ کو دیکھو جتنے لوگ
چُنے گئے وہ وہی ہیں جن کی صداقت اور نیکی کا دشمن معترف
تھا۔ لیکن اگر زمانہ کے حالات کے مطابق اگر دنیا کو کہا جاتا
کہ اس کام کے لئے آدمیوں کو چُنو تو وہ کبھی ان کو نہ چُنتی۔
کیونکہ گو اُن کے اندر مخفی قابلیتیں تھیں لیکن ایک مبہم خیال
سے زیادہ لوگ ان کی اہمیت کو نہیں سمجھتے تھے۔ آخر مکہ والے
ابوبکرؓ کی قابلیت کے تو قائل تھے مگر سرداری کے لئے تو انہوں
نے ابوجہل۔ عتبہ اور شیبہ کو ہی چنا ہوا تھا۔ کیونکہ ابوبکرؓ کے
اندر وہ ایک مبہم نیکی پاتے تھے۔ ظاہری قابلیتیں ان کو عتبہ
شیبہ اور ابوجہل میں ہی نظر آتی تھیں۔ اسی طرح عمرؓ۔ عثمانؓ
علیؓ۔ عبد اللہ بن مسعودؓ۔ زبیرؓ اور طلحہؓ وغیرہم میں سے ایک
بھی نہیں تھا جس کو قوم نے اپنی سرداری کے لئے منتخب کیا ہو۔
اسی طرح یمن میں مثلاً ابوموسیٰ اشعری ایمان لائے اور
یہود میں سے عبد اللہ بن سلام ایمان لائے۔ مگر کیا کوئی کہہ
سکتا ہے کہ اگر اُن کی قومیں منتخب کرتیں تو وہ انہی لوگوں کو
کرتیں۔ یقیناً وہ دوسروں کو کرتیں لیکن اِس سے انکار نہیں
کیا جا سکتا کہ ایک مبہم اقرار اُن کی نیکی کا لوگوں کے دلوں
میں ضرور موجود تھا۔

غرض یہ لوگ ایسے تھے کہ قوم میں کسی تغیر کا پیدا
کرنا ان سے متوقع نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر تغیر پیدا انہوں نے
ہی کیا اور جن سے تغیر متوقع ہو سکتا تھا وہ محروم رہ گئے۔
پس یہ ایک نہایت ہی اہم معاملہ قومی ترقی کے ساتھ تعلق
رکھتا ہے اور اس مضمون پر اس سورۃ میں خاص طور پر بحث
کی گئی ہے کہ جب قوموں پر تغیر کا زمانہ آتا ہے تو اصل قابلیتیں
دب جاتی ہیں اور جھوٹی قابلیتیں اُبھر آتی ہیں لوگوں کے
مزاج کچھ ایسے بگڑ جاتے ہیں کہ حقیقی نیکی کو وہ پسند نہیں کرتے
اور مظاہرے اور بناوٹ اور قوم کی رگ پہچاننے کو وہ زیادہ
قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں وہ اس شخص کو آگے نہیں آنے
دیتے جو حقیقی لیڈر ہو بلکہ اُسے آگے لاتے ہیں جو نام کا تو
لیڈر ہو لیکن واقعہ میں قومی رسوم اور عادات کے پیچھے
چلنے والا ہو اس لئے زمانۂ ظلمت کی اصلاح کے لیڈر کا
چُننا لوگوں کے لئے ناممکن ہوتا ہے کیونکہ ان کی فطرتیں مسخ
اور غلامانہ بن چکی ہوتی ہیں جو اس نیک جدت کو بھی جو
رسم و رواج کے خلاف ہو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں
پس اس انتخاب کا حق اللہ تعالےٰ اپنے قبضہ میں رکھتا ہے

کیونکہ خدا کی نظر دلوں پر ہوتی ہے صرف منہ کی باتیں وہ پسند نہیں کرتا۔ ایک عام انسان تو کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ لوگ لائق ہیں تو آگے کیوں نہیں آگئے لیکن خدا جانتا ہے کہ اُن کا آگے نہ آنا حالات کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے ہے۔ قوم کے حالات ہی گندے ہو جاتے ہیں اور اس گندی زمین میں کوئی پاکیزہ درخت اُگ ہی نہیں سکتا اور جب تک اس زمین میں سے اُن کو نہ اکھاڑا جائے وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ اسی کی طرف سورۂ نازعات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ قابل تو یہ ہیں مگر زمین خراب ہے اس زمین میں یہ اُگ نہیں سکتے۔ اب ہم ایک نئی زمین ان لوگوں کے لئے پیدا کریں گے تب اُن کی قابلیتیں تمہیں نظر آنے لگ جائیں گی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے۔ جب مکہ میں یہ خبر اُس جگہ پہنچی جہاں اُن کے والد بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے مدینہ سے آنے والے ایک آدمی سے پوچھا کہ سناؤ مدینہ کا کیا حال ہے اُس نے کہا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں۔ انہوں نے پوچھا تو پھر مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ انہوں نے ایک آدمی کی بیعت کر لی ہے۔ انہوں نے کہا کس آدمی کی؟ وہ کہنے لگا ابوبکرؓ کی۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا کون ابوبکر؟ اُس نے جواب دیا ابن ابی قحافہ۔ کہنے لگے کون ابوقحافہ؟ اُس نے کہا تم۔ پھر انہوں نے مختلف خاندانوں کے نام لے لیکر پوچھا کہ کیا انہوں نے بیعت کر لی ہے؟ جب اُس نے بتایا کہ انہوں نے بیعت کر لی ہے تو وہ کہنے لگے بنو ہاشم کا کیا حال ہے۔ کیا انہوں نے بھی بیعت کر لی؟ اُس نے کہا ہاں۔ پھر انہوں نے بعض اور قبائل کے متعلق پوچھا اُس نے یہی جواب دیا کہ انہوں نے بھی بیعت کر لی ہے۔ ابوقحافہ ظاہر میں تو اسلام لے آئے تھے لیکن ابھی پورے طور پر اُن کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوا تھا جب انہوں نے یہ باتیں سُنیں تو تھوڑی دیر تک خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا سر اُٹھایا اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ گویا یہ دن اُن کے ایمان کی صفائی کا تھا جس میں اُن کو اسلام کی سچائی کے متعلق حقیقی بصیرت حاصل ہوئی۔ اُن کے ذہن میں یہ کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ کوئی دن ایسا بھی آ سکتا ہے جب ابوبکرؓ کو عرب کے سارے قبائل اپنا خلیفہ اور بادشاہ مان لینگے اور یہ بات بھی ٹھیک ہے جس ابوبکرؓ کو انہوں نے پالا تھا اور جس نگاہ سے انہوں نے ابوبکرؓ کو دیکھا تھا وہ ابوبکرؓ واقعہ میں اُس وقت اس عظیم الشان منصب کے قابل نہیں تھا۔ مگر اُس کی وجہ یہی تھی کہ انہیں اُس مٹی میں اُگایا جا رہا تھا جس سے اُن کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ جب خدا نے زمین بدل دی اور وہ زمین اس پودے کے مناسب حال ہو گئی تب ابوبکرؓ کی روح کا پودا اُبھرا اور اُس نے نشوونما پاتے پاتے ایک بہت بڑے درخت کا رنگ اختیار کر لیا۔ یہ بالکل ویسی ہی بات ہے جیسے آم کشمیر میں لگا دو تو وہ نہیں اُگیں گے۔ اور اگر سیب کا درخت پنجاب میں بو دو تو وہ کبھی اچھا پھل نہیں دے گا۔ نیک روحوں کے لئے بھی مناسب حال زمین کی ضرورت ہوتی ہے اور زمین کے لئے مناسب حال پودے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کفر کی زمین میں عتبہ شیبہ اور ابوجہل ہی بڑھ سکتے تھے۔ ابوبکرؓ نہیں اٹھا سکتے تھے اور ایمان کی زمین میں ابوبکرؓ ہی بڑھ سکتے تھے۔ عتبہ، شیبہ اور ابوجہل سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ وہ اس زمین میں جھاڑیوں سے بھی زیادہ ذلیل نظر آتے تھے بلکہ جھاڑیاں تو کیا اُن کی گھاس پھونس جیسی حیثیت بھی نہیں تھی۔ اسی مضمون کی طرف اس سورۃ میں اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تم کو وہ روحیں نظر نہیں آتیں جنہوں نے دین کی اشاعت کا کام سرانجام دینا ہے اور جن کے ہاتھوں پر اسلام کا غلبہ مقدر ہے۔ اسی لئے تم پوچھتے ہو کہ وہ روحیں آئیں گی کہاں سے جو نَازِعَات۔ نَاشِطَات۔ سَابِقَات سَابِحَات اور مُدَبِّرَات ہونگی اور ان روحوں کو چُنے گا کون؟ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ہم چُنیں گے اور کون چُنے گا۔ بے شک آج وہ روحیں تم کو نظر نہیں آتیں مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہاری زمین ناسازگار رہے۔ تمہارے باغ میں وہ نیکی کے پودے تو لگے ہوتے ہیں مگر زمین کے مناسب حال نہ ہونے کی وجہ سے وہ سُوکھ رہے ہیں۔ جب ہم ان پودوں کو اس زمین سے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ۙ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ

(کیا) چیں بجبیں ہوگیا اور مُنہ موڑ لیا ؟ (صرف) اس بات پر کہ اُس کے پاس (ایک) نابینا (جسو اقف لوگ جانتے ہیں) آیا؟ ۲ ۵

اگھیڑ کر اصل زمین میں بوئیں گے تو اُس وقت تم دیکھو گے کہ وُہ کیسے شاندار درخت بنتے ہیں۔

عَبَسَ

**حل لغات۔** عَبَسَ فُلَانٌ وَجْهَهٗ کے معنے ہوتے ہیں قَطَّبَهٗ۔ اُس نے ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے ماتھے پر شکن ڈال لئے (اقرب) اور تَوَلّٰی عَنْہُ کے معنے ہوتے ہیں اَعْرَضَ عَنْہُ وَتَرَکَہٗ۔ اس سے اعراض کرلیا اور اُس سے توجہ کو ہٹا لیا (اقرب)

۲،۱ سورۃ عَبَسَ کا شانِ نزول

**تفسیر۔** کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن اُم مکتوم ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں تشریف لائے۔ یہ اس وقت تک مسلمان ہو چکے تھے یا اگر ظاہری طور پر انہوں نے بیعت نہ کی ہو تو بہر حال رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے۔ جب یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوئے تو اُس وقت آپ کے پاس عتبہ و شیبہ (ربیعہ کے دونوں بیٹے جو مکہ کے لیڈروں میں سے تھے) اور ابوجہل اور عباس ابن عبدالمطلب اور امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ بیٹھے ہوئے تھے اور آپ ان کو بڑے شوق سے تبلیغ کر رہے تھے کہ شاید یہ مان جائیں تو اُن کے ذریعہ سے باقی مکہ والے بھی اسلام میں داخل ہو جائیں باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ عبداللہ بن ام مکتوم آئے اور انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اَقْرِئْنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مِمَّا عَلَّمَکَ اللّٰہُ تَعَالٰی کہ مجھے قرآن پڑھایئے اور جو کچھ خدا تعالےٰ نے آپ کو سکھایا ہے وہ مجھے بھی سکھایئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جس پر انہوں نے دو تین بار اسی بات کو دُہرایا چنانچہ لکھا ہے وَلَمْ یَعْلَمْ تَشَاغُلَہٗ بِالْقَوْمِ یعنی اُن کو علم نہ ہوا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسروں سے باتیں کر رہے ہیں۔ فَکَرِہَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَطْعَہٗ لِکَلَامِہٖ وَعَبَسَ وَاَعْرَضَ عَنْہُ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے قطع کلام کو ناپسند فرمایا آپ کے ماتھے پر شکن پڑے اور آپ نے اُن سے اعراض کر لیا۔ اس پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ توبیخ نازل ہوئی (کشاف) چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بعد میں اُن کو بلا کر اُن کی عزت افزائی کی اور اُن سے باتیں کیں اور اس کے بعد جب کبھی وہ آپ کے پاس آتے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اُن کے لئے چادر بچھوا دیتے اور انہیں اس پر بیٹھنے کے لئے کہتے (فتح البیان)

یہ واقعہ ہے جو اس سورۃ کا شانِ نزول بتایا جاتا ہے اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک اندھے کو حقیر جانا اور یہ سمجھ کر کہ وہ معمولی اور غریب آدمی ہے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اور وہ بڑے بڑے خاندانوں کے لوگ جو اس وقت آپ کے پاس موجود تھے اُن کی طرف ہی آپ نے اپنی توجہ رکھی اور یہ سمجھا کہ مشہور خاندانی لوگوں کی طرف توجہ رکھنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے ایک اندھے اور غریب کی طرف توجہ کی کیا ضرورت ہے۔

اس روایت کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ عبداللہ بن ام مکتوم کون تھا۔ عبداللہ بن ام مکتوم حضرت خدیجہؓ کے بھائی تھے یعنی اُن کے ماموں کے بیٹے تھے اُن کے نام اور نسب کے متعلق قریب کے ناموں میں اختلاف ہے مگر قوم کے لحاظ سے سب اس بات پر متفق ہیں کہ بنی عامر بن لُؤَیّ میں سے تھے۔ اُن کا نام اور نسب نامہ بعض عبداللہ

بن شریح بن مالک بن ربیعۃ الفہری بتاتے ہیں اور بعض عبداللہ بن عمرو بن قیس ابن زائدہ بن الاعصم بتاتے ہیں اور بعض اُن کا نام ہی عمرو بن قیس ابن زائدہ بتاتے ہیں (روح المعانی) یہ ابن ام مکتوم کیوں کہلاتے ہیں اس کے متعلق زمخشری نے لکھا ہے کہ اُم مکتوم اُن کی دادی کا نام تھا۔ لیکن ابن عبدالبر اور دوسرے مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے اُن کے نزدیک یہ اُن کی والدہ کی کنیت ہے اور اُن کا اصل نام عاتکہ بنت عامر بن مخزوم تھا۔ اُن کی کنیت ام مکتوم اس لئے تھی کہ یہ پیدا ہی اندھے ہوئے تھے اس لئے اُن کی کنیت ام مکتوم پڑ گئی یعنی اندھے کی ماں۔ بعض مؤرخین یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اندھے پیدا نہیں ہوئے تھے کچھ دیر تک اُن کی آنکھیں سلامت رہیں مگر بعد میں کسی وجہ سے اُن کی بینائی جاتی رہی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دو دفعہ اُن کو مدینہ کا امیر بھی مقرر فرمایا۔ اس شجرۂ نسب کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ یہ کہنا کہ وہ حقیر آدمی تھے اور اُن کی طرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی توجہ مفید نہیں ہو سکتی تھی ان واقعات سے بالبداہت غلط ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ ان کی والدہ اور والد دونوں زبردست قبائل میں سے ہیں۔ اور یہ ایک ایسی عورت کے بھائی ہیں جسکی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں انتہاء درجہ کی عزت تھی اور اس حد تک عزت تھی کہ اُن کی وفات کے سالوں بعد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کو اُن پر رشک آجاتا تھا حضرت عائشہؓ خود بیان کرتی ہیں کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تکرار اور تواتر کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کا ذکر فرماتے تو میں بعض دفعہ بے تاب ہو کر کہتی یا رسول اللہ! آپ اُس بڑھیا کا ذکر چھوڑیں گے بھی یا نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے تو آپ کو اس سے بہت بہتر عورتیں دے دی ہیں؟ اُس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُن کے جواب میں فرماتے عائشہ! تم کو معلوم نہیں خدیجہؓ کے اندر کتنی خوبیاں تھیں اور اس نے میری ایک لمبے عرصہ تک کیسی خدمت کی۔ پس حضرت خدیجہؓ کے بھائی اور ماں اور باپ دونوں کی طرف سے زبردست خاندانوں کے فرد کی عظمت صرف نابینا ہونے کی وجہ سے تو نہیں جا سکتی تھی۔ آخر تبلیغ زبان سے کی جاتی ہے آنکھوں سے تو نہیں کی جاتی۔ پس یہ کہنا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھا کہ ایک حقیر اندھا آدمی میرے پاس آیا ہے میں بڑے بڑے لوگوں کو چھوڑ کر ایسے غریب اور معمولی آدمی کی طرف کیوں توجہ کروں بالبداہت واقعات سے غلط ثابت ہوتا ہے۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دو دفعہ مدینہ کا سردار مقرر کیا اور یہ سردار مقرر کرنا محض لحاظ کے طور پر نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کو سردار مقرر فرمایا تو اس لئے کہ ان میں امارت کی قابلیت تھی اور اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم یہ سمجھتے تھے کہ عرب انکی خاندانی عظمت کی وجہ سے انہیں اپنا سردار تسلیم کرنے میں کوئی تکلیف محسوس نہیں کرینگے۔ کیونکہ عرب کے دستور کے مطابق کوئی ایسا شخص امیر مقرر نہیں کیا جا سکتا تھا جس کا خاندانی لحاظ سے لوگوں پر اثر نہ ہوتا۔ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی امیر مقرر کیا ہمیشہ انہی لوگوں کو کیا جو خاندانی لحاظ سے عظمت و شہرت کے مالک ہوتے تھے اور جن کے متعلق یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ لوگوں کو اُن کی اطاعت سے کوئی گریز نہیں ہوگا چنانچہ ایک دفعہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو اپنے بعد امیر مقرر فرمایا حقیقت یہ ہے کہ عربوں میں نسلی تعصب اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ وہ ادنیٰ اقوام یا بے اثر لوگوں کی امارت کو تسلیم ہی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تو بہت لمبے عرصہ کے بعد اسلام نے انکے دلوں سے یہ بات دور کی ورنہ شروع شروع میں یہ بالکل ناممکن تھا کہ وہ کسی ایسے آدمی کی امارت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتے جو خاندانی طور پر کوئی اثر نہ رکھتا ہو۔ پس یہ سمجھنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک حقیر آدمی آیا اور آپ نے اُس کی طرف محض اُس کی غربت اور عدم عزت کی وجہ سے توجہ نہ کی بالبداہت باطل ہے اور یہ اتنا موٹا مضمون ہے کہ تعجب آتا ہے مسلمانوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آیا حالانکہ بعض دشمنانِ اسلام کی سمجھ میں آگیا ہے چنانچہ نولڈکے NOLDEKE جو مشہور جرمن مستشرق ہے وہ یہ واقعہ لکھ کر کہتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹا واقعہ ہے عبداللہ بن ام مکتوم کا شجرۂ نسب بتا رہا ہے کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔

اور اس لئے یہ بات اس کے متعلق ہرگز نہیں ہو سکتی گویا اُس کا ذہن بھی اِدھر چلا گیا کہ یہ واقعہ یہاں چسپاں نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر یہ بات درست ہوتی تو اُس کو خوش ہونا چاہیئے تھا کہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہتک ہوتی ہے مگر وہ کہتا ہے یہ بات واقعات کے بالکل خلاف ہے اور اسے ان آیات پر چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ میرے نزدیک علاوہ اس شہادت کے پانچ اور امور ایسے ہیں جن کی وجہ سے ہر شخص کو ماننا پڑتا ہے کہ یہ واقعہ اس رنگ میں یہاں چسپاں نہیں ہوتا

اس سورۃ کے نزول کے متعلق مفسرین کے بیان کئے ہوئے واقعہ کے چسپاں نہ ہونے کے پانچ دلائل

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ ابن ام مکتوم اندھے تھے بہرے نہیں تھے۔ یا تو یہ کہا جاتا کہ ابن ام مکتوم بہرے تھے اور چونکہ بہرے ہونے کی وجہ سے وہ باتوں کو نہیں سُن سکتے تھے اس لئے اُن کو پتہ نہیں لگا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بعض دوسرے لوگوں سے مصروف گفتگو ہیں اور چونکہ اُن کو اپنے بہرے پن کی وجہ سے اس بات کا علم نہیں ہو سکا اس لئے انہوں نے آتے ہی سوال کر دیا۔ اگر یہ ثابت ہو جائے تو پھر ابن اُم مکتوم پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ عدم علم کی حالت میں کسی بات کا انسان سے سرزد ہو جانا اُسے مورد الزام قرار نہیں دے سکتا لیکن تاریخ سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ بہرے تھے۔ چنانچہ بعض مفسرین کو بھی یہ اعتراض سوجھا ہے کہ جب ہم اس واقعہ کو بیان کر رہے ہیں تو ہر شخص یہ کہیگا کہ قصور ابن ام مکتوم کا ہے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بات کر رہے تھے تو انہوں نے بیچ میں دخل کیوں دے دیا۔ آخر ہر شخص جانتا ہے کہ جب دوسرے سے گفتگو کی جا رہی ہو تو اُس وقت اگر کوئی شخص دخل دیدے اور کلام کو قطع کرنے کی کوشش کرے تو وہ تہذیب اور شائستگی کے خلاف حرکت کا مرتکب سمجھا جاتا ہے اور اُسے کسی صورت میں بھی اپنے فعل میں حق بجانب نہیں سمجھا جا سکتا پس جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بعض اور لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے اور عبد اللہ بن اُم مکتوم نے اس میں دخل دے دیا اور آپکی بات کو قطع کرنا چاہا تو ایسی صورت میں عبد اللہ بن ام مکتوم ہی زجر کے قابل تھا کہ اُس نے خلاف تہذیب ایک حرکت کا

پہلی دلیل

ارتکاب کیا۔ بہر حال یہ ایک اعتراض ہے جو مفسرین کو بھی سوجھا ہے اور انہوں نے اس کا جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے مگر وہ جواب ایسا کمزور ہے کہ اُسے پڑھ کر حیرت آتی ہے کہ مفسرین نے یہ کیا کہدیا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شاید ان لوگوں کو کان میں تبلیغ کر رہے تھے جس کی آواز عبد اللہ بن ام مکتوم کو نہیں پہنچی۔ مگر یہ بالکل ہنسی کے قابل بات ہے کہ سات آدمی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں موجود ہوں اور ان سات آدمیوں کو آپ کان میں تبلیغ کر رہے ہوں اور ایسی ہلکی آواز سے کہ کوئی پاس کا شخص بھی اُس کو سُن نہ سکے دُنیا کی کوئی عقل اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتی اور احمق سے احمق انسان بھی اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ سات آدمی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور اُن سات آدمیوں کو بجائے کھلے طور پر تبلیغ کرنے کے آپ ہر ایک کے کان کے ساتھ اپنا مُنہ لگا رہے ہوں اور اُسے اسلام کی تبلیغ کر رہے ہوں۔ بات یہ ہے کہ فطرت خود بولتی ہے کہ سچائی کیا ہے خواہ اس پر کس قدر پردے ڈالنے کی کوشش کی جائے۔ بہر حال اگر عبد اللہ بن ام مکتوم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اس وقت بولے جب آپ دوسروں کو تبلیغ کر رہے تھے تو ملزم ابن ام مکتوم تھے اور اُن کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ اس وقت بولتے۔ اور اگر انہوں نے سُنا نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کر رہے ہیں تو پھر ثابت کرنا چاہیئے کہ وہ بہرے تھے لیکن تاریخ یہ تو بتاتی ہے کہ وہ اندھے تھے یہ نہیں بتاتی کہ وہ اس کے ساتھ بہرے بھی تھے۔ اور جب وہ بہرے نہیں تھے جب وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کو سُن رہے تھے۔ جب انہیں معلوم تھا کہ اس وقت مکہ کے بڑے بڑے رؤساء کو تبلیغ کی جا رہی ہے تو وہ بولے کیوں؟ اُن کا اس موقعہ پر بولنا بتا رہا ہے کہ قصور ابن مکتوم کا ہی تھا اور یہ بات تو عقل کے بالکل خلاف ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بات کر رہے ہوں اور ابن مکتوم نے اس کو سُنا ہی نہ ہو۔ جیسے مفسرین نے ایک بے بنیاد توجیہ کی ہے بہر حال جرم ابن ام مکتوم کا ثابت ہوتا ہے

مگر بتایا یہ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈانٹ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پڑی۔ اسی مشکل کی وجہ سے مفسرین نے عجیب قیاس کیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُن کو کان میں تبلیغ کر رہے تھے حالانکہ یہ تبلیغ کا موقع تھا کسی کی بیوی کا جھگڑا نہیں تھا کہ اس کے متعلق اُسے کان میں کچھ کہنے کی ضرورت ہوتی تاکہ دوسرا شخص اُسے سُن نہ لے۔ خدا اور رسول کی باتیں تھیں۔ اسلام کی اشاعت کا کام تھا۔ توحید کی تعلیم تھی۔ مگر بتایا یہ جاتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بڑی آہستگی سے عتبہ اور شیبہ کے کان کے ساتھ اپنا منہ لگا کر کہہ رہے تھے کہ دیکھو اللہ ایک ہے۔ اللہ نے ہی سب دنیا کو پیدا کیا ہے۔ بُتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ انہیں چھوڑ دو اور توحید کا اقرار کرو۔ دنیا کا کوئی بھی معقول انسان اسے تسلیم نہیں کر سکتا بلکہ جس شخص کے سامنے بھی یہ بات پیش کی جائے وہ ہنس پڑیگا کہ کیسی جاہلانہ بات کہی جا رہی ہے۔

دوسری دلیل[1]

(۲) دوسرے اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب نہیں دیا تو آپ نے عین ثواب کا کام کیا اُن پر اعتراض کیسا؟ آپ بڑے بڑے رؤساء کو تبلیغ کر رہے تھے۔ اُن پر اسلام کی حقیقت واضح کر رہے تھے۔ اُن کو خدا اور اُس کے رسول کیطرف بُلا رہے تھے۔ ایسی حالت میں جب ایک شخص نے آپ کے کلام کو قطع کرنا چاہا اور موقع اور محل کو نظر انداز کر کے تہذیب و شائستگی کے اصول کے بالکل خلاف ایک بات پیش کر دی تو اُس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اگر اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو آپ نے بالکل درست کیا۔ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جو ہمیں اس فعل سے روکتی ہو بلکہ اگر آج بھی ہماری مجلس میں کوئی ایسی حرکت کرے تو باوجود عَبَسَ وَتَوَلّٰی والی آیت کے نازل ہونے کے ہم آج بھی اس سے وہی سلوک کرینگے جو عبداللہ بن ام مکتوم سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ میں اگر قرآن کریم کا درس دے رہا ہوں اور کوئی شخص درمیان میں مجھے آکر کہے کہ اس درس کو چھوڑیئے اور میری فلاں بات کا جواب دیجئے۔ تو کیا میں اُس وقت درس چھوڑ دوں گا اور اس کی بات کی طرف متوجہ ہو جاؤنگا۔ یا اُس سے اعراض کروں گا کہ اُس نے موقع اور محل کو نظر انداز کر کے سلسلہ کلام کو قطع کرنا چاہا؟ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسے موقع پر اعراض کرنا ہی ضروری ہوتا ہے۔ اگر درمیان میں کوئی شخص دخل دیدے تو اس سے بات کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ طبائع پر جو اثر ہو رہا ہوتا ہے وہ جاتا رہتا ہے۔ دلیل بھول جاتی ہے اور دخل دینے والے کی بدتہذیبی کا الگ اثر پڑتا ہے۔ پس ایسی حالت میں ضروری ہوتا ہے کہ اس کی بات کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ کیا کوئی شخص اس بات کو جائز قرار دے سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت پیش کر رہے ہوتے اور ابن ام مکتوم کے دخل دینے پر اُسے سورۂ نازعات کا درس دینا شروع کر دیتے اور جب گھنٹہ بھر گذر جاتا تو پھر اُن لوگوں سے کہتے کہ لو اب بقیہ آدھی دلیل تم بھی سُن لو؟ دنیا میں جاہل سے جاہل اور احمق سے احمق انسان بھی ایسی حرکت نہیں کرتا مگر یہ لوگ محض اس بات کی وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ آپ کو تبلیغ چھوڑ کر ابن ام مکتوم کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیئے تھا اور تہذیب و تمدن کے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیئے تھا۔ گویا یہ لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس کو ایک ایسا رنگ دینا چاہتے ہیں جسے دنیا میں کہیں بھی معقول قرار نہیں دیا جاتا۔

تیسری دلیل[2]

(۳) تیسرے اندھے کی بات کو ناپسند کر کے اُس پر تیوری چڑھانا اور منہ پھیر لینا یہ تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا ثبوت ہے۔ اس پر تو آپ کی تعریف ہونی چاہیئے تھی نہ یہ کہ توبیخ نازل ہوتی۔ ایک اندھا شخص آتا ہے وہ ایک غیر معقول بات کرتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اسکو ڈانٹتے نہیں تاکہ اُس کا دل میلا نہ ہو صرف اُس کے بار بار دخل دینے کی وجہ سے آپ کے ماتھے پر شکن آجاتے ہیں لیکن پھر بھی آپکی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتے آپ چاہتے تھے کہ اُس کا دل نہ دُکھے مگر دوسری طرف وہ ایک ایسی بات کر رہا تھا جو سراسر غیر معقول تھی۔ ایسی حالت میں آپ حیران تھے کہ میں کروں کیا؟ ادھر میں بات کو نہیں چھوڑ سکتا دوسری طرف اگر اس کو ڈانٹتا ہوں تو اس کا دل

میسلا ہوتا ہے اب میں کروں تو کیا کروں۔ ایسی حالت میں بہترین طریق جو ایک انسان اختیار کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ مُنہ پھیر لے اور اس طرح دونوں باتیں ہو جائیں سلسلہ کلام بھی نہ رُکے اور دوسرے شخص کے دل کو بھی صدمہ نہ پہنچے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ماتھے پر شکن پڑے اور آپ نے اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ مُنہ پھیرنے میں حکمت یہ تھی کہ آپ چاہتے تھے مجھے غصہ پیدا نہ ہو اگر عبد اللہ بن اُم مکتوم میرے سامنے ہو گا تو ممکن ہے غصہ کی حالت میں میرے مُنہ سے کوئی بات نکل جائے۔ چنانچہ آپ نے تیوری چڑھائی جس کو اندھا نہیں دیکھ سکتا تھا اور پھر اُس سے مُنہ پھیر لیا تاکہ اس کے متعلق زیادہ غصہ پیدا نہ ہو اور زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جس سے اُس کے دل کو صدمہ ہو۔ پس آپ کا یہ فعل تو ایسا تھا کہ اس پر عرش سے خدا تعالیٰ کی طرف سے تعریف آنی چاہیئے تھی نہ یہ کہ ڈانٹ پڑتی؟ اور کہا جاتا ہے کہ آپ نے اچھا کام نہیں کیا۔ پھر اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ طریق اختیار نہ کرتے تو مفسرین کو بتانا چاہیئے تھا کہ آپ کیا کرتے اور وہ کونسا دوسرا قدم تھا جو آپ تمام اخلاقی پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اٹھا سکتے تھے۔ مگر وہ کوئی دوسرا طریق نہیں بتا سکے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک بھی یہی طریق تھا جو اس موقعہ پر اختیار کیا جا سکتا تھا۔ اگر اس واقعہ سے کچھ پتہ چلتا ہے تو وہ یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیوری چڑھائی اور آپ کو ابن ام مکتوم کی بات بُری لگی لیکن آپ نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف زائد بات یہ کی کہ جب آپ نے دیکھا کہ وہ باز نہیں آتا تو آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ایسا نہ ہو اُسے اپنے سامنے بیٹھے دیکھ کر غصہ میں میرے مُنہ سے کوئی بات نکل جائے۔ آپ نے اس کی طرف سے اپنا مُنہ پھیر لیا تاکہ نہ وہ نظر آئے اور نہ اس کے متعلق طبیعت میں زیادہ جوش پیدا ہو اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت اعلیٰ درجہ کے اخلاق پر دلالت کرتی ہیں۔

چوتھی دلیل

(۴) چوتھے ابن اُم مکتوم خود ایک بڑے خاندان کے فرد تھے اس لئے ان کو حقیر سمجھنے کے کوئی معنے ہی نہیں۔ لیکن اگر فرض بھی کر لو کہ وہ حقیر تھے تو اُن کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی غربت کی وجہ سے یا اُن کے ادنیٰ ہونے کی وجہ سے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم غرباء کی طرف خاص طور پر توجہ کیا کرتے تھے اور کبھی کسی شخص کو محض اُس کے غریب ہونے یا اس کے ادنیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے تحقیر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں مکہ کی زندگی میں ہی آپ غلاموں کو تبلیغ کرتے اور بعض دفعہ گھنٹہ گھنٹہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ اُن کے پاس کھڑے رہتے اور انہیں محبت اور پیار کے ساتھ اسلام کی باتیں پہنچاتے حالانکہ وہ نہایت ادنیٰ طبقہ کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ دو عیسائی غلاموں کے متعلق تاریخ میں ذکر آتا ہے کہ وہ نہایت شوق سے انجیل پڑھا کرتے تھے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے اندر یہ مذہبی جوش پایا تو آپ بہت خوش ہوئے اور آپ نے سمجھا کہ یہ لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کو خدا تعالےٰ کا پیغام پہنچایا جائے۔ چنانچہ آپ اُن کے پاس جاتے اور بڑی بڑی دیر تک اُن کے پاس بیٹھے رہتے وہ عیسائی غلام آہن گری کا کام کرتے تھے۔ وہ لوہا کوٹتے جاتے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس کھڑے ہو کر انہیں تبلیغ کرتے رہتے۔ پس وہ شخص جو گلیوں میں ادنیٰ ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے پاس کھڑا ہو جاتا تھا جو غلاموں کو کئی کئی گھنٹے تبلیغ کرتا رہتا تھا۔ جو غریب اور معمولی طبقہ کے لوگوں سے ملنے میں اپنی کوئی ہتک محسوس نہیں کرتا تھا۔ اُس کے متعلق یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے ایک شخص کی طرف محض اس لئے متوجہ نہ ہوا کہ وہ غریب آدمی تھا۔ جو شخص غلاموں کے ساتھ برسر بازار گفتگو کرنے سے نہیں گھبراتا تھا اور جو شخص اُن کو تبلیغ کرنے میں اپنی کوئی ہتک محسوس نہیں کرتا تھا اُس کے لئے یہ کوئی شرم کی بات نہیں تھی کہ وہ ابن ام مکتوم سے بات کر لیتا بشرطیکہ اخلاق اس بات کی اجازت دیتے۔

(۵) پانچواں ردّ اس کا یہ ہے کہ اگر یہ توبیخ تھی اور اگر اس آیت کے ذریعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ ڈانٹا گیا تھا تو پھر چاہیئے تھا کہ آپ اپنے رویّہ کو بدل لیتے کیونکہ ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کے بعد ابن اُمّ مکتوم کو بلایا اور اُسے کہا کہ بتاؤ تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو تمہاری خاطر تو خدا نے مجھ کو ڈانٹا ہے۔ پس اگر یہ واقعہ درست ہے تو اس کے بعد لازمی طور پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا سابق طریق عمل بدل لینا چاہیئے تھا اور آئندہ یہ دستور العمل بنا لینا چاہیئے تھا کہ جب بھی کوئی شخص آپ کی بات میں دخل دیتا آپ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اپنے سلسلۂ کلام کو منقطع کر دیتے۔ مگر ہمیں تاریخ سے ایسے واقعات نظر آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بعد میں بھی اپنا یہی طریق عمل رکھا۔ چنانچہ بخاری میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا حضور اُس وقت مجلس میں گفتگو فرما رہے تھے اُس نے آپ کے کلام میں دخل دیتے ہوئے ایک سوال کیا مگر آپ نے اُس کا جواب نہیں دیا اور اپنی بات میں ہی مشغول رہے یہاں تک کہ صحابہ کہتے ہیں ہم نے سمجھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم شاید خفا ہو گئے ہیں۔ جب آپ بات ختم کر چکے تو آپ نے فرمایا کہ سائل کہاں ہے؟ اور پھر آپ نے اُس کے سوال کا جواب دیا (بخاری جلد اول کتاب العلم باب مَنْ سُئِلَ عِلْمًا وَهُوَ مُشْتَغِلٌ فِي حَدِيثِهِ فَاتَمَّ الحدیث ثُمَّ اجاب السائل) گویا وہ طریق جو ابن اُمّ مکتوم کے واقعہ کے وقت آپ نے اختیار کیا تھا وہی طریق آپ نے بعد میں بھی جاری رکھا اور جب بھی کسی شخص نے آپ کی گفتگو کے دوران میں دخل دے کر آپ سے کوئی سوال کرنا چاہا آپ نے کبھی اس کا جواب نہیں دیا جب تک اپنی بات کو ختم نہیں کر لیا۔ اور یہ طریق وہ ہے جو نہ صرف مکہ مکرمہ میں بلکہ مدینہ منورہ میں بھی آپ نے جاری رکھا۔ بلکہ جیسا کہ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے آپ کا عام طریق ہی یہ تھا کہ جب تک بات ختم نہ کر لیتے کبھی دوسرے شخص کے سوال کا جواب نہ دیتے وہی شرفاء کا طریق ہے۔ پس اگر واقعہ میں یہ توبیخ ہوتی تو پھر چاہیئے تھا کہ ان آیات کے نزول کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جب بھی کوئی شخص بات کرتا اور جس حالت میں بھی کرتا آپ فوراً اس کا جواب دینا شروع کر دیتے اور سمجھتے کہ میں اُس غلطی کا اعادہ نہ کروں جو ایک دفعہ مجھ سے ہو چکی ہے لیکن آپ نے کبھی اپنے طریق کو نہیں بدلا۔ اور جب آپ نے وہی رویّہ رکھا جو ابن اُمّ مکتوم کے واقعہ کے وقت تھا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ توبیخ کس بات پر تھی اور کس بات پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو روکا گیا تھا؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل تو ثابت کر رہا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کے آخر تک عَبَسَ وَ تَوَلّٰی والی بات پر ہی عمل کیا اور جب بھی کوئی شخص آپ کی بات میں دخل دیتا آپ اُسے پسند نہ فرماتے۔ کیونکہ تداخل سے تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ اثر جاتا رہتا ہے۔ بات پوری نہیں ہوتی اور مضمون کے کئی پہلو ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ پس اگر اس واقعہ کو درست تسلیم کیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ ڈانٹ بھی پڑی مگر آپ پھر بھی نہ مانے۔

۳۷۱ پانچویں دلیل

میں ان دلائل کے بیان کرنے سے پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ عبداللہ بن اُمّ مکتوم کے حالات بتاتے ہیں کہ وہ کوئی ذلیل یا حقیر آدمی نہیں تھے۔ بیشک وہ اندھے تھے لیکن آخر وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں سے تھے حضرت خدیجہؓ کے ماموں زاد بھائی تھے اور باپ اور ماں کی طرف سے بھی مشہور خاندانوں میں سے تھے۔ اس خاندانی اثر کی وجہ سے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ کے تعلقات کی وجہ سے انہیں آپ کا مقرب ہونا چاہیئے تھا اور جیسا کہ واقعات ثابت کرتے ہیں وہ آپ کے مقرب ہی تھے چنانچہ بعد میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا انہیں دو دفعہ اپنے بعد مدینہ کا امیر مقرر کرنا اسی بات کا ثبوت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ان کا احترام پایا جاتا تھا اور آپ ان کے خاندانی اثر کے قائل تھے۔ پس یہ دلیل بھی اس واقعہ کے غلط ہونے کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

سورۃ کی پہلی آیات میں مفسرین کو پیش آنیوالی مشکلات کا حل

میرے نزدیک ان آیات میں ہی خدا تعالیٰ نے ایک حل رکھ دیا ہے جس کی طرف مفسرین نے توجہ نہیں کی۔ اُن کا ذہن ادھر گیا ہے مگر وہ اس کی اَور اَور توجیہیں کرتے رہے ہیں۔ اور وہ حل یہ ہے کہ ان آیات کی بناوٹ اور اُن کی ترتیب پر ہمیں غور کرنا چاہیئے۔ یہ آیات اس طرح ہیں عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی۔ اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی۔ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰٓی۔ اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی۔ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی۔ فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی۔ وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی۔ وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی۔ وَھُوَ یَخْشٰی۔ فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَھّٰی۔ ان آیات میں عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی تین غائب کے صیغے ہیں۔ یعنی کسی نے عُبُوْس اختیار کیا۔ کسی نے تَوَلّی کی اور کسی کے پاس اَعْمٰی آیا۔ لیکن آگے فرماتا ہے وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی۔ تجھ کو کس نے بتایا کہ اس کے متعلق یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ تزکیہ حاصل کرے گا۔ یہاں غائب کی بجائے مخاطب کا صیغہ آگیا۔ اسی طرح اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی میں مخاطب کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے گویا یہاں کچھ غائب کے صیغے ہیں اور کچھ مخاطب کے صیغے ہیں ان غائب اور مخاطب کے صیغوں کے متعلق چار ہی صورتیں ہیں۔ (۱) یا تو ہم غائب اور مخاطب دونوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سمجھیں (۲) یا ہم غائب اور مخاطب دونوں کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے غیر کے متعلق سمجھیں۔ یعنی یا تو ہم یہ سمجھیں کہ عَبَسَ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے اور مَا یُدْرِیْکَ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے اور یا ہم یہ سمجھیں کہ عَبَسَ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کے متعلق ہے اور مَا یُدْرِیْکَ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کے متعلق ہے (۳) اور یا پھر ہم یہ سمجھیں کہ عَبَسَ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے اور مَا یُدْرِیْکَ کسی اور کے متعلق ہے (۴) اور یا پھر ہم یہ سمجھیں کہ عَبَسَ کسی اور کے متعلق ہے اور مَا یُدْرِیْکَ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے۔ یہ چار ہی صورتیں ہیں جو بن سکتی ہیں اور ہمیں یہ تعیین کرنا ہے کہ ان چاروں میں سے اصل بات کیا ہے۔ پہلے ہم اس بات کو لے لیتے ہیں کہ یہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہی نہیں عَبَسَ بھی غیر نے کیا اور مَا یُدْرِیْکَ بھی غیر سے تعلق رکھتا ہے مگر اس طرح چونکہ آیات کے معنے بالکل غیر معقول ہو جاتے ہیں اس لئے ہمیں ان میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ روایات نہایت تواتر سے ابن ام مکتوم کا قصہ بیان کرتی ہیں اور جس قصہ کو اتنے تواتر اور تکرار کے ساتھ مختلف کتب میں بیان کیا جائے وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ بہرحال ماننا پڑتا ہے کہ کوئی واقعہ ہوا ضرور ہے پس اگر ہم عَبَسَ اور مَا یُدْرِیْکَ دونوں کسی غیر کے متعلق قرار دیں تو اس قصہ کو سرے سے جھوٹا کہنا پڑتا ہے اور یہ بات بظاہر ناممکن ہے۔ ہم احادیث اور تاریخ دونوں میں اس واقعہ کا تکرار کے ساتھ ذکر پاتے ہیں اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عَبَسَ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہیں بلکہ کسی اور کے متعلق ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہم عَبَسَ بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق سمجھ لیتے ہیں اور مَا یُدْرِیْکَ میں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب سمجھ لیتے ہیں۔ مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ضمائر کو کیوں بدلا۔ پہلے اُس نے عَبَسَ وَتَوَلّٰی کیوں کہا اور پھر اُس نے مَا یُدْرِیْکَ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیوں کیا؟ مفسرین اس موقعہ پر بیان کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے عَبَسَ وَتَوَلّٰی میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا لحاظ کر کے غائب کے صیغے استعمال فرمائے ہیں اگر مخاطب کے صیغے استعمال کئے جاتے تو آپ کو زیادہ تکلیف ہوتی اس لئے خدا تعالےٰ نے یہ خیال کر کے کہ آپ کو بُرا نہ لگے عَبَسْتَ وَ تَوَلَّیْتَ اَنْ جَآءَکَ الْاَعْمٰی نہیں فرمایا بلکہ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی فرمایا۔ پھر ذرا عتاب کم ہو گیا تو مَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی سے آپ کو خطاب شروع کر دیا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اگلی آیتوں میں عتاب زیادہ ہے کم نہیں ہے۔ اور عَبَسَ وَتَوَلّٰی میں تو عتاب ہے ہی نہیں۔ جیسا کہ

ہیں نے بتایا ہے کہ ایک اندھے کے سامنے عَبُوس اور تَوَلّی
سے کام لینا ہرگز کوئی ایسا فعل نہیں ہے جس سے اُس کی
دلآزاری ہو اور نہ یہ فعل ایسا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے
کوئی عتاب نازل ہونے کا امکان ہو۔ بلکہ یہ تو آپ کے اعلیٰ
درجہ کے اخلاق کا ایک ثبوت تھا۔ پس یہ عجیب بات ہے کہ جہاں
عتاب نہیں تھا وہاں تو اُس نے غائب کے صیغے استعمال کئے
اور جہاں بہت زیادہ عتاب تھا وہاں اُس نے مخاطب کے صیغے
استعمال کرنے شروع کر دئے۔ آخر یہ کتنے سخت الفاظ ہیں کہ
اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی وَمَا عَلَیْكَ
اَلَّا یَزَّكّٰی وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی وَهُوَ یَخْشٰی
فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی۔ کہ جو شخص مستغنی ہے تُو اس کی طرف پوری
توجہ دیتا ہے حالانکہ تجھ پر کوئی اعتراض نہیں اگر وہ پاک نہ ہو اور
جو تیری طرف دوڑتا آتا ہے اور وہ ڈرتا بھی ہے تُو اس سے
بے رغبتی ظاہر کرتا ہے۔ کیا یہ عبوس اور تولّی سے کم خطرناک
الفاظ ہیں؟ پس جہاں واقعہ میں توبیخ کا موقعہ تھا وہاں تو اللہ تعالیٰ
نے مخاطب کے صیغے استعمال کر دئے اور جہاں توبیخ کا کوئی
موقع ہی نہیں تھا بلکہ تعریف کا موقع تھا وہاں اس نے غائب
کے صیغے رکھ دئے۔ گویا تعریف کو تو نظر انداز کر دیا اور توبیخ کے
پہلو کو نمایاں کر دیا۔ پس یہ توجیہ جو مفسرین کی طرف سے کی جاتی
ہے بالکل غلط ہے اور ان کے معنوں کو تسلیم کرتے ہوئے ضمائر کے
بدلنے کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی۔

اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں جن میں سے پہلی یہ ہے کہ
عَبَسَ وَتَوَلّٰی ہم کسی غیر کے متعلق سمجھیں اور وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ
یَزَّكّٰی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرار دیں۔ مگر اس صورت
میں جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ہمیں
اس واقعہ کا انکار کرنا پڑتا ہے جو ابن ام مکتوم کے متعلق احادیث
اور تاریخ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ واقع ایسا ہے جس
کا اس قدر شہادات کے بعد کسی صورت میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا
متواتر تاریخی کتب میں اس واقعہ کو دوہرایا گیا ہے اور صحاح ستہ کی
بعض کتب میں بھی یہ واقع پایا جاتا ہے (ترمذی ابواب التفسیر)
پس اگر ہم عَبَسَ وَتَوَلّٰی کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق
نہ سمجھیں تو ایک بہت بڑے تاریخی واقعہ کو غلط قرار دینا پڑتا ہے
حالانکہ تاریخی ثبوت اُس وقت تک رد نہیں کیا جا سکتا جب تک کوئی
ویسا ہی اہم ثبوت اس کی تردید نہ کر دے۔ اب صرف چوتھی صورت
رہ جاتی ہے کہ عَبَسَ وَتَوَلّٰی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے
متعلق سمجھیں اور وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰی کا خطاب کسی اور
سے قرار دیں۔ اور میرے نزدیک یہی صورت ایسی ہے جس سے اس
مشکل کا حل ہو سکتا ہے اس طرح قصہ کی بناوٹ پر جو زد پڑتی ہے وہ
دُور ہو جاتی ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقام اور آپکی شان پر
بھی کوئی اعتراض واقع نہیں ہو سکتا۔ پس میرے نزدیک عَبَسَ وَ
تَوَلّٰی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہی ہے اور میں سمجھتا
ہوں کہ ابن ام مکتوم کا واقعہ بالکل صحیح ہے کیونکہ تواتر اور تکرار سے
یہ واقعہ مختلف کتب میں بیان کیا گیا ہے اور ہم بغیر کسی قطعی اور
یقینی ثبوت کے جو تاریخی شہادت بھی اپنے اندر رکھتا ہو اس
واقعہ کو رد نہیں کر سکتے۔ بہرحال ابن ام مکتوم آئے اور اُس وقت
آئے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کفار مکہ کے بڑے بڑے
رؤساء کو تبلیغ کر رہے تھے۔ انہیں یہ دیکھ کر جوش پیدا ہوا کہ
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اِن کفار پر اپنے قیمتی وقت کو کیوں ضائع
کر رہے ہیں۔ دنیا میں مختلف طبائع ہوتی ہیں اور وہ اپنے اپنے
رنگ میں خیالات کا اظہار کر دیتی ہیں۔ میں نے احمدیوں میں بھی
دیکھا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جب انہیں معلوم ہو کہ کسی
شدید دشمن کو تبلیغ کی جا رہی ہے تو وہ اُس وقت برداشت نہیں
کر سکتے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ جانے بھی دو یہ مردود لوگ ہیں یہ منہ
لگانے کے قابل نہیں یہ تو دوزخ کی آگ میں جلنے والے ہیں ان پر
اپنا وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گویا دشمن کو دیکھ کر اُن کی
طبیعت میں ایسا جوش پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہ برداشت ہی نہیں
کر سکتے کہ اُن سے باتیں کیوں کی جا رہی ہیں۔ اُن کا نقطۂ نگاہ
یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ تو جہنم کا ایندھن ہیں اسی مخالفت کی حالت
میں مریں گے اور خدا کے غضب کے مستحق ہوں گے انہیں تبلیغ
کرنا۔ خدا اور اس کے رسول کی باتیں سمجھانا اپنے وقت کو ضائع

کرنے کے مترادف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عبداللہ بن ام مکتوم کی طبیعت بھی ایسی ہی ہوگی۔ جب وہ وہاں پہنچے اور انہوں نے دیکھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم عتبہ اور شیبہ اور ابوجہل اور امیہ اور ولید وغیرہ کو تبلیغ کر رہے ہیں تو اُن کا جوش بھڑک اٹھا اور اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ خبیث دشمن جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دن رات گالیاں دینے والے ہیں آپ کی مجلس میں آ کر کیوں بیٹھے ہیں یہ تو جہنم کی آگ کے مورد ہیں ان کا خدا اور اس کے رسول کی باتوں سے کیا تعلق ہے اور ان پر اپنے وقت کو ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ اُن کے دل کے خیالات تھے اور انہی خیالات کے نتیجہ میں انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی باتوں میں دخل دینا شروع کر دیا کہ یا رسول اللہ! آپ عتبہ اور شیبہ اور ابوجہل وغیرہ کو اسلام کی باتیں کیوں بتا رہے ہیں اَقْرِئْنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ تَعَالٰی۔ ان کو دفع کریں اور میری طرف آپ توجہ کریں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اُن کا اس طرح دخل دینا سخت ناگوار گذرا کہ باہر سے مہمان آئے ہوئے ہیں میں اُن سے گفتگو کر رہا ہوں اور میرا ہی ایک مرید حد سے متجاوز ہوتا جا رہا ہے اور ایسا رویہ اختیار کر رہا ہے جو ان مہمانوں کی دلآزاری اور دلشکنی کا موجب ہے۔ اور گو انہوں نے اس وقت کفار کو کوئی گالی نہیں دی مگر بہرحال جب انہوں نے کہہ دیا کہ آپ میری طرف توجہ کریں تو اس کے معنے یہی تھے کہ ان لوگوں کو آپ دفع کریں یہ تو اسلام کے شدید دشمن ہیں انہوں نے اسلام کے احکام کو کہاں ماننا ہے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سمجھتے تھے کہ یہ لوگ خواہ مانیں یا نہ مانیں میرا فرض ہے کہ میں ان کے کانوں تک تمام باتیں پہنچا دوں اور خدا کے حضور بری الذمہ ہو جاؤں۔ غرض عبداللہ بن ام مکتوم نے اپنے جوش میں ایک ایسی حرکت کی جو عقل اور تہذیب کے بالکل خلاف تھی جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ان کو تبلیغ کر رہے تھے تو ان کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ یہ سمجھ لیتے کہ ان کو تبلیغ بے فائدہ ہے آپ کو چاہئے اُن کو چھوڑ کر میری طرف توجہ کریں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ لوگ بعد میں واقع میں جہنمی ہی ثابت ہوئے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے مگر اُس وقت تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہی فرض تھا کہ آپ آنیوالے مہمانوں کی عزت کریں۔ ان کی طرف توجہ کریں اور اُن سے عزت واحترام کے ساتھ باتیں کریں۔ لیکن عبداللہ بن اُم مکتوم کے دل میں خدا تعالیٰ کے احکام کا وہ ادب نہیں ہو سکتا تھا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں تھا۔ اور نہ اُن کو اکرامِ ضیف کا اس قدر احساس ہو سکتا تھا جتنا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کا احساس تھا خصوصاً اندھے میں تو یہ احساس بہت کم ہوتا ہے چونکہ اسے کچھ نظر نہیں آتا اس لئے وہ دوسروں کو کھری کھری سنا دیتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی کہتے ہیں کہ اگر کھری کھری باتیں سُننی ہوں تو کسی اندھے سے جا کر سُن لو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ چونکہ اندھے کو نظر نہیں آتا اس لئے اُسے اس بات کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہوتی۔ کہ لوگوں پر اس کی بات کا کیا اثر ہو رہا ہے۔ غرض عبداللہ بن ام مکتوم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ آپ اشد ترین دشمن کفار کو تبلیغ کر رہے ہیں تو اُن کی طبیعت میں سخت جوش پیدا ہوا وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں اور اُن سے بھی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ تم یہاں سے نکلو تمہارا یہاں کیا کام؟ آخر انہوں نے سوچ کر یہی کیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہنا شروع کر دیا کہ یا رسول اللہ! اَقْرِئْنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ تَعَالٰی اور اس کو بار بار دوہرایا اُن کی یہ بات رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ آئی۔ دوسری طرف آپ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ اُن کا دل ٹوٹے اس لئے اُس وقت آپ نے عبوس اور تولّی سے کام لیا۔ آپ نے خیال فرمایا کہ آخر یہ کفار کے رؤساء کیا کہیں گے کہ یہ مسلمان ایسے تہذیب سے ناآشنا ہیں کہ آدابِ مجلس کا بھی خیال نہیں رکھتے اور یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کوئی شخص اُن کے پاس اُن کی باتیں سننے کے لئے آیا ہوا ہے۔ خواہ وہ منافقت سے آتے تھے۔ خواہ دل میں وہ آپ کی باتوں کو جھوٹا ہی کہتے جاتے تھے مگر چونکہ وہ ظاہر یہ کرتے تھے کہ ہم اسلام کی باتیں سننے کیلئے آئے ہیں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی

# وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝

اور (اے رسول) کونسی بات تجھے (اسپر) آگاہ کرسکتی ہے کہ وہ ضرور پاک ہوجائیگا یا (موجبات عبرت کو) یاد کریگا تو (یہ) یاد کرنا اُسے نفع بخشیگا۔ ۳ؐ*

سمجھتے تھے کہ ان کو تبلیغ کرنا ضروری ہے اس لئے آپ نے ابن اُم مکتوم کی دخل اندازی پر عبوس کیا اور تولّی کی۔ اس واقعہ کی طرف اِن آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى۔ ہمارے رسول نے عبوس کیا اور تولّی کی۔ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى۔ اس موقعہ پر کہ آپ کے پاس ایک اندھا آیا۔ اَلْاَعْمٰى کا لفظ بھی بتلاتا ہے کہ یہاں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اَلْاَعْمٰى سے کوئی خاص اندھا مراد ہے۔ اگر اس جگہ اس اندھے کی تعریف کرنے کا موقعہ ہوتا اور یہ کہنا ہوتا کہ اُس اندھے کی طرف کیوں توجہ نہیں کی گئی یا اُس اندھے نے جو فعل کیا تھا وہ بڑا قابلِ تعریف تھا تو بجائے اَلْاَعْمٰى کہنے کے اس کا نام لیا جاتا اور کہا جاتا کہ فلاں شخص آیا مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عبوس اور تولّی سے کام لیا۔ لیکن اس جگہ چونکہ زد ایک اندھے پر پڑتی تھی اس لئے اس کا نام نہیں لیا گیا اور اَلْاَعْمٰى کہہ کر اشارہ کردیا کہ یہاں ایک خاص واقعہ کا ہم ذکر کررہے ہیں۔ اس وجہ سے اَعْمٰى کے ساتھ اَلْ لگا دیا۔ اور اس طرح ایک مخصوص اندھے کی طرف اشارہ کیا گیا۔ پس اللہ تعالیٰ کا اَلْاَعْمٰى کہنا بتارہا ہے کہ اس واقعہ کی زد اُس اعمٰی پر ہی پڑتی تھی تبھی اُس کا نام نہیں لیا گیا۔ ورنہ اگر یہ تعریف کا موقع ہوتا تو اللہ تعالیٰ ضرور نام لیتا اور کہتا کہ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ اُمِّ مَكْتُوْمٍ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ ادھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق صرف عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى کے الفاظ رکھ دیئے کیونکہ ان دونوں میں آپ کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کی تعریف کی گئی ہے۔

میرے نزدیک واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ بن اُم مکتوم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے اور انہوں نے ایسے رنگ میں سوال کیا جو دوسروں کی دلشکنی کا باعث تھا اور پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کلام بھی قطع ہوتا تھا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن پر اپنی ناراضگی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ صرف اتنا ہوا کہ آپ نے ماتھے پر تیوری چڑھائی۔ اور اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جنکو ایک اندھا شخص دیکھ نہیں سکتا۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی باتیں جاری رکھیں اور عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف کوئی توجہ نہ کی تو وہ غصہ میں اُٹھ کر چلے گئے۔ ممکن ہے انہوں نے بعض اور لوگوں کے پاس بھی اس بات کو بیان کیا ہو اور ممکن ہے جن کے پاس انہوں نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہو ان کی طبیعت بھی اسی قسم کی جوش والی ہو اور ان کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ یہ بات اچھی نہیں ہوئی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ہماری طرف توجہ کرنی چاہیئے یہ خبیث دشمن کون ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آکر بیٹھ جاتے ہیں اور آپ کے وقت کو ضائع کرتے ہیں۔ پس عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے اور وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ میں عبداللہ بن ام مکتوم کی طرح کے خیالات رکھنے والے لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہمارے اس رسول نے ایک اندھے کے بیجا دخل دینے پر عبوست کی اور بڑے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا ثبوت دیا اور ہمارے اس رسول نے صرف تولّی کی اور بڑے اعلیٰ درجہ کے اخلاق کا ثبوت دیا تاکہ غصہ اور ناراضگی کی حالت میں بات بڑھ نہ جائے۔*

## ۳ؐ حل لغات۔ مَا يُدْرِيكَ۔ يُدْرِيكَ

يُدْرِيْ اور كَ سے مرکب ہے۔ يُدْرِيْ اَدْرٰى کا مضارع <sup></sup>

*نوٹ: عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى سے كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ تک کی آیات کا ترجمہ متن میں اس مضمون کے مطابق نہیں کیا گیا جو نوٹ ۲ؐ میں بیان ہوچکا کہ ان آیات کا ترجمہ ایک اور مضمون کے مطابق کیا گیا جو کہ نوٹ ۱ؐ کے ماتحت درج کیا گیا ہے۔ نوٹ ۲ؐ کے ماتحت کیگئی تفسیر کے مطابق ان آیات کا ترجمہ یوں ہوجاتا ہے۔

"وہ چیں بجبیں ہوا اور (اسکی طرف سے) مُنہ موڑ لیا اسوجہ سے کہ اسکے پاس ایک نابینا (جیسے واقف لوگ جانتے ہیں) آیا اور اے معترض کونسی بات تجھے (اسپر) آگاہ کرسکتی ہے کہ وہ ضرور پاک ہوجائیگا یا (موجبات عبرت کو) یاد کریگا تو (یہ) یاد کرنا اُسے نفع بخش دیگا وہ شخص جو بے پرواہی کرتا ہے تو تُو اسکی طرف خوب توجہ کرتا ہے حالانکہ تجھ پر اس (وجہ سے) کوئی الزام نہیں کہ وہ پاک نہ ہوگا۔ اور جو تیری طرف دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ (ساتھ ہی خدا سے) ڈرتا بھی ہے تو تُو اس سے بے اعتنائی کرتا ہے۔ ہرگز نہیں یقیناً یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے۔" نوٹ ۳ؐ۔ لَعَلَّ کا ترجمہ "ضرور" کے لفظ سے کیا گیا ہے اسلئے کہ لَعَلَّ کلام ملوک کے طور پر استعمال ہوتا ہے یعنی بادشاہ کیلئے کوئی اور یا بادشاہ اپنی نسبت خود اُمید اور توقع کے الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن مراد اس سے یقینی بات یا حکم کے ہوتی ہے۔

واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور کاف ضمیر کا ہے۔ اَدْرٰی کے معنے ہیں اَعْلَمَهٗ۔ اُس کو بتایا (اقرب) یُدْرِیْكَ کے معنے ہوں گے اس نے تجھ کو بتایا ہے اور مَا یُدْرِیْكَ کے معنے ہونگے کس نے تجھے بتایا ہے؟ نیز عرب لوگ جب کہتے ہیں مَا یُدْرِیْكَ تو بسا اوقات مراد یہ ہوتی ہے کہ مَا تَدْرِیْ یعنی تو نہیں جانتا۔ تجھے اس کا علم نہیں؟

**یَزَّکّٰی** یَزَّکّٰی اصل میں یَتَزَکّٰی ہے تاء کا زاء میں ادغام کر دیا گیا اور یَتَزَکّٰی سے یَزَّکّٰی ہو گیا۔ تَزَکّٰی فُلَانٌ کے معنے ہوتے ہیں۔ صَارَ زَکِیًّا وہ پاک ہو گیا (اقرب) اور یَتَزَکّٰی کے معنے ہوں گے۔ وہ پاک ہو جاتا ہے۔ اور لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰی کے معنے ہوں گے کہ اُس کیلئے ممکن ہے کہ وہ ہدایت پا جائے۔

**یَذَّکَّرُ** یَذَّکَّرُ:۔ یَذَّکَّرُ اصل میں یَتَذَکَّرُ ہے۔ تاء کو ذال میں ادغام کر دیا گیا۔ اور یَذَّکَّرُ ہو گیا۔ یَتَذَکَّرُ تَذَکَّرَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور تَذَکَّرَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں حَفِظَهٗ فِیْ ذِهْنِهٖ کسی چیز کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ اور جب تَذَکَّرَ مَا کَانَ قَدْ نَسِیَ کہیں تو معنے ہوں گے فَطِنَ بِهٖ کسی بھولی ہوئی بات کو یاد کر لیا۔ (اقرب) پس یَتَذَکَّرُ کے معنے ہوں گے۔ کسی نصیحت والی بات کو ذہن میں وہ محفوظ کر لے (۲) یا کسی نصیحت والی بھولی ہوئی بات کو یاد کر لے۔

**تفسیر**۔ اس آیت کے صاف معنے یہ ہیں کہ تجھ کو کس نے بتایا کہ وہ شخص ہدایت پا جاتا۔ مگر مفسرین اس کے معنے یہ کرتے ہیں کہ تجھ کو کس نے بتایا کہ وہ ہدایت نہ پاتا۔ پھر وہ کہتے ہیں مَا یُدْرِیْكَ الگ جملہ ہے اور لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰی الگ جملہ ہے۔ گویا اس کے معنے وہ اس رنگ میں کرتے ہیں کہ مَا یُدْرِیْكَ تجھے کس نے بتایا ہے کہ وہ ہدایت نہ پاتا لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰی شاید وہ ہدایت پا جاتا۔ حالانکہ اس آیت کے صاف معنے یہ ہیں کہ تجھے کس نے بتایا کہ وہ شخص ضرور فائدہ اٹھاتا۔ یہاں یُدْرِیْكَ سے مراد وہ خیال ہو گا جو بعض مسلمانوں کے دل میں اُس وقت پیدا ہوا یا ہو سکتا تھا۔

پس اللہ تعالیٰ نے فرماتا ہے اے معترض تجھے کس نے بتایا ہے کہ اگر عبد اللہ بن ام مکتوم کی طرف توجہ کی جاتی تو وہ ضرور فائدہ اٹھاتا۔ آخر لوگ مرتد بھی ہو جاتے ہیں اور باوجود ایمان کے بڑے بڑے دعووں کے اُن پر بعض دفعہ ایسا وقت بھی آجاتا ہے جب اُن کی تمام کوششیں ایمان کے خلاف صرف ہونے لگ جاتی ہیں۔ پس جب حالت یہ ہے اور تغیرات کے مختلف دور آتے رہتے ہیں تو تمہارے پاس کونسا ذریعہ ایسا ہے جس سے تمہیں پتہ لگ گیا کہ فلاں شخص کی طرف توجہ کرنا زیادہ مفید تھا۔ انبیاء کا مقام بے شک ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ کسی شخص سے کوئی بات کہیں تو خواہ وہ کیسے ہی اہم کام میں مشغول ہو اور خواہ اُس کو ترک کرنا کتنا ہی تکلیف دِہ ہو اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو ترک کر دے اور نبی کی بات سننے کی طرف متوجہ ہو جائے اور درحقیقت یہی ایمان کی علامت ہے خدا کے رسول کی آواز کے بعد کسی انسان کا کوئی حق نہیں رہتا کہ وہ دوسرے امور کیطرف متوجہ رہے پس مقامِ نبوت رکھنے والا انسان یا اُسکا نائب اگر کسی شخص کو اپنی طرف متوجہ کرے اور وہ شخص مثلاً اُسوقت کسی کو تبلیغ کر رہا ہو تو خواہ قطع کلامی کو لوگ بدتہذیبی سمجھیں اس کا فرض ہوگا کہ وہ تبلیغ کو بند کر دے اور خدا کے رسول اور اس کے نائب کی بات سننے کیطرف متوجہ ہو جائے۔ اگر ابن ام مکتوم تبلیغ کر رہے ہوتے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اُن کو بلاتے تو اُن کا فرض تھا کہ وہ تبلیغ کو چھوڑ دیتے اور اس بات کی پروا نہ کرتے کہ اگر میں نے ایسا کیا تو اس کو تہذیب کے خلاف سمجھا جائے گا۔ مگر عبد اللہ بن ام مکتوم کو یہ مقام حاصل نہیں تھا کہ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تو آپ اُس کی طرف ضرور متوجہ ہو جاتے اور دوسروں کو تبلیغ کرنا چھوڑ دیتے۔ یہ بھی ایک قیاس تھا کہ اگر کفار کی طرف توجہ کی گئی تو ان کو فائدہ نہ ہوگا۔ اور یہ بھی ایک قیاس تھا کہ اگر عبد اللہ بن ام مکتوم کی طرف توجہ کی جاتی تو اُسے فائدہ ہوتا۔ کوئی قطعی اور یقینی بات نہیں تھی اور جب یہ دونوں قیاسی باتیں تھیں تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا فرض تھا کہ اخلاق جس بات کی تائید میں تھے اس کو اختیار کرتے اور

# أَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝

(کیا) جو شخص (حق سے) بے پرواہی کرتا ہے۔ (اس کی طرف) تو تو خوب توجہ کرتا ہے ؟

# وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝

حالانکہ تجھ پر (اس وجہ سے) کوئی الزام نہیں کہ وہ پاک نہ ہوگا۔ ۸ع

جس بات کی اخلاق اجازت نہیں دیتے اس کی طرف توجہ نہ کرتے اسی وجہ سے آپ نے عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف تو توجہ نہ کی اور کفار کی طرف ہی تمام توجہ رکھی۔ پس مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى میں یہ بتایا گیا ہے کہ اے معترض تو جو کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غلطی کی تجھے کس نے بتایا ہے کہ ابن اُم مکتوم کے لئے تزکیہ حاصل کرنا ممکن تھا دوسرے کے لئے نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُس نے بعد میں تزکیہ حاصل کر لیا مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کیا پتہ تھا کہ کل اس کا کیا انجام ہوگا اور یہ ہدایت پر قائم بھی رہے گا یا نہیں۔ بہرحال جب خدا نے کہا ہے کہ جو شخص تمہارے گھر میں آئے تم اس کا احترام کرو اور جب خدا نے یہ کہا ہے کہ جو بات مقدم ہو اسس کو مقدم رکھو اور جو مؤخر ہو اس کو مؤخر رکھو تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کس طرح کر سکتے تھے ؟ اور کس طرح فیصلہ کر سکتے تھے کہ عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف اگر توجہ کی گئی تو وہ ضرور پاک ہو جائے گا اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى یا یہ بھی کس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو سکتا تھا کہ اگر اُسے کچھ نصیحت کی باتیں بتائی گئیں تو وہ اُن سے فائدہ اُٹھائیگا ؟ ممکن ہے کوئی شخص کہہ دیتا کہ اگر زیادہ نہیں تو عبداللہ بن ام مکتوم کچھ تو فائدہ اُٹھا لیتے۔ مگر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ تمہیں اس بات کا بھی کیا علم ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ فائدہ اُٹھاتا یا نہ اُٹھاتا ؟ یہ بھی ایک قیاس ہے اور وہ بھی ایک قیاس ہے۔ اور جب دو قیاس جمع ہو گئے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس قیاس کو ترجیح دے دی جس کے ترجیح دینے سے کم از کم تعریف میں بھی کوئی نقص واقع نہیں ہو سکتا تھا۔ اور خدا تعالےٰ کا یہ قانون بھی پورا ہو جاتا تھا کہ مقدم کو مقدم اور مؤخر کو مؤخر رکھو۔

## ۴ حل لغات

۔ اِسْتَغْنٰى غَنِيَ سے باب استفعال ہے۔ غَنِيَ غِنًا کے معنے ہوتے ہیں۔ وہ مالدار ہو گیا۔ اور اِسْتَغْنٰى کے معنے ہوں گے۔ اُس نے چاہا کہ وہ مالدار ہو جائے۔ نیز اِسْتَغْنٰى عَنْهُ بِهٖ کے معنے ہوتے ہیں اِكْتَفٰى اُس نے ایک چیز کے مل جانے سے دوسری سے لاپرواہی کی (اقرب) پس اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى کے معنے ہونگے (۱) وہ جو مال کا طالب ہے (۲) وہ جو لاپرواہی کرتا ہے۔ (حاشیہ: اِسْتَغْنٰى)

تَصَدّٰى اصل میں تَتَصَدّٰى ہے جو تَصَدّٰى کا مضارع ہے۔ تَصَدّٰى لَهٗ کے معنے ہیں تَعَرَّضَ وَهُوَ الَّذِيْ يَسْتَشْرِفُهٗ نَاظِرًا اِلَيْهِ۔ کسی چیز کے سامنے آیا۔ اور شوق سے اس کو دیکھا۔ اور تَصَدّٰى لِلْاَمْرِ کہیں تو معنے ہوں گے رَفَعَ رَاْسَهٗ اِلَيْهِ اپنا سر اس کی طرف توجہ کے لئے اٹھایا (اقرب) پس تَصَدّٰى کے معنے ہوں گے۔ تو (۱) اس کے سامنے آتا ہے (۲) تو اس کی طرف توجہ دیتا ہے۔ (حاشیہ: تَصَدّٰى)

**تفسیر** ۔ یہاں عام انسانوں کی حالت بیان کرتے ہوئے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اعتراض کرنیوالوں کا اپنا حال بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کی اپنی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ بڑے لوگوں کی طرف تو توجہ کرتے ہیں لیکن چھوٹے درجہ کے آدمیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ گویا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے والوں کو انکی اپنی حالت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اے معترض! تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہتا ہے کہ جو

# وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ وَ هُوَ يَخْشٰى ۙ

اور (کیا) جو تیری طرف دوڑتا ہوا آتا ہے۔ اور وہ (ساتھ ہی خدا سے) ڈرتا بھی ہے

# فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ

تو تُو اُس سے بے اعتنائی کرتا ہے؟ ۵

مستغنی ہوتا ہے اس کی طرف وہ زیادہ توجہ کرتے ہیں اور جو غریب اور معمولی درجہ کا آدمی ہوتا ہے اس کی طرف وہ کوئی توجہ نہیں کرتے۔ حالانکہ اے معترض تُو جو کچھ کہہ رہا ہے یہ تیری اپنی حالت ہے اور تیرا ذاتی رویہ واقعہ میں ایسا ہی ہے کہ تو اُمراء کی طرف توجہ کرتا ہے اور غرباء کو نظر انداز کر دیتا ہے مگر تُو اپنی اس حالت کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتا ہے اور جو الزام خود تجھ پر عائد ہوتا ہے وہ تُو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگا رہا ہے۔ تُو اپنے حالات پر غور کر اور دیکھ کہ کیا یہ سچ نہیں کہ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى جو شخص امیر ہوتا ہے تیری ساری توجہ کا وہ مرکز بن جاتا ہے تَصَدّٰى دراصل تَتَصَدّٰى ہے وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى حالانکہ تجھ پر اس بات کی کوئی ذمہ داری نہیں کہ کون شخص ہدایت پاتا ہے اور کون نہیں پاتا۔ تمہیں خدا تعالےٰ کے قانون کا احترام مدنظر رکھنا چاہیئے اور جو کچھ خدا کہے اُس پر اپنی ذاتی خواہشات کو قربان کر دینا چاہیئے۔ خدا کہے کہ مومن سے بات کرو تو تم مومن سے بات کرو اور اگر خدا کہے کہ کافر سے بات کرو تو تم کافر سے بات کرو۔ مگر تم تو عمداً اور ارادتاً انہی کی طرف توجہ کرتے ہو جو امراء میں شامل ہوتے ہیں حالانکہ یہ صرف خدا کو ہی پتہ ہے کہ کس نے نَازِعَات میں سے بننا ہے اور کس نے نَاشِطَات میں سے بننا ہے۔ تمہارا کام یہی ہے کہ جو خدا تعالیٰ کے مقررہ قواعد ہیں اُن پر عمل کرو۔ خدا تعالےٰ نے اکرام ضیف کا حکم دیا ہے تم اکرامِ ضیف کو ملحوظ رکھو۔ خدا تعالیٰ نے مقدم کو مقدم اور مؤخر کو مؤخر رکھنے کا حکم دیا ہے تمہارا فرض ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو اور اس بات کو نظر انداز کر دو کہ فلاں امیر ہے اور فلاں غریب۔ مگر تمہاری حالت یہ ہے کہ تم امراء کی طرف توجہ رکھتے ہو اور پھر کہتے یہ ہو کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایسا کرتے ہیں حالانکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تو جو کچھ کیا خدائی منشاء کے مطابق کیا۔ اس کے احکام کو انہوں نے ملحوظ رکھا۔ اس کے اوامر کو انہوں نے تسلیم کیا اور اُس کے قوانین کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ مگر تم بجائے اپنی حالت پر غور کرنے کے یہ نقص محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر رہے ہو۔ حالانکہ انہوں نے جو کچھ کیا بالکل بجا اور درست کیا۔

يَسْعٰى ٢ تَلَهّٰى ٢

## ۵ حل لغات

يَسْعٰى سَعٰى سے مضارع کا صیغہ ہے اور سَعٰى کے معنے ہیں۔ قَصَدَ اُس نے ارادہ کیا۔ اور جب سَعَى الرَّجُلُ کہیں تو معنے ہوں گے مَشٰى وَعَدَا یعنی وہ دوڑ کر چلا (اقرب) پس يَسْعٰى کے معنے ہوں گے وُہ دوڑ کر آتا ہے (۲) وہ قصد کرتا ہے۔

تَلَهّٰى اصل میں تَتَلَهّٰى ہے جو تَلَهّٰى سے مضارع ہے اور تَتَلَهّٰى کے معنے ہیں۔ تَتَشَاغَلُ تُو ایک سے توجہ ہٹا کر دوسرے کی طرف متوجہ ہوتا ہے (لسان)

## تفسیر

اس آیت میں خدا تعالےٰ نے کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ نہیں کیا مگر اس سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ یہ آیت ابن ام مکتوم والے واقعہ پر چسپاں نہیں ہوسکتی کیونکہ ابن ام مکتوم تو اندھے تھے وہ دوڑتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس کس طرح آسکتے تھے۔ پھر ابن ام مکتوم تو اتنے دلیر آدمی تھے کہ مکہ کے بڑے بڑے رؤساء بیٹھے ہیں اور وہ آتے ہی اُن کو ڈانٹنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ خدا اور اُس کے رسول کے دشمن یہاں بیٹھے ہی کیوں ہیں۔ یہ تو مردود لوگ ہیں ان کی طرف توجہ کرنا اپنے وقت کو

ضائع کرتا ہے مگر یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَهُوَ يَخْشٰى ساتھ ہی وہ ڈرتا بھی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا عبداللہ بن ام مکتوم والے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں بھی درحقیقت لوگوں کے اندرونی اخلاق کا ایک عام نقشہ کھینچا گیا ہے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنیوالوں کو جواب دیا گیا ہے کہ تم ہمارے رسول پر کیا اعتراض کرتے ہو تمہاری تو اپنی حالت یہ ہے کہ تمہارے پاس اگر کوئی غریب شخص دوڑا دوڑا آئے تو تم اس کی طرف منہ بھی نہیں کرتے لیکن اگر کوئی امیر آجائے تو صرف اتنی بات پر ہی خوش ہو جاتے ہو کہ وہ امیر تمہارے پاس چل کر آیا اور تم اس پر خوشی سے اپنے جامہ میں پھولے نہیں سماتے۔ پس یہ تمہاری اپنی حالت ہے ہمارا رسول ایسا نہیں۔ ہمارے رسول کے متعلق یہ کہنا کہ وہ امیروں کیطرف زیادہ توجہ کرتا ہے اور غرباء کو نظر انداز کر دیتا ہے صریح ظلم ہے۔ ہاں تمہاری حالت یہی ہے اور اس کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں چنانچہ واقعہ میں اگر دنیا پر غور کرکے دیکھا جائے تو لوگوں کے دلوں میں اس بات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ کسی امیر شخص سے انہیں گفتگو کرنے کا موقعہ مل جائے مگر اللہ تعالیٰ کے انبیاء ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک دفعہ لاہور یا امرتسر کے سٹیشن پر تھے کہ پنڈت لیکھرام بھی وہاں آپہنچے اور اس نے آپکو آکر سلام کیا۔ چونکہ پنڈت لیکھرام آریہ سماج میں بہت بڑی حیثیت رکھتے تھے اس لئے جو لوگ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ تھے وہ بہت خوش ہوئے کہ لیکھرام آپ کو سلام کرنے کے لئے آیا ہے۔ مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انکی طرف ذرا بھی توجہ نہ کی اور جب یہ سمجھ کر کہ شاید آپ نے دیکھا نہیں کہ پنڈت لیکھرام صاحب سلام کر رہے ہیں آپ کو اس طرف توجہ دلائی گئی تو آپ نے بڑے جوش سے فرمایا کہ اسے شرم نہیں آتی کہ میرے آقا کو تو گالیاں دیتا ہے اور مجھے آکر سلام کرتا ہے۔ گویا آپ نے اس بات کی ذرا بھی پروا نہ کی کہ لیکھرام آیا ہے لیکن عام لوگوں کے نزدیک سب سے بڑی کامیابی یہی ہوتی ہے کہ کسی بڑے رئیس یا لیڈر سے اُن کو ملنے کا اتفاق ہو جائے۔ چنانچہ جب کوئی ایسا شخص اُن کے پاس آتا ہے وہ بڑی توجہ سے اُس سے ملتے ہیں لیکن اگر کوئی غریب شخص آجائے تو پروا بھی نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ معترضین کو اُن کے اسی نقص کی طرف توجہ دلاتا ہے اور بتاتا ہے کہ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى۔ تمہاری اپنی حالت یہ ہے کہ جو شخص تمہارے پاس دوڑتا ہوا آئے اور ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت بھی اپنے دل میں رکھتا ہو لیکن امارت اس میں نہ ہو تم اُس سے غافل رہتے ہو۔ پس وہ لوگ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اُن کو زجر کیا ہے کہ تم ہمارے رسول پر کیا اعتراض کرتے ہو جاؤ اور اپنے اخلاق کو دیکھو۔ تمہاری حالت یہ ہے کہ جب تمہارے پاس کوئی بڑا آدمی آجائے تو تم اُس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے ہو۔ اس کیطرف تم اپنی تمام توجہ صرف کر دیتے ہو لیکن اگر کوئی مسکین اور غریب آدمی آجائے تو تم اُس سے منہ پھیر لیتے ہو اور اُس سے بات تک کرنا گوارا نہیں کرتے۔ تمہارا اعتراض آخر کیا ہے یہی کہ عبداللہ بن ام مکتوم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ نے اس کی طرف توجہ نہ کی حالانکہ اُس وقت آپ کا اس کی طرف توجہ نہ کرنا ہی ضروری تھا۔ اُس نے مجلس میں آکر ایک نامناسب حرکت کی خلافِ اخلاق حرکت کی۔ خلاف آداب حرکت کی اور وہ یقیناً اسی بات کا مستحق تھا کہ اس کی طرف توجہ نہ کی جاتی مگر تم اس پر اعتراض کر رہے ہو اور تم یہ نہیں دیکھتے کہ ایک جائز فعل پر تو اعتراض کر رہے ہو اور تمہاری اپنی حالت یہ ہے کہ تم امیروں کی طرف تو توجہ رکھتے ہو غریبوں کو اپنی خاطر میں ہی نہیں لاتے۔

غرض اُن چاروں باتوں میں سے جن کو میں تفصیل کے ساتھ اوپر بیان کر چکا ہوں اس موقعہ پر ایک ہی بات چسپاں ہوتی ہے۔ میرے نزدیک عَبَسَ وَتَوَلّٰى رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہی ہے اور میرے نزدیک ایک اندھے کے آنے پر آپ کا عبوس اور تولّی اختیار کرنا

اعلیٰ درجے کا قابلِ تعریف فعل ہے اور یہ آیت بھی آپ کے اخلاق کی تعریف کے لئے ہی نازل ہوئی ہے مذمت کے لئے نازل نہیں ہوئی۔ مذمت والے معنے کرکے آیات کی ترتیب قائم ہی نہیں رہتی میں نے بتایا ہے کہ ان آیات میں غائب کے صیغے شروع ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد ہی مخاطب کے صیغے شروع ہو جاتے ہیں صیغوں کی یہ تبدیلی کسی حکمت کے بغیر نہیں ہو سکتی اور وہ حکمت یہی ہے کہ پہلے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی گئی ہے اور پھر کفار یا بعض ناتربیت یافتہ مسلمانوں کے دلوں میں اِس واقعہ سے جو وساوس پیدا ہوئے تھے یا ہو سکتے تھے اُن کا ازالہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل اللہ تعالےٰ کے منشا اور اُس کے احکام کے بالکل مطابق تھا آپ پر اعتراض کرنیوالوں کی اپنی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اُمراء اور غرباء میں تفاوت کرتے ہیں۔ وہ بڑوں اور چھوٹوں میں امتیاز روا رکھتے ہیں مگر ہمارا رسول ایسا نہیں ہے پس عَبَسَ وَتَوَلّٰی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرنیکے بعد وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰی میں معترضین کو مخاطب کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تمہارا اعتراض بالکل بیہودہ ہے تمہیں کونسا یقینی علم اِس بات کا ہے کہ ابن ام مکتوم کی طرف اگر توجہ کی جاتی تو وہ ضرور فائدہ اٹھاتا یا تمہیں کونسا الہام ہوا ہے کہ ابن ام مکتوم کا فائدہ اٹھانا زیادہ قرینِ قیاس تھا۔ صرف تمہارا قیاس ہی ہے کہ اس کی طرف توجہ کرنا زیادہ بہتر تھا۔ اور جب یہ صرف قیاس تھا کسی یقینی اور قطعی علم پر اِس کی بنیاد نہیں تھی تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مقدم کو مقدم رکھا اور اکرامِ ضیف کے حکم کو بھی نظر انداز نہ ہونے دیا اور ابن ام مکتوم کی دخل اندازی پر ایسے رنگ میں ناراضگی کیا جس سے اندھے کو کوئی خاص تکلیف نہیں ہو سکتی تھی۔ پس آپ نے جو کچھ کیا بالکل درست کیا لیکن اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتراض کرنے والو! تمہارے اپنے اخلاق یہی ہیں مگر تم الزام ہمارے رسول پر لگاتے ہو۔ انبیاءؑ پر الزام لگانا یا اُن پر کوئی بیجا اعتراض کرنا بہت خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ اپنے انبیاءؑ کے متعلق بہت بڑی غیرت رکھتا ہے۔ اسی غیرت کا مظاہرہ اللہ تعالیٰ نے اِسجگہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ کمزوری خود تمہارے اندر پائی جاتی ہے اور تمہارے اپنے اخلاق ایسے ہی ہیں۔

ابن ام مکتوم کے ایسے دخل پر چپ رہ کر خاموشی اختیار کر کے آنحضرت کے بہترین اخلاق کا اظہار

میں نے دیکھا ہے بیسیوں دفعہ منافق مجھ پر کئی قسم کے اعتراض کرتے ہیں میں اُن کے جواب میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ یہ اعتراض تو صحیح ہیں مگر مجھ پر نہیں بلکہ خود تم پر پڑتے ہیں کیونکہ تمہارے اپنے اعمال بتا رہے ہیں کہ تم میں یہ یہ خرابیاں پائی جاتی ہیں یہی طریق اللہ تعالےٰ نے اِسجگہ اختیار کیا ہے کہ جہانتک اِس اعتراض کا تعلق ہے کہ بعض لوگ غریبوں کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اُمراء کیطرف توجہ کر لیتے ہیں یہ تو بالکل صحیح اور درست ہے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا بلکہ معترضین کے اندر بیشک یہ کمزوری پائی جاتی ہے اور ہم انکی اِس کمزوری کو تسلیم کرتے ہیں۔ گویا ایکطرف اللہ تعالےٰ نے اِس اعتراض کو صحیح قرار دیا اور دوسری طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراض کیا جاتا تھا اُسکو غلط قرار دیدیا اور مسلمانوں کو نصیحت کر دی کہ مسلمانوں میں سے جدید العہد یا کمزوروں میں سے بعض لوگ چونکہ خود اُن کے اندر یہ نقائص پائے جاتے ہیں اس لئے وہ اِن نقائص کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں حرج نہیں سمجھتے تمہیں اِن باتوں سے بچنا چاہیئے اور رسول کے متعلق مقامِ ادب پر کھڑا ہونا چاہیئے۔

احادیث کی مدد ہوں کو نظر انداز کر کے صحیح معنی عَبَسَ وَتَوَلّٰی کے

اگر روایتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تب تو آسانی سے اِن آیات کے یہ معنے کئے جا سکتے ہیں کہ عَبَسَ وَتَوَلّٰی کافر کی نسبت ہے اور مراد یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جب رؤساء مشرکین بیٹھے ہوئے تھے ایک اندھا آیا اور اُس نے کچھ سیکھنا چاہا اس پر ایک کافر سردار نے عبوست کا اظہار کیا۔ اور مُنہ پھیر لیا۔ گویا اِس امر کو کہ آپ کے پاس ایک اندھا سیکھنے آیا ہے ایک حقیر امر سمجھا اور اس پر حقارت کا اظہار مُنہ پھیر لینے سے کیا۔ اس پر فرماتا ہے اے عبوست اور تولّی کرنے والے! تجھے کیا معلوم ہے یہ شخص تو تزکیہ حاصل کریگا یا نصیحت سُنیگا اور اُس سے فائدہ اٹھائے گا اور بطور دوست اور شاگرد ایسا ہی آدمی مفید ہوتا ہے اور عقلمند ایسے ہی انسان کی عزت کرتے ہیں۔

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهُ ۝

وقف لازم

(دیکھو) ہرگز نہیں (یہ سب الزامات غلط ہیں) یقیناً یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے پس جو چاہے اسے اپنے ذہن میں مستحضر کرلے ؀۶

باقی رہا مالدار اور بظاہری ترقی یافتہ سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بڑا مال کے آنے پر ناک بھوں چڑھانے والے تو تو ایسے ہی آدمی کی طرف لپکتا ہے اور اُسی کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اور تجھے اس کا کوئی احساس نہیں ہوتا کہ وہ پاک ہوتا ہے یا بدکار رہتا ہے تجھے تو اس سے غرض ہے کہ وہ مالدار اور دولتمند ہو پھر کسی اور شے کی پروا نہیں۔ اور دوسرا شخص جو تیری طرف دوڑتا آتا ہے (یعنی سوالی یا حاجتمند) اور اس کا دل ڈرتا ہوتا ہے کہ یہ بڑا آدمی ہے میری بات بھی سنتا ہے یا نہیں۔ تو نہ اُس کو اپنی عنایت کا امیدوار سمجھ کر اُس کی قدر کرتا ہے اور نہ اُس کی مسکینی اور دردمند ہوتے ہوئے دل کا خیال کرتا ہے اور اُسے کہہ دیتا ہے ہمیں فرصت نہیں اور سمجھتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اندھوں اور اپاہجوں کی طرف توجہ کرنا اُس کے ادنیٰ ہونے کی علامت ہے اور تیرا مالداروں کی صحبت کا متلاشی ہونا تیرے بڑے ہونے کی علامت ہے مگر یہ امر درست نہیں کیونکہ قابلِ توجہ وہی ہے جس کی اصلاح اور پاکیزگی کی امید کی جائے۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل مستحسن ہے اور تیرا ناک بھوں چڑھانا ناواجب ہے۔ ان آیات میں بتایا ہے کہ اسلام کے آئندہ سپاہی امراء سے نہیں چُنے جائیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ اُن کا انتخاب اُن ارواحِ طیبہ سے کریگا جو صداقت کو ماننے اور پاکیزگی کو حاصل کرنے کی تڑپ رکھتی ہیں۔ گویا اَلنَّازِعَات اَلنَّاشِطَات وغیرہ ارواح جن کا اُوپر ذکر ہوا تھا اُن کی نسبت بتایا ہے کہ اُن کی جستجو مالداروں اور رؤساء میں نہ کرو اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ کمیں اور دبکی بیٹھی ہیں اللہ تعالیٰ ہی اُن کو چُنے گا۔

؀۶ **تفسیر**۔ اُن معنوں کے لحاظ سے جنکو اوپر بیان کیا جاچکا ہے کَلَّا کا لفظ اس کمزور انسان کے متعلق سمجھا جائے گا جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق شبہ کیا اور اپنے دل میں بعض ایسے وساوس کو آنے دیا جو اعلیٰ درجہ کے ایمان کے خلاف تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کَلَّا ہرگز یوں بات نہیں جیسا کہ تم خیال کرتے ہو۔ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ یہ چیز جو ہماری طرف سے آئی ہے یہ تو ایک نصیحت کے طور پر ہے۔ یعنی قرآن کریم خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک نصیحت نامہ کے طور پر نازل ہوا ہے اور اس کے نزول سے ہماری غرض یہ ہے کہ دُنیا کے تمام لوگ ہدایت پائیں پس جبکہ اس کتاب کی غرض لوگوں کو ہدایت کے راستہ پر قائم کرنا ہے تو بنی نوع انسان میں سے جس شخص کے قلب کو بھی اس ہدایت سے مناسبت ہوگی وہ اس کو ضرور قبول کریگا کیونکہ جب یہ چیز اُسی زمین میں پنپ سکتی ہے جو اس کے مناسبِ حال ہو تو وہ لوگ جو اس سے مناسبت نہیں رکھتے ہوں گے وہ اس کی طرف آئیں گے ہی نہیں۔ اور جو لوگ اُس سے مناسبت رکھتے ہوں گے وہ خود بخود آجائیں گے اُن کو چُننے اور انتخاب کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوسکتا ہے۔ میں نے جیسا کہ شروع میں بیان کیا تھا سورۃ نازعات کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ یہ نَازِعَات اور نَاشِطَات بننے والی روحیں آئیں گی کہاں سے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمہارے دل میں یہ سوال کیوں پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں کہاں سے آئیں گے جب ہم نے خود ان لوگوں کو چُننا ہے اور جب ان کا انتخاب ہمارے ہاتھوں میں ہے تو تمہیں اس کے متعلق کسی فکر کی ضرورت نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ نَازِعَات اور نَاشِطَات بننے والی قابلیتوں کے حامل کون کون لوگ ہیں اور آیا وہ امراء میں ہیں یا غرباء میں یا امراء اور غرباء دونوں میں ہیں۔ ہم اُن کے ذاتی اوصاف سے آگاہ ہیں ہمیں اُن کی مخفی قابلیتوں کا علم ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کسی میں کیا کیا خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے ہم خود ان عظیم الشان امور کی سرانجام دہی کے لئے قابلیتیں رکھنے والے نفوس کو کھینچ کھینچ کر لائیں گے قطع نظر اس کے کہ ایسے نفوس امراء میں ہوں یا غرباء میں۔ چنانچہ دیکھ لو حضرت عثمانؓ اسلام میں داخل ہوئے جو مکہ کے

؀۶ كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ میں ابن ام مکتوم کے متعلق آنحضرت پر اعتراض کرنے والوں کا جواب۔

مالدار خاندان میں سے تھے اور طلحہؓ اور زبیرؓ بھی اسلام میں داخل ہوئے جو چوٹی کے رئیس خاندانوں میں سے تھے گو اُس وقت قوم کے منتخب لیڈر نہ تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ دولت اپنے ساتھ نہیں لائے لیکن حضرت عثمان اپنے ساتھ دولت بھی لائے۔ گویا امراء اور معزز خاندانوں میں سے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے مناسب حال پایا اُن کو کھینچ لایا اور جن کو غرباء میں سے اسلام کے مناسب حال دیکھا اُن کو غرباء میں سے کھینچ لایا۔

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے ہماری جماعت کے ایک دوست تھے شیخ غلام احمد صاحب مرحوم اُن کو اپنے متعلق تصوّف میں دخل رکھنے کا خاص خیال تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ تصوّف کے متعلق جو اُن کا نظریہ ہے وہی سب دنیا کا ہونا چاہیئے۔ ایک دفعہ وہ مجھ سے ملے اور کہنے لگے بتائیے آپ کو غریب اچھے لگتے ہیں یا امیر اچھے لگتے ہیں۔ میں نے پہلے تو اُن کو ٹالنا چاہا مگر جب بار بار اور اصرار کے ساتھ انہوں نے یہ سوال کیا تو میں نے اُنہیں کہا کہ مجھے نہ امیر اچھے لگتے ہیں نہ غریب اچھے لگتے ہیں نہ امیر بُرے لگتے ہیں نہ غریب بُرے لگتے ہیں۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ جہاں تک خدا تعالیٰ کے کام کا تعلق ہے اس کو سرانجام دینے کے لئے وہ میرے ساتھ کسی امیر کو وابستہ کرتا ہے یا کسی غریب کو وابستہ کرتا ہے۔ اگر میرے کام کے لئے وہ ایک غریب کو چُنتا ہے تو وہی مجھے اچھا لگتا ہے اور اگر میرے کام کے لئے وہ ایک امیر کو چُنتا ہے تو وہی مجھے اچھا لگتا ہے میں تو اللہ تعالیٰ کے اشارہ کی طرف نگاہ رکھتا ہوں کہ وہ کس آدمی کو کام کے لئے میرے ساتھ وابستہ کر رہا ہے۔ اگر امیر ہو تو مجھے اُس امیر سے محبت ہو جاتی ہے اور اگر غریب ہو تو مجھے اُس غریب سے محبت ہو جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی یہ سُنت ہے کہ وہ اپنے کام کے لئے امیروں کو بھی چُنتا ہے اور غریبوں کو بھی چُنتا ہے مگر اکثر وہ غریبوں میں سے چُنتا ہے اور اگر کوئی امیر چُنا جاتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ خاندانی لحاظ سے اللہ تعالیٰ اسکو آگے لانا پسند کرتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ذاتی قابلیتوں کے لحاظ سے وہ اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اُسے آگے لایا جائے مگر چونکہ خاندانی عظمت کا جوہر بھی اُس کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے نبی کی جماعت میں وہ عزت پا جاتا ہے۔۔

یہ مضمون ہے جو اللہ تعالیٰ اس آیت میں بیان فرما رہا ہے کہ كَلَّآ اِنَّهَا تَذۡكِرَةٌ۔ یہ قرآن تو ایک نصیحت کی کتاب ہے جو چاہے اسے پڑھے اور جو چاہے اس سے فائدہ اُٹھالے۔ اس میں نبی کا کوئی واسطہ نہیں۔ خدا تعالیٰ نے مختلف لوگوں کی طبائع اس کے مطابق بنا دی ہیں اور وہ آہستہ آہستہ اس سے فائدہ اٹھاتے چلے جائیں گے ان کے راستہ میں کوئی چیز روک نہیں بن سکتی اگر امیر کو اس کے ساتھ قلبی مناسبت ہے تو اس امیر کو روکا نہیں جا سکتا اور اگر ایک غریب کو اس کے ساتھ قلبی مناسبت ہے تو اُس غریب کو روکا نہیں جا سکتا۔ فَمَنۡ شَآءَ ذَكَرَهٗ۔ یہ خیال کر لینا کہ دین صرف غریبوں کے لئے ہی ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ دین غریبوں کے لئے بھی ہے اور دین امیروں کیلئے بھی ہے جو چاہے خدا تعالیٰ کے دین میں داخل ہو کر فائدہ اٹھا لے اور اللہ تعالیٰ کے قرب میں بڑھ جائے ہم نے کسی کو روکا ہوا نہیں۔ یہی فقرہ ہے جو میں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق کہا اور جس پر آج کل خاص طور پر شور پڑا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قرب کے راستوں کو محدود نہیں کیا۔ اُس نے اپنے فرشتوں کو اعلیٰ درجہ کے روحانی مدارج پر اس لئے نہیں کھڑا کر دیا کہ اب کسی کو آگے مت بڑھنے دو۔ خدا تعالیٰ کے قرب کے راستے کھلے ہیں اور کھلے رہیں گے یہاں تک کہ اگر کوئی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کے قرب میں بڑھنا چاہے تو وہ بڑھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی روک نہیں اگر کوئی بڑھ سکتا ہے تو بڑھ کر دکھا دے۔ مگر جب کسی نے اب تک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر نہیں دکھایا اور نہ آئندہ دکھا سکتا ہے تو گو حقیقت یہی ہوگی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سب سے افضل ہیں مگر کہا یہی جائے گا کہ خدا تعالیٰ نے جبراً آپ کو اس مقام پر نہیں پہنچایا اور نہ اُس نے زبردستی طور پر دوسروں کو بڑھنے سے روکا۔ خدا تعالیٰ کے قرب کے راستے کھلے ہیں اور اگر کوئی شخص بڑھنا

جا ہے تو پڑھ سکتا ہے۔ یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمایا ہے کہ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ہماری طرف سے کوئی روک نہیں قرآن تو ساری دنیا کے لئے ہے۔ امیر کے لئے بھی ہے اور غریب کے لئے بھی ہے۔ عالم کے لئے بھی ہے اور جاہل کے لئے بھی ہے۔ کالے کے لئے بھی ہے اور گورے کے لئے بھی ہے۔ مشرقی کے لئے بھی ہے اور مغربی کے لئے بھی ہے۔ جو چاہے اس سے فائدہ اٹھالے۔

اِنَّهَا میں هَا کی ضمیر ہدایت اور موعظت کی طرف جاتی ہے گویا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ کے معنے یہ ہیں کہ اِنَّ الْهِدَايَةَ الَّتِيْ جَآءَتْ مِنَ اللّٰهِ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ اَيِ الْقُرْاٰنَ۔ پس جو چاہے اس کلام سے جو ہم نے نازل کیا ہے فائدہ اٹھالے۔ هَا کی ضمیر دونوں طرف جا سکتی ہے ذِكْرٰی کی طرف بھی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور قرآن کی طرف بھی۔ مگر اگلی آیات میں چونکہ خصوصیت سے قرآن کریم کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے وہی مراد ہے اور اس امر کو ظاہر کرنے کے لئے ایک جگہ مؤنث کی ضمیر یعنی ھا کو استعمال کر دیا اور آگے ذَكَرَهٗ میں مذکر کی استعمال کر کے بتا دیا کہ مراد قرآن کریم ہے ہاں اس کی صفت تذکیر کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا مقصود ہے اس لئے اس کی طرف مؤنث کی ضمیر پھیری گئی ہے۔

**ایک نیا نکتہ** آیات مذکورۃ الصدر کے ایک اور لطیف معنے بھی ہو سکتے ہیں۔ اور انہی کے مطابق میں نے ترجمہ کیا ہے اور وہ معنے یوں ہیں کہ اس جگہ کلام طنزیہ ہے جیسے کہ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (دخان ع۳ پ۲۵) یعنی یہ جہنم کا کھانا کھا تُو تو بہت ہی طاقت ور اور معزز تھا۔ مطلب یہ کہ تُو اپنے آپ کو طاقتور اور معزز کہا کرتا تھا حالانکہ تو نہ طاقتور تھا اور نہ معزز تھا یہ سب تیرے نفس کا فریب تھا اگر تُو اپنے خیال کے مطابق ہوتا تو آج تجھ کو جہنم کی ذلیل غذائیں کیوں کھانی پڑتیں۔ صاحب کشاف کہتے ہیں کہ یہ آیت ھزء اور تہکم کی قسم سے ہے یعنی دشمن کے قول کی بظاہر تصدیق کی گئی ہے لیکن اصل میں اس کی تردید مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہارا یہ قول بالکل خلاف عقل ہے۔

دوسری زبانوں میں بھی یہ کلام طنز استعمال ہوتا ہے چنانچہ اُردو میں بھی اگر کوئی شخص کسی کا دوست ہو اور ہمیشہ اس کی خیر خواہی کرتا رہا ہو اور وہ دوسرا شخص کسی موقعہ پر اس کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کر دے جو خیر خواہی کے خلاف ہو تو وہ دوست اُسے جواب میں کہتا ہے "ہاں ہاں کیوں نہیں میں تمہارا دشمن جو ہُوا" اور مراد اس کی یہ ہوتی ہے کہ مَیں تو تمہارا دوست ہوں اور ہمیشہ تمہاری خیر خواہی کرتا رہا ہوں تم ایسا الزام مجھ پر کس طرح لگا سکتے ہو۔ غرض مدنظر تو تردید ہوتی ہے لیکن ظاہر میں انسان اس قول کی تائید کرتا ہے۔ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (دخان ع۳ پ۲۵) میں بھی یہی طریق کلام استعمال کیا گیا ہو۔ دشمن کہا کرتا تھا کہ میں عزیز و کریم ہوں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ ذلیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کے دن ہم اُسے دوزخ میں ڈالیں گے اور اُسے کہیں گے لو یہ عذاب چکھو اس لئے کہ تم عزیز و کریم ہو اور مطلب اس کا یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو عزیز و کریم کہنے میں جھوٹے تھے۔ اگر تم عزیز و کریم ہوتے تو یہ عذاب تمہیں کیوں دیا جاتا۔ اسی رنگ کا کلام میرے نزدیک اس سورۃ میں بھی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک دفعہ ایک اندھا آیا۔ اس نے ایک بے موقعہ بات کی اور آپ کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار ظاہر ہوئے۔ لیکن آپ نے اپنی ناپسندیدگی کو دبانے کے لئے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ کفار تو مومنوں میں

اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ میں ھا کی ضمیر کا مرجع

سورۃ عبس کی پہلی آیات کے ایک اور لطیف معنے

پھوٹ ڈلوانے کی ہمیشہ کوشش کیا ہی کرتے ہیں جب کفار کو اِس واقعہ کا علم ہؤا اور کیوں نہ معلوم ہوتا کہ خود کفار ہی کی موجودگی میں یہ واقعہ ہؤا تھا تو کفار نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے اِس واقعہ سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور یہ مشہور کرنا شروع کیا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک غریب ساتھی کی بڑی ہتک کی ہے صرف اس لئے کہ وہ غریب تھا جب آپؐ کے پاس شرفاءِ مکہ بیٹھے تھے اس کے آنے پر آپؐ ناراض ہو گئے۔ اور اس ذریعہ سے مسلمانوں کے دلوں میں تذبذب اور شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالےٰ اُن کے اِس اعتراض کی کمزوری اور لغویّت ظاہر کرنے کے لئے طنز اور تہکم کے رنگ میں اس اعتراض کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى۔ ہمارے رسول نے تیوری چڑھائی اور مُنہ پھیر لیا صرف اتنی سی بات پر کہ ابن اُمِّ مکتوم اُس کے پاس آیا۔ اور مطلب یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ظاہر ہیں اور دوست و دشمن اُن سے واقف ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ہی غرباء کے ساتھ رہتی تھی اور غرباء کی جماعت ہی آپؐ کے اردگرد بیٹھتی تھی جو شخص غلاموں کی آزادی اور غریبوں، بیواؤں یتیموں اور مسکینوں کی ترقی کے لئے رات دن مشغول رہتا ہو اُس پر یہ الزام لگانا کہ صرف اس وجہ سے کہ ایک اندھا اس کے پاس آیا تھا اُس نے تیوری چڑھائی اور مُنہ پھیر لیا۔ کوئی عقلمند اِس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ پس یہ الزام خود اپنی ذات میں اپنی تردید کر رہا ہے۔ جیسے کہتے ہیں آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ سورج کا نکلنا ہی سورج ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ محمدؐ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف اِس امر کا منسوب کرنا ہی اِس الزام کا کافی جواب ہے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ پھر وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى

آنحضرتؐ کے اخلاق کو پیش کر کے آنحضرتؐ پر ابن ام مکتوم کے متعلق اعتراض کرنیوالوں کا مُنہ توڑ جواب۔

کہہ کر اِس تردید کو دلیل عقلی سے بھی مکمل کر دیا اور فرمایا کہ اندھے یا سوجاکھے کا سوال نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا کیا علم ہو سکتا تھا کہ کون سا شخص ہدایت پائے گا اور کون سا نہیں۔ کون ہدایت پر قائم رہے گا اور کون پھسل جائے گا۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو ظاہری شریعت کے پابند ہیں اور غیب کے علم میں دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔ غیب کا علم خدا کے پاس ہے اور وہی جانتا ہے کہ جو لوگ آج کافر نظر آتے ہیں وہ مرتے وقت کیا ہوں گے اور جو لوگ آج مومن نظر آتے ہیں وہ مرتے وقت کیا ہوں گے۔ ہماری شریعت کا ظاہری حکم یہی ہے کہ جو شخص ہم سے بات کر رہا ہو ہم پہلے اُس کی طرف توجہ کریں اور بعد میں آنے والا اپنے موقع کا انتظار کرے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شریعت کے اس حکم پر عمل کیا اور خدا کے حکم کو پورا کر دیا۔ غیب کا آپؐ کو علم نہیں تھا کہ آپؐ کہہ سکتے کہ کِس کو تبلیغ کرنا وقت کو ضائع کرنا ہے اور کِس کو تبلیغ کرنا وقت کو صحیح طور پر استعمال کرنا ہے! ایک وقت وہ تھا کہ بلالؓ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اسلام کے لئے تکلیفیں اُٹھا رہا تھا۔ جلتی ریت پر اُس کو لٹایا جاتا۔ کھُردرے پتھروں پر اُس کو گھسیٹا جاتا اور نوجوان اُس کے ننگے سینہ پر چڑھ چڑھ کر کُودتے تاکہ اُسے اسلام سے پھرا دیں اور عمرؓ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مارنے کے لئے تلوار لئے پھرتے تھے لیکن بعد کے واقعات نے کیا بتایا۔ بے شک بلالؓ کا انجام بہت ہی اچھا ہؤا مگر جس مقام کو عمرؓ پہنچے بلالؓ تو نہیں پہنچے۔ پس محض اس لئے کہ کوئی شخص اُس وقت کافر تھا اور کوئی دوسرا شخص اُس وقت مسلمان تھا اس کو بنا قرار دیتے ہوئے شریعت کا ظاہری حکم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

کس طرح توڑ سکتے تھے۔ آپؐ کو کیا معلوم تھا کہ وہ ظاہر میں کافر نظر آنے والے لوگ آئندہ کیا بننے والے تھے۔ چنانچہ بعض روایات میں آتا ہے کہ اُن میں حضرت عباسؓ بھی تھے۔ اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ابن اُمّ مکتوم عباسؓ کے درجہ کو نہیں پہنچے۔ حضرت عباسؓ سے جو شوکت اسلام کو پہنچی اور خلفاءِ اسلام ان کی زندگی میں جس طرح اُن کا مشورہ لیتے اور اس پر عمل کرتے تھے وہ اُن کے عالی مقام پر شاہد ہے۔ پس مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰۤی اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرٰی میں خدا تعالیٰ نے عام طریق استدلال سے بھی اِس اعتراض کو رد کر دیا۔ پھر اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی کہہ کر اسی قسم کے تہکم والے کلام کی طرف دوبارہ رجوع کیا اور کفار کا یہ بقیہ اعتراض دُہرایا کہ یہی جو محمدؐ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف توجہ نہیں کرتا اُس کی طرف بوجہ اُس کے عالی مرتبہ ہونے کے آپؐ بڑی توجہ کرتے ہیں۔ اِس اعتراض کو بھی ھزء اور تہکم کے طور پر اِس طرح دُہرایا گیا ہے گویا اِس اعتراض کی صحت کو قبول کر لیا گیا ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح وہ شخص جس کا انصاف ظاہر ہو معترض کے جواب میں کہتا ہے۔ ہاں ہاں میں تو ظالم ہوں ہی لیکن اِس اعتراض کے دُہرانے کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ میرے وجود کی طرف اِس اعتراض کا منسوب ہونا ہی اِس کے غلط ہونے کا ثبوت ہے۔ اِس جگہ اِس اعتراض کے نقل کرنے سے بھی یہی مراد ہے کہ ایسا ہرگز نہیں۔ چنانچہ پہلے اعتراض کی طرح یہاں بھی بعد میں اس اعتراض کے رد کرنے کی عقلی دلیل بیان فرما دی اور فرمایا کہ وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّکّٰی یہ اعتراض ہی بالبداہت غلط ہے۔ تیرے متعلق یہ کتنا خلافِ عقل بات ہے۔ اگر یہ لوگ سمجھ سے کام لیں تو ان کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اُن کفار کا جو مجلس میں بیٹھے تھے ہدایت پانا یا نہ پاتا نہ تیرے اختیار میں ہے نہ تیرے سپرد ہے۔ گویا پہلی آیات میں تو یہ بتایا گیا تھا کہ ابن اُمّ مکتوم کا ہدایت پر مرنا تیرے علم کی بات نہیں اور اِس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کفار کے ہدایت نہ پانے پر تجھ سے کوئی بازپُرس نہ ہونی تھی پھر کس ذاتی غرض سے تُو نے ابن اُمّ مکتوم کی طرف توجہ نہ کی اور کس فائدہ کی وجہ سے تُو نے ان کفار کی طرف توجہ کی نہ تو ابن اُمّ مکتوم کی طرف توجہ نہ کرنے میں تیرا کوئی فائدہ تھا۔ اور نہ اُن کفار کی طرف توجہ کرنے میں تیرا کوئی فائدہ تھا پس اِن واقعات کی موجودگی میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اِس واقعہ کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ (وہ وجہ وہی تھی جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یعنی شریعت کے ظاہری احکام کی پابندی۔)

اِس کے بعد فرماتا ہے وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی۔ وَهُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی یہ بھی کفار کا ہی قول ہے اور بطور ھزء و تہکم اِسے یوں بیان کیا گیا ہے گویا واقعہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ کفار یہ بھی کہتے ہیں کہ جو شخص تیری طرف دوڑتا ہوا آتا ہے اور جو خدا سے ڈرتا ہے اس کی طرف سے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) بے اعتنائی کرتے ہیں۔ چونکہ یہ ھزء اور تہکم کے طور پر عبارت ہے اس لئے اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ میرے اِن معنوں کا قطعی اور یقینی ثبوت اِس بات سے ملتا ہے کہ ان آیات کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْکِرَةٌ اور کَلَّاۤ کے معنے ہوتے ہیں جو پہلی بات کہی گئی ہے وہ غلط ہے اب یہ صاف بات ہے کہ پہلی بات جو کہی گئی ہے وہ وہی اعتراض ہیں جو دشمنوں کی طرف سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر کئے گئے ہیں یعنی آپؐ نے ایک اندھے کے معاملہ میں بداخلاقی سے کام لیا اور بعض دولت مندوں کی طرف زیادہ توجہ کی۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جس بات کی

عَبَسَ وَتَوَلّٰی کے غلط ہونے کی تائید کَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْکِرَةٌ سے۔

تردید کرے ہم اس کی تصدیق کریں۔ کَلَّا کے لفظ نے بتا دیا ہے کہ یہ سب اعتراضات غلط ہیں۔ پس جتنی باتیں پہلے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اعتراض والی بیان ہوئی ہیں وہ بطور رمز اور تہکم کے بیان کی گئی ہیں اور ظاہر الفاظ تو تصدیق کے ہیں لیکن اصل مراد انکار ہے جیسا کہ اس طریقِ کلام کا قاعدہ ہے۔

کَلَّا کے معنے یہی ہوا کرتے ہیں کہ اس سے پہلے جو بات مذکور ہو اس کا اس کلام سے سختی سے ردّ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کلیات ابی البقاء میں لکھا ہے قَالَ عَمْرُو بْنُ عَبْدِ اللّٰہِ اِذَا سَمِعْتَ اللّٰہَ یَقُوْلُ کَلَّا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ کَذَبْتَ یعنی عمرو بن عبد اللہ فرماتے ہیں جب تم خدا کے کلام میں کَلَّا کا لفظ پڑھو تو سمجھ لو کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ پہلی باتوں کا کہنے والا جھوٹا ہے۔ پس کَلَّا اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ کے معنے یہ ہوئے کہ پہلے جو اعتراضات بیان کئے گئے ہیں وہ جھوٹے ہیں اور ان کے جھوٹے ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن کریم ایک نصیحت کی کتاب ہے کافر کو سنانا بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فرض ہے اور مومن کو سنانا بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فرض ہو۔ پس اگر آپ قرآن شریف کفار کو سنا رہے تھے تو ایک مومن کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ درمیان میں بولتا۔ اور اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو بالکل ٹھیک کیا۔

کَلَّا کا استعمال کلامِ عرب میں

مغنی اللبیب میں کَلَّا کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا ہے عِنْدَ سِیْبَوَیْہِ وَالْخَلِیْلِ وَالْمُبَرِّدِ وَالزَّجَّاجِ وَاَکْثَرِ الْبَصْرِیِّیْنَ حَرْفٌ مَعْنَاہُ الرَّدْعُ وَالزَّجْرُ لَا مَعْنٰی لَھَا عِنْدَھُمْ اِلَّا ذَالِکَ حَتّٰی اِنَّھُمْ یُجِیْزُوْنَ اَبَدًا اَلْوَقْفَ عَلَیْھَا وَالْاِبْتِدَاءُ بِمَا بَعْدَھَا وَحَتّٰی قَالَ جَمَاعَۃٌ مِّنْھُمْ مَتٰی سَمِعْتَ کَلَّا فِیْ سُوْرَۃٍ فَاحْکُمْ بِاَنَّھَا مَکِّیَّۃٌ لِاَنَّ فِیْھَا مَعْنَی التَّھْدِیْدِ وَالْوَعِیْدِ وَاَکْثَرُ مَا نَزَلَ ذَالِکَ بِمَکَّۃَ لِاَنَّ اَکْثَرَ الْعُتُوِّ کَانَ بِھَا۔ یعنی سیبویہ اور خلیل اور مبرد اور زجاج اور اکثر بصری کہتے ہیں کہ اس کے معنے زجر اور تردید کے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک اس کے سوا کَلَّا کے اور کوئی معنے ہی نہیں ہیں یہاں تک کہ وہ لوگ اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ ہمیشہ کَلَّا کے لفظ پر وقف کر لینا اور مابعد کے فقرہ کو ایک نیا جملہ فرض کر لینا چاہیئے۔ اور ان میں سے ایک جماعت تو یہاں تک کہتی ہے کہ جب کسی سورۃ میں کَلَّا کا لفظ آئے تو سمجھ لو کہ وہ مکی ہے کیوں کہ اس لفظ کے معنوں میں ڈرانے اور دھمکی دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے اور زیادہ تر یہ لفظ مکی سورتوں میں اترا ہے کیونکہ اکثر شرارتیں اور زیادتیاں مکہ میں ہی ہوا کرتی تھیں اس پر صاحبِ مغنی نے بے شک اعتراض کیا ہے کہ قرآن شریف میں جو یہ آتا ہے کہ یٰۤاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ۔ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ۔ کَلَّا بَلْ تُکَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ (الانفطار ع۱) اس میں کوئی تہدید یا وعید نظر نہیں آتا مگر یہ اعتراض بالبداہت باطل ہے اس لئے کہ قرآن کریم نے خود ہی بتا دیا ہے کہ کَلَّا کے لفظ سے پہلے اعتراض ہی مراد تھا کیونکہ فرماتا ہے بَلْ تُکَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ تم جزاء سزاء کو جھٹلاتے ہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیات میں ان لوگوں کا ردّ تھا جو جزاء سزاء کے منکر ہیں۔ پس جب ایسے لوگوں کا ذکر تھا جو جزاء سزاء کے منکر تھے اور انہی کی تردید کی جا رہی تھی۔ تو کَلَّا میں وعید اور تہدید مراد نہیں ہوگی تو کیا

فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍۙ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۙ بِاَیْدِیْ

(وہ قرآن ایسے) صحیفوں میں ہے (جو) عزت والے ہیں بلند شان (اور) پاک ہیں (لکھنے والوں اور دُور دُور) سفر

سَفَرَةٍۙ کِرَامٍۭ بَرَرَةٍؕ

۵ع

کرنے والوں کے ہاتھوں میں (ہیں) (ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں جو) معزز ہیں اور اعلیٰ درجہ کے نیکوکار ہیں۔

پیار مرلو ہوگا؟

غرض بڑے بڑے نحویوں اور ادیبوں کی نگاہ میں کَلَّا کا لفظ منکرین اور مخالفین کے لئے استعمال ہوتا ہے اور تہدید اور وعید اس میں شامل ہوتی ہے۔ پس کَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ سے معلوم ہوا کہ پہلے اقوال خدا تعالیٰ کے مصدق نہیں بلکہ منکروں اور دشمنانِ اسلام کے ہیں جن کو ردّ کیا گیا ہے تبھی تو ہر اعتراض کے بعد اللہ تعالیٰ اُن کی تردید کرتا ہے اگر واقعہ اسی طرح ہوتا اور یہ الزام وہ ہوتے جن کی خدا تعالیٰ تصدیق کرتا ہے تو پھر ان آیات کے بعد کَلَّا کے استعمال کے کیا معنے تھے؟ پھر تو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ یہ الزام بالکل سچے ہیں۔ پس پہلے الزام بیان کرنا اور پھر کَلَّا کہنا بتاتا ہے کہ یہ الزام دشمنوں کی طرف سے غلط طور پر لگائے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں محض ھزء اور تہکم کے رنگ میں اُن کا ذکر کیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہمارے رسول کو یوں کہا جاتا ہے۔ مگر یہ بالکل جھوٹ ہے وہ ایسا نہیں بلکہ ان تمام الزامات سے پاک ہے ؏

**حل لغات** ۔ مُكَرَّمَةٌ كَرَّمَ سے ہے اور كَرَّمَ کے معنے ہوتے ہیں عَظَّمَ وَنَزَّهَ اس کی بڑائی بیان کی اور اس کو عیوب سے منزّہ قرار دیا (اقرب) اور مُكَرَّمَةٌ کے معنے ہوئے مُعَظَّمَةٌ وَمُنَزَّهَةٌ عَنْ كُلِّ خَطَاءٍ وَنَقْصٍ یعنی وہ جن کی عظمت بیان کی جاتی ہے اور جن کو تمام نقائص خرابیوں اور عیوب سے مبرّا قرار دیا جاتا ہے۔

مَرْفُوْعَةٌ رَفَعَ سے ہے اور رَفَعَهٗ (رَفْعًا) کے معنے ہوتے ہیں ضِدُّ وَضَعَهٗ اس کو اوپر کیا۔ بلند کیا۔ اور جب رَفَعَ اِلَى السُّلْطَانِ (رُفْعَانًا) کہیں تو معنے ہوں گے قَرَّبَهٗ کہ اس کو بادشاہ کا مقرب بنا دیا (اقرب)

مُطَهَّرَةٌ طَهَّرَ سے ہے اور طَهَّرَهٗ کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَهٗ طَاهِرًا۔ اُس کو پاک قرار دیا (اقرب)

سَفَرَةٌ ۔ اَلسَّافِرُ کی جمع ہے اور اس کے دو معنے ہوتے ہیں۔ ایک تو مسافر کے۔ ان معنوں میں اس کا کوئی فعل نہیں آتا۔ دوسرے معنے اس کے کاتب کے ہوتے ہیں (اقرب)

كِرَامٌ ۔ كَرِيْمٌ کی جمع ہے اور اس کے معنے معزز اور بزرگ لوگوں کے ہیں (اقرب) کبھی کبھی لفظ کَرِیْم ایسے سخی آدمی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو لوگوں کو بہت ہی نفع پہنچائے اور کَرِیْم اُس چیز کو بھی کہتے ہیں جو اپنی جنس میں سے بہترین ہو چنانچہ عرب کہتے ہیں اَلْكَرِيْمُ مِنْ كُلِّ قَوْمٍ اور انکی مراد یہ ہوتی ہے کہ مَا يَجْمَعُ فَضَائِلَهٗ کہ فلاں شخص ساری قوم میں سے کریم ہے یعنی ساری قوم کی خوبیاں اس میں پائی جاتی ہیں۔ اقرب کے مؤلف لکھتے ہیں "اَلْكَرِيْمُ مَنْ يُّوْصِلُ النَّفْعَ بِلَا عِوَضٍ فَالْكَرَمُ هُوَ اِفَادَةُ مَا يَنْبَغِيْ لَا لِعِوَضٍ" یعنی کریم ایسے شخص کو کہتے ہیں جو لوگوں کو نفع پہنچائے اور کسی سے معاوضہ کی خواہش نہ کرے (اقرب) پس کِرَام کے معنے ہوں گے (۱) سخی (۲) بزرگ (۳) قوم میں سے بہترین۔ (۴) ایسے لوگ جنہیں لوگوں کو بلا معاوضہ فائدہ پہنچانے کا جنون ہو۔

مَرْفُوْعَةٌ سَفَرَةٌ كِرَامٌ مُكَرَّمَةٌ

بَرَرَةٍ

بَرَرَةٌ جمع ہے اَلْبَرُّ وَالْبَارُّ کی جو کہ بَرَّ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور بَرَّ وَالِدَہٗ کے معنے ہیں اَحْسَنَ الطَّاعَۃَ اِلَیْہِ وَرَفَقَ بِہٖ وَتَحَرّٰی مَحَابَّہٗ وَتَوَقّٰی مَکَارِھَہٗ (اقرب) کہ اُس نے اپنے والد کی پوری اطاعت کی اور اُس کے ساتھ نرمی سے پیش آیا اور اُسکی خوشنودی کے ذرائع کو تلاش کیا اور اُن پر عمل کیا اور ہر ایک اُس بات سے بچا جو اُس کے والد کو ناراض کرے۔

**تفسیر**۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ قرآن ایسے صحیفوں میں ہے جو مُکَرَّمَۃٍ ہیں مَرْفُوْعَۃٍ ہیں اور مُطَہَّرَۃٍ ہیں۔

فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ میں سُوَرِ قرآن کی طرف اشارہ۔

اسجگہ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے صُحُف کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو جمع پر دلالت کرتا ہے صَحِیْفَۃ کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس میں درحقیقت قرآن کریم کی سورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے ماتحت الگ الگ ٹکڑوں میں نازل ہوئی ہیں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ان مختلف ٹکڑوں کو آپس میں یونہی جوڑ دیا گیا ہے کسی خاص حکمت کو مدنظر نہیں رکھا گیا مگر قرآن نہ صرف اُن کے علیحدہ علیحدہ نزول کو بلکہ اُن کے علیحدہ علیحدہ وجود کو تسلیم کرتا ہے اور ہر سورۃ کو ایک صحیفہ قرار دیتا ہے۔ گویا صُحُف کہہ کر اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ قرآن کریم کی ہر سورۃ اپنی ذات میں ایک علیحدہ اور مستقل مضمون رکھتی ہے ورنہ وہ صحیفہ نہیں کہلا سکتی تھی۔

صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ کے الفاظ میں اس طرف اشارہ کہ قرآن مجید میں سب انبیاء کی تعلیم جمع کر دی گئی ہے۔

دوسرے صُحُف کہہ کر اُس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جس کا صُحُفِ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی (الاعلیٰ ع ۱) کے الفاظ میں ذکر آتا ہے یعنی صُحُف کہکر اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ صحف سابقہ کی تمام اعلیٰ درجہ کی اخلاقی اور روحانی تعلیموں کو جو انسانی فطرت کے مناسب حال تھیں اس قرآن میں جمع کر دیا گیا ہے گویا کتاب تو ایک ہی ہے مگر اس میں تمام انبیاء کے صحیفے جمع ہیں اسی لئے اس کے لئے جمع کا لفظ لایا گیا اور صحیفہ کی بجائے صحف کہا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کو بھی صحف اسی لئے کہا گیا ہے کہ اُس میں آپ سے پہلے تمام انبیاء کی تعلیمیں جمع تھیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفہ کو بھی اسی لئے صحف کہا گیا کہ اُس میں نوحؑ اور بعض دوسرے انبیاءؑ کے صحیفے جمع تھے۔ اور پھر قرآن کو بھی صحف کہا گیا کیونکہ قرآن وہ کتاب ہے جس نے آدمؑ سے لیکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک آنے والے تمام انبیاء کے صحف کو اپنے اندر جمع کر لیا اور کوئی تعلیم ایسی نہیں رہی جس کی بنی نوع انسان کو ضرورت ہو اور اس کا قرآن کریم میں ذکر نہ آتا ہو۔ گویا جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء کہا گیا ان معنوں میں کہ آپؐ کے وجود میں تمام انبیاء سابقین جمع ہو گئے تھے اسی طرح آپؐ کی کتاب کو صحف کہا گیا کیونکہ اس میں تمام انبیاءِ سابقین کے صحیفوں کو جمع کر دیا گیا تھا درحقیقت کوئی نبی دُنیا میں ایسا نہیں آیا جو اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی صحیفہ نہ لایا ہو مگر اسکے معنے یہ نہیں کہ وہ شریعت جدیدہ لایا یا احکام جدیدہ لایا۔ صحیفہ سے مراد ایک پیغام حقیقت ہے جو اُسوقت کے مناسب حال ہو، اسی وجہ سے قرآن کریم میں صحفِ ابراہیم کا ذکر ہے۔ حالانکہ وہ حامل شریعتِ جدیدہ نہ تھے حضرت نوحؑ کے تابع تھے جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے اِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِبْرٰھِیْمَ (صافات ع ۳)، آدمؑ مبعوث ہوا تو وہ اپنے ساتھ پہلا صحیفہ لایا۔ اسکے بعد اگر نوحؑ دوسرا نبی ہوا ہے تو نوحؑ کا صحیفہ صحیفتین کہلائے گا کیونکہ اُس میں آدمؑ کا بھی صحیفہ تھا اور نوحؑ کا بھی صحیفہ تھا۔ پھر جوں جوں انبیاء آتے گئے وہ اپنے سے پہلے آنیوالے انبیاء کی تعلیموں کے بھی حامل رہے یہاں تک کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور آپؐ کو جو کتاب دی گئی اُس میں تمام پہلے انبیاء کے صحیفوں کو شامل کر دیا گیا۔ اسلئے وہ کتاب کوئی ایک صحیفہ نہیں بلکہ کئی صحف کا مجموعہ ہے اسی لئے قرآن نے اس کے لئے فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ (المرسلات ع ۱) کہکر مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کی طرف اشارہ کر دیا حالانکہ آنے والا صرف ایک رسول تھا مگر چونکہ اس کی رسالت میں گذشتہ تمام انبیاء کی رسالت بھی شامل ہو جانی تھی

اور وہ ہر گذشتہ نبی کا بروز ہونیوالا تھا اُسے رسول کی بجائے رُسل کہا گیا۔ یہی وہ بات ہے جسکا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہام میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جَرِیُّ اللّٰہِ فِیْ حُلَلِ الْاَنْبِیَاءِ اللہ کا جری جو تمام انبیاء کا لباس پہنکر اس دُنیا میں آیا ہے۔ اسی طرح قرآن ایک صحیفہ نہیں بلکہ وہ مجموعہ ہے اُن تمام تعلیموں کا جو گذشتہ انبیاء کو دی گئیں اور پھر وہ مجموعہ ہے اُس نادر تعلیم کا بھی جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پہ نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ یہ قرآن ایسے صحف میں ہے جو مکرمہ ہیں۔ مرفوعہ ہیں اور مطہرہ ہیں۔ یہاں ایک لطیف قرآنی ترتیب کا منظر پیش کیا گیا ہے کہ ایک طرف تو قرآن کی یہ تین صفات بیان کی گئی ہیں (۱) مُكَرَّمَة (۲) مَرْفُوْعَة (۳) مُطَهَّرَة اور دوسری طرف وہ لوگ جنہوں نے حاملین قرآن بننا تھا ان کی بھی تین صفات بیان کی گئی ہیں۔ (۱) سَفَرَة (۲) كِرَام (۳) بَرَرَة۔

قرآن کریم کی پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مُكَرَّمَة ہے مُكَرَّمَة کے معنے عربی زبان میں مُعَظَّمَةٌ وَ مُنَزَّهَةٌ عَنْ كُلِّ خَطَاءٍ وَ نَقْصٍ کے ہوتے ہیں یعنی ہر قسم کی خرابی اور نقص سے پاک۔ گویا پہلی بات قرآن کریم کے متعلق یہ بتائی کہ وہ بزرگ کتاب ہے اور دُنیا میں اسکی عزت کی جائے گی۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ دُنیا میں جو بھی الہامی کتاب موجود ہے اسکی عزت اس کتاب کو ماننے والے لوگوں کے دلوں میں پائی جاتی ہے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بعض کتابوں کو زیادہ عزت حاصل ہوتی ہے اور بعض کو کم عزت حاصل ہوتی ہے اور جب ہر الہامی کتاب کی اسکے ماننے والے عزت کرتے ہیں تو قرآن کریم کو خاص طور پر مُكَرَّمَة کہنا اس امر کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ یہ وہ کتاب ہے جس کی اور تمام الہامی کتابوں سے زیادہ عزت کی جائیگی کیونکہ وہ کتاب جس کی پہلے ہی عزت کی جاتی ہو جب اُس کے متعلق کہا جائے کہ وہ مُكَرَّمَة ہے تو لازماً اس کے یہ معنے ہونگے کہ اس کی عزت نسبتی طور پر دوسری کتب سے بہت زیادہ کی جائیگی۔ چنانچہ دیکھ لو دُنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس کی عزت قرآن کریم سے بڑھکر کی جاتی ہو۔ اس کتاب کو لوگ حفظ کرتے ہیں۔ یہ کتاب نمازوں میں پڑھی جاتی ہے۔ اور پھر اس کتاب پر عمل کرنیوالی قوم دُنیا میں موجود ہے لیکن کوئی کتاب ایسی نہیں جس پر عمل کرنیوالی قوم دُنیا میں موجود ہو۔ وید پر عمل کرنیوالے کہیں نظر نہیں آتے۔ تورات پر عمل کرنیوالے بہت شاذونادر دکھائی دیتے ہیں اور جو لوگ عمل کرتے ہیں ان کا عمل اس قسم کا ہوتا ہے جسے پنجابی میں "اُدھ پچدھا" کہتے ہیں یعنی کسی بات پر عمل کیا اور کسی پر نہ کیا۔ انجیل تو عملی لحاظ سے بالکل ختم ہے ابھی گذشتہ دنوں انگلستان میں پادریوں نے انجیل کی تعلیم کے خلاف یہ فتویٰ دے دیا تھا کہ عورتیں ننگے سر گرجا میں جا سکتی ہیں۔ ہمارے مبلغ مولوی جلال الدین صاحب شمس نے اُن کو پکڑا کہ تم نے یہ کیا فتویٰ دیدیا تمہاری انجیلی تعلیم تو اسکے مخالف ہے۔ مگر انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے کہدیا شریعت لعنت ہے جب شریعت اُن کے نزدیک لعنت بن گئی تو اس پر عمل کرنیکی تحریک اُن کے دلوں میں کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس پر اس تنزل کے زمانہ میں بھی عمل کیا جاتا ہے ہم خواہ غیر احمدیوں کو کچھ کہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لاکھوں کروڑوں مسلمان آج بھی ایسے نظر آتے ہیں جنکے دلوں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ وہ قرآن پر عمل کریں اور خواہ کس قدر کوئی بے عمل ہو اُسکے دل کے اندرونی گوشوں میں یہ خواہش موجود ہوتی ہے کہ میں قرآن پر عمل کروں اور اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کروں۔ یہ تو اس زمانہ تنزل کا حال ہے۔ اپنے دَور میں تو قرآن پر وہ عمل ہوا ہے کہ جسکی کوئی حد ہی نہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ پر قرآن نے حکومت کی اور ایسی شاندار حکومت کی جس کی مثال دُنیا کی تاریخ میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔

دوسرے معنے مُكَرَّمَة کے مُنَزَّهَةٌ عَنْ كُلِّ خَطَاءٍ وَ نَقْصٍ کے ہوتے ہیں کہ وہ چیز ہر قسم کی خرابی اور نقص سے پاک ہو۔ یہ خوبی بھی قرآن میں پائی جاتی ہے کہ اس میں

لطیفہ: مُكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ کے مقابل میں سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ کہکر ایک لطیف مضمون کی طرف اشارہ۔

کوئی غیر بات داخل نہیں۔ اور تو اور قرآن کریم میں
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی قول کو بھی برداشت
نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی حدیث ایسی ہو جو صحاح ستہ میں سے
ہر حدیث کی کتاب میں آتی ہو اور ہر محدث اس حدیث کی صحت پر
متفق ہو تو پھر بھی قرآن میں اُس حدیث کو درج نہیں کیا جا سکتا
پس خدا نے قرآن کو ایسا بنایا ہے کہ وہ تمام قسم کی غیر باتوں سے
پاک ہے یہاں تک کہ ہم دیکھتے ہیں دشمن سے دشمن کو بھی یہ تسلیم
کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا کہ قرآن ہر قسم کی انسانی دست بُرد سے
پاک ہے۔ میور جیسا شدید دشمن اسلام بھی جو قرآن پر جگہ جگہ
اعتراض کرتا ہے جب اس مقام پر پہنچتا ہے تو اُسے سوائے یہ
کہنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ قرآن جس شکل میں آج سے
ساڑھے تیرہ سو سال پہلے تھا اسی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ وہ
اپنی کتاب میں ایک جگہ اس امر پر بحث کرتا ہے اور کہتا ہے
فلاں پادری نے یہ کہا ہے اور فلاں پادری نے یہ لکھا ہے مگر وہ
ان سب کے دلائل کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے سچی بات یہ ہے کہ
قرآن کریم سے متعلق ہم یقینی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس شکل میں
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ قرآن دنیا کے سامنے
پیش کیا تھا اُسی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ نولڈکے
NOLDEKE مشہور جرمن مستشرق بھی قرآن کی اس خوبی کا
اعتراف کرتا ہے اور باوجود دشمن ہونے کے اُس نے بھی تسلیم
کیا ہے کہ قرآن پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ وہ انسانی دستبرد
کا شکار ہو گیا۔ نولڈکے NOLDEKE اسلام کا دشمن
ہے مگر تمام مستشرقین یورپ میں سے سب سے زیادہ تحقیق اُس
نے کی ہے اور میں نے دیکھا ہے بعض دفعہ صحیح حقیقت پر اُس کی
غضب کی نظر پڑتی ہے معلوم ہوتا ہے اُس نے بڑے سچے طور پر
قرآن پر غور کیا تھا۔ وہ بھی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ میں یہ
قطعاً مان نہیں سکتا کہ قرآن میں کوئی اور بات داخل کر دی
گئی ہو وہ اسی طرح دوسرے لوگوں کے دخل سے پاک ہے
جس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پاک تھا
وہ کہتا ہے تم بے شک یہ کہہ لو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے یہ قرآن بنایا مگر تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس قرآن میں کوئی
تبدیلی ہو گئی۔ جس طرح وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
زمانہ میں تھا اُسی طرح وہ اس زمانہ میں بھی ہے۔ پس یہ قرآن
مُکَرَّمَۃ ہے یعنی ہر قسم کی خطاء لفظی و معنوی سے پاک ہے۔
اور دنیا کی کوئی کتاب اس خوبی میں قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مُکَرَّمَۃ کے لفظ میں قرآن مجید کے محفوظ رہنے کی پیشگوئی

اس کے مقابلہ میں حاملین قرآن کی جو صفات بیان کی
گئی ہیں اُن میں سے پہلی صفت سَفَرَۃ ہے گویا مُکَرَّمَۃ
کے مقابل پر اللہ تعالیٰ نے سَفَرَۃ کو رکھا ہے اور بتایا ہے کہ
اس کی بزرگی کا ذریعہ اللہ تعالیٰ سَفَرَۃ کو بنائے گا۔ سَفَرَۃ
کے معنے یا مسافر کے ہوتے ہیں یا پھر کاتب کے ہوتے ہیں۔

سَفَرَۃ کے لفظ میں اس طرف اشارہ کہ قرآن کریم دنیا میں پھیل جائیگا

پہلے معنوں کے لحاظ سے اس میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن
دنیا میں یکدم پھیل جائے گا کیونکہ وہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں
ہوگا جو مسافر ہوں گے۔ مطلب یہ کہ مسلمان اس کو لیکر نکل جائیں گے
اور دنیا کے کونہ کونہ میں اس کی تعلیم پہنچا دیں گے چنانچہ تاریخ
سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے
معًا بعد کچھ صحابہ ایران میں چلے گئے۔ کچھ افغانستان میں چلے گئے
کچھ چین کی طرف نکل گئے۔ کچھ جزائر کی طرف چلے گئے اور اس طرح
ایک طرف چین کے انتہائی کناروں تک اور دوسری طرف الجزائر
تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی زندگی میں ہی قرآن پھیل
گیا۔ گویا جتنی معلومہ دنیا تھی اُس میں قرآن کی تعلیم صحابہؓ کے
ہاتھ سے پھیل گئی بلکہ بعض ممالک کے لوگ اب تک اس بات
کے مدعی ہیں کہ صحابہؓ کی لائی ہوئی قرآن کی کاپیاں اُن کے
پاس موجود ہیں۔ تو فرماتا ہے بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ۔ یہ قرآن
اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو بڑے سفر کرنے والے ہوں گے
اور اس طرح قرآن کی اشاعت کا کام سرانجام دیں گے۔

سَفَرَۃ کے لفظ میں قرآن کے لکھے جانے کی طرف اشارہ

سَفَرَۃ کے ایک معنے چونکہ کاتب کے بھی ہیں اس لئے
بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ کہہ کر قرآن کریم کے لکھنے کی طرف اشارہ
کیا گیا اور بتایا گیا کہ یہ قرآن اُن لوگوں کے ہاتھ میں جائے گا
جو کاتب ہوں گے اور یہ قرآن صرف زبانوں پر ہی نہیں رہیگا
بلکہ فوراً ضبط تحریر میں آجائے گا۔ پس اس آیت سے صحابہؓ

کے زمانہ میں ہی قرآن کریم کا لکھا جانا ثابت ہوتا ہے۔ دشمن اعتراض کرتا ہے کہ قرآن کریم بعد میں لکھا گیا حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ۔ جس قوم کے ہاتھ میں ہم یہ قرآن دیں گے وہ اسے فوراً لکھ لیگی صرف زبانوں پر اسے نہیں رہنے دے گی۔ عیسائی قرآن کریم کے متعلق ہمیشہ یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ قرآن کو بہت بعد میں لکھا گیا حالانکہ اُن کی اپنی کتاب انجیل کے متعلق تاریخ سے یہ امر ثابت ہے کہ وہ ایک سو اسی سال کے بعد لکھی گئی۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف جن باتوں کو منسوب کیا جاتا ہے وہ بھی بہت بعد میں لکھی گئیں مگر قرآن کریم وہ کتاب ہے کہ جہاں اسے زبانی یاد کیا جاتا تھا وہاں یہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں بھی تھا جو سَفَرَةٍ تھے اسے فوراً لکھ لیتے تھے۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں ہی سارا قرآن لکھا گیا تھا۔

اس میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن کی تمام دنیا میں عزت کی جائے گی کیونکہ وہ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ہوگا جو تعلیم کسی ایک ملک میں محدود ہوگی لازماً اس کا اکرام اور رنگ کا ہوگا اور جو سارے ملکوں میں ہوگی اُس کا اکرام اور رنگ کا ہوگا۔ پس چونکہ قرآن سفر کرنے والے لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا اس قرآن کی تکریم بھی ساری دنیا میں ہوگی، کسی ایک ملک میں نہیں ہوگی۔ پھر سَفَرَةٍ کے معنے خالی لکھنے کے نہیں ہوتے بلکہ اس کے مادہ میں انکشاف کے معنے بھی پائے جاتے ہیں پس بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ کہہ کر اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ اُسے ایسے لکھنے والے لکھیں گے جو اس کے مطالب کو واضح کریں گے اور اس کے اغلاق کو کھولیں گے گویا بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ کے معنے یہ ہوئے کہ قرآن اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو اس کی تفسیریں کرنے والے ہوں گے۔ اس کے حقائق کو واضح کرنے والے ہوں گے اور اس کی پوشیدہ اور مغلق باتوں پر سے پردہ اٹھانے والے ہوں گے اور اس طرح قرآن نہ صرف خطاءِ لفظی سے پاک ہوگا بلکہ وہ خطاءِ معنوی سے بھی پاک ہوگا۔

سَفَرَةٍ چونکہ مُکَرَّمَةٍ کے مقابل میں ہے اس لئے اس آیت کا مطلب یہ ہُوا کہ قرآن کریم کو ماننے والے اس کی بڑی عزت کریں گے اور نہ صرف خود عزت کریں گے بلکہ ساری دنیا میں پھیل کر ساری دنیا سے اس کی عزت کرائیں گے۔ تیسری طرف اس قرآن کو محفوظ رکھیں گے اور اس طرح قرآن کی عزت میں اور بھی اضافہ ہوگا جیسے میں نے میور ( MUIR ) اور نولڈکے NOLDEKE کے متعلق بتایا ہے کہ باوجود شدید دشمن اسلام ہونے کے وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ قرآن پوری طرح محفوظ ہے۔ پس قرآن کے ضبط تحریر میں آجانے کی وجہ سے اس کے اعزاز میں اور بھی اضافہ ہوگیا یہاں تک کہ دشمن بھی اس اعزاز کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکے۔

پھر قرآنی معارف کی تشریح کے لحاظ سے بھی اس کی تکریم میں غیر معمولی اضافہ ہُوا کیونکہ قرآن کی نہ صرف ظاہری حیثیت قائم رہی بلکہ اس کی معنوی حیثیت بھی قائم رہی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں قرآن دیا جو اس کے اغلاق کو کھولنے والے اور اس کے مطالب کی وضاحت کرنے والے تھے۔ اس میں اس امر کی طرف بھی اشارہ تھا کہ قرآن کی بولی دنیا میں بولی جائے گی یہ زبان زندہ رہے گی اور اس کے مضامین کو حل کرنے کے لئے لوگوں کو کسی قسم کی دقت پیش نہیں آئے گی۔

دوسری صفت اللہ تعالیٰ نے مَرْفُوْعَةٍ بیان فرمائی ہے۔ رَفَعَ کے معنے ہوتے ہیں اونچا کیا۔ یعنی ذلت نہ کی بلکہ اعزاز کیا۔ اس کے مقابلہ میں صحابہؓ کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ کِرَامٌ ہوں گے اور کِرَامٌ کے معنے بزرگ کے ہوتے ہیں اس جگہ قرآن کے متعلق مَرْفُوْعَةٍ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے

مَرْفُوْعَةٍ کے لفظ کا ظاہری معنے کے لحاظ سے پورا ہونا

اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں مَرْفُوْعَةٍ کے معنے ذی شان ہونے کے ہیں۔ یہ بات ظاہری لحاظ سے بھی قرآن کریم کے متعلق پائی جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو قرآن کو اُمّتِ محمدیہ کبھی نیچا نہیں رکھتی ہمیشہ اسے اونچی جگہ پر رکھا جاتا ہے بلکہ اگر کوئی شخص قرآن کریم کو نیچے رکھ دے تو سب مسلمان اس سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کہ تم نے قرآن کریم کی ہتک کی۔ پس ظاہر میں بھی یہ معنے قرآن کریم پر چسپاں ہو جاتے ہیں کیونکہ مسلمان جس طرح

قرآن کو اونچا رکھتے ہیں دُنیا کی کوئی عالمگیر قوم اپنی الہامی کتاب کی اس طرح عزت نہیں کرتی۔ درحقیقت اور کوئی عالمگیر قوم اپنی کتاب کو اونچا رکھنے کی عادی ہی نہیں۔ نہ عیسائی انجیل کو اونچا رکھتے ہیں نہ یہودی تورات کو اونچا رکھتے ہیں۔ یہ شرف صرف قرآن کریم کو ہی حاصل ہے کہ مسلمان اسکو اونچی جگہ پر رکھتے ہیں۔ اسکو نیچے رکھنا وہ برداشت ہی نہیں کرسکتے۔

مَیں نے بتایا تھا کہ قرآن کریم کی تین صفات جو اس جگہ بیان کی گئی ہیں وہ حاملینِ قرآن کی تین صفات کے مقابل میں رکھی گئی ہیں اور اس طرح بتایا گیا ہے کہ ان میں سے ایک چیز دوسری چیز کا سبب ہے۔ چنانچہ دیکھ لو قرآن مُکَرَّمَۃ ہوگیا اس لئے کہ وہ سَفَرَۃ کے ہاتھ میں تھا جو اُسے لیکر دُنیا کے مختلف مُلکوں میں پھیل گئے اور سَفَرَۃ۔ مُکَرَّم ہوگئے اس لئے کہ اُن کے ہاتھ میں وہ کتاب تھی جو بڑی عزت والی تھی۔ گویا یہ دونوں باتیں ایکدوسرے سے لازم ملزوم تھیں۔ یہ جوش جو کسی شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ میں اس چیز کو اپنے ہاتھ میں لیکر باہر نکل جاؤں اسی لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کو مُکَرَّمَۃ سمجھتا ہے اور اُسے یقین ہوتا ہے کہ اس چیز کو پھیلانا میری عزت کا موجب ہے مگر جب وہ اُسے پھیلا دیتا ہے تو اسکا طبعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خود بھی مکرم بنجاتا ہے کیونکہ وہ ایسی چیز کو پھیلاتا ہے جو تکریم رکھنے والی ہوتی ہے۔ گویا قرآن کا مُکَرَّم ہونا سَفَرَۃ کی وجہ سے تھا اور سَفَرَۃ کا مُکَرَّم ہونا قرآن کی وجہ سے تھا۔ قرآن مسلمانوں کی عزت کا باعث ہوا اور مسلمان قرآن کی عزت کو بڑھانے کا باعث ہوئے جیسے ایک مشینری چکر کھاتی چلی جاتی ہے اسی طرح ایک طرف قرآن نے صحابہؓ کو اونچا کیا اور دوسری طرف صحابہؓ نے قرآن کو اونچا کیا۔ صحابہؓ قرآن کی عزت بڑھنے کا موجب ہوتے تھے اور قرآن صحابہؓ کی عزت بڑھنے کا موجب ہوتا تھا۔

دوسری صفت قرآن کی مَرْفُوْعَۃ بتائی کہ وہ بڑی ذی شان کتاب ہے۔ اب یہ لازمی بات ہے کہ جس شخص کے پاس کوئی ذی شان چیز ہوگی وہ ضرور کِرَامٌ بن جائیگا۔ مگر دوسری طرف جس چیز کی کِرَامٌ عزت کریں وہ بھی ذی شان اور معزز ہوجاتی ہے چنانچہ دیکھ لو جب کوئی معزز آدمی کسی کی عزت کریگا لوگ کہیں گے کہ معلوم ہوتا ہے یہ شخص بڑی عزت والا ہے کیونکہ فلاں معزز آدمی نے اس کی عزت کی تھی پس وہ اس کی عزت کرنے پر مجبور ہونگے۔ اور جب وہ معزز بنکر پھر دوسرے کی عزت کرے گا تو اس کی شہرت میں بھی اضافہ ہوگا کہ اسے فلاں معزز آدمی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ گویا یہ ایک سلسلہ ہے جو مشینری کی طرح چکر کھاتا چلا جاتا ہے۔ جو لوگ خود کسی چیز کے اوصاف سے ذاتی طور پر واقف نہ ہوں وہ اگر اُس چیز سے متاثر ہوتے ہیں تو اُسی وقت جب وہ دیکھیں کہ کوئی بڑا آدمی جس کا اُن کے دل میں احترام موجود ہے اُس چیز کی تعریف کر رہا ہے یہ دیکھکر وہ خود بھی اُس کے مدّاح بن جاتے ہیں۔ اب جو قرآن کریم پر ایمان رکھتے تھے وہ تو اُس کی عزت کرتے ہی تھے مگر ایک عیسائی کے نزدیک قرآن کریم کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ روم کے بادشاہ کو بھی اس کی عظمت کا احساس ہو اور وہ کہتا ہے یہ بہت بڑی کتاب ہے جسے عمرؓ جیسا عظیم الشان انسان مانتا ہے حالانکہ عمرؓ کیوں بڑے بنے اسی لئے کہ انہوں نے قرآن پر عمل کیا۔ گویا ایک طرف روما کا بادشاہ یہ کہیگا کہ قرآن بڑی کتاب ہے جس کو عمرؓ جیسا انسان مانتا ہے اور دوسری طرف عمرؓ کی حقیقت کو جاننے والا یہ کہیگا کہ قرآن بڑی کتاب ہے کیونکہ اسکو ماننے والا عمرؓ ادنیٰ حالت سے ترقی کرکے اس قدر بڑا بن گیا۔ غرض جب سچی باتیں ایک دوسرے کے مقابل میں آجاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اُبھارتی چلی جاتی ہیں۔ اسی لئے فرمایا کہ قرآن مَرْفُوْعَۃ ہے یعنی بڑی ذی شان کتاب ہے اور اس کے ذی شان ہونے کا ثبوت یہ ہوگا کہ اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے عزت پاتے چلے جائیں گے اور جب وہ عزت پا جائیں گے تو پھر قرآن کو ایک نئی عزت حاصل ہوگی کیونکہ لوگ کہیں گے کہ اس کتاب کو تو بڑے بڑے معزز آدمی مانتے ہیں پھر یہ بات دوبارہ چکر کھائیگی کہ قرآن کریم کی نئی حاصل کردہ عزت کی وجہ سے کچھ اور لوگ

اس کا عملی تجربہ کرنے کی طرف متوجہ ہوں گے اور اسکی اتباع سے عزت پائینگے اور پھر اور لوگ انکی عزت کو دیکھکر قرآن کریم کی عزت کے قائل ہونگے اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا چلا جائے گا۔ قرآن لوگوں کو کرام بنائے گا اور لوگ قرآن کو مرفوعہ بنائینگے گویا پہلے مُکَرَّمَة کے ذریعہ سے قرآن کریم کی ذاتی عزت بتائی پھر مَرْفُوْعَة کے ذریعہ سے بتایا کہ قرآن مسلمانوں کو کِرَامٌ بنادے گا اور وہ اسے مَرْفُوْعَة بنادینگے۔ مسلمان سارے عالم پر چھاجائیں گے اور اس طرح پھر دوسری قسم کی عزت قرآن کریم کو ملے گی یعنی بادشاہوں کا محبوب ہونیکے سبب سے سب دُنیا میں مَرْفُوْعَة ہو جائے گا کہ سب اسے اپنے سروں پر رکھیں گے۔

تیسری صفت قرآن کریم کی مُطَهَّرَة بیان کی گئی ہے اور مُطَهَّرَة کے معنے پاکیزہ کے ہوتے ہیں اس کے مقابل میں بَرَرَة کو رکھا گیا ہے جو بَرَّ سے ہے اور بَرَّ کے معنے ہوتے ہیں اَحْسَنَ الطَّاعَةَ اِلَيْهِ وَرَفَقَ وَتَحَرَّى مَحَابَّهُ وَتَوَقّٰى مَكَارِهَهُ کہ اُس کی پوری طرح اطاعت کی۔ اُس کے ساتھ رفق کیا۔ اور اُس کی اچھی چیزوں کو خوب شوق سے حاصل کیا یا اُس کی طرف توجہ سے کام لیا اور اسکی ناپسندیدہ باتوں سے بچا۔ یہ کتنا چھوٹا سا لفظ ہے مگر اس کے اندر کتنے وسیع معنے ہیں اور کس طرح اس ایک لفظ میں ہی حاملین قرآن کے اوصاف کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے بَرَرَة کے معنے یہ ہوئے کہ وہ قرآن کی پوری اطاعت کرنے والے ہوں گے۔ اُس کے ساتھ اپنا پورا تعلق رکھیں گے۔ جو چیزیں اس نے پسند کی ہیں اُن کو وہ پورے زور سے حاصل کرنے کی کوشش کرینگے اور جن چیزوں سے اُس نے منع کیا ہے اُن سے وہ پورے زور سے بچیں گے۔

قرآن کریم کے متعلق مُطَهَّرَة اور صحابہؓ کے متعلق بَرَرَة کا لفظ استعمال کر کے اللہ تعالےٰ نے اِس طرف اشارہ کیا ہے کہ قرآن کریم اپنے اندر کوئی ایسی بات نہیں رکھتا جو فطرتِ انسانی کے خلاف ہو۔ تمام باتیں جو فطرتِ انسانی کو اُبھارنے والی ہیں وہ اُس کے اندر موجود ہیں اور تمام باتیں جو فطرتِ انسانی کو بگاڑنے والی ہیں اُن سے وہ پاک ہے۔ اِس وجہ سے وہ لوگ جو اِس کتاب سے تعلق رکھنے والے ہوں گے وہ بھی ایسے ہی ہوں گے کہ اسکی ساری باتوں پر عمل کریں گے اور اُن ساری باتوں سے بچنے کی کوشش کرینگے جن سے قرآن کریم نے روکا ہے۔ غرض بَرَرَة کہکر اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ مومن اپنا پورا زور اِس بات پر صرف کرینگے کہ قرآن کریم نے جن باتوں پر عمل کرنیکا حکم دیا ہے اُن پر عمل کریں اور وہ پورا زور اس بات پر صرف کریں گے کہ قرآن کریم نے جن باتوں سے منع کیا ہے اُن سے مجتنب رہیں اور اِس طرح وہ بَرَرَة ہوں گے یعنی اسکے نتیجہ میں کامل متقی بن جائینگے جب انسان اس مقام پر نہیں ہوتا اور وہ اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا رہتا ہے کہ میں قرآن کریم کی بات کو مانوں یا نہ مانوں تو وہ بَرَرَة میں شامل نہیں سمجھا جاسکتا۔ اور نہ وہ قرآن کو مُطَهَّر سمجھنے والا قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اگر وہ قرآن کریم کو مُطَهَّر سمجھتا اور یقین رکھتا کہ قرآن کریم نے ہر وہ تعلیم دی ہے جسکی فطرتِ انسانی کو پیاس ہے اور ہر اُس بات سے روکا ہے جو فطرت کو مسخ کرنیوالی ہے تو وہ اسکے احکام پر عمل بھی کرتا اور اُسکے نواہی سے بچنے کی بھی کوشش کرتا مگر جب وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے معنے یہی ہوتے ہیں کہ نہ وہ قرآن کے مطہر ہونے پر ایمان رکھتا ہے اور نہ اپنے آپ کو بَرَرَة میں شامل کرنا چاہتا ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مُطَهَّرَة کے مقابل میں بَرَرَة رکھا ہے یہ بتانے کیلئے کہ ان دونوں میں نسبت پائی جاتی ہے۔

جب قرآن پر عمل کرنے کے نتیجہ میں لوگ بَرَرَة بن جائینگے تو وہ قرآن کو نئے سرے سے مطہر بنائینگے۔ اس لئے کہ جب انسان نیکوکار ہوگا۔ قرآن پر عمل کرے گا۔ اللہ تعالےٰ کے احکام کو مدنظر رکھے گا تو یہ لازمی بات ہے کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے اُس پر روحانی فیوض کا نزول ہوگا کیونکہ جب انسان نیکیوں میں حصہ لیتا اور اللہ تعالیٰ کے قرب میں بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو اُس پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے فیوض نازل ہوتے ہیں جب بَرَرَة پر قرآن کریم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں فیوض نازل ہوں گے تو

# قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۝

انسان ہلاک ہو وہ کیسا ناشکرا ہے ۵۸

وہ ان فیوض کو قرآن کریم کی طرف منسوب کریں گے اور اس طرح قرآن کریم کو ایک نئے رنگ کی طہارت حاصل ہو جائے گی جیسے قرآن کریم تو پہلے ہی مطہر تھا مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مبعوث ہو کر اُسے جس طرح مطہر کیا اس سے پہلے اور کسی نے نہیں کیا مگر سوال یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کس نے بَرَرَةٍ میں سے بنایا تھا؟ اسی قرآن نے۔ گویا قرآن نے مسیح موعودؑ کو پاک کیا اور مسیح موعودؑ نے قرآن کی طہارت کے پوشیدہ اوصاف کو ظاہر کیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے پہلے لوگ قرآن کریم کی طرف کئی قسم کی غلط باتیں منسوب کیا کرتے تھے مگر آپ نے اُن تمام غلط عقائد اور غلط تعلیمات کا باطل ہونا ثابت کر دیا اور اس طرح قرآن کو مطہر بنا دیا۔ جب آپ نے قرآن کو مطہر بنایا تو یہ لازمی بات تھی کہ اس کے نتیجہ میں آپ کی نیکیوں میں اور بھی اضافہ ہو جاتا پس قرآن کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ مطہر ہے اُس پر عمل کرنیوالے بَرَرَةٍ میں شامل ہو جاتے ہیں اور بَرَرَةٍ میں شامل ہونیوالے پھر قرآن کو مطہر کرتے ہیں اور قرآن اُن کو پھر نیکیوں میں بڑھاتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا امور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کلام کی عظمت کسی ظاہری سامان کی محتاج نہیں بلکہ قلوب کی صفائی کے ساتھ قرآن کریم کی عظمت قائم ہوتی ہے۔ گویا بتایا گیا ہے کہ اس قرآن سے وہی لوگ فائدہ اٹھائیں گے جو نیک ہوں مگر وہ لوگ فائدہ نہیں اٹھا سکتے جو نیک نہیں ہیں۔ اور جب یہ بات ہے تو پھر یہ کوئی سوال ہی نہ رہا کہ ظاہر میں فلاں شخص بڑا ہے اور فلاں شخص چھوٹا۔ فلاں شخص عالم ہے اور فلاں شخص جاہل۔ کیونکہ یہاں ظاہری بڑائی یا ظاہری علم یا ظاہری عزت کا کوئی سوال نہیں۔ قرآن ایسے ہی ہاتھوں میں ترقی کرے گا جو سَفَرَةٍ ہوں گے۔ کِرَامٍ ہوں گے اور بَرَرَةٍ کے اوصاف اپنے اندر رکھتے ہوں گے خواہ وہ ظاہری طور پر بڑوں میں سے ہوں یا چھوٹوں میں سے۔ امیروں میں سے ہوں یا غریبوں میں سے۔ چنانچہ مکہ کے چوٹی کے خاندانوں میں سے بھی اللہ تعالیٰ نے کئی لوگوں کو خدمت کی توفیق دی اور غرباء میں سے بھی کئی لوگوں نے اسلام کی شاندار خدمات سرانجام دیں۔ چنانچہ دیکھ لو حضرت علیؓ چوٹی کے خاندان میں سے تھے حضرت حمزہؓ چوٹی کے خاندان میں سے تھے۔ حضرت عمرؓ چوٹی کے خاندان میں سے تھے۔ حضرت عثمانؓ چوٹی کے خاندان میں سے تھے اس کے بالمقابل زیدؓ اور بلالؓ اور سمرہ اور خبابؓ۔ صہیبؓ۔ عامرؓ۔ عمارؓ۔ ابوفکیہہؓ چھوٹے سمجھے جانیوالوں میں سے تھے۔ گویا بڑے لوگوں میں سے بھی قرآن کریم کے خادم چُنے گئے اور چھوٹے لوگوں میں سے بھی۔ پس فرماتا ہے تمہارا یہ سوال بالکل غلط ہے کہ یہ لوگ آئیں گے کہاں سے؟ اسی طرح تمہارا یہ خیال بھی غلط ہے کہ فلاں شخص ہی دین کے قابل ہے اور فلاں نہیں۔ یہ معاملہ قلوب سے تعلق رکھتا ہے ظاہر سے نہیں۔ اور اس وجہ سے ہم ان لوگوں کا خود انتخاب کریں گے۔ قرآن کریم میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو اچھے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور اگر کسی شخص کو قرآن کریم کی خوبیاں نہیں کھینچ سکیں تو وہ یقیناً اس زمانہ میں حقیقی بڑائی حاصل کرنے کا مستحق ہی نہیں۔

**۵۸ حل لغات۔** قُتِلَ قَتَلَ سے مجہول کا صیغہ ہے اور قَتَلَ اللّٰهُ الْاِنْسَانَ کے معنے ہیں لَعَنَهُ اللّٰهُ نے اُس پر لعنت کی (اقرب) پس قُتِلَ الْاِنْسَانُ کے معنے ہوں گے۔ اس انسان پر لعنت ہو۔

**تفسیر۔** جس قسم کا لطیف نقشہ قرآن کریم کی خوبیوں اور اُس کے کمالات کا اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کھینچا ہے اُس کی مناسبت سے فرماتا ہے قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ۔ یہ منکر انسان جو قرآن کریم سے اعراض کرنے والا اور اُس کے احکام سے علیحدگی اختیار کرنیوالا ہے کتنا بڑا ناشکر گزار انسان ہے

قُتِلَ (margin)

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝

(وہ غور تو کرے) کہ کس چیز سے خدا نے اُسے پیدا کیا ہے نطفہ سے (پیدا کیا ہی) (پہلے تو) اُسے پیدا کیا پھر اس کیلئے (ترقی کا ایک)

ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ ۝

اندازہ مقرر کیا۔ پھر (اس کے) راستہ کو (آسان بنایا) خوب ہی (اُسے) آسان بنایا ۵۹

اس کے سامنے ایک ایسا عظیم الشان کلام پیش کیا جارہا ہے جو مکرّم ہے جو مرفوعہ اور مطہرہ ہے اور جو نہ صرف آپ ہی پاک ہے بلکہ اس کے اندر یہ خصوصیت بھی موجود ہے کہ جو شخص اس کو ہاتھ لگالے وہ بھی پاک ہوجاتا ہے گویا جیسے سنگ پارس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ جس چیز سے چھوجائے سونا بن جاتی ہے اسی طرح یہ قرآن ایسی کتاب ہے کہ نہ صرف خود اعزاز رکھنے والی ہے بلکہ جو لوگ اس پر عمل کرتے ہیں وہ بھی معزز بن جاتے ہیں۔ نہ صرف خود پاک ہے بلکہ جو اس پر عمل کرتے ہیں وہ بھی پاک بن جاتے ہیں جب ایسی عظیم الشان کتاب ہے تو قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَهٗ۔ اس قرآن سے اعراض کرنے والا انسان ہلاک ہو وہ کتنا بڑا ناشکرا ہے قرآن اس کے سامنے تھا اور اس کے لئے موقع تھا کہ وہ اس کے احکام پر عمل کرکے سَفَرَةٍ میں سے بن جاتا۔ کِرَامٍ میں سے بن جاتا۔ بَرَرَةٍ میں سے بن جاتا۔ اگر قرآن کے اندر صرف ذاتی خوبیاں ہوتیں تو کوئی شخص کہہ سکتا تھا کہ مجھے تو وہ خوبیاں اس کلام میں نظر نہیں آئیں مگر قرآن کی خوبیاں وہ ہیں جو صرف ذاتی نہیں بلکہ متعدی ہیں اور دوسروں کے اندر بھی پیدا ہوجاتی ہیں۔ پس یہ انسان کیسا ناشکرا ہے کہ ہم نے تو اسے بڑھانے اور ترقی دینے کا سامان کیا مگر وہ اُلٹا اس کلام سے دُور بھاگتا ہے۔

**۵۹ تفسیر۔** آخر وہ یہ تو سوچے کہ ہم نے اُس کی پیدائش کس طرح کی ہے اور کن اعلیٰ اور بلند اغراض کے لئے اُسے دُنیا میں بھیجا ہے۔ قرآن کریم کا یہ ایک عجیب وصف ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنی شان کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمیں تمہاری کوئی پرواہ نہیں۔ اگر تم مانوگے تو تمہارا اپنا فائدہ ہوگا اور اگر انکار کروگے تو تمہارا اپنا نقصان ہوگا۔ مگر دوسری طرف جس طرح ماں کے دل میں اپنے بچہ کے متعلق رحم اور محبت کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں اسی طرح قرآن کریم میں پیدا ہوجاتے ہیں اور پھر محبت اور پیار سے اُن کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ماں بھی اسی طرح کرتی ہے جب بچہ اس کا کہنا نہیں مانتا تو وہ ناراض ہوکر کہتی ہے کہ میرا کیا ہے ہم نے تو تمہارے فائدہ کے لئے یہ بات کہی تھی مگر تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ پھر اُسے پُچکار کر کہنا شروع کردیتی ہے کہ بچے کھانا کھالے۔ اور اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح بچہ اس کی بات مان لے۔ اسی طرح قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَهٗ میں اللہ تعالیٰ نے استغناء ظاہر کیا تھا کہ انسان ہلاک ہوجائے وہ کتنا بڑا ناشکرا ہے قرآن جیسی کتاب اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے اور وہ پھر بھی تلخی اور اعراض سے کام لیتا ہے مگر یہ کہنے کے معاً بعد فرمادیا مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ۔ مِنْ نُّطْفَةٍ۔ گویا انسان کو پچکارنا شروع کردیا کہ کسی طرح وہ اُس کی طرف واپس آجائے۔ فرماتا ہے کیا انسان اس بات پر بھی غور نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ اُسے کس طرح پیدا کرتا ہے مِنْ نُّطْفَةٍ وہ اسے ایک چھوٹے سے قطرہ سے پیدا کرتا ہے اور پھر پیدا کرنے کے بعد اُس نے اُسے چھوڑ نہیں دیا بلکہ فَقَدَّرَهٗ اس کا اندازہ مقرر کیا قَدَّرَهٗ کے متعلق مفردات والا لکھتا ہے کہ اِشَارَةٌ اِلٰی مَآ اَوْجَدَهٗ فِیْهِ بِالْقُوَّةِ فَیُظْهِرُ حَالًا فَحَالًا اِلَی الْوُجُوْدِ بِالصُّوْرَةِ کہ وہ مخفی قوتیں جو خدا تعالیٰ نے

ح۱۱
قُتِلَ الْاِنْسَانُ میں قرآن سے اعراض کرنے والے سے خطاب

ح
مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ کہکر لطیف طریقہ سے قرآن پر غور کرنے کی تلقین

انسان میں رکھی ہیں اور جن کو موقع موقع پر انسان ظاہر کرتا چلا جاتا ہے اُن کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے گویا خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ کے معنے یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور پھر اس میں ایسی طاقتیں اور قوتیں رکھیں جو ہر موقع و محل کے مطابق اس سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ جیسا کام ہوتا ہے ویسی ہی قوتیں اس سے ظاہر ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ گویا ایک وسیع ترقی کا میدان اللہ تعالیٰ نے اُس کے لئے پیدا کیا ہے۔ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهٗ ادھر اُس نے انسان کے لئے ترقی کا ایک وسیع میدان پیدا کیا ہے اور اُدھر اس کے اندر ایسا مادہ رکھ دیا ہے کہ جب بھی کوئی اہم موقع اُس کے سامنے آئے اس کے مطابق اس کی اندرونی قابلیتیں اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں اور اُسے کوئی قربانی بھی دوبھر محسوس نہیں ہوتی۔ پس ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهٗ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کے اندر ایسا مادہ پیدا کر دیا ہے کہ اگر وہ اپنی طبیعت پر ذرا بھی بوجھ ڈال لے تو ہر کام اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے اور وہ بڑی بڑی دشوار گذار گھاٹیاں آسانی سے عبور کر جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ عادت بُری چیز ہے لیکن اللہ تعالےٰ فرماتا ہے عادت بھی ہمارے فضلوں میں سے ایک فضل ہے۔ اور جب کسی کام کی عادت انسان کو ہو جائے تو پھر اس کام کے کرتے وقت کوئی دِقت محسوس نہیں ہوتی۔ پس کسی کام کی عادت ہو جانا ایک خوبی ہے بشرطیکہ اس عادت کا استعمال کسی بُرے موقع پر نہ ہو۔ پس فرماتا ہے ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهٗ۔ انسان کو پیدا کرنے اور اس کے اندر ترقی کی قابلیتیں رکھنے کے بعد ہم نے اُس کا راستہ آسان کر دیا ہے۔ نماز پڑھنا پہلے انسان کو بڑا دوبھر معلوم ہوتا ہے مگر کچھ دن باقاعدگی اور التزام سے نمازیں پڑھنے کے بعد ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ نمازوں کا پڑھنا بالکل آسان معلوم ہونے لگتا ہے۔ روزے رکھنے لگیں تو پہلے مشکل معلوم ہوتے ہیں لیکن جب روزوں کی

٢١١
ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهٗ کا مطلب

عادت ہو جائے تو پھر محسوس بھی نہیں ہوتا کہ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ یہی حال صدقہ و خیرات اور دوسری نیکیوں کا ہے۔ جن لوگوں کو صدقہ و خیرات کی عادت ہو جائے ہم نے دیکھا ہے کہ جب تک وہ روزانہ کچھ نہ کچھ صدقہ نہ کر لیں انہیں چین ہی نہیں آتا۔ عربوں کو اس بات کی عادت تھی کہ وہ کھانا کھاتے وقت کسی اَور کو اپنے ساتھ ضرور شریک کر لیا کرتے تھے اور پھر یہ عادت رفتہ رفتہ ایسی پختہ ہو گئی کہ جب تک وہ کسی اَور کو اپنے ساتھ دستر خوان پر نہیں بٹھا لیتے تھے وہ کھانا نہیں کھا سکتے تھے اور تلاش کر کر کے دوسروں کو اپنے کھانے میں شریک کرتے تھے۔ تو فرماتا ہے ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهٗ بظاہر انسان کے سامنے قربانی کا ایک بہت بڑا وسیع میدان ہے مگر اس کے ساتھ ہی فطرتِ انسانی میں ہم نے یہ مادہ رکھ دیا ہے کہ جب وہ عمل کرنا شروع کر دے تو بجائے اس کے کہ کام بوجھل محسوس ہو وہ اُسے آسان معلوم ہونے لگتا ہے اور اس کی طرف اُسے دلی رغبت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ ایک نیکی کے بعد دوسری نیکی اور دوسری کے بعد تیسری نیکی میں وہ حصہ لینا شروع کر دیتا ہے۔ اگر عادت نہ ہوتی تو ایک نیکی کا کام بھی سرانجام دینا اس کے لئے مشکل ہوتا مگر چونکہ رفتہ رفتہ کاموں کی عادت ہوتی چلی جاتی ہے اس لئے انسان کاموں سے گھبراتا نہیں بلکہ اُن میں ایک لذت اور سُرور محسوس کرتا ہے۔ پہلے وہ نماز پڑھتا ہے تو اُسے نماز کی عادت ہو جاتی ہے پھر روزے رکھتا ہے تو اُسے روزوں کی عادت ہو جاتی ہے۔ پھر صدقہ و خیرات میں حصہ لیتا ہے تو اُسے صدقہ و خیرات کی عادت ہو جاتی ہے اس طرح وہ ایک ایک نیکی کو فتح کرتا چلا جاتا ہے اور آگے بڑھنا اس کے لئے بالکل آسان ہو جاتا ہے۔

---

# ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ○

پھر (عمر طبعی کے بعد) اُسے مار دیا پھر اُسے (موعود) قبر میں رکھا ۲۱؎ ٭

۲۱؎ **تفسیر** - فرماتا ہے اس کے بعد ہم نے اُس کو وفات دی یعنی ہمارا طریق یہ ہے کہ اس کے بعد ہم اُسکو وفات دے دیتے ہیں۔ یہاں خدا تعالےٰ نے موت کو اپنے احسان کے طور پر پیش کیا ہے چنانچہ دیکھ لو ان آیات میں ہر جگہ خدا تعالےٰ نے اپنے احسانات کا ہی ذکر کیا ہے فرماتا ہے مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝ ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ ۔ یہ سب احسانات ہیں جو اللہ تعالےٰ نے شمار کرائے ہیں۔ اِسی ذیل میں فرماتا ہے ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۔ پس اماتت کو بھی یہاں احسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے جب انسان نیکیوں میں حصّہ لیتا اور مسلسل حصہ لیتا چلا جاتا ہے تو آخر ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہم کہتے ہیں اب تم نے بڑی محنت اُٹھالی آؤ ہم تمکو پنشن دیتے ہیں۔ گویا موت کیا ہے ایک پنشن ہے جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ملتی ہے۔ دنیا میں لوگوں کو پنشن ملتی ہے تو وہ گورنمنٹ کے ممنون ہوتے ہیں مگر فرماتا ہے یہ عجیب نادن ہیں کہ ہم ان کو پنشن دیتے ہیں تو لوگ رونا شروع کر دیتے ہیں۔ فَاَقْبَرَهٗ جب انسان کو ہم موت دیتے ہیں تو اس کے بعد اُسے قبر میں داخل کرتے ہیں۔ اَقْبَرَهٗ کے معنے ہیں جَعَلَ لَهٗ قَبْرًا یُّدْفَنُ فِیْهِ (اقرب) کہ اُس کیلئے ایک قبر مقرر کی جس میں وہ دفن کیا جاتا ہے اور یہ بھی اس کے معنے ہو سکتے ہیں کہ جَعَلَهٗ مِمَّنْ یُّقْبَرُ اُسے اُن لوگوں میں سے بنایا جن کے لئے قبر میں داخل ہونا مقدر ہے اور اَقْبَرَ الْقَوْمَ کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ اَمَرَ اَنْ یُّقْبَرَ قَتِیْلُهُمْ (اقرب) اُس نے حکم دیا کہ اُن کے مقتولوں کو قبروں میں دفن کیا جائے۔ پس اَقْبَرَهٗ کے معنے ہوئے قبر میں اس کو داخل کیا یا قبر میں داخل ہونے کا حکم دیا یا اُس کے لئے قبر میں داخل ہونے کا نظام جاری کیا۔ گویا یا تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جَعَلَ لَهٗ قَبْرًا یُّدْفَنُ فِیْهِ اور یا اس کے معنے ہوں گے جَعَلَهٗ مِمَّنْ یُّقْبَرُ کہ ہم نے اس کو ایسا بنایا کہ اس کو قبر میں ضرور داخل ہونا پڑتا ہے۔ اب اگر فَاَقْبَرَهٗ کے معنے یہ لئے جائیں کہ جَعَلَ لَهٗ قَبْرًا یُّدْفَنُ فِیْهِ یعنی ہر انسان قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو یہ معنے اس لحاظ سے یہاں چسپاں نہیں ہونگے کیونکہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو قبروں میں دفن نہیں ہوتے۔ اور اگر وہ معنے لئے جائیں جو اَمَرَ اَنْ یُّقْبَرَ قَتِیْلُهُمْ سے ظاہر ہیں تو وہ بھی یہاں چسپاں نہیں ہو سکتے۔ پس میرے نزدیک اَقْبَرَهٗ کے معنے اس جگہ یہی مناسب ہیں کہ جَعَلَهٗ مِمَّنْ یُّقْبَرُ یعنی ہم نے اس کو ایسا بنایا ہے کہ وہ قبر میں داخل کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک دلیل ہے جو پچھلی دلیل کے ایک حصہ اور ٹکڑہ کے طور پر اس جگہ بیان ہوئی ہے۔ اگر اَقْبَرَهٗ کے معنے خالی مٹی میں دفن کئے جانے کے ہوں تو یہ الفاظ دلیل کا حصہ نہیں بن سکتے۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ کے معنے[2]

وہ معنے جو عام طور پر ہماری طرف سے اس آیت کے کئے جاتے ہیں کہ اس آیت میں اُس قبر کا ذکر ہے جو عالم برزخ میں ہر انسان کو ملتی ہے وہ بھی درست ہیں مگر دشمن کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک ڈھکوسلہ ہے ہمیں تو نظر نہیں آتا کہ اگلے جہان میں ہر مرنے والے کو قبر میں داخل کیا جاتا ہے اس لئے ہم تمہاری اس بے دلیل بات کو کس طرح مان سکتے ہیں اور میرے نزدیک جبکہ یہ ایک دلیل ہے جو گذشتہ دلیل کے جزو کے طور پر بیان ہوئی ہے تو بہرحال اَقْبَرَهٗ کا کوئی حصہ دنیا میں بھی نظر آنا چاہیئے۔ جو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے معنے یہ کریں کہ جَعَلَهٗ مِمَّنْ یُّقْبَرُ یعنی انسانی فطرت میں اللہ تعالےٰ نے یہ مادہ رکھ دیا ہے کہ وہ

٭ نوٹ: اس جگہ قاعدہ بیان ہوا ہے اور اس لحاظ سے ترجمہ میں پیدا کرتا ہے۔ اندازہ مقرر کرتا ہے۔ آسان بناتا ہے۔ مار دیتا ہے وغیرہ کے الفاظ آنے چاہئیں لیکن چونکہ یہ الفاظ ترجمہ سے دور چلے جاتے تھے ہم نے ماضی کی جگہ ماضی ہی کے الفاظ رکھے ہیں لیکن مفہوم یہی ہے کہ انسان کی حالت ایسی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کا سلوک اُس سے اس اس طرح کا ہوتا ہے پھر بھی وہ سمجھتا نہیں ؛

اپنے مردے کو قبر میں داخل کرے۔ اگر بعض لوگ اپنے مُردوں کو جلادیتے ہیں تو درحقیقت وہ بھی اسی لئے جلاتے ہیں کہ وہ پسند نہیں کرتے کہ اُن کے مُردے سڑتے گلتے رہیں اسی لئے وہ ان کو جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔ جو لوگ اپنے مُردے جانوروں کو کھلا دیتے ہیں وہ بھی اسی لئے کہ اُن کے نزدیک مردہ کا احترام یہ تقاضا کرتا ہے کہ ایسا کیا جائے۔ گویا مُردوں کی عزت اور اُن کا احترام کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے اور یہی معنے فَاَقْبَرَہٗ کے ہیں کہ کوئی انسان اپنے مُردے کی ہتک برداشت نہیں کر سکتا باوجود اس کے کہ وہ ایک بے جان لاشہ ہوتا ہے فطرتِ انسانی اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی کہ اُسے یونہی پھینک دیا جائے بلکہ ہر انسان خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو اُس کا مناسب اعزاز کرے گا اور اپنے اپنے رنگ میں جو سلوک مناسب ہوگا اُس سے کرے گا۔ اور یہی وہ بات ہے جس میں انسان دوسرے جانداروں سے ممتاز ہے ورنہ اگر کھانے کو لو۔ تو انسان بھی کھاتا ہے اور جانور بھی کھاتا ہے۔ سونے کو لو تو انسان بھی سوتا ہے اور جانور بھی سوتا ہے۔ مرنے کو لو تو انسان بھی مرتا ہے اور جانور بھی مرتا ہے۔ آگے یہ فرق ہو جاتا ہے کہ جانوروں میں یہ مادہ نہیں کہ وہ دوسرے جانوروں کی لاشوں کو دفنائیں لیکن کوئی انسان اپنے مردوں کو ایسی طرز پر نہیں رکھتا جس سے ان کے اعزاز میں فرق آئے۔ یہ مُردے کا اعزاز اور اُس کا احترام جو انسانی فطرت میں داخل ہے بتاتا ہے کہ انسانی زندگی موت پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر انسان کی زندگی اُس کی موت پر ختم ہے تو پھر اُس کے جسم کا احترام کو نسا رہا یا اُس کے اعزاز کی ضرورت ہی کیا ہے اس صورت میں بیشک اُسے میدان میں پھینک دیا جائے کوئی حرج نہیں ہوگا لیکن فطرتِ انسانی میں اس مادہ کا ہونا کہ مُردے کی عزت کی جائے اور اس کی عظمت میں کوئی فرق نہ آئے اس بات کی دلیل ہے کہ زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔ فرماتا ہے ہم تمہارے سامنے اس فطری دلیل کو پیش کرتے ہیں۔ تم اپنے مردہ کی لاش کو

ملٹ ۲۱
ثُمَّ اَمَاتَہٗ فَاَقْبَرَہٗ میں بعث بعد الموت کی طرف اشارہ

تحقیر کے ساتھ پھینکتے نہیں بلکہ اس کا مناسب احترام کرنا ضروری سمجھتے ہو۔ اگر اس کی آئندہ زندگی کا کوئی امکان نہیں تو تمہارے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوتا ہے کہ مردے کا مناسب احترام کیا جائے۔ خواہ تم اپنے مُردوں کو بجلی سے جلا دو خواہ لکڑیوں کے انبار میں رکھ کر آگ لگا دو۔ خواہ خاص مقام پر رکھ کر سدھائی ہوئی چیلوں اور گِدھوں کو کھلا دو۔ بہرحال تم اپنے مُردوں سے وہ معاملہ نہیں کرتے جو جانور کرتے ہیں ایک کُتا مر جاتا ہے تو دوسرے کُتوں کو خیال بھی نہیں آتا کہ اس کے ساتھ کوئی خاص سلوک کریں۔ وہ اُسی طرح پڑا رہتا ہے یہاں تک کہ گل سڑ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر انسانی زندگی اُس کی موت پر ختم تھی تو پھر چاہیئے تھا لوگ اپنے مردوں کو یونہی پھینک دیتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ اپنے اپنے رنگ میں اس کا مناسب اعزاز کرتے ہیں۔ پس فرماتا ہے ثُمَّ اَمَاتَہٗ فَاَقْبَرَہٗ ہم انسان کو موت دیتے ہیں۔ اور پھر اُس کے رشتہ داروں کے دلوں میں ایسی حس پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ اس کی لاش کو یونہی نہیں پھینک دیتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں اگر ہم نے ایسا کیا تو مردہ کی عزت اور اس کے احترام میں فرق آئے گا۔ یہ دلیلِ فطرت پیش کر کے اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ جب مرنے کے بعد بھی تم عزت کے قائل ہو اور لاش کی عزت کرنا اپنے لئے ضروری سمجھتے ہو تو اس سے معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد کی زندگی کا تمہارے دلوں میں بھی احساس موجود ہے گو یہ احساس ادنیٰ ہے مگر بہرحال یہ ادنیٰ احساس تمہاری روح کو اس اہم امر کی طرف متوجہ کرنے کے لئے کافی ہے کہ آخر وجہ کیا ہے کہ تمہارے دلوں میں مردہ کے احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ تمہارے دلوں میں اس جذبہ کا نمایاں طور پر پایا جانا اور دنیا میں کسی انسان کا بھی اپنے مردہ کی لاش کی ہتک گوارا نہ کر سکنا اس بات کا ثبوت ہے کہ زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ کوئی اور حیات ہے جس کا اس موت سے آغاز ہوتا ہے اور انسان نہیں چاہتا کہ اس زندگی کے کوچہ میں داخل کرتے وقت محض اس خیال سے کہ یہ جسم تو مُردہ ہو چکا ہے اس کی عزت میں کوئی فرق آنے دے۔

# ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ۝ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ۝

پھر جب چاہے گا اُسے دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا [۱۱] (ایسا) ہرگز نہیں (جو تم سمجھتے ہو) (دیکھتے نہیں کہ) ابھی تک جو اسے حکم ملا تھا اُسے پورا نہیں کیا [۱۲]

**[۱۱] حل لغات** - اَنْشَرَ اللّٰہُ الْمَیِّتَ کے معنے ہوتے ہیں اَحْیَاہٗ - اللہ تعالیٰ نے مردے کو زندہ کیا (اقرب) پس اِذَا شَآءَ اَنْشَرَہٗ کے معنے ہوں گے جب وہ چاہے گا اُسے زندہ کرے گا۔

**تفسیر** - فرماتا ہے تم کو ان ساری باتوں سے نتیجہ نکال لینا چاہیئے کہ جب خدا چاہے گا تم کو دوبارہ زندہ کر دیگا ورنہ یہ تمام سلسلۂ پیدائش ہی لغو اور بے معنی قرار دینا پڑتا ہے آخر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اتنا بڑا کارخانہ جاری کرے اور پھر اس کے اندر کوئی غرض اور حکمت کام نہ کر رہی ہو۔ وہ انسان کو پیدا کرتا ہے ایک ایسی چیز سے جو نہایت ہی ذلیل ہے پھر ادنیٰ حالت سے ترقی دیتے دیتے اُسے اعلیٰ درجہ کے مقامات تک پہنچا دیتا ہے۔ اُس کے اندر ایسی قوتیں رکھتا ہے جو غیر محدود ہیں اور جوں جوں ترقی کے سامان ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں اُس کے مقابلہ میں اُس کی اندرونی قوتیں بھی نشو نما ہوئی شروع ہو جاتی ہیں پھر نہ صرف انسان کے اندر اُس نے مختلف قسم کی قوتیں پیدا کیں بلکہ عادت کے ذریعہ وہ اُس کے کاموں میں بشاشت پیدا کر دیتا ہے اور جب اسی طرح ترقی کرتے کرتے انسان اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو تم یہ خیال کرتے ہو کہ اس کے بعد روح کو فنا کر دیا جاتا ہے حالانکہ اتنے بڑے کام کے بعد انعام ملنے کا حق ہوتا ہے نہ یہ کہ انعام تو کوئی نہ دیا جائے اور روح کو ابدی طور پر فنا کر دیا جائے۔ پھر جب انسان مر جاتا ہے تو تمہاری فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ مادہ پیدا کیا ہُوا ہوتا ہے کہ تم اپنے مردہ کی عزت کرو چنانچہ تم اپنے اپنے طریق کے مطابق احترام کے ساتھ اُسے اپنے گھر سے جدا کرتے ہو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی تم کسی عزت کے قائل ہو اور تمہارا یہ فعل اس بات پر گواہ ہے کہ زندگی موت پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَہٗ ایک اور حیات انسان کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ اور وہ جب چاہے گا انسان کو زندہ کر دے گا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ تم اور تو ساری باتیں مانتے چلے آتے ہو مگر یہاں آکر انکار کر دیتے ہو۔ گویا تم تسلیم کرتے ہو کہ انسان کی پیدائش بغیر کسی حکمت کے نہیں ہوئی۔ اس کا ادنیٰ حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ درجہ تک کی حالت تک پہنچنا۔ اس کے اندر ترقی کی وسیع قابلیتوں کا رکھا جانا اس کے سامنے ترقیات کا ایک وسیع میدان ہونا۔ اور پھر اُن ترقیات کے مطابق انسانی قوتوں کا اُبھر آنا اور پھر عادت کے ذریعہ اس کے اندر بشاشت کا پیدا ہونا اور پھر جب وہ مر جائے تو تمہارا اپنے مردہ کی لاش کا احترام کرنا یہ سب امور اس بات کی ایک کھلی دلیل ہیں کہ مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ مگر تمہاری عجیب حالت ہے کہ تم اور تو سب باتوں کو مانتے چلے آتے ہو مگر ان باتوں کا جو طبعی نتیجہ ہے اُس کو تسلیم کرنے سے نشوز کرتے ہو۔

اَنْشَرَ

**[۱۲] تفسیر** - فرماتا ہے كَلَّا ہرگز نہیں لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ اُس نے اب تک وہ کام نہیں کیا جس کا اُسے حکم دیا گیا تھا۔ لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ میں اسی طرف اشارہ ہے جس طرف مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰی میں اشارہ کیا گیا تھا اور جس کا قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ میں بھی ذکر تھا۔ کہ انسان کے لئے موقع تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کے قرب میں بڑھے اور اپنی عاقبت کو سنوار لے مگر اب تک اس نے اپنے اس غرض کو ادا نہیں کیا۔ اُس کے لئے روحانی ترقیات حاصل کرنے کا بہت بڑا موقع تھا اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے قرب کا میدان کھلا تھا مگر افسوس کہ اس نے اپنے اس فرض کو کما حقہٗ اب تک سر انجام نہیں دیا۔ یہی وہ چیز ہے جس پر میں آج کل بار بار زور دے رہا ہوں اور جماعت کو توجہ دلا رہا ہوں کہ وہ آئندہ نسلوں تک اس امانتِ روحانی کو پہنچانے کے لئے اس قدر

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ سے مراد

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ ۝ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ

پس چاہیئے کہ انسان اپنے کھانے کی طرف دیکھے (اور دیکھے) کہ ہم نے (بادلوں سے) پانی کو خوب

صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا

برسایا ہے پھر زمین کو خوب پھاڑا ہے پھر اس میں دانہ اُگایا

حَبًّا ۝ وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۝ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝

ہے اور (اسی طرح) انگور اور ترکاریاں (اور سبز چارہ) اور زیتون اور کھجوریں

وَحَدَائِقَ غُلْبًا ۝ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝

اور گھنے باغات اور میوے اور خشک گھانس (اور جھاڑیاں بھی)

تو دی اور اس قدر جانکاہی سے کام لے کہ شیطان ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جائے اور کفر کے غلبہ کا دنیا میں کوئی امکان نہ رہے۔ آج تک کسی اُمت نے بھی اپنی نسل کو شیطانی حملوں سے محفوظ رکھنے پر زور نہیں دیا اگر ہماری جماعت اس فرض کو سرانجام دے لے تو یقیناً یہ ایک بے مثال کام ہوگا اور اس کی نظیر اور کسی اُمت میں نہیں مل سکے گی۔ اللہ تعالےٰ اسی نکتہ کی طرف توجہ دلاتا ہے اور افسوس کے ساتھ فرماتا ہے کہ لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ہم نے انسان کو جو حکم دیا تھا اس کو اب تک اُس نے ادا نہیں کیا۔ فرداً فرداً لوگوں نے اپنی اصلاح کی بہت کوششیں کی ہیں مگر قوم کی قوم کو اُبھار کر ترقی کے میدان میں اس طرح بڑھاتے چلے جانا کہ پھر اس کے گرنے کا کوئی امکان نہ رہے اور شیطان اُس کو ورغلانے سے مایوس ہو جائے یہ کام ایسا ہے جس کی طرف ابھی تک توجہ نہیں کی گئی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر چونکہ مختلف دَور آتے ہیں اس لئے ممکن ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دَوروں میں سے کوئی دَور ایسا بھی آجائے جس میں اس فرض کی ادائیگی ہو سکے جس کا كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اب تک الگ الگ کوششیں کرکے اُن کے نتائج کو دیکھا جا چکا ہے

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ میں موعود کل ادیان کی بعثت کی ضرورت کی طرف اشارہ

صحابہؓ نے تیس سال کوشش کی مگر پھر اُن کی نسلوں میں کمزوری پیدا ہو گئی اور نیکی کا تسلسل جاتا رہا۔ اب ہمارے لئے موقع ہے کہ ہم اس کام کو سرانجام دینے کی کوشش کریں تاکہ قومی طور پر اسلام دنیا میں اس طرح قائم ہو جائے کہ پھر اس کے گرنے کا کوئی امکان ہی نہ رہے۔ یہ کام ایسا ہے جو پہلے کبھی نہیں ہُوا۔ انفرادی رنگ میں بے شک بہت کوششیں ہوئیں مگر قومی طور پر اسلام کی برتری کی ایسی کوشش نہیں کی گئی کہ نیکی کا تسلسل قائم رہتا اور اسلام کے گرنے کا کبھی خطرہ پیدا نہ ہوتا۔ پس كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ میں اسی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ اب تک انسان نے وہ بات نہیں کی جس کا ہم نے اسے حکم دیا تھا۔

اس کے ایک اور معنے بھی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ انسانی قوتیں جس مقام عظیم کو حاصل کر سکتی ہیں اب تک انسان نے اُس مقام کو حاصل نہیں کیا پس تم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ابھی موعود کل ادیان آنا باقی ہے جس سے انسانی ترقی کا آخری مقام وابستہ ہے اور بجائے اس کے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو حقارت سے دیکھا جائے اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ کرنی چاہیئے۔

# مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝

(یہ سب) تمہارے اور تمہارے جانوروں کے فائدہ کیلئے (کیا گیا ہے) ۝۱۳

**۱۳ تفسیر** - چاہیئے کہ انسان اپنے کھانے کی طرف دیکھے اور غور کرے کہ ہم اُس کی جسمانی پرورش کے لئے کیا کچھ کرتے ہیں۔ ہم نے اس کے لئے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے زمین کو اس کی خاطر پھاڑا۔ پھر ہم نے اُس میں سے دانے نکالے اور انگور پیدا کئے اور قضب پیدا کیا۔ لُغت میں لکھا ہے کہ اَلْقَضْبُ كُلُّ شَجَرَةٍ طَالَتْ وَ بَسَطَتْ اَغْصَانُهَا وَالْقَتُّ - وَالْقَتُّ: اَلْفِصْفِصَةُ الْيَابِسُ وَالْفِصْفِصَةُ نَبَاتٌ تَعْلِفُهُ الدَّوَابُّ وَهِيَ تُسَمّٰى بِذٰلِكَ مَا دَامَتْ رَطْبَةً فَاِذَا جَفَّتْ زَالَ عَنْهَا اِسْمُ الْفِصْفِصَةِ وَسُمِّيَتْ بِالْقَتِّ حَبُّهَا كَحَبِّ الْكِرْسَنَّةِ لٰكِنْ فِيْهِ طُوْلٌ (اقرب) قضب کہتے ہیں ہر ایسے درخت کو جو اونچا بھی ہو اور اس کی شاخیں بھی ادھر اُدھر پھیلی ہوئی ہوں۔ جانور اس کو شوق سے کھاتے ہیں خصوصاً اونٹ ایسے درخت کی طرف بہت رغبت سے جاتا ہے۔ اسی طرح قَتّ کو بھی قضب کہتے ہیں اور قَتّ فِصْفِصَة کو کہتے ہیں یہ ایک روئیدگی ہے جس کو جانور کھاتے ہیں جب تک تازہ رہے فِصْفِصَة کہتے ہیں اور جب سُوکھ جائے تو اس کو قَتّ کہتے ہیں۔ اس کا دانہ کرسنہ کی طرح ہوتا ہے مگر اس سے کسی قدر لمبا ہوتا ہے (کرسنہ گندنے کو کہتے ہیں جسے پنجابی میں بھوکاٹ کہا جاتا ہے) پھر فرماتا ہے ہم نے زیتون نکالا اور کھجوریں پیدا کیں اور باغات پیدا کئے مَنڈیروں والے۔ ایسے باغات غُلْبًا ہوں بڑے گھنے ہیں۔ غُلب اُس چیز کو کہتے ہیں جو مُلْتَفّ یعنی لپٹی ہوئی ہو۔ پس حَدَآئِقَ غُلْبًا کے معنے یہ ہوئے کہ ہم نے ایسے باغات پیدا کئے ہیں جن کی شاخیں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی ہیں یعنی بڑے گھنے ہیں۔ اسی طرح ہم نے میوے پیدا کئے ہیں اور پھر چارہ بھی پیدا کیا ہے۔ اَبٌّ اُن تمام چیزوں کو کہتے ہیں جن کو انسان نہیں کھاتا اور نہ اُن کو بوتا ہے۔ قدرتاً زمین میں سے اُگ آتی ہیں اور جانور اُن کو کھاتے ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے اَلْاَبُّ كُلُّ مَا يُنْبِتُ الْاَرْضُ مِمَّا لَا يَاْكُلُهُ النَّاسُ وَلَا يَزْرَعُوْنَهٗ (فتح البیان)

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ - ان تمام چیزوں کو ہم نے تمہارے لئے فائدہ کا موجب بنایا ہے اور تمہارے انعام کے لئے بھی۔ قرآن کریم کے بعض مقامات ایسے ہیں جو لفظی رنگ میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں اسی قسم کی مشابہت اس جگہ بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ یہی مضمون سورۂ نازعات میں بھی تھا گر اور رنگ میں۔ وہاں فرمایا تھا ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا ۝ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ۝ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا ۝ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ۝ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ - اس سورۃ میں بھی اسی طرح کی چیزیں گنائی ہیں کہ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ - فرق صرف یہ ہے کہ سورۂ نازعات میں زیادہ تر آسمانی چیزوں کو پیش کیا گیا تھا۔ گو زمینی چیزوں کا بھی اس میں ذکر تھا مگر اصل مقصد نظام سماوی کو پیش کرنا تھا لیکن اس جگہ نظام ارضی کو خصوصیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ گویا پہلی سورۃ میں اُس وسیع نظام کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جو آسمان اور زمین دونوں پر حاوی ہے مگر اس سورۃ میں اُس مخصوص نظام کی طرف اشارہ ہے جو زمین میں روئیدگی پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ وہاں خدا تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کیا تھا کہ جس طرح زمین پر آسمان کا وجود ضروری ہے اور بغیر آسمانی نظام کے

الْقَضْبُ

سورۃ نازعات اور سورۃ عبس کے ایک مضمون کی مشابہت

زمینی نظام قائم نہیں ہو سکتا اسی طرح تمہارے لئے بھی ایک روحانی بلندی کی ضرورت ہے۔ اگر تم یہ خیال کرو کہ اس رُوحانی بلندی کے بغیر تم نظام ارضی کو قائم کر سکو گے تو یہ تمہاری غلطی ہو گی جس طرح آسمان کے بغیر زمین کا وجود عبث ہے اسی طرح روحانی نظام کے بغیر جسمانی نظام عبث اور بے کار ہوتا ہے یہاں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانی فطرتوں میں سے بعض ایسی ہیں جو قرآن کریم سے مناسبت رکھتی ہیں اور بعض ایسی ہیں جو قرآن کریم سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ وہ فطرتیں جو قرآن کریم سے مناسبت رکھتی ہیں وہ آپ ہی آپ اس طرف آ جائیں گی اور جو اس سے مناسبت نہیں رکھتیں وہ اس طرف توجہ بھی نہیں کریں گی۔ پس سورۂ نازعات میں اور مضمون تھا اور اس سورۃ میں اور مضمون ہے۔ وہاں آسمان کا ذکر کلام الٰہی کے نزول کی ضرورت پر روشنی ڈالنے کیلئے پیش کیا گیا تھا اور یہاں یہ بتایا ہے کہ بعض طبائع قرآنی تعلیم سے مناسبت رکھتی ہیں اور بعض نہیں رکھتیں۔ وہ طبائع جو اس تعلیم سے مناسبت رکھتی ہیں وہ دوڑتی ہوئی اس طرف آ جائینگی اور جنکے قلب میں اس سے کوئی مناسبت نہیں ہو گی وہ اس سے دُور رہیں گی جیسے زمین کو دیکھ لو کہ اس میں سے دانے بھی اُگتے ہیں۔ انگور بھی پیدا ہوتے ہیں۔ درخت بھی پیدا ہوتے ہیں۔ زیتون بھی پیدا ہوتا ہے کھجوریں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ باغات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ میوے بھی پیدا ہوتے ہیں اور چارہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز ایسی ہے جسے انسان مُنہ مارتا ہے اور کوئی چیز ایسی ہے جسے جانور مُنہ مارتا ہے۔ یہی انسانی طبائع کا حال ہے۔ جو قرآن کے مناسب حال ہیں وہ اس طرف آ جائیں گی اور جو کفر کے مناسب حال ہیں وہ اُس طرف چلی جائیں گی۔ گویا فطرتیں خود بخود بول اٹھیں گی کہ اُن کے مناسب حال کونسی چیز ہے۔ جیسے انگور ہوں تو اُن کی طرف انسان جائے گا اونٹ نہیں جائے گا لیکن اگر کیکر کا درخت ہو تو اس کی طرف اونٹ جائے گا انسان نہیں جائے گا۔ تو فرماتا ہے انسان نے بیشک ابھی تک اس قرآن پر عمل نہیں کیا مگر وہ مجبور ہے جس دن قرآن کریم کی روئیدگیاں ظاہر ہوئیں اور اس کا حُسن دنیا میں چمکا تم دیکھ لو گے کہ مناسب حال فطرتیں اس کی طرف دوڑتی ہوئی آئیں گی۔ اب تو یہ لوگ تمہیں تھوڑے سے نظر آتے ہیں مگر پھر گروہ در گروہ اور جوق در جوق لوگ اس مذہب میں داخل ہونے شروع ہو جائینگے۔ چنانچہ مثال دیتے ہوئے فرماتا ہے۔ تم دنیا میں دیکھ لو۔ کچھ دانے۔ انگور۔ زیتون۔ کھجور۔ باغات اور میوے ہوتے ہیں اور کچھ جھاڑیاں اور چارہ وغیرہ ہوتا ہے۔ تم اُن چیزوں کی طرف چلے جاتے ہو جو تمہارے مناسب حال ہیں اور جانور اُن چیزوں کی طرف چلے جاتے ہیں جو اُن کے مناسب حال ہیں۔ اسی طرح جو نیک فطرتیں ہیں وہ قرآن کیطرف آ جائینگی اور جو بد فطرتیں ہیں وہ کفر کیطرف چلی جائینگی۔

یہ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن چیزوں کا تو زیادہ ذکر کیا ہے جو انسانوں کے کھانے کے کام آتی ہیں مگر اُن چیزوں کا کم ذکر کیا ہے جو جانوروں کے کھانے کے کام آتی ہیں چنانچہ چھ جگہ انسانوں کے کام آنے والی چیزوں کا ذکر کیا اور دو جگہ جانوروں کے کام آنے والی چیزوں کا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن زیادہ آدمی کھینچے گا اور کفر اپنی طرف کم آدمی کھینچے گا چنانچہ جانور کے لئے تو صرف قَضْبًا اور اَبًّا کا ذکر کیا مگر انسان کے لئے حَبًّا وَّعِنَبًا وَّزَيْتُونًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّفَاكِهَةً انہی چیزوں کا ذکر کر دیا یہ بتانے کے لئے کہ قرآن کی طرف لوگوں کا رجوع زیادہ ہو گا اور کفر کی طرف کم۔ پس فرماتا ہے یہ سوال ہی غلط ہے کہ اسلام کا غلبہ کس طرح ہو گا۔ فطرتیں اپنی مناسب حال چیز کی طرف آپ ہی بھاگتی چلی آئینگی۔ وہ فطرتیں جو قرآن کریم کے مناسب حال ہیں وہ اس کی طرف آ جائیں گی جیسے حَبّ اور عِنَب اور زیتون اور نخل اور حدائق اور فاکھۃ کی طرف انسان جاتے ہیں اور جو فطرتیں کفر کے مناسب حال ہیں وہ اُس طرف چلی جائینگی جیسے جانور قضب اور اَبّ کی طرف جاتے ہیں انگوروں اور کھجوروں کی طرف نہیں جاتے۔

---

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۝ يَوۡمَ يَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِيۡهِ ۝

پھر (یہ بھی تو سوچو کہ) جب کان پھاڑنے والی (مصیبت) آئیگی جس دن کہ انسان اپنے بھائی سے (دُور) بھاگے گا اور

وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيۡهِ ۝ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيۡهِ ۝ لِكُلِّ امۡرِئٍ

(اسی طرح) اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے (بھی) اس دن ہر ایک آدمی

مِّنۡهُمۡ يَوۡمَئِذٍ شَاۡنٌ يُّغۡنِيۡهِ ۝

کی حالت ایسی ہوگی کہ وہ اُسے اپنی (ہی) طرف اُلجھائے رکھیگی ۳۸؎

۳۸؎ حل لغات۔ اَلصَّآخَّةُ: صَخَّ سے اسم فاعل کا مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور صَخَّ الصَّوۡتُ الۡاُذُنَ کے معنے ہوتے ہیں اَصَمَّهَا۔ اتنے زور کی آواز آئی کہ اس نے کان پھاڑ دیا اور اُسے بہرہ کر دیا (اقرب) اَلصَّآخَّةُ کے معنے ہیں صَيۡحَةٌ تُصِمُّ لِشِدَّتِهَا۔ ایسے زور کی آواز جو کانوں کو بہرہ کر دے نیز اس کے معنے ہیں اَلدَّاهِيَةُ سخت مصیبت (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے جب وہ کان پھاڑنے والی آواز آجائے گی يَوۡمَ يَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِيۡهِ جس دن کہ آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا وَ اُمِّهٖ اور اپنی ماں سے بھاگیگا وَ اَبِيۡهِ اور اپنے باپ سے بھاگیگا وَ صَاحِبَتِهٖ اور اپنی بیوی سے بھاگے گا وَ بَنِيۡهِ اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔ لِكُلِّ امۡرِئٍ مِّنۡهُمۡ يَوۡمَئِذٍ شَاۡنٌ يُّغۡنِيۡهِ۔ اُس دن انسان کے حالات ایسے ہونگے کہ وہ گردوپیش کی طرف نہ دیکھ سکیگا اور دوسروں کی طرف وہ توجہ ہی نہیں کرے گا۔ قیامت کے دن تو لوگوں کی ایسی حالت ہوگی ہی۔ صحابہؓ کرام کے حالات پر غور کر کے دیکھو جس وقت قرآن کا نزول ہُوا کس طرح دنیا نے اپنی آنکھوں سے اس نظارہ کا مشاہدہ کیا کہ باپ نے بیٹے کو چھوڑ دیا بیٹے نے باپ کو چھوڑ دیا۔ ماں بیٹی سے الگ ہوگئی اور بیٹی ماں سے الگ ہوگئی۔ بھائی بھائی سے جدا ہو گیا اور دوست دوست سے علیحدہ ہوگیا۔ يَوۡمَ يَفِرُّ الۡمَرۡءُ مِنۡ اَخِيۡهِ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيۡهِ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيۡهِ بھائی بھائی کو چھوڑ کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آگیا۔ خاوند اپنی بیوی کو چھوڑ کر اور بیوی اپنے خاوند کو چھوڑ کر۔ باپ اپنے بیٹے سے الگ ہو کر اور بیٹا اپنے باپ سے الگ ہو کر۔ ماں اپنی بیٹی کو چھوڑ کر اور بیٹی اپنی ماں سے علیحدہ ہو کر۔ دوست اپنے دوست کو چھوڑ کر اور رشتہ دار اپنے رشتہ دار سے علیحدہ ہو کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے حلقۂ اطاعت میں آگئے اور انہوں نے کسی دنیوی محبت کی خدا اور اس کے رسول کی رضاء کے مقابلہ میں پروا نہ کی۔ لِكُلِّ امۡرِئٍ مِّنۡهُمۡ يَوۡمَئِذٍ شَاۡنٌ يُّغۡنِيۡهِ اور پھر وہ اسلام اور قرآن کی محبت میں ایسے محو ہوگئے کہ وہ دنیا اور اُسکی دلچسپیوں کو بالکل بھول ہی گئے۔ تاریخ اسلام کے صفحات پر صحابہؓ کرام کی اس قربانی کی کتنی ہی واضح مثالیں موجود ہیں مگر میں اس جگہ صرف دو مثالیں بیان کر دیتا ہوں جن کا میں پہلے بھی کئی دفعہ ذکر کر چکا ہوں۔ ایک نوجوان جو اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا مسلمان ہوگیا۔ اُس کے ماں باپ نے اُسے کئی قسم کی تکلیفیں دینی شروع کیں یہاں تک کہ اس کے برتن الگ کر دئے مگر وہ اسلام کو ترک کرنے پر آمادہ نہ ہُوا آخر کچھ عرصہ کے بعد وہ مکہ سے ہجرت کر کے چلا گیا۔ کچھ مدت گذرنے کے بعد وہ پھر مکہ میں واپس آیا جس پر اُس کے ماں باپ اُسے بڑے شوق اور محبت سے ملے۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ اسلام سے

اَلصَّآخَّةُ سے مراد قرآن کی آواز

وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ مُّسۡفِرَةٌ ۙ ضَاحِكَةٌ مُّسۡتَبۡشِرَةٌ ۚ

کچھ (لوگوں کے) چہرے اُس دن روشن ہوں گے ہنستے ہوئے خوش بخوش ۵ا؎

توبہ کرچکا ہے اور بیٹے نے یہ سمجھا کہ یہ میرے بعد اسلام کی دشمنی کو ترک کرچکے ہیں اور اس لئے مجھے محبت سے مل رہے ہیں اور اور اب اپنے افعال پر پچھتاتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ماں باپ نے کہا بیٹا ہم تو تمہیں پہلے بھی یہی نصیحت کیا کرتے تھے کہ اس صابی کی طرف مت جاؤ۔ اُن کا اشارہ اس صابی کے لفظ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کی طرف تھا۔ گویا اس رنگ میں انہوں نے اپنی خیرخواہی جتانی شروع کردی کہ ہم تو تمہیں پہلے ہی کہا کرتے تھے کہ اسلام میں داخل ہوکر تم نے بڑی غلطی کی۔ اب اچھا ہوا جو اسلام کو چھوڑ کر پھر ہم میں شامل ہوگئے ہو۔ اُس نوجوان نے جب یہ بات سُنی تو وہ اُسی وقت کھڑا ہوگیا اور کہا ماں! تم میری ماں ہو اور باپ! تم میرے باپ ہو مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مجھے اور کوئی پیارا نہیں۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ تمہارے دل میں رحم پیدا ہوچکا ہے اور تم اپنے افعال پر پشیمان ہو لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ اگر تمہارا میرے ساتھ ملنا اسی شرط سے وابستہ ہے کہ میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دوں تو یہ ناممکن بات ہے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میرے باپ ہیں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی میری ماں ہیں۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھا اور پھر اُس نے مرتے دم تک اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا۔ پھر اس عورت کے واقعہ پر غور کرو جو مدینہ کی رہنے والی تھی جو جنگ اُحد میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر سُن کر دیوانہ وار اپنے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی اور جب اُسے یکے بعد دیگرے بتایا گیا کہ تیرا باپ اس جنگ میں مارا گیا ہے۔ تیرا خاوند اس جنگ میں مارا گیا ہے تیرا بھائی اس جنگ میں مارا گیا ہے تو اُس نے کہا میں تم سے یہ نہیں پوچھتی کہ میرے باپ اور میرے خاوند اور میرے بھائی کا کیا حال ہے میں تم سے یہ پوچھتی ہوں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے اور جب اس کو بتایا گیا کہ آپ تو خدا کے فضل سے بخیریت ہیں تو اُس کے مُنہ سے بے اختیار نکلا کہ اگر آپ خیریت سے ہیں تو پھر کوئی مصیبت ایسی نہیں ہوسکتی جو ناقابل برداشت ہو۔ غرض يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ کا نظارہ ہمیں صحابہ کرام میں نظر آتا ہے۔ اس کے بالمقابل کفار میں بھی ایسا ہی جوش تھا کہ بھائی بھائی پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہوجاتا اور باپ بیٹے کو قتل کرنے کیلئے دوڑتا۔ چنانچہ جب جنگ ہوتی تو اس میں بھائی بھائی کو مارنے کیلئے آگے بڑھتا تھا اور اپنے رشتہ داری تعلقات کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا تھا یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک جنس نہیں ہیں بلکہ دو الگ الگ جنسیں ہیں۔ مومن ہے تو وہ کہتا تھا میرا کافر کوئی واسطہ نہیں میرا وہی دوست ہے جو مومن ہے اور کافر ہے تو وہ کہتا تھا میرا مومن سے کوئی واسطہ نہیں۔ میرا وہی دوست ہے جو کافر ہے۔ یہی وہ صَاخَّۃ کی علامت ہے جو سچے مذہب کی آمد پر ظاہر ہُوا کرتی ہے اور جس کے بعد کسی قسم کی مداہنت یا کسی قسم کی منافقت برداشت نہیں کی جاسکتی۔ کفر اور ایمان میں ایک بیّن اور کُھلا کُھلا امتیاز ہوجاتا ہے لیکن جھوٹے مذاہب کے درمیان یہ بات نہیں ہوتی۔ اسی طرح اُس قوم میں بھی یہ امتیازی علامت نہیں رہ سکتی۔ جو جھوٹے مذہب کا حصہ بن جائے جیسے غیر مبایعین ہیں کہ وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم کے خلاف غیر احمدیوں کے پیچھے نمازیں پڑھ لیں گے۔ اُن سے رشتہ داری تعلقات قائم کرلیں گے اور اس میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے حالانکہ خدا کی آواز صاخّہ ہوتی ہے اور جب وہ بلند ہوتی ہے تو بھائی کو اپنے بھائی سے اور رشتہ دار کو اپنے رشتہ دار سے جُدا ہونا پڑتا ہے۔

یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ کا نظارہ صحابہ کرام میں

مُسْفِرَۃٌ

**۵ا؎ حل لغات۔** مُسْفِرَۃٌ کے معنے ہیں مُضِیْئَۃٌ مُشْرِقَۃٌ۔ روشن اور چمکنے والی چنانچہ اَسْفَرَ الصُّبْحُ کے معنے ہوتے ہیں اَضَاءَ وَاَشْرَقَ۔ صبح روشن ہوگئی اور اس کی

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝

اور کچھ (لوگوں کے) چہرے اُس دن ایسے ہونگے کہ اُن پر غبار اُڑ رہی ہوگی۔ اُن پر سیاہی چھا رہی ہوگی ۱۶؎

ع ۱ ۵

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝

یہی وہ (لوگ) ہوں گے جو کافر اور بدکار ہیں ۱۷؎

سفیدی پھیل گئی۔ اور اَسْفَرَ وَجْهُهٗ کے معنے ہوتے ہیں۔ حَسُنَ وَاَشْرَقَ کہ اس کا چہرہ خوبصورت ہوگیا اور روشن ہوگیا (اقرب) پس فرماتاہے اُس دن کچھ چہرے ایسے ہوں گے جو بڑے خوبصورت ہوں گے۔ بڑے روشن اور چمکدار ہونگے۔ ضَاحِكَةٌ ہنس رہے ہوں گے۔

مُّسْتَبْشِرَةٌ۔ اِسْتَبْشَرَ سے ہے اور اِسْتَبْشَرَ کے معنے خوش ہونے کے بھی ہوتے ہیں اور خوشخبری حاصل کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ (لسان) پس مُسْتَبْشِرَةٌ کے معنے یہ ہیں کہ وہ بڑے خوش ہونگے اور انہیں بڑی خوشخبریاں مل رہی ہوں گی۔ کہ ابھی اور فتح آنے والی ہے اور غلبہ ملنے والا ہے اور نصرت نازل ہونے والی ہے۔

**تفسیر۔** فرماتاہے مومن اور کافر چونکہ دو الگ الگ گروہ ہیں اس لئے ان سے ہمارا سلوک بھی الگ الگ ہوگا جو لوگ ہمارے احکام پر ایمان لاتے ہیں ان کو ہم اپنے انعامات سے حصہ دیں گے اور جنہوں نے انکار کیا ہے ان کو اپنے عذاب سے حصہ دیں گے۔ چنانچہ فرماتا ہے اس دن کچھ چہرے ایسے ہوں گے جو روشن ہوں گے اور خوبصورت ہوں گے ہنس رہے ہوں گے اور خوش ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے بشارتیں حاصل کر رہے ہوں گے۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے مُسْتَبْشِرَةٌ دو معنے رکھتا ہے خوش ہونیکے بھی اور خوشخبری حاصل کرنیوالے کے بھی۔ تو مومنوں کو ہر دو امور حاصل ہونگے۔

**۱۶؎ حل لغات۔** غَبَرَةٌ کے معنے ہیں اَلْغُبَارُ یعنی غبار (اقرب)

تَرْهَقُ رَهِقَ سے ہے اور رَهِقَ کے معنے ہوتے ہیں غَشِيَهٗ وَلَحِقَهٗ۔ اس کو جا پکڑا یا جا لیا (اقرب) پس تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ کے یہ معنے ہوئے قترہ انکو پکڑ لیگی یا قترہ اُن سے جا ملیگی اور قَتَرَةٌ کے معنے ہوتے ہیں اَلْغَبَرَةُ غبار اس کی جمع قَتَرٌ آتی ہے (اقرب)

**تفسیر۔** فرماتاہے جس دن یہ افتراق پیدا ہوجائیگا کفر اور اسلام میں ایک بیّن امتیاز قائم ہو جائیگا۔ خدا تعالیٰ کا صور آسمان سے پھونکا جائیگا اور مومن ایک طرف ہوجائینگے اور کافر دوسری طرف۔ کچھ لوگ ایمان کے باغ پر لٹو ہو رہے ہوں گے اور کچھ کفر کے گھاس پر مُنہ مار رہے ہوں گے اور اونٹ اور بکریاں درختوں کی طرف چلی جائیں گی اور انسان انگوروں اور کھجوروں کی طرف چلے جائیں گے یہ مضمون ہے جو اللہ تعالیٰ نے اِن آیات میں بیان کیا ہے۔ فرماتاہے اُس دن کچھ چہرے ایسے ہوں گے جن پر غبار پڑا ہوا ہوگا۔ مطلب یہ ہوا کہ پہلے دن اُن کے مُنہ پر مٹی لگیگی اور پھر اُن کے سارے جسم کو ڈھانپ لے گی۔ جانور کو جب ذبح کرنے کے لئے لٹایا جاتا ہے تو پہلے اُس کے مُنہ کو مٹی لگتی ہے لیکن جب اُسے ذبح کیا جاتا ہے تو وہ تڑپتا ہے اور اس تڑپنے کی وجہ سے اُس کے سارے جسم پر مٹی لگ جاتی ہے۔ اسی طرف اِن آیات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کو ذبح کرنے کے لئے پہلے ہم زمین پر لٹائیں گے جس سے اُنکے منہ پر مٹی لگیگی مگر جب انہیں ذبح کیا جائے گا اور یہ تڑپنا شروع کریں گے۔ تو پھر اُن کا سارا جسم مٹی سے ڈھانپا جائے گا گویا کفار کی کامل تباہی کی خبر دی گئی ہے۔

**۱۷؎ حل لغات۔** اَلْكَفَرَةُ۔ كَافِرٌ کی جمع ہے جو كَفَرَ سے اسم فاعل ہے اور كَفَرَ کے معنے ہیں۔ ضِدُّ اٰمَنَ

مُسْتَبْشِرَةٌ ۱؎

غَبَرَةٌ ۱؎

تَرْهَقُ ۱؎

كَفَرَةٌ ۱؎

وہ ایمان نہ لایا اور جب کَفَرَ نِعْمَةَ اللّٰہِ کہیں تو معنے ہوں گے جَحَدَهَا وَسَتَرَهَا یعنی خدا کی نعمت کی ناقدری و ناشکری کی اور اس کا انکار کیا۔ اور جب کَفَرَ الشَّیْءَ کہیں تو معنے ہوں گے سَتَرَهَا کسی چیز کو چھپا دیا (اقرب) پس کافر کے معنے ہوں گے (۱) ایمان نہ لانے والا (۲) اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کرنے والا (۳) کسی بات کو چھپانے والا۔ اقرب کا مصنف لکھتا ہے کہ کَفَرَةٌ عربی زبان میں عموماً ان لوگوں کیلئے بولتے ہیں جو خدا کی نعمتوں کی ناقدری کریں (اقرب)

اَلْفَجَرَةُ

اَلْفَجَرَةُ :۔ اَلْفَاجِرُ کی جمع ہے جو فَجَرَ یَفْجُرُ سے اسم فاعل ہے۔ فَجَرَ الرَّجُلُ (فُجُوْرًا) کے معنے ہیں اِنْبَعَثَ فِی الْمَعَاصِیْ وَزَنٰی وَفَسَقَ۔ وہ گناہوں کے ارتکاب میں لگ گیا حتیٰ کہ کھلی کھلی بے حیائی کے کام کرنے شروع کر دئے۔ اور جب فَجَرَ الْحَالِفُ کہیں تو معنے ہونگے کَذَبَ قسم کھانے والے نے جھوٹی قسم کھائی۔ نیز کہتے ہیں فَجَرَ فُلَانًا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ کَذَّبَهٗ وَعَصَاهُ وَخَالَفَهٗ یعنی فلاں شخص کو جھٹلایا اور اس کی مخالفت کی اور اس کے خلاف کیا۔ اور جب فَجَرَ اَمْرُ الْقَوْمِ کا فقرہ کہیں تو معنے ہونگے فَسَدَ قوم کا معاملہ خراب ہو گیا۔ اور جب فَجَرَ فُلَانٌ عَنِ الْحَقِّ کہیں تو معنے ہوں گے عَدَلَ عَنْهُ۔ حق بات سے پھر گیا (اقرب) پس اَلْفَجَرَةُ کے معنے ہوں گے (۱) حق بات سے پھرنے والے (۲) جھوٹی قسمیں کھانے والے (۳) نافرمان اور خدا کے احکام کو جھٹلانے والے (۴) بے حیائی کے کام کرنیوالے (۵) ایسے لوگ جن کا معاملہ خراب ہو چکا ہو۔

**تفسیر**۔ یہ سمجھ لو کہ یہ تباہ ہونیوالے لوگ ہی کافر اور فاجر ہیں گویا واقعہ تمہیں خود بخود بتا دے گا کہ کون لوگ ایمان لانیوالے ہیں اور کون لوگ کفر اور فسق و فجور میں ترقی کرنے والے ہیں۔ اب تم لوگوں کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مکہ میں سے کونسے لوگ ایمان لائینگے اور کونسے لوگ انکار کرینگے مگر جسوقت اسلام کا باغ لگا آدمی اس طرف بھاگ پڑینگے جس طرف انگور اور کھجور اور دانے اور زیتون اور میوے وغیرہ ہیں۔ اور جانور اُس طرف بھاگ پڑیں گے جس طرف کیکر کے درخت کھڑے ہیں۔ جو لوگ انگور اور کھجور وغیرہ کی طرف جائیں تم سمجھ لو کہ وہ آدمی ہیں اور جو کیکر کے درختوں یا چارہ وغیرہ پر منہ مارنے کے لئے دوڑ پڑیں اُن کے متعلق تم یہ یقین کر لو کہ وہ بھیڑیں اور بکریاں ہیں۔ ایک دن آئے گا جب ان کو ذبح کر دیا جائے گا۔ اور مسلمان اُن پر غلبہ حاصل کر لیں گے ؎

# سُورَةُ التَّكْوِيرِ

سورۃ تکویر

## مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تِسْعٌ وَعِشْرُونَ آيَةً دُونَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيهَا رُكُوعٌ وَاحِدٌ

یہ سورۃ مکی ہے۔ اور اس کی بسم اللہ کے علاوہ اُنتیس آیات ہیں اور ایک رکوع ہے [۱]

[۱] سورۃ التکویر مکی ہے ۔ بعثت سے قبل از ہجرت یا اس سے کچھ پہلے کی معلوم ہوتی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سورۃ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ كَاَنَّهُ رَأْيُ عَيْنٍ فَلْيَقْرَأْ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ۔ اَخْرَجَهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَحَسَّنَهُ وَالْحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ (روح المعانی) یعنی ابن عمرؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جو قیامت کو اس طرح معلوم کرنا چاہے جس طرح آنکھوں دیکھی چیز۔ اُسے اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ سے شروع ہونے والی سورتیں پڑھنی چاہئیں۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے اور مسند احمد حنبل میں بھی یہ روایت مذکور ہے ۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس سورۃ میں ایک یوم القیامۃ کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ ایسا تفصیلی ہے کہ یوم القیامۃ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ اس سے مراد وہ یوم القیامۃ ہے جو تمام بنی نوع انسان کے مرنے کے بعد آئے گا یا کوئی اور ہے۔

سو اس بارہ میں یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کریم میں قیامت کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہے ۔ مرنے کے بعد جب سب لوگ زندہ کئے جائیں گے اس کے لئے بھی قیامت کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ نبی کی بعثت کے لئے بھی قیامت کا لفظ استعمال ہوتا ہے نبی کے دشمنوں کی تباہی کے لئے بھی قیامت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور نبی پر ایمان لانے والوں کی ترقی کے لئے بھی قیامت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ نبی کی بعثت بھی قیامت ہے کیونکہ وہ موجب ہوتی ہے ہر ایک چیز کے اُبھر آنے کا۔ نبی جب ظاہر ہوتا ہے تو نیکی کی طاقتیں بھی اُبھر آتی ہیں اور بدی کی طاقتیں بھی اُبھر آتی ہیں اس لئے وہ بھی ایک قیامت ہوتا ہے کیونکہ اُس کے آنے پر دنیا میں ایک حشر برپا ہو جاتا ہے اور قلوب کی مخفی طاقتیں ظاہر ہو جاتی ہیں چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ابو بکر کے ابو بکر رضؓ بننے کا اور ابو جہل کے ابو جہل بننے کا موجب ہوئے ورنہ ابو جہل تو پہلے ابو الحکم کہلاتا تھا جب اس کو وہ روحانی وجود نظر آیا جس کے ظاہر ہونے میں اُس نے اپنی طاغوتی طاقتوں کی موت دیکھی تو یکدم اس نے اپنی طاغوتی قوتوں کو بڑھا دیا تاکہ وہ اس نورانی وجود کو دنیا سے مٹا دے تب اس کی وہ شکل ظاہر ہوئی جس سے آج ہم سب نفرت کرتے ہیں اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ آئے ہوتے اور لوگ ابو الحکم سے ملتے تو شاید تاریخوں میں وہ یہ ذکر کرتے کہ ابو الحکم عرب کا ایک شریف اور با اخلاق رئیس تھا۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غالب نورانی وجود کو دیکھ کر اس کی طاغوتی قوتیں جوش میں آگئیں اور اس کا اندرونی گند دنیا پر ظاہر ہو گیا۔ اسی طرح اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہ آئے ہوتے اور لوگ حضرت ابو بکرؓ سے ملتے تو وہ تاریخوں میں ذکر کرتے کہ ابو بکر عرب کا ایک شریف۔ اچھا اور دیانتدار تاجر تھا۔ لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے نتیجہ میں ابو بکر کا حسن اس رنگ میں ظاہر ہوا کہ آج تک سب دنیا اُس کی تعریف پر مجبور ہے ۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے ہی ابو بکر ابو بکرؓ بنا اور ابو جہل ابو جہل بنا ۔ موجودہ زمانہ میں ہی دیکھ لو مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مخالفت نہ کرتے یا مولوی ثناء اللہ صاحب مخالفت نہ کرتے

سورۃ تکویر مکی ہے

سورۃ تکویر میں قیامت کا ذکر

[۲۱۱] قیامت سے مراد بعثتِ انبیاء

قرآن مجید میں قیامت سے مراد کفار کی تباہی

اور ہمیں اُن کا تاریخوں میں ذکر کرنا پڑتا تو ہم کہتے کہ یہ اپنی قوم کے بڑے عالم تھے۔ صداقت سے ان کی اندرونی دشمنی کبھی ظاہر نہ ہوتی مگر اب ان کی تحریروں کو پڑھ کر یوں پتہ لگتا ہے کہ سچ کو دیکھ کر اُن کا دل چاہتا ہے کہ اُسے بالکل ملیامیٹ کر دیں۔ یہ انقلاب صرف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے ہوا ورنہ اُن کی یہ طاقت اُبھرنی نہ تھی یا حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کو اگر ہم حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بغیر ملتے تو ہم یہی کہتے کہ آپ ایک بڑے عالم تھے۔ طبیب تھے اور غریب پروری کا مادہ اپنے اندر رکھنے والے تھے اس سے زیادہ ہمیں اُن کی نیکی نظر نہ آتی۔

الغرض نبی کی بعثت بھی ایک قیامت ہی ہے پھر وہ گھڑی بھی ایک قیامت ہوتی ہے جب نبی کی بعثت کی وجہ سے اللہ تعالےٰ اس کے دشمنوں کو تباہ کرتا ہے کیونکہ قیامت بمعنی موت بھی آتی ہے۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ (مجمع البحار و تشیید المعانی) جو مر جاتا ہے اس کی قیامت اُسی وقت آجاتی ہے۔ اگر ایک شخص کی موت کو قیامت کہہ سکتے ہیں ۔ تو قوم کی موت اور تباہی قیامت کہلانے کی زیادہ مستحق ہے۔ علامہ شیخ محمد طاہر سندھی

قرآن اور حدیث میں قیامت کے تین استعمال

مصنف مجمع بحار الانوار لفظ قیامت کے نیچے لکھتے ہیں وَقَدْ وَرَدَ فِي الْكِتٰبِ وَالسُّنَّةِ عَلٰى ثَلَاثَةِ اَقْسَامٍ اَلْقِيٰمَةُ الْكُبْرٰى وَالْبَعْثُ لِلْجَزَاءِ وَالْوُسْطٰى وَهِيَ انْقِرَاضُ الْقَرْنِ وَالصُّغْرٰى وَهُوَ مَوْتُ الْاِنْسَانِ یعنی قرآن کریم اور حدیث سے قیامۃ کے تین استعمال ثابت ہیں۔ قیامت کبریٰ جو جزا و سزا کے لئے بعثت ثانیہ کے مفہوم میں استعمال ہوتی ہے اور قیامت وسطیٰ جس سے مراد پہلی صدی کا خاتمہ ہے یعنی جب مسلمانوں میں تنزل کے آثار ظاہر ہوں گے اور صغریٰ یعنی موت انسانی۔

قرآن کریم سے اسی امر کی تصدیق ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ روشنی لفظ قیامت اور ساعۃ پر پڑتی ہے (یہ دونوں لفظ ہم معنی استعمال ہوتے ہیں) چنانچہ قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ قیامت (۱) نبی کی قوم کی ترقی (۲) دشمنوں کے تنزل (۳) اور نبی کی قوم کے زمانۂ ترقی کے بعد تنزل کے دور پر بولا جاتا ہے۔ پہلے معنوں کے مطابق قرآن کریم میں سورۂ قمر کی یہ آیت ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ساعت یعنی قیامت قریب ہی آگئی ہے اور چاند پھٹ گیا ہے عام طور پر مسلمانوں میں شق قمر کے معجزہ کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ اسمیں شق قمر کے معجزہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے حالانکہ اس آیت میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے معلوم ہو کہ صرف اسی معجزہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ اس آیت میں شق قمر کے مضمون کو ضمنی امر کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور اقتراب ساعۃ کی دلیل قرار دیا گیا ہے بس شق قمر کے کوئی بھی معنے لو خواہ عرب کی حکومت کے زوال کے یا اس معجزہ کے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے مومنوں اور کافروں کو اس طرح دکھایا کہ انہیں چاند پھٹتا ہوا نظر آیا بہرحال یہ امر ثابت ہے کہ قرآن کریم اس انشقاق قمر کو اس امر کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے کہ اب قیامت کو آیا سمجھو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وہ قیامت کبریٰ جس وقت تمام عالم مر کر دوبارہ اُٹھے گا اب تک کہ اس نشان پر قریباً تیرہ سو ستر سال گزر چکے ہیں ظاہر نہیں ہوئی اور جبکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اُمت میں مسیح اور مہدی ظاہر ہونے والے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے اسلام پھر ترقی کرنے والا ہے اگر ان کا زمانہ اور اُن کے بعد کا زمانہ عام مسلمان (کیونکہ ہمارے نزدیک وہ ظاہر ہو چکے ہیں) سات سو سال کا بھی تسلیم کرلیں تو قیامت دو ہزار سال بعد آئے گی ان حالات میں کفار کو اقتراب ساعۃ سے ڈرانے کے کوئی بھی تو معنے نہیں رہتے اور یہ ایک تمسخر ہو جاتا ہے جو قرآن کریم کی شان سے بعید ہے کہ وہ کفارِ مکہ کو ڈراتا ہے کہ اے کفارِ مکہ! تم تباہ ہو جاؤ گے اور اسلام غلبہ پالے گا پھر وہ زوال پذیر ہوگا اور اس کے زوال پر صدیاں گذرنے پر ایک مسیح ظاہر ہوگا اور وہ دنیا پر غالب آکر اسلام کو غالب کرے گا اور پھر ایک لمبے عرصہ ترقی کے بعد کفر ترقی کرے گا اور اس وقت

دنیا تباہ ہو جائے گی اور ہم تم کو اسے کفار جن کا نام ونشان مٹ ہو گئے اس وقت تک دو ہزار سال ہو چکے ہوں گے اس دن سے ڈراتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ اب سے صرف دو ہزار سال کے بعد آنے والا ہے کوئی عقلمند آدمی بھی لوگوں کے سامنے ایسی بات پیش کر سکتا ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف جو سب عالموں سے اعلم ہے وہ بات کیوں منسوب کی جاتی ہے جسے خود انسان اپنی نسبت منسوب کیا جانا پسند نہیں کرتا۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اس اقتراب ساعت سے مراد اسلام کا غلبہ ہے اور جیسا کہ عرب کے محاورہ سے ظاہر ہے قمر کے معنے عرب کی حکومت یا عرب کے سردار کے ہوتے ہیں پس اللہ تعالیٰ نے پہلے کفار اور مسلمانوں کو انشقاقِ قمر کا معجزہ دکھایا پھر قرآن کریم میں اس معجزہ کی تفسیر بیان فرما دی اور فرمایا کہ تم لوگ انشقاقِ قمر کا معجزہ دیکھ چکے ہو وہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ عربوں کی حکومت (یعنی کفار عربوں کی حکومت) اب تباہ ہونے والی ہے اور اسلام کی ترقی کا وقت جو دشمنانِ اسلام کے لئے ایک قیامت کا نظارہ پیش کرے گا نزدیک آ گیا ہے اور اس آیت میں ساعت یا قیامت سے مراد اسلام کی ترقی کا دور ہے نہ کچھ اور۔ اسی طرح سورۂ ممتحنہ میں بعض مسلمانوں کا ذکر کر کے کہ وہ بعض دفعہ مسلمانوں کی خبریں کفار کو بھجوا دیتے ہیں اور یہ بُرا فعل ہے فرماتا ہے اِنْ یَّثْقَفُوْکُمْ یَکُوْنُوْا لَکُمْ اَعْدَآءً وَّ یَبْسُطُوْٓا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ وَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ ۝ لَنْ تَنْفَعَکُمْ اَرْحَامُکُمْ وَ لَآ اَوْلَادُکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَفْصِلُ بَیْنَکُمْ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ (ممتحنہ ع ۱) یعنی یہ کفار تو تمہارے پکے دشمن ہیں اگر تم کو پکڑنے کا موقعہ لے کوئی موقعہ دشمنی کا جانے نہ دیں اور اپنے ہاتھ تمہاری طرف سزا کے لئے بڑھائیں اور اسی طرح زبان درازی سے نہ چوکیں اور ان کا تو دل یہی چاہتا ہے کہ تم کافر ہو جاؤ۔ لیکن یاد رکھو کہ خواہ یہ لوگ تمہارے عزیز ہوں یا اولاد یہ تم کو قیامت کے دن نفع نہ دیں گے اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان اس دن امتیاز قائم کر دے گا اور اللہ تعالیٰ اُسے جو تم کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔

اس آیت میں یوم قیامت سے مراد وہی فیصلہ کا دن ہوا جو اس دنیا میں فتح مکہ اور بعد کے زمانہ میں ظاہر ہوا اور جس نے کافر و مومن کو الگ الگ کر دیا۔ قومی ترقی میں کفار کوئی مدد نہ کر سکے حتیٰ کہ غزوہ حنین میں بجائے فائدہ پہنچانے کے کفار مسلمانوں کے بھاگنے کا موجب ہوئے اور جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عباسؓ نے آواز دی کہ اے انصار! اے بیعتِ رضوان کرنے والو! خدا کا رسول تم کو بلاتا ہے تو انصار غیر معمولی قربانی کر کے لوٹے اور مسلمانوں کی شکست فتح سے بدل گئی لیکن کفار نے جا کر مکہ ہی میں دم لیا۔ پس اس آیت کا مضمون جب پوری طرح اس دنیا میں پورا ہوا ہے بغیر کسی تاویل یا توجیہ کے۔ تو اس کو مرنے کے بعد کے زمانہ پر لگانا کوئی معنے نہیں رکھتا۔

اسی طرح سورۂ بقرہ میں فرماتا ہے زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ (بقرہ ع ۲۶) اس آیت میں بھی یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فتح مکہ وغیرہ قسم کے واقعات کی نسبت استعمال ہوا ہے۔ یہاں فرمایا گیا ہے کہ کافر ورلی زندگی کو اچھا سمجھتے ہیں یعنی موجودہ وقت کی طاقت پر گھمنڈ رکھتے ہیں حالانکہ انجام مسلمانوں کا اچھا ہوگا اور قیامت کے دن مسلمان کافروں پر غالب ہوں گے اور انہیں بے حساب رزق ملے گا۔ یہ واقعہ اسی دنیا میں فتح مکہ اور بعد کے واقعات سے پورا ہوا۔ اگر یہ معنے کرو کہ مسلمان مرنے کے بعد قیامت کے دن کافروں پر غالب ہوں گے تو اول تو یہ دلیل و برہان نہیں رہتی کیونکہ مرنے کے بعد کے واقعہ کو حجت کے طور پر پیش کرنا ایک بے فائدہ امر ہے اس سے کون شخص ایمان حاصل کر سکتا ہے؟ مرنے کے بعد تو ایمان کا نفع ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے اس صورت میں آیت قرآنی کا یہ مطلب ہوگا کہ مسلمانوں کو غلبہ اس دنیا میں نہ ملے گا مرنے کے بعد ملے گا اور یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ مسلمانوں کو فتح مکہ اور بعد کی جنگوں سے اسی دنیا میں غلبہ ملا۔ اگر کہا جائے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بغیر حساب رزق

دینے کا ذکر کیا ہے اور یہ بعد از موت زندگی میں ہی ممکن ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بغیر حساب کے دو معنے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ عمل کی نسبت زیادہ ملنا گویا عمل کے حساب سے جس قدر ملنا چاہیئے تھا اس سے زیادہ مل گیا۔ دوسرے معنے اس کے یہ ہوتے ہیں کہ جس کو رزق ملے گا وہ اُسے نہایت اچھی طرح خرچ کرے گا اور اُسے اس کا حساب نہ دینا ہوگا۔ حساب اُسی وقت دیا جاتا ہے کہ جب فرض کو صحیح طور پر بجا نہ لایا جائے۔ چنانچہ احادیث میں ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس سے حساب لیا گیا تباہ ہُوا۔ پھر حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ اللہ تعالےٰ تو فرماتا ہے فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا۔ کہ مومنوں کا بھی حساب ہوگا۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حساب سے مراد یہ ہے کہ پوری طرح حساب لیا جائے ورنہ مومن کا حساب تو یونہی سرسری ہے اور نہ ہونے کے برابر (بخاری کتاب الرقاق باب من نوقش الحساب) پس بغیر حساب کے ایک معنے یہ ہیں کہ مومنوں کو جو ملے گا وہ اُسے نیک طور پر خرچ کریں گے اور اس طرح حساب کی زحمت سے بچ جائینگے اور یہ دونوں معنے مسلمانوں کی زندگی میں ہی پورے ہوگئے مرنے کے بعد کی قیامت کا انہیں انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جو کچھ مسلمانوں کو ملا بلا حساب ملا۔ اُن کی قربانیاں بیشک بہت تھیں مگر خدا تعالےٰ کی طرف سے جو اجر انہیں ملا وہ ان کی قربانیوں سے بہت زیادہ تھا۔ اونٹ اور بکریاں چرانے والے ساری دنیا کے بادشاہ ہوگئے اور مقہور اور مغلوب قوم زبردست بادشاہتوں کی مالک ہوگئی۔ اسی طرح دوسرے معنوں کے رُو سے بھی انہیں بغیر حساب ملا یعنی وہ ایسے تقوٰی کے مالک ہوئے کہ آج تک اُنکی نیکی کی دنیا تعریف کر رہی ہے۔ انہوں نے بہت کچھ کمایا لیکن گنوایا نہیں۔ اُسے اس طرح خرچ کیا کہ اس دنیا میں نیکی اور اگلے جہان میں ثواب کا موجب ہُوا (اس بارہ میں دیکھو سورۂ نور آیت ۳۸ ع۵ و سورۂ ص آیت ۴۹ ع۴ و سورۂ زمر آیت ۱۰ ع۲) خلاصہ یہ کہ آیت مذکورہ بالا میں جس یوم قیامت کا ذکر ہے اس سے مراد غلبۂ اسلام ہے کیونکہ اسی موقعہ پر مسلمانوں کو کفار پر فوقیت حاصل

احادیث میں قیامت سے مراد انقلاب دنیا

ہوچکی تھی اور بغیر حساب رزق بھی مل گیا تھا۔ اسی طرح سورۃ قیامۃ میں دو قیامتوں کا ذکر ہے ایک اس دنیا کی اور ایک آخرۃ کی۔ چنانچہ ایک قیامت کا یوں ذکر ہے فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (قیامۃ ع۱) یعنی اس وقت چاند گرہن لگے گا اور اس کے بعد سورج گرہن لگے گا اور گرہن مرنے والی قیامت کی علامت نہیں بلکہ مہدی مسعود کی علامت احادیث سے ثابت ہے پس ان آیات میں جس قیامت کا ذکر ہے وہ آخری زمانہ میں اسلام کے احیاء کی قیامت ہے نہ مرنے کے بعد اُٹھنے والی۔ ان آیات کے سوا متعدد جگہ قرآن کریم میں قیامت اور ساعۃ سے مراد اس دُنیا کے کسی عظیم الشان انقلاب کو مراد لیا گیا ہے اور آیات زیر تفسیر میں بھی جس قیامت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (جیسا کہ اگلے مضامین سے ثابت ہوگا) اس سے مراد اس دنیا کی قیامت ہے جبکہ اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو مرنے کے بعد پھر زندہ کریگا اور اسلام مٹ کر پھر تازہ ہوگا اور اس زمانہ کی علامات اس اور اس سے بعد کی سورۃ میں بیان کی گئی ہیں۔

جیسا کہ قرآن کریم کے محاورہ میں قیامت سے مراد اس دنیا کا انقلاب بھی لیا گیا ہے احادیث نبی کریمؐ میں بھی قیامت اور ساعۃ ان معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں چنانچہ بخاری کتاب الایمان باب سوال جبریل عن علم الساعۃ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت جبریل انسانی شکل میں متمثل ہوکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے ساتھ کے صحابہ کو بھی نظر آئے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مَتَى السَّاعَةُ۔ قیامت کب آنے والی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مَا الْمَسْئُوْلُ اَعْلَمُ مِنَ السَّائِلِ وَسَاُخْبِرُكَ عَنْ اَشْرَاطِهَا اِذَا وَلَدَتِ الْاَمَةُ رَبَّهَا وَاِذَا تَطَاوَلَ رُعَاةُ الْاِبِلِ الْبُهْمِ فِي الْبُنْيَانِ یعنی اس بارہ میں سائل سے زیادہ مجھے علم نہیں ہاں میں اُسکی علامات بتا دیتا ہوں۔ اس کی علامات یہ ہیں کہ لونڈی اپنے مالک کو جنے گی اور اونٹوں کے چرانے والے اونچے اونچے مکان بنائینگے چنانچہ یہ خو عباس کی ترقی کے زمانہ میں ہُوا۔ اکثر بادشاہوں نے

لونڈیوں کو گھر میں ڈالا اور انکی اولاد بادشاہ ہوئی اور انکے رشتہ داروں
کے ذریعہ سے عرب حکومت تباہ ہو گئی۔ اسی طرح اس زمانہ میں بجائے
محنت اور قربانی اور سفروں کے عرب لوگوں نے شہری زندگی
اختیار کر لی اور بڑی بڑی عمارتیں بنانے میں مشغول ہو گئے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک مجلس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
باتیں کر رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے ساعت کے بارہ میں
سوال کیا آپ بات کرتے رہے اور اُسکی بات کا جواب نہ دیا جب پہلی
بات ختم کر چکے تو فرمایا ساعت کے بارہ میں سوال کرنیوالا کہاں ہے۔
سوال کرنیوالے نے کہا کہ میں حاضر ہوں اس پر آپ نے فرمایا فَاِذَا
ضُيِّعَتِ الْاَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ یعنی جب امانت میں کمی
آجائیگی اُسوقت سے قیامت کا انتظار کرو۔ اس پر اُس شخص نے کہا
كَيْفَ اِضَاعَتُهَا؟ یا رسول اللہ امانت کس طرح ضائع ہوگی اس
پر آپ نے فرمایا اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰى غَيْرِ اَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ
السَّاعَةَ (بخاری کتاب العلم باب من سُئل علماً وھو مشغول
فی حدیثہ) یعنی امانت سے مراد امانت حکومت ہے پس جب حکومت
نااہل لوگوں کے سپرد کی جائیگی اسوقت ہی قیامت کے منتظر ہو جاؤ۔
اس جگہ قیامت سے مراد مسلمانوں کی تباہی اور تنزل کا وقت ہے۔

اسی طرح بخاری میں آتا ہے اِنَّ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ
اَنْ يُّرْفَعَ الْعِلْمُ وَيَثْبُتَ الْجَهْلُ وَيُشْرَبَ الْخَمْرُ وَ
يَظْهَرَ الزِّنَا (کتاب العلم باب رفع العلم) یعنی قیامت کی علامات
میں سے یہ علامات ہیں کہ علم اُٹھ جائیگا اور جہالت قائم ہو جائیگی
اور شراب پی جائیگی اور زنا علی الاعلان کیا جائیگا یعنی کنچنیوں کا
طریق رائج ہو جائیگا اور لوگ اپنی زنا کاریوں کا مجالس میں فخر
سے ذکر کرینگے۔ اس حدیث میں قیامت سے مراد اسلام کا تنزل ہے۔

اسی طرح بخاری کی حدیث ہے لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى
يُقْبَضَ الْعِلْمُ وَتَكْثُرَ الزَّلَازِلُ وَيَتَقَارَبَ الزَّمَانُ وَ
تَظْهَرَ الْفِتَنُ وَيَكْثُرَ الْهَرْجُ وَهُوَ الْقَتْلُ وَحَتّٰى يَكْثُرَ
فِيْكُمُ الْمَالُ فَيَفِيْضُ (کتاب الاستسقاء باب ما قیل فی الزلازل)
یعنی قیامت اس وقت تک نہ آئیگی جب تک علم مٹ نہ جائے اور
زلازل کثرت سے نہ آئیں اور علم تاریخ ترقی نہ کر جائے اور کثرت
سے فتن ظاہر نہ ہوں اور قتل کا رواج ترقی نہ کر جائے اور مال
کی اس قدر زیادتی نہ ہو جائے کہ لوگ مسرف ہو جائیں۔ یہ حدیث
بھی مسلمانوں کے تنزل کو قیامت کا نام دیتی ہے۔

اسی طرح بخاری میں حدیث ہے لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى
تُقَاتِلُوْا قَوْمًا نِعَالُهُمُ الشَّعْرُ وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى
تُقَاتِلُوْا قَوْمًا كَاَنَّ وُجُوْهَهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ۔
(کتاب الجہاد و قتال الترک) یعنی قیامت اُس وقت تک نہ آئے گی
جبتک کہ تم اس قوم سے جنگ نہ کرو کہ انکی جوتیاں بالوں والی ہونگی۔
اور انکے منہ ڈھالوں کیطرح چپٹے ہونگے یہ ترکوں کے حملوں کیطرف اشارہ
ہے اور مراد یہ ہے کہ اسلامی تنزل کا زمانہ ترکوں کے حملوں سے شروع ہوگا۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ
كَهَاتَيْنِ يَعْنِيْ اِصْبَعَيْنِ (بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی
اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ) یعنی آپ نے اپنی دو انگلیوں کو جوڑ کر
دکھایا اور فرمایا میرا اور قیامت کا زمانہ اسی طرح ساتھ ملا ہوا ہے۔
یہ امر ظاہر ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ پر تو تیرہ سو سال
ہو گئے اور ابتک قیامت نہیں آئی۔ پس اس جگہ قیامت کے معنے کچھ اور ہیں
اور وہ معنے اسلام کی ترقی کے ہیں اور آپ کا ارشاد یہ ہے کہ بعض
نبی ایسے آئے ہیں کہ اُن کی قوم نے اُن کے مرنے کے بہت بعد جاکر
ترقی کی ہے مگر مجھ سے اللہ تعالےٰ کا یہ وعدہ ہے کہ میرے زمانہ میں
ہی اسلام کی ترقی ہو جائیگی چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔

اسی طرح ترمذی میں ہے اِقْتِرَابُ السَّاعَةِ هَلَاكُ
الْعَرَبِ یعنی قیامت کے قریب آنیکے ایک معنے عربوں کی ہلاکت
کے ہیں چنانچہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ کے
میں نے یہی معنے کئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم اور احادیث میں لفظ قیامت کے
معنے قیامتِ کبریٰ کے بھی ہیں یعنی اس قیامت کے جو تمام
انسانوں کی ہلاکت سے یا اُنکے دوبارہ اُٹھنے سے ظاہر ہوگی اور
اس کے معنے کسی قومی ترقی کے بھی ہیں اور کسی قوم کے تنزل کے بھی
اور کسی فرد کی موت کے بھی۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے
جو یہ فرمایا کہ جو شخص یوم القیامۃ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہے

وہ ان سورتوں کو پڑھ لے اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہو سکتا کہ ان سورتوں میں صرف اسی قیامت کا ذکر ہے جو مرنے کے بعد آنیوالی ہے اگر قرآن قیامت کے کئی معنے لے سکتا ہے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس لفظ کو اسکے متعدد معانی میں استعمال فرما سکتے ہیں بہرحال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس قیامت کا ان سورتوں میں ذکر آتا ہے اس قیامت کا ایک تفصیلی نقشہ ان میں کھینچ دیا گیا ہے۔ ایسا تفصیلی کہ اس کو دیکھنے کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے گویا یوم القیامۃ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے چنانچہ بعد میں اس سورۃ کی جو تفسیر کی جائے گی اس سے معلوم ہوگا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل درست ہے۔

## سورۂ تکویر کا سورۂ عبس اور پہلی سورتوں سے تعلق

اس سورۃ کا تعلق پہلی سورۃ بلکہ پہلی سورتوں سے یہ ہے کہ ان سورتوں میں غلبۂ اسلام اور قیامت کُبریٰ کا ذکر تھا اور اسلام کا غلبہ کم سے کم دو دفعہ مقدر تھا جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دو دفعہ مقدر تھی پس وہ قیامت جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ قائم ہونی تھی اس کے دو بڑے مظہر تھے جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے اور سورۂ جمعہ میں اس کا ذکر آتا ہے پس ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں یہ قیامت آنی تھی اور ایک دفعہ تیرہ سو سال کے بعد یعنی آپ کے دورِ اوّل پر ایک ہزار سال تنزّل کا زمانہ گذر جانے کے بعد آنی مقدر تھی۔

قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اسلام پر تنزّل کا بھی ایک دور آنیوالا تھا جیسا کہ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ

مصلح موعود کی پیشگوئی قرآنی آیت کی مصدق

اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (السجدہ ع۱) سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ امر اسلام کو آسمان سے زمین پر نازل فرمائے گا پھر ایک ہزار سال کے عرصہ میں وہ واپس اللہ تعالیٰ کی طرف چلا جائے گا چونکہ احادیث میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ترقی کا زمانہ تین قرن کا ہے اس لئے ہزار سال تنزّل کے مل کر تنزّل کا زمانہ ۱۳۰۰ ہجری پر ختم ہوتا ہے یا اندازاً ۱۸۸۶ء کو۔* پس جب پہلے یہ بات بتائی کہ اسلام کا غلبہ ہوگا اور پھر اس پر ایک تنزّل کا زمانہ آئیگا تو ضروری تھا کہ یہ بھی بتایا جاتا کہ اس تنزّل کے بعد کیا ہوگا تاکہ مسلمان دل برداشتہ نہ ہو جائیں اور ہمت ہار کر نہ بیٹھ جائیں۔

حدیثوں میں آتا ہے ابو یاسر بن اخطب جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا ایک مشہور یہودی عالم تھا ایک دن کچھ اور یہود سمیت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گذرا جبکہ آپ سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ پڑھ رہے تھے وہ یہ سنکر اپنے بھائی حُیَی بن اخطب کے پاس گیا اور اُسے کہا کہ میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ پڑھتے سُنا ہے۔ وہ کہنے لگا کیا تم سچ کہتے ہو؟ اُس نے کہا ہاں۔ اس پر حُیَی کچھ اور لوگوں کو ساتھ لیکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور کہا کہ کیا درست ہے کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کیطرف سے کوئی ایسا کلام نازل ہوا ہے جس میں الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ آتا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں وہ کہنے لگا تو پھر ڈر کی کوئی بات نہیں اگر آپ کا غلبہ بھی ہوا تو کل اکہتر سال رہیگا کیونکہ علم ابجد کے لحاظ سے الف کا ایک لام کے تیس اور میم کے چالیس عدد ہیں کل ۷۱ سال ہوئے یہ ۷۱ سال ہم کسی نہ کسی طرح کاٹ لینگے اسکے بعد آپکا غلبہ نہیں رہ سکتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے الٓمّٓصٓ بھی الہام ہوا ہے وہ کہنے لگا تو خیر ابجد کے لحاظ سے الف کا ایک لام کے تیس میم کے چالیس اور ص کے نوّے

---

* حاشیہ: سنہ ۱۸۸۶ء اس طور پر بنتا ہے کہ ۱۳۰۰ ہجری سالوں کو شمسی سالوں میں تبدیل کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سنہ ۶۲۲ء میں ہوئی اور ۱۳۰۰ ہجری سالوں کے شمسی سال ۱۲۶۴ بنتے ہیں۔ جب اِن دونوں کو ملایا جائے تو ۱۸۸۶ ہوتے ہیں یا کسروں کو نکال دیا جائے تو ۱۸۸۵ - اور سنہ ۱۸۸۶ء ہی وہ سال تھا کہ جب بانی سلسلہ احمدیہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام کی فتح کا علم دیا گیا اور آپ کے ذریعہ سے ایک سلسلہ کی جو اسلام کی بنیاد کو مضبوط کرنے والا ہوگا۔ خبر دی گئی۔ اور یہ اطلاع بھی دی گئی کہ آپ کی نسل سے ایک ایسا لڑکا بھی پیدا ہوگا جو نو سال کے عرصہ میں پیدا ہوگا جس کے ذریعہ سے اسلام کی شہرت دنیا کے کناروں تک پہنچے گی اور وہ لڑکا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق یہ راقم السطور ہی ہے جس کی خبر سنہ ۱۸۸۶ء کے شروع ہی میں دی گئی جو قرآنی پیشگوئی کی مصدق اور اس کو پورا کرنے والی ہے۔ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ لَا يُسْئَلُ عَنْهُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ؁

کل ایک سو اکاسٹھ سال ہوتے یہ مدت پہلے سے زیادہ ہے مگر خیر کوئی زیادہ لمبا عرصہ نہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مجھے الٓرٰ بھی الہام ہُوا ہے کہنے لگا تو پھر دو سَو اکتیس سال بن گئے کیونکہ الف کا ایک لام کے تیس اور راء کے دو سَو۔ آپ نے فرمایا اَور سُن لو مجھ پر المّرٰ بھی الہام ہُوا ہے۔ تب اس نے کہا کہ یہ تو پہلے سے بھی گراں اور لمبا عرصہ ہے۔ الف کا ایک لام کے تیس میم کے چالیس اور راء کے دو سَو ہوتے ہیں کل دو سو اکہتر سال کا عرصہ ہُوا۔ پھر اپنے ساتھیوں کو کہنے لگا یہاں سے چلو یہ معاملہ مشتبہ ہوگیا ہے (فتح البیان ص۲۴)
تو تنزل کی پیشگوئیوں کو سُن کر دُشمن بعض دفعہ یہ خیال کرلیتا ہے کہ اگر اس مذہب پر تنزل ایک دن آنے ہی والا ہے تو کسی طرح درمیانی زمانہ کو ہم برداشت کرلیں گے آخر وقت آئے گا کہ یہ زمانہ گذر جائے گا اور پھر ہمارے غلبہ کے ایام آجائیں گے اسی لئے نبی کبھی تباہی کی خبر پر اپنے زمانہ کو ختم نہیں کرتا بلکہ وہ ساتھ ہی یہ خبر بھی دیتا ہے کہ میرے بعد ایک اور نبی آنے والا ہے جو تنزل کے بعد پھر ترقی اور غلبہ کا دروازہ قوم کے لئے کھول دیگا یوں تو ہمیشہ سے یہ قانون چلا آیا ہے کہ ترقی کے ساتھ ہی تنزل کا دور بھی وابستہ ہوتا ہے لیکن نبی کبھی تنزل کے زمانہ کی خبر دینے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اس کے ساتھ ہی ایک نئے دَور کی بھی بشارت دیتا ہے اور اس طرح بتاتا ہے کہ گو میں مر جاؤنگا مگر یہ سلسلہ کبھی مٹ نہیں سکتا۔ اگر درمیان میں عارضی طور پر کوئی تنزل کا زمانہ بھی آیا تو پھر کفر پر دین کے غلبہ کے ایام آجائیں گے۔ اس طرح کفر کو اپنی ترقی سے ہمیشہ مایوس رکھا جاتا ہے اور مومنوں کے دلوں کو تسلی دی جاتی ہے کہ وہ مایوس مت ہوں بلکہ اپنی ہمت کو مضبوط رکھیں۔ اپنے ارادوں کو بلند کریں اور اپنی نگاہ کو اونچا رکھیں کہ اسلام پھر غالب آئے گا اور کفر پھر تباہی و بربادی کے گڑھے میں گرے گا۔ یہی فرق خدائی کلام اور ایک غیر کے کلام میں ہوتا ہے۔ بھلا کوئی غیر یہ طاقت رکھ سکتا ہے کہ وہ غیر متناہی ترقیات کی خبر دے سکے۔ خدا ہی ہے جو غیب کا علم رکھتا ہے اور پھر ساتھ ہی اپنے منشاء کو پورا کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے اور اپنے پیاروں کو اس سے اطلاع دیتا رہتا ہے تاکہ وہ اور لوگوں تک ان باتوں کو پہنچا دیں اور اس طرح پیشگوئیاں اُن کے دلوں کی ڈھارس کا موجب بن جائیں۔

یُوں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی تنزل کا دَور آیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی تنزل کا دَور آیا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی تنزل کا دَور آیا مگر اس تنزل کا انبیاء کی پیشگوئیوں میں ضرور ذکر ہوتا ہے تاکہ جب یہ زمانہ آئے تو اُس وقت یہ تنزل بھی نبی کی صداقت کا ثبوت بن جائے۔ اگر تنزل بغیر کسی پیشگوئی کے آجائے تو لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک اتفاقی بات ہے لیکن اگر تنزل آنے کی پہلے سے خبر موجود ہو تو مومن کہہ سکتے ہیں کہ یہ تنزل بھی ہماری صداقت کا ثبوت ہے کیونکہ اس تنزل کی پہلے سے پیشگوئیاں موجود ہیں لیکن اگر تنزل کی ہی خبر ہو تنزل کے بعد ترقی کی خبر نہ ہو تو یہ بھی دلوں کو مایوس کرنے والی بات ہوسکتی ہے اسی لئے جہاں ایک طرف تنزل کی خبر دی جاتی ہے تاکہ جب یہ دَور آئے تو خود تنزل اپنی ذات میں انبیاء کی صداقت کا ایک ثبوت ہو وہاں تنزل کے بعد ایک ترقی کی بھی خبر دی جاتی ہے تاکہ مسلمانوں کو اطمینان رہے اور کفر اپنی دائمی سربلندی کی کبھی امید نہ رکھے۔ اگر یہ ترقی کسی نبی سے وابستہ ہو تو اس نبی کی خبر دی جاتی ہے اور اگر کسی اور شخص سے وابستہ ہو تو اس کی خبر دی جاتی ہے۔ بہرحال یہ ایک عظیم الشان گُر ہے جو دلوں کو بڑھانے اور ان کو ڈھارس دینے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا ہے میرا اس کے متعلق ذاتی طور پر ایک بڑا زبردست تجربہ ہے میں نے اپنی کتاب "دعوۃ الامیر" میں اس نکتہ کو بیان کیا ہے کہ اسلام پر آج جو مصیبت آئی ہوئی ہے اسکی خبر رسول کریم صلے اللہ وآلہ وسلم کے کلام میں تفصیلاً موجود ہے اور جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے اس تنزل کی خبر دے چکے ہیں۔ بلکہ اس تنزل کے بعد ایک ترقی کے دَور کی بشارت بھی آپ سُنا چکے ہیں تو مسلمانوں کے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ تنزل جتنا بڑھتا چلا جائے ہم کہیں گے کہ اس سے اسلام کی تکذیب ہونے کی بجائے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت ثابت ہو رہی ہے

۲۱۱
آنحضرت صلعم کی زبان سے اسلام کے تنزل کے بعد اس کے عروج کی پیشگوئی

کیونکہ آپ کے کلام میں ان کا پہلے سے ذکر موجود ہے۔ قرآن کریم میں
اس کی مثال بھی پائی جاتی ہے چنانچہ سورۃ احزاب میں ذکر آتا ہے
کہ جب کفار کے لشکر مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے جمع ہوگئے اور
منافقوں نے طعنے دینے شروع کردئے کہ دنیا کی فتوحات کے وعدے
کہاں گئے تو اس وقت مومنوں کے ایمان اور بڑھ گئے اور انہوں
نے کہا ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ
وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (الاحزاب ع۳)
یعنی اس کی خبر تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پہلے سے دے چکے تھے
اس لئے ہمارے لئے خوشی کا مقام ہے کہ خدا کے منہ کی بات پوری
ہوئی۔ غم اور فکر کی کونسی بات ہے۔ تو دیکھو اس وعدہ کی وجہ سے
وہ ڈرے نہیں لیکن اگر یہ وعدہ نہ ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ
گھبرا جاتے۔ پس وہی چیز جس کو دشمن ڈرانے کے لئے استعمال
کرتا ہے اسی میں ایمان کی مضبوطی کا سامان اللہ تعالیٰ نے رکھا
ہوتا ہے۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ جب خدا نے اس تنزل کی خبر دی تھی
اور خدا تعالیٰ کے کلام میں یہ بات موجود تھی تو پھر میرے لئے
اس میں گھبرانے کی کونسی بات ہے۔

غرض مومن کے لئے اُن ابتلاؤں میں جو خدائی پیشگوئی
کے ماتحت آئیں بڑی بھاری طاقت ہوتی ہے کیونکہ اُن ابتلاؤں
اور اُن مصیبتوں اور اُن دکھوں سے اللہ تعالیٰ کی باتیں پوری
ہوتی ہیں۔ اگر وہ ابتلاء آئیں تو وہی دشمن جو ان ابتلاؤں کو
اسلام کے جھوٹا ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے جھٹ یہ کہنے لگ جائے
کہ تمہارے نبی نے تو یہ خبر دی تھی مگر اب تک پوری نہیں ہوئی۔
لیکن جب وہ خبر پوری ہوجاتی ہے جب پیشگوئیوں کے مطابق
ایک تنزل کا دور آجاتا ہے تو اسی کو مذہب کے جھوٹا ہونے کا
ثبوت قرار دے دیتا ہے حالانکہ یہ صداقت کا ثبوت ہوتا ہے۔ یہ
اس نبی کی راستبازی کا ثبوت ہوتا ہے۔ یہ کفر کی شکست کا ثبوت
ہوتا ہے کیونکہ جیسے ترقی کے متعلق خدا تعالیٰ کی بات پوری ہوئی تنزل کے
بارہ میں بھی خدا تعالیٰ کی بات پوری ہوئی اور یہی ثابت کرنا مذہب کا اولین کام
ہوتا ہے۔ پس یہ ایک بڑا بھاری نکتہ ہے جس کو سمجھ لینے کے بعد زمانۂ
تنزل میں بھی انسان کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا
قدم ایک مضبوط چٹان پر قائم رہتا ہے وہ جانتا ہے کہ میرا مذہب
بہرحال سچا ہے۔ غلبہ کے ایام میں بھی وہ سچا تھا اور تنزل کے ایام
میں بھی وہ سچا ہے کیونکہ اس تنزل کی وہ پہلے سے خبر دے چکا تھا۔
مگر افسوس کہ مسلمانوں نے اس نکتہ کو نہ سمجھا اور وہ مایوسی کا شکار
ہوگئے۔ میں نے اپنی کتاب دعوۃ الامیر میں اس بات کو ایک حد تک
تشریح سے بیان کیا ہے اور اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ اسلام کے
تنزل کی خبریں بھی اپنے اندر اسلام اور قرآن کی صداقت کا ثبوت
رکھتی ہیں کیونکہ ان خبروں کا قرآن اور احادیث میں تفصیل سے ذکر آتا
ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی اسلام صرف تنزل کی خبر پر اکتفا نہیں
کرتا بلکہ اس نے یہ خبر بھی دی ہوتی ہے کہ اس زمانۂ تنزل کے بعد
اسلام پھر اپنے کمال کو پہنچے گا۔ پھر کفر اپنے منہ کے بل گرے گا اور
پھر ساری دنیا پر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا غلبہ
ہوگا۔ پس یہ تنزل اپنے اندر ایک ترقی کی بشارت رکھتا ہے۔ اور یہ
تاریکی ایک سورج کے نمودار ہونے کی خبر دے رہی ہے اور جب حالت
یہ ہے تو مسلمان کیوں مایوس ہیں اور کیوں وہ خدائی وعدوں کے مطابق
غور نہیں کرتے کہ وہ آسمانی روشنی کہاں ظاہر ہوئی اور اس ظلمت کے
پردے چاک کرنے والا سورج کس جگہ طلوع ہوا ہے۔

اسی سلسلہ میں میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اس بارہ میں مجھے
ایک عجیب تجربہ ہوا ہے۔ سرحد کے ایک رئیس چوہدری فقیر محمد صاحب
اگزیکٹو انجینئر تھے وہ ایک دفعہ دہلی میں مجھے ملے اور انہوں نے مجھ
سے ذکر کیا کہ ہم چار بھائی ہیں جن میں سے دو بھائی غیر احمدی ہیں
اور دو بھائی احمدی ہیں۔ اپنے متعلق انہوں نے کہا کہ میں ابھی
تک آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہوا۔ میں نے اُن سے کہا کہ
آپ کیوں احمدی نہیں ہوتے کیا آپ کو احمدیت کی صداقت کے
متعلق کوئی شبہ ہے؟ ان کی طبیعت میں مذاق تھا وہ میرے
اس سوال کے جواب میں کہنے لگے کہ مجھے تو ابھی تک احمدیت پر
غور کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن بات یہ ہے کہ ہم پورا پورا انصاف
کرنے کے عادی ہیں۔ روپیہ میں سے اٹھنی ہم نے آپکو دیدی
ہے اور اٹھنی دوسرے مسلمانوں کو دے دی ہے۔ میں نے بھی
اُن سے مذاقاً کہا کہ خاں صاحب ہم تو اٹھنی پر راضی نہیں ہوتے

ہم تو پورا روپیہ لے کر چھوڑا کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگے تو پھر اپنی توجہ سے لیجئے۔ میں نے کہا ہماری کوشش تو یہی ہے اللہ تعالیٰ جب چاہے گا بقیہ اٹھنی بھی مل جائے گی۔ وہ اُس وقت معہ اہل و عیال انگلستان کی سیر کو جا رہے تھے میری اس بات کو سُن کر انہوں نے کہا کہ خان محمد اکرم خان صاحب چارسدہ والے میرے بھائی ہیں انہوں نے آپ کی بعض کتابیں میرے ٹرنک میں رکھ دی ہیں۔ میں نے ان سے کہا بھی ہے کہ میں تو وہاں سیر کیلئے جا رہا ہوں ان کتابوں کے پڑھنے کا کہاں موقع ہو گا مگر وہ مانے نہیں اور زبردستی میرے ٹرنک میں انہوں نے کتابیں رکھ دی ہیں مگر اب تک مجھے پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ ولایت چلے گئے۔ ابھی تین مہینے ہی گذرے تھے کہ مجھے ایک چٹھی پہنچی۔ اس کے شروع میں ہی یہ لکھا تھا کہ میں اصل مطلب لکھنے سے پہلے آپ کی شناخت کے لئے یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ میں وہ ہوں جو آج سے تین ماہ پہلے دہلی کے شاہی قلعہ میں آپ سے ملا تھا اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ ہم نے پورا پورا انصاف کیا ہے اٹھنی آپ کو دے دی ہے اور اٹھنی غیر احمدیوں کو دے دی ہے جس پر آپ نے کہا تھا کہ ہم تو پورا روپیہ لے کر چھوڑا کرتے ہیں سو آپ کے حکم کے مطابق اب ایک اور چونی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور اپنے آپ کو بیعت میں شامل کرتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے اسی مضمون کی طرف جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں اشارہ کیا اور لکھا کہ جب میں ولایت میں آیا اور میں نے مختلف مقامات کی سیر کی تو گو میں پٹھان ہوں اور مذہبی جوش میرے دل میں موجود ہے مگر کفر کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر میرا دل پژمردہ ہوتا چلا گیا اور میں نے کہا کہ اسلام اس قدر گر چکا ہے اور کفر اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ اب بظاہر اسلام کے جیتنے اور کفر کے سرنگوں ہونے کا دنیا میں کوئی امکان نہیں۔ اسلام مر چکا ہے اب اُس کے زندہ ہونے کی امید ایک واہمہ سے بڑھ کر حقیقت نہیں رکھتی۔ یہ خیالات تھے جو میرے دل پر غالب آتے چلے گئے اور اس قدر میرے دل میں مایوسی پیدا ہوئی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب اسلام دنیا پر غالب نہیں آ سکتا۔ ایک دن میرے دل پر اس خیال کا بے انتہا اثر ہوا اور حالت مایوسی میں میں نے کہا آؤ ان کتب کو پڑھ کر دیکھو جو میرے بھائی نے میرے ٹرنک میں رکھ دی تھیں چنانچہ پہلے "اسلامی اصول کی فلاسفی" نکلی اور اُسے میں نے پڑھا اس کے بعد آپ کی کتاب "دعوۃ الامیر" نکلی اور اُسے میں نے پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے پڑھتے اس کتاب میں وہی ذکر آ گیا جس نے میرے دل میں انتہائی طور پر مایوسی پیدا کر دی تھی یعنی اسلام کے تنزّل اور اس کے ادبار کا اس میں ذکر تھا مگر ساتھ ہی بتایا گیا تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے تنزّل کے متعلق یہ پیشگوئی کی تھی جو پوری ہو گئی۔ وہ پیشگوئی کی تھی جو پوری ہو گئی۔ غرض یکے بعد دیگرے اسلامی تنزّل کے متعلق کئی پیشگوئیاں تھیں جو پڑھنے میں آئیں اور جو واقعہ میں پوری ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد آپ نے اسلام کی ترقی کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشگوئیاں پوری ہو گئیں جو اسلام کے تنزّل کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں تو وہ پیشگوئیاں کیوں پوری نہیں ہوں گی جو اسلام کے دوبارہ غلبہ کے متعلق ہیں۔ میں نے جب یہ مضمون پڑھا تو میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ مایوسی میرے دل سے جاتی رہی۔ امید جگمگا اٹھی اور میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں اُس وقت تک سونے کے لئے اپنے بستر پر نہیں جاؤنگا جب تک آپ کو اپنی بیعت کا خط نہ لکھ لوں چنانچہ سونے سے پہلے میں یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں میری بیعت کو قبول کیا جائے۔

غرض سچی بات یہی ہے کہ جب وہ تکلیفیں اور وہ دُکھ جو اسلام اور مسلمانوں پر آئے اُن کے متعلق یہ معلوم ہو کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ان تمام تکالیف کی خبر پہلے سے دے چکے ہیں تو ان تکالیف میں بھی راحت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور انسان سمجھتا ہے کہ جیسے تنزّل کی خبریں پوری ہو گئیں اسی طرح ایک دن اسلام کے غلبہ کی پیشگوئیاں بھی پوری ہو جائینگی اسی طرح اگلی قیامت کا بھی ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے سے ثبوت مل جاتا ہے کیونکہ جو خدا اس جہان میں مردہ روحوں کا

# بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

## اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ○

جب (نور) آفتاب کو لپیٹ دیا جائے گا ؎۲

احیاء کرسکتا ہے وہ اگلے جہان میں کیوں نہیں کرسکتا۔ اگر اس دنیا کی روحانی موت اور اس کا احیاء پیشگوئیوں کے مطابق ہوسکتا ہے تو اگلے جہان میں بھی مُردوں کا احیاء پیشگوئیوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

كُوِّرَتْ ؎۲ **حل لغات۔** كُوِّرَتْ كُوِّرَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے اور كَوَّرَ الْعَمَامَةَ عَلٰى رَأْسِهٖ کے معنے ہوتے ہیں لَفَّهَا۔ اُس نے اپنے سر پر عمامہ لپیٹا اور كَوَّرَ فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں صَرَعَهٗ اُس نے فلاں کو گرا دیا۔ اور جب كَوَّرَ الْمَتَاعَ کہیں تو معنے ہوتے ہیں جَمَعَهٗ وَ شَدَّهٗ وَ لَفَّهٗ عَلٰى جِهَةِ الْاِسْتِدَارَةِ اس نے اپنے مال و اسباب کو جمع کیا۔ اُسے باندھا اور اُسے اس طرح لپیٹا جس طرح گٹھڑی کو گول کرکے باندھتے ہیں (اقرب) اس لحاظ سے اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے معنے ہوئے جبکہ سورج کو لپیٹا جائے گا یا جبکہ سورج کو گرا لیا جائے گا۔ اگر سورج کے لفظ کا استعمال یہاں مجازاً سمجھ لیا جائے تو سورج سے مادی سورج مراد نہ لیا جائے بلکہ یہ سمجھا جائے کہ اس میں مجازی طور پر کسی انسان کو سورج قرار دیا گیا ہے تو ان معنوں کا سمجھنا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ میں لفظ شمس کا استعمال مجازی سمجھا جائیگا مگر یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ كُوِّرَتْ کے معنے لغۃً صرف لپیٹے جانے کے نہیں بلکہ اس کے معنے ایسے طور پر لپیٹے جانے کے ہیں جس طرح گٹھڑی کو لپیٹا جاتا ہے۔ پس اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے معنے صرف یہ نہیں کہ جبکہ سورج کو لپیٹا جائے گا بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جبکہ سورج کو گٹھڑی کی طرح باندھ دیا جائے گا اور اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس طرح گٹھڑی باندھ کر الگ رکھ دیتے ہیں اسی طرح سورج کو گٹھڑی کی طرح باندھ کر الگ رکھ دیا جائیگا اور اُس سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رکھا جائے گا۔ اسی طرح اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے ایک معنے حذف مضاف کی صورت میں یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ جبکہ سورج کی روشنی کو دور کر دیا جائے گا یا سورج کی روشنی کو لپیٹ دیا جائے گا اور یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ سورج کو مٹا دیا جائے گا یعنی جیسے گٹھڑی میں چیز کو باندھ دیا جاتا ہے اور وہ نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے اسی طرح سورج بھی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔

**تفسیر۔** اس آیت کے جو معنے ہماری جماعت کی طرف سے کئے جاتے ہیں اُن کو جب اگلی آیات کے معنوں سے ملایا جائے تو یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ جو معنے ہماری جماعت کی طرف سے کئے جاتے ہیں اُن میں کوئی تکلف نہیں بلکہ وہی حقیقی اور صحیح معنے ہیں۔ یہ بات میں نے اس لئے بیان کی ہے کہ ممکن ہے سورۂ تکویر کی اس پہلی آیت کی تفسیر بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہو چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتب میں اس آیت پر بحث کی ہے اور ہماری جماعت کی طرف سے بھی یہ آیت بالعموم پیش ہوتی رہتی ہے اس لئے وہ دوست جو ہماری جماعت کی باتیں سنتے رہتے ہیں ان کو تو کوئی تکلف نظر نہیں آئیگا لیکن جو لوگ ہماری جماعت کے لٹریچر سے واقفیت نہیں رکھتے یا جن کو ہمارے سلسلہ کی باتیں سننے کا بہت کم موقع ملتا ہے انکو شاید ان معنوں میں کوئی تکلف محسوس ہو لیکن جب وہ ساری آیات پر غور کریں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان معنوں میں تکلف کوئی نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اسی حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔

یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو سورج قرار دیا ہے (سورہ احزاب ع۶) پس جب خدا نے یہ فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جبکہ سورج کو لپیٹ دیا جائے گا تو اس کے معنے یہ تھے کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کو ترک کر دیا جائے گا۔ لوگ اپنی اپنی رائے پر عمل کریں گے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مسلمان بیزار ہو جائیں گے۔ قلبی طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اقتداء اور متابعت کی کوئی ضرورت نہیں سمجھیں گے اور آپ کی تعلیمات سے مُنہ پھیر لیں گے۔ چنانچہ یہ نظارہ آج کل ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے مسلمانوں میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی طرف بہت ہی کم توجہ ہے۔ قرآن پر عمل تو پہلے ہی نہیں تھا حدیث پر عمل بھی بہت حد تک مٹ گیا ہے اور اگر کچھ ہے تو وہ صرف لفظی عمل ہے حقیقت اور روح کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نور دنیا پر ظاہر نہیں ہوتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نور صرف اس بات میں نہیں کہ وضو کرتے وقت بازو کو کہنی تک دھونا چاہیئے اور سر پر مسح کرنا چاہیئے بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بھی بتایا ہے خواہ وہ انسانی زندگی کے کسی شعبہ سے تعلق رکھنے والی بات ہو اس میں سے ہر لفظ بلکہ ہر ایک حرف پر عمل کرنا ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ انسان کا چہرہ سورج کی طرح چمکنے لگتا اور روحانی ترقیات کی طرف اس کا قدم سرعت سے بڑھنے لگتا ہے مگر مسلمانوں کو اس بات کا کوئی احساس ہی نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نور کو وہ کس طرح دنیا سے اوجھل کر رہے ہیں بے شک ظاہر میں اہلحدیث کا ایک طبقہ موجود ہے جو اپنے آپ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کرنے والا قرار دیتا ہے مگر وہ بھی اُن برکات کو ظاہر نہیں کرتا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ہمراہ لاتے تھے ان کا بھی زیادہ تر زور ظاہر پر ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم کے مغز اور اس کی روح کی طرف ان کی کوئی توجہ نہیں۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ دنیا کی ہدایت کے لئے جو سب سے اہم چیز لائے وہ قرآن کریم ہے مگر اہلحدیث کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ قرآن کو حدیث کے تابع کر دیں۔ گویا انہوں نے اگر ایک چہرہ کو ظاہر کیا تھا تو دوسرے چہرہ کو انہوں نے مٹا دیا حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سورج ہونے کے لحاظ سے قرآن کے بھی مظہر تھے اور حدیث کے بھی مظہر تھے مگر وہ ایک حصہ کو بالکل مٹا دیتے ہیں اور اس طرح نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کے ذریعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نور دنیا پر ظاہر ہو رہا ہے۔ غرض وہ روحانی سورج جو دنیا کو روشنی پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تھا اس کی اتباع کو ترک کر دیا گیا ہے سُنیوں میں اگر کہیں قرآن پر بحث ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حدیث کو باطل کر دیں اور صرف قرآن کی اس تفسیر کو جو اُن کے ذہنوں نے پیدا کی ہے رہنے دیں۔ اور اگر اہلحدیث کی طرف سے حدیث پر بحث ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرآن کو راویوں کے خیالات کے تابع کر دیں اور یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں جن سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نور دنیا پر ظاہر نہیں ہو سکتا۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ سے مراد آنحضرت صلعم کی اتباع کو ترک کر دیا جانا

بہرحال اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے دو معنے ہیں (۱) اتباع محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ترک کر دیا جائے گا۔ اور لوگ اپنی اپنی رائے پر عمل کرنے لگیں گے (۲) یا یہ کہ انوار محمدیہ کا نزول بند ہو جائے گا اور مسلمان جن کا کام یہ تھا کہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور دنیا میں زیادہ سے زیادہ پھیلائیں وہ آپ کے نور کو ظاہر کرنے کی بجائے اس کو کم کرنے کا موجب ہوں گے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے مراد انوار محمدیہ کے نزول کا بند ہو جانا

چونکہ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے ایک معنے روشنی کے مٹ جانے کے بھی ہیں اس لئے اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ جب سورج اندھیر ہو جائے گا یعنی اُسے گرہن لگے گا۔ یہ وہی پیشگوئی ہے جس کا حدیثوں میں بھی ذکر آتا ہے کہ اِنَّ لِمَهْدِيِّنَا اٰيَتَيْنِ لَمْ تَكُوْنَا مُنْذُ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَنْكَسِفُ الْقَمَرُ لِاَوَّلِ لَيْلَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ وَتَنْكَسِفُ الشَّمْسُ فِي النِّصْفِ مِنْهُ (دار قطنی ۱۸۸) یعنے ہمارے مہدی کے دو نشان ہیں۔

# وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝

اور جب ستارے دُھندلے ہو جائیں گے ۵۳

جب سے آسمان و زمین پیدا ہوئے ہیں کسی شخص کے زمانہ میں وہ نشان ظاہر نہیں ہوئے یعنی چاند گرہن کی راتوں میں سے پہلی رات کو رمضان میں چاند گرہن لگیگا اور سورج گرہن کی تاریخوں میں سے درمیانی تاریخ کو اسی رمضان میں سورج گرہن لگے گا۔ گو اس سورۃ میں خالی سورج کا لفظ آتا ہے مگر حدیثوں میں سورج اور چاند دونوں کا ذکر ہے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ میں سورج گرہن کی پیشگوئی

اس کے متعلق یہ امر سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ قرآن کا محاورہ ہے اور عربی زبان کا بھی۔ کہ جو چیزیں آپس میں لازم ملزوم ہوں ان میں سے بعض دفعہ ایک چیز کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور دوسری کا ذکر حذف کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ ایک اور جگہ اس پیشگوئی کے ضمن میں سورج اور چاند دونوں کا اکٹھا ذکر آتا ہے (دیکھو سورۃ قیامۃ) اس لئے یہاں صرف سورج کا ذکر کر دیا اور چاند کا ذکر چھوڑ دیا کیونکہ چاند سورج کے تابع ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گرمی سردی کا اکٹھا ذکر کرنا ہو تو بعض دفعہ سردی کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور مراد یہ ہوتی ہے کہ گرمی کا ذکر اس کے ساتھ ہی سمجھنا چاہیئے یا گرمی کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور سردی کا ذکر اس کے ساتھ ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس جگہ چونکہ پیشگوئی کے ایک حصہ کو بیان کر دیا گیا ہے اس لئے دوسرے حصہ کی طرف خود بخود اشارہ ہو گیا اور یہ ضرورت نہ رہی کہ اس کا بھی نام لے کر ذکر کیا جاتا۔

اَلنُّجُوْمُ

**۵۳ حل لغات**۔ اَلنُّجُوْمُ: اَلنَّجْمُ کی جمع ہے اور اَلنَّجْمُ کے معنے ہیں (۱) اَلْكَوْكَبُ۔ ستارا (۲) اَلنَّبَاتُ عَلٰى غَيْرِ سَاقٍ وَهُوَ خِلَافُ الشَّجَرِ۔ بے جڑ والی بوٹی جس کو ہمارے ملک میں بیل کہتے ہیں (۳) اَلْاَصْلُ کسی چیز کی جڑ۔ کہتے ہیں هُوَ مِنْ نَجْمِ صِدْقٍ۔ وہ سچائی کی جڑ سے ہے یعنی اس کی بات سچی ہوتی ہے یا وہ اعلیٰ خاندان سے ہے۔ نیز کہتے ہیں لَيْسَ لِهٰذَا الْحَدِيْثِ نَجْمٌ اَیْ اَصْلٌ۔ اس بات کی کوئی جڑ نہیں یعنی حقیقت نہیں۔ نَجْمٌ کی جمع اَنْجُمٌ وَ اَنْجَامٌ وَنُجُوْمٌ وَ نُجُمٌ آتی ہے (اقرب)

اِنْكَدَرَتْ

اِنْكَدَرَتْ: اِنْكَدَرَ سے مؤنث کا صیغہ ہے (جو كَدَرَ سے بنا ہے) اور اِنْكَدَرَ فِيْ سَيْرِهٖ کے معنے ہوتے ہیں اَسْرَعَ وَانْقَضَّ۔ اس نے جلدی جلدی حرکت کی اور گر گیا۔ کہتے ہیں اِنْكَدَرَ يَعْدُوْا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ تیزی سے دوڑا اور جب اِنْكَدَرَ عَلَيْهِ الْقَوْمُ کہیں تو معنے ہوتے ہیں اِنْصَبُّوْا۔ لوگ اس پر جا پڑے۔ اور اِنْكَدَرَتِ النُّجُوْمُ کے معنے ہوتے ہیں تَنَاثَرَتْ ستارے جھڑ گئے (اقرب) اور كَدَرَ (يَكْدُرُ) یا كَدِرَ (يَكْدَرُ جو اِنْكَدَرَ کا اصل ہے) كَدَرًا وَكَدَارَةً وَكُدُوْرًا وَكُدُوْرَةً وَكُدْرَةً۔ صفا کے مقابل کے الفاظ ہوتے ہیں یعنی وہ گدلا ہو گیا (اقرب)۔ جیسے ہمارے ملک میں بھی کہتے ہیں کہ طبیعت مکدر ہو گئی یا خراب ہو گئی پس ان معنوں کے اعتبار سے وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ کے معنے ہوں گے جب ستارے گدلے ہو جائیں گے۔ اور نجوم سے مجازی طور پر وہ وجود لئے جائیں گے جن سے دنیا کو ہدایت مل رہی تھی اور جو لوگوں کے لئے راہنمائی کا موجب ہو رہے تھے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جبکہ یہ نجوم گدلے ہو جائیں گے یعنی ان کا سلسلہ فیوض جاتا رہے گا اور لوگ اُن سے ہدایت پانا بند کر دیں گے۔

**تفسیر**۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ (تشیید المبانی) میرے صحابہؓ ستاروں کی طرح ہیں بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ۔ تم جس کے پیچھے بھی چلو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ جب شمس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

وجود مراد لیا گیا ہے تو نجوم سے مراد آپ کے صحابہؓ ہوئے پس وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ کے یہ معنے ہوئے کہ نہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع مفقود ہو جائے گی بلکہ صحابہؓ کی اتباع بھی جاتی رہے گی اور اُن کے بتائے ہوئے علوم بھی مفقود ہو جائیں گے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں اس زمانہ میں ایسا ہی نظارہ نظر آ رہا ہے لوگ جب بھی کوئی مثال پیش کریں گے بجائے اس کے کہ صحابہؓ کا ذکر کریں وہ کہیں گے ہٹلر نے یوں کہا ہے یا نپولین نے یوں کہا ہے یا ابراہیم لنکن نے یوں کہا ہے۔ لیکن پُرانے زمانہ میں لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ ابوبکرؓ نے یوں کہا ہے۔ عمرؓ نے یوں کہا ہے عثمانؓ نے یوں کہا ہے۔ علیؓ نے یوں کہا ہے۔ غرض مسلمانوں میں صحابہ کے نقش قدم پر چلنے کی اہمیت بالکل جاتی رہی ہے۔ انگریزی میں کہتے ہیں کہ کسی قوم کی زندگی اُس کی ٹریڈیشن TRADITION پر چلتی ہے یعنی قوم کا ہر فرد جب تک اپنے دل میں یہ احساس نہ رکھتا ہو کہ اُس نے اپنی قومی روایات کو زندہ رکھنا ہے اس وقت تک قوم کی زندگی کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ زندہ قوموں کا یہی دستور ہے کہ اُن کا ہر فرد اپنے باپ دادا کے نیک افعال کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے باپ نے یوں کیا تھا میرا دادا اس طرح کیا کرتا تھا۔ جب تک قوم اس روح کو اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے اس کی زندگی کی گھڑیاں لمبی ہوتی چلی جاتی ہیں اور جب یہ رُوح مر جاتی ہے تو قوم بھی اس کے ساتھ ہی مر جاتی ہے۔ پس وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ کے یہ معنے ہوئے کہ صحابہؓ کی خوبیاں اور اُن کے کمالات عمل کے لحاظ سے مٹ جائیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قومی ٹریڈیشن TRADITION یعنی قومی برتری کی روایات بھی قوم کے حافظہ سے جاتی رہیں گی اور وہ روایات زندہ نہیں رہیں گی جن سے اخلاق ترقی کرتے اور اُمنگوں میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ جب قوم کے افراد کے سامنے بار بار یہ بات آتی رہے کہ ہمارے باپ دادا اپنے اندر بہت بڑی خوبیاں اور کمالات رکھتے تھے تو وہ خود بھی ترقی کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر انہیں کہا جائے کہ تمہارے باپ دادا بالکل نالائق تھے انہیں ترقی سے کوئی لگاؤ نہیں تھا تو آگے بڑھنے کی قابلیت اُن میں مفقود ہو جاتی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں پر سب سے بڑی تباہی اسی وجہ سے آئی ہے کہ اُن کی شاندار قومی روایات طاقِ نسیان پر رکھ دی گئی ہیں اور ماضی سے اُن کا تعلق مٹ گیا ہے۔ اور صحابہؓ اور اُن کے نقش قدم پر چلنے والے لیڈروں کی خوبیاں مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ اس ٹریڈیشن کے تباہ کرنے میں یوروپین لوگوں کی لکھی ہوئی تاریخوں نے خصوصیت سے حصہ لیا ہے۔ کوئی مسلمان بادشاہ ایسا نہیں جس پر انہوں نے الزام نہ لگایا ہو اور اُسے بُری سے بُری اور بھیانک سے بھیانک صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہر مسلمان طالب علم جو اُن تاریخوں کو پڑھتا ہے یہ سمجھنا شروع کر دیتا ہے کہ اس کے آباء میں کوئی خوبی نہ تھی وہ ہر خوبی دوسروں کی طرف منسوب کرتا اور ہر نقص اپنے بزرگوں کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح قومی ترقی کی جڑ کھوکھلی ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ بغیر ٹریڈیشن کے۔ بغیر قومی روایات کو زندہ رکھنے کے دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ آسان سے آسان طریق کسی قوم کو تباہ کرنے کا یہ ہے کہ اُسے اپنی پچھلی تاریخ سے بدظن کر دیا جائے۔ اگر اُسے اپنی پچھلی تاریخ سے بدظن کر دیا جائے تو وہ اُجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (ابراہیم ع ۴) کا مصداق بن جاتی ہے اور کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ یوروپین لوگوں نے اس آسان حربہ سے کام لیا اور تمام اسلامی تاریخ کو انہوں نے بگاڑ کر رکھ دیا۔ بڑے بڑے مسلمان بادشاہوں کا ذکر کریں گے تو کہیں گے فلاں میں یہ نقص تھا اور فلاں میں وہ نقص تھا۔ اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ وہ اس کا نام تحقیقات رکھتے ہیں اور دعوے سے کہتے ہیں کہ تحقیق کے بعد یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ فلاں مسلمان بادشاہ ایسا تھا حالانکہ وہ سراسر جھوٹ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

اَلنُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ سے مراد صحابہ کی اتباع کا مفقود ہو جانا

آج کسی مسلمان سے پوچھ کر دیکھو اُسے اپنے اَسلاف میں کوئی خوبی نظر ہی نہیں آئے گی۔ وہ کہے گا محمود غزنوی ڈاکو تھا اورنگ زیب ظالم تھا۔ فلاں ایسا تھا اور فلاں ایسا تھا گویا عیب شماری اور الزام تراشی ہی اُن کا کام رہ گیا ہے۔ اُن کے اندر یہ حس ہی نہیں رہی کہ وہ کسی کی خوبیوں کو بھی دیکھ سکیں۔ اس نقص کی وجہ سے مسلمانوں میں ٹریڈیشن کا وجود ہی باقی نہیں رہا اور اُن کی قومی ترقی کی جڑ کو کاٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ وہ مسلمانوں کو اپنے آباء کے خلاف مشتعل کرنے کے لئے ایسے ایسے حربوں سے کام لیتے ہیں جو قطعاً کوئی شریف انسان استعمال نہیں کر سکتا۔ مثلاً کسی مسلمان بادشاہ کا ذکر کریں گے تو کہیں گے کہ وہ تو شراب پیتا تھا اور وہ اِس الزام کا ذکر محض اس لئے کریں گے کہ مسلمانوں کی طبیعتوں میں جوش پیدا ہو جائے اور وہ اُسے بُرا بھلا کہنے لگ جائیں۔

اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ میں اس امر کی پیشگوئی کہ علماء اور امراء کا اثر جاتا رہے گا۔

حالانکہ یہ الزام لگانے والے وہ ہیں جو خود دن رات شرابیں پیتے اور کئی قسم کے ناروا افعال کرتے رہتے ہیں مگر یہ شرابی قوم اپنے افعال کی طرف تو نہیں دیکھتی اور کسی مسلمان بادشاہ کا ذکر آ جائے تو اس کے متعلق لکھ دیتی ہے کہ وہ شراب پیتا تھا۔ محض اس لئے کہ مسلمان بھڑک اُٹھیں اور وہ اس سے متنفر ہو جائیں حالانکہ یہ قوم وہ ہے جس کا ہر فرد شراب پیتا ہے جس کا بادشاہ بھی شراب پیتا ہے اور جس کا وزیر اعظم بھی شراب پیتا ہے۔ چرچل بھی شراب پیتا ہے اور روزویلٹ بھی شراب پیتا ہے۔ مگر وہ مسلمان بادشاہ کے متعلق یہ ضرور ذکر کریں گے کہ وہ شراب پیتا تھا۔ چلو ہم نے مان لیا کہ وہ شراب پیتا تھا مگر تم تو وہ ہو جو ہمیں اُس مسلمان بادشاہ سے متنفر کر کے اُن لوگوں کی خوبیوں کا ہمیں قائل کرنا چاہتے ہو جو اس سے ہزاروں گُنے زیادہ شراب پیا کرتے تھے اور ہزاروں گنا زیادہ بُرے افعال کیا کرتے تھے۔ غرض فرماتا ہے کہ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ یعنی تاریخ اسلامی مکدّر ہو جائے گی۔ اُس کی خوبیاں مٹا دی جائیں گی اور یوں معلوم ہو گا کہ نجوم میں انکدار واقع ہو گیا ہے۔

اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ میں شہب کے گرنے کی طرف اشارہ

(۲) نَجْمٌ کے ایک معنے چونکہ اَصْلٌ کے بھی ہیں اِس لئے اَلنُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ کے معنے یہ بھی ہیں کہ جڑیں خراب ہو جائیں گی یعنی قومی برتری کے جو اصول رائج ہیں کہ فلاں آدمی فلاں قوم سے ہے اور فلاں آدمی فلاں قوم سے۔ یہ مٹ جائیں گے چنانچہ اس زمانہ میں نسلی برتری کا احساس بالکل مٹا دیا گیا ہے۔ یورپ میں تو یہ امتیاز بالکل رہا ہی نہیں ہمارے ملک میں بھی آہستہ آہستہ یہ احساس مٹتا چلا جا رہا ہے اور جو لوگ خاندانی سمجھے جاتے تھے اُن کا رسوخ اب مفقود ہو رہا ہے۔ پس اس کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ قومی برتری کے جو عام قواعد دنیا میں رائج ہیں وہ اُس وقت نہیں رہیں گے۔ چنانچہ دیکھ لو آج کل اچھوت اقوام کو اُبھارنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ بھی اسی لئے ہیں کہ ان نسلی امتیازات کو بالکل مٹا دیا جائے۔

(۳) وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ کے یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ اُس زمانہ میں علماء اور امراء دونوں کا اثر جاتا رہے گا۔ قوم کی راہنمائی کی باگ ڈور انہی دو طبقوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ امراء سیاسی راہنمائی کرتے ہیں۔ اور علماء مذہبی راہنمائی کرتے ہیں پس وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ کے یہ معنے ہوئے کہ پبلک کا تعلق علماء اور امراء دونوں سے کمزور ہو جائے گا۔ امراء کا اثر دنیوی لوگوں پر سے اُٹھ جائے گا اور علماء کا اثر دینی میلان رکھنے والوں پر سے اُٹھ جائے گا۔ گویا امراء کی طاقت بھی ٹوٹ جائے گی اور علماء کی طاقت بھی ٹوٹ جائے گی۔

(۴) اِنْكَدَرَتْ کے ایک معنے تَنَاثَرَتْ کے بھی ہیں پس اس معنے کے اعتبار سے جب ہم پہلی آیت کے ساتھ ملائیں تو چونکہ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ سورج اور چاند کو گرہن لگے گا اس لئے اس مناسبت سے اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ کے یہ معنے ہوں گے کہ موعود زمانہ میں شُہب بڑی کثرت سے گریں گے چنانچہ یہ پیشگوئی بھی بڑی واضح طور پر پوری ہوئی اور ۲۸ نومبر ۱۸۸۵ء کو اس کثرت سے شُہب گرے کہ فضاء آسمان میں ہر طرف

# وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝

اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے ۴؎

شعلے چلتے ہوئے نظر آتے تھے اور یورپ اور امریکہ اور ایشیا کی اخبارات نے اس نظارہ قدرت کو عجیب سمجھ کر بہت کچھ لکھا اور حیرت ظاہر کی۔ اگر ہم شمس کے روحانی معنے کریں تو نُجُوْم کے بھی روحانی معنے کریں گے۔ اور اگر شمس سے ظاہری سورج مراد لیا جائے تو نجوم کے انکدار سے بھی شہب کا کثرت سے گرنا مراد لیا جائے گا۔ غرض وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ کے یہ معنے ہوئے (۱) کثرت سے شہب کی بارش ہوگی (۲) یا یہ کہ صحابہؓ کی اتباع بھی جاتی رہے گی۔ اُن کے بتلائے ہوئے علوم متروک ہو جائیں گے یا یہ کہ اُن کی اتباع نیکی اور تقوے میں لوگ چھوڑ دیں گے (۳) یا یہ کہ جو لوگ خاندانی سمجھے جاتے تھے اُن کا رسوخ جاتا رہے گا (۴) یا امراء کا اثر عوام پر سے اُٹھ جائے گا (۵) یا یہ کہ علماء مذہبی کا رسوخ مٹ جائیگا۔ یہ سب علامات ہیں جو آج کل پوری ہو چکی ہیں۔

۴؎ حل لغات۔ جِبَالُ: اَلْجَبَلُ کی جمع ہے اور اَلْجَبَلُ کے معنے ہیں كُلُّ وَتَدٍ لِلْاَرْضِ عَظُمَ وَطَالَ۔ یعنی اونچے ٹیلے کو جبل کہتے ہیں اور جِبَالٌ خِلَافُ السَّاحِلِ کو بھی کہتے ہیں یعنی اندرون ملک کو۔ اور جبل کے ایک معنے سَيِّدُ الْقَوْمِ وَعَالِمُهُمْ کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ عرب کہتے ہیں فُلَانٌ جَبَلُ قَوْمِهٖ کہ فلاں اپنی قوم کا جبل ہے یعنی اس قوم کا سردار اور بڑا عالم ہے (اقرب)

سُيِّرَتْ: سَيَّرَ سے مؤنث کا مجہول کا صیغہ ہے اور سَيَّرَ کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَهٗ سَائِرًا۔ اس کو چلایا اور سَيَّرَ الْجُلَّ عَنْ ظَهْرِ الدَّابَّةِ کے معنے ہوتے ہیں اَلْقَاهُ۔ جانور کا جھول اتار کر پیٹھ پر سے نیچے پھینک دیا اور سَيَّرَ الْمَثَلَ کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَهٗ يَسِيْرُ بَيْنَ النَّاسِ۔ کسی محاورہ کو پھیلا دیا اور سَيَّرَهٗ مِنْ بَلَدِهٖ کے معنے ہیں اَخْرَجَهٗ وَاَجْلَاهُ۔ اس کو اپنے شہر سے نکال دیا اور جلاوطن کر دیا (اقرب) پس وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ کے معنے ہوں گے (۱) جب پہاڑ چلائے جائیں گے (۲) جب علماء اور لیڈر اپنے ملکوں سے نکالے جائیں گے

تفسیر۔ اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ جب پہاڑ اپنی جگہ سے چلائے جائیں گے یعنی پہاڑوں کو اڑا اڑا کر رستے بنائے جائیں گے۔ اس صورت میں سُيِّرَتْ کے لفظ کا استعمال ایسا ہی سمجھا جائے گا جیسے کہتے ہیں پرنالے چلتے ہیں حالانکہ پرنالہ نہیں چلتا بلکہ پانی چل رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح سُيِّرَتِ الْجِبَالُ کے یہ معنے لئے جائیں گے کہ پہاڑوں کو ڈائنامیٹ سے اڑا اڑا کر راستے تیار کئے جائیں گے چنانچہ اس کا ثبوت ہر پہاڑ پر موجود ہے۔ پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر اور ڈائنامیٹ سے اڑا اڑا کر سڑکیں اور راستے بڑی کثرت سے تیار کئے گئے ہیں۔ ڈلہوزی۔ شملہ۔ مری۔ کشمیر۔ منصوری وغیرہ تمام پہاڑوں پر یہ راستے دیکھے جا سکتے ہیں۔ پس اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ کے یہ معنے ہوئے کہ پہاڑوں پر رستے تیار کئے جائیں گے جن پر لوگ چلیں گے گویا ان معنوں کی صورت میں یہاں سیر کی نسبت مقام کی جگہ صاحب مقام کی طرف سمجھی جائے گی یعنی لفظاً تو یہ کہا گیا ہے کہ پہاڑ چلائے جائیں گے مگر مراد یہ ہے کہ پہاڑوں پر لوگ کثرت سے چلیں گے کیونکہ پہاڑوں پر اچھے رستے تیار ہو جائیں گے موجودہ زمانہ میں اس کثرت سے پہاڑ اڑائے گئے ہیں کہ کوئی حد ہی نہیں رہی شاید ہی کوئی پہاڑ ایسا رہ گیا ہو جہاں سڑکیں اور رستے تیار نہ کر لئے گئے ہوں۔ ورنہ ہر پہاڑ پر چلنے کے لئے راستے بن گئے ہیں۔ پہاڑ کے نیچے ڈائنامیٹ رکھ دیتے ہیں اور وہ فوراً ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ پھر لڑائیوں میں بھی کثرت سے پہاڑ اڑائے جاتے ہیں۔ اوپر دشمن کی فوج موجود ہوتی ہے اور نیچے بارود رکھ کر اُسے اڑا دیا

اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ کی پیشگوئی کے مطابق پہاڑوں کا اڑایا جانا

اَلْجِبَالُ

سُيِّرَتْ

جاتا ہے پہلے زمانوں میں تو اتنا بارود ہی نہیں تھا کہ پہاڑوں
کو اڑایا جاسکتا۔ ضمناً اس آیت میں بارود کی کثرت کی طرف بھی
اشارہ پایا جاتا ہے کیونکہ سڑکیں وغیرہ تیار نہیں ہوسکتی تھیں
جب تک ڈائنامیٹ نہ ہوتا۔ اگر ڈائنامیٹ نہ ہوتا تو چٹانوں کا
اڑانا بڑا مشکل ہوتا۔ اسی طرح بعض مشینیں ایسی ایجاد ہوچکی
ہیں جو رستوں کو بالکل صاف کردیتی ہیں۔ پس ضمناً اس آیت
میں بارود کی کثرت اور ایسی مشینری کی ایجاد کی طرف بھی اشارہ
تھا جن سے پہاڑوں پر سڑکیں وغیرہ تیار ہوسکیں۔

اِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ میں علماء اور سادات قوم کے ملکوں سے نکالے جانے کی پیشگوئی

(۲) جَبَلٌ کے ایک معنے چونکہ سَیِّدُ الْقَوْمِ وَعَالِمُهُمْ
کے بھی ہوتے ہیں اس لئے وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ
کے یہ معنے بھی ہیں کہ علماء و سادات قوم کو ملکوں میں سے نکال
دیا جائے گا۔ اس کی مثال بھی پہلے کہیں نظر نہیں آتی موجودہ
زمانہ ہی ہے جس میں ایک طرف تمام رُوس سے ایسے مذہبی لوگوں
کو نکال دیا گیا ہے جو مذہب کو سیاست پر مقدم رکھتے ہیں۔
دوسری طرف ترکوں نے مذہب پر ایسا ہاتھ صاف کیا ہے کہ
حکم دے دیا ہے کہ اگر نماز پڑھی جائے تو ترکی میں ہی پڑھی
جائے۔ قرآن پڑھا جائے تو ترکی میں پڑھا جائے اور اگر
کوئی شخص ایسا نہ کرے تو وہ اُسے اپنے ملک سے نکال دیتے
ہیں یا قید کردیتے ہیں۔

اگلی آیات پر بحث تو بعد میں آئے گی انہی تین آیات پر
غور کرکے دیکھو اور سوچو کہ کیا اس زمانہ سے قبل دنیا میں کسی
زمانہ میں بھی ان باتوں کا اجتماع ہوا ہے؟ اگر دنیا کی ساری
تاریخ کو جمع کرلیا جائے تب بھی کسی زمانہ میں ان علامات کا تیسرا
حصہ تو کیا دسواں حصہ بھی نظر نہیں آئے گا۔ سورج چاند کو گرہن
لگنا، تہذیب کا کفر سے گرنا اور پھر قومی روایات کا مٹ جانا
یہ اتنی بیّن علامات ہیں کہ اس سے پہلے کسی زمانہ میں نظر نہیں
آتیں۔ چھ ہزار سال تو کجا اگر ایک لاکھ سال کی تاریخ کو بھی
جمع کرلیا جائے تو کہیں یہ دکھائی نہیں دے گا کہ مغلوب اقوام
کی قومی روایات کو اس طرح مٹا دیا گیا ہو جس طرح آج مٹایا
گیا ہے۔ یورپ کا ہر جاہل، شرابی، ظالم بادشاہ اچھی شکل میں
پیش کیا جاتا ہے اور ہر اچھے اخلاق کا مسلمان بادشاہ کریہہ شکل
میں دکھایا جاتا ہے اور مغربی لوگوں کے ہاتھ میں تعلیم ہونے
کی وجہ سے مسلمان بھی اسی خیال کے ہوگئے ہیں۔ یہ تو پہلے زمانہ
میں بھی نظر آنے گا کہ زید اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھول
گیا یا بکر اپنے آباء کی خوبیوں سے غافل ہوگیا مگر یہ کہیں
دکھائی نہیں دے گا کہ قوم کی قوم اپنی شاندار قومی روایات کو
نہ صرف بھلا دے بلکہ اپنے اسلاف کی خوبیاں بھی اُسے عیب
نظر آنے لگ جائیں۔ آج لاکھوں لوگ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ
فلاں مسلمان بادشاہ ایسا گندہ تھا اور فلاں مسلمان بادشاہ ایسا
خبیث تھا حالانکہ اُن سے زیادہ گندے اور ان سے زیادہ
خبیث بادشاہوں کی وہ تعریف کررہے ہوتے ہیں۔ وہ یہ تو
کہہ دیتے ہیں کہ محمود غزنوی ایسا تھا مگر وہ اتنا نہیں سوچتے
کہ وہ خود جن کی تعریف کررہے ہوتے ہیں وہ اُن سے زیادہ
گندے اور ناپاک ہوتے ہیں۔ کوئی مسلمان بادشاہ تو کبھی
شراب پیتا ہوگا مگر یہ جن کی تعریف کرتے ہیں وہ رات دن خمرا میں
پیتے تھے۔ اگر شراب پینا نقص ہے تو یہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے
نقص ہے عیسائیت کے نقطۂ نگاہ سے تو یہ ایک اچھا کام ہے پس
انہیں تو چاہیئے تھا کہ وہ خوش ہوتے کہ ایک مسلمان بادشاہ بھی
شراب پینے پر مجبور ہوا مگر وہ اُلٹا اس کو بُرا بھلا کہتے ہیں جس
کی غرض سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتی کہ مسلمانوں کے دلوں میں
اپنے بادشاہوں کی نسبت نفرت اور حقارت کے جذبات پیدا ہوں
حالانکہ انہیں اس سے کیا واسطہ ہے کہ کوئی شراب پیتا تھا یا
نہیں۔ انہیں تو نظامِ حکومت کے لحاظ سے تبصرہ کرنا چاہیئے
کہ اس نے حکومت سے تعلق رکھنے والے کام کس طرح
سرانجام دیئے۔

میں گذشتہ دنوں لاہور میں تھا کہ ایک شخص نے مجھ
سے سوال کیا کہ محمود غزنوی کے فلاں فلاں افعال آیا اسلام
کے مطابق تھے یا اس کی تعلیم کے خلاف تھے؟ میں نے اُس سے
کہا کہ ان امور کا تعلق مذہبی نقطۂ نگاہ کے ساتھ ہے لیکن تم جس
وقت کسی مسلمان بادشاہ کو بُرا کہتے ہو تو تمہارا منشاء یہ ہوتا ہے کہ

# وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝

اور جب دس مہینے کی گابھن اونٹنیاں آوارہ چھوڑ دی جائیں گی ؎۵

تم یہ ثابت کرو کہ یہ مسلمان بادشاہ تو بُرا تھا لیکن فلاں یوروپین بادشاہ بہت اچھا تھا حالانکہ اُس یوروپین بادشاہ میں بھی ہزاروں عیوب ہوتے ہیں پس یہ طریق درست نہیں تمہیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ محمود غزنوی نے جو اخلاق دکھلائے وہ اُس زمانہ کے اور بادشاہوں کے مقابلہ میں کیسے تھے۔ اگر اپنے زمانہ کے بادشاہوں کے مقابلہ میں اُس نے اعلیٰ درجہ کے اخلاق دکھائے ہیں تو گو اس میں بعض کمزوریاں بھی ہوں پھر بھی تاریخی نقطۂ نگاہ سے وہ ایک اعلیٰ درجہ کا بادشاہ سمجھا جائے گا اور اُس کا مقابلہ موجودہ زمانہ کے کسی بادشاہ سے نہیں کیا جائے گا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ ایڈیسن نے کئی ایجادات کی تھیں اس کے بعد ایجادات کا سلسلہ ایڈیسن کی ایجادات سے کئی گنا بڑھ گیا مگر اس سے ایڈیسن کی عزت میں کمی نہیں آسکتی۔ اس لئے کہ اپنے زمانہ میں اُس نے ایسا کام کیا جو نہایت شاندار تھا۔ اسی طرح اگر محمود غزنوی نے اپنے زمانہ کے بادشاہوں کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کے اخلاق دکھائے ہیں تو بہرحال وہ ایک قابلِ تعریف بادشاہ سمجھا جائے گا اور اسی نقطۂ نگاہ سے ہمیں اس کے افعال کو دیکھنا پڑے گا۔ غرض قومی روایات کے گلا ہو جانے کی مثال موجودہ زمانہ میں اتنی واضح اور اس قدر نمایاں ہے کہ قومی طور پر اس سے پہلے کسی زمانہ میں یہ مثال نظر نہیں آتی۔

اسی طرح علماء اور امراء کا زور ٹوٹ جانا بھی نہایت واضح ہے کہ پہلے کسی زمانہ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ روس کو مذہب پر سختی سے پابند ہونے والے علماء کو نکال دیا گیا۔ ٹرکی سے ان کو نکال دیا گیا۔ جرمنی اور اٹلی سے انہیں نکال دیا گیا۔ اسی طرح بعض اور ممالک میں اُن سے یہ سلوک کیا گیا اور مقامِ عزت سے اتار کر انہیں اس طرح نیچے پھینک دیا گیا جس طرح جانور کا جھول اتار کر پھینک دیا جاتا ہے۔ غرض یہ علامات جو ان تین آیات میں بیان کی گئی ہیں اور وہ علامات جو اگلی آیات میں بیان ہیں اگر ان سب کو بیان کیا جائے تو یقیناً کسی زمانہ بھی یہ باتیں اکٹھے طور پر نظر نہیں آئیں گی۔ بلکہ اگر یہ سب باتیں ایک نقشہ کے طور پر شائع کر دی جائیں اور ساتھ ہی یہ انعام مقرر کر دیا جائے کہ اگر کوئی شخص ان علامات کو گذشتہ زمانہ پر چسپاں کر کے دکھا دے تو اُسے لاکھ یا دو لاکھ روپیہ بطور انعام دیا جائے گا تب بھی کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکیگا کہ پہلے کسی ایک زمانہ میں یہ علامات پوری ہو چکی ہیں۔ دنیا کے کسی مؤرخ کے سامنے ان علامات کو رکھدو اور پھر اس سے پوچھو کہ یہ علامات کس زمانہ پر صادق آتی ہیں تو وہ فوراً کہہ اُٹھے گا کہ یہ تو اسی زمانہ کی علامات بیان کی جا رہی ہیں پہلے کسی زمانہ میں ایسے حالات پیدا نہیں ہوئے۔ غرض ہر شخص کی انگلی ان آیات کو پڑھکر موجودہ زمانہ کی طرف ہی اُٹھے گی کسی اور زمانہ کی طرف نہیں اُٹھ سکتی اور یہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ان سورتوں میں ایک یوم القیامۃ کا ایسا واضح نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اُس یوم القیامۃ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے تو وہ اِن سورتوں کو پڑھ لے۔

**؎۵ حل لغات۔** عِشَارٌ: عُشَرَاءُ کی جمع ہے۔ عربی زبان میں مفردات میں عُشَرَاءُ کی اپنے وزن میں کوئی نظیر نہیں۔ صرف نُفَسَاءُ ہی ایک لفظ ہے جو اس کے ہم وزن ہے گویا عُشَرَاءُ اور نُفَسَاءُ دو ہی لفظ اس وزن میں پائے جاتے ہیں تیسرا کوئی لفظ ان وزنوں کے لحاظ سے عربی زبان میں نہیں ہے۔ لکھا ہے اَلْعُشَرَاءُ کَنُفَسَاءَ وَلَا ثَالِثَ لِهٰذَيْنِ الْاِسْمَيْنِ (اقرب) عِشَار اُن اونٹنیوں کو کہتے ہیں جن کے حمل پر دس مہینے گذر جائیں یا آٹھ مہینے گذر جائیں۔ اکثر لوگوں کے نزدیک عِشَار انہی اونٹنیوں کو کہتے ہیں جن کے حمل پر دس مہینے گذر جائیں مگر بعض نے کہا ہے کہ جن کے حمل پر آٹھ مہینے گذر جائیں انکو بھی

عِشَار کہتے ہیں (اقرب) اس لفظ کی بناوٹ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کا خیال زیادہ صحیح ہے جو عشار دس ماہ کی گابھن اونٹنیوں کو کہتے ہیں۔ اُن اونٹنیوں کے گلّہ کو بھی عِشَار کہتے ہیں جن میں سے بعض بچہ جَن چکی ہوں اور بعض کا بچہ قریب میں ہونے والا ہو (اقرب) گویا عِشار دس ماہ کی گابھن اونٹنیوں کو بھی کہتے ہیں اور اونٹنیوں کا وُہ گلّہ بھی عِشَار کہلاتا ہے جن میں سے بعض بچہ جن چکی ہوں اور بعض انتظار کر رہی ہوں۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ میں لفظ عِشَار استعمال کرنے کی وجہ

عُطِّلَتْ

عُطِّلَتْ: عَطَّلَ سے مجہول مؤنث کا صیغہ ہے اور عَطَّلَ الْاِبِلَ کے معنے ہوتے ہیں خَلَّاہُ بِلَا رَاعٍ یعنی بغیر گلّہ بان اور چرواہے کے اُونٹ کو چھوڑ دیا وَکُلُّ مَا تُرِكَ ضِيَاعًا فَقَدْ عُطِّلَ۔ اور ہر وہ چیز جسے یونہی ضائع ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے اس کیلئے عَطَّلَ کا لفظ آتا ہے (اقرب) پس وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ کے معنے یہ ہوئے (۱) جبکہ دس ماہ کی گابھن اونٹنیوں کو یونہی چھوڑ دیا جائے گا یعنی خواہ وہ مریں یا جئیں اُن سے کوئی تعلق نہیں رکھا جائے گا۔ (۲) ایسی اونٹنیوں کے گلّوں کو جن میں سے بعض بچہ دے چکی ہوں اور بعض ابھی بچہ دینے والی ہوں چھوڑ دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ چاہے مریں یا رہیں ہمارا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

**تفسیر**۔ قرآن کریم عرب میں نازل ہُوا ہے اس لئے قرآن کریم میں عرب کی ضروریات اور اہل عرب کے جذبات کو سب سے مقدم رکھا گیا ہے تاکہ پہلے وہ خود قرآن کریم کو اچھی طرح سمجھ لیں اور پھر اُسے دنیا میں پھیلائیں۔ جو قوم الہامِ الٰہی کی اوّلین مخاطب ہوتی ہے اس کے محاورات اور اس کے جذبات وغیرہ کو کلام میں مقدم رکھا جاتا ہے کیونکہ اگر وہ اس کلام کو سمجھے گی نہیں تو اُسے پھیلائے گی کس طرح۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ عرب میں سواری اور غذا دونوں چیزیں اونٹ سے وابستہ تھیں اونٹ ہی پر وہ سواری کرتے تھے اور اونٹنی کا دُودھ ہی غذا کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح اونٹ کا گوشت کھایا کرتے تھے اور ان تینوں باتوں کے لحاظ سے دس ماہ کی گابھن اونٹنی خواہ وُہ بچہ جَن چکی ہو یا بچہ جننے والی ہو ان کی نگاہ میں بہت بڑی وقعت رکھتی تھی اس لئے کہ بچہ جننے والی نہ صرف خود سواری کے قابل ہوتی تھی بلکہ اس کے متعلق یہ امید بھی ہوتی تھی کہ اس کا جو بچہ پیدا ہوگا وہ بھی سواری کے یا غذا کے کام آئیگا۔ پھر وہ اونٹنی کا دُودھ پیتے تھے اور دُودھ کے لحاظ سے بھی دس ماہ کی گابھن اونٹنی کو وہ بہت قیمتی سمجھتے تھے کیونکہ جانتے تھے کہ یہ عنقریب بچہ دے گی اور ہم اس کا دُودھ خوب پئیں گے۔ پھر وہ گوشت کھایا کرتے تھے اس لحاظ سے دس ماہ کی گابھن اونٹنی بہت اعلیٰ خیال کی جاتی تھی کیونکہ چھوٹے بچے کا گوشت بہت اچھا ہوتا ہے۔ پشاور کی تجارت کا ایک بڑا حصہ دُنبہ کے بچے کے گوشت سے وابستہ ہے وہ دو ماہ کا دنبہ ذبح کرکے اس کا گوشت بیچتے ہیں اور لوگ دُور دُور سے اس دنبہ کا گوشت چکھنے کو پشاور جاتے ہیں۔ بکری کے چھوٹے بچے کا گوشت بھی بہت مزیدار ہوتا ہے۔ غرض وہ ایسی اونٹنی کو بہت قیمتی سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ ہم اونٹنی کا دودھ پئیں گے اور بچے کا گوشت کھائیں گے لیکن اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ایک زمانہ آنے والا ہے جب ایسی اونٹنیاں بیکار چھوڑ دی جائیں گی جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے لُغت کے لحاظ سے عَطَّلَ کے معنے یہ ہوئے کہ کسی چیز کو ضائع ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے اور اس سے کسی قسم کا واسطہ نہ رکھا جائے۔ اس لحاظ سے عُطِّلَتْ کے دو ہی معنے ہو سکتے ہیں کہ (۱) اونٹ کو بیکار کرنے والی سواریاں نکل آئیں گی جس سے ایسی اونٹنیوں کی قیمت بھی کہ دس ماہ سے گابھن ہوں اور جلد بچہ دینے والی ہوں گر جائے گی اور لوگ اُن کو چھوڑ دیں گے (۲) یا یہ کہ اس قدر تیز سواریاں نکل آئیں گی کہ اُن کی وجہ سے ہر قسم کی غذائیں عرب میں پہنچنے لگیں گی اور اونٹ کے دودھ کی چنداں ضرورت

# وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۝

اور جب وحشی اکٹھے کئے جائیں گے ۵۶

نہ رہیگی جس کیوجہ سے کبھی ہوتی اور جننے کے قریب پہنچی ہوئی اونٹنی کی قدر پہلے جیسی نہ رہیگی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں اس زمانہ میں یہ دونوں باتیں پوری ہو چکی ہیں۔ سواری کیلئے دخانی جہاز۔ ریل۔ موٹر اور ہوائی جہاز ایجاد ہو چکے ہیں اور ان نئی ایجادات کیوجہ سے عرب میں جہاں اونٹوں پر سفر کیا جاتا تھا وہاں اب موٹروں پر سفر کیا جاتا ہے۔ جب شروع شروع میں عرب میں موٹریں جاری کی گئیں تو بدوؤں نے بغاوت کر دی کہ اس طرح ہماری تجارت کو نقصان ہوگا مگر آخر موٹریں ہی جاری رہیں اور اونٹ کی سواری متروک ہو گئی چنانچہ اب مکہ میں جانیوالے موٹروں پر سفر کر کے ہی جاتے ہیں۔ مولوی ثناء اللہ صاحب نے ایک دفعہ اعتراض کیا تھا کہ مکہ میں تو ابتک ریل نہیں گئی حالانکہ ریل کیا اور موٹر کیا مطلب تو یہ تھا کہ اونٹ کی سواری جاتی رہیگی اور اس کی بجائے ایسی نئی سواریاں نکل آئینگی جن کو لوگ زیادہ ترجیح دینگے چنانچہ موٹروں نے اونٹ کی سواری کی اہمیت بالکل گرا دی ہے۔ ریل تو مقررہ وقت پر چلتی ہے مگر موٹریں ہر وقت چل سکتی ہیں اسلئے جہاں موٹر چلتی ہے وہاں دوسری سواریاں بالکل رہ جاتی ہیں کیونکہ وہ ہر وقت چل سکتی ہے غرض اس پیشگوئی کو اللہ تعالیٰ نے خاص رنگ میں پورا کر دیا کہ اب جدہ سے مکہ اور مکہ سے مدینہ کیطرف موٹر چلتی ہے اونٹ کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔

اس پیشگوئی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ ایسے تیز رفتار جہاز پیدا ہو جائینگے کہ جن کیوجہ سے ہر قسم کی سبزی ترکاری عرب میں پہنچنے لگ جائیگی چنانچہ پیشگوئی کا یہ حصہ بھی پورا ہوا۔ وہ قوم جسکی غذا ہی اونٹ کا دودھ اور اسکا گوشت تھا اب اسکو دنبے کا گوشت بھی میسر آرہا ہے سبزیاں اور ترکاریاں بھی مل رہی ہیں اور اُسے اونٹ کا دودھ یا اس کا گوشت کھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اونٹ کا دودھ آخر ضرورت کے ماتحت ہی پیا جاتا تھا یہ تو نہیں کہ وہ کوئی مزیدار شے ہے میں نے خود اُسے پی کر دیکھا ہے ایسا بمزہ ہوتا ہے کہ اس کے پینے سے قے آتی ہے جس شخص کو کھانے کیلئے اور کچھ نہ ملے وہ بیشک یہ دودھ پی سکتا ہے مگر جسے اور چیزیں کھانے کے لئے مل جائیں وہ اونٹنی کا دودھ کیوں پئے گا۔ اسی طرح اونٹ کا گوشت بھی بڑا سخت ہوتا ہے اور گو عرب لوگ اُسے کھایا کرتے تھے مگر جب انہیں دنبے کا گوشت کھانے کو مل جائے تو وہ اونٹ کا گوشت کیوں کھائیں۔ اور جب سبزی ترکاری انہیں میسر آجائے تو وہ اونٹنی کے دودھ کی طرف کیوں رغبت کریں۔ یہی بات اس آیت میں بیان کی گئی تھی کہ نقل و حرکت کے سامان اس قدر کثرت سے نکل آئیں گے اور اتنی تیز رفتار سواریاں ایجاد ہو جائیں گی کہ ہر چیز عرب میں پہنچنے لگ جائیگی اس وجہ سے نہ اونٹ کی سواری کی کوئی اہمیت رہے گی اور نہ اونٹنی کے دودھ اور اس کے بچہ کے گوشت کی قدر رہے گی۔ ہم دیکھتے ہیں اب عرب میں پان بھی پہنچ گیا ہے حالانکہ عرب کا پان سے کوئی تعلق نہیں لیکن جہازوں میں لد کر اب پان بھی عرب میں پہنچنے لگ گیا ہے اور ہندوستانی تو الگ رہے بعض عرب بھی شوق کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح اور کئی قسم کا سامان خورد و نوش جو پہلے اہل عرب کے واہمہ میں بھی نہیں آسکتا تھا اب وہاں آسانی سے پہنچ رہا ہے اور اس طرح اونٹ کے دودھ اور اس کے گوشت کی ضرورت بہت کم ہو گئی ہے اور روز بروز کم ہوتی جائے گی یہاں تک کہ اونٹ کی ضرورت وہاں اسی طرح رہ جائے گی جس طرح دوسرے ملکوں میں ہے اور پہلی سی بات اب بھی نہیں رہی آئندہ اور بھی تبدیل ہو جائیگی۔

**۵۶ حل لغات۔** اَلْوُحُوْشُ: حَيَوَانُ الْبَرِّ اَلْوُحُوْشُ اَوْ مَا لَا يَسْتَأْنِسُ مِنْ دَوَابِّ الْبَرِّ۔ جنگلی جانور یا وہ چوپایہ جو انسانوں سے مانوس نہ ہو وَحْشِیٌّ کہلاتا ہے اور وُحُوْش اس کی جمع ہے (اقرب)

حُشِرَتْ: حَشَرَ سے مؤنث مجہول کا صیغہ ہے اور حَشَرَ النَّاسَ (حَشْرًا) کے معنے ہوتے ہیں جَمَعَهُمْ لوگوں کو جمع کیا۔ اور حَشَرَ السِّنَانَ کے معنے ہوتے ہیں

دَقَّقَہٗ وَلَطَّفَہٗ ۔اُس نے نیزے کی نوک کو خوب تیز کیا اور حَشَرَ فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں جَلَاہُ عَنْ وَطَنِہٖ اس کو اپنے وطن سے نکال دیا۔ اور حَشَرَ الْجَمْعَ کے معنے ہوتے ہیں اَخْرَجَہٗ مِنْ مَّکَانٍ اِلٰی اٰخَرَ۔ لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل کر دیا اور حُشِرَ مجہول کے صیغہ میں اس کے ایک زائد معنی بھی ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں حُشِرَتِ الْوُحُوْشُ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ مَاتَتْ وَاُھْلِکَتْ یعنی وحشی مر گئے یا ان کو مار دیا گیا۔ (اقرب) پس وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ کے ایک معنے یہ ہوں گے کہ وحشیوں کو ہلاک کر دیا جائے گا۔

**تفسیر**۔ یہ بھی ایک زبردست پیشگوئی ہے جو موجودہ زمانہ میں پوری ہوئی۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ایک زمانہ میں وحشی جانور جمع کئے جائیں گے۔ چنانچہ دیکھ لو آجکل چڑیا گھروں میں جس قدر وحشی جانور اکٹھے کئے گئے ہیں اس کی مثال پہلے زمانوں میں کہاں ملتی ہے کوئی صوبہ اور کوئی ملک ایسا نہیں جہاں کوئی چڑیا گھر نہ ہو اور اس میں وحشی جانوروں کو اکٹھا نہ کیا گیا ہو۔ پہلے زمانہ میں شاید ساری دنیا میں بھی کوئی ایک مقام ایسا نہیں مل سکتا تھا جہاں اس طرح جانور اکٹھے کئے گئے ہوں مگر اب کوئی ملک ایسا نہیں جس میں چڑیا گھر نہ ہوں بلکہ کوئی صوبہ ایسا نہیں جس میں چڑیا گھر نہ ہو۔ اور پھر اس بارہ میں ملکوں اور صوبوں کی آپس میں رقابت پائی جاتی ہے اور ہر ملک یہ چاہتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ وحشی جانور اکٹھا کرے یہ تو چڑیا خانوں کا حال ہے جہاں زندہ وحشی جانور اکٹھے ہوتے ہیں عجائب گھروں میں مُردہ جانوروں کی کھالوں میں بھوسہ بھر بھر کر ان کو رکھا جاتا ہے تاکہ لوگ آئیں انکو دیکھیں اور اپنے معلومات میں اضافہ کریں۔ اسی طرح علم حیات کی تحقیقات کے لئے سائنٹفک ریسرچ انسٹی ٹیوشن RESEARCH INSTITUTION میں مردہ جانوروں کے لاشے اور اُن کے ڈھانچے لا لا کر جمع کئے جاتے ہیں اور دیکھا جاتا ہے کہ یہ ڈھانچے کتنے سال کے ہیں یا کتنا زمانہ ان پر گذر چکا ہے یا اُن کی مختلف حالتوں کو دیکھنے اور دوسروں کو یاد کرانے کے لئے اُن ڈھانچوں پر غور کیا جاتا ہے غرض کیا چڑیا گھروں کے لحاظ سے اور کیا عجائب گھروں کے لحاظ سے اور کیا علم حیات کی تحقیق کے لحاظ سے اس پیشگوئی کی صداقت پوری طرح ثابت ہے اور جس طرح موجودہ زمانہ میں وحشی جانوروں کو زندہ یا مردہ اکٹھا کیا گیا ہے اس کی مثال پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔

(۲) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وُحُوْش سے مجازاً وحشی انسان مراد لئے جائیں۔ عربی زبان میں کثرت سے یہ لفظ اِن معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اُردو زبان میں بھی کہتے ہیں فلاں آدمی تو وحشی ہے اُس سے باتیں نہ کیجئے۔ یا فلاں لوگ تو وُحُوش ہیں۔ اسی لحاظ سے وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ کے یہ معنے ہوں گے کہ وحشی انسان یعنی جنگلی یا غیر تعلیم یافتہ اقوام جمع کی جائیں گی اور اُن کا تعلق بوجہ اشاعت تمدن اور راستوں کے کھل جانے کے متمدن اقوام سے ہو جائے گا۔ پنجاب کے بار کے علاقہ میں چلے جاؤ تمہیں جگہ جگہ یہ سنائی دے گا کہ فلاں نئی آبادی ہے اور فلاں جانگلیوں کا گاؤں ہے اور جانگلی کے معنے وحشی کے ہی ہیں۔ گویا وہ ادنیٰ یا وحشی اقوام جو پہلے الگ رہا کرتی تھیں اب متمدن لوگوں میں بالکل مل گئی ہیں۔ پہاڑی لوگوں کو بھی وحشی سمجھا جاتا تھا مگر اب ہر جگہ پہاڑوں پر سینیٹوریم بن گئی ہیں جن کی وجہ سے دنیا کے اکثر مالدار لوگ گرمی کا موسم پہاڑوں پر گذارتے ہیں اور اس طرح پہاڑی لوگوں کا تعلق بھی متمدن لوگوں سے ہو گیا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ ہم نورپور آ رہے تھے جو پٹھانکوٹ سے پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مولوی یار محمد صاحب مرحوم بھی ہمارے ساتھ تھے ہم نے دیکھا کہ پگڈنڈی پر ایک عورت کھڑی ہے چونکہ ہم نے بھی اُسی پگڈنڈی پر سے گذرنا تھا اس لئے مولوی یار محمد صاحب نے اس عورت سے کہا کہ مائی ذرا ایک طرف ہو جاؤ۔ اُس نے یہ سنتے ہی شور مچانا اور گالیاں دینا شروع کر دیا کہ میری ہتک کر دی گئی ہے۔ مولوی صاحب حیران

تھے کہ میں نے اس کی کیا ہتک کی ہے اور ہم بھی حیرت زدہ تھے کہ یہ بات کیا ہوئی۔ مگر وہ برابر شور مچاتی اور گالیاں دیتی چلی گئی۔ آخر مولوی صاحب نے اس کی منتیں کیں کہ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیا جائے اور کہا کہ ہمارے ہاں مائی کا لفظ عزت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اسی لئے میں نے یہ لفظ استعمال کیا تھا میری غرض تمہاری ہتک کرنا نہیں تھی۔ مگر وہ کہتی جاتی تھی کہ تم نے تو مجھے اپنے باپ کی بیوی بنا دیا ہے۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ مائی کے معنے وہ عورت کیا سمجھتی تھی اور کیوں اُس نے گالیاں دیں اور شور مچایا۔ کچھ عرصہ گذرا کہ مجھے ڈلہوزی آتے ہوئے معلوم ہوا کہ ہماری موٹر کا ڈرائیور نور پور کا ہے میں نے ڈرائیور کو راستہ میں یہ لطیفہ سنایا۔ وہ سُن کر کہنے لگا یہ بہت پُرانے زمانہ کی بات ہے اب عورتوں کو بے شک مائی کہکر دیکھ لیں انہیں بُرا محسوس نہیں ہوگا کیونکہ اب پنجابی اُن سے ملنے لگ گئے ہیں اور وہ سب سمجھتی ہیں کہ مائی کے کیا معنے ہوتے ہیں مگر آج سے چالیس سال پہلے یہ کیفیت تھی کہ پندرہ بیس منٹ تک مولوی صاحب اس کی منتیں کرتے چلے گئے اور وہ عورت کہتی جاتی تھی کہ تُو نے مجھے اپنے باپ کی بیوی بنا دیا ہے تو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ایک زمانہ میں ادنیٰ یا وحشی اقوام بھی متمدّن لوگوں میں ملا دی جائیں گی اور عالمگیر سیاسی نظام شروع ہو جائے گا جس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنے ہوں گے کہ زمین کا چپہ چپہ آباد کر دیا جائے گا۔ ادنیٰ اقوام میں بھی بیداری پیدا ہو جائیگی اور اُن میں بھی تعلیم کا چرچا شروع ہو جائیگا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں افریقہ کے باشندے پہلے ننگے پھرا کرتے تھے مگر اب وہی لوگ ولایت میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جاتے اور وہاں سے ڈاکٹر یا بیرسٹر وغیرہ بن کر واپس آتے ہیں۔ ہماری جماعت کے مبلغ مولوی عبدالرحیم صاحب نیّر افریقہ کے حبشیوں کی تصویریں دکھایا کرتے ہیں کہ جب تک احمدی مبلغ وہاں نہیں پہنچے تھے وہ لوگ ننگے پھرا کرتے تھے مگر اب احمدی مبلغوں کے جانے کے بعد وہ لباس پہننے لگ گئے ہیں۔ غرض جس طرح اس زمانہ میں تمام وحشی اقوام کی تربیت ہو رہی ہے اس سے پہلے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ انسان کسی ایک چیز کو اتفاق کہہ سکتا ہے مگر وہ ان سب علامتوں کو جو قرآن کریم نے ایک جا اور ایک زمانہ کے متعلق بیان فرمائی ہیں کس طرح اتفاقی قرار دے گا۔

(۳) یہ معنے بھی اس آیت کے ہو سکتے ہیں کہ جو اقوام نزولِ قرآن کے وقت وحشی سمجھی جاتی تھیں وہ اُبھار دی جائینگی اور دنیا میں پھیل جائیں گی یعنی یورپ اور امریکہ کا غلبہ ہوگا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یورپ بالکل وحشی تھا اور یورپ کے اکثر ممالک کے باشندے افریقہ کے حبشیوں کی طرح قریباً ننگے پھرا کرتے تھے۔ بلکہ آج سے پانچ چھ سو سال پہلے کی اگر تصویریں دیکھی جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت بھی وہ لوگ کھال کا لباس پہنا کرتے تھے۔ اُن کے گھٹنوں تک کھال ہوتی تھی۔ ہاتھ میں تیر کمان ہوتا تھا اور سر پر عجیب قسم کی ٹوپی ہوتی تھی۔ پس وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ جو قومیں نزولِ قرآن کے وقت وحشی سمجھی جاتی تھیں اُن کو اُبھار دیا جائے گا۔ وہ اجتماع اور طاقت اپنے اندر پیدا کرلیں گی اور دنیا میں پھیلا دی جائیں گی (۴) یا یہ کہ ایسی قوموں کی حکومت ہو جائے گی جو بے دین ہو جائیں گی کیونکہ انس وہ ہے جس میں دین ہو اور وحشی وہ ہے جس میں دین نہ ہو پس وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ کے ایک یہ معنے ہوں گے کہ بے دین حکومتیں قائم ہو جائیں گی جیسے رُوس میں یا اور بعض دوسرے ممالک میں ایسی حکومتیں قائم ہیں جن کو دین سے کوئی مس ہی نہیں گویا دہریہ قوموں کے حاکم ہو جانیکے متعلق ان میں پیشگوئی پائی جاتی ہے۔

(۵) اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ بداخلاقی عام طور پر پھیل جائے گی اور دیندار لوگ دب جائیں گے۔

(۶) اس آیت کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وحشی اقوام کو اُن کے علاقوں سے نکال دیا جائے گا جیسا کہ افریقہ میں ہو رہا ہے۔ کینیا کالونی میں چلے جاؤ۔ یوگنڈا میں چلے جاؤ۔ ہر جگہ یہی نظارہ نظر آنے گا۔ انگریز وہاں گئے اور انہوں نے

# وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝

اور جب دریاؤں (کے پانیوں) کو (نکال کر دوسری طرف) بہایا جائیگا ۝

اصل باشندوں کو نوٹس دے دیا کہ یا تو اس زمین کو سنبھالو اور یا اس میں سے نکل جاؤ۔ وہاں ایک ایک شخص کی پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ میل پر ریاست ہوتی تھی مگر یوروپین قوموں نے جاتے ہی اُن سب کو اپنی زمینوں اور جائدادوں سے بے دخل کر دیا اور خود اُن پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ افریقہ میں بعض انگریزوں کے پاس ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ ایکڑ زمین ہے۔ اور گو انگریز بھی اس زمین کو بسا نہیں رہے مگر جب یہ وہاں گئے تو انہوں نے تمام لوگوں کو نوٹس دے دیا کہ اپنی اپنی زمین کو سنبھالو یا اسے چھوڑ دو۔ اب ایک شخص اتنی بڑی زمین کہاں سنبھال سکتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے اُن کو بے دخل کر دیا اور خود زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ یہی حال امریکہ کا ہے وہاں ریڈ انڈینز RED INDIANS کی حکومت ہوا کرتی تھی اور شمالی اور جنوبی امریکہ سب اُن کے قبضہ میں تھا مگر انہوں نے سو سال میں اُن سب کو بے دخل کر دیا اور خود تمام علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

(۶) حُشِرَتْ کے ایک معنے چونکہ اُھْلِکَتْ کے بھی ہیں اس لئے اس آیت کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ انہیں قسم قسم کی تدابیر سے ہلاک کر دیا جائے گا۔ چنانچہ قدیم باشندوں کو یوروپینز نے قسم قسم کی اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا۔ اب ایک ریاست کے متعلق میں نے پڑھا ہے کہ اُس میں صرف تیرہ[۱۳] قدیم باشندے باقی ہیں حالانکہ پہلے لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ اسی طرح آسٹریلیا کے پُرانے باشندوں کا اب کہیں پتہ نہیں چلتا اُن سب کو جو لاکھوں کی تعداد میں تھے یوروپین لوگوں نے قسم قسم کی تکالیف اور دُکھوں سے ایسا مٹایا کہ اب معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں گئے۔

بِحَارٌ

۵ **حل لغات**۔ بِحَارٌ جمع ہے بَحْرٌ کی اور اَلْبَحْرُ کے معنے ہیں خِلَافُ الْبَرِّ یعنی بحر کا لفظ خشکی کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے معنے ہیں۔ اَلْمَآءُ الْمِلْحُ۔ نمکین پانی والی جگہ یعنی سمندر۔ وَ کُلُّ نَهْرٍ عَظِيْمٍ۔ ہر بڑا دریا۔ کُلُّ مُتَوَسِّعٍ فِیْ شَیْءٍ۔ ہر چیز میں وسعت رکھنے والا وجود۔ فَالرَّجُلُ الْمُتَوَسِّعُ فِی الْعِلْمِ بَحْرٌ وَالْفَرَسُ الْمُتَوَسِّعُ فِیْ جَرْیِهٖ بَحْرٌ۔ ہر وہ آدمی جس کا علم وسیع ہو اُسے بحر کہتے ہیں اور ہر وہ گھوڑا جو بہت تیز دوڑتا ہو اُسے بھی بحر کہتے ہیں (اقرب) غرض جس چیز میں بھی غیر معمولی وسعت پائی جاتی ہو عربی زبان میں اُسے بحر کہا جاتا ہے بُحُوْرٌ وَ اَبْحُرٌ وَ بِحَارٌ اس کی جمع ہیں۔

سُجِّرَتْ: سَجَّرَ سے مجہول مؤنث کا صیغہ ہے اور سَجَّرَ الْمَآءَ کے معنے ہوتے ہیں فَجَّرَهٗ۔ اس نے پانی کو پھاڑا۔ اور سَجَّرَ التَّنُّوْرَ کے معنے ہوتے ہیں مَلَأَهٗ بِالْحَطَبِ لِيُحْمِيَهٗ۔ تنور کو لکڑیوں سے بھر دیا تاکہ اُسکو گرم کرے۔ وَفِی الْقُرْاٰنِ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ قِيْلَ اَیْ اُحْمِيَتْ بِتَفْجِيْرِ بَعْضِهَا اِلٰی بَعْضٍ حَتّٰی يَعُوْدَ بَحْرًا وَاحِدًا۔ لغت میں جو لکھا ہے کہ قرآن میں جو آتا ہے اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ۔ اس کے یہ معنے کئے جاتے ہیں کہ بعض دریاؤں کو بعض میں پھاڑ کر ملا دینے سے پانی میں جوش پیدا کر دیا جائے گا یہاں تک کہ ایک بڑا دریا نظر آنے لگ جائے گا (اقرب)

**تفسیر**۔ دریاؤں کا پھاڑنا دو طرح ہو سکتا ہے۔ اوّل اس طرح کہ اس کا پانی کسی اور طرف لے جایا جائے۔ دوسرے اس طرح کہ اس میں کوئی اور پانی ملا دیا جائے پس اس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ یا تو دریا نہریں نکال نکال کر خشک کر دئے جائیں گے یا دریاؤں میں اور پانی ملا کر اُن کو بڑھا دیا جائیگا۔ یہ دونوں نظارے آج کل دنیا میں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ کئی دریا ایسے ہیں جن میں سے نہریں نکال نکال کر انکو خشک کر دیا گیا ہے اور کئی دریا ایسے ہیں جن میں دوسرے دریاؤں کا پانی ملا کر

# وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝

اور جب (مختلف) نفوس جمع کئے جائیں گے ۵۸

اُن کو وسیع کر دیا گیا ہے۔ ہمارے ملک میں دریاؤں کو جہاز رانی کے قابل نہیں سمجھا گیا لیکن یورپ میں اس کا بڑا رواج ہے اور وہ دریاؤں کو درست کر کے اندرون ملک میں بھی جہاز چلاتے ہیں تا کہ رسل و رسائل میں آسانی رہے۔ اب تک کے تجربہ سے یہی ثابت ہوا ہے کہ ریل نقل اسباب کے لحاظ سے مہنگی ہے لیکن جہاز سستا ہے اس وجہ سے یوروپین لوگ تجارت کے لئے جہازوں سے زیادہ کام لیتے ہیں اور جہاں دریا سمندر سے ملتے ہیں اس علاقہ کو صاف اور ہموار کر کے دریا کو جہاز رانی کے قابل بنا دیتے ہیں جس کی وجہ سے تیس تیس چالیس چالیس پچاس پچاس بلکہ بعض جگہ سو سو میل تک وہ اندرون ملک میں جہاز لے جاتے ہیں اور اس طرح اُن کو تجارت میں بہت آسانی رہتی ہے۔ ہمارے ملک میں اس کا رواج نہیں لیکن وہاں اس کا کثرت سے رواج ہے اور پھر یہ بھی ہو رہا ہے کہ دریاؤں میں سے نہریں نکالی جاتی ہیں بلکہ بعض جگہ وسیع نہریں نکالنے کے لئے ایک دریا کا پانی دوسرے دریا کے پانی میں ملا دیتے ہیں اور اس طرح بحار کی تسجیر عمل میں آ رہی ہے۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ عالم جاہل ہو جائیں گے اور ان کا علم مفقود ہو جائیگا کیونکہ بحر کے ایک معنے عالم کے بھی ہیں اور چونکہ بحر کے معنے اَلْمَاءُ الْمِلْحُ کے بھی ہیں یعنی صرف دریا مراد نہیں بلکہ اس کے معنے سمندر کے بھی ہیں اس لئے اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ سمندر آپس میں ملا دئے جائیں گے جیسے نہر سویز کے ذریعہ سے قلزم اور روم کو یا نہر پانامہ کے ذریعہ سے دو امریکی سمندروں کو آپس میں ملا دیا گیا۔

**۵۸ تفسیر**۔ اس آیت میں رسل و رسائل اور سفر کی آسانیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آخری زمانہ میں بعض ایسی چیزوں کی ایجاد عمل میں آ جائیگی جن سے لوگ ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو جائیں گے۔ چنانچہ پہلی چیز جو اس زمانہ میں قرآن کریم کی اس پیش کردہ صداقت کو ظاہر کر رہی ہے وہ ریل ہے۔ ریل کا ایک ڈبہ ہوتا ہے لیکن اگر غور کرو تو اسی ایک ڈبہ میں کوئی چینی بیٹھا ہوتا ہے کوئی انگریز بیٹھا ہوتا ہے کسی طرف بنگالی بیٹھا دکھائی دیتا ہے اور کسی طرف پٹھان بیٹھا نظر آتا ہے۔ اسی طرح پنجابی بھی اُسی ڈبہ میں موجود ہوتا ہے۔ غرض مختلف علاقوں کے رہنے والے اور مختلف زبانوں کے بولنے والے لوگ ریل کے ایک ڈبہ میں موجود ہوتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں بڑی مشکل سے دوسرے علاقہ یا دوسرے ملک کے لوگ نظر آیا کرتے تھے مگر اب ذرائع رسل و رسائل اور آمد و رفت میں اسقدر آسانی اور سہولت پیدا ہو گئی ہے کہ ہندوستان کے آدمی امریکہ میں نظر آ جاتے ہیں اور امریکہ کے ہندوستان میں نظر آ جاتے ہیں۔ پھر تار، ریڈیو اور ڈاک خانہ یہ تو ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ کی پیشگوئی کو نہایت واضح طور پر پورا کر دیا ہے۔ ہم گھر میں آرام سے بیٹھے ہوتے ہیں اور ریڈیو پر کبھی چینیوں کی تقریریں سُن رہے ہوتے ہیں۔ کبھی جاپانیوں کے لیکچر سُن رہے ہوتے ہیں۔ کبھی جرمنوں اور کبھی انگریزوں کی باتیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی ہوتی ہیں گویا دوسرے الفاظ میں ہم اور ایک چینی ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں یا ہم اور ایک جاپانی ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں یا ہم اور ایک انگریز ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں یا ہم اور ایک جرمن ایک جگہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا کہ اس زمانہ میں ایک قسم کے علوم پھیل جائیں گے چنانچہ دنیا میں مغربی علوم کا اب اس قدر غلبہ ہو گیا ہے کہ نفوس انسانی کا آپس میں جوڑ اور اتحاد پیدا ہونا بالکل آسان ہو گیا ہے اس زمانہ میں یہ علوم اتنے غالب آ گئے ہیں کہ ساری

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ میلوں سی نہریں نکالے جانے کی پیشگوئی

# وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝

اور جب زندہ گاڑی جانیوالی (لڑکی) کے بارے میں سوال کیا جائیگا (کہ آخر) کس گناہ کے بدلہ میں اسکو قتل کیا گیا (تھا) ؀۵۹

دنیا پر چھاگئے ہیں۔ بالخصوص یوروپین فلسفہ نے انسانی دماغ کو ایک خاص رنگ میں ڈھال دیا ہے اب اگر ایک چینی سوچتا ہے تو مغربی رنگ میں سوچتا ہے۔ جاپانی سوچتا ہے تو مغربی رنگ میں سوچتا ہے۔ عرب سوچتا ہے تو مغربی رنگ میں اور پٹھان سوچتا ہے تو وہ بھی مغربی رنگ میں۔ حالانکہ جُدا جُدا قومیں ہیں۔ جُدا جُدا زبانیں ہیں مگر مغربی فلسفہ اور مغربی تہذیب سب پر چھا گئی ہے۔ اور مختلف اقوام کے افراد علمی طور پر آپس میں ملا دئیے گئے ہیں اسی طرح اسکے یہ معنی بھی ہیں کہ مختلف اقوام کے افراد کا آپس میں شادی بیاہ کرنے کا رواج ہو جائیگا۔ چنانچہ حبشی عورتیں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے ساتھ بیاہی جاتی ہیں اور انگریز عورتیں دوسری اقوام کے مردوں سے شادی کر لیتی ہیں۔ فرانس میں چلے جاؤ تو تمہیں نظر آئے گا کہ ایک فرانسیسی اپنی حبشی بیوی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جا رہا ہے اُسے یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ میں فرانسیسی ہوں اور یہ حبشی ہے۔ اسی طرح انٹر میرج بلز INTER MARRIAGE BILLS پاس ہونے شروع ہو گئے ہیں تاکہ غیر مذاہب والوں کے ساتھ شادی بیاہ میں کوئی روک نہ ہو پہلے اس قسم کی شادیاں لوگ بہت رُک رُک کر کرتے تھے مگر اب زور دے کر انٹر میرج بلز پاس کرائے جاتے ہیں تاکہ اس قسم کی شادیوں میں کوئی روک پیدا نہ ہو سکے۔ لاہور میں اُمّ طاہر رضؓ کی بیماری کے سلسلہ میں جب میں مقیم تھا تو ایک بہت بڑے لیڈر مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ انکی بیوی بھی اُن کے ساتھ تھیں باتوں باتوں میں اُن کی بیوی نے جو مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوئی تھی بتایا کہ ہم تین بہنیں ہیں جن میں سے دو ہندوؤں میں بیاہی ہوئی ہیں اور ایک کی مسلمان کے ساتھ شادی ہو چکی ہے۔ پشاور میں ایک دفعہ اسی بات پر بہت شور اُٹھا تھا کیونکہ ڈاکٹر خان کی بیٹی نے ایک سکھ ہوا باز سے شادی کر لی تھی۔ غرض مختلف قوموں میں اس قسم کی شادیوں کا رواج بہت ترقی کر چکا ہے جو قرآن کریم کی پیشگوئی وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ کی صداقت کا ثبوت ہے۔

اسی طرح اس کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ مختلف قسم کے نفوس مل جائیں گے اور وہ اپنی اپنی الگ سوسائٹیاں بنائیں گے چنانچہ دیکھ لو کہیں لیبر پارٹی بنی ہوئی ہے۔ کہیں فاشسٹ پارٹی بنی ہوئی ہے۔ کہیں کمیونسٹ پارٹی بنی ہوئی ہے۔ اور کہیں سوشلسٹ پارٹی بنی ہوئی ہے چند ہم خیال لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور پھر وہ اپنی اپنی پارٹیاں بنا لیتے ہیں۔ مزدور اپنے حق کے لئے لڑتا ہے۔ صنّاع اپنے حقوق کے لئے جد و جہد کرتا ہے اور مدرس اور تاجر اپنے اپنے رنگ میں کوشش کرتا ہے غرض قومی سوسائٹیاں بڑی کثرت سے بن گئی ہیں اور ہر سوسائٹی کوشش کرتی ہے کہ اس کے ہم پیشہ افراد کے حقوق پامال نہ ہوں۔ اور ترقی کی دوڑ میں وہ دوسروں سے پیچھے نہ رہے۔

یہ تمام علامات ایسی ہیں جو اس زمانہ کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور اسی زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو پورا کیا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اور کوئی زمانہ ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جس میں یہ علامات پوری ہوئی ہوں۔ ہر شخص جس کے سامنے ان علامات کو رکھا جائے وہ یہی کہیگا کہ ان میں موجودہ زمانہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور کسی زمانہ کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ خطبہ پڑھا اور کہا وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ۔ پھر آپ نے فرمایا تَزَوَّجُهَا اَنْ تُؤَلِّفَ كُلَّ شِيْعَةٍ اِلٰى شِيْعَتِهِمْ (رواہ ابن ابی حاتم عن نعمان بن بشیر بحوالہ ابن کثیر) یعنی اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایک خیال یا پیشہ کے لوگ آپس میں سوسائٹیاں بنالیں گے۔ سو جیسا کہ موجودہ زمانہ کے حالات سے ظاہر ہے یہ پیشگوئی بڑی وضاحت سے پوری ہو چکی ہے۔

## ؀۵۹ حل لغات

مَوْءٗدَةٌ

مَوْءٗدَةٌ: وَاَدَ سے نکلا ہے اور وَاَدَ بِنْتَهٗ (يَئِدُهَا) وَأْدًا کے معنے ہوتے ہیں

دَفَنَهَا فِي الْقَبْرِ وَهِيَ حَيَّةٌ۔ اُس نے اپنی لڑکی کو زندہ ہی قبر میں دفن کر دیا۔ وَعِبَارَةُ الْاَسَاسِ اَثْقَلَهَا بِالتُّرَابِ اور زمخشری اپنی کتاب اساس میں لکھتے ہیں کہ اِس کے معنے اَثْقَلَهَا بِالتُّرَابِ کے ہوتے ہیں یعنی اُس پر مٹی کا بوجھ ڈالدیا۔ پھر لکھا ہے فَهِيَ وَئِيْدٌ وَوَئِيْدَةٌ وَمَوْءُوْدَةٌ یعنی مَوْءُوْدَةٌ کو وَئِيْدٌ اور وَئِيْدَةٌ بھی کہتے ہیں (اقرب)

**تفسیر** - وَاِذَا الْمَوْءُوْدَةُ سُئِلَتْ کے معنے یہ ہیں کہ زمین میں زندہ دفن کی جانے والی لڑکی کے بارہ میں سوال کیا جائے گا۔ لیکن مفسرین اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ مَوْءُوْدَہ سے سوال کیا جائے گا۔ لیکن میرے نزدیک یہ معنے قرآن کریم کے محاورہ کے لحاظ سے درست نہیں ہیں۔ مفسرین نے اسکی یہ توجیہ کی ہے کہ موؤدہ سے پوچھنے میں زجر زیادہ ہے کیونکہ اُس سے گواہی طلب کی جا رہی ہوگی لیکن میں سمجھتا ہوں یہ معنے قرآن کریم کے اسلوبِ بیان اور متعارف طریقِ عمل کے خلاف ہیں۔ قرآن کریم سے صاف پتہ لگتا ہے کہ سوال مجرم سے ہی کیا جاتا ہے نہ کہ اُس سے جس پر ظلم کیا گیا ہو چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (انبیاء ع) یعنی جو کچھ اللہ کرتا ہے اُس کے متعلق اُس سے نہ پوچھا جائے گا ہاں یہ لوگ جو کچھ عمل کرتے ہیں اُس کے متعلق اُن سے سوال کیا جائے گا۔ اسی طرح پھر فرماتا ہے لِيَسْئَلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ (احزاب ع) یعنی تا کہ اللہ تعالےٰ سچ بولنے والوں سے انکی سچائی کا سوال کرے سورۂ عنکبوت میں فرماتا ہے وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (العنکبوت ع) اور ضرور ان لوگوں سے قیامت کے دن اس کا سوال کیا جائے گا جو یہ افترا کرتے تھے۔ پھر فرماتا ہے وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ (زخرف ع) یعنی اِن لوگوں نے فرشتوں کو جو رحمٰن کے بندے ہیں لڑکی بنا دیا۔ کیا انہوں نے اُن کی پیدائش کو دیکھا ہے۔ عنقریب انکی گواہی لکھی جائے گی اور اُن سے اس کا سوال کیا جائے گا۔ اِن آیات سے ہم کو پتہ لگتا ہے کہ جہاں جہاں سوال کا ذکر آتا ہے وہاں مجرم سے ہی پوچھے جانے کا ذکر آتا ہے نہ کہ غیر مجرم سے۔ البتہ ایک مقام ایسا ہے جہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ وہاں ایک غیر مجرم سے سوال کیا گیا ہے اور وہ مقام وہ ہے جہاں حضرت مسیح ناصریؑ سے سوال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (مائدہ ع) یعنی جب اللہ تعالےٰ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لو؟ عیسیٰ کہیں گے کہ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اور تُو پاک ہے۔ مجھے یہ ہرگز سزاوار نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو بیشک تُو اُسے جانتا ہوگا کیونکہ تُو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے علم میں ہے اس لئے کہ بیشک چھپی ہوئی باتوں کا جاننے والا تُو ہی ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ نصاریٰ کہتے تھے کہ حضرت مسیحؑ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے اس لئے نصاریٰ کو جھوٹا کرنے کے لئے حضرت مسیحؑ سے اس سوال کا پوچھا جانا ضروری تھا۔ لیکن یہاں یہ بات کس طرح چسپاں ہو سکتی ہے کہ موؤدہ کہتی تھی کہ مجھے بے شک زمین میں دفن کر دو۔ اگر کفار کا دعویٰ ہوتا کہ موؤدہ نے ہمیں کہا ہے کہ مجھے زندہ گاڑ دیا جائے تو اس صورت میں بے شک اس سے سوال ہو سکتا تھا اور گاڑنے والا کہہ سکتا تھا کہ آپ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں خود اُس سے پوچھ کر دیکھ لیجئے اس نے خود کہا تھا کہ مجھے زندہ گاڑ دیا جائے۔ لیکن جبکہ موؤدہ کی نسبت ایسی کوئی بات نہیں کہی جاتی تو موؤدہ سے سوال کرنے کے بھی کوئی معنے نہیں ہو سکتے۔

۲۱۱
وَاِذَا الْمَوْءُوْدَةُ سُئِلَتْ کے معنے پہلے مفسرین کے نزدیک اور انکے معنی کی تنقیط

میرے نزدیک اس جگہ حذف ہے اور وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ درحقیقت وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ عَنْهَا ہے یعنی جبکہ موؤدہ کے بارہ میں سوال کیا جائے گا اور چونکہ موؤدہ کسی حق سے نہیں گاڑی جاتی اس لئے جب اس کے بارہ میں مجرم سے سوال کیا جائے گا تو مجرم پھنس جائے گا۔ یوں تو مومن سے بھی حساب لیا جائے گا اور کافر سے بھی حساب لیا جائے گا مگر مومن اور کافر کے حساب میں فرق یہ ہے کہ مومن سے آسان حساب لیا جائے گا جیسا کہ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا (الانشقاق) سے ظاہر ہے ایک دو سرسری باتیں پوچھکر اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔ لیکن جب کافر سے حساب لیا جائے گا تو بڑی سختی سے لیا جائیگا۔ احادیث میں بھی آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ عُذِّبَ (بخاری کتاب العلم باب من نوقش الحساب عُذِّب) یعنی جس سے سختی سے حساب لیا گیا وہ ضرور عذاب میں مبتلا ہوگا۔ درحقیقت مجرم سے جب کوئی سوال کیا جاتا ہے اور اس میں سختی سے کام لیا جاتا ہے تو اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ حساب لے کر اُسے سزا دی جائے لیکن مومن کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات سے حصہ دینا ہے اس لئے اُس کے اچھے اچھے اعمال نکال کر اس کے سامنے رکھے جائیں گے اور پوچھا جائے گا کہ بتاؤ کیا تم نے یہ کام کئے تھے اور جب وہ اقرار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل کر دے گا۔ گویا کافر کے حساب کی غرض اُسے ذلیل کرنا ہے لیکن مومن کے حساب کی غرض یہ ہوگی کہ اس کے اچھے اچھے کام لوگوں پر ظاہر کئے جائیں اور انہیں پتہ لگے کہ کہ اس نے کیسے کیسے نیک اعمال کئے ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے اُس دن موؤدہ کے بارہ میں مجرموں سے سختی سے سوال کیا جائے گا اور اُن سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ تم نے جو ان کو زندہ درگور کیا تھا تو ان کا کیا قصور تھا؟

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سے زمخشری کا یہ خیال کہ مشرکین کے بچے نجات پا جائیں گے

یہاں مفسرین نے ایک بحث کی ہے جو گو ایک ضمنی مضمون کے طور پر نکلتی ہے لیکن وہ ایک نہایت ہی اہم مضمون ہے۔ اگرچہ جہاں تک عقائد کا سوال ہے وہ مضمون غیر اہم ہے اور اس لحاظ سے بھی اس کا چنداں فائدہ نہیں کہ اگلے جہان کے متعلق اُس میں بحث کی گئی ہے جس کا اس جہان میں کوئی زیادہ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن بہرحال چونکہ وہ ایک علمی مضمون ہے اس لئے میں اُس مضمون کو اس جگہ بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ سے زمخشری نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مشرکوں کے بچے نجات پا جائیں گے۔ انہوں نے یہ استدلال اس رنگ میں کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں اس آیت میں یہ ذکر آتا ہے کہ مَوْءُودَةُ سے یا مَوْءُودَةُ کے بارے میں (ان دونوں میں سے کوئی سمجھ لو) یہ سوال کیا جائے گا بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ کہ وہ کس گناہ کے بدلہ میں ماری گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں اس آیت سے یہ پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اُسے صَاحِبَةُ الذَّنْبِ قرار نہیں دیا اگر وہ صَاحِبَةُ الذَّنْبِ ہوتی تو اس کے متعلق یہ نہ کہا جاتا کہ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ

زمخشری کے خیال کی تردید

اسی بحث میں دوسرے مفسرین بھی پڑ گئے ہیں کہ زمخشری نے اس آیت سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں یا یہ مسئلہ اپنی ذات میں غلط ہے یا درست۔ جہاں تک اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ مجرموں کے بچے بری ہیں اور وہ جنت میں جائیں گے اس میں زمخشری نے حضرت ابن عباسؓ کی اتباع کی ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ بعض لوگ کہتے ہیں مشرکین کے بچے جہنمی ہوں گے۔ آپ نے فرمایا وہ جھوٹ بولتے ہیں قرآن کریم میں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ۔ پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ کفار کے بچے جہنم میں جائیں گے وہ جھوٹ بولتا ہے۔ مگر صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ یہ اثر ضعیف ہے۔ اس میں حضرت ابن عباسؓ نے بھی اسی آیت سے استدلال کیا ہے مگر حضرت ابن عباسؓ نے وجہ استدلال نہیں بتائی صرف آیت بتاری ہے لیکن زمخشری نے وجہ استدلال بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ کو قرار دیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کفار کے بچوں کو بری قرار دیا گیا ہے۔ مگر جہاں تک زمخشری کا استدلال اس آیت سے ہے وہ بالکل غلط ہے بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکل سکتا کہ کفار کے بچے جنت میں جائیں گے۔ اس لئے کہ کسی خاص شخص کا اگر کسی خاص پہلو میں مجرم ہونا

ثابت نہ ہو تو یہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ وہ کسی لحاظ سے بھی مجرم نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور لحاظ سے مجرم اور گنہگار ہو۔ بے شک جہاں تک بچے کا سوال ہے اور جہاں تک صرف اس جرم کا تعلق ہے یہ استدلال درست ہے لیکن عام طور پر نہیں کیونکہ ایک جرم کے نہ ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ دوسرا کوئی جرم بھی نہیں ہے۔ پس میں زمخشری کے اس نتیجہ کی اختلاف کرتے ہوئے اس سلسلۂ مضامین کی بعض اور کڑیاں بیان کرتا ہوں۔ آخر میں مَیں اس بارہ میں اپنے نقطۂ نگاہ کی بھی وضاحت کر دوں گا۔

زمخشری کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ کا بھی ایک قول پیش کیا جاتا ہے مگر چونکہ انہوں نے وجہ استدلال بیان نہیں کی اس لئے ہمیں دوسری نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے زمخشری نے کہا ہے کہ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ مگر جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اس آیت سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ کیونکہ کسی ایک جرم میں کسی کا مجرم نہ ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ کسی لحاظ سے بھی مجرم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بعض اور وجوہ سے مجرم ہو لیکن ایک بات ضرور ہے جو زمخشری کے حق میں ہے اور وہ یہ کہ یہ سوال ایک بچہ کے متعلق ہے اور جب بچے کے متعلق سوال ہے تو چونکہ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ایک نابالغ بچہ کے متعلق ہے اور وہ شریعت کا مکلّف نہیں اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر اُس نے یہ گناہ نہیں کیا تو کوئی اور گناہ کیا ہوگا۔ گو عام طور پر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جب اُس نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا جو اُسے اس سزا کا مستحق بناتا تو معلوم ہوا وہ بالکل بری ہے درست نہیں۔ لیکن بہرحال جب یہ سوال ایسے بچہ کے متعلق ہوگا جو بالغ نہیں تو بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ میں مَوْءٗدَۃُ کے گناہ کا ذکر نہیں سمجھا جائے گا بلکہ اُسے مارنے والے کے گناہ کا اس میں ذکر سمجھا جائے گا کہ تو نے یہ فعل کس بناء پر کیا تھا۔

مشرکین کی اولاد کے بارہ میں علماء میں سخت اختلاف ہے کہ وہ جنتی ہے یا نہیں۔ اس بارہ میں احادیث بھی اور آثار بھی بعض لوگوں نے نقل کئے ہیں جو یہ ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے سلمۃ بن یزید الجعفی سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا اَلْوَائِدَۃُ وَالْمَوْءُوْدَۃُ فِی النَّارِ اِلَّا اَنْ تُدْرِكَ الْوَائِدَةُ الْاِسْلَامَ فَیَعْفُوَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھَا (بحوالہ روح المعانی وابن کثیر) کہ زندہ گاڑنے والی اور زندہ گاڑی ہوئی دونوں جہنمی ہیں سوائے اس کے کہ جو گاڑنے والی زندہ رہ جائے وہ اسلام کا زمانہ پالے تو اسلام قبول کرنے سے اس کو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا۔

مشرکین کے بچوں کے جنت میں جانے کے بارہ میں علماء کا اختلاف

نسائی نے بھی یہ حدیث بیان کی ہے مگر نسائی کے راوی داؤد بن ہند یہ ہیں۔ اور ابن ابی حاتم نے بھی ابن مسعودؓ سے یہ روایت کی ہے کہ اَلْوَائِدَۃُ وَالْمَوْءُوْدَۃُ فِی النَّارِ (ابن کثیر) یعنی زندہ گاڑنے والی اور زندہ گاڑی ہوئی دونوں جہنمی ہیں۔ اسی طرح ابوداؤد اور نسائی حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں۔ کہ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ اَوْلَادِ الْمُشْرِکِیْنَ. فَقَالَ: اَللّٰہُ تَعَالٰی اِذْ خَلَقَھُمْ. اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِیْنَ۔ یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مشرکین کی اولاد کے بارہ میں سوال کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب اُن کو پیدا کیا تھا تو وہ خوب جانتا تھا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔ اس سے بھی وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انکو دوزخیوں کے گھر میں پیدا کیا تھا اس لئے وہ جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔

ان معنوں کی تائید میں وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت بھی نقل کرتے ہیں جو ابوداؤد میں آتی ہے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ذَرَارِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ میں نے کہا یا رسول اللہ! مومنوں کی اولاد کے متعلق کیا فتویٰ ہے؟ فَقَالَ مَعَ اٰبَآءِھِمْ۔ آپ نے فرمایا وہ اپنے آباء کے ساتھ ہیں۔ قُلْتُ بِلَا عَمَلٍ میں نے کہا یا رسول اللہ! کیا بغیر عمل کے؟ قَالَ۔ اَللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا عَامِلِیْنَ۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ وہ کرنے والے تھے۔ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَذَرَارِیُّ الْمُشْرِکِیْنَ میں نے کہا یا رسول اللہ! مشرکین کی اولاد کے متعلق کیا حکم ہے؟

فَقَالَ مَعَ اٰبَآءِ هِمْ۔ آپ نے فرمایا وہ اپنے آباء کے ساتھ ہیں قُلْتُ بِلَا عَمَلٍ۔ میں نے کہا یا رسول اللہ کیا بغیر عمل کے؟ قَالَ۔ اَللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا عَامِلِیْنَ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اسکو بہتر جانتا ہے جو کچھ وہ کرنیوالے تھے۔ اس حدیث کو پہلی حدیث سے ملا کر وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ اولاد مشرکین نے آئندہ مشرک ہی ہونا تھا اس لئے ضروری ہے کہ انکو دوزخ میں داخل کیا جائے۔ اس کے علاوہ مسند احمد بن حنبل میں حضرت خدیجہ رض کی طرف منسوب کرکے ایک روایت آتی ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے دو بچوں کے متعلق پوچھا جو جاہلیت کے زمانہ میں فوت ہوئے تھے کہ اُن کا کیا حال ہے؟ آپ نے فرمایا هُمَا فِی النَّارِ وہ دونوں دوزخ میں ہیں۔

یہ وہ احادیث اور آثار ہیں جن سے مشرکوں کے بچوں کے دوزخ میں جانے کے متعلق استدلال کیا جاتا ہے۔ امام نووی شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں کہ تمام علماء جن کی رائے وقعت رکھتی ہے اس امر پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کے بچے جنت میں جائینگے کیونکہ وہ مکلّف نہیں لیکن بعض نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مندرجہ ذیل حدیث کی وجہ سے توقف کیا ہے۔

حدیثوں میں آتا ہے ایک انصاری بچہ ایک دفعہ مرگیا جب یہ خبر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں پہنچی تو آپ نے فرمایا طُوْبٰی لَهٗ عُصْفُوْرٌ مِّنْ عَصَافِیْرِ الْجَنَّةِ کہ کیا برکت والا انجام ہے یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی لَمْ یَعْمَلِ السُّوْٓءَ وَلَمْ یُدْرِکْهُ۔ کہ نہ کوئی برا عمل کیا اور نہ کسی برے عمل کی عمر تک پہنچا۔ قَالَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَوْ غَیْرَ ذٰلِکَ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنکر فرمایا کہ یا پھر وہ دوزخی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا یَا عَائِشَةُ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی خَلَقَ لِلْجَنَّةِ اَهْلًا خَلَقَهُمْ لَهَا وَهِیَ فِیْ اَصْلَابِ اٰبَآءِ هِمْ وَخَلَقَ لِلنَّارِ اَهْلًا خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِیْ اَصْلَابِ اٰبَآءِ هِمْ۔ یعنی اے عائشہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے مناسب حال کچھ لوگوں کو پیدا کیا ہے اور انکو اسوقت سے اس نے جنت کا اہل بنا دیا ہے جبکہ وہ ابھی اپنے باپ دادا کی پیٹھوں میں تھے

کفار و مشرکین کے بچوں کی نجات و عدم نجات کے متعلق تین مذاہب

اور کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں داخل کرنے کیلئے پیدا کیا ہے اور انکو اسوقت سے دوزخ کا مستحق قرار دیدیا ہے جبکہ وہ ابھی اپنے آباء کی پیٹھوں میں تھے۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مومنوں کی اولاد مرنے کے بعد جنت میں جاتی ہے وہ اسکا جواب یہ دیتے ہیں کہ شاید رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب ہوگا کہ بے دلیل بات سے قطعی نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے۔ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک استدلال ہے اس استدلال پر اپنے عقیدہ کی بنیاد کیوں رکھتی ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ شاید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکشاف حقیقت سے پہلے فرمایا ہو۔ جب آپ پر انکشاف حقیقت ہو گیا اور آپکو معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا کیا منشاء ہے تو آپ نے اپنے اس عقیدہ کو بدل لیا چنانچہ وہ اس انکشاف حقیقت کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ بعد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَمُوْتُ لَهٗ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْوَلَدِ لَمْ یَبْلُغُوا الْحِنْثَ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی الْجَنَّةَ بِفَضْلِ رَحْمَتِهٖ اِیَّاهُمْ۔ کہ کوئی ایسا مسلمان نہیں کہ جسکے تین بیٹے مرے ہوں اور وہ ایسی عمر کو ابھی نہ پہنچے ہوں جس میں انسان گنہگار ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحمت سے ان سب کو جنت میں داخل کردیگا۔ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی الْجَنَّةَ بِفَضْلِهٖ وَبِرَحْمَتِهٖ اِیَّاهُمْ وہ بھی اور اس کی اولاد بھی سب جنت میں چلے جائینگے۔ یہ حدیث صاف بتاتی ہے کہ مومنوں کی اولاد جنت میں جائے گی۔ جب آپ نے انصاری لڑکے کے متعلق فرمایا کہ تم کیوں کہتی ہو وہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے تو معلوم ہوتا ہے اسوقت تک ابھی آپ پر اس کے متعلق انکشاف نہیں ہوا تھا۔

باقی رہے کفار و مشرکین کے بچے۔ سو اُن کے متعلق تین مذاہب ہیں۔ اکثر کہتے ہیں کہ وہ دوزخ میں جائینگے اور اُن کا استدلال اسی حدیث سے ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا عَامِلِیْنَ۔ دوسرا گروہ اسکی نسبت خاموش ہے وہ کہتا ہے ہمیں کیا پتہ کہ کیا ہوگا۔ یہ قیامت سے تعلق رکھنے والی بات ہے اس سے ہم اس میں دخل نہیں دے سکتے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ جنتی ہیں اور وہ کئی دلیلوں سے استدلال کرتے ہیں۔ اُن میں سے زیادہ تر انحصار

اُن کا اس حدیث پر ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ بچوں کو لے کر ایک بڑے درخت کے نیچے جنت میں بیٹھے ہیں اور ان بچوں کو کھلا رہے ہیں لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ اَوَ اَوْلَادُ الْمُشْرِکِیْنَ کیا مشرکوں کی اولاد بھی اس میں شامل ہے؟ قَالَ وَاَوْلَادُ الْمُشْرِکِیْنَ۔ آپ نے فرمایا ہاں مشرکین کی اولاد بھی اس میں شامل ہے (بخاری بحوالہ روح المعانی) اسی طرح اس آیت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ وَمَا کُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل ع) یعنی جتنک بعثت رسول نہ ہو جائے عذاب نازل نہیں ہو سکتا اور چونکہ بچوں کی طرف رسول کی بعثت نہیں ہوتی کیونکہ وہ مکلف نہیں۔ بعثت رسول اُسی کی طرف ہوتی ہے جو مکلف ہو اس لئے معلوم ہُوا کہ اُن کو کوئی عذاب نہیں ہوگا۔

ان تین مذاہب کے علاوہ بعض اور مذاہب بھی ہیں۔ چنانچہ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ بچے جنت اور دوزخ کے درمیان عالمِ برزخ میں رہیں گے اور ایک یہ مذہب ہے کہ اُن کا دوبارہ امتحان ہوگا اور اس کے نتیجہ کے مطابق وہ جنت و دوزخ میں جائیں گے اور وہ امتحان اس طرح ہوگا کہ انہیں کہا جائیگا کہ جاؤ دوزخ میں چلے جاؤ۔ جو دوزخ میں جلنے پر راضی ہو جائینگے وہ مطیع ہوں گے اور جنت میں بھیج دئے جائیں گے اور جو دوزخ میں جانے سے انکار کریں گے وہ کافر قرار دئے جا کر دوزخ میں ڈال دئے جائیں گے۔ چنانچہ وہ لوگ اس حدیث سے بھی جو اُوپر گذر چکی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے متعلق فرمایا وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا عَامِلِیْنَ یہی استدلال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ان الفاظ میں ابہام سے کام لیا گیا ہے آخری نتیجہ بیان نہیں کیا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے محض یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ اگر انہیں تبلیغ پہنچتی تو وہ کیا کرتے یعنی اُس وقت انہوں نے جو جو اعمال کرنے تھے وہ خدا تعالیٰ کے علم میں ہیں اور وہ جانتا ہے کہ اُن کا انجام کیا ہوتا پس اس حدیث سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اُن کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے بلکہ حدیث اپنے الفاظ کے ذریعہ اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ انکو موقعہ ملنے پر جو کچھ انہوں نے کرنا تھا اللہ تعالیٰ اُسے جانتا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے اسی جواب کو ترجیح دی ہے۔ اس خیال کی ان احادیث سے بھی تائید ہوتی ہے کہ پاگل۔ فاتر العقل اور وہ بڈھے جن کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہتے اُنکی طرف اللہ تعالیٰ اگلے جہان میں دوبارہ نبی مبعوث کریگا۔ امام سیوطی نے بھی اسی خیال کو ترجیح دی ہے مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے ایک اور خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ بچوں کا حشر تو ہوگا لیکن بچہ چونکہ مکلف نہیں اس لئے وہ کہتے ہیں مشرکین کے بچے زندہ تو کئے جائیں گے لیکن پھر جانوروں کی طرح مٹی کر دئے جائینگے۔ اس استدلال پر وہ اِذَا الْمَوْءٗدَۃُ سُئِلَتْ والی آیت سے ہی مجبور ہوئے ہیں کیونکہ اس میں یہ ذکر آتا ہے کہ مَوْءٗدَۃ کے بارہ میں سوال کیا جائے گا اور یہ سوال اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جتنک اُسے زندہ نہ کیا جائے پس وہ اس امر کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ بچوں کو بھی دوبارہ زندہ کیا جائیگا اور اُن کے بارہ میں مجرموں سے دریافت کیا جائیگا کہ انہوں نے انکو کس قصور کی بناء پر زندہ درگور کیا تھا۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے حدیثوں میں آتا ہے کہ ایک بکری جس نے دوسری بکری کو دنیا میں سینگ مارا ہوگا قیامت کے دن انکو بھی زندہ کیا جائیگا اور جسے سینگ مارا گیا ہوگا اُسے کہا جائیگا کہ وہ دوسری کو سینگ مارے۔ پس وہ اس آیت سے یہ بات ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ بچوں کا بھی حشر ہوگا مگر وہ کہتے ہیں چونکہ بچے اپنی ذات میں جنت کے مستحق نہیں ہونگے اس لئے ان سوالات کے بعد انکو مٹی کر دیا جائیگا جیسے جانوروں کو اُن کا حق دلانے کے بعد فنا کر دیا جائیگا۔

حضرت امام احمد صاحب سرہندی نے امام سیوطی کی آخری رائے کی تائید کی ہے کہ بچے زندہ تو ہونگے مگر پھر انہیں فنا کر دیا جائیگا۔

جن لوگوں نے بچوں کو جنتی قرار دیا ہے اُن میں اس بات پر بحث ہوئی ہے کہ بچے جو جنتی ہونگے تو آخر کسی استحقاق کے ماتحت تو نہیں ہونگے کیونکہ انہوں نے کوئی عمل نہیں کیا ہوگا پھر جنت میں اُنہیں کیوں رکھا جائیگا۔ اس پر بعض کہتے ہیں کہ یہ

خدا کی دین ہے وہ جس طرح چاہے کرے اس میں کسی انسان کو دخل دینے کا کیا حق ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ جنت میں خادم کے طور پر چلے گئے اور ماں باپ اُن کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے پس وہ وہاں بطور استحقاق کے نہیں جائیں گے بلکہ کام اور خدمت کے لئے جائیں گے (اوپر کے اقوال و احادیث تفسیر روح المعانی سے نقل کی گئی ہیں)

اسی طرح مسند امام احمد بن حنبل میں ایک روایت آتی ہے جس کی آخری راویہ ایک عورت ہیں یعنی خنساء کی چچی یا پھوپھی ان سے روایت ہے کہ وہ کہتی ہیں قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَنْ فِی الْجَنَّۃِ۔ میں نے کہا یا رسول اللہ جنت میں کون کون جائیگا؟ قَالَ النَّبِیُّ فِی الْجَنَّۃِ۔ آپ نے فرمایا نبی جنت میں جائیگا۔ وَالشَّھِیْدُ فِی الْجَنَّۃِ اور شہید جنت میں جائیگا۔ وَالْمَوْلُوْدُ فِی الْجَنَّۃِ اور چھوٹا بچہ بھی جنت میں جائے گا وَالْمَوْءُ دَۃُ فِی الْجَنَّۃِ اور موؤدہ بھی جنت میں جائے گی۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے حسن سے مرسل روایت کی ہے قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَنْ فِی الْجَنَّۃِ قَالَ الْمَوْءُ دَۃُ فِی الْجَنَّۃِ آپ سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ جنت میں کون جائے گا؟ آپ نے فرمایا موؤدہ جنت میں جائے گی۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضؓ سے بھی یہ روایت کی ہے کہ اَطْفَالُ الْمُشْرِکِیْنَ فِی الْجَنَّۃِ فَمَنْ زَعَمَ اَنَّھُمْ فِی النَّارِ فَقَدْ کَذَبَ لِقَوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَاِذَا الْمَوْءُ دَۃُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ۔

یہ وہ پُرانے اقوال ہیں جو مومنوں اور مشرکوں کے بچوں کے متعلق ہمیں احادیث اور ائمہ سابقین کی کتب میں سے ملتے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ مومنوں کے بچوں کے جنت میں جانے کے متعلق قریباً تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ صرف دو حدیثیں ایسی ہیں کہ اگر وہ صحیح ہوں تو اس مسئلہ کو کسی قدر مشتبہ کر دیتی ہیں جن میں سے ایک وہ حدیث ہے جس میں حضرت خدیجہؓ کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے دو بچے جو جاہلیت میں مر گئے تھے اُن کا کیا حال ہے آپ نے فرمایا وہ دوزخ میں ہیں۔ پس یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مومنوں کے بچے بہرصورت جنت میں جائیں گے تو حضرت خدیجہؓ کے ایک سوال کے جواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں فرمایا کہ وہ دونوں بچے دوزخ میں ہیں۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق روایت آتی ہے کہ جب آپ نے ایک انصاری بچے کے متعلق فرمایا کہ اس کا انجام بڑا مبارک ہوا ہے وہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی۔ تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَوْ غَیْرَ ذٰلِکَ یا شاید وہ دوزخی ہو اور پھر یہ دلیل بھی دی کہ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَلَقَ لِلْجَنَّۃِ اَھْلًا خَلَقَھُمْ لَھَا وَھُمْ فِیْ اَصْلَابِ اٰبَآءِھِمْ وَخَلَقَ لِلنَّارِ اَھْلًا خَلَقَھُمْ لَھَا وَھُمْ فِیْ اَصْلَابِ اٰبَآءِھِمْ۔ جب تک ان دونوں حوالوں کو ہم حل نہ کر لیں اُس وقت تک کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔

اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کہ بعض لوگ جنت کے لئے پیدا کر دئے گئے ہیں اور بعض لوگ دوزخ کے لئے۔ درست ہے، تو ہم ایک مومن کے بچے کے متعلق بھی یہ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ جنتی ہے یا دوزخی۔ اور اس طرح سارا استدلال باطل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں محدثین نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ یہ پہلے کی بات ہوگی۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ابھی انکشاف حقیقت نہیں ہوا تھا جب انکشاف ہو گیا تو آپ نے اپنے عقیدہ کو بدل دیا۔ مگر اس میں ایک اور مشکل یہ پیش آ جاتی ہے کہ حدیثوں میں ہی ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ بچوں کو لے کر ایک جگہ جنت میں بیٹھے ہیں اور آپ نے فرمایا کہ ان بچوں میں مشرکین کے بچے بھی تھے۔ یہ واقعہ معراج سے تعلق رکھتا ہے اور معراج کی حدیث ۵ سنہ بعد دعویٰ نبوت کی ہے گویا ہجرت سے آٹھ سال پہلے یہ انکشاف آپ پر ہو چکا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شادی ہجرت سے ایک سال بعد ہوئی ہے اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نو سال قبل اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر یہ انکشاف ہو چکا تھا اور

جب اس کی طرف سے انکشاف ہو چکا تھا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح ایسی بات کہہ سکتے تھے جو اس انکشاف کے خلاف ہوتی پس یہ جواب بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

بہرحال جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہ ہمیں ایک دوسری سے ٹکراتی ہوئی ملتی ہیں اور جب وہ ایک دوسری سے ٹکراتی ہوئی نظر آتی ہیں تو ہمیں قرآن شریف کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور غور کرنا چاہیئے کہ اس بارہ میں وہ کیا تعلیم پیش کرتا ہے کیونکہ قرآن شریف وہ کلام ہے جو خدا تعالیٰ نے نازل کیا اور جسے بغیر کسی خطرہ کے ہم قبول کرنے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ بے شک حدیثوں میں سے بعض ایسی ہیں جو صحاح میں آئی ہیں اور وہ بڑے پایہ کی ہیں مگر بہرحال حدیثوں میں یا تو خلط ہو گیا ہے اور یا پھر وضاعین نے وضع کی ہیں اس لئے ہم اس مسئلہ کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے قرآن شریف کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (آل عمران ع ۱۹) کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ اور جب وہ ظلم نہیں کرتا تو یہ کس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ بچوں کو بغیر قصور کے دوزخ میں داخل کر دے گا۔ وہ شخص جس نے کوئی فعل کیا ہی نہیں اور جو مکلف ہی نہیں ہوا اس کو سزا دینا تو قطعی طور پر ظلم ہے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا کہ ہم بغیر بعثتِ رسول کے لوگوں کو عذاب نہیں دیا کرتے محدثین نے بھی اس آیت سے استدلال کر کے بچوں کو بری قرار دیا ہے۔ پس ایک طرف اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ہم اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتے اور دوسری طرف یہ فرمانا کہ جب تک ہم رسول بھیج کر لوگوں پر اپنی حجت تمام نہ کر لیں ان کو اپنے عذاب میں مبتلا نہیں کرتے بتلا رہا ہے کہ بچے عذاب کے مورد نہیں ہو سکتے کیونکہ نہ انہوں نے کوئی جرم کیا اور نہ ان کی طرف بعثتِ رسول ہوئی۔ اسی طرح فرماتا ہے وَلَوْ اَنَّا اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَا اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى (طٰهٰ ع ۸) یعنی اگر ہم قرآن اتارنے سے پہلے کسی عذاب سے ان لوگوں کو ہلاک کر دیتے۔ تو بے شک یہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے ہم تیرے حکم پر چلتے۔ اسی مضمون کو ایک اور جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (المائدہ ع ۳) یعنی اے اہل کتاب جب رسولوں کے آنے میں مدتوں تک ناغہ رہا تو ہمارا رسول تمہارے پاس آیا۔ جو احکام الٰہی تم سے صاف صاف بیان کرتا ہے اور ہم نے یہ رسول اس غرض سے بھیجا کہ مبادا کل کو کہیں تم کہنے لگو کہ ہمارے پاس نہ تو کوئی نجات کی خوشخبری سنانیوالا اور نہ عذاب الٰہی سے ڈرانے والا آیا تو اب تو تم کو اس عذر کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ کیونکہ تمہارے پاس خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا آچکا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حجتِ صحیحہ اس بات کو قرار دیتا ہے کہ کسی نبی کی پہلے بعثت ہو اور پھر لوگ یا اس کی تکذیب کریں اور یا اس پر ایمان لائیں۔ کیونکہ فرماتا ہے ہم نے اسی لئے تمہاری طرف نبی بھیجے ہیں تا کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ دو کہ ہماری طرف کوئی رسول نہیں آیا تھا۔ گویا باوجود اس کے کہ ان میں عقل موجود تھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اگر ہم تمہاری طرف نبی نہ بھیجتے تو ہم تم کو بری سمجھتے۔ جب بڑی عمر کے آدمی بھی نبی کی بعثت کے بغیر بری سمجھے جا سکتے ہیں تو ان بچوں کو جو نبی کی حقیقت سمجھنے کے قابل ہی نہیں اور جو احکامِ شریعت کے مکلف ہی نہیں ان کو ملزم قرار دینا اور کہنا کہ وہ دوزخ میں جائیں گے یقیناً قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم نے یہ اصول رکھا ہے کہ جس شخص میں عقل موجود ہے مگر نبی اس کی طرف نہیں آیا وہ بھی مجرم نہیں۔ پھر جس میں عقل و فہم کا مادہ بھی نہ ہو وہ کس طرح مجرم قرار دیا جا سکتا ہے؟ بہرحال

قرآن ان معنوں کو ردّ کرتا ہے۔ جب اللہ تعالےٰ عقلمندوں کو بھی نبی کی بعثت کے بغیر قابلِ سرزنش قرار نہیں دیتا تو جن پر رسول کی موجودگی میں بھی حجت نہیں ہوسکتی تھی انکو کس طرح عذاب مل سکتا ہے۔ پس قرآن کریم کی آیات سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ عقیدہ بالکل غلط ہے کہ بچے دوزخ میں جائیں گے۔ اب رہا یہ سوال کہ اگر بچے مکلّف نہیں ہیں تو پھر مومنوں اور کفار کے بچوں کا کیا حال ہوگا؟ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ جہاں تک مومنوں کے بچوں کا سوال ہے حدیثِ معراج اس کی تائید میں ہے کہ وہ جنت میں جائینگے اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ حدیثِ معراج بڑے پایہ کی ہے اور بڑے تواتر سے آتی ہے اور مختلف اسناد سے آتی ہے اور گو اس میں بعض مقامات پر اضطراب بھی پایا جاتا ہے لیکن اصولی طور پر حدیثِ معراج کیطرف محدثین کی بڑی نظر پڑتی ہے۔ پس حدیثِ معراج اس بات کی دلیل ہے کہ مومنوں کے بچے جنت میں رکھے جائینگے۔ دوسرے عقلی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ مومن کی تسلّی اور اُس کی خوشی کے لئے جنت میں اُس کے بچوں کا ہونا نہایت ضروری ہے اللہ تعالیٰ جنتیوں کے متعلق فرماتا ہے لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ (النحل ع۴) وُہ اُس میں جو کچھ چاہیں گے اُن کو مل جائے گا اور جب یہ صورت ہے تو ایک ماں تو سب سے پہلے یہ خواہش کرے گی کہ میرا بچہ مجھے واپس دے دو۔ ہم نے دیکھا ہے جب کوئی عورت مرنے لگتی ہے تو وہ اُس وقت کہتی ہے کہ میرا بچہ جو مر چکا ہے مَیں اب اُس سے جا کر ملونگی۔ پس عقل بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ عورتوں کی تسلّی اور انکے اطمینان کے لئے اُن کے بچے انہیں ملنے چاہئیں چاہے وہ کسی صورت میں ملیں۔ یہ بحث نہیں وہ خواہ خدم کے طور پر ملیں یا کھلونے کے طور پر، بہرحال ملنے چاہئیں سوائے اس کے جو دوزخی ہو اور خدا اور اُس کے رسول کا مخالف ہو کیونکہ ایسے لڑکے سے مومن اپنے تعلق کو کاٹ دیگا اور اُس کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ وہ اُس سے ملے۔ بہرحال اگر کوئی لڑکا بالغ ہے اور پھر کافر اور مشرک ہے تب تو کوئی اعتراض نہیں اللہ تعالےٰ اُسے جہاں چاہے رکھے ایک مومن کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا اور نہ اُسے کوئی دُکھ ہوسکتا ہے کیونکہ اس کی محبت وہ اپنے دل سے نکال دیتا ہے لیکن جو بچہ بالغ نہیں جو معصومیت کی حالت میں فوت ہوا ہے عقل اور فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اُسے اپنے ماں باپ کے پاس جنّت میں رکھا جائے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جنت اسی صورت میں جنت ہوسکتی ہے جب ماں کے پاس اس کے بچے موجود ہوں۔ اس عقلی تائید کی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حدیثِ معراج عین فطرت کے مطابق ہے۔ باقی رہے کفار و مشرکین کے بچے سو گو بعض حدیثیں اس بات کی تائید میں ہیں کہ وہ دوزخ میں جائیں گے لیکن بعض ایسی بھی حدیثیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے جیسا کہ حدیثِ معراج میں ہی اولاد المشرکین کا بھی ذکر آتا ہے مگر یہ مسئلہ ایسا اہم نہیں۔ جہاں تک مومن کی اولاد کا مسئلہ ہے بیشک وہ اہم ہے لیکن جہاں تک مشرکوں کی اولاد کا مسئلہ ہے وہ اپنے اندر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر یہ فیصلہ ہو کہ اولادِ مشرکین کے جنت میں جانیوالی حدیثیں بھی صحیح ہیں اور دوزخ میں جانیوالی حدیثیں بھی صحیح ہیں تو رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف ع۱۹) کے مطابق ہم اُن کے جنت میں جانیوالی حدیثوں کو ترجیح دیدیں گے کیونکہ قرآن نے یہ اصول بتا دیا ہے کہ جب دو چیزیں ٹکرا جائیں تو جس میں رحمت کا پہلو زیادہ ہو وہ لے لو۔ کیونکہ خدا کی رحمت اُس کے غضب پر غالب ہوتی ہے پس اگر دونوں حدیثیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوں اور ہم کوئی فیصلہ نہ کرسکیں کہ ان میں سے کس کو ترجیح دی جائے تو وراثت یہی کہے گی کہ رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ کے اصول کے مطابق جنت میں جانیوالی حدیثوں کو ترجیح دے دو۔ لیکن اگر یہ نہ ہو تو میرے نزدیک اس بات کو مدنظر رکھکر کہ دوزخی جب جنت میں جائیگا تو اس کا وہ مقام نہیں ہوسکتا جو براہِ راست جنت میں جانے والے کا ہوسکتا ہے یہ ممکن ہے کہ شروع سے جنتی اور بعد میں جنت میں جانیوالے میں یہ ایک امتیاز ہو کہ شروع سے جنتی کی صغیر اولاد بھی اُس کے پاس رکھی جائے

خواہ ایک تابع کی شکل میں۔ اور بعد میں آنے والے کی صغیر اولاد فنا کر دی جائے کیونکہ وہ اپنی ذات میں مستحق نہیں اور بالواسطہ استحقاق کا فائدہ اُسے پہنچا نہیں۔

اگر اس حدیث کو اصل قرار دے لو جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بچوں کی طرف دوبارہ نبی مبعوث ہوگا (دیکھو مسند احمد بن حنبل بروایت ابوہریرہ بحوالہ روح المعانی جلد ۵ زیر آیت مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا) تو پھر یہ بحث ہی فضول ہے کیونکہ اس کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں نہ مومنوں کے بچوں کا سوال رہتا ہے اور نہ کافروں کے بچوں کا سوال رہتا ہے۔ پھر حدیث معراج کے یہ معنے ہونگے کہ یوم البعث تک تو تمام بچے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس رہیں گے اور وہ جنت کا کھلونا بنے رہیں گے پھر انکی طرف نبی مبعوث کیا جائیگا اور وہ اس پر ایمان لاکر یا اس کی تکذیب کرکے جنت یا دوزخ میں چلے جائیں گے۔ لیکن اگر اس حدیث کے کوئی دوسرے معنے کئے جائیں جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ فطرتی ایمان پر وہاں فیصلہ کر دیا جائیگا تو پھر اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ دوزخی نے تو بہرحال دوزخ میں جانا ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ اسکی صغیر اولاد کو بطور رحم مٹا دیا جائیگا تو اس میں کوئی ظلم نہیں۔ مومنوں کے بچوں کا انکی دلجوئی کیلئے کسی شکل میں جنت میں جانا عین رحم ہے لیکن کافر چونکہ اپنے دل کا چین دوزخ میں پہلے ہی کھو چکا ہوگا اس لئے اسکی صغیر اولاد کو مٹا دیا جائے گا اور یہ اُس پر رحم ہوگا ظلم نہ ہوگا گویا مومنوں کی صغیر اولاد تو اپنے ماں باپ کے ساتھ جنت میں رکھی جائیگی لیکن کفار کی صغیر اولاد جانوروں کی طرح مٹی کر دی جائیگی ان معنوں کو تسلیم کرنے کی صورت میں دونوں اقوال میں تطبیق ہو جاتی ہے اور حضرت امام احمد صاحب سرہندی کی رائے سب سے زیادہ صحیح اور درست معلوم ہوتی ہے۔

باقی رہا یہ کہ وہ جنت میں کس حیثیت سے رہیں گے؟ یہ صرف ایک علمی سوال ہے۔ ورنہ جس طرح خدا چاہے رکھے اس میں ہمارا کیا دخل ہو سکتا ہے مگر مجھے قرآن کریم کی دعاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ نعماء جنت سے پوری طرح متمتع ہونیوالے وجود صرف بالغ ہی ہوں گے دوسرے صرف دلجمعی کیلئے جنتیوں کے پاس رکھے جائیں گے پہلے میں سمجھتا تھا کہ جس طرح ماں باپ جنت میں جائیں گے اسی طرح بچے جنت میں رکھے جائینگے مگر اب مجھے قرآن پر غور کرنیسے معلوم ہوا ہے کہ گو چھوٹے بچے بھی جنت میں رکھے جائینگے مگر انکی حیثیت میں کسی قدر فرق ہوگا۔ ان دو آیتوں میں سے جن سے مومنوں کے بچوں کے جنت میں مختلف حیثیت میں جانے کا پتہ ملتا ہے پہلی یہ ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (طور ع ۱) یعنی جو لوگ ایمان لے آئے اور اُن کی اولاد ایمان میں اُن کی تابع ہو چکی ہے انکی اولاد کو بھی ہم اُن سے ملا دیں گے اور اُن کے عمل سے ہم کچھ کم نہ کریں گے اسی طرح فرماتا ہے جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ (رعد ع ۳) یعنی ہمیشگی کے باغات ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے اور اُن کے باپ دادا میں سے جنھوں نے اعمال صالحہ کئے تھے وہ بھی ان باغات میں داخل ہوں گے اور انکی بیبیاں اور انکی اولاد جو نیک ہوں گے وہ بھی وہاں ہوں گے۔ اسی طرح ملائکہ کی دعا ہے رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ࣙالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ (مومن ع ۱) یعنی اے ہمارے رب انہیں ہمیشہ رہنے کے باغوں میں داخل کر جن کے دینے کا تُو نے وعدہ کیا ہے اور اُن کے باپ دادا اور اُن کی بیویوں اور اولاد میں سے جو نیک ہوں اُن کو بھی جنت میں داخل فرما۔ ان ساری جگہوں میں مَنْ صَلَحَ یا بِاِيْمَانٍ وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بچوں اور دوسروں کا جنت میں جانا اپنے اندر کچھ فرق ضرور رکھتا ہے چونکہ اُن کی ارواح کو پورا ارتقاء حاصل نہیں ہوگا اس لئے انکا جنت میں جانا بطور استحقاق نہیں ہوگا بلکہ اپنے ماں باپ کی خوشی

قیامت کو بچوں کیطرف نبی کی بعثت

مومنوں کے چھوٹے فوت شدہ بچوں کا جنت میں مقام

کے لئے ہوگا اس لئے مفسرین کا ذہن اس طرف گیا ہے کہ اُن
بچوں کو وہاں خدم کے طور پر رکھا جائے گا لیکن میں ان کا نام
خدم نہیں رکھتا بلکہ کھلونا رکھتا ہوں میرے نزدیک اُنکی ارواح
ایسی ترقی یافتہ نہیں ہوں گی کہ وہ جنت کی لذتوں سے پوری طرح
متمتع ہوسکیں۔ دوسرے جنتیوں کے متعلق تو آتا ہے کہ ملائکہ
جنت کے ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے اور کہیں گے
سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ
(الرعد ع۳) کہ تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے میں جو دنیا میں
تم صبر کرتے رہے ہو یہ سب انعام اُسی کا صلہ ہے۔ پس دیکھو
دار آخرت کا بدلہ کیسا اچھا ہے۔ مگر ملائکہ کا یہ سلام انہی لوگوں
کو ہوسکتا ہے جو مَنْ اٰمَنَ میں داخل ہوں یا مَنْ صَلَحَ
میں داخل ہوں۔ پس چونکہ ان آیات میں وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ
بِإِيمَانٍ اور مَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَ
ذُرِّيَّاتِهِمْ وغیرہ الفاظ آتے ہیں۔ اور چھوٹے بچے نہ ایمان
لاتے ہیں نہ اعلیٰ درجہ کی صلاحیتیں اُن میں ہوتی ہیں اس لئے بچوں
جنت میں وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا جو دوسروں کو حاصل
ہوگا۔ پس جو بالغ ہوں گے یا بڑی عمر کے ہوں گے وہ تو جنت
میں استحقاق کے طور پر جائیں گے مگر جو بچے چھوٹی عمر میں فوت
ہوچکے ہوں گے وہ اگر بغیر کسی مزید امتحان کے جنت میں گئے

مسئلہ عزل کے متعلق بعض احادیث

تو صرف اپنے ماں باپ کا دل خوش کرنے کے لئے وہاں رکھے
جائیں گے اور ان کی دلجمعی کا سامان ہوں گے خواہ کسی شکل اور
کسی درجہ روحانیت میں اُن کو داخل کیا جائے یہ ایک الٰہی راز
ہے اس میں پڑنے کی ہم کو ضرورت نہیں۔ پہلے میرا ذہن اِدھر
نہیں جاتا تھا اور میں حیران ہوتا تھا کہ وہاں بچوں کو خدم کے
طور پر کیوں رکھا جائے گا مگر ان آیات پر غور کرنے سے مجھے
معلوم ہوا کہ خواہ ان کا نام خدم رکھ لو۔ خواہ کھلونا کہہ لو
بہرحال چونکہ پورے طور پر اُن کی ارواح کا ارتقاء نہیں ہوا ہوگا
اس لئے گو وہ مومنوں کے ساتھ ہی رکھے جائیں گے مگر اُن کی
کیفیت جداگانہ ہوگی۔

اس جگہ ایک اور بات یاد رکھنے والی ہے کہ ضمنی طور پر
یہاں سے ایک اور مسئلہ کا بھی استنباط ہوتا ہے۔
رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص مسلمان
ہوجائے اس کے کفر کے سارے گناہ مٹ جاتے ہیں یہ ایک
عام مشہور مسئلہ ہے اور احادیث سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے مگر
اس مسئلہ میں کچھ ترمیم کی ضرورت ہے خواہ وہ ترمیم اصلاحی نہ ہو
بلکہ تکمیل کی ہو۔ حدیثوں میں آتا ہے عبدالرزاق نے نعمان بن البشیر
سے اور انہوں نے عمر ابن الخطاب سے نقل کیا ہے کہ قیس ابن عاصم
رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے
کہا یا رسول اللہ میں نے کچھ لڑکیاں جاہلیت میں زندہ دفن کی
ہیں آپ نے فرمایا ہر موؤدہ کے بدلہ میں ایک غلام آزاد کردو۔
اُس نے کہا یا رسول اللہ اِنِّي صَاحِبُ اِبِلٍ۔ میں تو
صاحب الابل ہوں غلام کہاں سے لاؤں اُونٹوں کے متعلق
فرمائیں تو اُن کو نحر کرنے کے لئے تیار ہوں آپ نے فرمایا
فَانْحَرْ عَنْ كُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُنَّ بُدْنَةً (ابن کثیر)
کہ ہر ایک کے بدلہ میں ایک اونٹ قربان کردو۔ اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ ایسے گناہ جو انسان کی فطرت پر بھاری ہوں باوجود
اُن کی بخشش کے اور باوجود اسلام نصیب ہوجانے اور توبہ
قبول ہوجانے کے پھر بھی اگر انسان کفارہ ادا کرتا رہے تو
تکمیل روحانیت کے لئے یہ بات بہت مفید ہوتی ہے۔

اس جگہ ایک اور حدیث بھی نقل کی جاتی ہے جس پر
روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ امام احمد روایت کرتے ہیں کہ
جذامہ بنت وہب اخت عکاشہ نے بیان کیا قَالَتْ حَضَرْتُ
رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ نَاسٍ وَهُوَ
يَقُوْلُ لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اَنْهٰى عَنِ الْغِيْلَةِ۔ کہ
میں ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر
ہوئی کچھ اور لوگ بھی ساتھ تھے آپ اُس وقت فرمارہے تھے
کہ میں نے ارادہ کیا تھا کہ لوگوں سے کہہ دوں کہ جب عورت بچے
کو دودھ پلا رہی ہو تو مرد اُس سے صحبت نہ کیا کرے فَنَظَرْتُ
فِي الرُّوْمِ وَفَارِسَ فَاِذَا هُمْ يُغِيْلُوْنَ اَوْلَادَهُمْ
وَلَا يَضُرُّ اَوْلَادَهُمْ ذٰلِكَ شَيْئًا۔ لیکن پھر میں نے

روم اور فارس کو دیکھا کہ وہاں کے رہنے والے برابر یہ کام کرتے ہیں مگر ان کے بچوں کو کوئی نقصان نہیں ہوتا اس لئے میں نے اس ممانعت کا خیال ترک کر دیا ثُمَّ سَأَلُوْهُ عَنِ الْعَزْلِ۔ پھر انہوں نے آپ سے عزل کے متعلق پوچھا کہ اس بارہ میں آپ کا کیا حکم ہے فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَالِکَ الْوَاْدُ الْخَفِیُّ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ بھی ایک وأد خفی ہے۔ یہ روایت مسلم نے سعید بن ابی ایوب سے اور مالک بن انس سے بھی نقل کی ہے اور ابو داؤد اور الترمذی اور النسائی نے یہ روایت ابی الاسود سے روایت کی ہے۔ اس روایت سے بعض لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب عزل بھی وأد خفی ہے تو یہ فعل بھی کسی سزا کا مستحق ہونا چاہیئے لیکن یہ بات روایت سے درست معلوم نہیں ہوتی۔ اوّل تو اگر عزل منع ہے اس وجہ سے کہ عزل وأد خفی ہے تو پھر حاملہ سے جماع بھی منع ہونا چاہیئے مگر حمل کے ایام میں جماع کی حرمت کہیں سے ثابت نہیں حالانکہ وہ وأد قطعی اور یقینی ہے۔ دوسرے عزل کے جائز ہونے کے متعلق بھی احادیث آتی ہیں مثلاً ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے عزل کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا بے شک کرو جس متنفس کو خدا نے پیدا کرنا ہے وہ تو اُسے بہرحال پیدا کر کے رہے گا (بخاری کتاب القدر باب کان امر اللہ قدراً مقدوراً) پس چونکہ عزل کا جواز بعض دوسری احادیث سے ثابت ہے اس لئے گو یہ حدیث بڑے بلند پایہ کی ہے مگر میرے نزدیک اس کے یہی معنے ہیں کہ بلا ضرورت ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔ اگر کوئی شخص بلا ضرورت ایسا کرتا ہے تو وہ وأد خفی سے کام لیتا ہے یعنی وہ شخص جس کی عزل سے غرض نسل انسانی کا انقطاع ہو وہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک مجرم اور گنہگار ہے ورنہ اور کئی صورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن میں عزل ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کی بیوی بیمار ہے۔ وہ دوسری شادی کی توفیق نہیں رکھتا لیکن خود اُس میں خدا نے قوائے شہوانیہ پیدا کئے ہیں۔ دوسری طرف ڈاکٹر کہتا ہے کہ اگر عورت کو حمل ہو گیا تو اس کی جان کا خطرہ ہو گا ایسی حالت میں نہ صرف عزل جائز ہو گا بلکہ اگر حمل ہو جائے تو اُس کا نکلوا دینا بھی جائز ہو گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے میں نے خود سنا ہے کہ ایسی حالت میں اگر کوئی عورت حمل نہیں نکلواتی اور وہ مر جاتی ہے تو ہمارے نزدیک وہ خودکشی کرنیوالی ہے۔ آپ نے فرمایا ایسی حالت میں ضروری ہے کہ بچہ کو نکلوا دیا جائے۔ کیونکہ بچہ کے متعلق تو ہمیں کچھ علم نہیں کہ اُس نے کیسا بننا ہے مگر ایک زندہ وجود ہمارے سامنے ہوتا ہے اور اُس کی جان کی حفاظت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ اس کو بچایا جائے اور اس کے بچہ کو تلف ہونے دیا جائے لیکن اگر کوئی خشیۃ املاق کی وجہ سے عزل کرتا یا حمل کو نکلواتا ہے تو وہ ایک ناجائز فعل کا ارتکاب کرتا ہے۔ بہرحال عزل کے جواز یا عدم جواز کا فتوےٰ عورت کے حالات کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اگر ضرورت کے موقع پر ایسا کیا جاتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اگر بلا ضرورت کیا جاتا ہے تو ناپسندیدہ ہے اور اگر نسل انسانی کے انقطاع کے لئے ایسا کیا جاتا ہے تو حرام ہے۔ مثلاً یورپ والے صرف نسل انسانی کے انقطاع کے لئے ایسا کرتے ہیں اور چونکہ اس کے نتیجہ میں قوم تباہ ہوتی ہے اس لئے یہ فعل یقیناً ناجائز اور حرام ہو گا۔ اور اگر کوئی بلا ضرورت کرتا ہے تو وہ ایک مکروہ کام کرتا ہے اور اگر ضرورت حقہ پر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ ایک جائز کام کرتا ہے۔ بہرحال اس مسئلہ کے تینوں پہلو ہیں۔ جب عزل کو قومی تباہی کا موجب بنا دیا جائے تو یہ حرام ہو جاتا ہے۔ جب عزل قومی تباہی کا موجب نہ ہو لیکن اس کی کوئی ضرورت بھی نہ ہو تو یہ مکروہ ہوتا ہے۔ اور جب کسی عورت کی جان بچانے کے لئے یا کسی ایسی ہی ضرورت کے لئے جسے شریعت جائز قرار دیتی ہو ایسا کیا جائے تو یہ جائز ہوتا ہے۔ پس ہر عزل وأد الخفی کے ماتحت نہیں آ سکتا۔ وہی عزل اس جرم کا مرتکب بناتا ہے جو قومی تباہی کا موجب بن جائے جیسے فرانس وغیرہ ممالک میں اس کا رواج ہو رہا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ وہاں کی آبادی خطرناک طور پر کم ہو گئی ہے اور وہ قوم دوسروں کے مقابلہ میں بالکل مقہور اور ذلیل ہو گئی ہے اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

۲۴۱ مسئلہ عزل اور اُسکا جواز و عدم جواز

# وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝

اور جب کتابیں پھیلا دی جائیں گی ۝۱۰

نے فرمایا ہے تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ (لسانی جلد دوم کتاب النکاح) کہ جو عورتیں کثرت سے بچے جننے والی ہوں اُن سے شادیاں کیا کرو کیونکہ اس طرح قوم کی ترقی ہوتی ہے وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ کو اگر قیامت پر چسپاں کیا جائے تو سُئِلَتْ کے دونوں معنے ہوسکتے ہیں (۱) وائدسے پوچھا جائے گا (۲) یا موءُدہ کو دوبارہ زندہ کرکے پوچھا جائے گا خواہ بعد میں وحوش کی طرح اُسے فنا کر دیا جائے مگر بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وائد سے پوچھا جائے گا۔

وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ سے مراد اخبارات اور رسالوں کی اشاعت

وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ کی پیشگوئی کا ظہور

جس طرح اس سورۃ کی اور تمام پیشگوئیاں موجودہ زمانہ میں پوری ہو چکی ہیں اسی طرح اِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ کی پیشگوئی بھی پوری ہو چکی ہے۔ کیونکہ اس میں بتایا گیا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جبکہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی قانوناً ممانعت کر دی جائے گی اور اگر کوئی ایسا کرے گا تو اُسے سزا دی دی جائے گی۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں ایسا قانون حکومت انگریزی نے جاری کر دیا اور اس طرح یہ علامت بھی جو آخری زمانہ سے تعلق رکھتی تھی پوری ہو گئی۔

نُشِّرَتْ

**۱۰۔ حل لغات۔** نُشِرَتْ: نَشَرَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے اور نَشَرَ الْخَبَرَ (نَشْرًا) کے معنے ہیں اَذَاعَهٗ۔ اُس کو پھیلا دیا۔ اور نَشَرَ الثَّوْبَ وَالْكِتَابَ کے معنے ہیں بَسَطَهٗ۔ خِلَافُ طَوَاهُ۔ اُس نے کپڑے اور کتاب کو کھولا۔ اور نَشَرَ اللّٰهُ الْمَوْتٰى کے معنے ہوتے ہیں اَحْيَاهُمْ۔ اللہ نے مُردوں کو زندہ کیا اور نَشَرَ الْمَوْتٰى کے معنے ہیں حَيُوْا۔ مردے زندہ ہوگئے اس لحاظ سے یہ لازم بھی ہے اور متعدی بھی (اقرب) پس وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ کے معنے ہوں گے جبکہ صحیفے پھیلائے جائیں گے یا جبکہ وہ کھولے جائیں گے یا جبکہ مردہ صحیفے پھر زندہ کئے جائیں گے۔

**تفسیر۔** یہ تینوں معنے اس زمانہ میں بڑی شان کے ساتھ پورے ہو رہے ہیں وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ کے پہلے معنے یہ تھے کہ صحیفے پھیلائے جائیں گے یہ پیشگوئی اس طرح پوری ہوئی کہ کتابوں اور اخبارات کی اشاعت کیلئے مطابع نکل آئے ہیں۔ پھر ریل گاڑیاں ایجاد ہو چکی ہیں جن سے شائع شدہ اخباریں اور کتابیں سارے جہان میں پھیل جاتی ہیں دنیا میں پچاس پچاس لاکھ روزانہ چھپنے والے اخبارات موجود ہیں۔ اسی طرح کتابیں چھپتی ہیں تو دس دس بیس بیس لاکھ نسخہ ایک ایک کتاب کا نکل جاتا ہے۔ یہی خبر اس آیت میں دی گئی تھی کہ صحیفے دنیا میں پھیلا دئے جائیں گے۔

دوسرے معنے اس کے یہ تھے کہ صحیفے کھولے جائیں گے یہ پیشگوئی بھی پوری ہو چکی ہے کیونکہ کتابوں کے پڑھنے کا رواج موجودہ زمانہ میں بہت بڑھ گیا ہے۔ پھر بڑی بڑی لائبریریاں کھل گئی ہیں جہاں لوگ آتے اور کتابیں وغیرہ پڑھتے رہتے ہیں اور جو لوگ لائبریریوں کے ممبر ہوتے ہیں وہ اپنے گھر پر بھی اُن کتابوں کو پڑھنے کیلئے لے جاتے ہیں۔ غرض کتابیں بجائے بند رہنے کے کھل گئی ہیں اور علم کا چرچا دنیا میں چاروں طرف ہو گیا ہے۔ پھر یہ پیشگوئی اس رنگ میں بھی پوری ہوئی ہے کہ بڑی بڑی پُرانی لائبریریاں آثار قدیمہ والوں نے نکال کر رکھ دی ہیں بخت نصر کی لائبریری جو اینٹوں پر لکھی ہوئی تھی وہ سب کی سب نکال لی گئی ہے۔ اور اس طرح مُردہ صحیفوں کو بھی زندہ کر دیا گیا ہے۔ گویا وہ کتابیں جن کو لوگ بھول چکے تھے اور جو عملی طور پر بالکل متروک ہو چکی تھیں آثار قدیمہ والے انکو بھی کھود کھود کر نکال رہے ہیں اور لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اسی طرح مصر میں فرعون موسیٰ سے پہلے کے آثار نکال کر انکو پڑھا جا رہا ہے مصریوں کی پُرانی زبان جو ہیلو گرافی کہلاتی تھی بالکل مٹ گئی تھی۔ مگر

# وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝۱۲

اور جب آسمان کی کھال اُتاری جائے گی ۱۱؎

آثارِ قدیمہ والوں نے اپنی عمریں صرف کرکے آخر اس زبان کا پتہ لگالیا۔ چنانچہ وہ اُن آثار کو پڑھ کر یہ بتادیتے ہیں کہ موسیٰؑ سے دو ہزار سال پہلے یہ ہُوا اور تین ہزار سال پہلے یہ ہُوا۔ غرض مُردہ صحیفے اس زمانہ میں زندہ کئے جارہے ہیں اور اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ کی پیشگوئی بڑی صفائی سے پوری ہورہی ہے۔

**۱۱؎ حل لغات** ۔ کُشِطَتْ: کَشَطَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے اور کَشَطَ کے معنے ہوتے ہیں دَفَعَ شَیْئًا عَنْ شَیْءٍ قَدْ غَشَّاهُ وَنَحَّاهُ۔ کسی چیز کو دوسری چیز پر سے اٹھانا جس نے اسکو ڈھانکا ہُوا ہو۔ کَشَطَ الْجُلَّ عَنِ الْفَرَسِ وَالْغِطَاءَ عَنِ الشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں قَلَعَهٗ وَنَزَعَهٗ وَكَشَفَهٗ عَنْهُ۔ یعنی جھول کو گھوڑے پر سے یا کسی اور چیز سے اُتارا یا کسی چیز کو اُکھیڑ دیا اور کَشَطَ الْبَعِیْرَ کے معنے ہوتے ہیں نَزَعَ جِلْدَهٗ۔ اُسکی جلد کو کھینچکر اُتارا (اقرب) چنانچہ عربی زبان میں سَلْخُ الْبَعِیْرِ نہیں کہتے بلکہ کہتے ہیں کَشْطُ الْبَعِیْرِ یعنی سَلَخَ کا لفظ بکری کے متعلق استعمال ہوتا ہے اُونٹ کے متعلق استعمال نہیں ہوتا۔ پس وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ کے معنے ہوں گے جب آسمان کی کھال کھینچی جائے گی (۲) آسمان کا پردہ اُتارا جائیگا۔

**تفسیر** ۔ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ میں آسمان سے مراد چونکہ آسمانی علوم بھی لئے جاسکتے ہیں اس لئے اس آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ آسمانی علوم پر سے پردے اُٹھا دئے جائیں گے یعنی اُس وقت آسمانی علوم دب گئے ہوں گے اور ان پر پردے پڑ چکے ہوں گے تب اللہ تعالیٰ ایک ایسے آدمی کو مبعوث کرے گا جو آسمانی علوم کو کھول کر رکھ دے گا اور قرآن کریم کے وہ اسرار جو چُھپے ہوئے تھے یا احادیث کے وہ علوم جو مخفی چلے آتے تھے اُن سب کو ظاہر کردیگا۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ آسمان کی کھال کھینچی جائیگی یعنی علم ہیئت میں حیرت انگیز ترقی ہوگی۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں کہ تم تو بال کی کھال اتارتے ہو جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم تو بہت باریکیاں نکالتے ہو۔ چنانچہ اس زمانہ میں علم ہیئت میں خیال و وہم سے بھی زیادہ ترقی ہوئی ہے اور سیرِ نجوم اور وسعتِ عالم اور خلقِ عالم اور اجرامِ فلکی وغیرہ کے بارہ میں غیر معمولی علوم کا اضافہ ہُوا ہے جو گذشتہ ہزاروں سال میں بھی نہ ہُوا تھا۔ آج سے سو ڈیڑھ سو سال سے پہلے جو ھندسہ اور حساب دان تھے وہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے تھے کہ تھوڑے عرصہ کے بعد ہی کیا سے کیا ہوجائیگا پہلے زمانہ میں زیادہ سے زیادہ تین فٹ قطر کی دوربینیں ہوتی تھیں مگر اب امریکہ میں ایک سو فٹ قطر کی دُوربین ایجاد کی گئی ہے۔ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ دُوربین کا جتنا قطر بڑھتا جاتا ہے اُتنی ہی اسکی طاقت بڑھتی چلی جاتی ہے کہتے ہیں کہ اس دُوربین پر ایک کروڑ ڈالر سے زیادہ خرچ ہُوا ہے ہر شخص غور کرسکتا ہے کہ اتنی بڑی دُوربین کتنے سالوں میں تیار ہوئی ہوگی اور اس کے لئے کس قدر ماہرین ساری دنیا سے جمع کئے گئے ہونگے۔ بہرحال یہ دُوربین تیار ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ علم ہیئت میں حیرت انگیز ترقی ہوگئی۔ دو ستاروں کے باہمی فاصلہ کا اندازہ لگانے کیلئے علم ہیئت والوں کا طریق یہ ہے کہ وہ رفتارِ نور سے باہمی فاصلے کا اندازہ لگاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نور کی رفتار فی سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے ایک لاکھ چھیاسی ہزار کو ساٹھ سے ضرب دینگے تو ایک منٹ کی رفتار نکل آئیگی پھر ساٹھ سے ضرب دیں گے تو ایک گھنٹہ کی رفتار نکل آئیگی پھر اُسے چوبیس سے ضرب دیں گے تو ایک دن کی رفتار نکل آئیگی اور پھر اُسے تین سو ساٹھ سے ضرب دیں گے تو ایک سال کی رفتار نکل آئے گی۔ اس بنیاد پر جب وہ ایک ستارے کا دوسرے ستارہ سے فاصلہ بتانا چاہیں تو یہ نہیں کہیں گے کہ

كُشِطَتْ

وہ ستارہ اتنے میل دُور ہے بلکہ کہیں گے کہ وہ بیس سالِ نوری کے فاصلہ پر ہے یا ایک ہزار سالِ نوری کے فاصلہ پر ہے مطلب یہ کہ ایک سالِ نوری کا جس قدر فاصلہ بنتا ہے اُسے اتنے سالوں سے ضرب دے لو اور پھر خود ہی اندازہ لگا لو کہ ان میں کتنا فاصلہ ہے پس دُوربینوں کی ایجاد کے ذریعہ ایک تو علم نجوم میں بہت بڑی ترقی ہوئی ہے پھر اس سے وسعتِ عالم کے متعلق سابقہ علوم میں بھی بہت بڑی تبدیلی ہوئی ہے۔ گذشتہ زمانے کا ذکر تو جانے دو جنگِ عظیم سے پہلے ہیئت دان دو ہزار سالِ نوری عالم کی وسعت سمجھتے تھے مگر پچھلی جنگ کے خاتمہ پر انہوں نے اعلان کیا کہ یہ عالم بارہ ہزار سالِ نوری تک پھیلا ہوا ہے اور اب کہتے ہیں کہ اس عالم میں اتنی وسعت ہے کہ ہم اس کا اندازہ لگانے سے قطعی طور پر قاصر ہیں۔ اور جو لوگ کچھ اندازہ بتاتے ہیں وُہ کہتے ہیں کہ چھتیس۳۶ یا چالیس ہزار سالِ نوری تک یہ عالم پھیل گیا ہے۔ اور اب جبکہ میں اس نوٹ کی نظرثانی کر رہا ہوں پہلے سے بھی اور فاصلہ کے ستاروں کا پتہ لگنے کا اعلان ہوا ہے

پھر نئے حساب کے ذریعہ انہوں نے اپنی تحقیق میں اس قدر ترقی کر لی ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم نے اس سارے عالم کا مرکز دریافت کر لیا ہے جس میں یہ سورج اور چاند وغیرہ ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے ایک چھوٹا سا ذرّہ ہوتا ہے وہ کہتے ہیں اس عالم کے اوپر ایک اَور عالم ہے پھر اَور عالم ہے پھر اَور عالم ہے اور آخر میں ایک بہت بڑا مرکز ہے جس کے اردگرد یہ سب سیارے اور ستارے اور سورج اور چاند وغیرہ چکر کھا رہے ہیں۔ اُن کو اپنی اس تحقیق پر اس قدر ناز ہے کہ ماہرینِ حساب یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے خدائی کا راز دریافت کر لیا ہے گویا وہ مرکز اُن کے نزدیک خدا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہاں سے اللہ تعالیٰ ساری دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ اسی طرح پیدائشِ عالم کے کے متعلق پُرانے اور موجودہ نظریہ میں بہت بڑا فرق پیدا ہوگیا ہے اب ایسے آلے نکل آئے ہیں جن سے شعاعوں کو پھاڑ کر بتادیا جاتا ہے کہ وہ شعاعیں جن ستاروں سے نکل رہی ہیں اُن میں کون کون سا مادّہ ہے کیونکہ ہر شعاع جو کسی ستارہ سے لوٹتی ہے اس ستارہ کو ساخت دینے والی دھاتوں کا اثر اپنے اندر رکھتی ہے۔ پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ تمام روشنیاں ایک ہی قسم کی ہیں مگر اب ماہرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہر روشنی الگ قسم کی ہوتی ہے پلاٹینم سے نکلنے والی روشنی کو اگر پھاڑا جائے تو وہ بتادے گی کہ وہ پلاٹینم میں سے نکلی ہے۔ اور اگر ریڈیم سے نکلی ہوئی روشنی کو دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ریڈیم کی ہے۔ غرض ہر روشنی کو پھاڑ کر وہ بتادیتے ہیں کہ اس کے ساتھ کن کن چیزوں کا تعلق ہے۔ اس علمی ترقی کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ سائنس دان یہاں بیٹھے ہوئے سورج کی روشنی لیں گے اور اس کا تجزیہ کر کے بتادیں گے کہ سورج میں فلاں فلاں عناصر ہیں۔ مریخ کی روشنی پھاڑ کر بتادیں گے کہ اس میں فلاں فلاں عناصر ہیں۔ غرض علم ہیئت میں ایسے عظیم الشان تغیرات ہوئے ہیں کہ اُن کو دیکھ کر حیرت آتی ہے۔

پھر ایک اور انکشاف بھی ہوا ہے جو اسلام کی بہت بڑی تائید کرتا ہے۔ پہلے تمام یورپ پر ڈارون تھیوری کا غلبہ تھا۔ مگر اب کہا جاتا ہے کہ اس دنیا کی کل اڑتالیس ہزار سال عمر ہے اور سورج جوں جوں اپنے مرکز کے قریب آتا جاتا ہے اسکی گرمی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے یہاں تک کہ جب اڑتالیس ہزار سال پورے ہو جائیں گے تو سورج کی گرمی اتنی شدید ہو جائے گی کہ زمین اور اردگرد کے تمام سیاروں کو پگھلا کر رکھ دے گی۔ یہ وہی بات ہے جس کا حدیثوں میں ذکر آتا ہے کہ جب قیامت آئیگی تو سورج بالکل قریب آجائے گا اور اُس کی گرمی زمین کو تباہ کردیگی غرض علم ہیئت کے ذریعہ آسمان کی کھال اُدھیڑ دی گئی ہے اور اس علم میں ایسی عظیم الشان ترقی ہوئی ہے کہ جس کی مثال پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔

تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ سماء سے مراد سماوی علوم لئے جائیں۔ اس صورت میں اس آیت کا یہ مطلب ہو گا کہ یہ لوگ دین کو پھاڑ کر رکھ دیں گے اور اُس کی ایسی چھان بین کریں گے کہ اپنے خیال میں اس کی کھال اُدھیڑ دیں گے چنانچہ دیکھ لو اس زمانہ میں دین کے متعلق ایسی ایسی بحثیں ہوئی ہیں جو پہلے کبھی نہیں

# وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ ۝

اور جب جہنم کو بھڑکایا جائے گا ؏۱۲

ہوئی تھیں۔ پھر ہر مذہب والے نے اپنے اپنے مذہب کا ایسا تجزیہ کیا ہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں رہی۔ مثلاً بائیبل ہے عیسائیوں نے اس کی کھال اُدھیڑ کر رکھ دی ہے اور ثابت کیا ہے کہ فلاں بات موسیٰ کی نہیں بلکہ ہارونؑ کی ہے۔ یا یہ لفظ فلاں زبان کا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فلاں زبان تھی اس لئے معلوم ہُوا کہ یہ لفظ بعد میں ملایا گیا ہے۔ غرض ایسا تجزیہ کیا ہے کہ ایک ایک بات کو خود عیسائیوں نے کھول کر رکھ دیا ہے۔ اس چیر پھاڑ میں اگر کوئی زندہ وجود بچا ہے تو وہ صرف قرآن ہے۔ ویدوں کے متعلق بھی خود ہندو محققین نے بہت بڑی تحقیقاتیں کی ہیں اور انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ویدوں میں فلاں فلاں زبان شامل ہے اور یہ زبان فلاں فلاں سنہ میں بولی جاتی تھی۔ اسی طرح ویدوں کی تاریخ اور اُن کی ترتیب کے متعلق ایسا تجزیہ کیا ہے کہ اُن کی کھال اُدھیڑ دی ہے۔ اس چیر پھاڑ سے صرف قرآن ہی محفوظ رہا ہے اور کوئی کتاب محفوظ نہیں رہی۔ مگر چونکہ پیشگوئی تھی کہ بہرحال آسمانی علوم کی کھال اُتاری جائے گی اور اُن کے اسرار کو منکشف کیا جائے گا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ کے ماتحت اور کتابوں کی چیر پھاڑ کا کام تو یورپ والوں کے سپرد کر دیا اور قرآنی علوم کے انکشاف کا کام حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سپرد کر دیا۔ کیونکہ وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ کی پیشگوئی نے سب پر چسپاں ہونا تھا مگر باقی کتب کا چونکہ اعزاز مدنظر نہیں تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُنکو قصابوں کے سپرد کر دیا کہ تم اُن کی کھالیں اُدھیڑ دو۔ اور قرآن کا چونکہ اعزاز مدنظر تھا اس لئے اُسے بجائے غیروں کے ہاتھوں میں دینے کے اپنے ایک برگزیدہ کے ہاتھ میں دے دیا کہ تم اس کے معارف ظاہر کرو اور اسکے حقائق دنیا پر روشن کرو۔

سُعِّرَتْ

**؏۱۲ حل لغات۔** سُعِّرَتْ: سُعِّرَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور سَعَّرَ النَّارَ وَالْحَرْبَ کے معنے ہوتے ہیں أَوْقَدَهُمَا وَأَشْعَلَهُمَا وَهَيَّجَهُمَا کہ جنگ کو یا آگ کو بھڑکایا (اقرب) پس وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ کے معنے ہوں گے جب جہنم کو بھڑکایا جائیگا۔

**تفسیر۔** جہنّم کے معنے خود آگ کے ہیں۔ پس جو پہلے ہی آگ ہے اس کا بھڑکایا جانا اور بھی خطرناک حالت پر دلالت کرتا ہے یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہتے ہیں "کریلا اور پھر نیم چڑھا"۔ جہنم کے بھڑکائے جانے کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ اُس زمانہ میں گناہ کی زیادتی ہو جائے گی کیونکہ جب کوئی مہمان آیا ہُوا ہو تو اس کا کھانا پکانے اور ضیافت کرنے کے لئے آگ کو بھڑکایا جاتا ہے۔ پس جہنم جن لوگوں کا گھر ہے اور جن کا نُزل واقعہ ہُوا ہے جب وہ کثرت سے اُس گھر میں جائیں گے تو یہ لازمی بات ہے کہ اُس کی آگ بھی بھڑکائی جائے گی۔ پس اس کے ایک معنے یہ ہیں کہ گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے اُس زمانہ میں دوزخیوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔

آسمانی کتب کی تحقیقات

وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ میں نبی کے آنے کی پیشگوئی

وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ اُس وقت خدا تعالیٰ کا ایک نبی آئے گا جس کی مخالفت کی وجہ سے خدا تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھیگا کیونکہ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا (بنی اسرآئیل ع۲) ہم اُس وقت تک لوگوں پر عذاب نازل نہیں کرتے جبتک اپنا رسول بھیجکر اُن پر حجت تمام نہ کرلیں پس اس آیت میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ اُس وقت خدا تعالیٰ کا ایک مامور آئیگا کیونکہ جب اُسکی طرف سے کوئی مامور آتا ہے تو اسکے آنے کے ساتھ جہاں مومنوں کے لئے رحمت کے دروازے کھلتے ہیں وہاں کفار کے لئے عذاب کے دروازے بھی کھول دئے جاتے ہیں ؀

وَاِذَا الۡجَنَّۃُ اُزۡلِفَتۡ ۞ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ۞

اور جب جنت کو قریب کر دیا جائے گا ۱۳؎ (اُس دن) ہر جان جو کچھ اُس نے حاضر کیا ہے جان لے گی ۱۴؎

اُزۡلِفَتۡ

**۱۳؎ حل لغات۔** اُزْلِفَتْ: اَزْلَفَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے اور اَزْلَفَہٗ کے معنے ہیں قَرَّبَہٗ اُس کو قریب کیا (اقرب) پس وَاِذَا الْجَنَّۃُ اُزْلِفَتْ کے معنے ہوں گے جب جنت قریب کی جائے گی۔

اِذَا الۡجَنَّۃُ اُزۡلِفَتۡ کے دو معنے

**تفسیر۔** یہ اِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ کا ایک طبعی نتیجہ ہے جو بیان کیا گیا ہے کیونکہ جب گناہ بڑھ جاتے ہیں اور خدا تعالےٰ کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں رہتی تو اُس وقت جنت بھی لوگوں کے قریب کر دی جاتی ہے اور تھوڑی سی محنت اور تھوڑی سی قربانی سے وہ اُس کو حاصل کر لیتے ہیں جس زمانہ میں نیکی کی کثرت ہو جنت کا حصول اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا اُس زمانہ میں جب لوگوں میں عام طور پر بے دینی پائی جاتی ہو۔

عَلِمَتۡ نَفۡسٌ سے خدا کی تقدیر خاص کا اجراء

کیونکہ اُس وقت خدا تعالےٰ کی طرف ادنیٰ توجہ بھی اُسکی خوشنودی کا مستحق بنا دیتی ہے۔ اس آیت کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ جنت کے حصول کے لئے اس زمانہ کی قربانیاں نسبتاً آسان ہونگی جہاد بند ہوگا اور اس طرح جانی قربانی کے مواقع پیش نہیں آئیں گے صرف مالی قربانی کرکے یا وقت کی قربانی کرکے یا جذبات و احساسات کی قربانی کرکے وہ جنت کو حاصل کر سکینگے پہلا زمانہ وہ تھا جب اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ (بخاری کتاب الجہاد) کا سبق مومنوں کے سامنے دُہرایا جاتا تھا مگر اس زمانہ میں تلوار کا جہاد اللہ تعالےٰ کی حکمت کے ماتحت بند ہے اس لئے اب وہ تکالیف برداشت نہیں کرنی پڑتیں جو پہلے زمانوں میں برداشت کرنی پڑتی تھیں اب جہاد بالسیف کے بغیر ہی مالی قربانیوں میں حصہ لے کر جنت مل سکتی ہے۔

اس آیت کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مامور من اللہ کی بیعت کی وجہ سے جنت کا پانا اُن سے پہلے لوگوں کی نسبت آسان ہو جائے گا جنہوں نے کسی مامور کا زمانہ نہیں دیکھا۔ آج سے سو سال پہلے ساری عمر بزرگانِ دین کی صحبت میں گذار کر جو نور حاصل ہوتا تھا وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک نکتہ معرفت سے انسانی قلب میں پیدا ہو جاتا ہے پھر جو نشانات اور معجزات اس وقت ہمارے سامنے ہیں اور جن کے ذریعہ ایک زندہ خدا ہمیں نظر آرہا ہے یہ پہلے کہاں تھے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ کے تازہ الہامات ہمارے ایمانوں میں جو تازگی پیدا کرتے ہیں وہ پہلے لوگوں کو کہاں نصیب ہوتی تھی۔ پس حق یہی ہے کہ اس زمانہ میں ایک مامور من اللہ کی بعثت اور پھر اُسکی بیعت کی وجہ سے جنت کا حصول پہلے لوگوں کی نسبت بہت زیادہ آسان ہو گیا ہے اور یہی مامور کے زمانہ کی علامت ہوتی ہے کہ اُس وقت جنت بالکل قریب کر دی جاتی ہے۔

**۱۴؎ تفسیر۔** فرماتا ہے اُس دن الٰہی تقدیر خاص طور پر جاری ہوگی اور نتائج اعمال خاص طور پر نکلنے شروع ہونگے مطلب یہ کہ عام زمانہ میں فردی محاسبہ ہوتا ہے لیکن انبیاء کے زمانہ میں قومی محاسبہ ہوتا ہے جیسا کہ آیت وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (بنی اسرائیل عٰ) سے ظاہر ہے اور قومی محاسبہ بڑا سخت ہوتا ہے فردی محاسبہ نظر نہیں آتا کیونکہ اس کا تعلق انفرادی طور پر الگ الگ لوگوں سے ہوتا ہے لیکن قومی محاسبہ ایسی چیز ہے جو سب کو نظر آجاتی ہے کیونکہ اس کا تعلق تمام قوم کے ساتھ ہوتا ہے چنانچہ زلازل اور جنگوں کی کثرت سے اس قومی محاسبہ کے دن کا اب اظہار ہو رہا ہے قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ زلازل سے زمین اس طرح ہلائی جائیگی کہ انسان پکار اُٹھیگا مَا لَهَا (سورۃ زلزال) زمین کو کیا ہو گیا ہے کہ عذاب پر عذاب اور تباہی پر تباہی آتی جا رہی ہے۔ چنانچہ اب عام طور پر یہی احساس لوگوں کے قلوب میں پیدا ہو رہا ہے کہ یہ خدائی عذاب ہے جو دنیا پر مسلط ہے اور اسی کی طرف سے اِن زلازل اور جنگوں اور وباؤں کے ذریعہ دنیا میں تغیر پیدا کیا جا رہا ہے پس فرماتا ہے

# فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝

پس ایسا نہیں (جو تم خیال کرتے ہو) میں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں. چلتے چلتے پیچھے ہٹ جانیوالوں کو (جو ساتھ ہی) ناک کی سیدھ چلنے والے (بھی ہیں) اور پھر گھر دبکیا

ایک دن آئیگا جب اِن زلازل اور جنگوں کے نتائج قومی طور پر نکلنے شروع ہوجائینگے۔ اور تقدیر الٰہی دنیا میں خاص طور پر جاری ہوجائیگی۔

**۱۵ حل لغات۔** اَلْخُنَّسُ. خَانِسٌ کی جمع ہے جو خَنَسَ سے اسم فاعل ہے۔ اور خَنَسَ عَنْهُ کے معنے ہوتے ہیں تَاَخَّرَ وَانْقَبَضَ. اس سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور خَنَسَ بَيْنَ اَصْحَابِهٖ کے معنی ہوتے ہیں اِسْتَخْفٰى اپنے ساتھیوں میں چھپ گیا۔ اور جب خَنَسَ الْقَوْلَ کہیں تو معنے ہوتے ہیں۔ اَسَاءَهٗ۔ اسے بُری بات سے مخاطب کیا (اقرب) گویا خَانِسٌ کے معنے ہوئے جو پیچھے ہٹ جاتا ہے یا مخفی ہوجاتا ہے۔ یا بُری باتیں کہنے لگ جاتا ہے تو خُنَّس ہوئے بُری بات کہنے والے۔ پیچھے ہٹ جانے والے چھپ جانے والے۔

اَلْجَوَارِ، اَلْجَارِيَةُ کی جمع ہے۔ جو اَلْجَارِي سے مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور جَارِيَه چلنے والی کو کہتے ہیں۔ نیز اس کے معنی ہیں (۱) اَلصَّبِيَّةُ بچہ (۲) اَلْاَمَةُ لونڈی (۳) اَلشَّمْسُ۔ سورج (۴) اَلسَّفِيْنَةُ۔ کشتی (۵) اَلْحَيَّةُ۔ اور سانپ کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب) پس جَوَارِ سے مراد لونڈیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ لڑکیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ سورج بھی ہوسکتا ہے۔ کشتیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ سانپ بھی ہوسکتا ہے اور پھر سیدھے چلنے والے وجود بھی اس سے مراد ہوسکتے ہیں۔

اَلْكُنَّسُ، اَلْكَانِسُ کی جمع ہے اور اَلْكَانِسُ اُس ہرن کو کہتے ہیں۔ جو اپنی غار میں داخل ہوجاتا ہے۔ (اقرب) کیونکہ کناس ہرن کی رہائش کی جگہ کو کہتے ہیں۔

**تفسیر۔** فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ اس میں گواہ کے طور پر ان ہستیوں کو پیش کیا گیا ہے جن کی تین صفات ہیں۔ وہ خُنَّس ہیں یعنی پیچھے ہٹ جاتی ہیں آگے کو چلتی ہیں۔ اور چھپ جاتی ہیں۔ ان صفات والی ہستیوں سے مراد اس زمانہ کے مسلمان ہیں۔ یہ تین صفات وہ ہیں جو قوم کی تباہی کا موجب ہوجاتی ہیں۔ (۱) خطرہ کے وقت پیچھے ہٹ جانا (۲) بلا غور و فکر آگے بڑھتے چلے جانا (۳) سب کام چھوڑ چھاڑ کر گھروں میں نکمے بیٹھ جانا۔ چونکہ پہلی آیت میں عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ فرمایا تھا۔ یعنی انسان نے جو کچھ کیا ہے اس کا نتیجہ ضرور دیکھ لیگا۔ اس کے اس زمانہ کے اعمال کو بتاتا ہے۔ کہ وہ اس وقت تین پہلو رکھتے ہونگے۔ یعنی اول مسلمان مغربیت سے ڈر کر میدان سے بھاگ جائینگے۔ اور غلط راستہ اختیار کرلیں گے۔ پھر اس کے ساتھ ہی عقل و دانش کو ترک کرکے رسمی اسلام کو بھی پیش کرتے رہیں گے۔ لیکن باوجود اس کے حقیقی قربانی ان سے مفقود ہوگی۔ وہ چھپکر گھروں میں بیٹھ جائینگے۔ اور دشمن کا روحانی مقابلہ نہ کرینگے۔ بھلے بُرے سے کچھ تعلق نہ رکھیں گے۔ جس کی وجہ سے اسلام کمزور ہوجائیگا۔ اور دشمنانِ اسلام غالب آتے چلے جائینگے۔ ادنیٰ تدبر سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی حالت ایسی ہی ہے اور یہی زمانہ اس سورۃ میں مذکور ہے۔ اوّل تو سب کے سب مسلمان خُنَّس ہیں یعنی سیدھے راستہ سے بھٹک گئے ہیں۔ اور نقطۂ صداقت سے واپس ہٹ گئے ہیں۔ یعنی انہوں نے کفر کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر کام کرنا شروع کردیا ہے۔ اور اسی طریق کو وہ خدمت قوم و خدمت ملک سمجھتے ہیں۔ یورپ کے طریق اور یورپ کے رویہ کو اور اسکے فلسفہ کو ان لوگوں نے اپنا راہ نما بنالیا ہے۔ اور اسکے خلاف کو موجب خسران و تباب سمجھتے ہیں۔ درحقیقت وہ نام کے مسلمان ہیں اور انہوں نے مغربیت کا نام اسلام رکھ لیا ہے اب حال ہے کہ ایک ہی طور و طریق رکھ کر ایک آدمی عیسائی کہلاتا ہے

الخنس

فلا اقسم بالخنس الجوار الکنس میں مسلمانوں کے اندر آخری زمانہ میں تین صفات پیدا ہوجانے کی پیشگوئی

الجوار

الکنس

وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۝ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۝

اور رات کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں، جب وہ خاتمہ کو پہنچ جاتی ہے۔ اور صبح کو جب وہ سانس لینے لگتی ہے ۝

اور ویسا ہی طور و طریق رکھ کر دوسرا آدمی مسلمان کہلاتا ہے۔ محقق دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ کہ یہ کیا عجیب بات ہے کہ وہی طور و طریقہ مسیحیت بھی کہلاتا ہے۔ اور اسلام بھی۔ لیکن اسکے ساتھ ہی انکی یہ حالت ہے کہ جہاں وہ حقیقت میں اسلام سے ہٹ گئے ہیں بظاہر وہ اسی راستہ پر چلے جا رہے ہیں۔ اور کہلاتے مسلمان ہی ہیں۔ گویا ایک طرف اسلام کو چھوڑ رہے ہیں۔ اور دوسری طرف اسلام کی طرف رغبت بھی ظاہر کر رہے ہیں۔ اور یہ دکھاتے ہیں۔ کہ وہ اسلامی راستہ پر چل رہے ہیں۔ لیکن انکا یہ جوش و خروش صرف رسمی اور زبانی ہے۔ کیونکہ جہاں ایک رسمی اسلام کی اتباع کا انکو دعویٰ ہے۔ وہاں یہ بھی نظر آتا ہے۔ کہ کام کے وقت وہ اپنے گھروں میں چھپ جاتے ہیں۔ اور اسلام کی خاطر کوئی قربانی نہیں کرتے۔ یہ نقشہ لفظاً لفظاً اس وقت کے مسلمانوں پر چسپاں ہوتا ہے۔ وہ اسلام کی تعلیم کو چھوڑ چکے ہیں۔ مگر باوجود اسکے اسلام پر چلنے کے دعویدار بھی ہیں۔ اور انکی تائید میں خوب نعرے بھی لگاتے ہیں۔ لیکن عملاً وہ ہر ایک قربانی سے گریز بھی کر رہے ہیں۔ اس گری ہوئی حالت میں بھی اگر مسلمان سچی قربانی کریں جس طرح یورپ کے لوگ کرتے ہیں۔ تو وہ اپنی دنیوی عزت کا کثیر حصہ واپس لے سکتے ہیں۔ مگر حقیقی عمل کے وقت وہ گُنس ہو جاتے ہیں۔ یعنی اپنی غاروں میں چھپکر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور دشمن اسلام کی متاع لوٹ کرلے جاتا ہے۔ یورپ تو الگ رہا۔ ہندوستان کی غلام اقوام کے مقابلہ پر بھی مسلمان باوجود بعض قوموں سے زیادہ ہونے کے انکے مقابلہ پر دلیری سے نہیں کھڑا ہو سکتا۔ کیونکہ دائمی اور مستقل قربانی سے وہ گھبراتا ہے۔ اسلئے پہلی جھپکی کے بعد وہ پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتا ہے! اور میدان ہمیشہ اس سے کمزور لیکن زیادہ منظم جماعت کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔

تنفّس

۱۶ حل لغات۔ عَسْعَسَ الَّيْلُ کے معنی ہیں مَضٰی عسعس رات گزر گئی چلی گئی۔ نیز اس کے معنے ہیں اَظْلَمَ۔ رات کی تاریکی پورے زور سے چھا گئی۔ (اقرب)

تَنَفَّسَ کے اصل معنے ہیں اَدْخَلَ النَّفَسَ اِلٰی رِئَتِهٖ کہ سانس کو پھیپھڑوں میں داخل کیا۔ یعنی سانس لیا۔ اور جب تَنَفَّسَ الصُّبْحُ کہیں تو معنی ہوتے ہیں تَبَلَّجَ صبح روشن ہوگئی (اقرب)

تفسیر۔ پہلی آیت میں جو بھیانک نقشہ اس زمانہ کے مسلمانوں کا کھینچا گیا تھا۔ اور جسے دیکھ کر تباہی کے سوا کوئی انجام نظر نہ آتا تھا اب ان آیات میں تسلی دلاتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ تاریکی کا یہ دور دائمی نہ ہوگا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ رات کو بھی بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ جب وہ چلی جائیگی۔ اور خاتمہ کے قریب پہنچ جائیگی۔ اور صبح کو بھی بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ جب وہ سانس لیگی۔ یعنی اپنے وجود کو ظاہر کرنے لگے گی۔ رات کا جانا اور صبح کا آنا تنزّل کے دور کے خاتمہ اور ترقی کے نئے دور کے ظہور پر دلالت کرتا ہے۔ اور اسی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اسلام کے اس دور تنزل پر اللہ تعالیٰ خاموش نہ رہیگا بلکہ اسے دور کرنیکے سامان پیدا کریگا۔ اور اس وقت صبح کا ستارہ اسکی طرف سے طلوع ہوگا۔ یعنی وقت کا مصلح اور امام جو ہر تاریک رات کے بعد صبح کے ستارہ کی طرح ظاہر ہوتا ہے۔ اس وقت ظاہر ہوگا۔

جب ظلمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور انسان روشنی کے ظہور سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اس وقت اگر روشنی کے ہلکے سے آثار نمودار ہوں۔ تو وہ نظارہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے ایک انسان بظاہر مرا ہوا نظر آتا ہے لیکن دراصل ابھی زندہ ہوتا ہے۔ اس وقت جب اسکے موہنہ پر پانی کے چھینٹے دیئے جاتے ہیں تو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی جدوجہد کے بعد وہ ایک ہلکی سی سسکی لیتا ہے۔ جس پر گھر والے خوش ہو جاتے ہیں۔ کہ یہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ۔ اس وقت ایسا تاریکی کا زمانہ ہوگا۔

# إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي

یقیناً وہ ایک بزرگ رسول کا کلام ہے۔ (جو) قوت والا اور صاحب عرش کے

# الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ۝

حضور بڑا درجہ رکھنے والا (ہے) (جو) مطاع (بھی) ہے (اور) اسکے ساتھ امین بھی ۔ ؎

کہ ہر شخص کہیگا اسلام اب مرچکا۔ اسکی زندگی کے کوئی آثار باقی نہیں رہے۔ کچھ لوگ ایسے ہونگے جو اسلام کے مردہ کو چھوڑ کر چلے جائینگے۔ کچھ لوگ ایسے ہونگے جو بیٹھ کر رونے لگ جائینگے۔ مگر کچھ لوگ ایسے ہونگے جو اپنے کام میں لگے رہینگے۔ اور وہ اس کے مونہہ پر چھینٹے دیتے چلے جائینگے۔ یہاں تک کہ اسلام ذرا سا سانس لیگا۔ اس وقت سب کہیں گے کہ لو اسلام زندہ ہو گیا پس فرماتا ہے وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ۔ ہم شہادت کے طور پر صبح کو پیش کرتے ہیں جب وہ کوشش سے ایک سانس لے گی۔

تَنَفَّسَ الصُّبْحُ کے معنے ہوتے ہیں تَبَلَّجَ اَی اَشْرَقَ وَاَنَارَ۔ یعنی روشن ہوگئی یا اس نے روشن کر دیا۔ اس مفہوم کو اور طرح بھی ادا کیا جا سکتا تھا مگر اللہ تعالےٰ نے الفاظ ایسے رکھے ہیں۔ جو مایوسی کی حالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور بتلاتے ہیں کہ اسلام کی ترقی اس وقت ناممکن خیال کی جاتی ہوگی۔ بہرحال فرماتا ہے وقت آئیگا جب رات دور ہو جائیگی۔ اور صبح کوشش سے ایک سانس لے گی جس سے مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو جائینگے۔ اور ان کے دلوں میں یہ یقین پیدا ہو جائیگا۔ کہ اسلام اب ضرور غالب آکر رہیگا۔ اور خدام اسلام جیت جائینگے۔

**؎ حل لغات**۔ مَكِينٌ: مَكُنَ سے ہے۔ اور مَكُنَ فُلَانٌ عِنْدَ السُّلْطَانِ کے معنے ہوتے ہیں۔ عَظُمَ عِنْدَهُ وَارْتَفَعَ وَصَارَ ذَا مَنْزِلَةٍ کہ فلاں شخص کا رتبہ بادشاہ کے ہاں بڑھ گیا۔ اور بادشاہ کے حضور مقرب اور معزز ہو گیا (اقرب) پس مَكِينٌ کے معنے ہونگے۔ بادشاہ کے ہاں معزز مقرب اور رتبہ رکھنے والا

*آخری زمانہ میں اسلام کی ترقی کی پیشگوئی پر تین اعتراضات اور ان کے جوابات*

**تفسیر**۔ اسلام کی ترقی اور اس کے تنزل کے متعلق اور آخر میں اسلام کے دوبارہ غلبہ اور عروج کے متعلق ان آیات میں جس تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسکو دیکھ کر ایسے شخص کے دل میں جسکے سامنے ابھی ان واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی رونما نہیں ہوا تھا تین اعتراض پیدا ہوسکتے تھے اول یہ کہ آپ اسلام کے تنزل کی خبر دے رہے ہیں حالانکہ تنزل کی خبر کے معنی ہی کیا ہیں۔ اسلام کی تو دنیا میں کہیں بھی ترقی نظر نہیں آتی۔ اور جب آپ کے مذہب کا دنیا میں کہیں نام ہی نہیں۔ اور نہ لوگ کثرت سے اس میں شامل ہیں۔ تو اس کے تنزل کی خبر دینے کے کیا معنی ہیں۔ (۲) پھر جب اسلام ترقی کر گیا۔ اور مسلمانوں کو حکومتیں حاصل ہو گئیں۔ اس وقت اگر ان سے کوئی پوچھتا۔ کہ کیا تمہارا بھی کبھی تنزل ہوگا۔ تو وہ سب اسکو ناممکن بتاتے۔ اور کہتے کہ اسلام کی شان و شوکت کو کون توڑ سکتا ہے۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے کیا وہم و گمان میں بھی یہ بات آسکتی تھی۔ کہ وہ عیسائی جو ان کی ماتحتی میں اپنی زندگی کے دن بسر کرتے تھے۔ کسی دن غالب آجائینگے۔ اور اس قدر طاقت حاصل کر لینگے۔ کہ مسلمان اگر سارے ملکر بھی شور مچائینگے۔ تو وہ اس آواز کو نہیں سنیں گے۔ گویا جس طرح ابتداء اسلام میں لوگوں کے لئے یہ بات ماننی ناممکن تھی۔ کہ اسلام کسی زمانہ میں ترقی کر جائیگا۔ اسی طرح اسلام کے دور ترقی میں لوگوں کے لئے یہ بات ماننی مشکل تھی۔ کہ اسلام کسی وقت گر جائیگا۔ (۳) پھر جب اسلام کا تنزل ہوا تو ایسا ہوا کہ اب مسلمانوں کو لاکھ سمجھاؤ۔ کہ وہ پھر ترقی کر جائینگے۔ انکی سمجھ میں ہی یہ بات نہیں آتی۔ کہ اتنے عظیم الشان

*تَنَفَّسَ الصُّبْحُ میں اسلام کی ترقی حالت کا نقشہ*

*مُطَاعٍ*

تنزل کے بعد وہ کس طرح ترقی کر سکیں گے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے کے بعد یہ یقین پیدا ہوتا ہے۔ کہ اسلام غالب آئیگا۔ لیکن اگر آپ سے تعلق نہ ہو۔ تو اس یقین کے پیدا ہونیکا کوئی ذریعہ ہی نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان جب بھی اپنے غلبہ کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ انکی خواہش ہوتی ہے۔ کہ عیسائیوں سے صلح ہو جائے۔ یا ہندوؤں سے ملکر انکو حکومت حاصل ہو جائے۔ انکے وہم وگمان میں بھی یہ بات کبھی نہیں آتی۔ کہ جو آج اسلام کا حال ہے۔ وہی حال اب عیسائیت کا ہونے والا ہے اور جس طرح آج مسلمان عیسائیوں کے مقابلہ میں بالکل بے بس ہیں۔ اسی طرح عیسائی مسلمانوں کے سامنے بے حیثیت ہو جائینگے۔ یہ ہرگز صرف ہماری جماعت کا ہی ہے۔ کیونکہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے نشانات کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھا اور ہم ایک ایسے خدا پر ایمان لائے ہیں۔ جو زندہ اور طاقتور خدا ہے۔ غرض ہر قدم پر دوسرے قدم کا وہم بھی نہیں آسکتا تھا۔ جب یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اسوقت اسلام کی ترقی کا خیال ناممکن تھا۔ جب اسلام کی ترقی کا دور آیا تو اس کے تنزل کا خیال ناممکن تھا۔ اور جب اسپر تنزل آیا۔ تو اب اسکی ترقی کو ناممکن بتلایا جارہا ہے۔ اور چونکہ اس پیشگوئی کا ہر قدم ایسا تھا۔ جسپر لوگوں کو یقین ہی نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ۔ تم قدم بقدم چلو۔ اور پھر دیکھو کہ ہمارے رسول کی باتیں کسطرح پوری ہوتی ہیں آج تم ہمارے رسول کو تحقیر کی نگاہوں سے دیکھتے ہو۔ لیکن ہم تمہارے سامنے اس پیشگوئی کا اعلان کرتے ہیں۔ کہ پہلا قدم یہ ہوگا کہ یہ رسول کریم تسلیم کیا جائیگا۔ یہ ایک قریب کی پیشگوئی ہے۔ جس کے پورا ہونے پر بعید زمانہ سے تعلق رکھنے والی پیشگوئیوں کے بھی پورا ہونیکی بھی امید کی جاسکتی ہے۔ اس وقت یہ تمہیں غیر معزز نظر آرہا ہے۔ اور تم اسے اپنے رحم پر سمجھتے ہو۔ لیکن عنقریب تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ اسکا رسول کریم ہونا ثابت ہو جائیگا۔ اور جب یہ بات ثابت ہو جائیگی۔ کہ اگر ایک ناممکن بات ہو گئی ہے۔ تو دوسری ناممکن باتیں بھی وقوع میں آجائینگی۔

یہاں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ قرآن خدا کا کلام نہیں بلکہ بندے کا کلام ہے۔ مگر یہ اعتراض کلام کے طریق کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔ جب کوئی شخص ہم سے آکر بات کرتا ہے۔ تو ہماری اس سے دو بحثیں ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ جو کچھ کہتا ہے آیا لفظاً لفظاً درست ہے یا نہیں۔ دوم بعض دفعہ الفاظ کا سوال نہیں ہوتا صرف اتنا دریافت کیا جاتا ہے۔ کہ آیا اسنے پیغام کا مفہوم درست طور پر ادا کیا ہے یا نہیں یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور انکے الگ الگ ہونے کی وجہ سے دونوں کا آپس میں فرق بھی بہت بڑا ہے۔ مثلاً ایک شخص ہمارے پاس آکر کہتا ہے۔ کہ مجھے فلاں شخص نے بتایا ہے۔ کہ تم کو فلاں عہدہ دیدیا گیا ہے۔ اب کبھی تو اس شخص کو خود بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجھے فلاں عہدہ دیدیا گیا ہے۔ مگر اسے آرڈر کے الفاظ کا علم نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں وہ خبر دینے والے سے پوچھتا ہے کہ کیا تمہیں معلوم ہے۔ کہ آرڈر کے الفاظ کیا تھے۔ اگر اسے علم ہو تو بتا دیتا ہے۔ اور اگر علم نہ ہو تو معذرت کر دیتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کہ اسے پہلی دفعہ ہی عہدہ کی خبر ملتی ہے ایسی حالت میں وہ یہ دریافت کرتا ہے۔ کہ بتاؤ تم نے جو مجھے پیغام آکر دیا ہے۔ آیا یہ اپنے مفہوم کے لحاظ سے درست ہے؟ اس وقت اسے الفاظ سے اتنی غرض نہیں ہوتی۔ جتنی مفہوم کے درست ہونے سے غرض ہوتی ہے۔ تو یہ الگ الگ صورتیں ہیں جو عام طور پر پیش آتی رہتی ہیں۔ اب ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ دشمن کا مطالبہ کیا تھا جس کے متعلق اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ کہا گیا۔ سو اگر کوئی شخص غور کرے۔ تو ادنیٰ فکر سے بھی یہ بات معلوم کر سکتا ہے کہ دشمن کا سوال یہ نہیں تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ کہا ہے یا نہیں یا اِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ اس نے کہا ہے یا نہیں۔ بلکہ دشمن تو یہ پوچھتا تھا کہ الفاظ چاہے کچھ ہوں سوال یہ ہے کہ ان کا جو مفہوم ہے وہ کب پورا ہوگا۔ اسے اِذَا یا اَلشَّمْسُ یا کُوِّرَتْ یا اَلنُّجُوْمُ وغیرہ الفاظ سے کوئی بحث نہیں تھی۔ وہ کہتا تھا کہ الفاظ خواہ کچھ رکھ لو۔ سوال یہ ہے کہ یہ باتیں کب ہونگی؟ پس اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ میں

سورۃ کے الفاظ کی طرف اشارہ نہیں۔ بلکہ اس کے مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ دشمن کی طرف سے الفاظ کے متعلق بھی بحث کی جاتی ہے۔ مگر جہاں پیشگوئیوں کے متعلق بحث ہو۔ وہاں یہ بحث نہیں ہوتی۔ کہ الفاظ کون سے نازل ہوئے ہیں بلکہ وہاں یہ بحث ہوتی ہے۔ کہ ان الفاظ کا مفہوم کب پورا ہوگا اللہ تعالیٰ دشمنوں کے اس مطالبہ کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ یہ بات جو کہی گئی ہے ایک معزز رسول نے کہی ہے۔ اور معزز رسول جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ اس لئے یہ مفہوم ایک دن پورا ہو کر رہیگا۔ پس یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اس جگہ کفار کی طرف سے الفاظ کے متعلق اعتراض نہیں کہ آیا وہ خدا کی طرف سے ہیں یا نہیں۔ بلکہ مفہوم کے متعلق اعتراض ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ یہ پیغام جو تم کو دیا گیا ہے ایک رسول کریم نے دیا ہے۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے رسول امین نہیں کہا بلکہ رسول کریم کہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں الفاظ کے ضبط کی بحث ہوتی ہے۔ وہاں رسول امین کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور جہاں مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کا ذکر ہو۔ وہاں رسول کریم کے الفاظ لائے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہی پیغامبر عزت کا مستحق ہوتا ہے۔ جو پیغام کو صحیح طور پر دوسرے تک پہنچا دیتا ہے۔ اگر آقا کچھ کہے اور نوکر جا کر کچھ کہدے۔ آقا تو یہ کہے کہ میں فلاں جگہ کل آؤنگا۔ اور وہ جا کر یہ کہدے کہ وہ کہتے ہیں میں نہیں آؤنگا۔ تو وہ آقا کی نگاہوں میں ذلیل ہو جائیگا۔ عزت کے قابل وہی رسول ہوتا ہے۔ جو پیغام کو صحیح طور پر پہنچانیوالا ہو۔ دشمن کو الفاظ سے اتنی بحث نہیں ہوتی۔ جتنی اس کے مطالب اور معانی سے بحث ہوتی ہے۔ اس لئے رسول کا کام ہوتا ہے۔ کہ الفاظ کے صحیح معانی لوگوں کے سامنے بیان کر دے۔ اگر وہ بیان نہ کرے تو خطرہ ہوتا ہے کہ لوگ دھوکا کھا جائیں۔ پس یہاں اصل سوال الفاظ کا نہیں بلکہ مفہوم کا سوال ہے کہ آیا وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اسلئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ہمارا معزز رسول ہے۔ اگر اسمیں یہ قابلیت نہ ہوتی۔ کہ صحیح پیغام لوگوں تک پہنچاتا۔ تو ہم اسے اتنی بڑی عزت کیوں دیتے۔ پس خالی الفاظ قرآن نہیں۔ بلکہ الفاظ قرآن کی تشریح بھی اسمیں شامل ہے

یہاں ایک ذوقی لطیفہ بھی ہے۔ مفسرین نے رسول کریم سے جبریل مراد لیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا رد ایک ایسے عجیب طریق سے کیا ہے۔ کہ لطف آجاتا ہے۔ مسلمانوں میں عام طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول کریم ہی کہا جاتا ہے۔ اور جہاں بھی رسول کریم لکھا ہوا ہو ہر مسلمان کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ آس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی مراد نہیں۔ پس مفسرین نے تو اس سے جبریل مراد لیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں اس لفظ کا استعمال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق اتنا کثرت سے کر دیا۔ کہ اب رسول کریم کے الفاظ دیکھنے کے بعد کسی کا ذہن جبریل کیطرف منتقل ہی نہیں ہو سکتا پھر یہ بات بھی ہے کہ جبریل کا کام تشریح کرنا نہیں۔ بلکہ صاف الفاظ پہنچانا ہے اگر یہاں خالی الفاظ پہنچانے کا ذکر ہوتا۔ تو امین کا لفظ رکھا جاتا کیونکہ الفاظ کو ان کی اصل صورت میں لوگوں تک پہنچا دینا انسان کی امانت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن یہاں کریم کا لفظ رکھا گیا۔ جو عزت پر دلالت کرتا ہے۔ اور پیغامبر کی عزت اسی وقت ظاہر ہو سکتی ہے۔ جب وہ پیغام کی صحیح اور درست تشریح لوگوں تک پہنچائے۔

رسول کریم سے مراد جبریل نہیں بلکہ آنحضرت صلعم ہیں۔

فرماتا ہے اول تو تم دیکھو گے کہ یہ معزز اور برگزیدہ سمجھا جائیگا۔ بڑا عقلمند اور سمجھدار قرار پائیگا۔ پھر ذِيْ قُوَّةٍ تم دیکھو گے کہ ایک دن یہ ذی قوۃ ہو جائیگا۔ آج یہ تمہیں کمزور نظر آتا ہے اور تمہیں اس کی سچائی کا کوئی ثبوت نظر نہیں آتا۔ لیکن ہم تمہیں بتاتے ہیں۔ ایک دن یہ بڑا طاقتور ہو جائیگا۔ چنانچہ دیکھ لو یا تو یہ حالت تھی۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہلاک کرنے کے لئے آپ کے اردگرد گھیرے ڈالے جاتے تھے۔ اور یا صلح حدیبیہ کے معاً بعد آپ میں اتنی بڑی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ آپ بڑے بڑے بادشاہوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور انہیں تبلیغی خطوط بھجواتے ہیں۔ انکے لئے یہ امر بالکل حیرت کا موجب تھا۔ کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا انقلاب واقعہ ہو گیا۔ کہ عرب کا وہ اُمّی انسان جسے بالکل حقیر سمجھا جاتا تھا۔ اس قدر طاقت پکڑ گیا ہے کہ وہ ہمیں مخاطب کرتا اور اسلام میں داخل ہونیکی دعوت دیتا ہے۔ آجکل

اور زمانہ ہے۔ آجکل بادشاہوں کے پاس خط جائیں تو وُہ انکو پڑھ کر اسی وقت پھینک دینگے اور پروا بھی نہیں کرینگے۔ کہ کسنے کیا لکھا ہے۔ مگر اس وقت بڑے بڑے جابر بادشاہ تھے۔ اور انکو خط لکھنا کسی معمولی انسان کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ کسریٰ نے جب یہ خط پڑھا۔ تو وُہ آگ بگولہ ہو گیا۔ اسے اپنی ہتک محسوس ہوئی۔ اور اس نے نہایت غصہ کا اظہار کیا۔ آجکل قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اس زمانہ میں بادشاہوں کو خط لکھنا کتنا مشکل کام تھا۔ کیونکہ اب زمانہ اور ہے آج جو شخص چاہے بادشاہوں کو خط لکھ سکتا ہے۔ بلکہ جنگ سے پہلے اگر کوئی ہٹلر مسولینی یا روزویلٹ کو خط لکھنا چاہتا تو آسانی سے لکھ سکتا تھا مگر وُہ زمانہ ایسا نہیں تھا۔ اس زمانہ میں بادشاہوں کو کسی معمولی آدمی کا خط لکھنا اپنی موت کو خود بلانے کے مترادف تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت دفعہ دھوکا لگ جاتا ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اسی بات پر بہت فخر کیا کرتے تھے۔ کہ میں وائسرائے کو خط لکھتا ہوں تو وُہ میرے خط کا جواب دے دیتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ اس میں کونسی بڑی بات ہے۔ اُسے تو اگر ایک چوڑھا بھی خط لکھے۔ تو وُہ جواب دیدیگا ڈیئر سر DEAR SIR! مخصوص الفاظ ہیں جو ہر خط پر لکھے جاتے ہیں۔ پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ میری بڑی عزت ہو گئی حالانکہ یہ عام الفاظ ہوتے ہیں مگر مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اسی دھوکہ میں رہے۔ کہ وائسرائے مجھے خط لکھتے ہیں۔ تو مہربان من کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ہاں اسکے سوا اور کوئی لفظ ہی نہیں۔ وُہ ایک چوڑھے کو بھی خط لکھیں گے تو اوپر یہی الفاظ لکھیں گے۔ ڈپٹی کمشنر کو لکھیں گے تو اُسے بھی یہی لکھینگے۔ تو بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں۔ جن سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اسی رنگ کی ایک اور مثال مجھے یاد آگئی۔ میں نے ایک دفعہ ایک احمدی کو دیکھا کہ وُہ دوسرے سے بحث کر رہا تھا۔ کہ کیا تم نے مجھے کبھی جھوٹ بولتے دیکھا۔ اور اس کے متعلق وُہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ع۲) کو بار بار پیش کرتا کہ میں تم میں اتنا عرصہ رہا ہوں۔ کیا تم نے مجھے جھوٹ یا فریب سے کام لیتے دیکھا۔ حالانکہ یہ استدلال اسکے لئے ہوتا ہے جو قوم کے سامنے آچکا ہوتا ہے۔ نہ کہ جو شخص اٹھے اس سے اپنی صداقت کا استدلال کرنا شروع کر دے۔ جو شخص قوم کی نظروں کے سامنے آجائے۔ اس کے لئے بے شک یہ دلیل ہے لیکن دوسرے کے لئے نہیں۔ اسی طرح کسی بڑے آدمی کو چٹھی بھیجنے کی اہمیت موجودہ زمانے میں نہیں رہی۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ بعض مسلمان جب ان باتوں کو پڑھتے ہیں۔ تو حیران ہوتے ہیں کہ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بادشاہوں کو چٹھیاں بھجوا دی تھیں۔ تو اس میں کونسی عجیب بات ہو گئی۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس زمانہ میں بادشاہوں کو چٹھی لکھنا بڑی خطرناک بات ہوا کرتی تھی اور بادشاہ بعض دفعہ ناراض ہو کر چٹھی بھجوانے والے کو مروا دیا کرتے تھے۔ لیکن آجکل کا زمانہ اور ہے۔ اب اگر روزانہ بھی چٹھیاں لکھی جائیں تو کوئی اہم بات نہیں سمجھی جا سکتی۔ پھر اس بات پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خطوط جب مختلف بادشاہوں کو پہنچے تھے۔ تو انہوں نے ان خطوط کا لکھنا ایک حماقت سمجھی تھی۔ یا اس کا ان کے قلوب پر خاص اثر ہوا تھا تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط قیصر کو پہنچا تو اس نے ابو سفیان کو بلایا۔ اور اس سے کئی باتیں دریافت کیں۔ جب سب باتیں دریافت کر چکا۔ تو ابو سفیان کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔ کہ لَقَدْ اَمِرَ اَمْرُ ابْنُ اَبِيْ كَبْشَةَ اِنَّهٗ يَخَافُهٗ مَلِكُ بَنِي الْاَصْفَرِ (بخاری کتاب کیف کان بدء الوحی) کہ اس شخص کا معاملہ تو بہت بڑھ گیا ہے۔ کہ رومیوں کا بادشاہ بھی اس سے خوف کھاتا ہے۔ اسی طرح قیصر کو جبکہ وہ شام پر اپنی فوجیں لیکر آیا ہوا تھا۔ یہ لکھا کہ اگر تو ایمان نہیں لائیگا۔ تو اِنَّ عَلَيْكَ اِثْمَ الْاَرِيْسِيِّيْنَ (بخاری کتاب کیف کان بدء الوحی) یعنی تیرے ماتحت جس قدر لوگ ہیں ان سب کا گناہ تیرے سر پر ہو گا بتا رہا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا خط یہ جانتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ ممکن ہے وُہ فوج لیکر ہم پر چڑھائی کر دے۔ اور ممکن ہے وُہ مجھے مارنے کا فیصلہ کرے۔ مگر آپ نے اس بات کی کوئی پروا نہ کی۔

آنحضرت صلعم کے ذی قوۃ اور ذی العرش مکین ہونے کا ایک نظارہ

اور بڑے بڑے بادشاہوں کو کھلے طور پر سنادیا کہ اگر تم ایمان لاؤ گے تو اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ اور اگر انکار کروگے تو خدا تعالےٰ کے حضور ایک مجرم کی حیثیت میں کھڑے ہوگے۔ تو فرماتا ہے آج تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو لیکن عنقریب تم دیکھو گے کہ وُہ ذِیْ قُوَّۃٍ ہو جائیگا بڑے بڑے بادشاہ اس کے خوف سے کانپیں گے اور غیر معمولی عظمت اسے حاصل ہو جائیگی۔

عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ۔ پھر ذِیْ قُوَّۃٍ ہونے کے بعد تم اس میں ایک زائد بات بھی دیکھو گے۔ ذِیْ قُوَّۃٍ ہونے والے عام طور پر دین اور مذہب کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور وُہ طاقتور ہو کر ضعیفوں کے حقوق غصب کر لیتے ہیں۔ مگر فرمایا یہ ایسا نہیں ہوگا۔

دراصل مکہ والوں کے دلوں میں بھی وہی شبہ تھا۔ جو یورپ والوں کو پیدا ہوا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بڑائی حاصل کرنے یا بادشاہت اور حکومت اپنے قبضہ میں لینے کے لئے سب کچھ کر رہے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ پیغام بھجوایا تھا۔ کہ اگر آپ دولت چاہتے ہیں۔ تو ہم اتنی دولت آپ کے لئے جمع کر دیتے ہیں۔ کہ عرب میں اور کسی کے پاس اتنی دولت نہ ہوگی۔ اور اگر آپ حکومت چاہتے ہیں۔ تو ہم آپکو اپنا بادشاہ ماننے کے لئے تیار ہیں۔ مگر ہمارے بتوں کو برا بھلا نہ کہا جائے۔ تو مکہ والے سمجھتے تھے۔ کہ یہ سب پیشگوئیاں اسی لئے کی جاتی ہیں کہ حکومت حاصل کرنے کی خواہش دل میں پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم یہ خیال کرتے ہو۔ کہ اسنے اپنے ذی قوۃ ہونے کے متعلق اس لئے خبریں دینی شروع کر دی ہیں۔ کہ یہ بادشاہ بننا چاہتا ہے یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ بادشاہ ہوگا۔ مگر اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق نہیں ہوگا۔ بلکہ جب یہ بادشاہ ہوگا۔ تو تم دیکھو گے کہ یہ تقویٰ میں پہلے سے بھی بڑھ جائیگا۔ اور جو شخص بادشاہت کے بعد نیکی اور تقویٰ میں پہلے سے بھی بڑھ جائے۔ اسکے متعلق نہیں کہا جاسکتا۔ کہ وُہ حکومت کی ذاتی طور پر خواہش رکھتا تھا۔ بلکہ اسکے متعلق یہی سمجھا جائیگا۔ کہ خدا نے خود اس مقام پر اسے کھڑا کیا ہے۔ فرماتا ہے ہم بھی جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بادشاہت دینگے تو وہ غریب پرور ہوگا۔ منکسر المزاج ہوگا۔ وہ خدمت خلق کرنے والا ہوگا۔ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا کرنیوالا ہوگا۔ گویا بادشاہت اس کی نماز کو بڑھا دیگی۔ اسکے روزہ کو ترقی دیگی۔ اسکے صدقہ اور اسکے حج اور اسکی دوسری نیکیوں میں اضافہ کر دیگی۔ پس ذِیْ قُوَّۃٍ کے ساتھ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ رکھ کر دونوں کا جوڑ بتادیا۔ لیکن ذِیْ قُوَّۃٍ میں ایک خوبی تھی اور ایک نقص تھا۔ خوبی تو یہ تھی کہ جو شخص ذی قوۃ ہو وہ دوسروں پر غالب آجاتا ہے۔ اور نقص یہ ہوتا ہے کہ طاقت حاصل کرنے کے بعد انسان دوسروں کے حقوق کو دلیری سے دبا لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم ہمارے رسول میں یہ بات نہیں دیکھو گے۔ اس کی ذی قوۃ والی حالت اسے مغرور نہیں کریگی۔ بلکہ وہ اسے عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ بنادیگی۔ اسکی بادشاہت اسے نیکیوں میں اور بڑھا کر اسے خدا تعالیٰ کا اور بھی مقرب بنادیگی۔ اس کا تقوےٰ میں بڑھنا اسکا دین میں ترقی کرنا۔ اسکا لوگوں کے حقوق کی ادائگی کا خیال رکھنا سب باتیں اسکا ثبوت ہونگی۔ کہ اسکی بادشاہت دنیوی بادشاہت نہیں۔ اور اسکی بادشاہت اسے دین سے بے بہرہ کرنیکا موجب نہیں بلکہ اسے تقویٰ اور طہارت اور عرفان میں ترقی دینے کا موجب ہے۔

ذِیْ قُوَّۃٍ کہہ کر عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ کہنے کی وجہ

پھر فرماتا ہے مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ دو متضاد باتیں لے آیا ہے۔ اول مُطَاعٍ اور پھر ساتھ ہی اَمِیْنٍ۔ مُطَاعٍ کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ سب لوگ اس کی باتیں ماننے پر مجبور ہونگے۔ مگر فرمایا گو یہ لوگوں کا مطاع ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی اَمِیْنٍ بھی ہوگا۔ جو شخص مطاع ہو جاتا ہے۔ اسکے اندر بعض دفعہ غرور اور کبر پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وُہ سمجھتا ہے۔ کہ مَیں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ کوئی شخص میرے فیصلے کے خلاف اپنی زبان نہیں کھول سکتا۔ مگر فرماتا ہے جب خدا اس کے ہاتھ میں لوگوں کی گردنیں دیگا۔ انکی عزتیں دیگا۔ ان کے مال دیگا۔ تو تم دیکھو گے۔ یہ ہر شخص کا حق پوری دیانتداری کے ساتھ ادا کریگا۔ گویا جہاں خدا کا حق پوری طرح ادا کرنے کے لحاظ سے یہ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ ہوگا۔ وہاں بندوں کے حقوق ادا کرنے کے لحاظ سے یہ

مطاع کے ساتھ امین کا لفظ لانے میں حکمت

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ

اور تمہارا ساتھی ہرگز مجنون نہیں ۱۸ اور اس نے اُس (غیب) کو یقیناً کھلے اُفق میں

الْمُبِيْنِ ۝ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝

دیکھا ہے۔ اور وہ غیب (کی خبریں بتانے) میں ہرگز بخیل نہیں ۱۹

امن بھی ہوگا۔

ان چار الفاظ میں اللہ تعالےٰ نے حکومتی اخلاق کا ایسا بدنست نقشہ کھینچا ہے کہ جس کی مثال دنیا کے پردہ پر نہیں مل سکتی۔ فرماتا ہے یہ بادشاہ ہوجائیگا۔ مگر خدائی بادشاہت کا جُوا اپنی گردن پر رکھیگا۔ یہ حاکم ہوجائیگا مگر سب لوگوں کے حقوق پورے انصاف کے ساتھ ادا کریگا۔ گویا اطاعت اللہ اسمیں اس وقت پائی جائیگی جب اسکے پاس طاقت ہوگی۔ اور شفقت علی خلق اللہ اس میں اس وقت پائی جائیگی۔ جب بندے اس کے رحم پر ہونگے۔ غرض کَرِیْمٍ۔ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ۔ مُطَاعٍ۔ اَمِیْنٍ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ہیں جو ان آیات میں بیان کی گئی ہیں۔

ان آیات کے ایک اور معنے بھی ہیں۔ اور وہ یہ کہ آپ نے وہ عزت پائی۔ کہ کسی نے کیا پائی ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کو بھی وہ نصیب نہیں ہے۔ ذِیْ قُوَّۃٍ ایسے ہوئے کہ قیصر و کسریٰ کی بادشاہتوں کو الٹ دیا۔ مگر ساتھ ہی مَکِیْنٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ بھی ہیں کہ آجتک آپکی ہتک کرنے والے ذلیل کئے جاتے ہیں مُطَاعٍ ہیں کہ جب سب بادشاہوں کے تخت الٹے جارہے ہیں۔ آپکے تخت کو دوبارہ ایک مامور کے ذریعہ سے قائم کیا جارہا ہے۔ اَمِیْنٍ ہیں کہ جس کلام کو پہنچانا آپکے ذمہ لگایا گیا تھا۔ آج تک محفوظ ہے۔ اور روحانی طور پر اس کی حفاظت کا سامان کیا جارہا ہے۔ اسمیں اگر آپکی قوتِ قدسیہ کا دخل نہیں تو اور کیا ہے۔

الْاُفُقُ

۱۸ تفسیر۔ چونکہ ایسی پیشگوئیوں کو سنکر بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں۔ کہ یہ شخص جو ایسی باتیں کرتا ہے پاگل ہے۔ اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا اخلاق کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ۔ تم اس شبہ میں مبتلا نہ ہونا کہ یہ پاگل ہے۔ کیونکہ وہ صَاحِبُكُمْ ہے۔ تمہارے ساتھ رہا ہے۔ کہیں باہر سے نہیں آیا۔ اور تم خود اس کی نیکی اور تقویٰ اور عقل اور اصابت رائے کے گواہ رہے ہو۔ پھر اب کس وجہ سے اسے پاگل قرار دیتے ہو۔ آخر عقل سے جنون کی طرف رجوع یا کسی صدمہ سے ہوتا ہے یا بیماری سے یا تدریجی طور پر ہوتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تمہارے ساتھ رہے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی بات بھی آپ میں نہیں پائی جاتی۔ پھر ان کو پاگل تم کس طرح کہتے ہو۔ یہ قرآن کریم کا معجزانہ کمال ہے کہ ایک لفظ میں دلیل بیان کردیتا ہے۔ اس جگہ صرف صَاحِبُكُمْ کے مختصر سے لفظ سے مجنون ہونے کے الزام کی نفی کردی۔ یعنی اس طرف توجہ دلا کر کہ یہ تو تمہارا صاحب یعنی دوست اور مشیر کار اور راستدار کہلاتا تھا۔ یکدم اسے جنون آخر کہاں سے آیا۔ اور اس دعویٰ کے بعد اس کے مجنون ہونیکا فتوے کیوں لگانے لگ گئے۔ اس سے پہلے تو اسے اپنا آقا اور سردار کہا کرتے تھے۔ اور اپنا لیڈر تسلیم کرتے تھے۔ اور بڑا عقلمند اور سمجھدار قرار دیتے تھے۔

ضَنِيْنٌ

۱۹ حل لغات۔ اَلْاُفُقُ وَ الْاُفْقُ اَلْاٰفَاقُ کا مفرد ہے۔ اور اَلْاٰفَاقُ کے معنی ہیں اَلنَّوَاحِیْ اطراف (اقرب) اور اُفُقُ الْمُبِیْنِ۔ نَاحِیَةُ الْمَشْرِقِ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ سورج مشرق سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔

مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ اَیْ مَا هُوَ بِبَخِیْلٍ یعنی ضنین کے معنی ہیں بخیل اور مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ کے معنے ہیں کہ وہ غیب بیان کرنے پر بخیل نہیں (مفردات)

تفسیر۔ مجنون کے الزام کو رد کرکے اب بتاتا ہے۔ کہ

جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دورِ نبوت ایک لمبے عرصہ تک کے لئے ہے تو وہ اس لمبے عرصہ کے متعلق پیشگوئیاں کیوں نہ کرے۔ وہ اپنے دعویٰ کی وجہ سے مجبور ہے کہ جو باتیں تم کو دُور اور خلاف عقل نظر آتی ہیں اُن پر روشنی ڈالے کیونکہ وُہ باتیں اس کے زمانۂ بعثت کے اندر شامل ہیں تمہارے لئے وہ زمانۂ غیب ہے لیکن اس کے جان پر وہ ظاہر ہے اور اس کی دنیا کے لئے بطور افقِ مبین کے ہے جسے وہ دیکھ رہا ہے اور جن خبروں کو وہ بتا رہا ہے وہ مشرق سے تعلق رکھتی ہیں۔

مشرق کا استدلال اس سے ہوتا ہے کہ گو افق تو ہر جہت بعیدہ کو کہتے ہیں لیکن حدِ نظر جہاں آسمان اور زمین کو ملتے ہوئے دیکھتی ہے وہ ہر سمت افق تو ہوتی ہے مگر افقِ مبین نہیں ہوتی یعنی کھولنے اور ظاہر کرنے والی افق۔ کھولنے اور ظاہر کرنے والی افق مشرق ہی کی ہوتی ہے جدھر سے سورج نکلتا ہے اور اندھیروں کو پھاڑ دیتا ہے پس افقِ مبین کے الفاظ ادا کرکے نہ صرف زمانہ بعیدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بلکہ مشرق کی طرف کے ظہور کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ اس کی بتائی ہوئی خبریں گو تم کو عجیب معلوم ہوتی ہیں مگر تمہیں اسے مجنون کہنے کا حق نہیں ہے کیونکہ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ اس نے غیب کی ایک ہی خبر نہیں دی کہ تم کہہ دو یہ تو پاگل ہے بلکہ یہ غیب پر بخیل نہیں ہے یعنی اس نے آئندہ حالات سے تعلق رکھنے والی بہت سی اہم خبریں دی ہیں جن میں سے کئی پوری بھی ہو چکی ہیں۔ اگر ایک ہی خبر ہوتی جو اس نے دی ہوتی اور اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ کہا ہوتا کہ چونکہ تیرہ سو سال کے بعد ایسا ہو جائے گا اس لئے تم مجھے مان لو تو تم کہہ سکتے تھے کہ یہ پاگل ہے مگر اب تم یہ بات نہیں کہہ سکتے کیونکہ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ۔ یہ پہلی خبر نہیں ہے جو اس نے دی ہو بلکہ اور بھی یہ بہت سی خبریں دے چکا ہے اور وہ خبریں پوری بھی ہو چکی ہیں پس تم ان خبروں پر قیاس کرکے کہہ سکتے ہو کہ یہ بات بھی ایک دن پوری ہو جائے گی۔ تمہارا یہ حق نہیں ہے کہ تم اسے پاگل کہو۔ آج کل جو جھوٹے مدعی کھڑے ہو گئے ہیں اُن سے جب ہماری بحث ہوتی ہے کہ بتاؤ تمہاری کون کون سی پیشگوئی پوری ہوئی تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ تم مرزا صاحب کی فلاں بات مانتے ہو یا نہیں جس نے ابھی تین سو سال کے بعد پورا ہونا ہے جب تم اس بات کو مانتے ہو تو ہماری بات کیوں نہیں مان لیتے۔ ہم انہیں یہی کہا کرتے ہیں کہ اگر مرزا صاحب کی صرف یہی ایک پیشگوئی ہوتی کہ تین سو سال کے بعد ایسا ہو جائے گا تو یقیناً یہ آپ کی صداقت کا کوئی قطعی ثبوت نہ تھا۔ آپ کی صداقت کا ثبوت تو یہ ہے کہ آپ نے اس کے علاوہ اور بھی کئی پیشگوئیاں کیں جو پوری ہو گئیں اُن پر قیاس کرکے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ پیشگوئی بھی ایک دن پوری ہو جائے گی مگر تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تمہاری اب تک کوئی پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ جتنی پیشگوئیاں ہیں سب آئندہ زمانوں سے تعلق رکھتی ہیں چنانچہ جس قدر مدعی ہیں اُن کا سارا زور اسی پر ہوتا ہے کہ اگر تم اُن کو مان لو تو اسلام کو ترقی حاصل ہو جائے گی مگر وہ یہ نہیں سوچتے کہ میں ان کو کس طرح مان لوں جبکہ اُن کی صداقت کا کوئی ثبوت ہی نہیں۔ تو فرماتا ہے وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ۔ سچے مدعی کو پہچاننے کا یہ ایک زبردست اصول ہے کہ اس کی بعض پیشگوئیاں قریب زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض بعید زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیشگوئی فرمائی ہے کہ روس کا عصا مجھے دیا جائیگا یا تین سو سال میں جماعت احمدیہ کا ساری دنیا پر غلبہ ہو جائے گا۔ ان پیشگوئیوں کو دشمن دیکھتا ہے تو وہ کہتا ہے یہ محض ڈھکوسلے ہیں کون ان باتوں کو مان سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کا جواب اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں دیا ہے کہ یہ غیب پر بخیل نہیں ہے اس نے صرف ایک یا دو خبریں نہیں دیں جو ابھی صدیوں بعد پوری ہونیوالی ہیں بلکہ یہ اور بھی کئی قسم کی خبریں دے چکا ہے جو پوری ہو چکی ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے تم کیوں یہ تسلیم نہیں کرتے کہ جب وہ باتیں پوری ہو گئی ہیں تو یہ باتیں بھی پوری ہو جائیں گی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پاس آکر جب کوئی شخص کہتا کہ مجھے کوئی نشان دکھایا جائے تو آپ فرماتے پہلے نشانات سے

افقِ مبین سے مراد مشرق

سچے مدعی کو پہچاننے کا ایک اصول

# وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝

اور نہ وہ (یعنی اس پر نازل ہونیوالا کلام) دھتکارے ہوئے شیطان کی (کہی ہوئی) بات ہے ۵۲

تم نے کیا فائدہ اٹھایا ہے کہ تمہیں اور نشان دکھایا جائے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمائی ہے۔ کہ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ۔ بظاہر تم اسے ایک پاگل کی بڑ قرار دیتے ہو کہ دُور مشرق میں ایک مامور آئے گا جس کے ساتھ اسلام کی ترقی وابستہ ہوگی لیکن اگر یہ پاگلوں والی بات ہوتی تو اس کی صداقت کا کوئی اور ثبوت نہ ہوتا۔ لیکن جب اس کی پیشگوئیاں بکثرت ایسی موجود ہیں جو پوری ہو چکی ہیں تو تمہیں ماننا پڑیگا کہ یہ پاگل نہیں ہے اور پھر جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے اس کے اخلاق اور اس کی پہلی زندگی کے حالات مزید ثبوت ہیں اس بات کا کہ یہ مجنون نہیں ہے۔

رَجِيْمٍ **۵۲ حل لغات**۔ رَجِيْمٌ: رَجَمَ میں سے ہے اور رَجَمَهٗ کے معنے ہوتے ہیں رَمَاهُ بِالْحِجَارَةِ۔ اُسے پتھر سے مارا (۲) قَتَلَهٗ۔ اس کو قتل کر دیا (۳) قَذَفَهٗ۔ اس پر تہمت لگائی (۴) لَعَنَهٗ۔ اس پر لعنت کی (۵) شَتَمَهٗ۔ اس کو گالی دی (۶) هَجَرَهٗ۔ اس کو چھوڑ دیا (۷) طَرَدَهٗ اس کو دھتکار دیا (اقرب) پس رَجِيْم کے معنے ہونگے دھتکارا ہوا (۲) چھوڑا ہُوا (۳) ملعون (۴) تہمت لگایا ہُوا (۵) گالی دیا ہُوا (۶) پتھراؤ کیا ہُوا۔

**تفسیر**۔ یہاں ایک نہایت لطیف اور زبردست ثبوت پیش کیا گیا ہے جو صادق اور کاذب مدعی میں مابہ الامتیاز کا کام دیتا ہے مگر چونکہ یہ ثبوت باریک ہوتا ہے اس لئے جبتک ایک ماہرِ فن اس دلیل کو صحیح طور پر پیش نہ کرے دوسرا شخص سمجھ نہیں سکتا۔ رَجِيْم کے معنے ہوتے ہیں دھتکارا ہُوا پس وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ الرَّجِيْمِ کے یہ معنے ہوئے کہ یہ دھتکارے ہوئے شیطان کا قول نہیں ہے۔ یعنی دو ہی الزام کفار لگا سکتے تھے ایک یہ کہ نعوذ باللہ آپ پاگل ہیں اس کا جواب اوپر گذر چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ نعوذ باللہ آپ بد اور شیطان سے تعلق رکھتے ہیں اس کا بھی وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ سے رد ہو گیا کیونکہ جس کی کئی پیشگوئیاں پوری ہو چکی ہوں وہ شیطان سے تعلق رکھنے والا کس طرح کہلا سکتا ہے شیطان کو علمِ غیب کہاں سے آیا وہ تو دھتکارا ہوا ہے چنانچہ قرآن کریم نے دوسری جگہ اس مضمون کو یوں بیان فرمایا ہے اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨالْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝ (صافات ع۱) یعنی ہم نے ورلے آسمان کو ستاروں کے ساتھ مزین کیا ہے اور ہم نے اسے ہر سرکش شیطان سے محفوظ کیا ہے وہ خدا کے مقربوں کی بات نہیں سُن سکتے (کجا یکہ خدا تعالیٰ کی بات سنیں) اور ہر طرف سے اُن پر پتھراؤ ہوتا ہے تاکہ انہیں دُور کر دیا جائے اور انہیں مستقل عذاب ملتا ہے۔ ہاں اگر کوئی بات (مقربین سے) اُچک لے تو اللہ تعالیٰ اُس پر ایک چھید دینے والا ستارہ پھینکتا ہے جو اُسے تباہ کر دیتا ہے پس اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ علمِ غیب شیطانوں کو نہیں ہوتا۔ اگر جھوٹے ملہمین کسی کی بات کو اپنی طرف منسوب کر کے وہ غیب دان بننا بھی چاہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو سزا دے کر تباہ کر دیتا ہے پس جبکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غیب کے بیان کرنے میں بخیل نہیں یعنی کثرت سے غیب بیان کرتے ہیں تو انکا تعلق شیطان سے کس طرح ہو سکتا ہے وہ تو لازماً خدا تعالےٰ کے مامور ہی سمجھے جا سکتے ہیں۔ ایک دلیل اور بھی اس جگہ دی گئی ہے اور وہ یہ کہ رَجِيْم دھتکارے ہوئے کو کہتے ہیں۔ پس اس جگہ کفار کو اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ مدعی تو روز بروز ترقی کر رہا ہے جو شخص شیطان سے تعلق رکھتا ہے وہ تو ذلیل ہُوا کرتا ہے نہ کہ ترقی کرتا جاتا ہے۔

ضمنی طور پر اس جگہ یہ ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اس دلیل کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور اُن کے لئے سچے اور جھوٹے مدعی میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو مدعی بھی کھڑا ہوگا خواہ وہ جھوٹا ہی ہو کچھ نہ کچھ لوگ اس کے ساتھ ضرور مل جاتے ہیں اور پھر عام طور پر وہ اس بات کو اپنی صداقت کے ثبوت کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھو ہم اکیلے تھے اب ہمارے ساتھ اس قدر آدمی شامل ہیں۔ میں نے دیکھا ہے عام طور پر ہماری جماعت کے آدمی بھی بعض دفعہ ایسے موقع پر گھبرا جاتے ہیں مثلاً میاں عبد اللہ تیماپوری کہہ دیتے ہیں کہ میں پہلے اکیلا تھا مگر اب مجھے ماننے والے اتنے ہو گئے ہیں یا میاں غلام محمد کہہ دیتے ہیں میرے ساتھ اتنے لوگ ہیں اور یہ میری سچائی کا ثبوت ہے اگر میں جھوٹا ہوتا تو اللہ تعالیٰ مجھے یہ کامیابی کہاں عطا کرتا۔ درحقیقت یہ دلیل بہت نازک ہے اور جس طرح چٹانوں میں سے جہاز کو حفاظت سے گذارنا پڑتا ہے اسی طرح اس دلیل کے متعلق یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں کوئی شخص دھوکا نہ کھا جائے اور وہ اپنے ایمان کو برباد نہ کرے۔

درحقیقت اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ دلیل اس وقت مکمل ہوتی ہے جب تین باتیں اس میں پائی جائیں۔ بغیر ان تین پہلوؤں کے یہ دلیل کسی مدعی کی طرف سے اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش نہیں کی جا سکتی۔

اوّل اُس کی جماعت میں تقویٰ و طہارت اور نیکی کا ایک معیار ہونا چاہیئے۔ خالی چند آدمیوں کا ساتھ مل جانا یا دعویٰ پر ایمان لے آنا کسی مدعی کی صداقت کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ صداقت کے ثبوت کے لئے ضروری ہے کہ تقویٰ و طہارت اور نیکی کا معیار پیش کیا جائے جس سے پتہ لگے کہ اس مدعی پر ایمان لانے والوں کا خدا سے تعلق ہو گیا ہے۔ یہ تو لوگ مان سکتے ہیں کہ ایک شخص کو نیکی کا خیال تھا اور اس کے دل میں یہ احساس تھا کہ میں ترقی کروں مگر ایک دن اس کا دماغ خراب ہو گیا لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اُس سے جو شخص بھی جڑتا جائے اُس کی زندگی میں ایک تغیر پیدا ہوتا چلا جائے اور نیکی اور تقویٰ اس کے قلب میں سرایت کر جائے۔ پس کسی مدعی کو ماننے والوں کی نیکی اور تقویٰ کا معیار ایسا بلند ہونا چاہیئے اور اُن کے اندر اللہ تعالیٰ کی خشیت اور بنی نوع انسان کے لئے قربانی اور ایثار کا اس قدر مادہ ہونا چاہیئے کہ اسے دیکھ کر انسان خود بخود کہہ اُٹھے کہ جو لوگ خود ایسے ایسے ہیں ان کا مطاع تو بہرحال خدا کا راستباز انسان ہوگا۔ جب تک یہ علامت کسی جماعت کے اندر نہ ہو اس وقت تک اُس کے شیطانِ رجیم سے الگ ہونے کا کوئی یقینی ثبوت نہیں ہو سکتا۔

دوسرے شیطان رجیم کے معنے ہیں ایسا شیطان جو ذلیل ہو کیونکہ جس کو رجم ہوتا ہے وہ لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہو جاتا ہے مگر سچے نبی کی یہ علامت ہوتی ہے کہ اس کی جماعت بالقوہ اعزاز اپنے اندر رکھتی ہے اور اس کے افراد کے اندر ترقی کی ایسی قابلیتیں پائی جاتی ہیں کہ ہر دیکھنے والا اس یقین سے پُر ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ ایک دن دنیا پر غالب آجائیں گے۔

انبیاء کی جماعتوں کی تین صفات

جیسے حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق قرآن کریم میں ذکر آتا ہے کہ انہیں کفار نے یہ کہا کہ یَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا (ہود ع) اے صالح تجھ پر تو ہماری بڑی امیدیں تھیں اور ہم سمجھتے تھے کہ تُو قوم کو ترقی کی طرف لے جائے گا۔ یہ امید تو لوگ رکھتے ہی ہیں دعویٰ کے بعد جب ایک جماعت اس کے ساتھ کھڑی ہو جاتی ہے اُس وقت اُنکے دماغوں میں ایسی تازگی اور اُن کے دلوں میں ایسی ہمت بلند پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کسی روک کی پروا نہیں کرتے۔ مگر اس ہمت بلند سے مراد خیالی پلاؤ پکانا نہیں۔ جیسا کہ بعض مدعیوں نے کہہ دیا کہ دنیا کی حکومت ہمیں ملے گی۔ اور جب اُن کے ایک مرید نے کہا کہ مجھے کیا ملے گا تو اُسے کہا گیا کہ پنجاب کی بادشاہت۔ بلکہ ہمت بلند سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسے طریق اختیار کرتے ہیں جن سے دنیا یہ سمجھنے پر مجبور ہوتی ہے کہ اُن کی طرف سے دنیا کو فتح کرنے کے ذرائع عمل میں لائے جا رہے ہیں اور وہ اس غلبہ کے لئے معقول جد و جہد کر رہے ہیں۔ پس سچے مدعی کی دوسری علامت یہ ہوتی ہے کہ اس کی جماعت میں رجم نہیں پایا جاتا بلکہ

اقدام پایا جاتا ہے۔ رجم کے معنے ہیں بھاگنا جس پر پتھراؤ ہوتا ہے وہ اس سے بچنے کے لئے بھاگتا ہے۔ مگر صادق مدعی کی جماعت دشمنوں سے بھاگا نہیں کرتی بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے وہ حملہ کر کے اُن کو کھا جانے کی کوشش کر رہی ہے۔

تیسری بات اس کے اندر یہ بتائی گئی ہے کہ جس پر پتھراؤ ہو وہ سامنے نہیں آتا بلکہ اِدھر اُدھر چھُپتا پھرتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں مومنوں سے فرماتا ہے کہ وہ خنّاس کے وسوسوں سے بچنے کے لئے ہمیشہ دعا کرتے رہا کریں اور خنّاس وہی ہوتا ہے اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝ جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے پیدا کرتا اور خود چھپ جاتا ہے اسی مناسبت سے ان آیات میں خُنّس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر انبیاء کی جماعتوں میں کوئی اخفا نہیں ہوتا وہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی تعلیم کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم نے اس تعلیم پر جو جو اعتراض کرنا ہے وہ بے شک کرلو مگر دوسروں میں یہ ہمت نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ اُن کی تعلیم کا لوگوں کو علم نہ ہو۔ جیسے بہائی ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنے مذہب کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ کبھی سپاہی بھی لوگوں سے چھپتا ہے۔ سپاہی تو وردی پہن کر لوگوں کے سامنے پھرتا ہے مگر چور اِدھر اُدھر چھپتا پھرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کوئی اُسے دیکھ نہ لے۔ پس جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھڑے کئے جاتے ہیں وہ اپنی کسی بات کو چھپاتے نہیں۔ بلکہ علی الاعلان لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ ہمارے عقائد ہیں۔ ان باتوں پر ہمارا ایمان ہے اور یہ یہ ہماری شریعت کے احکام ہیں۔ اگر تمہیں ان پر کوئی اعتراض ہے تو بے شک کرلو۔ مگر جھوٹے لوگ اپنے مذہب اور اس کی تعلیم کو کسی نہ کسی رنگ میں ضرور چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پس فرماتا ہے وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ الرَّجِيمِ یہ شیطان رجیم کا قول نہیں اگر شیطان رجیم کا قول ہوتا تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسے ضرور چھپاتے مگر اُسے تو ہم نے حکم دیا ہوا ہے کہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (الحجر ع ۶) کہ اے نبی جس چیز کے ظاہر کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اُسے ظاہر کرو۔ اور بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (المائدہ ع ۱۰) کہ جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کو تم لوگوں تک پہنچا دو۔ اور جب کوئی بات تم سے نہیں چھپائی جاتی تو یہ شیطان رجیم کا کلام کس طرح ہو سکتا ہے؟ تم بے شک اعتراض کرلو۔ اس تعلیم کے متعلق جو کچھ کہنا چاہتے ہو کھلے طور پر کہہ لو تمہاری ایک ایک بات کا جواب دیا جائے گا اور ثابت کیا جائے گا کہ تمہارے اعتراضات محض غلط ہیں اصل تعلیم وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے۔ اور جبکہ کوئی بات بھی اس کلام میں ایسی نہیں جو خدا کی طرف منسوب نہ ہو سکتی ہو یا لوگوں کے اعتراضات کے ڈر سے اُسے چھپانے کی ضرورت محسوس ہو۔ تو یہ چیز اپنی ذات میں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شیطان رجیم کا قول نہیں ہے یہ صادق اور کاذب مدعی نبوت میں امتیاز کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ عام طور پر ہر مدعی کاذب اپنی تعلیم میں کسی حد تک ضرور اخفا سے کام لیتا ہے مگر صادق مدعی نبوت جو کچھ کہتا ہے علی الاعلان کہتا ہے۔ ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے۔ اور کسی اعتراض کی پروا نہیں کرتا۔ اسی طرح شیطانی جماعتوں میں قوتِ اقدام نہیں ہوتی۔ کوئی ایسی سکیم اُن کے سامنے نہیں ہوتی جس پر عمل کر کے وہ ترقی کی امید کر سکیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی جماعت کی ترقی کے لئے غیر معمولی سامان بھی پیدا کر دیا کرتا ہے مگر بہرحال جماعتی تدابیر کا بھی بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ وہ کُن کہہ کر اپنے نبی کے ماننے والوں کو دنیا پر غالب نہیں کر دیا کرتا بلکہ کئی قسم کی دنیوی تدابیر سے کام لیتا ہے گویا تقدیر اور تدبیر دونوں کا ایک چکر ہے جو چلتا چلا جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ (آل عمران ع ۵) کہ کفار نے بھی تدابیر سے کام لیا اور اللہ نے بھی تدابیر سے کام لیا اور آخر خدا اپنی تدابیر میں غالب آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی سلسلوں کی کامیابی میں بھی تدبیر کا

فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝

پھر (باوجود اس کے) تم کہاں جاتے ہو - یہ تو صرف (تمام) جہانوں کے لئے ایک نصیحت ہے ۲۱؎

دخل ہوتا ہے گو تدبیر اور تقدیر دونوں کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اُسی کی مشیّت کا دنیا میں نفاذ ہوتا ہے۔ مگر الٰہی جماعتوں کا یہ اوّلیں فرض ہوتا ہے کہ وہ ترقی کی تدابیر اختیار کریں اور ایسی سکیمیں سوچیں جو اُن کے قدم کو آگے کی طرف بڑھانے والی ہوں۔

ہماری جماعت کو دیکھ لو اللہ تعالےٰ نے ہمارے ہر فرد کے اندر ایسی قوتِ اقدام رکھ دی ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ جماعت ایک دن دنیا کو کھا جائے گی۔ "زمیندار" جیسے اشد معاند اخبار نے بھی ایک دفعہ لکھا تھا کہ "میری آنکھیں یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہیں کہ وہ لوگ جو کینٹ اور ہیگل کے فلسفہ تک کو خاطر میں نہیں لاتے وہ بھی مرزا غلام احمد قادیانی کے ماننے والوں میں شامل ہوتے جاتے ہیں" (زمیندار ۹ راکتوبر ۱۹۳۲ء) اُس کا یہ اقرار درحقیقت اعلان تھا اس امر کا کہ وہ بھی محسوس کر رہا ہے کہ جماعت احمدیہ دنیا پر چھا جائیگی۔

پھر سچے مدعی کی تعلیم میں کوئی اخفا نہیں ہوتا۔ وہ کھلم کھلا اپنی باتوں کو پیش کرتا اور ساری دنیا کو پکار کر کہتا ہے کہ اگر تم نے کوئی اعتراض کرنا ہے تو آؤ اور اعتراض کرو میں اس کا جواب دینے کے لئے تیار ہوں شیطان رجیم میں یہ جرأت کہاں ہوسکتی ہے وہ تو کوشش کرتا ہے کہ لوگوں کی نگاہ سے چھپے اور خنّاس بن کر مخفی رہے۔ اسی طرح سچے مدعی کی جماعت کو نیکی کا جو بلند مقام حاصل ہوتا ہے وہ کاذب مدعی کے ماننے والوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ غرض شیطان بزدل ہوتا ہے مگر مومنوں کے اندر اقدام پایا جاتا ہے۔ شیطان بدی کی طرف لے جاتا ہے اور اُن میں نیکی کا مادہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ شیطان بے اصول ہوتا ہے مگر اُنکے سامنے ایک معیّن پروگرام ہوتا ہے جو اُن کی کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔ شیطان چھپ چھپ کر باتیں کرتا ہے اور وہ علی الاعلان باتیں کرتے ہیں۔ پھر تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ یہ کلام جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں یہ شیطانِ رجیم کا کلام ہے۔

بعض دفعہ الفاظ تھوڑے سے ہوتے ہیں مگر اُن میں مضامین بڑے وسیع طور پر پائے جاتے ہیں یہاں بھی شیطان رجیم کا لفظ رکھ کر اللہ تعالےٰ نے ایک بہت بڑا مضمون بیان کر دیا ہے اور اُن آیات کی طرف اشارہ کر دیا ہے جن میں شیطان رجیم کا ذکر آتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ شیطان رجیم کی جو جو عادتیں قرآن کریم میں بیان کی گئی ہیں وہ سب دیکھ لو اور پھر ایک ایک بات کے متعلق غور کرو آخر تم اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ یہ شیطان رجیم کا کلام نہیں ہے۔

**۲۱؎ حل لغات** - ذِكْرٌ : کے معنے ہیں اَلتَّلَفُّظُ بِالشَّیْءِ - کسی چیز کا زبان سے تلفظ کرنا۔ اِحْضَارُهٗ فِی الذِّهْنِ بِحَیْثُ لَا یَغِیْبُ عَنْهُ - کسی چیز کو ذہن میں اس طرح مستحضر کرنا کہ وہ ذہن سے غائب نہ ہوجائے۔ اَلصِّیْتُ - شہرت۔ اَلشَّرَفُ - بزرگی - شرف - اَلْكِتَابُ فِیْهِ تَفْصِیْلُ الدِّیْنِ وَوَضْعُ الْمِلَلِ - ایسی کتاب جس میں دین کی تفصیل ہو۔ اَلذِّكْرُ مِنَ الْقَوْلِ - اَلصُّلْبُ الْمَتِیْنُ - پکی اور مضبوط بات (اقرب)

ذِكْرٌ ۲

**تفسیر** - فرماتا ہے اب بولو۔ کیا تمہارے لئے کوئی بھی رستہ باقی ہے۔ اگر تم کہو کہ اس کی ذات میں نقص ہے تو ہم نے تمہارے سامنے یہ بات پیش کر دی ہے کہ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ - یہ تمہارا ساتھی ہے دن رات تمہارے ساتھ رہتا اور تمہارے ساتھ ہی اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ تم خود اس بات کی گواہی دے سکتے ہو کہ یہ مجنون نہیں ہے۔ پھر اگر تم کہو کہ اس نے جو کلام پیش کیا ہے یہ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ شیطان کی طرف سے ہے تو اس کا بھی

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ

(خصوصاً) تم میں سے اس کے لئے جو سیدھے راستہ پر چلنا چاہے ۲۲؎ اور تم یہ نہیں چاہ سکتے مگر

اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اسی صورت میں کہ اللہ (جو) سب جہانوں کا رب (ہے) ایسا ہی چاہے ۲۳؎

ع ۱ ۶

ہم نے تفصیلاً جواب دے دیا ہے اب جواب دو کہ تمہارے لئے کونسا راستہ باقی ہے سوائے اس کے اب تمہارے لئے اور کوئی چارہ نہیں کہ تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہو جاؤ اور ان کی بیعت میں شامل ہو جاؤ۔ اگر تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل جاؤ گے تو جنت میں جاؤ گے اور اگر انکار کرو گے تو جہنم میں داخل کئے جاؤ گے اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ باقی تمہارا یہ جو سوال ہے کہ اگلے زمانہ سے تعلق رکھنے والی خبریں ابھی سے کیوں دی جارہی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے مخاطب صرف مکہ والے نہیں بلکہ وہ بھی ہیں جو تیرہ سو سال کے بعد آئینگے اور وہ بھی ہیں جو قیامت تک آئیں گے۔ تم تو مکہ کے کنوئیں کے مینڈک ہو تم یہ بات کہاں سمجھ سکتے ہو کہ قرآن صرف مکہ کے لئے نہیں۔ صرف عرب کے لئے نہیں بلکہ وہ ساری دنیا اور قیامت تک آنے والے سب زمانوں کے لئے ہے اس لئے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ باتیں بھی بیان کرنی پڑتی ہیں جو اگلے زمانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ تم ان باتوں پر ہنستے ہو مگر اس کی وجہ یہی ہے کہ تمہاری نظر وسیع نہیں۔ تم اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ قرآن کو ہم نے تمام دنیا کی ہدایت کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس میں آئندہ زمانوں میں رونما ہونیوالے واقعات کے متعلق بھی خبریں موجود ہوں۔

قرآن مجید ہر فطرت کے لئے

**۲۲؎ تفسیر**۔ فرماتا ہے اس قرآن کی صرف یہی خوبی نہیں کہ یہ تمام زمانوں کی ہدایت کے لئے نازل کیا گیا ہے بلکہ اس کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس کے احکام میں ہر فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ہر قسم کی فطرت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس شریعت کو نازل کیا ہے جس فطرت کا آدمی بھی اللہ تعالیٰ کے قرب کا راستہ اختیار کرنا چاہے وہ آسانی سے اختیار کر سکتا ہے اور اُسے جس قدر سامانوں کی ضرورت محسوس ہو وہ سب سامان قرآن میں موجود ہیں جس طرح تم میں سے ہر امیر اور غریب۔ عورت اور مرد۔ بچہ اور جوان۔ مالک اور مزدور۔ حاکم اور ماتحت کے متعلق قرآن کریم میں احکام موجود ہیں اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق مکمل ہدایات اس میں نہ ہوں۔ اسی طرح کوئی فطرت ایسی نہیں جس کے لئے قرآنی احکام پر عمل کرنا بوجھ محسوس ہو ہر نوع کا اس میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہر فطرت کا اس میں لحاظ رکھا گیا ہے اور پھر ہر زمانہ کا اس میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ پس ہماری طرف سے یہ کھلا اعلان ہے کہ بنی نوع انسان میں سے جو چاہے فائدہ اُٹھائے۔ لفظ مِنْكُمْ میں صرف مکہ والوں سے خطاب نہیں بلکہ تمام اہل زمین کو خطاب ہے اور لِمَنْ شَآءَ سے مراد لِمَنْ شَآءَ مِنْ سُكَّانِ الْعٰلَمِيْنَ ہے کہ کسی زمانہ میں کسی فطرت کا آدمی آ جائے قرآن میں اُس کی ہدایت کا سامان موجود ہوگا۔ بے شک اس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو تمہاری فطرت یا تمہارے زمانہ کے مطابق نہیں ہیں اور تمہیں یہ پاگل پن کی باتیں نظر آتی ہیں مگر ہم ان کا ذکر چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ قرآن صرف تمہارے لئے نہیں بلکہ ہر زمانہ کے لئے ہے۔

**۲۳؎ تفسیر**۔ پہلے میں وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ کے صرف یہ معنے سمجھا کرتا تھا کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ میں واؤ حالیہ ہے اور میں پہلی

آیت سے تھا کہ اس کے یہ معنے کیا کرتا تھا کہ جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہے درآنحالیکہ اس کی مشیت خدا کی مشیت کے مطابق ہو جائے وہ ہدایت پا جائے گا لیکن اب میں اس کے ایک اور معنے سمجھتا ہوں جو ترتیبِ مضمون کے اعتبار سے بھی پہلے معنوں پر مقدم ہیں۔ اس ضمن میں ایک بات پہلے ذہن نشین کر لینی چاہیئے۔ کہ پہلے فرمایا تھا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ اور یہاں فرمایا ہے وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ ان الفاظ نے میری توجہ کو اس بات کی طرف پھیرا کہ یہاں درحقیقت ایک وسیع مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وہ مضمون یہ ہے کہ دنیا میں دو زمانے آیا کرتے ہیں ایک زمانہ وہ ہوتا ہے جب افراد کے سامنے ہدایت موجود ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ وہ اس ہدایت کی طرف توجہ کریں یا نہ کریں۔ لیکن دوسرا زمانہ وہ ہوتا ہے جب ہدایت کُلّی طور پر دنیا سے مٹ جاتی ہے اور بحیثیت قوم دین پر زوال آ جاتا ہے ایسے وقت میں افراد کے دل میں صحیح طریق کی طرف رغبت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ آخر کسی چیز کی طرف رغبت اچھے نمونہ کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ انسان کہتا ہے فلاں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے مجھے بھی کوشش کرنی چاہیئے کہ میرے اندر یہ خوبی پیدا ہو۔ فلاں بڑا نمازی ہے میں بھی نمازی بنوں یا فلاں بڑا روزہ دار ہے میں بھی روزے رکھا کروں غرض نیکیوں کی طرف رغبت اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک نمونہ سامنے موجود نہ ہو۔ اسی لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ اگر تم نیکیوں میں ترقی کرنا چاہتے ہو تو صادقین کی صحبت میں رہا کرو۔ لیکن جب نمونہ کوئی نہ رہے اور بحیثیت قوم زوالِ دین ہو جائے تو لوگ نیکیوں کی طرف کس طرح توجہ کر سکتے ہیں ایسے زمانہ میں جب تک پہلے اللہ تعالیٰ کی مشیت ظاہر نہ ہو۔ وہ اپنی طرف سے کسی کو لوگوں کی اصلاح کیلئے کھڑا نہ کرے اور آسمان سے ہدایت نازل نہ ہو اُس وقت تک لوگوں کے قلوب میں نیکی کی رغبت اور اس پر عمل کرنیکا احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ گویا ایک وقت تو وہ ہوتا ہے جب بندے کے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ دین کی طرف رغبت کرے اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو یہ اس کا اپنا قصور ہوتا ہے ورنہ خدا نے اس کی ہدایت کا سامان پیدا کیا ہوا ہوتا ہے لیکن دوسرا وقت وہ ہوتا ہے کہ اگر خدا ہدایت کا سامان کرے تو لوگ ہدایت پا سکتے ہیں ورنہ صراطِ مستقیم کا پانا تو الگ رہا اُس کی سچی خواہش بھی لوگ اپنے دل میں پیدا نہیں کر سکتے۔ پس ایسے زمانہ کا واحد علاج مامور کی بعثت ہوتی ہے۔ جب تک کسی مامور کی بعثت نہ ہو لوگ ہدایت کی راہوں کو اختیار نہیں کر سکتے یہ زمانہ جس کی ان آیات میں خبر دی جا رہی تھی چونکہ ایک مامور کا زمانہ تھا اور جس وقت یہ خبر دی جا رہی تھی وہ بھی ایک مامور کا زمانہ تھا۔ گویا اس سورۃ کے شروع میں جن لوگوں کی خبر دی گئی تھی وہ بھی ایسے تھے جن میں ایک مامور نے آنا تھا اور جن کی خبر آخری آیت میں ہے وہ بھی وہ تھے جن میں ایک مامور آیا ہوا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے والو! تم جو کہتے ہو کہ ہمیں محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ یا اے لوگو! جنہیں ایک مامور کی بعثت کی کی خبر افقِ مبین میں دی گئی ہے۔ تم کہتے ہو کہ ہمیں مامور کی ضرورت نہیں ہم خود اللہ تعالیٰ کے قرب کے راستوں کو اختیار کر لیں گے۔ تمہیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں ہدایت بالکل مٹ چکی ہے اس لئے تمہارا حال اب اُن لوگوں کی طرح نہیں ہے جو نبی کے زمانہ میں ہوتے ہیں جن کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب چاہیں ہدایت پر چلنا شروع کر دیں۔ تو کہتے ہو کہ ہم اپنے زور سے ترقی حاصل کر لیں گے ہمیں کسی مامور کی اتباع کی ضرورت نہیں۔ مگر یاد رکھو تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ آ جائے تو پھر دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہو سکتی جو اس پر ایمان لانیکے

مامور کے آنے کی ضرورت

بغیر ترقی کر سکے۔ اگر کوئی فرد یا کوئی قوم ایسی امید اپنے دل میں رکھے تو یہ محض اس کی جہالت ہوگی۔ جب دلوں میں سے کلی طور پر ایمان مٹ جاتا ہے تو پھر جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نازل نہ ہو وہ نہ صرف ہدایت سے ہی محروم نہیں ہوتی بلکہ ہدایت کے متعلق رغبت بھی اسکے دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یاد رکھو یہ بالکل ناممکن ہے کہ تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بغیر ترقی کر سکو۔ اس زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں بڑے بڑے مولوی مسلمانوں میں موجود ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو کسی مسیح یا مہدی کی کیا ضرورت ہے۔ علماء راہنمائی کا فرض سرانجام دینے کے لئے بالکل کافی ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے پہلے رَبُّ الْعَالَمِیْن کو جوش آئے گا کہ میں اپنا کلام دنیا میں بھیجوں اس کے بعد بنی نوع انسان میں قرب الٰہی کی سچی خواہش پیدا ہوگی۔ اس کے بغیر یہ خواہش کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

غرض اس آیت میں یہ اصول بتایا گیا ہے کہ جب ہدایت دنیا سے کلی طور پر مٹ جاتی ہے گمراہی چاروں طرف چھا جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کا نور لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس زمانہ میں جب کبھی ترقی ہوگی آسمانی نشانات اور ماموِر الٰہی کی بعثت کے ذریعہ ہوگی۔ گویا پہلے خدا کی مشیت آسمان سے ظاہر ہوگی اور اس کے بعد لوگوں کے دلوں میں نیکی کی طرف رغبت پیدا ہوگی اسی لئے ذِکْرٌ لِّلْعَالَمِیْنَ کو وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ کے ساتھ ملا کر بیان کیا کہ ایک ایسا زمانہ ہوتا ہے رَبُّ الْعَالَمِیْنَ جب ذِکْرٌ لِّلْعَالَمِیْنَ نازل کرے تب ہی افراد کے دلوں میں نیکی کی خواہش پیدا ہوتی ہے ورنہ نہیں۔ جو شخص اس نکتہ سے غافل ہوتا ہے وہ ہدایت پانے سے محروم رہ جاتا ہے ؏

---

# سُوْرَۃُ الْاِنْفِطَارِ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ الانفطار - یہ سورۃ مکی ہے

## وَھِیَ دُوْنَ الْبَسْمَلَۃِ تِسْعَ عَشْرَۃَ اٰیَۃً

اور اس کی بسم اللہ کے علاوہ اُنیس ۱۹ آیات ہیں ۵

۵ سُورۃ الانفطار کا مضمون پہلی سورۃ کے مضمون کے تسلسل میں ہے اسے الگ اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں اسی سلسلہ کی ایک مستقل کڑی کو بیان کیا گیا ہے۔ گویا مضمون تو وہی ہے مگر اُس کی ایک دوسری قسم بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی علامتیں جو مسیحیت کے ساتھ خاص ہیں وہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں۔ اس بات کی حکمت کہ کیوں دو ٹکڑے کر دئے گئے ہیں ایک تو یہی ہے کہ بعض حصے بعض مضمونوں کے خاص ہوتے ہیں اُن پر زور دینے کے لئے اُن کو الگ کر دیا جاتا ہے۔

دوسری حکمت جو قرآن کریم کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے اور گو وہ ایک چھوٹی سی بات ہے مگر اس سے قرآن کریم کے ماننے والوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے یہ ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ تھا اور قرآن کریم آخری الہامی کتاب تھی جس کی وجہ سے اس کے مضامین کو اس کے ماننے والوں کے قلوب میں پختہ کرنا نہایت ہی اہم سوال تھا پہلی کتابوں کو اگر اُن کے ماننے والے بھول بھی جاتے تو اس میں کوئی حرج نہ تھا کیونکہ اُن کی جگہ اور کتابیں آنے والی تھیں لیکن قرآن کریم آخری شرعی کتاب تھی اگر لوگ اس کو بھول جاتے تو دُنیا میں تباہی آجاتی۔ اور لوگ ہمیشہ کی گمراہی میں مبتلا ہو جاتے پس اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جو بظاہر بالکل چھوٹی سی ہے مگر نتیجہ کے لحاظ سے اتنی اہم ہے کہ اُس کی قیمت کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا اور وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کو مختلف ٹکڑوں میں بیان کیا گیا۔ اور پھر وہ ٹکڑے ایسی ترتیب سے بنائے گئے کہ چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑہ سے لیکر بڑے سے بڑے ٹکڑہ تک اس کو تقسیم کر دیا گیا جس کی وجہ سے چھوٹا بچہ بھی اُس کا کچھ حصہ یاد کر سکتا ہے اُس سے بڑا بھی یاد کر سکتا ہے اُس سے بڑا بھی اور اُس سے بڑا بھی۔ ادنیٰ سے ادنیٰ حافظہ والا بھی اس کا کچھ حصہ یاد کر سکتا ہے اور پھر اس سے اوپر جیسے جیسے حافظے بڑھتے چلے جائیں وہ اس کے مختلف ٹکڑے یاد کر سکتے ہیں۔ سورہ اخلاص اور سورہ کوثر کتنی چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں پوری دو دو سطر کی بھی نہیں ہیں بلکہ اگر باریک لکھی جائیں تو ایک سطر میں ختم ہو جاتی ہیں اور معمولی حافظہ کا چار سال کا بچہ بھی اُنکو یاد کر سکتا ہے۔ سورۂ بقرہ اڑھائی پاروں کی ہے اور ان کے درمیان مختلف درجوں کی سورتیں ہیں کوئی تین پانچ دس یا پندرہ آیت کی۔ کوئی بیس تیس اور ساٹھ آیت کی اور کوئی سو آیت کی۔ اسی طرح سورتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں پس کسی لیاقت اور حافظہ کا آدمی نہیں جو قرآن کریم کی کوئی سورۃ یاد نہ کر سکتا ہو۔ اور جس کا حافظہ تیز ہو وہ تو سارا قرآن یاد کر لیتا ہے چنانچہ اس پر عمل ہو رہا ہے اور وہ مسلمان جو تعلیم یافتہ ہیں آخری دو تین پاروں کی سورتیں علیٰ قدر مراتب یاد کر لیتے ہیں۔ اس طرح ایک ہی وقت میں قرآن کریم کے مختلف ٹکڑوں کے لاکھوں حافظ موجود ہوتے ہیں سارے قرآن کے حافظ الگ رہے بظاہر یہ کتنی چھوٹی سی بات ہے مگر دُنیا کی زندگی چھ ہزار سال کی سمجھو یا لاکھ کی یا دس لاکھ کی۔ اگر کسی انسان نے یہ بات بنائی ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی انسان کو یہ بات نہیں سوجھی آخر دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو قرآن مجید کو انسانی کلام

سورۃ الانفطار کا تعلق پہلی سورۃ سے ہے۔

قرآن مجید کی ایک خصوصیت

قرآن کریم کو مختلف ٹکڑوں میں اتارے جانے کی وجہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ○

جب آسمان پھٹ جائے گا ۲

سمجھا جائے یا خدائی کلام سمجھا جائے۔ اگر کہو کہ یہ انسانی کلام ہے تو پھر دنیا میں جو انسانی کلام ہیں ان میں سے کسی میں بھی یہ بات نہیں اور آج تک کسی انسان کو یہ بات نہیں سوجھی بلکہ قرآن کریم کے نازل ہونے کے بعد بھی نہیں سوجھی۔ اور اگر یہ خدا کا کلام ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ اس کتاب کے متعلق اس کا منشا تھا کہ اسے یاد کیا جائے تبھی اُس نے یہ تدبیر کی۔ اگر انسانی کلام سمجھ لو تب بھی اسکی فوقیت ثابت ہے اور یُوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک چھوٹے سے گُر کے ذریعہ اُس نے کایا پلٹ دی۔ اور اگر خدائی کلام سمجھ لو تو تب بھی ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ اس کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

قرآن مجید کا مختلف ٹکڑوں میں اترنا اُسکی فوقیت کا موجب۔

اگر کوئی کہے کہ کوئی ٹکڑہ تو جس کتاب میں سے چاہے انسان یاد کر سکتا ہے پس اس طرح ٹکڑے کرنے سے قرآن کریم کو کونسی خصوصیت حاصل ہوگئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک کتاب میں سے کوئی ٹکڑہ انسان یاد کر سکتا ہے مگر کیا ہر شخص اس بات کا بھی فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ ٹکڑہ اپنے اندر کامل مضمون رکھتا ہے۔ یہ تو مصنّفِ کتاب یا منزلِ کتاب ہی بتا سکتا ہے کہ اُس کا کون کونسا ٹکڑہ اپنی ذات میں مکمل ہے قرآن شریف کا ہر ٹکڑہ صرف چند آیتوں کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل مضمون کا نام ہے کوئی تین آیتیں سورہ بقرہ کی انسان یاد کرے تو اسے کیا فائدہ ہو سکتا ہے بسا اوقات وہ تین آیتیں کسی مکمل مضمون پر مشتمل نہ ہونگی اور جب تک سیاق وسباق کو نہ ملایا جائے گا وہ اپنے مفہوم کو واضح نہیں کرینگی لیکن سورۂ اخلاص کو لے لو تو گو وہ دو سطر کی بھی سورۃ نہیں مگر اُس میں ایک سارا مضمون بیان کر دیا گیا ہے اسی طرح سورۂ کوثر لے لو یا سورۂ لہب کو لے لو

اِنْفَطَرَتْ

سب اپنے اپنے مضامین کے اعتبار سے بالکل مکمل ہیں لیکن اور سورتوں کا اگر اتنا ہی کوئی ٹکڑا لے لیا جائے تو جہاں تک مضمون کا تعلق ہے ضروری نہیں کہ اُس میں مکمل مضمون آ جائے مگر جب مصنف یا منزلِ کتاب ٹکڑوں کو الگ الگ کر دے تو پھر اس میں سہولت ہو جاتی ہے پس قرآن کا صرف کوئی ٹکڑہ یاد کر لینا وہ فائدہ نہیں دے سکتا تھا جو فائدہ موجودہ صورت میں پہنچ رہا ہے اور وہ تحریک بھی پیدا نہیں کر سکتا تھا جو موجودہ صورت میں قلوب میں پیدا ہوتی ہے چنانچہ اس بات کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر عیسائیوں سے پوچھا جائے کہ انہیں انجیل کے کتنے ٹکڑے یاد ہیں تو شائد چند معروف ٹکڑے انہیں یاد ہوں تو ہوں ورنہ ساری انجیل مختلف ٹکڑوں کی صورت میں ان کو یاد نہیں ہوگی لیکن اگر قرآن کے متعلق پوچھا جائے تو سارا قرآن مختلف ٹکڑوں کی صورت میں غیر حافظ لوگوں کو بھی یاد ہوگا کسی کو سورۃ بقرہ یاد ہوگی کسی کو سورۂ آل عمران یاد ہوگی کسی کو سورۂ نساء یاد ہوگی اور کسی کو آخری سورتوں میں سے کوئی سورتیں یاد ہونگی تو علیحدہ تقسیم کی وجہ سے حفظ میں جو مدد ملی ہے وہ اکٹھا رکھنے کی صورت میں نہیں مل سکتی تھی اور اسی حکمت کے ماتحت انکی تقسیم کی گئی ہے۔

غرض گو اس سورۃ کا مضمون پہلی سورۃ کے مضمون کے تسلسل میں ہے مگر اسے الگ اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں بعض جدید مضامین کی طرف توجہ دلائی گئی جو گو تعلق تو اسی سلسلہ سے رکھتے ہیں مگر انکی نوعیت اور رنگ کی ہے اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ مضمون جہاں مختلف ہوتا ہے وہاں الگ سورۃ بنا دی جاتی ہے تاکہ اس کا پڑھنا اور یاد کرنا کمزوروں پر بھی گراں نہ گذرے۔

**۲ حل لغات۔** اِنْفَطَرَتْ: اِنْفَطَرَ سے

مؤنث کا صیغہ ہے اور اِنْفَطَرَ الشَّیْئُ کے معنی ہیں اِنْشَقَّ کوئی چیز پھٹ گئی (اقرب) پس اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ کے معنے ہونگے جب آسمان پھٹ جائے گا۔

تفسیر۔ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ میں آخری زمانہ کے اُس تغیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو عیسائیت سے وابستہ ہے یعنی عیسائیت کے غلبہ کی طرف اس سورۃ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم ع) قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اور زمین بھی پھٹ جائے اور پہاڑ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر جائیں۔ اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے رحمٰن کا ایک بیٹا تسلیم کیا ہے جس وقت قرآن کریم نازل ہوا ہے اس وقت عیسائیت کو دنیا کے بہت تھوڑے حصہ پر غلبہ حاصل تھا اور وہ عام تبلیغ بھی نہیں کرتے تھے اُس وقت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جتنا شرک عیسائیوں کی طرف سے اس وقت کیا جاتا ہے قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائیں پھر اگر کوئی ایسا زمانہ آجائے جب اُس سے دس بیس بلکہ سو گنا زیادہ شرک پھیل جائے تو لازمی طور پر قرآنی محاورہ کے مطابق ہم بھی کہیں گے کہ آسمان پھٹ گیا چنانچہ دیکھ لو روما کی حکومت عیسائی تھی مگر ساری دنیا اُس کے ماتحت نہیں تھی صرف ترکی مصر حبشہ اور یونان اس کے ماتحت تھا گویا وسطی ایشیا کا ایک جزو تھا جس پر وہ حکمرانی کر رہی تھی مگر آج عیسائیت کو ساری دنیا پر غلبہ حاصل ہو چکا ہے۔ پھر عیسائیت کی تبلیغ کے نئے نئے تدابیر کو اس زمانہ میں اختیار کیا گیا ہے وہ پہلے کبھی اختیار نہیں کی گئیں کروڑوں کروڑ انجیل کے نسخے دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دیئے گئے ہیں۔ لاکھوں روپیہ اپنے مشنوں کی کامیابی پر خرچ کیا جاتا ہے مدرسے بنائے جاتے ہیں تاکہ اُن کے ذریعہ لڑکوں کو عیسائیت کا شکار بنایا جاسکے۔ کالج بنائے جا رہے ہیں تاکہ عیسائیت کا زہر نوجوانوں کے قلوب میں داخل کیا جائے کوڑھی خانے بنائے جا رہے ہیں۔ شفا خانے تیار ہو رہے ہیں اور ان سب کی غرض صرف یہی ہے کہ لوگ ایک خدا کی پرستش چھوڑ دیں اور تین خداؤں کو ماننے لگ جائیں پس جب عیسائیت کے قلیل غلبہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں کیونکہ یہ لوگ مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دے رہے ہیں تو اب جبکہ شرک تمام دنیا میں پھیل چکا ہے اور عیسائیت کا غلبہ اپنے کمال تک جا پہنچا ہے یہ کیوں نہیں کہا جائے گا کہ وہ آسمان جو پھٹنے کے قریب تھا اب شدت شرک کی وجہ سے پھٹ گیا ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ میں عیسائیت کے تمام دنیا میں چھا جانے کی طرف اشارہ

جو چیز اپنی انتہاء کو پہنچ چکی ہو اس پر اگر ذرا بھی زور لگ جائے گا تو وہ سلامت نہیں رہ سکتی بلکہ پھٹ جاتی ہے پس فرماتا ہے اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وہ جو ہم نے کہا تھا کہ آسمان اور زمین عیسائیوں کے مشرکانہ عقیدہ کی وجہ سے پھٹنے کے قریب ہیں اگر شرک ذرا بھی بڑھا تو وہ پھٹ جائیں گے وہ زمانہ آئندہ آنے والا ہے کہ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا پر یہ لوگ زور دینا شروع کر دیں گے اور آسمان پھٹ جائے گا کیونکہ ظلم اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا۔ پس آسمان پھٹ جائے گا سے مراد یہ ہے کہ عیسائیت غالب آجائے گی اور شرک بڑی کثرت سے دنیا میں پھیل جائے گا چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ جس قسم کی ترقی اور جس قسم کا غلبہ عیسائیت کو حاصل ہوا ہے اُس قسم کی ترقی اور غلبہ کی مثال درحقیقت اسلام کے زمانہ میں بھی نہیں ملتی فرق یہ ہے کہ اسلام نے ایک چھلانگ میں ترقی کی ہے اور انہوں نے بیسیوں چھلانگوں میں ترقی کی ہے پھر اسلام کی ترقی تو معجزانہ تھی مگر انکی سب ترقیات غیر معجزانہ ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک مادیات کا سوال ہے اسلام کے غلبہ سے یہ غلبہ بڑھ گیا ہے کیونکہ اسلام اپنے ہر ماننے والے کو انصاف سکھاتا ہے اور وہ ظلم اور بے انصافی کے قریب

اسلام کی ترقی اور عیسائیت کی ترقی میں ایک فرق

بھی نہیں پھٹکتا۔ مگر یہ لوگ وہ ہیں جو نہ انصاف کی پروا کرتے ہیں نہ ظلم سے ڈرتے ہیں نہ حقوق غصب کرنے سے گھبراتے ہیں۔ مغرب سے مشرق کے انتہائی کناروں تک یہ لوگ پھیلتے چلے گئے اور مسیح کی عظمت دلوں میں قائم کرتے گئے۔ یہ اثر لوگوں کے قلوب پر اس حد تک ہے کہ عیسائیوں میں ایسے کئی لوگ مل جائیں گے جو تین خداؤں کے قائل نہیں ہوں گے مگر مسیح ناصریؑ کی عظمت اُن کے دلوں میں برابر قائم ہوگی۔ مجھے ایک دفعہ انگلستان میں ایک دہریہ ڈاکٹر ملنے کے لئے آیا اور مَیں نے دیکھا کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کر دیتا۔ مَیں نے اسے سمجھایا کہ یہ طریق درست نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تمہیں حملہ نہیں کرنا چاہئے مگر وہ آریوں کی طرح برابر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر حملے کرتا چلا گیا۔ آخر جب مَیں نے دیکھا کہ وہ میرے صبر سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر حملہ کرنے میں بڑھ رہا ہے تو مَیں نے یسوع کی حقیقت اس کے سامنے کھولنی شروع کر دی۔ ابھی مَیں نے چند ہی باتیں کی تھیں کہ اس کا رنگ سُرخ ہوگیا اور کہنے لگا۔ آپ مسیح کا ذکر کیوں کرتے ہیں مَیں نے کہا مَیں سمجھ گیا ہوں کہ گو تم دہریہ ہو مگر تمہارے دل میں عیسائیت باقی ہے اس لئے میں مسیح کا ضرور ذکر کروں گا۔ وہ کہنے لگا میں مسیح کے خلاف کوئی بات نہیں سُن سکتا۔ مَیں نے کہا تو مَیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی بات نہیں سُن سکتا۔ اگر تم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر حملہ جاری رکھو گے تو تمہیں مسیح کے خلاف بھی میری زبان سے باتیں سُننی پڑیں گی اس پر غصہ میں اس نے بات بند کر دی اور چلا گیا تو مَیں نے دیکھا ہے بعض لوگ اس بات پر خوش ہو جاتے ہیں کہ یورپ میں دہریت پائی جاتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ لوگ عیسائیت سے بیزار ہو چکے ہیں حالانکہ دہریہ ہونے کے باوجود اُن کے دلوں سے مسیح ناصریؑ کی عظمت نہیں گئی۔ یہی رگ تھی جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پکڑی اور جس کی وجہ سے مسلمانوں نے آپ پر کفر کے فتوے لگانے شروع کر دئے آپ نے فرمایا جب تک مسیح کو دفن نہیں کیا جائے گا عیسائیت کبھی مر نہیں سکتی۔ یہ صرف مسیح کے پرستار ہیں اور عقائد سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ آسمان پھٹ جائے گا۔ آسمان پھٹ جانے کے معنے یہ ہیں کہ بڑی سخت آفت آجائے گی اور اتنا شدید ظلم ہوگا کہ اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

آسمان پھٹ جانے کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ آسمانی وجودوں کے دل اس شرک کو دیکھ کر زخمی ہو جائیں گے۔ خدا تعالےٰ کو یہ بات سخت بُری لگیگی فرشتوں کو اس سے تکلیف ہوگی اور انبیاء کے دل اس کو دیکھ کر تڑپ اُٹھیں گے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لکھا بھی ہے کہ مَیں نے حضرت مسیح کو کشفی حالت میں دیکھا کہ وہ اس تکلیف سے تڑپ رہے ہیں کہ میرے نام پر دُنیا میں اس طرح ظلم ہو رہا ہے۔ غرض اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ عیسائیت کا غلبہ ہو جائے گا اور آسمان پر جوش پیدا ہو جائے گا کہ دُنیا پر اتنا بڑا ظلم ہو رہا ہے جس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی گویا یہ ایک ایسی آفت ہوگی جو بے مثال ہوگی۔ حضرت خلیفہ اوّل رضؓ کسی بزرگ کا ایک ذوقی لطیفہ سُنایا کرتے تھے کہ انہوں نے کہا کہ ضَآلِّیْنَ پر جو شدّ اور مدّ اکٹھی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی فتنہ بڑا سخت ہوگا۔ اور پھر بڑا لمبا ہوگا۔

آسمان کے پھٹنے سے مراد آسمانی لوگوں کے دلوں کا زخمی ہونا۔

# وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝

اور جب ستارے جھڑ جائیں گے ۳؎

۳؎ **حل لغات۔** کَوَاكِبُ۔ کَوْکَبٌ کی جمع ہے۔ اور جب کَوْکَبَ الْحَدِیْدُ کہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں بَرِقَ وَتَوَقَّدَ یعنی لوہا آگ میں گرم کرنے پر سُرخ ہوگیا۔ اور چمکنے لگ پڑا۔

کَوْکَبٌ کا لفظ اپنے اندر کثیر معنے رکھتا ہے جو یہ ہیں:۔ (۱) اَلنَّجْمُ۔ ستارہ (۲) نُقْطَةٌ بَيْضَاءُ تَحْدُثُ فِی الْعَيْنِ۔ آنکھ کا پھولا (۳) مَا طَالَ مِنَ النَّبَاتِ۔ جو روئیدگی لمبے قد کی ہو۔ اس کو بھی کوکب کہتے ہیں۔ (۴) سَيِّدُ الْقَوْمِ وَفَارِسُهُمْ۔ قوم کا سردار اور ان کا جرنیل۔ (۵) شِدَّةُ الْحَرِّ۔ گرمی کی شدت۔ (۶) اَلسَّيْفُ۔ تلوار۔ (۷) اَلْمَاءُ پانی (۸) اَلْمَجْلِسُ مجلس کو بھی کوکب کہتے ہیں جہاں لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ (۹) اَلْمِسْمَارُ۔ کیل کو بھی کوکب کہتے ہیں (۱۰) اَلْخِطَّةُ يُخَالِفُ لَوْنُهَا لَوْنَ اَرْضِهَا۔ کوکب اس زمین کو بھی کہتے ہیں جس کا رنگ پاس کی زمینوں سے مختلف ہو (۱۱) الطَّلْقُ مِنَ الْاَوْدِيَةِ۔ وسیع وادی کو بھی کوکب کہتے ہیں (۱۲) الرَّجُلُ بِسِلَاحِهٖ۔ مسلح آدمی کو بھی کوکب کہتے ہیں (۱۳) اَلْجَبَلُ۔ پہاڑ کو بھی کہتے ہیں۔ (۱۴) اَلْغُلَامُ الْمُرَاهِقُ اُس لڑکے کو بھی کوکب کہتے ہیں جو جوانی کے قریب پہنچا ہوا ہو (۱۵) اَلْقُطْرُ۔ کھمبی کو بھی کوکب کہتے ہیں۔ (۱۶) مُعْظَمُ الشَّیْءِ کسی چیز کے بڑے حصہ کو بھی کوکب کہتے ہیں (۱۷) نَوْرُ الرَّوْضَةِ باغ کی کلی کو بھی کوکب کہتے ہیں (۱۸) بَرِيْقُ الْحَدِيْدِ وَتَوَقُّدُهٗ۔ گرم ہو کر جو لوہے میں چمک پیدا ہوتی ہے اسے بھی کوکب کہتے ہیں (۱۹) كَوْكَبٌ مِنَ الْبِئْرِ عَيْنُهَا الَّذِیْ يَنْبَعُ الْمَاءُ مِنْهُ۔ کنوئیں کے سوتے کو بھی کوکب کہتے ہیں جس میں سے پانی نکلتا ہے (۲۰) کُہر کو بھی کوکب کہتے ہیں۔ نیز عربی زبان کا محاورہ ہے۔ ذَهَبُوْا تَحْتَ كُلِّ كَوْكَبٍ جس کے معنے ہیں تَفَرَّقُوْا۔ وہ الگ الگ ہو گئے (۲۱) يَوْمٌ ذُوْ كَوَاكِبَ کے معنے ہوتے ہیں ذُوْ شَدَائِدَ۔ یعنی ایسا دن جو بلاؤں اور مصیبتوں سے پُر ہو (اقرب) غرض کَوْکَب کے وسیع معنے ہیں۔ کوکب ستاروں کو بھی کہتے ہیں سردارانِ قوم کو بھی کہتے ہیں اور قوم کے جرنیل کو بھی کہتے ہیں۔

کَوَاکِب

اِنْتَثَرَتْ۔ نَثَرَ سے ہے اور نَثَرَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں رَمَاهُ مُتَفَرِّقًا اُس نے کسی چیز کو اس طرح پھینکا کہ وہ بکھر گئی۔ اور تَنَاثَرَ وَتَنَثَّرَ وَانْتَثَرَ الشَّیْءُ کے معنے ہوتے ہیں۔ تَسَاقَطَ مُتَفَرِّقًا کوئی چیز متفرق ہو کر گر گئی۔ عرب کہتے ہیں۔ تَفَرَّقَ الْقَوْمُ وَتَنَثَّرُوْا یعنی قوم منتشر ہوگئی اور بکھر گئی (اقرب)

اِنْتَثَرَتْ

**تفسیر۔** اس جگہ یہ امر ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ اس سے پہلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ اور یہاں فرمایا ہے وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ درحقیقت یہ دو الگ الگ باتیں ہیں جو ایک خاص فرق کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ اسی لئے وہاں نجوم کا لفظ رکھا گیا تھا اور یہاں کواکب کا لفظ رکھا گیا ہے۔ پھر وہاں انکدار کا لفظ رکھا گیا تھا اور یہاں اِنْتِثَار کا لفظ رکھا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انکدار کے معنی بھی اِنْتِثَار کے ہی ہوتے ہیں مگر یہاں الفاظ اللہ تعالیٰ نے بدل دئے ہیں۔ حالانکہ لفظوں کا بدلنا ضروری نہیں قرآن کریم میں ایک ایک آیت تین تین چار چار جگہوں میں آئی ہے۔ پس یہ نہیں کہ قرآن کریم نے یہ اصول مقرر کیا ہوا ہو کہ جب وہ دوسری دفعہ وہی مضمون بیان کرے تو الفاظ کو ضرور بدل دیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم الفاظ کو دہرا بھی دیتا ہے اس لئے ان آیات میں الفاظ کے بدلنے میں ضرور کوئی حکمت ہونی چاہیئے اگر انکدار کا لفظ اِنْتِثَار کے معنوں میں واقعہ ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ

اذا الکواکب انتثرت اور اذا النجوم انکدرت ہر دو آیات کے مضمون میں ایک فرق

إِنْكَدَرَتْ کی بجائے إِنْتَثَرَتْ بھی کہہ سکتا تھا اور اگر یہاں انتثار بمعنے انکدار ہے تو یہاں انتثرت کی بجائے انکدرت بھی کہا جا سکتا تھا کیونکہ قرآن کریم میں کئی آیتیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک ہی مضمون بیان کرنے کے لئے پہلے ہی الفاظ کو دُہرایا گیا ہے پس قرآن کریم کے اس طریقِ عمل کو دیکھتے ہوئے کہ وہ الفاظ کے دُہرانے سے اجتناب کرنے کو ضروری نہیں سمجھتا یہاں الفاظ کا بدل دینا بتا رہا ہے کہ ان دونوں کے مفہوم میں کوئی فرق ہے۔

نجم اور کوکب کے معنے میں فرق۔

اس تمہید کے بعد میں یہ بتاتا ہوں کہ نجم کی تشریحات کو جب ہم لغت میں دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زور اصل کے معنوں پر ہوتا ہے چنانچہ نجم کے ایک معنے یہ بتائے جا چکے ہیں کہ جس کی ساق نہ ہو اور یہ لازمی بات ہے کہ جس چیز کی ساق نہ ہو گی وہ لمبی نہیں ہو سکے گی۔ وہ پودہ جس کی جڑ نہ ہو وہ اونچا کس طرح ہو سکتا ہے مگر کوکب کے ایک معنے لغت میں یہ لکھے ہیں کہ مَاطَالَ مِنَ النَّبَاتِ وہ روئیدگی جو لمبے قد کی ہو۔ پھر کوکب کے ایک معنے سَیِّدُ الْقَوْمِ وَفَارِسُهُمْ کے کئے گئے ہیں گویا اِس میں فن و مہارت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ فارس جرنیل کو کہتے ہیں پس نجم میں ہنر کی طرف نہیں بلکہ نسل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور کوکب میں نسل کی طرف اتنا اشارہ نہیں پایا جاتا جتنا ہنر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ اِدھر کوکب کے ایک معنے شِدَّةُ الْحَرِّ کے بھی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کواکب سے مُراد ایسے لوگ ہوتے ہیں جن میں کام کرنے کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے اُن کی طبیعت میں تیزی ہوتی ہے اور وہ سیفِ ماضی کے طور پر قوم میں اثر اور رسوخ رکھتے ہیں۔ یہ فرق بتا رہا ہے کہ پہلی آیت میں نجوم اور اِس آیت میں کواکب اور اسی طرح پہلی آیت میں انکدرت اور اس آیت میں انتثرت کے الفاظ کا استعمال بلا وجہ نہیں بلکہ ان میں بہت بڑی حکمت پائی جاتی ہے۔

انکدار اور انتثار کے معنے میں فرق۔

اصل بات یہ ہے کہ انکدار کے معنے گدلا ہو جانے کے ہیں اور انتثار کے معنے ٹوٹ کر متفرق ہو جانے کے ہیں پس سورۂ تکویر کی آیت وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ میں اس طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ نسلی رؤساء کا پبلک میں رسوخ کمزور ہو جائے گا اور وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ صاحبِ فن اور ہنر لوگ بھی محض اپنے فن اور ہنر کے زور سے وہ رسوخ جو پہلے پیدا کر لیا کرتے تھے نہ کر سکیں گے یعنے یورپ کی ترقی کے سلسلہ میں جو تغیرات پیدا ہوں گے اُن کے نتیجہ میں بڑے بڑے ماہرین فن کی طاقتیں بالکل ٹوٹ جائینگی چنانچہ دیکھ لو یہ دونوں باتیں اس زمانہ میں پوری ہو گئی ہیں غیر عیسائی ممالک میں علماء تو موجود ہیں مگر ان کا رسوخ زائل ہو چکا ہے یا بڑے بڑے فن کار تو پائے جاتے ہیں مگر اُن کا اثر باقی نہیں رہا اور عیسائی ممالک میں اِن تغیّرات کی وجہ سے پارلیمنٹیں بن گئی ہیں۔ اُمراء اور رؤساء کی طاقتیں بالکل ٹوٹ گئی ہیں اور اُمراء اور ماہرین فنوں کی جگہ لیبر پارٹیوں اور کمیونسٹ پارٹیوں وغیرہ نے لے لی ہے پس یہ علامت بھی اس تغیر پر دلالت کرتی ہے جو یورپ کی ترقی کے سلسلہ میں ظاہر ہوا ہے۔ غیر عیسائی ممالک میں بھی یوروپین ممالک کی نقل میں یہ تغیر پیدا ہو رہا ہے مگر وہ کامل نہیں اس جگہ چونکہ یوروپین اقوام کا ذکر ہے اس لئے فرماتا ہے کہ یوروپین قوموں میں جو تغیر پیدا ہو گا وہ ایسا ہو گا کہ قوم پر اثر رکھنے والے لوگ خواہ نسلی سردار ہوں یا فنی سردار ہوں بالکل گر جائیں گے اور دوسری قومیں اُن کی جگہ لے لینگی لیکن غیر اقوام میں یہ تغیر پیدا ہو گا

# وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝

اور جب سمندر پھاڑ (کر ملا) دیئے جائیں گے ۵۴

کہ اُن میں صرف بڑے لوگوں کا رسوخ کمزور ہو جائیگا

**۵۴ حل لغات** ۔ فُجِّرَتْ :۔ فَجَّرَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے اور فَجَّرَ کے معنے وہی ہیں جو فَجَرَ کے ہیں اور اِن دونوں میں سوائے اس کے اور کوئی فرق نہیں کہ فَجَّرَ میں تشدید مبالغہ کے لئے استعمال کی جاتی ہے ورنہ فَجَرَ بھی متعدی ہے اور فَجَّرَ بھی متعدی ہے فَجَرَ الْمَاءَ کے معنے ہوتے ہیں فَتَحَ لَهٗ طَرِیْقًا فَجَرٰی اُس نے پانی کے لئے راستہ کھولا اور وہ بہنے لگ گیا اور فَجَرَ الْقَنَاةَ کے معنے ہوتے ہیں شَقَّهَا وَقِیْلَ شَقًّا وَاسِعًا پانی کی نالی کو خوب کھلا بنایا اور جب فَجَّرَ الرَّجُلَ کہیں تو اس کے معنی ہونگے اَلنِّسْبَةُ اِلَی الْفُجُوْرِ اُس کو فجور کی طرف منسوب کیا (اقرب)

**تفسیر** ۔ اِس آیت کے الفاظ بھی قریبًا وہی ہیں جو پہلی سورۃ میں تھے وہاں فرمایا تھا وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ اور یہاں فرمایا ہے وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ میں بتا چکا ہوں کہ سورۂ انفطار میں ایک مخصوص [illegible] کی طرف اشارہ ہے جو عیسائیت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اس لئے یہ سب علامات عیسائیوں پر چسپاں ہونگی۔

مَیں سمجھتا ہوں اس آیت کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ عیسائی اپنی ترقی کے زمانہ میں سمندروں کو پھاڑ کر آپس میں ملادیں گے چنانچہ اس کی نمایاں مثال نہر سویز اور نہر پانامہ پیش کرتی ہیں اور یہ دونوں عیسائیوں کی بنائی ہوئی نہریں ہیں اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا میں بڑی بڑی شاندار نہریں پائی جاتی ہیں۔ ایرانیوں نے بھی نہریں بنائی ہیں پٹھانوں نے بھی بنائی ہیں اور مغلوں نے بھی بنائی ہیں مگر اس فن میں گو یورپ نے بڑی ترقی کی ہے [illegible] منفرد اور موجد نہیں مگر اس آیت میں جو علامت بتائی گئی ہے کہ سمندر پھاڑ کر آپس میں ملادئے جائیں گے اس میں یورپ منفرد ہے اس سے پہلے دو سمندروں کو زمین پھاڑ کر نہیں ملایا گیا۔ سورۂ تکویر کی آیت وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ کی تشریح میں دریاؤں سے نہریں نکالے جانے کا مفہوم اس بناء پر بیان کیا گیا تھا کہ وہ سورۃ آخری زمانہ سے تعلق رکھنے والے عام حالات کی طرف راہنمائی کرتی تھی لیکن یہ سورۃ ایسی ہے جس کا عیسائیوں کے ساتھ خاص طور پر تعلق ہے۔

اس سورۃ میں اُنہی علامات کا ذکر پایا جاتا ہے جو مخصوص طور پر عیسائی اقوام میں پائی جانے والی تھیں اور چونکہ سمندروں کو پھاڑ کر آپس میں ملا دینے کی اس سے پہلے اور کوئی مثال دنیا میں نہیں ملتی اس لئے پہلی آیت میں جہاں عام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بحار سے دریا مراد لئے گئے تھے وہاں اس جگہ عیسائیوں کے مخصوص حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بحار سے سمندر مراد لئے جائیں گے اور معنے یہ ہونگے کہ وہ سمندروں کو چیر کر ایک دوسرے سے ملا دیں گے۔

دوسرے معنے اِس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں اور ہیں کہ بحر اس جگہ وسیع علم رکھنے والے انسان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اس صورت میں وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ کے یہ معنے ہونگے کہ جس وقت مسیحی پادریوں کی طرف سے کثرت سے فسق و فجور منسوب کیا جائے گا گویا اِدھر عیسائیت دُنیا پر غالب آجائیگی اور شرک کی تعلیم لوگوں میں پھیلا دے گی اور دوسری طرف کلیسیا بالکل گندی ہو جائے گی۔ گویا جسمانی لحاظ سے تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ وہ سمندروں کو پھاڑینگے

فُجِّرَتْ

اذا البحار فجرت میں سمندروں کے آپس میں ملائے جانے کی پیشگوئی

اذا البحار فجرت میں یہ اشارہ کہ کلیسیا گندہ ہو جائیگا

# وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝

اور جب قبریں اکھیڑ کر (ادھر اُدھر) بکھیر دی جائیں گی شہ

اور روحانی لحاظ سے اس کے یہ معنے ہونگے کہ کلیسا بالکل خراب ہو جائے گی۔

اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ کے یہ معنے کہ دریاؤں کے دہانے کھولے جائیں گے۔

تیسرے معنی اس کے یہ ہیں کہ اس زمانہ میں دریاؤں کو وسیع کر دیا جائے گا اور ان کا راستہ کھلا کر دیا جائیگا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں یورپ اور امریکہ کے بہت سے دریاؤں کے دہانے اس طرح کھولدیئے گئے ہیں کہ بڑے بڑے جہاز ان میں سے گذر جاتے ہیں پہلے سمندروں کے قریب جاکر دریا پھٹ جاتے تھے۔ اور پھیل کر چھوٹی چھوٹی نالیوں میں سمندر میں ملتے تھے مگر اس زمانہ میں بہت سے دریا فرانس، جرمنی، آسٹریا، انگلینڈ اور امریکہ کے دہانوں کے پاس ایک گہرے نالے کی صورت میں بدل دیئے گئے ہیں جن کی وجہ سے وہاں جہاز بھی چلنے لگے ہیں اور بعض جگہ تو سوسو دو دو سومیل تک جہاز سمندر کے دہانہ سے دریا کے ذریعے اندر کو ملک میں چلے جاتے ہیں اور اس طرح اموال تجارت بسہولت اور تھوڑے خرچ پر ملک سے باہر بھی جاتا ہے اور اندر بھی آجاتا ہے۔

بُعْثِرَتْ

**۵ حل لغات**۔ بُعْثِرَتْ۔ بَعْثَرَ سے مجہول کا مؤنث کا صیغہ ہے اور بَعْثَرَ الشَّيْءَ کے معنے ہوتے ہیں فَرَّقَهٗ وَبَدَّدَهٗ کسی چیز کو پراگندہ کر دیا۔ اور بَعْثَرَ الْقَبْرَ کے معنے ہوتے ہیں اِسْتَخْرَجَهٗ فَكَشَفَهٗ وَاَثَارَ مَافِيْهِ۔ اُس نے قبر کی مٹی کو نکالا اور جو اس کے اندر تھا اسے ننگا کر دیا اور پھر اسے باہر نکالکر پھیلا دیا (اقرب) پس وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ کے معنے ہونگے جبکہ قبریں اکھیڑی جاوینگی۔ (۲) اور ان کے اندر سے جو کچھ نکلے گا۔ اسے پھیلا دیا جائے گا۔

بعثرت قبور سے مراد

**تفسیر**۔ یہ چیز بھی ہم کو اس زمانہ میں عیسائیوں میں بڑی شدت سے نظر آتی ہے پہلے زمانوں میں قبرستانوں کی اس قدر عزت کی جاتی تھی کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر سامنے قبرستان آجاتا تھا تو لوگ اپنے شہر کا رُخ بدل دیا کرتے تھے اور یہ برداشت نہیں کرتے تھے کہ قبرستانوں کے احترام میں کوئی فرق آئے مگر اس قوم میں قبرستانوں کا ادب بالکل نہیں رہا دِلّی بناتے وقت اُنہوں نے سینکڑوں قبرستان اُکھیڑ دیئے اور اُن کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ پُرانی تاریخ کو ہم پڑھتے ہیں تو حیرت آتی ہے کہ اُن کے دلوں میں کسقدر مرنے والوں کا احترام تھا کہ قبرستان سامنے آنے پر وہ شہر کا رُخ بدل دیتے۔ مگر یہ لوگ جب کسی جگہ شہر بسانے کا ارادہ کریں اور وہاں قبرستان ان کو دکھائی دے تو بڑی جرات سے اس کو اُکھیڑ کر پھینک دیتے ہیں اور جس رنگ میں چاہتے ہیں عمارت بنا لیتے ہیں پس اس کے ایک معنے یہ ہیں کہ کثرت آبادی کی وجہ سے قبرستان اُکھیڑ دیئے جائیں گے۔

پھر بَعْثَرَۃ قبور سے مُراد پُرانے مقبروں کا کھولنا بھی ہے جیسے مصر میں ہو رہا ہے کہ پُرانی قبریں کھود کھود کر ممی بنائی ہوئی لاشیں نکالتے رہتے ہیں لغت نے اس لفظ کے کیا ہی اچھے معنے بتائے ہیں اِسْتَخْرَجَهٗ فَكَشَفَهٗ وَاَثَارَ مَافِيْهِ کہ قبر کی مٹی کو نکالا اور اسے ننگا کر دیا اور جو کچھ اس میں سے ملا اس کو پھیلا دیا۔ عیسائی لوگ بھی قبریں کھودتے ہیں۔ ممیوں کو نکالتے ہیں اور ان میں سے کوئی فرانس کے میوزم میں بھیج دیتے ہیں کوئی انگلستان کے میوزم میں بھیج دیتے ہیں کوئی امریکہ اور روس کے میوزم میں بھیج دیتے ہیں گویا جس طرح جائیدادیں تقسیم کی جاتی ہیں اِسی طرح وہ

# عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ۞

وہ ہر ایک (خطاکار) جان (جس کا یہاں ذکر ہے) جان لے گی کہ کیا (کچھ) اُس نے آگے بھیجا ہے۔ اور کیا (کچھ) پیچھے چھوڑا ہے ۵۶

لاشوں کو آپس میں تقسیم کرتے اور اپنے اپنے ممالک کے عجائب گھروں میں رکھتے ہیں۔ بس یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے پُرانے لوگوں کی لاشوں کو ان کی قبروں میں سے نکال نکال کر ننگا کر دیا ہے اور پھر مختلف ممالک میں پھیلا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جب مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو ان کا فرض ہے کہ وہ ان لاشوں کو پھر قبروں میں دفن کر دیں کیونکہ یہ بڑی گندی بات ہے کہ لاشیں نکال نکال کر لوگوں کے سامنے رکھی جائیں اور ان کی تحقیر و تذلیل کی جائے۔ فرعونِ مصر کی لاش کو بھی وہ اسی طرح زمین میں دفن کر دیں اور اس پر ایک کتبہ لگا کر لکھ دیا جائے کہ یہاں فرعون مصر کی لاش دفن ہے۔ قبر کا لفظ چونکہ عام دفن شدہ چیزوں کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے اس لئے اس کے ایک یہ معنی بھی ہیں کہ اس زمانہ میں پُرانے شہر زمین میں سے نکالے جائیں گے چنانچہ اب اُن کے دفینے نکال نکال کر مختلف عجائب گھروں میں تقسیم ہو رہے ہیں اسی طرح اس کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ پُرانے کتب خانے باہر آ جائیں گے اور پُرانی عمارات اور قبرستانوں کا پتہ لگ جائے گا۔

۵۶ **تفسیر:** یہاں اللہ تعالیٰ نے عَلِمَتْ کُلُّ نَفْسٍ نہیں فرمایا بلکہ عَلِمَتْ نَفْسٌ فرمایا ہے۔ ایسا کیوں فرمایا؟ اس کے متعلق بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دوسری جگہ کُلُّ نَفْسٍ آ گیا ہے۔ اس لئے اس جگہ کُلّ کا لفظ چھوڑ دیا گیا ہے وہ دوسری جگہ یہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا یعنی اُس دن سے ڈرو جس دن ہر شخص جو کچھ نیکی اس نے کی ہوگی اسے اپنے سامنے موجود پائے گا۔ اور جو بدی اس نے کی ہوگی اسے بھی (آلِ عمران ع ۳) پس مفسرین کہتے ہیں کہ چونکہ اس جگہ کُلُّ نَفْسٍ کا ذکر آ گیا ہے اس لئے اس آیت میں صرف نَفْسٌ کہا گیا ہے کُلُّ نَفْسٍ نہیں کہا گیا میں تو یہ نہیں کہتا کہ قرآن کریم میں ایسا طریق تسلیم نہیں کیا جا سکتا اگر ایک جگہ صرف اشارہ ہو اور دوسری جگہ تفصیلاً ذکر ہو تو ایسا درست ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی میں اُن کے استدلال کو درست تسلیم نہیں کر سکتا میرے نزدیک یہاں تنوین تحقیر کی ہے یعنی یہ نفس جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے یعنی نفس عیسائیت۔ یہ ذلیل جان (جو اپنا بُرا بھلا بھی نہیں سمجھتی یا یہ بھی نہیں سمجھتی کہ کس کام کو کرنا چاہیئے تھا اور کس کام کو نہیں کرنا چاہیئے تھا) جان لے گی اُس کو جو اس نے آگے بھیجا تھا اور جو کچھ اس نے پیچھے کیا تھا چونکہ قبور کا اُکھیڑنا بڑا گندہ کام تھا اور دوسری طرف انہوں نے اتنا بڑا شرک کیا تھا جس سے آسمان پھٹ گیا اور یہ دونوں کام ایسے ہیں جس سے فطرت کو گھن آتی ہے اس لئے ان کی تحقیر کرتے ہوئے فرماتا ہے یہ حقیر جان جان لے گی مَا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ جو کام اسے آگے کرنا چاہیئے تھا اُسے اُس نے پیچھے کر دیا اور جو کام پیچھے کرنا چاہیئے تھا اُسے اُس نے پہلے کر دیا۔ یہ الفاظ بھی اس کی حقارت کے لئے استعمال کئے گئے ہیں

عَلِمَتْ نَفْسٌ میں نکرہ کا استعمال برائے حقارت

چنانچہ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ کی ذات جسے مقام عالی دینا چاہیئے تھا اُسے تو ان لوگوں نے نیچا کر دیا اور مسیح جو خدا تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک بندہ تھا اُسے خدا کے تخت پر بٹھا دیا چنانچہ عیسائی حضرت مسیحؑ سے ہی دُعائیں مانگتے ہیں خدا سے نہیں مانگتے۔ گویا خدا تعالیٰ اُن کے نزدیک نعوذ باللہ پنشن پر چلا گیا ہے اب خدائی کا کام صرف مسیح کے ہاتھ میں ہے پس قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۙ

اے انسان تجھے کس نے تیرے محسن رب کے بارے میں مغرور بنا دیا ہے۔ ؎۵

کا ایک نمونہ انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ خدا کو ایک بندے کا درجہ دے دیا اور بندے کو خدا کا درجہ دے دیا اور دوسرا نمونہ یہ کہ گزشتہ وفات یافتہ لوگوں کی لاشوں کو نکالکر ایک تماشہ کے طور پر عجائب گھروں میں رکھتے ہیں اور چونکہ قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ میں آگے پیچھے کا مفہوم ہوتا ہے اِس لئے اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ جان لینگے کہ انہوں نے کس کام کو کیا اور کس کو نہ کیا محاورہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ تم نے کس کام کو اختیار کر لیا اور کس کو نہ کیا۔ کس کو ترجیح دے دی اور کس کو نہ دی۔ پس مطلب یہ ہُوا کہ اِس ذلیل جان کو علم ہو جائے گا کہ کونسا کام کرنے والا تھا اور کونسا کام کرنے والا نہیں تھا یعنی وہ کام جو کرنے والے تھے وہ تو انہوں نے نہ کئے اور جو کام نہ کرنے والے تھے وہ انہوں نے کر لئے۔

ماغرّک کے معنے۔

ایک معنے اس آیت کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جب اُوپر کے واقعات ظاہر ہونگے شرک پھیل جائے گا اور بادشاہوں اور سرداروں کی طاقت توڑ کر رکھ دی جائیگی اور سمندر ملا دیئے جائینگے اور قبریں کھود کر بکھیر دی جائینگی تو اس وقت اللہ تعالیٰ ایسے سامان پیدا کر دیگا کہ اس جان ناتوان کو جو اس طرح خدائی اپنے ہاتھ میں لینی چاہے گی معلوم ہو جائے گا کہ کیا کرنا چاہیئے تھا اور کیا نہیں یعنے شرک کی بُرائی اور دنیا کے انہماک کی غلطی ان پر کھل جائے گی اور یہ پھر ایک دفعہ توحید کی طرف لوٹیں گے اور اپنی غلطیوں پر نادم ہونگے۔

ربّ کے ساتھ کریم کا لفظ لانے کی وجہ۔

؎۵ حل لغات۔ اَلْكَرِيْمُ کے معنے ہیں ذُوالْکَرَم۔ احسان والا۔ (اقرب)

الکریم

تفسیر۔ یہاں بھی اَلْاِنْسَان سے مراد ہر انسان نہیں بلکہ وہی عَلِمَتْ نَفْسٌ والا انسان مراد ہے کہ نفس دنی رکھنے والے انسان مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ آخر یہ تو بتا تجھے تیرے رب کریم پر جرأت کس نے دلائی

یاایھا الانسان میں الانسان سے مراد۔

مَا غَرَّكَ بِفُلَانٍ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے جس کے معنے ہوتے ہیں كَيْفَ اِجْتَرَأْتَ عَلَيْهِ (اقرب) تُو نے کس طرح اس کے خلاف جرأت سے کام لیا پس مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ کے معنے ہوں گے كَيْفَ اِجْتَرَأْتَ عَلٰى مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَ اٰمِنْتَ مِنْ عِقَابِهٖ وَلَمْ تَكُنْ هٰذِهِ الْجُرْأَةُ جَائِزَةً لَكَ کہ تُو نے کس طرح اُسکی معصیت پر جرأت کی اور اُس کے عذاب سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھ لیا حالانکہ یہ جرأت تیرے لئے مناسب نہیں تھی۔ کَرِیْم کا لفظ یہاں اُن کی اس جُرأت کی عدم مناسبت کے اظہار کے لئے لایا گیا ہے۔ ایک فعل ایسا ہوتا ہے جو دوسرے کی شان کے لحاظ سے مناسب ہوتا ہے مگر بِرَبِّكَ کہہ کر بتایا کہ تجھے اپنے رب پر کس طرح جرأت ہوئی اور کَرِیْم کہہ کر بتایا کہ تمہارا یہ فعل تو کسی صورت میں بھی مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ نہ صرف تمہارا رب تھا بلکہ رب کریم تھا اپنے رب کو کریم دیکھ کر تو تمہارے اندر شرم اور حیا کا مادہ پیدا ہونا چاہیئے تھا نہ یہ کہ اُلٹا اُس کے احسانات سے نافرمان بن جاتے اور محسن کی ہتک کا موجب ہو جاتے۔ جائز موقع پر اگر کوئی جُرأت سے کام لیتا ہے تو اُس میں شرافت کا مادہ سمجھا جاتا ہے اور ناجائز موقع پر اگر کوئی جرأت دکھاتا ہے تو وہ تہوّر سے کام لینے والا سمجھا جاتا ہے لیکن فرماتا ہے تمہارا یہ فعل تو تہوّر بھی نہیں۔ اس میں تو کمینگی اور رذالت پائی جاتی ہے کہ تم نے محسن کشی کی اپنے رب کو کریم دیکھ کر بجائے اس کے کہ اسکی اطاعت کرتے تم نے اسکی نافرمانی کرنی شروع کر دی اور ایسے عقائد اختیار کر لیے۔ تو

خدا تعالیٰ کی شان کے بالکل خلاف ہیں۔

یہاں بھی مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ کے ماتحت ضمنی بحث کے طور پر مفسرین نے عجیب عجیب باتیں بیان کی ہیں۔ بعض صوفیاء نے لکھا ہے کہ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ تمہارے جُرموں کے متعلق تم سے سوال کرے تو تم اُسے کیا جواب دو۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ ہمارا رب چونکہ کریم ہے اس لئے ہمیں غرور پیدا ہؤا اور ہم نے یہ گناہ کئے۔ چنانچہ بقول ان کے حضرت فضیلؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ خدا تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے تو انہوں نے کہا میں تو خدا تعالیٰ سے یہ کہوں گا کہ تیرے عفو اور احسانات کے پردوں نے مجھے مغرور کر دیا۔

مگر اس طرف اُن کا ذہن اس وجہ سے گیا ہے کہ انہوں نے ساری سورۃ کے معنے نہیں سمجھے۔ صرف ایک ٹکڑہ لے لیا اور اُس سے انہوں نے استدلال کر لیا۔ اگر وہ دیکھتے کہ اس سورۃ میں صرف دشمنانِ اسلام کا ذکر ہو رہا ہے تو وہ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ کو کبھی مسلمانوں پر چسپاں نہ کرتے۔ ہمارے ملک میں بھی لوگ کہتے ہیں کہ ع

کرم ہائے تو ما را کرد گستاخ

اگر اس فقرہ کو استعارۃً کسی وقت استعمال کر لیا جائے اور "کرد گستاخ" سے مراد گستاخی نہ لی جائے بلکہ بے تکلفی مراد لی جائے اور یہ سمجھا جائے کہ جس سے انسان بے تکلف ہوتا ہے اس سے بے تکلفی میں بعض دفعہ ایسی بات بھی کہہ لیتا ہے جو دوسری حالت میں نہیں کہی جا سکتی تو اور بات ہے لیکن اگر گستاخی سے حقیقی گستاخی مراد ہو تو یہ قطعاً غلط ہے۔ کرم انسان کو گستاخ نہیں بنایا کرتا بلکہ اس کے اندر محبت اور اطاعت کا مادہ زیادہ پیدا کر دیا کرتا ہے۔ یُوں تو اس فقرہ کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی استعمال کیا ہے اور ہم بھی بعض دفعہ یہ فقرہ استعمال کر لیتے ہیں مگر واقعہ یہی ہے کہ جہاں کرم ہو وہاں کرم انسان کو حقیقی طور پر گستاخ نہیں بنا سکتا۔

آیت مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ میں غلط کریم پر جیسے مفسرین کی ضمنی بحثیں۔

اس آیت کے ضمن میں مفسرین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بھی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک دفعہ اپنے ایک نوکر کو آواز دی مگر وہ نہ بولا۔ آپ نے بار بار آواز دی مگر پھر بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکا اتفاقاً آپ کو سامنے نظر آ گیا تو آپ نے اس سے پُوچھا مَالَكَ لَمْ تُجِبْنِيْ کہ تجھے کیا ہو گیا کہ میں نے تجھے اتنی بار بلایا مگر تُو پھر بھی نہیں بولا۔ قَالَ لِثِقَتِيْ بِحِلْمِكَ وَ اٰمِنٍ مِّنْ عُقُوْبَتِكَ فَاسْتَحْسَنَ جَوَابَهٗ وَ اَعْتَقَهٗ (کشاف) اس نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ مجھے آپ کی نرمی کا یقین تھا اور آپ کی سزا سے میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہوں اس لئے میں نے آپ کی بات کا جواب نہ دیا۔ حضرت علیؓ کو اُس لڑکے کا یہ جواب پسند آیا تو آپ نے اسے آزاد کر دیا۔ وہ کہتے ہیں یہ واقعہ بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ عنایات اور عفو کا سلوک بھی انسان کو گناہوں پر دلیر کر دیتا ہے مگر یہ محض ذوقی بات ہے واقعہ بڑا عمدہ ہے مگر اس کا مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ والی آیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس لڑکے نے جب دیکھا کہ حضرت علیؓ اب مجھ پر ناراض ہوں گے تو اُس نے یہ لطیفہ بنا لیا جو حضرت علیؓ کو پسند آ گیا۔ اس سے یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ زیر بحث آیت میں بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ یہ محض ذوقی باتیں ہیں سعدی نے لکھا ہے کہ ع

پادشاہاں گہے بسلامے برنجند وگہے بدشنام خلعت دہند

بادشاہ کبھی تعریف سے ناراض ہو جاتے ہیں اور کبھی گالی پر خلعت دے دیتے ہیں۔ مگر ایسی باتوں سے کوئی

اصول مستنبط نہیں ہو سکتا ہی کہنا پڑتا ہے کہ مختلف انسان مختلف رنگ کا مذاق رکھتے ہیں اور پھر انکی عادتیں بھی مختلف اوقات میں بدلتی رہتی ہیں اس لئے کبھی کسی بات سے وہ خوش ہو جاتے ہیں اور کبھی کسی بات سے بگڑ جاتے ہیں جہانگیر کا واقعہ ہی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے نورجہاں کے ہاتھ میں دو کبوتر پکڑا دیئے اتفاقاً ایک کبوتر نورجہاں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جہانگیر واپس آیا تو اس نے پوچھا کہ دوسرا کبوتر کہاں گیا۔ اس نے کہا اُڑ گیا ہے۔ جہانگیر نے غصہ سے پوچھا کس طرح اُڑ گیا۔ اُس نے دوسرا کبوتر بھی اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا اور کہا کہ اس طرح۔ جہانگیر کو اسکی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ وہ اسی وقت سے اس پر عاشق ہو گیا اور چونکہ باپ کی مخالفت کی وجہ سے اس سے شادی نہ کر سکا باپ کے مرنے کے بعد اس کے بیوہ ہونے پر اس سے شادی کرلی۔ تو بعض دفعہ ایسا ہو جاتا ہے کہ کسی کی بُری بات بھی اچھی لگتی ہے لیکن یہ آیت کی تفسیر نہیں کہلا سکتی۔ ممکن ہے حضرت علیؓ نے ایک بچے کے مُنہ سے جب یہ بات سُنی ہو تو خواہ یہ گستاخی کا ہی رنگ رکھتی ہو مگر آپ نے یہ دیکھ کر کہ اس نے اپنے بچاؤ کے لئے کیسا عجیب طریق اختیار کیا ہے آپ نے اسے آزاد کر دیا مگر بہرحال یہ ایک انفرادی واقعہ ہے۔ قرآن کریم کی تفسیر ایسے واقعات سے نہیں کی جا سکتی۔

ایک سبق آموز واقعہ۔[۲۰۱] اسی سلسلہ میں امام قشیری نے اپنی کتاب شرح الاسماء میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے جس سے نصیحت کا پہلو بھی نکلتا ہے مجھے یہ واقعہ بہت پسند آیا اور گو یہ واقعہ بھی میرے نزدیک ہرگز یہاں چسپاں نہیں ہوتا مگر یہ بتانے کے لئے کہ انسانی فطرت سزا سے بچنے کے لئے کیا کیا حیلے نکال لیتی ہے اس کو بیان کرتا ہوں وہ لکھتے ہیں کسی بزرگ نے بیان کیا ہے کہ مَیں بصرہ کے بازار سے گذر رہا تھا کہ اچانک مَیں نے ایک جنازہ دیکھا جس کے ساتھ صرف چار آدمی تھے مَیں نے کہا بصرہ میں ایک مسلمان مر جائے اور اُس کے جنازہ کے ساتھ صرف چار آدمی اور وہ بھی چارپائی اُٹھانے والے ہوں یہ تو بہت بُری بات ہے۔ مَیں اسکے جنازہ کے ساتھ ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ مَیں بھی ساتھ ہو لیا جب وہ لوگ نعش کو دفن کر کے واپس آنے لگے تو مَیں نے اُن سے کہا یہ کیا بات ہے کہ بصرے جیسے بڑے شہر میں ایک مسلمان مرتا ہے اور اس کے جنازہ کے ساتھ صرف چار آدمی آتے ہیں وہ کہنے لگے ہم چاروں بھی جنازہ کی نیت سے نہیں آئے ہم تو مزدور ہیں یہ عورت جو سامنے کھڑی ہے ہمیں مزدوری پہ لائی ہے پس ہم بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں آئے بلکہ مزدوروں کی حیثیت سے آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس جواب سے میری حیرت اور بھی بڑھ گئی کہ پہلے تو میں سمجھتا تھا بصرہ کے کم از کم چار مسلمان تو اس جنازہ کے ساتھ آئے ہیں مگر اب معلوم ہؤا کہ ایک بھی نہیں آیا کیونکہ جو ساتھ آئے ہیں وہ صرف مزدور ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے یہ جواب دے کر وہ مزدور تو چلے گئے اور اُس عورت نے جو اُن کو لائی تھی آسمان کی طرف اپنے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنی شروع کر دی۔ جب دُعا مانگ چکی تو اس نے قہقہ لگایا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ وہ کہتے ہیں میں یہ نظارہ دیکھ کر مبہوت سا ہو گیا کہ یہ تماشہ کیا ہو رہا ہے چنانچہ مَیں نے اس عورت کا دامن پکڑ لیا اور کہا کہ مائی مَیں تجھے جانے نہیں دینا پہلے مجھے بتاؤ کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ اوّل تو اس جنازہ میں کوئی مسلمان شامل نہیں ہؤا۔ پھر تم نے دُعا کی اور دُعا کے بعد ہنس پڑیں اسکی وجہ بھی میری سمجھ میں کوئی نہیں آتی مجھے سچ سچ بتاؤ کہ یہ ماجرا کیا ہے اس نے کہا سُنو یہ میرے لڑکے کا جنازہ تھا اور وہ سخت بدکار اور گنہگار تھا قسم قسم کے گناہوں میں وہ مبتلا رہتا تھا اور

باوجود سمجھانے کے اپنی حرکات سے باز نہیں آتا تھا چند دن گذرے کہ یہ بیمار ہوگیا۔ جب اسکی بیماری پر تین دن ہوگئے تو اس نے مجھے بلایا اور کہا اماں میں اب بچتا نظر نہیں آتا۔ جب میں مرجاؤں تو ہمسایوں کو خبر نہ دینا کیونکہ وہ میری موت سے خوش ہونگے اور کہیں گے کہ اچھا ہوا وہ مرگیا ہے اور پھر جنازہ میں بھی انہوں نے شامل نہیں ہونا اس لئے انہیں اطلاع دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مزدور لے کر مجھے دفن کرا دینا صرف اتنی مہربانی کرنا کہ ایک انگوٹھی پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لکھ کر میری انگلی میں ڈال دینا اور میری لاش کو نہلا دھلا کر میرے چہرہ پر اپنا پَیر رکھ کر کہنا کہ خدا کے گنہ گار روں کی یہی سزا ہوتی ہے۔ پھر جب مجھے دفن کر چکو تو ہاتھ اُٹھا کر میرے لئے دُعا کرنا اور کہنا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ رَضِیْتُ عَنْهُ فَارْضَ عَنْهُ اے اللہ میں اس سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہوجا۔ وہ کہنے لگی بیٹے اس کی موت کے بعد جس طرح اُس نے کہا تھا اسی طرح کیا۔ نہلا دُھلا کر اس کے مُنہ پر میں نے اپنا پاؤں رکھا اور کہا کہ یہی جزا اس شخص کی ہے جو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرے اور میں نے محلہ والوں کو بھی اطلاع نہ دی اور پھر چار مزدور اُجرت پر لے لئے اور انہیں ساتھ لے کر اپنے بیٹے کو دفن کر دیا جب میں دفن کر چکی تو میں نے ہاتھ اُٹھا کر دعا کی کہ یا اللہ میں نے اس کے سب گناہ بخش دیئے ہیں تو تو بہت زیادہ رحیم و کریم ہے تُو بھی اپنے فضل سے اس کو بخش دے۔ جب میں یہ دُعا کر چکی تو یکدم مجھ پر کشفی حالت طاری ہوئی اور میں نے اپنے لڑکے کی یہ آواز سُنی جو نہایت صاف طور پر مجھے سُنائی دی کہ اِنْصَرِفِیْ یَا اُمِّیْ فَقَدْ قَدِمْتُ عَلٰی رَبٍّ کَرِیْمٍ فَرَضِیَ عَنِّیْ اس پر خوشی میں میری ہنسی زور سے نکل گئی۔ (روح البیان)

یہ واقعہ اللہ بہتر جانتا ہے صحیح ہے یا غلط۔ امام قشیری [illegible] کے آدمی ہیں اس لئے ممکن ہے یہ واقعہ انہوں نے تحقیق سے ہی لکھا ہو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس رنگ میں فرمایا ہے کہ بعض دفعہ ایک آدمی دوزخیوں کے کام کرتا چلا جاتا ہے مگر اُس کے اندر کوئی نیکی مخفی ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب بُرے اعمال کرتے کرتے وہ جہنّم میں گرنے کے قریب پہنچ جاتا ہے تو یکدم اللہ تعالیٰ کے فضل کا ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے اور وہ جنّت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور ایک دوسرا آدمی جنّت کے مستحق بنانے والے اعمال کرتا چلا جاتا ہے مگر اُس کے دل میں کوئی بدی مخفی ہوتی ہے جب نیک اعمال کرتے کرتے وہ ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ قریب ہوتا ہے وہ جنّت میں داخل ہو جائے تو یکدم اسکی چھپی ہوئی بدی ظاہر ہو جاتی ہے اور وہ جہنّم میں جا پڑتا ہے۔ پس یہ روایت خواہ بناوٹی ہے یا حقیقی لیکن بہرحال سبق آموز ہے اور چونکہ مجھے یہ روایت بہت پسند آئی ہے اس لئے گو میرے نزدیک اس آیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں مگر میں نے اسے بیان کر دیا ہے۔ اس کا اپنی ماں کو یہ کہنا کہ مرنے کے بعد میرے چہرہ پر اپنے پیر رکھ کر کہنا کہ یہ سزا اُس شخص کی ہے جو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے بتاتا ہے کہ اُس کے دل میں نیکی تھی اس نے سمجھا کہ میں بدی کے ایسے مقام پر پہنچا ہوا ہوں کہ اب میری زبان سے یہ بھی نہیں نکل سکتا کہ خدایا میں توبہ کرتا ہوں لیکن میرے نزدیک جب اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ میرے چہرہ پر اپنے پیر رکھ کر یہ الفاظ کہنا تو عملی طور پر اُس نے توبہ کرلی معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کو اسکی یہی ادا پسند آگئی اور اُس نے اسے جنّت میں داخل کر دیا۔ پس یہ روایت خواہ بناوٹی ہو یا یہ واقعہ صحیح ہو بڑی عمدہ روایت ہے اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا کرشمہ انسان کی آنکھوں کے سامنے لے آتی ہے۔

تفاسیر کی ان ذوقی باتوں کے مقابلہ میں صحابہؓ

نے وہی طریق اختیار کیا ہے جو اس آیت کی تفسیر
کرتے ہوئے ایک سمجھدار انسان اختیار کرسکتا ہے
اور اس آیت کا جو مفہوم ثابت ہوتا ہے صرف اُس
کو انہوں نے بیان کیا ہے ذوقی باتوں کی طرف وہ نہیں
گئے۔ چنانچہ سفیان بیان کرتے ہیں اَنَّ عُمَرَ سَمِعَ
رَجُلًا یَقْرَءُ یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ
الْكَرِیْمِ فَقَالَ عُمَرُ اَلْجَھْلُ (ابن ابی حاتم۔ حوالہ
ابن کثیر) کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو یہ پڑھتے سُنا
کہ یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ
اے انسان تجھے کس نے رب کریم پر جرأت دلادی۔
حضرت عمرؓ نے کہا جہالت نے۔ اور کس نے۔ اسی طرح
حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی روایت ہے چنانچہ ابن ابی
حاتم کہتے ہیں قَالَ ابْنُ عُمَرَ غَرَّہٗ وَاللّٰہِ جَھْلُہٗ
(ابن کثیر) کہ حضرت ابن عمرؓ نے کہا خدا کی قسم اسے جہالت
نے مغرور کردیا۔ ابن عباس اور الربیع ابن خیثم اور حسن
بصری سے بھی یہی مروی ہے (ابن کثیر) اور قتادہ
سے آیت مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ کے متعلق
روایت ہے وہ کہتے ہیں مَا غَرَّ ابْنَ اٰدَمَ غَیْرُ ھٰذَا
الْعَدُوِّ الشَّیْطٰنُ (ابن کثیر) کہ ابن آدم کو کسی نے جرأت
نہیں دلائی سوائے اُس دشمن کے جس کا نام شیطان ہے
صوفیاء نے جو معنے کئے ہیں وہ اس بناء پر کئے ہیں کہ
وہ کہتے ہیں یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ
میں انسان سے سوال کیا گیا ہے کہ تجھے کس چیز نے مغرور
کیا تھا مگر آگے اَلْكَرِیْمِ کا لفظ استعمال فرماکر اللہ تعالیٰ
نے خود ہی جواب سکھا دیا ہے کہ کہہ دینا۔ کریم خدا کی
بخشش اور عفو نے ہمیں یہ جرأت دلادی تھی۔ لیکن شاہدؔ
بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی بخشش اور عفو کی وجہ سے انہیں
گناہوں پر دلیری نہیں ہوئی بلکہ ان کی دلیری کی وجہ یہ تھی
کہ وہ شیطان کے پیچھے چل پڑے اور خدا تعالیٰ کے نافرمان
بن گئے یا یہ کہ اُن سے یہ گناہ ان کی جہالت کی وجہ سے سرزد

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ میں لفظ کریم کی تشریح صحابہؓ کے نزدیک

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ کا مخاطب مومن نہیں بلکہ کافر ہے

ہوئے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو سمجھتے اسکی اطاعت
کی قدر و قیمت کو جانتے اور بصیرت سے کام لیتے تو ایسے
افعال کے وہ مرتکب نہ ہوتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ
مومن خدا تعالیٰ کو کریم سمجھتا ہے اور وہ اسکی بخشش اور عفو
پر ہر لحظہ یقین رکھتا ہے مگر گناہوں کے ارتکاب کی اسے وجہ
قرار دینا کسی صورت میں بھی درست نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ
قرآن کریم میں صاف طور پر فرماتا ہے کہ گناہوں کے ارتکاب
کی بڑی وجہ انسان کی جہالت ہوتی ہے فرماتا ہے مَنْ
عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَھَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ
اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (انعام ع ۶) یعنی جو کوئی تم
میں سے نادانی سے کچھ برائی کا کام کرے گا۔ پھر اس کے بعد
توبہ کرے گا اور نیک کام کرنے لگے گا۔ تو اللہ اس کے گناہ
بخش دے گا کیونکہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ پس جو شخص بھی
گناہ کرتا ہے درحقیقت جہالت سے کرتا ہے دیدہ دانستہ
تو وہی گناہ کرے گا جو کافر ہوگا۔ اس لئے یہ تو کہا جاسکتا
ہے کہ انسان کو شیطان کی اتباع مغرور کردیتی ہے یا
اُس کی جہالت اُسے دھوکا دے دیتی ہے مگر یہ نہیں کہا
جاسکتا کہ اس جرأت اور غرور کا موجب خدا تعالیٰ کا
کرم اور بخشش ہوتی ہے سوائے اس کے کہ اسے ایک
غیر طبعی نتیجہ قرار دیا جائے جو خود ایک نفس کی بیماری
کہلائے گا۔ خدا تعالیٰ کے کرم کے نتیجہ میں انسان اپنے
ایمان اور اپنے عرفان میں ترقی کیا کرتا ہے یہ نہیں ہوتا
کہ وہ گناہوں پر دلیر ہوجائے پس یہ بالکل غلط ہے کہ
اللہ تعالیٰ کا کرم انسان کے لئے گناہوں پر جرأت کرنے کا
موجب ہوجائے بیشک مومن خدا تعالیٰ کے کرم پر بڑا
یقین رکھتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی رحمت کا ہمیشہ امیدوار
رہتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں اس بات کے بیان
کرنے کا کونسا موقع تھا یہاں تو کفار کا ذکر ہو رہا ہے
لیکن ہمیں بتایا یہ جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار سے کہے گا
کہ جب میں تمہارے گناہوں کی تم سے پرسش کروں تو تم

مجھے کہہ دینا۔ آپ جو کریم خدا تھے آپ کے کرم نے ہی ہمیں مغرور کر دیا تھا۔ کیا کوئی عقل تسلیم کرسکتی ہے کہ ایک طرف کفار کے متعلق ناراضگی کا اظہار کیا جا رہا ہو اور دوسری طرف یہ راز و نیاز کی باتیں بھی ہو رہی ہوں مومنوں کا ذکر ہوتا تب تو کسی حد تک یہ بات معقول بھی قرار دی جا سکتی تھی مگر یہاں تو کفار کا ذکر ہے خدا تعالیٰ اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں نے اتنا بڑا جرم کیا ہے جس سے آسمان پھٹ گیا ہے مگر بتایا یہ جا رہا ہے کہ خدا نے آگے انہیں خود ہی جواب سکھا دیا ہے کہ تمہارا جرم بیشک سخت ہے مگر مجھے یہ جواب دے دینا تو میں تمہیں معاف کر دوں گا ایسے خطرناک عذاب کے وقت تو اس قسم کی راز و نیاز کی باتوں کی طرف خیال بھی نہیں کیا جا سکتا مگر نہ معلوم صوفیاء کو کیا سوجھا کہ اس آیت سے انہوں نے یہ نکتہ نکال کر پیش کر دیا حالانکہ اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ربِ کریم کے سامنے تو تمہیں شرم کرنی چاہیئے تھی مگر تم ایسے گستاخ اور بے ادب نکلے کہ تم نے اپنے رب کریم کی بھی پروا نہ کی۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کریم سے شرم کی جاتی ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں لیٹے ہوئے تھے اور آپؐ کی ٹانگوں کا کچھ حصہ ننگا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ آئے اور بیٹھ گئے پھر حضرت عمرؓ آئے اور بیٹھ گئے مگر آپؐ نے کوئی پروا نہ کی۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ حضرت عثمانؓ نے دستک دے دی۔ آپ فوراً اُٹھ بیٹھے اور اپنی ٹانگوں کو کپڑے سے ڈھانک لیا اور فرمایا عثمانؓ بہت شرمیلا ہے اُس کے سامنے ٹانگ کا کچھ حصہ ننگا رکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ چنانچہ حدیث کے یہ الفاظ ہیں اَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُضْطَجِعًا فِيْ بَيْتِهٖ كَاشِفًا عَنْ فَخِذَيْهِ اَوْ سَاقَيْهِ فَاسْتَاْذَنَ اَبُوْبَكْرٍ فَاَذِنَ لَهٗ وَهُوَ عَلٰى تِلْكَ الْحَالِ فَتَحَدَّثَ ثُمَّ اسْتَاْذَنَ عُمَرُ فَاَذِنَ لَهٗ وَهُوَ كَذٰلِكَ فَتَحَدَّثَ ثُمَّ اسْتَاْذَنَ عُثْمَانُ فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَوّٰى ثِيَابَهٗ فَلَمَّا خَرَجَ قَالَتْ عَائِشَةُ دَخَلَ اَبُوْبَكْرٍ فَلَمْ تَهْتَشَّ لَهٗ وَلَمْ تُبَالِهٖ ثُمَّ دَخَلَ عُمَرُ فَلَمْ تَهْتَشَّ لَهٗ وَلَمْ تُبَالِهٖ ثُمَّ دَخَلَ عُثْمَانُ فَجَلَسْتَ وَسَوَّيْتَ ثِيَابَكَ فَقَالَ اَلَا اَسْتَحْيِيْ مِنْ رَجُلٍ تَسْتَحْيِيْ مِنْهُ الْمَلَائِكَةُ (مسلم کتاب الفضائل) یعنی حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں لیٹے ہوئے تھے۔ اور اپنی پنڈلیوں سے کپڑا ہٹایا ہوا تھا اسی حالت میں ابوبکرؓ نے اندر آنے کی اجازت چاہی تو آپؐ اسی طرح لیٹے رہے۔ اور آپؐ نے اجازت دے دی اور ان سے گفتگو فرماتے رہے۔ پھر عمرؓ آئے۔ اور انہوں نے اجازت طلب کی اور آپؐ نے اجازت دے دی۔ اور اسی طرح لیٹے رہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد عثمانؓ آئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کھڑے ہوئے اور کپڑے کو درست کر لیا اور ان کو اندر آنے کی اجازت دیدی جب سب چلے گئے تو حضرت عائشہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ کہ یا رسول اللہ ابوبکر آئے اور عمر آئے تو آپؐ نے انکی آمد پر خاص پروا نہ کی اور اسی طرح لیٹے رہے جیسے لیٹے تھے لیکن عثمان کی آمد پر آپ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کپڑے ٹھیک کر لئے۔ آپؐ نے جواب دیا اے عائشہ کیا میں اس سے شرم نہ کروں جس سے فرشتے بھی شرم کرتے ہیں۔ تو دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمانؓ کی شرم کا لحاظ کیا کہ وہ لوگوں سے شرماتے تھے آپ اُن سے شرمائے۔ پھر ہم اس آیت سے یہ کس طرح مراد لے سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے کریم ہونے نے لوگوں کو گناہوں پر جرأت دلائی تھی۔ میرے نزدیک رب کریم کے الفاظ سے اسی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو اپنے کریم خدا کی بات تو مانی چاہیئے تھی نہ یہ کہ اُلٹا اس کی نافرمانی کرنے لگ جاتا۔

# الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِیْۤ اَیِّ

(اس رب کے بارے میں) جس نے تجھے پیدا کیا پھر تجھے (یعنی تیری اندرونی قوتوں کو) درست کیا پھر (دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں) تجھے مناسب

# صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝

قوتیں بخشیں (پھر) جو صورت اس نے پسند کی اس میں تجھے ڈھالا۔ ۵۵

میرے نزدیک مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ میں عیسائیت کی طرف نہایت لطیف پیرایہ میں اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ عیسائیت خدا تعالےٰ کے رحم پر بڑا زور دیتی ہے اور اُسکی بُنیاد ہی اس مسئلہ پر ہے کہ خدا محبّت ہے۔ خدا مہربان ہے۔ گو تفصیلات میں وہ خدا تعالےٰ کو نعوذ باللہ بڑا ظالم بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کے گناہ معاف ہی نہیں کر سکتا۔ مگر بہر حال وہ خدا تعالیٰ کی رحمت پر زور دیتے ہیں اور پھر ساتھ ہی یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ وہ لوگوں کے گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو تم اللہ تعالیٰ کو کریم کہتے ہو اور دوسری طرف ایسی صفات اُسکی طرف منسوب کرتے ہو جو اُس کے کریم ہونے کے خلاف ہیں اور تم اس کا ایک بیٹا تسلیم کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اُس نے لوگوں کے گناہ معاف کرنے کی جب کوئی اور صورت نہ دیکھی تو اپنے بیٹے کو لوگوں کے گناہوں کے بدلہ میں قربان کر دیا۔ پس اس جگہ مومنوں کا ذکر نہیں بلکہ ایسے دشمن کا ذکر ہے جو ایک طرف خدا تعالیٰ کو رب کریم کہتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہتا ہے کہ وہ گناہ معاف نہیں کر سکتا مجھے اِس وقت اچھی طرح یاد نہیں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے عیسائی کتابوں میں خدا تعالیٰ کے متعلق رحیم و کریم کا اکٹھا ذکر ہوتا ہے اور اگر نہ بھی ہو تب بھی کرم میں رحم شامل ہے بہر حال رب کریم کے الفاظ لاکر اس قوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو خدا تعالیٰ کو ایک طرف ربِّ کریم قرار دیتی ہے اور پھر دوسری طرف اُس پر اتہام بھی لگاتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ فرماتا ہے لے انسان تجھے کس نے یہ جرأت دلائی کہ ایک طرف تو اسے رب کریم کہتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہتا ہے کہ خدا گناہ معاف نہیں کر سکتا تھا اس وجہ سے اُس نے اپنے بیٹے کو صلیب پر قربان کر دیا۔

*حاشیہ:* سَوّٰی — آیت مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ میں کریم کہکر عیسائیت کے عقائد پر چوٹ

**۵۵ حل لغات۔** سَوّٰی کے معنے ہوتے ہیں سب عیبوں اور نقصوں کو دُور کیا (اقرب)، عَدَلَ کے ایک معنی نقص دُور کرنے کے بھی ہوتے ہیں جیسے کہتے ہیں عَدَلَ السَّھْمَ: اَقَامَهٗ تیر کو بالکل سیدھا کیا اور اس کے نقص کو دُور کر دیا اور عَدَّلَهٗ کے معنے ہوتے ہیں قَوَّمَهٗ اس کے نقص کو دُور کر دیا اسی طرح عَدَلَ کے معنے موازنہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ عَدَلَ فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں وَازَنَهٗ اس کا موازنہ کیا (اقرب)

فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ کی لوگ کئی ترکیبیں کرتے ہیں آسان ترصورت یہ ہے کہ مَا کو زائدہ قرار دے دیا جائے اور معنے یہ لئے جائیں کہ رَكَّبَكَ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ شَآءَ یعنی اُس نے اپنی مرضی کے مطابق تجھ کو صورۃ بخشی جسمانی بھی اور روحانی بھی گویا شَآءَ سے مُراد وہ صورت ہوگی جو اُس نے خود پسند کی اور جسے اُسکی مشیّت نے ترجیح دی یعنے ایسا نہیں ہوا کہ اتفاقی طور پر انسان کو اس صورت میں پیدا کر دیا گیا ہے بلکہ یہ وہ صورت ہے جسے خدا نے انسان کے لئے پسند کیا۔

**تفسیر**۔ اس آیت میں چار باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اوّل۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ دوم۔ اس کا تسویہ کیا یعنی ہر ذاتی نقص اور عیب کو دُور کیا۔ سوم پھر اس کی تعدیل کی یعنی دوسری اشیاء کی نسبت سے اس کی اصلاح کی۔ چہارم۔ پھر اسے ایسی صورت دی جو خدا تعالیٰ کی چنندہ صورت تھی اس چنندہ صورت کے مطابق اس نے انسان کی تخلیق کی۔ یعنی اعلیٰ درجہ کے کمالات اس میں رکھے۔ یہ چار باتیں مسیحیوں کی گستاخی کو اور زیادہ بھیانک بنانے کے لئے ہیں۔ مسیحی تاریخ دو خطرناک عیبوں پر مشتمل ہے (۱) اللہ تعالیٰ کی گستاخی پر جس کی تفصیل یہ ہے (الف) اللہ تعالیٰ کا شرک (ب) اللہ تعالیٰ پر عیب لگانا کہ وہ معاف نہیں کر سکتا (ج) اللہ تعالیٰ پر الزام کہ آدم کا گناہ اس نے اولاد میں رکھ دیا (د) اللہ تعالیٰ پر الزام کہ وہ بے گناہ کو دوسروں کی خاطر سزا دیتا ہے اور اس طرح ظالم ہے (۲) بنی نوع انسان کے متعلق (الف) غرور اور کبر اپنے آپ کو ہر بات میں دوسری اقوام پر فضیلت دینا۔ (ب) دوسروں کی نیکیوں کو چھپانا اور ان کے احسانات کا انکار کرنا (۳) بنی نوع انسان کی فطرت کو گندہ قرار دینا اور اس کے مقابل پر اپنے اندر خدائی طاقتوں کا دعویٰ۔ اسی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتا ہے کہ اے اوپر ذکر کئے ہوئے انسان یعنی مسیحی بتا تو کہ آخر کس بات نے تجھے مغرور کیا ہے اور پھر مغرور بھی رب کریم کے مقابل پر۔ یعنی ایک طرف تو خدا تعالیٰ کو گراتا ہے دوسری طرف اپنے آپ کو بڑھاتا ہے ایک طرف تو یہ تسلیم کرتا ہے کہ تیرا رب کریم ہے اور دوسری طرف تیری یہ حالت ہے کہ تو ایک بندے کو خدا کا بیٹا بنا رہا ہے جس کی بُنیاد اس دلیل پر ہے کہ خدا لوگوں کے گناہ معاف نہیں کر سکتا۔ اور چونکہ وہ معافی دینے کی طاقت نہیں رکھتا تھا اس لئے معافی کی قائم مقام کوئی اور چیز ہونی چاہیئے تھی سو وہ قائم مقام خدا تعالےٰ نے اپنے بیٹے کو بنا کر بھیج دیا۔ جس نے لوگوں کے گناہوں کی خاطر اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ یہی کفّارے کے مسئلہ کی بنیاد ہے جس پر عیسائی مذہب کی بنیاد ہے اور جس کی بناء پر وہ لوگوں میں حضرت مسیح کے ابن اللہ ہونے کا پراپیگنڈہ کرتے ہیں حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ تورات میں اور بھی کئی انبیاء کو بلکہ یہود کی قوم کو بھی خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا گیا تھا چنانچہ خروج باب ۴ آیت ۲۲ میں لکھا ہے "خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ جب تو مصر میں پہنچے تو دیکھ وہ سب کرامات جو مَیں نے تیرے ہاتھ میں رکھی ہیں فرعون کے آگے دکھانا۔ لیکن میں اس کے دل کو سخت کروں گا اور وہ ان لوگوں کو جانے نہیں دیگا۔ اور تُو فرعون سے کہنا کہ خداوند یُوں فرماتا ہے۔ کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا بیٹا ہے اور میں تجھے کہہ چکا ہوں کہ میرے بیٹے کو جانے دے۔"

مسیحیت میں دو خطرناک عیب

پھر سلیمان کے متعلق خدا تعالیٰ کہتا ہے "وہ میرا بیٹا ہوگا اور مَیں اس کا باپ ہونگا اور میں اسرائیل پر اس کی سلطنت کا تخت ابد تک قائم رکھوں گا۔" (تواریخ $\frac{22}{10}$) پس یہ سوال ہو سکتا تھا کہ جب اور انبیاء بلکہ صلحاء بھی خدا تعالےٰ کے بیٹے کہلاتے تھے تو حضرت مسیح کو بھی اگر ابن اللہ کہہ دیا گیا تو اس میں کونسی زائد خصوصیّت پیدا ہو گئی۔ اس لئے مسیحیوں نے یہ بات بنائی کہ مسیح کی امتیازی شان یہ ہے کہ اس کی قربانی کے ساتھ لوگوں کے گناہوں کی معافی وابستہ تھی اور چونکہ یہ خصوصیّت کسی اور نبی کو حاصل نہیں ہوئی اس لئے گو اُن کو بھی ابن اللہ کہا گیا ہے مگر وہ اَور معنوں میں ہے اور مسیح کو ابن اللہ اور معنوں میں کہا گیا ہے اسی طرح آہستہ آہستہ انہوں نے مسیح کی اُلوہیت کا مشرکانہ عقیدہ لوگوں کے قلوب میں راسخ کر دیا۔

مسیح کو ابن اللہ کہے جانے کا مطلب

دوسری چیز جو عیسائیوں کے گھمنڈ کا موجب ہوئی وہ اُن کی طاقت اور قوت اور اعلیٰ درجہ کی مادی ترقیات ہیں۔ اور یہ ترقیات اُن کو اس وجہ سے حاصل ہوئیں کہ انہیں اسلامی علوم بیج کے طور پر مل گئے تھے

مسیحیوں کے گھمنڈ کی وجہ۔

جن پر وہ اور عمارت بنا کر ترقی کر گئے۔ مسلمانوں کو یونانی
علم ملا تھا جس پر مزید تحقیق کر کے وہ ترقی کر گئے اور عیسائیوں
کو مسلمانوں کا علم مل گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں
سے زیادہ ترقی کر جاتے۔ جب انہیں ترقی حاصل ہوئی
تو ان کے دماغ میں غرور پیدا ہونا شروع ہو گیا کہ جو
ایجادات ہم نے کی ہیں وہ اب تک اور کسی قوم نے نہیں
کیں اس طرح انہیں اپنی ترقیات کے متعلق فخر پیدا ہو
گیا حالانکہ یہ اشیاء تو انہیں اور بھی اللہ تعالیٰ کی طرف
جھکانے والی ہونی چاہیئے تھیں

الَّذِیْ خَلَقَكَ کہہ کر عیسائیوں کو توحید کی طرف متوجہ کرنا۔

الَّذِیْ خَلَقَكَ کہہ کر اللہ تعالیٰ عیسائیوں کو
اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ تمہیں اُس خدا کا تو خیال کرنا
چاہیئے تھا جس نے تمہیں پیدا کیا۔ بائبل میں لکھا
ہے "خدا نے ساتویں دن کو برکت دی اور اسے مقدس
ٹھہرایا۔ کیونکہ اس میں خدا ساری کائنات سے جسے اس
نے پیدا کیا اور بنایا فارغ ہوا۔ یہ ہے آسمان اور زمین
کی پیدائش جب وہ خلق ہوئے جس دن خداوند خدا نے
زمین اور آسمان کو بنایا" (پیدائش باب ۲ آیت ۳ تا ۵) پھر
لکھا ہے " اور کہو خداوند ہمارا خدا ازل سے ابد تک
مبارک ہے تیرا جلالی نام مبارک ہو جو سب حمد و تعریف
سے بالا ہے تو ہی اکیلا خداوند ہے تو نے آسمان اور
آسمانوں کے آسمان کو اور ان کے سارے لشکر کو اور زمین
کو اور جو کچھ اس پر ہے اور سمندروں کو اور جو کچھ ان میں ہے
بنایا اور تو ان سبھوں کا پروردگار ہے" (نحمیاہ باب ۹ آیت ۶)
گویا آیت مذکورہ میں یہ توجہ دلائی ہے کہ جب وہی تمہارا
خالق ہے تو تم اُس کی بادشاہت کو دوسروں کی طرف کیوں
منسوب کرتے ہو۔ پھر خَلَقَكَ کے بعد سَوّٰىكَ کہہ کر
اسی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اس نے تم کو تمام معائب اور
نقائص سے پاک بنایا ہے انسانی فطرت میں جس
قدر کمزوریاں تھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے
اُن کا علاج بھی انسانی فطرت کے اندر ہی رکھ دیا ہے انسان
پر بڑی بڑی مشکلات آتی ہیں مگر ساتھ ہی اُن مشکلات کو
برداشت کرنے کا مادہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ بیماریوں
کے جراثیم حملہ کر کے آتے ہیں تو اُن کا توڑ انسانی نفس میں
پہلے ہی موجود ہوتا ہے۔ اور کئی قسم کی بیماریاں ہیں جو اندر ہی اندر
فنا ہو جاتی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ جسمانی طور پر اس نے
تمہارے علاج کے سامان تمہارے خون میں پیدا کئے ہیں
اور روحانی اور اخلاقی علاج بھی تمہارے نفس میں پیدا
کئے ہیں لیکن تمہاری نجات کے لئے اس نے ایک غیر طبعی
طریقہ ایجاد کیا کہ ایک بے گنہ پھانسی پر لٹکا دیا تا تم کو
نجات دلائے گویا وہ خون کا پیاسا ہے جب تک خون نہ پی
لے کسی کو چھوڑتا نہیں۔ العیاذ باللہ۔

عَدَلَكَ اور سَوّٰىكَ میں امتیازی فرق۔

اسی طرح فَعَدَلَكَ فرما کر اس طرف توجہ دلائی
کہ اس نے تمہارے نفس کی ہی اصلاح نہیں کی بلکہ تمہارے
وجود کو بیرونی دنیا کی نسبت سے بھی ایسا بنایا ہے کہ وہ
اسیر حکومت کا اہل ہے گویا جہاں ذاتی کمال بخشا تھا وہاں
نسبتی کمال بھی بخشا ہے پھر خدا تعالیٰ کے اس فعل کے بعد
یہ خیال کرنا کہ انسان نجات پانے کے لئے خدا تعالیٰ کے
بیٹے کی قربانی کا محتاج ہے کہاں تک درست ہو سکتا ہے
اور اسی طرح خدائی قانون کے ماتحت ترقی کرنے والی اقوام
کو دوسروں پر فخر کرنا اور انہیں ذلیل سمجھنا اور ذلیل قرار
دینا کس طرح زیب دیتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ فَسَوّٰىكَ میں صرف معمولی
تسویہ کی طرف اشارہ نہیں جو جسم کے ساتھ تعلق رکھتا ہو
بلکہ فَسَوّٰى سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے انسان
کے اندر ایسے اعلیٰ درجہ کے کمالات پیدا کر دیئے ہیں جن
سے اگر وہ کام لے تو خدا تعالیٰ سے بھی مل سکتا ہے۔

فَعَدَلَكَ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس کام
کے لئے اس نے انسان کو پیدا کیا تھا یعنے زمین پر خدا تعالیٰ
کا نائب بننے کے لئے اس کے متعلق اس نے موازنہ کیا کہ
وہ طاقتیں انسان کے اندر موجود ہیں یا نہیں یعنے وہ دوسری

مخلوق پر حکومت کرنے کا اہل ہے یا نہیں اور موازنہ کر کے اُس نے انسان کو وہ سب طاقتیں بخشیں جن سے وہ مادی دنیا پر حکومت کر سکتا ہے۔ عَدَلَ کے دو معنے بتائے جا چکے ہیں ایک تو تقویم کے معنے ہیں جو فَسَوّٰىكَ میں آ چکے ہیں پس یہاں دوسرے معنے ہی مُراد ہیں ورنہ تکرار فضول ہو جاتی ہے جو قرآن کریم کی شان کے خلاف ہے وہ دوسرے معنے موازنہ کے ہیں یعنے دوسری چیزوں کے قویٰ کو مدنظر رکھ کر اس میں طاقتیں رکھی ہیں تا کہ وہ ان پر حکومت کر سکے اور خدا تعالیٰ کا نائب ہو سکے اور اس مضمون سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ دُنیا پر اگر کسی قوم کو حکومت ملے اور علوم سائنس پر وہ غالب آئے تو اسے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اس نے اسے یہ قویٰ بخشے ہیں نہ کہ اُلٹا مغرور اور متکبّر ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی حکومت سے آزادی کا دعویٰ کرنے لگے اور دوسرے انسانوں پر ناجائز فضیلت کا مدعی بن جائے اور بجائے خدا تعالیٰ کی مغفرت حاصل کرنے کے اُسکی ناراضگی کو سہیڑ لے۔

فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ اس جملے سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو وہ صورت دی جو اس کی پسندیدہ اور چنیدہ صورت تھی یعنے صفات الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرنے کی صلاحیت۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صورت سب سے اعلیٰ ہے جسے خدا تعالیٰ کی تصویر کھینچنے کا موقعہ ملے اس سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہو سکتا ہے بائبل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ چنانچہ لکھا ہے "پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند بنادیں۔ (پیدائش باب ۱ آیت ۲۶) اس حوالہ کا یہی مطلب ہے کہ انسان کے اندر ایسے قویٰ رکھے کہ وہ صفات الٰہیہ کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے اور گویا صفاتی طور پر خدا تعالیٰ کا مظہر بن سکتا ہے احادیث میں بھی اس مضمون کی طرف اشارہ ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کہ تم اللہ تعالیٰ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو یعنے خدا جیسے بنو۔

فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ کا جملہ یا تو تفسیر سمجھا جائے گا خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ کا یعنی اُس نے خلق وہ کیا جو اس کا پسندیدہ تھا۔ اس نے تسویہ وہ کیا جو اس کا پسندیدہ تھا۔ اس نے عدل وہ کیا جو اس کا پسندیدہ تھا۔ اور یا پھر اس کے یہ معنے ہونگے اور انہی معنوں کو مینے اوپر ترجیح دی ہے کہ اس نے تمام ضروری طاقتیں انسان کے اندر پیدا کر کے اُسے وہ صورتِ روحانی بخشی جو اُس کی پسندیدہ تھی یعنی تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کی قابلیت اس میں پیدا کی۔

یہاں صورتِ روحانی کے معنے جو مینے لئے ہیں وہی درست ہیں اس لئے کہ صورت جسمانی کا ذکر پہلے خلق میں آ چکا ہے اور جو ذکر پہلے آ چکا ہے اسے دوبارہ دُہرانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس جملہ میں صورتِ رُوحانی کی تکمیل کا ذکر ہے یہ معنے اس لئے بھی مرجح ہیں کہ انسان کا ناک کان اور مُنہ وغیرہ ایسی چیزیں نہیں ہیں جو خدا تعالیٰ کو پیاری لگیں۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک تو انسان کی روحانی صورت ہی پسندیدہ ہوتی ہے خواہ جسمانی لحاظ سے اُس کے ناک کان کا تناسب کیسا ہی کیوں نہ ہو پس فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ کے معنی یہ ہیں کہ تمام قوتیں پیدا کرنے کے بعد ہم نے اسے وہ رُوحانی اُصول بتائے جو ہمارے نہایت ہی پسندیدہ تھے اور جن کے ماتحت وہ ہماری صورت پر بننے کا اہل ہو گیا فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ میں اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ جب جب جو صورت تیری ہم نے پسند کی تجھ کو بخشی جو صورت رُوحانی نوح کے زمانہ میں مناسب تھی اس کے اُصول نوحؑ کے ذریعہ سے بتائے۔ جو صورت ابراہیمؑ کے زمانہ

1 فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ میں صورۃ سے مراد روحانی صورت۔

کے مطابق مناسب تھی اس کے اُصول ابراہیمؑ کے ذریعہ
سے بتائے۔ جو صورت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے زمانہ کے مناسب
تھی اُس کے اُصول اُن کے ذریعہ سے بتائے اور جو صورت
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے مناسب تھی
اس کے اُصول محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ
سے بتائے۔ اسی طرح ہر قوم نے اپنے ماحول کے مطابق
دنیوی ترقیات حاصل کیں اور علوم میں ایجادیں کیں۔
گویا ہم نے روحانی اور جسمانی علوم زمانہ اور حالات کے
مطابق نازل کئے۔ تورات اُس وقت نازل کی جب
تورات کی ضرورت تھی اور قرآن اُس وقت نازل کیا
جب قرآن کی ضرورت تھی۔ علوم یونانی اس وقت نازل
کئے جب انسانی دماغ اُن کو سمجھنے کی قابلیت رکھتا تھا
اور علوم عربیہ اس وقت نازل کئے جب انسان ان کو
سمجھنے کی طاقت رکھتا تھا۔ اور علوم مغرب اُس وقت
نازل کئے جب انسان ان کو سمجھنے کی طاقت رکھتا تھا
پھر خدا تعالیٰ کے احسانات کی ناشکری کرکے دینِ حقیقی
سے اجتناب اور بنی نوع انسان پر تفاخر کے معنے
ہی کیا ہوئے

حضرت مسیح کے داؤد کی اولاد میں سے ہونے کا بے بنیاد دعوٰی۔

میری عمر کوئی بیس سال کی تھی اور میں اُن دنوں
لاہور میں تھا کہ میاں محمد شریف صاحب ای۔ اے۔ سی
جن سے میرے دوستانہ تعلقات تھے مجھے ایک پادری
مسٹر وُوڈ کے پاس لے گئے جو مشنری کالج کا پرنسپل تھا۔
وہ کہنے لگے کہ چلو اس سے مذہبی مسائل پر گفتگو کریں
مَیں نے کہا چلیں مَیں تیار ہوں۔ اسے اُردو پوری طرح نہیں
آتی تھی اور مجھے انگریزی پوری طرح نہیں آتی تھی مگر پھر بھی
ہم نے آپس میں کچھ گفتگو کر ہی لی۔ کچھ وہ میری مدد کر دیتا
اور کچھ مَیں اُسکی مدد کر دیتا اور اس طرح باتوں کا سلسلہ جاری
رہا۔ مَیں نے اس سے یہ سوال کیا کہ تم بتاؤ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کی
نجات کس طرح ہوئی ہے۔ جس ذریعہ سے انکی نجات ہوگئی ہے
اسی ذریعہ سے اب بھی لوگوں کی نجات ہوسکتی ہے اس نے کہا
ابراہیمؑ اور موسیٰؑ حضرت مسیح پر ایمان لاچکے تھے مَیں نے کہا
وہ ایمان کس طرح لا چکے تھے وہ تو حضرت مسیح سے پہلے
ہوئے ہیں۔ قرآن کریم نے بھی اس سوال کو لیا ہے کہ حضرت
ابراہیمؑ کے متعلق یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ نصارٰی میں سے
تھے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے وہ تو پہلے گذر چکے تھے انکو
نصارٰی میں سے کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے پس مَیں نے کہا
کہ یہ بات تو بالکل غلط ہے اگر حضرت مسیح پر ان کے
ایمان لانے کا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہو تو اسے پیش کریں
اس نے کہا داؤدؑ نے پیشگوئی کی تھی کہ اسکی اولاد میں ایک
ایسا شخص ہوگا جو خدا کا بیٹا ہوگا مَیں نے کہا حضرت مسیح تو
داؤدؑ کی اولاد میں سے تھے ہی نہیں یہ پیشگوئی ان پر کس
طرح چسپاں ہوسکتی ہے کیونکہ انجیل میں دو جگہ مسیح کا
نسب نامہ درج ہے (۱) متی باب ۱ آیت ۱ تا ۱۸۔ اور پھر
لوقا باب ۳ آیت ۲۳ ہر دو میں لکھا ہے کہ یوسف جس نے
مریم سے شادی کی وہ داؤدؑ کی اولاد میں سے تھا تو نہ معلوم
یسُوع مسیح کس طرح داؤدؑ کی اولاد میں سے بن گیا۔ حالانکہ
یوسف اس کا باپ نہ تھا۔ بلکہ وہ تو بے باپ پیدا ہوا۔
اور ماں کی طرف سے اسرائیلیوں کا نسب نامہ ہو نہیں
سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ بے باپ کے پیدا ہونے کا
دعوٰی ابن داؤدؑ ہونے کے دعوٰی کے بالکل خلاف ہے
اور پھر اس سے ابراہیمؑ کا ایمان کہاں سے ثابت ہوا پیشگوئی
تو کرے داؤدؑ اور ایمان ثابت ہو ابراہیمؑ کا اس نے کہا
ابراہیمؑ کی نسبت آتا ہے کہ اُس سے اولاد کی ترقی کا وعدہ
تھا مَیں نے کہا کہ مسیح تو ابراہیمؑ کی نسل سے نہ تھے اگر اولاد
کی پیشگوئی ہے تو وہ اس کی نسبت سمجھی جائے گی جو یقیناً
نسل ابراہیمؑ سے ہے یعنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی ذات بابرکات نہ کہ مسیح کی نسبت جو اگر خدا کا بیٹا
تھا۔ تو ابراہیمؑ کا نہ تھا اور اگر ابراہیمؑ کا بیٹا تھا تو بات
ہی ختم ہوجاتی ہے۔ آخر لمبی بحث کے بعد تنگ آکر اُس
نے کہا کہ یونانی میں ایک مثل ہے کہ سوال ہر بے وقوف

# كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝

ایسا ہرگز نہیں (جو تم خیال کرتے ہو) بلکہ تم تو جزا سزا کو جھٹلاتے ہو ۹

کرسکتا ہے مگر جواب دینے کے لئے عقلمند انسان چاہیئے میری طبیعت بھی ان دنوں تیز تھی مَیں نے جھٹ کہا کہ میں تو آپ کو عقلمند سمجھ کر ہی آیا تھا اب مجھے معلوم ہُوا کہ یہ میری غلطی تھی۔ اُس نے مجھے بیوقوف بنایا تھا مَیں نے اس کا حملہ اس پر اُلٹ دیا۔

پس فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم ہر زمانہ کے لحاظ سے انسان کو تعلیم دیتے چلے آئے ہیں کبھی ہم نے اسکی ہدایت کے لئے کوئی تعلیم نازل کی اور کبھی کوئی۔ اور وہ تعلیم ایسی تھی جو انسان کے مطابق حال تھی اور جس پر چل کر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرسکتا تھا اس کے باوجود پہلے انبیاء کی تنقیص اور دوسری اقوام کی تنقیص (جو مسیحیوں کا شیوہ ہے) خلافِ عقل ہے اسی طرح مسیح کے بعد آنے والی مکمل تعلیم کا انکار بھی خلافِ عقل ہے۔

غرض اَلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اے انسان پہلے تو خدا نے تجھے کرم کے ساتھ پیدا کیا یعنی تیری پیدائش کو اپنے کرم کے نیچے رکھا پھر اپنے کرم کے ساتھ تجھے ہر ایسے نقص سے جو تیری ترقی کی راہ میں حائل ہو سکتا تھا دُور کیا۔ پھر دوسری چیزوں کے مقابل پر تیری تکمیل کی جب مَیں نے یہ سب کچھ کرلیا تو تُو نے اُس مقصد کو ہی چھوڑ کر اَور طرف رُخ کرلیا یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ بادشاہ ایک لشکر کو تیار کرے پہلے ان کو بھرتی کرے پھر تربیت دے پھر سامان جمع کرے پھر سامان دے کر سواریاں حوالے کرے اور جنگ کی طرف بھجوائے مگر وہ شہر سے باہر نکل کر ایک شراب خانہ میں جمع ہوجائیں اور جوا کھیلنے لگیں۔ کیا یہ لوگ اپنے آقا کو شرمندہ کرنے والے نہ ہونگے۔ کیا ان سے بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ کہہ کر خطاب کرنا زجر اور افسوس کے طور پر ہوگا یا جواب سکھانے کے لئے۔ ہاں یہ ضرور ظاہر ہے کہ یہ افسوس اور ناراضگی ایک محسن کی ہے جو اپنے احسان جتا کر افسوس کرتا ہے کہ ہم نے کیا چاہا تھا اور تم نے کیا کر دیا۔

**۹ حل لغات** ۔ اَلدِّیْنُ کے معنی ہیں اَلْجَزَاءُ وَالْمُکَافَأَۃُ۔ جزا اور بدلہ۔ اَلْحِسَابُ۔ حساب کرنا۔ اَلْقَضَاءُ فیصلہ کرنا۔ (اقرب)

اَلدِّیْن

**تفسیر** ۔ فرماتا ہے کہ ہم تمہیں سچی بات بتاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ خیال کہ ہم مسیح پر ایمان لاکر بخشے جائیں گے یہ تو محض ایک بہانہ ہے اصل بات یہ ہے کہ تمہیں بخشے جانے یا نہ بخشے جانے پر ایمان ہی نہیں اور قیامت کے تم قائل ہی نہیں ہو چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ ایک عیسائی پادری کو بھی قیامت کے وجود پر حقیقی ایمان نہیں ہوتا مَیں نے دیکھا ہے جب بھی وہ قیامت پر بحث کرتے ہیں۔ اس سے ان کا منشاء صرف اتنا ہوتا ہے کہ حضرت مسیح دوبارہ آسمان سے اُتریں گے اور یہی قیامت ہوگی*

عیسائیت بعث بعد الموت کی منکر ہے۔

* ان کا یہ عقیدہ انکی کتب میں پایا جاتا ہے۔ "دعائے عام" جو کرسچن نالج سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں صبح کی دُعاؤں کے ضمن میں لکھا ہے کہ ہر ایک دُعا کرنیوالا مندرجہ ذیل عبارت دُہرائے "میں ایمان رکھتا ہوں۔ خدا قادرِ مطلق باپ پر جو آسمان و زمین کا خالق ہے اور یسوع مسیح پر جو اس کا اکلوتا بیٹا ہمارا خداوند ہے وہ رُوح القدس کی قدرت سے پیٹ میں پڑا۔ کنواری مریم سے پیدا ہوا۔ پیلاطوس کے عہد میں دُکھ اُٹھایا۔ مصلوب ہُوا۔ مرگیا اور دفن ہُوا۔ عالم ارواح میں اُتر گیا۔ تیسرے روز مُردوں میں سے جی اُٹھا۔ آسمان پر چڑھ گیا اور خدا قادرِ مطلق باپ کے دہنے بیٹھا ہے وہاں سے وہ زندوں اور مُردوں کی عدالت کیلئے آنیوالا ہے" نیز دیکھیں کتاب مذکورہ ص۲۴۵ زیرعنوان بچوں کا علانیہ بپتسمہ "وہ وہاں سے (یعنی مسیح) دنیا کے آخر میں زندوں اور مردوں کی عدالت کرنے کیلئے آنیوالا ہے۔ پس روز روشن کیطرح اس عبارت کے آخری فقرہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مسیح کی آمد ثانی ہی قیامت ہے۔

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝

اور یقیناً تم پر (تمہارے خدا کی طرف سے) نگران مقرر ہیں (جو) شریف (اور) ہر بات کو لکھنے والے (ہیں)

يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ

تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں ۵ یقیناً نیکیوں میں بڑھ جانے والے لوگ (ہمیشہ)

ورنہ موت کے بعد جو قیامت آنے والی ہے اُس پر اُن کو کوئی یقین نہیں ہوتا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ یہودی مذہب میں قیامت کا کوئی ذکر نہیں۔ ہمیں اس بات پر یقین ہے کہ تورات میں قیامت کا ضرور ذکر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا کلام اس ذکر سے خالی نہیں ہو سکتا مگر موجودہ تورات سے قیامت کے وجود کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا۔ قرآن کریم میں یہ ذکر آتا ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے ہمیں صرف چند دن عذاب دیا جائے گا۔ اس کے بعد ہم کو معاف کر دیا جائے گا۔ (سورہ بقرہ ع ۹) مگر اس کے لئے بھی ہمیں پُرانی کتب میں سے حوالے محنت سے تلاش کرنے پڑتے ہیں کہ یہودیوں کا یہ عقیدہ ہوا کرتا تھا اگر قیامت کا کثرت سے یہودی کتب میں ذکر ہوتا تو اس قسم کی تلاش کی کوئی ضرورت نہ ہوتی بات یہ ہے کہ یہودی مذہب میں قیامت کا اس قدر کم ذکر کیا گیا ہے کہ یہود میں سے اکثر کا یہ خیال ہے کہ قیامت کا عقیدہ درست ہی نہیں اس وجہ سے وہ اپنا سارا زور دنیا کمانے پر صرف کر دیتے ہیں یہی حال عیسائیوں کا ہے پس فرماتا ہے كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ کیوں باتیں بناتے ہو سیدھی بات یہ ہے کہ قیامت پر تمہیں ایمان ہی نہیں۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ صفات نیک اگر استعمال ہوں تو انسان کے لئے سکھ کا موجب بن جاتی ہیں اور اگر بُری صفات اختیار کی جائیں تو وہ انسان کے لئے دُکھ کا موجب بن جاتی ہیں رب کریم کو چھوڑ کر اُسکی دی ہوئی طاقتوں کو استعمال کروگے تو راستہ سے بھٹک ہی جاؤ گے اور ایک دن اپنے بد انجام کو دیکھ لوگے۔

اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ میں اعمال محفوظ کئے جانے کی طرف اشارہ۔

۵ تفسیر۔ قرآن کریم کے بعض دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانی اعمال کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اور فرشتے اس کام پر مقرر ہیں احادیث صحیحہ میں بھی اس کا ذکر آتا ہے پس وہ تو ہے ہی اور اس میں مسلمانوں کی کوئی تخصیص نہیں عیسائیوں کے اعمال بھی لکھے جاتے ہیں۔ یہودیوں کے اعمال لکھے جاتے ہیں۔ زرتشتیوں کے اعمال بھی لکھے جاتے ہیں اور اسی طرح دوسری اقوام کے اعمال بھی لکھے جاتے ہیں۔ غرض ہر کافر و دیندار، مومن مشرک سب کے اعمال محفوظ رکھے جاتے ہیں اور قیامت کے دن وہ ہر انسان کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ اب وائرلیس کی ایجاد نے قرآن کریم کے اس بیان کی صحت کا مزید ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کیونکہ وائرلیس کی ایجاد نے ثابت کر دیا ہے کہ ہر حرکت جو انسان کرتا ہے خواہ وہ خفیف سے خفیف تر کیوں نہ ہو سارے جَوّ میں پھیل جاتی ہے پس اس سے اتنا پتہ لگ گیا کہ انسان جو بھی حرکت کرتا ہے وہ فوری طور پر جَوّ میں لکھی جاتی ہے لکھے جانے کے معنے یہی ہیں کہ وہ اُدھر منتقل ہو جاتی ہے۔ اب صرف یہ سوال رہ گیا ہے کہ وہ حرکت یا وہ آواز جَوّ میں کتنی دیر تک محفوظ رہتی ہے۔ مجھے ہمیشہ امید رہتی ہے کہ ممکن ہے کوئی زمانہ ایسا بھی آ جائے کہ ہم گذشتہ لوگوں کی آوازوں کو کسی آلہ کے ذریعہ سے سُن سکیں مثلاً ہم نپولین کے مُنہ سے اسکی

باتیں سُن لیں یا اگر پچھلے لوگوں کی باتوں کو ہم نہ سُن
سکیں تو آیندہ کے لئے ہی کوئی ایسا انتظام ہو جائے
کہ ہم اُن آوازوں کو جو جَوّ میں منتقل ہو جائیں دو دن
چار دن دس دن کے بعد سُن سکیں۔ ریڈیو اور فونوگراف
دونوں مل کر اب بھی یہ کام کرتے ہیں چنانچہ بادشاہ تقریر
کرتا ہے تو وہ تقریر دو دو چار چار دن کے بعد دوسرے
ملکوں میں سنادی جاتی ہے تو وائرلیس اور فونوگراف
دونوں نے مل کر قرآن کریم کی اس بیان کردہ صداقت
کا ثبوت مہیا کر دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ انسان کا
کوئی عمل ضائع نہیں جاتا وہ ضرور کوئی نہ کوئی نشان
چھوڑ جاتا ہے حتّٰی کہ بعض دفعہ آنے والی نسلوں پر
وہ عمل جا کر ظاہر ہوتا ہے پہلے لوگ حیران ہوتے تھے کہ
اعمال کس طرح لکھے جاتے ہیں مگر اب وائرلیس اور
فونوگراف کی ایجاد نے ایک نیا ثبوت اس امر کا مہیا
کر دیا ہے کہ انسانی اعمال محفوظ رکھے جا سکتے ہیں۔

قرآن کریم نے قیامت کے دن کے متعلق جو کچھ
کہا ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ
اس دن ایسا ہی ہوگا انسان کے ہاتھ اور پیر گواہی
دیں گے کہ وہ کیا کرتا رہا ہے اور کیسے اعمال اس سے
سرزد ہوتے رہے ہیں ممکن ہے کوئی آلہ ایسا ہو جسپر
قیامت کے دن انسان کے ہاتھ پیر اور زبان وغیرہ
رکھ دیئے جائیں اور یہ اعضاء تمام گذشتہ باتوں کو
دہرانا شروع کر دیں گویا ایک ریکارڈ اُس وقت لگ
جائے اور انسان سے کہا جائے کہ لو اب سُن لو تم کیا
کچھ کرتے رہے ہو۔ اُس وقت وہ کہیں گالیاں دیتا
نظر آئے گا۔ کبھی تسبیح کرتا دکھائی دیگا کہیں جھوٹ
بولتا دیکھا جائے گا اور وہ اپنے ہی اعمال کو دیکھ کر
شرمندہ ہوگا کہ مَیں کیا کرتا رہا ہوں۔

قرآن کریم میں مومنوں کے متعلق آتا ہے کہ اُن
سے حِسَابًا یَّسِیْرًا (سورۃ انشقاق) لیا جائے گا
اس کا مطلب مَیں یہی سمجھتا ہوں کہ چونکہ مومن کو
اللہ تعالیٰ نے معاف کرنا ہوگا اس لئے وہ اسے
بدنام نہیں کرے گا اور اس کے اعمال کی تفصیلات
دریافت نہیں کرے گا صرف اتنا پوچھ لے گا کہ ٹوٹل
ٹھیک ہے یا نہیں۔ جب کہا جائے گا کہ ٹوٹل ٹھیک
ہے تو اللہ تعالیٰ کہے گا اسے لے جاؤ جنت میں۔
اس طرح اس کی بدیوں پر پردہ پڑا رہے گا لیکن جس
کا ٹوٹل ٹھیک نہیں ہوگا اس کے متعلق خدا کہے گا
کہ نکالو اس کا اعمالنامہ۔ اور اس کا ایک ایک عمل
اس کے سامنے پیش کرو۔ اس طرح اسکی بدیاں
ایک ایک کر کے سامنے لائی جائینگی اور وہ اوّلین
و آخرین میں شرمندہ اور ذلیل ہوگا لیکن اگر اِنَّ
عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ کو
عیسائیت کے لئے مخصوص قرار دیا جائے تو پھر
میں سمجھتا ہوں اس سے مراد وقت کا مامور اور اسکی
جماعت ہے۔ فرماتا ہے اِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ
ہم ایسے لوگ پیدا کرینگے جو تمہاری مشرکانہ باتوں
کو نوٹ کریں گے اُن کو محفوظ کریں گے اور ان کو یاد
رکھیں گے کیونکہ اُن کا کام یہ ہوگا کہ وہ تمہاری ان باتوں
کا رد کریں اور تمہارے اس زہر کا ازالہ کریں پس چونکہ
وہ تمہارے ان مشرکانہ عقائد کی تردید کے لئے کھڑے
ہونگے اس لئے وہ ان باتوں کو نوٹ کرتے چلے جائینگے
یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ اور جو کچھ تم کرو گے اس سے
وہ خوب واقف ہو [illegible] مطلب نہیں ہے کہ وہ عیسائیوں
کے تمام اعمال کو جانتے ہونگے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ
اُن کے اعمال کی حقیقت سے خوب واقف ہوں گے
عیسائیت دھوکا دیگی وہ اپنے بُرے کاموں کو بھی اچھی
صورت میں پیش کرنے کی کوشش کریگی مگر وہ لوگ اس
دھوکا میں نہیں آئینگے وہ انکی نیتوں کو خوب سمجھتے ہونگے
اور جانتے ہونگے کہ یہ لوگ اندرونی طور پر کیسے ہیں۔

قیامت کے دن مومنوں کا سرسری حساب

اِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ میں مامور اور اسکی جماعت کی طرف اشارہ

قیامت کے دن ہاتھ پاؤں کا گواہی دینا۔

نَعِيْمٍ ۝ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۝ يَّصْلَوْنَهَا

نعمت میں (رہتے) ہیں اور بدکار لوگ بھی یقیناً (ہمیشہ) جہنم میں (رہتے) ہیں وہ (خصوصیت کے ساتھ) اس

يَوْمَ الدِّيْنِ ۝

میں جزا سزا کے دن داخل ہونگے ۱۵

الْاَبْرَار

۱۱ حل لغات۔ اَلْاَبْرَارُ۔ بَرٌّ کی جمع ہے جو بَرَّ سے صفت مشبّہ کا صیغہ ہے۔ اور بَرَّ کے معنے ہیں اَحْسَنَ الطَّاعَةَ اِلَيْهِ وَرَفِقَ بِهٖ وَتَحَرّٰى مَحَابَّهٗ وَتَوَقّٰى مَكَارِهَهٗ یعنی اچھی طرح اس کی اطاعت کی اور اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا نیز اس کی خوشنودی کو حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کی ناراضگی کی باتوں سے بچا۔ (اقرب) پس اَلْاَبْرَار کے معنے ہونگے اچھی طرح اطاعت کرنیوالے اور نرمی کا برتاؤ کرنے اور خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو حاصل کرنے کی کوشش کرنیوالے اور اسکی ناراضگی سے بچنے کی کوشش کرنے والے۔

النعیم

اَلنَّعِيْمُ:۔ اَلْمَالُ یعنی نَعِیْم کے معنے مال کے ہوتے ہیں۔ اور نیز اس کے معنے ہیں اَلدَّعَةُ آرام کہتے ہیں رَجُلٌ نَعِيْمُ الْبَالِ اور معنے ہوتے ہیں هَادِئُ الْبَالِ مُرْتَاحُهٗ آسودہ حال شخص۔ اور نَعِيْمُ اللّٰهِ کے معنے ہیں۔ عَطِيَّتُهٗ۔ اللہ کا دیا ہوا عطیہ۔ (اقرب)

مومن کے لئے اسی دنیا میں جنت اور کافر کے لئے اسی دنیا میں جہنم۔

نَعِیْمٌ کے لفظ کی بناوٹ ایسی ہے کہ میں مدتوں ابتدائی عمر میں اسے جمع سمجھتا رہا۔ حالانکہ یہ واحد ہے جمع نہیں۔ مولوی محمد علی صاحب نے بھی اس کا ترجمہ "نعمتیں" کیا ہے۔ حالانکہ نَعِیْمٌ کے معنے صرف نعمت کے ہیں نعمتوں کے نہیں ہیں۔ مگر اس لفظ کی بناوٹ ایسی ہے کہ دھوکا لگ جاتا ہے اور غیر عرب اسے جمع سمجھنے لگ جاتا ہے۔

تفسیر۔ یہاں اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومن نعیم میں ہیں اور فجار جحیم میں ہیں۔ لیکن آگے چل کر فرمادیا يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ کہ وہ جزا سزا کے وقت اس میں داخل ہونگے گو صَلِیَ کے معنے آگ میں داخل ہونے کے ہوتے ہیں۔ اور کفار کی نسبت یہ فرمایا گیا ہے مگر چونکہ عربی زبان کا محاورہ ہے کہ کبھی دو باتوں کے ذکر میں ایک کی تشریح کر دی جاتی ہے اور دوسری کی تشریح اس میں آجاتی ہے اس لئے یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مومنوں کے داخل ہونے کے ذکر کو اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ کفار کے جہنم میں داخلہ پر ان کے جنت میں داخلہ کو قیاس کر لو۔ اس صورت میں اس آیت کے یہ معنے کئے جائیں گے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مرنے کے بعد کے انتظار کی ضرورت ہی نہیں۔ مومن اسی دُنیا میں جنت میں نظر آئیں گے۔ اور کافر اسی دُنیا میں دوزخ میں نظر آئیں گے۔ یعنے وہ اطمینان جو دلوں کو سکون بخشتا ہے کفار کے دلوں سے کوسوں دُور ہے اور باوجود دولت و ثروت رکھنے کے وہ اپنی تمام کوششوں کا نتیجہ ٹیڑھا نکلتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اسکے بالمقابل مومن باوجود ظاہری مشکلات اور مصائب اور تباہیوں کے یقین اور امید سے پُر ہیں اور اپنے مستقبل کو شاندار اور اپنے دین کو کامیاب دیکھ کر جنت کے مزے لے رہے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جس شخص کو خدا تعالیٰ پر

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ

اور وہ کسی طرح بھی اس سے (بچ کر) غائب نہیں ہو سکتے۔ ١٢ﻫ اور (اے مخاطب) تجھے کس نے اس بات کا علم دیا کہ

سچا ایمان نہ ہو اسے خواہ کتنی دولت مل جائے وہ اس کے سکون و اطمینان کا موجب نہیں بن سکتی۔ یورپ کے جسقدر فلاسفر ہیں وہ اس بات پر متفق ہیں کہ اطمینان یورپ والوں کے دلوں سے اُڑ چکا ہے۔ باوجود ظاہری شان و شوکت کے قلوب میں ایسی بے چینی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے نہ انہیں دولت کا مزہ آتا ہے نہ انہیں راحت و آرام کے سامانوں میں لذت محسوس ہوتی ہے ایک جہنم ہے جو ہر وقت انکے دلوں پر شعلہ زن رہتی ہے لیکن مومن اس دنیا میں اپنے آپکو جنت میں محسوس کرتا ہے۔ وہ دنیوی لحاظ سے مال و دولت اپنے پاس نہیں رکھتا لیکن اسکا دل مطمئن ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی جنت میں پاتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک مشہور واقعہ ہے ایک مجسٹریٹ جس کے پاس آپ کا ایک مقدمہ تھا اس کے متعلق آپکو یہ خبر پہنچی کہ اس نے آپکو سزا دینے کا پختہ فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ خبر خواجہ کمال الدین صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پہنچائی اور اس خیال کے ماتحت پہنچائی کہ نہ معلوم اب کیا ہوگا۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بات سنی تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا۔ وہ خدا تعالیٰ کے شیر پر ہاتھ ڈالکر تو دیکھے۔ اگر وہ ہاتھ ڈالیگا تو خود زخمی ہو جائے گا مگر ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچیگا۔ تو مومن چونکہ خدا پر کامل یقین رکھتا ہے اس لئے اس کے دل میں اطمینان ہوتا ہے کہ خواہ کیسی مصیبت آ جائے میرا رب میری مدد کریگا۔ اور اس طرح اسی دنیا میں وہ جنت میں داخل ہوتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ایک واقعہ اس جنتِ ارضی کا بے مثال نمونہ پیش کرتا ہے۔ غارِ ثور میں آپ اور حضرت ابوبکرؓ دونوں چھپے بیٹھے تھے۔ دشمن اس غار کے سر پر آ پہنچا اور اسقدر قریب آ گیا کہ حضرت ابوبکرؓ کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ اب دشمن اتنا قریب ہے کہ اگر وہ ذرا جھک کر اندر کی طرف دیکھے تو وہ ہمیں پکڑ سکتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس خطرے کا اظہار کر دیا جس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نہایت اطمینان کے ساتھ فرمایا۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (المردفی الانف جلد ثانی) غم مت کر خدا ہمارے ساتھ ہے۔

تو مومن ہر وقت جنت میں رہتا ہے اور کافر ہر وقت دوزخ میں رہتا ہے۔ اور اس طرح دوزخ اور جنت ہر انسان کے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے اور وہ ہر وقت یا دوزخ میں جلتا ہے یا جنت میں اطمینان سے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر آنکھیں ہوں تو انسان اس دنیا میں یہ دوزخ اور جنت دیکھ سکتا ہے مگر فرماتا ہے ان کفار کو یہ جہنم ابھی نظر نہیں آتی۔ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید مومن دوزخ میں ہیں اور وہ جنت میں لیکن گھبراؤ نہیں اس کا اظہار یَوْمُ الدِّیْن کو ہو جائیگا اور ہم انہیں ایک دن اپنی آنکھوں سے یہ جہنم دکھا دیں گے جس میں وہ اب مخفی طور پر جل رہے ہیں۔ جب وہ دن آئیگا تو دشمن بھی کہہ اٹھے گا کہ ہاں میں جہنم میں ہوں اور مومن جنت میں۔

**١٢ﻫ تفسیر۔** فرماتا ہے۔ یہ پورا زور لگا دیں گے کہ اس جہنم میں داخل ہونے سے بچ جائیں مگر بچ نہیں سکیں گے۔ آخر وہ دن آئیگا جب انکی طاقتیں توڑ دی جائینگی جب انکی حکومتیں مٹا دی جائیں گی اور جب زمین ان کے پیروں تلے سے نکل جائیگی۔ چنانچہ وہ جنگ جو آجکل ہو رہی ہے یہ خود ایک جہنم ہے جس نے انکی طاقتوں میں تزلزل پیدا کر دیا ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ اب یورپ

## الدِّيْنِ ۝ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝

جزا سزا کا وقت کیا ہے۔ پھر (ہم تجھے کہتے ہیں کہ) تجھے کس نے علم دیا ہے کہ جزا سزا کا وقت کیا ہے ۱۳؎

کے تنزّل کا وقت آرہا ہے۔ اور ابھی جیسا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بتایا اور میں اسے دو سال سے شائع کر چکا ہوں ایک اور عظیم الشان جنگ کی تیاریاں آسمان پر ہو رہی ہیں اور اس کے نتیجہ میں ایک وہ دن آئیگا جب وہ یہ نہیں کہیں گے کہ یورپ کے تنزّل کا وقت آرہا ہے بلکہ وہ کہیں گے یورپ کے تنزّل کا وقت آگیا۔ قیامت کے دن تو دینِ حقیقی کے منکر جہنم میں جائیں گے ہی مگر اس دنیا میں بھی وہ جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ اور یہ اس سے بچ نہیں سکیں گے۔ یہ اس سے بچنے کے لئے پورا زور لگائیں گے۔ کوشش کریں گے کہ جہنم کے دروازے ان پر بند ہو جائیں۔ جیسے آجکل کہیں لیگ آف نیشنز بنائی جا رہی ہے۔ اور کہیں اس آگ کو فرو کرنے کے لئے اَور تدابیر اختیار کیجا رہی ہیں مگر یہ سب تدابیر رائیگان جائینگی سب کوششیں اکارت ثابت ہونگی۔ یہ اس آگ سے غائب ہونا چاہینگے مگر غائب نہیں ہو سکینگے۔ اپنا سارا زور اس بات پر صرف کریں گے کہ اس جہنم سے بچ جائیں مگر بچ نہیں سکیں گے۔ جو کوشش بھی اس غرض کے لئے کریں گے الٹ پڑیگی اور وہ انہیں اور زیادہ اس جہنم کی طرف دھکیل کر لیجائے گی جس میں داخل ہونا ان کے لئے مقدّر ہو چکا ہے۔

**۱۳؎ تفسیر**۔ فرماتا ہے کس نے تم کو بتایا کہ یَوْمُ الدِّيْنِ کیا چیز ہے۔ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ پھر ہم کہتے ہیں کس نے تم کو بتایا۔ کہ يَوْمُ الدِّيْنِ کیا چیز ہے؟

مَآ اَدْرٰىكَ کا لفظ قرآن کریم میں جس مقام پر بھی دوہرایا گیا ہے وہاں اس بات کی تشریح کرنے کے لئے اسے دوہرایا گیا ہے جس کا اس مقام پر ذکر آتا ہے یہاں چونکہ يَوْمُ الدِّيْنِ کا بیان ہے۔ اس لئے ایک دفعہ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ کہنے کے بعد ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ کہنا صاف طور پر بتا رہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اس جگہ جس يَوْمُ الدِّيْنِ کا ذکر کر رہے ہیں اس سے کیا مراد ہے۔ یعنی يَوْمُ الدِّيْنِ تو کئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان آیات میں ہم نے جس يَوْمُ الدِّيْنِ کا ذکر کیا ہے اس سے ہماری مراد کیا ہے۔ ورنہ اگر مَآ اَدْرٰىكَ کا دوبارہ آنا تشریح کے لئے نہ ہو تو پھر اس کے دوہرانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پہلے جو کچھ بتایا ہے وہ بھی خدا نے ہی بتایا ہے۔ انسان نے خود تو معلوم نہیں کیا۔ اور جب وہ بھی خدا نے بتایا ہے تو یہ کہنا کہ تجھے کیا پتہ کہ يَوْمُ الدِّيْنِ کیا ہے۔ اپنے اندر کوئی معنے نہیں رکھ سکتا۔ یا تو پہلی باتیں انسان نے خود معلوم کی ہوتیں۔ تو کہا جا سکتا تھا کہ پہلی باتیں تو تمہیں معلوم تھیں اب تمہیں کیا پتہ کہ يَوْمُ الدِّيْنِ کیا چیز ہے۔ مگر جب اِن باتوں کا علم بھی انسان کو خدا تعالےٰ کے بتانے کے بعد ہوا۔ تو اس بات کا علم بھی خدا تعالےٰ کے بتائے بغیر کس طرح ہو سکتا ہے۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے۔ کہ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ کو دوہرانا محض اس لئے ہے۔ کہ تم کو کیا پتہ ہے کہ یہ يَوْمُ الدِّيْنِ جس کا ہم اِن آیات میں ذکر کر رہے ہیں کیا چیز ہے؟ آؤ ہم تم کو بتاتے ہیں کہ جس يَوْمُ الدِّيْنِ کا ہم نے ذکر کیا ہے اس سے ہماری مراد کیا ہے؟

---

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ط

(یہ وقت) اس دن (ہوگا) جس میں کوئی جان کسی جان کو فائدہ پہنچانے کیلئے کوئی اختیار نہ رکھے گی۔

وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝

ع ۱

اور سب فیصلہ اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا ۱۴ ؎

۱۴ ؎ تفسیر۔ یہاں نَفْسٌ لِّنَفْسٍ سے میں اپنے ذوق کے مطابق پھر وہی نفس عیسائیت مراد لیتا ہوں جس کا عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ میں ذکر کیا گیا تھا کہ یورپ کی جتھے بازیاں اس کے کسی کام نہیں آئینگی۔ وہ جتھے بنا بنا کر اور لیگ آف نیشنز قائم کر کے اس عذاب سے بچنے کی کوشش کریں گے مگر نہ ان کے جتھے ان کے کام آئیں گے اور نہ انکی سوسائیٹیاں انکو اس عذاب سے بچا سکیں گی۔

عیسائیت کی بنیاد چونکہ کفارہ پر ہے اس لئے يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا میں اس امر کیطرف بھی اشارہ ہے کہ تمہارا کفارہ دھرے کا دھرا رہ جائیگا اور وہ تمہارے کسی کام نہیں آئیگا۔

وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ قیامت کے لحاظ سے تو اس آیت کا مفہوم ظاہر ہی ہے۔ اس دنیا کے لحاظ سے اِس آیت کے یہ معنے ہیں کہ اُنیس سو سال سے عیسائی یہ دعا کرتے چلے آئے ہیں کہ اے خدا تیری بادشاہت جس طرح آسمان پر ہے اسی طرح زمین پر بھی آئے مگر اُنیس سو سال تک خدا کی بادشاہت زمین پر لانے والے اپنے مقصد میں ناکام رہے اور وہ خدا تعالےٰ کی بادشاہت کو زمین پر اس طرح نہ لا سکے جس طرح وہ آسمان پر قائم ہے لیکن جب کبھی بھی وہ اس امر میں ناکام رہیں گے تو اللہ تعالیٰ ایک دوسری جماعت کو کھڑا کر دے گا جو امر الٰہی کو آسمان سے زمین پر لانے میں کامیاب ہو جائیگی اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت کو زمین پر قائم کر کے دکھا دے گی۔ گویا جس کام کو لوگ اُنیس سو سال میں نہ کر سکے وہ کام ہماری ایک اور جماعت کر کے دکھائے گی اور اللہ تعالیٰ کا حکم زمین پر جاری ہو جائیگا۔

وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ کے معنے اس دنیا کے لحاظ سے۔

خدا تعالےٰ مجسم نہیں کہ وہ دنیا میں آجائے۔ خدا تعالےٰ کے آنے سے مراد اس کی بادشاہت کا قیام ہوتا ہے۔ اور اس آیت میں یہی خبر دی گئی ہے کہ آخر وہ بادشاہت قائم ہو جائے گی۔ حق آجائیگا اور باطل بھاگ جائے گا۔ اس طرح وہ مایوسی جو پہلی آیتوں کے مطالعہ سے دلوں میں پیدا ہو سکتی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے اس کو دور کر دیا۔ اور مومنوں سے کہہ دیا کہ ڈرو نہیں۔ قرآن کا زمین سے اُٹھ جانا۔ ایمان کا ثریا پر چلا جانا۔ کفر کا دنیا پر غالب آجانا۔ شرک اور معصیت کا لوگوں میں پھیل جانا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا روشن چہرہ لوگوں سے اوجھل ہو جانا۔ صحابہؓ کی اتباع کا شوق دلوں سے جلتے رہنا تمہارے دلوں میں مایوسی مت پیدا کرے۔ ہم تمہیں بشارت دیتے ہیں کہ اَلْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ۔ گو عیسائی فتنہ بڑا سخت ہے۔ مگر ہم قرآن اور اسلام کی حکومت دنیا میں قائم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارے اس فیصلہ کو بدل نہیں سکتی۔ ہم پھر اسلام کو قائم کریں گے۔ پھر قرآن کو قائم کریں گے۔ پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ

علیہ وآلہ وسلم کی حکومت ساری دنیا میں قائم کریں گے۔ اس لئے تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارے لئے مایوسی کا کوئی مقام نہیں۔ بلکہ خوشی اور مسرت کا مقام ہے۔ کہ اسلام پھر اپنی گم گشتہ عزت کو حاصل کرے گا اور ساری دنیا پر غالب آجائے گا۔

# سُوْرَةُ التَّطْفِيْفِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ تطفیف - یہ سورۃ مکی ہے [1]

## وَهِيَ سِتٌّ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ

اور بسم اللہ کے علاوہ اس کی چھتیس [۳۶] آیات ہیں

[1] اس سورۃ کے مکی یا مدنی ہونے کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سورۃ کی پہلی چھ [۶] آیات مدنی ہیں۔ گویا يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تک مدنی آیات ہیں اور بعض کے نزدیک یہ ساری سورۃ ہی مدنی ہے (اتقان جلد اول مصری [۱۲]) لیکن اکثر مفسرین کی یہ رائے ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں جو قرآن شریف شائع ہوتے ہیں اُن پر سُوْرَةُ التَّطْفِيْفِ مَكِّيَّةٌ ہی لکھا ہوتا ہے۔

جن یوروپین محققین نے اس پر بحث کی ہے تعجب ہے کہ اپنے اصول کے خلاف انہوں نے بھی اسے مکی قرار دیا ہے حالانکہ اُن کے معترضانہ میلانات کو مدنظر رکھتے ہوئے اُنہیں اسے زبردستی بھی مدنی قرار دینا چاہیئے تھا خصوصاً جبکہ بعض مفسرین کی تصدیق انہیں حاصل ہوگئی تھی۔ لیکن یہ خدا تعالیٰ کا تصرف ہے کہ انہوں نے اِسے مکی ہی قرار دیا ہے اور پھر مکی بھی ابتدائی سورتوں میں سے۔ چنانچہ نولڈکے NOLDEKE جرمن پروفیسر اور میور MUIR دونوں اسے چوتھے سال قبل ہجرت کے قریب کی بتاتے ہیں اور یہی رائے درست ہے کہ یہ مکی اور ابتدائی زمانہ کی ہے۔

سورتوں کے مکی یا مدنی قرار دینے کی بنیاد اول تو روایات پر ہوتی ہے جن کو بیان کرنے والے بعض دفعہ تو اُس وقت کے مسلمان ہوتے ہیں جس وقت وہ سورۃ نازل ہوئی اور وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے علم میں یہ سورۃ فلاں وقت نازل ہوئی ہے اور بعض لوگ اپنا علم نہیں بتاتے بلکہ اس امر پر قیاس کرکے رائے لگاتے ہیں کہ ہم فلاں وقت مدینہ میں گئے تھے اور یہ سورۃ پڑھی گئی تھی اس لئے اُس وقت کی نازل شدہ ہے۔ حالانکہ پہلے کی نازل شدہ سورۃ بھی تو اُس وقت پڑھی جا سکتی ہے۔ تیسرے بعض واقعات جو سورۃ میں مذکور ہوں اُن کی بناء پر زمانہ نزول مقرر کیا جاتا ہے۔ چوتھے بعض الفاظ کی بناء پر جن کی نسبت مفسرین یا مستشرقین یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ صرف مکی یا مدنی زمانہ میں استعمال ہوتے تھے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ سورۃ مکی ہے یا مدنی۔ پانچویں تفصیلی مسائل کی بناء پر مستشرقین سورتوں کو مدنی قرار دیتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک تفصیلی مسائل مدنی سورتوں میں ہوتے ہیں۔ چھٹے طرز کلام کی بناء پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً لمبی آیتیں ہوں تو مستشرقین اُن کو مدنی اور چھوٹی آیات ہوں تو مکی قرار دیتے ہیں۔ ساتویں یہود کا ذکر آجائے تو مستشرقین کہہ دیتے ہیں کہ یہ مدنی سورۃ ہے۔ آٹھویں اگر کفار کے خلاف کوئی سخت حکم آجائے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ مدنی ہے۔ ان دلیلوں میں سے صرف پہلی دلیل یقینی ہے باقی صرف ظنی ہیں اور انہیں مستشرقین اسلام کے خلاف حربہ کے طور پر استعمال کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ اور بعض دلائل ان میں سے قطعاً غلط بھی ہیں مگر یہ موقعہ ان پر بحث کا نہیں ہے۔ خود مستشرقین کا اپنا طریق عمل ان دلائل کے خلاف پڑتا ہے کیونکہ بعض دفعہ وہ خود (جب اُن کا مطلب اس طرح پورا ہوتا ہو) ان دلائل کے خلاف رائے دے جاتے ہیں جیسا کہ مختلف مقامات پر اس کی طرف تفسیر میں اشارہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

درحقیقت مستشرقین بعض دلائل سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم کی تعلیم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں اور یہودیوں سے مل کر سیکھی تھی۔ پس اگر یہ ثابت ہو جائے

سورۃ تطفیف مکی ہے

سورۃ کے مکی یا مدنی قرار دئے جانیکے اصول اور انکی حقیقت

کہ مکی سورتوں میں عیسائیوں اور یہودیوں کی تعلیمات کا کوئی تفصیلی ذکر نہیں تو وہ کہتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ مدنی سورتوں میں ان کا اس لئے ذکر ہے کہ آپ نے مدینہ میں غیروں سے مل کر ان باتوں کو سیکھ لیا۔ جو مسلمان مفسرین ان امور میں کمزور دلائل کی بناء پر رائے قائم کرتے ہیں وہ نادانستہ طور پر عیسائیت کو تقویت پہنچا دیتے ہیں حالانکہ یہ اصول بالکل قیاسی ہیں اور تاریخی مسئلہ کو قیاس سے طے کرنا غلط طریق عمل ہوتا ہے صرف قطعی تاریخی شہادت یا داخلی قیاس ہی ایسے موقعہ پر صحیح ہوتے ہیں اور وہ بھی اُس صورت میں جبکہ خود قرآن کا دوسرا مضمون اُن کی تائید کرتا ہو۔ یہ مضمون بہت لمبا ہے جس کو اس وقت بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ضمناً میں نے اس طرف توجہ دلادی ہے ورنہ یہ مضمون تقاضا کرتا ہے کہ اس پر ایک مستقل رسالہ لکھا جائے۔ سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کے متعلق جہاں تک روایات صحیحہ کا تعلق ہے یا تاریخی تحقیق کا تعلق ہے انکو ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن جو حصہ قیاس سے تعلق رکھتا ہے اس میں بعض غلط اصول قرار دے دیئے گئے ہیں جن کی وجہ سے غلط نتائج پیدا ہوتے ہیں اور اُن غلط نتائج سے دشمنانِ اسلام ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں انہیں تسلیم کرنے کو ہم تیار نہیں۔ بہرحال یہ مضمون ایک مستقل رسالہ کا طالب ہے تاکہ تفصیلی طور پر بحث کرکے یہ بتایا جائے کہ قرآن کریم کی ترتیب کے متعلق جو استدلال کئے جاتے ہیں اُن میں کیا کچھ غلطیاں ہیں اور کن بنیادوں پر ان نقائص کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔

سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کے متعلق صحیح رسالہ لکھے جانے کی ضرورت

اللہ تعالیٰ ہماری جماعت میں سے کسی کو توفیق دے یا خود مجھے ہی توفیق دیدے تو اس کے متعلق ایک مستقل رسالہ لکھا جانا ضروری ہے درحقیقت امام سیوطی نے جو اتقان کتاب لکھی تھی وہ اس سلسلہ کی پہلی کوشش تھی جس میں اُن سے بہت سی غلطیاں بھی ہوئیں۔

سورتوں کے آپس میں تعلقات کو سمجھنے کا ایک طریق

اب ضرورت ہے کہ ایک حقیقی اتقان لکھی جائے کیونکہ اتقان کے معنے ہیں مضبوط اور پکی باتیں۔ لیکن غلطی سے اُس میں کچھ کچی باتیں بھی آگئی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ حقیقی معنوں میں ایک اتقان کتاب لکھی جائے جس میں صحیح اصول پر اس مسئلہ کو بیان کیا جائے اور غلط باتوں کی تردید کی جائے۔

## ترتیب

پہلی سورۃ سے سورۃ تطفیف کے دو تعلق

پہلی سورۃ سے اس سورۃ کے دو تعلق ہیں ایک قریب کا اور ایک بعید کا۔ یعنی ایک تو قریب مضمون سے اس کا تعلق ہے اور ایک سلسلۂ کلام سے اس کا تعلق ہے۔ میرا تجربہ یہی ہے کہ قریباً ہر سورۃ کا دوسری سورۃ سے تعلق ہوتا ہے اور پھر میرے علم کے مطابق ہر سورۃ کا دوسری سورۃ سے ایک تعلق قریب ہوتا ہے اور ایک تعلق بعید ہوتا ہے یعنی ایک تعلق تو ایسا ہوتا ہے جو اسے پہلی سورۃ کی آخری آیتوں سے ملا دیتا ہے لیکن ایک تعلق ایسا ہوتا ہے جو سلسلۂ مضمون سے متعلق ہوتا ہے پھر آگے یہ تعلق دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تعلق تو سورۃ کا قریب کی سورۃ یا اس کے ساتھ کی سورۃ سے ہوتا ہے اور مضمون میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے اور ایک تعلق ایسا ہوتا ہے جو چھ چھ سات سات بلکہ دس دس سورتیں پیچھے جا کر اس سورۃ کو پچھلی سورتوں سے ملا دیتا ہے یہ بھی ایک ایسا مضمون ہے جو خدا تعالیٰ کے فضل سے ایک حد تک میں نے سمجھا ہے۔ سورتوں کے آپس کے قریب کے تعلقات اور تسلسل مضمون کے اعتبار سے اُن کے آپس کے تعلقات بالعموم میں نے اخذ کئے ہیں لیکن مجھ پر اثر یہ ہے کہ سورتوں کا ایک تعلق بعید یا ابعد بھی ہوتا ہے۔ مجھے اس کے متعلق ایسی فرصت نہیں ملی کہ اس مضمون کو مکمل طور پر حل کر سکوں۔ چونکہ میرے پاس پہلے ہی کاموں کی کثرت ہے اور اس کے لئے فرصت نکالنا بہت مشکل ہے اس لئے میں اس مضمون کو حل کرنے کی ایک تجویز بتا دیتا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ قرآن کریم کی سورتیں الگ الگ خوشخط لکھوا کر اُن کے چارٹ بنوائے جائیں اور پھر اُن الگ الگ ٹکڑوں کو انسان ایک کمرے میں لٹکا دے اور فرصت کے وقت اُن کو دیکھتا رہے۔ اس کے نتیجہ میں اُسے سورتوں کے باہمی تعلقات کا ضرور نشان مل جائے گا جب ایک چارٹ حل ہو جائے تو دوسرے پر غور کرنا شروع کر دے۔ دوسرا حل ہو جائے تو تیسرے کو مدنظر رکھ لے جس شخص کو فرصت ہو اور قرآن کریم پر غور کرنے کا

وہ شوق رکھتا ہو اگر وہ ایسا کرے تو اس کو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے قریب کا تعلق تو یہ ہے کہ سورۂ انفطار کے آخر میں فرمایا تھا یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا ؕ وَ الۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ۔ گویا وہاں ایک محاسبے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا تھا اور بتایا تھا کہ تمہیں یہ گھاٹا اپنے پاس سے پورا کرنا پڑے گا دوسرا کوئی شخص اس کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔ پس چونکہ وہاں محاسبے کا ذکر تھا اس لئے وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ میں اللہ تعالیٰ نے ادھر اشارہ فرمایا کہ جس نے حساب دینا ہو اس کو اپنا حساب بالکل صاف رکھنا چاہیئے۔ یہی بات ہے جو حضرت مسیح ناصریؑ نے کہی مگر مسیحیوں کی نظر سے پوشیدہ ہو گئی۔ حضرت مسیحؑ نے کہا۔

"مبارک وے جو رحم دل ہیں کیونکہ اُن پر رحم کیا جائیگا۔" (متی $\frac{5}{7}$) اسی طرح ایک دوسری جگہ ان کی بات بیان کی گئی ہے۔ لکھا ہے۔

"اگر تم آدمیوں کے گناہ بخشو گے تو تمہارا باپ بھی جو آسمان پر ہے تمہیں بخشیگا پر اگر تم آدمیوں کو اُن کے گناہ نہ بخشو گے تو تمہارا باپ بھی تمہارے گناہ نہ بخشیگا۔" (متی $\frac{6}{14-15}$)

اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ اس جگہ بیان فرماتا ہے کہ تم نے خدا کے سامنے پیش ہونا ہے اگر تم وہاں گھاٹے سے بچنا چاہتے ہو تو بندوں کو بھی کسی قسم کا گھاٹا نہ دو۔

عجیب بات یہ ہے کہ عیسائیوں کو جو کچھ تعلیم دی گئی تھی اس کے بالکل اُلٹ انہوں نے نتیجہ نکال لیا یعنی اُنہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم تو رحم کر سکتے ہیں لیکن خدا رحم نہیں کر سکتا حالانکہ خدا ہمارے رحم کو اپنے رحم کی وجہ قرار دیتا ہے اور حضرت مسیحؑ بھی یہی فرماتے ہیں کہ تم لوگوں پر رحم کرو تا آسمانی باپ تم پر رحم کرے۔ گویا ہمیں رحم کرنے کی اس لئے ضرورت ہے تاکہ خدا ہم پر رحم کرے مگر دوسری طرف عیسائیت یہ کہتی ہے کہ تم تو رحم کر سکتے ہو لیکن خدا رحم نہیں کر سکتا۔ یہ کتنی متضاد تعلیم ہے جو عیسائیت میں پائی جاتی ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمہارا معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے اگر تم چاہتے ہو کہ خدا تمہارے ساتھ نرمی اور محبت کا سلوک کرے تو تم بھی اس کے بندوں کے ساتھ نرمی اور محبت کے ساتھ پیش آؤ۔

یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا ؕ وَ الۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ میں خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کے معاملے کا ذکر کیا گیا ہے اور وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ میں بنی نوع انسان کے باہمی معاملات کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ ٹھیک ٹھیک معاملہ کیا کرو تاکہ خدا تمہارے ساتھ نیک سلوک کرے۔ گویا سورۂ انفطار کا آخری حصہ حضرت مسیح ناصریؑ کے ایک قول کی تائید کرتا ہے اور اس سورۃ کا پہلا حصہ حضرت مسیح ناصریؑ کے دوسرے قول کی تائید کرتا ہے۔

اس سورۃ کا پہلی سورتوں سے تعلق بلحاظ مضمون

ترتیب بعینہٖ یہ ہے کہ گذشتہ دو سورتوں میں عیسائیت کا ذکر ہو رہا ہے اور عیسائیوں کے اعمال کے دو حصّے بڑے خطرناک ہیں۔ وہ حصہ بھی جو مذہب کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور وہ حصہ بھی جو غیر اقوام کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے اُن کے اعمال کی بُرائی اس سے ظاہر ہے کہ وہ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں مسیح ناصریؑ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی توحید کو مٹا رہے ہیں۔ اسی کی طرف پہلی سورۃ میں اشارہ کیا گیا تھا کہ اِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ یعنی ہم نے جو کہا تھا کہ ان لوگوں کے شرک سے قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائے وہ وقت آگیا ہے اور انہوں نے اسقدر شرک سے کام لیا ہے کہ آسمان واقعہ میں پھٹ گیا ہے۔

پس اُن کے اعمال کا ایک حصّہ تو یہ ہے۔ دوسرا حصہ اُن کے اعمال کا آپس کی جتھہ بندی اور باقی تمام غیر قوموں سے انتہائی بدسلوکی سے پیش آنا ہے۔ پس پہلی سورۃ میں عیسائیوں کی مذہبی بُرائی بتانے کے بعد اس سورۃ میں یہ بیان کرتا ہے کہ اُن کا معاملہ دوسری اقوام سے بہت بُرا ہوگا۔ وہ اُن کو لوٹیں گے۔ اُن کے معاہدات اور معاملات ہمیشہ دو رُخے ہونگے۔ آپس میں اُن کا اور سلوک ہوگا اور دوسری اقوام سے اُن کا اور سلوک ہوگا۔ غرض تطفیف عیسائیت کا ایک نہایت ہی

# بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

## وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝

وزن میں کمی کرنے والوں کیلئے عذاب (ہی) عذاب ہے ۲؎

نمایاں پہلو ہے۔ ان سے پہلے تاریخ میں قوموں کی جتھہ بندی کی اور کوئی مثال ایسی نہیں ملتی جیسی یوروپین اقوام میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ لوگ دہریہ ہیں۔ عقائد کے اعتبار سے ان کا عیسائیت سے کوئی تعلق نہیں لیکن جہاں عیسائیت کا سوال آجائے وہاں یہ ضرور اس کا لحاظ کر جائیں گے۔ اور دہریہ ہوتے ہوئے بھی عیسائیت کی رعایت کریں گے۔ جرمن ہیں وہ بھی دہریہ ہیں مگر عیسائیوں سے اُن کا معاملہ اَور رنگ کا ہوگا۔ اور دوسری اقوام سے اَور رنگ کا ہوگا۔ وہ یہودیوں پر سختی سے سخت ظلم کریں گے مگر عیسائیوں کا سوال آجائے تو اُن سے نرمی کا برتاؤ کریں گے۔ یہی حال انگریزوں اور امریکن باشندوں کا ہے اُن کے اندر کوئی مذہب نہیں لیکن عیسائیت کے نام کا مٹنا وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اب لڑائی ہو رہی ہے مسلمانوں اور ہندوؤں کو وہ اس جنگ میں کٹوا رہے ہیں مگر کہہ یہ رہے ہیں کہ ہم کرسچن سویلزیشن قائم کریں گے حالانکہ کرسچن سویلزیشن کا کوئی مفہوم نہیں سوائے زمانۂ حاضرہ کی تہذیب کے اور عیسائیت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ مگر وہ کہتے یہی ہیں کہ ہم عیسائی تہذیب دنیا میں قائم کرنے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔

وَیْلٌ

مُطَفِّفِیْنَ ۲؎

پھر یہ عجیب معاملہ ہے کہ عیسائی قومیں آپس میں بھی ایک دوسرے پر ظلم کرتی ہیں مگر اس ظلم کا دائرہ محدود ہوتا ہے گویا انہوں نے ظلم کے دو دائرے بنالئے ہیں۔ ایک ظلم عیسائیت پر اور ایک ظلم غیر عیسائیت پر۔ جب غیر پر ظلم ہو تو تمام عیسائی قومیں اکٹھی ہو جاتی ہیں اور آپس کے تعلقات کو بھلا دیتی ہیں پس یہ لوگ دو ظلم کر رہے ہیں ایک خدا پر ظلم ہے اور ایک اس کی مخلوق پر ظلم ہے۔ چونکہ مخلوق پر ظلم عیسائیوں کے اعمال کا دوسرا حصہ تھا اس لئے اللہ تعالےٰ نے اس کے لئے دوسرا باب باندھ دیا یعنی دوسری سورۃ میں اس کا ذکر کیا۔ جیسے زمانہ کے تغیرات میں سے عیسائیت کا تغیر اتنا اہم تھا کہ اللہ تعالےٰ نے اس کے لئے ایک الگ سورۃ نازل فرمادی۔ اسی طرح عیسائیت کے دو بہت بڑے ظلم تھے۔ ایک وہ ظلم تھا جس کا خدا سے تعلق تھا اور ایک وہ ظلم تھا جس کا مخلوق کے ساتھ تعلق تھا۔ خدا تعالےٰ پر عیسائیت کا جو ظلم تھا اس کو سورۂ انفطار میں بیان کر دیا گیا اور جو ظلم انسانوں پر تھا اس کو سورۂ تطفیف میں بیان کر دیا گیا۔

**۲؎ حل لغات۔** کلمہ وَیْل عذاب کے لئے اور دُکھ کے لئے بیان کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَیْلٌ یعنی عذاب ہوگا۔ دُکھ ہوگا۔

لِلْمُطَفِّفِیْنَ: مطففین کے لئے۔ مُطَفِّفِیْنَ مُطَفِّفٌ سے جمع کا صیغہ ہے اور مُطَفِّفٌ طَفَّفَ سے اسم فاعل ہے۔ طَفَّفَ الْمِکْیَالَ کے معنے ہیں نَقَّصَهٗ۔ اس کو کم ماپ کر دیا۔ اور طَفَّفَ الْوَزْنَ کے بھی یہی معنے ہیں کہ نَقَّصَهٗ۔ اس کو کم وزن کر کے دیا۔ گویا تطفیف کا لفظ کَیل کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے اور وزن کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے۔ نیز کہتے ہیں طَفَّفَ عَلٰی عِیَالِهٖ اَیْ قَتَّرَ عَلَیْهِمْ۔ اُس نے اپنے عیال کو تنگ رزق مہیا کیا اور کہتے ہیں طَفَّفَ عَلَى الرَّجُلِ اَیْ اَعْطَاهُ اَقَلَّ مِمَّا اَخَذَ مِنْهُ یعنی جو کچھ اس سے لیا تھا اُس سے کم اس کو دیا (اقرب) پس مُطَفِّفٌ کے معنے ہوں گے کسی کو وزن یا ماپ میں کم دینے والا۔

**تفسیر۔** یہ یوروپین اقوام کا خاصہ ہے کہ وہ غیر قوموں کے

حقوق کو غصب کرنا اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ اُن کی ساری سیاسی اور
اقتصادی پالیسی کا بنیادی اصول یہی ہے کہ غیر قوموں کے حقوق
کو غصب کر لیا جائے۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ ایک بات
بیان فرمایا کرتے تھے جس کا میری طبیعت پر بڑا گہرا اثر ہے
آپ فرماتے تھے دنیا میں کوئی قوم سود لے کر ذلیل ہو جاتی ہے
اور کوئی قوم سود دے کر ذلیل ہو جاتی ہے مگر یہ عیسائی قوم
ایسی ہے کہ یہ سود لے کر بھی لُوٹتی ہے اور سود دے کر بھی
لُوٹتی ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ سود لے کر لُوٹنا تو ان کے بنکوں
سے ظاہر ہے اور سود دے کر دوسروں کو لُوٹ لینے کے
ذکر میں آپ اودھ کی حکومت کی مثال دیا کرتے تھے۔ بعد
میں مَیں نے حوالے دیکھے تو آپ کی یہ بات درست معلوم ہوئی
کہ واقعہ میں انہوں نے اودھ کی حکومت کو سود دے کر لوٹا ہے
انہوں نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ کلکتہ بنک میں اگر اپنا روپیہ
جمع کراؤ تو تمہیں بڑا نفع ملے گا۔ چنانچہ لوگوں نے روپیہ جمع
کرانا شروع کر دیا اور انہوں نے ان کو خوب سود دیا یہاں
تک کہ عورتوں نے اپنے زیورات بیچ بیچ کر روپیہ اس بنک
میں جمع کرانا شروع کر دیا اور سمجھا کہ انگریز بڑے خیر خواہ
ہیں یہ تو ہمیں خوب منافع دیتے ہیں۔ جب اودھ کے بادشاہ
سے انگریزوں کا اختلاف پیدا ہُوا اور انگریزی فوجیں لکھنؤ کی
طرف بڑھنی شروع ہوئیں تو امراء نے بادشاہ کو انگریزی فوج
کے اس حملہ سے بالکل غافل رکھا جب انگریزی فوجیں لکھنؤ کے
قریب آئیں تو اودھ کے تمام امراء کو نوٹس مل گیا کہ اگر تم نے
ذرا بھی حرکت کی تو تمہارا بنک میں جس قدر روپیہ ہے وہ سب
ضبط کر لیا جائے گا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ خاموش بیٹھے رہے اور
بادشاہ کو تب پتہ لگا جب انگریزی فوجیں شہر کے دروازہ پر
پہنچ گئیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بادشاہ کو غافل رکھنے کے
لئے امراء نے ناچ کی تحریک کر دی تھی چنانچہ وہ اسی ناچ میں
مشغول رہا یہاں تک کہ انگریزی فوجیں اُسکے سر پر جا پہنچیں۔
غرض عیسائی قوم ایسی ہے جس نے روپیہ لیکر بھی دوسروں
کو لوٹا ہے اور روپیہ دے کر بھی دوسروں کو لوٹا ہے یہ صحیح معنوں

میں مُطَفِّف ہیں اور ہر بات میں اپنا حق فائق رکھتے ہیں۔
لیکن اگر دوسروں کے حق کا سوال ہو تو اُس پر سو سو اعتراض
کر دیتے ہیں آخر یہ موٹی بات ہے کہ وجہ کیا ہے کہ ساری
دنیا اُن کے قبضہ میں آگئی۔ کون سے جائز دلائل اور معقول وجوہ
تھے جن کی بناء پر انہوں نے اتنا بڑا تسلط حاصل کر لیا کہ چین
ہے تو اس میں ان کا دخل ہے۔ ہندوستان ہے تو وہاں اُنکا
دخل ہے۔ افغانستان ہے تو اس پر اُن کا دباؤ ہے۔ اسی طرح
بخارا گیا اور چینی ترکستان گیا اور کاکیشیا گیا اور حجاز چیا گیا
ہر جگہ ان کا دخل ہے۔ عرب ہے تو وہاں ان کا تصرف ہے۔
ترکی ہے تو اس کے معاملات میں ان کا دخل ہے۔ مصر ہے تو
وہ ان کے قبضہ میں ہے۔ افریقہ ہے تو وہ ان کے ماتحت ہے
آخر لوگوں نے کون سے قصور کئے تھے کہ جن کی وجہ سے یہ جہاں
بھی گئے وہ مغلوب ہوتے گئے اور یہ غالب آتے چلے گئے۔
اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ زبردست کا ٹھینگا
سر پر۔ اِن کی مثال بالکل اس بندر کی سی ہے جو دو بلیوں کا
پنیر وزن کرنے کے بہانہ سے کھا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ دو بلیوں
نے کہیں سے پنیر کا ایک ٹکڑہ چُرایا جس پر اُن دونوں میں لڑائی
ہو گئی۔ ایک کہتی تھی کہ مَیں اتنا حصہ لوں گی اور دوسری کہتی
تھی کہ مَیں اتنا حصہ لوں گی۔ آخر انہوں نے ایک بندر سے کہا
کہ یہ پنیر ہم میں بانٹ دو۔ بندر نے ترازو لیا اور اندازاً اُسے
دو ٹکڑوں میں کاٹ کر الگ الگ پلڑے میں رکھ دیا جب اُس
نے ترازو کو اٹھایا تو دونوں پلڑوں میں کچھ فرق پڑ گیا۔ اس
پر بجائے دوسری طرف سے چھوٹا سا ٹکڑہ کاٹ کر کسی ہلکے پلڑے
میں رکھنے کے اُس نے مُنہ مار کر بھاری ٹکڑے میں سے ایک بڑا سا
ٹکڑہ کاٹ لیا۔ اور جب دوبارہ دوسرا پلڑا جھک گیا تو اُس
طرف سے ایک بڑا سا ٹکڑہ کاٹ کر مُنہ میں ڈال لیا اسی طرح وہ
کبھی ایک طرف سے پنیر کا ٹکڑہ کاٹ کر کھا لیتا اور کبھی
دوسری طرف سے۔ یہاں تک کہ بہت تھوڑا سا پنیر رہ گیا۔ آخر
میں بلیوں کو بھی سمجھ آگئی کہ ہم نے یہ کیا حماقت کی کہ ایک بندر
کے سپرد پنیر کر دیا وہ تو اسی طرح تمام پنیر کھا جائیگا چنانچہ

۲۱۱
یورپین اقوام کا غیر قوموں کے حقوق کو غصب کرنیکا خاصہ

# اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝

(ان کیلئے) جو لوگوں سے تول کر لیتے ہیں تو خوب پورا کر کے لیتے ہیں ۳ؔ

بلیوں نے کہا کہ حضور اب ہمیں پنیر عنایت فرما دیجئے ہم خود ہی بانٹ لیں گی۔ اس پر بندر نے کہا اب تو صرف میری محنت کا بدلہ باقی رہ گیا ہے اور یہ کہہ کر اُس نے پنیر کا آخری ٹکڑا بھی اپنے مُنہ میں ڈال لیا۔ یہی ان لوگوں کا حال ہے جب بھی یہ کسی قوم کا کوئی معاملہ طے کرنے لگتے ہیں یہی کہتے ہیں کہ ہمارا حق اتنا بنتا ہے اور اس حق پر بحث کرتے کرتے سارا ملک ہضم کر جاتے ہیں اور آخر میں جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ حق مانگنے والے محروم رہ جاتے ہیں اور یہ لوگ اُن کے تمام حقوق غصب کر کے اُن پر قبضہ جما لیتے ہیں۔

یورپین اقوام کا ہر فیصلے میں اپنا اختیار رکھنا

اِكْتَالُوْا

**۳ؔ حل لغات** ۔ اِكْتَالُوْا: اِكْتَالَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اِكْتَالَ کے دو صلے آتے ہیں مِنْ اور عَلٰی چنانچہ عربی زبان میں اِكْتَالَ مِنْهُ اور اِكْتَالَ عَلَيْهِ دونوں استعمال ہوتے ہیں اور اِكْتَالَ مِنْهُ وَ عَلَيْهِ اِكْتِيَالًا کے معنے ہوتے ہیں اَخَذَ مِنْهُ وَتَوَلَّى الْكَيْلَ بِنَفْسِهٖ۔ اس نے دوسرے سے اپنا حق وزن کر کے لیا اس خصوصیت کے ساتھ کہ پیمانہ اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھا دوسرے کے ہاتھ میں اُسے جانے نہیں دیا۔ (اقرب) پس اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ کے یہ معنے ہوئے کہ جب وہ لوگوں سے اپنا حق لینے کے لئے پیمانہ کے ذریعہ فیصلہ کرتے ہیں تو پیمانہ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں اور پھر جو کچھ لیتے ہیں پورا پورا لیتے ہیں۔

ہر قرآن کا جبکہ حق کا پورا لینا تو انصاف پر دلالت کرتا ہے لیکن پھر يَسْتَوْفُوْنَ کیوں فرمایا

**تفسیر** ۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عیسائی قوم کے جس نقص کو بیان فرمایا ہے اس کے اظہار کے لئے بعض اور الفاظ بھی استعمال ہو سکتے تھے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ جب وہ سودا کرتے ہیں تو اپنا حق پوری طرح لے لیتے ہیں مگر اُس نے یہ نہیں کہا بلکہ اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں یہ بتلانے کیلئے کہ سارا معاملہ ان لوگوں کے اپنے ہاتھ میں ہوگا اور فیصلہ کا اختیار صرف اُنہی کو حاصل ہوگا خواہ انہوں نے لوگوں سے حق لینا ہو یا انہوں نے لوگوں کا حق دینا ہو چنانچہ آج واقعات اس کی تصدیق کر رہے ہیں۔ کوئی معاملہ ہو فیصلہ کا اختیار انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی آزادی کا سوال ہی لے لو یہ نہیں ہوسکتا کہ ہندوستانی لیڈر آپس میں بیٹھ کر کوئی فیصلہ کر سکیں۔ انگریز یہی کہتے ہیں کہ بے شک تم اکٹھے ہو کر غور کرو مگر تمہارا آخری کام یہ ہوگا کہ اپنے مطالبات کو ہمارے سامنے پیش کرو پھر ہمارا اختیار ہوگا کہ ہم اُن میں سے جس مطالبہ کو چاہیں منظور کریں اور جس مطالبہ کو چاہیں رد کر دیں۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ اس قوم کو دنیا پر ایسا غلبہ حاصل ہوگا کہ لوگوں کو حقوق دینے یا اُن سے اپنے حقوق لینے کا تمام اختیار انہی لوگوں کو حاصل ہوگا۔ دنیا میں گاہک اپنی جگہ اختیار رکھتا ہے اور تاجر اپنی جگہ اختیار رکھتا ہے لیکن یہ اگر گاہک ہوں گے تب بھی کہیں گے کہ تمہیں تولنے کا اختیار نہیں۔ چیز تول کر ہم خود لیں گے اور اگر یہ تاجر ہونگے تب بھی یہ کہیں گے کہ جو کچھ ہم مانگتے ہیں وہ تم دو اس سے کم ایک پائی بھی لینے کے لئے ہم تیار نہیں ہیں۔ غرض تمام اختیارات لینے اور دینے کے ان کو حاصل ہوں گے دوسروں کا اختیار نہیں ہوگا کہ وہ اس میں دخل دے سکیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے يَسْتَوْفُوْنَ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے معنے پورا لینے کے ہیں اور پورا لینا بظاہر انصاف پر دلالت کرتا ہے لیکن درحقیقت اس جگہ يَسْتَوْفُوْنَ الْحَقَّ مراد نہیں یعنی یہ مطلب نہیں کہ جتنا ان کا حق تھا وہ لیتے ہیں بلکہ يَسْتَوْفُوْنَ الْمُطَالَبَةَ ہے یعنی جتنا مانگتے ہیں اتنا لے کر چھوڑتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس جگہ انکی

برائی ہو رہی ہے تعریف نہیں۔ اور بُرائی کا پہلو یہی ہے کہ لے تو زیادہ لے اور دے تو کم دے۔ پس یَسْتَوْفُوْنَ سے مراد حق پورا لینا مراد نہیں بلکہ اپنا مطالبہ پورا لینا مراد ہے ہاں بطور تنزل یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ ہمیشہ حق پورا لیتے ہیں کبھی دوسرے پر رحم نہیں کرتے اور اپنے حق کا کوئی حصّہ معاف نہیں کرتے یعنی رواشتی ثنا شیلاک کا سا سلوک کرتے ہیں۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ اس جگہ اِکْتِیَال کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنے ترازو اپنے ہاتھ میں لے کر خود تول کر لینے کے ہوتے ہیں یہ نہیں کہ کوئی دوسرا تول کر دے۔ ان لفظوں کے استعمال سے بھی ظاہر ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنا حق لیتے ہیں اور دوسرے کا کوئی دخل اس میں آنے نہیں دیتے۔

شا شیلاک کی کہانی حقیقت میں عیسائیوں پر پوری طرح چسپاں ہوتی ہے یہ لوگ بھی جب کسی سے کچھ لینا ہوتا ہے تو ایسی سختی سے مطالبہ کرتے ہیں کہ کسی چیز کی بھی پرواہ نہیں کرتے لیکن جب دینے کا سوال آئے تو سو سو بہانے بنانے لگ جاتے ہیں۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ اِکْتَالَ کے دو صلے آتے ہیں مِنْ اور عَلٰی۔ چنانچہ اِکْتَالَ مِنْہُ اور اِکْتَالَ عَلَیْہِ دونوں عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں اور دونوں کے ایک ہی معنے سمجھے جاتے ہیں لیکن بعض علماء ادب نے کہا ہے کہ صلہ کے تغیر سے اس لفظ کے مفہوم میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ صحیح ہے کہ اِکْتَالَ مِنْہُ اور اِکْتَالَ عَلَیْہِ دونوں صلے آتے ہیں لیکن جب اِکْتَالَ کے ساتھ عَلٰی کا صلہ آئے تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَخَذْتُ مَا عَلَیْہِ کَیْلًا کہ جو کچھ میرا اُس کے ذمہ تھا وہ میں نے اُس سے وزن کر کے لے لیا۔ فرّاء جو مشہور نحوی ہے اُس نے یہ تشریح کی ہے اور کہا ہے کہ عَلٰی کے صلہ کے ساتھ جب اِکْتَالَ کا لفظ آئے تو اس کے معنے اَخَذْتُ مَا عَلَیْہِ کَیْلًا کے ہوتے ہیں یعنی میں نے اس سے وہ چیز جو اس کے ذمہ تھی لے لی۔ لیکن اگر اِکْتَلْتُ مِنْہُ کہا جائے تو اس کے معنے اِسْتَوْفَیْتُ مِنْہُ کَیْلًا کے ہوتے ہیں کہ میں نے ماپ کر اس سے پورا پورا لے لیا یعنی زور پورا لینے پر ہوتا ہے (معانی) گویا عَلٰی کے صلہ میں تو یہ مراد لی گئی ہے کہ جو کچھ دوسرے کے ذمہ ہو اس سے لے لیا جائے یعنی لے لینے پر زور ہوتا ہے اور مِنْ کے صلہ کے ساتھ اس لفظ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ ماپ کر اس سے پورا پورا لے لیا یعنی پورا پورا لینے پر زور ہوتا ہے۔ غرض اس آیت میں اس امر پر زور ہے کہ وہ لوگ حق لے کر اور اپنے اندازہ کے مطابق پورا لے کر چھوڑتے ہیں بات یہ ہے کہ ایک حق کا لینا تو اس طرح ہوتا ہے کہ دوسرے شخص سے ہم گفتگو کرتے ہیں اُس کے دلائل سنتے ہیں اور پھر باہمی مشورہ سے فیصلہ کرتے ہیں کہ اس کا اتنا حق بنتا ہے لیکن ایک زبردستی کا حق ہوتا ہے کہ دوسرے کو تحکمانہ طور پر کہا جائے کہ میرے نزدیک تمہارے ذمہ یہ حق نکلتا ہے اور اب تم سے میں اس حق کو لے کر رہوں گا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ یہ عیسائی لوگ ایسے ہوں گے کہ دوسروں سے کہیں گے جو کچھ ہم تم سے مانگتے ہیں وہ ہمیں دے دو۔ پیمانہ اُن کے اپنے ہاتھ میں ہو گا۔ اپنے حق کے فیصلہ کا اختیار بھی اُن کے اپنے ہاتھ میں ہو گا اور وہ جو جی چاہے گا اپنا حق جتا کر دوسروں سے لے لیں گے اور پھر اصرار کر کے لیں گے گویا حق کی مقدار کی تعیین وہ دوسرے پر نہیں چھوڑیں گے بلکہ اسکی مقدار معیّن کرنے کا حق اپنے پاس رکھیں گے اور بجائے تراضیٔ فریقین سے ایک حق مقرر کرنے کے جو حق اپنے لئے خود مناسب سمجھیں گے وہ تجویز کر لیں گے مطلب یہ ہوا کہ رحم اور شفقت اُن میں بالکل نہیں ہو گی اور حق کے نام کے ماتحت انکی کارروائیاں جبری اور ظالمانہ ہوں گی۔ اس تشریح کو سمجھ لینے کے بعد اس اعتراض کا جواب دینا آسان ہو جاتا ہے جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ اس آیت میں ذم کا کوئی پہلو ہے ہی نہیں پھر وَیْلٌ کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ کہہ کر آگے یہ کہا گیا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ۔ وہ مطفف جو لوگوں سے اپنا حق پورا پورا لیتے ہیں اُن کیلئے عذاب ہو حالانکہ

یورپین اقوام پر شا ئیلاک کی کہانی کا صادق آنا

اپنا حق لینا محلِ ذم نہیں ہے پھر اپنا حق لینے پر اُن کے لئے
وَیْل جو کلمۂ عذاب ہے کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اعتراض
اُن معنوں کے رو سے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں بالکل جاتا رہتا
ہے۔ کیونکہ حق خود مقرر کرنے پر اصرار اور پھر حق لینے میں انتہائی
سختی اور عدمِ رحم خود محلِ ذم ہے اور رحم اور شفقت جس قوم
میں نہ ہو وہ وَیْل کے نیچے ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں عَلٰی کا صلہ
خلاف کے معنوں میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے پس اگر لوگوں
کو ضرر اور نقصان پہنچانا اس کے مفہوم میں شامل سمجھا جائے
تو یہ بھی محلِ ذم ہے۔ اس صورت میں اَلَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا
عَلَى النَّاسِ کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ لوگوں سے تول کر لیتے
ہیں ایسی صورت میں کہ اُن کو ضرر پہنچتا ہو۔ اس صورت میں بھی
وَیْل کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔

اِکْتَالَ مِنْہُ اور اِکْتَالَ عَلَیْہِ میں فرق

اس موقعہ پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اگر عَلٰی
بمعنے خلاف اس جگہ استعمال ہوا ہے تو پھر یَسْتَوْفُوْنَ کے
کیا معنے ہوتے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں استیفاء سے
مراد استیفاء مطابق خواہش ہے نہ کہ استیفاء مطابق واقعہ۔
یہ نہیں کہ دوسرا اگر یہ سمجھتا ہو کہ میرے ذمہ دو سیر حق نکلتا ہے
تو یہ دو سیر لے کر ہی راضی ہو جائیں گے بلکہ یہ اگر تین سیر لینا
چاہیں گے تو تین سیر ہی لیں گے اس سے کم نہیں لیں گے۔
پس یہاں استیفاء سے مراد استیفاء مطابق واقعہ نہیں بلکہ
استیفاء مطابق خواہش ہے گویا یَسْتَوْفُوْنَ کے معنے یہ
ہیں کہ یَسْتَوْفُوْنَ کَمَا یَشَاءُوْنَ یا یَسْتَوْفُوْنَ
حَسْبَ مُطَالَبَتِهِمْ اور ان معنوں میں یَسْتَوْفُوْنَ کا
کا مفہوم عَلٰی کے مفہوم کے خلاف نہیں پڑتا بلکہ عین مطابق
ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ عَلٰی اِکْتَالُوْا کا صلہ ہی نہیں بلکہ
عَلٰی یَسْتَوْفُوْنَ کا صلہ ہے اور مراد یہ ہے کہ ان کا استیفاء
اپنے حق میں اور دوسروں کے خلاف ہوتا ہے یعنی ایسی صورت
میں استیفاء کراتے ہیں جس کا اثر دوسروں کے خلاف پڑتا ہے
اور اصل جملہ یہ ہے اِذَا اکْتَالُوْا یَسْتَوْفُوْنَ عَلَى النَّاسِ
یعنی وہ لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہوئے اپنی خواہش کے مطابق
پورا لیتے ہیں گویا اپنے حق میں تو استیفاء ہوتا ہے لیکن لوگوں
کے خلاف ہوتا ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ لغت والوں نے لکھا ہے کہ اِکْتَالَ
کا صلہ مِنْ اور عَلٰی دونوں طرح آتا ہے اور معنوں کے
لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں لیکن مفسرین نے اس پر
بحث کی ہے کہ یہاں اِکْتَالُوْا عَلٰی کیوں آیا ہے اِکْتَالُوْا
مِنْ کیوں نہیں آیا۔ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ فرّاء کے نزدیک
اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عَلٰی کا صلہ استعمال کیا ہے اور
مِنْ کے صلہ کی بجائے یَسْتَوْفُوْنَ کا لفظ لے آیا ہے کیونکہ
جب اِکْتَلْتُ مِنْهُ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں
اِسْتَوْفَیْتُ مِنْهُ کَیْلًا۔ گویا اس کے نزدیک دونوں
صلے استعمال ہو گئے ہیں۔ پس یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ
اِکْتَالُوْا عَلٰی کیوں آیا ہے اور اِکْتَالُوْا مِنْ کیوں نہیں آیا۔
یَسْتَوْفُوْنَ کا لفظ مِنْ کا قائم مقام ہے اور عَلٰی کا صلہ
تو ظاہر ہی ہے۔ فرّاء کی اس توجیہ کے مطابق اعتراض کا
جواب تو آ گیا لیکن یہ توجیہ ہمیں قرآن کریم کے محاورہ کے خلاف
نظر آتی ہے۔ قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عَلٰی
اور مِنْ کے استعمال میں کچھ فرق ہے اور یہ درحقیقت الگ
الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں آتا ہے۔
فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ
(یوسف ع۸) ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دے کہ ہم تول کر
لیں گے اور اس کی حفاظت بھی کریں گے۔ دوسری جگہ آتا ہے
فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ (یوسف ع۱۰) اے آقا ہمیں پورا پورا
تول کر دے۔ جس سے ظاہر ہے کہ یوسف کے بھائیوں نے خود
نہیں ماپا بلکہ دوسرے سے مپوایا۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام
خود فرماتے ہیں اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْٓ اُوْفِی الْكَيْلَ (یوسف ع۸)
کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پورا پورا ماپ دیتا ہوں۔ ان آیات سے
معلوم ہوتا ہے کہ اِکْتِیَال کرنے والے حضرت یوسف علیہ السلام
تھے اور وہ غلہ ماپ کر دیتے تھے بھائی ماپ نہیں کرتے تھے۔

# وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ○

اور جب (کسی چیز کو) انہیں تول کر یا وزن کر کے دیتے ہیں تو تھوڑا دیتے ہیں ۵۵ؔ

مگر باوجود اس کے بھائی نَكْتَلْ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اِكْتَالَ کا لفظ جب بھی بولا جائے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس شخص نے آپ تولا یہ غلط ہے کیونکہ قرآن کریم میں آتا ہے فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دے کہ ہم اِكْتِيَال کریں گے مگر باوجود اس کے بھائی بھی ملتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام ناپا کرتے تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام بھی کہتے ہیں کہ اَنِّیْٓ اُوْفِی الْكَيْلَ۔ میں ماپ کر دوں گا جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ درحقیقت اِكْتَالَ مِنْهُ کا لفظ استعمال ہو تو اس کے دونوں معنے ہوتے ہیں خواہ خود ماپ کرے یا دوسرے سے کروائے اور جب اِكْتَالَ عَلَيْهِ ہو تو صرف خود ماپ کر لینے کے معنے ہوتے کیونکہ عَلٰی کا صلہ خلاف کے معنے دیتا ہے۔

## ۵۴ حل لغات

كَالُوْا: كَالَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے کہتے ہیں كَالَ الطَّعَامَ وَغَيْرَهٗ وَاَكْثَرُ اِسْتِعْمَالِهٖ فِی الطَّعَامِ یعنی كَالَ کا لفظ بالعموم کھانے کی اشیاء کے ماپنے اور تولنے پر بولا جاتا ہے لیکن غیر کے لئے بھی استعمال کر لیتے ہیں نیز اس کے معنے ہیں حَقَّقَ كَمِّيَّتَهٗ اَوْ مِقْدَارَهٗ بِوَاسِطَةِ اٰلَةٍ مُعَدَّةٍ لِذٰلِكَ كَالصَّاعِ وَالْاِرْدَبِّ وَالذِّرَاعِ وَنَحْوَ ذٰلِكَ (اقرب) کسی چیز کی کمیت یا اُس کی مقدار اس آلہ کے ذریعہ سے جو اس کیلئے مقرر کیا گیا ہو معلوم کرنا جیسے ہمارے ہاں ایک خاص پیمانہ کو ٹوپہ کہتے ہیں اور اس کے ذریعہ ماپ کر چیزیں لیتے دیتے ہیں یا عرب میں صاع ہُوا کرتا تھا اسی طرح سیروں کے ذریعہ کسی چیز کا وزن کرنا اور کہنا کہ فلاں چیز اتنے سیر ہے یا گز کے ذریعہ کسی چیز کو ماپنا۔ سب کے لئے كَالَ کا لفظ استعمال ہوتا ہے گویا كَالَ کے لفظ کے معنے یہ ہیں کہ اندازہ کے لئے جو چیز مناسب حال مقرر ہو اُس سے کوئی چیز لینا۔ اگر وزن کی چیز ہو تو باٹوں کے ذریعہ وزن کر کے لینا۔ اگر پیمانہ کے ذریعہ ماپنے والی چیز ہے تو پیمانہ سے ماپ کر لینا اور اگر گز سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہو تو گز سے اندازہ کر کے لینا۔ پس كَالَ میں تینوں چیزیں شامل ہیں صاع سے ماپنا۔ باٹوں سے وزن کرنا اور گز وغیرہ سے اندازہ کرنا۔ مگر چونکہ قرآن کریم نے كَالُوْهُمْ کے بعد اَوْ وَّزَنُوْهُمْ کے الفاظ بھی استعمال فرمائے ہیں اس لئے ہمیں وزن کو الگ رکھنا پڑے گا اور كَالُوْهُمْ میں صرف صاع کے ذریعہ یا گز کے ذریعہ جو اندازہ لگایا جاتا ہے اسی کو شامل سمجھنا پڑیگا۔ اگر قرآن کریم اَوْ وَّزَنُوْهُمْ کے الفاظ زائد نہ کرتا تو كَالُوْهُمْ میں وزن بھی شامل ہوتا جیسا کہ لغت والوں نے وزن کو بھی اس میں شامل کیا ہے مگر چونکہ وزن کا ذکر اللہ تعالےٰ نے الگ کر دیا ہے اس لئے كَالُوْهُمْ میں صرف دو چیزیں رہ جائیں گی۔ صاع کے ذریعہ ماپنا یا ذراع کے ذریعہ ماپنا۔ اسی طرح لغت والے لکھتے ہیں وَقَدْ يَتَعَدّٰی اِلٰی مَفْعُوْلَيْنِ فَيُقَالُ كِلْتُ زَيْدًا الطَّعَامَ (اقرب) یعنی کبھی اس کے دو مفعول بھی آجاتے ہیں جیسے کہتے ہیں میں نے زید کو غلہ اندازہ کر کے دیا۔ اور کبھی مفعولِ اوّل پر لام بھی آجاتا ہے چنانچہ کہتے ہیں كِلْتُ لِزَيْدٍ الطَّعَامَ۔ یہ لفظ وزن کے لئے بھی استعمال ہو جاتا ہے جیسے کہتے ہیں كَالَ الصَّيْرَفُ الدَّرَاهِمَ اَیْ وَزَنَهَا (اقرب) صراف نے درہم تول کر دئے۔ پھر كَالَ کا لفظ اس سے بھی وسیع معنوں میں استعمال ہو جاتا ہے کہتے ہیں كَالَ الشَّیْءَ بِالشَّیْءِ: قَاسَهٗ۔ کسی چیز کو کسی چیز پر قیاس کیا۔ نیز کہتے ہیں كِلْتُ فُلَانًا بِفُلَانٍ اَیْ قِسْتُهٗ بِهٖ۔ یعنی میں نے اس شخص پر فلاں شخص کا اندازہ اور قیاس کیا اور کہتے ہیں كَالَ الْفَرَسَ بِغَيْرِهٖ: قَاسَهٗ بِهٖ فِی الْجَرْیِ (اقرب) یعنی گھوڑا دیکھا۔ اس کی دوڑ دیکھی اور پھر

كَالُوْهُمْ

بجیا کہ فلاں گھوڑا زیادہ اچھا ہے کیونکہ اسکی دوڑ اچھی ہے اور فلاں گھوڑا کمزور ہے کیونکہ اسکی دوڑ خراب ہے گویا ظاہری ماپ تول کے علاوہ باطنی اندازہ بھی اس سے استعارۃً مراد لے سکتے ہیں۔

مسیحی اقوام کا وزن اور کیل میں غیر اقوام کو لوٹنا۔

**تفسیر** - اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ بیان فرماتا ہے کہ جب یہ کسی قوم کو ماپ کر دیتے ہیں یا اسے وزن کر کے دیتے ہیں تو اسمیں ہمیشہ دوسرے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یعنی ظاہری شکل ماپ اور تول کی ہوگی اور دوسرے کو یہی دکھائیں گے کہ ہم تمہیں جو کچھ دے رہے ہیں ماپ تول کر دے رہے ہیں اور اندازہ کے مطابق بالکل صحیح صحیح دے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسروں کو نقصان ہوگا اور انکو فائدہ ہوگا۔

یہ خرابی ایسی ہے جو خصوصیت کے ساتھ مسیحیوں میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ وزن کو لیں تب بھی یہ قوم دوسروں کو لوٹتی ہے اور کیل کو لیں تب بھی یہ قوم دوسروں کو لوٹتی ہے اس قوم کو بڑا غلبہ تجارت سے حاصل ہوا ہے اور تجارت میں یہ لوگ حد درجہ کی چالاکی اور ہوشیاری سے کام لیتے ہیں۔ جہانتک انفرادی تجارت کا سوال ہے یورپین لوگوں میں سے سو میں سے ایک بھی دھوکا نہیں کریگا بلکہ ہزار میں سے ایک بھی دھوکا نہیں کریگا۔ اسکے مقابلہ میں ایشیائی لوگوں کی یہ حالت ہے کہ سو میں سے ننانوے دھوکا کریں گے بلکہ ننانوے کیا سو میں سے سو ہی دھوکا باز ہوں گے۔ ہزار میں سے ایک شاید کوئی ایسا نکل آئے جو انفرادی تجارت میں دھوکا باز نہ ہو لیکن بالعموم ایشیائی اس پہلو میں نہایت بُرا نمونہ دکھاتے ہیں۔ اگر چیز کو تولتے ہوئے وہ تھوڑی سی بے ایمانی نہ کرلیں اور دوسرے کو کسی قدر کم چیز نہ دیں تو ان کا دل دھڑکنے لگجاتا ہے اور وہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح ڈنڈی مار کر ہم کچھ فائدہ اٹھا لیں۔ پس جہاں تک انفرادی تجارت کا سوال ہے یورپین لوگوں کا نمونہ اس بارہ میں نہایت اعلیٰ ہے مگر جب قومی تجارت کا سوال آجائے تو یہ قوم اتنی لوٹ کرتی ہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں ایسے کئی واقعات ہیں کہ انہوں نے کروڑوں کروڑ روپیہ کا سامان

کیل کے ساتھ لفظ وزن کا اضافہ کرنے کی وجہ۔

اور توپیں وغیرہ غیر ملکوں کو بنا کر دئے۔ مگر نہ وہ توپیں اچھی تھیں نہ وہ جہاز اچھے تھے نہ وہ سامان اچھا تھا۔ بالکل ردی اور گندہ سامان انہوں نے بھجوا دیا اور کروڑوں کروڑ روپیہ وصول کرلیا۔ بیشک خوردہ فروشی میں انکی خیانت سے کوئی ٹکا نہیں کھا سکتا لیکن جہاں بڑی تجارت کا سوال آجائے وہاں اسقدر لوٹ مچاتے ہیں کہ جسکی کوئی حد ہی نہیں ملکوں کے ملک غارت کر جاتے ہیں اور تجارت میں پالیٹکس کو شامل کر دیتے ہیں پس درحقیقت وہ تجارت نہیں ہوتی بلکہ ایک رنگ کی سیاست ہوتی ہے جس کے ذریعہ یہ دوسرے ملک پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔

فرض کرو الف اور باء دو یورپین قومیں ہیں اور انکی آپس میں دشمنی ہے۔ الف سمجھتا ہے کہ اگر میری باء سے لڑائی ہوگئی تو ج اس لڑائی میں ضرور باء کیطرف سے شامل ہوگا لیکن اسے سامان جنگ کیلئے ہماری امداد کی ضرورت ہے جب ایسی صورت پیدا ہو تو الف ج کے لئے سامان جنگ کے ریٹ گرا دے گا اور اسکے لئے سامان جنگ تیار کرنے پر آمادگی ظاہر کریگا مگر کوئی چیز وقت پر تیار کر کے نہیں دے گا۔ یہانتک کہ لڑائی کا وقت آجائیگا اور ج سامان نہ ہونیکی وجہ سے باء کی مدد نہ کرسکے گا یا دشمن کے ہاتھوں پیسا جائیگا۔

تو جہانتک بڑی تجارتوں کا سوال ہے یا قومی تجارتوں کا سوال ہے یہ قوم خطرناک تطفیف کرتی ہے۔ اور اس سورۃ میں انکی اسی خرابی کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ پہلے فرمایا تھا اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ مگر اسکے بعد وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ فرمایا ہے یعنی کیل کے ساتھ وزن کے لفظ کا اضافہ کر دیا ہے۔ حالانکہ جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کیل کے لفظ میں ماپ تول وغیرہ سب شامل ہیں۔ اگر تو کیل کے وہی معنے لئے جائیں جو لغت میں آتے ہیں تو اس صورت میں كَالُوْهُمْ کے بعد اَوْ وَّزَنُوْهُمْ کے لفظ کی زیادتی کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ کیل کے معنوں میں

بھی وزن کے معنے شامل ہیں۔ اور اگر یہ توجیہہ کیجائے کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے کالَ کے زیادہ معروف معنوں کو لیا ہے جو ماپنے کے ہیں تو پھر یہ اعتراض پڑتا ہے کہ اس صورت میں پہلی آیت میں بھی وزن کا لفظ بڑھانا چاہیئے تھا مگر وہاں یہ لفظ نہیں رکھا گیا۔ خلاصہ یہ کہ یا تو پہلی آیت میں یوں کہا جاتا اَلَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا وَاتَّزَنُوْا عَلَى النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ یا پھر دوسری آیت یوں ہوتی کہ وَاِذَا کَالُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ۔

زجاج نے یہ سوال اٹھا کر اتنا جواب دیا ہے کہ چونکہ کیل اور وزن معنوں میں مقاربت اور شارکت رکھتے ہیں اس لئے ایک کو بیان کر کے دوسرے کو چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ ذہن خود اس کا اندازہ کر لیتا ہے پس پہلی آیت سے بھی مراد یہ ہے کہ اِکْتَالُوْا وَاتَّزَنُوْا گویا دو قریب المعنیٰ الفاظ میں سے صرف ایک پر حصر کر لیا گیا ہے۔ یہ جواب ایک حد تک درست ہے اور قرآن کریم میں اس قسم کی اور بھی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ جہاں دو الفاظ اپنے معنوں کے لحاظ سے ایکدوسرے سے قرابت اور اتصال رکھتے ہوں وہاں ایک کو بیان کر دیا جاتا ہے اور دوسرے کا ذکر چھوڑ دیا جاتا ہے مثلاً گرمی سردی کا اکٹھا ذکر کرنا ہو تو خالی گرمی یا خالی سردی کا ذکر کر دیا جائیگا۔ یا سورج چاند کا اکٹھا ذکر کرنا ہو تو صرف سورج کا ذکر کر دیا جائیگا اور چاند کا ذکر اسی میں شامل سمجھ لیا جائیگا پس یہ صحیح ہے کہ دو قرابت رکھنے والے الفاظ میں سے بعض دفعہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے پر حصر کر لیا جاتا ہے لیکن اس جواب سے تسلی نہیں ہوتی کیونکہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر دوسری آیت میں کَالُوْھُمْ کے ساتھ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ کیوں بڑھایا گیا وہاں بھی کیل کے ذکر پر ہی کفایت کیجاتی اور وزن کا ذکر ساتھ نہ کیا جاتا۔ اسکا جواب یہ ہے کہ کیل میں نقصان کا خطرہ بہت کم ہوتا ہے لیکن وزن میں نقصان کا خطرہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں چیزیں ماپنے کیلئے ٹوپہ ہوتا ہے یا بعض لوگوں نے دو دو آدھ سیر یا پاؤ پاؤ وزن کے گلاس رکھے ہوئے ہوتے ہیں یا بعض گڈویاں ایسی ہوتی ہیں جن میں صحیح اندازہ کی چیز آجاتی ہے ایسی اندازہ کے جو برتن ہوتے ہیں خواہ ٹوپہ ہو یا گلاس یا گڈویاں ہوں انمیں کمی صرف ایسی ہی ہو سکتی ہے جو نظری ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ سیر میں سے پاؤ کم ہو جائے! اتنا تو ہو سکتا ہے کہ ماپتے وقت ذرا سے کنارے نیچے رہ جائیں مگر اس سے زیادہ کمی نہیں آسکتی لیکن وزن میں بڑی بھاری کمی کیجا سکتی ہے اور ڈنڈی مارنے کا فن ایسا ہے کہ سیر کی جگہ بعض دفعہ تین تین پاؤ چیز رہ جاتی ہے اور لینے والے کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ میرے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے لیکن ماپ میں۔ یا ٹوپہ میں یا ڈروپی میں سیر میں پاؤ کا فرق کبھی نہیں پڑیگا پس چونکہ وزن میں بہت زیادہ نقصان ہو سکتا ہے اس لئے جہاں لینے کا سوال تھا وہاں صرف اِکْتَالُوْا کا لفظ استعمال کر دیا اور بتا دیا کہ جب وہ ماپ کے ذریعہ لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اسمیں آپ ہی یہ مضمون بھی آگیا کہ جو لوگ تھوڑا نقصان برداشت نہیں کر سکتے وہ بڑا نقصان کب برداشت کر سکتے ہیں پس اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا اَلَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ کہ وہ لوگ ایسے ہیں کہ جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں تو اس سے آپ ہی یہ نتیجہ نکل آیا کہ جو لوگ کم نقصان بھی جو ماپ سے تعلق رکھتا ہے برداشت نہیں کر سکتے وہ بڑا نقصان تو کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے مگر اِکْتَالُوْا کے بالمقابل جب کَالُوْھُمْ کہا تو تھوڑا دینے کے لفظ سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ زیادہ بھی لوٹ لیتے ہیں کیونکہ اگر کوئی شخص چھوٹا نقصان پہنچائے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ بڑا نقصان بھی پہنچا سکتا ہے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص چھوٹا گناہ کر لے مگر جب بڑا گناہ آئے تو اس سے ڈر جائے پس چونکہ کَالُوْا کا لفظ اصل حقیقت پر پوری طرح روشنی نہیں ڈالتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ہی اَوْ وَّزَنُوْھُمْ کا لفظ استعمال کر کے بتا دیا کہ جہاں تھوڑا نقصان پہنچا سکیں وہاں تھوڑا نقصان پہنچاتے ہیں اور جہاں بس چلے وہاں زیادہ نقصان پہنچا دیتے ہیں۔

مفسرین کی اس بات پر بحث کہ کَالُوْھُم اَوْ وَّزَنُوْھُم میں کیل کے ساتھ وزن کے لفظ کا کیوں اضافہ کیا گیا ہے

پس اَلَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ کے معنے یہ ہوئے کہ جب انہوں نے لوگوں سے اپنا کوئی حق لینا ہوتا ہے تو چھوٹا نقصان

أَلَا يَظُنُّ أُولٰٓئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

کیا یہ (لوگ) یقین نہیں کرتے کہ وہ اٹھائے جائیں گے اس عظیم الشان وقت (کا فیصلہ دیکھنے) کے لئے ؎

يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

جس وقت (تمام) لوگ سب جہانوں کے رب (کا فیصلہ سننے) کے لئے کھڑے ہونگے ؎

نہیں اٹھاتے لیکن جب دینے کا سوال آتے تو اگر چھوٹا نقصان پہنچا سکیں تو چھوٹا نقصان پہنچا دیتے ہیں اور اگر بڑا نقصان پہنچا سکیں تو بڑا نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ پس ان معانی کی جو نظرِ ترتیب ہے اُس کے لحاظ سے اِکْتَالُوْا کے بعد اِسْتَوْفُوْا کا حذف مطابق بلاغت تھا لیکن کَالُوْهُمْ کے بعد وَزَنُوْا کا لفظ حذف کرنا خلاف اصولِ بلاغت تھا۔

**۵ تفسیر** ۔ فرماتا ہے اب تو یہ قومیں ایک دائرہ میں بیٹھی ہوئی ہیں اور یوں سمجھتی ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت اُن کا کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتی لیکن ایک دن آئے گا جب ایک دوسری قسم کا بعث ہوگا۔

لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ سے مراد

لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ سے قیامت بھی مراد ہوسکتی ہے اور وہ دن بھی اس سے مراد ہوسکتا ہے جب موجودہ دَور کا نتیجہ نکلے گا۔ درحقیقت ہر قوم کا الگ الگ دَور ہوتا ہے اور ہر دَور کی الگ الگ قیامت ہوتی ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ سے مراد لِحِسَابِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ہے یعنی یوم عظیم کے حساب کے لئے۔

**۶ تفسیر** ۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس نے ترقی کی ہو اور پھر اس پر ایک محاسبہ کا دن نہ آیا ہو مگر عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح افراد کو اپنی موت بھولی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح اقوام اپنی موت کے دن سے غافل اور بے پرواہ ہوتی ہیں

مسیحی اقوام کا اپنی موت سے غافل ہونا [۲۹۱]

دنیا میں سب سے زیادہ یقینی اور قطعی چیز اگر کوئی ہے تو وہ موت ہے مگر موت ہی انسان کو سب سے زیادہ بھولی ہوئی ہوتی ہے ہر شخص جانتا ہے کہ اُس کا باپ مرا۔ اُس کا دادا مرا۔ اُس کا پڑدادا مرا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اُس کا فلاں فلاں رشتہ دار مرچکا ہے اور جو باقی ہیں وہ بھی ایک دن مرجائیں گے مگر پھر سب سے زیادہ اگر کسی چیز سے وہ غافل ہوتا ہے تو وہ موت ہی ہے۔ اسی طرح یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کی ہر قوم مرچکی ہے اور جو قومیں آج موجود ہیں وہ بھی ایک دن مرجائیں گی مگر قومیں سب سے زیادہ اس موت سے غافل رہتی ہیں۔ قرآن کریم نے اس امر پر بڑا زور دیا ہے اور بار بار فرمایا ہے کہ بتاؤ کیا کوئی قوم ایسی بھی ہے جو موت سے بچی ہو۔ تاریخی لحاظ سے اگر تحقیق کی جائے تو ایک ہزار سے کم اُن اقوام کی تعداد نہیں نکلے گی جنہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں دنیا پر اس قدر غلبہ پایا کہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ان قوموں نے میدان کو جیت لیا ہے اور اُن فاتح اقوام نے بھی اپنے غرور میں یہ خیال کرنا شروع کر دیا کہ گذشتہ قومیں تو مرگئیں۔ عروج کے بعد زوال سے ہمکنار ہوگئیں۔ عزت کے بعد ذلت کے گڑھے میں گر گئیں مگر ہم اس ترقی کے بعد مر نہیں سکتیں مگر آخر وہ وقت آیا جب وہ فاتح اقوام بھی مٹ گئیں وہ بھی تباہ اور برباد ہوگئیں اور اُن کا نام بھی دنیا سے ناپید ہوگیا۔ پس فرماتا ہے یہ مغربی اقوام جنہوں نے ظلم پر اپنی کمر باندھی ہوئی ہے جو دنیا پر آفت ڈھا رہے ہیں اور جو لوگوں کے حقوق کو دبائے چلے جارہے ہیں أَلَا يَظُنُّ أُولٰٓئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ۔ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ کیا اُن کو کبھی خیال نہیں آتا کہ ہمارا ایک اور بعث بھی ہونے والا ہے اُس بڑے دن کے لئے جس دن وہ رب العالمین خدا کے سامنے پیش ہوں گے اور خدا اُن سے کہیگا کہ کیا ایشیائی میرے بندے نہیں تھے۔ کیا افریقی میرے بندے نہیں تھے۔ پھر تم نے کیا کیا کہ اُن سے ظالمانہ سلوک روا رکھا؟ جب یہ یوم البعث آئے گا تو رب العالمین خدا انکو نیچے

کر دے گا اور جو نیچے ہوں گے اُن کو اُوپر کر دے گا اسی
کی طرف بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ (العادیات) میں اشارہ
کیا گیا ہے۔ بُعْثِرَ کے معنے ہوتے ہیں زمین کو اُلٹ دینا
اُوپر کی چیز کو نیچے اور نیچے کی چیز کو اوپر کر دینا۔ اللہ تعالیٰ
بھی اُس دن ایسا ہی کرے گا کہ ان حاکم اقوام کو تختِ حکومت
سے محروم کر دے گا۔ اور اُن لوگوں کو جنہیں یہ ذلیل
قرار دیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ حکومت کے تخت پر بٹھا
دے گا۔ درحقیقت قوموں کی ترقی اور اُن کا تنزّل ایک
دَوری کیفیت رکھتا ہے۔ جس طرح بچے آپس میں کُشتی کرتے
ہیں تو ایک بچہ دوسرے کو گرا کر اُس کے سینہ پر چڑھ جاتا
ہے۔ ماں باپ یہ نظارہ دیکھتے رہتے ہیں آخر جب دیکھتے
ہیں کہ اُوپر والا اُترتا نہیں تو اس کی ٹانگ گھسیٹ کر کھینچ لیتے
ہیں اور پھر دوسرا بچہ اس کے سینہ پر چڑھ جاتا ہے۔
یہی حال قوموں کا ہے اللہ تعالیٰ جب دیکھتا ہے کہ ایک
قوم اپنے غلبہ سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے تو اُسے گھسیٹ
کر حکومت کے تخت سے اُتار لیتا ہے اور محکوم قوموں کے
ہاتھ میں بادشاہت کی باگ دُور دے دیتا ہے۔ دنیا میں
قوموں کے بڑے بڑے لمبے غلبے ہوئے ہیں۔ عیسائیت کا
غلبہ تو صرف تین سو سال ہے مسلمانوں کا ہزار سال تک غلبہ
رہا مگر وہ بھی مٹ گیا۔ پس فرماتا ہے کیا ان کے دلوں میں
یہ کبھی خیال نہیں آتا کہ ہمارا بھی ایک بعث ہوگا۔ ہم پر
بھی وہ دن آنے والا ہے جو ہمارے محاسبہ کا دن ہوگا
بعث کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ نتیجہ کے دن
صرف قوم کے موجود افراد کے اعمال کا ہی نتیجہ نہیں نکلتا
بلکہ اُن کے آباء کے اعمال کا نتیجہ بھی نکلتا ہے جب ایک قوم
دوسری قوم کے خلاف اُٹھتی ہے تو صرف زندہ لوگوں کے
اعمال کا محاسبہ نہیں لیتی بلکہ اُن کے آباء کے سلوک کا بدلہ
بھی لیتی ہے۔ اس طرح گویا قوم کے سب افراد زندہ ہو کر
اپنا حساب پیش کرتے ہیں۔

یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

ہیں درحقیقت یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا
کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اب تو یہ
مشرقی اور مغربی۔ گورے اور کالے۔ یورپین اور ایشیائی
میں فرق کرتے ہیں مگر ایک دن آئے گا جب یہ لوگ اُس
خدا کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے جو رب العالمین ہے۔
وہ اس وقت ان لوگوں سے ان مظالم کے بارہ میں بازپُرس
کرے گا اور کہے گا کہ کیوں تم نے ایک طبقہ کو ذلیل کیا
اور کیوں اُس کو محکوم و مغلوب رکھا۔ آخر خدا کسی ایک
قوم کا نہیں بلکہ وہ رب العالمین ہے۔ وہ ایشیائیوں کا
بھی خدا ہے اور افریقنوں کا بھی خدا ہے اور چینیوں کا
کا بھی خدا ہے اور جاپانیوں کا بھی خدا ہے اور انگریزوں
کا بھی خدا ہے اور امریکنوں کا بھی خدا ہے۔ وہ اپنے
بندوں کو اُسی کے ماتحت دیکھ کر خوش ہو سکتا ہے جو رب العالمین
کی صفت اپنے اندر لے لے اور اُس کی ربوبیت کا کامل
مظہر بن جائے۔ عارضی حکومتیں دنیا میں بے شک ہوتی
چلی آتی ہیں اور وہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد مٹتی
بھی رہی ہیں۔ لیکن مستقل طور پر وہی قوم دنیا پر حکومت
کر سکتی ہے جو لوگوں سے زائد حقوق نہ مانگے۔ اور اُن سے
کہے کہ یہ ہماری نہیں بلکہ تمہاری حکومت ہے۔ جو قوم دنیا
میں بنی نوع انسان کی خدمت کا احساس لے کر کھڑی ہوگی
اور پھر زائد حقوق مانگنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوگی وہ ہمیشہ
رہے گی۔ اُس کے خلاف لوگوں کو بغاوت کرنے کی کبھی ضرورت
ہی پیش نہیں آ سکتی۔

۲۰۱ غالب اقوام کا مغلوب ہو جانا

۲۰۲ خدا تعالیٰ کے حساب لینے سے مراد

خدا تعالیٰ کے حساب لینے کے یہ معنے نہیں کہ وہ
خود براہِ راست حساب لے۔ قیامت کے دن وہ خود حساب
لے گا اور اس دنیا میں وہ انسانوں میں سے ہی کسی فرد یا
قوم کو حساب لینے کے لئے کھڑا کر دیتا ہے اُس قوم کا
حساب لینا خدا تعالیٰ کا حساب لینا ہی کہلاتا ہے ۞

# كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ

ایسا نہیں (جو یہ سمجھتے ہیں) بدکاروں (کی جزا) کا حکم یقیناً سجین میں ہے اور تجھے کس نے بتایا ہے

# مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝

کہ سجین کیا ہے۔ وہ ایسا حکم ہے جس (کے اٹل ہونے) پر مہر لگائی گئی ہے

سجین

**۵ حل لغات**۔ سِجِّيْنٌ کے لغت میں دو معنے لکھے ہیں: (۱) اَلدَّائِمُ (۲) اَلشَّدِيْدُ (اقرب) یعنی سجین کے لفظ کے معنے عربی زبان میں دائم اور شدید کے ہوتے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں اس لفظ کے کوئی بھی معنے نہیں ہیں کیونکہ یہ عربی لفظ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں اصل میں سجین کا نون لام سے بدلا ہوا ہے اور یہ لفظ سجل سے نکلا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (الانبیاء ع۷) اس صورت میں اس کے معنے تحریر کے ہیں اور یا پھر یہ لفظ سجیل یعنی ان گھڑے پتھر کے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ (الفیل)۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں اس لئے کہ سجین کے معنے فراء اور زجاج اور ابوعبیدہ نے کئے ہیں اور یہ لوگ علم ادب میں بہت بلند مرتبہ رکھنے والے تھے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک لفظ عربی زبان کا تو نہ ہوتا اور وہ اس کے معنے کرنے لگ جاتے۔ اپنے معنوں کی تائید میں انہوں نے بعض اشعار بھی نقل کئے ہیں جن میں سجین کا لفظ پرانے شعراء نے استعمال کیا ہے پھر جب ہم ذاتی طور پر غور کرتے ہیں تو ہمیں عربی زبان میں اس لفظ کے اور مادے بھی مل جاتے ہیں مثلاً سَجَنَهُ سَجْنًا کے معنے ہوتے ہیں حَبَسَهٗ فِي السِّجْنِ اسکو قیدخانہ میں بند کر دیا۔ اور سَجَنَ الْهَمَّ کے معنے ہوتے ہیں اَضْمَرَهٗ اس نے اپنے غم کو چھپا لیا۔ (اقرب) پس جبکہ اس لفظ کے دوسرے مادے عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں اور جبکہ عربی زبان کے ماہرین نے اس کے معنے دائم اور شدید کے کئے ہیں تو یہ خیال کر لینا

سجین غیر عربی نہیں

کہ یہ لفظ عربی زبان کا نہیں بلکہ کسی اور زبان کا ہے جسے عربی زبان میں شامل کر لیا گیا ہے قطعاً غلط اور بے بنیاد بات ہے۔

درحقیقت یہ ایک غلطی ہے جو بعض عرب مفسروں کو لگی ہے جب وہ ایک لفظ کو جو عام طور پر عربی میں استعمال نہیں ہوتا دیکھتے ہیں تو فوراً یہ خیال کر لیتے ہیں کہ یہ عربی کا لفظ نہیں حالانکہ دوسرے ماہرین لغت اسے عربی کا لفظ قرار دیتے ہیں۔ انکی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر آجکل کے عیسائی ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ قرآن کریم میں غیر زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور غیر زبانوں کے الفاظ کی وجہ سے وہ نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ قرآن کریم کے متعلق جو یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ میں نازل کیا گیا ہے یہ غلط ہے حالانکہ اگر ان مفسرین کی بات کو جو کہتے ہیں کہ قرآن کریم کا فلاں فلاں لفظ عربی نہیں تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی یہ اعتراض عقل کے بالکل خلاف ہے دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں غیر زبان کا کوئی لفظ نہ پایا جاتا ہو۔ دو چار فقرے کہہ دینا اور بات ہے مگر متمدن زمانہ کی کوئی بڑی تحریر ایسی نہیں ہو سکتی جس میں غیر زبان کا کوئی لفظ نہ آئے۔ بائبل میں بھی غیر زبانوں کے الفاظ موجود ہیں (وید پر بھی) یہ اعتراض عائد ہوتا ہے کہ اس میں غیر زبانوں کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ صرف ایک شخص ایسا گذرا ہے جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ میں اپنی کتاب میں غیر زبان کے الفاظ استعمال نہیں کروں گا اور اس نے اپنے اس دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بڑا زور لگایا وہ بڑا بھاری ادیب تھا اور بڑا مشہور عالم تھا مگر وہ بھی اس دعویٰ میں پورا نہیں اترا اور اسے بھی

غیرزبان کے الفاظ اپنی کتاب میں استعمال کرنے پڑے۔ میری مراد فردوسی سے ہے اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ میں پہلوی زبان میں شاہنامہ لکھوں گا۔ مگر شاہنامہ میں بیسیوں الفاظ غیر زبانوں کے پائے جاتے ہیں بعض عربی کے ہیں بعض تازہ فارسی کے ہیں اور بعض دوسری زبانوں کے ہیں۔

درحقیقت کوئی متمدن زبان ہو ہی نہیں سکتی جس میں آپس کے میل جول کی وجہ سے دوسری زبانوں کے الفاظ داخل نہ ہو جائیں اور بعض دفعہ تو چسکا پیدا ہو جاتا ہے کہ فلاں زبان کا یہ لفظ ہم اپنی زبان میں ضرور شامل کرلیں اور اس طرح رفتہ رفتہ وہ لفظ زبان میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ مثلاً انگریزی زبان میں پکّا کا لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے حالانکہ یہ اردو زبان کا لفظ ہے مگر آپس کے میل جول کی وجہ سے یہ لفظ انگریزوں کو ایسا پسند آیا کہ انہوں نے اسے اپنی زبان میں شامل کرلیا یہانتک کہ انگریزی لغت کی کتابوں میں بھی پکّا کا لفظ درج ہوتا ہے اور اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہوتا ہے کہ یہ اردو زبان کا لفظ ہے جو انگریزی زبان میں آگیا ہے۔ اسی طرح بکواس کا لفظ ہے جو انگریزوں کو پسند آگیا۔ چنانچہ بہت سے انگریز جب دوسرے پر ناراض ہوتے ہیں تو کہدیتے ہیں do not buck یعنی بکواس مت کرو۔ یہ بک کا لفظ بھی اردو سے ہی انگریزی میں منتقل ہوا ہے۔ اسی طرح اور سینکڑوں الفاظ ہیں جو عربی یا اردو سے لیکر انگریزی زبان میں شامل کرلئے گئے ہیں مثلاً ایڈمرل ADMIRAL کا لفظ انگریزی میں استعمال ہوتا ہے جو امیر البحر سے بگڑا ہوا ہے۔ ایڈمرل امیر البحر کو کہا جاتا ہے انگریزوں نے لامیر کا لفظ رہنے دیا اور بحر کو چھوڑ دیا۔ تو یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر زبان کے الفاظ دوسری زبانوں میں استعمال ہوتے رہتے ہیں مگر اس وجہ سے ان الفاظ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس دوسری زبان کے لفظ ہی نہیں ہیں۔ وہ کثرت استعمال کی وجہ سے دوسری زبان کا جزو بنجاتے ہیں اور اسی زبان کا لفظ سمجھے جاتے ہیں مثلاً اردو میں اگر متداول اور رائج العام لفظ انگریزی کا بولا جائے تو بھی کہیں گے کہ اس لفظ کا بولنے والا فصیح اردو بول رہا ہے یہ نہ کہیں گے کہ انگریزی الفاظ کی وجہ سے اسکی اردو خراب ہوگئی ہے۔ ہاں کثرت سے اور غیر مروج الفاظ کا استعمال ہو تو وہ قابل اعتراض ہوتا ہے۔ عربی زبان کے اُمّ الالسنہ ہونیکی وجہ سے اسکے الفاظ کثرت سے غیر زبانوں میں پائے جاتے ہیں لیکن اسکے علاوہ آپس کے میل جول کی وجہ سے بھی ہر زبان میں دوسری زبان کے الفاظ آجاتے ہیں اور عربی زبان اس سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔ اور اگر ایسا لفظ عربی زبان میں پایا جائے تو اسکا استعمال غیر فصیح نہ ہوگا نہ اس کلام کو جس میں وہ پایا جائے وہ غیر عربی بنادے گا۔

شیکسپیئر مشہور انگریز ادیب ہے اسکی کتب میں بھی بہت سے فرانسیسی زبان کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں مگر اسکی وجہ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شیکسپیئر کی کتب غیر فصیح انگریزی میں ہیں۔ اسی طرح اگر قرآن کریم کسی غیر زبان کا لفظ لے آئے۔ جو عربوں میں استعمال ہوچکا ہو اور عربوں نے اس کو پسند کرلیا ہو تو یہ بات اس لفظ کے عربی ہونے کے خلاف ہرگز نہیں ہوسکتی۔ درحقیقت یہ مخالفت کا ایک مجنونانہ مظاہرہ ہے جس کے ماتحت بعض پرانے منافقین نے قرآن کریم پر اعتراض کیا۔ اور جس کے ماتحت آجکل کے یورپین مستشرق بھی اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہونے کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس میں غیر زبانوں کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں اور پھر وہ ایسے الفاظ کی ایک فہرست پیش کردیتے ہیں۔ انمیں سے بعض کے متعلق ہم یقیناً یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ وہ عربی زبان کے الفاظ نہیں ہیں مثلاً توراۃ کا لفظ عربی زبان کا نہیں اور ہم اسے تسلیم کرتے ہیں یا کون مسلمان کہتا ہے کہ جبریل عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ لفظ اپنی موجودہ شکل میں عربی زبان کا لفظ نہیں اسی طرح میکائیل کا لفظ عربی زبان کا نہیں۔ یا اسحٰق کا لفظ ہے ہم کب اس کے غیر عربی ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ اسی طرح عیسیٰ کا لفظ ہے یہ بھی عربی زبان کا نہیں بلکہ جیسس JFSIS کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ پس ہمیں اس سے ہرگز انکار نہیں ہے کہ قرآن کریم میں غیر زبانوں

۲۱ مختلف زبانوں میں غیر زبانوں کے الفاظ۔

کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اور اگر وہ ایسے الفاظ کی تلاش میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ قرآن اور اسلام پر حملہ کر سکیں گے تو وہ اپنے وقت کو بالکل ضائع کرتے ہیں۔ ہم اگر اُن کی بعض باتوں کا انکار کرتے ہیں تو محض اس لئے کہ بعض الفاظ عربی زبان کے ہی ہوتے ہیں مگر وہ زبردستی ان کو غیر زبانوں کے الفاظ قرار دے دیتے ہیں۔ اس وجہ سے انکار نہیں کرتے کہ قرآن مجید میں غیر زبان کا کوئی لفظ پایا ہی نہیں جا سکتا۔ ہمیں اُن پر اگر شکوہ پیدا ہوتا ہے تو اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں یا حد سے زیادہ غلو کرتے ہیں اور عربی الفاظ کے متعلق بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں کہ وہ غیر عربی الفاظ ہیں اُن کا یہ فعل ہمارے لئے باعثِ اعتراض ہوتا ہے ورنہ ہم خود تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں غیر زبانوں کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں اور ہمارے نزدیک یہ بات ہرگز قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ اس قسم کے الفاظ میں سے جن کو زبردستی غیر زبان کا قرار دیا جاتا ہے ایک سِجّین کا لفظ بھی ہے ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے مگر وہ بلاوجہ اسے غیر زبان کا لفظ قرار دے دیتے ہیں یہ بات ہے جو وجہِ اعتراض ہے ورنہ اگر ایک لفظ تو کیا اگر وہ پانچسو لفظ بھی قرآن کریم میں سے ایسے نکال کر لے آئیں جو غیر زبانوں کے ہوں تو ہم کہیں گے کہ ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ جب عربوں نے ان الفاظ کو اپنی زبان میں شامل کر لیا اور اُن کو انہوں نے کثرت سے استعمال کرنا شروع کر دیا تو اس کے بعد عربی میں ان الفاظ کا پایا جانا ہرگز قابلِ اعتراض امر نہیں ہو سکتا۔ لوگ روزانہ سٹیشن پر جاتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں ٹکٹ دو۔ مگر کیا ٹکٹ ہماری زبان کا لفظ ہے؟ یا لوگ بازار میں جاتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں فونٹن پن دکھاؤ۔ کیا فونٹن پن اردو زبان کا لفظ ہے؟ مگر باوجود اس کے کہ یہ دونوں الفاظ ہماری زبان کے نہیں جب کوئی شخص کہتا ہے کہ مجھے ٹکٹ دو یا فونٹن پن دکھاؤ تو سب لوگ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ بیا اردو زبان بول رہا ہے کوئی اور زبان نہیں بول رہا۔ تو جو الفاظ زبان میں رائج ہو جاتے ہیں اُن کا استعمال کرنا ہرگز قابلِ اعتراض نہیں ہوتا اسی طرح جو الفاظ اصطلاحی ہوتے ہیں یا جو الفاظ کسی قوم پر حجت کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں ان کا بھی اصل صورت میں استعمال کرنا ہرگز قابلِ اعتراض امر نہیں ہوتا۔ یا مثلاً اسماء کو اُن کی اصل زبان میں ہی بیان کر دینا قطعاً کوئی ایسا امر نہیں ہے جو قابلِ اعتراض ہو۔ اگر کسی شخص کا نام کرشن چند ہو تو یہ نہیں ہوگا کہ دوسری زبان میں ہم کرشن چند کا ذکر کرتے وقت اس نام کا ترجمہ کرنے لگ جائیں بلکہ ایسی حالت میں ہم کرشن چند نام ہی لکھیں گے اور یہ پروا نہیں کریں گے کہ یہ کسی اور زبان کا لفظ ہے اور ہم کسی اور زبان میں بات کر رہے ہیں پس یہ ایک غلط اور بے معنی اعتراض ہے جو قرآن کریم پر کیا جاتا ہے۔ بالخصوص سِجّین کے متعلق ان کا اعتراض کرنا سراسر غلط ہے۔ سِجّین عربی زبان کا لفظ ہے۔ لُغت میں اس کے معنے موجود ہیں۔ عربی زبان میں اس کے اور اشتقاق بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مجھے تحقیق کا موقع نہیں ملا ورنہ ممکن ہے اشتقاقِ کبیر میں بھی اس کا ثبوت مل جائے۔ بہرحال سِجّین کو غیر زبان کا لفظ قرار دینا ہرگز درست نہیں ہے۔

مَرْقُوْمٌ: رَقَمَ سے اسم مفعول ہے اور رَقَمَ الْكِتَابَ کے معنے ہیں اَعْجَمَهٗ وَبَيَّنَهٗ۔ اس نے کتاب کو لکھا اور اس پر زیر زبر لگائی۔ اور رَقَمَ الثَّوْبَ کے معنے ہوتے ہیں خَطَّطَهٗ وَاَعْلَمَهٗ۔ اس نے کپڑے پر دھاریاں بنائیں اور نشان لگائے۔ نیز کہتے ہیں فُلَانٌ يَرْقُمُ فِي الْمَآءِ يُضْرَبُ مَثَلًا لِلْحَذِقِ فِي الْاُمُوْرِ یعنی فلاں شخص معاملات میں بڑا حاذق ہے (اقرب)

ضحاک کہتے ہیں کہ مَرْقُوْم کے معنے لغت حِمیر میں مختوم کے بھی ہیں یعنی جس پر مُہر لگی ہوئی ہو۔ وَاَصْلُ الرَّقْمِ: اَلْكِتَابَةُ اور یہ کہ رقم کے اصل معنے کتابت کے ہیں (فتح البیان)

**تفسیر**۔ یہاں بعض لوگوں نے سوال اٹھایا ہے کہ كِتٰبُ الْفُجَّارِ فِيْ كِتٰبٍ مَّرْقُوْمٍ کے معنے ہی کیا ہوئے؟ یعنی بتایا یہ گیا ہے کہ کتاب فجار سِجّین میں ہے اور پھر سِجّین کی تشریح

مَرْقُوْمٌ

۲۷۱
قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ کے استعمال ہونے کی وجہ

کی گئی ہے کہ وہ کتاب مرقوم ہے گویا دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ فجار کی کتاب۔ کتاب میں ہے اور یہ ایک ایسا فقرہ ہے جو بالکل بے معنی ہے جس کا کوئی مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ علامہ زمخشری نے بھی یہ سوال اُٹھایا ہے اور پھر اپنی کتاب میں انہوں نے اس کا جواب بھی دیا ہے چنانچہ وہ کشاف میں لکھتے ہیں سجین عام ہے اور کتاب الفجار اس کا ایک باب ہے یعنی سجین وہ کتاب ہے جس میں مشرک۔ کافر۔ منافق فجار سب کے اعمال لکھے جاتے ہیں اور اسی کو بغیر کسی قید کے کتاب مرقوم کہا گیا ہے کیونکہ اس میں ہر بُرے آدمی کا ذکر ہے خواہ وہ فاجر ہو یا منافق ہو یا کافر ہو یا مشرک ہو لیکن کتاب الفجار میں صرف ایک خاص قسم کے گروہ کی شرارتوں اور انکی بدعمالیوں کا ذکر ہے اور بتایا یہ گیا ہے کہ کتابِ فجار بھی کتاب سجین میں شامل ہے گویا جزو کو کل کی طرف منسوب کیا گیا ہے پس اُنکے نزدیک کتاب الفجار میں جو کتاب کا لفظ آیا ہے وہ باب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور کتاب مرقوم میں جو کتاب کا لفظ ہے وہ زیادہ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ فجار کا اعمال نامہ کتاب مرقوم کا ایک حصہ اور باب ہے۔ الواحدی کہتے ہیں کہ کتاب مرقوم کو سجین کی تفسیر قرار دینا درست نہیں کیونکہ روایات سے سجین کتاب معلوم نہیں ہوتی اس لئے کتَابٌ مرقوم کو اِنَّ کِتَابَ الْفُجَّارِ کا بیان سمجھنا چاہیئے اور جملہ کی تقدیر یوں سمجھی جائے کہ هُوَ كِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ۔ گویا وہ لَفِيْ سِجِّيْنٍ وَمَا أَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ کو درمیان میں ایک جملہ معترضہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں اصل فقرہ صرف اتنا ہے کہ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ۔ مگر یہ معنے درست نہیں ہیں کیونکہ اس صورت میں سِجِّيْنٍ بلا تفسیر رہ جائے گا جو محاورۂ قرآنی کے خلاف ہے۔

سجین کے متعلق مفسرین نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:۔

بعض نے اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ کے یہ معنے کئے ہیں کہ سات زمینوں کے نیچے ایک بہت بڑی چٹان ہے جس کا نام سجین ہے اس چٹان کے نیچے کفار کے اعمالنامے رکھے جاتے ہیں اور بعض کہتے ہیں سجین کسی چٹان کا نام نہیں بلکہ سجین نام ہے شیطان کے کلّے کا۔ شیطان زمین کے نیچے لیٹا رہتا ہے جب کوئی کافر مرجاتا ہے تو فرشتے اُس کی رُوح کو آسمان پر لے جاتے ہیں۔ کافر کی روح دیکھ کر آسمان والے کہتے ہیں ہم اس روح کو نہیں رکھ سکتے اسے واپس لے جاؤ چنانچہ وہ اسے زمین کے نیچے لے جاتے ہیں جہاں شیطان لیٹا ہوا ہوتا ہے۔ شیطان نے تمام کفار کے اعمال نامے اپنے کلّے کے نیچے رکھے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کا کلّہ اُن اعمالناموں کی وجہ سے پھولا ہوا ہوتا ہے۔ جب کافر کی روح اس کے پاس پہنچتی ہے تو وہ اس کا اعمالنامہ بھی پہلے اعمالناموں سے نتھی کر کے اپنے کلّے کے نیچے رکھ کر لیٹ جاتا ہے۔ اس قسم کی اور بھی بعض لغو اور بے ہُودہ روایات تفسیروں میں پائی جاتی ہیں۔

۳۱۱ اِنَّ كِتٰبُ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ کے متعلق ایک خیال اور اسکی تشریح

۳۱۲ لفظ سجین کی تشریح پہلے مفسرین کے نزدیک

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہود بعض مسلمانوں سے تمسخر کیا کرتے تھے اور وہ مسلمان اپنی سادہ لوحی کے سبب اُن کی بتلائی ہوئی روایات کو آگے بیان کر دیتے تھے یہاں تک کہ بعض مفسر انہیں اپنی تفاسیر میں درج کر لیا کرتے تھے حالانکہ یہود اسلام کے شدید دشمن تھے اُن سے قرآن کریم کی کسی آیت کے معنے پوچھنا کسی صورت میں درست نہ تھا مگر وہ یہودیوں کے پاس چلے جاتے اور پوچھتے کہ اس آیت کے معنے کیا ہیں وہ تمسخر کرتے ہوئے ایسی باتیں کہہ دیتے جو سرتاپا غلط اور بے بنیاد ہوتیں۔ چنانچہ تفاسیر میں ایسی بہت سی روایات پائی جاتی ہیں جن کا یہودی کتب میں بھی کوئی نشان نہیں ملتا۔ لیکن بعض روائتیں ایسی ہیں جو یہودی کتب سے مل جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض دیانتدار یہودی تھے اور اپنی کتابوں میں سے جو کچھ بتاتے تھے سچ سچ بتا دیتے تھے لیکن بعض بالکل جھوٹی باتیں مسلمانوں کو بتا دیا کرتے تھے اور مسلمان اپنی جہالت سے اُنکو قرآن کریم کی آیات کی تفسیر سمجھ لیتے تھے۔ ابن کثیر والے نے ایک جگہ اسی قسم کی روایات کا ذکر کرتے ہوئے ایک نہایت ہی لطیف فقرہ لکھا ہے۔ وہ ایک روایت کے ذکر پر لکھتے ہیں کہ یہ

ایسی ہی روایت ہے جیسے ابن عباسؓ سے بعض یہودی روایات مروی ہیں وہ یہودیوں سے اُن پر اعتماد کر کے سوال کر لیا کرتے تھے اور یہودی انہیں جو کچھ بتا دیتے تھے اس کو وہ حُسن ظنی کر کے سچا سمجھ لیتے تھے۔ مجھے ابن کثیر کے مصنف کی یہ بات بڑی پسند آئی کہ اُس نے بڑی دلیری اور جرأت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ سجّین کے متعلق جو روایات تفسیروں میں پائی جاتی ہیں وہ بھی ایسی ہی ہیں کہ ان کا یہودی کتب سے بھی پتہ نہیں چلتا۔

عجیب بات یہ کہ اللہ تعالیٰ اس جگہ صاف طور پر فرماتا ہے کہ سجّین کتابِ مرقوم ہے مگر بعض مفسّر کہتے ہیں کہ یہ سات زمینوں کے نیچے ایک چٹان ہے یا شیطان کے کلّوں کو سجّین کہا گیا ہے۔ جہاں خدا تعالیٰ نے کوئی بات نہیں بتائی وہاں تو وہ جو چاہیں کہہ جائیں مگر جہاں خدا تعالیٰ سجّین کے معنے بتا رہا ہے وہاں بھی یہ کہنا کہ اس کے معنے وہ نہیں جو قرآن نے بتائے ہیں بلکہ اس کے کچھ اَور معنے ہیں بہت بڑی غلطی ہے حالانکہ لغت میں سجّین کے معنے موجود ہیں اور کتاب کے معنے بھی موجود ہیں۔ سجّین کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے معنے دائم اور شدید کے ہیں اور کتاب کے متعلق لکھا ہے مَا يُكْتَبُ فِيْهِ یعنی لکھی ہوئی تصنیف (۲) اَلدَّوَاةُ۔ دوات (۳) اَلتَّوْرَاةُ ۔ تورات (۴) اَلصَّحِيْفَةُ صحیفہ (۵) اَلْفَرْضُ۔ فرض (۶) اَلْحُكْمُ۔ حکم (۷) اَلْقَدَرُ۔ قضاء آسمانی۔ اندازہ (۸) وَ فِي الْمِصْبَاحِ وَ يُطْلَقُ الْكِتَابُ عَلَى الْمُنَزَّلِ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب (اقرب) ان معنوں کے لحاظ سے اِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ کا ایک تو یہ مفہوم ہوگا کہ فُجَّار کے متعلق ہمارا جو حکم ہے وہ سجّین نامی کتاب میں ہے۔ دنیا میں بھی کتابوں کے مختلف نام رکھے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس رجسٹر میں ان کا ذکر کیا گیا ہے اس کا نام سجّین ہے یعنی ان فجّار کا جو اعمال نامہ ہوگا اُس پر یہ ہیڈنگ ہوگا کہ ان کے ساتھ معاملہ دائمی اور سخت کیا جائے گا کیونکہ سجّین کے معنے دائم کے بھی ہیں اور شدید کے بھی۔ اور اگر کتاب کے معنے اَلْقَدَرُ کے لیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اُن کے متعلق ایک ایسا اندازہ کیا گیا ہے جو لَفِيْ سِجِّيْنٍ حالتِ دائمی اور شدّت میں ہوگا۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ اور یہ حالتِ دائمی اور شدّت کیا چیز ہے كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا فیصلہ ہے جو لکھا ہوا ہے یعنی وہ ٹلے گا نہیں پس كِتٰبُ الْفُجَّارِ کے معنے ہوئے قَضَاءُ اللّٰهِ فِيْ حَقِّ الْفُجَّارِ یا حُكْمُ اللّٰهِ فِيْ حَقِّ الْفُجَّارِ یا قَدَرُ اللّٰهِ فِيْ حَقِّ الْفُجَّارِ یعنی اللہ تعالیٰ کا فیصلہ فجّار کے حق میں سجّین میں ہے یعنی اس دفتر میں ہے جس میں دائمی اور شدید عذاب والوں کا ذکر ہے ان معنوں کو جو لغت کے لحاظ سے ثابت شدہ ہیں اگر لے لیا جائے تو اس امر کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ شیطان کے کلّے کو چیر چیر کر اُس میں کفار کے نامۂ اعمال کو رکھا جائے یا زمین کے نیچے چٹانیں تلاش کی جائیں یہ سب بے معنی اور لغو باتیں ہیں۔

قتادہ۔ سعید بن جبیر۔ مقاتل اور کعب کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا سجّین ساتویں زمین کے نیچے ایک چٹان ہے اُسے ہٹا کر اُس کے نیچے کتابِ فجار رکھی جاتی ہے۔ اس صورت میں وہ کہتے ہیں کہ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ میں حذفِ مضاف ہے اور مراد یہ ہے کہ سِجِّيْنٌ مَحَلُّ كِتَابٍ مَّرْقُوْمٍ ہے یعنی کفار کے اعمال ناموں کی جگہ سجّین ہے مگر ابو عبیدہ اور اخفش اور مبرّد اور زجّاج جیسے نحویوں اور ادیبوں نے جن میں سے ابو عبیدہ اور مبرّد ادب کے بہت بڑے ماہر گذرے ہیں اور اخفش اور زجّاج نحو کے بہت بڑے ماہر گذرے ہیں لَفِيْ سِجِّيْنٍ کے معنے لَفِيْ حَبْسٍ وَّ ضِيْقٍ شَدِيْدٍ کئے ہیں یعنی فجّار کی منزل حبس و ضیق شدید میں ہوگی۔ وہ کہتے ہیں لَفِيْ سِجِّيْنٍ اَیْ لَفِيْ مَكَانِ خَسَاسَةٍ وَ ذِلَّةٍ خساست اور ذلت اُن کا مقام ہوگا۔ اس صورت میں كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ سجّین کی صفت ان معنوں میں ہوگی کہ یہ شدّت اور حبس کا مقام ایک کتابِ مرقوم میں ہے یعنی ایک لکھا ہوا فیصلہ ہے جو ٹل نہیں سکتا۔

میرے نزدیک اس آیت کے جو صاف معنے ہیں وہ یہی ہیں کہ فجّار کا فیصلہ سجّین میں ہے جو ایک اٹل فیصلہ ہے یا یہ کہ سجّین ایک ایسا فیصلہ ہے جو کتاب مرقوم ہے یعنی اٹل ہے۔

اِس آیت کے معنے اِس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ غیروں سے معاملات کرنے کے لحاظ سے ہی جس کا اس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے عیسائی قوم خراب نہ ہوگی بلکہ اس قوم میں فسق وفجور بھی ہوگا کیونکہ نام تبھی رکھا جاتا ہے جب کسی چیز کی کثرت پائی جائے پس فجار کہہ کر بتایا کہ اس قوم میں صرف یہی عیب نہیں ہوگا کہ وہ دوسری اقوام سے بے انصافی کرے گی بلکہ اور بھی کئی قسم کے معائب اور فسق وفجور میں یہ مبتلا ہوگی۔ اور اُن کے متعلق جو فیصلہ ہوگا وہ بڑا سخت اور لمبا ہوگا جس طرح ان کا معاملہ دوسری اقوام سے لمبا اور سخت تھا اور جس طرح ان کی فتح اور کامیابی لمبی ہوگی اسی طرح اُن کے ساتھ معاملہ بھی لمبا اور سخت کیا جائیگا۔

پھر میرے نزدیک اس آیت کے ایک اور معنے بھی ہیں جس کی طرف پہلے کسی مفسر کا خیال نہیں گیا اور وہ یہ کہ قرآن کریم کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ انذاری ہے اور ایک حصہ تبشیری ہے کچھ حصہ میں تو دشمنانِ صداقت کی تباہیوں اور انکی بربادیوں کا ذکر ہے اور کچھ حصہ میں مومنوں کی ترقیات اور اُن رحمتوں اور برکات کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے لئے مقدر ہیں۔ پس میرے نزدیک سجین اور علیین قرآن کریم کے دو حصوں کا نام رکھا گیا ہے علیین قرآن کریم کے وہ حصے ہیں جن میں مومنوں کا ذکر ہے اور سجین قرآن کریم کے وہ حصے ہیں جن میں کافروں کا ذکر ہے اس لحاظ سے اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ کے یہ نہایت ہی لطیف معنے ہوں گے کہ کس طرح ہوسکتا ہے یہ قوم تباہ نہ ہو۔ ان لوگوں کی تباہی اور بربادی کا فیصلہ تو قرآن کریم کے اُن حصوں میں موجود ہے جن میں آئندہ زمانہ کی تباہیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اُن حصوں میں اس قوم کی تباہی اور بربادی کی خبریں دی جاچکی ہیں۔ ضحاک کہتے ہیں کہ مَرْقُوْم کے معنے لغت حمیر میں مَخْتُوْم کے ہیں اور یہ معنے اس مقام پر نہایت عمدگی سے چسپاں ہوتے ہیں کیونکہ کتابِ مختوم وہی ہے جو بدلتی نہیں جس کے فیصلے آخری اور قطعی ہوتے ہیں اور جس میں کسی قسم کی تبدیلی کا امکان نہیں گویا وہ خاتم الکتب ہے اور یہ خوبی قرآن کریم میں ہی پائی جاتی ہے۔ اگر یہ فیصلے کسی ایسی کتاب میں بیان ہوتے جو منسوخ ہوچکی ہوتی یا جس نے آئندہ کسی زمانہ میں منسوخ ہوجانا ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ جب یہ کتاب منسوخ ہوچکی یا آئندہ منسوخ ہونے والی ہے تو اس کے فیصلوں سے کیا خوف ہوسکتا ہے مگر یہ سجین تو وہ ہے جو کتاب مرقوم ہے۔ یعنی یہ فیصلے اُس کتاب میں لکھے ہوئے ہیں جو کبھی تبدیل نہیں ہوسکتی اس لئے یہ فیصلے اٹل ہیں۔ اس صورت میں اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ میں کتاب کو حکم کے معنوں میں لیا جائے گا اور مراد یہ لی جائے گی کہ اِن فجار کا حکم سجین میں ہے اور سجین کے معنے قرآن کریم کے انذاری حصہ کے ہوں گے۔ اسی طرح علیین سے مراد قرآن کریم کا وہ تبشیری حصہ لیا جائے گا جس میں مومنوں کی ترقیات کا ذکر آتا ہے۔ پس میرے نزدیک یہ ایک نہایت ہی لطیف اور واضح معنے ہیں جو اس مقام پر پوری طرح چسپاں ہوتے ہیں کیونکہ جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اسی طرح قرآن خاتم الکتب ہے اُس کے فیصلے اٹل اور قطعی ہیں خواہ وہ کفار کی تباہی کے متعلق ہوں یا مومنوں کی ترقی کے متعلق ہوں۔

[۲۹۱ سجین اور علیین کا صحیح مفہوم]

اب مَآ اَدْرٰىكَ کے متعلق بھی ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ عربی زبان میں مَآ اَدْرٰىكَ اور مَا يُدْرِيْكَ دونوں کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ مَا تَدْرِیْ تو اس بات کو نہیں جانتا۔ لیکن قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں الفاظ کے استعمال میں فرق ہے۔ قرآن کریم میں مَآ اَدْرٰىكَ اور مَا يُدْرِيْكَ دونوں ہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مَآ اَدْرٰىكَ بارہ جگہ آیا ہے اور مَا يُدْرِيْكَ تین جگہ آیا ہے۔ چنانچہ مَآ اَدْرٰىكَ جن بارہ مقامات پر آیا ہے وہ یہ ہیں (۱) الحاقہ (۲) مدثر (۳) مرسلات (۴) انفطار (۵) تطفیف (۶) تطفیف (۷) طارق (۸) بلد (۹) قدر (۱۰) قارعہ (۱۱) قارعہ (۱۲) ہمزہ۔

[۲ مَآ اَدْرٰىكَ اور مَا يُدْرِيْكَ کے استعمال میں فرق]

ان سب مقامات پر مَآ اَدْرٰىكَ کے بعد اسم آیا ہے جیسے مَا الْحَآقَّةُ۔ مَا سَقَرُ۔ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ مَا سِجِّيْنٌ۔ مَا عِلِّيُّوْنَ۔ مَا الطَّارِقُ۔ مَا الْعَقَبَةُ۔

مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۔ مَا الْقَارِعَةُ ۔ مَا هِيَهْ ۔ مَا الْحُطَمَةُ
اس کے برخلاف مَا يُدْرِيكَ جتنی جگہ آیا ہے کسی فعل
کی طرف اُس میں اشارہ ہے۔ چنانچہ مَا يُدْرِيكَ قرآن کریم
میں تین جگہ آیا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں۔ احزاب میں اور عبس میں۔
سورہ شوریٰ میں آتا ہے وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ
قَرِيبٌ (ع۲) سورۂ احزاب میں آتا ہے وَمَا يُدْرِيكَ
لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا (ع۸) سورۂ عبس میں
آتا ہے وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى (ع۱) ان سب
مقامات پر کسی وقوعہ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ دوسرا فرق
یہ ہے کہ جہاں بھی مَا أَدْرَاكَ آیا ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے
کسی سوال کا جواب دیا ہے مثلاً مَا الْقَارِعَةُ کے بعد یہ بتایا
ہے کہ قارعہ کیا چیز ہے۔ مَا سَقَرُ کے بعد بتایا ہے کہ سقر
کیا چیز ہے اور مَا يَوْمُ الْفَصْلِ یا مَا يَوْمُ الدِّينِ کے
بعد بتایا ہے کہ یوم الفصل یا یوم الدین کیا چیز ہے گویا جہاں بھی
مَا أَدْرَاكَ آیا ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی سوال کا
جواب دیا ہے۔ مثلاً (۱) سورۂ الحاقہ میں مَا الْحَاقَّةُ کے بعد
فرماتا ہے كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ ۝ فَأَمَّا
ثَمُودُ فَأُهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ ۝ وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا
بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ یعنی ثمود اور عاد قوموں نے موعود
عذاب کو جھٹلایا۔ سو اس کے بعد ثمود تو ایک بڑے زور کی کڑک
کے صدمہ سے ہلاک کر دئے گئے۔ اور رہے عاد سو وہ بھی ایک
سخت آندھی سے ہلاک کر دئے گئے۔ الغرض ان آیات میں اور
بعد کی آیات میں فرعون اور پہلے معذب لوگوں کا ذکر کر کے
بتایا ہے کہ الحاقہ سے مراد وہ اٹل عذاب ہیں جن کو زبردست
اقوام ساری کوششوں کے باوجود ٹلا نہیں سکتیں (۲) پھر
سورۂ مدثر میں مَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ کے بعد اس کی تفسیر بھی
کر دی کہ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝
عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝ (المدثر ع۱) یعنی سقر ایسی چیز ہے
کہ نہ وہ باقی رکھتی ہے اور نہ جلائے بغیر چھوڑتی ہے اور آدمی
کے تن بدن کو جھلس دیتی ہے اس پر انیس ۱۹ فرشتے متعین ہیں

(۳) سورۂ مرسلات میں فرمایا ہے کہ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ
الْفَصْلِ اور پھر اس کا لمبا جواب دیتے ہوئے فرمایا هَٰذَا
يَوْمُ لَا يَنطِقُونَ ۝ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ۝
وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝ هَٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ
جَمَعْنَاكُمْ وَالْأَوَّلِينَ ۝ (مرسلات ع۲) یعنی یوم الفصل وہ
دن ہوگا جبکہ گنہگار کوئی بات نہ کر سکیں گے اور نہ ان کو اجازت
دی جائے گی کہ وہ کوئی عذر پیش کریں۔ خوب یاد رکھو کہ عذاب
کو جھٹلانے والوں کے لئے تباہی ہی تباہی ہے اُس دن ہم ان
سے کہیں گے کہ یہی تو وہ یوم الفصل ہے جس میں تم کو اور پہلے
لوگوں کو فیصلے کے لئے ہم نے جمع کیا ہے (۴) پھر سورۂ انفطار
میں وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ کہا اور اس کی تفسیر
یوں کر دی کہ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا (انفطار ع۱)
یعنی یوم الدین وہ دن ہے جس دن کوئی جان کسی جان کے کچھ کام
نہ آسکے گی (۵) اسی طرح سورۂ تطفیف میں فرمایا وَمَا أَدْرَاكَ
مَا سِجِّينٌ اور اس کا جواب دیا کہ كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ۝ وَيْلٌ
يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝ (تطفیف ع۱) یعنی سجین ایک اٹل
حکم ہے (۶) پھر اسی سورۃ میں دوسری جگہ فرمایا وَمَا أَدْرَاكَ
مَا عِلِّيُّونَ اور اس کی تفسیر یوں فرما دی کہ كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ۝
يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ ۝ (تطفیف ع۱) یعنی علیون ایک ایسا
حکم ہے جو ضرور پورا ہوگا اور اس کو مقرب لوگ دیکھیں گے۔
گویا سجین وہ ہے کہ اُسے دیکھ کر کافر روئیں گے اور علیین وہ
ہے کہ اس کو دیکھ کر مومن اُس کی طرف شوق سے جائیں گے۔
(۷) پھر سورۂ طارق میں مَا الطَّارِقُ کہہ کر اس کا جواب دیا
النَّجْمُ الثَّاقِبُ (الطارق ع۱) کہ طارق ایک شان چمکنے والا
ستارہ ہے۔ (۸) پھر سورۂ بلد میں فرمایا مَا الْعَقَبَةُ اور اس
کا جواب یہ دیا کہ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي
مَسْغَبَةٍ ۝ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝
(البلد ع۱) یعنی عقبہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ گردن کا غلامی یا قرض
کے پھندے سے چھڑا دینا یا بھوک کے دن قرابت دار یتیم کو یا
خاک افتادہ مسکین کو کھانا کھلانا (۹) اسی طرح اس بات کو حل

کرنا تھا کہ مَا لَیْلَۃُ الْقَدْرِ یعنی لیلۃ القدر کی کیا شان ہے۔ اس لئے اس کے آگے جواب دے دیا کہ لَیْلَۃُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ ہ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْھَا بِاِذْنِ رَبِّھِمْ ۚ مِنْ کُلِّ اَمْرٍ ہ سَلٰمٌ ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ ہ (القدر ۲۲) یعنی لیلۃ القدر خیر و برکت میں ہزار مہینے سے بھی بہتر ہے اس لیلۃ القدر میں ہر ایک انتظام کے لئے فرشتے اور روح خدا تعالےٰ کے حکم سے اُترتے ہیں اور وہ رات امن و سلامتی کی رات ہے اور یہ خیر و برکت صبح کے طلوع ہونے تک رہتی ہے۔

(۱۰) اسی طرح سورۃ قارعہ میں مَا الْقَارِعَۃُ کہہ کر اس کے جواب میں فرمایا یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ہ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ ہ (القارعۃ ۲۶) یعنی قارعہ سے ہماری مراد ایک عظیم الشان حادثہ ہے اور جب وہ آئیگا اُس دن لوگ ایسے پڑے ہوئے ہونگے جیسے پر دار چیونٹیاں اور پہاڑ دُھنکی ہوئی روئی کی طرح ہوں گے (۱۱) پھر اسی سورۃ میں وَمَآ اَدْرٰکَ مَاھِیَہْ کہہ کر ھَاوِیَۃ کے بارے میں سوال کیا تھا اس کا یہ جواب دیا کہ نَارٌ حَامِیَۃٌ۔ یعنی ہاویہ ایک شعلے مارنے والی آگ ہے (۱۲) پھر سورۃ ہُمزہ میں فرمایا وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْحُطَمَۃُ اور اس کا یہ جواب دیا کہ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (ھمزہ ۲۶) یعنی حطمہ سے مراد اللہ کی وہ جلائی ہوئی آگ ہے جو داخل ہونے والوں کے دلوں کو جھانک رہی ہے۔

پس قرآن کریم میں جہاں بھی مَآ اَدْرٰکَ کا ذکر آیا ہے اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے کسی سوال کا ضرور جواب دیا ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل وَمَا یُدْرِیْکَ کے جواب میں ہمیشہ اللہ تعالےٰ نے بات کو لَعَلَّ سے شروع کیا ہے اور جواب کو مبہم اور ذوالوجوہ رکھا ہے۔ چنانچہ سورۃ شوریٰ میں فرمایا وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ پھر احزاب میں فرمایا وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ تَکُوْنُ قَرِیْبًا اور عبس میں فرمایا وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی۔ گویا تینوں جگہ لَعَلَّ کا لفظ رکھا۔ دو جگہ تو ساعت کا ذکر کرکے فرمایا کہ تم نہیں جانتے وہ کب آنے والی ہے۔ اُس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ اپنے بندوں کو اس کا علم نہیں دے سکتا۔ تیسری جگہ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی کہہ کر پھر وہی صورت اختیار کی گئی ہے جو اوپر کے دو مقامات میں اختیار کی گئی تھی۔ لیکن مَآ اَدْرٰکَ جہاں جہاں کہا گیا ہے وہاں سوال کا معیّن جواب دیا گیا ہے۔

مَآ اَدْرٰکَ اور مَا یُدْرِیْکَ کے اس فرق سے قرآن کریم کی فصاحت کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک لُغت کا سوال ہے اُس نے دونوں کو ہم معنیٰ قرار دیا ہے اور دونوں کے معنے یہ لکھے ہیں کہ مَا تَدْرِیْ۔ تو نہیں جانتا۔ اور یہ بات درست بھی ہے کہ دونوں کے یہی معنے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ وجہ کیا ہے کہ قرآن کریم نے ایک سے عدم علم کی طرف اشارہ کرکے علم عطا کر دیا ہے اور دوسرے سے عدم علم کی خبر دے کر ابہام کو قائم رکھا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ گو لغت نے دونوں کو ایک قرار دیا ہے مگر صیغہ کے لحاظ سے مَآ اَدْرٰکَ ماضی کا صیغہ ہے اور مَا یُدْرِیْکَ مضارع کا صیغہ ہے۔ اور گو استعمالِ عام میں اَدْرٰنِیْ اور یُدْرِیْنِیْ دونوں کے ایک معنی کر دئے گئے ہیں مگر قرآن کریم نے ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی کا صیغہ یقین پر دلالت کرتا ہے کیونکہ جو واقعہ ہو چکا وہ بہرحال قطعی اور یقینی ہوتا ہے لیکن مضارع محض توقع پر دلالت کرتا ہے اس لئے قرآن کریم نے بھی ان دونوں صیغوں کے استعمال میں اس فرقِ لطیف کو ملحوظ رکھا اور جس امر کو بتانا تھا اُسے ماضی کے صیغہ وَمَآ اَدْرٰکَ کے بعد رکھا اور جسے ابھی کچھ عرصہ کے لئے مبہم رکھنا تھا اُسے مَا یُدْرِیْکَ کے الفاظ کے بعد رکھا۔ تاکہ مضارع کی طرح اُس کا علم بھی مبہم اور غیر یقینی رہے کیونکہ مضارع کا صیغہ اپنے اندر یقین نہیں رکھتا بلکہ محض توقع رکھتا ہے۔

(حاشیہ: مَآ اَدْرٰکَ کے بعد کسی سوال کے جواب کا ذکر ہوتا ہے اور مَا یُدْرِیْکَ کے بعد جواب کو مبہم رکھا جاتا ہے۔)

چنانچہ دیکھ لو ہم کہتے ہیں یَذْھَبُ وہ جائے گا مگر اس میں یقینی خبر نہیں ہوتی کہ وہ ضرور جائے گا کیونکہ ہمیں کیا پتہ کہ وہ جائے گا یا مر جائے گا یا بیمار ہو جائے گا یا قید ہو جائیگا

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ

اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے عذاب (ہی عذاب) ہے (اُن کے لئے) جو جزاء سزا کے دن کا

الدِّيْنِ ۝ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝

انکار کرتے ہیں ۸ہ اور اس کا انکار نہیں کر سکتا مگر وہی جو حد سے نکلا ہوًا اور سخت گنہگار ہو ۹ہ

پس جس خبر کو یقینی کرنا مقصود نہ تھا اُسے اللہ تعالےٰ نے مضارع کے الفاظ کے بعد رکھا اور جس بات کا یقینی علم دینا تھا اُسے ماضی کے الفاظ کے بعد رکھا۔ گویا اس طرح لُغت میں ایک لطیف فرق جو الفاظ کے مناسب حال ہے پیدا کر دیا جسے پہلے ادیب مدِنظر نہ رکھتے تھے۔

**۸ہ تفسیر۔** اس آیت میں پہلی سورۃ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہاں چونکہ فرمایا تھا کہ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ اس لئے یہاں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس قسم کے ظلم ہمیشہ انجام سے استغناء اور انکار کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں جب کوئی سمجھ لے کہ میرے بُرے اعمال کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا تو وہ ہمیشہ عاجل فائدہ کو مقدم کر لیتا ہے اور بُرائیوں میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ اگر ہر فرد اور قوم کو اپنا انجام یاد رہے تو یہ حالت کبھی پیدا نہ ہو۔ مگر افسوس اس یقینی سبق سے بھی دنیا فائدہ نہیں اُٹھاتی۔ افراد اپنے اعمال سے برباد ہوتے ہیں۔ اقوام اپنے اعمال سے برباد ہوتی ہیں اور اُن کی آنکھوں کے سامنے پہلے لوگوں کی تباہی اور بربادی کے نظارے ہوتے ہیں مگر باوجود اس کے بار بار افراد اور اقوام اس کے خلاف چل کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ جیسے کہانیوں میں مقناطیس کے پہاڑ کا ذکر آتا ہے کہ جب جہاز اُس کے قریب پہنچتا تھا تو وہ رُک نہیں سکتا تھا جب تک اُس سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جاتا۔ اسی طرح معلوم ہوتا ہے يَوْمُ الدِّيْنِ کی تکذیب اور انجام کو بھول جانا وہی مقناطیس کا پہاڑ ہے کہ اُس کے سامنے اگر انسانی یا قومی زندگی کا جہاز مقابلہ کرہی نہیں سکتا ضرور اُدھر کھنچا چلا جاتا ہے اور آخر اُس سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتا ہے۔ درحقیقت ظالموں کو تباہ کرنیکا خدا تعالےٰ نے یہ سامان پیدا کیا ہے کہ وہ يَوْمُ الدِّيْنِ کو بھول کر اپنے ظلم میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور آخر اُسی ظلم کی چٹان سے ٹکرا کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ خدا تعالےٰ نے کافر کی جہنم اُس کے قلب اور دماغ میں ہی پیدا کی ہوئی ہوتی ہے اور آخر ایک دن اُس کو تباہ کرنے کا اسی میں سے سامان پیدا ہو جاتا ہے۔

**۹ہ حل لغات۔** اِعْتِدَاء کے معنے ظلم کرنے اور حد سے نکل جانے کے ہوتے ہیں چنانچہ اِعْتَدٰى عَلَيْهِ اِعْتِدَاءً کے معنے ہوتے ہیں ظَلَمَهٗ۔ اُس نے فلاں پر ظلم کیا (اقرب) مُعْتَدٍ۔ اِعْتَدٰى سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اس لئے مُعْتَدٍ کے معنے ہوں گے۔ ظلم کرنے والا۔

اَثِيْمٌ: اَثِمَ سے اسم فاعل کا مبالغہ کا صیغہ ہے اور اَثِمَ کے معنے عَمِلَ مَا لَا يَحِلُّ کے ہوتے ہیں یعنی اس نے ایک ایسا کام کیا جو جائز نہیں تھا اور وضع لُغت کے لحاظ سے اَثِمَتِ النَّاقَةُ الْمَشْيَ اِثْمًا کے معنے ہوتے ہیں اَبْطَأَتْ (اقرب) اونٹنی سُست چلی۔ پس اَثِيْم وہ ہوا جس نے وہ کام جو کرنا تھا نہ کیا۔ گویا اِثْم کا لفظ کمی پر دلالت کرتا ہے اور اِعْتِدَاء کا لفظ زیادتی پر دلالت کرتا ہے۔

**تفسیر۔** فرماتا ہے تَكْذِيْبُ يَوْمُ الدِّيْنِ کے متعلق جو بات ہم نے بیان کی ہے وہ ایسی نہیں کہ ہم یونہی ظلماً کر دیتے ہوں۔ یوم الدین کو بھول جانا کوئی اتفاقی امر نہیں ہوتا اور پھر یہ بھی نہیں کہ ہم نے اُن کو علم نہ دیا ہو ہم نے

اِعْتِدَاء
اَثِيْمٌ

انہیں علم بھی دیا ہوتا ہے وہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے اعمال کا نتیجہ اچھا نہیں نکل سکتا مگر پھر وہ کیوں یوم الدین کو بھول جاتے ہیں۔ فرماتا ہے اس کی دو وجوہ ہیں اِعْتِدَاء اور اِثْم۔ یہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے انسان یوم الدین کو بھول جاتا ہے یعنی جو کام نہ کرنے والے ہوں انکو وہ کرلیتا ہے اور جو کام کرنے والے ہوں اُن کو وہ نہیں کرتا مُعْتَدٍ وہ ہے جو نہ کرنے والے کاموں کو کرلے اور اَثِیْم وہ ہے جو کرنے والے کاموں کو نہ کرے۔ یوں اِثْم کے عام معنے گناہ کے ہی ہوتے ہیں مگر کسی لفظ کے وضع لغت کے لحاظ سے مخصوص معنے اس جگہ ہوتے ہیں جہاں اُس کے مقابل کا لفظ آجائے۔ اگر خالی مُعْتَدٍ کا لفظ یہاں آجاتا تو ہم اس کے معنے گناہ کے کرتے۔ چاہے وہ گناہ کسی بات میں زیادتی کا نتیجہ ہوتا یا کسی بات میں کمی کا نتیجہ ہوتا۔ اسی طرح اگر خالی اَثِیْم کا لفظ آجاتا تو اس کے معنے بھی ہم گناہ کے ہی کرتے۔ چاہے یہ گناہ زیادتی پر دلالت کرتا اور چاہے کمی پر۔ مگر چونکہ مُعْتَدٍ اور اَثِیْم دونوں لفظ اکٹھے آگئے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ دونوں کو ہم الگ الگ مفہوم کا حامل قرار دیں اور وہ مفہوم جیسا کہ اُوپر بتایا جاچکا ہے یہ ہے کہ اِثْم کا لفظ کمی پر دلالت کرتا ہے اور اعتداء کا لفظ زیادتی پر دلالت کرتا ہے اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ یوم الدین کی تکذیب ہمیشہ اعتداء اور اِثْم سے پیدا ہوتی ہے۔ پہلے انسان گناہ کرتا ہے اور جب اسے اپنے گناہ کے متعلق گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے کہ کہیں میں پکڑا نہ جاؤں یا میری بدنامی نہ ہو اور اس فکر میں اس کی جان گھلنی شروع ہوتی ہے تو اس کا دوسرا قدم یہ ہوتا ہے کہ وہ کوشش کرتا ہے میں اپنے انجام کو بھول جاؤں اور اس طرح میں اپنے دل کی خلش سے بچ جاؤں۔ گویا یوم الدین کی تکذیب ایک شراب ہے جس کے نشہ میں مدہوش ہوکر وہ اپنے انجام سے مستغنی ہوجاتا ہے۔ جیسے غالب نے کہا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو ✦ اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

یعنی انجام کا خیال اب میرے دل پر ہر وقت مستولی رہتا ہے اور اس فکر میں میری جان گھل رہی ہے۔ میں اس فکر سے بچنے کے لئے شراب پیتا ہوں تاکہ مجھ پر ہر وقت ایک بے خودی کی حالت طاری رہے اور انجام میری آنکھوں کے سامنے نہ آئے۔ اسی طرح تکذیب یوم الدین ایک قسم کی شراب ہے جب انسان اعتداء اور اِثْم میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ ان اعمال کا انجام وہ بھول جائے۔ چنانچہ وہ کبھی افیون کھاکر۔ کبھی شراب پی کر کبھی بھنگ اور چرس اور گانجا استعمال کرکے چاہتا ہے کہ ہر وقت مدہوش رہے اور اس کا بُرا انجام اس کی آنکھوں کے سامنے نہ آئے یا اگر وہ شراب اور افیون استعمال نہیں کرتا تو علمی طور پر تکذیب یوم الدین شروع کردیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ محض وہم ہے کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور اپنے اعمال کے متعلق اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ گویا یا تو وہ مادی نشوں کے ذریعہ سے اپنے علم کو کمزور کرتا ہے اور یا پھر فلسفی نشوں سے وہ اپنے علم کو گُند کردیتا ہے تاکہ وہ اس عذاب سے بچ جائے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ واقعہ میں اگر انسان اس پر غور کرے تو اُسے حیرت آجاتی ہے کہ کروڑوں لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں اور اُن کے اس مرض کی وجہ سوائے اعتداء اور اِثْم کے اور کچھ نہیں۔ وہ اعتداء اور اِثْم میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ اُن کا انجام بھیانک ہے تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے اس انجام کو بھول جائیں۔ چنانچہ یا تو وہ افیون اور شراب وغیرہ سے وہ اپنے اوپر مدہوشی طاری کرلیتے ہیں اور یا پھر فلسفی نشوں سے وہ یوم الدین کی تکذیب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ محض جھوٹ ہے کہ انسان مرکر دوبارہ زندہ ہوگا۔ غرض فرماتا ہے وہ پہلے اعتداء اور اِثْم کرتے ہیں اور جب اعتداء اور اِثْم میں بڑھ جاتے ہیں تو مادی یا دماغی نشوں سے یوم الدین کو بُھلا دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اَور زیادہ اعتداء اور اَور زیادہ اِثْم کرتے ہیں گویا اُن کی مثال بالکل اُس چیتے کی سی ہوتی ہے جس نے بھوک میں اپنی زبان چاٹنی شروع کردی تھی اور

مُعْتَدٍ اور اَثِیْم میں فرق

# اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝

جب ایسے لوگوں کے سامنے ہمارے نشانات پڑھے جائیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کی نقل کردہ باتیں ہیں ؏

رفتہ رفتہ اس کی تمام زبان کھائی گئی تھی۔ یہ لوگ بھی پہلے اعتداء اور اثم کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یوم الدین کو بھلا دیتے ہیں۔ جب یوم الدین کو بھول جاتے ہیں تو اور زیادہ اعتداء اور اثم کرتے ہیں اور یہ چکر چلتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اُن کے اعمال کا جہاز اس ظلم کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔

اَسَاطِیر

**؏ حل لغات**۔ اَسَاطِیر جمع ہے اور اس کا واحد اَلْاِسْطَارُ وَالْاُسْطَارَۃُ وَالْاُسْطُوْرَۃُ وَالْاِسْطِیْرُ ہے اور اس کے معنے ہوتے ہیں مَا یُسْطَرُ اَیْ یُکْتَبُ ہر وہ چیز جو لکھی جائے (اقرب) پس اَسَاطِیْر کے معنے ہوئے لکھی ہوئی باتیں۔ وَتُسْتَعْمَلُ فِی الْحَدِیْثِ لَا نِظَامَ لَهٗ عام محاورہ میں اَسَاطِیْر بے جوڑ باتوں کو بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک معنے حکایت کے ہیں (اقرب) یہ وہی لفظ ہے جس کو انگریزی میں سٹوری بنا ہے اور سپین سے انگریزی زبان میں بدل کر آگیا ہے پس اس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں یعنی مُعْتَدٍ اور اَثِیْم کے سامنے۔ تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں سے نقل کی ہوئی کچھ بے جوڑ سی باتیں ہیں یا یوں کہو کہ لغت کے لحاظ سے اس کے تین معنے بن جائیں گے (۱) پہلے لوگوں سے لکھی ہوئی یعنی نقل کی ہوئی کچھ باتیں ہیں (یہ معنی یُکْتَبُ سے لئے جائیں گے) (۲) یا پہلے لوگوں کے متعلق کچھ بے جوڑ سی باتیں ہیں (۳) یا پہلے لوگوں کی حکائتیں اور کہانیاں ہیں۔

۲۱۱ قرآن کریم میں اساطیرالاولین کا الزام نو مقامات پر

**تفسیر**۔ قرآن کریم میں اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ کا الزام ۹ مقامات پر آتا ہے جو یہ ہیں (۱) انعام ع ۳ (۲) انفال ع ۴ (۳) نحل ع ۳ (۴) مومنون ع ۵ (۵) فرقان ع ۱ (۶) نمل ع ۶ (۷) احقاف ع ۲ (۸) ن والقلم ع ۱ (۹) تطفیف ع ۱۔

(۱) سورہ انعام میں پہلے اہل کتاب کا ذکر کیا ہے پھر کفار کا ذکر ہے اور فرماتا ہے حَتّٰٓی اِذَا جَآءُوْكَ یُجَادِلُوْنَكَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (ع ۳)

(۲) سورہ انفال میں ہے وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (ع ۴)

(۳) سورہ نحل میں ہے وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ لِیَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ (ع ۳)

(۴) سورہ مومنون میں ہے قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (ع ۵)

(۵) سورہ فرقان میں ہے۔ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَیْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝ وَقَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰی عَلَیْهِ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا ۝ (ع ۱)

(۶) سورہ نمل میں ہے وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ (ع ۶)

(۷) سورہ احقاف میں ہے۔ وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدَانِنِیْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ (ع ۲)

(۸) سورہ ن والقلم میں ہے اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا

قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (ع)، پھر فرماتا ہے سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ۔

(۹) آخری مقام یہی سورۃ تطفیف ہے جو زیر بحث ہے اس میں فرماتا ہے وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ۔ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (ع)

ان آیات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ انعام کی آیت میں اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اس ذکر میں ہی کہ پرانی کتب کی پیشگوئیاں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نئے نشانات جب اُن کو دکھائے جاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو پرانے زمانہ کی باتیں دُہرائی جاتی ہیں گویا پیشگوئیاں نہیں ہیں بلکہ پرانی کتب کی باتوں کو دھوکا دینے والے طریق سے پیش کرکے مطلب حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ موسیٰؑ کی بات کو دیکھو جو فرعون کے سامنے ہوئی اور پھر فرعون کا انجام گویا ہمیں ڈرایا جاتا ہے کہ فرعون نے موسیٰؑ کا مقابلہ کیا اور وہ تباہ ہو گیا اگر ہم بھی مقابلہ کریں گے تو تباہ ہو جائیں گے۔ حالانکہ تمہاری موسیٰؑ سے کیا نسبت ہے۔ یا ابراہیمؑ کا ذکر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے دشمن تباہ ہوئے حالانکہ تمہاری ابراہیمؑ سے کیا نسبت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب آخری نتیجہ نکلے گا اُس وقت یہ لوگ کہیں گے کہ کاش ہم مخالفت نہ کرتے جیسا کہ فتح مکہ کے وقت ہوا۔ میں نے اسکی مثال بھی دی تھی کہ عرب کے بڑے بڑے سرداروں کے بیٹے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے وہاں اُن کی موجودگی میں پے در پے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے غلام صحابہؓ حضرت عمرؓ کے ملنے کے لئے آئے۔ جب بھی کوئی صحابی آتا جو کسی وقت اُن کا یا اُن کے باپ دادا کا غلام رہ چکا تھا اور وہ لوگ اُس سے کئی قسم کے مشقت طلب کام لیا کرتے تھے۔ تو حضرت عمرؓ اُن رؤسا مکہ سے کہتے اِن کے لئے جگہ چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ وہ ہٹتے ہٹتے جوتیوں میں جا پہنچے اور پھر ناراض ہو کر وہاں سے اُٹھے اور باہر آکر انہوں نے آپس میں کہا کہ آج ہماری کیسی ذلت ہوئی ہے ایک نوجوان جو اُن میں سے زیادہ سمجھدار تھا کہنے لگا کہ یہ کس وجہ سے ذلت ہوئی ہے آخر ہمارے باپ دادا کے کاموں کی وجہ سے ہی ہوئی ہے اگر ہمارے باپ دادا مخالفت نہ کرتے اور یہ لوگ اسلام کے لئے قربانیاں نہ کرتے تو ان کو عزت کس طرح ملتی اور ہمیں یہ ذلت کا دن آج کیوں دیکھنا پڑتا۔ یہی مضمون سورۃ انعام میں بیان کیا گیا ہے کہ اُس وقت لوگ کہیں گے کہ کاش ہم مخالفت نہ کرتے مگر اُس وقت اس افسوس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

قرآنی تحدی کا مقابلہ کہنے والوں کا تعدیہ

سورۃ انفال میں پیشگوئیوں کا ذکر نہیں بلکہ تعلیمات کا مقابلہ ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ یہ تو پہلی کتب کی نقل ہے چاہیں تو ہم بھی ایسا کہہ سکتے ہیں۔

سورۃ نحل میں بھی یہی مضمون ہے کہ گزشتہ لوگوں کی باتوں کی نقل کرتے ہیں کیونکہ وہاں مضمون یہ آتا ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اللہ تعالیٰ اُن کی توجہ اس طرف پھیرتا ہے کہ یہ نقل ہی سہی مگر محمد رسول اللہؐ اچھوں کی نقل کرتا ہے اور تم بُروں کی نقل کر رہے ہو کیونکہ آگے فرماتا ہے قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ۔ ایسی باتیں پہلے لوگ بھی کرتے چلے آئے ہیں۔ گویا فرماتا ہے بیشک تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہہ دو کہ وہ موسیٰؑ کی نقل کرتا ہے یا ابراہیمؑ کی نقل کرتا ہے یا کسی اور نبی کی نقل کرتا ہے بہرحال اس سے یہ ثابت ہوگا کہ وہ موسیٰؑ یا ابراہیمؑ کی نقل کر رہا ہے مگر تم اپنے اعمال کو دیکھو تم وہ کچھ کر رہے ہو جو فرعون نے کیا تھا یا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے دشمنوں نے کیا تھا یا نوحؑ کے دشمنوں نے کیا تھا۔ سو جس طرح پہلوں نے مخالفت کرکے نقصان اُٹھایا تھا تم بھی اُن کی نقل کرکے نقصان اُٹھاؤ گے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر الزام تو ان لوگوں کی نقل کا ہے جو مقبولان بارگاہِ الٰہی تھے۔ یا جگہ قیامت کا بھی ذکر ہے اور ساتھ ہی توحید کی تعلیم کا بھی۔ اور بتایا گیا ہے کہ توحید اور قیامت کے متعلق محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو تعلیم دیتے ہیں تم اُسے بیشک نقل کہہ لو مگر بہر حال یہ وُہی

تعلیم ہے جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ نے دی تم اِس تعلیم کی مخالفت کرتے ہو اس لئے تمہاری مثال وہی ہے جو فریسیوں اور فقیہوں اور نمرود اور شداد وغیرہ کی تھی نقل کرنیوالا آخر اُس کے ساتھ ہی رہیگا جس کی وہ نقل کرتا ہے پھر تمہیں خوشی کس بات کی ہے۔

سورہ مومنون سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہاں قیامتِ اُخروی کا ذکر ہے۔ کافر کہتے ہیں کہ قیامت کا ذکر پہلے لوگ بھی کرتے چلے آئے ہیں مگر ابتک آئی نہیں۔ جب پہلے لوگ بھی اس کا ذکر کرتے رہے اور اُنکے کہنے سے آئی نہیں تو تمہارے کہنے سے قیامت کس طرح آجائے گی۔ اللہ تعالیٰ اِس کا جواب دیتا ہے کہ خدا قدرتوں والا ہے۔ یہ سوال کہ قیامت نہیں آئی اس کے دو ہی معنے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا قیامت نہیں لا سکتا دوسرے یہ کہ قیامت اب تک کیوں نہیں آئی۔ فرماتا ہے خدا کے فعل تمہارے سامنے ہیں اُن کو دیکھکر تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قیامت نہیں آسکتی۔ باقی رہا یہ کہ وہ نہیں آئی سو جب آئے گی آجائے گی یہ کیا سوال ہے کہ وہ اب تک نہیں آئی اپنے وقت پر یہ بات پوری ہو جائے گی۔

سورہ مومنون کی اِس آیت سے قیامت کے وعدے کا بھی ثبوت ملتا ہے اور وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ صرف اِس دُنیا کی قیامت کا ذکر قرآن کریم میں ہے اُن کی بھی تردید ہوتی ہے کیونکہ اِس دُنیا کی قیامت کا وعدہ قرآن کریم میں تھا۔ مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔ گویا وہ اپنے آباء کا بھی ذکر کرتے ہیں جس سے دوسری قیامت ہی مراد ہو سکتی ہے۔ قرآن کریم یہ نہیں کہتا کہ بعث بعد الموت کا کوئی وعدہ نہ تھا تم غلط کہتے ہو یا قیامتِ کُبریٰ کا کوئی وعدہ نہ تھا تم غلط کہتے ہو۔ بلکہ وہ اُن کے اعتراض کو اِس جہت سے تسلیم کرتا ہے کہ ایسا وعدہ تھا اور دوسری جہت سے اِس کی تردید کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں یہ بات ہے اور خدا بڑی قدرتوں والا ہے۔ پس اپنے وقت پر جا کر یہ بات پوری ہو جائے گی۔

سورہ فرقان کی آیتوں سے ظاہر ہے کہ وہاں تعلیمات کا ذکر ہے اور الزام یہ لگایا گیا ہے کہ پُرانی تعلیمات کو نقل کر کے پیش کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کا جواب یہ دیا ہے کہ اِس تعلیم میں جو قرآن کریم پیش کرتا ہے رازِ کائنات اور رازِ فطرت مخفی ہیں۔ اسرارِ آسمانی اور اسرارِ زمینی دونوں کو اِس میں کھول دیا گیا ہے یعنی خدا کا معاملہ جو بندوں سے ہوتا ہے اور بندوں کا معاملہ جو خدا سے ہوتا ہے اُس پر پُوری تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف مواقع پر بندے جس فطرت کا اظہار کرتے ہیں اُس کا اِس تعلیم میں اظہار ہے۔ پھر جس تعلیم میں تمام قسم کی فطرتوں کے راز بیان ہیں خواہ وہ عرب میں ہوں یا ہندوستان میں ہوں۔ یا امریکہ میں ہوں یا یورپ میں ہوں۔ اور ہر قسم کی فطری ضروریات کا سامان اُس میں موجود ہے۔ اُدھر خدا تعالیٰ کے تمام قسم کے سلوک جو بندوں سے ہوتے ہیں چاہے وہ پہلے ہوئے ہیں یا نہیں اُن سب کو اس میں بیان کیا گیا ہے تو تم ان میں سے کس کس تعلیم کو نقل قرار دو گے۔ اور کونسی سابق تعلیم ایسی ہے جس میں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں۔ پہلی کتابیں وہ تھیں جن کا دائرہ ہدایت بہت محدود تھا۔ وہ محدود الزمان اور محدود الاوقات تعلیمات تھیں اور پھر صرف ایک ایک علاقہ کیلئے تھیں ساری دُنیا کے لئے نہیں تھیں۔ اِسی لئے اِن کتب میں ہر فطرت کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ تورات میں صرف یہودی قوم کو مدنظر رکھا گیا ہے باقی قوموں کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ اِسی طرح سارے زمانوں کو مدنظر نہیں رکھا گیا مگر قرآن وہ کتاب ہے جو ساری قوموں اور سارے زمانوں کے لئے ہے۔ وہ یہودیوں کے لئے بھی ہے۔ وہ عیسائیوں کیلئے بھی ہے وہ مسلمانوں کے لئے بھی ہے وہ ہندوؤں کے لئے بھی ہے۔ وہ یورپین لوگوں کیلئے بھی ہے۔ وہ چینیوں کیلئے بھی ہے۔ وہ جاپانیوں کیلئے بھی ہے۔ وہ وحشیوں کے لئے بھی ہے اور غیر وحشیوں کے لئے بھی ہے۔ غرض کوئی قوم ایسی نہیں جس کی ہدایت کے لئے قرآن نہ آیا ہو اور کوئی زمانہ ایسا نہیں جس میں قرآن کی ضرورت سے انکار کیا جا سکتا ہو اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نہایت جامع ہدایات نازل فرمائی ہیں جو ہر فطرت کے مطابقِ حال ہیں اور ہر زمانہ میں اُن پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ جب قرآن کریم کی یہ شان ہے تو یہ لوگ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ یہ قرآن پہلی کتابوں کی نقل ہے۔

سورۂ نمل میں فرمایا ہے وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ اِس آیت میں اُس طرح کا مضمون بیان ہوا ہے جس طرح سورۂ مومنون میں بیان کیا گیا تھا وہاں بھی فرمایا گیا تھا کہ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ پس جو مضمون سورۂ مومنون میں بیان کیا گیا تھا وہی ایک ادنیٰ تغیر سے سورۂ نمل میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اُن کے اعتراض کو ردّ نہیں کیا بلکہ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ (نمل ع) کہہ کر وہی جواب دیا گیا ہے جو سورۂ مومنون میں دیا تھا۔ اور اعتراض کو صحیح تسلیم کرکے اس کا ردّ بتایا ہے کہ یومِ آخر لازم ملزوم ہے دُنیوی قیامت سے۔ جب یہ ہو گئی تو سمجھو کہ وہ بھی ضرور ہوگی۔

ساتویں آیت سورۂ احقاف کی ہے اُس میں آتا ہے۔ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔ مگر اس سے پہلے ہے وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدَانِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ۔ اِس جگہ پر بھی قیامتِ کبریٰ کا ذکر ہے اور اس کا انکار کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ پہلے لوگوں نے بھی کہہ دیا تھا کہ قیامت آئے گی قیامت آئے گی اور اب تم نے بھی اُس ذکر کو دُہرا دیا۔

آٹھویں آیت سورۂ ن والقلم کی ہے۔ اِس میں کفار کی طرف سے پیشگوئیوں کا انکار کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ گذشتہ نبیوں کے ذکر سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر ہمیں ڈرایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اِس کا جواب یہ دیتا ہے کہ جب عملاً تم پر عذاب آجائے گا پھر تو نہ کہو گے کہ یہ صرف گذشتہ نبیوں کے واقعات سے ہمیں ڈراتا ہے پھر تو تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ یہ پیشگوئیاں ہیں یعنی جب یہ پیشگوئیاں ہیں تو نقل کس طرح ہو گئیں۔ جب تمہاری ناک پر نشانِ ذلت لگیگا تم پر آسمان سے عذاب نازل ہوگا۔ تم دُنیا میں بالکل ذلیل اور حقیر ہو جاؤ گے اور اسلام ترقی کر جائے گا تب تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ گذشتہ لوگوں کی کہانیاں ہیں یا پیشگوئیاں ہیں۔

نویں آیت یہی سورۂ تطفیف کی آیت ہے جو اِس وقت زیر بحث ہے۔ اِس میں تینوں باتوں کا ذکر ہے تعلیمات کا بھی اور بعثِ قریب اور بعثِ بعید کا بھی۔ کہ ان کو یہ لوگ غلط قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پُرانی تعلیمات ہیں یا پُرانی حکایات ہیں یا پُرانے لوگوں نے بھی اِسی طرح ڈرایا تھا مگر ہوا اِس طرح نہیں۔ فرماتا ہے یہ دونوں امور پُورے ہو کر رہیں گے۔ بعثِ قریب بھی اور بعثِ بعید بھی اور اُن کا نقل کا الزام بھی درست نہیں ہے کیونکہ نقال تو یہ بھی ہیں چنانچہ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ کہکر اس بات کو واضح کیا ہے کہ جو پہلے انبیاء کے دُشمنوں کے حالات ہیں وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے کفار سے ملاؤ تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہی کے حالات لکھے ہوئے ہیں۔ پس فجار جو کچھ کر رہے ہیں وہ پہلے کفار کی کتابوں میں رل جائیں گے۔ اس لیے نقل تو وہ بھی کرتے ہیں مگر سجّین کی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی بے شک نقل کرتے ہیں مگر علّیّین کی۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اعمال پر اگر تم غور کرو تو وہ تمہیں موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور نوحؑ اور دوسرے انبیاء میں نظر آجائیں گے اور یہ سیدھی بات ہے کہ نیک نیک کی نقل کرے گا اور بُرا بُرے کے پیچھے چلیگا۔ پس یہ الزام بے حقیقت ہے اس میں گویا یوں جواب دیا کہ نقل کرنا بھی تو آسان کام نہیں۔ آخر وجہ کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تو موسیٰؑ کی نقل کر لی عیسیٰؑ کی نقل کر لی۔ ابراہیمؑ کی نقل کر لی۔ نوحؑ کی نقل کر لی مگر تم نے نہ کی؟ آخر تم جو کہتے ہو کہ اُس نے نقل کر لی نقل کر لی۔ تم بھی نقل کر لو۔ مگر تمہارا سجّین والوں کی نقل کرنا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا علّیّین والوں کی نقل کرنا

یہ خود اپنی ذات میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک خوبی کا ثبوت ہے الزام کی بات نہیں۔ اِس سوال کا ایک اور جواب سورۂ فرقان میں آچکا ہے۔

اُوپر کے جوابات سے ظاہر ہے کہ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کفار نے تین مواقع پر کہا ہے۔ ایک انکارِ قیامت کے موقع پر یعنی جب بھی قیامت کا ذکر کیا جاتا وہ کہتے تھے کہ پہلے لوگ بھی ایسا ڈراوا جھوٹے طور پر دیتے رہے ہیں اور تم بھی یہ ڈراوا جھوٹے طور پر دے رہے ہو۔ پہلوں کی بات بھی جھوٹی نکلی اور تمہاری بات بھی جھوٹی ہے اب تک تو قیامت آئی نہیں۔ اِس موقعہ پر کفار پہلوں کو بھی جھوٹا کہتے تھے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی جھوٹا کہتے تھے کہ نہ پہلوں کی بات پوری ہوئی اور نہ تمہاری بات پوری ہوگی۔

دوسرا موقعہ جب کفار اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہکر الزام لگایا کرتے تھے وہ ہوتا تھا جب بعثتِ قریب کا اُنکے سامنے ذکر کیا جاتا جب اسلام کی ترقی اور اُسکے غلبہ کا ذکر کیا جاتا اور کُفر کی تباہی کی پیشگوئیاں کی جاتیں تو اِس موقعہ پر بھی وہ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہدیا کرتے تھے۔ مگر اِس موقعہ پر وہ پہلوں کو جھوٹا نہیں قرار دیتے تھے بلکہ یہ کہتے تھے کہ پہلے راستبازوں کی زندگی کی مثالیں تم اپنے اُوپر چسپاں کر لیتے ہو اور اِس طرح لوگوں کو مرعوب کرتے ہو حالانکہ تم سے وہ معاملہ نہ ہوگا کیونکہ وہ سچے تھے اور تم نعوذ باللہ جھوٹے ہو۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آج کل غیر احمدیوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ تم مرزا صاحب کی صداقت ثابت کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام کیوں لیتے ہو یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثالیں کیوں پیش کرتے ہو اُن کا اور تمہارا آپس میں جوڑ ہی کیا ہے کہ تم پہلے راستبازوں کی مثالیں دینی شروع کر دیتے ہو اور کہتے ہو کہ موسیٰؑ نے بھی یوں کیا اور عیسےٰؑ نے بھی یوں کیا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی یوں کیا۔ یہی طریق رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے مخالفین کا تھا۔ وہ بھی کہتے کہ تم تو لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے پہلے مقدس لوگوں کی زندگی کی مثالیں اپنے اُوپر چسپاں کر لیتے ہو حالانکہ تم سے وہ معاملہ نہیں ہوگا۔ وہ سچے تھے اور تم نعوذ باللہ جھوٹے ہو۔

تیسرا موقعہ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہکر الزام لگانے کا یہ ہوتا تھا کہ کفار اسلام کی تعلیم کی مشابہت پہلے نبیوں کی تعلیم سے دیکھ کر کہدیا کرتے تھے کہ یہ تو پہلے لوگوں کی باتوں کی نقلیں ہیں مثلاً قرآن کو دیکھا کہ اُس میں ایک تعلیم دی گئی ہے اور پھر وہی تعلیم اُنہیں موسیٰؑ یا عیسےٰؑ کی کتاب میں نظر آجاتی ہے تو کہتے ہیں کہ پہلے بزرگوں کی تعلیمات کو تم نقل کر کے پیش کر دیتے ہو تمہاری اِس میں کیا خوبی ہے۔ گویا تعلیمات کی خوبی وہ تسلیم کرتے تھے اِن تعلیمات کے پیش کرنے والوں کی بزرگی کو بھی وہ تسلیم کرتے تھے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کا انکار کرتے تھے محض اِس لئے کہ نقل سے کسی کی برتری ثابت نہیں ہوتی۔ اگر تم نے موسیٰؑ کی تعلیم کی نقل کر لی ہے یا عیسےٰؑ کی تعلیم کی نقل کر لی ہے تو یہ کس طرح ثابت ہوگیا کہ تم اپنے دعویٰ میں سچے بھی ہو۔ غرض اِن تین مواقع پر الگ الگ اعتراض ہیں اور الگ الگ معنوں میں کفار نے اِس دلیل سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے کبھی وہ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کے یہ معنے لیتے تھے کہ یہ پہلوں کی نقل کی ہوئی حکایتیں ہیں کبھی کہتے کہ یہ پہلوں کے متعلق بے جوڑ باتیں ہیں یونہی ان انبیاء کے واقعات اپنے اُوپر چسپاں کرنا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ نہ کوئی تعلق ہوتا ہے نہ جوڑ ہوتا ہے نہ واسطہ ہوتا ہے۔ پھر کبھی اِن معنوں میں وہ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہا کرتے کہ یہ پہلوں کی لکھی ہوئی باتیں ہیں۔ یعنی جو تعلیمیں پیش کی جارہی ہیں وہ وہی ہیں جو موسےٰؑ یا عیسےٰؑ یا اور انبیاء نے دیں کوئی نئی تعلیم اُن میں نہیں ہے۔

جب انکارِ قیامت کے موقعہ پر وہ ایسا کہتے تھے تو اُن کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ پہلے لوگوں نے بھی ویسے قصّے بنا لئے تھے اب تم نے بھی ویسی باتیں کہنی شروع کر دی ہیں نہ پہلے لوگوں کے کہنے کے بعد قیامت آئی اور نہ اب قیامت آسکتی ہے۔ وہ بھی جھوٹا ڈراوا دیتے رہے اور تم بھی جھوٹا ڈراوا دے رہے ہو۔ گویا وہ بھی جھوٹے اور تم بھی جھوٹے۔

جب وہ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کا الزام اِس طور پر لگایا کرتے

تھے کہ پہلے لوگوں کے متعلق بے جوڑ باتیں کہی جاتی ہیں تو انکا مطلب یہ ہوتا تھا کہ یہ باتیں تو سچی ہیں اور پہلے راستباز بھی سچے تھے مگر تم یونہی اُن باتوں کو اپنے اُوپر چسپاں کرنے لگ گئے ہو حالانکہ وہ سچے تھے اور تم جھوٹے ہو۔

تیسرے اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ کا الزام وہ اِن معنوں میں لگایا کرتے تھے کہ پہلے بزرگوں کی تعلیمات کو نقل کرکے پیش کر دیا جاتا ہے اِس میں تمہاری کیا خوبی ہے۔

غرض کفار کے یہ تین اعتراض اساطیر کے تین معنوں کے مطابق ہیں اور قرآن کریم نے بھی اُن کے الگ الگ جواب دیئے ہیں۔ اس جگہ چونکہ تعلیمات کا بھی ذکر تھا اور بعث بعد الموت کا بھی اور بعثِ قومی کا بھی اس لئے یہاں جو جواب دیا گیا ہے وہ اِن تینوں مضمونوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ بعثِ قریب کا جو انکار تھا اُس کے متعلق فرماتا ہے کہ اقوامِ مغرب جو سمجھتی ہیں کہ ان کو کوئی تنزل نہیں آئیگا آخر یہی دُنیا میں گر جائیں گی، ذلیل ہونگی اور اسلام اُن کی جگہ لے لیگا اور یہ ثبوت ہوگا بعثِ بعد الموت کے قائم ہونیکا گویا اِس ایک بعث سے دوسرے بعث کا ثبوت مل جائیگا۔

تیسری بات یہ تھی کہ یہ لوگ اسلام پر نقل کا الزام لگاتے تھے اس کا جواب یہ دیا کہ اِنَّ کِتَابَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ محمد رسول اللہؐ بیشک نقل کرتا ہے مگر جب بھی کرتا ہے موسٰےؑ اور عیسٰیؑ کی ہی کرتا ہے۔ یہ مان لو کہ وہ نقل کرتا ہے مگر آخر یہ کیا بات ہے کہ وہ جب بھی نقل کرتا ہے موسٰیؑ اور عیسٰیؑ اور دوسرے انبیاءؑ کی ہی کرتا ہے اور تم جب بھی نقل کرتے ہو فرعون اور اسکے ساتھیوں کی ہی کرتے ہو۔ پھر تمہارے مُنہ پر یہ زیب کس طرح دیتا ہے کہ تم کہتے ہو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جھوٹے ہیں آخر بات کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ جب بھی پڑتا ہے موسٰیؑ کے ہاتھ پر پڑتا ہے اور تمہارا ہاتھ جب بھی پڑتا ہے فرعون پر پڑتا ہے۔ وہ نبیوں کی تعلیمات پر چلتا ہے اور تم اُن نبیوں کی تعلیمات سے دُور بھاگتے اور شیاطین کے پیچھے جاتے ہو آخر کوئی مشابہت صحیح ہی ہے جو دونوں میں کام کر رہی ہے۔ اگر دونوں کی باتیں علیّین کے ہمرنگ ہوتیں اور کفار بھی انبیاء کی سی باتیں کہتے تو معاملہ مشتبہ ہو جاتا کہ دونوں میں سے کون سچا ہے کیونکہ وہ بھی موسٰیؑ کی بات کہتے اور یہ بھی موسٰیؑ کی بات کہتا وہ بھی عیسٰیؑ کی بات کہتے اور یہ بھی عیسٰیؑ کی بات کہتا۔ اُن کے اعمال بھی موسٰیؑ کی طرح کے ہوتے اور اُس کے اعمال بھی موسٰیؑ کی طرح کے ہوتے۔ اُن کے اعمال بھی عیسٰیؑ کی طرح کے ہوتے اور اُس کے اعمال بھی عیسٰیؑ کی طرح کے ہوتے۔ مگر یہاں تو ایک بیّن فرق اور نمایاں امتیاز نظر آتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال موسٰیؑ سے ملتے ہیں اور تمہارے اقوال اور تمہارے اعمال فرعون سے ملتے ہیں۔ یہ ابرار کے قدم پر چلتا ہے اور تم فجّار کے قدم پر چلتے ہو اور خود اپنے نبیوں کے خلاف تعلیمات دیتے ہو یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبیوں کے نقشِ قدم پر ہے اور تم اُس کے دشمنوں کے قدم پر ہو۔ پس نقل کا الزام بالکل غلط ہے یہ نقل نہیں بلکہ مشابہت ہے اور مشابہت بھی علیّین کی۔ اس لئے یہ مشابہت اسکی سچائی کی علامت ہے۔

اِس جگہ پر یہ بھی یاد رکھنے والی بات ہے کہ جہاں کفارِ مکہ نے اساطیر الاوّلین کا الزام قرآن کریم پر لگایا تھا وہاں آج تیرہ سَو سال کے بعد یوروپین لوگوں نے بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر یہی الزام لگایا ہے! وسپادری ٹسڈل نے "ماخذ قرآن" لکھ کر ثابت کیا ہے کہ قرآن دوسری کتابوں سے نقل کیا گیا ہے۔

سورہ تطفیف میں چونکہ یوروپین قوموں کا ذکر ہے اسلئے یہ بھی ایک مشابہت ہے جو یوروپین لوگوں کی کفارِ مکہ سے ہے۔ کہ جو باتیں کفارِ مکہ نے کہی تھیں وہی اُنہوں نے کہنی شروع کر دیں اور اُن سے بھی خدا تعالےٰ نے ایسی کتابیں لکھوا دیں جن میں وہی اعتراض دُہرایا گیا ہے جو کفارِ مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا کرتے تھے۔

گویا اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ میں یہ پیشگوئی مخفی تھی کہ آئندہ زمانہ میں جب عیسائی غالب آجائینگے یہی الزام اسلام اور قرآن پر عائد کریں گے۔ چنانچہ "ماخذ قرآن" میں خصوصیت سے اِسی موضوع پر بحث کی گئی ہے کہ قرآن دوسری

# كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

ہرگز (ایسا) نہیں (جو وہ کہتے ہیں) بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) اُن کے دلوں پر اُس نے جو وہ کما چکے ہیں - زنگ لگا دیا ہے - ۱۱؎

کتابوں کی نقل ہے - اسی طرح اور بھی کئی کتابیں عیسائیوں کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں جن میں قرآن کریم پر یہی الزام لگایا گیا ہے -

الغرض فرماتا ہے اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ - یعنی جب اُن کے سامنے ہماری باتیں پیش کی جائیں گی تو وہ کہیں گے کہ یہ اساطیر الاوّلین ہیں یعنی یہ لوگ جو مکذّب بالدّین ہیں جب اُن کے سامنے قرآن کریم کی تعلیم پیش کی جائے گی تو وہ کہیں گے کہ یہ کیا کتاب ہے اِس میں کچھ باتیں ویدسے نقل کی گئی ہیں - کچھ توراۃ سے نقل کی گئی ہیں - کچھ انجیل سے نقل کی گئی ہیں - کچھ ژند واوستا سے نقل کی گئی ہیں - اس کا جواب اللہ تعالےٰ نے اگلی آیت میں دیا ہے - لیکن اگر کوئی غور کرنے والا ہو تو یہی جواب کتنا واضح ہے کہ تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر کیا الزام لگاتے ہو - محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو وہ ہیں جنہوں نے پہلے سے تمہاری نسبت یہ خبر دے رکھی تھی کہ تم ایک زمانہ میں ایسا الزام لگاؤ گے - پس یہ الزام اُن کو جھوٹا ثابت کرنیوالا نہیں بلکہ اُن کی صداقت کو اور بھی واضح کرنیوالا ہے -

كَلَّا

۱۱؎ **حل لغات** - كَلَّا : مَعْنَاهُ الرَّدْعُ وَالزَّجْرُ یعنی کَلَّا کے معنے زجر کے بھی ہوتے ہیں اور دھتکارنے کے بھی ہوتے ہیں - اُردو میں اِس کا ترجمہ کیا جائے تو یہ ہوگا کہ بس بس رہنے دو ! یا اِس کا ترجمہ ہوگا ہوش سے بات کرو -

بَلْ کا عربی زبان میں دو معنوں کیلئے استعمال -

کلیات ابی البقاء میں لکھا ہے وَقَدْ تَجِيْءُ بَعْدَ الطَّلَبِ لِنَفْيِ اِجَابَةِ الطَّالِبِ - یہ کسی مطالبہ کے جواب میں آیا کرتا ہے یہ جتانے کے لئے کہ مطالبہ کرنے والے کی بات ہم ماننے کے لئے تیار نہیں یعنی کبھی کبھی کَلَّا کا لفظ اِن معنوں میں استعمال ہوتا ہے - یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ استعمال اُس وقت ہوتا ہے جبکہ مثلاً کسی نے تجھے کہا کہ اس اس طرح کام کرو - اور تم آگے سے جواب دو کہ كَلَّا اَیْ لَا يُجَابُ لِذٰلِكَ - یہ بات ایسی نہیں جسے کوئی مان سکے - اور کبھی یہ بمعنے حَقًّا بھی استعمال ہوتا ہے جیسے آتا ہے كَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى (اقرب) یعنی سچی بات یہ ہے کہ انسان تو سرکشی کرتا ہے -

رَانَ : رَانَ الشَّيْءُ فُلَانًا وَعَلَيْهِ وَبِهٖ (يَرِيْنُ رَيْنًا وَرُيُوْنًا) کے معنے ہوتے ہیں غَلَبَ عَلَيْهِ (اقرب) گویا لفظ رَیْن تین طرح استعمال ہوتا ہے - یہ بھی کہتے ہیں کہ رَانَ الشَّيْءُ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ رَانَ عَلَى الشَّيْءِ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ رَانَ بِهٖ اور ان تینوں صورتوں میں اسکے معنے ہوں گے - اس پر غالب آگیا - نیز کہتے ہیں رَانَتِ النَّفْسُ - جس کے معنے ہوتے ہیں خَبُثَتْ وَغَثَتْ نفس گندہ ہوگیا یا فریب میں مبتلا کر دیا گیا - (اقرب) اَلرَّيْنُ کے معنے ہوتے ہیں صَدَأٌ يَعْلُوا الشَّيْءَ الْجَلِيَّ - وہ زنگ جو کسی چیز پر لگ جاتا ہے (مفردات) پس رَانَ کے معنے ہوں گے - زنگ لگ گیا -

**تفسیر** - فرماتا ہے - اے قرآن مجید کو اساطیر الاوّلین کہنے والو ! ہوش کی دوا کرو ! سنبھل کر بات کرو ! اِس بات کا احساس کرو کہ تم کس چیز کے متعلق الزام لگا رہے ہو ! -

بَلْ کا لفظ جو اِس آیت میں استعمال ہوا ہے یہ تدارک کے لئے آتا ہے اور اس کے دو معنے ہوتے ہیں -

اوّل - بَلْ کا لفظ ان معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے - کہ (الف) اس سے پہلے بیان کی تردید اور بعد میں بیان ہونیوالے مضمون کی تصدیق مقصود ہوتی ہے - اور (باء) کبھی بَلْ سے پہلے بیان کردہ مضمون کی تصدیق اور بعد میں بیان کردہ مضمون کی تردید مقصود ہوتی ہے - بَلْ سے پہلے بیان کردہ مضمون کی تردید اور بعد میں بیان کردہ مضمون کی تصدیق کی مثال یہی

سورۂ تطفیف کی آیت ہے۔ اس میں بَلْ سے پہلے جو مضمون بیان ہؤا ہے یعنی کفار کا الزام کہ قرآن کریم اساطیر الاولین ہے اس کی تردید کی گئی ہے اور بَلْ کے بعد جو مضمون بیان ہوا ہے ۔ یعنی رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۔ اس کی تصدیق کی گئی ہے اور دوسرے استعمال یعنی پہلے کی تصدیق اور دوسرے کی تردید کی مثال سورۂ صٓ کی یہ آیت ہے۔ صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ۝ بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝ (ص آیت ۱، ۲) یعنی قرآن کریم کا ذِی الذِّکْر ہونا تو سچا ہے مگر ان کا انکار جھوٹا ہے۔ اُن کے انکار کی یہ وجہ نہیں کہ قرآن کریم میں ذکر کی اہلیت نہیں بلکہ اُن کے انکار کی یہ وجہ ہے کہ یہ تکبر اور صداقت سے تنفر کی مرض میں مبتلا ہیں۔ دوسری مثال اس کی سورۂ قٓ کی آیت قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ کی ہے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے مجید ہونے میں شبہ نہیں لیکن اُن کا انکار اُن کی جہالت کی وجہ سے ہے اور وہ جہالت یہ ہے کہ یہ اپنے میں سے ایک مُنذر کے آنے پر متعجب ہیں اور اصل کلام پر غور ہی نہیں کرتے۔

دوم ۔ دوسری قسم بَلْ کی یہ ہوتی ہے کہ وہ نہ پہلے مضمون کی تردید کرتا ہے نہ دوسرے کی بلکہ بغیر پہلے مضمون کی تردید کرنے کے وہ بَلْ کے بعد ایک زائد صداقت بتاتا ہے۔ جیسے سورۂ انبیاء ع میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۔ اس میں ہر بَلْ پہلے کی بھی تصحیح کرتا ہے اور بعد کی بھی مثلاً پہلے بَلْ کے بعد ہے قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ اس سے پہلے قرآن کریم میں کفار کا یہ اعتراض مذکور ہوا ہے کہ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ کہ کیا تم سحر پر ایمان لاتے ہو ایسی حالت میں کہ تم اپنی آنکھوں سے اُس کو دیکھ رہے ہو۔ اس کے بعد فرماتا ہے بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ یہاں بَلْ کا لفظ لا کر اللہ تعالیٰ نے پہلے مضمون کی تردید نہیں کی۔ یہ نہیں کہا کہ وہ سحر کا الزام نہیں لگاتے بلکہ ایک مزید بات یہ کہی ہے کہ وہ قرآن پر صرف سحر کا الزام ہی نہیں لگاتے بلکہ ایک زائد الزام یہ بھی لگاتے ہیں کہ وہ پراگندہ خوابیں ہیں۔ اس کے بعد پھر بَلْ کو دُہرایا ہے اور اس کے ساتھ ایک اور الزام بھی بیان کیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ پراگندہ خوابوں کا ہی الزام نہیں لگاتے بلکہ اِفْتَرٰىهُ بھی کہتے ہیں یعنی نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے افتراء کر کے یہ کلام بنا لیا ہے۔ پھر بَلْ کا لفظ تیسری دفعہ دُہرایا ہے اور اس کے بعد ایک چوتھا الزام بیان کیا ہے کہ هُوَ شَاعِرٌ وہ چوتھا الزام یہ لگاتے ہیں کہ یہ تو شاعر ہے دل لبھانے والی باتیں کر کے نوجوانوں کو ورغلا لیتا ہے۔ گویا ہر دفعہ بَلْ لا کر پہلے مضمون کی تردید کئے بغیر اُس پر ایک زائد بات بتائی کہ وہ صرف ایک الزام نہیں لگاتے بلکہ یہ الزام بھی لگاتے ہیں اور وہ الزام بھی لگاتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے لَوْ یَعْلَمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا حِیْنَ لَا یَکُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ۝ بَلْ تَاْتِیْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ (الانبیاء ع۳) اس میں بھی بَلْ سے پہلے مضمون کی تصدیق کرتے ہوئے آگے ایک مزید بات بتائی ہے کہ علاوہ اس کے کہ عذاب اس قدر سخت ہوگا کہ وہ اُسے دُور نہیں کر سکیں گے۔ وہ ایسا اچانک آئے گا کہ دل دھڑک جائیں گے اور عقلیں ماری جائیں گی۔

اس سورۃ میں بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ میں لفظ بَلْ کا استعمال اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ کے الزام کی تردید کرنے کے لئے آیا ہے کہ قرآن کریم کے متعلق یہ الزام لگانا بالکل غلط ہے اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ خود جہالت میں مبتلا ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں پر رَین لگ گیا ہے۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے رَین کے معنے غالب آجانے اور زنگ لگ جانے کے ہی ہیں۔ فرّاء کہتے ہیں کَثُرَتْ مِنْهُمُ الْمَعَاصِیْ وَالذُّنُوْبُ فَاَحَاطَتْ بِقُلُوْبِهِمْ فَذَالِكَ الرَّیْنُ یعنی رین کا مفہوم یہ ہے کہ اُن کے گناہ یا اُن کی نافرمانیاں اتنی بڑھ گئیں کہ اُن گناہوں اور نافرمانیوں نے اُن کے دلوں کا احاطہ کر لیا اور اُن کی اصلاح ناممکن ہو گئی۔ حسن کہتے ہیں کہ

دلوں پر رین لگنے کی تشریح فراء کے نزدیک

هُوَ الذَّنْبُ عَلَى الذَّنْبِ حَتّٰى یَعْمَی الْقَلْبُ یعنی رَین کے معنے گناہ پر گناہ کئے جانے کے ہیں یہاں تک کہ دل اندھا ہو جائے۔ گویا فرّاء کے نزدیک قرآن کریم نے رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کے الفاظ اِن معنوں میں استعمال فرمائے ہیں کہ ان کے گندے اعمال نے اُن کے دلوں کا احاطہ کر لیا اور حسن بصری یہ کہتے ہیں کہ اُن کے بُرے اعمال کی وجہ سے یعنی اس وجہ سے کہ بار بار گناہوں کا عمل اُن سے صادر ہوا۔ اُن کے دل صداقت کو معلوم کرنے کی قوت سے محروم ہو گئے۔ ابوزید کہتے ہیں کہ یُقَالُ قَدْ رِیْنَ بِالرَّجُلِ رَیْنًا اِذَا وَقَعَ فِیْمَا لَا یَسْتَطِیْعُ الْخُرُوْجَ مِنْهُ وَلَا قِبَلَ لَهٗ بِهٖ یعنی قَدْ رِیْنَ بِالرَّجُلِ رَیْنًا ایک محاورہ ہے اور یہ محاورہ اُس وقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی شخص ایسے گند میں مبتلا ہو جائے کہ نہ اُس سے نکل سکے اور نہ اُس کا مقابلہ کر سکے۔

رین کے لفظ کا اُس وقت استعمال جب کوئی گندے اعمال میں پھنس جائے اور نکل نہ سکے۔

اس لحاظ سے رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کے معنے یہ ہوں گے۔ کہ اُن کے اعمالِ بد کی وجہ سے آخر وہ دن آگیا کہ اگر وہ چاہیں بھی کہ ہم بدی سے نکل جائیں تو وہ نہیں نکل سکتے تھے۔ ابو معاذ نحوی کہتے ہیں کہ اَلرَّیْنُ اَنْ یَّسْوَدَّ الْقَلْبُ مِنَ الذُّنُوْبِ وَالطَّبْعُ اَنْ یُّطْبَعَ عَلَى الْقَلْبِ وَهُوَ اَشَدُّ مِنَ الرَّیْنِ وَالْاِقْفَالُ اَشَدُّ مِنَ الطَّبْعِ یعنی رَین کے معنے گناہوں کی وجہ سے انسان کا دل سیاہ ہو جانے کے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں رَین کی جگہ طبع کا لفظ بھی آتا ہے اور طبع کے معنے یہ ہیں کہ اُن کے دلوں پر مُہر لگ گئی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں کفّار کے دلوں کے متعلق اقفال یعنی تالوں کا لفظ بھی آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ طبع کا لفظ رَین سے زیادہ سخت ہے اور اقفال کا لفظ طبع سے زیادہ سخت ہے لیکن میرے نزدیک یہ بات درست نہیں۔ یہ تینوں لفظ یعنی رَین طبع اور اقفال الگ الگ مضمون بیان کرنے کے لئے آتے ہیں۔ رَین اصل میں زنگ کو کہتے ہیں اور زنگ اس بات کا نام ہوتا ہے کہ جس چیز پر زنگ لگا ہے وہ اپنی ذات میں گھُلنی شروع ہو گئی ہے۔ زنگ اسی کو کہتے ہیں کہ کوئی باہر کی چیز اثر کر کے دوسری چیز میں تغیر پیدا کر دیتی ہے۔ لوہے کو زنگ لگتا ہے تو اس کا بھی یہی مطلب ہوتا ہے کہ باہر سے نمی پہنچی اور اُس کا آکسائڈ بننا شروع ہو گیا یا تانبہ COPPER کو زنگ لگتا ہے تو اس کا بھی یہی مطلب ہوتا ہے کہ اُس میں بیرونی اثرات کی وجہ سے تغیر پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ پس رَین کا لفظ اس مفہوم پر دلالت کرتا ہے کہ کسی چیز کے اندر تغیر پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے اور وہ اپنی ماہیت کو چھوڑ بیٹھی ہے۔ اس تغیر کا اظہار کرنے کے لئے رَین کا لفظ بولا جاتا ہے لیکن طبع کا لفظ اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُس نے دوسرے کے نقش کو قبول کر لیا کیونکہ طبع کے معنے مُہر کے ہوتے ہیں۔ پس جب ہم طبع کا لفظ بولتے ہیں تو ہمارا اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اُس نے دوسرے کے نقش کو قبول کر لیا۔ اس کے مقابلہ میں جب ہم اقفال کا لفظ بولتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب یہ چیز اپنے زور سے نہیں کھُل سکتی۔ خدا ہی اس کو کھولے تو یہ کھُل سکتی ہے۔ پس یہ تین قسم کی الگ الگ کیفیتیں ہیں جن کے لئے رَین طبع اور اقفال کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہاں رَین کا لفظ یہ بتانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے کہ اُن پر بیرونی گناہوں کا اِس قدر اثر ہوا ہے کہ قلب جو نیکی کا منبع تھا اُس کی ماہیت ہی بدل گئی ہے اور وہ اب بدی پر دلیر ہو گیا ہے لیکن طبع میں یہ بتایا گیا ہے کہ اُن کے دلوں پر گناہوں کا ٹھپّہ لگ گیا ہے یعنی وہ چوٹی کے گنہگار ہو گئے ہیں کیونکہ ٹھپّہ والی چیز معیاری چیز ہوتی ہے۔ اور اقفال کے لفظ نے یہ بتایا کہ اُن کی حالت ایسی ہو چکی ہے کہ اب اللہ تعالےٰ ہی اُن کے دلوں کے تالے کھولے تو وہ کھُلیں گے کوئی انسان اُنکو کھولنے کی طاقت نہیں رکھتا یعنی آپ اپنی اصلاح کرنی اُنکے اختیار سے باہر ہو گئی ہے۔

رین، طبع اور اقفال میں فرق۔

رَین کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی ایک حدیث مروی ہے جو یہ ہے عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اَذْنَبَ ذَنْبًا نُكِتَتْ فِیْ قَلْبِهٖ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فَاِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُهٗ وَاِنْ عَادَ زَادَتْ

حَتّٰی تَغْلُفَ قَلْبَهٗ فَذٰلِكَ الرَّيْنُ الَّذِيْ ذَكَرَهُ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ فِي الْقُرْاٰنِ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ احمد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ اور ابن جریر وغیرہ نے بتغیرِھا اس روایت کو بیان کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضؓ کہتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو نُكِتَتْ فِيْ قَلْبِهٖ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ۔ اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ ڈال دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ بدی کی رغبت اُس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے فَاِنْ تَابَ اگر وہ توبہ کرے وَنَزَعَ اور اپنے نفس کو پیچھے کھینچ لے وَاسْتَغْفَرَ اور استغفار کرے تو صُقِلَ قَلْبُهٗ اُس کا دل صاف ہو جاتا ہے وَاِنْ عَادَ اور اگر وہ پھر گناہ کرے تو زِيْدَتْ حَتّٰى تَغْلُفَ قَلْبَهٗ یہ سیاہی بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک دن اُس کے دل کو بالکل ڈھانپ لیتی ہے اس کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا فَذٰلِكَ الرَّيْنُ الَّذِيْ ذَكَرَهُ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ فِي الْقُرْاٰنِ۔ یعنی اسی حالت کی طرف قرآن کریم نے رین کے لفظ سے اشارہ فرمایا ہے

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے ایک زبردست نفسیاتی و اخلاقی نکتہ بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر عمل اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ ہر عمل کا اثر وہی نہیں جو اُس عمل کے ساتھ متعلق ہے بلکہ اس کے علاوہ اُس کا اثر انسان کے اخلاق اور اُس کی عقل اور اُس کے علم کے آئندہ ظہور پر بھی پڑتا ہے۔ ایک شخص جھوٹ بولتا ہے تو جھوٹ سے تعلق رکھنے والا جو اثر ہے وہ یہ ہے کہ اوّل وہ دوسروں میں بدنام ہو جاتا ہے اس کا اعتبار جاتا رہتا ہے۔ خدا تعالےٰ کی نافرمانی کی وجہ سے عاجل یا آجل عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ جس کے خلاف جھوٹ بولا جاتا ہے وہ اس کا دشمن ہو کر اُس کے نقصان کے درپے ہو جاتا ہے پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض راستباز دوست اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ تم جھوٹے آدمی ہو ہم تمہارے ساتھ دوستی نہیں رکھ سکتے یہ تو اُس جھوٹ کے طبعی اور منفرد اثرات ہیں مگر ان کے علاوہ ہر گناہ کا ایک اور اثر بھی ہوتا ہے جو انسان کے دماغ اور اُس کے دل پر پڑتا ہے۔ مثلاً میں نے جھوٹ کی مثال دی تھی۔ جب کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو اُس کے دماغ اور دل پر اس کا پہلا اثر یہ پڑتا ہے کہ جھوٹ سے نفرت کم ہو جاتی ہے اور آئندہ جھوٹ بولنا اُس کے لئے آسان ہو جاتا ہے یہی حال اور گناہوں کا ہے۔ پہلی دفعہ چوری کرتے ہوئے یا پہلی دفعہ جھگڑا کرتے ہوئے یا پہلی دفعہ گالیاں دیتے ہوئے یا پہلی دفعہ فساد کرتے ہوئے یا پہلی دفعہ قتل کرتے ہوئے انسان ڈرتا ہے کہ اگر میں نے ایسا کیا تو کہیں پکڑا نہ جاؤں یا لوگوں میں بدنام نہ ہو جاؤں مگر جب ایک دفعہ وہ ایسا فعل کر لیتا ہے تو اُس کے دماغ پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ نہ صرف بدی کی نفرت اُس کے دل سے کم ہو جاتی ہے بلکہ دوسری دفعہ جھوٹ بولنا یا دوسری دفعہ چوری کرنا یا دوسری دفعہ گالیاں دینا اور فساد کرنا اُس کے لئے آسان ہو جاتا ہے اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ان افعال کو کرنا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرا اثر انسان کے دماغ اور اُس کے دل پر یہ پڑتا ہے کہ بوجہ ایک بدی کے ارتکاب کے دوسری بدیوں سے بھی اُس کی نفرت کم ہو جاتی ہے جو شخص چوری کرتا ہے اُس کے لئے اور جرائم کا ارتکاب نسبتاً آسان ہو جاتا ہے کیونکہ چوری کا فعل خدا تعالیٰ کی نافرمانی کا احساس کم کر دیتا ہے۔ یہی حال جھوٹ اور دوسرے گناہوں کا ہے ہر گناہ اپنی ذات میں بھی بُرا ہوتا ہے لیکن ہر گناہ کا ایک خارجی اثر یہ ہوتا ہے کہ اور گناہوں سے نفرت کم ہو جاتی ہے اور خدا تعالےٰ کی نافرمانی میں انسان بڑھتا چلا جاتا ہے۔

بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ میں ایک نفسیاتی نکتہ

تیسرا اثر اس کا یہ پڑتا ہے کہ بوجہ خود ارتکاب بدی کے انسان دوسروں پر بھی بدظنی کرنے لگ جاتا ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ جب میں نے یہ فعل کیا ہے تو دوسرے بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے۔ ایک شخص سچ بول رہا ہوتا ہے مگر وہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں سچ کون بولتا ہے یہ بھی جھوٹ ہی بول رہا ہے اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ خود جھوٹ بولنے کا عادی ہوتا ہے۔ اس طرح وہ صداقت کے معلوم کرنے سے محروم ہو جاتا ہے اور

كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ۝

یوں نہیں (جس طرح وہ کہتے ہیں بلکہ) اُس دن وہ یقیناً اپنے رب کے سامنے آنے سے روکے جائیں گے۔

ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ۝ ثُمَّ يُقَالُ هَٰذَا

پھر وہ ضرور جہنّم میں داخل ہوں گے۔ پھر اُن سے کہا جائے گا یہی تو

الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝

وہ (انجام) ہے جس کا تم انکار کیا کرتے تھے ؎۱۲

بجائے سچ سے فائدہ اٹھانے کے غلط محرکات دوسروں کے افعال کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ سچائی اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے مگر وہ اس پر غور کرنے کی بجائے اس کو رد کر دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جس طرح میں جھوٹ بول رہا ہوں اسی طرح یہ بھی جھوٹ بول رہا ہے جس طرح میں فریب سے کام لیتا ہوں اسی طرح فلاں بھی فریب کرتا ہے۔

جھوٹ بولنے کے چار اثر

چوتھا اثر اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ گناہوں کے نتیجہ میں صادقوں کی معیت سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ اُس کے نزدیک کوئی صادق ہوتا ہی نہیں۔ سب لوگوں کو وہ اپنی طرح جھوٹا سمجھتا ہے اور صادق بھی اس کی معیت سے پرہیز کرنے لگ جاتے ہیں۔

مسیحیوں کے متعلق حضرت مسیح کی دعا اور اس کا نتیجہ

یہ وسیع مضمون جو ساری دنیا کی نیکی اور بدی کے لئے بطور جڑ کے ہے اور جو دنیا کے اخلاق کی تباہی کا انکشاف کر رہا ہے۔ قرآن کریم نے اس چھوٹے سے فقرہ میں بیان کر دیا ہے کہ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ۔ ہر کسب اپنے براہ راست نتیجہ کے علاوہ ایک اور نتیجہ بھی پیدا کر دیا کرتا ہے جو یہ ہے کہ وہ کسب انسان کی قوتِ عقلیہ اور قوتِ علمیہ اور قوتِ فکریہ کو مار دیتا ہے اور اسی کا نام رَین ہے

؎۱۲ **تفسیر**۔ یہاں كَلَّا تیسری دفعہ آیا ہے۔ پہلے فرمایا تھا كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ۔ پھر فرمایا تھا كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ اب فرماتا ہے كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ اس کے بعد آگے آئے گا كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ۔ شاید اتنا قریب قریب كَلَّا کا استعمال قرآن کریم میں اور کسی جگہ نہیں ہوا۔ یہ چند آیات ہیں مگر ان چند آیات میں ہی چار جگہ كَلَّا استعمال کیا گیا ہے۔ میں بتا چکا ہوں کہ كَلَّا کے معنے ردع اور زجر کے ہیں پس كَلَّا کا جس جگہ تکرار کیا گیا ہے اُس میں شدّتِ عذاب کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسیحیوں کی نسبت فرمایا تھا کہ فَمَن يَكْفُرْ بَعْدُ مِنكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ (مائدہ ع ۱۵) یعنی جب حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے مائدہ مانگا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں دے تو دوں گا مگر اس نعمت کا انکار نہایت خطرناک نتائج پیدا کرنے والا ہوگا۔ چونکہ تم نے یہ دعا کی ہے کہ تمہاری قوم کو دنیا میں ترقیات نصیب ہوں اس لئے میں انہیں ترقیات تو دوں گا اور بہت بڑی ترقیات دوں گا لیکن اگر میری نعمتوں کا انہوں نے انکار کیا دین سے نفرت کی۔ خدا تعالیٰ سے بعد اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے منہ موڑ لیا تو فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ میں عیسائی قوم کو وہ عذاب دوں گا جو آج تک کبھی کسی قوم کو نہیں دیا گیا۔ پس چونکہ سورۂ مائدہ میں مسیحی اقوام کو دنیوی ترقیات عطا کرنے کا وعدہ تھا اور پھر اس کے ساتھ ہی یہ خبر تھی کہ اگر انہوں نے کفر کی طرف رجوع کیا تو میں اُن پر وہ عذاب نازل کروں گا جو دنیا میں

کسی قوم پر نازل نہیں ہُوا۔ اس لئے یہاں کَلَّاۤ کا تکرار
اسی عذابِ شدید کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے
کہ اسے عیسائیو اب ہوشیار ہو جاؤ! تم مطفف بنتے ہوئے
لوگوں کے حقوق کو غصب کرتے ہو اور دنیا کی ترقیات کے مزے
لُوٹ رہے ہو۔ میں نے تمہیں کہہ دیا تھا کہ اگر دنیا ملنے کے بعد
تم نے نافرمانی کی، میرے اس احسان کو بھلا دیا اور میری طرف
سے اپنی توجہ ہٹا کر دنیا پر گر گئے تو پھر میں تمہیں وہ عذاب
دُوں گا جو آج تک کسی کو نہیں دیا گیا سو وہ عذاب کی خبر جو میں
پہلے سے دے چکا تھا اب اُس کا وقت قریب آ رہا ہے اور
خدا تعالیٰ کی گرفت تم پر نازل ہونے والی ہے جو نہایت شدید
اور ہیبتناک ہوگی۔ پھر کَلَّا کے اس تکرار پر غور کرنے سے ایک اور
بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہاں تین دفعہ کَلَّاۤ کفر کے ذکر کے بعد
آتا ہے اور ایک دفعہ کَلَّاۤ مومنوں کے ذکر سے پہلے ہے۔ اس میں
اس طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تین جھٹکے عیسائیت کی تباہی
کے لئے لگیں گے اور چوتھا جھٹکا اسلام کے قیام کا موجب ہوگا
بظاہر جہاں تک عقل کام دیتی ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلی
جنگِ عظیم جو ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی پہلا جھٹکا تھا جو عیسائیت کو
لگا۔ اب دوسری جنگ جو شروع ہے یہ دوسرا جھٹکا ہے
اس کے بعد ایک تیسری جنگِ عظیم ہوگی جو مغرب کی تباہی کے
لئے تیسرا اور آخری جھٹکا ہوگا۔ اس کے بعد ایک چوتھا جھٹکا
لگیگا جس کے بعد اسلام اپنے عُروج کو پہنچ جائے گا اور مغربی
اقوام بالکل ذلیل ہو جائیں گی کیونکہ چوتھے کَلَّاۤ کے بعد ہی یہ ذکر
آتا ہے کہ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۔ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا
عِلِّيُّوْنَ ۔ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۔
اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ میں
يَوْمَئِذٍ سے مراد يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ والا یوم
ہی ہے۔ فرماتا ہے یہ لوگ اُس دن اپنے رب سے محجوب ہوں گے
اس آیت میں رَبّ کا لفظ لا کر اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے
کہ ربوبیت کا رشتہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ماں اور بچہ میں
ہوتا ہے۔ بچے کو ماں پالتی ہے، دُودھ پلاتی ہے، اُس کی
غور و پرداخت کرتی ہے۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھتی ہے
اور اس کو بڑا کرتی ہے۔ رَبّ کے بھی یہی معنے ہیں کہ وہ انسان
کی جسمانی اور روحانی پرورش کے سامان مہیّا کرتا ہے۔
پس جو رب ہوتا ہے وہ بھی اس شخص کے پاس آنے کی
کوشش کرتا ہے جس کی وہ ربوبیت کرتا ہے اور جس کی
ربوبیت کی جاتی ہے وہ بھی رب کے پاس آنے کی کوشش
کرتا ہے۔ ماں بھی بچہ سے محبت کرتی ہے اور بچہ بھی ماں سے
محبت کرتا ہے۔ پس فرماتا ہے ہمارا اور ان کا رشتہ وہ ہے کہ
ہم ان سے محبت کرتے ہیں اور انہیں ہم سے محبت کرنی چاہیئے
مگر باوجود اس رشتہ کے اُنہیں گناہوں سے ایسی وابستگی ہو جائے گی
کہ یہ اپنے رب سے محجوب ہو جائیں گے۔ محجوب اس کو کہتے ہیں
جو پردہ سے کسی دوسری چیز سے روکا گیا ہو اور جو شخص اپنے
رب سے محجوب ہو اُس کی بدقسمتی میں تو کوئی شبہ ہی نہیں
ہو سکتا۔ پس فرماتا ہے یہ لوگ کیسے بدقسمت ہیں کہ ربوبیت
کے رشتہ کے بعد بھی اپنے رب سے یہ اُس دن محجوب رہینگے۔

عیسائیت کی تباہی کے لئے تین جھٹکے

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس دن محجوب ہونے
کے کیا معنے ہیں (۱) کیا باقی انسان خدا تعالیٰ کو دیکھتے ہیں
کہ اُن کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنے رب سے محجوب
ہوں گے (۲) دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُس دن سے
پہلے عیسائی خدا تعالیٰ کو دیکھتے تھے کہ فرماتا ہے کہ اُس دن
وہ اپنے رب سے محجوب ہوں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک رؤیتِ قلب کا تعلق
ہے ہر انسان جو بے دین نہ ہو خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہے چنانچہ
قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ
اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل ع۸) جو
شخص اس دنیا میں خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھتا وہ آخرت میں بھی
اُس کو نہیں دیکھے گا اس سے معلوم ہُوا کہ جتنے مومن نجات
پانے والے ہیں اُن سب کو خدا تعالیٰ نے اپنا دیکھنے والا قرار
دیا ہے مگر دنیا میں ہر مومن یہ نہیں کہتا کہ میں نے خدا تعالیٰ کو
دیکھ لیا ہے اس سے معلوم ہُوا کہ ایک درجہ رؤیتِ الٰہی کا

خدا تعالیٰ کو محجوب ہونیکا مطلب

محض ایمان لانا ہے۔ جب کسی شخص کو ایمان نصیب ہو جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُسے رویت الٰہی نصیب ہو گئی اور ایمان بغیر خدا تعالےٰ کی صفات کا علم رکھنے کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ آخر خدا کسی مادی چیز کا نام تو نہیں بلکہ خدا نام ہے اس ہستی کا جو ربّ ہے، جو رحمٰن ہے، جو رحیم ہے اور جو مالکِ یوم الدین ہے اور اسی طرح اور صفاتِ حسنہ سے متّصف ہے۔ پس جب کسی نے خدا تعالےٰ کی ربوبیت، اُس کی رحمانیت، اُس کی رحیمیت اور اُس کی مالکیت وغیرہ کو سمجھ لیا اور اس کی دوسری صفات پر یقین رکھا تو اُس کو ایک درجہ رویتِ الٰہی کا نصیب ہو گیا۔ پس ایک رویت وہ ہے جو ہر مومن کو نصیب ہوتی ہے خواہ وہ ادنےٰ درجے کا مومن ہو یا اعلیٰ درجے کا، اس میں کوئی استثناء اور امتیاز نہیں ہے۔

رویت الٰہی کے درجے

پھر سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ (رکوع ۷) کہ جو شخص ہمارے ذکر سے اعراض کرتا ہے، ہماری صفات پر غور نہیں کرتا، اُن کا مطالعہ نہیں کرتا، اُس کی زندگی بڑی تنگ زندگی ہوتی ہے۔ کیونکہ وسعتِ عمل پیدا ہوتی ہے خدا تعالیٰ کی صفات کی وجہ سے جسے خدا تعالےٰ پر سچا ایمان حاصل ہو اُس کے اندر سخاوت ہوتی ہے، سچائی ہوتی ہے، دیانتداری ہوتی ہے، امانت ہوتی ہے، رأفت ہوتی ہے، محبت ہوتی ہے اور وہ اپنے ان نیک اعمال میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے مگر جو صفاتِ الٰہیہ پر ایمان نہ رکھتا ہو اُس کا دائرۂ عمل نہایت محدود ہوتا ہے۔ درحقیقت دائرۂ عمل، اعلیٰ مطمحِ نظر IDEAL سے وسیع ہوتا ہے جب کوئی اعلیٰ مطمحِ نظر سامنے نہ ہو تو اعمال محدود ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کے مقابلہ میں فلاسفروں کے اخلاق بالکل ہیچ ہوتے ہیں اور پھر اُن کے اندر جو تھوڑے بہت اخلاق پائے جاتے ہیں اُن کا دائرۂ عمل بھی بہت تنگ ہوتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اخلاق کو دیکھا جائے یا حضرت موسےٰ علیہ السلام کے اخلاق کو دیکھا جائے یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اخلاق کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے اعمال کا دائرہ غیر معمولی طور پر وسیع تھا۔ اُن کے اندر سچائی بھی شاندار طور پر پائی جاتی تھی، اُن کے اندر امانت بھی شاندار طور پر پائی جاتی تھی، اُن کے اندر سخاوت بھی شاندار طور پر پائی جاتی تھی، اُن کے اندر بشاشت بھی شاندار طور پر پائی جاتی تھی، اُن کے اندر رحم بھی شاندار طور پر پایا جاتا تھا، اُن کے اندر غریبوں کی پرورش کا مادہ بھی شاندار طور پر پایا جاتا تھا، اُن کے اندر انصاف بھی شاندار طور پر پایا جاتا تھا، اُن کے اندر توکّل بھی شاندار طور پر پایا جاتا تھا۔ غرض جیسیوں قسم کے اخلاق اُن میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں اگر تم فلاسفروں کو دیکھو تو ممکن ہے کوئی ایک فلاسفر ایسا نکل آئے جو امین ہو یا جود و سخا کا مادہ اپنے اندر رکھنے والا ہو لیکن ایک فلاسفر بھی ایسا نہیں نکل سکتا جو سارے اخلاق کا جامع ہو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جب تک کوئی اعلیٰ مطمحِ نظر سامنے نہ ہو، جب تک کوئی ایسی تصویر سامنے نہ ہو جس کی نقل اتاری جا سکے اُس وقت تک اعمال نہایت محدود دائرہ میں چکر کھاتے رہتے ہیں اور اُن میں وسعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور جب کسی کے اعمال نہایت تنگ اور محدود دائرہ کے اندر ہوں تو اُس کے عمل میں وسعت پیدا نہیں ہو سکتی اور جب کسی نے اپنے اعمال میں وسعت ہی پیدا نہیں کی تو وہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کو کس طرح دیکھ سکتا ہے وہ شخص جس نے اپنے آپ کو ربّ نہیں بنایا وہ اپنے رب خدا کو کس طرح پہچان سکتا ہے۔ جس نے اپنے آپ کو رحیم نہیں بنایا وہ رحیم خدا کو کس طرح پہچان سکتا ہے۔ جس نے اپنے آپ کو رحمٰن نہیں بنایا وہ رحمٰن خدا کو کس طرح پہچان سکتا ہے۔ جس نے اپنے آپ کو غفور نہیں بنایا، ستّار نہیں بنایا، مہیمن نہیں بنایا، وہ غفور اور ستّار اور مہیمن خدا کو کس طرح پہچان سکتا ہے اور وہ قیامت کے دن خدا تعالےٰ کو دیکھنے کی اہلیت ہی کس طرح رکھ سکتا ہے۔ جس نے خربوزہ نہیں دیکھا وہ خربوزے

کو دیکھ کر اُسے پہچان کس طرح سکتا ہے وہ تو اُس کی حقیقت معلوم کرنے سے قاصر ہی رہے گا۔ ایسی صورت میں جب اُس کا دائرۂ اعمال نہایت تنگ ہوگا اور خدا تعالیٰ کی صفات کا انعکاس اُس نے اپنے آئینۂ قلب میں پیدا نہیں کیا ہوگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیامت کے دن جب خدا تعالیٰ کی صفات ظاہر ہوں گی تو وہ اُن کو پہچان نہیں سکے گا بلکہ اندھوں کی طرح کھڑا رہے گا اور اُسے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ جب وہ اندھا ہونے کی حالت میں قیامت کے دن اٹھیگا تو چونکہ وہ اپنے ذہن میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ میں بڑا بصیر ہوں، مَیں بڑا فلاسفر اور مدبر ہوں اس لئے وہ خدا تعالیٰ سے کہیگا رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ أَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا۔ کہ میں تو بڑا بصیر تھا، نفسیات کا علم رکھنے والا تھا، مشاہدات پر اپنے علوم کی بنیاد رکھتا تھا، فلسفہ اور سائنس کا ماہر تھا، کتابوں کا دن رات مطالعہ کیا کرتا تھا، کائناتِ عالم کے اسرار پر غور کیا کرتا تھا مجھے آج اندھا کیوں پیدا کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا كَذٰلِكَ أَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى۔ تیرے سامنے اپنے نبی کے ذریعہ ہم نے نشانات و معجزات ظاہر کئے، ہم نے اپنے قادر ہونے کے نشانات ظاہر کئے، اپنے ربّ ہونے کے ثبوت دئے، اپنے رحیم ہونے کے دلائل دئے، اپنے مالک ہونیکے شواہد مہیا کئے، اپنے مُحیی اور مُمیت ہونیکے ثبوت پیش کئے مگر تُو نے اُن کی طرف توجہ ہی نہ کی۔ تُو ہمارے نبی کو دیکھ کر یہی کہتا رہا کہ یہ لغو باتیں ہیں ایک مُلّا ان باتوں کو کیا جانے، میں فلاسفر ہوں، میں کینٹ اور میں ہیگل ہوں، میں ایسے لغو امور کی طرف توجہ کرکے اپنے وقت کو ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ جب تُو نے ہماری طرف توجہ نہ کی تو ہم نے بھی تیری طرف توجہ نہ کی آنکھیں چونکہ ہماری طرف سے ملتی ہیں اور وہ نور بھی ہم ہی دیتے ہیں جس سے انسان دیکھ سکتا ہے اس لئے یہ چیزیں تجھے اسی صورت میں مل سکتی تھیں جب تو ہماری طرف توجہ کرتا۔ جب تُو نے ہم سے مُنہ پھیر لیا تو ہم نے بھی اپنا نور تجھ سے واپس لے لیا اور تُو اس جہان میں اندھا پیدا ہُوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے

کہ معجزات و نشانات سے مومن کو ایک رویت نصیب ہوتی ہے جو اس سے محروم ہو وہ اس سے بڑی رویت سے بھی جو دنیا یا آخرت میں ہوگی محجوب ہوں گے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ کیا وہ اُس دن سے پہلے خدا تعالیٰ کو دیکھتے تھے کہ اُن کے متعلق فرمایا گیا ہے إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ۔ اُس دن وہ خدا تعالیٰ سے محجوب ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دن محجوب ہونے کے یہ معنے ہیں کہ وہ تو رویت کا دن مقرر ہے اُس دن بھی انہیں رویت نصیب نہ ہوگی۔ یعنی عام قاعدہ یہ ہے کہ علم کے ساتھ چیز کی شناخت ہوتی ہے لیکن بعض دفعہ دل پر ایسا زنگ لگا ہُوا ہوتا ہے کہ علم کے ساتھ عرفان نہیں آتا۔ دنیا میں عام قانون یہ ہے کہ علم کے ساتھ ہی عرفان آجاتا ہے کسی کو کہہ دیں کہ یہ افیون ہے تو وہ اُس کے کھانے سے احتراز کرے گا اور سمجھیگا کہ اگر میں نے افیون کھائی تو میں بیمار ہو جاؤں گا یا میرے اعصاب کمزور ہو جائیں گے اس لئے وہ افیون کھانے سے ڈرتا ہے مگر ایک اور شخص ہوتا ہے جسے افیون کھانے کی عادت ہو چکی ہوتی ہے اُسے خواہ ڈاکٹر منع کریں، خواہ اس کے اخلاق خراب ہوں، خواہ اُس کی صحت برباد ہو اُس پر کوئی اثر ہوتا ہی نہیں اور وہ برابر افیون استعمال کرتا چلا جاتا ہے۔ گویا اُسے علم تو ہوتا ہے مگر عرفان نہیں ہوتا پُرانی عادت اور دل کے زنگ کی وجہ سے علم کے باوجود اسے معرفت حاصل نہیں ہوتی اور وہ افیون کا استعمال ترک نہیں کر سکتا۔ تو یہ دو حالتیں ہیں جو مختلف انسانوں پر وارد ہوتی ہیں۔ رویت در حقیقت عرفان کا نام ہے علم کا نام نہیں۔ وہ دن چونکہ رویت کے لئے مقرر ہوگا اور رویت عرفان سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ علم سے۔ اس لئے باوجود اس علم کے کہ وہ غلطی میں مبتلا تھے جب خدا تعالیٰ کی قدرتیں اور اُس کی طاقتیں ظاہر ہوں گی تو اُن کو عرفان حاصل نہیں ہوگا کیونکہ اُن کے دل گندے ہو چکے ہوں گے۔ گویا عرفان جو علم کا ایک طبعی نتیجہ ہے وہ ساتھ نہیں آئے گا جیسے افیون کھانے والے کو خواہ کتنا ڈراؤ وہ اُسے چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ اسے افیون کھانے کی

# كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝

یُوں نہیں (جس طرح تم کہتے ہو بلکہ) ابرار (کی جزاء) کا حکم یقیناً عِلّیّین میں ہے ۔ ۱۳؎

عادت پڑ چکی ہوتی ہے ۔ فرماتا ہے چونکہ وہ دن انکشاف کا ہوگا اُنہیں علم تو حاصل ہو جائے گا مگر چونکہ اُن کے قلوب گندے ہو چکے ہوں گے اس لئے علم کے باوجود اُنہیں عرفان حاصل نہ ہوگا وہ کہیں گے کہ خدا قادر ہے ، وہ سمجھیں گے کہ خدا رحیم ہے ، وہ سمجھیں گے کہ خدا عزیز ہے مگر باوجود اس کے اپنے ربّ اور رحیم اور قادر اور کریم خدا سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوگا اور اس وجہ سے وہ جنّت کے مستحق نہیں ہوں گے بلکہ دوزخ کے ہی مستحق رہیں گے ۔

**۱۳؎ تفسیر** ۔ فرماتا ہے خبردار ! تم یہ سمجھتے ہو کہ مومن ترقی نہیں کریں گے ! یہ بالکل غلط ہے مومنوں کی قسمت تو عِلّیّین میں لکھی ہوئی ہے ۔ اگر اس کے معنے قرآن کریم کے کئے جائیں تو عِلّیّین سے مراد قرآن کریم کے وہ حصّے ہوں گے جن میں مومنوں کی ترقیات کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیشگوئیاں موجود ہیں ۔ اور اگر عِلّیّین سے مراد اعلیٰ مقامات لے لو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ مومنوں کی قسمت تو اعلیٰ درجہ کے مقامات کے متعلق فیصل شدہ ہے ۔

*عِلّیّین کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول*

عِلّیّین کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس سے مراد جنّت ہے (ابن کثیر) اور مفردات والے لکھتے ہیں کہ ذَالِكَ فِي الْحَقِيْقَةِ اِسْمُ سُكَّانِهَا درحقیقت یہ جنّت میں رہنے والوں کا نام ہے اور وہ کہتے ہیں کہ هٰذَا اَقْرَبُ فِي الْعَرَبِيَّةِ اِذْ كَانَ هٰذَا الْجَمْعُ يَخْتَصُّ بِالنَّاطِقِيْنَ ۔ عربی زبان کے لحاظ سے عِلّیّین کے یہ معنے بالکل درست ہیں کیونکہ یہ جمع ذوی العقول کے ساتھ ہی مختص ہے پس اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ کے یہ معنے ہوئے کہ ابرار کا نام عِلّیّین میں لکھا ہوا ہے یا جہاں عِلّیّین کا ذکر ہے وہاں ان کا بھی ہے ۔ ابن ماجہ ۔ طبرانی اور بیہقی میں عبداللہ بن کعب بن مالک کی ایک روایت آتی ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ عِلّیّین کیا چیز ہے حضرت عبداللہؓ کہتے ہیں کہ لَمَّا حَضَرَتْ كَعْبًا نِ الْوَفَاةُ اَتَتْهُ اُمُّ بِشْرٍ بِنْتُ الْبَرَاءِ فَقَالَتْ اِنْ لَقِيْتَ اِبْنِيْ فَاَقْرِئْهُ مِنِّي السَّلَامَ فَقَالَ غَفَرَ اللّٰهُ لَكِ اُمَّ بِشْرٍ نَحْنُ اَشْغَلُ مِنْ ذَالِكَ فَقَالَتْ اَمَا سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ نَسَمَةَ الْمُؤْمِنِ تَسْرَحُ فِي الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ وَاِنَّ نَسَمَةَ الْكَافِرِ فِيْ سِجِّيْنٍ قَالَ بَلٰى قَالَتْ فَهُوَ ذَالِكَ ۔ یعنی عبداللہ بن کعب بن مالک کہتے ہیں جب حضرت کعبؓ کی وفات قریب پہنچی تو ایک صحابیہ اُمّ بشر نام اُن کے پاس آئیں اور جب انہوں نے اُنکو حالتِ نزع میں دیکھا تو وہ کہنے لگیں میاں کعب تمہیں اگلے جہان میں اگر میرا بیٹا نظر آجائے تو اُسے میرا سلام کہہ دینا حضرت کعبؓ کہنے لگے غَفَرَ اللّٰهُ لَكِ اُمَّ بِشْرٍ ۔ اے اُمّ بشر اللہ تعالیٰ تجھے معاف کرے ۔ میری جان کندنی کا وقت ہے اور تُو اپنے بیٹے کا سلام مجھے پہنچا رہی ہے مجھے تو اس وقت یہ فکر ہے کہ میں نے خدا کو کیا جواب دینا ہے تیرے بیٹے کو سلام پہنچانا کس کو یاد رہیگا ۔ وہ کہنے لگیں کیا تم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ بات نہیں سُنی کہ مومن کی روح جنّت میں جہاں چاہتی ہے چلی جاتی ہے لیکن کافر کی رُوح سجّین میں پڑی رہتی ہے ؟ اس حدیث سے معلوم ہُوا کہ عِلّیّین کے معنے آزادی اور حُرّیت کے ہیں کیونکہ بتایا گیا ہے کہ اِنَّ نَسَمَةَ الْمُؤْمِنِ تَسْرَحُ فِي الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ مومن کی روح جنت میں جہاں چاہے گی جا سکے گی ۔ اس کے مقابلہ میں سجّین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور سجّین کے معنے مَیں اس سے پہلے بتا چکا ہوں کہ قید کے ہیں ۔ پس عِلّیّین کے معنے آزادی اور حُرّیت کے ہوئے اور آیت کا مطلب یہ ہُوا کہ کفار نے جس طرح اپنے اعمال کا دائرہ بہت محدود رکھا تھا اور جس طرح اعمال صالحہ کی بجا آوری

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝

اور تجھے کس نے بتایا ہے کہ علیّون کیا ہے۔ ایک لکھا ہوا حکم ہے

يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝

جسے مقرب لوگ (خود اپنی آنکھوں سے) دیکھیں گے ۱۴۵

میں انہوں نے کوتاہی کی تھی اسی طرح اُنہیں سجّین یعنی ایک قید کی حالت میں رکھا جائے گا لیکن مومن نے چونکہ اپنے اعمال کا دائرہ غیر معمولی طور پر وسیع رکھا تھا اس لئے وہ علّیین میں شامل ہوگا یعنی ایسی جماعت میں جس کی نیکی اور ارتقاء کی کوئی حد ہی نہیں۔ یہ معنے تو دنیا کے لحاظ سے ہیں۔ لیکن آخرت کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جس طرح اس جہان میں اُس نے اپنے اعمال کا دائرہ وسیع رکھا تھا اسی طرح اگلے جہان میں خدا اس سے یہ سلوک کرے گا کہ وہ اس کی روح کو آزاد رکھیگا اور وہ جہاں چاہے گا جا سکے گا۔ میں نے اپنی کتاب "احمدیت یعنی حقیقی اسلام" میں اس امر پر بحث کی ہے کہ روح انسانی جنت میں ہر جگہ جا سکتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب جنتیوں کا ایک درجہ ہو جائے گا میں نے وہاں ثابت کیا ہے کہ ایک جنتی ہر جگہ جا بھی سکتا ہے اور درجوں میں بھی فرق رہ سکتا ہے۔

الغرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ۔ اے عیسائیو! یاد رکھو کہ تمہاری تباہی کے لئے تین زبردست جھٹکے لگیں گے اور تباہی کے ان تین دوروں کے بعد جب آخری جھٹکا لگیگا تو یکدم مسلمانوں کو نیچے سے اُٹھا کر اعلیٰ درجہ کے مراتب پر پہنچا دیا جائے گا۔

۱۴۵ تفسیر۔ فرماتا ہے۔ اے سننے والے! تجھے کیا پتہ کہ عِلِّيُّوْنَ کس کو کہتے ہیں كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ یہ ایک دفتر ہے جو لکھا ہوا ہے یا كِتٰبٌ مَّخْتُوْمٌ ایک ایسا فیصلہ ہے جس پر مہر لگ چکی ہے اور جو اٹل ہے یا یہ کہ یہ ایک لکھا ہوا فیصلہ ہے اس کے بھی وہی معنے ہیں جو پہلے کے ہیں کیونکہ اٹل اُسی فیصلہ کو کہتے ہیں جو لکھا ہوا ہو۔

يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ۔ یہ نتیجہ یا یہ انجام جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اس کو مقرب لوگ دیکھیں گے یا حاضر ہونگے اس مقام پر مقرب۔

یہ فرق ہے جو مومن اور کافر میں ہے یعنی کافر کیلئے وہ دن ایسا ہوگا کہ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۔ وہ آہیں بھرے گا۔ افسوس کرے گا اور کوشش کرے گا کہ کسی طرح میں اس انجام سے بھاگوں لیکن مقرب اس کی طرف دوڑ کر جائے گا اور اپنی مرضی سے جائے گا کیونکہ اس کے لحاظ سے وہ پسندیدہ انجام ہوگا۔ گویا کفار کی تباہی اور اس کے مقابلہ میں مومنوں کے اقتدار کی پیشگوئی یہاں آکر ختم کی اور بتایا کہ بے شک مطففین کا ایک لمبے عرصہ تک غلبہ چلا جائے گا مگر اللہ تعالیٰ اس غلبہ کو ضرور ختم کرے گا۔ چنانچہ ایک ہی سورۃ میں چار دفعہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد كَلَّا کے استعمال میں یہ مخفی اشارہ پایا جاتا ہے کہ مغربی اقوام کی تباہی کے لئے تین زبردست جھٹکے لگیں گے اس کے بعد چوتھا جھٹکا ایسا ہوگا جو ان مطففین کا انجام اُن کی آنکھوں کے سامنے لے آئیگا۔ اسلام غالب آجائے گا۔ کفر تباہ ہو جائے گا اور عیسائیوں کا انجام ایسا خطرناک ہوگا کہ وہ اس سے بھاگنے کی پوری کوشش کریں گے مگر وہ اس سے بھاگ نہیں سکیں گے لیکن مومن اپنے انجام کی طرف دوڑ کر جائینگے اور کہینگے کہ یہ کیسا اچھا انجام ہے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سجّین کا لفظ جو کفار کے لئے استعمال ہوا تھا مفرد تھا گو علّیین کا لفظ جو مومنوں کے لئے استعمال ہوا ہے وہ جمع کا لفظ ہے اس فرق سے اس طرف

# اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ۝ عَلَی الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ۝

نیکی میں بڑھے ہوئے لوگ یقیناً نعمت (کے مقام) میں رکھے جائینگے ۱۵؎ چھپر کھٹوں پہ (بیٹھے سب حال) دیکھ رہے ہوں گے۔ ۱۶؎

کافر کیلئے لفظ سجین مفرد اور مومن کیلئے علیین جمع استعمال کرنے میں حکمت

اشارہ کیا گیا ہے کہ کافر کی سزا کو اللہ تعالیٰ بڑھاتا نہیں مگر مومن کے انعام کو بڑھاتا چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے کافر تو ایک ہی قید خانہ میں پڑا رہتا ہے لیکن مومن گھر بدلتا جاتا ہے ایک گھر کے بعد اُس سے اعلیٰ گھر اُسے ملتا ہے اور اس کے بعد اس سے اعلیٰ گھر۔ اسی طرح خدا تعالیٰ اُسے کئی دنیاؤں کی سیر کرا دیتا ہے اس لئے مومن کے گھر کئی ہوں گے اور کافر کا گھر ایک۔ پس کافر کے گھر کے لئے مفرد لفظ استعمال ہوا اور مومن کیلئے چونکہ کئی گھر ہونے تھے اس کے بارہ میں جمع کا لفظ استعمال کیا۔

## ۱۵؎ حل لغات۔
نَعِیْم کیلئے دیکھو سورہ انفطار ۱۵؎

## تفسیر۔
یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ نعمت اُن پہ ہوگی بلکہ یہ فرمایا کہ وہ نعمت میں ہوں گے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تمام ماحول کو اُن کے لئے نعمت بنا دیا جائے گا۔ کسی چیز کو کسی انسان پر گرایا جائے تو وہ گر کر پھیل جاتی ہے۔ اس کی یوں مثال سمجھ لو کہ ایک شخص پر پانی کا لوٹا گرایا جائے اور ایک شخص ایسا ہو جو تالاب میں کود جائے۔ پانی کو تو یہ دونوں چھوئیں گے مگر پانی سے اُس کا تعلق جس پر ایک لوٹا گرایا گیا ہے اور اس کا جو تالاب میں کودا ہے ایک نمایاں فرق رکھتا ہوگا۔ پس اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ کا یہ مطلب ہے کہ اُن کے لئے تمام ماحول نعمت کا بنا دیا جائے اور وہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی تالاب میں کود جاتا ہے گویا خدا تعالیٰ کی نعمت اُنکو چاروں طرف سے ڈھانپ لے گی۔

عَلَی الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ کا مطلب

## ۱۶؎ حل لغات۔
اَرَآئِكُ: اَرِیْكَۃٌ کی جمع ہے اور اس کے معنے ہوتے ہیں سَرِیْرٌ مُنَجَّدٌ مُزَیَّنٌ فِیْ قُبَّۃٍ اَوْ بَیْتٍ فَاِذَا لَمْ یَكُنْ فِیْهِ سَرِیْرٌ فَهُوَ حَجَلَۃٌ۔ ایک ایسا تخت جو مزین ہو۔ نقش و نگار والا ہو۔ سونے کا کام اُس پر کیا گیا ہو اور اُس کو ایک قُبّہ یا کمرہ میں رکھا گیا ہو۔ مطلب یہ کہ اسے پردہ دار بنایا گیا ہو۔ جب جی چاہے پردے ڈالے جاسکیں اُردو میں اسے چھپر کھٹ کہتے ہیں۔

## تفسیر۔
یَنْظُرُوْنَ اَبْرَار کی صفت ہے کہ اَبرار اُس وقت دیکھتے ہوں گے یا یہ اُس کا حال ہے اور مطلب یہ ہے کہ بعض نعماء دنیا میں ملتی ہیں مگر انسان اُن کی حقیقت کو سمجھتا نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ مومنوں کو یہ نعمت دے گا تو اُن کی حالت ایسی ہوگی کہ وہ دیکھ رہے ہوں گے یعنی وہ سمجھتے ہوں گے کہ اس نعمت کی کیا قدر و قیمت ہے۔ اس کی موٹی مثال یہ دیکھ لو کہ اگر ایک بچے کو ہیرا دے دو تو وہ ہرگز یہ خیال نہیں کرے گا کہ اُسے کوئی قیمتی چیز دے دی گئی ہے۔ اسی طرح بعض قوموں کو دنیوی نعمتیں مل جائیں تو وہ اُن کی حقیقت کو نہیں سمجھتیں جیسے یورپ والوں کو مائدہ ملا اور وہ مائدہ ملا جس کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی مگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُنہیں جو کچھ حاصل ہوا اپنے زورِ بازو سے حاصل ہوا ہے گویا دیکھنے والی نظر ماری گئی ہے۔ لیکن مومنوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہم اُنہیں نعمتیں دیں گے تو ایسی حالت میں دیں گے کہ عَلَی الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ وہ آرائک پر بیٹھے ہوئے خوب سمجھ رہے ہوں گے کہ یہ نعمتیں اُنہیں اُن پیشگوئیوں کی وجہ سے ملی ہیں جو اُن کے متعلق کی گئی تھیں۔ گویا بصیرتِ روحانی اُن کے اندر موجود ہوگی۔ اس لئے بارِ امانت کو وہ صحیح طور پر اٹھائیں گے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ لو۔ حضرت عمرؓ کو دیکھ لو۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو دیکھ لو۔ انہوں نے ایک ایک قدم پر یہ سمجھا کہ یہ چیز ہماری نہیں بلکہ خدا تعالیٰ نے

ہم کو دی ہے اور جب انہوں نے اس بات کو سمجھا تو انہوں نے اس چیز کی اسی طرح حفاظت کی جس طرح خدا تعالیٰ کی چیز کی حفاظت کی جانی چاہیئے۔

یَنۡظُرُوۡنَ کو اگر ابرار کی صفت سمجھا جائے تو اس صورت میں مفسرین یہ لکھتے ہیں کہ اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ (۱) اعلیٰ نظارے مومنوں کے سامنے کئے جائیں گے یعنی دیکھنے کی عمدہ عمدہ چیزیں اُن کے سامنے ہونگی (۲) دوسرے یہ کہ وہ کفار کا عذاب دیکھیں گے۔

درحقیقت مفسرین کے سامنے یہی بات رہی ہے کہ وہ ان آیات کو قیامت کے متعلق مخصوص سمجھتے ہیں اور چونکہ وہ ان آیات کو قیامت کے متعلق سمجھتے ہیں اس لئے اسی ماحول کی چیزیں اُن کے ذہن میں آتی ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک گو یہ آیتیں قیامت پر بھی چسپاں ہوسکتی ہیں مگر قیامت کے آنے سے پہلے اس دنیا کی بھی نعمتیں مراد ہیں جن کے دئے جانے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابرار کو وعدہ ہے اس لئے میرے نزدیک اوّل تو یہ جواب ہے پہلی چیز کا پہلے اللہ تعالیٰ نے کفار کے متعلق فرمایا تھا کَلَّاۤ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ۔ خبردار ہو جاؤ اور سنو! کہ اُس دن کافر اپنے رب سے محجوب ہوں گے یعنی اپنے رب کی شکل انکو نظر نہیں آئیگی۔ جب فجار کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ تو ضروری تھا کہ اس کے بعد ابرار کا ذکر کرکے بتایا جاتا کہ اُن کا کیا حال ہوگا۔ سو اس کے مقابلہ میں فرمادیا کہ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ۝ عَلَی الۡاَرَآئِكِ یَنۡظُرُوۡنَ ۝ پس یَنۡظُرُوۡنَ سے مراد وہی چیز لی جائیگی جس کے متعلق پہلی آیات میں قرینہ موجود ہے اسی وجہ سے جس چیز کو دیکھنا ہے اُس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر نہیں کیا اور مراد یہ ہے کہ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ۝ عَلَی الۡاَرَآئِكِ اِلٰی رَبِّهِمۡ یَنۡظُرُوۡنَ پس یَنۡظُرُوۡنَ کے ایک معنے یہ ہیں کہ مومن اپنے رب کو دیکھیں گے۔ محجوب نہیں ہونگے۔ یہ دیکھنا دو طرح ہوتا ہے۔ ایک صفاتی نظری یعنی صفاتِ الٰہیہ کا ظہور بیرونی دنیا میں۔ جیسے ہمارے ملک میں کہتے ہیں کہ خدا یاد آگیا جب کوئی بڑی مصیبت ظاہر ہو یا کوئی بڑا تغیر رونما ہو یا ایسے حالات پیدا ہوں جو غیر معمولی ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ خدا یاد آگیا۔ یہ بھی محاورہ ہے کہ خدا نظر آگیا۔ پس اِلٰی رَبِّهِمۡ یَنۡظُرُوۡنَ کے ایک معنے یہ ہوئے کہ جب وقت آئیگا تو ایسے عظیم الشان تغیرات خدا تعالیٰ پیدا کریگا کہ جس شخص کے اندر ذرا بھی ایمان ہوگا وہ کہیگا کہ یہ تغیر خدا تعالیٰ کے سوا اور کسی نے نہیں کیا۔ اس کی مثال موجود ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے والد گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ مدینہ سے ایک شخص وہاں جا نکلا۔ انہوں نے اُس سے کہا کہ سناؤ مدینہ کا کیا حال ہے؟ اُس نے جواب میں کہا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فوت ہوگئے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد نے پوچھا پھر کیا ہوا؟ اُس نے کہا لوگوں نے ایک شخص کو خلیفہ منتخب کر لیا ہے۔ انہوں نے پوچھا کس کو؟ اُس نے جواب دیا ابو بکر کو۔ اس پر انہوں نے پوچھا کون ابو بکر؟ اُس نے جواب دیا ابن ابی قحافہ۔ اس پر انہوں نے مختلف خاندانوں کا نام لیا کہ فلاں فلاں بڑے خاندانوں کے لوگوں نے مان لیا؟ اُس نے کہا ان قبائل نے بھی بیعت کر لی ہے۔ جب یہ ساری بات ہوگئی تو حضرت ابو بکر رضؓ کے والد بے اختیار کہہ اُٹھے اَشۡهَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَا شَرِیۡكَ لَهٗ وَاَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ واقعہ میں خدا ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی تو مکہ کے لوگ جو دوسرے کی اطاعت نہیں کرسکتے تھے۔ جو کسی کی بات تک نہیں مانتے تھے اور پھر بڑے بڑے قبائل اور خاندانوں کے لوگ ابو بکر رضؓ کو کس طرح اپنا خلیفہ مان لیتے۔ اسی طرح انصار اپنے شہر میں رہتے تھے اور ایسی حالت میں ان کو خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ حکومت ہمارے ہاتھ میں آنی چاہیئے مگر مدینہ میں بیٹھے ہوئے انہوں نے مکہ کے ایک شخص ابوبکر رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ تو فرماتا ہے ایسے حالات پیدا ہونگے کہ لوگ کہینگے ہمیں خدا نظر آگیا جس طرح ابو قحافہ کو ابو بکر رضؓ کی خلافت پر خدا یاد آگیا اور اُس نے کہا اَشۡهَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَا شَرِیۡكَ لَهٗ وَاَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ۔

دوسرا دیکھنا ایسا ہوتا ہے جیسے روحانی طور پر اللہ تعالےٰ

بندے کے قلب پر اپنے آپ کو نازل کرکے یقینِ کامل کا مقام پیدا کر دیتا ہے۔ مگر یہ دیکھنا پہلے دیکھنے کے بعد ہوتا ہے کیونکہ قلبی رؤیت میں بعض دفعہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خیالی یا وہمی تو نہیں۔ اس لئے جب اللہ تعالیٰ اردگرد نشانات دکھا لیتا ہے تو پھر انسانی قلب پر نازل ہوتا ہے اور چونکہ ایسا شخص پہلے صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اردگرد دیکھ چکا ہوتا ہے اس لئے جب یہ ظہور اس کے سامنے آتا ہے تو اُسے اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق یقین کامل پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بھی بیان فرمایا ہے کہ وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات ع۱) یہاں پہلے فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ فرمایا ہے اور پھر وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ کو بیان فرمایا ہے پس اللہ تعالیٰ کی یہی سنّت ہے کہ وہ پہلے اردگرد نشانات دکھاتا ہے اور پھر انسانی قلب پر اپنی تجلّی نازل کرتا ہے تاکہ وہ دھوکا میں نہ رہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی آتا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ پر وحی کا ابتداء رویاء صالحہ سے ہوا جو فلق الصبح کی طرح پوری ہوتی تھیں۔ اس قسم کے حالات اللہ تعالیٰ خود ہی پیدا کرتا ہے تاکہ وحی و الہام کا مورد بھی کوئی شبہ نہ کرے اور لوگ بھی یہ نہ کہیں کہ یہ پاگل ہو گیا ہے اس کے بعد قلب پر تجلّی نازل ہوتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اللہ تعالیٰ کی جو تجلّیات ہوئیں اُن میں بھی اسی تدریج کا پہلو نظر آتا ہے۔ پہلے اس قسم کے الہامات نازل ہونے شروع ہوئے کہ "آج حاجی ارباب محمد لشکر خان کے قرابتی کا روپیہ آتا ہے" (تذکرہ ص۵) یا "ڈگری ہو گئی ہے مسلمان ہے" (تذکرہ ص۶) اور جب تواتر کے ساتھ ان الہامات نے پورا ہو کر ادھر لوگوں کو آپ کی سچائی کی طرف متوجہ کر دیا اور اُدھر آپ کے دل میں یقین پیدا ہو گیا تو اس کے بعد آخری تجلّی ہوئی۔ غرض اللہ تعالیٰ پہلے سے ایسے حالات پیدا کر دیتا ہے کہ دُور بین نگاہ رکھنے والا سمجھنا شروع کر دیتا ہے کہ پردۂ قدرت سے اب کچھ ظاہر ہونے والا ہے پس عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ کے یہ معنے ہوئے کہ جو ادنیٰ مومن ہیں وہ خدا تعالیٰ کی اس تجلّی کو دیکھیں گے جو اردگرد ہوتی ہے اور جو کامل مومن ہیں وہ خدا تعالیٰ کی اُس تجلّی کو دیکھیں گے جو اُن کے اپنے نفس پر ظاہر ہوگی۔

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ میں صحابہ کے خصائص کی طرف اشارہ

یہ تو پہلے معنوں کے الف اور بلا دو حصے تھے مگر اس کے ایک اور معنے بھی ہیں اور وہ یہ کہ يَنْظُرُوْنَ کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ آرائک اور سُرُر تو سونے کا مقام ہوتے ہیں۔ انسان اُن پر لیٹتا ہے اس لئے کہ وہ آرام کرے یا اس لئے کہ وہ سو کر اپنی کوفت کو دُور کرے۔ لیکن فرماتا ہے وہ ایسے دیندار لوگ ہونگے کہ ایسے مقامات پر بھی کہ سونے اور آرام کرنے کے ہیں چست اور ہوشیار رہیں گے اور اپنے مفوضہ کاموں کی کڑی نگرانی رکھیں گے گویا بتایا کہ اَور لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب انہیں نعمتیں ملتی ہیں۔ آرام و آسائش کے سامان حاصل ہوتے ہیں تو وہ سست اور غافل ہو جاتے ہیں۔ اپنے فرائض کو عمدگی سے ادا نہیں کرتے۔ لوگوں کے حقوق کو ادا کرنے کا فکر نہیں کرتے۔ وہ دنیوی عیش کے سامانوں میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ تمام فرائض کو بُھلا بیٹھتے ہیں مگر ابرار کی یہ حالت نہیں ہوگی۔ جب اللہ کی طرف سے انہیں دنیا کی حکومت ملیگی۔ جب انہیں عزت ملے گی، رتبہ ملیگا، مال ملیگا تو وہ سُست نہیں ہو جائیں گے بلکہ اپنے فرائض کو پوری خوش اسلوبی سے ادا کرینگے اور وہ ہر وقت ایسے رہینگے جیسے دیکھ رہے ہیں کہ کہ کیا نقص واقعہ ہونے والا ہے اور وہ اس کو کس طرح دُور کر سکتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق مسلمانوں کو مال دیا، دولت دی، عزت دی، رُتبہ دیا مگر وہ اسلام سے غافل نہیں ہوگئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے متعلق آتا ہے کہ جب وہ فوت ہوئے تو کئی کروڑ روپیہ کی جائداد اُن کے ترکہ میں تقسیم ہوئی۔ اُنکی سالانہ آمد بھی لاکھوں دینار تھی مگر باوجود اس کے وہ رات اور دن اشاعتِ اسلام میں مشغول رہے اور مال و دولت کی فراوانی نے اُن کے اندر کسل یا غفلت پیدا نہیں کی۔ یہی حال حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا تھا وہ ساری دنیا کے بادشاہ ہو گئے مگر سُست اور غافل نہیں ہوئے بلکہ اپنے فرائض منصبی کو پوری تندہی سے ادا کرتے رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ حضرت عثمانؓ بیان کرتے ہیں وہ کہتے ہیں مَیں ایک دفعہ باہر قبہ میں بیٹھا ہُوا تھا اور اتنی شدید گرمی پڑ رہی تھی کہ دروازہ کھولنے کی بھی ہمت نہیں

# تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝

تُو (اگر انہیں دیکھے تو) اُن کے چہروں میں نعمت کی شادابی محسوس کرے گا ۲۵

پڑتی تھی کہ اتنے میں میرے غلام نے مجھے کہا دیکھئے اس شدید دھوپ میں باہر ایک شخص پھر رہا ہے۔ میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا تو مجھے ایک شخص نظر آیا جس کا مُنہ شدتِ گرمی کی وجہ سے جُھلسا ہُوا تھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ کوئی مسافر ہوگا مگر تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ وہ شخص میرے قبّہ کے قریب پہنچا اور میں نے دیکھا کہ وہ حضرت عمرؓ ہیں۔ اُنکو دیکھتے ہی میں گھبرا کر باہر نکل آیا اور میں نے کہا اس گرمی میں آپ کہاں؟ حضرت عمرؓ فرمانے لگے بیت المال کا ایک اُونٹ گم ہوگیا تھا جس کی تلاش میں مَیں باہر پھر رہا ہوں۔ تو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ۔ وہ ہوں گے تختوں پر مگر ہر وقت نگرانی اُن کا کام ہوگا۔ دنیا کی نعمتیں اور دنیا کے آرام اُن کو سُست نہیں بنائیں گے وُہ اُن ارائک کے اندر سوتے رہتے ہونگے بلکہ بیدار و ہوشیار ہونگے۔ لوگوں کے حقوق کی دیکھ بھال کرینگے اور اپنے فرائض منصبی کو پوری خوش اسلوبی سے ادا کرتے چلے جائیں گے۔

## ۲۵ حل لغات۔
نَضْرَةٌ کے معنے ہوتے ہیں (۱) نعمت (۲) عیش (۳) غنیٰ (۴) وَ قِيْلَ الْحُسْنُ وَالرَّوْنَقُ وَاللُّطْفُ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نَضْرَةٌ کے معنے حُسن۔ رونق اور لطف کے ہوتے ہیں (اقرب) اسی طرح جو ادیب ہیں انہوں نے تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ کے معنے کئے ہیں بَرِيْقَهٗ وَ نَدَاهُ یعنی اس کی چمک اور اس کی تراوت (اقرب) پس تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ کے یہ معنے ہوئے کہ تُو پہچانے گا اُن کے مُونہوں سے خدا تعالےٰ کی نعمت کی تازگی یا نعمت کا غناء۔ یا نعمت کا حُسن یا نعمت کی رونق یا نعمت کا لُطف۔

**تفسیر**۔ اس آیت کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ نعمتِ الٰہی اُن کے دلوں پر اس طرح نازل ہوگی کہ چہرہ سے خوشی پھوٹ پھوٹ پڑے گی۔ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ سے پتہ لگتا ہے کہ یہ نعمت اُن کے دل پر نازل ہوگی اور اس طرح نازل ہوگی کہ اُنکے چہروں سے ظاہر ہو جائے گی اور وُہ اسے چھپا نہیں سکیں گے دنیا میں دو قسم کی باتیں ہوتی ہیں ایک وہ جنہیں چھپایا جا سکتا ہے اور ایک وہ جنہیں انسان چھپا نہیں سکتا بلکہ خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں۔ صحابہؓ کے متعلق اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ نَضْرَةُ النَّعِيْمِ اُن کے چہروں سے پھُوٹ پھُوٹ پڑیگی اور وہ خدا تعالےٰ کی اس نعمت کو لوگوں سے چھپا نہیں سکیں گے۔ فیج اعوج کے زمانہ میں مسلمانوں میں بعض ایسے ایسے صوفیاء گذرے ہیں جو دس دس بارہ بارہ سال تک لوگوں سے خدمت لینے کے بعد اُنہیں دین کی کوئی ایک بات یا معرفت کا کوئی ایک نکتہ بتایا کرتے تھے اس کے مقابلہ میں صحابہؓ کی جو حالت تھی اُس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک صحابی کہتے ہیں اگر تلوار میری گردن پر رکھ دی جائے اور کوئی دشمن مجھے قتل کرنے لگے اور اُسوقت مجھے یاد آ جائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات مجھے ایسی بھی یاد ہے جو ابھی تک میں نے بیان نہیں کی تو میں اُس کے تلوار چلانے سے پہلے پہلے اس بات کو بیان کردُونگا۔ تو انکو یہ شوق تھا کہ خدا تعالےٰ کی باتوں کو دنیا میں زیادہ پھیلائیں۔ لیکن اور لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں اگر ہم نے لوگوں کو اپنا علم بتا دیا تو پھر ہمارا علم ختم ہو جائیگا اور وہ بھی ہمارے برابر ہو جائیں گے۔

نَضْرَةً

میں نے جب جلسہ سالانہ پر ذکر الٰہی کے متعلق تقریر کی تو ایک غیر احمدی صوفی جو باہر سے آئے ہوئے تھے اور میری اُس تقریر میں شامل تھے انہوں نے مجھے ایک رقعہ لکھا جس کا مضمون قریباً یہ تھا کہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں کہ وہ نکتے جو صوفیاء دس دس بارہ بارہ سال تک لوگوں سے خدمت لینے کے بعد بتایا کرتے تھے اس طرح پے در پے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ تو لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کو چھپاتے ہیں لیکن ہمیں اس بات کی پروا بھی نہیں ہوتی کیونکہ ہمیں اللہ تعالےٰ ہر وقت نئی سے نئی باتیں

سکھاتا رہتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ علوم کا چھپانا ایسا ہی ہے جیسے صاف پانی کو گدلا کر دیا جائے اور خدا تعالیٰ کا حکم بھی یہی ہے کہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (سورۃ الضحیٰ) خدا تعالےٰ کی نعمتوں کو دنیا میں زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ۔ پس فرمایا وہ خدا تعالےٰ کی نعمتوں کو چھپائیں گے نہیں بلکہ یوں معلوم ہوگا کہ وہ اُن کے چہروں سے پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہو رہی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ کوئی شخص ملے تو اس کے سامنے ان نعمتوں کو رکھ دیں۔

کسبی اور نسبی غنا میں فرق

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ چونکہ اس آیت سے پہلے مادی ترقیات کا ذکر تھا اس لئے فرمایا کہ جب ان لوگوں کو مادی ترقیات ملیں گی تو اُن کا حال دوسرے لوگوں سے مختلف ہوگا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو نعماء ظاہری تو ملتی ہیں مگر ان کا دل اندر سے جل رہا ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کو حکومت تو مل جاتی ہے مگر اس کے خاندان میں ایسا تفرقہ اور فساد ہوتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے اس حکومت نے میری زندگی کو وبالِ جان بنا دیا ہے یا امراء اور وزراء میں ایسی ایسی ریشہ دوانیاں ہوتی ہیں کہ حکومت ملنے کے باوجود انہیں دل کا اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ باورچی کھانا لاتا ہے تو وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں باورچی نے کھانے میں زہر نہ ملا دیا ہو۔ طبیب آتا ہے تو وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ دوا میں زہر ملا کر مجھے ہلاک نہ کر دے۔ وزیر ملنے آتا ہے تو وہ ڈرتے ہیں کہ یہ کہیں مار نہ ڈالے۔ اسی وجہ سے بادشاہوں کی طرف سے عجیب عجیب قسم کی حفاظتیں اور نگرانیاں کی جاتی ہیں۔ مگر فرماتا ہے ہم مومنوں کو وہ نعمتیں دینگے جو نہ صرف اُن کے ظاہر پر ہوگی بلکہ اُن کے دل پر نازل ہونگی اور اس وجہ سے یہ نہیں ہوگا کہ انہیں مادی کامیابی تو حاصل ہو جائے مگر ان کے دل خوش نہ ہوں بلکہ جہاں انہیں مادی ترقیات کے سامان ہماری طرف سے ملیں گے وہاں اُن کے دل بھی خوش ہونگے اور مادی ترقی قلبی خوشی کے ساتھ ملی ہوئی ہوگی۔

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ کے تین معنے

تیسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ان کو غناءِ نعیم ملیگا یعنی حقیقی نعمت سے جو غناء پیدا ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے انسان غرباء پر رحم کرتا ہے وہ اُن کو حاصل ہوگا۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اخلاق کسبی طور پر اچھے ہوتے ہیں اور بعض اخلاق نسلی طور پر اچھے ہوتے ہیں۔ مثلاً کسبی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ کسب والا اپنے مال کی اچھی طرح حفاظت کرتا ہے لیکن نسب والا اپنے مال کی اُس طرح حفاظت نہیں کرتا۔ چنانچہ کسبی طور پر مالدار ہو جانے والے کا نوکر اگر کچھ نقصان کر بیٹھے تو وہ اس سے بڑی سختی کا معاملہ کرتا ہے لیکن نسبی طور پر جن کے اندر غناء پایا جاتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام عفو اور چشم پوشی کرنا ہے۔ نَضْرَةٌ کے ایک معنے چونکہ غناء کے بھی ہیں اس لئے اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ باوجود اس کے کہ اونٹ چراتے چراتے صحابہؓ کو حکومت کے تخت پر بٹھا دیا جائے گا وہ ویسے ہی وسیع الحوصلہ اور ویسے ہی بااخلاق ہوں گے جیسے نسلاً بعد نسلٍ وہ حکومت کرتے چلے آتے ہوں گویا وہ اخلاق جو کسب کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں وہ بھی انکو حاصل ہوں گے اور جو نسلی طور پر حاصل ہوتے ہیں وہ بھی اُن میں اُسی دن پیدا ہو جائیں گے جس دن اللہ تعالےٰ کی طرف سے انہیں حکومت کے تخت پر بٹھایا جائیگا۔ چنانچہ صحابہؓ کو دیکھ لو کوئی کمینگی انکے نفس میں نظر نہیں آتی حالانکہ نو دولتوں میں کچھ نہ کچھ وہ بات ضرور ہوتی ہے جسے انگریزی میں فاپشنیس FOPPISHNESS کہتے ہیں یعنی اُن کی طرف سے ایک قسم کا اظہار اس بات کا ہوتا ہے کہ ہم دولت مند ہیں اور اس طرح لوگوں کو پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ وہ ہیں جنہیں نئی نئی دولت ملی ہے مگر فرماتا ہے تم ان صحابہ کے چہروں کو دیکھو گے تو تمہیں ان پر غناءِ دولت نظر آئے گا تم ان کو دیکھکر یہ خیال بھی نہیں کر سکو گے کہ انہیں نئی نئی دولت ملی ہے بلکہ یوں سمجھو گے کہ یہ نسلاً بعد نسلٍ اسی طرح حکمران چلے آتے ہیں۔ کمینگی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر چڑنا اور اپنی دولت مندی کا اظہار کرنا اُن کے اندر نظر نہیں آئے گا۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ ایک شخص کے متعلق جو بعد میں عیسائی ہو گیا سُنایا کرتے تھے کہ اُسے اپنے باپ دادا سے ورثہ میں کچھ جائداد ملی جو اُس نے تباہ و برباد کر دی اور وہ کنگال ہو گیا مگر اس حالت میں بھی اس کی عادت یہ تھی کہ جب وہ لاہور سٹیشن پر اُترتا تو قُلی کو بلا کر اپنا رُومال اُسے پکڑا دیتا اور کہتا کہ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ آپ فرماتے کہ میں نے اُس سے پوچھا کہ تم یہ کیا کرتے ہو کہ

# يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۙ

اُنہیں خالص سربمہر شراب پلائی جائے گی ۱۳

تمہارے پاس سامان تو کوئی ہوتا نہیں اور تم صرف رومال جیب سے نکال کر قلی کو پکڑا دیتے ہو اور کہتے ہو کہ وہ اسے ہاتھ میں لٹکائے ہوئے تمہارے پیچھے پیچھے چلا آئے۔ اس پر وہ کہنے لگا اس کے بغیر شان نہیں ہوتی۔

تو یکدم انسان کو دولت مل جائے تو اُس کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں مگر فرمایا یہ شتربان اونٹوں کو چراتے چراتے حکومت کے تخت پر جا بیٹھیں گے مگر نَو دولتوں والی کمینگی ان کے اخلاق میں نہیں پائی جائے گی بلکہ غنائِ نعیم اُن کے چہروں سے ظاہر ہوگا چنانچہ صحابہؓ جہاں بیٹھتے اس امر کا صاف صاف اقرار کرتے کہ ہم غریب ہوتے تھے، بھوکے رہتے تھے، کھانے اور پہننے کو کچھ نہیں ملتا تھا مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی برکت سے خدا نے ہمیں یہ نعمتیں عطا فرما دیں۔ ایران کے بادشاہ نے ایک دفعہ اُن سے کہہ دیا کہ تم ذلیل لوگ گوہ کھانے والے میرے ملک پر حملہ کرنے کے لئے آئے ہو تمہاری حیثیت ہی کیا ہے کہ تم ایسا کر سکو۔ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ لڑ پڑتا کہ میری ہتک کی گئی ہے مگر صحابہؓ نے کہا آپ نے جو کچھ کہا بالکل درست ہے ہماری یہی حالت ہُوا کرتی تھی مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آنے کے بعد ہماری یہ حالت نہیں رہی۔ اب ہم میں تغیر پیدا ہو چکا ہے۔ غرض غنائِ نعمت اُن کا جزو بن گئی تھی یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی گذشتہ حالت کو چھپاتے ہوں اور سمجھتے ہوں کہ اگر لوگوں کو ہماری پہلی حالت کا پتہ لگ گیا تو ہماری ہتک ہوگی۔ وہ اس میں کوئی ہتک نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس حالت سے دوسری حالت کو پانے میں خدا تعالےٰ کا ایک نشان دیکھتے تھے اس لئے اُس کے اظہار میں مزہ حاصل کرتے تھے۔ پس تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ تو غنائِ نعمت اُن کے چہروں پر دیکھے گا نَو دولتوں والی حالت اُن میں نہیں دیکھے گا۔

**۱۳ حل لغات** - رَحِيْق خالص چیز کو کہتے ہیں۔ اسی طرح رَحِيْق کے ایک معنے شراب کے ہیں۔ اور رَحِيْق ایک قسم کی خوشبو کو بھی کہتے ہیں (تاج العروس)

مَخْتُوْم: خَتَمَ سے نکلا ہے اور خَتَمَ يَخْتِمُ خَتْمًا وَخِتَامًا کے معنے ہوتے ہیں طَبَعَهٗ وَوَضَعَ عَلَيْهِ الْخَاتَمَ۔ اور عَلٰی کے ساتھ بھی یہ متعدی آتا ہے چنانچہ کہتے ہیں خَتَمَ الْكِتَابَ وَعَلَى الْكِتَابِ یعنی اُس نے کسی چیز پر مُہر لگائی۔ خَتَمَ الشَّيْءَ خَتْمًا کے معنے ہوتے ہیں بَلَغَ اٰخِرَهٗ۔ کسی چیز کو ختم کر دیا اور اُس کے آخر تک پہنچ گیا۔ خَتَمَ الْكِتَابَ کے معنے ہوتے ہیں قَرَاَهٗ كُلَّهٗ وَاَتَمَّهٗ۔ اُس نے تمام کتاب پڑھ لی اور اُسے تکمیل تک پہنچا دیا۔ خَتَمَ الصَّكَّ وَغَيْرَهٗ کے معنے ہوتے ہیں وَضَعَ عَلَيْهِ نَقْشَ خَاتِمِهٖ حَتّٰى لَا يَجْرِيَ عَلَيْهِ التَّزْوِيْرُ۔ اُس نے چک یا ویسی ہی کسی چیز پر اپنی انگوٹھی سے مُہر لگا دی تاکہ کسی قسم کی دھوکا بازی نہ ہو۔ خَتَمَ الْعَمَلَ کے معنے ہوتے ہیں فَرَغَ مِنْهُ اس سے فارغ ہو گیا۔ اور خَتَمَ الْاِنَاءَ کے معنے ہوتے ہیں سَدَّهٗ بِالطِّيْنِ وَنَحْوِهٖ اس کا مٹی وغیرہ سے مُنہ بند کر دیا۔ وَفِي الْقُرْاٰنِ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتَامُهٗ مِسْكٌ اور قرآن میں جو آتا ہے کہ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ۔ اُس کے بھی یہی معنے ہیں کہ وہ شراب سربمہر ہوگی۔ جیسے انگریزی دوائیوں کی جو شیشیاں آتی ہیں اُن کے مونہوں پر لاکھ لگا کر اوپر کارخانہ کی مہر لگی ہوتی ہوتی ہے اسی طرح وہ رحیق مختوم ہوگی یعنی اُس کا منہ بند ہوگا اور اُس پر مُہر لگی ہوئی ہوگی۔ خَتَمَ الزَّرْعَ وَخَتَمَ عَلَيْهِ کے معنے ہوتے ہیں سَقَاهٗ اَوَّلَ سَقْيَةٍ۔ اس کو پہلی دفعہ پانی پلایا اور خَتَمَ اللّٰهُ لَهٗ الْخَيْرَ کے معنے ہوتے ہیں اَتَمَّهٗ۔ اللہ تعالےٰ نے اُس پر خیر کا اتمام کر دیا۔ اور خَتَمَ عَلٰى قَلْبِهٖ

کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَهُ لَا یَفْهَمُ شَیْئًا وَ لَا یَخْرُجُ مِنْهُ شَیْءٌ۔ اُسے ایسا بنا دیا کہ نہ وہ کچھ سمجھتا ہے اور نہ اُس کے قلب میں سے کوئی چیز باہر آتی ہے یعنی نہ وہ خود سمجھتا ہے اور نہ دوسرے کو سمجھا سکتا ہے اور خَتَمَ اللّٰهُ لَهٗ بِالْخَیْرِ کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَ لَهٗ عَاقِبَةً حَسَنَةً۔ اس کا انجام اچھا کر دیا۔ اور کبھی خَتَمَ کی بجائے خَتَّمَ بھی بولتے ہیں جو مبالغہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

لفظ مختوم میں شراب کی خوبی کا اظہار۔

**تفسیر** - یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ کے یہ معنے ہیں کہ انہیں ایسی خالص شراب پلائی جائے گی جو مختوم ہوگی۔ مختوم کے ایک معنے یہ ہیں کہ ایسی چیز جو ختم کر دی گئی ہو اور جس کے آخر تک انسان پہنچ جائے پس رَحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ کے یہ معنے ہوئے کہ اُن کو ایسی لطیف اور اعلیٰ شراب ملے گی کہ جس کو ملے گی وہ اُسے آخر تک ختم ہی کر جائے گا چھوڑے گا نہیں یعنی اپنے اپنے ظرف کے مطابق وہ ساری شراب پی جائے گا۔

ان معنوں سے ظاہر ہے کہ رحیقِ مختوم سے مراد عام شراب نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح خِتَامُهٗ مِسْكٌ اور مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ کے الفاظ کا آنا بتا رہا ہے کہ اس سے دنیوی شراب مراد نہیں ہے بہرحال یہ کوئی ایسی چیز ہے کہ یا تو اُسے اگلے جہان کی طرف منسوب کرنا پڑے گا اور یا اگر اس جہان کی طرف اُسے منسوب کیا جائے تو اس سے مراد کوئی ایسی چیز لینی پڑے گی جو ساری کی ساری پی جائے گی اور جس کا اپنے اپنے ظرف کے مطابق ایک قطرہ تک انسان باقی نہیں چھوڑے۔

رحیق سے مراد محبت الٰہی کا نشہ

میرے نزدیک یہاں رَحِیْق سے مراد محبتِ الٰہی کا نشہ ہے جو قرآن پیدا کرتا ہے جس طرح شراب انسان کو مدہوش بنا دیتی ہے اسی طرح خدا تعالےٰ کا عشق انسان میں ایک قسم کی وارفتگی پیدا کر دیتا ہے اور اُسے ہر وقت اللہ تعالےٰ کے آستانہ پر جھکائے رکھتا ہے۔ شاعروں کو دیکھ لو وہ بھی اپنے معشوق کی آنکھ کو میخانہ کہتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح شراب نشہ پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح محبوب کی آنکھ عاشق کو مدہوش بنا دیتی ہے۔ پس شعراء نے یہ محاورہ کثرت سے استعمال کر کے بتا دیا ہے کہ شراب سے مراد صرف مادی شراب نہیں ہوتی بلکہ محبت اور عشق کا نشہ بھی شراب کہلا سکتا ہے۔ غرض اللہ تعالےٰ فرماتا ہے یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ۔ انہیں شرابِ محبت پلائی جائے گی۔ اس سے مراد قرآن کریم کی تعلیم اور اس کے مضامین یا اُس کی روشنی میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں کہ وہ اُن پر محبت کے نشہ میں مخمور ہو کر ایسا عمل کریں گے کہ اپنے عشق کو کمال تک پہنچا دیں گے۔

مَخْتُوْم کا لفظ ایک طرف شراب کی خوبی ظاہر کرتا ہے تو دوسری طرف پینے والوں کی خوبی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اَور قوموں کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے تعلیمیں تو دی گئیں مگر انہوں نے اُن پر اُدھورا عمل کیا۔ موسیٰؑ کو جو کچھ دیا گیا تھا اُس میں سے کچھ موسیٰؑ کی قوم نے لیا اور کچھ نہ لیا۔ عیسیٰؑ کو جو کچھ دیا گیا تھا اُس میں سے بھی کچھ عیسیٰؑ کی قوم نے لیا اور کچھ نہ لیا۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قوم وہ ہے کہ جب اُس نے خُم کو مُنہ لگایا تو پھر اُس نے اُسے چھوڑا نہیں بلکہ وہ پیتی چلی گئی یہاں تک کہ اُسے ختم کر دیا یعنی اُس کی ایک ایک تعلیم کو اُس نے جامۂ عمل پہنایا۔ اسی طرح مختوم کے لفظ سے قرآن کریم کی تعلیم کی خوبی بھی ظاہر ہے کیونکہ جس تعلیم کو چھوڑا نہ جائے اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے ایسی نہیں جو برداشت نہ ہو سکے جس تعلیم کو انسان برداشت نہ کر سکتا ہو اُسے چھوڑ دیتا ہے مگر قرآن کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (القمر ع۱) ہم نے قرآن کو عمل کے لئے بالکل آسان کر دیا ہے اس کی کوئی تعلیم ایسی نہیں جس کا فطرتِ صحیحہ انکار کر سکتی ہو یا جس پر عمل کرنا اُس کیلئے دشوار ہو۔ پس اس ایک لفظ کے استعمال سے دونوں خوبیوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ اِدھر قرآن کے متعلق بتا دیا کہ اس کی کوئی تعلیم ایسی نہیں جسے چھوڑا جا سکے انسان اس کی ایک ایک بات پر عمل کر سکتا ہے اور کسی کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس پر عمل کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ دوسری طرف صحابہؓ کی تعریف کر دی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو وہ خادم اور ساتھی ملے تھے کہ جنہوں نے خُم سے مُنہ لگایا تو وہ خُم کا خُم ہی چڑھا گئے۔

# خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ

اُس کے آخر میں مُشک ہوگا ؀۱۹

خَتَم کے دو معنے مُہر کے ہوتے ہیں اور جس چیز پر مُہر لگی ہوئی ہو اُس میں کسی اور چیز کی آمیزش نہیں ہوسکتی پس رَحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ کے یہ معنے ہوئے کہ وہ پاک اور منزہ ہوگی اور اُس میں کسی اور شے کی آمیزش نہ ہوگی۔ یہ بھی قرآن کریم کی صفت ہے اور دشمن سے دشمن بھی سوائے شیعوں کے اقرار کرتا ہے کہ قرآن کریم ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہے اور اس میں نہ کوئی چیز باہر سے داخل ہوئی ہے اور نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر نکلی ہے۔ جس چیز پر مُہر لگی ہوئی ہو اُس میں یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ نہ اُس کے اندر کی چیز باہر نکلتی ہے اور نہ باہر سے کوئی چیز اندر داخل ہوتی ہے اسی طرح قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو مختوم ہے۔ جب قرآن نازل ہوا تھا اس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم زندہ موجود تھے اور آپ کے ہوتے ہوئے کوئی شخص اس میں بگاڑ پیدا کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد خطرہ ہوسکتا تھا کہ اس میں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہوجائے سو اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ بعد میں بھی یہ مختوم ہی رہیگا۔ یہاں چونکہ مسلمانوں کو بادشاہت عطا کئے جانے کا ذکر ہو رہا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک زمانہ آئیگا جب مسلمان ارائک پر بیٹھیں گے اِس لئے اِس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ جب مسلمان بادشاہ ہوجائینگے۔ حکومت اُن کو حاصل ہوجائے گی۔ طاقت اُن کے پاس ہوگی اور وہ تمام قسم کے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتے ہوں گے اُس زمانہ میں بھی قرآن بالکل محفوظ رہے گا اور کسی بادشاہ کو بھی یہ طاقت نہیں ہوگی کہ وہ اس میں تصرف کرسکے۔ دنیا میں عام طور پر جب بادشاہت کا زمانہ آتا ہے تو لوگ چاہتے ہیں کہ اب ہم عیش کریں اور لُطف اُٹھائیں اور چونکہ مذہبی تعلیمیں اُن کے عیش میں حائل ہوتی ہیں اس لئے وہ اُن تعلیموں کو بدلنا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر فرماتا ہے قرآن وہ ہے جو اسلامی ترقی کے زمانہ میں بھی بالکل خالص رہیگا نہ کوئی تعلیم اس میں سے خارج ہوسکے گی اور نہ کوئی نئی تعلیم اس میں داخل کی جاسکے گی۔ مسیحیوں میں اسی طرح خرابی پیدا ہوئی کہ جب روما کا بادشاہ عیسائیت میں داخل ہونے لگا تو اس نے کہا کہ مجھے عیسائیت قبول کرنے میں تو کوئی عذر نہیں مگر سبت کا دن جو ہفتہ کو منایا جاتا ہے وہ اتوار کے دن منالیا جایا کرے کیونکہ ہماری قوم اتوار کا دن مناتی ہے ہفتہ کا دن نہیں مناتی چنانچہ عیسائیوں نے سبت کا دن بدل کر اتوار کر دیا۔ پھر اُس نے کہا کہ ہماری قوم خالص توحید کا عقیدہ نہیں مان سکتی اس میں کچھ ایسے اشارے کنائے رکھدیں جن کو دیکھ کر لوگوں کے لئے عیسائیت قبول کرنا آسان ہوجائے۔ انھوں نے یہ بات بھی مان لی اور کہا کہ ہم۔ باپ خدا بیٹا خدا اور روح القدس خدا کہنا شروع کر دیتے ہیں چنانچہ وہ بادشاہ مع اپنی قوم کے عیسائیت میں شامل ہوگیا۔ عیسائیوں نے پہلے تو صرف لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کرنے کے لئے یہ تین نام رکھے تھے مگر آہستہ آہستہ یہ حقیقت میں تبدیل ہوگئے اور عیسائیوں نے ایک کی بجائے تین خداؤں کا عقیدہ اختیار کرلیا۔ تو جب بادشاہت آتی ہے۔ ترقی آتا ہے۔ طاقت حاصل ہوتی ہے تو مذہب میں کئی قسم کی تبدیلیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مسلمان جب ارائک پر بیٹھیں گے جب تختِ حکومت ان کو نصیب ہوگا۔ جب طاقت اُن کو حاصل ہوگی۔ جب اقتدار اُن کو میسر آئے گا تو اُس وقت بھی یہ کلام رحیق مختوم رہیگا اور بادشاہوں کو بھی یہ جرأت نہیں ہوگی کہ وہ اس میں اپنے مطلب کی کوئی چیز بڑھادیں یا اس کی کسی تعلیم کو خارج کردیں۔ گویا اسلام کی ترقی کے زمانہ میں بھی قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے اسی طرح اسمیں شیعوں کا رد بھی ہوگیا جو خیال کرتے ہیں کہ قرآن کریم کا کچھ حصہ غائب ہے کیونکہ ختم کے دونوں مفہوم ہوتے ہیں نہ اسمیں کوئی چیز پڑسکتی ہے اور نہ اسمیں سے کوئی چیز نکل سکتی ہے پس جو کتاب مختوم ہو اُس کے متعلق یہ کہنا کہ اُس کا ایک حصہ غائب ہوچکا ہے کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔

؀۱۹ **حل لغات**۔ خِتَام: خَتَمَ کا مصدر ہے اور خِتَام

اس کے معنے ہیں اَلْفَصُّ مِنْ مَفَاصِلِ الْخَیْلِ ۔ وَ الْمَقْطَعُ وَالطِّیْنُ یُخْتَمُ بِہٖ عَلَی الشَّیْءِ یعنی ختام گھوڑے کے جوڑ کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ختام نظم کے آخری شعر کو بھی کہتے ہیں اور ختام اُس مٹی کو بھی کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی دوسری چیز پر مہر لگائی جائے۔ پس خِتٰمُہٗ مِسْکٌ کے یہ معنے ہوئے کہ (۱) وہ مُنہ بند کرنیوالی چیز مشک کی ہوگی (۲) یا اُس کا آخری حصہ مشک ہوگا (۳) یا اس کے انتہاء تک مشک ہوگا۔

خِتٰمُہٗ مِسْکٌ کے تین معنے

**تفسیر**۔ اس آیت کے پہلے معنے یہ ہیں کہ اُس کی مُہر مُشک کی ہوگی یعنی جو اشیاء اُس کی حفاظت پر لگیں گی وہ بھی مُشک کی طرح ہونگی۔ یہ امر ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی خدمت اور اُس کی حفاظت ظاہری کا کام حُفّاظ اور قرّاء کے سپرد رہی۔ وہ قرآن کریم کے خادم ہیں اور اس کی حفاظت کا کام سرانجام دے رہے ہیں جس طرح مُہر کی یہ غرض ہوتی ہے کہ کوئی چیز باہر سے اندر داخل نہ ہو اور کوئی چیز اندر سے باہر خارج نہ ہو اسی طرح اس آیت میں یہ بتایا گیا تھا کہ قرآن کریم کی خدمت پر ایسے انسان مقرر کئے جائیں گے جو مشک کی طرح خوشبودار ہونگے یعنی وہ اعلیٰ درجہ کے نیک۔ اپنی ذمہ واری کو سمجھنے والے اور قرآن کریم کی حفاظت کا حق ادا کرنیوالے ہونگے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں چودہ سو سال گزر چکے ہیں مگر کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوا جس میں حُفّاظ کی ایک بڑی بھاری جماعت دنیا میں موجود نہ ہو اور وہ قرآن کریم کی خدمت نہ کر رہی ہو۔ پس خِتٰمُہٗ مِسْکٌ میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ اس کی حفاظت ظاہری کے لئے ہم ایسے لوگ کھڑے کرینگے جو نیکی اور تقویٰ میں اعلیٰ مقام رکھتے ہونگے اور مشک کی طرح خوشبودار ہونگے۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ اُس کا آخر مشک کا ہوگا شراب کے نیچے ہمیشہ ایک چیز بیٹھ جاتی ہے جسے گار کہتے ہیں۔ یورپ میں تو یہ قاعدہ ہے کہ وہ شراب کشید کرنے کے بعد اُسے سال سال دو دو سال تک پڑا رہنے دیتے ہیں اور اس کے بعد اُسے شیشیوں میں بھرتے ہیں تاکہ جس قدر دُرد تہ نشین ہونی ہے وہ ہو جائے بلکہ بعض دفعہ تو دس دس پندرہ پندرہ سال تک شراب کو کشید کر کے رکھ دیتے ہیں۔ تاکہ انگور وغیرہ کے باریک ذرّے جو پانی میں ملے ہوئے ہوتے ہیں وہ آہستہ آہستہ تہ نشین ہو جائیں مگر پہلے زمانہ میں یہ رواج نہیں تھا اور شراب بنانے کے بعد جلد ہی بیچ دیتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ شراب کی بوتل کے نیچے گار بیٹھ جاتی۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ شراب کی دُرد تو گندی ہوتی ہے مگر قرآن وہ کتاب ہے جس کا دُرد بھی مشک کی طرح ہے۔ اب تم خود ہی سوچ لو کہ جس کا دُرد مشک کا ہوگا اس کا اصل کیسا ہوگا۔ دُرد کیا ہوتا ہے۔ دُرد ظاہری جسم کو کہتے ہیں مثلاً انگور یا کھجور وغیرہ سے شراب نکالی جائے تو انگور کے باریک باریک ذرّے یا کھجور وغیرہ کے ذرات نیچے بیٹھ جاتے ہیں اور شراب اُن انگوروں یا کھجوروں کا ست ہوتا ہے۔ پس چونکہ دُرد ظاہری جسم کو کہتے ہیں اور شراب ست ہوتا ہے اس لئے جب قرآن کے متعلق یہ کہا گیا کہ اس کی گار بھی مشک ہے تو اس گار سے مراد قرآن کریم کی ظاہری تعلیم ہوگی۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وہ کتاب ہے کہ اس کی ظاہری تعلیم بھی اچھی ہے اور اس کی باطنی تعلیم بھی اچھی ہے۔ اس کی موٹی سے موٹی تعلیم جو کسی معاملہ کے متعلق ہوئے تو وہ مشک ہی مشک ہوگی اس سے تم قرآن کریم کی اعلیٰ درجہ کی روحانی تعلیمات کا اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کیسی ہوں گی۔

تیسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ جس طرح اس قرآن کی ابتداء اعلیٰ ہے اسی طرح اس کی انتہاء بھی اعلیٰ ہوگی۔ ابتداء میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جیسا عظیم الشان انسان اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام لے کر آیا اور آخری زمانہ میں مسیح موعودؑ اس کی اشاعت کے لئے اللہ تعالےٰ کی طرف سے مبعوث ہوگا۔ گویا یہ وہ گلاس ہے جسے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لوگ پینا شروع کریں گے اور پیتے چلے جائینگے مگر آخر تک یہ مشک ہی مشک رہیگا یعنی ہمیشہ اللہ تعالےٰ ایسے آدمی مبعوث کرتا رہیگا جو قرآن کریم کی خدمت کریں گے اور اسلام کی اشاعت کا کام سرانجام دینگے اور آخری زمانہ میں بھی ایسا آدمی پیدا ہوگا جو اس قرآن کی خوشبو کو ساری دنیا میں پھیلا دے گا۔

یہاں ایک لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝ وَمِزَاجُهٗ مِنْ

اور چاہیئے کہ خواہش رکھنے والے (انسان) ایسی (ہی) چیز کی خواہش کریں [۲۰] اور اس میں تسنیم کی

تَسْنِيْمٍ ۝ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۝

آمیزش ہوگی ۔ (ہماری مراد اس) چشمہ (سے ہے) جس سے مقرب لوگ پئیں گے [۲۱]

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مشک بڑا پسند تھا اور آپ ہمیشہ اسے استعمال فرمایا کرتے تھے پس فرمایا کہ اس کا ختام بھی مشک پر ہوگا یعنی ایسے انسان پر جو کثرت سے مشک استعمال کرنے والا ہوگا خدا تعالےٰ کی سُنت ہے کہ وہ بالعموم ایک ظاہری علامت شناخت کی بھی مقرر فرما دیتا ہے۔ جیسے ختم نبوت کے حقیقی معنوں کے ساتھ ایک نشان بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پشت مبارک پر بنا ہُوا تھا۔

**[۲۰] حل لغات۔** تَنَافَسُوْا فِي الشَّيْءِ کے معنے ہوتے ہیں نَافَسُوْا اور نَافَسَ فِي الشَّيْءِ مُنَافَسَةً وَنِفَاسًا کے معنے ہوتے ہیں رَغِبَ فِيْهِ عَلٰى وَجْهِ الْمُبَارَاةِ فِي الْكَرَمِ۔ کہ مقابلہ کے جذبہ کے ساتھ نیک اور اچھے کاموں میں ایک دوسرے کے مقابل میں مشغول ہوگئے اور دوسرے معنے اس کے ہوتے ہیں بَالَغَ فِيْهِ وَغَالَ وَزَايَدَ۔ کسی کام کو حد سے زیادہ کرنا۔ اس میں غلوّ سے کام لینا اور اس کام میں بڑھتے چلے جانا (اقرب) پس فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ کے معنے یہ ہوئے کہ یہ وہ چیز ہے (یعنی رحیقِ مختوم کا ملنا) جس کے متعلق لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اس کو لینے کے لئے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

**تفسیر۔** اس آیت سے صاف پتہ لگتا ہے کہ رحیقِ مختوم کوئی مادی چیز نہیں بلکہ روحانی چیز ہے۔ کیونکہ اگر یہ مادی چیز ہوتی تو جو شخص ایک گلاس ہی پی سکتا ہے اُسے یہ کس طرح کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ تنافس وہاں ہی ہوتا ہے جہاں ایک شخص دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ پس یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ روحانی چیز ہے جس میں دوسروں سے مقابلہ ہو سکتا تھا کوئی مادی چیز نہیں کہ جو محدود طور پر ہی استعمال کی جا سکتی ہے اور جس میں دوسرے سے مقابلہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ روحانی نعمت تھی اور اس میں دوسروں سے مقابلہ کیا جا سکتا تھا اس لئے فرمایا کہ تم اگر اس معاملہ میں کسی دوسرے پر رشک کرو تو یہ بالکل جائز ہے۔ تم اگر کوشش کرتے ہو کہ دینی خدمات میں کوئی دوسرا تم سے بڑھ نہ سکے تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ تمہارے لئے ضروری ہے کہ ایسا کرو۔ تَنَافُس کے معنے روز بروز بڑھتے چلے جانے کے ہیں۔ پس جہاں اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ تم دوسروں کا مقابلہ کرو اور کوشش کرو کہ اپنے ساتھیوں سے بڑھ جاؤ وہاں اس کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ تم کوشش کرو کہ تمہارا آج کا دن کل کے دن سے بڑھ جائے گویا مُبَارَاة کے تو یہ معنے ہیں کہ تم دوسروں کا مقابلہ کرو اور تزاید کے یہ معنے ہیں کہ تمہارا آج کا قدم تمہارے کل کے قدم سے آگے ہو یہ دو چیزیں اپنے سامنے رکھو پھر دیکھو کہ کس طرح تم جلد سے جلد ترقی حاصل کر لیتے ہو۔

**[۲۱] حل لغات۔** مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ۔ مَزَجَ مِزَاجُهٗ

[حاشیہ:] خِتَامُهٗ مِسْكٌ کا ظاہری الفاظ میں پورا ہونا

[حاشیہ:] تَنَافَسُوْا

[حاشیہ:] اس بات کی دلیل کہ رحیق مختوم سے مراد کوئی مادی چیز نہیں

الشَّیْءَ مَزْجًا و مِزَاجًا کے معنے ہوتے ہیں خَلَطَهٗ بِهٖ۔ کسی چیز سے اُس کو ملا دیا (اقرب)

تَسْنِیْم: سَنَّمَ الْکَلَأُ الْبَعِیْرَ کے معنے ہوتے ہیں عَظَّمَ سَنَامَهٗ۔ گھاس نے اونٹ کے کوہان کو بڑا کر دیا۔ سَنَّمَ فُلَانٌ الْاِنَاءَ کے معنے ہوتے ہیں مَلَأَهٗ۔ اُس نے اس کا برتن بھر دیا۔ سَنَّمَ الْمِکْیَالَ کے معنے ہوتے ہیں مَلَأَهٗ ثُمَّ عَمِلَ فَوْقَهٗ مِثْلَ السَّنَامِ مِنَ الطَّعَامِ۔ اُس نے برتن کو بھرا اور پھر بھر کر چوٹی دار بنا دیا۔ سَنَّمَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں عَلَاهُ۔ اُس کو اونچا کیا اور سَنَّمَ الْقَبْرَ کے معنے ہوتے ہیں ضِدُّ سَطَّحَهٗ۔ اُس نے قبر کو اونچا کیا (اقرب) پس تَسْنِیْم کے معنے ہوئے۔ اونچا کرنا یا بھر دینا یا ایسی چیز جو کہ اونچا کر دینے والی ہے یا بھر دینے والی ہے۔

**تفسیر**۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شراب کے پیالوں کو الہامی پانی سے مدد دیتا رہے گا تاکہ ہر مزاج کا آدمی ہر زمانہ میں اس سے فائدہ اٹھاتا رہے۔ یعنی قرآن گو رحیق ہے مگر رحیق بھی اس پانی سے بنتی ہے جو اُس کے مناسب حال ہو۔ تھوڑے پانی کی ضرورت ہو تو اس میں تھوڑا پانی ملایا جاتا ہے۔ اور زیادہ پانی کی ضرورت ہو تو اُس میں زیادہ پانی ملایا جاتا ہے۔ گویا زمانہ اور ذوق کے لحاظ سے اُس میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اور گو چیز وہی رہے مگر اس کی شکل کو بدلنا ضروری ہوتا ہے تاکہ لوگ اس سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے رہیں۔ پس مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْم کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرما دیا کہ وہ ہر زمانہ کے لحاظ سے ایسے الہامات نازل کرتا رہے گا جو اس رحیق میں مناسب حال تمزیج کا باعث ہوں گے۔ پس تسنیم سے مراد الہام کا پانی ہے جو قرآن میں ہر زمانہ میں ملایا جاتا رہا ہے اور بتایا گیا ہے کہ بغیر تازہ کلام الٰہی کے قرآن کریم اونچا نہیں ہوتا

تسنیم سے مراد الہام الٰہی

اُس کی عظمت اور اُس کی شان اور اُس کی فوقیت اس وقت صحیح طور پر ظاہر ہوتی ہے جب تسنیم کا پانی اُس میں ملایا جائے۔ پس فرمایا قرآن بے شک رحیق مختوم ہے مگر ہر زمانہ میں ایسی ضرورتیں پیش آتی رہیں گی جن کے لئے تازہ کلامِ الٰہی کی ضرورت ہوگی اس وقت ہم اپنا کلام نازل کریں گے جو قرآن کے لئے تسنیم کا موجب ہوگا۔ یعنی اُس کو اُونچا کرنے اور اس کی شان اور عظمت کو ظاہر کرنے کا باعث ہوگا۔ آگے فرماتا ہے تمہیں کچھ پتہ ہے یہ تسنیم کیا چیز ہے؟ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ۔ یہ ایک چشمہ ہے جس سے مقرب لوگ پانی پیتے ہیں۔ یَشْرَبُ بِهَا کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس میں باء زائدہ ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں باء بمعنے مِنْ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہاں باء حال کے لئے آئی ہے یعنی عَیْنًا یَّشْرَبُ مَمْزُوْجًا بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ وہ ایک چشمہ ہے جس سے ملا کر رحیق پیتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں باء معنًا استعمال ہوئی ہے یعنے اصل میں یہ دو جملے ہیں یَشْرَبُ وَیَلْتَذُّ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ۔ مقرب اس میں سے پیتے اور لذت حاصل کرتے ہیں۔

یَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْم میں الہام الٰہی کا ہی ذکر کیا گیا تھا کیونکہ اس آیت میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کو تازہ الہام کی روشنی میں پیش کیا جاتا رہے گا۔ اور یہ الہام مقرب لوگوں پر نازل ہوگا یعنی امت محمدیہ میں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جن کے دلوں میں تسنیم کا چشمہ پھوٹے گا اور وہ اس پانی کو پی کر قرآن کریم کی ایسی تشریحیں اور توضیحیں کریں گے جن سے ہر زمانہ کے لوگ فائدہ اُٹھا سکیں گے۔

## إِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ۝ۖ

وہ (لوگ) جو مجرم ہوئے یقیناً مومنوں سے ہنسی (ٹھٹھا) کیا کرتے تھے۔

## وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ۝ۖ

اور جب اُن کے پاس سے گزرتے تھے تو ایک دوسرے کو آنکھوں کے اشارے کیا کرتے تھے ۲۲

**۲۲ حل لغات**۔ يَضْحَكُوْنَ : ضَحِكَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اَلضَّحْكُ (جو ضَحِكَ کا مصدر ہے) کے معنے ہیں اِنْبِسَاطُ الْوَجْهِ وَتَكَشُّرُ الْاَسْنَانِ مِنْ سُرُوْرِ النَّفْسِ یعنی ضحك کے اصل معنی ہیں چہرے پر کشادگی پیدا ہو جانا اور خوشی کے ساتھ دانت بجنے لگ جانا وَاسْتُعِيْرَ الضَّحْكُ لِلسُّخْرِيَّةِ۔ پھر استعارۃً اسکو تمسخر کے معنوں میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔ چنانچہ کہتے ہیں ضَحِكْتُ مِنْهُ۔ میں نے اس سے تمسخر کیا۔ وَرَجُلٌ ضُحَكَةٌ يَضْحَكُ مِنَ النَّاسِ۔ وہ شخص جو لوگوں سے تمسخر کرے اُس کو ضُحَكَةٌ کہتے ہیں۔ وَضُحْكَةٌ لِمَنْ يُضْحَكُ مِنْهُ اور وہ شخص جس پر لوگ ہنسیں اس کو ضُحْكَةٌ کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ۔ اِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُوْنَ۔ تَعْجَبُوْنَ وَتَضْحَكُوْنَ۔ اور معنے یہ ہیں کہ وہ تعجب کرتے ہیں۔ استعجاب کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اُن کی حالت پر تعجب کر کے مذاق کرتے ہیں گویا ضحك کے معنے ایسی ہنسی کے ہیں جس کے ساتھ تعجب بھی شامل ہوتا ہے۔ وَيُسْتَعْمَلُ فِي السُّرُوْرِ الْمُجَرَّدِ۔ اور کبھی یہ لفظ خالی خوشی کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے خواہ ظاہری طور پر ہنسی آئی ہو یا نہ آئی ہو۔ وَاسْتُعْمِلَ لِلتَّعَجُّبِ الْمُجَرَّدِ تَارَةً۔ اور کبھی مجرد تعجب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی خواہ صرف تعجب ہو۔ خوشی ہو یا نہ ہو۔ پھر مفردات کے مصنف لکھتے ہیں وَمِنْ هٰذَا الْمَعْنٰى قَصَدَ مَنْ قَالَ اَلضَّحْكُ يَخْتَصُّ بِالْاِنْسَانِ وَلَيْسَ يُوْجَدُ فِيْ غَيْرِهٖ مِنَ الْحَيَوَانِ اھ معنوں کے رو سے بعض نے کہا ہے کہ ضحك انسان کے ساتھ مختص ہے کسی حیوان میں ضحک نہیں پایا جاتا (مفردات) تعجب ہے کہ مفردات والوں نے یہ کس طرح لکھ دیا حالانکہ تعجب جانوروں میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے چنانچہ جانور کے سامنے کوئی نئی چیز رکھ دی جائے تو وہ اُس کے پاس جاتا ہے اُسے تھوتھنی مارتا ہے۔ سونگھتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ وہ چیز اُس کے کھانے کے قابل نہیں تو پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ البتہ قہقہ مار کر ہنسنے والا کوئی جانور دکھائی نہیں دیتا۔ صرف ایک قلیل حد تک بندر میں ہنسی کا مادہ پایا جاتا ہے۔

پھر وہ کہتے ہیں وَلِهٰذَا الْمَعْنٰى قَالَ وَاِنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى۔ قرآن کریم میں یہ جو آتا ہے کہ اِنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى* اس کے معنے بھی تعجب کے ہی ہیں۔ اسی طرح مفردات والے قرآنی آیت اِمْرَاَتُهٗ قَائِمَةٌ

يَضْحَكُوْنَ

۲۷۱
ضحك سے مراد تعجب

* نوٹ:۔ مفردات کے مصنف نے هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى کی آیت میں ضَحِكَ سے مراد تعجب لیا ہے اور یہ معنے چسپاں ہوتے نظر نہیں آتے۔ غالباً یہ آیت غلطی سے لکھی گئی ہے۔ اصل آیت جس سے استنباط ہے وہ اس سے اگلی ہے۔

فضَحِکَتْ میں ضَحِکَتْ کے معنے حَاضَتْ کرنے کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں جس مفسّر نے یہ لکھا ہے اُس نے پہلے مفسّر کے معنے غلط سمجھے اُس کی یہ مراد نہ تھی کہ ضَحِکَتْ کے معنے حَاضَتْ کے ہیں بلکہ اُس نے یہ لکھا تھا کہ اُس وقت جبکہ وہ ہنسیں اُن کو حیض آ گیا۔

یَتَغَامَزُوْنَ

مفردات والوں کے نزدیک اس آیت میں بھی ضَحِکَتْ کا لفظ تعجب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں قرآن کریم کی دوسری آیتیں اِن معنوں کو ثابت کر دیتی ہیں۔ قرآن کریم میں آتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو جب لڑکے کی خوشخبری ملی تو انہوں نے کہا ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّھٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا ؕ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ (ھود ع) اسی طرح آتا ہے اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ رَحْمَتُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ ؕ اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ (ھود ع) ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ضَحِکَتْ کے معنے تعجب کے ہی ہیں کیونکہ ضَحِکَتْ کے لفظ کی اَتَعْجَبِیْنَ سے تشریح کی گئی ہے۔ مفردات کے مصنف یہ بات بھی کہتے ہیں کہ کوئی چیز اگر واضح ہو اور اُس میں چمک ہو تو وہ بھی استعارۃً ضاحک کہلاتی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے سُمِّیَ الْبَرْقُ الْعَارِضُ ضَاحِکًا وَالْحَجَرُ یَبْرُقُ ضَاحِکًا وَ سُمِّیَ الْبَلَحُ حِیْنَ یَتَفَتَّقُ ضَاحِکًا وَطَرِیْقٌ ضَحُوْکٌ وَاضِحٌ وَ ضَحِکَ الْغَدِیْرُ: تَلَأْلَأَ مِنِ امْتِلَائِہٖ (مفردات) یعنی بجلی کو جب وہ بادلوں میں چمک رہی ہو ضاحک کہتے ہیں۔ پتھر جو چمک رہا ہو اُس کو بھی ضاحک کہتے ہیں۔ کھجور جب پختہ ہونے پر آئے اُسے بھی ضاحک کہتے ہیں۔ کھلے راستہ کو بھی طَرِیْقٌ ضَحُوْکٌ کہتے ہیں۔ اور وہ تالاب جو پانی سے خوب بھرا ہوا ہو اور اس کی کثرت کی وجہ سے چمک رہا ہو اس کے متعلق بھی کہتے ہیں کہ ضَحِکَ الْغَدِیْرُ۔ تالاب پانی کی کثرت سے چمک پڑا۔

یَتَغَامَزُوْنَ: تَغَامَزَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور تَغَامَزَ الْقَوْمُ کے معنے ہوتے ہیں اَشَارَ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ بِاَعْیُنِھِمْ۔ ایک دوسرے کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا۔ (اقرب)

اسلام کی ترقی کی پیشگوئی پر کفار کا ہنسنا

**تفسیر۔** اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے یقیناً وہ لوگ جنہوں نے جرم کیا اور جو خدا تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی وجہ سے کٹ چکے ہیں وہ اُن لوگوں سے جو کہ مومن ہیں تمسخر کرتے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ضعف اور اُن کی کمزوری کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس زمانہ میں اُن کی حالت اس قدر کمزور ہوگی اور اُن کا دوبارہ ترقی اور عروج حاصل کرنا بظاہر اس قدر ناممکن ہوگا کہ کفار اُن کو دیکھ دیکھ کر ہنسیں گے اور جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے یہ کہیں گے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے پھر ترقی عطا کرنے والا ہے تو وہ کہیں گے یہ تو پاگل ہو گئے ہیں۔ ان کے دماغ سلامت نہیں رہے۔ کہ یہ خیال کرتے ہیں انہیں حکومت مل جائے گی۔ دنیا میں ایک بہت بڑی تبدیلی ان کے ذریعہ ہوگی اور نظامِ نَو کو یہ لوگ قائم کریں گے۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِھِمْ یَتَغَامَزُوْنَ۔ اور

وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ۝

اور جب اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے تھے تو (مسلمانوں کے خلاف) خوب باتیں بناتے ہوئے لوٹتے تھے ۳۲

جب وہ ان کے پاس سے گذرتے ہیں تو وہ اُن کو دیکھکر آنکھیں مارتے ہیں۔ آنکھیں اُس وقت ماری جاتی ہیں جب انسان کسی دوسرے کے متعلق یہ یقین رکھتا ہو کہ وہ پاگل ہے اور وہ اپنے جنون کی حالت میں سمجھتا ہے کہ میں کامیاب ہو جاؤں گا اور دنیا کا بادشاہ بن جاؤنگا ایسی حالت میں لوگ اُس کو دیکھ دیکھ کر اپنے ساتھیوں کو توجہ دلانے کے لئے آنکھیں مارتے ہیں۔ اِس خیال سے کہ اگر ہم نے مُنہ سے کوئی بات کی تو یہ پیچھے پڑ جائے گا۔ پس فرماتا ہے یہ لوگ بھی جب مومنوں کو دیکھیں گے اور اُن کی زبان سے یہ باتیں سنیں گے کہ دنیا میں وہ ایک بہت بڑا تغیر پیدا کرنے والے ہیں تو وہ آپس میں آنکھیں ماریں گے کہ یہ لوگ تو پاگل ہوگئے ہیں۔

یہ بالکل وہی نقشہ ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی پر ہنسنے والوں کا تھا۔ جب حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالےٰ کے حکم ماتحت کشتی تیار کر رہے تھے تو کفار وہاں سے گذرتے اور اُن کو دیکھ دیکھکر ہنستے تھے کہ یہ تو پاگل ہوگیا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے اُس زمانہ میں مومن بظاہر ایسے ہی بے کار کاموں میں مشغول نظر آئیں گے اور جب کفار ان کو دیکھینگے تو وہ ایک دوسرے کو آنکھیں ماریں گے کہ دیکھو جی یہ پاگل کیا کر رہے ہیں۔

اِس آیت سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ غالب قوم میں اُس وقت تسامح ہوگا اور اُن کے ظاہری اخلاق اور ہوں گے اور باطنی اور۔ تغامز انسان اُسی جگہ کرتا ہے جہاں وہ سمجھتا ہے کہ میرا کچھ کہنا اخلاق کے خلاف ہے اور یہ بات یوروپین قوموں میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ اُن سے کوئی بات کرو وہ رسمی طور پر اُس وقت یہی کہیں گے کہ آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں مگر دل میں کہہ رہے ہوتے ہیں کہ یہ تو پاگل ہیں۔ پس يَتَغَامَزُوْنَ کہکر اللہ تعالےٰ نے یوروپین لوگوں کے اخلاق کا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ وہ ظاہر کچھ کریں گے اور اُن کے دل میں کچھ ہوگا۔

**۳۲ حل لغات۔** فَكِهِيْنَ: فَكِهٌ کی جمع ہے۔ کہتے ہیں۔ فَكِهَ الرَّجُلُ فَكَهًا وَفَكَاهَةً۔ كَانَ طَيِّبَ النَّفْسِ مَزَّاحًا ضَحُوْكًا یعنی وہ بڑی اچھی طبیعت والا بامذاق اور ہنسنے والا ہے یا فَكِهَ الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں يُحَدِّثُ اَصْحَابَهٗ فَيُضْحِكُهُمْ۔ وہ اپنے ساتھیوں سے اِس غرض کے لئے باتیں کرتا ہے تا کہ وہ ہنسیں۔ فَهُوَ فَاكِهٌ وَفَكِهٌ وَفَيْكَهَانٌ۔ اسے فَاكِهٌ۔ فَكِهٌ اور فَيْكَهَانٌ بھی کہتے ہیں اور فَكِهَ مِنْهُ کے معنے ہوتے ہیں تعجب۔ اُس نے تعجب کیا (اقرب)

**تفسیر۔** فرماتا ہے ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جب یہ اپنی قوم یا اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر جاتے ہیں تو خوب قہقہے لگاتے اور مذاق

وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ۝

اور جب (بھی) انہیں دیکھتے تھے کہتے تھے کہ یہ لوگ تو (بالکل) گمراہ ہیں ۲۴؎

وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ ۝

حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے ۲۵؎

کرتے جاتے ہیں کہ یہ کیسے بے وقوف لوگ ہیں۔ چونکہ فَکِہَ مِنْہُ کے معنے تعجب کرنے کے بھی ہیں اس لئے اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ تعجب کریں گے کہ یہ لوگ کیسے بے ہودہ خیالات میں پڑے ہوئے ہیں اور کیسی حماقت میں مبتلا ہیں کہ خیال کرتے ہیں اُن کی تعلیم اس ترقی اور تعلیم کے زمانہ میں پھیل جائے گی۔

**۲۴؎ تفسیر۔** رَاَوْھُمْ کی ضمیر دونوں طرف جا سکتی ہے یعنی اَھْل کی طرف بھی اور مُؤْمِنِیْن کی طرف بھی۔ یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ اِذَا رَاَوْا اَھْلَھُمْ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِذَا رَاَوُا الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی بعض حالتوں میں تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ صرف تغامز کرتے ہیں۔ لیکن بعض حالتوں میں وہ مومنوں کو دیکھ کر رُک نہیں سکتے بلکہ ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ یہ لوگ بڑے گمراہ اور بے وقوف ہیں اور چونکہ رَاَوْھُمْ کی ضمیر اَھْل کی طرف بھی جاتی ہے اس لئے اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ جب وہ اپنی قوم کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے ان لوگوں کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے ان سے ترقی کی امید کرنا بالکل غلط ہے۔ یہ لوگ آخر تباہ و برباد ہی ہوں گے۔ دنیا میں کوئی نیک تغیر پیدا نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں اُن کی یہ بات پہلی بات کی ضد ہو گی یعنی اُن کی حالت یہ ہے کہ وہ سامنے تو تغامز کرتے ہیں ایک پادری بھی آجائے تو وہ کہے گا کہ آپ لوگ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں لیکن جب اپنی قوم میں جاتے ہیں تو اسلام کے خلاف بڑی سخت کتابیں لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ تو بالکل گمراہ ہیں۔

رَاَوْھُمْ میں ھُمْ کی ضمیر کا مرجع

**۲۵؎ تفسیر۔** یہ بھی مغربی اقوام کی ایک خصوصیت ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی حفاظت کے بہانہ سے اُن پر قبضہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور جب پوچھو کہ تم نے فلاں ملک پر کیوں قبضہ کیا؟ تو کہتے ہیں ہم نے تو اُس ملک کی حفاظت کے لئے یہ کام کیا ہے۔ انہوں نے اسی حفاظت کے بہانہ سے ہندوستان لے لیا اور اسی حفاظت کے بہانہ سے افریقہ اور دوسرے ممالک پر قبضہ کر لیا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے یہ لوگ دوسروں کے محافظ بنا کر تو نہیں بھیجے گئے تھے پھر یہ کیوں ایسا کرتے ہیں کہ ہر ملک میں دخل دینا شروع کر دیتے ہیں اور اس کی

مَا اُرْسِلُوْا عَلَیْھِمْ حٰفِظِیْنَ میں مغربی اقوام کے ایک خاصہ کی طرف اشارہ

فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۝

پس جو ایمان لائے (وہ) اس (جزاء سزا کے) دن کفار پر ہنسیں گے ۵۲۶

عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ ۝

چھپر کھٹوں پر بیٹھے ہوئے (ان کا سب حال) دیکھ رہے ہونگے ۵۲۷

حفاظت کا بہانہ بنا کر اس پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس آیت میں درحقیقت سوال اور جواب دونوں آگئے ہیں مگر قرآن کریم کا یہ ایک نہایت ہی لطیف طریق ہے کہ وہ بعض دفعہ سوال چھوڑ دیتا ہے اور جواب دے دیتا ہے اور بعض دفعہ ایک حصہ بات کا بیان کر دیتا ہے اور دوسرا چھوڑ دیتا ہے کیونکہ وہ حصہ بیان کردہ حصہ کی وجہ سے خود ہی سمجھ میں آجاتا ہے۔

مَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ کی آیت سارے مضمون کا ایک حصہ ہے۔ بقیہ حصہ محذوف ہے جو یہ ہے کہ یہ لوگ کیوں دوسروں کے ملکوں پر قبضہ کئے بیٹھے ہیں حالانکہ اللہ تعالےٰ نے اُن کے سپرد یہ کام نہ کیا تھا کہ یہ دوسرے ملکوں میں گھس کر اُن پر قبضہ کریں اور عذر یہ کریں کہ ہم تو اس کی حفاظت کے لئے آئے ہیں گویا یہ خدا تعالےٰ کے مقرر کردہ داروغہ ہیں۔

**۵۲۶ تفسیر۔** فرماتا ہے اُس دن یا اگر فرض کیا جائے کہ وہ دن ذہن میں مستحضر کر کے بات کی جاتی ہے تو یوں کہا جائے گا کہ آج کے دن مومن کفار سے اُن کی ہنسی کا بدلہ لیں گے۔ مومن کی یہ شان نہیں ہوتی کہ وہ ہنسی اُڑائے یا تمسخر اور استہزاء سے کام لے۔ قرآن کریم نے اس کو جہالت کا کام قرار دیا ہے۔ پس یہاں يَضْحَكُونَ کے معنے ہنسی کرنے کے نہیں بلکہ ہنسی کا بدلہ لینے کے ہیں۔

يَضْحَكُونَ سے مراد ہنسی کا بدلہ لینے گے

**۵۲۷ تفسیر۔** یہاں پھر گذشتہ مضمون کو دُہرا دیا ہے کہ وہ تختوں پر بیٹھے ہوئے کس رنگ میں اُن سے بدلہ لیں گے۔ بُرے رنگ میں نہیں بلکہ اس اچھے رنگ میں کہ انہوں نے تو تختوں پر بیٹھ کر ظلم کئے تھے مگر وہ تختوں پر بیٹھ کر انصاف کرینگے۔ اور دیکھیں گے کہ کسی سے نا انصافی تو نہیں ہو رہی۔

مَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ میں مضمون کا پہلا حصہ حذف ہے

يَنْظُرُونَ کے معنے اس جگہ نگرانی اور تعہد کے لئے جائیں گے کہ مومن اُس دن ہر معاملہ پر نظر رکھیں گے اور دیکھیں گے کہ کسی پر ظلم نہ ہو۔

يَنْظُرُونَ سے مراد نگرانی کرنا

ع ۱ / ۸

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ع

(اور آپس میں کہینگے کہ) کیا کافروں کو جو کچھ وہ کیا کرتے تھے پورا بدلہ مل گیا (یا نہیں) ۲۸ ع

**۲۸ تفسیر** - ثُوِّبَ الْكُفَّارُ یا تو یَنْظُرُوْنَ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے کہ وہ دیکھیں گے کہ بدلہ کفار کو پورا پورا مل گیا ہے یا نہیں اور یا پھر اس کے یہ معنے ہیں کہ یُقَالُ لَهُمْ هَلْ ثُوِّبَ ۔ کفار سے کہا جائے گا کہ بتاؤ تمہارے اعمال کے نتائج نکل آئے ہیں یا نہیں تم سمجھتے تھے کہ اس تطفیف اور ظلم کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا اور تمہارا غلبہ قیامت تک چلتا چلا جائے گا اور عیسائی حکومتیں جو ظلم چاہیں گی لوگوں پر ڈھاتی رہیں گی ۔ اب بتاؤ تمہیں اپنے مظالم کا بدلہ مل گیا ہے یا نہیں ملا ؟

# سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ الانشقاق ۔ یہ سورۃ مکی ہے[۱]

## وَهِيَ خَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ

اور اس کی بسم اللہ کے علاوہ پچیس آیتیں ہیں

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

سورۃ الانشقاق مکی ہے

۱ه سورۃ الانشقاق مکی ہے۔ مضمون اور عبارت اور روایات سے ابتدائی زمانہ کی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا مضمون سورۃ تکویر۔ انفطار۔ اور تطفیف کے ساتھ ملتا ہے۔

سورۃ انشقاق کا تعلق پہلی سورتوں سے[۱]

اس سورۃ کا تعلق پہلی سورتوں سے ظاہر ہے۔ اپنے ساتھ کی سورۃ سے اس کا تعلق یہ ہے کہ اس میں فرمایا تھا هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ یعنی کفار جو سمجھتے تھے۔ کہ ان کی بے اعتدالیوں کا بدلہ نہ ملیگا۔ جب ان کی شان و شوکت خاک میں مل جائیگی۔ اور مسلمان عروج حاصل کرینگے۔ تو ان کفار کو کہا جائیگا۔ لو! دیکھ لو اپنی تباہی کیا تمہیں اپنی بے اعتدالیوں کا بدلہ ملا یا نہیں۔ اس وقت کفر کی طاقت ٹوٹ جائیگی۔ اور کفر کی تباہی کے ساتھ یہ لازمی ہوتا ہے۔ کہ ایمان کی ترقی ہو۔ کیونکہ روحانی اور جسمانی دنیا میں کبھی خلائے کامل نہیں ہوتا۔ جب بھی ایک چیز جاتی ہے۔ اس کی جگہ دوسری چیز لے لیتی ہے۔ اگر کفر جائیگا تو اس کی جگہ ایمان لے لیگا۔ اور اگر ایمان جائیگا تو اس کی جگہ کفر لے لیگا۔ چونکہ پچھلی سورۃ میں کفر کی تباہی کا ذکر تھا۔ اس لئے اس کے بعد آنے والی سورۃ میں ایمان کی ترقی کا ذکر فرمایا ہے۔ گویا اپنے ساتھ کی تین سورتوں سے جو اس کے ہم معنی اور ہم سلسلہ ہیں۔ اس کا یہ تعلق ہے کہ ان میں بنیادی مسئلہ کفر کی ترقی اور پھر اس کا انجام تھا اور اس میں بنیادی مسئلہ ایمان کے ظہور کا ہے۔ یوں ان پہلی تین سورتوں میں جس طرح آخری زمانہ کا ذکر ہے۔ اس سورۃ میں بھی آخری زمانہ کا ہی ذکر ہے۔

سورۃ انشقاق اور سورۃ انفطار کا باہمی جوڑ[۲]

سورۃ تطفیف کے متعلق میں نے بتایا تھا کہ درحقیقت وہ سورۃ انفطار کے تسلسل میں ہے پس اصل مضمون جو اس سورۃ سے پہلے ہم سمجھینگے۔ وہ سورۃ انفطار کا ہی ہوگا۔ سورۃ انفطار کو بھی آسمان کے لفظ سے شروع کیا گیا تھا۔ اور اس سورۃ کو بھی آسمان کے لفظ سے شروع کیا گیا ہے۔ اس جگہ آسمان کے ایسے پھٹنے کا ذکر کیا گیا تھا۔ جو خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکاتا ہے اور اس سورۃ میں آسمان کے ایسے پھٹنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی رحمت کو جذب کرتا ہے۔ پس یہ سورۃ اپنی پہلی تین سورتوں سے ملکر اسلام کے دوسرے غلبہ اور اس سے پہلے کی خرابیوں اور تلخیوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اور ہر سورۃ میں ایک نیا رنگ اختیار کیا گیا ہے۔ سورۃ انشقاق میں بھی آخری زمانہ کا ذکر ہے۔ مگر اس طرح کہ اس زمانہ میں خدا تعالیٰ آسمانی علوم کو ظاہر کریگا اور زمین ان کو قبول کریگی۔ گویا پہلی سورۃ میں آسمان پھٹنے سے مراد مسیحیت کے غلبہ کا ذکر تھا اور اس سورۃ میں آسمان کے پھٹنے سے مراد علوم آسمانیہ کا ظہور یا آسمانی بارش کا نزول ہے۔ اسی وجہ سے آذنت

# إِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝

جب آسمان پھٹ جائیگا[۲]

لِرَبِّهَا کے لفظ بعد میں رکھے گئے ہیں جس میں بتایا ہے۔ کہ اس جگہ آسمان کا پھٹنا اللہ تعالیٰ کی مخالفت میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں ہے۔

اِنْشَقَّتْ

**[۲] حل لغات۔** اِنْشَقَّتْ اِنْشَقَّ سے مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور اِنْشَقَّ شَقَّ سے باب انفعال ہے اور شَقَّ الشَّیْءَ شَقًّا کے معنی ہوتے ہیں۔ صَدَعَهٗ وَفَرَّقَهٗ اس کے اندر شگاف کر دیا اور اس کو الگ الگ کر دیا۔ چنانچہ اسی سے یہ محاورہ ہے۔ کہ شَقَّ عَصَا الْمُسْلِمِيْنَ اَیْ فَرَّقَ جَمْعَهُمْ وَکَلِمَتَهُمْ اس نے مسلمانوں کے عصا کو پھاڑ دیا۔ یعنی انکی جمعیت اور اتحاد کو پراگندہ کر دیا۔ اور شَقَّ نَابُ الْبَعِيْرِ اَوْ نَابُ الصَّبِیِّ وَشَقَّ الصُّبْحُ شُقُوْقًا کے معنی ہوتے ہیں طَلَعَ دانت نکل آئے یا صبح ظاہر ہو گئی اور شَقَّ النَّبْتُ شُقُوْقًا۔ اس وقت کہتے ہیں جب پہلی روئیدگی زمین میں سے پھوٹتی ہے۔ (اقرب) اور جب صرف شَقَّ الْعَصَا کہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں فَارَقَ الْجَمَاعَةَ وہ جماعت سے الگ ہو گیا۔ اور شَقَّقَ بھی انہی معنوں میں آتا ہے۔ کہتے ہیں شَقَّقَ الْحَطَبَ شَقَّقَهٗ اس نے لکڑی چیری۔ اور اِنْشَقَّ الشَّیْءُ کے معنی ہوتے ہیں۔ اِنْفَتَحَ فِيْهِ فُرْجَةٌ وَانْصَدَعَ کسی چیز میں شگاف ہو گیا۔ اور اِنْشَقَّ الْاَمْرُ کے معنی ہوتے ہیں۔ اِنْفَرَقَ وَتَبَدَّدَ اِخْتِلَافًا تفرقہ پیدا ہو گیا۔ اور افتراق کی وجہ سے اس میں پراگندگی پیدا ہو گئی۔ اور اِنْشَقَّ الْفَجْرُ کے معنی ہوتے ہیں طَلَعَ فجر ہو گئی۔ اور اِنْشَقَّ الْبَرْقُ کے معنی ہوتے ہیں اِنْعَقَّ بجلی بادلوں میں کوندتی ہوئی نکل گئی (اقرب) پس اِنْشَقَّتْ کے معنی ہونگے کوئی چیز پھٹ گئی اور اس کے پھٹنے سے دوسری چیز جو اس کے پیچھے تھی نظر آنے لگی۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ میں آسمان کا پھٹنا بطور رحمت کے ہے

**تفسیر۔** جیسا کہ حل لغات سے ظاہر ہے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ کے معنی یہ ہیں کہ آسمان پھٹ گیا۔ یا یہ کہ آسمان ظاہر ہو گیا۔ کیونکہ انشقاق کسی چیز کے باہر نکل آنے اور بجلی کے کوندنے اور فجر کے طلوع کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ درحقیقت انشقاق کے اصل میں دو ہی نتیجے ہوتے ہیں۔ یا تو کوئی چیز پھٹ کر ننگا ہو جاتی ہے۔ یا پیچھے جو چیز رکی ہوئی ہو وہ باہر آ جاتی ہے۔ بعض دفعہ کسی چیز کے باہر نکلنے میں کوئی روک حائل ہوتی ہے۔ جب سوراخ ہو جائے۔ تو وہ چیز باہر آ جاتی ہے۔ اس لحاظ سے آسمان پھٹنے سے عذاب اور رحمت دونوں کا نزول مراد لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ خدا کے پاس عذاب بھی ہے اور اس کے پاس رحمت بھی ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ میں آسمان کا ایسا پھٹنا مراد تھا۔ جس کے نتیجے عذاب تھا۔ مگر اس سورت میں ایسا پھٹنا مراد ہے جس کے پیچھے خدا تعالیٰ کا کلام یا الہام ہے یا ایسی ہی بات ہے۔ جیسے قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے۔ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء ع) یعنی کفار اس امر پر کیوں غور نہیں کرتے کہ آسمان اور زمین دونوں بالکل گیند سے بنے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے آسمان کو بھی پھاڑ دیا اور زمین کو بھی۔ یہاں آسمان پھٹنے سے نزول عذاب مراد نہیں۔ کیونکہ آگے فرماتا ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ۔ اور ہم نے پانی سے ہر شے کو زندہ کیا ہے کیا وہ ایمان نہیں لاتے۔ پس یہاں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت

# وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝

اور اپنے رب (کی بات سننے) کے لئے کان دھریگا۔ اور یہی (اسپر) فرض ہے ۳

کا ذکر فرمارہا ہے۔ کہ آسمان اور زمین دونوں بالکل بند تھے۔ اور ان میں کوئی سوراخ نہ تھا۔ نہ زمین اپنی روئیدگی نکالتی تھی۔ نہ آسمان پانی برساتا تھا۔ پھر ہم نے دونوں کو پھاڑ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آسمان سے پانی اترنا شروع ہوگیا۔ اور زمین میں سے روئیدگی نکلنی شروع ہوگئی۔ یہی مضمون یہاں دوسرے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے فرماتا ہے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ۔ عذاب الٰہی کے نزول کی وجہ سے اور کفر شرک اور بدعت کے پھیلنے کی وجہ سے جن کا پہلی سورتوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ آسمان نے اپنی برکتیں روک لی تھیں۔ اور وہ بالکل سمٹ گیا تھا۔ اس میں کوئی سوراخ نہ تھا۔ جس میں سے زمین والوں پر رحمتیں نازل ہوتیں صرف وہی سوراخ کھلا تھا جس میں سے غضب اور عذاب نازل ہوتے ہیں۔ پھر خدا نے اپنے بندوں پر رحم کیا۔ اور اسے اس طرح پھاڑا۔ کہ اس میں سے رحم نازل ہونا شروع ہوگیا۔ چنانچہ آگے اس کی دلیل دے دی کہ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ۔ یہ آسمان کا پھٹنا فرمانبرداری اور اطاعت کے لئے ہے۔ جس طرح پہلا پھٹنا نافرمانی اور گناہ کی وجہ سے تھا یعنی اب وہ رحمت کے لئے اور کلام الٰہی کے نزول کے لئے پھٹا ہے۔

**۳ حل لغات۔** اَذِنَتْ اَذِنَ سے مؤنث کا صیغہ ہے۔ اور اَذِنَ بِالشَّیْءِ اِذْنًا وَاَذَنًا وَاَذَانًا وَاَذَانَةً کے معنی ہوتے ہیں عَلِمَ بِهٖ۔ یعنی اس کا علم حاصل کیا۔ اور اَذِنَ لَهٗ فِی الشَّیْءِ اِذْنًا وَاَذِیْنًا کے معنی ہوتے ہیں اَبَاحَهٗ لَهٗ اس کو اجازت دی۔ اور اَذِنَ اِلَیْهِ اَذَنًا کے معنی ہوتے ہیں اِسْتَمَعَ اس کی بات کو سنا (اقرب) مفردات میں لکھا ہے۔ وَاَذِنَ اِسْتَمَعَ نَحْوَ قَوْلِهٖ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ یعنی اَذِنَ کے معنی سننے کے بھی ہوتے ہیں۔ بخاری میں حدیث آتی ہے۔ کہ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا اَذِنَ اللّٰهُ لِشَیْءٍ مَا اَذِنَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَتَغَنّٰی بِالْقُرْاٰنِ (بخاری کتاب فضائل القرآن باب من لم یتغن بالقرآن) یعنی اللہ تعالیٰ کسی بات کو اس طرح شوق سے نہیں سنتا جیسے اپنے نبی کی بات کو جب وہ قرآن پڑھ رہا ہو۔

حُقَّتْ حَقَّ سے ہے۔ اور حَقَّ عَلَیْكَ وَیَحِقُّ عَلَیْكَ وَحُقَّ لَكَ اَنْ تَفْعَلَ كَذَا کے معنی ہوتے ہیں وَجَبَ عَلَیْكَ تجھ پر یہ بات واجب ہے (اقرب) پس اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ کے معنی یہ ہوئے کہ حُقَّ لَهَا اَنْ تَفْعَلَ كَذَا۔ یعنی وہ اپنے رب کی بات پر کان دھریگا اور وہ اسی لائق ہے کہ اپنے رب کی بات کو اچھی طرح سنے۔ اس پر غور کرے اور اس کے حکم کی اطاعت کرے

**تفسیر۔** اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ کہ آخری زمانہ میں جہاں خدا تعالیٰ کے غضب نازل ہونگے۔ اور اس کی طرف سے کئی قسم کی آفات اترینگی۔ وہاں یہ بھی سامان کئے جائینگے کہ آسمان سے کلام الٰہی نازل ہو۔ انشقاق آسمان درحقیقت بارش پر دلالت کرتا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ایک قوم کے لئے آسمان پھٹے گا۔ تاکہ اس پر غضب کا مینہ برسے اور ایک اور قوم پر بھی آسمان پھٹے گا۔ مگر اس لئے کہ اس پر رحمت کی بارش نازل ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے کلام اور آسمانی علوم کا ظہور ہو۔ گویا قرآن مردہ ہوچکا ہوگا مگر اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ پھر علوم قرآنیہ کو آسمان سے نازل کریگا۔ اور اپنے کلام اور الہام کی بارش برسیگا

حُقَّتْ

اَذِنَتْ

# وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝

اور جب زمین پھیلا دی جائے گی ۳؎

انشقاق سماء سے مراد پیدائش آدم

اس آیت کے ایک اور معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں دُوسری جگہ آتا ہے۔ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۙ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا (الحاقہ ع) یعنی آسمان پھٹے گا۔ اور فرشتے اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے اس کے کناروں پر آکر کھڑے ہو جائینگے اس آیت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے زیرِ تفسیر آیت کے معنی یہ ہونگے کہ جس طرح آدمِ اوّل کی پیدائش پر فرشتوں سے کہا گیا تھا۔ کہ اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ اسی طرح آخری زمانہ میں آسمان پھٹے گا۔ اور فرشتے اطاعت کے لئے کھڑے ہو جائینگے یعنی ایک نیا روحانی آدم پیدا کیا جائیگا اور فرشتے احکامِ الٰہی کی بجا آوری کے لئے کمربستہ و تیار ہو جائینگے۔

مُدَّتْ

پس اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ کا ایک مطلب یہ ہوا کہ ایک نیا آدم پیدا ہوگا ایک نئی رُوح دنیا میں آئیگی۔ آسمان کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ اور فرشتے بار بار آئینگے تاکہ اس کی مدد اور نصرت کریں۔

اَذِنَتْ لِرَبِّهَا کے ساتھ لفظ حُقَّتْ لانے کی وجہ

اس جگہ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حُقَّتْ بھی فرمایا ہے کہ آسمان اپنے رب کی بات پر کان دھریگا اور وہ اسی بات کا اہل تھا۔ یہ حُقَّتْ کا لفظ انقیاد کی شدّت بتانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ یوں خالی انقیاد کا اظہار بھی کافی تھا مگر حُقَّتْ کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ اسی لائق تھا۔ اور اسی غرض کے لئے اس کو بنایا گیا تھا۔ اور جو چیز کسی خاص غرض کے لئے بنائی جاتی ہے۔ اس کا فعل دوسروں سے زیادہ اعلیٰ ہوتا ہے۔ ایک کام چھری کا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس چاقو ہو۔ تو وہ بھی چھری کا کام دے دیگا۔ مگر وہ کام ایسا اچھا نہیں ہوگا جیسے چھری سے کام ہو سکتا تھا۔ یا ایک کام تلوار کا ہے۔ ہمارے پاس تلوار نہ ہو۔ تو گو چھری بھی کچھ کام دے جائیگی۔ مگر ایسا اچھا کام نہیں دیگی۔ جیسے تلوار دے سکتی تھی۔ تو جو چیز جس غرض کے لئے بنائی گئی ہو۔ اس کا فعل دُوسری چیزوں سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ پس حُقَّتْ کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اطاعت و فرمانبرداری میں کمال دکھائینگے۔ کیونکہ ان کو خدا نے پیدا ہی اس لئے کیا ہے۔ اور ان کے اندر اس نے یہ قابلیت رکھی ہے۔ کہ وہ خدا تعالےٰ کے احکام کو پُورا کریں۔

۳؎ **حل لغات** مُدَّتْ مَدَّ سے ہے۔ اور مَدَّ اللّٰهُ الْاَرْضَ کے معنی ہوتے ہیں بَسَطَهَا زمین کو خدا نے پھیلایا۔ مَدَّ اللّٰهُ عُمُرَهٗ کے معنی ہوتے ہیں اَطَالَهٗ اللہ نے اس کی عمر کو لمبا کر دیا۔ اور مَدَّ الْمَدْيُوْنَ کے معنے ہوتے ہیں اَمْهَلَهٗ مقروض کو اس نے مہلت دے دی۔ اور مَدَّ الْقَوْمَ کے معنی ہوتے ہیں صَارَ لَهُمْ مَدَدًا وَّ اَغَاثَهُمْ بِنَفْسِهٖ اس نے لوگوں کی مدد کی۔ اور ان کی فریاد کو سنا وَفِي اللِّسَانِ مَدَدْتُ الْاَرْضَ مَدًّا اِذَا زِدْتَ فِيْهَا تُرَابًا اَوْ سَمَادًا مِنْ غَيْرِهَا لِيَكُوْنَ اَعْمَرَ لَهَا وَاَكْثَرَ رَيْعًا لِزَرْعِهَا۔ لسان میں لکھا ہے۔ کہ مَدَدْتُ الْاَرْضَ اس وقت کہتے ہیں جب زمین کے اندر اچھی مٹی جو تازہ ہو۔ یا مٹی میں ملی ہوئی کھاد ڈالی جائے۔ تاکہ کھیتی خوب ہو۔ اور مَدَّ السِّرَاجَ بِالسَّلِيْطِ کے معنی ہوتے ہیں صَبَّ فِيْهِ زَيْتًا اس نے دیئے میں تیل ڈالا (اقرب)۔ پس مُدَّتْ کے معنی ہونگے پھیلائی جائیگی (۲) اس کی کمی پُوری کی جائیگی۔ اس کو مہلت دی جائیگی۔ (۳) اس کی فریاد سنی جائیگی۔

# وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ۝

اور جو کچھ اس میں ہے اس کو نکال پھینکے گی۔ اور خالی ہو جائے گی ؎

تفسیر۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مَدَّ اللّٰهُ الْاَرْضَ کے معنی ہوتے ہیں بَسَطَهَا۔ زمین کو خدا نے پھیلا دیا۔ اس لحاظ سے وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ کے معنی ہونگے جب زمین پھیلائی جائیگی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے۔ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا (الحجر ع۲) کہ زمین کو ہم نے پھیلا دیا ہے۔ پس جبکہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی پھیلا رکھا ہے۔ تو اس کے بعد یہ فرمانا کہ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ۔ پھر ایک زمانہ میں زمین پھیلائی جائیگی۔ اس کے سوائے اس کے اور کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ کہ پہلی زمین کفر اور گناہ کی وجہ سے تباہ ہو چکی ہوگی تب اللہ تعالیٰ ایک نئی زمین لوگوں کے لئے پیدا فرمائیگا۔ پس وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ کے الفاظ ایک نئی زمین کی پیدائش کے معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ اور بتایا گیا ہے کہ زمین اپنی پہلی قابلیتیں کفر اور گناہوں کی کثرت کی وجہ سے کھو چکی ہوگی۔ اس لئے آسمان کو پھاڑنے کے بعد خدا تعالیٰ زمین کو بھی اس قابل بنائیگا۔ کہ اس کے انوار کو جذب کر سکے۔

مَدَّ کے دوسرے معنی اَطَالَ اللّٰهُ عُمُرَهٗ کے ہوتے ہیں۔ کہ اللہ نے اس کی عمر کو لمبا کر دیا۔ اسی طرح کہتے ہیں مَدَّ الْمَدْيُوْنَ اَمْهَلَهٗ۔ اس نے اپنے مقروض کو مہلت دیدی۔ اس لحاظ سے آیت کے یہ معنی ہونگے۔ کہ جب کفر اور شرک کی کثرت کی وجہ سے آسمان پھٹ جائیگا۔ اس وقت زمین بھی اپنے گناہوں کی وجہ سے اس بات کی مستحق ہوگی کہ اسے تباہ کر دیا جائے۔ لیکن اس نئے آسمانی شگاف کی وجہ سے جس سے اللہ تعالیٰ کے انوار اور اس کی برکات نازل ہونگی زمین اس بات کی مستحق ہوگی۔ کہ اسے مہلت دی جائے۔ اور اس کی عمر کو لمبا کر دیا جائے۔ اگر نبی کے آنے کے ساتھ ہی قیامت آجائے۔ تو اس کی بعثت کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہوتا ہے کہ زمین والوں کو مہلت دی جائے۔ اور انہیں موقعہ دیا جائے۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کی باتوں پر غور کریں۔ پس وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ کے یہ معنی ہیں۔ کہ زمین کی عمر لمبی کر دی جائیگی۔ اور اسے مہلت دی جائیگی۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کی برکات سے فائدہ اٹھا سکے۔ اسی طرح مَدَّ الْقَوْمَ کے ایک معنی ہیں صَارَ لَهُمْ مَدَدًا وَاَغَاثَهُمْ بِنَفْسِهٖ ان معنوں کے لحاظ سے وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ کا یہ مطلب ہوگا۔ کہ جب زمین کی فریاد کو خدا پہنچیگا۔ یعنی لوگوں کے گناہوں اور شرک کی وجہ سے زمین اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کریگی۔ کہ الٰہی میں گندی ہو گئی ہوں خراب ہو گئی ہوں۔ اور لوگوں نے اپنے گناہوں کی وجہ سے مجھے بگاڑ دیا ہے۔ پس جب آسمان پھٹے گا تو فرشتے اتریںگے۔ اور زمین کی مدد کرینگے۔ گویا زمین کی پکار اور اس کی فریاد سنی جائیگی۔

لسان العرب میں جو معنی مَدَّ کے کئے گئے ہیں۔ اور جو حل لغات میں لکھے جا چکے ہیں۔ کہ مَدَّ کے معنی کھاد ڈالنے کے بھی ہوتے ہیں۔ ان کے اعتبار سے وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ کے یہ معنی ہونگے کہ زمین میں کھاد ڈالی جائیگی۔ اور خدا تعالیٰ روحانی ترقیات کے ابھرنے کے نئے سامان کریگا۔ اسی طرح حل لغات میں لکھا گیا ہے کہ مَدَّ السِّرَاجَ بِالسَّلِيْطِ کے معنی ہوتے ہیں کہ صَبَّ فِيْهِ زَيْتًا۔ اسنے دیئے میں تیل ڈالا۔ تیل ڈالنے کے معنی حیات کے بھی لئے جا سکتے ہیں۔ اور دوبارہ قابلیتوں کے پیدا کرنے کے بھی لئے جا سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ کا یہ مطلب ہوگا کہ زمین میں نئی قابلیتیں پیدا کر دی جائینگی۔ غرض اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ زمین کو نئی عمر دی جائیگی۔ اس کی ہلاکت کو اللہ تعالیٰ پیچھے ڈال دیگا۔ اور اس میں کھاد ڈالیگا۔ تاکہ وہ ترقی کرے

(حاشیہ: وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ کے چار معنے)

(حاشیہ: تَخَلَّتْ)

؎ حل لغات۔ تَخَلَّتْ تَخَلِّیْ سے مونث کا صیغہ

ہے۔ اور تَخَلّٰی مِنْہُ وَعَنْہُ کے معنی ہوتے ہیں ترک کیا اس کو چھوڑ دیا۔ اور تَخَلّٰی لَہٗ کے معنی ہوتے ہیں۔ تَفَرَّغَ لَہٗ کسی کے لئے فارغ ہو گیا۔ پس تَخَلَّتْ کے معنی ہونگے وہ چھوڑ دیگی یا الگ کر دیگی۔

وَاَلْقَتْ مَا فِیْہَا وَتَخَلَّتْ سے مراد مامور کی جماعت

**تفسیر**۔ اس آیت کے معنی ایک تو یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ اپنے اس مامور کو جس کے لئے آسمان پھٹے گا۔ اور فرشتے آسمان سے اتریں گے۔ ایسی جماعت عطا فرمائیگا جو قربانی کرنے والی ہوگی اور قربانی بھی معمولی نہیں بلکہ اَلْقَتْ مَا فِیْہَا وَتَخَلَّتْ اپنے مال اور اپنی جان اور اپنی عزت اور اپنے وطن اور اپنے آرام اور اپنے جذبات غرض ہر چیز کی وہ انتہائی طور پر قربانی کرنے والی ہوگی۔ اور خدا تعالےٰ کی راہ میں کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریگی۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جو جماعت عطا فرمائی وہ ایسی ہی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس زمانہ میں جس میں ہماری جماعت پیدا کی گئی ہے کئی وجوہ سے اس جماعت کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشابہت ہے۔ وہ معجزات اور نشانوں کو دیکھتے ہیں جیسا کہ صحابہؓ نے دیکھا۔ وہ خدا تعالیٰ کے نشانوں اور تازہ بتازہ تائیدات سے نور اور یقین پاتے ہیں جیسا کہ صحابہؓ نے پایا۔ وہ خدا کی راہ میں لوگوں کے ٹھٹھے اور ہنسی اور لعن طعن اور طرح طرح کی دل آزاری اور بدزبانی اور قطع رحم وغیرہ کا صدمہ اٹھا رہے ہیں جیسا کہ صحابہؓ نے اٹھایا۔ وہ خدا کے کھلے کھلے نشانوں اور آسمانی مددوں اور حکمت کی تعلیم سے پاک زندگی حاصل کرتے جاتے ہیں۔ جیسا کہ صحابہؓ نے حاصل کی۔ بہتیرے ان میں سے ہیں کہ نماز میں روتے اور سجدہ گاہوں کو آنسوؤں سے تر کرتے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم روتے تھے۔ بہتیرے ان میں سے ایسے ہیں۔ جن کو سچی خوابیں آتی ہیں۔ اور الہام الٰہی سے مشرف ہوتے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہوتے تھے۔ بہتیرے ان میں سے ایسے ہیں۔ کہ اپنے محنت سے کمائے ہوئے مالوں کو محض خدا تعالیٰ کی مرضات کے لئے ہمارے سلسلہ میں خرچ کرتے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم خرچ کرتے تھے۔ ان میں ایسے کئی لوگ پاؤ گے کہ جو موت کو یاد رکھتے اور دلوں کے نرم اور سچی تقویٰ پر قدم مار رہے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت تھی۔ وہ خدا کا گروہ ہے جس کو خدا آپ سنبھال رہا ہے۔ اور دن بدن ان کے دلوں کو پاک کر رہا ہے۔ اور ان کے سینوں کو آسمانی حکمتوں سے بھر رہا ہے۔ اور آسمانی نشانوں سے ان کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ جیسا کہ صحابہ کو کھینچتا تھا غرض اس جماعت میں وہ ساری علامتیں پائی جاتی ہیں جو اٰخَرِیْنَ مِنْہُمْ کے لفظ سے مفہوم ہو رہی ہیں۔ اور ضرور تھا کہ خدا کا فرمودہ ایک دن پورا ہوتا" (ایام الصلح صفحہ ۷۲)

اسی طرح فرماتے ہیں:۔

"میں دیکھتا ہوں کہ میری جماعت نے جس قدر نیکی اور صلاحیت میں ترقی کی ہے۔ یہ بھی ایک معجزہ ہے۔ ہزارہا آدمی دل سے فدا ہیں۔ اگر آج ان کو کہا جائے۔ کہ اپنے تمام اموال سے دست بردار ہو جاؤ۔ تو وہ دستبردار ہو جانے کے لئے مستعد ہیں۔ پھر بھی میں ہمیشہ ان کو اور ترقیات کے لئے ترغیب دیتا ہوں۔ اور ان کی نیکیاں ان کو نہیں سناتا مگر دل میں خوش ہوں"۔ (الذکر الحکیم نمبر ۴ صفحہ ۱۰)

غرض اَلْقَتْ مَا فِیْہَا وَتَخَلَّتْ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ اس زمانہ کے مامور کو ایسی جماعت عطا فرمائیگا۔ جو خدا اور اس کے رسول کے لئے ان تمام چیزوں کو پھینک دیگی جو اس کے پاس ہونگی اور خالی ہو جائیگی۔

اَلْقَتْ مَا فِیْہَا وَتَخَلَّتْ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ لوگ اپنی اندرونی قابلیتوں سے پورا پورا کام لینگے۔

# وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝

اور اپنے رب (کی بات سننے) کے لئے کان دھریگی۔ اور یہی (اس پر) فرض ہے ۝

# يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا

اے انسان تو اپنے رب کی طرف پورا زور لگا کر جانے والا ہے۔ (اور) پھر اس سے

# فَمُلٰقِيْهِ ۝

ملنے والا ہے ؀

اسی طرح اَلْقَتْ مَافِيْهَا وَتَخَلَّتْ سے یہ بھی مراد ہے کہ نفوسِ پاکیزہ اس دن کلام الٰہی کو سننے کے لئے تیار ہوجائینگے۔ اور آسمانی بارش اس پر نازل ہوگی۔ اور دلوں کو اس طرح تیار کردیا جائیگا۔ جس طرح زمین کو کھاد ڈال کر ہل چلاکر اور سہاگہ دیکر درست کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مُدَّتْ میں یہ سب امور شامل ہیں۔

اسی طرح ان الفاظ میں اس امر کیطرف بھی اشارہ تھا کہ تمام روحانی اور جسمانی علوم کو زمین باہر نکال دیگی۔ اور کوئی چیز مخفی نہیں رہیگی۔ گویا اس زمانہ میں روحانی اور جسمانی علوم کا ایسا اجتماع ہوگا۔ جس کی مثال پہلے کبی زمانہ میں نہیں ملیگی۔ پس اَلْقَتْ مَافِيْهَا وَتَخَلَّتْ کے معنی یہ ہوئے کہ زمین اس زمانہ میں اپنے سارے خزانے اگل دیگی۔ یعنی وہ وقت علوم کی ترقی کا ہوگا۔ اور علوم آسمانی اور علوم زمینی دونوں کا اس زمانہ میں مکمل ظہور ہوگا ظاہری لحاظ سے اس کے یہ معنی ہونگے۔ کہ زمین میں ایسے تغیرات ہونگے۔ کہ جو کچھ اس میں ہوگا۔ وہ اسے باہر پھینکنا شروع کردیگی۔ چنانچہ پٹرول۔ مٹی کا تیل ہزاروں قسم کی دوائیں ویزلین۔ گلیسرین۔ ریڈیم اور کئی قسم کی دھاتیں اور دوسری قابل استعمال اشیاء زمین میں سے ہی نکلی ہیں۔ گویا اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ کہ وہ زمانہ ایسا ہوگا۔ کہ اِدھر آسمان سب کچھ پھینک دیگا۔ اور اُدھر زمین جو کچھ اس میں ہوگا نکالکر باہر پھینک دیگی۔ یہی مضمون دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (سورۃ الزلزال) یعنی ایک زمانہ ایسا آنیوالا ہے جب زمین کو خوب جھنجھوڑا جائیگا۔ اور وہ اپنے تمام بوجھوں کو نکالکر خالی ہوجائیگی۔

اَلْقَتْ مَافِيْهَا وَتَخَلَّتْ کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں۔ کہ زمین اپنے گناہوں کا کفارہ اداکریگی یعنی جو کچھ گند اس میں مخفی ہوگا وہ سب پھینک دیگی نیکیوں میں ترقی کریگی۔ گناہوں سے بیزار ہوجائیگی۔ اور آسمانی مدد اور نصرت کی وجہ سے اسکی ایسی اصلاح ہوجائیگی کہ زمین میں جسقدر نقائص پائے جاتے ہیں سب پھینک کر خالی ہوجائیگی۔

۵ **تفسیر**۔ یہ کفروالی زمین کا ذکر نہیں بلکہ ایمان والی زمین کا ذکر ہے کہ وہ اپنے رب کے لئے کان رکھیگی۔ خالی استماع اور چیز ہے۔ اور اسمیں اتنی توجہ نہیں پائی جاتی جتنی توجہ اس شخص کے اندر ہوتی ہے۔ جو کان لگاکر بیٹھا ہوا ہو کہ کوئی بات رہ نہ جائے۔ پس فرمایا ہے وہ زمین اپنے رب کی باتیں سننے کے لئے کان لگائے بیٹھی رہیگی وَحُقَّتْ اور یہ زمین ہے ہی اس قابل یعنی ہم زمین میں بھی ایسی قابلیت پیدا کردینگے کہ خدا تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور اطاعت کا مادہ اسمیں پیدا ہوجائیگا

۶ **حل لغات**۔ كَادِحٌ كَدَحَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے

ا
اَلْقَتْ مَا
فِيْهَا وَتَخَلَّتْ
کے پانچ معنی

۲
كَادِحٌ

اور کَدَح کے معنی ہوتے ہیں پُوری محنت کرنا۔ ایسی محنت کرنا جس کا جسم پر اثر پڑ جائے۔ کہتے ہیں کَدَحَ (یَکْدَحُ کَدْحاً) اَیْ سَعٰی وَعَمِلَ لِنَفْسِہٖ خَیْراً اَوْ شَرّاً وَکَدَّ۔ اس نے کام کرنے کی کوشش کی۔ چاہے وُہ کوشش اچھی تھی یا بُری۔ اور خوب محنت سے کام لیا وَقِیْلَ اَلْکَدْحُ جُھْدُ النَّفْسِ فِی الْعَمَلِ وَالْکَدُّ فِیْہِ حَتّٰی یُؤَثِّرَ فِیْھَا۔ بعض لغوی کہتے ہیں کہ کدح اس کام کو کہتے ہیں۔ جو اتنی محنت سے کیا جائے کہ انسان کی صحت برباد ہو جائے۔ اس کی ہڈیاں گھُل جائیں اور اس کے جسم کے اندر تک اثر پہونچ جائے۔ (اقرب) پس کَادِحٌ کے معنی ہونگے۔ پُوری محنت و مشقت کرنے والا

**تفسیر**۔ فرماتا ہے اے انسان تو پوری جدوجہد کریگا۔ پوری محنت کریگا اپنے رب کی طرف جانے کی فَمُلٰقِیْہِ اور آخر تو اس سے جا کر مل ہی جائیگا۔

۲۱
خدا کو پانے کے لئے انتہائی محنت کی ضرورت

یہاں یٰۤاَیُّھَا الْاِنْسَانُ میں یا تو عام قاعدہ بیان کیا گیا ہے۔ اور یا اس سے مراد صرف وقت کا امام ہے یعنی یا تو اس سے یہ مراد ہے۔ کہ اے انسان تیرے لئے اپنے رب سے ملنے کا رستہ کھلا ہے۔ شرط یہ ہے کہ تیری طرف سے کدح ہونا چاہیئے۔ اِن معنوں کے لحاظ سے ہر انسان اِس میں شامل ہے۔ اور یا پھر ہر انسان براہ راست اس میں شامل نہیں۔ بلکہ کامل انسان کے تابع ہو کر شامل ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ اے کامل انسان تو اپنے رب کو پانے کے لئے بڑی قربانیاں کریگا۔ اور آخر ایک دن اس کو پا ہی لیگا۔ اور جب کوئی کامل انسان اس کو پا لیتا ہے۔ تو پھر سب کو حکم ہو جاتا ہے کہ تم بھی اسی راستہ پر چلو۔ اور خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرلو

اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کے رستے کا ملنا معمولی بات نہیں ہوتی۔ اِس غرض کے لئے انسان کو اتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ کہ اس کی ہڈیوں تک اثر پہونچ جاتا ہے۔ یہی وُہ نکتہ ہے جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ لقاءِ الٰہی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب انہیں ایمان نصیب ہو گیا۔ تو کچھ دیر بیٹھ کر ایمان کی باتوں کا مزہ لے لینے اور نماز روزہ ظاہری طور پر ادا کر لینے سے ہی ان کی روحانیت کامل ہو جائیگی۔ حالانکہ روحانیت کامل ہوتی ہے اس غم کی وجہ سے جو عشق سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کے اثر سے انسان کی ہڈیاں تک گھُل جاتی ہیں۔ جب تک انسان کے دل میں خدا تعالیٰ کے متعلق یہ رغبت پیدا نہ ہو۔ یہ غم پیدا نہ ہو۔ یہ عشق اور محبت پیدا نہ ہو۔ اس وقت تک مُلٰقِیْہِ کا مقام اسے میسر نہیں آسکتا۔ باقی نماز پڑھ لینا یا روزے رکھ کر یہ سمجھ لینا کہ میں نے بڑی مشقت برداشت کرلی ہے۔ ایسی باتیں نہیں ہیں۔ جو کدح میں شامل ہوں۔ اِس سے بہت زیادہ مشقت طلب کام لوگ کرتے ہیں۔ جولاہوں کو دیکھ کر وُہ کتنی محنت کرتے ہیں۔ دھوبیوں کو دیکھ لو۔ وہ کس قدر مشقت کا کام کرتے ہیں۔ سقوں کو دیکھ لو۔ وہ کس قدر تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ مگر یہ نہیں ہوتا۔ کہ اس کام سے ان کی ہڈیاں گھلنی شروع ہو جائیں۔ کام کا جتنا اثر ہوتا ہے صرف جسم پر ہوتا ہے۔ جو کچھ دیر کے بعد زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ کَادِحٌ کا لفظ استعمال فرماتا ہے اور کدح اس بات کو کہتے ہیں کہ انسان ایسا عمل کرے کہ یوں معلوم ہو اس کی صحت بگڑ جائیگی۔ اس کی ہڈیاں گھُل جائینگی۔ اور اس کا جسم تباہ ہو جائیگا۔ جب انسان اس رنگ میں کام کرتا ہے۔ تب اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے اس کے بغیر اس کا اپنی کامیابی کے متعلق امید رکھنا غلطی ہوتی ہے۔ میں نے اپنی جماعت میں خدام الاحمدیہ اور انصار اللہ کو اسی غرض کے لئے قائم کیا ہے۔ کہ وُہ محنت کریں اور مشقت طلب کاموں کی اپنے اندر عادت پیدا کریں۔ جب تک انسان اپنے اوقات کو ضائع ہونے سے نہیں بچاتا اسے خدا نہیں مل سکتا۔ خدام الاحمدیہ اور انصار اللہ کے قیام کا اصل مقصد یہ ہے۔ کہ جماعت میں مشقت طلب کاموں کی عادت پیدا ہو۔ اور ہر فرد کسی نہ کسی کام میں مشغول

ہے۔ پس یٰۤاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ جب تک ہر انسان اپنے آپکو کام کرتے کرتے فنا نہیں کر دیتا۔ اس وقت تک قومی طور پر خدا نظر نہیں آسکتا۔ انفرادی طور پر بے شک کدح کے بعد انسان کو لقاء الٰہی حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر قومی طور پر اسی وقت لقاء الٰہی کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ جب قوم کا ہر فرد اپنے آپ کو فنا کر دیتا ہے۔

دنیا میں لقاء الٰہی دو طرح حاصل ہوتا ہے۔ ایک فردی طور پر اور ایک قومی طور پر۔ اگر قوم تباہ بھی ہو چکی ہو تب بھی فردی طور پر انسان خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔ جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے قبل باوجود اس کے کہ مسلمان قومی طور پر تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ ان میں بعض بزرگ پائے جاتے تھے۔ مثلاً حضرت عبد اللہ غزنوی کے متعلق خود حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لکھا ہے کہ وہ بزرگ انسان تھے۔ اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے حضرت سید احمد صاحب بریلوی یا حضرت مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شہید اور اسی طرح بعض اور بزرگ گذرے ہیں۔ مگر یہ چالیس کروڑ مسلمانوں میں سے چند نفوس تھے۔ جو خدا تعالیٰ سے ملے ان لوگوں کو خدا تعالیٰ نے یہ دکھانے کے لئے بھیجا تھا کہ اسلام اب بھی اپنے اندر طاقت رکھتا ہے اور اب بھی وہ لوگوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ اب بھی وہ انہیں خدا تعالیٰ کے دربار تک پہنچا سکتا ہے۔ مگر قومی طور پر ان کے وجود سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ پس حضرت سید احمد صاحب بریلوی کیا تھے۔ وہ درحقیقت حجت تھے سستوں پر۔ وہ حجت تھے غافلوں پر اور وہ یہ بتانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ کہ اسلام اب بھی اپنے اندر زندگی بخش اثرات رکھتا ہے۔ اسی طرح حضرت سید اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کیا تھے وہ حجت تھے سستوں پر۔ وہ حجت تھے غافلوں پر۔ اور وہ یہ بتانے کے لئے بھیجے گئے تھے کہ اسلام اب بھی اپنے اندر زندگی بخش اثرات رکھتا ہے۔ مگر بحیثیت قوم اسلام کو ان کے وجود سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ کیونکہ اسلام نام تھا چالیس کروڑ افراد کا جن میں سے کوئی چین میں رہتے تھے کوئی جاپان میں رہتے تھے۔ کوئی سماٹرا اور جاوا میں رہتے تھے۔ اور کوئی دوسرے ممالک میں رہتے تھے۔ اور یہ وہ ممالک ہیں جہاں ان لوگوں کی کوئی آواز نہیں پہنچی۔ یوں ہماری جماعت بھی ابھی چھوٹی سی ہے۔ مگر ہماری جماعت وہ ہے جو خدا تعالیٰ کے فضل سے مختلف ممالک میں پھیل رہی ہے۔ پس وہ لوگ صرف غافلوں پر حجت تھے۔ اور اس بات کی دلیل تھے کہ خدا اب بھی لوگوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ ورنہ ان کے زمانہ میں قومی طور پر مسلمانوں نے خدا تعالیٰ کے چہرہ کو نہیں دیکھا۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰۤاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ[1] اے جماعتِ مومنین کے ہر فرد تم میں سے ہر شخص کو اس راستہ میں اپنے آپ کو فنا کر دینا پڑیگا۔ تب تمہیں قومی طور پر خدا تعالیٰ کا چہرہ نظر آئیگا۔ اور اس کے لقا کی نعمت تمہیں میسر آئیگی۔ اور یہی نعمت حقیقی نعمت ہوتی ہے۔ ورنہ انفرادی طور پر تو ہر زمانہ میں لوگ خدا تعالیٰ کو پاتے رہتے ہیں۔ لیکن انفرادی طور پر خدا تعالیٰ کو پا لینے سے قوم کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ قومی طور پر اسی وقت خدا تعالیٰ کا جلال ظاہر ہوتا ہے اور قوم کا ہر فرد خدا تعالیٰ کا چہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ جب ہر فرد اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے قرب کے راستوں میں فنا کر دیتا ہے۔ اور اس وقت تک پیچھے نہیں ہٹتا۔ جب تک اس نعمتِ عظیمہ کو حاصل نہیں کر لیتا

مُلٰقِیْهِ کی ضمیر جزا کی طرف بھی جا سکتی ہے مگر جو معنی اس وقت میں کر رہا ہوں۔ اس لحاظ سے خدا کا ملنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ گو جزا کی طرف بھی اس کی

[1] ملاقیہ میں ضمیر جزا کی طرف بھی جا سکتی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَسَوْفَ

پس جس کے داہنے ہاتھ میں اس کا اعمال نامہ دیا جائے گا۔ اس سے تو جلد

يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۙ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ

ہی آسان حساب سے لیا جائے گا۔ اور وہ اپنے اہل کی طرف خوش (وخوش)

مَسْرُوْرًا ۙ

لوٹے گا ۔

ضمیر جاسکتی ہے۔

**تفسیر**۔ کام کرنے کے لئے ہمیشہ دایاں ہاتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ پچھلی آیت میں کدح کا لفظ استعمال فرمایا تھا۔ اس لئے یہاں یہ بتایا کہ ساری ترقی دائیں ہاتھ کے چلانے میں ہے۔ اگر تم دایاں ہاتھ چلاتے جاؤ گے تو جیت جاؤ گے۔ ان دو آیات میں ساری تحریک جدید کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ کہ محنت و مشقت برداشت کرنا اور ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہونا انسان کو اپنی زندگی میں کامیاب بنا دیتا ہے۔ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا کے یہی معنی ہیں کہ اس شخص کا حساب آسان لیا جائیگا۔ یعنی مشکلات اور تکالیف کے آنے پر وہ کوئی گھبراہٹ محسوس نہیں کریگا۔ کیونکہ مشقت برداشت کرتے کرتے وہ ان چیزوں کا عادی ہو چکا ہوگا اور اسے مشکلات بھی آسان معلوم ہونگی۔ جو شخص نکما سست اور عیاش ہو وہ ذراسی مصیبت پر بھی گھبرا جاتا ہے لیکن جو شخص محنتی ہو اور مشقت برداشت کرنے کا عادی ہو۔ اس پر خواہ مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ اس کو آسانی سے برداشت کر لیتا ہے۔ اس آیت کے یہ معنی بھی ہیں کہ خدا ایسے مومن سے آسان معاملہ کریگا۔ مگر اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ خواہ کس مصیبت میں ڈالا جائے۔ وہ اسے آسان معلوم ہوگی۔ جن لوگوں نے رسول کریم صلے اللہ

(حاشیہ: دائیں ہاتھ میں کتاب دیئے جانے سے مراد)

(حاشیہ: دو قسم کے ابتلاء)

علیہ و آلہٖ وسلم کے لئے اپنا وطن چھوڑا۔ اپنی عزت چھوڑی اپنا مال چھوڑا۔ اپنے بیوی بچے چھوڑے۔ ان کو بعد میں کونسی ایسی مصیبتیں پیش آئی تھیں۔ جنہوں نے ان کو دکھ میں ڈال دیا ہو۔ بعد میں جو بھی مصیبت آئی۔ وہ انہیں بالکل آسان معلوم ہوئی۔ اور اسے انہوں نے ہنسی خوشی برداشت کر لیا۔ غالب شرابی تھا۔ لیکن اس کی زبان پر حکمت کی بہت سی باتیں جاری ہوئی ہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس کے دل میں مفرو زیکی تھی۔ وہ ایک مقام پر کہتا ہے ع

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

جب انسان اپنے آپ کو تنعم اور عیش کا عادی بنالے تو جو حساب بھی آتا ہے۔ اسے سخت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر شدائد برداشت کرنے کا انسان عادی بن جائے۔ تو پھر اسے حساب آسان نظر آتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ دو قسم کے ابتلاء ہوتے ہیں۔ ایک ابتلاء وہ ہوتا ہے۔ جس میں بندے کو اختیار ہوتا ہے۔ کہ وہ اس کے متعلق اگر کوئی آرام اور سہولت کا پہلو تلاش کر سکتا ہو تو کرلے لیکن ایک ابتلاء وہ ہوتا ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے اور اس میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے۔ جیسے نماز کے لئے وضو کرنا پڑتا ہے۔ نماز کے لئے وضو کرنا ضروری ہوتا

# وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝

اور جس کو اس کی پیٹھ کے پیچھے سے اس کا اعمال نامہ دیا جائے گا

# فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝ وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا ۝

وہ جلد ہی (اپنے مونہہ سے اپنی) ہلاکت کو بلائیگا - اور بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا ۵ے

ہے۔ لیکن اگر سردی کا موسم ہو۔ تو انسان کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اگر چاہے تو پانی کو گرم کرے۔ یہ وہ ابتلاء ہے جس کے جاری کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے انسان کے اختیار میں دیا ہے۔ لیکن دوسری قسم کا ابتلاء ہے اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ اس کے صدمہ کو آسان کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ جیسے کہ کسی عزیز کی موت۔ ایسے صدمے بھی برداشت ہو سکتے ہیں۔ کہ انسان اپنے آپ کو تلخ زندگی کا عادی بنائے اور عیش و آرام کی زندگی کو چھوڑ دے۔ اور جب انسان ایسا کرے تو اسے ہر چیز آسان معلوم ہوتی ہے۔

وَیَنْقَلِبُ اِلٰۤی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا۔ اور وہ اپنے اہل کی طرف خوش خوش واپس آئیگا۔ یہ آیت بھی صاف طور پر بتا رہی ہے۔ کہ اس میں دنیا کے حساب کا ہی ذکر ہو رہا ہے۔ کیونکہ اگلے جہان میں جب حساب ہوگا۔ اس وقت تو کسی کو اپنے اہل کا پتہ ہی نہیں ہوگا۔ کہ وہ کہاں ہے۔ پھر ضروری نہیں۔ کہ اس کے اہل میں جتنے افراد ہوں وہ سارے جنتی ہوں۔ ہو سکتا ہے ان میں سے بعض دوزخی ہوں۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ حساب کے بعد وہ اسی وقت اپنے اہل کی طرف جائیگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ مومن مرد کے اہل و عیال کو بھی اس کے ساتھ ہی رکھیگا۔ مگر یہ بعد میں ہوگا۔ یہ نہیں کہ ادھر حساب ہو رہا ہو۔ اور ادھر اس کا اہل جنت میں اس کے ساتھ جانے کے لئے وہاں آن موجود ہو۔ وہاں تو ایسی کیفیت ہوگی۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ اگر تم نے مجھے وہاں تلاش کرنا ہو۔ تو اس اس نشان کے ذریعہ سے کرنا۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش کے لئے علامتوں کی ضرورت ہوگی۔ تو ایک عام مومن کو اپنا اہل کس طرح فوراً مل سکیگا۔ پس یَنْقَلِبُ اِلٰۤی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا کے الفاظ بتا رہے ہیں۔ کہ یہ دنیا کا واقعہ ہے۔ یعنی دین کے لئے محنت کرنے والا محنت کریگا۔ اور پھر اچھے نتائج حاصل کرکے اپنے اہل کے پاس خوش و خرم واپس آئیگا۔

۵ے **حل لغات** :- اَلثُّبُوْرُ۔ اَلْهَلَاكُ وَالْفَسَادُ یعنی ثبور کے معنی ہلاکت اور فساد کے ہیں۔ (مفردات)

الثبور [2]

**تفسیر** :- وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے کام ہمیشہ پیچھے ڈالتا رہتا ہے کہتا ہے آج نہیں کل کرونگا۔ کل آتا ہے تو کہتا ہے پرسوں کرونگا۔ غرض وہ جو اپنی پیٹھ کے پیچھے کام کو پھینکتا چلا جائیگا۔ اسے پیٹھ کے پیچھے سے کتاب دی جائیگی۔ جس نے دائیں ہاتھ کو کام میں لگائے رکھا تھا اُسے تو دائیں ہاتھ میں کتاب دی جائیگی۔ لیکن جو روز بروز اپنے کام کو پیچھے ڈالتا چلا جائیگا۔ اسے پیٹھ کے پیچھے سے کتاب دی جائیگی۔

پیٹھ کے پیچھے سے کتاب دیئے جانے سے مراد

فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا۔ جس شخص کی پیٹھ کے پیچھے سے کتاب آئیگی۔ صاف بات ہے کہ اس کے لئے کوئی خوشی کی بات نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خوشی کی بات ظاہر کی جاتی ہے۔ اور رنج والی چیز چھپائی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے لئے بھی یہ بات رنج کا موجب ہوگی۔ اس لئے

# اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ اِنَّهٗ ظَنَّ

وہ اپنے اہل وعیال میں خوب خوش رہا کرتا تھا۹؎ (اور) یقین رکھتا تھا کہ

# اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۝

فراخی کے بعد کبھی اسے تنگی نہ آئیگی ۱۰؎

اسے پیٹھ کے پیچھے سے کتاب دی جائیگی۔ جسے دیکھ کر وُہ جلدی ہی اپنے لئے ہلاکت طلب کریگا۔ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا کے معنی ہیں یَدْعُوْا ثُبُوْرًا لِنَفْسِہٖ یعنی وہ اپنے نفس کے لئے ہلاکت طلب کریگا۔

یہ بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ خدائی گرفت اتنی سخت ہوگی۔ کہ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا والا نظارہ نظر آجائیگا۔ اور وُہ کہیگا کاش میں مرجاؤں اور اس انجام کو نہ دیکھوں۔

یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ہلاکت خدا نہیں بھیجتا بلکہ بندہ اپنے اعمال کی وجہ سے اس کا خود مورد بنتا ہے۔ پس عذاب دینے والا خدا نہیں بلکہ بندہ اپنے اعمال سے اس عذاب کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ وَیَصْلٰی سَعِیْرًا۔ اور وُہ ایک بھڑکنے والی آگ میں داخل ہوگا۔ دنیا کے لحاظ سے اس کے یہ معنی ہونگے۔ کہ وُہ جلن اور فکر اور غم میں مبتلا کیا جائیگا اور آخرت کے لحاظ سے معنی ظاہر ہی ہیں۔

۹؎ **تفسیر**۔ فرماتا ہے یہ وُہ شخص ہے۔ جو اپنے اہل میں بہت مسرور رہا کرتا تھا۔ پہلی آیات میں آیا تھا کہ یَنْقَلِبُ اِلٰٓی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا۔ یعنی محنت اور کوشش اور کدح کی وجہ سے چونکہ مومن کو اپنے گھر میں آرام اور چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے جب اسے بدلہ ملیگا۔ تو یَنْقَلِبُ اِلٰٓی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا وُہ اپنے اہل کیطرف خوش خوش جائیگا۔ کہ میں کامیاب و بامراد واپس آگیا۔ لیکن کافر چونکہ اپنے گھر میں عیش و آرام سے بیٹھا رہتا تھا۔ خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اس لئے جب نتیجہ نکلیگا۔ تو وہ سخت غمگین ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومن اپنے کام کو غم سے شروع کرتا اور خوشی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے اور کافر خوشی سے شروع کرتا اور غم پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔

۱۰؎ **حل لغات**۔ حَارَ۔ یَحُوْرُ (حَوْرًا وَحُؤُوْرًا) کے معنی ہوتے ہیں رَجَعَ واپس لوٹا۔ حَارَتِ الْغُصَّةُ حَوْرًا کے معنی ہوتے ہیں اِنْحَدَرَتْ کَاَنَّهَا رَجَعَتْ مِنْ مَوْضِعِهَا۔ گلے میں پھنسنے والی چیز نیچے اتر گئی گویا اپنی جگہ سے ہٹ گئی اور حَارَ فُلَانٌ حَوْرًا۔ کے معنی ہوتے ہیں۔ تَحَیَّرَ وہ متحیر ہوگیا۔ اور عربی میں محاورہ ہے۔ کہتے ہیں حَارَ بَعْدَ مَا کَارَ۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْکَوْرِ اَیْ مِنَ النُّقْصَانِ بَعْدَ الزِّیَادَةِ۔ یعنی خوشی کے بعد غم۔ فائدہ کے بعد نقصان اور سکھ کے بعد دکھ سے ہم اللہ تعالےٰ کی پناہ چاہتے ہیں (اقرب) گویا حَوْرٌ کے معنی ہیں حالت کا بدلنا۔ پس اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ کے یہ معنی ہوئے کہ وہ یہ خیال کرتا تھا۔ کہ وُہ ہماری طرف لوٹ کر نہیں آئیگا۔ یا اس کی اچھی حالت بُری حالت کی طرف نہیں لوٹیگی۔ یا یہ کہ وُہ کبھی بھی ایسی مشکلات سے دوچار نہیں ہوگا۔ کہ وہ متحیر ہوکر رہ جائے۔ یا یہ کہ اسے نقصان کبھی نہیں پہونچیگا۔

**تفسیر**۔ اکثر تباہیاں دنیا میں اس خیال کے ماتحت آتی ہیں۔ کہ بہت لوگ جب ان کو کوئی کامیابی یا ترقی یا بلندی

حَارَ

# بَلٰٓى ۛ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ۝

مگر ایسا تو (ضرور) ہونا تھا۔ کیونکہ اس کا رب اسے یقیناً دیکھ رہا تھا [۱۱]

# فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝

پس یوں نہیں (جو یہ سمجھتے ہیں بلکہ) میں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں سورج کے غروب ہونے کے بعد کی سرخی کو [۱۲]

حاصل ہوتی ہے۔ تو سمجھ لیتے ہیں۔ کہ اب اس کے بعد تنزل کی حالت کبھی نہیں آئیگی۔ جس کی وجہ سے وہ تنزل سے بچنے کے لئے تیاری نہیں کرتے۔ قومیں ترقی کر جاتی ہیں۔ تو وہ آئندہ کے لئے تنزل کے رستے مسدود کرنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تنزل کا وقت آتا ہے۔ تو پھر انہیں واپس لوٹنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ الٰہی قانون یہی ہے۔ کہ جس جہت پر گاڑی چل رہی ہو سٹیم کے ختم ہونے کے بعد بھی کچھ دیر گاڑی اسی طرف چلتی رہتی ہے اور یہی چیز قوموں کے دھوکے کا موجب ہو جاتی ہے۔ اگر قومی سٹیم کے ختم ہوتے ہی یکدم ترقی کی گاڑی رک جائے۔ تو علاج کی طرف توجہ پیدا ہو جائے لیکن سٹیم بند ہو جاتی ہے اور گاڑی چلتی رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اس وقت قومی بربادی کا احساس ہوتا ہے۔ جب اس کا علاج ناممکن ہو جاتا ہے۔

**۱۱ تفسیر**۔ فرماتا ہے ایسے انسان کا یہ خیال درست نہیں حقیقت تو اس کے خلاف ہے۔ یقیناً اس کا رب اس کو اچھی طرح سے دیکھ رہا تھا۔ یعنی ہر عمل انسان کا اور ہر عمل قوم کا خدا کی نگاہ کے نیچے ہوتا ہے۔ جب وہ عمل اسے بھولا ہوا ہوتا ہے۔ خدا کو وہ یاد ہوتا ہے۔ اس لئے خواہ قومی اعمال پر کتنا ہی پردہ پڑا ہوا ہو نتیجہ حقیقت کے مطابق نکلتا ہے۔ کبھی خلاف نہیں نکلتا۔ فرماتا ہے ان لوگوں کے لئے بھی ایک دن تنزل کے سامان پیدا ہو جائینگے۔ یہاں وہ لوگ مراد ہیں۔ جو اس زمانہ کے ظہور کے مقابل پر کھڑے ہونگے۔ اور یہ بتایا گیا ہے۔ کہ بظاہر اس آسمانی اور زمینی تبدیلی کے وقت کفر طاقتور ہوگا اور دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ کفر مغلوب نہیں ہو سکتا۔ مگر اندرونی طور پر اس میں ایسی تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہونگی۔ کہ وہ آسمانی نظام کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکیگا۔

لَآ اُقْسِمُ میں لفظ لا کے متعلق بحث

**۱۲ حل لغات**۔ یہاں جو لا آیا ہے اس کے متعلق نحویوں میں اختلاف ہے۔ ابو عبیدہ اور ایک جماعت مفسرین کی کہتی ہے۔ کہ یہ لا زائدہ ہے۔ اور مراد یہی ہے۔ کہ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ یعنی میں شفق کو بطور شہادت پیش کرتا ہوں لا کے استعمال کے متعلق ادیبوں میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ ایسے موقعہ پر زائد استعمال ہوتا ہے۔ اور زِيَادَتُهَا جَارِيَةٌ فِي كَلَامِ الْعَرَبِ۔ اس کی یہ زیادت کلام عرب میں عام رائج ہے۔ چنانچہ وہ مثال کے طور پر قرآن کریم کی ان دو آیات کو پیش کرتے ہیں۔ (۱) مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ تجھے کس نے منع کیا کہ سجدہ نہ کرے حالانکہ یہاں مراد یہ ہے۔ کہ تو سجدہ کرے۔ (۲) اسی طرح آتا ہے لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ تاکہ اہل کتاب کو معلوم نہ ہو۔ حالانکہ مراد یہ ہے کہ اہل کتاب کو معلوم ہو ساتھ ہی یہ لوگ کہتے ہیں۔ اِنَّمَا تَزْدَادُ فِيْ وَسْطِ الْكَلَامِ لَا فِيْ اَوَّلِهٖ یعنی لا درمیان کلام میں زائد آتا ہے ابتدا کلام میں زائد نہیں آتا۔ مگر بعض مفسرین اس کے بارہ میں یہ کہتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کے کلام پر یہ قاعدہ لگتا ہے۔ قرآن کریم پر نہیں لگتا۔ کیونکہ سب قرآن ایک ہی سورۃ کے حکم میں ہے۔ اس لئے جہاں بھی لا آئیگا وسط کلام ہی سمجھا جائیگا۔ اس پر معترضین نے یہ کہا ہے کہ مضمون کے لحاظ سے

بیشک سارا قرآن کریم ایک ہی حکم میں ہے مگر عبارت ظاہری کے لحاظ سے اس کی آیات الگ الگ ہیں۔ پس عبارت ظاہری کے لحاظ سے ایک سورۃ کو دُوسری سورۃ کا حصہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر اس اعتراض کو درست تسلیم کر لیا جائے۔ تو لَا کے اس استعمال پر جو سورتوں کے شروع میں ہوا ہے اعتراض پڑیگا۔ مگر ان قسموں پر اعتراض نہیں پڑ سکتا۔ جو درمیان میں آ جاتی ہیں۔ جیسے یہاں ہے۔

اس جگہ یہ بات مدنظر رکھنی چاہئیے۔ کہ اس غلطی کی بنیاد ایک ذہنی وسوسہ پر ہے۔ اور وہ یہ کہ لَا کو نافیہ سمجھا گیا ہے۔ لَا نافیہ کی صورت میں ہمیں بے شک اس بات کی احتیاج ہے۔ کہ اس سے پہلے کوئی مضمون نکالیں جس کی نفی لَا کرتا ہو۔ لیکن زائدہ کی صورت میں یہ سوال کہ ابتداء میں آیا ہے عقلی طور پر درست معلوم نہیں ہوتا۔

کشاف میں لکھا ہے کہ لَا نافیہ کا استعمال قسم سے پہلے عربوں کے کلام اور شعروں میں عام ہے اور اس کا مقصد مضمون قسم کی تاکید کرنا ہوتا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں۔ کہ ھِیَ رَدٌّ لِکَلَامِھِمْ وَعَقِیْدَتِھِمْ کَاَنَّہٗ قِیْلَ لَیْسَ الْاَمْرُ کَمَا ذَکَرْتُمْ اُقْسِمُ بِکَذَا وَکَذَا یعنی لا نفی کے معنوں میں ہی آیا ہے۔ اور مخالف کے کلام اور اس کے عقیدہ کی تردید میں آیا ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ جس طرح تم کہتے ہو اس طرح معاملہ نہیں۔ میں اپنی بات کی شہادت کے لئے فلاں بات پیش کرتا ہوں۔ چنانچہ فراء اور اکثر نحویوں کا قول ہے کہ یہ لَا زائدہ نہیں۔ بلکہ نافیہ ہے۔ اور وُہ اس کی مثال بھی دیتے ہیں۔ کہ عام عربی بول چال میں کہتے ہیں لَا وَاللّٰہِ اور جب وُہ یہ الفاظ کہتے ہیں تو یہ معنی نہیں ہوتے۔ کہ میں اللہ کی قسم نہیں کھاتا بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہ مَیں تمہاری بات رَدّ کرتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ میری بات سچی ہے بعض کہتے ہیں کہ ہوتا تو نفی کے لئے ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ مضمون قسم کی نفی کے لئے ہو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اس چیز کی قسم کھا کر میں اس کا پورا حق ادا نہیں کرتا۔ اور اس کی پوری عظمت ظاہر نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ معنی خواہ کتنے بڑے آدمی نے کئے ہوں۔ بہر حال لغو اور غلط ہیں۔ کیونکہ یہاں اللہ تعالےٰ کی قسموں کا ذکر ہے۔ پس یہ معنی کرنے کہ خدا فرماتا ہے میں قسم تو کھاتا ہوں پر قسم کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ ایک کھلی ہوئی غلطی ہے۔ الحمد للہ کے مستحق وجود کے متعلق یہ کہنا کہ وُہ حق ادا نہیں کر سکتا۔ کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ بعض نے کہا ہے۔ کہ نفی قسم ہی مراد ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ مَیں اس چیز کی قسم نہیں کھاتا۔ اور مقدر یہ مضمون ہوتا ہے۔ کہ یہ امر ظاہر ہے۔ اور اس پر کسی قسم کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ معنی بالبداہت باطل ہیں۔ کیونکہ جس امر کو ظاہر کرنا ہے وُہ مقسم علیہ ہے۔ اور وہی مطلوب ہے۔ اور جس چیز کی قسم کھائی ہے۔ وُہ تو گواہ ہے۔ اور یہ کہنا کہ مَیں تو اس کی قسم نہیں کھاتا۔ اور مراد یہ لینا کہ میں تو اس کی گواہی نہیں دلاتا۔ کیونکہ اس کی گواہی ظاہر ہے۔ ایک بے معنی فقرہ ہو جاتا ہے۔ پس حقیقت یہی ہے کہ یہاں لَا زائدہ ہے۔ یعنی تاکید کے لئے آیا ہے اور محاورہٗ عرب کے عین مطابق ہے اور اس بارہ میں کسی لمبے تردد کی ہمیں ضرورت نہیں۔ ہاں جب نافیہ ہو تو ضرور ہے کہ اس سے پہلے کوئی مضمون بیان ہوا ہو۔ خواہ اس سورۃ میں خواہ اس سے پہلے کی سورۃ میں جس کے تسلسل میں اگلی سورۃ کا مضمون بیان کیا گیا ہو

**حل لغات** الشَّفَق

اَلشَّفَقُ۔ شَفَقٌ مصدر بھی ہے اور شَفَقٌ کے معنی ہیں اَلْحُمْرَۃُ فِی الْاُفُقِ مِنَ الْغُرُوْبِ اِلَی الْعِشَآءِ الْاٰخِرَۃِ اَوْ اِلٰی قَرِیْبِھَا اَوْ اِلٰی قَرِیْبِ الْعَتَمَۃِ۔ یعنی شفق اس سرخی کو کہتے ہیں جو افق میں ہوتی ہے۔ غروب شمس کے وقت سے لے کر عشا کے وقت تک یعنی وہ عشا جسے ہم اپنی زبان میں عشا کہتے ہیں۔ (عربی زبان میں شام کو

# وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝

اور رات کو بھی اور اسے بھی جسے وہ سمیٹ لیتی ہے [۱]

بھی عشا کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وُہ عشار کو عشار الاخریٰ کہتے ہیں۔) اَوْ اِلٰی قَرِیْبِ الْعَتَمَۃِ یا عشار کے قریب تک فَاِذَا ذَھَبَ قِیْلَ غَابَ الشَّفَقُ جب وُہ سرخی جاتی رہے تو کہتے ہیں شفق غائب ہوگئی۔ اصمعی کہتے ہیں سَمِعْتُ بَعْضَ الْعَرَبِ یَقُوْلُ عَلَیْہِ ثَوْبٌ کَاَنَّہُ الشَّفَقُ وَکَانَ اَحْمَرُ یعنی میں نے بعض عربوں کو یہ کہتے سنا ہے۔ کہ اس پر میں نے ایسا کپڑا دیکھا جو شفق کی مانند تھا اور وُہ کپڑا جس کی نسبت انہوں نے یہ فقرہ کہا سُرخ رنگ کا تھا۔ پس معلوم ہوا۔ کہ شفق سُرخی پر دلالت کرتا ہے اور صحاح میں علامہ جوہری لکھتے ہیں کہ اَلشَّفَقُ بَقِیَّۃُ ضَوْءِ الشَّمْسِ وَحُمْرَتُھَا فِیْ اَوَّلِ اللَّیْلِ اِلٰی قَرِیْبٍ مِنَ الْعَتَمَۃِ۔ شفق سورج کی بقیہ روشنی اور اس کے ساتھ اس کی سُرخی کو کہتے ہیں۔ جو ابتداء شام سے اندھیرا ہونے کے قریب تک چلی جاتی ہے۔

بعض تفاسیر میں لکھا ہے رُوِیَ عَنْ عَلِیٍّ وَابْنِ عَبَّاسٍ وَعُبَادَۃَ ابْنِ الصَّامِتِ وَاَبِیْ ھُرَیْرَۃَ وَشَدَّادِ ابْنِ اَوْسٍ وَابْنِ عُمَرَ وَمُحَمَّدِ ابْنِ عَلِیِّ بْنِ الْحُسَیْنِ وَمَکْحُوْلٍ وَبَکْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ الْمُزَنِیِّ وَبُکَیْرِ بْنِ الْاَشَجِّ وَمَالِکٍ وَابْنِ اَبِیْ ذِئْبٍ وَعَبْدِ الْعَزِیْزِ بْنِ اَبِیْ سَلَمَۃَ الْمَاجِشُوْنِ اَنَّھُمْ قَالُوْا اَلشَّفَقُ الْحُمْرَۃُ۔ یعنی شفق اَلْحُمْرَۃُ کا نام ہے۔ اور مجاہد کہتے ہیں۔ کہ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ شفق سورج چڑھنے سے پہلے وقت کا نام ہے۔ وَاَھْلُ اللُّغَۃِ بَعْدَ غُرُوْبِھَا۔ اور اہل لغت کہتے ہیں کہ یہ بعد غروب الشمس کا نام ہے۔ اسی طرح مسلم میں یہ حدیث آتی ہے۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہُ قَالَ وَقْتُ الْمَغْرِبِ مَا لَمْ یَغِبِ الشَّفَقُ کہ مغرب کا وقت اس وقت تک ہے۔ جب تک شفق غائب نہ ہو جائے یہ حدیث لکھ کر صاحب ابن کثیر لکھتے ہیں فَفِیْہِ دَلِیْلٌ اَنَّ مَا قَالَ اَصْحَابُ اللُّغَۃِ صَحِیْحٌ وَالشَّفَقُ حُمْرَۃٌ بَعْدَ غُرُوْبِ الشَّمْسِ۔ اس میں سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ اصحاب لغت کا یہ خیال کہ غروب شمس کے بعد افق میں جو سُرخی رہ جاتی ہے۔ اس کا نام شفق ہے بالکل صحیح ہے۔

مجاہد کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ آیت میں رات کا لفظ بعد میں ہے۔ اس لئے شفق سے مراد دن ہے وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ چونکہ یہاں مقابلہ ہے رات سے۔ اس لئے شفق کا اشارہ دن کی طرف ہونا چاہئیے۔ مگر یہ دلیل محض عقلی ہے۔ اور مجاہد نے واضح کر دیا ہے۔ کہ وہ کسی لغت پر اس کی بنیاد نہیں رکھ رہے بلکہ ایک عقلی دلیل پیش کر رہے حالانکہ عقلاً رات کے معنی کرتے ہوئے بھی شفق کا لفظ درست ہے۔ اس لئے کہ شفق کا وقت وُہ ہوتا ہے۔ جب دن کی روشنی کچھ باقی ہوتی ہے۔ پس تقابل پھر بھی موجود ہے۔ چنانچہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں اس وقت کو جبکہ دن جاتا رہیگا۔ مگر اسکی روشنی کچھ کچھ باقی رہیگی۔ اور میں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں رات کو جب اس کی تاریکی پھیل جائیگی۔ پس یہاں تقابل موجود ہے۔ اس لئے خلاف لغت شفق کے معنی دن کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

**تفسیر**۔ اس آیت کی وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کی آیت کے بعد لکھیں

[۱] **حل لغات**۔ وَسَقَہٗ یَسِقُہٗ وَسْقاً کے

# وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۝

اور چاند کو (بھی) جب وُہ تیرھویں کا ہو جائے [۱۲]

معنی ہوتے ہیں جَمَعَہٗ وَحَمَلَہٗ کسی چیز کو جمع کیا۔ اور اس کو اٹھالیا وَسَقَ الْبَعِیْرَ کے معنی ہوتے ہیں حَمَّلَہُ الْوَسْقَ اس پر وسق لاد دیا (راقب) وسق کے معنی کسی جانور کی طاقت کے مطابق بوجھ کے ہیں۔ چنانچہ وَسْقُ الْبَعِیْرِ کے معنی ہوتے ہیں حِمْلُ الْبَعِیْرِ یعنی ایک اونٹ کا بوجھ (راقب) بعض نے وسق کے وزن بھی بتائے ہیں۔ چنانچہ علم طور پر ساٹھ صاع کا ایک وسق سمجھا جاتا ہے لیکن اہل حجاز ۳۲۰ رطل کا اور اہل عراق ۴۸۰ رطل کا ایک وسق قرار دیتے ہیں۔

وَسَقَ الْبَعِیْرَ وَسِیْقاً کے معنی ہوتے ہیں سَاقَہٗ اونٹ کو چلایا۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٌ وَالْحَسَنُ وَقَتَادَةُ وَمَا وَسَقَ وَمَا جَمَعَ یعنی ابن عباس مجاہد حسن اور قتادہ کہتے ہیں کہ وَمَا وَسَقَ کے معنی وَمَا جَمَعَ کے ہیں یعنی جو اس نے جمع کیا۔ قتادہ اس کی تفسیر کرتے ہیں وَمَا جَمَعَ مِنْ نَجْمٍ وَدَابَّةٍ۔ جو کچھ بوٹیاں اور جانور وغیرہ یا ستارے ہیں ان کو جمع کیا۔ وَقَالَ عِكْرِمَةُ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ يَقُوْلُ مَا سَاقَ مِنْ ظُلْمَةٍ۔ عکرمہ اس کے معنی چلانے کے لیتے ہیں۔ یعنی جو ظلمت بھی اس کو وُہ دھکیل کرلے آئی۔ سائق وُہ ہوتا ہے جو پیچھے سے دھکا دیتا ہے۔ اور قائد وُہ ہوتا ہے جو آگے سے کھینچتا ہے پس وَمَا وَسَقَ کے یہ معنی ہونگے۔ کہ جس اندھیرے کو وُہ دھکا دیکر آگے لے آئے۔

**تفسیر**۔ اس آیت کی تفسیر اگلی آیت کے بعد آئیگی

**۱۲ حل لغات**۔ اِتَّسَقَ لغوی طور پر وَسَقَ کا باب افتعال ہے۔ اور اِتَّسَقَ الْاَمْرُ کے معنی ہوتے ہیں۔ اِنْتَظَمَ وَاسْتَوٰی کام ٹھیک ہو گیا منظم ہو گیا

اتّسق

اور درست ہو گیا۔ (راقب) مفردات میں لکھا ہے۔ اَلْاِتِّسَاقُ كَالْاِجْتِمَاعِ وَالْاِطِّرَادِ کہ اتساق کے معنی ہیں۔ اجتماع اور اطراد اور اطراد کے معنی ہیں کوئی چیز دوسرے کے پیچھے آئی۔ اور ٹھیک ہو گئی۔ چنانچہ کہتے ہیں اِطَّرَدَ الْاَمْرُ اِی تَبِعَ بَعْضُہٗ بَعْضاً وَاسْتَقَامَ۔ اطراد کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے سارے حصے جمع ہو کر وہ کام ٹھیک ہو گیا۔ فراء اِتَّسَقَ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ اِتِّسَاقُہٗ اِمْتِلَاؤُہٗ وَاجْتِمَاعُہٗ وَاسْتِوَاؤُہٗ لَیْلَةَ ثَلَاثَ عَشَرَةَ وَرَابِعَ عَشَرَةَ اِلٰی سِتَّ عَشَرَةَ وَھُوَ اِفْتَعَلَ مِنَ الْوَسْقِ الَّذِیْ ھُوَ الْجَمْعُ یعنی اتساق کے معنی چاند کے پورا روشن ہو جانے اور مکمل ہو جانیکے ہیں جو تیرھویں رات سے سولھویں رات تک ہوتا ہے۔ وُہ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ یہ وسق کے لفظ سے باب افتعال ہے جس کے معنے جمع کرنے کے ہوتے ہیں۔ حسن بصری کہتے ہیں کہ اِتَّسَقَ کے معنی ہیں اِمْتَلَأَ وَاجْتَمَعَ بھر گیا۔ اور اکٹھا ہو گیا۔ قتادہ کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں اِسْتَدَارَ گول ہو گیا وَیُقَالُ اَمْرُ فُلَانٍ مُتَّسِقٌ اَیْ مُجْتَمِعٌ۔ عرب کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا معاملہ متسق ہے۔ یعنی بالکل ٹھیک ہے۔ (فتح البیان) ابن کثیر میں ہے قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اِذَا اجْتَمَعَ وَاسْتَوٰی ابن عباس کہتے ہیں کہ اِتَّسَقَ کے معنی ہیں جمع ہو گیا اور درست ہو گیا۔ وَكَذَا قَالَ عِكْرِمَةُ وَمُجَاهِدٌ وَسَعِيْدُ بْنُ جُبَيْرٍ وَمَسْرُوْقٌ وَاَبُوْ صَالِحٍ وَالضَّحَّاكُ وَابْنُ زَيْدٍ اِذَا اتَّسَقَ اِذَا اسْتَوٰی یعنی عکرمہ۔ مجاہد۔ سعید بن جبیر۔ مسروق۔ ابو صالح۔ ضحاک اور ابن زید نے بھی اِذَا اتَّسَقَ کے یہ معنی کئے ہیں۔ کہ اِذَا اسْتَوٰی یعنی جب پورا پورا ہو گیا۔ اور ٹھیک ہو گیا وَقَالَ الْحَسَنُ اِذَا اجْتَمَعَ اِذَا امْتَلَأَ حسن بصری سے یہ بھی معنی

مروی ہیں کہ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کے معنی ہیں بھر گیا۔ اور روشنی مکمل ہوگئی وَقَالَ قَتَادَۃُ اِذَا اسْتَدَارَ۔ قتادہ کہتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اس کی گولائی پوری ہوگئی۔ وَمَعْنٰی کَلَامِہٖ اَنَّہٗ اِذَا تَکَامَلَ نُوْرُہٗ وَاَبْدَرَ۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ قتادہ کا مطلب یہ ہے کہ اتساق کے معنی یہ ہیں۔ کہ جب چاند کا نور پورا ہوگیا۔ اور وُہ بدر بن گیا۔

علامہ آلوسی اپنی تفسیر فتح البیان میں لکھتے ہیں۔ کہ اِتَّسَقَ۔ اِجْتَمَعَ نُوْرُہٗ وَصَارَ بَدْرًا۔ یعنی اِتَّسَقَ کے معنی یہ ہیں۔ کہ اس کا نور مکمل ہوگیا۔ اور وہ بدر بن گیا۔

صاحب کشاف اِتَّسَقَ کے معنوں میں لکھتے ہیں کہ اِجْتَمَعَ وَاسْتَوٰی لَیْلَۃَ اَرْبَعَۃَ عَشَرَ یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ چاند نے اپنے نور کو مکمل کر لیا اور وُہ چودھویں رات کا ہوگیا۔ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اِتَّسَقَ اِسْتَوٰی وَعَنْہُ قَالَ لَیْلَۃَ ثَلَاثَ عَشَرَ ابن عباس بھی اِتَّسَقَ کے معنی اِسْتَوٰی کے کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ چاند تیرھویں رات کا ہوگیا۔

**تفسیر**۔ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم مندرجہ بالا تین آیتوں کو دیکھتے ہیں۔ تو ان میں تین حالتیں بیان کی گئی ہیں۔ اوّل حالت یہ بتائی گئی ہے کہ ہم تمہارے سامنے شفق کی حالت کو پیش کرتے ہیں۔ شفق جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے یقینی اور قطعی طور پر سورج کے ڈوب جانے کے بعد کے عرصہ کا نام ہے۔ جب روشنی اور سُرخی ابھی باقی ہوتی ہے۔ اور وَسَقَ کے معنی جمع کرنے کے بتائے جا چکے ہیں۔ پس وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ کے یہ معنی ہوئے کہ رات جب وُہ اپنی ساری کیفیتوں کو جمع کرلیتی ہے۔ آخر رات لکڑیاں جمع نہیں کیا کرتی۔ کہ یہ خیال کیا جائے کہ نہ معلوم رات کیا کچھ جمع کریگی۔ ہر چیز اپنے اندر بعض خاص صفات رکھتی ہے۔ اور جب ساری صفات اس میں جمع ہوجائیں تو وُہ مکمل ہوجاتی ہے پس وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ کے یہ معنی ہوئے کہ رات جب اکٹھا کرلیتی ہے یعنی ان ساری صفات کو جو رات کو کامل رات بنانے والی ہیں اپنے اندر جمع کرلیتی ہے وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ اور ہم چاند کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جب وہ تیرھویں یا چودھویں رات کا ہوجائیگا جس طرح رات نے اپنی ساری چیزوں کو جمع کرلیا تھا یعنی اندھیرا اور خاموشی اور دوسری چیزیں جو رات سے وابستہ ہیں۔ اسی طرح چاند اپنی ساری طاقتوں کو جمع کرلیگا۔ اور چاند اپنی ساری طاقتوں کو چودھویں رات میں ہی جمع کیا کرتا ہے۔

مفسرین نے اس جگہ یہ معنی کئے ہیں۔ کہ یہاں اس کی تدریج بیان کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اس طرح تدریجی طور پر ترقیات ہوا کرتی ہیں۔ اور بعضوں نے یہ معنی کئے ہیں کہ ان آیات میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کی ترقی کا ذکر ہے۔ لیکن یہ آیات بالبداہت اس خیال کو ردّ کرتی ہیں۔ اس لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو ظلمتِ شب میں نازل ہوئے تھے وہاں شفق کا سوال ہی کونسا تھا۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تو خدا تعالیٰ نے سورج قرار دیا ہے۔ اور یہاں قمر کا ذکر ہے۔ اور قمر وُہ ہوتا ہے جو دُوسرے سے نور لیتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کب قمر تھے کہ اس کے بعد بدر بن گئے۔ آپ تو سورج تھے۔ پس یہ معنی قلتِ تدبر کا نتیجہ ہیں۔ بات یہ ہے کہ پہلی سورتوں میں بتلایا گیا تھا کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا جب کفر دنیا پر چھاجائیگا۔ جیسے سورۂ تکویر اور تطفیف وغیرہ میں ذکر تھا اور اس سورۃ میں جیسا کہ مَیں نے بیان کیا ہے اسلام کی ترقی کا ذکر ہے کفر کا نہیں۔ گو کفر کا ذکر ساتھ ہے مگر ان سورتوں میں کفر کا ذکر اصل تھا اور اسلام کا ذکر تابع تھا اور اس سورۃ میں اسلام کا ذکر اصل

ملاحظہ ۲۱ فلا اقسم بالشفق کے معنے بزعم مفسرین کے نزدیک اور اس کی تردید۔

مقصد ہے اور کفر کا ذکر اس کے تابع ہے۔ جیسے اَذِنَتْ لِرَبِّہَا وَحُقَّتْ سے استدلال کرکے بتایا جا چکا ہے پس جب اسلام کی دوبارہ ترقی کا ذکر کیا گیا۔ تو لازماً یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔ کہ اسلام کا تنزل کب ہوگا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ان سارے تغیرات کا ذکر کرتا ہے۔ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد مسلمانوں پر آنے والے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سراج منیر کہا جا چکا ہے۔ اور سراج منیر جب غروب ہوگا۔ تو لازماً ایک شفق کی حالت پیدا ہوگی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ یعنی میں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں تمہارے سامنے اس زمانہ کو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جائیگا۔ شفق کا لفظ اس لئے استعمال فرمایا کہ شفق کے وقت بھی سورج موجود ہوتا ہے اور رات کے وقت بھی سورج موجود ہوتا ہے قمر کے وقت بھی سورج موجود ہوتا ہے۔ لیکن وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ جب اوپر کی سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے تنزل کی طرف اشارہ فرمایا۔ تو کسی انسان کا ذہن اس طرف بھی جا سکتا تھا۔ کہ شاید اس وقت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ناکارہ ہو جائیگی فرماتا ہے ناکارہ نہیں ہوگی بلکہ وہ شفق اور لیل کا زمانہ ہوگا۔ اور شفق اور لیل کے وقت سورج مٹ نہیں جاتا وہ موجود ہوتا ہے۔ مگر لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ان الفاظ کے ذریعہ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ تنزل اسلام تنزل محمدیت کی وجہ سے نہیں ہوگا بلکہ تنزل مسلمین کی وجہ سے ہوگا۔ کسی قوم کا تنزل دو سببوں میں سے کسی ایک سبب سے ہوا کرتا ہے۔ یا تو لیڈر بگڑ جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے قوم بگڑ جاتی ہے۔ اور یا لیڈر تو صحیح حالت پر قائم رہتا ہے۔ مگر قوم اس سے مونہہ پھیر لیتی ہے۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں جو تنزل کی خبریں دی گئی ہیں۔ وہ تنزل اور انحطاط محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بگڑنے کی وجہ سے نہیں ہوگا۔ بلکہ مسلمانوں کے بگڑنے کی وجہ سے ہوگا۔ اور وہ آپ سے دور جا پڑینگے۔ اور اس طرح نور ہدایت حاصل کرنے سے محروم رہینگے۔ جیسے شفق اور لیل سورج کے مٹ جانے کی وجہ سے نہیں آتیں۔ بلکہ زمین کے سورج سے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے آتی ہیں۔

شفق سے مراد

اِس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے۔ کہ زمین چکر کھاتی ہے۔ کیونکہ اگر سورج کو چکر والا سمجھا جاتا تو یہ مثال غلط ہو جاتی۔ تب یہ معنی بنتے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نعوذ باللہ بھاگ گئے۔ حالانکہ خدا یہ بتاتا ہے۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں بھاگے۔ بلکہ تم بھاگے۔ پس یہ مثال اسی صورت میں صحیح طور پر چسپاں ہو سکتی ہے۔ جب ہم یہ سمجھیں کہ زمین چکر کھاتی ہے ؛

یہ شفق کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوا جس کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا تھا خَیْرُکُمْ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ یَکُوْنُ بَعْدَھُمْ قَوْمٌ یَخُوْنُوْنَ وَلَا یُؤْتَمَنُوْنَ وَیَشْھَدُوْنَ وَلَا یُسْتَشْھَدُوْنَ وَیَنْذُرُوْنَ وَلَا یَفُوْنَ وَیَظْھَرُ فِیْھِمُ السِّمَنُ (بخاری) یعنی میرے بعد تین صدیوں تک کا زمانہ تو اچھا ہے۔ لیکن پھر خرابیاں پھیل جائینگی۔ گویا آپ نے ابتدائی تین صدیوں کو خیر و برکت والا قرار دیا ہے۔ پس یہ تین صدیاں تھیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے سورج کی۔ اس کے بعد سورج غائب ہوا۔ اور شفق کا زمانہ شروع ہوا۔ یعنی وہ زمانہ جب نور اور ظلمت ابھی ملے ہوئے تھے۔ پھر وہ زمانہ آیا۔ جب

رات نے اپنی ساری تاریکیوں کو جمع کر لیا ۔

اس جگہ ایک اور لطیفہ بھی یاد رکھنے والا ہے ۔ اور وہ یہ کہ جگہ شفق کا وقت بہت کم ہوتا ہے ۔ اور وہ عام طور پر رات کا حصہ سمجھا جاتا ہے ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے شفق کو الگ کیوں بیان کیا ۔ اس کی وجہ یہ ہے ۔ کہ اسلام میں شفق کے زمانہ کو ایک خصوصیت حاصل ہونے والی تھی ۔ اور وہ یہ کہ عام طور پر شفق کا وقت چھوٹا ہوتا ہے ۔ اور رات کا لمبا لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت سے خدا تعالیٰ کا یہ معاملہ مقدر تھا ۔ کہ ان کے لئے شفق کا زمانہ لمبا ہو اور رات کا چھوٹا اور اس طرح شفق کا وقت اپنی ذات میں ایک مستقل حیثیت اختیار کرے ۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے بعد ایسا ہی ہوا مسلمانوں میں ہمیشہ ایسے لوگ کھڑے ہوتے رہے جنہوں نے شفق کا کام کیا ۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور کو دنیا سے غائب ہونے نہیں دیا ۔ درحقیقت بارھویں اور تیرھویں صدی ہی اصل میں تاریک راتیں تھیں ۔ اگرچہ غور کرنے سے ان میں بھی کچھ کچھ شفق کا زمانہ نظر آجاتا ہے ۔

وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ اور رات جب وہ وساق اختیار کرے ۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ شفق وسق بکلی چلی جائیگی ۔ اس میں جہاں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور نہیں مٹے گا بلکہ مسلمان اس نور سے مونہہ پھیر لیں گے ۔ وہاں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے ۔ کہ جب وہ رات آئیگی تو اتنی تاریک اور بھیانک ہوگی ۔ کہ وہ تمام چیزیں جو رات کو مکمل بناتی ہیں ۔ ان کو وہ اپنے اندر جمع کرے گی ۔ جب رات کامل طور پر دنیا میں چھا جاتی ہے ۔ تو اس میں چوریاں بھی ہوتی ہیں ۔ ڈاکے بھی پڑتے ہیں ۔ قتل بھی ہوتے ہیں سانپ بھی نکلتے ہیں ۔ بچھو بھی باہر آجاتے ہیں ۔ اور اندھیرا بھی اس طرح چھا جاتا ہے ۔ کہ کوئی چیز نظر نہیں آتی ۔ پس وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ میں بتایا کہ وہ فتنہ بڑا شدید ہوگا ۔ اور وہ ساری چیزیں اس میں جمع ہو جائینگی ۔ جو رات کو مکمل رات بنانیوالی ہوتی ہیں

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ یہ تین آیات اپنے مطلب کو اس قدر واضح کر دیتی ہیں کہ مفسرین کا یہ نتیجہ نکالنا کہ ان میں تدریج بتائی گئی ہے بالکل باطل نتیجہ ثابت ہوتا ہے ۔ پہلے شفق کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد انتہائی تاریک رات کا اور اس کے بعد قمر کا جو اپنی منازل طے کر کے بدر بنتا ہے ۔ اور یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جو کبھی اکٹھی نہیں ہوتیں نہ شفق کے بعد لازماً انتہائی تاریک رات آتی ہے ۔ اور نہ انتہائی تاریک کے بعد بدر نکلا کرتا ہے ۔ آخر کوئی مفسر مجھے بتلائے ۔ کہ وہ کونسا بدر ہے ۔ جو وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ کے بعد نکلتا ہے ۔ مگر یہاں وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ کا پہلے ذکر کیا گیا ہے ۔ اور بدر کا بعد میں ذکر کیا گیا ہے ۔ پس یہاں تدریجی ترقی کا کوئی ذکر نہیں اور نہ جسمانیات کا کوئی قانون بیان ہو رہا ہے ۔ بلکہ روحانی نقطۂ نگاہ سے اسلام کے تنزل اور اس کی ترقی کے مختلف ادوار کا ذکر کیا جا رہا ہے ۔ پس لیل سے یہاں کوئی دنیوی رات مراد نہیں ۔ بلکہ روحانی رات مراد ہے ۔ اور دنیوی اور روحانی راتوں میں یہ فرق ہوتا ہے ۔ کہ دنیوی راتوں میں بدر سے پہلی راتیں تاریک نہیں ہوتیں ۔ بلکہ روشن ہوتی ہیں ۔ مثلاً ۱۴ سے پہلے ۱۲ یا ۱۳ تاریخ کی راتیں تاریک نہیں ہونگی ۔ انتہائی تاریک راتیں ۲۸ - ۲۹ ہونگی ۔ لیکن روحانی دنیا میں بدر کامل اس وقت ظاہر ہوتا ہے ۔ جب اس سے پہلے ایک سخت تاریک رات دنیا پر چھائی ہوئی ہوتی ہے لیکن وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ کے بعد وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ رکھ کر بتا دیا گیا ہے کہ یہاں جسمانی نہیں بلکہ روحانی شفق روحانی رات اور روحانی بدر کا ذکر کیا جا رہا ہے ۔ اس

اور ۲ شفق لیل اور قمر کو بطور شہادت پیش کرنیکا مطلب

# لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ؕ

تم ضرور درجہ بدرجہ ان حالتوں پر پہنچو گے ۱۳

لئے تدریج کا یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرماتا ہے وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ۔ ہم شہادت کے طور پر چاند کو پیش کرتے ہیں۔ جب وہ بدر بن جاتا ہے۔ یہ مسیح موعود کی بعثت کے متعلق اتنی واضح پیشگوئی ہے کہ اس کے بعد کسی کا یہ کہنا کہ قرآن میں مسیح موعود کا ذکر نہیں خطرناک ظلم ہے۔ یہاں تین حالتیں بیان کی گئی ہیں۔ اور بتایا گیا ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد شفق کا زمانہ بہت لمبا ہوگا۔ اسکے بعد ایک چھوٹا سا تاریک زمانہ آئیگا۔ مگر باوجود اس کے کہ وہ چھوٹا ہوگا اس قدر تاریک ہوگا کہ جس قدر تاریکی دنیا میں ممکن ہے۔ سب اس میں جمع ہوجائیگی۔ اس کے بعد یکدم رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روشنی لینے والے وجودوں میں سے ایک بدر بن جائیگا۔ اور رات پر اس طرح چھا جائیگا کہ اسے شروع سے لیکر آخر تک منوّر کردیگا۔ بدر کا یہی کام ہوتا ہے کہ وہ رات کو شروع سے آخر تک روشن کردیتا ہے۔ وہ روحانی بدرِ کامل بھی اپنے نور کو دنیا میں اس طرح پھیلا دیگا۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا بُعد لوگوں کو محسوس نہیں ہوگا۔ یہ نہایت ہی واضح اور مکمل نقشہ ان تغیرات کا کھینچا گیا ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر آخر تک رونما ہونے تھے۔ اور جنہوں نے اسلام پر اثرانداز ہونا تھا؛

ے ۲ لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ میں عن کے معنے بعد کے

**۱۳ حل لغات**۔ اَلطَّبَقُ کے معنی ہیں اَلۡقَرۡنُ مِنَ الزَّمَانِ ایک صدی۔ اَلنَّاسُ ایک زمانہ کے لوگ اَلۡجَمَاعَةُ جماعت۔ اَلۡحَالُ۔ حال (اقرب) اَلطَّبَقُ الۡمُطَابَقَةُ (مفردات)

ے ۱ الطبق

**تفسیر**۔ فرماتا ہے ہم اپنی ذات ہی کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم ضرور ایک درجہ کے بعد دوسرے درجہ پر جاؤ گے۔ لَتَرۡكَبُنَّ میں لام اور نون مشدّد لانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اگر یہ آیات اپنے اندر کوئی اہم پیشگوئی نہیں رکھتی تھیں اس آیت کی بناوٹ ہی واضح کررہی ہے۔ کہ ان آیات کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ پر چسپاں کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ واقعات آئندہ زمانہ کے متعلق بطور پیشگوئی بیان کئے گئے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ شفق کا کوئی سوال پیدا ہوسکتا تھا۔ نہ انتہائی تاریک رات کا اور نہ اس وقت کوئی قمر تھا جو اتساق اختیار کرکے بدر بن گیا ہو۔ پس یہ آیات قطعی طور پر بعد کے زمانہ سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔

عَنۡ کے عربی زبان میں بہت سے معنی ہوتے ہیں جن میں سے ایک یہ ہیں کہ عَنۡ علاوہ اور معنوں کے بعد کے معنی بھی دیتا ہے جیسے کہتے ہیں عَنۡ قَلِيۡلٍ اَدُوۡرُكَ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ بَعۡدَ قَلِيۡلٍ اَدُوۡرُكَ۔ اس جگہ بھی عن کے معنے بعد کے ہی ہیں اور مراد یہ ہے۔ کہ لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا بَعۡدَ طَبَقٍ۔ یعنی تم ایک درجہ کے بعد دوسرے درجہ تک پہنچو گے۔ جیسا کہ حل لغات میں لکھا جاچکا ہے طبق کے معنی مطابق کے بھی ہوتے ہیں۔ اور اس کے معنی حال کے بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح طبق کے ایک معنی جماعت کے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں حالت اور جماعت دونوں معنی لگ سکتے یعنی ہم اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتے ہیں۔ کہ تم ضرور ان چاروں حالتوں میں سے ایک کے بعد دوسری پر گزرتے ہوئے چلے جاؤ گے۔ اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں۔ کہ تم ایک جماعت کے بعد دوسری جماعت پر سوار ہوتے جاؤ گے۔ یعنی جس جس جماعت کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ اس جماعت کی حالت تم پر وارد ہوتی جائیگی؛

اب دیکھو کس طرح خدا تعالیٰ نے ان تمام باتوں کو پورا کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مہرِ منوّر تین صدیوں تک دنیا کو روشن کرتا رہا۔ اس کے بعد شفق کا زمانہ آیا۔ جو بہت لمبا عرصہ رہا۔ سید عبدالقادر صاحب جیلانی۔ حضرت معین الدین صاحب چشتی۔ حضرت محی الدین صاحب ابن عربی اور دوسرے کئی بزرگ اس زمانہ شفق میں آئے۔ اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور اور آپ کی تعلیم کو قائم رکھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت رات پڑ گئی تھی مگر پھر بھی کوئی شخص سورج کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ شفق کی سُرخی موجود تھی۔ اس کے بعد بارھویں اور تیرھویں صدی میں تاریکی آئی اور ایسی بھیانک اور خطرناک شکل میں کہ وَ الَّیۡلِ وَمَا وَسَقَ کا نظارہ نظر آنے لگ گیا۔ رات اپنے اندر جس قدر بلائیں جمع کر سکتی ہے۔ وہ تمام بلائیں۔ اور تمام آفتیں اور تمام مصیبتیں اس تاریک رات نے اپنے اندر جمع کر لی تھیں۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایسا تباہی کا زمانہ تھا۔ کہ جس کی نظیر پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔ پھر اس انتہائی تاریک رات کے معاً بعد وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کے مطابق ایک قمر بدر کی صورت اختیار کر گیا۔ اور وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور دنیا تک پہنچانے لگ گیا۔

اس پیشگوئی پر غور کرو اور دیکھو کہ یہ پیشگوئی نہ صرف معناً پوری ہوئی بلکہ لفظاً لفظاً پوری ہوئی ہے۔ چنانچہ اتساق کی تشریح کرتے ہوئے بتلایا جا چکا ہے کہ تیرھویں رات سے سولہویں رات تک کے چاند کے لئے اتساق کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات بھی نمایاں طور پر پوری ہوئی۔ کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تیرھویں صدی میں پیدا ہوئے۔ چودھویں صدی میں آپ نے دعوے فرمایا۔ اور پھر آپ نے بطور پیشگوئی اعلان فرمایا کہ مسیح موعود کا زمانہ تین سو سال تک ہے یعنی سولہویں صدی کے آخر تک۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"مسیح موعود کا زمانہ اس حد تک ہے۔ جس حد تک اس کے دیکھنے والے یا دیکھنے والوں کے دیکھنے والے اور یا پھر دیکھنے والوں کے دیکھنے والے دنیا میں پائے جائینگے۔ اور اس کی تعلیم پر قائم ہونگے۔ غرض قرونِ ثلاثہ کا ہونا بر عایت منہاجِ نبوت ضروری ہے۔" (تریاق القلوب طبع اول حاشیہ صفحہ ۱۵۶)

اسی طرح فرمایا۔

"ابھی تیسری صدی آج کے دن سے پوری نہیں ہوگی کہ عیسیٰ کا انتظار کرنے والے کیا مسلمان اور کیا عیسائی سخت نا امید اور بدظن ہو کر اس جھوٹے عقیدہ کو چھوڑ دینگے۔ اور دنیا میں ایک ہی مذہب ہوگا۔ اور ایک ہی پیشوا میں تو ایک تخم ریزی کرنے کے لئے آیا ہوں۔ سو میرے ہاتھ سے وہ تخم بویا گیا۔ اور اب وہ بڑھیگا۔ اور پھولیگا۔ اور کوئی نہیں جو اس کو روک سکے" (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۶۵)

حضرت مسیح موعود کا نور سولہویں صدی تک

پھر آپ مخالفین کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"مقدر یوں ہے کہ وہ لوگ جو اس جماعت سے باہر ہیں۔ وہ دن بدن کم ہوتے جائینگے۔ اور تمام فرقے مسلمانوں کے جو اس سلسلہ سے باہر ہیں۔ وہ دن بدن کم ہو کر اس سلسلہ میں داخل ہوتے جائینگے یا نابود ہوتے جائینگے۔ جیسا کہ یہودی گھٹتے گھٹتے یہاں تک کم ہو گئے۔ کہ بہت ہی تھوڑے رہ گئے۔ ایسا ہی اس جماعت کے مخالفوں کا انجام ہوگا اور اس جماعت کے لوگ اپنی تعداد اور قوتِ مذہب کے رو سے سب پر غالب ہو جائینگے" (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۸۰)

غرض مسیح موعود کا زمانہ تیرھویں صدی سے شروع ہو کر سولہویں صدی کے آخر تک پہونچیگا۔ اور یہی لغت والے کہتے ہیں کہ اتساق کے معنی یہ ہیں کہ وہ چاند جو تیرھویں سے سولہویں رات تک جاتا ہے۔

اگر یہاں صرف بدر کا لفظ رکھ دیا جاتا۔ تو مضمون میں وہ وسعت پیدا نہ ہوتی۔ جو وَالۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کے الفاظ سے پیدا ہوئی۔ کیونکہ اتساق کا لفظ رکھ کر مسیح موعود

# فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ

پھر ان (لوگوں) کو کیا ہوا ہے۔ کہ ایمان نہیں لاتے ۱۴ؔ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جائے۔ تو

# لَا يَسْجُدُوْنَ ۝ السجدة

سجدہ نہیں کرتے ۱۵ؔ

کے زمانہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ کہ تیرھویں صدی میں وہ پیدا ہوگا۔ چودھویں صدی میں اس کا ظہور ہوگا۔ اور سولہویں صدی کے آخر تک اس کا اثر ترقی کرتا جائیگا۔

لَا يَسْجُدُوْنَ کے دو معنے

۱۴ؔ تفسیر۔ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ یعنی اس زمانہ کے لوگوں کو کیا ہوگیا۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ اتساق کے زمانہ کا ہم کو پتہ نہیں۔ کہ وہ کب ہوگا۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے تو بدر کامل کا ظہور نہیں دیکھا۔ مگر یہ لوگ شفق اور لیل کو تو دیکھ چکے تھے اور اس پر قیاس کر کے سمجھ سکتے تھے۔ کہ جب شفق بھی آچکی اور لیل بھی ظاہر ہوگئی۔ تو وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ کی پیشگوئی کے پورا ہونے کا وقت بھی آجائیگا۔ مگر وہ تو لیل کو دیکھ کر بالکل مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ اور یہ خیال کرنے لگ گئے کہ اب اسلام کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ پس تعجب ہے کہ ان لوگوں کو کیا ہوگیا۔ انہوں نے شفق کو بھی دیکھا۔ انہوں نے لیل کو بھی دیکھا۔ مگر یہ نہ سمجھا۔ کہ بدر کامل کا ظہور بھی مقدر ہے۔

لَا يُؤْمِنُوْنَ ایمان نہیں لاتے۔ یعنی اس بات پر ایمان نہیں لاتے کہ بدر اس تاریک و تار رات پر چھا جائیگا اور تمام ظلمات کو پھاڑ دیگا۔

يَسْجُدُوْنَ

۱۵ؔ حل لغات۔ يَسْجُدُوْنَ يَسْجُدُ سے جمع کا صیغہ ہے۔ اور سَجَدَ يَسْجُدُ کے معنی ہوتے ہیں خَضَعَ وَانْحَنٰى عاجزی کی اور عجز کا اظہار جھکنے سے کیا نیز کہتے ہیں سَجَدَتِ السَّفِيْنَةُ لِلرِّيَاحِ اور معنی ہوتے ہیں طَاعَتْهَا وَمَالَتْ بِمَيْلِهَا۔ کہ کشتی نے ہوا کی اطاعت کی۔ اور جدھر ہوا کا رخ تھا۔ ادھر چل پڑی (اقرب) پس يَسْجُدُوْنَ کے معنی ہونگے۔ وہ فرمانبرداری کرتے ہیں۔ اور لَا يَسْجُدُوْنَ کے معنی ہونگے فرمانبرداری نہیں کرتے۔

تفسیر۔ یہاں سجدہ کے دو معنی ہیں اول یہ کہ وہ فرمانبرداری نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ جب قرآن کا دوبارہ نزول ہوتا ہے۔ تو وہ کیوں اس شکریہ میں سجدہ نہیں کرتے۔ اس میں یہ پیشگوئی مخفی تھی۔ کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا۔ جب قرآن دنیا سے مٹ جائیگا۔ اور ایمان ثریا پر چلا جائیگا۔ اس وقت ایک بدری وجود پھر قرآن کریم کو دنیا میں واپس لائیگا۔ پھر اسی قرآن کو پڑھا جائیگا۔ پھر اس قرآن پر عمل شروع ہوگا۔ پھر اس کے احکام کو تازہ کیا جائیگا۔ فرماتا ہے۔ یہ ہماری اتنی بڑی نعمت ہے۔ کہ چاہیئے تھا خدا تعالیٰ کے اس عظیم الشان فضل پر وہ سجدوں میں گر جاتے۔ کہ انہیں ان کی کتاب واپس مل گئی۔ ان کا روحانی خزانہ جو مدتوں سے ضائع ہو چکا تھا۔ پھر ان کے گھروں میں واپس آگیا۔ مگر یہ لوگ ایسے ناشکر گزار ہیں۔ کہ الٹا اس پر الزام لگاتے ہیں۔ کہ وہ قرآن میں تحریف کر رہا ہے۔ یا یہ معنی ہیں۔ کہ وہ بدری وجود تو قرآن پیش کریگا مگر یہ لوگ بجائے قرآن کی فرمانبرداری کرنے کے اس کے سامنے حدیثوں یا ائمہ سلف کے اقوال کو پیش کرینگے۔ قرآن کی طرف نہیں جائینگے۔

ہماری جماعت کے ایک دوست میاں نظام الدین صاحب کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ جو میں نے بارہا سنایا ہے۔ کہ وہ ابھی بیعت میں شامل نہیں تھے۔ کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام

کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اگر میں قرآن کریم کی سو آئتیں ایسی نکلوا کر لے آؤں۔ جن سے حیات مسیح ثابت ہوتی ہو۔ تو کیا آپ مان جائینگے کہ حضرت عیسیٰ زندہ ہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا سو آیتوں کا کیا سوال ہے۔ آپ ایک آیت ہی پیش کر دیں۔ تو میں ماننے کے لئے تیار ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں دس آیتیں تو ضرور لا کر آپ کو دکھاؤنگا۔ اور یہ کہہ کر خوش خوش مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کے پاس گئے۔ تاکہ قرآن سے ایسی آیتیں نکلوا لائیں۔ مولوی محمد حسین صاحب ان دنوں لاہور میں تھے۔ حضرت خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ بھی جموں سے چھٹی پر وہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ اور وفات و حیات مسیح پر بحث کے لئے آپس میں شرائط کا تصفیہ ہو رہا تھا۔ حضرت خلیفۂ اول رضؓ فرماتے تھے۔ کہ اس مسئلہ کا قرآن سے فیصلہ ہونا چاہیئے۔ اور مولوی محمد حسین صاحب یہ کہتے تھے کہ حدیثیں بھی شامل ہونی چاہئیں۔ آخر بڑی بحث اور ردّوکد کے بعد حضرت خلیفۂ اول رضؓ نے مان لیا۔ کہ بخاری بھی شامل کر لی جائے۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کو فخر کرنے کی بہت عادت تھی۔ حضرت خلیفۂ اول رضؓ نے جب ان کی یہی بات مان لی۔ کہ بخاری سے بھی تائیدی رنگ میں ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔ تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ مسجد میں بیٹھ کر انہوں نے لاف زنی شروع کر دی کہ مولوی نورالدین رضؓ نے یوں دلیل دی۔ اور میں نے اسے یوں پکڑا۔ اس نے اس طرح کہا۔ اور میں نے اسے اس طرح گرایا۔ اتنے میں میاں نظام الدین صاحب بھی وہاں جا پہنچے۔ اور کہنے لگے مولوی صاحب ان بحثوں کو چھوڑیے میں مرزا صاحب کو منوا کر آرہا ہوں۔ کہ اگر میں قرآن سے دس آیتیں ایسی نکال کر لے آؤں۔ جن سے حیات مسیح ثابت ہوتی ہو۔ تو وہ اپنے عقیدہ کو ترک کر دینگے آپ مہربانی فرما کر مجھے جلدی سے ایسی دس آیتیں قرآن سے لکھ دیں۔ تاکہ میں مرزا صاحب کے سامنے پیش کروں۔

مولوی صاحب جو فخر و مباہات سے کام لے رہے تھے۔ اور بار بار کہہ رہے تھے۔ کہ میں نے مولوی نورالدین رضؓ کو یوں رگیدا۔ اسے اس طرح پکڑا۔ اور اس طرح گرایا۔ ان کے تو یہ بات سنتے ہی حواس اڑ گئے۔ اور جوش میں کہنے لگے تجھے کس پاگل اور جاہل نے کہا تھا۔ کہ تو اس معاملہ میں دخل دیتا۔ میں دو مہینے بحث کر کر کے مولوی نورالدین رضؓ کو حدیث کی طرف لایا تھا۔ تو پھر اس مسئلہ کو قرآن کی طرف لے گیا ہے۔ یہ اتنا گندہ فقرہ تھا۔ کہ میاں نظام الدین صاحب جو اپنے دل میں اسلام کی محبت رکھتے تھے۔ اسے برداشت نہ کر سکے تھوڑی دیر تک حیرت سے ان کا مونہہ دیکھتے رہے۔ اور پھر کہنے لگے مولوی صاحب اگر یہی بات ہے تو پھر جدھر قرآن ہے ادھر ہی میں ہوں۔ چنانچہ وہ وہاں سے واپس آئے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیعت میں شامل ہو گئے

پس اس آیت کے ایک یہ بھی معنی ہیں۔ کہ وہ بدری وجود قرآن پیش کریگا۔ مگر وہ اُسے ضعیف حدیثوں اور لوگوں کے اقوال کی طرف لانے کی کوشش کریں گے۔ اسی طرح اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ اس وقت قرآن آسمان پر جا چکا ہوگا۔ تب ایک بدری وجود قرآن کو پھر واپس لائیگا۔ مگر یہ لوگ ایسے ہیں کہ خدا تعالےٰ کا اس عظیم الشان نعمت کے واپس ملنے پر بھی کوئی شکر ادا نہیں کرینگے۔ کہ اس نے ان پر کتنا بڑا رحم کیا۔ کتنا بڑا انعام کیا۔ کہ ان کے مذہب کو اس نے بچا لیا۔ اور انہیں ہلاکت کے گڑھے میں گرتے گرتے تھام لیا۔

اگر یہ معنی نہ کئے جائیں تو قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ کا وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کے ساتھ کوئی جوڑ ہی نہیں بنتا لیکن ہم حدیث صحیح سے اس کا جوڑ بتا سکتے ہیں۔ جیسی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بیان فرمایا ہے کہ آخری زمانہ میں قرآن کی تعلیم مٹ جائیگی۔ ایمان ثریا پر چلا جائیگا لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ (مشکوٰۃ کتاب العلم) اسلام کا صرف نام اور قرآن کا صرف رسم الخط باقی رہ جائیگا۔ معارف اور حقائق اور علوم سب آسمان پر اٹھ جائینگے

بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُکَذِّبُوْنَ ۝ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ

بلکہ (بات اتنی بڑھ گئی ہے کہ) جنہوں نے اس قرآن کا کفر کیا ہے۔ وہ تو (اسے) جھٹلاتے ہیں [۱] اور اللہ اسے جسے وہ (اپنے دلوں

بِمَا یُوْعُوْنَ ۝ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ

میں) چھپائے ہوئے ہیں۔ خوب جانتا ہے [۲] پس (انکے مخفی خیالات اور ظاہر اعمال کی وجہ سے) انہیں دردناک عذاب کی خبر دیدے [۳] مگر وہ (لوگ) جو

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ ع

ایمان لائے۔ اور انہوں نے مناسب حال عمل کئے۔ انہیں ایک نہ ختم ہونے والا (نیک) اجر ملنے والا ہے [۴]

تب ایک فارسی الاصل انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوگا جو ایمان کو ثریا سے واپس لائیگا۔ اور قرآنی علوم کو زندہ کردیگا۔ پس ہم اس آیت کے جو معنے کرتے ہیں وہ پورے طور پر یہاں چسپاں ہوجاتے ہیں۔ لیکن اور لوگ اس کے کیا معنی کرسکتے ہیں۔ وہ شفق اور لیل اور قمر کے ساتھ قرآن کا کوئی جوڑ بتا ہی نہیں سکے۔

[۱] تفسیر بَلْ کے معنی زیادتی کے ہیں یعنی صرف یہی بات نہیں کہ وہ قرآن کے دوبارہ نزول پر خدا تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر ادا نہیں کرتے۔ اور اس کی فرمانبرداری نہیں کرتے۔ بلکہ الٹے تکذیب کرنے لگ جاتے ہیں۔ یعنی بجائے اطاعت شعاری سے کام لینے کے وہ مسیح موعود کی تکذیب کرینگے۔ وہ قرآن کی آیتیں پیش کریگا۔ مگر یہ لوگ کہیں گے ہم ان آیتوں کو نہیں مانتے۔

المَمنون

[۲] حل لغات۔ یُوْعُوْنَ اَوْعٰی سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور اَوْعَی الشَّیْءَ وَالْکَلَامَ کے معنی ہوتے ہیں حَفِظَہٗ وَ جَمَعَہٗ کسی کلام کو یاد کیا۔ اور اکٹھا کیا۔ اور جب اَوْعَی الزَّادَ وَالْمَتَاعَ کہیں تو معنی ہوتے ہیں جَعَلَہٗ فِی الْوِعَاءِ وَجَمَعَہٗ کہ سامان کو تھیلے میں رکھا اور محفوظ کیا۔ (اقرب) پس یُوْعُوْنَ کے معنی ہونگے (۱) حفظ کرتے ہیں۔ اور جمع کرتے ہیں (۲) محفوظ کرتے ہیں

یوعون

حضرت مسیح موعود کی اتباع کے بغیر روحانی ترقی نہیں ہو سکتی

تفسیر۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ انکے دلوں میں کیا کچھ بھرا ہوا ہے۔ قرآن ان کے دلوں سے نکل جائیگا۔ اور یہی باقی رہ جائیگا کہ فلاں نے یہ کہا ہے فلاں نے یہ لکھا ہے۔ یُوْعُوْنَ کے ایک معنی حفظ کے بھی ہیں۔ چنانچہ اَوْعَی الشَّیْءَ اَوِ الْکَلَامَ کے معنی ہوتے ہیں۔ حَفِظَہٗ وَجَمَعَہٗ۔ اس نے حفظ کیا۔ اور جمع کیا۔ پس وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا یُوْعُوْنَ کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ انہوں نے دوسروں کے اقوال جو حفظ کر رکھے ہیں اللہ تعالیٰ انکو خوب جانتا ہے۔ یا انکے دلوں میں جو کچھ بھرا ہے اسے وہ خوب جانتا ہے۔

[۳] تفسیر فرماتا ہے ہم نے تو انکو فائدہ پہنچانے کے لئے یہ سب انتظام کیا تھا ہم چاہتے تھے کہ نور سے انکو حصہ ملے۔ اور خدا تعالیٰ کے قرب کی راہوں پر چلنا انکے لئے آسان ہو۔ مگر وہ تاریکی کے کونوں میں بیٹھے رہے۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کے نور سے مونہہ پھیر لیا۔ اسکی برکات کو رد کردیا۔ اور خدا تعالیٰ کے احسان پر سجدۂ شکر ادا کرنے کی بجائے اسکی آیات کی تکذیب کی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بہت بڑے دکھ میں مبتلا کئے جائینگے ؛

[۴] حل لغات۔ اَلْمَمْنُوْنُ کے معنی ہیں اَلْمَقْطُوْعُ کٹا ہوا (اقرب) پس غَیْرُ مَمْنُوْنٍ کے معنی ہونگے غیر مقطوع ؛

تفسیر۔ اس آیت کے وہی معنی ہیں جنکی طرف حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی کتب میں اشارہ فرمایا ہے کہ آئندہ کوئی شخص خدا تعالیٰ کے قرب اعلیٰ کی ولایت کا مقام حاصل نہیں کرسکتا۔ مگر وہی جو میری جماعت میں شامل ہوگا۔ اور میری اقتدا اور متابعت کا دم بھریگا۔ آئندہ زمانہ میں اگر اللہ تعالیٰ کیطرف سے کوئی نبی بھی مبعوث ہوگا۔ تو اسکے لئے ضروری ہوگا۔ کہ وہ مسیح موعود کے دروازہ میں سے گزرے۔ جسکے شکل میں تبدیلی آجائیگی۔ مگر اسکا تعلق مسیح موعود سے منقطع نہیں ہوگا۔ جسطرح محمدی نور کبھی منقطع نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اس نور کا سلسلہ اب قیامت تک منقطع نہیں ہوسکتا۔ اس میں شک نہیں۔ یہاں مومنوں کی جماعت کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر جماعت درحقیقت نبی کے تابع ہوتی ہے۔ اور چونکہ مسیح موعود اب قیامت تک آنیوالے تمام لوگوں کے لئے مسیح موعود اور خدا کے رسول ہیں۔ اسلئے اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ آئندہ جو بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرب ہونا چاہیگا۔ اسکے لئے ضروری ہوگا کہ وہ مسیح موعود کے واسطہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے۔ اور مسیح موعود کے واسطہ سے ہی خدا تعالیٰ تک پہنچے۔ اس کے بغیر کوئی انسان انہی برکات کو حاصل

## سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ اِثْنَتَانِ وَعِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۂ بروج۔ یہ سورۃ مکی ہے اور اس کی بسم اللہ کے سوا بائیس آیات ہیں ۱؎

۱؎ یہ سورۃ بھی پہلی چند سورتوں کے تسلسل میں ہے اور مکی سورۃ ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ لَا خَلَافَ فِیْ مَکِّیَّتِهَا۔ اس کے مکی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن انگریز مصنفین نے اس میں ایک شبہ پیدا کیا ہے۔ نولڈکے جرمن مستشرق اسے زمانۂ اول کے پہلے دَور یعنی ابتدائی اڑھائی سال کے اندر کی قرار دیتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مَا نَقَمُوْا سے لے کر ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ تک بعد کی ہیں۔ بعد کی آیات سے یہ مراد نہیں کہ کسی اور نے ملا دی ہیں۔ بلکہ اس کے نزدیک مدنی زندگی میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ملائی ہیں۔ وہ کہتا ہے ان آیتوں کی عبارت مکی عبارتوں سے مختلف ہے۔ کیونکہ یہ آیتیں باقی آیتوں سے لمبی ہیں اور مدنی سورتوں سے ملتی ہیں۔

وہیری اس پر ایک اور بات زائد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اس سورۃ میں مومنات کا لفظ آیا ہے۔ جیسا کہ لکھا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ۝ اور مومنات کا لفظ مدنی سورتوں میں ہی مروّج ہوا ہے مکی سورتوں میں نہیں۔ اس طرح نولڈکے کے خیالات کی وہ تصدیق کرتا ہے۔ نولڈکے کا خیال ہے کہ آٹھویں آیت سے لے کر گیارہویں آیت تک مدنی زمانہ کی آیات ہیں۔ جہاں تک مکی اور مدنی آیتوں کا سوال ہے ہمیں اس بحث سے کوئی تعلق نہیں کہ کوئی آیت مکی ہے یا مدنی۔ ہمارے نزدیک ہر آیت خدا تعالیٰ کی نازل کی ہوئی ہے اور ہر آیت ہمارے لئے قابلِ عمل ہے خواہ وہ مکہ میں نازل ہوئی ہو یا مدینہ میں۔ اس لئے ان کے مکی یا مدنی ہونے سے ہمارے نزدیک کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اور اگر منکرینِ اسلام کے نظریہ کو لو تو اُن کے نزدیک ہر آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی بنائی ہوئی ہے۔ اس لئے انہیں بھی اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کہ کوئی آیت مکی ہے یا مدنی۔ لیکن یہ بتانے کے لئے کہ مستشرقینِ یورپ اسلام کے متعلق بعض دفعہ کیسی رکیک اور بے بُنیاد باتیں بیان کرتے ہیں مَیں اس اعتراض پر بحث کرتا ہوں۔

سورۂ بروج مکی ہے۔

جہاں تک مَیں سمجھتا ہوں نولڈکے کا یہ دعویٰ خلافِ عقل ہے کیونکہ چند آیات کے ذرا لمبا ہو جانے سے اُن کے بعد میں نازل ہونے کا کوئی ثبوت نہیں نکل سکتا۔ آخر قرآن کریم کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ سارے کا سارا اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ اور نولڈکے اور اُس کے ساتھیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ سارا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بنایا ہے۔ بہرحال کسی تیسرے شخص کا تو یہاں سوال ہی نہیں۔ اب اگر یہ بات مان لی جائے کہ قرآن سارے کا سارا خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے تو یہ کہنا کہ مدینہ میں خدا تعالیٰ لمبی آیتیں نازل کر سکتا تھا لیکن مکہ میں نہیں حماقت ہے اور اگر اس نظریہ کو لے لیا جائے کہ تمام سورتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی بنائی ہوئی ہیں تب بھی نولڈکے اور دوسرے مستشرقین کا یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں لمبی آیتیں نہیں بنا سکتے تھے لیکن مدینہ میں بنا سکتے تھے بیہودہ بات ہے کسی حکمت کے ماتحت اگر عام طور پر مکی آیتیں چھوٹی ہیں تو اس کے یہ معنے نہیں کہ ان آیات کو بنانے والا لمبی آیتیں ضرورت کے موقع پر نہیں بنا سکتا تھا۔ پس عقلی طور پر یہ دعویٰ باطل ہے۔

مستشرقین کا مکی اور مدنی آیات پر بحث کرنے کا بیہودہ طریق۔

واقعات کے لحاظ سے بھی یہ بات درست ثابت نہیں ہوتی اس لئے کہ مومنات کا لفظ جس پر وہیری نے بُنیاد رکھی ہے اور کہا ہے کہ یہ صرف مدنی سورتوں میں آیا ہے مکی سورتوں میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ سورۂ نوح کی آیت ہے رَبِّ اغْفِرْ لِيْ

# بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(مَیں) اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

## وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ○ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ○

(مجھے) قسم ہے بُرجوں والے آسمان کی۔ اور اُس دن کی بھی جس کا وعدہ ہے ۲؎

وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ○ (نوح ع۲) یہاں مومنات کا لفظ بھی آیا ہے اور یہ آیت بھی لمبی ہے۔ گویا دونوں باتیں اِس آیت میں پائی جاتی ہیں۔ اور سورۂ نوح وہ سورۃ ہے جس کے مکّی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ فتح البیان کا مصنف لکھتا ہے اِنَّھَا مَکِّیَّۃٌ قَالَ الزُّبَیْرُ نَزَلَتْ بِمَکَّۃَ۔ یعنی سورۂ نوح مکّی ہے اور حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ یہ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ رُوح المعانی کے مصنف لکھتے ہیں مَکِّیَّۃٌ بِالْاِتِّفَاقِ۔ اِس پر سب اتفاق کرتے ہیں کہ سورۂ نوح مکّی ہے۔ نولڈکے جو سورۂ بروج کی بعض آیتوں کے لمبا ہونے سے یہ استدلال کرتا ہے کہ وہ مدنی ہیں وہ بھی سورۂ نوح کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ پہلے پانچ سال کی سورتوں میں سے ہے۔ اور وہیری جو مومنات کے لفظ کی وجہ سے سورۂ بروج کی آیات کو مدنی قرار دیتا ہے وہ بھی سورۂ نوح کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ ساتویں سال نبوت کی ہے۔ پس نولڈکے اور وہیری کی اپنی شہادتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ مکّی سورتوں میں مومنات کا لفظ بھی آتا ہے اور اس کی بعض آیات لمبی بھی ہیں پس معلوم ہوا کہ سورۂ بروج کے متعلق جو انہوں نے استدلال کیا تھا وُہ محض ایک ڈھکوسلہ تھا اور ڈھکوسلہ چونکہ یاد نہیں رہتا اسلئے کسی موقع پر کچھ نتیجہ نکال لیا اور کسی موقع پر کچھ۔

بات یہ ہے کہ قرآن کریم کے متعلق مستشرقین یورپ جس چیز کو دلیل قرار دیتے ہیں وہ محض ظن اور تخمین ہوتی ہے اور ہمارے ہندوستانی نوتعلیمیافتہ جب کوئی بات اُن کے مُنہ سے سُنتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ وہ وحی الٰہی سے بھی زیادہ مقدس ہے۔ حالانکہ اگر غور سے کام لیا جائے تو ایک ڈھکوسلے سے زیادہ اُس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

بُرُوْج

**۲؎ حل لغات۔** بُرُوْجٌ۔ بُرْجٌ کی جمع ہے۔ اور بُرْجٌ کے معنے عربی زبان میں اَلرُّکْنُ وَالْحِصْنُ وَالْقَصْرُ کے ہیں۔ یعنی عمارت کے مضبوط حصّہ یا قلعہ یا محل کو بُرج کہتے ہیں۔ نیز ستاروں کی گردش کی جگہ کو بھی بُرج کہتے ہیں (اقرب)۔ اِسی طرح کہتے ہیں بَرِجَتْ عَیْنُہٗ بَرَجًا کَانَ بَیَاضُھَا مُحْدِقًا بِالسَّوَادِ کُلِّہٖ لَا یَغِیْبُ مِنْ سَوَادِھَا شَیْءٌ فَھِیَ بَرْجَاءُ وَجَمْعُھَا بُرْجٌ۔ یعنی جب آنکھ کے متعلق بَرِجَتْ کا لفظ استعمال کریں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ آنکھ کی سیاہی کا اس کی سفیدی نے چاروں طرف سے خوب گھیرا کیا ہُوا ہے اور وہ عورت جس کی آنکھ اِس قسم کی ہو اس بَرْجَاءُ کہتے ہیں۔ اور بہت سی عورتوں کو بُرْجٌ کہتے ہیں۔ اِسی سے یہ محاورہ ہے کہ رَأَیْتُ بُرْجًا فِیْ بُرْجٍ۔ یعنی مَیں نے ایک قلعہ میں بہت سی خوبصورت عورتیں دیکھیں جن کی آنکھوں کی سفیدی نے اُن کی آنکھوں کی سیاہی کا احاطہ کیا ہُوا تھا۔ (اقرب) گویا بُرْجٌ مفرد بھی ہے اور اِس کے معنے رُکن۔ حِصن۔ اور قصر کے ہیں اور بُرْجٌ جمع بھی ہے جس کا مفرد بَرْجَاءُ ہے۔ اور اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ عورت جس کی آنکھوں کی سفیدی سیاہی کے چاروں طرف ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بعض عورتوں کی آنکھوں کی سیاہی ساری آنکھ میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُس کی آنکھیں بڑی ہیں پتلی خوب کھُلتی ہے اور سفیدی نظر آجاتی ہے۔

**تفسیر۔** فرماتا ہے ہم شہادت کے طور پر آسمان کو پیش کرتے ہیں جو بروج والا ہے۔ یہ بروج کیا ہیں؟ مفسرین نے اِس سے مراد علمِ ہیئت کے بروج لئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں بارہ ستاروں کے لئے بارہ بُرج ہوتے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ (۱) اَلْحَمَلُ (۲) اَلثَّوْرُ (۳) اَلْجَوْزَاءُ (۴) اَلسَّرْطَانُ (۵) اَلْاَسَدُ (۶) اَلسُّنْبُلَةُ (۷) اَلْمِیْزَانُ (۸) اَلْعَقْرَبُ (۹) اَلْقَوْسُ۔ (۱۰) اَلْجَدْیُ (۱۱) اَلدَّلْوُ (۱۲) اَلْحُوْتُ۔

بعض کہتے ہیں کہ سات سیارے اِن بارہ بُرجوں میں چکر کھاتے ہیں۔ اور گو بروج بارہ ہی ہیں مگر خصوصیت کے لحاظ سے وہ سات ستاروں سے مخصوص ہیں۔ چنانچہ (۱) مریخ کے لئے حمل اور عقرب (۲) زہرہ کے لئے ثور اور میزان (۳) عطارد کے لئے جوزا اور سنبلہ (۴) قمر کے لئے سرطان (۵) شمس کے لئے اسد (۶) مشتری کیلئے قوس اور حُوت (۷) اور زحل کے لئے جدی اور دلو مخصوص ہیں۔

ابن مردویہ جابر بن عبداللہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ بروج کیا چیز ہیں تو آپ نے فرمایا اَلْکَوَاکِبُ یعنی اُن سے مراد کواکب ہیں۔ غرض بُرج کا لفظ لغت کے لحاظ سے ویسے مقام کیلئے بولا جاتا ہے جہاں بادشاہ یا اُمراء ٹھہرتے ہوں۔ اور علمِ ہیئت والوں کی اصطلاح میں جو رائج ہو چکی ہے بُرج یا تو ستاروں کو اور یا پھر ستاروں کی گردش کے دائرہ کو کہتے ہیں جہاں وہ گردش کرتے ہیں۔ بہرحال پرانی ہیئت اِس بات پر متفق ہے کہ بُرج بارہ ہیں۔ اِس بنا پر آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم شہادت کے طور پر آسمان کو پیش کرتے ہیں جس میں بارہ بُرج ہیں یعنی بارہ ایسے مقام ہیں جہاں ستارے ٹھہرتے ہیں۔ وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ اور پھر ہم شہادت کے طور پر یوم موعود کو پیش کرتے ہیں۔ اگر بُرج کے معنے بارہ مقامات کے لئے جائیں تو یہ یوم موعود تیرھواں مقام ہوا۔ گویا بارہ مقاموں کو بھی اور یوم موعود کو بھی اللہ تعالیٰ شہادت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اور بارہ[1] اور یوم موعود مل کر تیرہ[1] ہو گئے۔ جب ہم اس کو وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ والی آیت سے ملاتے ہیں تو پہلی سورت سے اس کی ترتیب بالکل واضح ہو جاتی ہے وہاں فرمایا تھا ہم شہادت کے طور پر چاند کو پیش کرتے ہیں جب وہ تیرھویں رات میں داخل ہوتا ہے۔ اور یہاں فرمایا گیا ہے ہم بارہ بروج اور یوم موعود کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ پس یہاں بھی تیرہ زمانوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرما دیا۔ اور اِس طرح اس کا ایک گہرا تعلق پچھلی سورۃ سے ثابت ہو گیا۔

بروج سے مراد بارہ ستاروں کے بارہ مقامات۔

یہاں درحقیقت اُس مضمون کو بیان کیا گیا ہے جو پچھلی سورۃ میں بیان کیا گیا تھا۔ مگر شکل اور ہے۔ اور جو کچھ پچھلی سورۃ میں بیان کیا گیا تھا اُس کی صداقت کی ایک دلیل بھی اِس سورۃ میں بیان کی گئی ہے۔ پچھلی سورۃ میں فرمایا تھا فَمَا لَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ایمان نہیں لاتے۔ جو چیز اپنی ابتدائی حالت میں ہوتی ہے اُس پر ایمان لانا لوگوں کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اِس سورۃ کو شروع ہی اِس رنگ میں کیا ہے کہ ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اُن بارہ مقامات کو جہاں ستارے آکر ٹھہرتے ہیں۔ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بارہ صدیوں میں مختلف مجدّدین ظاہر ہوئے اور وہ الٰہی منشاء کے مطابق تجدیدِ دین کا کام کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ اُن مجدّدین کی بعثت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے اگر ہم اُمّتِ محمدیہ کے تھوڑے سے اختلاف اور اسلام اور مسلمانوں کی تھوڑی سی مصیبت کو دُور کرنے کے لئے مجدّدین مبعوث کرتے رہے ہیں تو کس طرح ہو سکتا ہے کہ اسلام پر ایک بھاری مصیبت آجائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کو دُور کرنے کا کوئی سامان نہ ہو۔ پس وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ کو فَمَا لَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ کے جواب میں مخالفین کے سامنے ایک دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم آسمان

سورۃ بروج کا پہلی سورۃ سے تعلق

کو اور اُس کے بارہ[۱۲] مقامات کو تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جن میں ستاروں نے قیام کیا یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے مختلف مجدد مبعوث ہوتے رہے۔ مجدّدین کے اس متواتر اور پے در پے ظہور کے بعد تیرہویں مقام پر آکر تمہیں کیوں مایوسی پیدا ہوگئی اور کیوں تم نے یہ خیال کر لیا کہ اللہ تعالےٰ اب لوگوں کی ہدایت کے لئے اپنے کسی مامور کو مبعوث نہیں کریگا۔ تمہارے پاس شہادت موجود ہے کہ پہلی صدی آئی اور اُس میں خدا تعالےٰ نے ایسے آدمی کھڑے کئے جو تجدیدِ دین کا کام کرتے رہے۔ دوسری صدی آئی اور اُس میں خدا تعالےٰ نے ایسے آدمی کھڑے کئے تیسری صدی آئی تو پھر یہی واقعہ ہوا۔ چوتھی صدی آئی تو پھر بھی ایسا ہی ہوا اور یہ سلسلہ چلتا چلا گیا یہاں تک کہ بارہ صدیوں میں بارہ دفعہ تمہارے لئے خدا تعالےٰ نے یہ ثبوت مہیا کیا کہ وہ اپنے دین کی مدد اور اُس کی نصرت کے لئے ہمیشہ ایسے آدمی کھڑے کیا کرتا ہے جو اُس کی طرف سے مظفر و منصور ہوتے ہیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم دُنیا میں پھیلاتے ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ بارہ جو غیر موعود تھے اُن کو تو تم نے مان لیا مگر تیرہواں جو موعود تھا اُس کی بعثت کو تسلیم کرنے سے تم نے انکار کر دیا۔ حالانکہ باقی وہ ہیں جن کے متعلق محض مبہم الفاظ میں خبر دی گئی تھی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے متعلق صرف اتنا فرمایا تھا کہ اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا (ابو داؤد جلد ۲ ملاً ۲۴۱) مگر تیرہویں کا نام لے کر بتایا گیا تھا کہ وہ ایسا ایسا ہوگا اس اس طرح کے کام کریگا اِن اِن علامات کے ساتھ آئیگا۔ یہ یہ نشانات اُس کی صداقت میں ظاہر ہوں گے۔ پس وہ غیر موعود جو ایک مبہم خبر کے نتیجہ میں ظاہر ہوئے تھے تم نے اُن کو تو مان لیا مگر وہ جس کا نام لے کر خدا نے خبر دی تھی جس کی بعثت کے اُس نے نشانات بتائے تھے۔ جس کی تعیین کے کئی شواہد بتائے گئے تھے۔ جس کا وقت اور جس کا زمانہ تک پیشگوئیوں میں معیّن کر دیا گیا تھا تم نے اُس کا انکار کر دیا۔ بلکہ مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت کے بعد انہوں نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کے لئے کسی مصلح کی ضرورت ہی نہیں۔ فرماتا ہے تم کو آج بارہ صدیوں کے بعد یہ بات سُوجھی ہے۔ بارہ صدیوں تک تم مانتے چلے آئے کہ احیاءِ اسلام کے لئے مجدّدین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام کی ترقی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی انسان کے مبعوث ہونے کی احتیاج ہوتی ہے۔ مگر جب تیرہویں صدی آئی اور اُس میں ہم نے اپنا موعود مامور بھیجدیا تو تم نے اُس کا انکار کر دیا۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ ہمیں کسی مصلح کی ضرورت ہی نہیں۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ میں آخری زمانہ میں بارہ مجددین کے بعد ایک مامور کے مبعوث کئے جانے کی پیشگوئی۔ [۲۱]

فَمَا لَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ اُن کو کیا ہوگیا کہ جو ہمارا موعود مامور تھا جس کی تفصیلات ہم نے پہلے سے بتا دی تھیں جس پر ایمان لانے کی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر تاکید فرمائی تھی جس کے درجہ اور شان کی تفہیم بڑی کثرت سے بیان کی گئی تھی اُس پر ایمان لانے سے اِن لوگوں نے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ یہ بات ہی غلط ہے کہ اسلام اپنی ترقی کے لئے آسمانی وجودوں کی بعثت کا محتاج ہے۔ فرماتا ہے ہم اسلام کی ترقی کے لئے بارہ بروج کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ غور کرو اور دیکھو کہ کس طرح ایک ایک قدم پر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی مدد فرمائی اور کفر کے حملوں کو نابود کرنے کیلئے اپنے مقدس لوگ کھڑے کرتا رہا۔ پھر جب تیرہویں صدی آئی تو ہم نے اُس زمانہ میں بھی اپنا وہ موعود بھیج دیا جس کی ہم خبر دیتے چلے آئے تھے۔ خدا تعالےٰ کی قدرت ہے ہم پر قرآن کریم کی آیات کے یہ مطالب تو بعد میں کھُلے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام ہی ہماری جماعت میں مسیح موعود پڑ گیا ہے۔ جس کے معنے یہی ہیں کہ یومِ موعود میں ظاہر ہونے والا مسیح۔ جس احمدی سے بھی سنو۔ خواہ وہ عالم ہو یا جاہل۔ پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ۔ تم سے یہی کہتے پاؤ گے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے

یوں کہا۔ یا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کی یہ دلیل ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام ہی مسیح موعود رکھ دیا۔ اور یہ لفظ اتنی کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ کہ مہدی کا لفظ بھی غائب ہو گیا ہے۔ حالانکہ مہدی کا لفظ حدیثوں میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ مگر چونکہ قرآن کریم میں اس کو موعود قرار دیا گیا تھا اس لئے خدا نے اپنے تصرّف سے مسیح موعودؑ کے الفاظ دُنیا میں رائج فرما دیئے

حدیثوں میں آتا ہے عَنِ ابْنِ اَبِیْ حَاتِمٍ وَابْنِ جَرِیْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْیَوْمُ الْمَوْعُوْدُ یَوْمُ الْقِیَامَۃِ وَشَاھِدٌ یَوْمُ الْجُمُعَۃِ وَمَشْھُوْدٌ یَوْمُ الْعَرَفَۃِ وَشَاھِدٌ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَشْھُوْدٌ یَوْمُ الْقِیٰمَۃِ۔ (ابن کثیر) یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوم موعود یوم قیامت ہے۔ شاہد یوم جمعہ ہے مشہود یوم عرفہ ہے۔ اسی طرح شاہد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور مشہود قیامت کا دن ہے۔ اس حدیث کی صحت سے ہم کو انکار نہیں۔ درحقیقت یوم موعود بہت سے ہیں۔ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ جنگ بدر کا دن بھی یوم موعود تھا کیونکہ اس جنگ کی قرآن کریم میں پیشگوئی موجود ہے۔ اسی طرح جنگِ احزاب بھی موعود تھی کیونکہ اس کی پیشگوئی کی گئی تھی۔ فتح مکّہ کا دن بھی یوم موعود تھا کیونکہ اس فتح کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیشگوئی کی گئی تھی پس ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اور بھی کئی یوم موعود ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہاں جس یوم موعود کا ذکر ہے وہ ایسا موعود ہے جسے اس واقعہ کے بعد آنا ہے جس کا ذکر ذات البروج میں ہے اور ذات البروج کے بعد آنے والا یوم موعود نہ قیامت کا دن ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اور ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس جگہ بھی موعود مراد ہو سکتا ہے جس نے بارہ بروج کے بعد تیرھویں صدی میں ظاہر ہونا تھا۔ کسی لفظ میں اشتراک کے یہ معنے نہیں ہوا کرتے کہ اس لفظ کے ہر جگہ ایک ہی معنے لئے جائیں بلکہ وہ لفظ اپنے موقع اور محل کے مطابق الگ الگ معنے دے گا۔ پس بیشک بدر یوم موعود ہے۔ احزاب یوم موعود ہے۔ فتح مکّہ یوم موعود ہے اور ہمیں اس سے ہرگز انکار نہیں۔ مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ کے بعد جس موعود کا ذکر ہے وہ سوائے مسیح موعودؑ کے اور کوئی نہیں۔ اور وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ میں بھی اسی موعود کی خبر دی گئی تھی۔ اگر اس جگہ یوم موعود سے مراد مسیح موعود نہیں تو سوال یہ ہے کہ وہ کونسی طاقت تھی جس نے اگلی اور پچھلی آیات میں ایسا جوڑ پیدا کر دیا کہ اُن سے جو بات بھی ثابت ہوتی ہے مسیح موعود پر چسپاں ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کا ایک طرف وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کہنا پھر وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ کہکر شہادت میں بُروج کو پیش کرنا اور پھر علم ہیئت کی طرف سے اس تحقیق کا ہونا کہ بُروج بارہ ہیں یہ سب کچھ بتا رہا ہے کہ جو کچھ ہوا الٰہی تصرّف کے ماتحت ہوا۔ اسی طرح اگلی آیت میں شاہد اور مشہود کا ذکر آتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہد ہزاروں ہوئے ہیں بلکہ ہر نبی شاہد ہوتا ہے۔ کیا دُنیا میں کوئی بھی نبی ایسا ہوا ہے جس نے دلائل اور معجزات اور بیّنات سے اللہ تعالیٰ کے وجود کی گواہی پیش نہ کی ہو۔ یقیناً ہر نبی ایسا کرتا رہا۔ پس ہر نبی شاہد ہے۔ ان معنوں میں کہ وہ خدا تعالیٰ کی ہستی اور اُس کی قدرت اور اُس کے جلال کا ایک زندہ گواہ ہوتا ہے۔ اور ہر نبی مشہود ہوتا ہے کیونکہ جب وہ دُنیا میں آتا ہے خدا تعالیٰ اُس کی صداقت کے ثبوت مہیا کرتا ہے۔ پس وہ خدا تعالیٰ کیلئے شاہد ہوتا ہے۔ اور چونکہ خدا اُس کی صداقت کے لئے نشانات و معجزات ظاہر کرتا ہے اس لئے وہ مشہود بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر نبی کے زمانہ میں خدا شاہد ہوتا ہے کیونکہ وہ نبی کی صداقت پر گواہ ہوتا ہے اور خدا مشہود بھی ہوتا ہے کیونکہ نبی کے ذریعہ اُس کا وجود

(حاشیہ: ۲۱۱ یوم موعود سے مراد)

# وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝

اور (آسمانی) گواہ کی۔ نیز جس پر گواہی دی گئی ہے اُس (آسمانی وجود) کی بھی ۳ ؎

دُنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس الہام میں اشارہ کیا گیا کہ یَا قَمَرُ یَا شَمْسُ اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْكَ۔ اے قمر اور اے شمس تُو مجھ سے ہے اور مَیں تجھ سے ہوں یعنی تُو قمر ہے اِن معنوں میں کہ تُو نے جو کچھ نُور لیا مجھ سے لیا اور تُو شمس ہے اِن معنوں میں کہ تیرے وجود سے میرا وجود روشن ہوا۔ اسی طرح مَیں شمس ہوں کیونکہ اگر مَیں تیری مدد نہ کرتا تو دُنیا میں تُو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکتا۔ اور مَیں قمر بھی ہوں کیونکہ مجھے تُو نے دُنیا میں رُوشناس کرایا۔

پس جس طرح خدا شمس بھی ہوتا ہے اور قمر بھی اسی طرح نبی ایک حیثیت سے شمس ہوتا ہے اور دوسری حیثیت سے قمر ہوتا ہے۔ یہی حال شاہد اور مشہود کا ہے۔ ہر نبی شاہد ہوتا ہے اور خدا مشہود ہوتا ہے مگر دوسری طرف اِس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خدا شاہد ہوتا ہے اور نبی مشہود ہوتا ہے مگر اسکے یہ معنے نہیں کہ شاہد اور مشہود ہم کسی اور چیز کو نہیں قرار دے سکتے۔ خود اس حدیث میں جس کا مَیں نے ابھی ذکر کیا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یوم جمعہ کو شاہد اور یوم عرفہ کو مشہود قرار دیا ہے۔ دوسری طرف آپؐ نے قیامت کے دن کو مشہود قرار دیا ہے۔ پس تمام حدیثیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ ہم یوم القیامۃ کے یوم موعود ہونے سے انکار نہیں کرتے۔ اسی طرح شاہد اور مشہود کے متعلق حدیثوں میں جو کچھ آتا ہے اُسے بھی تسلیم کرتے ہیں مگر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ یہاں کونسی بات چسپاں ہوتی ہے۔ یہاں یوم موعود سے مراد زمانہ مسیح موعودؑ ہے یا قیامت کا دن ہے۔ صاف بات ہے کہ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ میں یہ بتایا گیا تھا کہ ایک سخت تاریک و تار رات کے بعد جو روحانی طور پر تمام دُنیا پر چھا جائے گی اللہ تعالےٰ ظہورِ قمر کو اتّساق کا مقام بخشے گا۔ اور ضمناً یہ ثابت کیا

شاہد کی تشریح قرآن مجید میں۔

جا چکا ہے کہ قمر کے لئے اتّساق کا لفظ اُس وقت استعمال کرتے ہیں جب وہ تیرہویں رات کا ہو۔ گویا تیرہویں رات کے چاند کو شہادت کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سورہ بروج میں پھر یہی ذکر فرمایا۔ مگر اِس رنگ میں کہ پہلے بارہ بروج کا ذکر فرمایا اور پھر تیرہویں نمبر پر یوم موعود کا۔ اِس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اِس جگہ یوم موعود سے مراد وہی مسیح موعودؑ ہے جس کے لئے یہ مقدر کیا جا چکا تھا کہ وہ بارہ بروج کے بعد دُنیا میں مبعوث ہو گا۔

یوم کے معنے وقت کے ہوتے ہیں۔ اگر یہ معنے مراد لئے جائیں تو یوم موعود سے مراد وقت موعود ہو گا۔ اسی طرح یوم نہار یعنی معروف دن کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اِس صورت میں والیوم الموعود کے یہ معنے ہونگے کہ گو مثال ہم رات کی دیتے چلے آئے ہیں مگر اپنی ذات میں وہ وقت دن کی طرح روشن ہوگا اس لئے ہم اُسے یوم موعود کہہ رہے ہیں کیونکہ اُس دن خدا تعالےٰ کا نُور اور جلال ظاہر ہو گا۔

**۳ ؎ تفسیر**۔ میرے نزدیک قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ شاہد کی جو تعریف فرما دی ہے وہی اِس جگہ چسپاں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ ہُود میں فرماتا ہے اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (ہود ع ۲) یعنی کیا جو شخص اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر قائم ہے اور اُس کی صداقت کا ایک گواہ خدا تعالےٰ کی

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ﴿۵﴾ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ﴿۶﴾

خندقوں والے ہلاک ہو گئے۔ یعنی (خندقوں میں) آگ (بھڑکانے والے) جس میں (خوب) ایندھن (جھونکا گیا) تھا۔

اِذۡ ہُمۡ عَلَیۡہَا قُعُوۡدٌ ۙ﴿۷﴾ وَّ ہُمۡ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ

جب وہ اس (آگ) پر (دھرنا مار کر) بیٹھے ہوئے تھے۔ اور وہ مومنوں سے جو کچھ (معاملہ) کر رہے تھے

بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ شُہُوۡدٌ ؕ﴿۸﴾

آنکھیں کھولے کر رہے تھے۔ ؎

طرف سے آکر اُس کی پیروی کرے گا اور اُس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی جو لوگوں کے لئے امام و رحمت تھی ایک جھوٹے مدعی جیسا ہو سکتا ہے؟ اور موسیٰ کے سچے پیرو اس پر بھی ضرور ایمان لاتے ہیں اور ان مخالف گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے گا تو دوزخ کی آگ اُس کے لئے وعدہ کی جگہ ہے۔ پس اے مخاطب تو اس کے متعلق کسی قسم کے شک میں نہ پڑ وہ یقیناً بالکل حق ہے اور تیرے رب کی طرف سے ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لایا کرتے۔

اِس آیت میں شَاھِدٌ مِّنْہُ کے ذریعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کی خبر دی گئی ہے۔ پس شاہد مسیح موعود ہیں اور مشہود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اِس جگہ بیان فرمائی ہے کہ ہم شہادت کے طور پر اُس شاہد کو پیش کرتے ہیں جس کا دوسری جگہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اسی طرح ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات کو پیش کرتے ہیں پس شاہد سے مراد یہ ہے کہ اُس زمانہ میں جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت لوگوں کے قلوب سے مٹ چکی ہوگی وہ اِس بات کی گواہی دے گا کہ آپؐ سچے ہیں اور قرآن کریم کی صداقت لوگوں پر واضح کرے گا۔

**۵۴ حل لغات۔** اَلْاُخْدُوْدُ کے معنے ہیں:۔ اَلْحُفْرَۃُ الْمُسْتَطِیْلَۃُ فِی الْاَرْضِ۔ زمین میں لمبا کھدا ہوا گڑھا (اقرب) اِس کی جمع اَخَادِیْدُ آتی ہے۔

**تفسیر۔** فرماتا ہے ہلاک ہو گئے یا ہلاک کئے جائیں گے اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ یعنی خندقوں والے۔ اَلنَّارِ۔ وہ خندقیں جو نار پر مشتمل ہوں گی ایسی نار پر جو ذَاتِ الْوَقُوْدِ ہوگی۔ ایندھن والی ہوگی یعنی ہماری مراد اِس اُخدود سے وہ آگ ہے جو اُخدود میں جلائی جائے گی گویا ہلاکت کا اصل سبب خندق کھودنا نہیں بلکہ خندق میں آگ جلا کر لوگوں کو مبتلائے تعذیب کرنا ہوگا۔ اِذْ ھُمْ عَلَیْھَا قُعُوْدٌ جبکہ وہ اُس پر بیٹھیں گے۔ وَھُمْ عَلٰی مَا یَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ شُھُوْدٌ اور وہ جو کچھ مومنوں کے ساتھ کر رہے ہوں گے اُس پر وہ حاضر اور نگران ہوں گے۔

شاہد سے مراد مسیح موعودؑ۔

اِن آیات کے متعلق مفسرین نے دو باتیں بیان کی ہیں۔ اوّل یہ کہا ہے سینیا کا ایک بادشاہ تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے بعض لوگوں کو جو توحید پر قائم تھے عذاب دیا اور بعض نے لکھا ہے کہ یہ دانیال اور اُس کے دو ساتھیوں کے متعلق ہے جن کو بخت نصر نے عذاب دیا تھا۔ مَیں حیران ہوں کہ مفسرین نے یہ کس طرح لکھ دیا۔ اصل میں یہ بائبل کا بیان کردہ واقعہ ہے اور وہی قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے خصوصاً اس لئے کہ دانیال کی کتاب میں اس کا ذکر موجود ہے۔ دانیال

اصحاب الاخدود کے متعلق سابق مفسرین کے خیالات اور اُن کی تردید۔

اَلْاُخْدُوْدُ

باب۳ میں یہ واقعہ اِس طرح مذکور ہے۔

"اور نبوکدنضر بادشاہ نے ایک سونے کی مُورت بنوائی جس کی لمبائی ساٹھ ہاتھ اور چوڑائی چھ ہاتھ کی تھی۔ اور اُسے دُورا کے میدان صوبہ بابل میں نصب کیا۔ تب نبوکدنضر بادشاہ نے لوگوں کو بھیجا کہ امیروں اور حاکموں اور سرلشکروں اور منصفوں اور خزانچیوں اور مشیروں اور مجتہدوں اور سارے صوبوں کے منصب داروں کو جمع کریں تاکہ وے اُس مُورت کی جسے نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا تھا تقدیس کرنے کو آویں۔ تب امیر اور حاکم اور سرلشکر اور منصف اور خزانچی اور مشیر اور مجتہد اور صوبوں کے سارے منصب دار اُس مُورت کی تقدیس کے لئے جسے نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا تھا جمع ہوئے اور وے اُس مُورت کے آگے جسے نبوکدنضر نے نصب کیا تھا کھڑے ہوئے۔ تب ایک منادی نے بلند آواز سے پکارا کہ اے قومو! اے گروہو! اور اے مختلف لغتیں بولنے والو! تمہارے لئے یہ حکم ہے کہ جس وقت قرنائے اور نے اور ستار اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے باجے کی آواز سنو تو اِس سونے کی مُورت کے آگے جسے نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا ہے اوندھے مُنہ گرو اور سجدہ کرو۔ اور جو کوئی اوندھے مُنہ نہ گرے اور سجدہ نہ کرے تو اسی گھڑی جلتی بھٹی کے بیچ میں ڈالا جائے گا۔ سو اُسی دم جس وقت ساری قوموں نے قرنائے اور نے اور ستار اور رباب اور بربط اور ہر طرح کے باجے کی آواز سُنی اُسی وقت ساری قومیں اور گروہیں اور زبان بولنے والے اُس مُورت کے آگے جسے نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا تھا اوندھے مُنہ گرے اور انہوں نے سجدہ کیا۔ سو اُس وقت کئی ایک کسدی نزدیک آئے اور انہوں نے یہودیوں پر نالش کی۔ انہوں نے نبوکدنضر بادشاہ کے آگے عرض کی۔ اے بادشاہ! تا ابد جیتا رہ۔ اے بادشاہ تُو نے حکم کیا ہے کہ جو قرنائے اور نے اور ستار اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے باجے کی آواز سُنے سو اُس سونے کی مُورت کے آگے زمین تک جُھکے اور سجدہ کرے۔ اور جو کوئی زمین تک نہ جُھکے اور سجدہ نہ کرے سو ایک جلتی بھٹی کے بیچ میں ڈالا جائے گا۔ اب چند یہودی جنہیں تُو نے بابل کے صوبے کی کارپردازی پر متعین کیا ہے یعنی سدرک اور میسک اور عبید نجو۔ اِن آدمیوں نے تیری تعظیم نہیں کی ہے۔ وے تیرے معبودوں کی عبادت نہیں کرتے ہیں اور اُس سونے کی مُورت کو جسے تُو نے نصب کیا سجدہ نہیں کرتے۔ تب نبوکدنضر نے قہر اور غضب سے حُکم کیا کہ سدرک اور میسک اور عبید نجو کو حاضر کریں۔ سو اُنہوں نے اُن آدمیوں کو بادشاہ کے حضور حاضر کیا۔ نبوکدنضر نے ارشاد کیا اور اُنہیں کہا اے سدرک اور میسک اور عبید نجو! کیا یہ سچ ہے کہ تم لوگ میرے معبودوں کی عبادت نہیں کرتے ہو اور اُس سونے کی مُورت کو جسے مَیں نے نصب کیا سجدہ نہیں کرتے۔ پس اب بھی اگر مستعد رہو کہ جس دم قرنائے اور نے اور ستار اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے باجے کی آواز سنو تو اُسی دم اُس مُورت کے آگے جسے مَیں نے کھڑا کیا اوندھے مُنہ گر پڑو اور سجدہ کرو تو بہتر۔ پر اگر سجدہ نہ کروگے تو اُسی گھڑی ایک آگ کی جلتی بھٹی کے بیچ ڈالے جاؤگے اور وہ خدا کون ہے جو تمہیں میرے ہاتھ سے چھڑا دے گا۔ سدرک اور میسک اور عبید نجو نے جواب میں بادشاہ سے کہا کہ اے نبوکدنضر اِس مقدمے میں تجھے جواب دینا ہم ضرور نہیں جانتے۔ دیکھو تو۔ ہمارا خدا ہے جس کی عبادت ہم کرتے ہیں وہ ہمیں آگ کی جلتی بھٹی سے چھڑانے کی قدرت رکھتا ہے اور وہ اے بادشاہ تیرے ہاتھ سے ہم کو چھڑا دے گا اور نہیں تو اے بادشاہ! تجھے معلوم ہو کہ ہم تیرے معبودوں کی عبادت نہیں کریں گے اور اُس سونے کی مُورت کو جسے

تُونے نصب کیا ہے سجدہ نہ کریں گے۔ تب بنوکدنضر غصّہ سے بھر گیا اور اُس کے چہرے کا رنگ سدرک اور میسک اور عبید نجُو پر متبدّل ہوا اور اُس نے حکم دیا کہ بھٹی کی آنچ اُس معمول سے جو اُس کا تھا ہفت چند زیادہ کریں۔ اور لشکر کے زورآور پہلوانوں کو حکم کیا کہ سدرک اور میسک اور عبید نجُو کو باندھیں اور جلتی بھٹی میں ڈال دیں۔ تب وے اشخاص اپنی قبا اور زیر جامہ اور ٹوپی اور پوشاک سمیت باندھے گئے اور جلتی بھٹی کے بیچوں بیچ میں ڈالے گئے اسلئے کہ بادشاہ کا حکم تاکیدی تھا اور بھٹی کی آنچ نہایت زیادہ ہوئی۔ آگ کی لَو نے اُن لوگوں کو جنہوں نے سدرک اور میسک اور عبید نجُو کو اُٹھایا تھا ہلاک کیا اور یہ تین شخص یعنی سدرک اور میسک اور عبید نجُو باندھے ہوئے جلتی بھٹی کے درمیان گر پڑے۔ اُس وقت بنوکدنضر بادشاہ سراسیمہ ہوا اور اُس نے جلد اُٹھ کر ارکانِ دولت سے مخاطب ہو کر کہا۔ کیا ہم نے تین شخصوں کو بندھوا کر جلتی بھٹی میں نہیں ڈلوایا۔ انہوں نے جواب میں کہا۔ اے بادشاہ! سچ ہے۔ اُس نے جواب میں کہا۔ دیکھو چار شخص کھُلے ہوئے آگ کے بیچ پھرتے دیکھتا ہوں اور اُنہیں کچھ ضرر نہ ہوا۔ اور چوتھے کی صورت خدا کے بیٹے سی ہے۔

تب بنوکدنضر نے آگ کی جلتی بھٹی کے دروازے پر آکر پکارا کہ اے سدرک اور میسک اور عبید نجُو خدا تعالیٰ کے بندو باہر نکلو اور ادھر آؤ تو سدرک اور میسک اور عبید نجُو آگ کے درمیان سے نکل آئے اور سارے امیروں اور حاکموں اور سرلشکروں اور بادشاہ کے مشیروں نے فراہم ہو کر اُن شخصوں پر نظر کی کہ آگ کی اُن کے بدنوں پر تاثیر نہ ہوئی تھی اور نہ اُن کے سر کا ایک بال جھُلس گیا اور نہ اُن کی پوشاک میں مطلق کچھ فرق ہوا اور نہ آگ سے جلاہٹ کی بُو اُن پر سے معلوم ہوتی تھی۔ تب بنوکدنضر نے پکار کے کہا کہ سدرک اور میسک اور عبید نجُو کا خدا مبارک ہو جس نے اپنے فرشتے کو بھیجا اور اپنے بندوں کو جنہوں نے اُس پر توکّل کر کے بادشاہ کے حکم کو ٹال دیا ہے اور اپنے بدنوں کو نثار کیا کہ سوا اپنے خدا کے دوسرے معبود کی عبادت اور بندگی نہ کریں چھڑایا ہے اس لئے مَیں حکم کرتا ہوں کہ جو قوم یا گروہ یا اہلِ لغت سدرک اور میسک اور عبید نجُو کے خدا کے حق میں کوئی نالائق سخن بولیں گے تو اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جائیں گے۔ اور اُن کے گھر گھورے بن جائیں گے۔ کیونکہ کوئی دوسرا خدا نہیں جو اِس طرح چھڑا سکے۔ تب بادشاہ نے سدرک اور میسک اور عبید نجُو کو صوبہ بابل میں سرفراز کیا۔"

(دانی ایل باب ۳)

یہ ایک واقعہ ہے جو گذشتہ زمانہ میں ہوا۔ اور جس کو مفسّرین نے بھی بیان کیا ہے وہ اس میں دانیال کو بھی شامل کر دیتے ہیں مگر یہ اُن کی غلطی ہے۔ اور اِس غلطی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُس وقت بائبلیں کثرت سے نہیں تھیں اس لئے غلطی سے انہوں نے دانیال کو بھی اِس میں شامل سمجھ لیا۔ بہرحال یہ ایک واقعہ ہے جو گذشتہ زمانہ میں ہوا۔ اُس میں ایک بھٹی کا بھی ذکر آتا ہے۔ یہ بھی آتا ہے کہ اُس میں آگ جلائی گئی۔ یہ بھی آتا ہے کہ اُس میں تین آدمی پھینکے گئے۔ اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ اور اُس کے ساتھی اِس نظارہ کو دیکھتے رہے۔ اِس حد تک تو درست ہے لیکن اِس کے واقعات پورے طور پر قرآنی واقعات سے نہیں ملتے۔ کیونکہ قرآن کریم نے اُن کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ وہ آگ میں سے زندہ نکل آئے تھے۔ بائبل میں چونکہ مبالغہ بھی ہے اس لئے ممکن ہے اتنا حصّہ بعد میں بڑھا لیا گیا ہو۔ اور اِس حد تک بات درست ہو کہ کچھ لوگوں کو محض اسلئے آگ کی بھٹی میں جلا دیا گیا ہو کہ وہ کیوں خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں۔ ایسا ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے۔ اور ہر نبی کے وقت دشمنانِ دین کی طرف سے خدا تعالیٰ پر ایمان لانے والوں کو قسم قسم کے عذابوں میں مبتلا کیا گیا ہے لیکن میرا یہ یقین ہے کہ جب اِس سورت کو

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ وَ شَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ کے الفاظ سے شروع کیا گیا ہے تو شہادت کسی ایسے واقعہ کے متعلق ہی ہوتی ہے جو آئندہ زمانہ میں ہونے والا ہو۔ قرآن کریم میں تم یہ کہیں نہیں دیکھو گے کہ خدا نے کہا ہو میں سورج اور چاند کو اِس بات کی شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں کہ میں نے آدمؑ بھیجا تھا۔ یا نوحؑ بھیجا تھا۔ یا ابراہیمؑ اور موسٰیؑ کو مبعوث کیا تھا۔ شہادت ایسے ہی امور کے متعلق پیش کی جاتی ہے جو غیبی ہوں یا آئندہ زمانہ میں رُونما ہونے والے ہوں۔ پس جبکہ قرآن کریم میں کوئی قسم ایسی نہیں جو ماضی کے واقعات پر کھائی گئی ہو تو بائیبل کے اِس واقعہ کو قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ والی آیت پر چسپاں کرنا قرآنی طریق کے خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے۔

قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ میں آئندہ زمانہ میں ہونے والے واقعات کی پیشگوئی۔

ایک تاریخی واقعہ جو گذر چکا ہے اُس پر اللہ تعالیٰ کو قسم کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوسکتی تھی۔ میں اِس کا منکر نہیں کہ گذشتہ زمانہ میں بھی کوئی ایسا واقعہ ہوا ہو۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اگر گذشتہ زمانہ میں کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے تو یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ ایسا ہی واقعہ پھر کوئی ہونے والا ہے۔ پس میرے نزدیک قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ کے ذریعہ ایک دوسری پیشگوئی شروع کی گئی ہے۔ پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ مسیح موعودؑ ظاہر ہو گا اور اسلام کو غالب کرے گا۔ چنانچہ اس کی دلیل یہ دی گئی تھی کہ ماضی شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ احیاءِ اسلام کے لئے ہمیشہ مجدّدین مبعوث کرتا رہا ہے پس ضروری ہے کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے بالخصوص اس لئے کہ ہم ایک موعود کی بعثت کی خبر دے چکے ہیں۔ اب یہ بتاتا ہے کہ یومِ موعود آسانی سے نہیں آئے گا بلکہ اِس کے لئے مومنوں کو بڑی بھاری قربانیاں کرنی پڑیں گی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوم موعود کے متعلق بڑا زور دیا گیا تھا اس لئے ممکن تھا جماعتِ موعود یہ خیال کر لیتی کہ یہ یوم موعود خود بخود آجائے گا ہمیں اس کے لئے کسی خاص جدوجہد سے کام نہیں لینا پڑے گا۔ سو خدا تعالیٰ نے قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ کے ذریعہ اِس خیال کا ازالہ کر دیا اور بتایا کہ یہ یوم موعود آئے گا تو سہی مگر تمہیں اپنی جانوں کو اِس راہ میں قربان کرنا پڑے گا اور مخالفین کے جور و ستم اور اُن کے بھیانک مظالم کا ایک عرصہ تک تختۂ مشق بننا پڑے گا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی جماعت کو بارہا اِس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اسلام اور احمدیت کی ترقی ہم سے موت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگر ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ بغیر اُن قربانیوں کے جو صحابہؓ نے کیں یا بغیر اُن قربانیوں کے جو سابق انبیاءؑ کی اُمتیں بجا لائیں ہم اپنے مقصود کو حاصل کر لیں گے تو ہم سے زیادہ احمق اور غلطی خوردہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اسلام اور احمدیت کی ترقی ہماری قربانیوں کے ساتھ وابستہ ہے اور یہی وہ موت ہے جس میں حقیقی زندگی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ آپ اسلام اور احمدیت کی ترقی کی پیشگوئی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"سچائی کی فتح ہوگی اور اسلام کے لئے پھر اُس تازگی اور روشنی کا دن آئے گا جو پہلے وقتوں میں آچکا ہے اور وہ آفتاب اپنے پورے کمال کے ساتھ پھر چڑھے گا جیسا کہ پہلے چڑھ چکا ہے۔ لیکن ابھی ایسا نہیں۔ ضرور ہے کہ آسمان اُسے چڑھنے سے روکے رہے جب تک کہ محنت اور جانفشانی سے ہمارے جگر خون نہ ہو جائیں۔ اور ہم سارے آراموں کو اُس کے ظہور کے لئے نہ کھوئیں اور اعزازِ اسلام کے لئے ساری ذلّتیں قبول نہ کرلیں۔ اسلام کا زندہ ہونا ہم سے ایک فدیہ مانگتا ہے۔ وہ کیا

ہے؟ ہمارا اسی راہ میں مرنا۔ یہی موت ہے جس پر اسلام کی زندگی مسلمانوں کی زندگی اور زندہ خدا کی تجلّی موقوف ہے۔" (فتح اسلام ص۱۳ تا ۱۶)

اسی طرح فرماتے ہیں:۔

"دُنیا کی لذّتوں پر فریفتہ مت ہو کہ وہ خدا سے جُدا کرتی ہیں۔ اور خدا کے لئے تلخی کی زندگی اختیار کرو۔ درد جس سے خدا راضی ہو اُس لذّت سے بہتر ہے جس سے خدا ناراض ہو جائے۔ اور وہ شکست جس سے خدا راضی ہو اُس فتح سے بہتر ہے جو موجبِ غضبِ الٰہی ہو۔ اُس محبّت کو چھوڑ دو جو خدا کے غضب کے قریب کرے۔ اگر تم صاف دل ہو کر اُس کی طرف آجاؤ تو ہر ایک راہ میں وہ تمہاری مدد کرے گا اور کوئی دشمن تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ خدا کی رضا کو تم کسی طرح پا ہی نہیں سکتے جب تک تم اپنی رضا چھوڑ کر۔ اپنی لذّات چھوڑ کر۔ اپنی عزّت چھوڑ کر۔ اپنا مال چھوڑ کر۔ اپنی جان چھوڑ کر اُس کی راہ میں وہ تلخی نہ اُٹھاؤ جو موت کا نظارہ تمہارے سامنے پیش کرتی ہے۔ لیکن اگر تم تلخی اُٹھا لوگے تو ایک پیارے بچّے کی طرح خدا کی گود میں آجاؤ گے اور تم اُن راستبازوں کے وارث کیے جاؤ گے جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔"

"یہ مت خیال کرو کہ خدا تمہیں ضائع کر دیگا تم خدا کے ہاتھ کا ایک بیج ہو جو زمین میں بویا گیا۔ خدا فرماتا ہے کہ یہ بیج بڑھے گا اور پھولے گا اور ہر ایک طرف سے اِس کی شاخیں نکلیں گی اور ایک بڑا درخت ہو جائے گا۔ پس مبارک وہ جو خدا کی بات پر ایمان رکھے۔ اور درمیان میں آنے والے ابتلاؤں سے نہ ڈرے۔ کیونکہ ابتلاؤں کا آنا بھی ضروری ہے تا خدا تمہاری آزمائش کرے کہ کون اپنے دعویٰ بیعت میں صادق اور کون کاذب ہے۔ وہ جو کسی ابتلا سے لغزش کھائے گا وہ کچھ بھی خدا کا نقصان نہیں کرے گا اور بدبختی اُس کو جہنّم تک پہنچائے گی۔ اگر وہ پیدا نہ ہوتا تو اُس کے لئے اچھا تھا۔ مگر وہ سب لوگ جو اخیر تک صبر کریں گے اور اُن پر مصائب کے زلزلے آئیں گے اور حوادث کی آندھیاں چلیں گی اور قومیں ہنسی اور ٹھٹھا کریں گی اور دُنیا اُن سے سخت کراہت کے ساتھ پیش آئے گی وہ آخر فتحیاب ہوں گے اور برکتوں کے دروازے اُن پر کھولے جائیں گے۔ خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ میں اپنی جماعت کو اطلاع دوں کہ جو لوگ ایمان لائے ایسا ایمان جو اُس کے ساتھ دُنیا کی ملونی نہیں اور وہ ایمان نفاق یا بُزدلی سے آلودہ نہیں اور وہ ایمان اطاعت کے کسی درجہ سے محروم نہیں ایسے لوگ خدا کے پسندیدہ لوگ ہیں۔ اور خدا فرماتا ہے کہ وہی ہیں جن کا قدم صدق کا قدم ہے۔"

(الوصیّت)

[۳۰۱ اسلام کے زندہ کرنے کے لئے مصائب کا برداشت کرنا ضروری ہے]

آپؑ نے لوگوں کی ایسی غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا کہ اسلام اور احمدیت کو آپ ہی آپ ترقی حاصل ہو جائے گی۔ اِس کے لئے کسی قربانی یا جدّوجہد کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ چنانچہ آپؑ نے فرمایا:۔

"یاد رکھو! ہمارے پاس کوئی ایسی پھونک نہیں جس سے کوئی شخص یک دفعہ ابدال میں داخل ہو جائے سب انبیاءؑ کا اِس پر اتفاق ہے کہ ترقی مدارج کے لئے آزمائش ضروری ہے۔ اور جب تک کوئی شخص آزمائش اور امتحان کی منازل طے نہیں کرتا دیندار نہیں بن سکتا۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ دُکھ کے بعد ہی ہمیشہ راحت ہوا کرتی ہے۔ یاد رکھو جو شخص خدا کی راہ میں دُکھ اور مصیبت برداشت کرنے کے لئے

تیار نہیں وہ کاٹا جائے گا۔"

"صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ پر غور کرو کہ انہوں نے دین کی خاطر کیسے کیسے مصائب اُٹھائے۔ اور کن کن دُکھوں میں وہ مبتلا ہوئے۔ نہ دن کو آرام کیا نہ رات کو۔ خدا کی راہ میں ہر ایک مصیبت کو قبول کیا اور جان تک قربان کر دی۔"

احمدیت کی سخت مخالفت کی پیشگوئی

"یاد رکھو! جب تک اخلاص اور صدق سے کوشش نہیں کروگے کچھ نہیں بنے گا۔ بہت آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ یہاں سے تو بیعت کر جاتے ہیں مگر گھر میں جاکر جب تھوڑی سی بھی تکلیف آئی یا کسی نے دھمکایا یا حُقّہ پانی بند کرنا چاہا تو جھٹ مُرتد ہوگئے۔ ایسے لوگ ایمان فروش ہوتے ہیں۔ صحابہؓ کو دیکھو کہ انہوں نے تو دین کی خاطر اپنے سر کٹوا دیئے تھے۔ اور جان و مال سب خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ کسی دشمن کی دشمنی کی اُنہیں پرواہ تک بھی نہ تھی۔ وہ تو خدا کی راہ میں سب طرح کی تکالیف اُٹھاتے اور ہر طرح کے دُکھ برداشت کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اور انہوں نے اپنے دلوں میں فیصلہ کیا ہوا تھا۔ ایمان وہ ہے کہ سارا جہان مخالف ہو جائے۔ ہر طرف سے سانپ اور بچھو کاٹیں۔ ہر گوشہ سے بجلی گرے۔ ہر جگہ سے دُکھ ہو مگر ایمان متزلزل نہ ہو۔"

(بدر ۷/ اکتوبر سنہ ۰۸ء صفحہ ۹)

یہ وہ قربانی کی رُوح ہے جو جماعت احمدیہ میں پیدا ہونی چاہیئے۔ اور یہی وہ روح ہے جس کے قیام کے ساتھ قوموں کی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اِس سورۃ میں ایک طرف تو منکرین کو توجہ دلائی ہے کہ تم بارہ صدیوں تک خدا تعالیٰ کے مجدّدین کو مانتے چلے آئے تھے اب تیرہویں مقام پر آکر تمہیں کیا ہوگیا۔ کہ جب وہ موعود ظاہر ہوا جس کی خبر ہم دیتے چلے آئے تھے تو تم نے اُس کا انکار کر دیا اور دوسری طرف مومنوں سے کہا ہے کہ یاد رکھو تمہیں بھڑکتی ہوئی آگ میں جلنا پڑے گا تب اسلام کی شان و شوکت کا دن طلوع کرے گا۔

پس اِن آیات میں اُس مخالفت کی شدّت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو احمدیت کی آئندہ زمانہ میں ہونے والی ہے۔

اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومنوں کو عذاب دے دے کر دشمن مزہ اُٹھائیں گے۔

دو قسم کی تعذیبیں

تعذیبیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تعذیب وہ ہوتی ہے جس کے بعد دل میں رحم کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ مجرموں کو پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے تو مجسٹریٹ اور سپاہی وغیرہ افسوس بھی کرتے جاتے ہیں مگر ایک تعذیب وہ ہوتی ہے جس کے بعد عذاب دینے والا خوشی محسوس کرتا ہے کہ مَیں نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا۔ فرماتا ہے یہ معذّب تو ہوں گے مگر ساتھ ہی خوش ہوں گے کہ ہم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ گویا جلوس نکلیں گے اور اپنے اِس فعل پر بڑی خوشی منائی جائے گی جیسے حضرت صاحبزادہ عبداللطیف صاحب شہیدؓ پر پتھراؤ کیا گیا مگر کسی کو رحم نہ آیا۔ بادشاہ اور اُس کے درباری سب اکٹھے تھے اور کہتے تھے کہ اِسے خوب پتھر مارو۔ گویا عذاب دینے کے لئے وہ اِس طرح خوش خوش اکٹھے ہوئے جیسے کوئی میلہ ہو رہا ہے۔

وَهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ۔ شُهُوْدٌ شَاهِدٌ کی جمع ہے اور شَهِدَ يَشْهَدُ شُهُوْدًا کے معنے ہوتے ہیں حَضَرَ وہاں حاضر ہوا۔ دوسرے معنے ہوتے ہیں اِطَّلَعَ عَلَيْهِ کسی امر سے واقف اور آگاہ ہوا۔ یہاں شُهُوْدٌ کے معنے واقفوں کے بھی ہیں اور حاضر ہونے والوں کے بھی۔ اور مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے ہوئے کہ مومن بے گناہ ہیں اُنہیں عذاب اور دُکھ دیں گے۔ اسی طرح یہ معنے بھی ہیں کہ وہ عذاب دینے کے وقت خود بھی سامنے کھڑے ہوں گے اور اُن کے عذاب

وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّآ أَنْ يُّؤْمِنُوا بِاللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝

اور وہ ان سے صرف اسلئے دشمنی کرتے تھے کہ وہ غالب (اور) سب تعریفوں کے مالک اللہ پر کیوں ایمان لائے۔

الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ

وہ (اللہ) جس کے قبضہ میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور (یہ نہیں سوچتے کہ) اللہ

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝

ہر چیز (کے احوال سے) واقف ہے۔ ۵ؑ

کا تماشہ دیکھیں گے اور اُن پر اُنہیں رحم نہ آئے گا۔

اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ میلہ لگائیں گے۔ لوگوں کا اجتماع کریں گے اور سب کی موجودگی میں اُن کو عذاب دیں گے۔ دوسرے یہ کہ یہ تعذیب متواتر چلیگی کیونکہ کسی چیز پر بیٹھ جانا یہ ایک محاورہ ہے جسکے معنے اس کام کو متواتر کرتے چلے جانے کے ہوتے ہیں۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں کہ تم تو دھرنا مار کر بیٹھ رہے ہو مطلب یہ کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ اِسی طرح فرماتا ہے جہاں اُنکی مخالفتیں دیدہ دانستہ ہوں گی اور یہ سمجھتے ہوئے ہونگی کہ وہ جھوٹ اور فریب سے کام لے رہے ہیں وہاں ان مخالفتوں کا ایک لمبا سلسلہ ہوگا اور متواتر اُن کی طرف سے دُکھ دینے والے واقعات کا اعادہ ہوتا رہے گا۔

اِس زمانہ میں ہم احمدیت کے مخالفین کو دیکھتے ہیں تو اُن کی عملی حالت ہمیں یہی نظر آتی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ بات اسی طرح ہے جس طرح احمدیت پیش کرتی ہے مگر محض اسلئے کہ جماعت احمدیہ کی طرف سے پیش کیجاتی ہے اُسکی مخالفت کرنا وہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر آج ہم کہدیتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو مقام بلند حاصل کیا وہ اپنے زورِ عمل سے حاصل کیا تو تمام غیر احمدی شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ احمدی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہتک کرتے ہیں حالانکہ اس میں ہتک کی کوئی بات نہیں بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور عظمت اِسی عقیدہ سے ظاہر ہوتی ہے پہلے مَیں نے کہا تھا کہ شاید لوگ ہمارے لٹریچر کو نہیں دیکھتے اور سُنی سُنائی باتوں کی وجہ سے شور مچا دیتے ہیں مگر تھوڑے ہی دن ہوئے ایک دوست نے مجھے ایک اخبار کا کٹنگ بھیجا جس میں میرے خطبے کا حوالہ درج تھا اور پھر لکھا تھا دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیسی سخت ہتک ہے کہ کہا جاتا ہے آپؐ نے زورِ عمل سے اپنا مقام حاصل کیا صرف خدا تعالیٰ کی موہبت سے ایسا نہیں ہوا۔ گویا بات سمجھ لی مگر پھر بھی مخالفت کرنا ضروری سمجھا تاکہ لوگوں میں ہمارے خلاف جوش اور اشتعال پیدا ہو تو فرماتا ہے وَهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ وہ اپنے افعال کے ناروا ہونے پر خود گواہ ہوں گے۔ وہ ظلم کر رہے ہوں گے اور جانتے ہوں گے کہ ظلم کر رہے ہیں۔ وہ جھوٹ اور فریب سے کام لے رہے ہوں گے اور اُن کے نفوس جانتے ہونگے کہ وہ دھوکا اور فریب کر رہے ہیں مگر پھر بھی مخالفت کریں گے۔

حاشیہ: سـ۲۱ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ سے عذاب دینے والوں کے متعلق دو باتوں کا اظہار۔

## ۵ؑ حل لغات

نَقَمُوْا۔ نَقَمَ سے جمع کا صیغہ ہے۔ اور نَقَمَ مِنْهُ کے معنے ہوتے ہیں۔ اَنْكَرَهٗ عَلَيْهِ وَعَابَهٗ وَكَرِهَهٗ اَشَدَّ الْكَرَاهَةِ لِسُوْءِ فِعْلِهٖ۔ اُس کی بات کو ناپسند کیا۔ اُس پر عیب لگایا اور اُس کے بُرے فعل کی وجہ سے

حاشیہ: سـ نَقَمُوْا

اُس سے شدید کراہت اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ نیز کہتے ہیں نَقَمَ مِنْہُ اور معنے ہوتے ہیں عَاقَبَہٗ اُس کو سزا دی (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے اُن کی کوئی بات اُن کو حقیقتاً ناپسند نہیں ہوگی اور نہ اُن پر وہ کوئی حقیقی عیب لگا سکیں گے۔ سوائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر کیوں ایمان لائے۔ یوں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہونگے مگر فرق یہ ہوگا کہ یہ لوگ عزیز اور حمید خدا پر ایمان رکھتے ہوں گے۔ ایک زندہ اور قادر خدا کو مانتے ہونگے مگر وہ لوگ ایک مُردہ خدا کو ماننے والے ہوں گے۔ پس چونکہ موعود کے اتباع اُن کے مُردہ خدا کو نہیں مانتے ہوں گے بلکہ ایک عزیز اور حمید خدا کے قائل ہونگے۔ اس لئے وہ لوگ اُن کی مخالفت کریں گے۔ اُن کو طرح طرح کے دُکھ دینے کی کوشش کریں گے اور کہیں گے کہ اِن لوگوں نے ایک نیا دین بنا لیا ہے۔ حالانکہ وہ خدائے حمید کو پیش کر رہے ہوں گے اور یہ لوگ خدائے حمید پر طرح طرح کے عیوب لگا رہے ہونگے۔ مثلاً یہی کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں یا یہ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے یونہی افضل الرسل بنا دیا۔ ورنہ اگر اعمال کا سوال ہوتا تو ممکن تھا کہ کوئی اور شخص آپؐ سے آگے نکل جاتا۔ چنانچہ دیکھ لو وہ تمام عقائد جن کی وجہ سے جماعت احمدیہ پر اعتراض کیا جاتا ہے ان میں سے ایک ایک عقیدہ وہ ہے جو خدا کی حمد ثابت کرنے والا ہے مگر ان لوگوں کے سارے عقیدے وہ ہیں جو خدا تعالےٰ کی ہتک کا موجب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے یہاں صرف اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا نہیں فرمایا بلکہ اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کو تو وہ لوگ بھی مانتے ہوں گے فرق صرف یہ ہوگا کہ وہ اللہ تعالےٰ کو غیر عزیز اور غیر حمید مانتے ہوں گے۔ اور یہ لوگ خدا تعالےٰ کو العزیز اور الحمید قرار دیتے ہوں گے۔ اور یہی اختلاف تمام عداوت کی بنیاد ہوگا۔

اَلَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ ۔ الآیۃ۔ فرماتا ہے اُن کو یہ بھی ڈر نہیں آئے گا کہ یہ لوگ اُس خدا پر ایمان اور یقین رکھنے والے ہیں جو آسمانوں اور زمینوں کا خدا ہے۔ جو لوگ آسمانوں اور زمینوں کے خدا کی عزّت کو قائم کرنے کے لئے کوشش کریں گے۔ جو لوگ آسمانوں اور زمینوں کے خدا کی حمد کو قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ خدا اُن پر لوگوں کو ظلم کرتے دیکھے اور وہ خاموش رہے۔ دُنیا میں ذلیل سے ذلیل اور حقیر سے حقیر انسان بھی اپنی عزّت کرنے والے کا احترام کرتا ہے پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ آسمان اور زمین کے مالک خدا کی عزّت قائم کر رہے ہوں۔ اُس کی حمد قائم کر رہے ہوں۔ اور پھر دشمن اُن کو تباہ و برباد کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ وہ لوگ غور کریں کہ کیا اُن کے ظلموں کو دیکھ کر آسمانوں اور زمینوں کے خدا کی غیرت نہیں بھڑکے گی۔ اور کیا وہ اپنے غضب کی چکّی میں اُنکو پیس نہیں ڈالے گا۔

وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ۔ فرماتا ہے یہ بات ٹھیک ہے کہ یہ لوگ جانتے بُوجھتے ہوئے ظلم کرتے ہیں۔ مگر اِن کو یہ گھمنڈ ہے کہ پبلک ہمارے ساتھ ہے یہ لوگ ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں اُن کو پتہ نہیں کہ ہم بھی ان کے نگران اور محافظ موجود ہیں۔ اگر ان کو یہ گھمنڈ ہے کہ ہمیں عزّت کی نگاہ سے دیکھنے والے دُنیا میں بہت لوگ موجود ہیں جو ہمارے مظالم کو بھی اچھا قرار دیں گے تو کیا وہ اتنی بات نہیں سوچتے کہ وہ لوگ جو میری عزّت

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ۝

وہ لوگ جنہوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو عذاب میں مبتلا کیا پھر (اپنے فعل سے) توبہ بھی نہ کی اُنہیں یقیناً جہنّم کا عذاب ملے گا اور (اِس دُنیا میں بھی) اُنہیں (دل کو) جلا دینے والا عذاب ملیگا۔

کو قائم کرنے والے ہیں۔ میری حمد کو قائم کرنے والے ہیں وہ میری آنکھوں کے سامنے اِس طرح مظالم کا نشانہ بنائے گئے تو کیا مَیں خاموش رہوں گا۔ مَیں یقیناً اُن کی مدد کے لئے اُتروں گا اور مظالم کرنے والوں کو اپنے غضب کا نشانہ بنا دوں گا۔

**۵۶ حل لغات۔** فَتَنُوْا۔ فَتَنَ سے جمع کا صیغہ ہے۔ اور فَتَنَ الشَّيْءَ کے معنے ہوتے ہیں۔ اَحْرَقَہٗ۔ اُس کو جلا دیا (اقرب) پس اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ کے معنے ہوئے وہ لوگ جنہوں نے مومنوں کو آگ میں جلایا۔

**تفسیر۔** چونکہ کفار نے مومنوں کے لئے ایک بھڑکتی ہوئی آگ تیار کی تھی جس میں اُن کو ڈالا گیا تھا اس لئے فرماتا ہے۔ یقیناً وہ لوگ جو مومن مَردوں اور عورتوں کو عذاب دیتے ہیں اُن کے لئے جہنّم کا عذاب ہوگا۔ یہاں ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی آگ مراد ہو سکتی ہے۔ ظاہری اِس لحاظ سے کہ وہ اُن کے جسموں کو دُکھ دیں گے۔ اور باطنی اِس لحاظ سے کہ وہ ایسے ایسے جھُوٹے الزام لگائیں گے جن کو سُنکر اُن کے دل جل جائیں گے اور وہ حیران ہوں گے کہ ہم کیا کریں۔ فرماتا ہے وہ لوگ جو مومن مَردوں اور عورتوں کو جلاتے ہیں۔ اُن کی طرف طرح طرح کی جھُوٹی باتیں منسوب کرتے ہیں۔ اُن کا دل دُکھانے کے لئے ہر قسم کی تدابیر اختیار کرتے ہیں وہ مت سمجھیں کہ ہماری گرفت سے وہ بچ سکیں گے۔ چنانچہ آج کل ہماری جماعت کے خلاف جس رنگ میں فتنہ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اس کا ایک کھُلا اور واضح ثبوت ہے۔ غیر احمدی ہمارا دل یہ کہہ کر زخمی کرتے ہیں کہ ہم نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے۔ اور پیغامی یہ کہہ کر ہمیں دُکھ دیتے ہیں کہ ہم کلمۂ طیبہ کو نعوذ باللہ منسوخ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہم جو کچھ کہتے ہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عزّت اور آپؐ کے جلال کے اظہار کے لئے کہتے ہیں۔ کوئی ایسی بات اپنی زبان سے نہیں نکالتے جو آپؐ کی شان کو کم کرنے والی اور آپؐ کی عزّت کو بٹہ لگانے والی ہو۔ پس فرماتا ہے وہ لوگ جو مومن مَردوں اور مومن عورتوں کے بدنوں کو یا اُن کے دلوں کو یا اُن کے گھروں کو جلاتے ہیں اور پھر اپنے اس فعل سے توبہ نہیں کرتے ہم اُن کو عذاب میں مبتلا کریں گے۔ ہاں اگر کوئی شخص توبہ کرے تو پھر خواہ کتنا بڑا گناہ کر چکا ہو اُس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے اور اللہ تعالےٰ اُسے معاف فرما دیتا ہے۔ پس فرمایا گو اُنہوں نے بڑا گناہ کیا ہے لیکن اگر پھر بھی وہ توبہ کرلیں تو خواہ کوئی گناہ اُن سے سرزد ہو چکا ہو ہم اُن کو معاف کر دیں گے۔ لیکن اگر وہ توبہ نہیں کریں گے۔ تو یاد رکھیں کہ فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ جس طرح انہوں نے مومنوں کے دلوں کو بھی جلایا تھا اور اُن کے جسموں کو بھی جلایا تھا اُسی طرح اُن کو بھی دو قسم کا عذاب دیا جائے گا۔

فَتَنُوْا ۱

الٰہی جماعتوں کو دُکھ دینے کا نتیجہ ۲۰۱

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ

(اور وہ) جو ایمان لائے اور (اس کے ساتھ اس کے) مناسب حال عمل بھی کئے اُنہیں باغات ملیں گے

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ۝

جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ (اور) یہی تو بڑی کامیابی ہے۔ ۵۷

ظاہری بھی اور باطنی بھی۔ عذابِ جہنم ظاہری ہے اور عذاب الحریق باطنی ہے۔ یا عذاب الحریق ظاہری ہے اور عذابِ جہنم باطنی ہے۔ بہرحال اُن دو قسم کے عذابوں کے مقابلہ میں جو انہوں نے مومنوں کو دیئے اُن کو بھی دو قسم کے عذاب دیئے جائیں گے۔

**۵۷ حل لغات۔** اَلْفَوْزُ۔ اَلظَّفَرُ بِالْخَيْرِ۔ بہترین مقصود پا کر کامیاب ہونا۔ نیز اس کے معنے ہیں اَلنَّجَاةُ۔ نجات۔ (اقرب)

اَلْفَوْزُ

**تفسیر۔** یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ بجالائے۔ عمل صالح کے معنے ایسے عمل کے ہیں جو مطابقِ حالات ہو۔ یہ معنے اتنے اہم اور اس قدر ضروری ہیں کہ ان پر جس قدر بھی زور دیا جائے کم ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی تمام کامیابی اور ترقی کا دارومدار انہی معنوں پر ہے۔ اگر حالات کے مطابق عمل کیا جائے گا تو وہ یقیناً عمل صالح ہوگا۔ اور اگر حالات کی مطابقت کا خیال نہیں رکھا جائے گا تو وہ عمل غیر صالح ہوگا۔ مثلاً شراب اسلام سے پہلے حرام نہیں تھی۔ صرف اسلام نے اس کو قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے۔ اس صورت میں صلاحیت کے محض اتنے معنے نہیں ہوں گے کہ انسان شراب نہ پیئے بلکہ صلاحیت کے یہ معنے ہوں گے کہ جس زمانہ میں خدا نے کسی فعل سے روکا ہے اُس زمانہ میں اُس فعل سے رُک جائے۔ اگر شراب سے روکا ہے تو رُک جائے اور اگر نہیں روکا تو بیشک نہ رُکے۔ اسی وجہ سے گو اسلام کو پہلی شرائع سے کئی امور میں اختلاف ہے مگر چونکہ اُن شریعتوں میں شراب قطعی طور پر حرام نہیں تھی اس لئے اُن اُمتوں میں جن لوگوں نے شراب استعمال کی تھی انہوں نے عمل غیر صالح نہیں کیا تھا۔ بلکہ اُس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے وہ عمل صالح ہی تھا۔ پس ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُن کو جنّات ملیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ جس طرح کفار کے متعلق ذکر کیا گیا تھا کہ اُن کو دو قسم کے عذاب دیئے جائیں گے اسی طرح یہاں مومنوں کے متعلق فرماتا ہے کہ اُن کو دو قسم کے انعامات دیئے جائیں گے۔ اوّل باغات ملیں گے جو اوپر سے سایہ کرنے والی چیز ہیں۔ دوم۔ اُن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔ گویا اوپر سے بھی ٹھنڈک ہوگی اور نیچے سے بھی ٹھنڈک ہوگی۔ ظاہر میں بھی راحت ہوگی اور باطن میں بھی راحت ہوگی۔ لوگوں میں بھی عزت ہوگی اور خدا کے حضور بھی عزت ہوگی۔

عمل صالح کا مطلب

لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ کے دو معنے ہیں۔ اوّل یہ کہ باغوں کا سایہ ایسا ہوگا جو کسی جگہ سے ٹوٹے گا نہیں۔ اُن کی شاخیں آپس میں ملتی چلی جائیں گی۔ دو درختوں میں ایسا فاصلہ نہیں ہوگا کہ سایہ الگ الگ ہو جائے بلکہ اُس سائے کا ایک سلسلہ ہوگا جس میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہوگا۔ اسی طرح اُن کے نیچے جو نہریں بہتی ہوں گی اُنکے کسی حصہ پر بھی دھوپ نہیں پڑے گی بلکہ سایہ کے مسلسل ہونے کی وجہ سے وہ نہریں بھی اوّل سے آخر

جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ کے دو معنے

إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ ۝

یقیناً تیرے رب کی گرفت سخت ہوا کرتی ہے ۔ ۵۸ (کیونکہ) وہ وہی تو ہے (جو عذاب پہلا) شروع کرتا ہے اور پھر بار بار لوٹا کر دیتا ہے ۵۹

وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ۝

اور (اس کے ساتھ ہی) وہ بے انتہا بخشنے والا اور بے انتہا محبت کرنے والا بھی ہے ۶۰

تک سایہ کے نیچے ہوں گی۔ گویا رحمت کے کمال کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

دوسرے لَهُمْ میں اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ باغات انکی ملکیت ہونگے اور وہ نہریں اُن باغات سے وابستہ ہونگی۔ یوں تو سرگودھا اور لائلپور وغیرہ میں بھی نہریں ہیں مگر وہ مالکانِ اراضی کی نہیں بلکہ گورنمنٹ کی ہیں۔ لیکن وہاں جو نہریں ملیں گی وہ جنت کے ساتھ ہوں گی۔ مِنْ تَحْتِهَا کا بھی مطلب ہے کہ اِس جنت کی نعمتوں کے ضمن میں یہ نہریں ہوں گی۔ یعنی جس کے باغات ہوں گے اُسی کی نہریں ہوں گی۔ اس لئے ایک معنے تو یہ ہیں کہ اُس جنت کی تمام نعمتیں مالک کے اپنے اختیار میں ہوں گی۔ دوسرے یہ کہ وہ بڑی وسیع جنت ہوگی کیونکہ نہر دو چار گھماؤں میں نہیں چلتی بلکہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ بلکہ دو دو ہزار میل تک نہریں چلتی چلی جاتی ہیں۔ پس مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کہہ کر بتا دیا کہ جنّت کا بدلہ بڑا وسیع ہوگا۔

غرض ان آیات میں ایک طرف تو اِس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جنتیوں کو ظاہری نعمت بھی ملے گی اور قلبی نعمت بھی ملے گی۔ دوسرے یہ بتایا کہ اُن کی ترقی کے جو سامان ہوں گے وہ اُن کے قبضہ اور اختیار میں ہوں گے۔ تیسرے یہ کہ وہ سامان نہایت وسیع ہوں گے۔

۵۸ حل لغات۔ بَطْش یَبْطِشُ کے معنے ہوتے ہیں اَخَذَهٗ بِالْعُنْفِ۔ اس کو سختی سے گرفت کی۔ نیز اس کے معنے ہیں تَنَاوَلَهٗ بِالشِّدَّةِ عِنْدَ الصَّوْلَةِ حملہ کرتے وقت سختی سے اُسے پکڑا۔ اَخَذَ اَخْذًا شَدِيْدًا فِيْ كُلِّ شَيْءٍ۔ کسی چیز کو سختی سے پکڑا (اقرب) پس اَلْبَطْشُ کے معنے ہوں گے سختی سے گرفت کرنا۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ مومنوں کو دُکھ تو مت دیئے جائیں گے مگر خدا کی پکڑ بھی بڑی سخت ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی الہام ہے کہ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ یعنی جب تم گرفت کروگے تو سختی سے کروگے پس بے شک وہ مومنوں کو بڑا دُکھ دیں گے۔ مگر یاد رکھیں خدا کی گرفت بھی بڑی سخت ہے۔

۵۹ تفسیر۔ خدا پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے۔ اور دوبارہ بھی وہی لوٹاتا ہے۔ مطلب یہ کہ خدا ہی ہے جو اِس دُنیا میں بھی اُن کو عذاب دے گا اور آخرت میں بھی اُن کو عذاب دے گا۔ گویا يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ کا مطلب۔ وَيُعِيْدُ کے یہ معنے ہیں کہ يُبْدِئُ الْعَذَابَ فِي الدُّنْيَا وَيُعِيْدُهَا فِي الْاٰخِرَةِ۔

۶۰ تفسیر۔ اور وہ بہت بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے۔ یہاں چونکہ عیسائیت کا ذکر ہے اور عیسائی خدا کو بخشنے والا قرار نہیں دیتے لیکن خدا کو محبت کرنے والا وجود ضرور قرار دیتے

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۙ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ؕ هَلْ

(وہ) بزرگ عرش کا مالک (ہے) ۵۱۱ جس بات کا ارادہ کرے اُسے کرکے چھوڑنے والا ہے ۵۱۲ کیا

اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۙ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ؕ

تمہیں (دشمنانِ صداقت کے) لشکروں کی خبر نہیں ملی - (یعنی) فرعون اور ثمود کے لشکروں کی - ۵۱۳

دیتے ہیں- اس لئے خدا نے غفور اور وَدُوْد دونوں الفاظ کو اِس جگہ اکٹھا کر دیا ہے - کہ یہ عجیب بات ہے کہ اِدھر وہ لوگوں کے گناہوں کو بخشتا نہیں اور اُدھر یہ کہا جاتا ہے کہ خدا محبت ہے - حالانکہ غفور اور وَدُوْد ہمیشہ اکٹھے ہوتے ہیں - جو غفور ہوگا ضرور ہے کہ وہ وَدُوْد ہو اور جو وَدُوْد ہوگا ضرور ہے کہ وہ غفور ہو - یہاں یہ دونوں صفات اکٹھی کرکے عیسائیت کے اِس عقیدہ کی خدا تعالیٰ نے تردید کر دی ہے کہ لوگوں کے گناہوں کو بخشنا اُس کے عدل کے خلاف ہے -

غفور و وَدُوْد دو صفات اکٹھی لاکر عیسائیت کی تردید -

۵۱۱ تفسیر - فرماتا ہے وہ عرش والا ہے - اور بڑی بزرگی والا ہے - یہاں ذو العرش اس لئے کہا گیا ہے کہ عیسائی دُنیا نے ایک وقت یہ دُعا شروع کی جو اپنی غلط فہمی سے اب تک کرتے چلے آتے ہیں کہ اَے خدا تیری بادشاہی آئے - تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو (متی باب ۶ آیت ۱۰) اُنیس سو سال اُن کو یہ دُعا کرتے ہوئے گذر گئے مگر اُن کے نزدیک اب تک خدا کی بادشاہت آسمان سے زمین پر نہیں آئی - فرماتا ہے اے عیسائیو! تم یہ کیا کر رہے ہو وہ خدا تو عرش والا ہے اور مجید والا ہے اُنیس سو سال پہلے اگر اُس نے تمہیں یہ دُعا سکھائی تھی اور پھر اُنیس سو سال تک اُس نے اِس دُعا کو نہ سُنا اور زمین پر خدا کی بادشاہت نہ آئی تو وہ ذو العرش المجید کس طرح رہا - حالانکہ وہ ذو العرش ہے - وہ بڑی بزرگی کا مالک ہے - وہ جب کہتا ہے کہ اُس کی بادشاہت زمین پر آجائے تو پھر وہ آنے سے رُکا نہیں کرتی - چنانچہ خدا کی بادشاہت آسمان سے زمین پر پہلے مسیح ناصری کے ذریعہ آئی پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آئی اور اب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ خدا کی بادشاہت تیسری بار آسمان سے زمین پر آگئی ہے مگر وہ ابھی تک یہی دُعا مانگتے چلے جا رہے ہیں کہ اے خدا جس طرح تیری بادشاہت آسمان پر ہے اسی طرح زمین پر آوے -

۵۱۲ تفسیر - وہ جس کام کا ارادہ کرے اُسے کرکے رہتا ہے مگر تم یہ کہتے ہو اُس نے اپنی بادشاہت آسمان سے زمین پر لانیکا ارادہ تو کیا تھا مگر اب تک وہ اپنے اِس ارادہ کو پُورا نہیں کرسکا حالانکہ پہلا مسیح آیا اور اُس کے ذریعہ خدا کی بادشاہت زمین پر آگئی پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آئے اور اُن کے ذریعہ خدا کی بادشاہت زمین پر آگئی اور اب تیسری دفعہ پھر مسیح موعودؑ کے ذریعہ خدا کی بادشاہت آسمان سے زمین پر آگئی ہے مگر تم ابھی وہیں بیٹھے یہ دُعا کر رہے ہو کہ اے خدا تیری بادشاہت جس طرح آسمان پر ہے اُسی طرح زمین پر بھی آئے -

۵۱۳ تفسیر - فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ - جُنُوْد کا بدل ہے - کہ کیا تمہیں لشکروں کی خبر پہنچی ہے - اس کے بعد اُن جنود کے سرداروں کا نام لے لیا کہ وہ لشکر جو فرعون اور ثمود کے تھے - مطلب یہ کہ یہ کوئی چھپی ہوئی

# بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۝

حقیقت تو یہ ہے کہ کافر (شدید) انکار (کی مرض) میں (مبتلا) ہیں - ۵۱۴

# وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۝

حالانکہ اللہ (انہیں) اُن کے پیچھے سے (آکر) گھیرنے والا ہے - ۵۱۵

بات نہیں کہ ہم نے اُن دشمنوں سے کیا کیا تھا بلکہ یہ بالکل ظاہر بات ہے - پھر اگر تمہیں فرعون اور ثمود کے لشکروں کی بربادی کی خبریں معلوم ہیں تو کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے اور کیوں مخالفت میں بڑھتے جا رہے ہو -

**۵۱۴ تفسیر** - فرماتا ہے اِن کفار کے قلب کی حالت ایسی ہو گئی ہے جو تکذیب والی ہے کتنی ہی مثالیں اُن کے سامنے موجود ہوں یہ انکار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں - اور جب کسی کے قلب کی حالت ایسی ہو جائے کہ وہ ہر بات کی مخالفت کرنا اپنے لئے ضروری قرار دے لے تو پھر اُسے ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی کیونکہ ہدایت اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان غور سے کام لے اور جب اُس نے غور ہی نہ کرنا ہو تو ہدایت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے -

حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ ہمیشہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مخالفین کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک نٹ بڑے لمبے بانس پر چڑھ جاتا اور رستے پر چلنا شروع کر دیتا ہے - اسی طرح کبھی نیچے بانس پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے - اور جب یہ کرتب دکھا دیتا ہے تو کہتا ہے کیوں دکھا یا نا کرتب - اِس پر اُنہی میں سے ایک شخص جو نیچے کھڑا ہوتا ہے سر ہلا کر کہہ دیتا ہے کہ میں نہ مانوں - اِس پر وہ دوسرا کرتب دکھاتا ہے اور پھر جب پوچھتا ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ میں نہ مانوں - تو میں نہ مانوں کا تو کوئی علاج ہی نہیں ہو سکتا - یہی بات اللہ تعالیٰ نے اِس جگہ بیان فرمائی ہے کہ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ مخالفت میں بڑھتے بڑھتے ان لوگوں کی قلبی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ ان کے سامنے کوئی بھی نشان ظاہر ہو - کوئی بھی معجزہ ظاہر ہو ان کو اِس بات سے کوئی غرض ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس پر غور کریں - صرف ایک ہی مقصد اُن کے سامنے ہوتا ہے کہ ہم اِس نشان کی تکذیب کریں - پس یہ لوگ تو وہ ہیں جو تکذیب کے سمندر میں غرق ہو چکے ہیں -

**۵۱۵ حل لغات** - مُحِيْطٌ - اَحَاطَ کا اسم فاعل ہے اور اَحَاطَ بِالْاَمْرِ کے معنے ہیں اَحْدَقَ بِهٖ مِنْ جَوَانِبِهٖ کسی معاملہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا (اقرب) اور آیت مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ کے معنے ہیں لَا يُعْجِزُهٗ اَحَدٌ قُدْرَتُهٗ مُشْتَمِلَةٌ عَلَيْهِمْ یعنی خدا تعالیٰ کو کوئی عاجز نہیں کر سکتا کیونکہ اُس کی قدرت و طاقت اُن پر حاوی ہے - نیز کہتے ہیں اُحِيْطَ بِهٖ اور معنے ہوتے ہیں - اُس کی ہلاکت قریب آگئی (اقرب) پس مُحِيْطٌ کے معنے ہوں گے چاروں طرف سے گھیرنے والا -

مُحِيْطٌ

**تفسیر** - یہ تمسخر میں مشغول ہیں اور جب صداقت کے نشانات ظاہر کئے جاتے ہیں تو کہتے ہیں میں نہ مانوں - لیکن وہ اس بات سے ناواقف ہیں - کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کی بد اعمالیوں کے نتیجہ میں ایک خطرناک عذاب مقدر ہے - مُحِيْط کے لفظی معنے احاطہ کرنیوالے کے ہوتے ہیں لیکن محاورہ کے رو سے اسے عذاب کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے - فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اُن کے پیچھے سے اُن کا احاطہ کرنے والا ہے - احاطہ کا لفظ عذابِ تام پر دلالت کرتا ہے - رستہ کھلا ہو تو انسان بھاگ سکتا ہے لیکن جب چاروں طرف سے احاطہ ہو تو

# بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝ ع

(اسکے علاوہ) یہی ایک حقیقت ہے کہ وہ (کلام جو ان امور کی خبر دے رہا ہے) ایک بزرگ ہے مگر لوگ نہ مانیں) پڑھا جانیوالا کلام ہے جو کہ ہر ایک عزت والا ہے کہ اسکا لوح محفوظ میں ہونا

بھاگنے کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔

وَرَآئِهِمْ کے لفظ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جب وہ عذاب آئے گا تو اُنہیں پتہ بھی نہیں لگے گا۔ کیونکہ پیچھے سے جو چیز آتی ہے وہ اچانک آتی ہے پس فرمایا جب وہ عذاب اچانک طور پر آ جائیگا تو چاروں طرف سے اُن کا احاطہ کر لیا جائیگا اور اُنہیں اُس عذاب سے نکلنے کا کوئی رستہ نہیں ملیگا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی بار بار یہ الہام ہوا ہے کہ اِنِّیْ مَعَ الْاَفْوَاجِ اٰتِیْكَ بَغْتَةً یعنی میں اپنی افواج کیساتھ اچانک آؤنگا۔

لَوْحٌ **حل لغات**۔ لَوْحٌ۔ لَوْحٌ کے معنے ہیں کُلُّ صَحِيْفَةٍ عَرِيْضَةٍ خَشَبًا اَوْ عَظْمًا۔ لکڑی یا لوہے کی چوڑی تختی۔ اور لوح کو لوح اس واسطے کہتے ہیں کہ اس پر لکھنے کی وجہ سے معانی ظاہر ہوتے ہیں (چونکہ لَاحَ يَلُوْحُ کے معنے جس سے لوح بنا ہے ظاہر ہونے کے تھے اسلئے مصنف نے وجہ مناسبت اصل مادہ سے بیان کر دی۔)

**تفسیر**۔ فرماتا ہے یہ لوگ تو پہلے مکذبین سے بھی اپنے عناد اور مخالفت میں بڑھ رہے ہیں مگر ہم کہتے ہیں یہ وہ کلام ہے جو بڑا بزرگ ہے۔ یہ تکذیب میں زیادتی کرنی شروع کر دیں ہم اس کی تصدیق میں زیادتی کرنی شروع کر دینگے۔ گویا خدا صرف اتنی ہی غیرت نہیں دکھائیگا کہ دشمنوں کو تباہ و برباد کر دے بلکہ وہ یہ بھی کریگا کہ اس قرآن کو عزت کے مقام پر فائز کر دیگا اور دُنیا کی گردنیں اسکے آگے جھکا دیگا۔ بیشک یہ لوگ مخالفت کریں اور جتنی چاہیں کریں مگر خدا یہ ارادہ کر چکا ہے کہ وہ اس قرآن کو عزت کے مقام پر کھڑا کریگا کیونکہ یہ قرآن بڑی مجد والا ہے۔

لوح کے ساتھ محفوظ کہکر قرآن مجید کی دو خوبیوں کا اظہار

فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۔ محفوظ کی قرأت ظاء کی زیر سے بھی آئی ہے اور ظاء کی پیش سے بھی یعنی مَحْفُوْظٌ بھی ہے اور مَحْفُوْظٍ بھی۔ زیر کی صورت میں اس جملہ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ قرآن کریم ایک محفوظ لوح میں ہے اور پیش کی صورت میں محفوظ قرآن کریم کی صفت بنتا ہے اور جملہ کے معنے یہ ہوئے کہ قرآن مجید لوح میں ہے اور محفوظ ہے۔

ابوالفضل اور ابن خالویہ کہتے ہیں کہ لَوْحٌ لفظ نہیں بلکہ لُوْحٌ لام کی پیش سے ہے اور اسکے معنے ساتویں آسمان کے اوپر کی فضاء کے ہیں یہ معنے بالبداہت باطل ہیں کیونکہ ساتویں آسمان پر گیا کون تھا کہ اُسنے وہاں کی فضاء دیکھی اور اُسکا ایک خاص نام رکھا۔ صحاح جوہری کہتے ہیں کہ لُوْحٌ لام کی پیش کے ساتھ ہو تو اُسکے معنے آسمان اور زمین کے درمیان کی ہوا کے ہیں یعنی جو اور فضا کے یہ معنے لغت کے ہیں اور ساری کی تفسیر کے غلط ہونے پر شاہد ہیں۔ ابن المنذر نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف ایک روایت منسوب کی ہے جسمیں وہ کہتے ہیں کہ لوح ذکر ایک ہی لوح ہے (یعنی جسقدر ذکر خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں سب اسمیں درج ہیں) اور یہ لوح نور کی ہے اور تین سو سال میں ختم ہونیوالے سفر کے برابر لمبی ہے۔ ابوالشیخ کہتے ہیں کہ انسؓ سے مروی ہے کہ قرآن کریم میں جس لوح محفوظ کا ذکر ہے وہ اسرافیل کے ماتھے میں ہے اور امام سیوطیؒ حضرت عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ لوح محفوظ سو سال کے سفر کے برابر لمبی ہے اللہ تعالیٰ نے قلم سے دُنیا کے پیدا کرنے سے پہلے کہا میری مخلوق کے بارہ میں میرا علم لکھ اسپر اُسنے لکھا اور جو کچھ قیامت تک ہونا تھا وہ اسمیں لکھا گیا۔ مقاتل کہتے ہیں کہ لوح محفوظ عرش کے دائیں طرف رکھی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اسرائیلیات ہیں اور یہود نے بھولے بھالے مسلمانوں سے بدلہ لیا ہے۔

جیسا کہ حل لغات سے ظاہر ہے لوح ایک لکڑی یا ہڈی کی چوڑی تختی کو کہتے ہیں جس پر لکھا ہوا واضح ہو جائے۔ چنانچہ اسی مادہ کا فعل لَاحَ یَلُوْحُ ہے جسکے معنے ظاہر ہو چکے ہیں۔ چونکہ کاغذ کا صحیفہ لپیٹا جاتا ہے لیکن لکڑی لوہے یا ہڈی پر لکھی ہوئی کتاب لپیٹی نہیں جا سکتی اسلئے لوح کہنے میں یہ مدنظر ظاہر ہے کہ جو چیز لپیٹی نہ جائیگی اسمیں ایک خوبی بھی ہوگی اور ایک نقص۔ خوبی تو یہ کہ ہر ایک اسکو پڑھیگا اور اسکی خوب اشاعت ہوگی اور نقص یہ کہ بوجہ کھلی ہونیکے اسکے مٹانے یا اسمیں تصرف کرنے کا لوگوں کو زیادہ موقع مل سکیگا۔ اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس جگہ قرآن کریم کی نسبت بیان فرمایا ہے کہ وہ لوح محفوظ میں ہے یعنی قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ کثرت سے لوگوں کے ہاتھ میں جائیگا اور خوب پھیلیگا مگر ساتھ ہی وہ لوگوں کی دست بُرد سے محفوظ بھی رہیگا۔ گویا لوح پر لکھے ہوئے کلام کی خوبی تو اس کو ملیگی مگر اس کے نقص سے وہ محفوظ رہے گا۔

# سُوْرَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ طارق ۔ یہ سورۃ مکی ہے

# وَهِيَ دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ سَبْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً

اور بسم اللہ کے علاوہ اس کی سترہ آیتیں ہیں۔

## نزول کا وقت

یہ سورۃ مکی ہے۔ بعض راوی کہتے ہیں کہ جب ایک نجم ثاقب کے گرنے سے ابوجہل ڈر گیا تو اس وقت اس سورۃ کی پہلی تین آیات نازل ہوئیں۔

نولڈکے اور میور کا خیال ہے کہ یہ سورۃ نہایت ابتدائی سورتوں میں سے ہے مگر پادری ویری لکھتے ہیں کہ چونکہ اس میں کفار کے نقصان دہ منصوبوں کا بھی ذکر ہے اس لئے ۱۱ سے ۱۷ تک کی آیات ۳ سنہ بعد زمانہ نبوت کی ہیں۔ میں بار بار لکھ چکا ہوں کہ ایسے استدلال محض دشمنی کی وجہ سے ہیں ورنہ قرآن کریم پیشگوئیوں سے بھرا ہوا ہے کیوں اسے پیشگوئی نہ سمجھا جائے۔ دوسرے ایسے باریک فرق سے ہمارا کوئی نقصان بھی نہیں کیونکہ اگر یہ سمجھا جائے کہ دشمنی کے اظہار کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ہو تو یہ تو ماننا پڑیگا کہ قرآن کریم نے اس ابتدائی زمانہ میں ہی دشمن کی تباہی کی خبر دے دی تھی۔ پس اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا تو ویری صاحب کو بھی انکار نہیں۔

یہ سورۃ اس سلسلہ مضمون کی جو بیان ہوتا آرہا ہے چوتھی سورۃ ہے۔ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ اس سلسلہ کی پہلی سورۃ تھی اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ دوسری سورۃ تھی اور وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ تیسری سورۃ تھی اور وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ یعنی یہ سورۃ جو زیر بحث ہے اس سلسلہ کی چوتھی سورۃ ہے سورۃ تطفیف کے متعلق میں نے بتایا تھا کہ اس میں اس مضمون کے ایک پہلو کو بیان کیا گیا ہے جو اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ میں بیان کیا گیا تھا چنانچہ میرے اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ سورۃ تطفیف کے بعد دو سورتیں سَمَآء کے لفظ سے شروع ہوتی ہیں مگر سورۃ تطفیف کے شروع میں اَلسَّمَآءِ نہیں کیونکہ وہ پہلی سورۃ کے سلسلہ میں ہی بیان کی گئی ہے۔ غرض یہ اس سلسلہ کی آخری سورۃ ہے اس کے بعد وَالسَّمَآءِ کا لفظ نہیں بلکہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى سے نئی سورۃ کا مضمون شروع ہو گا۔ میرے نزدیک سورۃ طارق ایک عالمِ برزخ کے طور پر درمیان میں آئی ہے جس میں پہلے مضمون کو بدل کر ایک دوسری طرف پھیرا جائے گا۔

اس سورۃ اور پچھلی تین سورتوں میں سماء کے لفظ کو دوہرایا گیا ہے لیکن ہر جگہ اس کے ساتھ ایک اور چیز کو بیان کیا گیا ہے پہلے اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ کہا تھا پھر اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ فرمایا۔ گویا سماء کا لفظ تو وہی ہے مگر پہلی دفعہ اس کے ساتھ اِنْفِطَار کا ذکر کیا پھر سَمَآء کے لفظ کے ساتھ اِنْشِقَاق کا ذکر کیا پھر تیسری سورۃ میں سماء کے لفظ کے ساتھ ذَاتِ الْبُرُوْجِ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ کا ذکر کیا۔ اور یہاں سماء کے ساتھ طارق کا لفظ بڑھایا گیا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں سماء کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے اور دوسری سورتوں میں سماء کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔

سورۃ طارق مکی ہے

سورۃ طارق کا تعلق پہلی سورتوں سے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ○ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ○

(مجھے) قسم ہے آسمان کی اور صبح کے ستارے کی۔ اور کس چیز نے تجھے علم دیا ہے کہ صبح کا ستارہ کیا ہے؟

الطارق

**۲ حل لغات۔** طَارِقٌ کے عربی زبان میں تین معنے ہوتے ہیں (۱) اَلْاٰتِیْ لَیْلًا یعنی رات کو آنے والا شخص (۲) اَلنَّجْمُ الَّذِیْ یُقَالُ لَہٗ کَوْکَبُ الصُّبْحِ وہ ستارہ جسے کوکبِ صبح کہتے ہیں اور جو صبح کے طلوع ہونے کی خبر دیتا ہے (۳) اَلضَّارِبُ بِالْحَصٰی عَلٰی سَبِیْلِ التَّکَھُّنِ علم نجوم رکھنے والا شخص جو کنکریاں پھینک کر نتائج اخذ کرے۔ (اقرب)

**تفسیر۔** طَارِقٌ کے تین معنی لغت میں ہیں جیساکہ حل لغات میں بتایا گیا ہے سوال یہ ہے کہ کیا یہ تینوں معنی اس جگہ چسپاں ہوتے ہیں یا ان میں سے کوئی ایک؟

والسماء والطارق میں ما ادراک کہہ کر لفظ طارق کے معنی کی تعیین

اس بارہ میں یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ ہم بعض جگہ قرآن کریم کے ایک لفظ کے پانچ پانچ چھ چھ معنے کر جاتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ رہتا ہے کہ شائد زبردستی معنے کر دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے طریق کی اس آیت سے اور ایسی ہی بعض اور آیات سے تصدیق نکلتی ہے جب لغت میں ایک لفظ کے ایک سے زائد معنی ہوں تو بہرحال دو حالتیں ہونگی یا یہ کہ عبارت میں ایک معنی مُراد لئے گئے ہیں اور یا یہ کہ ایک سے زیادہ معنے مُراد لئے گئے ہیں۔ پھر جہاں ایک سے زیادہ معنے لئے گئے ہوں اُن میں سے بھی سارے معنے لئے جاسکیں گے اور کبھی یہ ہوگا کہ بعض لئے جاسکیں گے اور بعض نہیں پھر جہاں صرف ایک معنی مُراد لئے گئے ہوں وہاں بھی دو صورتیں ہونگی کبھی ایک معنے اتنے واضح ہونگے کہ عبارت سے صاف ثابت ہوگا کہ یہی معنے اُس جگہ چسپاں ہوسکتے ہیں اور کبھی وہ معنے اتنے واضح نہیں ہونگے اور اس کے لئے کسی اشارہ کی ضرورت ہوگی۔ قرآن کریم میں جس جگہ کسی لفظ کے ایک معنے لینے ہوں دوسرے نہ لینے ہوں وہاں مَآ اَدْرٰىكَ کا لفظ آتا ہے۔ گویا ایک لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں مگر مَآ اَدْرٰىكَ کے الفاظ کے بعد ایک معنی بتا کر اللہ تعالیٰ یہ بتا دیتا ہے کہ ہم اِس جگہ اِس سے یہ خاص معنے مُراد لیتے ہیں یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ جہاں مَآ اَدْرٰىكَ کا لفظ نہیں آتا وہاں ہمارا حق ہے کہ ہم اس کے کئی معنے کریں ورنہ وجہ کیا ہے کہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ معنوں کو محدود کر دیتا ہے اور دوسری جگہ محدود نہیں کرتا اسکی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ایک لفظ کے کئی کئی معنے کرنا قرآن کریم کے اصول کے خلاف نہیں ہاں جس جگہ وہ خود معنوں کو محدود کر دے وہاں ہمارا حق نہیں کہ ہم اُن معنوں کو ترک کر کے کوئی اور معنے کریں۔ پس وہ لوگ جو ہماری تفسیر پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ ہم کیوں ایک لفظ کے کئی کئی معنے جو لغت سے ثابت ہوتے ہیں کرتے ہیں اُن کا یہ اعتراض قلتِ تدبّر اور قرآن کریم پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ۔ النَّجْمُ الثَّاقِبُ اگر مَآ اَدْرٰىكَ کا لفظ یہاں نہ ہوتا تو کوئی کہہ دیتا کہ طارق سے مراد یہاں رات کو آنے والا ہے کوئی کہہ دیتا کہ یہاں طارق سے کاہن مراد ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے معنے کو محدود کرتے ہوئے فرما دیا وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ۔ تمہیں کس نے

بتایا کہ طارق کون ہے یعنی تمہارے پاس اس لفظ طارق کا صحیح مفہوم سمجھنے کا کوئی ذریعہ نہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ عرب لوگ طارق کے معنے نہیں جانتے تھے یہ عربی کا لفظ ہے اور اہل عرب جانتے تھے کہ طارق کے کیا کیا معنے ہیں پس مَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ کا بجز اس کے اور کوئی مطلب نہیں کہ طارق کے کئی معنوں میں سے تم کو کس طرح پتہ لگ سکتا ہے کہ ہم اس جگہ طارق کے کونسے معنے مُراد لے رہے ہیں اس لئے ہم تمہیں بتلاتے ہیں کہ اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ ہماری مُراد یہاں طارق کے لفظ سے صبح کا ستارہ ہے۔

اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے یہ تعلق ہے کہ پہلی سورۃ میں اور اُس سے پہلی سورۃ میں یہ مضمون بیان کیا گیا تھا کہ آنے والا بدر کی صورت میں آئیگا جیسے فرمایا وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کہ میں تیرھویں کے چاند کو بطور شہادت پیش کرتا ہوں یا فرمایا تھا وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ یعنی بارہ بروج کے بعد ایک تیرھویں موعود کی خبر دی گئی تھی۔ پس پہلی دونوں سورتوں میں آنے والے کے متعلق یہ بیان کیا گیا تھا کہ وہ بدر ہو گا۔ بدر کے لفظ سے ایک شبہ پیدا ہوتا تھا اور وہ یہ کہ گو بدر یہ بتاتا ہے کہ اس نے سورج کی روشنی کو پورے طور پر دوسروں تک پہنچا دیا ہے لیکن بدر ایک اور طرف بھی اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ سورج لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے پس اگر بدر پر ہی خاتمہ ہے تو دوسرے معنی اس کے یہ ہوں گے کہ نورِ محمدی براہِ راست اپنا پرتو اب دنیا پر نہیں ڈالیگا اور یہ ایک نقص ہے۔ نورِ محمدی اگر براہِ راست اپنا پرتو نہیں ڈالیگا تو اس کے معنے درحقیقت یہ بنجاتے ہیں کہ ہم نورِ محمدی کو تو دیکھیں گے مگر بواسطہ ایک دوسرے وجود کے اسے الگ نہیں دیکھیں گے۔ حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے اصل نبی ہیں اور جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہو کر آتا ہے وہ آپؐ کا تابع ہوتا ہے اور کوئی تابع اپنے متبوع کے رستہ میں روک بن کر کھڑا نہیں ہو سکتا اگر کوئی ایسا شخص آئے تو وہ خاتمِ سلسلہ ہی ہو سکتا ہے جیسے حضرت عیسٰی علیہ السلام آئے انہوں نے نورِ موسوی کو روکا مگر ساتھ ہی اُسے ختم کر دیا۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ ہم جو ایک موعود کی خبر دے رہے ہیں وہ پہلے لوگوں کی طرح نہیں ہو گا وہ آخری ہوتے تھے اِن معنوں میں کہ سلسلہ اُن پر ختم ہو جاتا تھا مگر اسلام میں آنے والا دو نام رکھتا ہے ایک بدر اور ایک طارق۔ بدر اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ سورج غروب ہو گیا اب اسکی روشنی بدر کے ذریعہ ہی دنیا تک پہنچ سکتی ہے اس کے بغیر نہیں۔ لیکن طارق اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ سورج چڑھنے والا ہے پس یہ نہیں ہو گا کہ آنے والا نورِ محمدی کو روک دے گا بلکہ وہ ایک لحاظ سے بدر ہو گا اور ایک لحاظ سے طارق ہو گا۔ وہ بدر ہو گا اِس لحاظ سے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نورِ نبوت اپنے اندر جذب کر کے دنیا تک پہنچائے گا اور وہ طارق ہو گا ان لوگوں کے لحاظ سے جو اس سے تعلق پیدا کرینگے۔ کیونکہ وہ اس سے تعلق پیدا کرنے کے بعد براہِ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق پیدا کر لیں گے گویا بدر کے لحاظ سے وہ نورِ نبوت کو لے کر لوگوں تک پہنچائے گا اور طارق کے لحاظ سے لوگوں میں یہ استعداد پیدا کرے گا کہ براہِ راست نورِ محمدی کا اکتساب کریں۔ پس بدر اور طارق دو نام ہیں جو آنے والے موعود کے رکھے گئے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ حدیثوں میں بھی آنے والے کے دو نام رکھے گئے ہیں ایک مسیح اور ایک مہدی۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لکھا ہے کہ میرا مدار مہدی کے نام پر ہے گو ہماری جماعت میں مسیح موعود نام زیادہ مشہور ہے درحقیقت بدر قائم مقام ہے عیسٰی کا اور طارق قائم مقام ہے مہدی کا جیسو کی

طارق سے مراد صبح کا ستارہ

سورۂ طارق کا تعلق سورۂ بروج سے

آخری زمانہ میں آنے والے موعود کے دو نام دو مختلف جہات سے

مقام پر کھڑے ہونے والے جس قدر لوگ آئے ہیں وہ صرف آخری ہی نہیں تھے بلکہ مسبوق شرعی نبی کے خادم بھی تھے۔ اُن کے آنے پر وہ سلسلہ ختم ہوگیا اور ایک نیا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری کیا گیا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آنے والے کا نام مسیح بھی رکھا اور مہدی بھی رکھا۔ نبی بھی رکھا اور اُمتی بھی رکھا۔ نبی کے لحاظ سے وہ بدر ہے اور اُمتی کے لحاظ سے وہ طارق ہے پس قرآن کریم نے آنے والے کے دو نام رکھے ہیں ایک اِنْشِقَاقِ قَمر یا یَوْمِ مَوْعُوْد اور ایک طَارِق جس میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ پھر نورِ محمدی کو دُنیا میں روشن کر دیگا گویا وہ اسلام کی ترقی اور انوارِ محمدی کے ظہور کی خبر دینے والا ہوگا۔ اس طرح ان سورتوں میں دونوں پیشگوئیوں کو بیان کر دیا گیا ہے عیسیٰ کی پیشگوئی پہلی دو جگہ بیان ہوئی ہے اور مہدویت کی پیشگوئی اس جگہ بیان ہوئی ہے۔

یہ بات بھی اپنے اندر ایک لطافت رکھتی ہے کہ اس سورۃ کے آخر میں پھر مضمون کو پہلے زمانہ کی طرف پھیر دیا گیا ہے جیسے فرماتا ہے فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا۔ گویا آخر میں پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضمون کو پھیر دیا اور جس طرح مضمون کا ابتداء رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے کیا گیا تھا اسی طرح مضمون کا خاتمہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں آسمان کو۔ پہلی سورۃ میں بھی آسمان کو بطور شہادت پیش کیا گیا تھا مگر وہاں فرمایا تھا وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ وہاں اِس ترتیب کو بیان کیا گیا تھا کہ مختلف حالتوں میں سے اسلام گذرتا جائے گا اور ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجدید دین کا کام جاری رہے گا یہاں تک کہ یَوْمِ مَوْعُوْد آجائے گا یعنی ایسا شخص کھڑا ہوگا جس کا نام نبی ہوگا اور لوگوں کے دلوں میں شبہ پیدا ہوگا کہ شائد نورِ محمدی ختم ہوگیا ہے۔ چونکہ یہ شبہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتا تھا اس لئے فرماتا ہے اب ہم اسکی دوسری جہت کو پیش کرتے ہیں کہ اُسکی ایک جہت ایسی ہی ہے جیسے طارق ہوتا ہے۔ جس طرح آسمانی نظام میں دونوں باتیں ہوتی ہیں چاند بھی ہوتا ہے اور تاریک راتیں بھی ہوتی ہیں۔ اِسی طرح وہ بدر بھی ہوگا اور طارق بھی۔ گویا ایک نام ایک جہت سے ختم کرنے کے معنی دیتا ہے اور دوسرا نام دوسری جہت سے اجراء کے معنے دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ مسیح موعودؑ کی بعثت جہاں نورِ محمدی کو بالواسطہ پھیلائے گی۔ وہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو بھی دُنیا میں قائم کرے گی۔ پس آپؐ کا بدر نام ہے اس وقت کا جبتک اسلام کو غلبہ حاصل نہیں ہوتا اور صرف رُوحانی فیوض ظاہر کئے جاتے ہیں جن میں مسیح موعودؑ کا وجود بطور واسطہ اور آئینہ کے ہے اور طارق نام ہے اُس وقت کا جب اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائیگا کیونکہ مہدی کے ہاتھ پر ہی اسلام کی فتح اور اُس کا غلبہ اور اس کی شریعت کا قیام مقدر ہے۔ جب تک اسلام کے غلبہ کا زمانہ آئے مسیح موعودؑ کا بدر نام غالب رہے گا۔ بدر کی جنگ میں بھی مسلمان سخت کمزور تھے اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ بدری زمانہ فتح کی علامت ہے لیکن ساتھ ہی وہ کمزوری کی بھی علامت ہے مگر اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ کمزوری کو اپنے پیچھے چھوڑتا ہُوا ترقی کو اپنے آگے لے آتا ہے۔

دونوں جگہ سَمَاء کا لفظ رکھ کر اللہ تعالےٰ نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ دونوں نظام آسمان کے تابع ہیں یعنی الہام الٰہی سے وابستہ ہوں گے۔ بدری مقام بھی الہام الٰہی سے وابستہ ہوگا اور مہدویت کا مقام بھی الہام الٰہی سے وابستہ ہوگا۔ بغیر آسمانی نظام کے نہ بدری مقام حاصل ہو سکتا ہے اور نہ طارق کا مقام

## اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝

(وہ ستارہ (وہ ہے) جو بہت چمکتا ہے۔ ۳ے)

## اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝

(اس امر پر قسم کھاتے ہیں کہ اس قسم کی) کوئی جان نہیں جس پر ایک نگران (خدا تعالیٰ کی طرف سے) مقرر نہ ہو ۴ے

حاصل ہو سکتا ہے یہ دونوں عہد سے آسمانی نظام چاہتے ہیں۔ اور پھر اس آسمانی نظام کو دُہرانے میں ایک یہ بھی غرض ہے کہ مسیح موعودؑ کی بعثت کے بعد بھی اللہ تعالیٰ اس کے مختلف مظاہر پیدا کرتا رہے گا کوئی جلالیت کا مظہر ہوگا اور کوئی مسیحیت کا مظہر ہوگا مگر اُن پر الہام الٰہی کا ہونا ضروری ہوگا کیونکہ دونوں جگہ سماء کا لفظ رکھا گیا ہے جو الہام الٰہی کی طرف اشارہ کرتا ہے

**۳ے حل لغات۔** اَلثَّاقِبُ۔ ثَقَبَ سے اسم فاعل ہے اور ثَقَبَ کے معنے چھید کرنے کے ہوتے ہیں۔ (اقرب) اور اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ کے معنے ہیں۔ روشن ستارہ جو ظلمت کو چھید دے۔ نیز کہتے ہیں ثَقَبَ النَّجْمُ اور معنے ہوتے ہیں اَضَاءَ یعنی ستارہ روشن ہوا۔ زمخشری اپنی کتاب اساس میں لکھتے ہیں کہ كَوْكَبٌ ثَاقِبٌ دُرِّيٌّ کے معنے ہیں شَدِيْدُ الْاِضَاءَةِ وَالتَّلَأْلُؤِ كَاَنَّهٗ يَثْقُبُ الظُّلْمَةَ فَيَنْفُذُ فِيْهَا وَيَدْرَاُهَا اَيْ يَدْفَعُهَا (اقرب) یعنی كَوْكَبٌ ثَاقِبٌ یا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ کے معنے ہوتے ہیں ایک چمکتا ہوا ستارہ جس میں خوب روشنی اور چمک ہو گویا وہ ظلمت کو چھید دیتا اور اس میں گھس کر ہر قسم کی تاریکی کو دور کر دیتا ہے۔

اَلنَّجْمُ کے معنے کے لئے دیکھیں سورۃ تکویر ۳ے

**تفسیر۔** جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ بدر کے لفظ سے یہ بتایا گیا تھا کہ بدری لحاظ سے باوجود ظلمتِ زمانہ کے آنے والا موعود نورِ محمدی کو پھیلا دے گا۔ اور اس کی جماعت اسلام کی خادم ہوگی اور طارق کے لحاظ سے یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ہر قسم کی ظلمتوں کو پھاڑ دیگا۔ درحقیقت محمدی زمانہ جلال کا زمانہ ہے اور فتوحات محمدیت سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے طارق کا لفظ لا کر بتا دیا کہ اس کے آنے کے ساتھ اسلامی فتوحات کا زمانہ آجائے گا اور تمام قسم کی ظلمات کو وہ پھاڑ کر رکھ دیگا۔

لَمَّا

**۴ے حل لغات۔** لَمَّا کے کئی معنے ہوتے ہیں جن میں سے ایک اِلَّا کے ہیں چنانچہ لغت میں لکھا ہے وَالثَّالِثُ مِنْ اَوْجُهِهَا اَنْ تَكُوْنَ حَرْفَ اِسْتِثْنَاءٍ فَتَدْخُلُ عَلَى الْجُمْلَةِ الْاِسْمِيَّةِ نَحْوُ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (اقرب) یعنی لَمَّا کی تیسری قسم یہ ہے (ہر قسم کی بھی آگے کئی کئی اقسام ہیں) کہ یہ حرفِ استثناء ہوتا ہے اور جملۂ اسمیہ پر آتا ہے جیسے قرآن کریم کی یہ آیت ہے کہ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ۔ یہاں سیبویہ کا ایک فقرہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اَعْجَبُ الْكَلِمَاتِ كَلِمَةُ لَمَّا اِنْ دَخَلَ عَلَى الْمَاضِيْ يَكُوْنُ ظَرْفًا وَاِنْ دَخَلَ عَلَى الْمُضَارِعِ يَكُوْنُ حَرْفًا وَاِنْ دَخَلَ لَا عَلَى الْمَاضِيْ وَلَا عَلَى الْمُضَارِعِ يَكُوْنُ بِمَعْنٰى اِلَّا (اقرب) یعنی لَمَّا ایک عجیب کلمہ ہے۔ اگر ماضی پر داخل ہو۔ تو ظرف کے معنے دیتا ہے اور اگر مضارع پر داخل ہو۔ تو حرف ہوتا ہے اور اگر نہ ماضی پر داخل ہو اور نہ مضارع پر تو اس کے معنے اِلَّا کے ہوتے ہیں۔ بہرحال لَمَّا کے کئی معنے

اَلثَّاقِبُ

اَلنَّجْمُ

ہوتے ہیں اور جب یہ جملہ اثبتیہ پر آتا ہے تو اس کے معنے اِلَّا کے ہوتے ہیں لیکن درحقیقت عربی محاورہ سے پتہ لگتا ہے کہ جب یہ اسم پر آئے اس وقت اس کے معنے اِلَّا کے نہیں ہوتے بلکہ اسم کے بغیر بھی یہ اِلَّا کے معنے دیتا ہے چنانچہ کہتے ہیں۔ اَنْشُدُکَ اللّٰہَ لَمَّا فَعَلْتَ۔ اَیْ مَا اَسْأَلُکَ اِلَّا فِعْلَکَ۔ یعنی سوائے تمہارے کام کے مجھے کسی اور سے غرض نہیں۔

**تفسیر۔** فرماتا ہے اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ۔ ہر جان جو دنیا میں آتی ہے اس پر ایک نگران مقرر ہوتا ہے۔ اس آیت کے لوگوں نے مختلف معنی کئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہیں کہ ہر انسان کا خدا حافظ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا (الاحزاب ع۷) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر رقیب ہے اور نفس شے کے تابع ہے جب چیز پر رقیب ہے تو نفس بھی اسی میں آگیا اسی طرح فرماتا ہے اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ (انفطار) کہ یقیناً تم پر تمہارے خدا کی طرف سے نگران مقرر ہیں فرماتا ہے لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ یعنی اللہ کی طرف سے اس کے آگے بھی اور اس کے پیچھے بھی ایک دوسرے کے پیچھے آنے والی ایک ملائکہ کی جماعت حفاظت کے لئے مقرر ہے جو اسکی اللہ کے حکم سے حفاظت کر رہے ہیں۔ (الرعد ع۲) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایک روایت مروی ہے آپؐ فرماتے ہیں وُکِّلَ بِالْمُؤْمِنِ مِائَةٌ وَّسِتُّوْنَ مَلَكًا يَذُبُّوْنَ عَنْهُ كَمَا يُذَبُّ عَنْ قَصْعَةِ الْعَسَلِ الذُّبَابُ (روح المعانی) یعنی ہر مومن پر ایک سو ساٹھ فرشتے مقرر ہوتے ہیں اور وہ اس سے اسی طرح شیطانی تحریکیں دور کرتے رہتے ہیں جس طرح شہد کے پیالے سے مکھیاں اڑائی جاتی ہیں۔

غرض انسان کی حفاظت کا قرآن اور حدیثوں دونوں سے پتہ لگتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ انسان کا نگران ہوتا ہے اور ملائکہ بھی اس فرض کو ادا کرتے ہیں۔

مگر میرے نزدیک اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ میں کُلّ سے مراد صرف اس قسم کے لوگ ہیں جو اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ یا اس کے قائم مقام ہوں اور چونکہ اس قسم کے کئی لوگ ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ بھی اس میں شامل تھے۔ حضرت عیسیٰؑ بھی اس میں شامل تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی اس میں شامل تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی اس میں شامل تھے۔ غرض ایک جماعت اس سے مراد تھی اس لئے کُلّ کا لفظ استعمال فرمایا۔ گویا کُلُّ نَفْسٍ سے مراد كُلُّ نَفْسٍ مِّنْ هٰذَا الْقِسْمِ ہے کہ اس قسم سے تعلق رکھنے والی ہر جان پر ایک نگران مقرر ہے اور وہ نگران خدا تعالیٰ کی ذات ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالےٰ نے فرما دیا کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ ع۱۰) کہ اللہ تمہیں لوگوں کے منصوبوں سے بچائے گا۔ یہی الہام حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہوا اور اسی قسم کا الہام حضرت مسیح ناصریؑ کو بھی ہوا کہ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (آل عمران ع۶) یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے عیسیٰ میں تجھے طبعی طور پر وفات دوں گا اور تجھے اپنے حضور عزت بخشوں گا۔ اور کافروں کے الزامات سے تجھے پاک کروں گا اور جو تیرے پیرو ہیں انہیں ان لوگوں پر جو منکر ہیں قیامت کے دن تک غالب رکھوں گا۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ

پس انسان کو دیکھنا چاہیئے۔ کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ایک اچھلنے والے پانی سے

دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝

پیدا کیا گیا ہے۔ وہ (پانی یا انسان) پیٹھ اور سینہ کی ہڈیوں سے نکلتا ہے۔ ۵

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ سلسلہ کا پہلا اور آخری نبی کبھی قتل نہیں ہو سکتا اللہ تعالیٰ اس کی خود حفاظت کیا کرتا ہے چنانچہ حضور فرماتے ہیں:-

"اگرچہ قتل ہونا مومن کے لئے شہادت ہے لیکن عادت اللہ اسی طرح ہے۔ کہ دو قسم کے مرسل من اللہ قتل نہیں ہوا کرتے۔ (۱) ایک وہ نبی جو سلسلہ کے اوّل پر آتے ہیں جیسا کہ سلسلہ موسویہ میں حضرت موسیٰؑ اور سلسلہ محمدیہ میں ہمارے سید و مولیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (۲) دوسرے وہ نبی اور مامور من اللہ جو سلسلہ کے آخر میں آتے ہیں جیسے کہ سلسلہ موسویہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سلسلہ محمدیہ میں یہ عاجز (تذکرۃ الشہادتین ص۶۸)

پس اِنْ كُلُّ نَفْسٍ سے مراد اِنْ كُلُّ نَفْسٍ مِنْ هٰذِهِ الطَّائِفَةِ ہے اگر ہم نفس سے مراد عام نفس لے لیں تو گو سارے نفسوں کی حفاظت کا قرآن کریم سے بھی پتہ لگتا ہے اور حدیثوں سے بھی پتہ لگتا ہے مگر مجھے ان معنوں کا اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ سے کوئی جوڑ نظر نہیں آتا لیکن جو معنے میں کرتا ہوں اُن سے آیات کا جوڑ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے لوگ جو اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ ہوں اللہ تعالیٰ ان کی خود حفاظت کرتا اور انہیں دشمنوں کی شرارتوں اور منصوبوں سے محفوظ رکھتا ہے ثاقب اِسی لئے فرمایا کہ وہ دوسروں کو مارے گا۔ اس کو کوئی نہیں مار سکتا۔ فرماتا ہے یہ وہ ستارہ ہے جو دوسروں کو چھید ڈالے گا مگر اس قسم کے آدمیوں کو اور کوئی چھید نہیں سکتا۔

سلسلہ کا پہلا اور آخری نبی قتل نہیں ہوتا۔

**۵ حل لغات۔** دَافِقٌ دَفَقَ سے ہے اور دَفَقَ الْمَآءُ کے معنے ہوتے ہیں اِنْصَبَّ بِمَرَّةٍ دفعۃً پانی بہ پڑا (اقرب) اَلدَّافِقُ کے معنے ہیں اَلْمُنْصَبُّ دفعۃً بہنے والا۔ (اقرب)

دَافِقٌ

اَلصُّلْبُ وَالصَّالِبُ۔ عَظْمٌ فِي الظَّهْرِ ذُوْ فِقَارٍ مِنْ لَدُنِ الْكَاهِلِ اِلَى الْعُجُبِ (اقرب) صلب اور صالب دونوں ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں یعنی کندھوں سے لے کر عجب الذنب تک جو ہڈی ہے اسے صلب بھی کہتے ہیں اور صالب بھی کہتے ہیں۔

اَلصُّلْب

تَرَائِب۔ تَرِيْبَةٌ کی جمع ہے۔ اور اس کے معنے سینہ کی ہڈیوں کے ہیں (اقرب) پس لفظی معنی يَخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ کے یہ ہوئے کہ وہ پانی جو نکلتا ہے۔ پیٹھ اور سینہ کی ہڈیوں کے درمیان سے۔

تَرَائِب

**تفسیر۔** پرانے زمانہ میں لوگوں سے یہ غلطی ہوئی کہ وہ اس آیت کو دیکھ کر اس طرف مائل ہوگئے کہ مادۂ منویہ سینہ اور پیٹھ کی ہڈیوں کے درمیان سے آتا ہے لیکن حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ اس کے ایک بہت ہی لطیف معنی کیا کرتے تھے آپ فرماتے تھے قرآن کریم بڑا لطیف کلام ہے وہ کبھی ننگے الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ اس نے صلب اور ترائب کا ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ صلب اور ترائب کا

یخرج من بین الصلب والترائب کے ایک لطیف معنے

## اِنَّهٗ عَلٰی رَجۡعِهٖ لَقَادِرٌ ۝ یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ ۝

وہ (خدا تعالیٰ) اس کے دوبارہ لوٹانے پر بھی یقیناً قادر ہے ؁ اس دن (لوٹانے پر) جب پوشیدہ بھید ظاہر کئے جائیں گے

## فَمَا لَهٗ مِنۡ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝

جس کے نتیجہ میں نہ تو (اپنے پر سے مصیبت ٹلانے کی) کوئی طاقت اس کے پاس رہے گی۔ اور نہ اس کا کوئی مددگار ہوگا ؎

جو وسط ہے وہاں سے مَاءٍ دَافِقٍ نکلتا ہے یہ معنے بڑے لطیف اور قرآن کریم کی شان کے بالکل مطابق ہیں۔

تُبۡلٰی

بعض لوگوں نے بَیۡنَ الصُّلۡبِ سے مراد مرد کا صلب اور ترائب سے مراد عورت کا سینہ لیا ہے اور وہ معنے یہ کرتے ہیں کہ انسان مرد کی پیٹھ سے پیدا ہوتا اور ماں کی چھاتیوں سے پلتا ہے۔ گویا صلب سے مراد صلب الأَبِ اور ترائب سے مراد ترائب الأُمِّ ہے یہ معنے عام معنوں سے زیادہ معقول ہو جاتے ہیں اور طبی لحاظ سے بھی اسپر کوئی اعتراض واقع نہیں ہوتا۔

بین الصلب والترائب سے مراد مرد کا صلب اور ماں کی چھاتیاں

؁ **تفسیر:** یہاں انسان کی پیدائش کا اللہ تعالےٰ نے ذکر کیا ہے اور پہلی بات یہ بتائی ہے کہ خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ۔ انسان میں خدا تعالیٰ نے دفق کی قابلیت رکھی ہے کیونکہ اس کی پیدائش ہی ایسے پانی سے ہوئی ہے جو اچھلنے والا ہے چنانچہ انسان کے تمام اعمال بھی اسی اچھلنے کی صفت کے مطابق ہوتے ہیں یعنی وہ ہمیشہ اُچھلتا کودتا ہے اور آگے کی طرف بڑھنے کی اس میں رغبت پائی جاتی ہے اور جس طرح اُچھلنے والا کبھی اوپر اُچھلتا ہے اور کبھی نیچے آتا ہے اسی طرح وہ مختلف دوروں سے گذرتا ہے کبھی وہ ادنیٰ دَور میں گزر رہا ہوتا ہے اور کبھی اعلیٰ دَوریں سے۔ یہ تمام باتیں دلالت کرتی ہیں کہ انسانی فطرت میں بڑھنے کا مادہ رکھا گیا ہے اور ترقی کا راستہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کھولا ہوا

السرائر سے مراد چھپی ہوئی باتیں

انسان کے ماء دافق سے پیدا ہونے سے مراد

ہے لیکن جب وہ اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتا تو نقصان بھی اٹھا لیتا ہے۔

؎ **حل لغات:** تُبۡلٰی کے معنے ہیں تُکۡشَفُ وَتُعۡرَفُ وَتُظۡهَرُ یعنی ظاہر کئے جائیں گے اور سَرَائِرُ سَرِیۡرَةٌ کی جمع ہے اور سَرِیۡرَةٌ کے معنے ہیں اَلسِّرُّ الَّذِیۡ یُکۡتَمُ ایسا راز جس کو انسان چھپاتا ہے اور سَرِیۡرَةُ الۡاِنۡسَانِ کے معنی ہیں مَا اَسَرَّهٗ مِنۡ اَمۡرِهٖ خَیۡرًا اَوۡ قِیۡلَ شَرًّا یعنی ہر وہ بات جو انسان چھپانا چاہتا ہو۔ خواہ وہ اچھی ہو یا بُری۔ اسی طرح کہتے ہیں فُلَانٌ طَیِّبُ السَّرِیۡرَةِ اَیۡ سَلِیۡمُ الۡقَلۡبِ وَصَافِی النِّیَّةِ یعنی فلاں صاف دل اور صاف نیت ہے (اقرب)

**تفسیر:** فرماتا ہے یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ جس دن کہ چُھپی ہوئی باتیں خدا تعالیٰ ظاہر کر دے گا یا ان کے مطابق انسان کا امتحان لیا جائے گا۔ ان معنوں کے رو سے مومن و کافر دونوں مُراد ہونگے اور اگر اس کے معنی صافی القلب کے لئے جائیں۔ تب صرف مومن کے لئے یہ آیت سمجھی جائے گی۔ اور اگر سرائر کے معنے صرف یہ کئے جائیں کہ وہ راز جن کو انسان چھپانا چاہتا ہے تو اس صورت میں یہ آیت صرف کافروں کے لئے ہوگی۔

فَمَا لَهٗ مِنۡ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ۔ یہ آیت اس بات کا ثبوت ہے کہ سَرِیۡرَہ کے معنے مذکرہ بالا آیت میں صافی القلب کے نہیں بلکہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جنکو انسان چھپاتا ہے اور چھپاتا ہمیشہ بُری باتوں کو ہی ہے

فرماتا ہے۔ یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ جس دن کہ انسان
کے خراب اور گندے ارادے ظاہر کر دیئے جائینگے
یا اُس کا امتحان لیا جائے گا۔ ایسے انسان کے اندر
نہ تو ذاتی طور پر کوئی قوت ہوگی اور نہ اس کا کوئی اور مددگار
ہوگا۔ پہلی آیات میں اَلنَّجۡمُ الثَّاقِبُ کا ذکر کیا گیا ہے
اور ثاقب ہمیشہ ایسی چیز پر ہوُا کرتا ہے جو تباہی و
بربادی کے قابل ہو۔ اچھی چیز کو پتھر مار مار کر چھیدا
نہیں جاتا پھر اِنۡ کُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَیۡهَا حَافِظٌ
میں یہ بتایا گیا تھا کہ لوگ اس نجم ثاقب کی مخالفت کرینگے
مگر اللہ تعالیٰ اُس نجم ثاقب کے ذریعہ تاریکی اور
ظلمت کو دُور کر دے گا اور وہ لوگ جو اُس وجود کے
خلاف منصوبے کریں گے اور خفیہ تدابیر کے ذریعہ
اس کے کام کو تباہ کرنا چاہیں گے اللہ تعالیٰ اُن کے
تمام گند اور بد ارادوں کو ظاہر کر دے گا اور ان
کو اس طرح تباہ کرے گا کہ نہ ذاتی طور پر وہ اُس
تباہی کو روکنے کی طاقت رکھیں گے اور نہ باہر
سے کوئی اور شخص ان کی مدد کے لئے کھڑا ہو سکے گا۔

ایک صاحب نے ایک دفعہ مجھے سنایا کہ میرے
والد مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کے بہت دوست
ہوُا کرتے تھے اور اُن کی مجھے ہدایت تھی کہ مولوی
محمد حسین صاحب جب شملہ میں آیا کریں تو مَیں اُن
سے ضرور ملنے کے لئے جایا کروں۔ ایک دفعہ مولوی
محمد حسین صاحب بٹالوی شملہ میں آئے۔ میں ان کو ملا
رہا تھا کہ اتنے میں حافظ عبدالرحمٰن صاحب کتاب النصر
کے مصنف وہاں آ گئے اور مولوی محمد حسین صاحب
سے کہنے لگے کہ مولوی صاحب مرزا قادیانی نے بڑی
ترقی کر لی ہے لوگ اس کے معتقد ہوتے جاتے ہیں
اور یہ فتنہ روز بروز ترقی کر رہا ہے مختلف گفتگوؤں
کے بعد کسی نے کہا کہ ایسے شخص کو کوئی مار بھی نہیں ڈالتا
اس پر مولوی محمد حسین صاحب کہنے لگے مشکل یہ ہے کہ کئی
دفعہ ایسا بھی لوگوں نے کرنا چاہا ہے مگر وہ کسی نہ کسی طرح
بچ جاتا ہے۔ اسی دوست نے ذکر کیا کہ جب وہ یہ باتیں
آپس میں کر رہے تھے تو مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ مولوی
آدمی ہیں۔ انہیں ان باتوں کا کیا علم۔ مَیں خود یہ ثواب
حاصل کروں گا۔ اور اُن کو ضرور قتل کر کے رہوں گا
یہ ارادہ مَیں نے پختہ طور پر کر لیا۔ مگر جب دوسرا دن ہوُا
تو حافظ عبدالرحمٰن صاحب پھر مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی
سے ملنے کے لئے آئے اور کہنے لگے مولوی صاحب اب
مرزا صاحب کے مقابلہ کا راستہ نکل آیا ہے مرزا صاحب
نے ایک اشتہار شائع کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ خدا کے حکم
کے ماتحت مَیں آیندہ کوئی مباحثہ نہیں کرونگا۔ یہ اشتہار
ایسا ہے جس سے مرزا بالکل پکڑا جائے گا۔ ہم اس کے
مقابلہ میں ایک مباحثہ کا اشتہار شائع کر دیتے ہیں اگر
اُس نے مباحثہ کو مان لیا تو ہم کہیں گے دیکھو ایک طرف
تو کہا جاتا ہے کہ خدا نے مجھے مباحثات سے روکا ہے
اور دوسری طرف مباحثہ کو منظور کر لیا گیا ہے معلوم ہوُا
ہے کہ جو کچھ کہا گیا تھا وہ بالکل جھوٹ تھا اور اگر وہ مباحثہ
کے لئے نہیں نکلے گا تب بھی اسکی شکست ہوگی کیونکہ ہم
دنیا میں اعلان کر دینگے کہ ہم مرزا صاحب کو مباحثہ
کے لئے بلاتے ہیں مگر وہ میدان میں نکلنے کے لئے تیار
نہیں۔ اُن کی یہ بات سُنتے ہی مولوی محمد حسین صاحب
اُٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے حافظ صاحب آپ نے
خوب بات نکالی۔ یہ مرزا قادیانی کو لوگوں کی نگاہ سے
گرانے کا نہایت کامیاب حربہ ہے۔

راوی نے بیان کیا کہ جب اُنکی یہ باتیں مَیں نے سُنیں
تو اسی وقت یقین کر لیا کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں پہلے دن
تو یہاں تک کہتے تھے کہ قتل کرنے والے قتل کرنا چاہتے
تھے مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ اور آج ایک خلاف تقویٰ
تجویز پر متفق ہو رہے ہیں۔ ان لوگوں میں ایمان اور
تقویٰ بالکل نہیں ہے۔ چنانچہ یہی واقعہ آخر میں اُنکی

# وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۙ

(اور مجھے) قسم ہے اس بادل کی جو بار بار برسنے والے مینہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور اس زمین کی بھی (مجھے قسم ہے) جو (بارش کے جواب میں) اُگ پڑتی ہے

ہدایت اور قبول احمدیت کا باعث ہو گیا۔ تو فرماتا ہے یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ وہ اُس نجم الثاقب کو مٹانے کے لئے قسم قسم کی کوششیں کریں گے مگر نہ اُنہیں ذاتی قوت ملے گی اور نہ کوئی مددگار ملے گا۔ جو لوگ بھی اُن کی مدد کے لئے کھڑے ہونگے وہ بالکل نکمے اور بیکار ہونگے۔

**۵۸ حل لغات۔** اَلسَّمَآءُ کے لغت میں کئی معنے ہیں۔ افلاک کو بھی سَمَاء کہتے ہیں۔ اُس وسیع فضاء کو بھی سَمَاء کہتے ہیں جو قبہ عظیمہ کی طرح زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اُس میں سورج چاند اور ستارے ہیں نیز ہر چیز جو اونچی ہو اور سایہ کرے اس کو بھی سَمَاء کہتے ہیں اور بادلوں کو بھی سَمَاء کہتے ہیں اور بعض اوقات بارش کو بھی سَمَاء کہہ دیتے ہیں (اقرب)

اَلسَّمَآءُ

رَجْعٌ کے معنے ہیں اَلْمَطَرُ بَعْدَ الْمَطَرِ یعنی وہ بارش جو لوٹ لوٹ کر آتی ہے (اقرب) اور اَلصَّدْعُ کے معنے ہیں اَلشَّقُّ فِیْ شَیْءٍ صُلْبٍ کسی سخت چیز میں اس کے پھٹنے کا نشان۔ اسی طرح صَدْعٌ نَبَاتُ الْاَرْضِ یعنی زمین کی روئیدگی کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب) پس ذَاتُ الرَّجْعِ کے معنے ہونگے بار بار برسنے والا بادل۔ اور ذَاتُ الصَّدْعِ کے معنے ہونگے پھٹنے والی چیز یا نباتات والی۔

رَجْعٌ

**تفسیر۔** فرماتا ہے ہم تمہارے سامنے آسمان کو پیش کرتے جو ذَاتُ الرَّجْعِ ہے۔ یہاں سَمَاء کے معنے بدل گئے ہیں جس طرح اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ کا اور مفہوم تھا اور اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ کا اور۔ اسی طرح یہاں سَمَاء کے معنے اور ہو گئے ہیں سَمَاء کا لفظ ایک تو افلاک کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے اسکے

والسماء ذات الرجع میں سما سے مراد

معنے بادل کے بھی ہیں۔ اس جگہ سَمَاء بادل کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم تمہارے سامنے شہادت کے طور پر اس بادل کو پیش کرتے ہیں جو ذَاتِ الرَّجْعِ ہے۔ رَجْعٌ کے معنے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اُس بادل کے ہوتے ہیں جو بار بار برستا ہے فرماتا ہے کیا تم بادلوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ بار بار زمین پر برستے ہیں اگر بادلوں سے پانی نہ اُترے اور اگر وہ بار بار زمین پر آ کر نہ برسیں تو زمین کی ترقی بالکل رُک جائے بادلوں کا پانی ہی ہے جو زمین کے نشوونما اور اسکی اندرونی قابلیتوں کو اُبھارنے کا باعث بنتا ہے پہلے فرمایا تھا اِنَّهٗ عَلٰی رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ یعنے اللہ تعالیٰ انسان کو پھر ترقی دینے پر قادر ہے اور یہاں فرمایا ہے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ بادل کو ہم بطور شہادت پیش کرتے ہیں جو بار بار برستا ہے یعنے جس طرح وہ بار بار برس کر زمین کو زندہ کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ بار بار نازل ہو کر دنیا کو روحانی زندگی بخشتا ہے۔ اسی طرح بادلوں کی مثال دے کر اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ بادل آتے اور بار بار برستے ہیں اگر بادل نہ برسیں تو دنیا تباہ ہو جائے۔ یہی حال روحانی زندگی کا ہوتا ہے اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے وہ لوگ کھڑے نہ ہوں جو دنیا کی اصلاح کے لئے مامور ہوتے ہیں اور الہام الٰہی کا پانی زمین پر نہ اُترے تو لوگوں کو روحانی زندگی کبھی حاصل نہ ہو سکے۔

وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ پھر تم کہتے ہو کہ خدا نے الہام تو بھیج دیا مگر دنیا اس قابل نہیں کہ وہ اس الہام کو مان سکے۔ فرماتا ہے تمہاری یہ بات بھی غلط

اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۙ وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ ۙ اِنَّھُمْ

(کہ ظاہر کرے) وہ یعنی قرآن یقیناً قطعی اور آخری بات ہے۔ اور وہ کوئی (بے فائدہ اور) کمزور کلام نہیں ۹؎ وہ لوگ یقیناً

یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا ۙ وَّ اَکِیْدُ کَیْدًا ۚ

(اس کے خلاف) خوب داؤ پیچ کرینگے۔ اور میں بھی (اس کے خلاف) خوب تدبیریں کرونگا۔ ۱۰؎

ہے کہ دنیا الہام الٰہی کو قبول کرنے کی استعداد اپنے اندر نہیں رکھتی۔ تم زمین کی طرف دیکھو وہ کس طرح بنجر پڑی ہوتی ہے اور بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ اس میں کسی قسم کی روئیدگی کی قابلیت نہیں رہی مگر خدا نے اُس کے اندر مخفی طور پر یہ قابلیت رکھی ہوئی ہوتی ہے کہ وُہ پھٹ کر اپنے اندر سے قسم قسم کی سبزیاں وغیرہ پیدا کردے چنانچہ جب بارش ہوتی ہے تو ناممکن نظر آنے والی بات بھی ممکن ہوجاتی ہے اور جہاں کسی قسم کے سبزہ کا امکان نظر نہیں آتا وہاں بھی سبزہ پیدا ہوجاتا ہے صَدْعٌ کے معنے لغت میں شَقٌّ کے بھی ہیں۔ اور ذَاتُ الصَّدْعِ کے معنے ذَاتُ النَّبَاتِ کے بھی ہیں پس ذَاتُ الصَّدْعِ کے معنے ہیں نبات والی زمین یا پھٹ کر روئیدگی پیدا کرنے والی چیز۔ فرماتا ہے یہ ایک ۹؎ سر نظام ہے جو ہماری طرف سے دنیا میں جاری ہے ایک طرف بار بار زمین پر بادل برستا ہے اور دوسری طرف زمین میں یہ قابلیت ہوتی ہے کہ وہ بار بار سبزیاں وغیرہ پیدا کرے۔ اسی طرح انسانی قابلیتیں گو تمہیں مردہ دکھائی دیتی ہیں مگر الہام الٰہی کی بارش کے بعد انہی مردہ قلوب میں سے کئی قسم کی سبزیاں اور روئیدگیاں پیدا ہونی شروع ہوجائینگی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جیسے بعض زمینیں شور ہوتی ہیں اسی طرح انسانوں میں سے بھی بعض شور ہوتے ہیں مگر الہام الٰہی کی بارش کے بعد اکثر لوگ ایسے نکلتے ہیں جو جلد یا بدیر مامورِ وقت کو قبول کرلیتے ہیں۔

۹؎ حل لغات۔ فَصْلٌ فَصَلَ کا مصدر ہے اور فَصَلَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں۔ قَطَعَہٗ وَ اَبَانَہٗ کسی چیز کو کاٹا اور دوسرے سے علیحدہ کردیا۔ نیز اَلْفَصْلُ کے معنی ہیں اَلْحَقُّ مِنَ الْقَوْلِ۔ سچی بات۔ اَلْقَضَاءُ بَیْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ۔ حق و باطل میں فرق اور فیصلہ کرنے والی چیز۔ کہتے ہیں قَوْلٌ فَصْلٌ اور معنے یہ ہوتے ہیں۔ حَقٌّ لَیْسَ بِبَاطِلٍ کہ یہ بات درست ہے باطل نہیں (اقرب)

اَلْھَزْلُ۔ ھَزَلَ کا مصدر ہے اور ھَزَلَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں صَارَ مَھْزُوْلًا۔ کمزور ہوگیا۔ اور جب ھَزَلَ فُلَانٌ فِیْ کَلَامِہٖ کہیں تو معنے ہونگے مَزَحَ وَ ھَذٰی ہنسی اور تمسخر اختیار کیا اور سنجیدگی کو چھوڑ دیا (اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے یہ قرآن قول فصل ہے یعنی اسکے نزول کے بعد تمہاری شکست میں کوئی شک نہیں ہو سکتا یا قول فصل سے مراد یہ ہے کہ یَفْصِلُ بَیْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ یعنی یہ قرآن حق اور باطل میں فرق کر دیگا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کے آنے کے بعد بھی حق اور باطل میں فرق پیدا نہ ہو۔ یا ضمیر موعود کی طرف جاتی ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ ممکن نہیں کہ وہ موعود آئے اور دنیا میں مذکورہ بالا تغیرات نہ ہوں۔ یہ ایک قطعی اور حتمی امر ہے۔ جس کا فیصلہ کیا جاچکا ہے۔ وَمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ یہ کمزور اور بے فائدہ بات نہیں۔

۱۰؎ تفسیر۔ یہاں پھر اس مضمون کو دُہرا دیا گیا ہے جو پچھلی تین چار سورتوں سے پہلے بیان ہورہا تھا۔ پہلی سورتوں میں یہ بتایا گیا تھا کہ اسلام بہت بڑی ترقی حاصل

ع ۱۱

# فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝

پس (اے رسول) کفار کو مہلت دو۔ انہیں کچھ (اور مہلت دو) تا جو زور لگانا چاہیں لگالیں) ۱۵

کرے گا اور تمام دُنیا میں پھیل جائے گا۔ کفار کے منصوبے دھرے رہ جائیں گے۔ ان کی کوششیں اکارت جائینگی اور اسلام بڑھتے بڑھتے دُنیا کے کناروں تک پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا تھا کہ اسلام پر ایک تنزل کا دَور آئے گا اور پھر یہ بتایا گیا تھا کہ اس تنزل کے بعد پھر اسلام کی ترقی کا زمانہ آئے گا اور کفر کو تباہ کیا جائے گا۔ یہ تمام ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا۔ دیکھو ہم نے اسلام کی ساری ہسٹری بتادی ہے کہ کس طرح اسلام غالب ہوگا پھر کس طرح اُس میں کمزوریاں پیدا ہونگی اور پھر کس طرح اس دورِ تنزل کے بعد ہم اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کا سامان کرینگے اور پھر اس مذہب کو دُنیا پر غالب کرکے دکھا دینگے یہ ایک لمبا سلسلہ جو ہم نے بتایا ہے کیا مکہ کے لوگ اتنی بڑی زنجیر کو توڑ دیں گے اور کیا یہ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اس نے تو ابھی بڑھنا ہے پھر گھٹنا ہے۔ پھر بڑھنا ہے اور دُنیا پر غالب آنا ہے اور مکہ کے لوگ اس خیال میں بیٹھے ہیں کہ وہ اپنی تدبیروں سے اسلام کو مٹا دیں گے۔ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وہ بھی تدبیریں کرتے ہیں وَاَكِيْدُ كَيْدًا اور میں بھی تدبیریں کروں گا۔

مَهِّلْ

**۱۵ حل لغات** ۔ مَهِّلْ۔ مَهَّلَ سے امر کا صیغہ ہے اور مَهَّلَ کے معنے ہیں اَنْظَرَهٗ وَاَجَّلَهٗ اس کو مہلت دی (اقرب) اَمْهِلْ اَمْهَلَ کا امر ہے اور اس کے بھی وہی معنے ہیں۔ جو مَهَّلَ کے ہیں (اقرب) نیز مَهَّلَ اور اَمْهَلَ کے معنے ہیں رَفَقَ بِهٖ اس کے ساتھ نرمی اور رفق کا معاملہ کیا (اقرب) پس اَمْهِلْ

اور مَهِّلْ کے معنے ہونگے (۱) مہلت دے (۲) نرمی کا معاملہ کر۔

**تفسیر**۔ اس آیت میں ایک لطیف اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یُوں بھی کہہ سکتا تھا کہ فَمَهِّلِ الْكَافِرِيْنَ رُوَيْدًا مگر بیان کی لطافت اور اس کی خوبی اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بجائے فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ رُوَيْدًا کے فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا فرمایا۔

مہّل کے بعد امہلہم رویدا کہنے کی وجہ

پہلے فرمایا کہ فَمَهِّلِ الْكَافِرِيْنَ کافروں کو مہلت دے اس سے دو کیفیتیں پیدا ہوتی تھیں۔ ایک مومنوں کے قلب میں۔ اور ایک کفار کے قلب میں۔ مومنوں کے قلب میں تو اس سے یہ کیفیت پیدا ہوتی تھی کہ نہ معلوم کفار کو یہ مہلت کب تک دی جائیگی اور کفار کے دل میں یہ کیفیت پیدا ہوتی تھی کہ ابھی کوئی فکر کی بات نہیں ہمیں اور مہلت مل گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کیفیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے فرمادیا۔ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا۔ اس طرح مومنوں کی بھی دلجوئی کر دی کہ کفار کو کوئی لمبی مہلت نہیں دی جائیگی بلکہ بہت تھوڑی مہلت دی جائیگی اور اُدھر کفار کی امید توڑ دی کہ تم یہ خیال مت کرو کہ تمہیں اور ڈھیل دی جائے گی تمہاری تباہی اور بربادی کا وقت اب بالکل قریب آ پہنچا ہے۔

محاورہ میں کہتے ہیں سَارُوْا سَيْرًا رُوَيْدًا اَیْ بِرِفْقٍ پس اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ انکو تھوڑی مدت تک مہلت دے۔ اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ایام مہلت میں ان سے رفق کا معاملہ کرو کیونکہ آخر انکی سزا کا وقت آنے والا ہے اس وقت انکی تباہی کے سامان اللہ تعالیٰ خود اپنے ہاتھوں سے کرے گا

# سُوْرَةُ الْاَعْلٰى مَكِّيَّةٌ

سورۃ الاعلیٰ - یہ سورۃ مکی ہے [1]

## وَهِيَ تِسْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے سوا انیس (۱۹) آیتیں ہیں اور ایک رکوع ہے

[1] یہ سورۃ جمہور کے نزدیک مکی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ ابن زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ بھی فرماتی ہیں کہ یہ مکی ہے۔ بخاری اور دوسری کتب احادیث میں حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ میں سے سب سے پہلے مصعب ابن عمیرؓ اور عبداللہ بن ام مکتومؓ مدینہ تشریف لائے اور انہوں نے ہمیں قرآن مجید سکھانا شروع کیا۔ اُن کے بعد عمارؓ اور بلالؓ اور سعدؓ آئے پھر عمر ابن خطابؓ بیس صحابہؓ سمیت آئے۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے اور میں نے مدینہ والوں کو کسی بات پر اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا جتنا رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری پر اُن کو خوش دیکھا۔ یہاں تک کہ بچے بھی خواہ وہ چھوٹے تھے یا بڑے جب آپس میں ملتے تو نہایت خوشی کیساتھ ایک دوسرے سے کہتے۔ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آگئے۔ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آگئے اور جب آپؐ تشریف لائے تو مَیں نے اُس وقت سورۃ الاعلیٰ اور اسی قسم کی بعض اور سورتیں یاد کی ہوئی تھیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

یورپین مصنفین بھی اِس طرف گئے ہیں کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہو چکی تھی۔ چنانچہ جرمن محقق نولڈکے اِسے سورۃ نون کے معاً بعد نازل ہونیوالی سورۃ قرار دیتا ہے۔ پادری ویری نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کی سترھویں، اٹھارھویں اور انیسویں آیتیں مدنی ہیں کیونکہ اِن آیتوں میں حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کی کتب کا ذکر کیا گیا ہے اور اِن انبیاء سے مدینہ میں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہودیوں سے ملنے کی وجہ سے ہی روشناس ہوئے تھے۔ لیکن یہ استدلال پادری ویری کے مخصوص استدلالوں کی قسم کا ہی ہے کیونکہ مکی سورتوں میں متعدد مقامات پر پُرانے انبیاء کا ذکر آتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تو قریش کے جدِّ امجد تھے اُن کے ذکر سے یہ قیاس کر لینا کہ مدینہ میں جا کر یہودیوں کی صحبت کے نتیجہ میں اِسے بیان کیا گیا ہے انتہائی طور پر عقل سے گری ہوئی بات ہے۔

اِس سورۃ کے متعلق مسند احمد، مسلم اور دوسری کتب احادیث میں نعمان ابن بشیرؓ سے روایت آتی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ اور عیدین کی نمازوں کی پہلی رکعت میں یہ سورۃ پڑھا کرتے تھے اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیہ تلاوت فرمایا کرتے تھے بلکہ اگر عید اور جمعہ اکٹھے ہو جاتے تب بھی آپؐ یہی دو سورتیں دونوں نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ دارقطنی۔ بیہقی اور حاکم میں ابی ابن کعبؓ سے روایت آتی ہے۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نمازِ وتر کی پہلی رکعت میں یہ سورۃ تلاوت فرماتے تھے دوسری رکعت میں سورۃ الکافرون اور تیسری رکعت میں سورۃ الاخلاص تلاوت فرمایا کرتے تھے حضرت علیؓ سے مسند احمدؒ میں روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اِس سورۃ کو بہت محبوب سمجھتے تھے۔

ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ حاکم اور بیہقی میں حضرت عائشہؓ سے بھی روایت آتی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم وتر کی پہلی رکعت میں یہ سورۃ دوسری رکعت میں سورۃ الکافرون اور تیسری رکعت میں سورۃ الاخلاص اور

سورۃ الاعلیٰ مکی ہے [1]

سورۃ الاعلیٰ کے نازل ہونیکا زمانہ [1]

پادری ویری کا سورۃ اعلیٰ کی بعض آیات کو مدنی ثابت کرنیکے متعلق بیہودہ استدلال [۳۱۱]

معوذتین پڑھا کرتے تھے۔

سورۃ اعلیٰ کا تعلق پہلی سورۃ سے

اِس سورۃ کا تعلق پہلی سورۃ سے بحرِ محیط کے مصنف تو یہ بتاتے ہیں کہ پہلی سورۃ میں ذکر تھا کہ انسان کی پیدائش اِس اِس طرح ہوئی ہے۔ اِس کا جواب کہ اُسے اِس طرح کس نے پیدا کیا ہے سورۃ الاعلیٰ میں دیا گیا ہے کہ اسے ربّ الاعلےٰ نے پیدا کیا ہے لیکن میرے نزدیک اِس سورۃ کا پہلی سورۃ سے تعلق یہ ہے کہ اُس سورۃ میں یہ مضمون بیان کیا گیا تھا کہ آنیوالا موعود جہاں یہ خصوصیت رکھتا ہوگا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نُور کو اپنے اندر جذب کر کے اُسے دوسرے لوگوں تک پہنچائے یعنی اُس کی حیثیت بدر کی سی ہوگی اور وہ چودھویں کے چاند کی طرح دُنیا میں اسلامی نور کو پھیلائے گا وہاں وہ طارق بھی ہوگا۔ طارق کہتے ہیں صبح کے ستارے کو اور صبح کا ستارہ سورج کے طلوع کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ اُس کے ذریعہ سے لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھیں گے بلکہ اُس پر ایمان لانے کی وجہ سے بنی نوعِ انسان کو ذاتی طور پر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ایسا تعلق پیدا ہو جائے گا کہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے انوار اور آپؐ کی برکات کو اپنے نفوس میں بھی دیکھنے لگ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والے موعود کے دو نام رکھے گئے تھے۔ ایک مسیح جو اُس کے بدر ہونے کی علامت ہے اور دوسرا مہدیؑ جو اُس کے طارق ہونے کی علامت ہے۔ یہ دو نام اُس کے دو مختلف کاموں کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نور اپنے اندر جذب کر کے لوگوں تک پہنچائے گا اور پھر لوگوں میں ایسی استعداد پیدا کرے گا کہ اُن کے تعلقات براہِ راست رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہو جائیں گے۔ پس وہ اپنے ایک کام کے لحاظ سے بدر ہوگا اور دوسرے کام کے لحاظ سے طارق ہوگا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو کامل نبی ہیں اور آپؐ پر وہ کلام نازل ہو چکا ہے جو آخری اور قطعی کلام ہے جیسا کہ پہلی سورۃ میں بھی بتایا گیا ہے کہ اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جو کلام نازل ہوا ہے وہ قولِ فصل ہے اور قولِ فصل کے معنے ہوتے ہیں وہ کلام جو باقی تمام چیزوں کو قطع کر دیتا ہے یعنی ایسا کلام جو سب سے اعلیٰ اور فائق ہو وہ قولِ فصل کہلاتا ہے۔ اسی طرح اس کے یہ بھی معنے ہوتے ہیں کہ وہ کلام جس کے بعد کسی اور کلام کی ضرورت نہیں رہتی۔ جیسے قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کی نسبت آتا ہے وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ؕ (صٓ ع ۲) یہاں فصل الخطاب کے معنے یہی ہیں کہ اُس کا فیصلہ آخری تھا۔ پس فصل کے معنے ہوئے وہ آخری اور کامل کلام جس کے بعد کسی اور کلام کی ضرورت نہیں رہتی۔ اِن معنوں کے لحاظ سے سوال پیدا ہوتا تھا کہ قرآن کریم جب قولِ فصل ہے یعنی آخری اور کامل کلام ہے جس کے بعد کسی اور کلام کی ضرورت نہیں رہتی تو پھر آنے والے موعود کی کیا ضرورت ہے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی قولِ فصل ہے اور آپؐ پر نازل شدہ شریعت اِس قدر کامل ہے کہ اس کے بعد کسی اور شریعت کی دُنیا کو ضرورت نہیں تو پھر آپؐ کے بعد کسی اور الہام کی کیا ضرورت ہوئی۔ پھر ساتھ ہی اللہ تعالےٰ نے فرما دیا تھا کہ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ یہ شریعت کمزور ہونے والی نہیں۔ هَزْلٌ کے معنے ضعیف اور ناطاقت اور کمزور اور ناکارہ کے ہوتے ہیں اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ کے معنے تو یہ تھے کہ یہ ایسا کلام ہے جس کے بعد کسی اور کلام کی ضرورت نہیں۔ اپنی ذات میں یہ کامل کلام ہے لیکن کامل تعلیم بھی چونکہ بعض دفعہ مٹ جایا کرتی ہے اِس لئے ساتھ ہی اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ یہ ضعیف اور ناکارہ ہونے والا کلام نہیں کہ تم یہ شبہ کر سکو کہ شاید یہ کلام بھی کسی دن مٹ جائے گا۔ اگر محض قولِ فصل تک بات کو ختم کر دیا جاتا تو اِس شبہ کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ بعض کلام قولِ فصل تو ہوتے ہیں مگر بوجہ وقتی ہونے کے کچھ

عرصہ کے بعد مٹ جاتے ہیں جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اٰتَیْنٰهُ الْحِکْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ ہم نے اُسے حکمت اور فصل الخطاب دیا مگر اس کے باوجود وہ کلام مٹ گیا پس قولِ فصل سے یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ قرآن کریم وقتی طور پر قولِ فصل ہے یا ہمیشہ کے لئے قولِ فصل ہے بلکہ یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ آخری کلام کے معنے یہ کیوں نہ سمجھ لئے جائیں کہ قرآن کریم صرف اپنے زمانہ کے لئے کامل تھا اور بوجہ سابق کتب کو منسوخ کر دینے کے اُس وقت کے لئے آخری تھا جیسا کہ بہائی کہتے ہیں۔ جب نئی ضرورتیں پیدا ہوں گی اُس وقت کوئی نئی کتاب آجائے گی۔ اِس شبہ کا ازالہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ یہ ضعیف اور ناکارہ ہونیوالا کلام نہیں۔ اِس کی ضرورت دُنیا سے کبھی محو نہیں ہوگی اور یہ کتاب کبھی مٹ نہیں سکے گی۔ پس مَا هُوَ بِالْهَزْلِ نے بتا دیا کہ یہ کلام وقتی طور پر فصل نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے قولِ فصل ہے۔ اور جب یہ کلام آخری کلام ہے۔ کامل کلام ہے اور ساتھ ہی کمزور ہونے والا نہیں تو سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ اس کلام کی موجودگی میں کسی اور کلام کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ کتاب کامل بھی ہے اور یہ کتاب کمزور بھی کبھی نہیں ہوگی تو پھر کسی اور کلام یا کسی اور مدعیٔ الہام کی کیا ضرورت ہوئی۔

اِسی طرح پہلی سورۃ میں بتایا گیا تھا کہ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ انسان کی پیدائش مَآءٍ دَافِقٍ یعنی اُچھلنے والے پانی سے ہوئی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ صرف مَآء کا لفظ بھی استعمال فرما سکتا تھا جیسے بعض دوسرے مقامات پر انسانی پیدائش کے متعلق صرف مَآء کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ دَافِقٍ کا لفظ اس کے ساتھ استعمال نہیں ہوا۔ مگر یہاں اللہ تعالیٰ نے بجائے مَآء کا لفظ استعمال کرنے کے مَآءٍ دَافِقٍ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ درحقیقت اِن الفاظ کے ذریعہ اِس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح ظاہری طور پر نُطفہ میں دفق کی خاصیت ہوتی ہے اور وہ اُچھل کر باہر نکلتا ہے اِسی طرح باطن میں بھی انسان کے اندر اُچھلنے کُودنے کی خاصیت رکھی گئی ہے۔ گویا اس کی ظاہری پیدائش سے اس کی باطنی پیدائش ملتی جُلتی ہے جس طرح ظاہر میں وہ اُچھلنے والے مادہ سے پیدا ہُوا ہے اسی طرح روحانی طور پر بھی اس میں اُچھال پیدا ہوتا ہے اور اس پر ترقی کے مختلف دَور آتے ہیں۔ وہ بڑھتا ہے گھٹتا ہے۔ بڑھتا ہے گھٹتا ہے۔ بڑھتا ہے گھٹتا ہے۔ یہ قول بھی اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ سے ٹکراتا تھا اور سوال پیدا ہوتا تھا کہ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ میں تو اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ انسانی پیدائش اُچھلنے والے پانی سے ہوئی ہے جس کے معنے یہ تھے کہ انسان کی روحانی پیدائش بھی اُچھلنے والے مادہ سے ہے اور اُس پر ترقی اور تنزّل کے مختلف دَور آتے ہیں۔ مگر یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن قولِ فصل ہے۔ جب یہ قولِ فصل ہے تو پھر بڑھنے اور گھٹنے کے کیا معنے ہوئے۔ اِس کلام کے نزول کے بعد انسان کو ہمیشہ بڑھنا ہی چاہیئے گھٹنا نہیں چاہیئے۔

سورۃ اعلیٰ میں ان باتوں کا ذکر کہ قرآن مجید کی موجودگی میں اور الہام کی کیا ضرورت ہے

مگر اُدھر تو تم بتا رہے ہو کہ جس طرح انسان ظاہر میں مَآءٍ دَافِقٍ سے پیدا ہوا ہے اسی طرح باطن میں بھی مَآءٍ دَافِقٍ سے پیدا ہُوا ہے۔ ایک رَو ہے جو اُس کے اندر پائی جاتی ہے کبھی وہ رَو ترقی کی طرف چلی جاتی ہے اور کبھی تنزّل کی طرف۔ اُچھلنے والی چیز کے معنے یہی ہوتے ہیں کہ وہ کبھی گرتی ہے کبھی اُچھلتی ہے کبھی اُوپر کی طرف چلی جاتی ہے اور کبھی نیچے کی طرف چلی جاتی ہے۔ پس مَآءٍ دَافِقٍ میں یہ اشارہ کیا گیا تھا کہ بنی نوعِ انسان کی پیدائش ایسے رنگ میں ہوئی ہے کہ کبھی قوم آگے کی طرف بڑھ جاتی ہے کبھی پیچھے کی طرف اپنا قدم ہٹا لیتی ہے کبھی ترقی کی طرف اپنا قدم بڑھا لیتی ہے کبھی تنزّل میں گر جاتی ہے۔ گویا انسانی پیدائش دفق کا رنگ اپنے اندر رکھتی ہے اور مختلف ویوز WAVES اور لہریں ہیں جو اُس کے اندر پائی جاتی ہیں لیکن دوسری

طرف بتلایا جاتا ہے کہ یہ قولِ فصل ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ قولِ فصل کے بعد یہ لہر پیچھے کی طرف نہیں جا سکتی۔ جب قولِ فصل کے بعد یہ رَو پیچھے کی طرف نہیں جا سکتی تو پھر خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ کا کیا مفہوم ہوُا۔ اگر اس کے بعد انسانی زندگی میں دفق نہیں پایا جائے گا تو قرآن کریم کی یہ آیت غلط ٹھہرتی ہے۔ اور اگر اُس میں دفق پایا جائے گا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آئندہ دفق کس رنگ میں ہوگا۔

جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ اور اِنَّهٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ کی آیات سے جو سوالات پیدا ہوتے تھے اُن کا اِس سورت میں جواب دیا گیا ہے۔ پھر اِنَّهٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ کے متعلق یہ سوال بھی پیدا ہوتا تھا کہ ابتدائے عالم سے اب تک دُنیا میں کئی انبیاء گذر چکے ہیں اُن میں سے کسی نبی پر پہلے یہ قولِ فصل کیوں نازل نہیں ہوُا اور کیوں اب قولِ فصل نازل ہوُا ہے۔ گویا جہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قولِ فصل کے بعد کسی موعود کی کیا ضرورت ہے وہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ قولِ فصل کا نزول اگر بنی نوع انسان برداشت کر سکتے ہیں تو یہ قولِ فصل پہلے کیوں نہ نازل کر دیا گیا اور اب کیوں نازل کیا گیا ہے۔ غرض دو سوال قولِ فصل سے اور ایک سوال خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ سے پیدا ہوتا تھا اِس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اِن سوالات کا جواب دیا ہے اور لوگوں کو بتاتا ہے کہ قانونِ قدرت سے یہ دونوں امور ظاہر ہیں کہ بعض اشیاء عارضی فوائد کے لئے پیدا کی جاتی ہیں اور بعض اشیاء لمبے فوائد کے لئے پیدا کی جاتی ہیں۔ جو اشیاء عارضی اغراض کے لئے پیدا کی جاتی ہیں اُن کی زندگی بہت تھوڑی ہوتی ہے لیکن جو اشیاء انتہائی کمال کے اظہار کے لئے پیدا کی جاتی ہیں اُن کی زندگی بہت لمبی ہوتی ہے یا اُن کا جسمانی ارتقاء بند ہو جاتا ہے۔

خلق کے لحاظ سے اِس سورۃ کا پہلی سورۃ سے ایک تعلق ہے اور وہ یوں کہ پہلی سورۃ میں انسانی پیدائش کا ذکر کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ اُس کی ترقی تدریجی ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۃ طارق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا يَخۡرُجُ مِنۡۢ بَيۡنِ الصُّلۡبِ وَالتَّرَآئِبِ وہ پہلے صُلب میں سے آتا ہے اور پھر ترائب اُس کو ترقی دیتے ہیں۔ یعنی پہلے باپ کے جسم میں نُطفہ بنتا ہے۔ پھر ماں کے رحم میں اُس نُطفہ کی پرورش ہوتی ہے اور پھر پیدائش کے بعد ماں کی چھاتیوں سے وہ غذا حاصل کر کے آہستہ آہستہ نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ گویا انسانی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے اُس کی تدریجی ترقی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اِس سورۃ میں اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ جس طرح انسان کی ظاہری ترقی تدریجی ہوتی ہے اسی طرح اس کی روحانی ترقی بھی تدریجی ہوتی ہے۔ یوں تو انسان ایک ہی قسم کے قویٰ لے کر پیدا ہوُا ہے مگر تجربہ کی مدد سے انسانی دماغ مزید نشو و نما پاتا جاتا ہے۔ گویا جس طرح انسان کی جسمانی پیدائش تدریجی رنگ میں ہوتی ہے اسی طرح اس کی روحانی پیدائش بھی تدریجی رنگ میں ہوتی ہے۔ اور جس طرح فرد کی پیدائش تدریجی منازل کو طے کرنے کے بعد ہوتی ہے اسی طرح قوم کی پیدائش بھی تدریجی منازل کو طے کرنے کے بعد ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ قومی دماغ ترقی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر زمانہ کے لحاظ سے ہدایت آتی رہی ہے مگر جس طرح سبزیاں اور ترکاریاں ضروری تو ہیں مگر انکی ضرورت کا زمانہ تھوڑا ہوتا ہے پس وہ جلد فنا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ شرائع بھی ضائع ہوتی رہیں لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی ضرورت عارضی نہیں بلکہ مستقل ہوتی ہے۔ وہ جب سے پیدا ہوئی ہیں اسی رنگ میں چلتی چلی جاتی ہیں۔ مثلاً سورج ہے یہ جب سے پیدا ہوُا ہے اُس وقت سے لیکر اب تک اسی صورت میں چلا جا رہا ہے یہ نہیں ہوتا کہ ایک سورج ہٹ جائے تو اُسکی جگہ دوسرا سورج پیدا ہو جائے یا مثلاً چاند ہے جب سے یہ پیدا ہوُا ہے اُس وقت سے لیکر اب تک قائم چلا آ رہا ہے۔ غرض مخلوق کے دائرہ میں جہاں بعض

اشیاء ایسی ہیں جن پر تباہی آئی اور وہ مٹ گئیں لیکن بعض اشیاء ایسی بھی ہیں جن پر تباہی نہیں آئی۔ چنانچہ مسئلۂ ارتقاء کے ماتحت محققین نے یہ تسلیم کیا ہے کہ بعض ناقص پیدائشیں بالکل معدوم ہو گئی ہیں۔ مگر جب انسان پیدا ہو گیا تو یہ ارتقائی تغیر بند ہو گیا۔ پس محض اس بات پر اپنے اعتراض کی بنیاد رکھنا کہ جو چیز پیدا کی گئی ہے اُسے فنا نہیں ہونا چاہیئے بالکل غلط اور باطل اصول ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے کئی چیزیں پیدا کی جاتی ہیں وہ ضروری اور فائدہ بخش بھی ہوتی ہیں۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد وہ فنا بھی ہو جاتی ہیں کیونکہ زمانہ تبدیل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں دُنیا کو اُن چیزوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر اس پر پھر ایک اور سوال پیدا ہوتا تھا اور وہ یہ کہ تمہارے پاس اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ قرآن کبھی منسوخ نہیں ہوگا۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ تورات آئی۔ وہ اپنے زمانہ کے لئے نہایت ضروری کتاب تھی مگر کچھ عرصہ کے بعد منسوخ ہو گئی۔ پھر کیوں نہ قرآن کریم کے متعلق بھی یہی بات تسلیم کر لی جائے کہ بے شک یہ ضروری ہے مگر صرف اپنے زمانہ کے لئے۔ ہمیشہ کے لئے نہیں۔ چنانچہ بہائی یہی کہتے ہیں کہ جب باقی شریعتیں منسوخ ہو گئیں تو تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ قرآن کبھی منسوخ نہیں ہوگا۔ اِس سوال کا بھی اللہ تعالیٰ نے اِس سورۃ میں جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہم تمہارے سامنے اِس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ کیوں پہلی شریعتیں منسوخ ہوئیں اور کیا دلیل ہے اِس بات پر کہ قرآن کبھی منسوخ نہیں ہوگا۔

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ جن سورتوں میں مسیح موعودؑ کا ذکر آتا ہے اُن میں تسبیح کا خاص طور پر ذکر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح موعودؑ کے ساتھ تسبیح کا کوئی خاص جوڑ ہے۔ یہ تو نہیں کہ جہاں بھی مسیح موعودؑ کا ذکر آیا ہو وہاں تسبیح کا بھی ذکر ہو بلکہ وہ سورتیں جن میں خصوصیت کے ساتھ مسیح موعودؑ کا ذکر کیا گیا ہے اُن سورتوں میں تسبیح کا بھی خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ مسیح موعودؑ کا خاص طور پر ذکر سورۃ صف۔ سورۃ جمعہ اور سورۃ الاعلیٰ میں آتا ہے۔ بعض اور سورتیں بھی ہیں جن میں مسیح موعودؑ کا ذکر آتا ہے جیسے اِس سے پہلی تین چار سورتوں کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے لیکن اِن تین سورتوں میں خصوصیت کے ساتھ مسیح موعودؑ کا ذکر آتا ہے۔ اِن میں سے سورۃ صف کو سَبَّحَ سے شروع کیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۝ پھر سورۃ جمعہ کو يُسَبِّحُ سے شروع کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۝ اور سورۃ الاعلیٰ کو سَبِّحْ سے شروع کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى۝ گویا تینوں افعال کا استعمال کیا گیا ہے۔ ماضی، مستقبل اور امر۔ سَبَّحَ خاص ماضی پر دلالت کرتا ہے۔ يُسَبِّحُ حال اور استقبال دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ مضارع کے معنوں میں حال کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور استقبال کا بھی۔ اور امر ہمیشہ استقبال کے متعلق ہوتا ہے۔ جب ہم کسی کو کہتے ہیں تو ایسا کر تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو اِس وقت نہیں کر رہا بلکہ ہمارے کہنے کے بعد کرے گا۔ پس امر ہمیشہ استقبال کے زمانہ پر دلالت کرتا ہے۔ پس اِن تین صیغوں یعنے ماضی مضارع اور امر کو استعمال کر کے تینوں زمانوں کی تسبیح مسیح موعودؑ کے ذکر میں بیان کی گئی ہے یعنی تینوں قسم کی تسبیحیں اُس کے زمانہ میں ہوں گی۔ ماضی کی بھی۔ حال کی بھی اور استقبال کی بھی۔ یہ ایک علیحدہ

(حاشیہ: ٢١١ آخری موعود کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی تین قسم کی تسبیحیں)

# بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)۔

# سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ○

(اے خاتم النبیین) اپنے بزرگ (و برتر) رب کے نام کا بے عیب ہونا بیان کر ۲؎

مضمون ہے جس کو تفصیلی طور پر یہاں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مَیں نے صرف اشارہ کر دیا ہے کہ اِن تینوں سورتوں میں تین افعال استعمال کئے گئے ہیں اور اِس طرح مسیح موعود کے ذریعہ سے تسبیح کی تکمیل کا وعدہ کیا گیا ہے۔

سَبِّحْ

**۲؎ حل لغات**:۔ سَبِّحْ امر کا صیغہ ہے اور سَبَّحَہٗ کے معنے ہوتے ہیں اُس نے اُسے نقص سے پاک قرار دیا (اقرب) پس سَبِّحْ کے معنے ہوئے نقص سے پاک قرار دے۔ رَبٌّ کے معنے ہوتے ہیں وہ ذات جو تدریجی طور پر ترقی دیتے ہوئے کمال تک پہنچاتی ہے۔ گویا پیدا کرنا اور پھر تدریجی طور پر ترقی دیتے ہوئے کمال تک پہنچانا یہ سب کچھ ربّ کے مفہوم میں شامل ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى میں اعلیٰ لانے کی وجہ

**تفسیر**۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى کے معنے ہیں تُو تسبیح کر اپنے رب کے نام کی جو اعلیٰ ہے یا اپنے رب کے اعلیٰ نام کی تسبیح کر۔ یہاں اعلیٰ صفتِ رب بھی ہوسکتا ہے اور صفتِ اسم بھی یعنی یہ بھی معنے ہوسکتے ہیں کہ اپنے رب کے اسم کی جو اعلیٰ ہے تسبیح بیان کر اور یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ اپنے اعلیٰ رب کے نام کی تسبیح بیان کر۔ رب کی صفت قرار دینے کی صورت میں اِس کے یہ معنے ہوں گے کہ تیرا رب جو اعلیٰ ہے یعنی تیرا رب جس کی ربوبیّت سب سے بلند اور ارفع شان رکھتی ہے اُس کی تسبیح بیان کر۔ اور اسم کی صفت ہونے کی صورت میں آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ تُو اپنے رب کے سب سے بلند نام کی تسبیح کر اور مطلب یہ ہوگا کہ تُو اپنے رب کا نام دُنیا میں بلند کر۔

بات یہ ہے کہ ربوبیّت کے لحاظ سے کئی لوگ خدا تعالیٰ کے شریک ہوتے ہیں جیسے ماں باپ ہیں کہ وہ بھی ایک قسم کے رب ہوتے ہیں کیونکہ بچوں کی ربوبیّت کرتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم میں رب کا لفظ غیر اللہ کی نسبت بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس طرح تسلیم کیا گیا ہے کہ اور لوگوں کو بھی نام کے لحاظ سے خدا تعالیٰ کی اِس صفت میں اشتراک حاصل ہے۔ چنانچہ ماں باپ ایک قسم کے رب ہوتے ہیں کیونکہ وہ بچوں کی ربوبیّت کرتے ہیں۔ استاد بھی ایک قسم کا رب ہوتا ہے۔ مذہبی پیشوا بھی ایک قسم کا رب ہوتا ہے۔ اسی طرح محسن انسان بھی ایک قسم کا رب ہوتا ہے۔ اور یہ سب اپنے اپنے دائرہ میں دوسروں کی ربوبیّت کرتے ہیں۔ پس چونکہ اور لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیّت میں شریک ہوتے ہیں اِس لئے یہاں صرف رب کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا بلکہ رب کے ساتھ اعلیٰ کا بطور صفت ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ گو اور لوگوں کو بھی نام کے لحاظ سے اِس صفت میں اشتراک حاصل ہوتا ہے مگر تیرا رب وہ ہے جو اعلیٰ ہے اور دوسروں کے رب وہ ہیں جو ادنیٰ ہیں۔ اُن کی ربوبیّتیں سخت ناقص ہوتی ہیں مگر خدا تعالیٰ کی ربوبیّت ہر لحاظ سے کامل ہوتی ہے۔ پس سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى فرما کر حکم دیا کہ خدا تعالیٰ کی ربوبیّت پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں اُن کو تُو دُور کر کیونکہ فعل میں ایک ناقص اشتراک ہونے کی وجہ سے دوسری ناقص ربوبیّتوں کو دیکھتے ہوئے جو اعتراضات پیدا ہوتے ہیں لوگ اُن کو خدا تعالیٰ کی طرف بھی منسوب کر دیتے ہیں یا سمجھ لیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بھی ایسا ہی کرتا ہوگا۔ پس اشتراکِ نام سے جو اشتباہ پیدا ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کی نسبت غلط

خیالات لوگوں میں پھیل جاتے ہیں تو اُن کو دُور کر جیسے ناقص تربیت کرنے والا استاد گو مربی ہوتا ہے مگر بعض دفعہ بجائے مفید ہونے کے اُس کی تربیت کئی قسم کے نقائص پیدا کرنے کا موجب بن جاتی ہے۔ یا ماں باپ کھانا کھلاتے ہیں۔ پانی پلاتے ہیں۔ کپڑے پہناتے ہیں۔ ہر قسم کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں مگر بعض دفعہ لاڈ اور چاؤ میں بچوں کے اخلاق بگاڑ دیتے ہیں۔ پس بے شک وہ بھی رب ہیں مگر اُن کی ربوبیت بعض دفعہ ناقص ثابت ہوتی ہے اور انسان بجائے فائدہ اُٹھانے کے کئی قسم کی خرابیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر فرماتا ہے ہماری ربوبیت میں کسی قسم کا نقص نہیں اس لئے تُو لوگوں کو بتا کہ بے شک ربوبیت کے نام میں لوگ خدا تعالیٰ کے شریک ہو جاتے ہیں لیکن جس خدا کو میں پیش کرتا ہوں وہ اعلیٰ ہے اُس کی ربوبیت کے کسی شعبہ میں بھی نقص نہیں پایا جاتا۔ وہ اگر تعلیم دیتا ہے تو غیر ناقص تعلیم دیتا ہے۔ سامان مہیا کرتا ہے تو ایسے سامان ہی مہیا کرتا ہے جو ضروری ہوتے ہیں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اُس کی ربوبیت ناقص ہو۔ جن سامانوں کی ضرورت ہو وہ مہیا نہ کرے یا جن سامانوں کی ضرورت نہ ہو اُن کو مہیا کر دے۔ ماں باپ کی تربیت میں یہ نقص ہوتا ہے کہ وہ بعض دفعہ صحیح ضرورت کو نہیں پہچانتے۔ ایسے وقت میں غذا دے دیتے ہیں جب غذا دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یا اُس وقت بچے کو غذا نہیں دیتے جب اُسے غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچے زیادہ تر اسی لئے بیمار ہوتے ہیں کہ ماں باپ اُن کی غور و پرداخت اور پرورش میں غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ بعض دفعہ بچے کو دُودھ کی ضرورت ہوتی ہے مگر ماں اُسے دُودھ نہیں پلاتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کمزور اور نحیف ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ اُسے دُودھ کی ضرورت نہیں ہوتی مگر ذرا سا رونے پر وہ اُسے دُودھ پلانا شروع کر دیتی ہے جس سے اُس کے معدہ میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں یا بعض دفعہ بچہ ایسی عمر کو پہنچ جاتا ہے جب اُسے ٹھوس غذا کھلانی چاہیئے مگر ماں اُسے

دُودھ ہی پلاتی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ بھی کمزور ہو جاتی ہے اور بچہ بھی ٹھوس غذا کو ہضم کرنے کی قوت کو کھو بیٹھتا ہے۔ دودھ ہمیشہ کے لئے غذا نہیں بلکہ صرف ایک وقت تک کے لئے غذا ہے۔ اگر اُس وقت کے گذرنے کے بعد بھی بچے کو دُودھ پلایا جائے تو اُس کے معدہ میں اِس قسم کی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ٹھوس غذا ہضم نہیں کر سکتا۔ اُسے سیّال غذا کی ہی عادت رہتی ہے۔ ذرا ٹھوس غذا اندر جائے تو اسہال شروع ہو جاتے ہیں۔ بڑوں کو دیکھ لو۔ جب کوئی بیمار ہو اور دس پندرہ دن دُودھ یا چاول استعمال کرتا رہے تو اس کے بعد جب وہ روٹی کھانا شروع کرتا ہے تو ابتدا میں اُسے بدہضمی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سیّال غذا استعمال کرنے کی وجہ سے معدہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح دُودھ بیشک ایک اچھی غذا ہے مگر بچے کے لئے خدا تعالیٰ نے ڈیڑھ دو سال تک ہی اِسے غذا بنایا ہے اگر بعد میں بھی دُودھ جاری رکھا جائے جیسا کہ نادان محبت کرنے والی مائیں بعض دفعہ تین تین چار چار یا پانچ پانچ بلکہ سات سات سال تک دُودھ پلاتی چلی جاتی ہیں تو اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوّل تو دُودھ خراب ہو جاتا ہے اور وہ بچے کو بیمار کر دیتا ہے دوسرے اُس کے معدے کو سخت غذائیں ہضم کرنے کی عادت نہیں پڑتی اور اُس کا معدہ ہمیشہ کے لئے کمزور ہو جاتا ہے۔ جس طرح بڑی عمر کے آدمی کو اگر ٹھوس غذا نہ ملے تو وہ کمزور ہو جاتا ہے اِسی طرح بچے کو جب ٹھوس غذا کی ضرورت ہو اگر دُودھ پر ہی رکھا جائے تو وہ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ مگر بعض عورتوں کو دیکھا گیا ہے وہ کئی کئی سال تک نادان محبت کے جوش میں بچے کو دودھ پلاتی جاتی ہیں اور جب پوچھا جائے کہ کیوں پلاتی ہو تو وہ کہدیتی ہیں کیا کریں یہ چھوڑتا ہی نہیں۔ اگر چھڑائیں تو رو پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی کمزور ہو جاتی ہیں اور بچہ بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ تو فرماتا ہے باقی رب کامل نہیں کبھی کسی چیز کی ضرورت کا موقع ہوگا تو وہ مہیا نہیں کریں گے۔ کبھی

موقع نہیں ہوگا تو مہیا کر دیں گے مگر خدا تعالیٰ ایسا نہیں اُس کی ربوبیت ہر قسم کے نقائص سے منزّہ اور پاک ہے۔

مَیں نے تمہید میں یہ بتایا تھا کہ پہلی سورۃ کی آیت اِنَّـهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ سے یہ اعتراض پیدا ہوتا تھا کہ خدا تعالیٰ نے شروع میں ہی کیوں قولِ فصل نازل نہیں کر دیا اِس کا جواب اِس آیت میں دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ ربّ ہے اس لئے وہ ضرورت اور تدریج کو ضرور مدّنظر رکھتا ہے۔ جب ایک ماں جو ناقص طور پر صفتِ ربوبیت کو ظاہر کرنے والی ہے شروع میں ہی اپنے بچّے کو روٹی نہیں کھلا دیتی اور صرف دُودھ پلاتی ہے پھر ہم غیر مناسب غذا کس طرح دے سکتے تھے۔ لیکن ماں تو پھر بھی کبھی غلطی کر جاتی ہے کبھی پیار سے بچّہ کو کباب یا بوٹی کھلا دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچّہ بیمار ہو کر مر جاتا ہے۔ لیکن فرماتا ہے ہم ایسے نہیں ہیں کہ محض جذباتی طور پر کامل شریعت اور قولِ فصل کو پہلے دن ہی نازل کر دیتے اور بنی نوعِ انسان کے دماغ کو فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچا دیتے۔ کیونکہ ہم ربّ ہی نہیں بلکہ ربِّ اعلیٰ ہیں۔ مثلاً آدمؑ کے وقت لوگوں کو پتہ ہی نہیں تھا کہ چوری کیا ہوتی ہے اُس وقت انسانوں کی کمی کی وجہ سے استعمال کرنے والی اشیاء با افراط تھیں۔ اور کسی چیز کی لوگوں کو احتیاج نہیں ہو سکتی تھی اُس وقت چوری کا خیال کسی کو آ ہی نہ سکتا تھا کیونکہ چوری کی رغبت کی ابتداء اُسی وقت ہوتی ہے جب انسان کو احتیاج محسوس ہوتی ہو۔ جب چیز کم ملے اور ضرورت زیادہ ہو لیکن آدمؑ کے وقت تو کسی چیز کی کمی کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چند گھرانے تھے جو دُنیا میں آباد تھے۔ اور ہر چیز ہر شخص کو بڑی کثرت سے مل سکتی تھی۔ اُس وقت اگر قرآن کریم نازل ہوتا اور کہتا کہ چوری نہ کرو تو لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے کہ چوری کیا ہوتی ہے۔ اِس پر اُنہیں بتایا جاتا کہ چوری یہ ہوتی ہے کہ کسی کا مال اُس کی اجازت کے بغیر جبکہ وہ دیکھ نہ رہا ہو اُٹھا لیا جائے اور اُسے اپنی ضرورت کے لئے استعمال کر لیا جائے۔

قرآن مجید کے آخری زمانے میں نازل کئے جانے کی وجہ

نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ چوری جو دُنیا میں ہزاروں سال کے بعد پیدا ہوئی وہ اُسی وقت پیدا ہو جاتی۔ یا اگر کہا جاتا بدکاری نہ کرو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اُسی وقت لوگ بدکاری کے بارہ میں سوال کرتے اور اس کا علم حاصل کر کے کئی کمزور انسان صرف تجربہ کرنے کے لئے اور اس کا مزا اٹھانے کے لئے بدکاری کو رواج دینے لگتے۔

بدکاری کا احساس بھی آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے۔ ابتداء میں انسان اِس قسم کا فعل کرنے سے ڈرتا ہے وہ سمجھتا ہے اگر مَیں نے ایسا کیا تو یہ بہت بُری بات ہوگی مگر کچھ عرصہ کے بعد جب وہ دیکھتا ہے کہ فلاں شخص نے یہ جُرم کیا تھا مگر اُس کا کوئی بُرا حال نہیں ہؤا تو اس کے دل میں بھی اِس جُرم کے متعلق دلیری پیدا ہو جاتی ہے۔ روحانی سزا تو لوگوں کو نظر نہیں آتی اور قیامت کے دن پر ایمان بھی بہت کم لوگوں کے دلوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ اگر بدی سے بچتے ہیں تو اسی لئے کہ دُنیا میں اِس کا بُرا نتیجہ اُنہیں بھگتنا نہ پڑے مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ فلاں نے یہ فعل کیا اور اُسے کوئی نقصان نہیں ہؤا تو اُن کو بھی شوق پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم بھی یہ فعل کر کے دیکھیں۔ پس اگر آدمؑ کے وقت ہی یہ کہہ دیا جاتا کہ بدکاری نہ کرو تو نتیجہ یہ ہوتا کہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے کہ بدکاری کیا ہوتی ہے اور جب اُنہیں پتہ لگتا تو یہ گناہ کمزور لوگوں میں پیدا ہو جاتا۔ یا مثلاً قتل ہے۔ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ ابناءِ آدمؑ میں کسی وقت قتل کا خیال پیدا ہؤا۔ اِس سے یہ مراد نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے اپنے بیٹوں میں یہ خیال پیدا ہؤا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ابناءِ آدمؑ میں سے کسی نے ایک دفعہ انتہائی غصّہ کی حالت میں دوسرے کو پتھر مارا تو وہ مر گیا۔ اِس واقعہ سے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ بھی بدلہ لینے کا ایک ذریعہ ہے ورنہ اس سے پہلے دُنیا میں قتل نہیں تھا بلکہ بعض قومیں اب بھی دُنیا میں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں قتل نہیں ہے۔ پس اُس وقت جب قتل کی طرف کسی کا ذہن منتقل ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ جب چوری کی طرف

کسی کا ذہن منتقل ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ جب بدکاری کی طرف کسی کا ذہن منتقل ہی نہیں ہو سکتا تھا اگر شریعتِ کامل نازل ہو جاتی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کہا جاتا کہ قتل نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔ بدکاری نہ کرو تو وہ جرائم جن کی بُنیاد سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال بعد جا کر پڑی اور جن جرائم سے ہزاروں سال تک لوگ بچے چلے آئے تھے اُن کی بُنیاد اسی وقت پڑ جاتی اور اگر ان امور کے متعلق کچھ بیان نہ ہوتا تو آئندہ زمانہ میں جب اِن گناہوں کا لوگوں میں رواج پڑتا، وہ شریعت ناقص ہو جاتی اور لوگوں کی ضرورت کو پُورا نہ کر سکتی۔

قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ بعض جرائم حضرت شعیبؑ کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ بعض جرائم حضرت لوطؑ کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ اور بعض جرائم اور انبیاءؑ کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ اگر یہ سارے جرائم آدمؑ کے وقت بتا دیئے جاتے تو اِس کے معنے یہ تھے کہ ہزاروں سال پہلے لوگوں کو اِن جرائم کی طرف توجہ دلا دی جاتی اور یہ اُن کی ترقی کے لئے خطرناک طور پر مُضر ہوتا۔ گویا یہ ایسی ہی بات ہوتی جیسے ماں اپنے بچہ کو کباب کھلانے لگ جائے یا اُسے روٹی کھلا دے۔ وہ بچہ جس کی عمر کا تقاضا یہ ہے کہ اُسے صرف دُودھ پلایا جائے۔ اگر اُسے روٹی دی جائیگی یا اُسے کباب کھلائے جائیں گے تو اِس کا نتیجہ سوائے اس کے کیا ہو گا کہ وہ مر جائے گا۔ پس فرماتا ہے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى۔ اگر لوگ کہیں کہ پہلے کیوں قولِ فصل نازل نہیں ہوا تو تُو انہیں کہدے کہ میرا رب اعلیٰ ہے۔ سارے بچوں کو ایک وقت میں ایک ہی قسم کی چیز دیا کرکے دینا ناقص ربّوں کا کام ہے لیکن کامل رب اُسی وقت کوئی چیز دیتا ہے جب اُس کی حقیقی ضرورت ہوتی ہے اور اُتنی ہی دیتا ہے جتنی ضروری ہوتی ہے اسی لئے پہلے زمانہ میں قولِ فصل نازل نہیں ہوا کیونکہ قولِ فصل کے معنے ہیں ایسی کتاب جو جامع ہو۔ جو ہر قسم کی ضروریات پر حاوی ہو اور جس کے بعد کسی اور شرعی کلام کی ضرورت نہ ہو۔ اگر ایسی جامع شریعت ابتداء میں ہی نازل کر دی جاتی تو پیدائشِ انسانی کے ساتھ ہی سارے جرائم کی بُنیاد رکھ دی جاتی اور انسانی نسل تباہ ہو جاتی۔ بے شک سابق شرائع میں بھی بدیوں سے روکا گیا ہے مگر ہر شریعت میں بدیوں سے اُسی وقت روکنے کا حکم نازل ہوا جب پہلے شیطانی لوگوں نے آہستہ آہستہ اُن بدیوں کو ایجاد کر لیا۔ ورنہ پہلی شریعت کی بُنیاد صرف فطرت پر رکھی گئی تھی پھر آہستہ آہستہ فطرت شریعتِ الہامیہ کی طرف منتقل ہوتی چلی گئی۔ جب انسان نے کسی قانونِ فطرت کو توڑا تو اس کے بعد الہامی کلام میں اُس کا ذکر کر دیا گیا۔ یہ نہیں ہوا کہ بدی کی ایجاد سے پہلے الٰہی کلام میں کسی بدی کا ذکر کر دیا گیا ہو۔ اگر ابتداء میں ہی کامل شریعت کے نزول کے ساتھ ہر قسم کی بدیوں کا ذکر کر دیا جاتا تو وہ جرائم جو ہزاروں سال بعد پیدا ہوئے اُن کی بُنیاد اُسی وقت پڑ جاتی اور دُنیا اخلاقی اور روحانی اعتبار سے تباہ ہو جاتی۔

پھر بعض ربوبیتیں ایسی ہوتی ہیں جو خود غرضی کے ماتحت ہوتی ہیں۔ انسان خوشامد کے لئے یا جھُوٹی نیک نامی حاصل کرنے کے لئے دوسرے سے معاملہ کرتا ہے مگر خدا تعالیٰ ایسا نہیں کرتا۔ یا انسان بعض دفعہ بے موقع اور بے محل کام کر دیتا ہے مگر خدا کی ربوبیت میں کوئی نقص نہیں پایا جاتا۔ یہی مضمون ہے جو اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ تیرے رب کی ربوبیت ایسی نہیں جو اپنے اندر کسی قسم کا نقص رکھتی ہو۔ پس گو نام کے لحاظ سے صفاتِ الٰہیہ میں دوسروں کو بھی ناقص طور پر اشتراک حاصل ہے مگر حقیقتاً صفاتِ الٰہیہ دوسروں کی صفات سے بالکل مغائر ہیں۔ جیسے رب ہونے کے لحاظ سے لوگوں کو ایک قسم کا اشتراک حاصل ہے یا رحیم ہونے یا عالم ہونے یا مالک ہونے میں بھی وہ اِن ناموں میں مشترک ہوتے ہیں لیکن یہ اشتراک صرف ظاہر میں ہو گا۔ حقیقت دونوں کی جداگانہ ہو گی۔ ناموں میں اشتراک محض اسلئے

ہے کہ اس کے بغیر انسان خدا تعالےٰ کی صفات کو سمجھ نہیں سکتا تھا اِسی لئے خدا تعالےٰ کی صفت سے ملتا جُلتا نام اُس کا رکھ دیا ورنہ انسان کی صفت بالکل اور رنگ کی ہے اور خدا تعالےٰ کی صفت اور رنگ کی۔ یہ طریق صرف تقریبِ تفہیم کیلئے اختیار کیا گیا ہے ورنہ خدا تعالےٰ کی ربوبیت اور قسم کی ہے اور بندے کی ربوبیّت اور قسم کی۔ خدا کی رحیمیت اور قسم کی ہے اور بندے کی رحیمیّت اور قسم کی۔ خدا کی مالکیّت اور قسم کی ہے اور بندے کی مالکیت اور قسم کی۔ خدا اور بندے کا اگر بعض صفات کے لحاظ سے ایک قسم کا نام رکھا جاتا ہے تو اس لئے کہ بندہ خدا تعالےٰ کی صفات کو سمجھ سکے۔ اگر ہم انسان کو بھی مالک کہتے ہیں اور خدا کو بھی مالک کہتے ہیں تو اس کا مفہوم صرف اس قدر ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ میں جو مالکیت کی صفت پائی جاتی ہے اس سے ایک ناقص تشابہ انسان کو بھی حاصل ہے نہ کہ ویسی ہی صفت انسان کو حاصل ہے۔ کیونکہ بندے کی صفت ناقص ہوتی ہے اور خدا تعالےٰ کی صفت کامل ہوتی ہے پس فرمایا سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۔ تیرا رب جو اعلیٰ ہے یعنی اُس کی ربوبیّت سب دوسروں سے بلند اور ارفع ہے اُس کی تسبیح کر یعنی خدا تعالےٰ کے صفاتی اسماء میں شریک ہونے کی وجہ سے لوگوں کے بعض ناقص افعال کی بنا پر لوگ خدا تعالیٰ کی صفات کے متعلق بھی کئی قسم کے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ بندے اور خدا کے کام ایک جیسے ہیں۔ تو اِن شبہات کا ازالہ کر اور خدا تعالےٰ کی ربوبیت پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں اُنکو دُور کر۔ یہ ایک لطیف اور وسیع مضمون ہے کہ صفاتِ الٰہیہ کے ظاہری اشتراک سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔

دوسرے معنے اِس آیت کے یہ ہیں کہ اسم سے مراد ہر اسم یعنی اسماء ہیں اور مراد یہ ہے کہ تیرا رب جو اعلیٰ ہے اُس کے نام کی تسبیح کر یعنی سب سے زیادہ احسان تجھ پر تیرے رب کا ہے جس سے بڑھ کر اور کوئی ربوبیت نہیں کر سکتا جب اُس نے تجھ سے وہ سلوک کیا ہے جو اور کسی سے نہیں کیا تو اب تیرا بھی فرض ہے کہ جو شخص خدا تعالےٰ کی ذات پر کسی قسم کا اعتراض کرے تو اُس کے اعتراض کا ازالہ کر۔ یہ ظاہر ہے کہ خدا تعالےٰ کا تیرے ساتھ وہ معاملہ رہا ہے جس کی دُنیا میں اور کہیں نظیر نہیں ملتی اس لئے تُو ہی صحیح طور پر لوگوں کے شکوک کا ازالہ کر سکتا ہے کیونکہ جس نے خدا تعالےٰ کو دیکھا ہو وہی اُس کی صفات پر لوگوں کے اعتراضات کو رد کر سکتا ہے جس نے اپنی ذات میں خدائی صفات کا مشاہدہ ہی نہ کیا ہو وہ کسی کے اعتراض کا کیا ازالہ کر سکتا ہے۔ پس فرماتا ہے ربِّ اعلیٰ نے تیری خود ربوبیّت کی ہے اور تیرے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو دُنیا میں اور کسی سے نہیں کیا اس لئے اب یہ تیرا کام ہے کہ صفاتِ الٰہیہ میں سے ہر صفت پر جو اعتراضات لوگوں کی طرف سے وارد ہوتے ہیں اُن کو دُور کر۔ اور اُن کو بتا کہ خدائی صفات ہر قسم کے نقائص سے منزّہ ہیں۔



واقعات پر غور کر کے دیکھ لو۔ خدا تعالےٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے جیسا سلوک کیا ہے ویسا سلوک دُنیا میں اور کسی سے نہیں ہوا۔ اس لئے خدا تعالےٰ کی صفات کو جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سمجھ سکتے تھے۔ کوئی اور شخص نہیں سمجھ سکتا تھا۔ مثلاً خدا تعالےٰ کی مالکیت کی صفت لے لو۔ خدا نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے جس رنگ میں اپنی مالکیت کا اظہار کیا اُس رنگ میں ابو جہل کے لئے نہیں کیا۔ ابو جہل تو صرف خیالی طور پر سمجھتا تھا کہ چونکہ لوگ کہتے ہیں خدا مالک ہے اس لئے مَیں بھی سمجھتا ہوں کہ وہ مالک ہے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تو خدا تعالےٰ نے عملاً مالک بن کر دکھا دیا کہ مالک کون ہوتا ہے؟ وہی جس کے قبضہ و اختیار میں تمام چیزیں ہوں اور وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے واپس لے لے۔ خدا تعالےٰ نے بھی عربوں سے حکومت لے لی اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دی۔ اب بھلا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا خدا تعالےٰ کی اِس صفت کو اور کون صحیح طور پر سمجھ سکتا تھا۔ دوسرے لوگ بھی خدا تعالیٰ کو مالک

سمجھتے ہیں مگر اس طرح کہ زید کہتا ہے خدا مالک ہے بکر کہتا ہے خدا مالک ہے۔ خالد کہتا ہے خدا مالک ہے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے خود مالک بن کر دکھا دیا اور اپنی اِس صفت کا آپؐ پر بلاواسطہ اظہار کیا اس لئے آپؐ اِس صفت کو جس رنگ میں سمجھ سکتے تھے دوسرے لوگ کہاں سمجھ سکتے تھے۔ یا مثلاً خدا تعالیٰ کی صفت ربوبیت کو ہی لے لو لوگ دُنیا میں پیدا ہوتے۔ ماں باپ کے زیرِ سایہ رہ کر پرورش حاصل کرتے اور اساتذہ سے علوم حاصل کرتے ہیں اُنہیں یہی نظر آتا ہے کہ ماں باپ نے روٹی کھلائی۔ ماں باپ نے کپڑے دیئے ماں باپ نے روپے خرچ کئے اور اساتذہ نے ہم کو پڑھا دیا وہ خدا تعالیٰ کو رب تو کہتے ہیں مگر اس کی اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی محض سُنی سُنائی بات ہوتی ہے۔ وہ حیران ہوتے ہیں کہ ہمارے مولوی تو کہتے ہیں خدا رزق دیتا ہے۔ خدا روپیہ دیتا ہے۔ خدا علم دیتا ہے مگر ہمیں تو یہی نظر آتا ہے کہ ہمارے ماں باپ نے ہمیں کھلایا اللہ تعالیٰ نے نہیں کھلایا۔ ہمارے ماں باپ نے ہمیں پڑھایا اللہ تعالیٰ نے نہیں پڑھایا لیکن چونکہ لوگ کہتے ہیں کہ اصل رب خدا ہے اس لئے وہ بھی خدا تعالیٰ کو رب کہہ دیتے ہیں اُن کے دل اِس بات پر یقین نہیں رکھتے اور اُن کی آنکھیں خدا تعالیٰ کی اِس صفت کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں مگر فرماتا ہے۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى۔ اور لوگوں کے سامنے تو خدا تعالیٰ اپنی ادنیٰ ربوبیت ظاہر کر رہا تھا مگر تیرے لئے اُس نے اپنی اعلیٰ ربوبیت کو ظاہر کیا۔ یعنی خدا تعالیٰ کی ربوبیت دو قسم کی ہوتی ہے ایک ادنیٰ ربوبیت جو لوگوں کے توسط سے ظاہر ہوتی ہے اور ایک اعلیٰ ربوبیت جو توسط کے بغیر ظاہر ہوتی ہے۔ پس فرماتا ہے تُو اُن اعتراضات کو دُور کر جو ہماری ربوبیت کی صفت پر کئے جاتے ہیں لوگوں کو ہم نے روٹی کھلائی مگر اُن کے ماں باپ کے ذریعہ لوگوں کو ہم نے علم سکھایا مگر اُن کے اُستادوں کے ذریعہ لیکن تجھے ہم نے براہِ راست اپنی تربیت میں رکھا۔ تجھے اپنے پاس سے رزق دیا اور خود علم سکھایا اور اپنی تمام صفات کا بلاواسطہ ظہور تیرے لئے کیا۔ اب تیرا فرض ہے کہ تُو صفاتِ الٰہیہ پر لوگوں کے اعتراضات کو دُور کرے۔ اور اُن کے شکوک و شبہات کا ازالہ کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی صفات کا بلاواسطہ ظہور[۲۰۱]

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جس رنگ میں ہر قسم کے علوم سے نوازا اور اپنی صفات کا براہِ راست نمونہ آپؐ کو دکھایا اُس کا صرف اِس بات سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ تو دُنیوی اُستادوں سے علوم سیکھتے ہیں مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خود براہِ راست ہر قسم کا علم سکھایا۔ پھر لوگوں کو علم کے حصول کے لئے بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی مشقت برداشت نہیں کرنی پڑی۔ لوگ تورات پڑھنا چاہتے ہیں تو کبھی عبرانی زبان سیکھتے ہیں کبھی یونانی زبان سیکھتے ہیں کبھی پُرانے صُحف کا مطالعہ کرتے ہیں اور کئی سال اُن کے اِسی جدوجہد اور تگ و دو میں صرف ہو جاتے ہیں مگر اِس کے باوجود اُن کو جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ناقص ہوتا ہے اور بسا اوقات بعد کی تحقیق اُس کا غلط ہونا ثابت کر دیتی ہے لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم رات کو سوتے ہیں۔ آپؐ کو کوئی پتہ نہیں کہ تورات میں کیا کیا احکام تھے۔ یا بنی اسرائیل کے ساتھ کیا کیا واقعات گذرے۔ یا موسٰیؑ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا کلام کیا تھا۔ آپؐ اِن سب امور سے بے خبری کی حالت میں رات کو بستر پر سوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپؐ پر اِن تمام حالات کو منکشف کر دیتا ہے اور پھر وہ حالات ایسے صحیح ثابت ہوتے ہیں کہ آج وہ باتیں تو سچی ثابت ہو رہی ہیں جو خدا تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بتائیں لیکن وہ باتیں غلط ثابت ہو رہی ہیں جو لوگوں نے بہت بڑی جدوجہد اور سالہا سال کی محنت کے بعد معلوم کی تھیں اور تاریخی کتابوں میں درج کی تھیں۔ اب دیکھ لو اِس بلاواسطہ ربوبیت کے نتیجہ میں جس طرح آپؐ کہہ سکتے تھے کہ خدا علیم ہے اِس طرح

اور کون خدا کے علیم ہونے کی شہادت دے سکتا تھا بیشک لوگ بھی خدا تعالیٰ کو علیم تسلیم کرتے ہیں مگر اس لئے نہیں کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے علیم ہونے کا مشاہدہ کیا ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ اُن کے ماں باپ یا اُستاد کہتے ہیں کہ خدا علیم ہے لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو رات کو بغیر علم کے سوئے اور صبح کو آپؐ کا سینہ ہر قسم کے علوم سے بھرا ہوا تھا۔ آپؐ جس طرح خدا تعالیٰ کے علیم ہونے کی صفت کا بے عیب ہونا ظاہر کر سکتے تھے دوسرے لوگ اُس طرح کہاں ظاہر کر سکتے تھے۔

پھر مثلاً رزق کو لے لو۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ انسان خود محنت کرتا۔ خود روزی کماتا اور خود اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے لئے معاش کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اُنکے سامنے خدا تعالیٰ کی صفتِ رزاقیت بغیر توسط کے ظاہر نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی اس صفت کے متعلق محض سماعی ایمان رکھتے ہیں مشاہدہ کی برکات اُن کو حاصل نہیں ہوتیں۔ وہ بے شک رسمی طور پر اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ رزاق ہے مگر اُن کے دل اس صفت کے متعلق ہر قسم کے یقین سے خالی ہوتے ہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے اپنی اس صفت کو بھی بغیر کسی توسط کے ظاہر کیا اور آپؐ کو جب بھی رزق ملا بغیر محنت کے ملا۔ آپؐ جب بچے تھے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی غیر معمولی محبت آپؐ کے رشتہ داروں کے دلوں میں پیدا کر دی۔ یہاں تک کہ آپؐ کی تربیت کے لئے جو دایہ مقرر ہوئی وہ بھی آپؐ سے بے انتہا محبت کرنیوالی ثابت ہوئی۔ چنانچہ تاریخوں میں ذکر آتا ہے کہ حلیمہ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دایہ تھیں وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت کیا کرتی تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ خدا تعالیٰ نے آپؐ کو اُن کے لئے رزق کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ آپؐ کی دایہ کے خاندان کے لوگ سخت غربت کی حالت میں تھے مگر آپؐ کے آنے پر خدا تعالیٰ نے اُنکی غربت کو دُور کر دیا اور اپنے فضل کے دروازے اُن کیلئے کھول دیئے اس لئے آپؐ سے اُن کو بے انتہا محبت ہو گئی آنحضرتؐ کی وجہ سے جو آپؐ کی دایہ پر خدا کا فضل ہوا تھا اس وجہ سے وہ یہ چاہتی تھیں کہ زیادہ سے زیادہ عرصہ آنحضرتؐ اُن کے گھر میں رہیں۔ تا وہ برکات جو آپؐ کیوجہ سے اُن کے گھر پر نازل ہو رہی تھیں اُن سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہو سکیں۔ چنانچہ جب آپؐ دو سال کے ہوئے۔ تو آپؐ کی دایہ آپؐ کی والدہ کے پاس گئیں اور اصرار کر کے اُنہیں واپس لے آئیں۔ (ابن ہشام جلد اوّل)

مکہ کے لوگوں میں دستور تھا کہ وہ اپنے بچے اردگرد کے گاؤں میں رہنے والی عورتوں کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔ تا کہ کھلی ہوا میں رہنے کی وجہ سے اُن کی صحت اچھی رہے اور زبان بھی صاف رہے۔ کیونکہ بدوی لوگوں کی زبان شہریوں کی نسبت زیادہ فصیح ہوا کرتی ہے۔ اور گاؤں کی عورتیں اس لئے شہر کے بچوں کو لے جاتی تھیں کہ اُن بچوں کی پرورش کے لئے اُن کے ماں باپ کافی رقم اُن کو دیتے تھے جس سے اُن کا گذارہ بھی اچھا ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حلیمہ بھی اسی غرض سے مکہ میں آئی اور اس غرض کے لئے آئی کہ اگر کسی کا بچہ ملے تو اُسے اپنے ساتھ لے جائے۔ مگر وہ کہتی ہیں میں مکہ کے جس گھر میں بھی گئی لوگ میرے پھٹے پُرانے کپڑوں اور پریشان بالوں کو دیکھ کر کہتے کہ ہم تجھے اپنا بچہ نہیں دے سکتے کیا ہم نے اپنا بچہ بھوکا مارنا ہے کہ اُسے تیرے حوالے کر دیں۔ اسی حالت میں میں سارا دن مکہ میں پھرتی رہی مگر مجھے کوئی بچہ نہ ملا۔ اُدھر یہ واقعہ ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ سارا دن اپنا بچہ بعض دوسری عورتوں کو دینے کے لئے اصرار کرتی رہیں مگر کوئی عورت اُس بچہ کو لینے کے لئے تیار نہ ہوتی۔ وہ یہی کہتیں کہ تُو ایک غریب عورت ہے ہم اس بچہ کو لے گئیں تو تُو نے ہمیں کیا انعام دینا ہے گویا مکہ میں ایک عورت کو سارا دن کوئی بچہ نہ ملا اور ایک عورت کو سارا دن اپنے بچہ کے لئے کوئی دایہ نہ ملی۔ دایہ

کو ہر گھر سے اس لئے رد کیا گیا کہ وہ ایک غریب عورت ہے اگر بچہ لے گئی تو وہ اُس کی پُوری طرح پرورش نہ کر سکیگی اور بچے کو اس لئے رد کیا گیا کہ اُس کی ماں ایک غریب اور بیوہ عورت تھی وہ پالنے والی کو انعام کیا دے گی۔ اسلئے سب عورتیں اُسے کہتیں کہ ہم تیرے بچہ کو لے گئیں تو ہمیں تجھ سے کسی انعام کی اُمید نہیں ہو سکتی۔ حلیمہ کہتی ہیں جب شام ہو گئی اور سورج غروب ہونے لگا تو میں شرمندہ اور حیران ہو گئی اور سوچنے لگی کہ سارا دن گذر گیا اور مجھے کسی نے غربت کی وجہ سے اپنا بچہ نہیں دیا کہ اتنے میں مجھے کسی نے بتایا کہ فلاں گھر میں ایک بچہ ہے جسے ابھی تک کوئی دایہ نہیں ملی۔ تو اُس گھر میں جا اور اُس بچے کو لیلے۔ حلیمہ کہتی ہیں میں نے سمجھا کہ خالی ہاتھ واپس جانے میں جو شرمندگی ہے اُس سے یہ بہتر ہے کہ میں اس بچے کو ہی اپنے ساتھ لے جاؤں۔ چنانچہ میں گئی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے آئی جب میں گھر پہنچی تو ایک عجیب نظارہ نظر آیا۔ ہماری بکریوں کا دُودھ بوجہ قحط سالی کے خشک ہو چکا تھا اور دیر سے ہمارے ہاں کوئی دُودھ نہیں تھا لیکن جب میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو لے کر اپنے گھر پہنچی تو ہماری بکریوں کے تھن دُودھ سے بھر گئے۔ وہ کہتی ہیں میں دل میں تو کُڑھتی آئی تھی کہ محض اپنی ناک کے لئے اور سہیلیوں میں شرمندگی سے بچنے کے لئے میں اِس بچے کو لائی ہوں ورنہ اِس بچے کی ماں مجھے کیا دے سکتی ہے لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ ہماری بکریوں کے تھن دُودھ سے بھر گئے ہیں تو میں نے کہا یہ بچہ تو ہمارے لئے رزق لایا ہے۔ چنانچہ اُس دن سے اُن کے دل میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت بیٹھ گئی اور پھر انہوں نے اپنے بچوں سے بھی زیادہ محبت اور شفقت کے ساتھ آپ کی پرورش کی۔

تو دیکھو وہ لوگ جو دوسروں کے ہاتھ سے روٹی کھاتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کو اپنا رب سمجھتے ہیں مگر اس لئے نہیں کہ انہوں نے اُس کی ربوبیت کا کوئی کرشمہ دیکھا ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ لوگ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ رب ہے۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے خدا تعالیٰ نے اپنی صفتِ ربوبیت کا اُس وقت ظہور کیا جب آپ سمجھتے بھی نہیں تھے کہ رب کیا ہوتا ہے۔ اور پھر جب آپ نے ہوش سنبھالا تو اُس وقت دایہ نے آپ کو بتایا کہ ہم نے تجھے نہیں کھلایا بلکہ تیری وجہ سے ہم نے کھایا ہے۔ اب سوچو کہ رب کے جو معنے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سمجھ سکتے تھے وہ اور کون سمجھ سکتا تھا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو وہی صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے جو براہِ راست صفتِ ربوبیت کا نمونہ دیکھے۔ وہ شخص جو واسطوں کے ذریعہ سے کسی صفت کا مشاہدہ کرتا ہے اُس پر بھی اِس صفت کا اثر ہوتا ہے مگر وہ اثر اور یہ اثر آپس میں بہت بڑا فرق رکھتے ہیں۔ اِس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے بعض دفعہ ہم کسی غریب کو خود پیسہ دے دیتے ہیں اور بعض دفعہ کسی اور کو پیسہ دے کر کہتے ہیں کہ یہ فلاں غریب کو دے دینا۔ اب یہ لازمی بات ہے کہ پیسے تو دونوں صورتوں میں غریب کو ہی پہنچیں گے مگر براہِ راست پیسہ دینے سے ہماری جو محبت اُس شخص کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے وہ مخفی صدقہ دینے سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ بے شک مخفی صدقہ دینے والے کو ثواب زیادہ ملتا ہے مگر جسے صدقہ ملتا ہے اُس کے دل میں صدقہ دینے والے کی محبت پیدا نہیں ہو سکتی لیکن اگر کوئی شخص براہِ راست کسی غریب کو صدقہ دیتا ہے تو خواہ ثواب اُسے کم حاصل ہو مگر دوسرے شخص کے دل میں محبت کا جوش پیدا ہو جائے گا اور وہ اُس کے لئے ضرور دُعا کرے گا۔ اسی طرح جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے ماں باپ کے ہاتھ سے روٹی کھلائی ہے اُن کو خدا تعالیٰ کی ربوبیت کا وہ مزا نہیں آ سکتا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس کی براہِ راست ربوبیت سے حاصل ہوتا تھا۔

اسی طرح خدا تعالیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ زندہ کرنے والا ہے۔ اِس صفت کے متعلق بھی ہر شخص کسی رنگ میں ایمان رکھتا ہے اور وہ کہہ دیتا ہے کہ ہاں مجھے

ایمان ہے اللہ تعالےٰ مرنے کے بعد لوگوں کو زندہ کرے گا مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے خدا تعالےٰ کی یہ صفت آپ کی زندگی میں ہی ظاہر ہوئی اور آپ نے اُس کی صفتِ احیاء کا اِسی دُنیا میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا۔ آپ جس قوم میں مبعوث ہوئے اُس پر ایسی تباہی اور بربادی آئی ہوئی تھی کہ جس کی نظیر دُنیا میں بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ مگر پھر خدا تعالےٰ نے آپ کے ذریعہ ہی آپ کے ہاتھ پر اُس مُردہ قوم کو زندہ کر دیا اور اُسے دُنیا کا فاتح اور حکمران بنا دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اور بیمار تندرست ہونا چاہتے ہیں مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو علاج کے لئے جو بیمار ملا وہ ایسا تھا جو اپنی زندگی کا خواہاں نہیں تھا۔ بلکہ چاہتا تھا کہ مر جائے اور اُس کا وجود دُنیا سے مٹ جائے۔ مگر پھر وہی بیمار جو مرنا چاہتا تھا جو زندگی کا ملنا ناممکن سمجھتا تھا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے اچھا ہوا۔ زندہ ہوا اور اُس نے دُنیا کے اور ہزاروں لاکھوں لوگوں کو زندہ کر دیا۔ مکہ کے لوگ جن میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی معمولی تاجر تھے۔ نہ اُن کو حکومت حاصل تھی۔ نہ اُن میں کوئی نظام موجود تھا۔ نہ اُنہیں کوئی عزت اور شہرت حاصل تھی۔ انتہائی کس مپرسی کی حالت میں ایک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ مگر دیکھو وہ لوگ آپ کے ذریعہ سے کس طرح زندہ ہو کر دُنیا میں پھیل گئے۔ جس طرح چیل جھپٹا مار کر اپنے شکار کو قابو میں کر لیتی ہے اسی طرح وہ دیوانہ وار دُنیا میں نکلے اور بڑی بڑی حکومتوں کو اُنہوں نے تہ و بالا کر دیا۔ اہلِ عرب کی حیثیت اس قدر معمولی تھی کہ ہمسایہ حکومتوں کے ادنےٰ ادنےٰ تحصیلدار بھی اُن کو ڈانٹ ڈپٹ دیا کرتے تھے۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں آنے کے بعد اُن کی طاقت کا یہ حال ہو گیا کہ وہ بڑی بڑی حکومتوں کے ساتھ ٹکرانے لگ گئے۔ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں اُن کے مقابلہ میں پاش پاش ہو گئیں۔ اور بڑے بڑے بادشاہ گردن جھکائے اور ہتھیار ڈالے اُن کے سامنے حاضر ہوئے۔ یہ نمونہ تھا اُس احیاء کا جو اللہ تعالےٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دکھایا۔ اور لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے سُن کر کہہ دیتے ہیں کہ خدا مُردے زندہ کیا کرتا ہے۔ باپ نے کہا کہ خدا محی ہے تو بچے نے بھی مان لیا۔ اُستاد نے کہہ دیا کہ خدا محی ہے تو شاگرد نے بھی تسلیم کر لیا مگر جس شخص نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا محی ہے جس شخص نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ قوم جو صدیوں سے مُردہ چلی آ رہی تھی۔ جو زندہ نہیں ہونا چاہتی تھی وہ زندہ ہو گئی۔ وہ فاتح اور حکمران ہو گئی۔ وہ خدا تعالےٰ کی اس صفت کا بے عیب ہونا جس طرح ظاہر کر سکتا ہے کوئی دوسرا کس طرح کر سکتا ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ شافی ہے۔ مگر لوگ اِس صفت کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ زبان سے تو کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ شافی ہے مگر انہوں نے اُس کی صفتِ شفا کا کوئی عملی نمونہ دیکھا نہیں ہوتا۔ وہ تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ ہم نے ہڑ کھائی اس لئے پاخانہ آ گیا۔ اُن کا ذہن صرف مادیات میں ہی اُلجھ کر رہ جاتا ہے اُس عظیم الشان ہستی کی طرف اُن کا دل متوجہ نہیں ہوتا جو اِس تمام کارخانۂ عالم کو چلا رہی ہے۔ اُن کا ذہن ہڑ کی طرف تو چلا جاتا ہے مگر خدا تعالےٰ کے شافی ہونے کی طرف اُن کا ذہن نہیں جاتا۔ مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالےٰ نے اپنی اِس صفت کا بھی براہِ راست نمونہ دکھایا۔ خیبر کی فتح کا سوال پیدا ہوا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بُلایا اور لشکرِ اسلامی کا علم آپ کے سپرد کرنا چاہا۔ مگر حضرت علیؓ کی آنکھیں دُکھ رہی تھیں۔ اور شدتِ تکلیف کی وجہ سے وہ سُوجی ہوئی تھیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اِس حالت میں دیکھا۔ تو آپ نے علیؓ سے فرمایا ادھر آؤ۔ وہ سامنے آئے تو آپ نے اپنا لعابِ دہن حضرت علیؓ کی آنکھ پر لگایا اور اُن کی آنکھیں

اُسی وقت اچھی ہوگئیں (ابن ہشام جلد دوم) آپ جانتے تھے کہ خدا نے کہا ہے خیبر علیؓ نے فتح کرنا ہے۔ اور جب کہ خدائی فیصلہ یہ ہے تو اِس کی آنکھ بیمار نہیں رہ سکتی۔ آپؐ نے لعاب دہن لگایا اور آنکھ فوراً اچھی ہوگئی۔ اب جس شخص کے ساتھ یہ معاملہ گذرا ہو وہی بتا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ شافی ہے دوسرا اگر کچھ کہے گا تو یہی کہ مَیں نے سُنا ہے کہ خدا شافی ہے مگر مجھے اُس کی اِس صفت کے متعلق کوئی مشاہدہ حاصل نہیں۔

غرض اللہ تعالیٰ کی تمام صفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا واسطہ دیکھیں مگر لوگوں نے اُن صفات کو بالواسطہ دیکھا اس لئے لوگ اُن عیوب کو دُور نہیں کر سکتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کئے جاتے تھے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر اُن عیوب کو بڑی عمدگی اور خوبی کے ساتھ دُور کر سکتے تھے اس لئے فرمایا سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى۔ اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تُو اپنے رب کے نام کی تسبیح کر اس لئے کہ تیرے لئے اُس کی ربوبیت اعلیٰ ظاہر ہوتی ہے مگر اور لوگوں کے لئے ربوبیت ادنیٰ ظاہر ہوتی ہے اس لئے لوگوں نے اُس کی صفات کا نقش نہایت دُھندلی صورت میں دیکھا ہے مگر تیرے لئے تو ہم اپنی تمام صفات کے ساتھ ظاہر ہوگئے ہیں اور تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ ہم میں کوئی نقص نہیں۔ اس لئے بنی نوع انسان کی طرف سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی تعلیم میں یہ نقائص ہیں۔ اُس کی صفات میں یہ عیوب ہیں۔ اُن کی پُورے زور سے تردید کر۔ کوئی کہتا ہے بتوں کو خدائی دیدی گئی ہے۔ کوئی کہتا ہے خدا کا بیٹا ہے۔ کوئی کہتا ہے فرشتے اُس کی بیٹیاں ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ کلام نہیں کرتا۔ کوئی کہتا ہے کائنات عالم کے چلانے میں صرف اسباب کا دخل ہے خدا تعالیٰ کا ہاتھ اس میں کوئی کام نہیں کر رہا۔ غرض کئی قسم کے اعتراضات ہیں جو لوگوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔ اور وہ اِس قسم کے اعتراضات ہیں اِس لحاظ سے معذور بھی سمجھے جا سکتے ہیں کہ انہوں نے ہم کو دیکھا نہیں۔ ہماری صفات اور جلال اور قدرت کا مشاہدہ انہوں نے نہیں کیا مگر تُو نے تو ہم کو دیکھ لیا ہے کیونکہ ہم تیرے لئے ربّ الاعلیٰ ہونے کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں اس لئے اب یہ تیرا ہی حق ہے کہ جو عیوب لوگوں کی طرف سے منسوب کئے جاتے ہیں اُن کو دُور کر اور خدا تعالیٰ کی عظمت دُنیا میں ظاہر کر۔ اِن معنوں کی صورت میں اسم سے مراد سارے اسماء لئے جائیں گے صرف ایک اسم مراد نہیں لیا جائے گا۔

پھر اسم سے اسماء مراد لینے کی صورت میں اِس طرف بھی اشارہ سمجھا جائے گا کہ خدا تعالیٰ کی شان تو سب سے اعلیٰ ہے لیکن بوجہ اِس کے کہ وہ رب ہے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف لے جاتا ہے۔ اِس قانون کے ماتحت اُس نے پہلی کُتب میں تشبیہی کلام استعمال کئے تھے لیکن اب ربوبیت اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے اور حقیقت پر سے پردہ اُٹھانے کا وقت آگیا ہے اس لئے تُو اِن تمام غلطیوں کا ازالہ کر جو صفاتِ الٰہیہ کے بارہ میں پہلی کُتب سے لگ رہی تھیں۔ اگر قرآن کریم کا سابق الہامی کُتب سے مقابلہ کیا جائے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ پہلی کُتب میں ربّ الاعلیٰ ہونے کا اظہار نہیں کیا گیا۔ یعنی پہلی کُتب کے نزول کے وقت چونکہ انسانی دماغ ابھی اپنے ارتقاء کو نہیں پہنچا تھا اور وہ زیادہ باریک باتوں کو سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتا تھا بلکہ ابھی نشو و نما حاصل کر رہا تھا اس لئے اُن کتب میں تشبیہی کلام کثرت کے ساتھ استعمال کیا گیا تھا کبھی کسی نبی کی بعثت کو خدا کا آنا کہہ دیا جاتا کبھی اللہ تعالیٰ کو باپ کہکر پکارا جاتا کبھی اس کے پیاروں کو خدا کا بیٹا کہہ دیا جاتا۔ کیونکہ بغیر اِن استعارات اور تشبیہی کلام کے وہ حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ مگر فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تیرے لئے ہم ربّ الاعلیٰ

سبّح اسم ربّک الاعلیٰ سے یہ مراد کہ رب کی اعلیٰ شان کو ظاہر کر

ہونے کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں یعنی تمام تشبیہات اور استعارات سے منزّہ اور بالا ہو کر ہم نے اپنا وجود تجھ پر ظاہر کیا ہے۔ اس لئے پہلی کتابوں سے جو اعتراضات پیدا ہوتے ہیں تو اُن کو دُور کر۔

پہلی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں کبھی اللہ تعالیٰ کو باپ کہہ دیا جاتا۔ کبھی اُسے ماں کہہ کر پکارا جاتا۔ کبھی کسی نبی کو خدا کا بیٹا کہہ دیا جاتا۔ کبھی کسی نبی کو خدا کا اکلوتا قرار دے دیا جاتا۔ اِس کے یہ معنے نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ کے بھی بیٹے ہیں یا اللہ تعالیٰ بھی باپ اور ماں کی طرح ہے بلکہ صرف اِس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے کہ جس طرح بیٹا باپ میں سے نکلتا ہے اُسی طرح نبی خدا تعالیٰ کی طرف سے اُس کی صفات کو ظاہر کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ یہ تشبیہی کلام استعمال کیا گیا تھا اور دراصل ایسا ہونا ضروری بھی تھا۔ کیونکہ انسانی دماغ ابھی نشو و نما پا رہا تھا وہ ارتقائی منازل کو آہستہ آہستہ طے کر رہا تھا اور ابھی وہ اِس قابل نہیں ہوا تھا کہ شریعت کے باریک احکام یا الٰہی کلام کی باریک حکمتوں کو سمجھ سکے۔ مگر اب تیرے لئے ہم ربّ الاعلیٰ ہونے کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں تشبیہ تب دی جاتی ہے جب کوئی چیز اُوپر سے نیچے کی طرف آئے۔ مگر جب کوئی چیز اونچی چلی جائے تو اُس کے لئے تشبیہات و استعارات استعمال کرنے کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اِسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم تیرے لئے ربّ الاعلیٰ ہونے کی حیثیت میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اسلئے تمام تشبیہات کی تشریحات کر دی گئی ہیں۔ اور بتا دیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ کو باپ کہا جاتا تھا تو اُس کے کیا معنے تھے۔ اور جب کسی نبی کو اُس کا بیٹا یا اکلوتا بیٹا کہا جاتا تھا تو اُس کے کیا معنے تھے۔ توحید کیا ہوتی ہے۔ شرک کن باتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ شرک کی کیا کیا قسمیں ہیں۔ یا اور اِسی قسم کے تمام مسائل کو ہم نے پُوری طرح واضح کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لئے تُو جس طرح اِن غلطیوں کو دُور کر سکتا ہے، پہلے لوگ اِن غلطیوں کو دُور نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ پہلے انبیاء کے لئے ہم ربّ الاعلیٰ ہونے کی حیثیت میں ظاہر نہیں ہوئے اِس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اُس وقت ربّ الاعلیٰ نہیں تھا بلکہ اِس کے صرف اتنے معنے ہیں کہ ظہورِ ربوبیّتِ اعلیٰ اُس وقت نہیں ہوا تھا لیکن اِس وقت ربوبیّت اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے۔ اور شریعت کو ہر لحاظ سے کامل کر دیا گیا ہے۔ اس لئے اُس کے ہر حکم کی حکمت اور ہر تعلیم کی خوبی کو واضح کر دیا گیا ہے۔ اور تیرا فرض ہے کہ تُو اُن اعتراضات کو دُور کرے جو خدا تعالیٰ کی ذات اور اُس کی صفات اور اُس کی تعلیم وغیرہ کے متعلق کئے جاتے ہیں۔

اگر اعلیٰ کو اسم کی صفت قرار دیا جائے تو اِس کے یہ معنے ہوں گے کہ تیرے رب کا جو اعلیٰ نام ہے اُس کی تسبیح کر اِس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کے ادنٰے نام بھی ہیں بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی تمام صفات اِس وقت اعلیٰ رنگ میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ تیرا کام یہ ہے کہ ہر صفت کا جو اعلیٰ ظہور ہے اُسے پیش کر اور ہر صفت پر جو اعتراض پڑتا ہو اُسے دُور کر تا کہ پہلے تمام اعتراضات مٹ جائیں اور خدا تعالیٰ کا جلال اپنی پُوری شان کے ساتھ دُنیا پر ظاہر ہو۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى کے متعلق یہ امر بھی یاد رکھنا چاہئے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کا طریق یہ تھا کہ اِس آیت کے نازل ہونے سے پہلے جب وہ رکوع میں جاتے تو کہا کرتے اَللّٰهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ اور جب سجدہ میں جاتے تو کہتے اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ مگر جب یہ آیت نازل ہوئی کہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِجْعَلُوْهَا فِيْ سُجُوْدِكُمْ۔ یہ تسبیح سجدہ کے وقت کیا کرو اور جب یہ آیت نازل ہوئی کہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (الواقعہ ع۲) تو آپؐ نے فرمایا اِجْعَلُوْهَا فِيْ رُكُوْعِكُمْ یہ تسبیح رکوع کے وقت کیا کرو۔ چنانچہ یہ جو ہم رکوع میں سُبحانَ

# اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝

(وہ) جس نے (انسان کو) پیدا کیا۔ اور (اسے) بے عیب بنایا ۳؎

رَبِّیَ الْعَظِیْمِ اور سجدہ میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کہتے ہیں اللہ تعالےٰ کے اِسی حکم کے نتیجہ میں کہتے ہیں۔ کہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ اور سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی۔ گویا خدا تعالےٰ نے بتا دیا کہ رکوع میں کس طرح تسبیح کرنی چاہیئے اور سجدہ میں کس طرح تسبیح کرنی چاہیئے۔ ورنہ اِس سے پہلے مسلمان رکوع میں اَللّٰھُمَّ لَكَ رَكَعْتُ اور سجدہ میں اَللّٰھُمَّ لَكَ سَجَدْتُ کہا کرتے تھے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی میں اِس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ چونکہ اعلیٰ اور بلند ہستی کا علم حاصل کرنا چھوٹی ہستیوں کے لئے مشکل ہوتا ہے اس لئے خدائی صفات کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ اُن کی کس رنگ میں تجلی ہوتی ہے۔ کون کون سی باتیں خدا تعالےٰ کی صفات کے منافی ہیں اور کون کون سی باتیں اُس کی صفات کے مطابق ہیں یہ انسان کا کام نہیں اور نہ اُس میں یہ قوت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی طرف سے خدا تعالےٰ کی صفات کے متعلق اندازے لگانے شروع کر دے اور سمجھ لے کہ وہ ایسا ہوگا۔ بلکہ یہ خدا کا کام ہے کہ وہ اپنی وحی کے ذریعہ سے بندوں کو اِس قسم کے امور سے آگاہ فرمائے۔ اس لئے خدا تعالےٰ کی طرف سے وحی کا نازل ہونا ضروری ہے۔ وہ لوگ جو وحیٔ الٰہی کی ضرورت تسلیم نہیں کرتے وہ بالفاظِ دیگر خدا تعالیٰ کا اپنی عقل سے احاطہ کرنا چاہتے ہیں حالانکہ یہ ناممکن ہے۔ خدا تعالیٰ کی ہستی اور اُس کی صفات کے متعلق انسان کوئی ایک بات بھی اُس وقت تک معلوم نہیں کرسکتا جب تک اللہ تعالےٰ اپنی وحی کے ذریعہ سے ان امور سے خود آگاہ نہ فرمائے اس لئے وحی کا ہونا ضروری ہے۔ بغیر وحیٔ الٰہی کے نہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اُس کے قرب کے راستوں کو اختیار کرسکتا ہے۔ پس محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ تو جس پر وحی نازل ہوئی ہے صفاتِ الٰہیہ کو لوگوں پر ظاہر کر وہ خود اپنی عقل سے اُن صفات کو نہیں سمجھ سکتے۔

**۳؎ حل لغات**۔ سَوَّی الشَّیْءَ وَتَسْوِیَةً کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَهٗ سَوِیًّا وَصَنَعَهٗ مُسْتَوِیًا اُس کو درست اور عیبوں سے پاک بنایا۔ اور سَوّٰی کے معنے یہ بھی ہوتے ہیں کہ عیبوں کو دُور کیا۔ چنانچہ کہتے ہیں سَوَّیْتُ الْمُعْوَجَّ فَمَا اسْتَوٰی۔ میں نے ٹیڑھے کو سیدھا کرنا چاہا مگر وہ سیدھا نہ ہوا (اقرب)، گویا سَوّٰی کے معنے یہی ہیں کہ اُسے ایسا بنایا کہ اُس میں کوئی عیب نہ تھا۔ السَّوّٰی کے یہ بھی معنے ہیں کہ اُس کو جو کج تھا درست کیا۔ گویا بے عیب بنانا یا عیب کو دُور کر دینا یہ دونوں باتیں تسویہ میں شامل ہیں پس اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی کے معنے یہ ہوئے کہ جس خدا نے پیدا کیا اور پھر اُس کو بے عیب بنایا یا جس خدا نے پیدا کیا اور پھر عیب پیدا ہونے کی صورت میں اُن عیوب کو دُور کیا۔

سَوّٰی

**تفسیر**۔ خدا تعالےٰ نے پیدا کیا اور اُسے درُست اور بے عیب بنایا۔ اِس کے یہ معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو ایسے رنگ میں پیدا کیا ہے کہ اُس کے اندر تمام ضروری طاقتیں موجود ہیں اور ترقی کے مادے اُس میں پُوری طرح پائے جاتے ہیں گویا وہ سب صفات جو انسانی ترقی کے لئے ضروری تھیں اللہ تعالےٰ نے انسان کے لئے مہیا فرما دی ہیں۔ اِسی بناء پر بائیبل میں آتا ہے:۔

"خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا"

(پیدائش ۱/۲۷)

پس سَوّٰی کے معنے یہ ہوئے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان میں

اعتدال اور ترقی کا مادہ پیدا کیا ہے۔ ہر قسم کی قابلیتیں اُس میں رکھدی ہیں اور ہر قسم کی ضروریات اُس کے لئے مہیا کر دی ہیں اور یہی بے عیب پیدا کرنے کے معنے ہیں۔ ورنہ بے عیب پیدا کرنے کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ اُس کے اندر خدائی پائی جاتی ہے۔ اِس کے معنے یہی ہیں کہ انسانی پیدائش میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ لغو اور فضول ہے۔ مثلاً آنکھ ہے یہ بالکل بیکار ہوتی اگر اُس کے مقابل میں سورج کی روشنی پیدا نہ کی جاتی مگر اللہ تعالیٰ کا احسان دیکھو کہ اُس نے ایک طرف آنکھ پیدا کی تو دوسری طرف سورج کی روشنی پیدا کر دی تاکہ آنکھ کام کر سکے۔ اِسی طرح تمام جسم انسانی کو دیکھ لو ہر چیز کسی نہ کسی غرض کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور اُس کا ضرور کوئی نہ کوئی فائدہ ہے۔ صرف دو چیزیں انسانی جسم میں ایسی ہیں جن کے متعلق ڈاکٹروں کا یہ خیال تھا کہ اِن کی کوئی غرض نہیں یہ یونہی پیدا کر دی گئی ہیں۔ ایک تو کان کی نوک کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ کسی خاص غرض کے لئے نہیں ہے۔ دوسرے معاء اعور یعنی اپنڈکس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جسم انسانی میں اِس کا کوئی خاص کام نہیں بعض اور چیزیں بھی تھیں جن کے متعلق پہلے زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ بے فائدہ پیدا کی گئی ہیں لیکن آہستہ آہستہ اُن کی ضرورت کو اطباء نے ظاہر کر دیا۔ صرف یہ دو چیزیں رہ گئی تھیں مگر آج سے چالیس پچاس سال پہلے معاء اعور کی ضرورت کو بھی ڈاکٹروں نے محسوس کر لیا۔ چنانچہ فرانس کے ایک ڈاکٹر نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آیا معاء اعور کا کوئی فائدہ ہے یا نہیں بارہ بندر لئے اور اُن میں سے چھ کے اپنڈکس اپریشن کے ذریعہ کاٹ دیئے اور چھ کے رہنے دیئے۔ اِس کے بعد اُس نے تمام بندروں کی یکساں پرورش شروع کر دی اور یہ غور کرنا شروع کیا کہ آیا دونوں میں کسی قسم کا کوئی فرق پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد اُس نے دیکھا کہ جن بندروں کے اپنڈکس کاٹ دیئے گئے تھے اُن کی قوتِ مقاومت کم ہو گئی ہے۔ وہ بیماریوں کا جلد شکار ہو جاتے ہیں اور نقرس اُن کے جسم کو لگتی نہیں لیکن دوسرے بندر جن کا اپریشن نہیں کیا گیا تھا وہ اُسی طرح مضبوط رہے ہیں جس طرح پہلے تھے۔ اِس سے ثابت ہو گیا کہ اپنڈکس جس کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ اِس کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ ایک زائد آنت ہے جو جسم انسانی میں پیدا ہو گئی ہے اس کا بھی انسانی جسم کی صحت کیساتھ گہرا تعلق ہے۔ اور جن لوگوں کی یہ آنت کاٹ دی جائے اُن کی قوتِ مقاومت کم ہو جاتی ہے۔ مگر اِس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ قوتِ مقاومت دوسروں کے مقابلہ میں کم ہو جاتی ہے بلکہ قوتِ مقاومت کے کم ہونے کے یہ معنے ہیں کہ جتنی طاقت اِس آنت کی موجودگی میں اُس کے اندر پائی جاتی ہو اپریشن کے بعد اُتنی طاقت اس کے اندر نہیں رہتی۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا اپریشن نہ ہؤا ہو اور کسی اور وجہ سے اُس کے اندر مقابلہ کی طاقت کم ہو اِس صورت میں اُس کا اور اپریشن والے شخص کا مقابلہ نہیں ہو گا بلکہ دیکھا یہ جائیگا کہ اِس شخص کے اندر پہلے کتنی طاقتِ مقابلہ تھی اور اب کتنی طاقتِ مقابلہ رہ گئی ہے۔ اِس موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اپریشن سے پہلے انسان کے اندر جتنی تابِ مقاومت ہوتی ہے اپریشن کے بعد اُتنی طاقت اُس میں نہیں رہتی بلکہ ضرور اُس میں کمی آجاتی ہے۔ فرانس کے اِس ڈاکٹر نے جو تجربہ کیا اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنڈکس کا انسان کی قوتِ مقاومت اور اُس کی صحت کی بحالی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ممکن ہے آئندہ چل کر اِس سے بھی زیادہ واضح طور پر اِس کے فوائد ثابت ہو جائیں لیکن بہرحال اِس وقت تک کی تحقیق بھی ثابت کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔ دوسری چیز جسے بیکار سمجھا جاتا تھا کان کی نو ہے۔ مگر اب معلوم ہؤا ہے کہ یہ بھی بیکار نہیں بلکہ آواز کے سُننے میں یہ ایک لطیف قسم کا اثر رکھتی ہے جس طرح بچے پتنگ کے ساتھ ایک چھوٹی سی دمچی یا پتلا سا کاغذ باندھ دیتے ہیں جو بظاہر زائد چیز نظر آتی ہے مگر پتنگ کے اُڑانے میں وہ بہت

سَوّٰی کے یہ معنی کہ انسان میں اعتدال اور ترقی کا مادہ پیدا کیا ہے۔

کام آتی ہے۔ اِسی طرح کان کی لَو علاوہ اِس کے کہ کان کو خوبصورت بنا دیتی ہے آواز کے ساتھ بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ بعض حصے جسم انسانی میں ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے خوبصورتی کے لئے پیدا کئے ہیں اِنہی میں سے ایک کان کی لَو بھی ہے۔ اگر کسی کے کان کی لَو کاٹ دی جائے تو وہ بالکل بُچا سا نظر آنے لگ جائے گا۔ اور اُس کی ساری خوبصورتی ماری جائیگی لیکن علاوہ خوبصورتی کے اِس لَو کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ چونکہ اِس کے اندر لچک پائی جاتی ہے اِس وجہ سے آواز اُس کے ذریعہ سے ایک لہر پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے آواز زیادہ عمدگی سے سُنی جا سکتی ہے۔ یہ ایک موٹا فائدہ کان کی لَو کا ہے۔ اور بھی کئی فوائد ہونگے جو اپنے اپنے وقت ظاہر ہوتے رہیں گے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر اُسے بے عیب بنایا ہے کوئی چیز ایسی نہیں جس کی کوئی نہ کوئی غرض نہ ہو۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ نے حکمت اور انسانی فائدہ کو مدِّنظر رکھتے ہوئے پیدا کی ہے۔

پھر خَلَقَ فَسَوّٰی کے یہ بھی معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو معتدل القویٰ بنایا ہے اور اُس کی قوتوں میں اُس نے ہر لحاظ سے اعتدال پیدا کیا ہے۔ ایک طرف اگر اُس نے انسان میں غصہ کی طاقت رکھی ہے تو اِس کے بالمقابل اُس نے نرمی کی قوت بھی اُس میں رکھ دی ہے۔ اگر ایک طرف اُس میں انتقام کی قوت پائی جاتی ہے تو دوسری طرف عفو کی قوت بھی اُس میں موجود ہے۔ اگر ایک طرف اُس میں شہوت کا مادہ پایا جاتا ہے تو دوسری طرف عفّت کا مادہ بھی اللہ تعالیٰ نے اُس میں رکھ دیا ہے۔ یہ دونوں بظاہر متضاد قوتیں ملکر انسان کی اخلاقی اور روحانی ترقی کا موجب ہوتی ہیں۔ اگر ایک دوسرے کے بالمقابل اِس قسم کی متضاد قوتیں انسان میں موجود نہ ہوتیں تو وہ کبھی با اخلاق نہیں کہلا سکتا تھا۔ جس شخص کے اندر شہوت نہیں وہ کبھی عفیف نہیں کہلا سکتا۔ جس شخص کے اندر غصہ نہیں وہ معاف کرنیوالا نہیں کہلا سکتا۔

اور جس شخص کے اندر نرمی نہیں وہ غیور نہیں کہلا سکتا۔ اخلاق کی حکومت اُسی شخص پر ہوتی ہے جس میں دونوں قابلیتیں پائی جاتی ہوں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اِس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی نامرد ہو تو اُسے یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ بڑا عفیف ہے یا اگر کوئی شخص نابینا ہو تو اُس کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کبھی بدنظری نہیں کرتا اس لئے کہ اُس کی نظر ہے ہی نہیں۔ اگر اُس کی نظر موجود ہوتی اور پھر وہ بدنظری سے محفوظ رہتا تو یہ بے شک قابلِ تعریف بات تھی لیکن جبکہ اُس کی آنکھیں ہی نہیں تو اُسے پاک نظر والا کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دونوں قسم کی قوتیں انسان میں نہ پائی جائیں اور ان قوتوں میں وہ صحیح توازن قائم نہ کرے اُس وقت تک وہ اخلاقی زندگی بسر کرنے والا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پس خَلَقَ فَسَوّٰی کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ ہم نے انسان کو معتدل القویٰ بنایا ہے اور اُس کے دائیں بائیں متضاد قوتیں رکھی ہیں اور اُس کے اندر یہ مادہ پیدا کیا ہے کہ وہ اِن قوتوں کے درمیان میں اپنے آپ کو اِس طرح برقرار رکھے جس طرح ترازو کے دو پلڑے آپس میں برابر ہوتے ہیں۔ اگر ایک طرف ہم نے اُس میں شہوت کا مادہ رکھا ہے تو دوسری طرف ہم نے عفّت کا مادہ بھی اُس میں رکھ دیا ہے۔ ایک طرف پاکیزگی کا مادہ ہم نے پیدا کیا ہے تو دوسری طرف غلاظت بھی اُس کے ساتھ لگا دی ہے۔ ایک طرف چُستی بنائی ہے تو دوسری طرف سُستی بنا دی ہے۔ ایک طرف کھانے پینے کے سامان بافراط پیدا کر دیئے ہیں تو دوسری طرف روزہ رکھ دیا ہے یعنی اُس میں ایسی قوت رکھ دی ہے کہ وہ ضرورت پر فاقہ کشی کر سکتا ہے۔ غرض دونوں قسم کے قویٰ انسان میں پیدا کئے گئے ہیں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے انسان میں یہ قابلیت رکھی ہے کہ وہ ان قویٰ کا صحیح استعمال کر کے با اخلاق نیک اور روحانی آدمی بن جائے۔ پس فرماتا ہے ایکطرف تو تمام ضروری طاقتیں ہم نے انسان میں رکھ دی ہیں اور

دوسری طرف اُس میں ترقی کا مادہ پیدا کر دیا ہے تاکہ وہ اِن قوتوں سے کام لے کر اخلاقی اور مذہبی رنگ میں ترقی کر سکے۔

خَلَقَ فَسَوّٰی کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور پھر جب جب اُس میں خرابی پیدا ہوئی اللہ تعالیٰ نے اُس کی درستی کے سامان کئے اور اُس کی کجی کو دُور کیا۔ تسویہ کے ایک معنے جیسا کہ اُوپر بتایا جا چکا ہے عیب پیدا ہونے پر اُس عیب کو دُور کرنے کے ہوتے ہیں۔ پس خَلَقَ فَسَوّٰی کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ اُس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر جب کبھی اُس میں خرابی پیدا ہوئی اللہ تعالیٰ نے اُس کو دُور کیا۔ جو خدا اپنے بندوں کا اِس قدر خیال رکھتا ہے اور ہر خرابی پر اُس کو دُور کرنے کے سامان مہیا کرتا ہے اُس کی طرف یہ عیب کبھی منسوب نہیں کیا جا سکتا کہ خرابی تو پیدا ہو مگر وہ اُس کو دُور کرنے کے سامان مہیا نہ کرے۔

پہلی سورۃ میں بیان شدہ قولِ فصل کے متعلق ایک شک کا ازالہ

دیکھو! اللہ تعالیٰ نے یہاں کس لطافت سے اُس اعتراض کا جواب دے دیا ہے جو پہلی سورۃ سے پیدا ہوتا تھا۔ میں بتا چکا ہوں کہ قولِ فصل کے متعلق یہ اعتراض پیدا ہوتا تھا کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعہ قولِ فصل آ چکا اور لوگوں کی راہنمائی کے لئے آپ ایک کامل تعلیم لے آئے تو اس کے بعد کسی اور موعود کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اِس کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے تم اللہ تعالیٰ کی صفات کی طرف دیکھو کہ اُس کے جسم پر جو بیماریاں حملہ کرتی ہیں اُن کے علاج کے سامان بھی اُس نے دُنیا میں پیدا کئے ہیں۔ جب بھی انسان بیمار ہوا اور اُس میں کسی قسم کی خرابی پیدا ہوئی اللہ تعالیٰ نے اُس کے تسویہ کے سامان پیدا کر دیئے۔ جب جسمانی بیماری پیدا ہوئی تو جسم کی صحت کے سامان پیدا کئے۔ جب روحانی بیماری پیدا ہوئی تو روحانی بیماریوں کے علاج پیدا کر دیئے۔ پس جب اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایسا کرتا چلا آیا ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ آئندہ کبھی تو پیدا ہو مگر وہ اُس کو دُور کرنے کے سامان پیدا نہ کرے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ کسی وقت کجی تو پیدا ہوئی مگر خدا نے اُس کو دُور نہیں کیا تو اِس سے خدا کا ناقص ہونا ثابت ہوگا اور اُس کی صفات پر اعتراض واقع ہوگا۔ اگر دُنیا میں خرابی پیدا ہو سکتی ہے تو بہرحال اُس کو دُور کرنا ضروری ہوگا کیونکہ یہ خدا کی سُنّت ہے کہ انسان جب بھی خرابی میں مبتلا ہوتا ہے وہ اُس کی ہدایت کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ اگر تم کہو کہ خدا کو قولِ فصل کے بعد اِس قسم کی خرابیاں دُور نہیں کرنی چاہئیں تو دوسرے الفاظ میں تم خدا تعالیٰ کو مورد الزام بنانا چاہتے ہو۔ پس تمہارا یہ خیال کہ قولِ فصل کے بعد کسی وحی کی ضرورت نہیں ایک غلط اور بے بُنیاد خیال ہے۔ اگر نقص پیدا ہو تو اُس کو دُور کرنے کا سامان اللہ تعالیٰ ضرور کرتا ہے۔ ورنہ اُس پر اعتراض عائد ہوتا ہے کہ خرابی کا اُس نے کیوں علاج نہ کیا۔ پس فرماتا ہے آج تک یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ جب بھی دُنیا میں خرابی پیدا ہوئی ہم نے اُس کو دُور کرنے کے سامان پیدا کر دیئے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ علاج خرابی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ایسا ہے جو معدہ کی خرابی کی وجہ سے روٹی نہیں کھاتا تو اُس کا ایسا علاج ہونا چاہیئے جس کے نتیجہ میں وہ روٹی کھا سکے۔ یہ علاج نہیں ہوگا کہ اُس پر کمبل اوڑھا دیا جائے۔ اگر انسانوں میں عملی خرابی پیدا ہو جائے تو اُس وقت صحیح علاج یہ ہوگا کہ اُن کی عملی اصلاح کی جائے۔ یہ علاج نہیں ہوگا کہ نئی شریعت نازل کر دی جائے۔ لیکن اگر شریعت میں خرابی پیدا ہو جائے تو پھر صحیح علاج یہ ہوگا کہ شریعت کی اصلاح کر دی جائے۔ بہرحال جیسا مرض ہوگا ویسا ہی علاج ہوگا۔ اگر کتاب بگڑ جائے تو اُس کا علاج ہوگا اور اگر لوگ بگڑ جائیں تو اُن کا علاج ہوگا۔ اگر انسان تو درست ہوں مگر قانون ناقص ہو تو اُس وقت قانون کو درست کیا جائے گا اور اگر قانون تو درست ہو مگر لوگوں میں خرابی پیدا ہو جائے تو لوگوں کو درست کیا جائیگا پس خَلَقَ فَسَوّٰی کہہ کر اللہ تعالیٰ نے اُس اعتراض کا

# وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝

اور جس نے (اس کی طاقتوں کا) اندازہ کیا۔ اور (انکے مطابق) اسے ہدایت دی ۔

جواب دیدیا جو اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ کے نتیجہ میں پیدا ہوتا تھا اور بتا دیا کہ انسان میں جب بھی خرابی پیدا ہوئی اللہ تعالیٰ اُس کو دُور کرتا چلا آیا ہے۔ اسی طرح آئندہ بھی جو خرابی پیدا ہوگی وہ اُس کو ضرور دُور کرے گا۔

**۵ حل لغات۔** قَدَّرَهٗ عَلَى الشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں جَعَلَهٗ قَادِرًا اُس کو قادر بنا دیا۔ اور قَدَّرَ فُلَانٌ کے معنے ہوتے ہیں رَوَّى وَفَكَّرَ فِیْ تَسْوِیَةِ اَمْرِهٖ۔ اُس نے کسی معاملہ میں غور کیا اور سوچا کہ اُسے کس طرح سر انجام دے۔ قَدَّرَ الشَّیْءَ بِالشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں قَاسَهٗ بِهٖ وَجَعَلَهٗ عَلٰی مِقْدَارِهٖ اُس نے ایک چیز کو دوسری پر قیاس کیا اور اُس کے مطابق اُسے بنایا۔ (اقرب) اِس آیت میں قَدَّرَ کے تینوں معنے ہوسکتے ہیں۔ یہ بھی کہ قَدَّرَهٗ عَلَى الشَّیْءِ یعنی قَدَّرَ الْاِنْسَانَ عَلَى الْهُدٰی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہدایت پر قادر بنایا۔ یعنی اُسے اِس قابل بنایا ہے کہ وہ ہدایت پائے اور ترقی کرے۔

دوسرے معنوں کے لحاظ سے وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی کا یہ مفہوم ہوگا کہ جس نے انسان کی حالت کا ہمیشہ اندازہ لگایا۔ کیونکہ قَدَّرَ فُلَانٌ کے معنے ہوتے ہیں رَوَّى وَفَكَّرَ فِیْ تَسْوِیَةِ اَمْرِهٖ۔ پس قَدَّرَ فَهَدٰی کے معنے یہ ہوئے کہ جب کبھی خرابی پیدا ہوئی اللہ تعالیٰ نے اُس کو دُور کرنے کی تجویز کی۔ اور اُس کا خرابی کو دُور کرنے کی تجویز کرنا سرسری نہ تھا بلکہ ہمیشہ اُس نے اندازہ لگایا کہ خرابی کس قسم کی ہے کیسی بیماری ہے اور کس قدر علاج سے وہ دُور ہوسکتی ہے۔ درحقیقت علاج میں اُسی وقت کامیابی ہوتی ہے جب مرض کے مطابق علاج کیا جائے۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ ایک شخص کو معمولی ملیریا بخار ہو تو ڈاکٹر اُسے روزانہ ساٹھ گرین کونین کھلانا شروع کردے لیکن ایک دوسرا شخص جسے شدید ملیریا ہو اُسے ڈاکٹر بعض دفعہ اتنی کونین کھلاتا ہے کہ اُس کے کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ فلاں شخص کو کونین زیادہ کیوں دی گئی اور فلاں کو کم کیوں تو یہ اُس کی نادانی ہوگی کیونکہ علاج مرض کے مطابق ہوتا ہے۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ بھی ہمیشہ خرابی کے مطابق اصلاح کے سامان پیدا فرماتا ہے۔ اور قَدَّرَ فَهَدٰی میں اِس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کے متعلق پہلے اندازہ لگایا کہ کیا مرض ہے۔ وہ شدید ہے یا خفیف کتنے علاج سے وہ اچھی ہوسکتی ہے۔ اور پھر اُس اندازہ کے مطابق علاج نازل کیا۔

قَدَّرَ کے ایک یہ معنے بھی تھے کہ قَاسَهٗ بِهٖ وَجَعَلَهٗ عَلٰی مِقْدَارِهٖ۔ اُس نے ایک چیز کو دوسری چیز پر قیاس کیا اور اُس کے مطابق اُسے بنایا۔ اِس لحاظ سے آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ انسان کی مرض اور اُس کے علاج کا موازنہ کرکے اللہ تعالیٰ نے اُس کی اصلاح اور درستی کے سامان مہیا کئے۔ پہلے معنے تو یہ تھے کہ جس قسم کی مرض تھی اُسی قسم کا علاج نازل کیا اور دوسرے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مرض کا اندازہ کیا اور پھر جتنی مرض تھی اُتنا علاج بھیج دیا۔

قَدَّرَ

**تفسیر۔** یہ آیت اپنے دونوں معنوں کے لحاظ سے پہلی آیت کے ساتھ نہایت گہرا تعلق رکھتی ہے اور اسی مضمون کا تسلسل اس میں پایا جاتا ہے جو اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی میں بیان کیا گیا تھا۔ خَلَقَ فَسَوّٰی کے دو معنے کئے گئے تھے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو معتدل القویٰ اور ترقی کرنیوالا بنایا۔ دوسرے یہ کہ جب بھی اُس میں کوئی خرابی پیدا ہوئی اللہ تعالیٰ نے اُس کو دُور کیا۔ ان دونوں معنوں کے لحاظ سے قَدَّرَ فَهَدٰی کے بھی دو معنے ہوں گے۔ پہلے معنوں کے مقابل پر یہ کہ چونکہ انسان میں ترقی کی استعداد رکھی گئی تھی۔ اور اُسے

قَدَّرَ فَهَدٰی کا تعلق پہلی آیت سے

کامل القویٰ بنایا گیا تھا۔ خدا تعالےٰ نے اُس کی طاقتوں کا اندازہ کرکے اس کے متواتر ترقی کرتے چلے جانے کے ذرائع مہیا کئے۔

دوسرے معنے اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی کے یہ تھے کہ جب کبھی اس میں خرابی پیدا ہوئی اور وہ کج ہوا اللہ تعالےٰ نے اُس کی ضرورت کے مطابق اُس کی اصلاح کے سامان کئے اور اُس کی کجی کو دُور کر دیا۔ اِن معنوں کے لحاظ سے وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی کے یہ معنے ہوں گے کہ جب بھی وہ کج ہوا اُس کی ضرورت کے مطابق اللہ تعالےٰ نے ہدایت بھجوا دی اور اِس طرح اُس کی اصلاح کی۔ اگر ضرورت کے مطابق ہدایت نہ ہوتی یا کم ہوتی تو وہ گمراہ ہو جاتا اور اگر ضرورت سے بڑھ جاتی تب بھی اُس کی قوتیں ٹوٹ جاتیں اور وہ حیران رہ جاتا پس اصلاح کا اُس نے صحیح طریق اختیار کیا اور اس قدر جو ضروری تھا نازل کیا۔ گویا جیسی جیسی مرض تھی اور جتنی جتنی کجی پائی جاتی تھی اُس کے مطابق اللہ تعالےٰ نے علاج نازل کیا اس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اگر ضرورت سے زائد تعلیم دی جاتی تو وہ بنی نوع انسان کو ہلاک کرنے والی ثابت ہوتی۔ چنانچہ اس کی مثال دیتے ہوئے بتایا جا چکا ہے کہ پہلے آدمؑ کے وقت ابھی سب بدیوں کے ارتکاب کا نہ موقع تھا نہ انسانی ذہن میں وہ آئی تھیں مگر اُن کا ذکر اُس وقت کر دیا جاتا تو گناہ پیدا ہوتا نہ کہ اصلاح۔ پس بدی کے ایجاد ہونے سے پہلے اُس کا علاج کرنا درست نہ تھا اسی لئے کامل کتاب اُس وقت آئی جب سب بدیاں اور بداخلاقیاں شیطانی لوگوں نے ایجاد کر لیں۔ دوسرے ارتقائے ذہنی جب تک نہ ہوا اُس وقت تک اعلیٰ تعلیمات کا سمجھنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ پس ضروری تھا کہ ارتقائے ذہنی تک وقتی کامل کتاب دی جاتی نہ کہ کلّی کامل۔ غرض چونکہ انسان کامل القویٰ پیدا کیا گیا تھا اس لئے کامل القویٰ ہونے کے لحاظ سے ایک وقت پھر اُسے کامل طور پر کامل تعلیم ملنی چاہیئے تھی۔ اور بوجہ ارتقاء کا مادہ اپنے اندر رکھنے کے اُسے ایک وقت تک صرف وقتی کامل تعلیمات ملنی چاہیئے تھیں۔ اگر کامل تعلیم نہ ملتی تو اُس کی طاقتوں کا پورا جواب نہ ملتا اور اگر وقتی کامل تعلیم نہ ملتی تو ارتقاء کی منازل طے نہ ہو سکتیں اور انسان بوجھ تلے دب کر کامل ہونے سے پہلے ہی مُرجھا جاتا۔ پس جس خدا نے اُسے پیدا کیا اور کامل بنایا اور ساتھ ہی نقائص و امراض کا شکار بھی بنایا تاکہ وہ اپنے عمل اور قوت سے کام لیکر انعام کا مستحق ہو اُس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اِن دونوں باتوں کا لحاظ رکھتا اور ہدایت کا لچکدار انتظام کرتا۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ اُس نے انسان کو پیدا کیا اور جب بھی اُس میں اعوجاج پیدا ہوتا رہا اُس کے مطابق وہ اصلاح کے سامان مہیا کرتا رہا۔ غرض پہلی آیت کے جو دو معنے کئے گئے تھے اُن کے لحاظ سے اِس آیت کے بھی دو معنے ہیں۔ ایک یہ کہ اُس نے انسان کی استعدادِ کمال کو ضائع نہیں ہونے دیا بلکہ ہمیشہ اُس کے بڑھنے کے ذرائع مہیا کئے۔ دوسرے یہ کہ مرض پیدا ہونے پر اُس مرض کے مطابق علاج نازل کیا۔ ایک معنوں کے لحاظ سے ترقی کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے معنوں کے لحاظ سے ازالۂ مرض کی طرف اشارہ ہے۔

اِس امر کا ثبوت کہ جو معنے مَیں نے کئے ہیں وہی صحیح ہیں اِس سے بھی ملتا ہے کہ یہاں خَلَقَ فَسَوّٰی کے بعد قَدَّرَ فَهَدٰی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر یہ معنے درست نہ ہوتے تو خَلَقَ سے قَدَّرَ کو پہلے رکھنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اندازہ پہلے ہوتا ہے اور عمل بعد میں۔ سو چونکہ خَلَقَ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اِس کے بعد خلق کا اندازہ لگانے کے معنے ہی کوئی نہیں بنتے۔ جسمانی یا روحانی قوتوں کا اندازہ تو خلق سے پہلے ہونا چاہیئے تھا نہ کہ بعد میں۔ پیدائش کے بعد جو اندازہ لگایا جائے وہ تو قوتوں کے موقع اور محل پر استعمال کا اندازہ ہی ہو سکتا ہے۔ یعنی انسان جس وقت جس قدر قویٰ کا اظہار بالفعل کر سکتا تھا اُس کا اندازہ کرکے اللہ تعالےٰ نے اُس کے مطابق ہدایت نازل کر دی یا جس قدر بدی کا اظہار کرنے کی اُس میں قابلیت پیدا ہوئی اس کا علاج اُس نے کیا۔ جب بدیاں پُوری طرح

ظاہر ہوگئیں اور نیکیوں کے کامل طور پر ظاہر کرنے کی قابلیت اُس میں پیدا ہوگئی تو پھر اللہ تعالےٰ نے کامل تعلیم بھجوا دی۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ یہاں تقدیرِ پیدائش کا ذکر ہے انہیں غور کرنا چاہیئے کہ تقدیرِ پیدائش خلق سے پہلے ہوتی ہے کہ بعد میں۔ اگر ایک شخص دو چھٹانک کی روٹی پکانا چاہے تو وہ آٹا گوندھتے وقت ہی یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں نے دو چھٹانک کی روٹی پکانی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ روٹی پکا کر فیصلہ کرے کہ میں نے دو چھٹانک کی روٹی پکانی ہے یا ڈیڑھ چھٹانک کی۔ اس قسم کا اندازہ ہمیشہ پہلے ہوتا ہے نہ کہ بعد میں۔ اسی طرح اگر یہاں تقدیر سے مراد تقدیرِ پیدائش ہوتی تو خلق سے پہلے اس کا ذکر ہونا چاہیئے تھا مگر اللہ تعالےٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ خَلَقَ فَسَوّٰی کے بعد یہ فرمایا ہے کہ قَدَّرَ فَهَدٰی پس یہ تقدیر وہ نہیں جو پیدائش سے پہلے ہوتی ہے بلکہ اس تقدیر سے دوسری قسم کی تقدیر مراد ہے۔ ایک تقدیر قوتوں کی ہوتی ہے اور ایک تقدیر اظہارِ قوۃ کی ہوتی ہے۔ قوۃ کی تقدیر خواہ وہ روحانیات سے تعلق رکھتی ہو یا جسمانیات سے ہمیشہ خلق سے پہلے ہوتی ہے لیکن اظہارِ قوۃ کے متعلق تقدیر خلق کے بعد ہر وقت ہو سکتی ہے۔ پس اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے اظہارِ قویٰ کے متعلق اپنی تقدیر کا ہی ذکر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ انسان جس وقت جس قدر قویٰ کا بالفعل اظہار کر سکتا تھا اُس کا اندازہ کر کے اللہ تعالےٰ نے ہدایت دی ہے یہی حکمت ہے جس کے ماتحت ایک وقت تو صرف وقتی کامل تعلیمات دی گئیں اور دوسرے وقت اُسے کُلّی کامل تعلیم دی گئی۔ وقتی کامل تعلیم اُس وقت دی گئی جب انسان ابھی اپنی قوتوں کا پورا اظہار بالفعل نہیں کر سکتا تھا اور ارتقائی منازل کو طے کر رہا تھا یا ابھی ہر قسم کی بدیوں کا پورا اظہار نہیں ہوا تھا اور کُلّی کامل تعلیم اُس وقت دی گئی جب ایک طرف بدیاں پورے طور پر ظاہر ہوگئیں اور دوسری طرف نیکیوں کے پورے طور پر ظاہر کرنے کی قابلیت انسان میں پیدا ہوگئی۔

اس آیت کے ایک اور معنے بھی ہیں اور وہ یہ کہ بیشک اللہ تعالےٰ نے انسان کو معتدل القویٰ اور نقائص سے پاک بنایا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اُس نے انسان کے لئے کئی قسم کی حدبندیاں بھی قائم کر دی ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ اُن قوتوں کو بے تحاشا استعمال کرنا شروع کر دے۔ مثلاً اللہ تعالےٰ نے انسان کو یہ طاقت دی ہے کہ وہ پانی پی سکتا ہے خواہ زید کا ہو۔ بکر کا ہو۔ عمرو کا ہو۔ خالد کا ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک حدبندی قائم کر دی کہ اپنا پانی پیو دوسرے کا پانی اُس کی اجازت کے بغیر نہ پیو۔ ہمارے ہاں چونکہ پانی کثرت کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے لوگ شائد پانی کی مثال کو پورے طور پر نہ سمجھ سکیں لیکن عرب کے رہنے والے اس مثال کو خوب سمجھ سکتے ہیں کیونکہ وہاں دس دس بارہ بارہ میل سے مشکیزوں میں پانی بھر کر آتا ہے۔ اس لئے وہاں پانی کو جو قیمت حاصل ہے ہمارے ملک میں نہیں۔ یا مثلاً اللہ تعالےٰ نے کہہ دیا کہ گوشت کھاؤ مگر ساتھ ہی احکام نازل کر دیئے کہ خنزیر کا گوشت نہ کھاؤ۔ مُردے کا گوشت نہ کھاؤ۔ جس جانور کو ذبح نہ کیا گیا ہو اُس کا گوشت نہ کھاؤ۔ گویا کئی قسم کی حدبندیوں میں انسان کو جکڑ دیا گیا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جو چاہے کرے یا جو چاہے استعمال کرے۔ پھر ایک تقدیر حالات کی ہوتی ہے۔ یوں تو انسان جو چاہے کر سکتا ہے مگر خدا تعالیٰ نے انسان کو ایسے حالات میں پیدا کیا ہے کہ وہ جو چاہے کر نہیں سکتا۔ ہر ایک شخص اگر لاکھ روپیہ دینا چاہے تو وہ دے سکتا ہے مگر ہر شخص کے پاس اس قدر روپیہ ہوتا ہی نہیں کہ وہ اپنی خواہش کو پورا کر سکے۔ خیالی طور پر تو ہر شخص لاکھ بلکہ کروڑ روپیہ بھی دے سکتا ہے مگر جہاں تک عملی طور پر لاکھ یا کروڑ روپیہ دینے کا سوال ہے ہر شخص اتنا روپیہ نہیں دے سکتا۔ اسی مضمون کے مطابق اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ہر انسان کے اردگرد ہم نے ایک حدبندی قائم کر دی ہے جس میں سے وہ باہر نہیں نکل سکتا۔ یہی وہ حدبندی ہے جسے ماحول کہتے ہیں۔ گویا قَدَّرَ فَهَدٰی سے اللہ تعالےٰ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان اپنے ماحول کے مطابق چلتا ہے اُسے

صرف قویٰ ہی پیدا نہیں کئے بلکہ اُن قویٰ کے ظہور کے لئے
ایک ماحول بھی پیدا کیا ہے۔ اس ماحول کو دیکھو اسکے مطابق
ہی قویٰ ظاہر ہو سکتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے جب بھی ہدایت
نازل کی ہے ماحول کو مدنظر رکھا ہے۔ یہ ماحول مادی بھی ہوتا
ہے اور دینی بھی۔ مادی ماحول تو حیوان اور انسان سب کے
لئے ہے مگر دینی ماحول یعنی شریعت صرف انسان کے لئے ہے
اور پھر شریعت بھی مادی ماحول کے مطابق ہوتی ہے کبھی
کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا حکم ہے کبھی بیٹھ کر اور کبھی لیٹ
کر۔ یہ سب ماحول کا لحاظ ہے پس ماحول اگر کامل تعلیم کو چاہیگا
تو کامل تعلیم آئے گی اور اگر ماحول کامل تعلیم کو نہ چاہے گا
تو کامل تعلیم نہ آئے گی۔ اس کی وجہ سے اعتراض کرنا قانونِ
قدرت پر اعتراض کرنا ہے۔ اگر ماں بچہ کو کباب نہیں کھلاتی
بلکہ دودھ پلاتی ہے تو رب الاعلیٰ سے یہ کب اُمید کی جاسکتی
ہے کہ وہ بے محل تعلیم کا نزول کرے۔ قَدَّرَ فَهَدٰى میں
اللہ تعالیٰ نے یہی مضمون بیان کیا ہے کہ کامل تعلیم وُہی
ہوگی جو ماحول کے مطابق ہو۔ اگر نماز کے متعلق صرف یہی
حکم دیا جاتا کہ ہر شخص کو کھڑے ہو کر پڑھنی چاہئے تو ایک
بیمار جو کھڑا نہ ہو سکتا وہ کیا کرتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ
نے ساتھ ہی اجازت دیدی کہ اگر کوئی بیمار ہو تو بیٹھ کر نماز
پڑھ لے۔ اگر بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتا تو لیٹ کر نماز پڑھ
لے۔ گویا ماحول کو مدنظر رکھ کر اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی ہے
یہ نہیں ہوا کہ اُس نے انسان کے مادی ماحول کو نظر انداز کر دیا
ہو پس کامل تعلیم وہی ہو سکتی ہے جو قَدَّرَ فَهَدٰى کے
مطابق ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا حکم تو دیدیا مگر ساتھ
ہی کہدیا کہ یہ حکم ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ اُن لوگوں کے لئے
ہے جن کے پاس اتنا روپیہ ہو۔ اگر یہ استثنیٰ نہ کیا جاتا تو لاکھوں
لوگ اس تعلیم پر عمل نہ کر سکتے اور گنہگار بن جاتے لیکن باقی
مذاہب کی تعلیم میں اس ماحول کو مدنظر نہیں رکھا گیا مثلاً
آریہ سماج کی یہ تعلیم ہے کہ مُردہ جلانے کے لئے صندل گھی،
زعفران اور کئی قسم کی چیزیں اکٹھی کرنی چاہئیں۔ چنانچہ پنڈت
دیانند صاحب "ستیارتھ پرکاش" میں لکھتے ہیں :-

"جسم کے وزن کے برابر گھی لینا چاہئے اور فی سیر
گھی میں ایک رتی کستوری اور ایک ماشہ کیسر ڈالنا چاہئے۔
کم از کم آدھ من صندل ڈالے زیادہ چاہے جس قدر ہو۔
اگر بتحر۔ کافور وغیرہ اور پلاش (ڈھاک) وغیرہ کی لکڑیاں
ویدی میں جمانی چاہئیں۔ اور اس پر مُردہ رکھ کر چاروں
طرف ویدی کے اُوپر منہ کی طرف سے ایک ایک بالشت
تک بھر کر مُردہ کو گھی وغیرہ کی آہوتی دیکر جلانا چاہئے"
(ستیارتھ پرکاش باب ۱۳ ایڈیشن چہارم صفحہ ۵۲۲)

مَیں نے ایک دفعہ اندازہ لگایا تو یہ چیزیں جن کو مُردہ جلانے
کے لئے ضروری قرار دیا گیا تھا قریباً چھ سو روپیہ کی بنتی تھیں۔
حالانکہ کئی آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ اپنے گھر کی تمام
چیزوں کو بیچ ڈالیں تب بھی وہ چھ سو روپیہ اکٹھا نہیں کر سکتے۔
اور کئی لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کا کوئی مکان ہی نہیں ہوتا
وہ کسی کی ڈیوڑھی پر دربان کے طور پر بیٹھے رہتے ہیں نہ اُنکی
کوئی زمین ہوتی ہے اور نہ جائیداد۔ وہ لوگ اتنا گھی، صندل
کستوری اور زعفران کہاں سے لا سکتے ہیں۔ یہ ثبوت ہے اِس
بات کا کہ آریہ سماج کی یہ تعلیم قَدَّرَ فَهَدٰى کے مطابق نہیں۔
وہ انسانی ماحول کو نظر انداز کر دیتی ہے حالانکہ ہر انسان اپنے
ماحول کے مطابق ہی چل سکتا ہے۔ ماحول سے باہر نکل کر عمل
کرنا اس کے لئے ناممکن ہوتا ہے۔ پس فرماتا ہے ہم نے انسان
کو ماحول والا بنایا ہے اور اس کے اردگرد کئی قسم کی دیواریں
کھڑی کی ہوئی ہیں۔ پس ہم نے جو تعلیم دی ہے اُس میں ان
تمام حدبندیوں کو مدنظر رکھ لیا گیا ہے۔ اگر یُوں کہا جاتا کہ ہر
انسان دس روپیہ چندہ دے تو لاکھوں لوگ کافر ہو جاتے۔
کیونکہ اُن کے پاس اتنا روپیہ ہی نہ ہوتا کہ وہ چندہ دے سکتے
مگر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا بلکہ اس کی بجائے یہ کہدیا کہ جو کچھ
اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے خواہ وہ تھوڑا ہے یا بہت اُس میں سے
کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں بھی خرچ کرو۔ اب یہ وہ تعلیم ہے
جو ماحول کے مطابق ہے اس میں ایک شخص ایک پیسہ دے کر بھی

ثواب حاصل کرسکتا ہے۔ اور ایک شخص لاکھ روپیہ دے کر بھی ثواب حاصل کرسکتا ہے۔ بہرحال ماحول کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ماحول کو نظر انداز کرکے جو تعلیم دی جائے گی وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کے سلسلہ میں جس طرح فرد کے ماحول کو مدنظر رکھا ہے اسی طرح وہ قوم کے ماحول کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ اگر قومی دماغ اعلیٰ تعلیم کو سمجھنے کے قابل نہ ہو تو وہ کبھی اعلیٰ تعلیم نازل نہیں کرتا۔

الغرض تمہارا یہ اعتراض کہ قولِ فصل خدا تعالیٰ نے پہلے زمانہ میں کیوں نازل نہ کردیا بالکل غلط ہے۔ اگر قولِ فصل اُس وقت نازل کردیا جاتا تو یہ بالکل ایسی ہی بات ہوتی جیسے ایک کنگال اور فقیر کو خدا تعالیٰ یہ حکم دیدے کہ تو ایک لاکھ روپیہ چندہ میں دے۔ ظاہر ہے کہ ایک فقیر جو خود ہی پیسے پیسے کا محتاج ہے وہ ایک لاکھ روپیہ نہیں دے سکتا اسی طرح جب انسانی دماغ ابھی اپنے ارتقاء کو نہیں پہنچا تھا اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے لئے قولِ فصل کس طرح نازل کردیتا۔ قولِ فصل تو اُسی وقت نازل ہوسکتا تھا جب دماغ اپنے ارتقاء کو پہنچ جاتا اور وہ ہر قسم کی روحانی باتوں کو سمجھنے کی استعداد اور قابلیت اپنے اندر پیدا کرلیتا اگر تم یہ کہتے ہو کہ آدمؑ کو خدا نے قولِ فصل کیوں نہ دیا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر قولِ فصل کیوں نازل کردیا یہ تو رعایت معلوم ہوتی ہے کہ ایک کو اعلیٰ تعلیم نہ دی گئی اور دوسرے کو اعلیٰ تعلیم دی گئی تو ہمارا جواب یہ ہے کہ تم کیوں ایک بچے کے سر پر ایک سیر بوجھ رکھتے ہو اور ایک مضبوط آدمی کے سر پر ایک من بوجھ رکھتے ہو۔ اِسی لئے کہ تم جانتے ہو اگر ہم نے بچے کے سر پر ایک من بوجھ رکھا تو وہ مرجائیگا لیکن مضبوط آدمی اِس بوجھ کو آسانی سے اُٹھالیگا اس لئے تم بچے کو تو ایک سیر بوجھ اُٹھانے کے لئے دیتے ہو اور مضبوط آدمی کو ایک من بوجھ اُٹھانے کے لئے دیتے ہو۔ یہ رعایت نہیں ہوتی بلکہ حالات اسی بات کا تقاضا کرتے ہیں اور اگر تم اِس کے خلاف کرو تو یہ تمہارا ظلم ہوگا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قولِ فصل اُس وقت نازل کیا جب دُنیا قولِ فصل کو برداشت کرسکتی تھی۔ اگر یہ قولِ فصل اُس وقت نازل کردیا جاتا جب دُنیا اُس کو برداشت نہیں کرسکتی تھی تو یہ ظلم ہوتا احسان نہ ہوتا۔ پس تمہارا یہ کہنا کہ خدا نے پہلے نبیوں پر نعوذ باللہ ظلم کیا اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ رعایت کی کہ پہلوں پر تو قولِ فصل نازل نہ کیا اور آپؐ پر نازل کردیا یہ بالکل غلط اور بے بُنیاد اعتراض ہے۔ خدا نے ظلم نہیں کیا بلکہ اُس نے موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی قوموں پر احسان کیا کہ اُن کی طرف قولِ فصل نہ بھیجا ورنہ وہ قومیں تباہ ہوجاتیں کیونکہ اُن میں اتنی قابلیت ہی نہ تھی کہ وہ اونچ نیچ کو سمجھ کر اس وسیع تعلیم پر عمل کرسکتیں۔ یہ تعلیم اُنکی طاقتوں کو اُبھارنے والی نہیں بلکہ اُن کو توڑنے والی ثابت ہوتی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کے ذہنی ارتقاء کو مدنظر رکھ کر صرف وقتی کامل تعلیم اُتاری نہ کہ کُلّی کامل تعلیم۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا کی مختلف چیزوں میں بھی خدا تعالیٰ نے کئی قسم کی حد بندیاں مقرر کی ہوئی ہیں۔ مثلاً شیر کو اللہ تعالیٰ نے گوشت کھانیوالا بنایا ہے۔ وہ گھاس نہیں کھاسکتا لیکن گائے کو اللہ تعالیٰ نے گھاس کھانیوالی بنایا ہے وہ گوشت نہیں کھاسکتی۔ عقلمندی کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ انسان دوسرے سے وہی کام لے جس کی اُس میں قابلیت پائی جاتی ہو کیسا احمق اور نادان وہ انسان ہوگا جو گائے کو گھاس اور شیر کو گوشت کھاتے دیکھے تو کہے یہ تو بڑا ظلم ہے کہ ایک کو گوشت کھلایا جائے اور دوسرے کو گھاس۔ یا تو دونوں کو گوشت کھلانا چاہیئے یا دونوں کو گھاس۔ اگر چڑیا گھر میں کوئی شخص جائے اور وہ شیر کے سامنے گوشت اور گائے کے سامنے گھاس کو پڑا دیکھ کر کہنا شروع کردے کہ یہ تو بڑا ظلم ہے تو کیا کوئی بھی معقول انسان اُس کی تائید کرے گا۔ ہر شخص کہیگا کہ اِس میں نہ شیر کی رعایت ہے نہ گائے پر ظلم ہے۔ گائے کے اندر گھاس کھانے کی ہی قابلیت ہے اور شیر کے اندر گوشت کھانے کی ہی قابلیت ہے۔ اسی طرح روحانی تعلیم ہمیشہ انسانی قابلیتوں کے مطابق اُترتی رہی ہے۔ یہ کہنا کہ قولِ فصل پہلے ہی کیوں نازل نہ کردیا گیا ایسی ہی بات

ہے جیسے کہا جائے کہ بچے کو پہلے دن ہی روٹی کیوں نہیں دیجاتی
دُودھ کیوں پلایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص بچے کو روٹی دیگا
تو وہ بڑھے گا نہیں بلکہ مر جائے گا۔ بچے کا فائدہ اسی میں ہے کہ
اس کو دُودھ پلایا جائے۔ یا مثلاً ہڈیاں ہیں شیر کے سامنے رکھو
تو وہ اُن کو چبا جائے گا لیکن انسان کو دو تو اوّل تو وہ کھا ہی
نہیں سکیگا اور اگر کوئی بڑی ہڈی کسی طرح نگل جائے گا تو اُس کی
انتڑیوں میں زخم پڑ جائیں گے اور آخر مر جائے گا۔ پھر کئی جانور
ہیں جو پتھر کھا جاتے ہیں۔ بڑے بڑے یا گھروں میں ایسے جانور
موجود ہیں۔ اُن کے سامنے پتھر رکھو تو وہ فوراً اُن کو کھا جاتے
ہیں۔ اب اگر اس نظارہ کو دیکھ کر کوئی شخص انسان کے سامنے
پتھر رکھ دے اور کہے کہ تُو اشرف المخلوق ہے پتھر کھا کر
دکھا تو وہ احمق ہی ہوگا۔ کیونکہ اگر انسان پتھر کھائے گا تو مر جائیگا
یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے قَدَّرَ فَہَدٰی میں بیان کیا ہے
اور بتایا ہے کہ تم اِس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھو کہ تعلیم ہمیشہ ماحول
کے مطابق اُترے گی۔ اگر ماحول کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف
سے تعلیم نازل نہ ہو تو خواہ وہ کتنی ہی اعلیٰ ہو انسان کو ہلاک کرنے
والی ہوگی اُسے ترقی کی منازل کی طرف لے جانے والی نہیں ہوگی۔
پس قولِ فصل کو اِس وقت نازل کرنا پہلوں پر ظلم نہیں۔ پہلوں
کے لئے جو تعلیم مناسب تھی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل
کر دی گئی۔ جب انسان ارتقائی منازل طے کرتے کرتے اُس
مقام تک پہنچ گیا کہ قولِ فصل کا نازل ہونا ضروری ہو گیا اور
اللہ تعالیٰ نے دیکھ لیا کہ انسان میں اُس کو برداشت کرنے کی
استعداد پیدا ہو گئی ہے تو اُس نے قولِ فصل نازل کر دیا۔ پہلے
لوگوں کے لئے قولِ فصل کا نازل کرنا ظلم تھا اور بعد میں آنے
والوں کے لئے قولِ فصل کو روک لینا ظلم تھا اس لئے اللہ تعالیٰ
نے جو کچھ کیا درست کیا۔ اُس کے کسی فعل پر اعتراض کرنا نادانی
اور حماقت کا ارتکاب کرنا ہے۔

غرض اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ پر جو اعتراضات پیدا
ہوتے تھے اُن کا جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس سورۃ
میں دیا گیا ہے اور اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی اور وَالَّذِیْ
قَدَّرَ فَہَدٰی میں یہ بتایا گیا ہے کہ الٰہی سُنت یہی ہے کہ
بگاڑ ہوتا ہے اور وہ اُس کی اصلاح کرتا ہے اور الٰہی قانون
سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے انسان کو معتدل قویٰ عطا
فرمائے ہیں۔ جب اُس نے انسان کو معتدل قویٰ عطا فرمائے
ہیں تو کس طرح ہو سکتا ہے کہ اُس کی طرف سے ایسی تعلیم
نہ آئے جو معتدل ہو یعنی ہر قسم کی قوتوں کا اُس میں جواب ہو۔
جب تک ایسا نہ ہو اُس وقت تک شریعت کامل نہیں کہلا
سکتی پس ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی شریعت
آتی جو ہر قسم کی فطرت کا اپنے اندر جواب رکھتی۔ پھر یہ بھی ضروری
تھا کہ جب کبھی نوعِ انسان کے اندر بگاڑ کے سامان پیدا ہوتے
اُس کی طرف سے اصلاح کے سامان پیدا کر دیئے جاتے۔
ایک طرف انسان میں بگاڑ کی قوت کا موجود ہونا اس بات
کو چاہتا ہے کہ متعدد بار ہدایتیں آئیں اور دوسری طرف
اُس کا انسان کو معتدل القویٰ اور کامل القویٰ بنانا اِس
بات کا تقاضا کرتا ہے کہ کسی نہ کسی وقت ایسی تعلیم بھی آئے جو
اپنی ذات میں کامل ہو اور انسانی فطرت کے تمام جذبات کو
اُس میں ملحوظ رکھا گیا ہو۔ یہ دونوں معانی اَلَّذِیْ خَلَقَ
فَسَوّٰی میں بیان کئے گئے تھے۔ اور پھر انہی معانی کی تشریح
وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَہَدٰی میں کر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ
انسان کی طاقتوں کا اندازہ لگاتا اور پھر اُس اندازہ کے مطابق
ہدایت نازل کرتا ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ یہاں پیدائشی طاقتیں یا بالقوّہ
خاصیتیں مراد نہیں اس لئے کہ وہ پیدائش سے پہلے بنائی جاتی
ہیں اور یہاں خَلَقَ کے بعد قَدَّرَ کا ذکر ہے۔ پس یہاں جس تقدیر
کا ذکر ہے اُس سے مراد انسانی قویٰ کا بالفعل ظہور ہے یعنی
جس جس رنگ میں انسانی طاقتیں ظہور کرتی گئیں اسی رنگ میں
اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آتی گئی۔ پس قَدَّرَ کے یہ معنے
نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اندازہ لگایا کہ انسان میں بالقوّہ
کتنی بڑھنے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ کس طرح ہو سکتا ہے کہ
خلق پہلے ہو اور یہ خاصیتیں بعد میں پیدا کی جائیں۔ ہم جب ایک

# وَالَّذِیْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۙ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی ۝

اور جس نے (زمین سے) چارہ نکالا — پھر اسے سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا ۝۵

انجن بنانے لگتے ہیں تو اُس کے بنانے سے پہلے یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ اُس نے اتنے وزن کو کھینچنا ہے اور جب ہم یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس انجن نے اتنا وزن کھینچنا ہے تو اسکے بعد اتنی طاقت کا انجن بنا دیتے ہیں۔ اچھا صناع وہی ہوتا ہے جو انجن بنانے سے پہلے اُس کی طاقت کا اندازہ کرے اور اُس کے مطابق انجن بنائے۔ جب وہ انجن بنا لیگا تو فوراً کہدیگا کہ یہ انجن اتنا وزن کھینچ سکتا ہے لیکن اگر کوئی اناڑی انجن بنانے لگے تو وہ بیشک اندازہ نہیں لگا سکے گا اور جب انجن بن جائے گا تو کہہ دے گا دیکھ لو یہ کتنا وزن کھینچ سکتا ہے۔ جتنا وزن کھینچ لے اتنی ہی اس کی طاقت سمجھ لیں۔ بہرحال تجربہ کار کسی چیز کے بنانے سے پہلے اُس کے متعلق اندازہ لگایا کرتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ بعد میں اندازہ لگائے یا مثلاً ایک تجربہ کار مستری چارپائی بنانا چاہتا ہے تو وہ چارپائی بنانے سے پہلے یہ اندازہ لگائے گا کہ مثلاً میں جس شخص کے لئے چارپائی بنانے لگا ہوں سات فٹ کا ہے میں ساڑھے سات فٹ چارپائی بناؤں۔ کچھ چارپائی سرہانے کی طرف چلی جائیگی اور کچھ پائنتی کی طرف اور اس طرح سات فٹ کے آدمی کیلئے یہ پوری ہو جائے گی۔ لیکن اگر کوئی اناڑی چارپائی بنائے گا تو وہ اِس قسم کا اندازہ نہیں کرے گا جیسی چارپائی بھی بن جائیگی بنا کر دے دیگا خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی۔ اگر چھوٹی بنی تو کہدیگا یہ تو خراب ہو گئی ہے اب اور چارپائی بنوا لو۔ بہرحال یہ صناع کا طریق نہیں ہوتا کہ وہ بنانے کے بعد کسی چیز کے متعلق اندازہ کرے لیکن یہاں اللہ تعالےٰ نے خَلَقَ فَسَوّٰی کو پہلے رکھا ہے اور قَدَّرَ فَهَدٰی کو بعد میں رکھا ہے۔ اِس میں اسی طرف اشارہ ہے کہ یہاں اُن بالقوّہ طاقتوں کا ذکر نہیں کیا گیا جو انسان میں پیدا کی گئی تھیں بلکہ اُس کی بالفعل طاقتوں کے ظہور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جس جس وقت انسان کا جتنا نشوونما ہو چکا ہوتا ہے اور جس حد تک وہ اپنے جذبات کو خدائی قانون کے ماتحت صحیح طور پر چلا سکتا ہے اُتنی تعلیم ہم اُس کیلئے نازل کر دیتے ہیں یا جتنی خرابیاں پیدا ہوں اُن کا علاج کر دیتے ہیں۔ چنانچہ موسیٰؑ کی کتاب موسوی لوگوں کے لئے کامل تھی۔ عیسےٰؑ کی تعلیمات عیسوی لوگوں کے لئے کامل تھیں لیکن اُمتِ محمدیہ کے لئے وہ تعلیمات کامل نہیں تھیں کیونکہ اُس وقت دُنیا اور زیادہ ترقی کر چکی تھی اور ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقتی کامل تعلیم کی بجائے کُلّی کامل تعلیم نازل ہوتی۔ اب اِس کی مثال اگلی آیتوں میں اللہ تعالےٰ دُنیا کی عام پیدائش سے دیتا ہے اور لوگوں کو بتاتا ہے کہ صرف روحانی عالم میں ہی نہیں بلکہ اس مادی دُنیا میں بھی ہمارا یہی قانون جاری ہے۔

**۵ حل لغات۔** مَرْعٰی اُس گھاس پھونس کو کہتے ہیں جس کو جانور کھاتا ہے۔ اور مَرْعٰی چراگاہ کو بھی کہتے ہیں (اقرب) اِس آیت میں مَرْعٰی سے مراد گھاس پھونس ہے چراگاہ مراد نہیں۔ (مَرْعٰی)

غُثَآءً۔ یہ لفظ غُثَاءٌ اور غُثَّاءٌ دونوں طرح بولا جاتا ہے اور اِس کے معنے ردّی چیز کے ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی چیز جو ردّی ہو جائے اُس کے متعلق کہتے ہیں وہ غُثَاء ہو گئی اور غُثَاءٌ کے معنے جھاگ کے بھی ہوتے ہیں اور غُثَاءٌ کے معنے ہلاک ہونے والی چیز کے بھی ہوتے ہیں اور غُثَاءٌ درخت کے اُن پتّوں کو بھی کہتے ہیں جو گر کر سڑ جاتے ہیں۔ اور جب بارش کا پانی یا سیلاب آتا ہے تو باغوں میدانوں اور گلیوں میں سے اُن سڑے ہوئے پتّوں کو پانی اُٹھا لیتا ہے اُس وقت جھاگ میں مل کر اُن گلے سڑے پتّوں کے جو باریک باریک ذرات نکلتے ہیں اُن کو بھی غُثَاءٌ یا غُثَّاءٌ کہتے ہیں۔ (اقرب)۔ (غُثَاء)

اَحْوٰی۔ یہ لفظ حَوِیَ سے نکلا ہے حَوِیَ الشَّیْءُ (اَحْوٰی)

کے معنے ہوتے ہیں کَانَ بِہٖ حُوَّۃٌ۔ اُس میں حُوّہ پایا جاتا ہے (اقرب) اور حُوَّۃٌ کے معنے ہوتے ہیں ایسی سیاہی جو سبزی کی طرف مائل ہو۔ یا ایسی سُرخی جو سیاہی کی طرف مائل ہو۔ (اقرب) پس اَحْوٰی کے معنے ہوئے ایسی سیاہ رنگ والی چیز جس میں کچھ سبزی کی جھلک پائی جاتی ہو یا ایسی سُرخ رنگ والی چیز جس میں کچھ سیاہی کی جھلک پائی جاتی ہو۔ چونکہ اَحْوٰی کے اصل معنے ایسی سیاہ رنگ والی چیز کے ہیں جس میں سبزی کی جھلک پائی جاتی ہو اس لئے اَحْوٰی کا لفظ عربی زبان میں دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ اُس چیز کو بھی اَحْوٰی کہتے ہیں جو ایسی شدید سبز ہو کہ اُس میں سیاہی کی جھلک پیدا ہو گئی ہو جیسے اعلیٰ درجہ کی روئیدگی ہو تو اس کی سبزی سیاہی مائل ہو جاتی ہے۔ اِس قسم کی روئیدگی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ اور اسی کے متعلق سرسبز و شاداب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس کے بالمقابل اَحْوٰی کا استعمال ایسی چیزوں کے متعلق بھی کیا جاتا ہے جن میں گل سڑ کر سیاہی پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا وہ سڑی گلی چیزیں جو گھاس پھونس کی قسم میں سے ہوتی ہیں اور جو پہلے تو سبز ہوتی ہیں لیکن پانی کے ساتھ مل کر اُن میں سڑاند پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر وہ اپنا اصل رنگ چھوڑ کر سیاہ ہو جاتی ہیں اُنکو بھی اَحْوٰی کہتے ہیں۔

**تفسیر**۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اُسی اعتراض کو رد کرتا ہے جو قولِ فصل کے متعلق پیدا ہوتا تھا۔ فرماتا ہے۔ وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى وہ خدا ہی ہے جس نے چارہ کو پیدا کیا ہے اور چارہ ایک محدود اور تھوڑے زمانہ سے تعلق رکھنے والی چیز ہوتی ہے۔ بعض گھاس ایسے ہیں جو پندرہ بیس دن رہتے ہیں۔ بعض سبزیاں ایسی ہیں جو مہینہ دو مہینے رہتی ہیں اور بعض ایسی ہیں جو چار پانچ مہینے رہتی ہیں مگر اِس عرصہ کے بعد وہ سڑ گل جاتی ہیں اور خدا اُن کو غُثَآءً اَحْوٰی کر دیتا ہے یعنی اُس کو سڑی گلی چیز کر دیتا ہے۔ اور وہ اَحْوٰی ہو جاتی ہے یعنی نہ صرف یہ کہ وہ سڑی

قولِ فصل کے متعلق پیدا شدہ سوال کے جواب کے متعلق مزید وضاحت

ہوئی ہوتی ہے بلکہ گل سڑ کر سیاہی مائل ہو جاتی ہے بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز سڑ تو جاتی ہے مگر اپنا رنگ نہیں چھوڑتی لیکن کبھی اُس میں اتنی سڑاند پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنا رنگ بھی چھوڑ دیتی ہے۔ اگر صرف غُثَآءً کا لفظ استعمال کیا جاتا تو اِس کے معنے یہ ہوتے کہ وہ بیکار اور گندی چیز ہو جاتی ہے۔ مگر غُثَآءً کے ساتھ خدا تعالیٰ نے اَحْوٰی کا لفظ بھی بڑھا دیا یہ بتانے کے لئے کہ وہ اتنی گندی اور خراب ہو جاتی ہے کہ اپنا رنگ بھی چھوڑ دیتی ہے۔ جب دُنیا میں خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ بعض اشیاء اتنی ناقص اور خراب ہو جاتی ہیں تو تمہارا یہ خیال کر لینا کہ اگر خدا تعالیٰ نے تعلیم دینی ہوتی تو قولِ فصل ہی دیتا ایسی تعلیم کیوں دیتا جو بدل جائے اور ایک زمانہ کے بعد خراب ہو جائے کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ تم غور کرو اور سوچو کہ چارہ خدا نے پیدا کیا ہے یا کسی اور نے۔ سبزیاں جو تم استعمال کرتے ہو اِن کو خدا نے پیدا کیا ہے یا کسی اور نے۔ پھر کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہی گھاس اور یہی سبزیاں کچھ عرصہ کے بعد اِس طرح گل سڑ جاتی ہیں کہ اُن میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ کئی قسم کی گیسیں اُن میں سے اُٹھنے لگتی ہیں اور مختلف قسم کی بیماریوں کا وہ موجب بن جاتی ہیں۔ جب یہ سبزیاں اچھی حالت میں ہوتی ہیں تو اُس وقت انہیں جانور کھاتے ہیں۔ انسان استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے جسم اُن سے نشو و نما حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے دماغ اُن سے طاقت حاصل کرتے ہیں اور وہ اِن سبزیوں سے کئی قسم کے فوائد حاصل کرتے ہیں۔ مگر پھر یہی سبزیاں ایک دن سڑ گل کر مختلف قسم کی بیماریوں اور مُلک کی صحت کو برباد کرنے کا موجب بن جاتی ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ نے سبزیاں ترکاریاں پیدا کی ہیں جو سڑتی گلتی اور خراب ہو کر نفع کی بجائے نقصان کا موجب بنتی ہیں اور اِس سے خدا تعالیٰ کی خدائی میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ اگر تم یہ نہیں کہتے کہ یہ چیزیں خدا تعالیٰ نے پیدا نہیں کیں بلکہ کسی اور نے کی ہیں۔ بلکہ تم کہتے ہو یہ بھی خدا تعالیٰ کی قدرت ہے اور وہ بھی خدا تعالیٰ کی قدرت ہے لمبے فوائد رکھنے والی اشیاء کی

پیدائش بھی خدا تعالےٰ کی قدرت کا نتیجہ ہے۔ اور وہ سبزیاں جو چند دنوں کے بعد ہی سڑ گل جاتی ہیں اُن کی پیدائش بھی خدا تعالےٰ کی قدرت کا نتیجہ ہے تو روحانی زندگی میں تمہیں کیوں اعتراض پیدا ہوتا ہے اور کیوں تم اِس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ بعض چیزیں عارضی زندگی رکھنے والی ہوتی ہیں اور بعض مستقل۔ کوئی تعلیم تھوڑے زمانہ کے لئے ہوتی ہے اور کوئی تعلیم لمبے عرصہ کے لئے۔ خدا تعالےٰ کی مخلوق میں اِس کا ثبوت موجود ہے۔ کہ جہاں اُس نے بعض چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً ترکاریاں وغیرہ پیدا کی ہیں جو چند دنوں کے بعد ہی گل سڑ جاتی ہیں وہاں اُس نے ایسے درخت بھی پیدا کئے ہیں جو سینکڑوں سال کی زندگی رکھتے ہیں۔ اور بعض اشیاء تو ایسی ہیں کہ جب تک نسلِ انسانی رہے گی اُس وقت تک وہ چیزیں بھی قائم رہیں گی۔ مثلاً سورج اور چاند اور پہاڑ اور زمین اور کانیں وغیرہ۔ یہ مستقل وجود رکھنے والی چیزیں ہیں۔ غرض دونوں قسم کی مخلوق دُنیا میں پائی جاتی ہے۔ وہ مخلوق بھی پائی جاتی ہے جو کچھ دن فائدہ پہنچا کر ختم ہو جاتی ہے اور وہ مخلوق بھی پائی جاتی ہے جو ہمارے نقطۂ نگاہ سے ہمیشہ ہمیش چلی جاتی ہے۔ گو خدا تعالےٰ کے نقطۂ نگاہ سے وہ چیزیں بھی فانی ہیں مثلاً سورج ہے اِس کے متعلق خدا ہی جانتا ہے کہ کب پیدا ہوا۔ کوئی انسانی نسل نہیں کہہ سکتی کہ اُس نے سورج کو پیدا ہوتے دیکھا ہے۔ اِسی طرح ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ کب فنا ہوگا۔ اور نہ ہماری آئندہ نسلیں جان سکتی ہیں کہ یہ کب فنا ہوگا کیونکہ نسلِ انسانی پہلے فنا ہوگی اور سورج بعد میں۔ اور اگر بالغرض دونوں کی تباہی ایک ہی وقت ہو تب بھی جاننا کس نے ہے کہ سورج تباہ ہو گیا۔ نسلِ انسانی بھی ختم ہو جائیگی اور سورج بھی ختم ہو جائے گا۔ بہرحال کوئی ایسا زمانہ نسلِ انسانی پر نہیں آسکتا جب سورج تباہ ہو جائے اور لوگ کہیں کہ ہمارے باپ دادا سورج کو دیکھتے تھے مگر ہم نہیں دیکھ سکتے کیونکہ وہ فنا ہو چکا ہے۔ جس طرح ہم سورج کو دیکھتے چلے آئے ہیں اسی طرح ہماری آئندہ نسلیں بھی اُس کو دیکھتی چلی جائیں گی اور کوئی ایسا زمانہ نہیں آئے گا جب انسانی نسل کی موجودگی میں سورج تباہ ہو جائے اور اُس کا وجود مِٹ جائے۔ اسی طرح چاند اور ستارے اور زمین بھی اُن اشیاء میں سے ہیں جن کو خدا تعالےٰ کی طرف سے ایک لمبی زندگی دی گئی ہے۔ پہاڑ بھی اصولاً اِنہی چیزوں میں شامل ہیں گو پہاڑوں میں چھوٹی موٹی تبدیلیاں زلازل کے نتیجہ میں ہوتی رہتی ہیں مگر بہرحال پہاڑ بھی انسانی پیدائش سے پہلے موجود تھے اور آخر تک موجود رہیں گے۔

غرض دونوں قسم کی اشیاء خدا تعالیٰ کی پیدائش میں نظر آتی ہیں اور کوئی شخص اُن پر اعتراض نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ یہ بھی خدا کی قدرت کا ثبوت ہے اور وہ بھی خدا کی قدرت کا ثبوت ہے۔ دُنیا میں ہزاروں ہزار ایسی چیزیں ہیں جن میں سے کوئی دو دو دن کی زندگی پاتی ہے کوئی دس دن کی۔ کوئی چھ مہینہ کی اور کوئی صرف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی۔ برسات کے موسم میں پردار چیونٹیاں پیدا ہوتی ہیں جو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد ہی فنا ہو جاتی ہیں۔ ہمارے مُلک میں مثل مشہور ہے کہ چیونٹی کو بھی پر لگے۔ یہ خاص قسم کی چیونٹیاں برسات میں پیدا ہوتی اور تھوڑی دیر کے بعد ہی فنا ہو جاتی ہیں۔ ایک دو گھنٹہ کے بعد گھر میں دیکھو تو اُن کے ڈھیروں ڈھیر اور سیروں سیر پر پڑے ہوئے ملیں گے۔ یہ بھی خدا تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے جو صرف ڈیڑھ گھنٹہ زندگی پاتی ہے مگر کوئی شخص اِس کو دیکھ کر خدا کی خدائی پر اعتراض نہیں کرتا۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ سورج کو تو خدا تعالےٰ نے لاکھوں سال سے پیدا کیا ہوا ہے اور یہ چیونٹیاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں ہی ہلاک ہو جاتی ہیں۔ بلکہ وہ کہتا ہے یہ چیز بھی خدا کی قدرت کا ثبوت ہے اور وہ چیز بھی خدا کی قدرت کا ثبوت ہے۔ پس یہ کہنا کہ وہ خدائی تعلیم کس طرح ہو گئی جو ایک وقت کے بعد منسوخ ہو گئی اگر خدائی تعلیم ہوتی تو کبھی منسوخ نہ ہوتی بالکل احمقانہ بات ہے۔ زیادہ تر ہندوؤں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ

## سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى ۙ

ہم (اے مسلمان) تجھے (اس طرح) پڑھائیں گے۔ کہ اس کے نتیجہ میں تو بھولے گا نہیں ؎۶

اگر اپنا کلام نازل کرے تو پھر اُسے کبھی منسوخ نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی کلام منسوخ ہوجاتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ کلام خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوا تھا۔ مگر اُنکا یہ خیال قطعی طور پر غلط اور بے بُنیاد ہے۔ قانونِ قدرت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کی چیزیں پیدا کی ہیں وہ بھی جو لمبی زندگی رکھتی ہیں اور وہ بھی جو عارضی زندگی رکھتی ہیں۔ کوئی چیز ایسی ہے جو چند منٹوں میں فنا ہوجاتی ہے۔ کوئی چیز ایسی ہے جو چند گھنٹوں کی زندگی حاصل کرکے فنا ہوجاتی ہے۔ کوئی چیز ایسی ہے جو چند مہینوں کے بعد فنا ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز ایسی ہے جو چند سالوں کے بعد فنا ہوجاتی ہے اور کوئی چیز ایسی ہے کہ جب سے انسان آیا اُسے دیکھتا چلا آیا اور جب تک رہے گا اُسے دیکھتا چلا جائے گا۔

جن لوگوں نے اَحۡوٰی کے معنے نہایت سرسبز و شاداب کے کئے ہیں اُن کو یہاں مشکل پیش آئی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اور غُثَآءً ردّی اور ٹوٹی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ اور ردّی چیز کے متعلق یہ کہنا کہ وہ سرسبز و شاداب ہوجاتی ہے درست نہیں۔ اِس مشکل کا حل انہوں نے اِس طرح کیا ہے کہ اَحۡوٰی کو انہوں نے مَرۡعٰی کا حال بنا دیا ہے اور فَجَعَلَهٗ غُثَآءً کو جملۂ معترضہ قرار دیا ہے۔ گویا اُن کے نزدیک اَحۡوٰی مَرۡعٰی کے ساتھ لگتا ہے اور معنے یہ ہیں کہ جس خدا نے چارے کو نہایت سرسبز و شاداب بنایا ہے وہی خدا اُس چارہ کو کچھ عرصہ کے بعد غُثَآءً بنا دیتا ہے یعنی باوجود اُس کی سرسبزی و شادابی کے اُس پر وہ زمانہ بھی آجاتا ہے جب وہ گل سڑ جاتا ہے۔ اِسی طرح سابق تعلیمات صرف وقتی ضرورت کو پورا کرتی تھیں مگر ایک وقت کے بعد سڑ جاتی تھیں آخر وہ وقت آگیا کہ بنی نوع انسان کو مستقل شریعت دی جائے۔

### ؎۶ حل لغات۔

تَنۡسٰی۔ نَسِیَ سے مضارع مخاطب کا صیغہ ہے اور نَسِیَ الشَّیْءَ نِسۡیًا وَنِسۡیَانًا وَنِسَایَةً وَ نَسۡوَةً کے معنے ہوتے ہیں ضِدُّ حَفِظَهٗ یعنی عربی زبان میں نِسیان حفظ کے مقابل کا لفظ ہے۔ قَالَ الرَّاغِبُ: اَلنِّسۡیَانُ تَرۡكُ الۡاِنۡسَانِ ضَبۡطَ مَا اسۡتُوۡدِعَ۔ امام راغب کہتے ہیں نِسیان کے ایک معنے یہ ہیں کہ جس چیز کا خیال رکھنا انسان کے سپرد تھا۔ اُس نے اُس کا خیال ترک کردیا۔ اِمَّا لِضُعۡفِ قَلۡبِهٖ۔ یا تو حافظہ کی خرابی کی وجہ سے یعنی وہ بھول گیا۔ اَوۡ عَنۡ قَصۡدٍ حَتّٰى يَنۡحَذِفَ عَنِ الۡقَلۡبِ ذِكۡرُهٗ۔ اور یا جان بُوجھ کر وہ اُس کا خیال اپنے ذہن میں نہیں آنے دیتا یعنی وہ چیز اُسے بھولی تو نہیں مگر اُس پر عمل کرنا اُس نے چھوڑ رکھا ہے اور اُس کے ساتھ اُس کا تعلق کم ہوگیا ہے۔ وَعَلَيۡهِ وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ اَیۡ لَا تَقۡصُدُوا التَّرۡكَ وَالۡاِهۡمَالَ۔ وہ کہتے ہیں لَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ کے بھی یہی معنے ہیں کہ تم ایک دوسرے پر احسان کرنا چھوڑا نہ کرو۔ یہ مطلب نہیں کہ تم بھولا نہ کرو۔ (اقرب) گویا لغتاً ترکِ عمل کے لئے بھی نِسیان کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے پس فَلَا تَنۡسٰی کے دو معنے ہوئے ایک یہ کہ تم اسے بھولو گے نہیں اور دوسرے یہ کہ تم اسے چھوڑو گے نہیں یعنی اُس پر عمل کرنا ترک نہیں کروگے۔

**تفسیر۔** یہ بات تو اُوپر کی آیات میں بیان ہوچکی ہے کہ انبیاءِ سابقین کے زمانہ میں صرف وقتی اور عارضی تعلیمات کا آنا اور قولِ فصل کا نازل نہ ہونا خلافِ سُنّت نہیں۔ قولِ فصل اُسی وقت آسکتا تھا جب دُنیا اُس کی برداشت کرسکتی اور زمانہ کو اُس کی ضرورت ہوتی۔ چونکہ قولِ فصل کی ضرورت

تنسوا ؎۱

نزولِ قرآن کے وقت میں ہوئی اس لئے اس کا نزول اللہ تعالیٰ کی طرف سے اب ہوا ہے پہلے نہیں ہوا۔ مگر اس پر دو اعتراض اور پڑتے تھے۔ ایک یہ کہ ہم یہ کیونکر مان لیں کہ یہ کلام قولِ فصل ہے۔ مان لیا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے مگر عارضی اور زمانی اور وقتی چیزیں بھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی رہی ہیں۔ پس ہم یہ کیوں نہ سمجھ لیں کہ قرآن کریم بھی اُن ہی وقتی تعلیمات میں سے ہے۔ آخر تمہارے نزدیک تورات فنا ہوگئی یا نہیں۔ انجیل دُنیا سے مٹ گئی یا نہیں۔ یا ویدوں کا زمانہ تمہارے نزدیک ختم ہوگیا یا نہیں۔ یا ژند اور اوستا منسوخ ہوگئیں یا نہیں۔ اگر تم اِن کتب کے متعلق یہ تسلیم کرتے ہو کہ یہ مٹ گئیں تو اسی طرح ہم کیوں نہ یہ سمجھ لیں کہ اسی قانون کے ماتحت قرآن کریم بھی مٹ سکتا ہے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں تو اس کی ضرورت تسلیم کی جا سکتی ہے مگر ہم کیوں نہ یہ سمجھ لیں کہ اِس زمانہ کے گذرنے کے بعد کسی اور وقت یہ کلام اسی طرح منسوخ ہو جائے گا جس طرح سابق الہامی کتب منسوخ ہوئیں۔ اگر کہو کہ یہ کامل کتاب ہے منسوخ نہیں ہوگی تو تمہارا یہ جواب صحیح نہیں اس لئے کہ موسیٰ کی کتاب بھی تو اپنے زمانہ کے لئے کامل تھی محض تمہارا یہ کہدینا کہ اِس زمانہ کے لوگوں کے لئے قرآن کریم کامل الہامی کتاب ہے یہ ثابت نہیں کرتا کہ آئندہ بھی یہ کتاب قابلِ عمل رہے گی۔ اس سے یہ تو ثابت ہوسکتا ہے کہ موجودہ زمانہ کیلئے قرآن کریم کامل الہامی کتاب ہے مگر یہ اِس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ آئندہ کبھی بھی قرآن کریم کے علاوہ کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہوگی یا اس کی تعلیم کبھی فنا نہیں ہوگی۔ جبکہ ہو سکتا ہے کہ کسی اور زمانہ میں یہ کتاب مٹ جائے اور اس کی جگہ کوئی اور کتاب آجائے

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ کامل کتاب ہے اور ویسی ہی خوبیاں اپنے اندر رکھتی ہے جیسی تم بیان کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اس کے بعد اب کوئی اور کتاب نازل نہیں ہو سکتی تو پھر قرآن کریم یہ کیوں کہتا ہے کہ ایک اور موعود آئے گا یا محمد صلے اللہ علیہ وسلم یہ کیوں کہتے ہیں کہ میرے بعد ایک اور مامور آئے گا؟

پس یہ دو سوال ابھی قابلِ جواب باقی تھے۔ اوّل یہ کہ ہم کیونکر مان لیں کہ قرآن کریم آخر تک نہ بگڑے گا۔ اور دوسرے یہ کہ اگر یہ کامل الہامی کتاب ہے تو اِس کے بعد کسی موعود کی خبر کیوں دی گئی ہے۔ اِن دونوں سوالات کا ضمنی جواب خَلَقَ فَسَوّٰى اور قَدَّرَ فَهَدٰى میں آچکا ہے مگر وہ ضمنی جواب تھا تفصیلی جواب جو مخصوص جواب کہلاتا ہے وہ ابھی نہیں آیا۔ اب اللہ تعالیٰ دونوں سوالات کا جواب دیتا ہے:

پہلا سوال یہ تھا کہ ہم یہ کیونکر مان لیں کہ قرآن کریم قولِ فصل ہے ہم کیوں نہ یہ کہیں کہ ایک زمانہ کے بعد یہ بھی بدل جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اِس کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى۔ الٰہی قانون یہ ہے کہ جن قانونوں نے بدلنا ہوتا ہے وہ ساتھ کے ساتھ مٹتے چلے جاتے ہیں انسان کو دیکھو اُس نے چونکہ مرنا ہوتا ہے اور اُس کی جگہ کسی اور قائم مقام نے آنا ہوتا ہے اس لئے ایک عمر کے بعد وہ بوڑھا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور ضعف و اضمحلال کے آثار اُس میں پیدا ہونے لگتے ہیں جن سے صاف طور پر پتہ لگتا ہے کہ اب یہ فنا ہوگا اور اس کی جگہ کوئی اور قائم مقام کھڑا ہوگا۔ پس وہ چیزیں جن کو خاص طور پر ایک لمبے عرصہ کے لئے پیدا نہیں کیا گیا جیسے سورج ہے یا چاند ہے ایک عرصہ گذرنے کے بعد بوڑھی ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور اُن پر بڑھاپے کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ بڑھاپا انسان پر بھی آتا ہے حیوانات پر بھی آتا ہے درختوں پر بھی آتا ہے چراگاہوں پر بھی آتا ہے۔ پس الٰہی قانون یہ ہے کہ جو چیزیں مٹنے والی ہوتی ہیں اُن پر اضمحلال اور بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں جن سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ اب وہ مٹ جائیں اور اُن کی جگہ نئی چیزیں پیدا کی جائیں یہی قانون ہمیں سابق الہامی کتب کے متعلق کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کوئی ایک

الہامی کتاب بھی ایسی نہیں جو اپنی اصل صورت میں دُنیا میں پائی جاتی ہو۔ کتاب ایک ہوتی ہے مگر اُس کے کسی نسخہ میں کچھ لکھا ہوتا ہے اور کسی نسخہ میں کچھ۔ انجیل کو ہی دیکھ لو آج کل چار اناجیل ہیں مگر اِن چاروں اناجیل میں بیسیوں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ پھر یہ چار انجیلیں بھی جس رنگ میں منتخب کی کی گئی ہیں وہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو الہامی قرار دینا کسی طرح بھی درست نہیں۔ جس وقت اِن چار اناجیل کا انتخاب کیا گیا ہے اُس وقت تین سو اناجیل عیسائیوں کے پاس موجود تھیں۔ واللہ اعلم یہ بات کہاں تک صحیح ہے مگر لوگ کہتے ہیں کہ پادریوں نے لمبی بحث کے بعد جب دیکھا کہ ہم میں فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ اِن تین سو اناجیل میں سے کونسی مستند ہیں اور کونسی غیر مستند تو انہوں نے ساری انجیلیں ایک میز پر رکھ دیں اور کتابوں پر زور سے ایک ڈنڈا مارا۔ جو کتابیں اُوپر رہ گئیں اُن کو مستند قرار دے دیا اور جو نیچے گر گئیں اُن کو غیر مستند قرار دیدیا۔ جس طرح مشہور ہے کہ ایک سُست اُستاد بجائے لڑکوں کے پرچے پڑھنے کے اپنے سامنے میز پر پرچے رکھ کر زور سے ہاتھ مارتا۔ جن لڑکوں کے پرچے نیچے گر جاتے اُن کو فیل کر دیتا اور جن لڑکوں کے پرچے اُوپر رہ جاتے اُن کو پاس کر دیتا۔ اِسی طرح پادریوں نے کیا کہ انجیلیں اپنے سامنے رکھ لیں ڈنڈا ہاتھ میں لیا اور زور سے اُن کتابوں پر مارا۔ جو نیچے گر گئیں اُن کے متعلق سمجھ لیا کہ یہ غیر مستند ہیں اور جو اُوپر رہ گئیں اُن کو الہامی قرار دیدیا لیکن اگر اِس واقعہ کو درست نہ سمجھا جائے اور چار اناجیل کا انتخاب پادریوں کے غور و فکر کا نتیجہ قرار دیا جائے تب بھی اگر انسانی غور و خوض ایک کتاب کو اصلی اور الہامی کہہ سکتا ہے تو وہی غور و خوض ایک نئی شریعت بھی بنا سکتا ہے۔ اور اگر انسانی غور و فکر کوئی شریعت نہیں بنا سکتا تو انسانی غور و خوض کے نتیجہ میں قطعی طور پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں یقینی الہام ہے۔ جب ایک ہی بات کے دو مدعی ہوں تو اُس وقت اُن میں سے کسی ایک کے حق میں اُس وقت تک قطعاً فیصلہ نہیں ہو سکتا جب تک بیرونی اور اندرونی شہادت اُس فیصلہ کی تائید میں موجود نہ ہو۔ بہرحال سابق الہامی کتب کے مٹنے کا سلسلہ اُن کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ جو اِس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ کتب دائمی ہدایت کے لئے نازل نہیں ہوئی تھیں۔ اور تو اور خود اُن مذاہب کے پَیرو اور اُن کتب پر ایمان رکھنے والے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کتب ایک لمبے عرصہ سے مٹتی چلی آ رہی ہیں۔ خود عیسائی مانتے ہیں کہ اناجیل حضرت مسیح ناصریؑ کے کئی سو سال کے بعد تصنیف کی گئی ہیں اور انسانوں نے یہ کتابیں لکھی ہیں، آسمان سے نازل نہیں ہوئیں۔ پھر اناجیل کے نسخہ جات میں اختلاف خود عیسائی محققین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ یہی حال تورات کا ہے۔ تورات کی اندرونی شہادت سے یہ امر ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ کتاب مٹ گئی تھی۔ اور اِس کے مٹنے کا باعث یہ ہوا کہ چھٹی صدی قبل مسیح یعنی چودھویں صدی ابراہیمیؑ کے آخر میں جب بخت نصر نے بیت المقدس کو جلا دیا تو تورات کی مقدس کتابیں بھی جل گئیں اور یہود قید ہو کر بابل میں لیجائے گئے۔ جہاں ستر سال تک قید رہے۔ اِس اسیری کے بعد وہ رہا ہوئے۔ اور حضرت عزیرؑ جن کی کتاب پُرانے عہدنامہ میں پائی جاتی ہے انہوں نے اِس کتاب کی تدوین دیگر احبار سمیت کی اور اپنی یادداشت کی بنا پر اُسے لکھا۔

حضرت عزیرؑ کے نام سے ایک اور کتاب عیزڈراس ESDRAS یونانی زبان میں موجود ہے۔ جو حضرت عزیرؑ کی اُس کتاب کے علاوہ ہے جو پُرانے عہدنامہ میں پائی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب موجودہ بائیبل کی کتابوں میں شامل نہیں مگر بائیبل سے کسی درجہ کم معتبر نہیں۔ چنانچہ بائیبل کا جو ضمیمہ بعد میں مرتب ہوا ہے اس میں عیزڈراس کو شامل کر لیا گیا ہے۔ اِس کتاب کی دوسری کتاب کے چودھویں باب کو پڑھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح حضرت عزیرؑ نے اپنے پانچ ساتھیوں سمیت چالیس دن تک تورات کو دوبارہ لکھا۔ کتاب مذکورہ کے چودھویں باب میں جو کچھ بیان

کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہے۔ لکھا ہے :-

"دیکھو اے خدا میں جاؤں گا جیسا کہ تو نے مجھے حکم دیا ہے۔ اور جو لوگ موجود ہیں میں اُن کو فہمائش کروں گا لیکن جو لوگ کہ بعد کو پیدا ہوں گے انکو کون فہمائش کرے گا۔ اس طرح دُنیا تاریکی میں ہے۔ اور جو لوگ اس میں رہتے ہیں بغیر روشنی کے ہیں۔ کیونکہ تیرا قانون جل گیا۔ پس کوئی نہیں جانتا ان چیزوں کو جو تُو کرتا ہے۔ اور ان کاموں کو جو شروع ہونیوالے ہیں۔ لیکن اگر مجھ پر تیری مہربانی ہے تو تُو روح القدس کو مجھ میں بھیج اور میں لکھوں تمام جو کچھ کہ دُنیا میں ابتدا سے ہوا ہے اور جو کچھ تیرے قانون میں لکھا تھا۔ تاکہ تیری راہ کو پا دیں اور وہ لوگ جو اخیر زمانے میں ہوں گے زندہ رہیں اور اُس نے مجھ کو یہ جواب دیا کہ جا اپنے راستے سے لوگوں کو اکٹھا کر اور اُن سے کہہ وہ چالیس دن تک تجھ کو نہ ڈھونڈیں لیکن دیکھ تُو بہت سے صندوق کے تختے تیار کر اور اپنے ساتھ سیریا SARIA ڈبریا DABRIA سیلیمیا SELEMIA اکانس ECANUS اور اسیل ESIAL کو لے۔ اور ان پانچوں کو جو بہت تیزی سے لکھنے کو تیار ہیں اور یہاں آ۔ اور میں تیرے دل میں سمجھ کی شمع روشن کروں گا۔ جو نہ بجھے گی تاوقتیکہ وہ چیزیں پُوری نہ ہوں جو تو لکھنی شروع کرے گا۔"

(آیت ۲۱ تا ۲۵)

غرض حضرت عزیرا اور پانچ زود نویس چالیس روز تک اوروں سے الگ تھلگ جا بیٹھے اور الہامی تائید سے انہوں نے چالیس دن میں دوسو چار کتابیں لکھیں۔ (آیت ۴۴) جن میں نہ صرف تورات بلکہ وہ سب کتابیں جو حضرت موسیٰ سے لیکر حضرت عزیر تک کے پیغمبروں کی طرف منسوب تھیں شامل ہیں۔

مزید برآں یہ کہ تاریخی طور پر اس بات کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا کہ یہودیوں میں تورات کو حفظ کرنیکا رواج ہو۔ بلکہ آج تک بھی یہود میں تورات کو حفظ کرنے کا عام رواج نہیں۔ اور جبکہ اُن میں حفظ کا رواج ہی نہیں تھا یہ کیونکر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں نے دوبارہ تورات کو لکھا تھا انہوں نے اُسے صحیح طور پر ہی لکھا تھا۔ تورات کی دوبارہ تدوین یہود کی جلاوطنی کے ایک لمبے عرصہ بعد ہوئی ہے۔ بخت نصر یہود کو قید کر کے بابل لے گیا تھا اور وہاں اُس نے ایک مُدت تک اُن کو اپنی غلامی میں رکھا۔ یہ مدت قریباً ساٹھ ستر سال بنتی ہے (دیکھو تاریخ بائبل مصنفہ پادری ولیم۔ جی بلیکی۔ بارھواں باب) اس کے بعد جب سائرس فارس اور میدیا کے بادشاہ کا زور ہوا تو اُس کے ساتھ یہود نے خفیہ سمجھوتہ کیا اور اس کے حملہ آور ہونے پر اندر سے اُس کی مدد کی جس کی وجہ سے وہ بابل پر بہت جلد قابض ہو گیا۔ اس کے بعد انعام کے طور پر اُس نے بنی اسرائیل کو اپنے مُلک کی طرف واپس جانیکی اجازت دیدی۔ اُس وقت عزرا نبی کا زمانہ تھا اور انہی کے زمانہ میں دوبارہ تورات لکھی گئی۔ یہ سارا عرصہ قریباً سو سال کا بنتا ہے اور ہر شخص قیاس کر سکتا ہے کہ اس عرصہ میں کتنے لوگ زندہ رہے ہوں گے اور کتنے مر چکے ہوں گے۔ بخت نصر کے حملے اور عزرا نبی کے زمانہ میں سو سال کا جو وقفہ ہے اس میں اگر یہود کو تورات حفظ ہوتی تب بھی اتنے لمبے عرصہ کے بعد اس کا دوبارہ لکھا جانا یقینی نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ بہت سے لوگ مر چکے ہوں گے لیکن اُن میں تو حفظ کا رواج ہی نہیں تھا اس لئے انہوں نے جو کچھ لکھا قیاسی اور خیالی طور پر لکھا۔ چنانچہ اس کا ثبوت بائبل سے ہی اس رنگ میں ملتا ہے کہ پہلے تو یہ ذکر آتا ہے کہ موسیٰ سے خدا نے یہ کہا اور موسیٰ کو خدا نے یہ حکم دیا۔ مگر اس کے بعد لکھا ہے :-

"سو خداوند کا بندہ موسےٰ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مر گیا اور اُس نے اُسے موآب کی ایک وادی میں بیتِ فغور کے مقابل گاڑا۔ پر آج کے دن تک کوئی اُس کی قبر کو نہیں جانتا اور موسیٰ اپنے مرنے کے وقت ایک سو بیس برس کا تھا۔"

سلسلہ ۲۱ تورات کا طبعی مٹ جانا اور اسکے بعد لکھا جانا

سلسلہ ۲ تورات کے مٹنے کے متعلق اسکی اندرونی شہادت

کہ نہ اُس کی آنکھیں دُھندلائیں اور نہ اُس کی تازگی جاتی رہی۔" (استثناء ب ۳۴ آیت ۵ تا ۷)

اب کیا کوئی شخص تسلیم کر سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ موسےٰؑ سے کہہ رہا ہے کہ پھر موسےٰؑ مرگیا اور اُسے موآب کی ایک وادی میں گاڑا گیا۔ مگر اب اُس کی قبر کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ صاف پتہ لگتا ہے کہ موسےٰؑ کی وفات کے بعد کسی شخص نے یہ حالات لکھے ہیں اور اُس وقت لکھے ہیں جبکہ موسےٰؑ کی قبر کا بھی لوگوں کو علم نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں گئی۔ آخر ایک نبی جو لاکھوں کا سردار تھا جس پر لوگ اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اُس کی قبر اُس وقت تک گم ہی کس طرح ہو سکتی تھی جب تک حکومت کا تسلسل اُن میں پایا جاتا تھا۔ یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ عزرا نبی کے زمانہ تک سو سال یہود نے جو جلاوطنی کی زندگی بسر کی تھی اس عرصہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر بھی مٹ گئی۔ جب بنی اسرائیل دوبارہ اپنے مُلک میں واپس آئے اور تورات لکھی گئی تو اُس وقت لکھنے والوں نے یہ بات بھی بڑھا دی کہ موسیٰؑ کی قبر کا اب نشان نہیں رہا کہ وہ کہاں تھی۔ ورنہ وہ شخص جو قوم کا حاکم ہو، جو ایک جماعت کو قائم کرنے والا ہو، جو اُن کی طاقتِ سیاسی اور علمی کا مرکز ہو، جو اُن کو خاک سے اُٹھا کر بامِ رفعت تک پہنچانے والا ہو اُس کی قبر مٹ ہی کس طرح سکتی تھی ہم تو دیکھتے ہیں ہمارے ملک میں کئی معمولی معمولی پیروں اور فقیروں کی قبریں بھی نہیں مٹتیں اور موسےٰؑ تو خدا کے نبی تھے۔ ایک قوم کے امام اور پیشوا تھے۔ شرعی نبی تھے۔ اُن کی قبر اتنی جلدی کس طرح مٹ گئی۔ ہندوستان میں حضرت نظام الدین صاحبؒ اولیاء اور حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ اور حضرت احمد صاحب سرہندی اور اسی طرح اور بڑے بڑے بزرگوں کے مقابر اب تک موجود ہیں حالانکہ مسلمانوں کی حکومت ہندوستان سے مٹ چکی ہے۔ مگر باوجود اسکے کہ اب ایک غیر حکومت ہے ان لوگوں کی قبریں اب تک محفوظ ہیں۔ ہاں اگر کوئی وقت ایسا آجائے کہ ہندو غالب آجائیں۔ وہ مسلمانوں کو ہندوستان میں سے نکال دیں۔ اُن کے مقدس مقامات کو مٹا دیں اور پھر کسی دوسرے وقت مسلمان اِس مُلک میں واپس آئیں تو پھر بیشک وہ کہہ سکتے ہیں ہمیں اب یاد نہیں رہا کہ ہمارے فلاں فلاں بزرگ کی کہاں قبر تھی۔ پس یہ فقرہ جو استثناء کے آخر میں موجود ہے صاف بتا رہا ہے کہ تورات اُس وقت لکھی گئی تھی جب یہود جلاوطنی سے واپس آئے تھے۔ اور چونکہ وہ قریباً ایک سو سال تک باہر رہے ہیں اس لئے جب اپنے مُلک میں آئے۔ تو اُنہیں یاد نہ رہا کہ موسیٰؑ کی قبر کہاں تھی۔ اسی لئے یہ لکھ دیا گیا کہ اب موسیٰؑ کی قبر کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ یہ تورات کی اندرونی شہادت اِس امر کا ثبوت ہے کہ تورات مٹ گئی تھی پھر دوبارہ اپنی یادداشت کی بنا پر اُسے مرتب کیا گیا۔

ویدوں کا بھی یہی حال ہے۔ اوّل تو یہی فیصلہ نہیں ہوتا کہ وید تین ہیں یا چار۔ اور پھر وید کے منتروں میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی وید میں کوئی منتر موجود ہوتا ہے اور کسی میں موجود نہیں ہوتا۔ کسی نسخہ میں وید کے زیادہ منتر ہوتے ہیں اور کسی میں کم۔ اس کے علاوہ خود ہندو علماء نے یہ تسلیم کیا ہے کہ وید اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں بلکہ محرف و مبدل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ پنڈت شانتی دیو شاستری صاحب لکھتے ہیں:۔

"پہلے تو آج تک یہی فیصلہ نہیں ہوا کہ وید چار ہیں یا تین۔ منوسمرتی اور شتپتھ براہمن کی رو سے رگوید یجروید اور سام وید۔ یہ تین ہی وید ہیں۔ اور واجسنئی اُپنشد۔ برھمنو اُپنشد اور مُنڈک اُپنشد کی رو سے چار وید ہیں۔ الخ" (رسالہ گنگا۔ فروری ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۳۲)

پھر ساہتیہ آچاریہ پنڈت مہیندر مشر صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"زمانہ کے لحاظ سے۔ مُلک کے لحاظ سے اور تلفظ کے لحاظ سے ان (ویدوں) میں بہت سا اختلاف ہوگیا ہے۔ اور آچاریوں (معلموں) کی باہمی مخالفت کے باعث اور یگیہ میں اُن کے استعمال کی وجہ سے بھی بہت سا اختلاف پڑ گیا ہے۔ اِس طرح ہر ایک وید مختلف

شاکھاؤں (نسخوں) میں منقسم ہوگیا ہے۔ رگوید کی بیس یا اکیس شاکھائیں (نسخے) یجروید کی ایک سو ایک شاکھائیں۔ سام وید کی ہزار شاکھائیں۔ اور اتھروید کی نَو یا پندرہ شاکھائیں (نسخے) ہیں۔"

(رسالہ گنگا جنوری ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۱۴)

پھر پنڈت راجا رام صاحب پروفیسر ڈی۔اے۔وی کالج لاہور لکھتے ہیں :-

"سائن آچاریہ نے اس (اتھرووید کانڈ ۲۰ کے ۱۲۶ تا ۱۲۳ سُوکتوں کو چھوڑ دیا ہے (ان کی تفسیر نہیں کی) اور ۶۹ - ۷۰ سُوکتوں کے درمیان رگوید منڈل ۱۰ کا سُوکت ۹۹ بھی پایا جاتا ہے۔ ہیٹنی نے ایک بڑے مفصل مضمون میں ثابت کیا ہے۔ کہ (اتھروید کے آخری ۱۹ - ۲۰ کانڈ) پری شِشٹ (ضمیمہ) ہیں۔" (اتھرووید بھاشِ جلد دوم صفحہ ۸۳۱)

اسی طرح پنڈت ویدک مُنی صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"حقیقت میں جس قدر بُری حالت اتھرووید کی ہوئی ہے اتنی اور کسی وید کی نہیں ہوئی۔ سائن آچاریہ کے بعد بھی کئی سُوکت اس میں ملا دیئے گئے ہیں۔ ملانے کا ڈھنگ بہت اچھا سوچا گیا ہے۔ وہ یہ کہ پہلے اُس کے شروع اور آخر میں اتھ (شروع) اور اِتی (ختم) لکھ دیا جاتا ہے جب کسی نے پُوچھا تک نہ تب شروع آخر میں اتھ اِتی لکھنا بند کر دیا جاتا ہے۔ بس صرف اتنے سے وہ سنگھیتہ (مجموعہ) میں مل جاتا ہے جیسے رگوید سنگھیتہ میں بالکھلیہ سُوکت ملائے جا رہے ہیں۔ ویسے ہی اتھرووید کے آخر میں آجکل کُنتاپ سُوکت ملائے جا رہے ہیں۔ اگر پُوچھا جائے کہ پانچویں انوواک سے لیکر کُنتاپ سُوکتوں سمیت جتنے سُوکت اتھرووید میں ملائے جا رہے ہیں وہ کہاں سے آئے؟ تو کوئی جواب نہیں ملتا۔ جہالت کا اتنا دَور دَورہ ہے کہ آخر میں "اتھرووید سنگھیتہ سماپت" لکھا ہوا دیکھ کر ہی یقین کر لیا جاتا ہے کہ بس جو کچھ اس خاتمہ تک چھپا ہوا یا لکھا ہوا ہے وہ سب اتھر سنگھیتہ ہے۔ یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ چھاپنے والا یا لکھنے والا کون اور کتنی قابلیت رکھتا ہے۔" (وید سرو سو صفحہ ۹۵)

پھر پنڈت مہیش چندر پرشاد بی۔اے تحریر فرماتے ہیں :-

"واجسنی (شُکل یجروید سنگھیتہ) بالکل نئی طرز پر ہے۔ اس میں وید اور براہمن بھاگ الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ اس میں چالیس ادھیائے ہیں۔ مگر لوگوں کا وشواش (یقین) ہے کہ ان میں ۱۸ اصل ہیں باقی بعد میں ملائے گئے ہیں . . . . ادھیائے ۱ سے ۱۸ تک کا بھاگ تیتری سنگھیتہ (کرشن یجروید) کے ساتھ نظم و نثر میں مطابقت رکھتا ہے۔ ان ۱۸ ادھیاؤں کے ہر ایک لفظ کی تشریح اس کے براہمن میں ملتی ہے۔ مگر باقی ۱۷ ادھیاؤں کے صرف تھوڑے تھوڑے منتروں پر ہی اس میں ٹپنی (نوٹ) پائی جاتی ہیں۔ کاتیاین نے ادھیائے ۲۶ سے ۳۵ تک کو کِھل (ملاوٹ) کے نام سے لکھا ہے . . . . . ادھیائے ۱۹ سے ۲۵ ان میں بھی یگیہ کے طریقوں کا ذکر ہے۔ یہ تیتری سنگھیتہ سے نہیں ملتے۔ ۲۶ سے لیکر ۲۹ ادھیاؤں تک کچھ خاص طور پر اُنہی یگیوں کے متعلق منتروں کا ذکر ہے جن کے بارہ میں پہلے ادھیاؤں میں بیان ہے۔ اور اس سے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ضرور بعد میں ملا دیئے گئے ہیں۔"

(سنسکرت ساہتیہ کا اتہاس جلد دوم صفحہ ۱۰۱)

الغرض خود ہندو علماء نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ وید اپنی شکل میں محفوظ نہیں بلکہ محرف و مبتدل ہو چکے ہیں۔

پارسی لوگ مسلمانوں سے عداوت رکھنے کی وجہ سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اُن کی مذہبی کتب کو جلا دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اُن کے پاس زرتشتؑ کی الہامی کتاب

ویدوں کے غیر محفوظ ہونے پر ہندوؤں کے پنڈتوں کی شہادتیں

صرف چند باب رہ گئے ہیں باقی کتاب سب ضائع ہوگئی ہم تو اِس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ مسلمانوں نے اُن کی مذہبی کتب کو جلایا ہے بلکہ خود پارسی کتب سے ثابت ہے کہ سکندر کے حملہ کے وقت ژند اوستا جلا دی گئی تھیں۔ لیکن اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے تب بھی اس سے کم از کم اتنی بات تو ثابت ہوگئی کہ اب اُن کے پاس زرتشت کا کلام مکمل صورت میں محفوظ نہیں جو کچھ ہے وہ اصل کتاب کا بہت تھوڑا سا حصّہ ہے۔

غرض آج دُنیا کے پردہ پر کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہو کہ جس شکل و صورت میں جس کتاب کو مذہب کے بانی نے پیش کیا تھا اسی شکل و صورت میں وہ اب دُنیا کے سامنے موجود ہے۔ اور یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ خدا تعالےٰ نے اِن کتابوں کے متعلق یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ مٹ جائیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ چاہتا تھا اُن کی جگہ اور کتاب نازل کرے۔ ورنہ اگر خدا تعالےٰ کا یہ منشاء تھا کہ تورات دُنیا میں قائم رہے تو جس خدا تعالےٰ نے موسیٰؑ پر تورات نازل کی تھی کیا وہ اس بات پر قادر نہیں تھا کہ اُس کے مٹ جانے کی صورت میں دوبارہ ایک نبی موسیٰؑ جیسا کھڑا کر دیتا۔ اور کہتا کہ چونکہ تورات مٹ گئی ہے اس لئے اب میں تجھ پر اصل تورات نازل کرتا ہوں اِسے دُنیا میں پھیلا۔ یا کیا خدا تعالےٰ یہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جو لوگ تورات کو مٹانے لگے تھے اُن کو خود اپنے عذاب سے ہلاک کر دیتا۔ اس طرح اگر ژند اوستا قائم رہنے والی چیزیں تھیں اور خدا تعالےٰ کا منشاء یہ تھا کہ وہ دُنیا میں محفوظ رہیں اور لوگ اُن پر عمل کریں تو کیا سکندر کو خدا تعالےٰ اپنے عذاب سے کچل نہیں سکتا تھا۔ اگر خدا تعالےٰ کا یہ منشاء تھا کہ ویدوں پر ہی عمل کیا جائے تو کیا خدا اُن پنڈتوں اور وید دانوں کو مار نہیں سکتا تھا جنہوں نے وید بدلنے کی کوشش کی۔ اگر خدا تعالےٰ کا منشاء یہ تھا کہ تورات اپنی اصل صورت میں قائم رہے تو کیا خدا تعالےٰ بخت نصر کو شکست نہیں دے سکتا تھا۔ اگر خدا تعالےٰ کا منشاء یہ تھا کہ دُنیا کا انجیل پر ہی عمل رہے تو کیا اللہ تعالےٰ اُن خرابیوں کو جو عیسائیوں نے انجیل میں پیدا کر دیں دُور نہیں کر سکتا تھا۔ یقیناً خدا تعالےٰ ایسا کر سکتا تھا۔ مگر خدا تعالےٰ نے اِن تغیرات کو ہونے دیا۔ کیونکہ خدا تعالےٰ کا خود یہ منشاء تھا کہ یہ کتابیں دُنیا میں محفوظ نہ رہیں۔

۲۱۱ صحفِ آسمانی کتب کے مقابل قرآن مجید کی حفاظت

دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جن چیزوں کو خدا تعالےٰ بچانے کا ارادہ رکھتا ہے دُنیا لاکھ کوشش کرے وہ اُن چیزوں کو بگاڑ نہیں سکتی۔ جب تک عیسیٰؑ کی تعلیم کو خدا تعالیٰ نے قائم رکھنا چاہا اُس نے اس تعلیم کی حفاظت کی۔ جب تک زرتشت کی تعلیم سے اُس نے کام لینا چاہا اُس نے اُس تعلیم کو دُنیا سے مٹنے نہ دیا۔ مگر جب اِن کُتب کا کام ختم ہوگیا تو اِن کتابوں سے اپنی حفاظت بھی اُٹھالی۔ غرض اللہ تعالےٰ کی سُنت سے یہ ثابت ہے کہ وہ الہامی کُتب کو اُس وقت تک جب تک وہ دُنیا کے لئے مفید اور نفع رساں رہتی ہیں ہر قسم کے تصرف اور تحریف و الحاق سے محفوظ رکھتا ہے۔ مگر جب اُن کا کام ختم ہو جاتا ہے تو دُنیا اُن میں بگاڑ پیدا کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اسی طرح پیدائشِ عالم میں جو چیزیں عارضی فوائد کی حامل ہوں وہ ایک عرصہ کے بعد سڑ گل جاتی ہیں مگر جو چیزیں لمبے فوائد کی حامل ہوں وہ چلتی چلی جاتی ہیں۔ اسی دلیل کا ذکر اللہ تعالےٰ اِس آیت میں کرتا ہے اور فرماتا ہے سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى۔ ہم تجھے وہ تعلیم دیں گے جسے تُو بھولے گا نہیں۔ یہاں تُو سے مراد صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ ساری اُمت محمدیہ مراد ہے۔ اور یہ قرآن کریم کا طریق بیان ہے کہ کہیں صرف نبی کو مخاطب کیا جاتا ہے مگر مراد ساری جماعت ہوتی ہے۔ پس "تُو بھولے گا نہیں" سے یہ مراد نہیں کہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بھولیں گے بلکہ مراد یہ ہے کہ اُمتِ محمدیہ اِس کو نہ بھولے گی اور اِس کے الفاظ محفوظ رکھے جائیں گے۔ چنانچہ دوسری جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (حجر ع۱) ہم نے ہی قرآن کریم نازل کیا ہے اور ہم ہی اِس کی حفاظت کا وعدہ کرتے ہیں۔ پس سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى کے یہ معنے نہیں کہ قرآن کریم صرف

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یاد رہے گا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کا یاد رہنا دُنیا کے لئے حجت نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص اپنے متعلق کہہ سکتا ہے کہ مجھے یہ کلام اسی طرح یاد ہے جس طرح مجھ پر اُترا۔ اگر کہو کہ اس میں صحابہؓ بھی شامل ہیں تو سوال یہ ہے کہ صحابہؓ کا نہ بھولنا قرآن کریم کی دائمی حفاظت کا ثبوت کس طرح کہلا سکتا ہے۔ دلیل تو وہ ہوتی ہے جو مخالف کو لاجواب کرنیوالی ہو۔ آخر یہ بھی کیا دلیل ہے کہ میں قرآن کریم کو نہیں بھولا تم مجھ سے بھی سُن لو اور میرے صحابہؓ سے بھی سُن لو۔ دُنیا کہیگی یہ تو مان لیا کہ تمہیں قرآن کریم اس وقت یاد ہے مگر اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ قرآن کریم ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے گا۔ ممکن ہے صحابہؓ کو یاد رہے اور بعد کے لوگ بھول جائیں پس یہ کوئی ایسی دلیل نہیں جسے مخالف کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ اور اُسے قرآن کریم کی حفاظت کے متعلق اطمینان دلایا جا سکے۔ وہ شخص جو ایمان اچھا نہ رکھتا ہو وہ تو مان لے گا مگر قرآن صرف مومنوں کے لئے نہیں بلکہ دشمنوں کے سامنے پیش کرنے کیلئے بھی ہے۔ خود قرآن کریم اس سورۃ کے شروع میں ہی فرماتا ہے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تُو اپنے رب کی تسبیح کر اور اُس کی صفات کا ہر قسم کے نقائص سے منزہ ہونا لوگوں پر ظاہر کر۔ پس جبکہ قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ اُسے دُنیا کے سامنے پیش کیا جائے تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُس کی صداقت کے متعلق ایسی ہی دلیل پیش کر سکتے تھے جو مخالفین پر حجت تمام کرنے والی ہو۔ نہ کہ ایسی دلیل جو صرف مومنوں کے دلوں کو اطمینان دلانے والی ہو۔ میں بتا چکا ہوں کہ اگر فَلَا تَنْسٰۤى سے صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپؐ کے صحابہؓ مراد لئے جائیں تو کوئی ایسی دلیل نہیں بنتی جو مخالفین کے لئے حجت کا کام دے سکے۔ اور چونکہ قرآن کریم کی صداقت کو دُنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس آیت کے ایسے معنے کئے جائیں جو قرآن کریم کی شان اور اُس کی عظمت کے مطابق ہوں۔ اور جس کی دوسری آیات سے بھی تائید ہوتی ہو اور وہ معنے یہی ہیں کہ فَلَا تَنْسٰۤى میں صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مراد نہیں بلکہ آپؐ بھی اور آپؐ کے تمام متبع بھی مراد ہیں۔ اور اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ ہم تمہیں وہ کلام سکھائیں گے جسے قیامت تک تم نہیں بھولو گے۔ بلکہ یہ کلام اسی طرح محفوظ رہے گا جس طرح اِس وقت ہے۔ چنانچہ اس دعوے کا ثبوت یہ ہے کہ اسلام کے اشد ترین معاند بھی آج کھلے بندوں تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کریم اُسی شکل و صورت میں محفوظ ہے جس شکل و صورت میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس کو پیش فرمایا۔ نولڈکے۔ سپرنگر اور ولیم میور سب نے اپنی کتابوں میں تسلیم کیا ہے کہ قطعی اور یقینی طور پر ہم سوائے قرآن کریم کے اور کسی کتاب کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ جس شکل میں بانی سلسلہ نے وہ کتاب پیش کی تھی اسی شکل میں وہ دُنیا کے سامنے موجود ہے۔ صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے متعلق حتمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جس شکل میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو یہ کتاب دی تھی اسی شکل میں اب بھی محفوظ ہے۔ وہ لوگ چونکہ اس بات کے قائل نہیں کہ قرآن کریم خدا تعالےٰ نے نازل کیا ہے بلکہ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ کتاب خود بنائی ہے اس لئے وہ یہ تو نہیں کہتے کہ جس شکل میں یہ کتاب نازل ہوئی تھی اُسی شکل میں محفوظ ہے مگر وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ جس شکل میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ کتاب پیش کی تھی اسی شکل میں یہ کتاب اب تک دُنیا میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ سر ولیم میور اپنی کتاب "دی کران" (القرآن) میں لکھتے ہیں:۔

"یہ تمام ثبوت دل کو پوری تسلی دلا دیتے ہیں کہ وہ قرآن جسے ہم آج پڑھتے ہیں لفظاً لفظاً وہی ہے جسے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو پڑھکر سُنایا تھا" (صفحہ ۴۰)

پھر سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اب جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے گو یہ بالکل ممکن ہے کہ محمد (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) نے اپنے زمانہ میں اسے خود بنایا ہو۔ اور بعض دفعہ اس میں خود ہی

بعض تبدیلیاں بھی کردی ہوں۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ وہی قرآن ہے جو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں دیا تھا۔"

اسی طرح سے لکھتے ہیں کہ:۔

"ہم نہایت مضبوط قیاسات کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ ہر ایک آیت جو قرآن میں ہے وہ اصلی ہے۔ اور محمد (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی غیر محرف تصنیف ہے۔"

پھر نولڈکے جرمن مستشرق لکھتا ہے کہ:۔

"ممکن ہے کہ تحریر کی کوئی معمولی غلطیاں (یعنی طرزِ تحریر کی) ہوں تو ہوں لیکن جو قرآن عثمانؓ نے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا اس کا مضمون وہی ہے جو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے پیش کیا تھا۔ گو اس کی ترتیب عجیب ہے۔

قرآن مجید کے محفوظ ہونے پر یورپین علماء کی شہادتیں

یورپین علماء کی یہ کوششیں کہ وہ ثابت کریں کہ قرآن میں بعد کے زمانہ میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی۔ بالکل ناکام ثابت ہوئی ہیں۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ قرآن)

الغرض یورپین مصنفین نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ جہاں تک قرآن کی ظاہری حفاظت کا سوال ہے اس میں کسی قسم کا شُبہ نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً یہ وہی کتاب ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو پڑھکر سنائی۔

غور کرو اور سوچو کہ کتنی عظیم الشان پیشگوئی ہے جو اِن چند الفاظ میں کی گئی کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى۔ اور پھر یہ پیشگوئی اس زمانہ میں کی گئی ہے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر صرف چند لوگ ایمان لانے والے پائے جاتے تھے سارا دُنیا آپؐ کی مخالف تھی۔ اور وہ آپؐ کے نام کو صفحۂ ہستی سے معدوم کرنے کے لئے تُلی ہوئی تھی۔ یہ نہیں کہ لاکھوں اور کروڑوں لوگ آپؐ کے ساتھ ہوں اور آپؐ ایک جتھا کو اپنے ارد گرد دیکھ کر کہنے لگ گئے ہوں کہ اب اس کتاب کو کوئی مٹا نہیں سکتا بلکہ آپؐ یہ پیشگوئی ایسی حالت میں کرتے ہیں جب آپؐ دُنیا کے ہر تیر کا نشانہ بنے ہوئے تھے اور آپؐ پر ایمان لانیوالے انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ ایسی نازک اور کمزور حالت میں آپؐ فرماتے ہیں یہ قرآن دُنیا میں قائم رہے گا اور کوئی شخص اِس کو مٹانے کی قدرت نہیں رکھیگا۔ لاکھوں اور کروڑوں ماننے والوں کے ہوتے ہوئے وید بدل گئے۔ لاکھوں اور کروڑوں ماننے والوں کے ہوتے ہوئے تورات بدل گئی۔ لاکھوں اور کروڑوں ماننے والوں کے ہوتے ہوئے انجیل بدل گئی۔ لاکھوں اور کروڑوں ماننے والوں کے ہوتے ہوئے زرتشت کی کتابیں بدل گئیں۔ لیکن ایک انسان جس کے ساتھ صرف اسّی۔ نوّے آدمی ہیں۔ وہ ایک ایسے مُلک میں جہاں حفاظت کا کوئی سامان نہ تھا۔ جہاں کسی قسم کی لائبریریاں نہ تھیں جہاں کسی قسم کی تعلیم کا رواج نہ تھا۔ اعلان کرتا ہے کہ میری یہ کتاب ہمیشہ محفوظ رہیگی۔ قیامت تک قائم رہے گی۔ اور دُنیا اس کے ایک شوشہ کو بھی بدلنے کی طاقت نہیں رکھیگی۔ اگر مکہ کے لوگ پڑھے لکھے ہوتے جب بھی خیال کیا جاسکتا تھا کہ شاید مکہ کے لوگوں کی تعلیمی قابلیت کو دیکھ کر ایسا اعلان کیا گیا ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ کی قدرت دیکھو کہ اسلام اُن لوگوں میں آیا جو لکھنا بھی نہیں جانتے تھے۔ ابتدائی کی صحابہؓ میں سے صرف تین چار ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ سات افراد سمجھ لو۔ اور کُل جماعت جو آپکے ارد گرد تھی وہ اسّی نوّے افراد سے زیادہ نہیں تھی۔ ایسی حالت میں یہ کتنی زبردست اور عظیم الشان پیشگوئی ہے کہ ہم تجھے قرآن پڑھائیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تُو قرآن کو بھُولے گا نہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے ہم نے دوسروں کو خاص طور پر نہیں پڑھایا مگر تیرے لئے چونکہ ہماری ربوبیّت اعلیٰ ظاہر ہوئی ہے اس لئے ہم تجھے ایسا اعلیٰ درس دیں گے جو تجھے کبھی نہیں بھُولے گا۔ یعنی وہ کلام جو تجھ پر نازل ہوگا وہ ہمیشہ دُنیا میں قائم رہے گا۔ اب دیکھو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کے کیسے سامان پیدا فرما دیئے کہ نہ صرف اُس نے باطنی حفاظت کی بلکہ ظاہری حفاظت کے لئے بھی اُس نے

متعدد سامان پیدا کر دیئے۔

پہلا سامان جو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کی ظاہری حفاظت کے لئے کیا وہ یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معاً بعد مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اگر ایک ہی متفق جتھہ حکومت کرتا رہتا تو ممکن تھا کہ کسی وقت ایمان کی کمزوری پیدا ہو کر وہ اپنی مرضی کے خلاف آیات قرآن کریم میں سے نکال دینے کی کوشش کرتا۔ مگر آنحضرت صلعم کی وفات کے معاً بعد اِدھر انصار میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ ہم خلافت کے مستحق ہیں اور اُدھر مہاجرین میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ ہم خلافت کے مستحق ہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں اُن میں رقابت اور اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور وہ ایک دوسرے کے حالات کے کڑے نگران بن گئے۔ دیکھ لو اِس وقت ہم میں اور غیر مبائعین میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف خواہ کس قدر تکلیف دہ ہو مگر اس میں کیا شُبہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں ہم ایک دوسرے کے نگران رہتے ہیں۔ ذرا کوئی بات ہو تو ہم شور مچا دیتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو ایسا لکھا ہے اور تم اِس کے خلاف بات پیش کر رہے ہو۔ اِسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معاً بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی آپس میں رقابت پیدا کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر فریق دوسرے کے حالات کا نگران بن گیا اور کسی بے ایمان سے بے ایمان کو بھی جُرأت نہ ہوئی کہ وہ قرآن کریم میں کسی قسم کی تحریف یا تغیر پیدا کر سکے پھر اُس وقت جب ابھی ہزاروں ہزار لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے زندہ تھے اللہ تعالیٰ نے شیعوں اور سُنّیوں کا اختلاف پیدا کر دیا۔ اور پھر خوارج کا گروہ نمودار ہو گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دَور میں شیعہ اور سُنّی دو گروہ بن چکے تھے۔ چنانچہ عبد اللہ بن سبا شیعیت کے خیالات سے ہی متاثر تھا جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اسلام کے خلاف بہت بڑا فتنہ برپا کیا۔ بغرض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چوبیس سال بعد جب ابھی ہزارہا صحابہؓ موجود تھے شیعہ اور سُنّی کا نزاع شروع ہو گیا۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریباً ۳۲ سال بعد خوارج پیدا ہو گئے۔ یہ شیعہ سُنّی اور خوارج تینوں قرآن کریم پر ایمان رکھتے تھے اور اِس وجہ سے تینوں ایک دوسرے کے رقیب اور نگران بن گئے جو قرآن کریم کی ظاہری حفاظت کا ایک عظیم الشان ذریعہ ثابت ہوا۔ پھر اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے شیعوں میں یہ خیال بھی پیدا کر دیا کہ قرآن کریم کا کچھ حصہ حضرت علیؓ کے پاس تھا مگر انہوں نے اس کو ظاہر نہ کیا۔ اب وہ حصہ امام غائب کے پاس ہے جب وہ ظاہر ہوں گے تو قرآن کریم کا وہ حصہ بھی اپنے ساتھ لائیں گے اب دیکھو یہ کیسی عجیب بات ہے کہ شیعہ قرآن کریم پر حملہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا ایک حصہ امام غائب کے پاس ہے مگر اس کے باوجود وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ قرآن کریم میں سے کوئی ایک آیت بھی کم نہیں۔ بلکہ لفظ بلفظ وہی کلام ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا۔ باقی رہا اُن کا یہ کہنا کہ قرآن میں سے دس پارے غائب ہیں اِس کا جواب یہ ہے کہ اگر دس پارے قرآن کریم میں نہیں ہیں تو اس کا لازماً یہ مطلب ہے کہ قرآن کریم احکام شرعی کے لحاظ سے مکمل کتاب نہیں بلکہ اس میں ابھی کئی قسم کے نقائص ہیں۔ کیونکہ دس پارے جو غائب ہیں اُن میں بھی آخر اللہ تعالیٰ کے احکام ہوں گے۔ اور جبکہ وہ پارے اِس قرآن کے ساتھ شامل نہیں تو لازماً اس میں کمی پائی جائے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسے احکام ہیں جو قرآن کریم میں موجود نہیں ہیں۔ آخر دس پاروں کے غائب ہونے کے نتیجہ میں چاہیئے تھا کہ بعض مذہبی مسائل نامکمل رہتے بعض تمدنی مسائل حل نہ ہوتے۔ بعض عبادات سے تعلق رکھنے والی تعلیمیں اِس میں موجود نہ ہوتیں۔ مگر ہمیں تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ کوئی ایک مذہبی تعلیم بھی نہیں ہے جو قرآن کریم میں موجود نہ ہو۔ کوئی ایک تمدنی مسئلہ بھی نہیں ہے جسے قرآن کریم نے حل نہ کیا ہو اور عبادات سے تعلق رکھنے والی کوئی ایک تعلیم بھی نہیں ہے جسے

قرآن مجید کی ظاہری حفاظت کے لئے خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ چھ سامان

پہلا سامان اختلافات مسلم

اللہ تعالیٰ نے بیان نہ کیا ہو۔ یہ قرآن اپنی تعلیم اور اپنے احکام اور اپنے اوامر اور اپنے نواہی کے لحاظ سے ہر طرح کامل ہے کسی قسم کا نقص اس میں پایا نہیں جاتا اور جب صورت حالات یہ ہے تو یہ کہنا کہ دس پارے غائب ہیں کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتا اگر دس پارے غائب ہوتے تو ضروری تھا کہ مسائل اسلامیہ میں کمی آجاتی مگر ہمیں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ اور نہ شیعہ یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ موجودہ قرآن میں کسی قسم کی کمی پائی جاتی ہو یا کوئی ضروری بات اس میں بیان ہونے سے رہ گئی ہے۔ اور جبکہ وہ بھی موجودہ قرآن کے کامل ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور ساتھ ہی کسی قسم کی کمی بیشی نہیں کرسکتے تو اُن کا یہ دعویٰ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ کہ اس قرآن میں سے دس پارے غائب ہیں۔ بہرحال خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کی ظاہری حفاظت کا ایک سامان یہ کیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معاً بعد مسلمانوں میں اختلاف پیدا کر دیا تاکہ وہ ایک دوسرے کے نگران رہیں اور کوئی فریق قرآن کریم میں دست برد نہ کرسکے۔

دوسرا سامان حفاظ کی کثرت

**دوسرا سامان** خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کے لئے یہ کیا کہ حفاظ و قراء کو اس کثرت کے ساتھ پیدا کر دیا کہ دُنیا میں اس کی اور کہیں نظیر نہیں ملتی۔ قرآن کریم پہلی الہامی کتاب نہیں جو دُنیا میں نازل ہوئی ہو بلکہ اس سے پہلے اور بھی کئی الہامی کتابیں نازل ہو چکی ہیں مگر کسی ایک کتاب کو بھی یہ بات میسر نہیں آئی کہ اُسے اس کے ماننے والوں نے حفظ کیا ہو۔ لیکن قرآن کریم وہ کتاب ہے جس کے لاکھوں حفاظ آج بھی دُنیا میں موجود ہیں اور وہ شروع سے لے کر آخر تک اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف سُنا سکتے ہیں۔ مَیں جب انگلستان گیا تو کسی شخص نے مجھ سے کہا کہ قرآن پر ایک بڑا زمانہ گذر چکا ہے اور پھر اُس وقت تو تحریر کا بھی رواج نہیں تھا اس لئے قرآن کریم کے متعلق یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ وہی کتاب ہے جو آج سے تیرہ سو سال پہلے دُنیا کے سامنے پیش کی گئی۔ مَیں ۱۹۲۴ء میں انگلستان گیا تھا اور اُس وقت ناصر احمد کی عمر ۱۵ سال کی تھی اور وہ قرآن کریم کو حفظ کر چکا تھا۔ مَیں نے اُسے جواب دیا کہ بے شک تحریر کا اُس وقت رواج نہیں تھا مگر حفاظ کا وجود پایا جاتا تھا لوگ اِس کتاب کو حفظ کر لیتے تھے اور اس طرح سینہ بسینہ نسلاً بعد نسل لوگ اس کو یاد رکھتے چلے جاتے تھے۔ اُس نے کہا اتنی بڑی کتاب کو کون حفظ کرسکتا ہے۔ مَیں نے کہا عربوں کا حافظہ تو دُنیا میں مشہور ہے۔ لاکھوں اشعار ایک ایک شخص کو یاد ہوا کرتے تھے۔ اُن کے لئے قرآن کریم کو حفظ کر لینا کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ مگر تم عربوں کا ذکر جانے دو میرا لڑکا جس کی عمر صرف پندرہ سال ہے اُس نے سارا قرآن کریم حفظ کیا ہوا ہے۔ یہ سُنکر وہ حیران ہو گیا کہ اتنی بڑی کتاب کو اُس نے کس طرح حفظ کر لیا۔ مَیں نے کہا ہمارے ہاں تو قرآن کریم حفظ کرنے کا عام رواج ہے۔ لوگ اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ اپنے بچوں کو قرآن کریم حفظ کراتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا ان کو حاصل ہو گئی۔ یورپین لوگ اِس بات کا قیاس بھی نہیں کرسکتے جس کی وجہ یہ ہے کہ اُنہیں یہ نعمت ملی ہی نہیں اور اِس وجہ سے وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ اتنی بڑی کتاب کو کس طرح حفظ کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں میں حفظ قرآن کا اس قدر رواج تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک غزوہ میں دشمن نے ستر حفاظ مار ڈالے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے دادا مرزا گل محمد صاحب کے متعلق بیان فرمایا کرتے تھے کہ اُن کے دربار میں پانچ سو حافظ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سپاہی وغیرہ ہر قسم کے پیشہ کے لوگ جو اُن کے دربار میں تھے اُن میں سے ایک کثیر حصّہ نے قرآن کریم کو حفظ کیا ہوا تھا۔ اِس زمانہ میں مسلمانوں کی حالت سخت کمزور ہے اور وہ تنزل کے دَور سے گذر رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود مَیں سمجھتا ہوں لاکھوں لاکھ حفاظ ہندوستان میں سے ہی نکل سکتے ہیں۔ غرض دوسرا ذریعہ قرآن کریم کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے یہ کیا کہ حفاظ و قراء کی کثرت پیدا کر دی۔ اور یہ چیز بھی ایسی ہے جو کسی کے بس کی نہیں۔ غرض قرآن کریم

کی حفاظت کا ایک سامان خدا تعالیٰ نے یہ کیا کہ دلوں میں اس کے حفظ کی رغبت پیدا کر دی۔ اور اِس طرح لاکھوں لوگوں کے سینوں میں اس کا ایک ایک لفظ بلکہ زیر اور زبر تک محفوظ کر دی۔

تیسرے رغبت کے علاوہ بعض طرز کلام ایسا ہوتا ہے جس کا حفظ کرنا آسان ہوتا ہے اور بعض طرز کلام ایسا ہوتا ہے جس کا حفظ کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے ایسے اسلوب پر نازل کیا ہے کہ نثر ہونے کے باوجود شعروں کی طرح ہے اور اُس کا یاد کرنا نہایت آسان ہے دُنیا کے کسی لڑکے کو تم اُردو کا ایک صفحہ دیدو اور ایک صفحہ قرآن کریم کا دیدو اور اُسے کہو کہ وہ اِن دونوں کو یاد کرے۔ تو قرآن کریم کا صفحہ وہ جلد یاد کرلے گا لیکن اُردو کا صفحہ یاد کرنا اُس کے لئے بہت مشکل ہوگا۔ پھر اگر کچھ دیر گذرنے کے بعد اُس سے دوبارہ سنو کہ اُس کے حافظہ میں قرآن اور اُردو کہاں تک محفوظ ہے تو اُردو والے صفحہ میں سے وہ شائد ایک سطر بھی سُنا نہیں سکے گا لیکن قرآن کو وہ اچھی طرح سُنا دے گا۔ پس تیسرا ذریعہ قرآن کریم کی ظاہری حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار کیا کہ اُسے ایسا اسلوب کلام بخشا جس کا یاد کرنا بہت ہی آسان ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ایک یورپین مصنف کا میں نے ایک حوالہ پڑھا ہے۔ وہ لکھتا ہے قرآن کریم کے تراجم کرنے میں یورپین مصنف اس لئے غلطی کھا جاتے ہیں کہ وہ اس کے سٹائل کو نہیں دیکھتے۔ قرآن کریم کا سٹائل ایسا غضب کا ہے کہ وہ نہ نظم ہے نہ نثر دونوں سے علیحدہ چیز ہے مگر چونکہ یورپین مصنف اس سٹائل کو نہیں سمجھتے اس لئے وہ قرآن کریم کے معانی کرنے میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے قرآن کریم کو ترجمہ سے سمجھنے کی کوشش کرنا اور اُس کے معانی کو استنباط کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی زبور کی آیات کے نثر کے ترجمہ سے اُن کا مطلب سمجھنا چاہے۔ زبور بھی ایسے سٹائل میں ہے جو شاعرانہ ہے وہ کہتا ہے زبور کا اگر نثری رنگ میں کوئی شخص ترجمہ کردے تو دوسرے لوگ نہیں سمجھ سکیں گے کہ زبور میں کیا کہا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کو ایسے خوشنما رنگ میں ڈھالا گیا ہے کہ محض نثر میں اس کا ترجمہ کرنے سے اُس کے باریک مطالب تک انسانی ذہن نہیں پہنچ سکتا۔ غرض قرآن کریم کو ایسا سٹائل بخشا گیا ہے کہ اُس کا حفظ کرنا اور سب عبارتوں سے زیادہ سہل اور آسان ہے۔ وہ نہ نثر ہے نہ نظم بلکہ ایک علیحدہ چیز ہے جس سے اُس کے حفظ کا پہلو خاص طور پر مضبوط ہوگیا ہے۔

قرآن مجید کی حفاظت کا تیسرا سامان یعنی اس کا عجیب اسلوب بیان

چوتھی چیز جس کا قرآن کریم کی ظاہری حفاظت کے ساتھ تعلق ہے وہ مسلمانوں میں علم قلم کی کثرت ہے جو اس سے پہلے کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ ادھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا اور اُدھر مسلمانوں میں قلم کا اتنا رواج ہوا اتنا رواج ہوا کہ اس سے پہلے دُنیا کی تاریخ میں علم قلم کی کثرت کا کہیں ثبوت نظر نہیں آتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سوا ڈیڑھ سو سال بعد ہی اس کثرت سے کتابیں پھیل گئیں کہ بعض شہروں میں ہزار ہزار دو دو ہزار کتب خانہ تھا اور ایک ایک شہر میں چھ چھ لاکھ کتابیں تھیں۔ یورپین لوگ کہتے ہیں کہ آجکل مطبع کی ایجاد کی وجہ سے کتابوں کی کثرت ہوگئی ہے مگر سوال یہ ہے کہ مطبع کی ایجاد سے پہلے مسلمانوں میں کتابوں کا رواج کہاں سے آگیا۔ یہ سب اُس پیشگوئی کی صداقت کا ثبوت تھا جو قرآن کریم میں اِن الفاظ میں کی گئی تھی کہ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۔ (العلق ع۱) مسلمان جب فن تحریر حاصل کر لیتے تو اس کے بعد سب سے پہلے برکت کے لئے وہ قرآن کریم ہی لکھا کرتے تھے۔ اورنگ زیب تک کی یہ حالت تھی کہ وہ برکت کے لئے روزانہ کچھ نہ کچھ حصہ قرآن کریم لکھا کرتا تھا۔ غرض لکھنے کا رواج مسلمانوں میں اتنا چلا اتنا چلا کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ لاکھوں کروڑوں دفعہ تحریر میں آگیا اور مختلف شہروں اور مختلف ملکوں میں اللہ تعالیٰ نے اس کو پھیلا دیا۔ ممکن ہے کوئی شخص کہہ دے کہ قرآن کریم کا تحریر میں آنا تو بہت بعد کی بات ہے ابتدائی زمانہ میں ایسا

قرآن مجید کی حفاظت کا چوتھا سامان کثرت تحریر کا رواج

نہیں تھا۔ سو اِس شُبہ کے ازالہ کے لئے مَیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ بات درست نہیں۔ مُسلمانوں میں نہایت کثرت کے ساتھ قرآن کریم کو لکھنے کا رواج تھا۔ یہانتک کہ تاریخوں میں آتا ہے کہ جب حضرت علیؓ اور معاویہؓ کا جھگڑا ہوا اور آپس میں جنگ ہوئی تو حضرت معاویہؓ کے ساتھیوں نے عین میدان جنگ میں پانچ سو قرآن اپنے سونٹوں پر باندھ کر کھڑا کر دیا اور کہا کہ ہم قرآن فیصلہ کے لئے پیش کرتے ہیں۔ اس سے آپس کے جھگڑے کا فیصلہ کر لو۔ ہمیں اِس کا فیصلہ منظور ہے۔ جس پر بعض نادان اور بیوقوف لوگ جو حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل تھے انہوں نے بغاوت کر دی اور کہا کہ جب یہ لوگ قرآن فیصلہ کیلئے پیش کر رہے ہیں تو ہمیں کسی لڑائی کی کیا ضرورت ہے۔ اِس واقعہ کا جو بھی نتیجہ نکلا اس سے یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں قرآن کریم کو لکھنے کا اسی ابتدائی زمانہ میں اتنی کثرت کے ساتھ رواج پایا جاتا تھا کہ حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے لشکروں میں جو چند ہزار کے ہی ہو سکتے تھے صرف ایک فریق کے پاس کم از کم پانچ سو قرآن موجود تھا۔ اِس سے اندازہ لگا کر کہا جا سکتا ہے کہ اُس وقت تک قرآن کریم کی یقیناً لاکھوں کاپیاں تیار ہو چکی ہوں گی جو سفر اور حضر میں مسلمان اپنے پاس رکھتے ہوں گے۔ پس یہ بھی ایک ذریعہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کے متعلق اختیار کیا۔

حفاظتِ قرآن کا پانچواں سامان۔

**پانچواں سامان** اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کے لئے یہ کر دیا کہ اسلام شروع میں ہی مختلف ممالک میں پھیل گیا۔ چنانچہ ابھی ہزاروں صحابہؓ زندہ تھے کہ اسلام شام میں بھی پہنچ گیا۔ عراق میں بھی پہنچ گیا فلسطین میں بھی پہنچ گیا۔ انطاکیہ میں بھی پہنچ گیا۔ ایران میں بھی پہنچ گیا۔ مصر میں بھی پہنچ گیا۔ اِسی طرح افریقہ کے مختلف علاقوں تک اسلام کا نام جا پہنچا۔ یہاں تک کہ صحابہؓ چین تک گئے اور انہوں نے اسلام کی اشاعت کی۔ ہندوستان میں آئے اور یہاں انہوں نے اسلام پھیلایا۔ سندھ میں جہاں ہماری زمینیں ہیں وہاں ایک گاؤں ہے جسے دیہہ صالو کہا جاتا ہے یعنی صحابیؓ کا گاؤں اور وہاں ایک قبر بھی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسی صحابیؓ کی قبر ہے۔ اِدھر تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہؓ ہندوستان میں آئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ بات درست ہی ہو کہ وہ کسی صحابیؓ کی قبر ہے۔ گو یقینی شواہد پر ہم اِس بات کی بُنیاد نہیں رکھ سکتے۔ مگر یہ روایتیں خواہ کس قدر کمزور اور ضعیف ہوں بہرحال پُرانے زمانہ سے چلی آ رہی ہیں اور اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ میں ہی صحابہؓ عرب سے نکل کر دُنیا کے مختلف ممالک میں پھیل گئے اور انہوں نے اسلام کو پھیلانا شروع کر دیا۔ اور چونکہ وہ جہاں بھی جاتے قرآن کریم کی کاپیاں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے اِس ذریعہ سے قرآن کریم کی ہزاروں کاپیاں یکدم سارے جہان میں پھیلا دیں اور مختلف اقوام اس کی حفاظت میں مشغول ہوگئیں۔ یہ بھی ایک ذریعہ تھا جو قرآن کریم کی ظاہری حفاظت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا۔

قرآن مجید کی حفاظت کا چھٹا سامان۔

**چھٹا سامان** اللہ تعالیٰ نے حفاظتِ قرآن کریم کے متعلق یہ پیدا کیا کہ شروع میں ہی عربی زبان مختلف ممالک میں پھیل گئی اور اِس وجہ سے ترجمہ کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ ہر مُلک کے لوگ عربی زبان میں ہی قرآن کریم کو سمجھ سکتے تھے۔ فرض کرو اگر عربوں کا فائدہ قرآن کریم کے بگاڑنے میں ہوتا تب بھی وہ اِس کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ فلسطینی نگرانی کے لئے موجود تھے۔ عراق اور شام اور مصر کے لوگ اُن کی نگرانی کے لئے موجود تھے اور وہ یہ جرأت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کر دیں۔ غرض عربی زبان کے مختلف ممالک میں پھیل جانے کی وجہ سے اس کی نگرانی مختلف قوموں کے ذمہ لگ گئی اور اِس طرح قرآن کریم ہر قسم کی تحریف اور ہر قسم کے تغیر و الحاق سے محفوظ رہا۔

یہ چھ ایسے سامان ہیں جو دُنیا کی اور کسی قوم کی الہامی کتاب کو میسر نہیں آئے۔ صرف قرآن کریم کو ہی اللہ تعالیٰ نے یہ سامان عطا فرمائے ہیں۔ پس سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى میں اِس

# اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝

سوائے اسکے جو اللہ (بھلانا) چاہے۔ وہ یقیناً ظاہر کو بھی جانتا ہے اور اُسے بھی جو مخفی ہو ۝ ۸

سوال کا جواب آگیا کہ ہم کیوں اسے قولِ فصل تسلیم کریں اور کیوں یہ نہ مانیں کہ یہ کتاب صرف وقتی طور پر کامل کتاب ہے۔ ایک زمانہ گذرنے کے بعد پھر کوئی اور کتاب آجائے گی۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِس کتاب کے بعد اور کوئی کتاب نہیں آسکتی۔ ہمارا اِس کتاب کی حفاظت کے متعلق وعدہ کرنا اور پھر اسکی حفاظت کے لئے ہر قسم کے سامانوں کا پیدا کر دینا خود اِس بات کا ثبوت ہوگا کہ اب الٰہی منشاء یہی ہے کہ یہ کتاب قیامت تک قائم رہے اگر اللہ تعالےٰ اِس کتاب کو بھی سابق الہامی کتب کی طرح منسوخ کر دینے والا ہوتا تو وہ اِس کو بھی پہلی کتابوں کی طرح بگڑنے دیتا اور وہ اس کی حفاظت کے سامان مہیا نہ کرتا۔ مگر خدا نے اسکو بگڑنے نہیں دیا کیونکہ یہ مستقل فائدہ پہنچانے والی کتاب ہے۔ اور جس چیز کا فائدہ مستقل ہو وہ الٰہی قانون کے ماتحت فنا نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (الرعد ع) جو چیز لوگوں کے لئے نفع رساں ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی سُنّت یہ ہے کہ وہ اُس کو زمین میں قائم رکھتا ہے۔ چونکہ قرآن کریم کی حفاظت کی گئی ہے اس لئے یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ یہ کتاب دُنیا میں ہمیشہ قائم رہے گی۔ کبھی منسوخ یا ناقابلِ عمل نہیں ہوگی۔

اب ایک سوال رہ جاتا ہے کہ اگر اِس کتاب نے ہمیشہ رہنا ہے تو پھر بتائیے کسی موعود کی کیا ضرورت ہے۔ اِس کا جواب اللہ تعالےٰ نے اگلے حصہ میں دیا ہے۔

**۸ تفسیر۔** اِس آیت کے متعلق بوجہ اُن معنوں کے نہ کرنے کے جن کو مَیں نے اُوپر بیان کیا ہے مفسرین کو دقت پیش آئی ہے اور وہ حیران ہوئے ہیں کہ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کے اِس جگہ کیا معنے ہوئے۔ کیا قرآن کا کچھ حصہ اُڑ جائے گا کہ خدا تعالےٰ نے فَلَا تَنْسٰى کے ساتھ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ بھی کہہ دیا۔ اِس دقت کو حل کرنے کیلئے بعض نے تو کہہ دیا ہے کہ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ سے منسوخ آیات مراد ہیں۔ مگر یہ درست نہیں اس لئے کہ جن آیات کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے وہ یا تو قرآن کریم میں آجتک لکھی ہوئی موجود ہیں یا اگر اِس عقیدہ کے رکھنے والوں کے قول کے مطابق اگر وہ منسوخ التلاوۃ بھی ہیں تو آج تک تفسیروں میں لکھی ہوئی ہیں۔ مگر خدا تعالےٰ اِس جگہ فرماتا ہے کہ وہ بھول جائیں گی جب وہ سب کی سب قرآن کریم میں یا تفسیروں میں موجود ہیں تو بھول کِس طرح جائیں گی۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ قرآن کریم میں کوئی آیت منسوخ بھی ہے۔ ہم قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو قابلِ عمل سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو قرآن کریم میں ناسخ منسوخ کے قائل ہیں مَیں اُن کا ذکر کر رہا ہوں۔ کہ اُن کا یہ استدلال درست نہیں۔ اس لئے کہ فَلَا تَنْسٰى کے ساتھ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کا ذکر کیا گیا ہے اور نسخ اول تو بھولنے کو نہیں کہتے۔ پھر جبکہ وہ سب آیات جنکو منسوخ قرار دیا جاتا ہے یا تو قرآن کریم میں یا تفاسیر میں موجود اور لکھی ہوئی ہیں تو وہ بھول کس طرح گئیں۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ وہ سب اسی طرح موجود ہیں اور کسی کو بھی بھولی نہیں۔ پس یہ معنے تو درست نہیں ہوسکتے۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کی تشریح سابق مفسرین کے نزدیک

بعض نے کہا ہے اِس سے مراد یہ ہے کہ شاذ و نادر کے طور پر تو بھول جائے گا اور پھر تجھے یاد آجائے گا لیکن یہ بھی درست نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ شاذ و نادر کا بھولنا بھی بھولنا ہی ہوتا ہے اور اگر وہ یاد آجاتا ہے تو وہ بھولنا کہلا ہی نہیں سکتا۔ پھر قرآن کریم تو اسی وقت سب کو سُنا دیا اور لکھا دیا جاتا تھا۔ یہ ہو کس طرح سکتا تھا کہ شاذ و نادر کے طور پر اُس کا کوئی حصہ بھول جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ فَلَا تَنْسٰى میں الف واصلہ ہے اور اصل میں نہی ہے یعنی فَلَا تَنْسَ تو

بھولیو نہیں۔ مگر یہ تاویل بعید اور خلافِ محاورۂ زبان ہے۔

بعض مفسّرین نے یہ معنے کئے ہیں کہ یہاں اِلَّا بمعنے نفی ہے کیونکہ عرب کبھی قلت کا لفظ نفی کے لئے بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ اِلَّا قَلِیْلًا سے مراد یہ ہوتی ہے کہ بالکل نہیں۔ اسی طرح اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ سے مراد یہی ہے کہ تو بالکل نہیں بھولے گا۔ مگر یہ تاویل درست نہیں کیونکہ نفی کے معنے اِلَّا اُسی وقت دیتا ہے جبکہ اس کے بعد کوئی لفظ قلت پر دلالت کرتا ہو۔ مگر یہاں تو ایک مضمون بعد میں بیان کیا گیا ہے اور خدا تعالیٰ کی مشیت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ زمخشری نے کشاف میں یہ معنے کئے ہیں کہ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کا اِس آیت میں کوئی مفہوم نہیں یعنی اس سے مراد کوئی استثناء نہیں بلکہ کلی طور پر نسیان کی نفی مراد ہے اور یہ ایسی ہی بات ہے جیسے بعض دفعہ ایک انسان دوسرے انسان سے کہتا ہے اَنْتَ سَہِیْمِیْ فِیْمَآ اَمْلِکُ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ۔ تو میری ملکیت میں حصہ دار ہے۔ ہاں جو خدا چاہے۔ وہ کہتے ہیں جس طرح وہاں اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کہنے سے کوئی استثناء مراد نہیں ہوتا اسی طرح یہاں بھی اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کے کوئی معنے نہیں ہیں۔ مگر بحرِ محیط کے مصنّف علامہ ابوحیان جو صرف و نحو کے بہت بڑے ماہر اور ادیب ہیں زمخشری کے اِن معنوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں جو الفاظ آئیں اُن کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُنکا کوئی مفہوم نہیں بلکہ الٰہی کلام تو الگ رہا کسی فصیح و بلیغ کلام میں بھی یہ بات پائی نہیں جا سکتی۔ اگر اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کسی انسان کا قول ہوتا تب تو کہا جا سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ کے استغناء کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسا کہا گیا ہے مگر یہ تو خدا کا اپنا کلام ہے۔ بندہ جب کسی فقرہ میں اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عجز و انکسار اور خدائی طاقت و عظمت کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے میرا تو یہ ارادہ ہے مگر میں کہہ نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ کا کیا منشاء ہے۔ لیکن جب خدا خود اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کے الفاظ استعمال کر رہا ہو تو اُنہیں بے معنی یا استغنائی طریق والے الفاظ کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ وہ کسی کے مقابل پر اپنے عجز کا اظہار کرتا ہے۔ بحرِ محیط والوں نے اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ سے نسخ مراد لیا ہے۔ اِسی طرح یہ بھی لکھا ہے کہ اِس سے وہ نسیان بھی مراد ہو سکتا ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے ماتحت بعض دفعہ اس لئے ہوتا تھا تاکہ اُمت کیلئے مختلف احکام میں آپؐ کا نمونہ ظاہر ہو۔ بہرحال مفسّرین نے اِس آیت کے مختلف معنے کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر جیسا کہ مَیں اُوپر ثابت کر آیا ہوں وہ سب کے سب غلط ہیں اور ایکدوسرے کے معانی کو انہوں نے خود ہی کاٹ دیا ہے۔ اِس آیت کے کوئی ایسے معنے ہونے چاہئیں جو پہلے حصہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور جو قرآن کریم کی عظمت اور اُس کی شان کے مطابق ہوں۔

اصل بات یہ ہے کہ نسیان دو قسم کا ہوتا ہے۔ کبھی لفظاً نسیان ہوتا ہے اور کبھی معناً نسیان ہوتا ہے۔ جب ہم کسی چیز کے بھول جانے کا ذکر کرتے ہیں تو اُس کے دو معنے ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کا وجود بھول گیا یعنی وہ الفاظ جو پہلے یاد تھے حافظہ میں سے نکل گئے ہیں یا شکل جو پہلے ذہن میں مستحضر تھی وہ اب جاتی رہی ہے لیکن کبھی اِس کے معنے حقیقت کو بھول جانے کے ہوتے ہیں۔ مثلاً کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک شعر یاد کرتا ہے جو کچھ عرصہ کے بعد اُسے بھول جاتا ہے۔ اس سے پُوچھا جاتا ہے کہ بتاؤ تمہیں وہ شعر یاد ہے۔ وہ کہتا ہے مَیں اس شعر کو بھول گیا ہوں مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس شعر کے الفاظ مجھے یاد نہیں رہے لیکن کبھی شعر ایسے مضمون کے متعلق ہوتا ہے جسے یاد رکھنا وہ ضروری نہیں سمجھتا الفاظ بیشک اُسے یاد ہوتے ہیں مگر مضمون اُسکی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اُس سے جب پُوچھا جائے کہ کیا فلاں شعر تمہیں یاد ہے اور پُوچھنے والا شعر پڑھ کر بھی سنا دے اور وہ جواب میں کہے کہ مَیں نے اس شعر کو بُھلا دیا ہے تو اسکے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ اس شعر کے الفاظ میرے ذہن میں

نہیں بلکہ یہ معنے ہوں گے کہ اِس شعر سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ مَیں نے اس کے مضمون کو بُھلا دیا ہے۔ یا مثلاً بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے سے پُوچھتا ہے تمہارے فلاں دوست کا کیا حال ہے۔ اور وہ جواب میں کہتا ہے مَیں نے اُسے بُھلا دیا ہے۔ اب اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ اُس کا نام اسے یاد نہیں رہا یا اُس کی شکل اُس کے ذہن میں مستحضر نہیں رہی۔ نام اُس وقت لیا جا رہا ہوتا ہے اور شکل بھی بہرحال اُس کے ذہن میں موجود ہوتی ہے اُس وقت اُس کا یہ کہنا کہ مَیں نے اُس کو بُھلا دیا ہے صرف یہ مفہوم رکھتا ہے کہ میرا اب اُس سے کوئی تعلق نہیں۔ تو نسیان کا لفظ صرف الفاظ بُھولنے کے معنوں میں ہی استعمال نہیں ہوتا بلکہ حقیقت کو بُھول جانے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور قرآن کریم میں اسکی مثال موجود ہے۔ اللہ تعالےٰ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرماتا ہے۔ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ ع) وہ ہمارے حکم کو بُھول گیا اور ہم نے اُس کے اندر عزم نہیں پایا۔ یہاں نسیان اور عزم نہ پائے جانے سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص ارادہ اور نیّت سے اُس نے یہ کام نہیں کیا تھا۔ یہ مراد نہیں کہ ہمارا حکم اُس کے ذہن سے نکل گیا تھا بلکہ جیسا کہ دوسری آیات سے ثابت ہے حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالےٰ کے اس حکم کو بُھولے نہیں تھے بلکہ یہ حکم اُنہیں خوب یاد تھا اور نہ صرف یاد تھا بلکہ شیطان نے اُنہیں یہ حکم یاد کرایا تھا۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں ذکر آتا ہے کہ جب شیطان حضرت آدم علیہ السلام کو ورغلانے کے لئے اُن کے پاس آیا تو کہا مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ۔ وَقَاسَمَهُمَاۤ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝ (اعراف ع) اب دیکھو شیطان اُن کو بہکا رہا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کا حکم اُنہیں یاد کرا رہا ہے اور کہتا ہے کہ بے شک خدا تعالیٰ نے تمہیں اِس درخت کے پاس جانے سے منع کیا تھا مگر یہ ممانعت کا حکم محض اس لئے تھا کہ اگر تم دونوں اِس درخت کے قریب گئے تو فرشتے بن جاؤ گے۔ یا خدا تعالیٰ کو یہ ڈر تھا کہ اگر تم اس درخت کے قریب گئے تو تم ابدی زندگی حاصل کر لو گے اس لئے خدا تعالےٰ نے تمہیں منع کیا اور کہا کہ اِس درخت کے قریب نہ جانا۔ گویا منع تو ضرور کیا تھا مگر اس لئے منع کیا تھا کہ خدا یہ نہیں چاہتا تھا کہ تم مَلک بن جاؤ اور خدا یہ نہیں چاہتا تھا کہ تم خالدین میں سے بن جاؤ۔ یہی اس ممانعت میں حکمت تھی مگر یہ دونوں باتیں اچھی ہیں بُری نہیں ہیں اس لئے اگر مَلک بننے کے لئے یا ابدی زندگی حاصل کرنے کے لئے اس حکم کو توڑ دیا جائے تو نقصان کی بات نہیں ہوگی بلکہ انجام کے لحاظ سے نہایت مفید ہوگی۔ وَقَاسَمَهُمَاۤ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝ اور اُس نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ یہ دونوں باتیں تمہارے فائدہ کی ہیں۔ خدا تعالےٰ نے اگر روکا تھا تو کسی ابتلاء یا امتحان کے طور پر روکا تھا ورنہ خدا تعالےٰ کا قرب ہمیشہ ہی اچھا ہوتا ہے۔ اگر تم فرشتے بن جاؤ تو بہرحال خدا تعالےٰ کا قرب تمہیں زیادہ حاصل ہوگا۔ اور اگر تم خالدین بن جاؤ تب بھی اِس میں تمہارا ہی فائدہ ہے تم ہمیشہ خدا تعالےٰ کا ذکر کرتے رہو گے اور اُس کے قُرب اور محبت میں بڑھتے رہو گے۔ خدا کا روکنا اور ممانعت کا حکم دینا تو ایک وقتی طور پر امتحان لینے کے لئے تھا ہمیشہ کے لئے نہیں تھا۔ یہ فقرات صاف بتا رہے ہیں کہ آدمؑ نہ صرف خدا تعالیٰ کے حکم کو بُھولا نہیں تھا بلکہ اُس وقت جب اُس نے اس حکم کی خلاف ورزی کی شیطان نے خدا تعالےٰ کا یہ حکم اُسے یاد کرایا اور بار بار قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ خدا تعالےٰ نے اگر روکا تھا تو اس لئے کہ اُسے ڈر تھا تم مَلک نہ بن جاؤ اور تم ابدی زندگی حاصل نہ کر لو اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جو ہر حالت میں انسان کیلئے مفید ہی مفید ہیں۔ خدا تعالےٰ کے دائمی قُرب اور فرشتوں

کی سی زندگی بسر کرنے سے بڑھ کر اور کونسی نعمت ہو سکتی ہے۔ اگر انسان فرشتہ بن جائے اور اگر اُسے دائمی زندگی حاصل ہوجائے۔ تو خدا تعالیٰ کا قُرب اُسے بہرحال پہلے سے زیادہ حاصل ہوجائیگا اور جبکہ انسان کی پیدائش کی اصل غرض خدا تعالیٰ کا قُرب حاصل کرنا ہی ہے تو اس حکم کے متعلق یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ عارضی طور پر ابتلاء کے طور پر دیا گیا تھا۔ اس لئے نہیں تھا کہ اس پر ہمیشہ کے لئے عمل کیا جائے۔ یہ وہ واقعہ ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰهٰ ع) آدمؑ ہمارے حکم کو بھول گیا۔ حالانکہ جہاں تک حکم کے الفاظ کا تعلق ہے قرآن کریم سے ہی ثابت ہے کہ آدمؑ اُس کو نہیں بھولا۔ بلکہ شیطان جو آدمؑ کو بہکانے کا موجب ہوا اُس نے خود یہ حکم یاد کرایا اور کہا کہ خدا نے روکا تو تھا مگر اس کی کچھ اور وجہ تھی۔ پس یہاں نسیان سے مراد نسیانِ الفاظ نہیں بلکہ نسیانِ اہمیّتِ حکم ہے۔ اور نَسِيَ سے یہ مراد ہے کہ آدمؑ ہمارے حکم کو لفظاً نہیں بلکہ معناً بھول گیا۔ ہمارے حکم کی اصل روح کو اُس نے نظر انداز کر دیا اور وہ اُس کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگیا۔

۲۰۸ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ میں جس بُھلانے کی طرف اشارہ ہے وہ روح ہے نہ احکام۔

اس آیت میں بھی اِلَّا سے اس دوسری قسم کے نسیان کی طرف ہی اشارہ ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى۔ ہم تجھ کو قرآن کریم پڑھائیں گے (اور تجھ سے مراد جیسا کہ میں بتا چکا ہوں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ اُمتِ محمدیہ مراد ہے) اور تو اس قرآن کو نہیں بھولے گا۔ یعنی تیری اُمت اس قرآن کو نہیں بھولے گی۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ مگر وہ حصہ جو خدا چاہے گا بھول جائے گا۔ یعنی ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ مسلمان لفظاً تو قرآن کریم کو یاد رکھیں گے مگر معناً اُس کو بھول جائیں گے۔ الفاظ کو تو قائم رکھیں گے مگر آدمؑ کی طرح الفاظ کی رُوح کو بھول جائیں گے۔ جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یُوْشِكُ اَنْ يَّاْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ (مشکوٰۃ کتاب العلم صٓ) یعنی ایک زمانہ ایسا آئے گا جب قرآن کے صرف الفاظ باقی رہ جائیں گے ایمان اور اسلام کی رُوح اُڑ جائے گی۔ اسی کا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ میں استثناء کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ تم اس قرآن کو نہیں بھولو گے مگر ایک قسم کا نسیان ہو سکے گا۔ یہ مطلب نہیں کہ سورۃ اعراف نہیں مٹے گی اور سورۃ مائدہ مٹ جائیگی یا سورۃ کوثر نہیں مٹیگی اور سورۃ الناس مٹ جائیگی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ تو باقی رہیں گے مگر معنے اُڑ جائینگے۔ پس اِلَّا اس جگہ قرآن کریم کے الفاظ کے ٹکڑوں کے استثناء کے طور پر استعمال نہیں ہوا بلکہ دو قسم کی حفاظتوں میں سے ایک قسم کی حفاظت کی نسبت استعمال ہوا ہے۔ اور اس میں قولِ فصل کے متعلق اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ اگر یہ قولِ فصل ہے تو پھر کسی اور مامور کی کیا ضرورت ہے۔ سو بتایا کہ قرآن کریم کے ظاہر کی حفاظت غیر فاصل کا وعدہ ہے اس کی معنوی غیر فاصل حفاظت کا وعدہ نہیں۔ وہ مستقل تو ہوگی مگر غیر فاصل نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ لوگوں کو نا اہل پلٹے گا۔ مغز قرآن اُڑ جائے گا۔ جسے واپس لانے کے لئے پھر ایک مامور کی ضرورت ہوگی۔

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ وجہ بیان

فرماتا ہے کہ کیوں ایک زمانہ میں مغزِ قرآن دُنیا سے اُٹھ جائے گا۔ اور صرف الفاظ لوگوں کے پاس باقی رہ جائیں گے ؟ فرماتا ہے خدا لوگوں کی قلبی اور اُن کی ظاہری حالت کو خوب جانتا ہے۔ جب تک مسلمانوں کا ظاہر بھی درست رہے گا اور اُن کا باطن بھی درست رہے گا قرآن ظاہر میں بھی محفوظ رہے گا۔ اور باطن میں بھی محفوظ رہے گا۔ جب مُسلمان صرف ظاہر میں مُسلمان کہلائیں گے اُن کا باطن خراب ہو جائے گا۔ قرآن کا بھی صرف ظاہر ٹھیک رہے گا اُس کا باطن یعنی مغز اُن سے اُٹھ جائے گا۔ خدا ظاہر کو بھی جانتا ہے اور باطن کو بھی جانتا ہے۔ جب مُسلمانوں کے دل میں ایمان نہیں رہے گا تو اللہ تعالےٰ قرآن کریم کے معنے اُن پر کیوں کھولے گا۔ قرآن کریم تو ایک نُور ہے جو صرف نورانی لوگوں پر کُھل سکتا ہے۔ بدعمل اور بے ایمان لوگ اِس کے معارف سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ پس اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ میں مسلمانوں کی آخری زمانہ کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مُسلمانوں پر ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب وہ الفاظ کو تو یاد رکھیں گے مگر عمل کرنا بُھول جائیں گے۔ یہ مطلب نہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے الفاظ بُھول جائیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ حمد کا لفظ مُنہ سے تو بولیں گے مگر اُن کے دل اللہ تعالےٰ کی حمد سے بالکل خالی ہونگے۔ وہ رب کا لفظ تو استعمال کریں گے مگر اللہ تعالےٰ کی ربوبیت پر کامل ایمان اُن کے دلوں میں نہیں ہوگا۔ وہ ظاہر میں مُسلمان کہلائیں گے۔ پس قرآن کریم ظاہر میں محفوظ رہے گا۔ لیکن چونکہ وہ باطن میں اسلام کو کھو دیں گے۔ قرآن کا مغز بھی اُن سے اُٹھ جائیگا۔ غرض اِس جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت دو قسم کی ہے ایک لفظی حفاظت اور ایک معنوی حفاظت۔ لفظی حفاظت کے متعلق یہ وعدہ ہے کہ وہ غیر فاصل ہوگی۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا۔ جب قرآن کریم کے الفاظ میں تغیّر و تبدّل ہو جائے مگر معنوی غیر فاصل حفاظت کا اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی وعدہ نہیں۔ بے شک وہ حفاظت بھی مستقل طور پر ہوگی مگر غیر فاصل نہیں ہوگی۔ بلکہ اُمّتِ محمدیہ بگڑ جائے گی تو کوئی نبی آجائے گا۔ پھر بگڑے گی تو پھر کوئی نبی آجائیگا ظاہری حفاظت بغیر کسی وقفہ کے ہوگی۔ لیکن باطنی حفاظت گو ہوگی قیامت تک۔ گر وقفوں کے ساتھ ہوگی۔

اِس آیت میں تفصیلی طور پر اُس اعتراض کا جواب آگیا ہے کہ قولِ فصل کے بعد کسی الہام یا کسی ماموُر کی بعثت کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے چونکہ ظاہر میں یہ شریعت ہمیشہ محفوظ رہے گی اس لئے ظاہر میں کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن باطن میں چونکہ نقص پیدا ہوتا رہے گا اس لئے ضروری ہے کہ افہام و تفہیم کے لئے اللہ تعالےٰ کی طرف سے اُس کے انبیاء اور مامور مبعوث ہوتے رہیں جو قرآن کریم کی معنوی حفاظت کا فرض سرانجام دیں۔ اور جس چیز کو لوگ بُھول چکے ہوں اُس کو دوبارہ الٰہی تائید سے تازہ کر دیں۔ اگر مسلمانوں میں خرابی پیدا نہ ہونی ہوتی تو کسی مامور کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کے متعلق یہ مقدر ہے کہ ایک عرصہ گذرنے کے بعد اُن میں خرابی پیدا ہو جائے گی۔ اسلام کی حقیقت محو ہو جائے گی۔ محض رسمی طور پر لوگ مُسلمان کہلائیں گے قرآن کی طرف اپنے آپ کو منسوب کریں گے لیکن مغزِ قرآن دُنیا سے اُٹھ جائے گا اور مسلمانوں کی عملی حالت سخت خراب ہو جائے گی اس لئے ضروری ہے کہ دوبارہ اسلام کو زندہ کرنے اور قرآن کریم کی تعلیم کو

اِنَّہٗ یَعْلَمُ الْجَھْرَ وَمَا یَخْفٰی میں اس بات کا جواب کہ قولِ فصل کے بعد کسی وحی کی کیا ضرورت ہے۔

# وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝۹

اور ہم (اے مخاطب) تیرے لئے (کامیابیوں اور) آسانیوں کا حصول آسان کر دیں گے ۝۹

قائم کرنے کے لئے اُس کی طرف سے کوئی مامور مبعوث ہو۔

نُيَسِّرُ

**۹ حل لغات۔** نُيَسِّرُ۔ يَسَّرَ سے مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اور يَسَّرَ الشَّيْءَ لِفُلَانٍ کے معنے ہوتے ہیں سَهَّلَهٗ لَهٗ وَدَفَعَهٗ لَهٗ۔ اُس کے لئے کسی چیز کے حصول کو آسان کر دیا گیا اور وہ چیز اُسے مہیا کر دی گئی۔ يَكُوْنُ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ۔ یہ لفظ خیر کے لئے بھی استعمال کر لیتے ہیں اور شر کے لئے بھی (اقرب) یعنی یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ يَسَّرَهٗ لِلْعُسْرٰى اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ يَسَّرَهٗ لِلْيُسْرٰى۔ اور يُسْرٰى کے معنے ہیں اَلسَّهْلُ (مفردات) آسان۔ پس نُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى کے یہ معنے ہوئے کہ ہم تیرے لئے آسانی پیدا کر دیں گے یُسْرٰی کے بارے میں۔ یا ہم تجھ کو مہیا کر دیں گے یُسْرٰی۔ یعنی تجھ کو جو چیز ملے گی وہ یُسْرٰی ہو گی اور اِس وجہ سے اُس پر عمل کرنا اور اُس تعلیم سے تعلق رکھنا لوگوں کے لئے آسان ہو گا۔

يُسْرٰى

**تفسیر۔** اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرماتا ہے کہ تیرے دین کی حفاظت اور اُس کے دائمی طور پر قیام کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے کہ اُس میں یُسْرٰی یعنی احکام شریعت میں سے زیادہ سہل کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ سابق مضمون کے تسلسل میں یہ ایک نئی دلیل اِس بات کی بیان کی گئی ہے کہ قرآن کریم ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ جس طرح کئی قسم کے ظاہری سامان اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کے کئے ہیں اسی طرح اس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے ایک یہ سامان بھی پیدا کیا ہے کہ اس میں ہر فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور اس لئے یہ تعلیم ہر زمانہ میں کامیاب طور پر چل سکتی ہے۔ لوگ اگر خود چھوڑ دیں تو اور بات ہے ورنہ قرآن کریم میں کوئی ایسی تعلیم نہیں جس میں فطرتِ انسانی کے کسی پہلو کو نظر انداز کیا گیا ہو یا کوئی ایسی تعلیم دی گئی ہو جس پر عمل کرنا لوگوں کو بارِ خاطر معلوم ہو۔ بلکہ اُس کی تعلیم انسانی فطرت کے مطابق ہے اور اس میں ایسی سہولتیں موجود ہیں جن کی وجہ سے ہر فطرت کا انسان اس کے احکام پر عمل کر سکتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو یہ یُسْرٰی ہی ہے کہ کسی وقت کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا حکم ہے اور کسی وقت بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت ہے کسی وقت لیٹ کر نماز پڑھنے کی اجازت ہے اور کسی وقت اشاروں اشاروں میں ہی نماز پڑھ لینے کی اجازت ہے۔ اگر صرف اتنا ہی حکم دے دیا جاتا کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھو تو بیمار اور معذور لوگ اِس پر عمل نہ کر سکتے اور گنہگار ہو جاتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ہر حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے احکام میں ایسی لچک پیدا کر دی ہے کہ کوئی انسان ایسا نہیں جو یہ کہہ سکے کہ میرے لئے اسلام کے فلاں حکم پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ یا مثلاً جہاد پر قرآن کریم نے بڑا زور دیا ہے مگر ساتھ ہی کہہ دیا ہے کہ وہ لُولے لنگڑے جو جہاد پر جانے کی طاقت نہیں رکھتے اگر دل میں اسلام کا درد رکھتے ہیں اور خواہش رکھتے ہیں کہ کاش اُن کے اندر طاقت ہوتی تو وہ بھی جہاد میں شریک ہوتے اِس قسم کے لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں جہاد کے ثواب میں شریک ہوں گے۔ غرض خدا تعالیٰ فرماتا ہے ہم تم کو لے جائیں گے یا ہم تم کو قریب کر دیں گے یُسْرٰی تعلیم کے۔ یہ یُسْرٰی قرآن کریم ہے۔ کیا بلحاظ اس کے کہ اس کو حفظ کرنا نہایت آسان

یُسْرٰی سے مراد احکام شریعت میں آسانی

ہے اور کیا بلحاظ اس کے کہ عمل کرنا نہایت آسان ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ کہ اسلام میں تو روزانہ پانچ وقت نمازیں پڑھنے کا حکم ہے اور عیسائیوں میں ہفتہ میں صرف ایک دن تھوڑی دیر کے لئے عبادت کرنے کا حکم ہے۔ اب بتاؤ اِن دونوں میں سے کونسی آسان تعلیم ہوئی۔ اسلام کی جس میں روزانہ پانچ وقت نماز پڑھنے کا حکم ہے یا عیسائیت کی جس میں ہفتہ میں صرف ایک دن تھوڑی دیر کے لئے عبادت کرنے کا حکم ہے۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ یُسْریٰ ایسی چیز کو بھی کہتے ہیں جو خواہ جسمانی طور پر تکلیف دہ ہو لیکن روحانی طور پر انسان کیلئے نہایت فرحت بخش ہو۔ ہمارے ہاں لوگ کہا کرتے ہیں کہ میرے لئے تو مرجانا آسان ہے بہ نسبت فلاں دوست کو چھوڑ دینے کے۔ اب دیکھو جہاں تک جسم کا تعلق ہے مرنا آسان نہیں اور کسی دوست کو چھوڑ دینا اس کے مقابلہ میں بالکل معمولی چیز ہے۔ موت کی تلخی جسم کے لئے بڑی سخت ہوتی ہے مگر اس کے باوجود انسان کہتا ہے کہ میرے لئے مرنا آسان ہے مگر میں اُس دوست کو نہیں چھوڑ سکتا۔ جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ میرے قلب کو اُس سے اپنی زندگی سے بھی زیادہ اُنس اور پیار ہے۔ اسی طرح اسلام میں گو روزانہ پانچ وقت نمازیں پڑھنے کا حکم ہے مگر چونکہ نمازیں انسان کا اپنا روحانی فائدہ ہے اس لئے پانچ نمازیں پڑھنا اُس کے لئے آسان ہو جائے گا بہ نسبت اُس ایک نماز کے جو ہفتہ میں صرف ایک دن پڑھنی پڑے۔ مومن کہے گا کہ میرے لئے یہ پانچ نمازیں بہ نسبت ہفتہ والی صرف ایک نماز کے زیادہ آسان ہیں کیونکہ صرف ایک نماز کے نتیجہ میں میرا خدا مجھ سے چھوٹ جاتا ہے اور پانچ نمازوں کے نتیجہ میں میرا خدا مجھ سے بل جاتا ہے۔ پس یُسْریٰ سے مراد ظاہری آسانی نہیں بلکہ روحانی فوائد کے اعتبار سے آسانی مراد ہے کہ جب انسان روحانی فوائد دیکھتا ہے تو عمل اُس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ ہم تجھے ایسی تعلیم دیں گے جس میں صرف احکام ہی نہیں ہوں گے بلکہ اُن احکام کے ساتھ ساتھ اُن کی حکمتیں بھی بیان ہوں گی اس لئے وہ احکام بجائے گراں گذرنے کے بالکل آسان معلوم ہوں گے۔ اور لوگ اُن کو چھوڑنا پسند نہیں کریں گے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جب کسی حکم کی حکمت بیان کردی جائے۔ اور انسان پر یہ واضح ہو جائے کہ یہ حکم میرے فائدہ کے لئے دیا گیا ہے تو جس شوق سے وہ حکمت معلوم کرنے کے بعد عمل کرتا ہے اُس شوق سے وہ حکمت معلوم کئے بغیر عمل نہیں کر سکتا۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے۔ کہ ہم نے ہر حکم کی حکمت بیان کردی ہے اور اس وجہ سے اس تعلیم پر عمل لوگوں کے لئے نہایت آسان ہو گیا ہے۔

نُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى سے یہ مراد ہے کہ قرآن مجید نے احکام کی حکمت بھی بیان کی ہے۔

غرض نُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى کے تین معنے ہوئے یہ بھی کہ ہم نے اِس قرآن کا حفظ کرنا آسان کردیا ہے یہ بھی کہ ہم نے احکام کے ساتھ اُن کی حکمتیں بھی بیان کردی ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کے لئے عمل آسان ہو گیا ہے اور یہ بھی کہ ہم نے ایسی تعلیم نازل کی ہے جس میں ہر فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ضرورت کے مطابق اُس میں لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ شریعت اسلامیہ کے تمام احکام کو دیکھو تو اسلام نے کسی ایک حکم کے متعلق بھی یہ نہیں کہا کہ اس میں حالات کے لحاظ سے کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ نماز کے متعلق اسلام نے نہایت ہی تاکیدی احکام دیئے ہیں لیکن اگر کوئی شخص بیہوش ہو جائے تو اس کیلئے

# فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝

پس اگر نصیحت کرنی (دُنیا میں) مفید ہوتی رہی ہے تو تم بھی نصیحت کرو ۔ ۱۰

کوئی حکم نہیں رہتا۔ اگر کوئی شخص پاگل ہو جائے تو اُس کے متعلق یہ حکم نہیں ہوگا کہ وہ بھی نماز پڑھے۔ بلکہ اگر کوئی شخص نماز پڑھتے پڑھتے پاگل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ جب تک پاگل رہے ایسا ہی سمجھا جائے گا جیسے وہ نماز پڑھتا رہا ہے اور اُسے وہی ثواب ملے گا جو نماز پڑھنے والوں کو ملتا ہے۔ غرض کوئی مشکل ایسی نہیں جس کا علاج اسلام میں موجود نہ ہو۔ بے شک اسلام نے یہ کہا ہے کہ نماز کے لئے مسجد میں آؤ لیکن اگر مسجد نہ ہو تو اسلام کہتا ہے گھر پر ہی پڑھ لو۔ اگر کوئی خاص جگہ عبادت کے لئے نہیں ملتی تو مٹی پر ہی کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ وضو نہیں کر سکتے تو تیمم کر لو۔ پھر امام کے متعلق کوئی خاص شرائط نہیں سوائے اِس کے کہ وہ متقی ہو۔ مگر عیسائیوں میں صرف ایک دن کی عبادت کے متعلق ہی کئی قسم کی شرائط پائی جاتی ہیں مثلاً عیسائیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ گرجا میں جائیں یہ ضروری ہے کہ پادری آئے جو انہیں عبادت کرائے۔ اور پھر ضروری ہے کہ پادری ایسا ہو جو ڈگری یافتہ ہو اور جس نے کالے رنگ کا کوٹ پہنا ہوا ہو۔ اب بتاؤ کالے رنگ کے کوٹ کا عبادت سے کیا تعلق ہے یا کسی ڈگری کے ہونے یا نہ ہونے کا عبادت کے ساتھ کیا جوڑ ہے۔ لیکن اسی قسم کی پابندیاں ہیں جو عیسائیت نے عبادت پر عائد کی ہوئی ہیں۔ اِس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے کس قدر آسانی پیدا کر دی ہے کہ وہ عبادت کے متعلق اِس قسم کی کوئی قطعی

پابندی اُن پر عائد نہیں کرتا۔ بلکہ انہیں اجازت دیتا ہے کہ وہ ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکتے ہیں۔ پس بے شک قرآن کریم میں بعض احکام بظاہر مشکل معلوم ہوتے ہیں مگر ان مشکل احکام کو باحکمت بنا کر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے آسان کر دیا ہے اور پھر اُن احکام کو لچک دار بنایا ہے جن میں ضرورت کے وقت کئی قسم کی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں اور ہر فطرت کا انسان آسانی سے اُن پر عمل کر سکتا ہے اور یہی اسلام کی حفاظت اور اُس کے دائمی طور پر قیام کا ایک ذریعہ ہے۔

**۱۰ حل لغات۔** ذِکْرٰی کے معنے نصیحت کے بھی ہوتے ہیں اور نصیحت کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے۔ اَلذِّكْرٰى اِسْمٌ لِلْاِدِّكَارِ وَ التَّذْكِيْرِ۔ اسی طرح لکھا ہے اَلذِّكْرُ بِاللِّسَانِ اَوْ بِالْقَلْبِ یعنی کسی کو نصیحت کرنا بھی اور کسی شخص کا خیال کرنا یا کسی کا نام لینا یا دل میں اُس کی یاد کا تازہ ہو جانا یا اُس کے متعلق کوئی بات کرنا یہ بھی ذِکْرٰی کہلاتا ہے (اقرب)۔ پس ذِکْرٰی کے معنے نصیحت کرنے اور یاد کرنے کے ہوئے یہاں صرف نصیحت کرنے اور وعظ کرنے کے ہی معنے ہیں۔ دوسرے معنے یہاں چسپاں نہیں ہوتے۔

**تفسیر۔** اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب ہم نے ایسی کامل تعلیم دی ہے جو ہمیشہ رہنے والی ہے اور جس کی قیامت تک حفاظت کی جائے گی تو اب تیرا کام یہ ہے کہ تو لوگوں کو نصیحت کر جبکہ یہ یقینی بات ہے کہ نصیحت لوگوں کو فائدہ دیتی ہے۔ اس آیت کے معنوں میں بھی

ذِکْرٰی

ایک اشکال ہے اور وہ یہ کہ اِنْ کے معنے تو شرط کے ہوتے ہیں۔ اِس صورت میں آیت کا ترجمہ یہ بنتا ہے کہ تو لوگوں کو وعظ و نصیحت کر اگر اِس ذِکْرٰی کے نتیجہ میں اُن کو کوئی نفع پہنچے۔ اِس پر یہ اعتراض پڑتا ہے کہ نصیحت کرنے والے کو کس طرح معلوم ہوگا کہ اِس نصیحت کے نتیجہ میں دوسرے کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے یا نہیں۔ فائدہ یا عدم فائدہ کا علم تو بعد میں ہوتا ہے نہ کہ پہلے نصیحت سے پہلے تو کسی کو یہ علم ہی نہیں ہو سکتا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اچھا نکلے گا یا بُرا نکلے گا۔ اِس مشکل کو دیکھتے ہوئے بعض مفسّرین نے اِس کے یہ معنے کئے ہیں کہ نصیحت کرو اگر فائدہ نہ ہو تو بے شک چھوڑ دو۔ یہ معنے کہاں تک درست ہیں اِس کے لئے ہمیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل دیکھنا چاہئے۔ کہ آیا آپؐ کا یہ طریق تھا کہ آپؐ برابر نصیحت کرتے چلے جاتے تھے یا جب آپؐ نصیحت کا کوئی فائدہ نہ دیکھتے تو چھوڑ دیتے تھے۔

یہ سورۃ مکّی ہے اور ابتدائی زمانۂ نبوّت میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔ مگر باوجود اِس آیت کے نزول کے ہم دیکھتے ہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مکّہ والوں کو برابر تیرہ سال تک نصیحت کرتے چلے گئے۔ اور آپؐ نے ایک دن کے لئے بھی اُن کو سمجھانا ترک نہیں کیا۔ اگر اِس آیت کے یہی معنے ہوں کہ نصیحت کا اگر فائدہ نہ ہو تو بیشک اسے چھوڑ دیا جائے تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ اِس آیت پر عمل نہیں کیا آپؐ دیکھتے تھے کہ نصیحت کا کوئی فائدہ نہیں نکل رہا۔ مگر اِس کے باوجود آپؐ سمجھاتے چلے جاتے تھے۔ پھر یہود کو اسلام میں داخل کرنے کے لئے آپؐ نے کتنا زور لگایا بار بار اُن کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ بار بار اُنکو وعظ و نصیحت کرتے تھے اور کبھی اِس بناء پر اپنی کوششوں کو ترک نہیں کرتے تھے کہ جب وعظ و نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تو سمجھانے کا کیا فائدہ۔ پس فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ایکدفعہ نصیحت کرو اور کوئی نہ مانے تو اُسے چھوڑ دو۔ جس طرح پُرانے زمانہ کی عورتیں بعض دفعہ دوسرے کو سمجھانے کے لئے کوئی بات کہتیں اور وہ نہ مانتا تو کہتیں "جہنم میں جاؤ ہمیں کیا"۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اِن معنوں کے خلاف ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اِن معنوں کو درست قرار دیا جائے ہاں اتنا بیشک درست ہے کہ ہنسی اور مذاق کرنیوالے لوگوں کی مجالس سے اُٹھ جانیکا حکم ہے مگر یہ حکم نصیحت نہ ماننے کیوجہ سے نہیں بلکہ تمسخر کرنے اور شعائر اللہ کی ہتک کرنیکی وجہ سے ہے۔ سنجیدہ لوگوں کو تبلیغ کرتے جانیکا ہی حکم ہے۔

ع ۱ ع ۲
فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى میں ایک اشکال اور اس کا حل مفسرین کے نزدیک

بعض مفسّرین کہتے ہیں کہ گو اِنْ کے معنے شرط کے ہیں مگر اس جگہ یہ کفّرین کے لئے توبیخ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں یعنی اِس امر کے اظہار کے لئے کہ کفار بڑے ضدّی ہیں اور نصیحت کم ہی مانتے ہیں اس لئے اُن میں سے بہت سے لوگ ضد کرتے جائینگے۔ بغرض اِنْ نصیحت کی حدبندی کیلئے نہیں ہے بلکہ جنکو نصیحت کی جائیگی انکی سنگدلی کے اظہار کیلئے ہے یہ معنے محاورہ کے مطابق ہیں اور اِن سے اشکال بھی دُور ہو جاتا ہے۔

بعض نحویوں نے یوں تاویل کی ہے کہ اِس جگہ اِنْ اِذْ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران ع ۱۴) یہاں یہ معنے نہیں کہ اگر تم مومن ہو تو تم غالب آجاؤ گے۔ کیونکہ اِس آیت سے قبل اللہ تعالیٰ انکو مومن قرار دے چکا ہے۔ پس اسکے یہ معنے تو ہو نہیں سکتے کہ اگر تم میں ایمان ہوا تو تمہیں غلبہ حاصل ہو جائیگا بلکہ اِسکے معنے یہ ہیں کہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِذْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یعنی جبکہ تم مومن ہو اور خدا اور اُسکے رسول پر ایمان رکھتے ہو تو یہ ہو کس طرح

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝

جو (خدا تعالےٰ سے) ڈرتا ہے وہ یقیناً نصیحت حاصل کریگا ۞ اور (اسکے برخلاف) جو نہایت بدبخت ہوگا وہ اس سے گریز ہی کرتا رہیگا ۞

سکتا ہے کہ تم مغلوب ہو جاؤ اور کفار تم پر غالب آجائیں۔ خدا تعالےٰ نے تمہیں دولتِ ایمان سے مشرف فرمایا ہے اسلئے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تمہیں کفار پر غلبہ حاصل نہ ہو اِسی طرح اِس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى جبکہ یہ یقینی اور تحقیقی بات ہے کہ ذِکرٰی سے ہمیشہ نفع پہنچتا ہے تو میرے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو ذِکرٰی کو چھوڑیو نہیں بلکہ دن اور رات اِس میں مشغول رہیو۔ اگر آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں اِن لوگوں کے سینے کھُل جائینگے اور یہ ہدایت کو قبول کر لینگے۔ پس یہاں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ ایک دو دفعہ نصیحت کرو اگر فائدہ نہ ہو تو چھوڑ دو۔ بلکہ حکم یہ دیا گیا ہے کہ ہمیشہ نصیحت کرتے جاؤ کیونکہ نصیحت ایسی چیز ہے جو ضرور دل پر اثر کرتی ہے

یَتَجَنَّبُهَا

اَلْاَشْقٰی

**۱۰ تفسیر**۔ انسانی حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قلبی کیفیات ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں کبھی اُس پر خشیت کی حالت طاری ہوتی ہے اور کبھی عدمِ خشیت کی۔ جب انسانی قلب پر الٰہی خشیت طاری ہو اور اللہ تعالیٰ کے جلال اور اسکی ہیبت سے وہ متاثر ہو تو اُسوقت معمولی سے معمولی نصیحت بھی بڑا گہرا اثر کرتی ہے لیکن اگر دل میں خشیت نہ ہو تو اعلیٰ سے اعلیٰ نصیحت بھی بیکار ہو جاتی ہے۔ ہر شخص کو اپنی زندگی میں اِس کا تجربہ ہوگا کہ بعض دفعہ ایک بات کسی شخص کو بیسیوں دفعہ کہی جاتی ہے مگر اُس پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور بعض دفعہ صرف ایک مرتبہ کہی جاتی ہے تو فوراً اس کا اثر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ انسانی قلب کی حالت بدلتی رہتی ہے کبھی اُس پر خشیت کی گھڑیاں آتی ہیں اور کبھی عدمِ خشیت کی۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ وعظ و نصیحت کے متعلق دوام سے کام لینے کی وجہ بیان فرماتا ہے اور بتاتا ہے کہ چونکہ انسانی قلب پر خشیت کے اوقات بھی آتے رہتے ہیں اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ سامع پر وہ گھڑی جب ہدایت کیلئے اُسکا سینہ کھُل جائے کب آئیگی اسلئے تمہارا فرض ہے کہ تم ہمیشہ نصیحت کرتے رہو کیونکہ تم نہیں جانتے دوسرے کی ہدایت کا کونسا وقت مقرر ہے۔

**۱۱ حل لغات**۔ یَتَجَنَّبُهَا۔ یَتَجَنَّبُ تَجَنَّبَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور تَجَنَّبَ عَنْهُ کے معنے ہیں بَعُدَ عَنْهُ یعنی اُس سے دُور ہو گیا (اقرب) پس یَتَجَنَّبُ کے معنے ہونگے وہ دُور ہو جائیگا۔ اَشْقٰی۔ شَقِیَ سے ہے اور شَقِيَ الرَّجُلُ يَشْقٰى۔ شَقًا وَ شَقَاءً وَ شَقَاوَةً وَ شِقَاوَةً وَ شِقْوَةً وَ شَقْوَةً کے معنے ہیں كَانَ شَقِيًّا ضِدُّ سَعِدَ فَهُوَ شَقِيٌّ جَمْعُهُ اَشْقِيَاءُ (اقرب) یعنی شقاوت سعادت کے مقابل کا لفظ ہے جیسے سعید کے مقابلہ میں شقی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور اسکے معنے اُس شخص کے ہوتے ہیں جس میں نیکی کی قابلیت مرجاتی ہے مفردات والے کہتے ہیں۔ كَمَا اَنَّ السَّعَادَةَ فِي الْاَصْلِ ضَرْبَانِ سَعَادَةٌ اُخْرَوِيَّةٌ وَسَعَادَةٌ دُنْيَوِيَّةٌ ثُمَّ السَّعَادَةُ الدُّنْيَوِيَّةُ ثَلَاثَةُ اَضْرُبٍ سَعَادَةٌ نَفْسِيَّةٌ وَبَدَنِيَّةٌ وَخَارِجِيَّةٌ كَذٰلِكَ الشَّقَاوَةُ عَلٰى هٰذِهِ الْاَضْرُبِ وَفِي الشَّقَاوَةِ الْاُخْرَوِيَّةِ قَالَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ... وَفِي الدُّنْيَوِيَّةِ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى قَالَ بَعْضُهُمْ قَدْ يُوضَعُ الشَّقَاءُ مَوْضِعَ التَّعَبِ نَحْوُ شَقِيتُ فِي كَذَا وَكُلُّ شَقَاوَةٍ تَعَبٌ وَلَيْسَ كُلُّ تَعَبٍ شَقَاوَةً فَالتَّعَبُ اَعَمُّ مِنَ الشَّقَاوَةِ۔ یعنی شقاوت سعادت کے مقابل کی چیز ہے۔ جس طرح سعادت دو قسم کی ہوتی ہے ایک سعادتِ اُخروی اور ایک سعادتِ دُنیوی اسی طرح شقاوت بھی دو قسم کی ہوتی ہے ایک شقاوتِ اُخروی اور ایک شقاوتِ دُنیوی۔ پھر دُنیوی سعادت، آگے تین قسم کی ہوتی ہے۔ ایک سعادتِ نفسیہ یعنی انسانی نفس میں نیکی اور شرافت پائی جائے۔ ایک سعادتِ بدنیہ یعنی انسانی جسم باصحت اور تندرست ہو کسی قسم کی بیماری اُمیں

نہ ہو۔ اور ایک سعادتِ خارجیہ یعنی انسان کے دوست اور اُس کے رشتہ دار آرام میں ہوں۔ اسکے متعلقین کو کسی قسم کا دُکھ نہ ہو۔ مُلک میں بدامنی نہ ہو اور اس طرح خارجی طور پر اُسے سکون اور اطمینان حاصل ہو۔ اگر انسانی نفس تو مطمئن ہو مگر اُس کے رشتہ داروں کو تکلیف ہو۔ دوست مصائب میں مبتلا ہوں یا مُلک میں بدامنی رونما ہو تب بھی انسان تکلیف محسوس کرتا ہے اور اگر رشتہ دار اور دوست تو آرام میں ہوں لیکن اس کا اپنا جسم بیمار ہو تب بھی اسے اطمینان نہیں ہو سکتا۔ تکمیلِ سعادت اسی وقت ہو سکتی ہے جب تینوں قسم کی سعادت یعنی سعادتِ نفسیہ۔ سعادتِ بدنیہ اور سعادتِ خارجیہ اُسے حاصل ہو۔ اِسی طرح شقاوت کی بھی تین قسمیں ہیں۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں بھی شقاوتِ اُخرویہ اور شقاوتِ دُنیویہ دونوں کے متعلق آیات پائی جاتی ہیں۔ اُخروی شقاوت کا ذکر اِس آیت میں ہے فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (طٰهٰ ع ۱۹) کہ وہ گمراہ نہیں ہوگا اور نہ شقی ہوگا۔ یہاں لَا يَشْقٰى سے مراد یہ ہے کہ اُس کی روح شقاوت میں مبتلا نہیں ہوگی۔ اِس کے مقابلہ میں دُنیوی شقاوت کا ذکر اِس آیت میں کیا گیا ہے کہ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (طٰهٰ ع ۱۹) یعنی اے آدمؑ ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں جنت سے نکال دے اور تم شقی ہو جاؤ۔ یہاں شقاوت سے اُخروی شقاوت مراد نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ اِس آیت میں فَتَشْقٰى کے معنے صرف یہ ہیں کہ تم جسمانی طور پر تکلیف میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

بعض لغت والے یہ بھی لکھتے ہیں کہ کبھی تھکان کے معنوں میں بھی شقاوت کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے جیسے کہتے ہیں شَقِيْتُ فِيْ كَذَا میں فلاں معاملہ میں پڑ کر سخت تھک گیا ہوں۔ مگر وہ کہتے ہیں اِس میں ایک فرق بھی ہے کہ كُلُّ شَقَاوَةٍ تَعَبٌ وَلَيْسَ كُلُّ تَعَبٍ شَقَاوَةً۔ ہر شقاوت تعب کہلا سکتی ہے لیکن ہر تعب کو شقاوت نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ شقاوت میں تذلیل کا ایک رنگ پایا جاتا ہے جو تعب میں نہیں ہوتا۔ اگر ایک خالص نیک کام کرتے ہوئے انسان کو تھکان ہو جائے تو اُسے شقاوت نہیں کہا جائیگا۔ اگر ایک شخص پچھلی رات کو اُٹھ کر دو تین گھنٹے تہجد کی نماز پڑھتا ہے تو لازماً اُسے تعب ہو جائیگی مگر اِس تعب کو ہم شقاوت نہیں کہیں گے۔ شقاوت کا لفظ اُس تعب کے متعلق استعمال کیا جاتا ہے جس میں بُرائی پائی جاتی ہو۔ پس اَشْقٰى اُس کو کہیں گے جس میں شقاوت ممد درجہ کی پائی جائے۔

**تفسیر**۔ اُوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا تھا کہ نصیحت کو باالتزام جاری رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ خشیت کے اوقات انسانی قلب پر آتے رہتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ جو شخص آج انکار کر رہا ہو وہ کل ہماری باتوں کو تسلیم کرنے لگ جائے۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ اگر تم ہمارے اِس حکم پر عمل جاری رکھو تو پھر ایسا ہی شخص ہدایت پانے سے محروم رہ سکتا ہے جو سخت شقی ہو اور جسکے گناہوں کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہو کہ اب اسے ہدایت نہیں مل سکتی ورنہ اور لوگ ضرور مان جائینگے۔ یہ علیحدہ سوال ہے کہ وہ جلدی مانتے ہیں یا دیر کے بعد مانتے ہیں۔

يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقٰى میں اَشْقٰى کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اَشْقٰى کا لفظ کیوں استعمال فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاءؑ سے افضل ہیں اسلئے آپؐ کا منکر بھی تمام انبیاءؑ کے منکرین میں سے زیادہ شقی اور بدبخت ہے۔ موسٰیؑ کا منکر صرف شقی ہے عیسٰیؑ کا منکر صرف شقی ہے۔ ابراہیمؑ کا منکر صرف شقی ہے داؤدؑ اور سلیمانؑ کا منکر صرف شقی ہے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا منکر اَشْقٰى ہے کیونکہ آپؐ تمام انبیاء سابقین سے زیادہ بلند درجہ رکھنے والے ہیں اور آپؐ جو ہدایت لائے وہ بھی تمام ہدایتوں سے افضل اور بلند تر ہے۔ دوسرے اَشْقٰى کا لفظ جیسا کہ میں اُوپر

# الَّذِیْ یَصْلَی النَّارَ الْکُبْرٰی ۝ ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا

(وہی) جو بڑی آگ میں داخل ہونیوالا ہے[۱۲] پھر (اس میں داخل ہونیکے بعد) نہ تو وہ اس میں مرے گا۔

# وَلَا یَحْیٰی ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ۝

اور نہ زندہ رہے گا[۱۳] جو پاک بنے گا وہ یقیناً کامیاب ہوگا[۱۴]

بیان کرچکا ہوں یہ بتانے کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ کہ ہدایت سے محروم صرف بڑا شقی ہوتا ہے ورنہ عام شقی بھی کسی وقت ہدایت پا جاتا ہے۔

یَصْلٰی **۱۲ حل لغات**۔ یَصْلٰی۔ صَلِیَ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور صَلِیَ النَّارَ کے معنے ہوتے ہیں قَاسٰی حَرَّھَا وَ اِحْتَرَقَ بِھَا وَدَخَلَ فِیْھَا۔ یعنی آگ کی گرمی کی تکلیف برداشت کی اور آگ میں جلا اور اس میں داخل ہؤا (اقرب) پس یَصْلَی النَّارَ کے معنے ہونگے وہ آگ میں داخل ہوگا۔

**تفسیر**۔ چونکہ اس شخص نے سب سے بڑے نبی کا انکار کیا تھا اسلئے اس مناسبت کی بناء پر فرمایا کہ ایسے شخص کو سب سے بڑی آگ میں داخل کیا جائیگا یا باوجود بار بار کی اور پوری تبلیغ کے نہ مانا اسلئے اشد ترین بھڑکنے والی آگ میں داخل کیا جائیگا۔

**۱۳ تفسیر**۔ وہ مریگا اسلئے نہیں کہ زندہ رہیگا اور زندہ اسلئے نہیں ہوگا کہ زندگی اُسکو کہتے ہیں جس میں انسان کو آرام اور سکون حاصل ہو۔ اُسے چونکہ انتہائی تکلیف ہوگی اسلئے اسکے زندہ ہونکو زندگی نہیں کہا جائیگا۔ اسکی ایسی ہی مثال ہے جیسے کسی سخت بیمار سے دریافت کیا جائے کہ تمہارا کیا حال ہے تو وہ کہتا ہے میرا حال کیا پوچھتے ہو میں نہ مرتا ہوں نہ جیتا ہوں یعنی میں مرا تو نہیں کیونکہ بچ رہا ہوں مگر میں جیتا بھی نہیں کیونکہ زندگی سخت تکلیف سے کٹ رہی ہے اسیطرح فرماتا ہے لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی عذاب اتنا شدید ہوگا کہ نہ تو وہ مرکر اس سے چھٹکارا حاصل کرسکیں گے اور نہ زندہ رہکر اسکو برداشت کرنیکی طاقت رکھینگے انکی زندگی موت سے بدتر ہوگی۔ اس آیت میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ عیسائی عام طور پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دشمنوں کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا کرتے تھے اُنکے اس اعتراض کا اس آیت سے بھی رد ہوتا ہے کیونکہ اسمیں بطور پیشگوئی بتایا گیا ہے کہ اسلام کے دشمن جو آج تمہیں دکھائی دے رہے ہیں انکو زندہ رکھا جائیگا تاکہ یہ اپنی آنکھوں سے اسلام کی ترقی اور اپنی ناکامی و نامرادی کو دیکھ دیکھکر جلیں اور انہیں معلوم ہو کہ وہ کیسے غلط راستہ پر چلتے رہے ہیں۔ اگر مسلمان دشمنوں کو ہلاک کر دیتے تو یہ پیشگوئی کس طرح پوری ہوتی پس دشمن کے اعتراض کا اس آیت میں جواب دیدیا گیا ہے۔ یہ سورۃ ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے۔ اور شروع میں ہی مسلمانوں کو حکم دیدیا گیا ہے کہ تمہاری مخالفت تو ہوگی مگر دیکھنا دشمن کو مارنا نہیں سوائے اس کے کہ وہ خود حملہ کرکے آجائیں کیونکہ ہمنے اسلام کو اتنی ترقی اور اتنی عظمت دینی ہے کہ انکی زندگی کا ایک ایک لمحہ ہزار ہزار موت کے برابر ہو جائیگا پس انہیں زندہ رہنے دینا تاکہ یہ اسلام کی شوکت اور اپنی نامرادی کو دیکھ دیکھکر ذلیل ہوں اور انہیں اپنی زندگی موت سے بھی بدتر معلوم ہو۔

اَفْلَحَ **۱۴ حل لغات**۔ اَفْلَحَ کے معنے ہوتے ہیں فَازَ وَظَفِرَ بِمَا طَلَبَ یعنی اپنے ارادہ میں کامیاب ہوگیا اور مقصود کو پالیا۔ کہتے ہیں اَفْلَحَ زَیْدٌ اور معنے ہوتے ہیں نَجَحَ فِیْ سَعْیِهٖ وَاَصَابَ فِیْ عَمَلِهٖ زید نے اپنی کوشش کے پھل کو پالیا اور اسکی محنت بارآور ہوئی (اقرب) تاج العروس میں ہے۔ ہر شخص جو کسی دُنیوی یا دینی بھلائی کو حاصل کرلے۔ مُفْلِحْ کہلاتا ہے اور فَلَاحْ ایسی کامیابی کو کہتے ہیں جسے دوسرے رشک کریں۔ ائمہ عرب کا اسپر اتفاق ہے کہ عربی زبان میں فَلَاحْ کے لفظ سے بڑھکر دینی اور دُنیوی دونوں بھلائیوں کو شامل رکھنے والا لفظ اور کوئی نہیں۔ تَزَکّٰی کے معنے ہیں صَارَ زَکِیًّا وہ پاک ہوگیا (اقرب)

**تفسیر**۔ فرماتا ہے یقیناً وہ شخص بامراد ہؤا جو نفسانی خواہشات

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ

اور (پاک ہونے کے ساتھ ساتھ) اس نے اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھتا رہا ۔ مگر (اے منکرو) تم لوگ تو ورلی زندگی کو (آخرت پر)

الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ اِنَّ هٰذَا لَفِي

ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت کہیں بہتر اور دیرپا ہے۔ ۱۱۶ یقیناً یہی (بات) پہلے

الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝

صحیفوں میں بھی (درج) ہے - (یعنی) ابراہیم اور موسےٰ کے صحیفوں میں ۱۱۷

سے اجتناب اختیار کرکے پاک ہوا۔ تَزَكّٰى کے معنے پاک ہونیکے ہوتے ہیں۔ پس اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ وہ شخص کامیاب ہوا جسے تقدس کا جامہ پہنا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ خود قدوس ہے اسلئے وہی شخص اس کا قرب حاصل کر سکتا ہے جو تقدس اور پاکیزگی اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ گناہ آلود زندگی بسر کرنیوالے خدا تعالیٰ کے احکام کو پس پشت ڈالنے والے شیطانی راہوں کو اختیار کرنیوالے اور نفسانی خواہشات کے پیچھے چلنے والے دنیا میں بھی ذلیل ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ذلیل ہونگے۔ تمام کامیابیوں کی جڑ پاکیزگی اختیار کرنا ہے۔

**۱۱۵ تفسیر** - ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ کے معنے صرف یہی نہیں کہ انسان مُنہ سے کہتا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ - سُبْحَانَ اللّٰهِ - اَللّٰهُ اَكْبَرُ یا آجکل کے نام نہاد مسلمانوں کی طرح جو ذکر الٰہی کی اہمیت اور اسکے طریق سے ناواقف ہوتے ہیں صرف اللہ اللہ کہتا ہے بلکہ اسکے معنے یہ ہیں کہ خدا انسان کو ہر وقت یاد رہے چنانچہ فَصَلّٰى کا لفظ جو اسکے ساتھ ہی استعمال ہوا ہے بتا رہا ہے کہ ذکر سے مراد محض الفاظ کی رٹ لگانا نہیں بلکہ اس سے مراد وہ ذکر ہے جسکے نتیجہ میں نماز پڑھی جاتی ہے اگر منہ سے کہنے والی بات ہی مراد ہوتی تو وہ تو خود بخود نماز میں آجاتی ہے اسکے علیحدہ بیان کرنیکی ضرورت نہیں تھی مگر اللہ تعالیٰ کا ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ کا پہلے ذکر کرنا اور فَصَلّٰى کو بعد میں رکھنا بتا رہا ہے کہ یہ وہ ذکر ہے جسکے بعد نماز پڑھی جاتی ہے یعنی انسانی قلب پر خدا تعالیٰ کی محبت اسقدر غالب ہو کہ وہ بےچین ہو کر کھڑا ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جائے پھر خدا کی محبت کا شعلہ اسکے دل میں بھڑک اُٹھے اور وہ اپنے محبوب کے سامنے سربسجود ہو جائے گویا ایک دیوانگی اور وارفتگی اُس پر طاری ہو۔ خدا تعالیٰ کا ذکر اسکی غذا ہو اور اسکی یاد اُسکے دل میں اس طرح بار بار تازہ ہو کہ وہ اس بات پر مجبور ہو جائے کہ خدا تعالیٰ کی عبادت کرے اور اپنی محبت کے جذبات کا ہدیہ اسکے سامنے پیش کرے۔ گویا اس ذکر سے مراد محض منہ سے اللہ اللہ کہنا نہیں بلکہ وہ عملی حالت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کے عشق پر دلالت کرتی ہے اور جس کے نتیجہ میں نماز اور عبادت پیدا ہوتی ہے۔

**۱۱۶ حل لغات** - تُؤْثِرُوْنَ - آثَرَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور آثَرَ کے معنے ہیں کسی چیز کو عمدہ سمجھکر اختیار کر لیا یا کسی ایک چیز کو دوسری پر فضیلت دی (اقرب)۔ پس تُؤْثِرُوْنَ کے معنے ہونگے تم ترجیح دیتے ہو (۲) عمدہ سمجھ کر اختیار کرتے ہو۔

**تفسیر** - اس آیت میں اللہ تعالیٰ دشمنانِ اسلام کی مخالفت کی وجہ بیان کرتا ہے کہ انکی یہ مخالفت کسی نیک جذبہ کی بنا پر نہیں کیونکہ مسلمان تو خدا تعالیٰ سے محبت کرنیوالے اور اسکی عبادتیں کرنیوالے ہیں بلکہ اسلئے ہے کہ وہ دنیوی زندگی کو اُخروی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں سو مسلمانوں کو اپنے لئے سدِّ راہ سمجھتے ہیں حالانکہ وہ نادان اتنا نہیں جانتے کہ دنیوی حیات تو ایک عارضی چیز ہے باقی رہنے والی زندگی تو وہی ہے جو آخرت کی ہے مگر چونکہ آخرت پر انکو ایمان نہیں اور دنیوی زندگی کے وہ دلدادہ ہیں اسلئے مسلمانوں کی مخالفت کرتے ہیں

**۱۱۷ تفسیر** - فرماتا ہے یہ بات جو ہمنے پہلے بیان کی ہے یہ کوئی فرضی اور من گھڑت نہیں بلکہ صُحُفِ اُولیٰ میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے چنانچہ موسیٰ اور ابراہیمؑ کے صحف کا مطالعہ کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ اُن صحف میں ایک قولِ فصل کی خبر دیگئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ ایک بہت بڑا نبی آنیوالا ہے جو اپنے ساتھ ایک کامل شریعت لائیگا۔ اُن صحف میں اس قسم کی پیشگوئیوں کا موجود ہونا بتلاتا ہے کہ باوجود پہلی کتب کے اس کتاب کی ضرورت تھی تبھی تو پہلے نبیوں نے

اُنکی خبر دی ورنہ اُنہیں اپنے بعد کسی اور نبی کے مبعوث ہونے یا کسی اور کتاب کے نازل ہونے کی خبر دینے کی کیا ضرورت تھی صُحفِ ابراہیم میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی جو خبر دی گئی تھی اسکو خود قرآن کریم نے نقل کیا ہے چنانچہ فرماتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (البقرہ ع ۱۵) یعنی اے میرے رب تو اُن میں ایک ایسا رسول مبعوث کیجیو جو اُن پر تیری آیات کی تلاوت کرے اُنہیں کتاب اور حکمت سکھائے اور اُنہیں پاکیزہ و مطہر بنائے۔ اگر ابراہیمؑ کے صُحف ہی قولِ فصل ہوتے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ دُعا کیوں کرتے۔ اُنکی اِس دُعا سے صاف پتہ لگتا ہے کہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام نوحؑ کی شریعت پر عمل کرنیوالے تھے جیسا کہ اِنَّ مِن شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ (الصافات ع ۳) سے ثابت ہے اور خود انکے اپنے الہامات کےبعض صُحف تھے۔ بہرحال اُنکی تعلیمیں منسوخ ہونیوالی تھیں مگر مٹنے والی نہ ہوتیں تو وہ یہ دُعا ہی کیوں کرتے یہی حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے اُنکی کتاب تورات میں تو نہایت صراحت کیساتھ یہ پیشگوئی آجتک موجود ہے کہ "میں اُن کیلئے اُنکے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا اور اپنا کلام اُسکے مُنہ میں ڈالونگا اور جو کچھ میں اُسے فرماؤنگا وہ سب اُن سے کہیگا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لیکر کہیگا نہ سُنیگا تو مَیں اُسکا حساب اُس سے لونگا" (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸، ۱۹) اسی طرح استثناء باب ۳۳ آیت ۲ میں لکھا ہے "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کیساتھ آیا اور اُسکے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت اُن کیلئے تھی۔"

پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے بعد ایک شرعی نبی کے آنے کی خبر دی ہے اور بتایا ہے کہ وہ نبی بنی اسرائیل میں سے نہیں آئے گا بلکہ اُن کے بھائیوں بنی اسماعیل میں سے آئیگا۔ گویا ابراہیمؑ بھی ایک شرعی نبی کی خبر دیتے ہیں اور موسیٰؑ بھی ایک شرعی نبی کی خبر دیتے ہیں جس کے صاف معنے ہیں کہ پہلے احکام قولِ فصل نہیں تھے قولِ فصل ابھی آنیوالا تھا جسکی اللہ تعالیٰ کے کئی انبیاء یکے بعد دیگرے خبر دیتے چلے آتے تھے۔ اس قسم کی اور بھی کئی پیشگوئیاں بائیبل میں پائی جاتی ہیں اور اُن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قولِ فصل کا دُنیا کو ایک مُدت سے وعدہ دیا جارہا تھا اور ضروری تھا کہ اب اُس وعدہ کو پُورا کر دیا جاتا۔

صحفِ ابراہیمؑ و موسیٰؑ میں آنحضرت صلعم کے متعلق پیشگوئیاں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کا تو تورات میں آجتک ذکر موجود ہے مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئی کا تورات میں کہیں وضاحت کیساتھ ذکر نہیں آتا صرف قرآن کریم نے اسکا ذکر کیا ہے لیکن قرآن کریم کے اِس دعویٰ کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ مکہ کے لوگوں کے سامنے قرآن کریم نے یہ بات پیش کی اور بڑے زور سے اعلان کیا کہ قرآن کے متعلق صُحفِ ابراہیمؑ اور صُحفِ موسیٰؑ میں پیشگوئی پائی جاتی ہے۔ مگر کفار میں سے کسی نے بھی اس کا انکار نہ کیا اور انہوں نے ایکدفعہ بھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ تم غلط کہتے ہو صُحفِ ابراہیمؑ میں اس قسم کی کوئی پیشگوئی نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں لوگوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اِس پیشگوئی کا علم تھا اور وہ جانتے تھے کہ ابراہیمؑ نے یہ پیشگوئی کی ہوئی ہے کہ میرے بعد ایک شرعی نبی آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خاموش رہے۔ ورنہ وہ کفار جو بات بات پر اعتراض کرنے کے عادی تھے اتنی اہم بات پر کس طرح خاموش رہ سکتے تھے۔ خود قرآن کریم نے کفار کے کئی اعتراضات کو نقل کیا ہے مگر کہیں بھی اُنکے اِس اعتراض کا ذکر نہیں آتا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ایک غلط بات منسوب کر دی گئی ہے۔ انہوں نے کوئی پیشگوئی قرآن کے متعلق یا اپنے بعد کسی شرعی نبی کے آنیکے متعلق نہیں کی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں کثرت سے یہ پیشگوئیاں رائج تھیں اور لوگوں کو امید تھی کہ اب ان پیشگوئیوں کے مطابق ضرور کوئی نہ کوئی شخص ظاہر ہوگا چنانچہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں میں سے بعض لوگوں نے اپنے بچوں کا نام محمدؐ رکھنا شروع کر دیا تھا کیونکہ تورات کی پیشگوئیوں سے انہیں معلوم ہوچکا تھا کہ آنیوالے کا نام محمدؐ ہوگا اس بناء پر انہوں نے اپنے بچوں کا نام محمدؐ رکھنا شروع کر دیا کہ شاید ہمارا بچہ ہی نبی بن جائے اور ان پیشگوئیوں کا مصداق ہو جائے۔

غرض آنیوالے موعودؑ کے متعلق عربوں کے دلوں میں اُمیدیں پائی جاتی تھیں اور وہ اِس بات کے منتظر تھے کہ کب اِن پیشگوئیوں کا مصداق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے۔

# سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ غاشیہ۔ یہ سورۃ مکی ہے[1]

## وَهِيَ سِتٌّ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے علاوہ چھبیس آیات ہیں اور ایک رکوع ہے

[1] اس سورۃ کا نام غاشیہ ہے اور یہ سورۃ بغیر کسی اختلاف کے مکی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ دونوں سے مروی ہے کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی اور چونکہ کوئی اور روایت اس کے خلاف نہیں اس لئے اس سورۃ کے مکی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

مسند احمد بن حنبل اور مسلم اور سُنن نسائی اور سُنن ابوداؤد اور ابن ماجہ میں نعمان بن بشیرؓ سے روایت آتی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جمعہ اور عیدین کی پہلی رکعت میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى اور دوسری میں سورۃ الغاشیہ پڑھا کرتے تھے بلکہ اگر دونوں نمازیں جمع ہو جاتی تھیں یعنی اگر کبھی عید الفطر اور جمعہ اکٹھے ہو جاتے یا عید الاضحیہ اور جمعہ اکٹھے ہو جاتے تب بھی آپ دونوں نمازوں میں یہ دونوں سورتیں پڑھا کرتے تھے۔

پادری ویری لکھتے ہیں کہ اس سورۃ کے نزول کا زمانہ چوتھے سال نبوت کے قریب ہے کیونکہ اس کے مضامین ایسے ہیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ مسلمانوں پر کفار کے مظالم یا تو شروع ہو گئے تھے یا شروع ہونے والے تھے۔ نولڈکے NOLDEKE جو جرمن مصنف ہے اُس کا بھی یہی خیال ہے اور چونکہ صحابہؓ کی رائے بھی جو قطعی طور پر آپس میں ملتی ہے اس رائے کے موافق ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ یہ سورۃ اتنا عرصہ پہلے نازل ہوئی ہے کہ یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ابتدائی زمانہ میں نازل ہونے کے خلاف کوئی بات کہی جا سکتی ہو اس لئے ہمیں اس سورۃ کے متعلق کسی بات کی تردید کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

سورۃ غاشیہ کی سورۃ ہے

اس کے مضامین ایسے ہی ہیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ دشمن اپنی دشمنی کو شروع کرنے والا ہے۔ اس میں ایسی دشمنی کا اظہار نہیں جو عملاً رُونما ہو چکی ہو لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ لوگ منصوبہ بازیاں کر رہے ہیں تاکہ مسلمانوں پر سختی کریں اور مسلمان حیران ہیں کہ اب کیا بنے گا۔ پس یوروپین مصنفین کا استدلال غلط نہیں کہ یہ سورۃ ابتدائی زمانہ کی ہے بلکہ اسلامی روایات کے مطابق درست ہی معلوم ہوتا ہے۔

اس سورۃ اور سورۃ الاعلیٰ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جمعہ اور عیدین میں پڑھنا اور بالالتزام پڑھنا اور اتنا تعہد کرنا کہ اگر دونوں نمازیں جمع ہو جائیں تب بھی آپ دونوں میں التزاماً یہ سورتیں پڑھا کرتے تھے بتاتا ہے کہ اسلام کی اجتماعی زندگی کے ساتھ یہ دونوں سورتیں گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ سورۃ الاعلیٰ کا جوڑ تو نظر ہی آتا ہے کہ اُس میں قرآن کریم کے قولِ فصل ہونے کے لحاظ سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح اسلام اپنے انتہائی کمال کو پہنچ جائے گا۔ اس ضمن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام کو ایسے خادم مل جائیں گے جو قرآن کریم کے حافظ ہوں گے۔ اسی طرح اس کی حفاظت کے متعلق اور کئی قسم کی غیر معمولی تحریکات دنیا میں جاری ہو جائیں گی۔ گویا سورۃ الاعلیٰ اسلامی ترقی اور دین اسلام کی اشاعت۔ اُس کے ماننے والوں کی زیادتی اور مسلمانوں کے غلبہ پر

[2] سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ غاشیہ کا مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق

[1] زمانہ نزول

دلالت کرتی تھی اور سورۃ الغاشیہ میں گو وہ مضمون نہیں مگر اس میں بھی یہ بات ضرور پائی جاتی ہے کہ کافروں کے اسلام کے خلاف اُٹھنے اور زور لگانے کا اس میں اشارہ کیا گیا ہے اور مومنوں کا اُن کے مقابلہ میں کامیاب ہونا اشارۃً بیان کیا گیا ہے مگر چونکہ ابھی اسلام کے ابتدائی ایام تھے اور خواہ مخواہ کفار کو بھڑکانا مقصود نہیں تھا اس لئے جنگ اور مقابلے کا اللہ تعالےٰ صریح الفاظ میں ذکر نہیں کرتا بلکہ ایسے الفاظ میں ذکر کرتا ہے جو ٹھیس لگانے والے نہ ہوں۔ جس طرح دشمن نے کھلے طور پر مخالفت کا اظہار نہیں کیا تھا اسی طرح اللہ تعالےٰ نے بھی کھلے طور پر یہ ذکر نہیں کیا کہ مسلمان لڑیں گے اور کفار کو مغلوب کرلیں گے صرف نتیجے کا ذکر کر دیا ہے کہ اسلام کے خلاف مخالفین کچھ کوششیں کریں گے لیکن وہ اسلام کو گزند پہنچانے میں ناکام رہیں گے اور آخر مسلمانوں کو اپنے مخالفین پر غلبہ حاصل ہوجائے گا۔ گویا صاف الفاظ میں اس سورۃ میں لڑائی کا ذکر نہیں کیا صرف اشارۃً اس کا ذکر کیا ہے تاکہ اس وقت جبکہ مخالفین اسلام نے کھلے طور پر حملہ نہیں کیا تھا اس قسم کی باتوں کی وجہ سے اسلام کی طرف سے ابتداء نہ سمجھی جائے اور یہ خیال نہ کیا جائے کہ کفار کو انہوں نے بھڑکا دیا ہے۔

سورۃ کا خلاصۂ مضمون

اس سورۃ کا مضمون بھی اجتماعی کاموں پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ اس سورۃ میں ایک مجموعۂ افراد کا ذکر کرتے ہوئے پیشگوئی کی گئی ہے کہ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ۔ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ۔ ان الفاظ میں اللہ تعالےٰ نے صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ترقی کی خبر نہیں دی بلکہ جماعت مسلمہ کی ترقی کی بھی خبر دی ہے اسی طرح وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ۔ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ میں اجتماعی طور پر کفار کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ناکام رہیں گے حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سورۃ الاعلیٰ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اور آخری زمانہ یعنی ہر دو زمانوں کے متعلق ہے اور یہ سورۃ بھی ان دونوں زمانوں کے حالات بیان کرتی ہے۔ چونکہ ان دونوں سورتوں کا مضمون ایسا ہی جو شروع زمانۂ اسلام سے آخر زمانۂ اسلام تک تعلق رکھنے والا تھا۔ اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہمیشہ جمعہ اور عیدین میں بالالتزام ان دونوں سورتوں کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ جمعہ اور عیدین جو اجتماع کے مواقع ہیں اُن میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ان دونوں سورتوں کی تلاوت کرنا بتاتا ہے کہ جب بھی مسلمان اجتماعی طاقت پکڑنے کی طرف متوجہ ہوں گے اور جب بھی خدا تعالےٰ مسلمانوں کی کمزوری کو دُور کرنے لگے گا اُس وقت یہ دونوں سورتیں اپنے مطالب کے لحاظ سے ظاہر ہوجائیں گی۔

سورۃ الاعلیٰ میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ مسلمانوں کی ترقی اُسی وقت ہوگی جب قرآن کریم کے معارف اور اُس کے علوم کو ظاہر کرنے والا ماموراللہ تعالےٰ کی طرف سے آئے گا۔ گویا مسلمانوں کی ترقی کبھی بھی دنیوی ذرائع سے نہیں ہوگی بلکہ مامورین پر ایمان لانے اور انکی ہدایت پر چلنے کے ذریعہ ہوگی جیسا کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى کے الفاظ اس پر شاہد ہیں کہ قرآن کریم کے خدام جو بھولے ہوئے قرآن کو پھر واپس لائیں گے اُن کے ذریعہ ہی مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عزت کو حاصل کرسکیں گے۔ آج جو مسلمان سیاسی ذرائع سے ترقی حاصل کرنا چاہتے ہیں اُن کو سورۃ الاعلیٰ کے مضامین کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

اسلام کی ترقی تلواروں کے سایہ کے نیچے

اب اس سورۃ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب بھی اسلام کو ترقی ہوگی تلواروں کے سایہ کے نیچے ہوگی۔ کبھی کوئی مامور ایسا نہیں آسکتا جس کے آنے پر دنیا اُس کا خوشی سے استقبال کرے اور کہے کہ "جی آئیاں نوں" یا "بھلے آئے" یا "بر سر و چشم"۔ بلکہ جب بھی کوئی مامور آئے گا وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ۔ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ کی حالت رونما ہوگی اور ضرور اسکی مخالفت ہوگی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

هَلۡ اَتٰىكَ حَدِیۡثُ الۡغَاشِیَةِ ۝

کیا تجھے (دنیا پر) چھا جانیوالی (مصیبت) کی بھی خبر پہنچی ہے؟ (یا نہیں) ۲ـه

اس مخالفت کے بغیر کسی روحانی سلسلہ کی ترقی کا امکان بالکل ناممکن ہے۔ اگر حضرت مسیح ناصریؑ جیسا کہ مسلمان سمجھتے ہیں کسی وقت آسمان سے اتر آئیں تو اُن کے زمانہ میں وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ لوگ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جائیں گے اور اُن کے حلقۂ غلامی میں شامل ہو جائینگے کیونکہ فرشتے اُن کے ساتھ ہوں گے اور کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکے گی۔ مگر الٰہی سُنت کے ماتحت ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ضروری ہے کہ ہر الٰہی سلسلہ کی مخالفت ہو اور مخالفت کے بعد اُس کو ترقی نصیب ہو۔ غرض ان دونوں سورتوں سے پتہ لگتا ہے کہ اسلام کو ہمیشہ شدید مخالفت کے بعد ترقی ہوتی ہے پس یہ دونوں سورتیں مضامین کے لحاظ سے آپس میں گہرا تعلق رکھتی ہیں۔

اس سورۃ کا سورۃ الاعلیٰ سے ایک قریبی تعلق بھی ہے جو بحر محیط کے مصنف نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں نار اور آخرت سے ڈرانے کا حکم تھا اور اس سورۃ میں دوزخ و جنت کا ذکر کیا گیا ہے مگر اصل تعلق وہی ہے جو میں نے بیان کیا ہے کہ ان ہر دو سورتوں میں اسلام کی ترقی کے دو[۱] اصول بیان کئے گئے ہیں۔ سورۃ الاعلیٰ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب بھی مسلمانوں کا تنزل ہوگا قرآن کریم کے بھولنے سے ہوگا اور جب بھی مسلمانوں کی ترقی ہوگی ایسے شخص کے ذریعہ ہوگی جو قرآن کو آسمان سے واپس لائے گا گویا ایسے مامور تو آئیں گے جو بھولے ہوئے قرآن کو یاد کرائینگے مگر ایسے مامور نہیں آسکتے جو نئی شریعت لائیں اور سورۃ الغاشیہ میں اللہ تعالےٰ نے یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی دورِ اوّل میں ہو یا دَورِ آخر میں ہمیشہ ایسے ماموروں کے ذریعہ ہوگی جن کی شدید مخالفت ہوگی مگر بالآخر وہ جیت جائیں گے جیسا کہ وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ میں بتایا ہے۔ پس مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اُن کی ترقی ہمیشہ ماموریں پر ایمان لانے اور ساری دنیا سے لڑائی جھگڑا مول لینے کے بعد ہوگی۔ ایسا وجود کوئی نہیں آسکتا جسے لوگ آپ ہی آپ مان لیں۔ پس آسمان سے کسی مامور کے اُترنے کا خیال بالکل خلافِ قرآن ہے

**۲ـه حل لغات۔** هَلۡ: جب فعل سے پہلے آئے تو اسکے معنے قَدۡ کے ہوتے ہیں لیکن عام طور پر هَلۡ تصدیق ایجابی کے لئے آتا ہے یعنی عام معنے اس کے ایسے سوال کے ہیں جس کے جواب میں تصدیق کا مطالبہ ہوتا ہے سوائے اس کے کہ اس کے بعد اِلَّا آجائے اُس وقت اس کے معنے نفی کے ہو جاتے ہیں۔ پس آیت کے معنے یا تو یہ ہوں گے کہ کیا حدیثِ غاشیہ آپہنچی یا نہیں یعنی آپہنچی ہے اور یا پھر یہ معنے ہوں گے کہ وہ ضرور آپہنچی ہے۔

حَدِیۡثٌ کے معنے خبر کے ہوتے ہیں (اقرب)

غَاشِیَةٌ: غَاشِیۡ کا مؤنث ہے اور اس کے معنے ہیں ڈھانکنے والی چیز۔ نیز غَاشِیَةٌ قیامت کا بھی

[۱] سورۃ غاشیہ کا سورۃ الاعلیٰ سے تعلق

هَلۡ

غَاشِیَةٌ

نام ہے کیونکہ اُس میں اس قدر ڈر اور خوف اور صدمہ
کی باتیں ہوں گی کہ اُن کی وجہ سے وہ انسانی دماغ پر
چھا جائے گی۔ (اقرب) جب کبھی کوئی بڑا حادثہ ہوتا
ہے باقی سارے حالات انسان کے دل سے محو ہو جاتے
ہیں۔ قیامت چونکہ ایک بڑا بھاری حادثہ ہو گا اور
قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ اُس وقت ہر شخص دوسرے
کو بھول جائے گا یہاں تک کہ ماں اپنے بچہ کو بھول جائیگی
اور قیامت کا خیال باقی تمام خیالات پر مستولی اور غالب
آجائے گا اس لئے قیامت کو بھی غَاشِیَۃ کہا جاتا
ہے اور غَاشِیَۃ جہنم کی آگ کو بھی کہتے ہیں (اقرب)

غاشیہ سے مراد عذاب الٰہی

کیونکہ اُس کا عذاب کامل ہے۔ عام عذاب ایسے ہوتے
ہیں کہ اُن میں کوئی نہ کوئی پہلو عذاب سے بچا ہوا ہوتا
ہے۔ ایک طرف سے اگر دُکھ پہنچ رہا ہوتا ہے تو دوسری
طرف سے سُکھ بھی پہنچ رہا ہوتا ہے۔ اگر کسی کا ایک
بچہ مرے تو اُس کا دُوسرا بچہ اُس کے سامنے کھیل رہا
ہوتا ہے یا کسی کا باپ مرے تو اُس کی ماں اُس کے
پاس موجود ہوتی ہے یا دوسرے بھائی۔ عزیز اور رشتہ دار
پاس ہوتے ہیں اور اس غم میں بھی تسکین کا ایک پہلو
پایا جاتا ہے۔ یا کسی کو مال میں نقصان پہنچتا ہے تو
دوسری طرف سے کوئی فائدہ اُسے پہنچ جاتا ہے غرض
دنیوی عذاب سب ایسے ہیں کہ ایک طرف سے اگر عذاب آتا
ہے تو اُس کے ساتھ ہی کوئی نہ کوئی سُکھ کا پہلو بھی
ہوتا ہے مگر جہنم کے عذاب کو غاشیہ اس لئے کہتے
ہیں کہ وہ کامل عذاب ہو گا اور اُس میں سُکھ کا کوئی پہلو
نہیں ہو گا۔ اور غاشیہ زبردست مصیبت کو بھی کہتے
ہیں چنانچہ کہتے ہیں تَاْتِیْہِ غَاشِیَۃٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰہِ اَیْ
نَائِبَۃٌ تَغْشَاہُ۔ یعنی اُس پر ایسی مصیبت نازل ہو گی
جو اس کو ڈھانپ لے گی (اقرب) اور غَاشِیَۃ کے
معنے غلافِ قلب کے بھی ہیں۔ اور غَاشِیَۃ پیٹ
کی بیماری کو بھی کہتے ہیں۔ اور غَاشِیَۃ کے معنے
ایسی جماعت کے بھی ہیں جو سوال کے رنگ میں یا کوئی
اور فائدہ اُٹھانے کے لئے انسان کے پیچھے پڑی رہے
(اقرب) سوالیوں کو اس لئے غاشیہ کہتے ہیں کہ وہ
بُری طرح پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ نوکروں چاکروں کو بھی
غاشیہ کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی آقا کی خوشنودی حاصل
کرنے کے لئے اُس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ اسی
طرح وہ دوست جو ایک دوسرے سے ملنے کے لئے گھروں
پر آتے جاتے ہیں وہ بھی غاشیہ کہلاتے ہیں (اقرب)

**تفسیر۔** قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی
عذابوں میں سے ایک عذاب خاص طور پر غاشیہ کہلانے
کا مستحق ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ
میں بھی آیا اور مسیح موعودؑ کے زمانہ کے لئے بھی اس کی
پیشگوئی تھی۔ سورۃ دُخان میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے
فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ
يَّغْشَى النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (الدخان ع۱)
یعنی تو انتظار کر اُس دن کا جب آسمان پر دُھواں ہی
دُھواں چھا جائے گا اور سارے انسانوں کو اپنے اندر
ڈھانپ لے گا یہ عذاب ہے جو نہایت ہی درد ناک
ہو گا۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب
مکہ والوں نے سخت دُکھ دیا تو آپ نے اس پیشگوئی کے
ماتحت دعا کی کہ اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلَیْھِمْ بِسَبْعٍ
کَسَبْعِ یُوْسُفَ (بخاری جلد ۳ کتاب تفسیر القرآن)
اے خدا ان لوگوں نے مجھے سخت تنگ کر لیا ہے تو
میری اُن سات سالوں سے مدد فرما جن سات سالوں
سے تُو نے حضرت یوسف علیہ السلام کی مدد کی تھی چنانچہ
اس دعا کے نتیجہ میں اُس زمانہ میں شدید قحط پڑا۔
بارشیں رُک گئیں اور اس قدر تباہی آئی کہ مکہ والوں نے
ابوسفیان کو خاص طور پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کی طرف بھیجا اور کہا کہ آپ کی قوم قحط کی وجہ سے برباد ہو گئی آپ
دعا کریں کہ ابھی یہ حالت بدل جائے (بخاری کتاب تفسیر القرآن تفسیر سورۃ دخان)

گویا جس طرح فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اپنے سفیر بھیجے تھے اسی طرح مکہ والوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں اپنا سفیر بھیجا اور درخواست کی کہ اس قحط کے دور ہونے کے متعلق دعا فرمائی جائے چنانچہ آپ نے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اس قحط کو دُور کر دیا۔ تو غاشیہ سے مراد وہ عذابِ دُخان بھی ہے جس کا ذکر سورۂ دُخان میں کیا گیا ہے۔
اِس دخانِ مبین کے عذاب کی مسیح موعودؑ کے زمانہ کیلئے بھی پیشگوئی کی گئی ہے چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر جو الہامات نازل ہوئے اُن میں ایک الہام یہ بھی ہے کہ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ وَّتَرَی الْاَرْضَ یَوْمَئِذٍ خَامِدَۃً مُّصْفَرَّۃً (تذکرہ ص۹۹)
غرض علاوہ اور عذابوں کے جن کی طرف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الہامات میں اشارہ کیا گیا ہے قحط کے عذاب کی خبر بھی آپ کے الہامات میں موجود ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں پر شدید تنگی اور مصیبت کے سال آئیں گے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں علاوہ عام قحطوں کے جنگوں کی وجہ سے جو قحط پڑے ہیں وہ ایسے شدید ہیں کہ اُن کی مثال پہلے زمانوں میں نہیں ملتی۔ دنیا میں ایک ایک سال کے قحط پڑتے ہیں تو تباہی آجاتی ہے مگر یہاں قحطوں کی یہ حالت ہے کہ بعض اقوام ایسی ہیں جنہوں نے چھ چھ سال سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ ۱۹۴۲ء کے شروع میں جب قحط کی تکلیف شروع ہوئی اور غلّہ کی سخت قلّت ہو گئی تو میں اُن دنوں میں سندھ میں تھا مجھے وہاں قادیان سے اطلاع ملی کہ یہاں اوّل تو گندم ملتی ہی نہیں اور اگر ملتی ہے تو اُس کی روٹی کالی پکتی ہے چنانچہ میں نے جو گندم کا نمونہ دیکھا زیرہ کے برابر اُس کا دانہ تھا اور رنگ ایسا تھا جیسے سیاہ گڑ ہوتا ہے میرے نزدیک تو اس گندم سے پکی ہوئی روٹیاں جانوروں

کے کھانے کے قابل بھی نہیں تھیں مگر لوگ اِن ایام میں مجبوراً وہی کھاتے رہے۔ بنگال میں یہ حالت ہوگئی کہ ایک یتیم لڑکی جو ایک احمدی نے پرورش کے لئے رکھی ہوئی ہے بتاتی ہے کہ میں اور واقعات تو بھول گئی ہوں مگر مجھے اتنا یاد ہے کہ لوگ مُردوں کی ہڈیاں لیکر کھا جاتے تھے بعض جگہ پر ثابت ہُوا ہے کہ عورتوں نے اپنے بچے ذبح کر کے کھا لئے۔ یہ کیسا خطرناک قحط ہے کہ دس لاکھ آدمی سے زیادہ چند مہینوں میں ہی بھوک کی وجہ سے مر گیا اور یہ دس لاکھ بھی گورنمنٹ کا اندازہ ہے ورنہ پبلک کا اندازہ یہ ہے کہ بنگال میں بیس لاکھ آدمی قحط کی وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں حالانکہ بیس لاکھ آدمی جنگ کے قریباً چھ سالہ عرصہ میں بھی ہلاک نہیں ہوئے پھر یہ وہ زمانہ ہے جس میں ریل موجود ہے۔ موٹریں موجود ہیں۔ لاریاں موجود ہیں۔ نہریں چل رہی ہیں اور سامان خورد و نوش نہایت آسانی کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچایا جا سکتا ہے باوجود سامانوں کی اس قدر افراط کے ایک سال کے اندر اندر بیس لاکھ آدمی بنگال میں بھوک کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ اگر یہ قحط کسی ایسی جگہ پڑتا جہاں کھانے پینے کا سامان کسی صورت میں بھی پہنچایا نہ جا سکتا تو شاید ایک آدمی بھی نہ بچتا اور سب کے سب ہلاک ہو جاتے ہزارہا آدمی ایسے ہیں جو بنگال سے نکل کر پنجاب اور سرحد میں آبسے ہیں اور انہوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ اب شاید قیامت تک بنگال میں قحط ہی رہے گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے خاندان میں سے کوئی زندہ ہی نہیں رہا اس لئے ہم گھبرا کر وہاں سے نکل آئے ہیں اب ہم نے واپس جا کر کیا کرنا ہے۔ بعض واقعات ایسے ہوئے ہیں۔ کہ ایک بھوک سے تڑپتے ہوئے بچہ کو اٹھا کر لایا گیا اور اُسے دُودھ پلایا گیا تو دُودھ کے اندر جاتے ہی وہ بچہ ہلاک ہو گیا۔ دراصل لمبے فاقہ کی وجہ سے معدہ میں

غاشیہ سے مراد قحط کا عذاب

۳۴۱
حضرت مسیح موعودؑ کے زمانہ میں آپکی پیشگوئی کے مطابق قحط کا عذاب

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝

اُس دن (جب وہ بھیجا جائیگی) کچھ چہرے اُترے ہوئے ہونگے (وہ) محنت کر رہے ہونگے اور تھک کر چور ہو رہی ہونگے (لیکن محنت انہیں فائدہ نہ دیگی) ۳۔۵

وُجُوْهٌ

زہر پیدا ہو جاتا ہے اور جب دُودھ یا کوئی اور غذا اندر جاتی ہے تو انسان ہلاک ہو جاتا ہے۔

پس هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ کے یہ معنے ہیں کہ کیا تمہیں معلوم ہے یا نہیں کہ غاشیہ کہلانیوالی مصیبت بھی آنے والی ہے۔ هَلْ چونکہ عام طور پر تصدیق استجابی کے لئے آتا ہے اس لئے اس کے معنے یہ ہونگے کہ کیا حدیثِ غاشیہ آپہنچی کہ نہیں یعنی آپہنچی ہے لیکن هَلْ جب فعل سے پہلے آئے تو کبھی قَدْ کے معنے بھی دیتا ہے اس لحاظ سے آیت یوں ہوگی قَدْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ۔ اب مخالفتیں تیز ہونیوالی

خَاشِعَةٌ

ہیں اس لئے خدا تعالےٰ کی طرف سے بھی عذاب کی خبریں آرہی ہیں یا اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہم نے تیری طرف حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ بھیجدی۔ دشمن اب شرارت میں بڑھنے والا ہے اس لئے ہم نے بھی عذاب کی خبریں دینی شروع کر دی ہیں اور غاشیہ کے معنے چونکہ اُس شخص کے بھی ہوتے ہیں جس کے پاس کثرت سے لوگ آئیں اس لئے حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ کے معنے فتوحات کے بھی ہو سکتے ہیں اور معنے یہ ہوں گے کہ چاروں طرف سے لوگوں کے وفود تیرے پاس آئیں گے۔ گویا درمیانی زمانہ مخالفت کو چھوڑ دیا اور آخری نتیجہ بیان

حدیث اتٰک حدیث الغاشیۃ میں فتحِ عظیم کی خبر

کر دیا کہ تیرے پاس وفود آئیں گے۔ ان معنوں کے لحاظ سے حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ میں سالِ وفود کی خبر دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کفار سے جنگ ہوگی۔ تو اس جنگ میں جیت جائیگا اور پھر چاروں

نَاصِبَةٌ

طرف سے لوگوں کے وفود تیرے پاس آئیں گے دشمن اُن کو دیکھ دیکھ کر جل مرے گا اور مومن بہت بڑی ترقیات حاصل کریں گے۔

## ۳۔۵ حل لغات

وُجُوْهٌ: وَجْهٌ کی جمع ہے اور وَجْهٌ کے اصل معنے تو چہرے کے ہوتے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی اس کے کئی معنے ہوتے ہیں چنانچہ ایک معنے سَيِّدُ الْقَوْمِ کے ہوتے ہیں یعنی قوم کا سردار۔ پھر وَجْهٌ کے معنے اس انسان کے بھی ہوتے ہیں جو عزت اور وجاہت رکھتا ہو (اقرب) چنانچہ کہتے ہیں رَجُلٌ وَجْهٌ اور مراد ہوتی ہے ذُو وَجَاهٍ۔ یعنی فلاں آدمی بڑی عزت اور وجاہت والا ہے پس وُجُوْهٌ کے معنے ہوئے کچھ لوگ جو معزز سمجھے جاتے ہیں یا کچھ لوگ جو قوم کے سردار ہیں۔

خَاشِعَةٌ: خَشَعَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے اور خَشَعَ لَهٗ خُشُوْعًا کے معنے ہوتے ہیں ذَلَّ وَتَطَامَنَ۔ اُس سے دب گیا۔ اُس کے ماتحت ہوگیا یا اُس کے سامنے اُسے جھکنا پڑا۔ اور خَشَعَ بِبَصَرِهٖ کے معنے ہوتے ہیں غَضَّهٗ۔ اُس نے اپنی آنکھیں نیچی رکھیں۔ اور خَشَعَ بَصَرُهٗ کے معنے ہوتے ہیں اِنْكَسَرَ۔ اُس کی نظر جھک گئی یعنی ذلت اور رسوائی کی وجہ سے انسان نے آنکھ اونچی نہ کی۔ اور خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ کے معنے ہیں سَكَنَتْ وَذَلَّتْ وَخَضَعَتْ آوازیں دب گئیں اور خدا تعالےٰ کے سامنے ذلت اور اقرارِ اتباع پر مجبور ہوگئیں (اقرب) پس وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ کے معنے ہوئے اُس دن کچھ سردارانِ قوم ہوں گے یا کچھ لوگ ہوں گے یا کچھ وجاہت والی ہستیاں ہونگی جو بالکل ذلیل ہو جائیں گی اور اُن کی آوازیں دب جائینگی

نَاصِبَةٌ: نَصَبَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے اور نَصَبَهُ الْهَمُّ کے معنے ہوتے ہیں اَتْعَبَهٗ غم نے اس کو تھکا دیا۔ اور نَصَبَ فُلَانٌ بِالشَّيْءِ وَكے

معنے ہوتے ہیں وَضَعَهٗ وَضْعًا ثَابِتًا كَنَصْبِ الرُّمْحِ وَالْبِنَاءِ وَالْحَجَرِ یعنی کسی چیز کو مضبوطی سے گاڑ دیا جیسے نیزہ گاڑا جاتا ہے یا بنیاد کو مضبوط بنایا جاتا ہے یا پتھر کو عمارت میں مضبوطی سے پیوست کر دیا جاتاہے۔ وَرَفَعَهٗ ضِدٌّ۔ نیز یہ لفظ اضداد میں سے ہے اور اس کے معنے بلند کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور نَصَبَ السَّيْرَ کے معنے ہوتے ہیں رَفَعَهٗ اَوْهُوَ اَنْ يَّسِيْرَ طُوْلَ يَوْمِهٖ سَيْرًا لَيِّنًا۔ اُس نے سیر کو بلند کیا یعنی خوب تیزی سے سفر کیا یا آہستہ آہستہ سارا دن سفر کرتا رہا گویا اس کے دونوں معنے ہیں۔ یہ بھی معنے ہیں کہ خوب گھوڑا دوڑایا اور یہ بھی معنے ہیں کہ آہستہ آہستہ دیر تک سفر کرتا چلا گیا۔ اور نَصَبَ بِفُلَانٍ کے معنے ہوتے ہیں عَادَاهُ۔ اُس سے دشمنی کی اور نَصَبَ لَهُ الْحَرْبَ کے معنے ہوتے ہیں وَضَعَهَا اُس کے خلاف لڑائی کی اور نَصَبَ الْعَلَمَ کے معنے ہوتے ہیں رَفَعَهٗ وَاَقَامَهٗ مُسْتَقْبِلًا بِهٖ۔ اس نے جھنڈے کو اپنے سامنے کھڑا کیا۔ اور نَصَبَ الشَّجَرَةَ کے معنے ہوتے ہیں غَرَسَهَا فِي الْاَرْضِ اس نے زمین میں درخت گاڑا اور نَصَبَ السُّلْطَانُ فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں وَلَّاهُ مَنْصَبًا۔ اس کو بادشاہ نے کسی منصب پر مقرر کیا اور نَصَبَ الشَّرَّ بِفُلَانٍ کے معنے ہوتے ہیں اَظْهَرَهٗ لَهٗ اس کے خلاف منصوبہ بازی کی اور نَصَبْتَ لَهٗ رَاْيًا کے معنے ہوتے ہیں اَشَرْتَ عَلَيْهِ بِرَاْيٍ لَا يَعْدِلُ عَنْهُ کہ تو نے ایسی رائے اُس کو دی جس سے وہ اِدھر اُدھر نہ ہو سکا (اقرب) پس عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ کے معنے ہوئے عمل کرنے والی جماعت یا اعلانِ جنگ کرنے والی یا اپنی بنیادوں کو مضبوطی سے گاڑ دینے والی یا لمبے لمبے سفر کرنے والی یا اپنی دشمنیوں کا اظہار کرنے والی یا عہدوں پر مقرر کرنے والی یا اپنے جھنڈوں کو اونچا کرنے والی یا نیزوں کو گاڑنے والی جماعت (اقرب)

غَاشِيَة کے معنے چونکہ عام مشکلات اور مصائب کے بھی ہیں جن میں وہ لڑائیاں بھی شامل ہیں جو کفار سے ہوئیں۔ اس لحاظ سے عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ کے یہ معنے ہوں گے کہ اب مخالفینِ اسلام تمہارے خلاف منصوبے کرنے والے ہیں اور اُن بغضوں اور کینوں کو جن کو وہ اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے ظاہر کرنے والے ہیں۔

**تفسیر**۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ سورۃ غاشیہ کا نزول رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوّت کے چوتھے سال کے قریب ہوا ہے اور یہی وہ سال ہے جس میں کفارِ مکّہ کی طرف سے منظم رنگ میں ایذاء دہی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابتداء میں تو لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کو سُنتے تو کہتے۔ ہائے ہائے بیچارا پاگل ہوگیا ہے (نعوذ باللہ من ذالک) اس طرح آپکو مجنون اور پاگل کہہ کر وہ اپنے دل کا غصہ نکال لیتے تھے مگر جب کچھ لوگوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مان لیا خصوصًا نوجوان طبقہ میں سے ایک بااثر حصہ آپ کی بیعت میں شامل ہوگیا جن میں حضرت عثمان رضؓ حضرت طلحہ رضؓ اور حضرت زبیر رضؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں تو کفار میں اسلام کے خلاف سخت جوش پیدا ہوگیا۔ اُن کے دلوں میں اسلام کی مخالفت کا جوش پیدا کرنے والی دو چیزیں تھیں ایک غلاموں کا اسلام میں شامل ہونا۔ دوسرے رؤساء میں سے بعض نوجوانوں کا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آنا۔ حضرت عثمان رضؓ۔ حضرت طلحہ رضؓ اور حضرت زبیر رضؓ ایسے خاندانوں میں سے تھے جو مکّہ کے رؤساء میں شمار ہوتے تھے۔ جب یہ لوگ ایمان لے آئے تو وہ لوگ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پاگل کہا کرتے تھے اُن لوگوں نے طعنہ دینا شروع کر دیا کہ کیا یہ پاگل ہے۔

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ کے آٹھ معنے

# تَصْلٰی نَارًا حَامِيَةً ۝

۵ ۔ (سخت گرم اور) بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے ؎ۂ

یہ تو تمہارے گھروں میں سے نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچکر لے گیا ہے اور تم اسی خیال میں مست ہو کہ یہ پاگل ہے ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اسی طرح جب غلام مسلمان ہوئے اور کفار مکہ نے ان غلاموں کے مُنہ سے یہ باتیں سنیں شروع کیں کہ بُتوں کی پرستش بالکل بیہودہ بات ہے اُن میں رکھا ہی کیا ہے وہ تو کسی کو نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ تو یہ باتیں اُن کیلئے بالکل ناقابلِ برداشت ہوگئیں۔ کیونکہ اوّل تو اُن کے بُتوں کو بُرا بھلا کہا جاتا تھا اور پھر کہنے والے وہ تھے جو اُن کے غلام تھے۔ یہ حالات تیسرے سال کے بعد پیدا ہونے لگ گئے تھے چنانچہ اسلام کی ترقی کو دیکھ کر انہوں نے علی الاعلان کہنا شروع کر دیا کہ اب مذاق ہوچکا۔ اب ہم ان باتوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں بھی جب آپس میں مذاق ہو تو معمولی مذاق تو دوسرا شخص برداشت کرتا جاتا ہے لیکن جب بات بڑھنے لگے تو وہ کہہ دیتا ہے اب حد ہوگئی اب اس کے بعد اگر کوئی مذاق کیا تو میں تم سے لڑ پڑوں گا۔ اسی طرح تیسرے سال کے بعد کفارِ مکہ نے کہنا شروع کر دیا کہ ہم تو ان باتوں کو مذاق سمجھتے تھے مگر اب تو حد ہوگئی اب یہ باتیں ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی ہیں چنانچہ انہوں نے اپنے بُغضوں اور شرارتوں کا اعلان کر دیا۔ پس اُن کے اس اعلان کی ہی خبر خدا تعالٰے نے وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ میں دی ہے کیونکہ نَاصِبَةٌ کے ایک معنے افسر مقرر کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ وقت آرہا ہے جبکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں مکہ والے کمانڈر اور افسر مقرر کریں گے اور یہ لوگ پورا زور لگائیں گے کہ اسلام نہ پھیلے چنانچہ پیشگوئی کے مطابق مخالفین نے مخالفت کے جھنڈے گاڑ دیئے اور مقابلہ کے لئے اُتر آئے۔

پھر جن الفاظ میں مخالفین کی مخالفت کی خبر دی ہے وہ ایسے ہیں کہ ان سے مخالفت کی تفصیل اور اُس کا انجام بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پہلے عَامِلَةٌ کہا ہے عَامِلَةٌ میں انفرادی طور پر مکہ والوں کے مخالفت کرنیکا ذکر تھا مگر اس کے بعد نَاصِبَةٌ کا لفظ استعمال کیا اور نَاصِبَةٌ میں قومی طور پر مخالفت کرنے کا ذکر ہے اور اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اب مکہ والے صرف انفرادی طور پر نہیں بلکہ قومی طور پر اور اجتماعی رنگ میں بھی مخالفت کریں گے اور اپنے میں سے بعض کو افسر مقرر کریں گے تاکہ ایک تنظیم کے ماتحت وہ مسلمانوں سے لڑیں اور اُن کو دِق کریں۔

پھر نَاصِبَةٌ کے ایک معنے چونکہ تھکنے والی جماعت کے بھی ہیں۔ گویا آیت کے اس حصہ میں مخالفت کے انجام کی طرف اشارہ کر دیا کہ اہالیانِ مکہ مخالفت میں پوری محنت صرف کریں گے مگر اس کے نتیجہ میں اُن کو کوئی خوشی نہیں پہنچیگی۔ محنت کریں گے لیکن نتیجہ تھکان ہی تھکان نکلیگا آرام و راحت میسر نہیں آئے گی۔

**؎ۂ حل لغات۔** حَامِيَةً: حَمِيَ سے ہے اور حَمِيَتِ النَّارُ کے معنے ہوتے ہیں اِشْتَدَّ حَرُّهَا آگ نہایت تیزی کے ساتھ بھڑک اُٹھی (اقرب) پس حَامِيَةً کے معنے ہوں گے شدّت سے بھڑکنے والی۔ اور تَصْلٰی نَارًا حَامِيَةً کے معنے ہوں گے کہ مخالف جماعتیں بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گی۔ ساری آگیں ایک قسم کی نہیں ہوتیں بعض آگیں زیادہ گرم ہوتی ہیں اور بعض

حَامِيَةً

# تُسْقٰی مِنْ عَیْنٍ اٰنِیَۃٍ ۝

انہیں اُبلتے ہوئے چشمہ سے (پانی) پلایا جائے گا ۵۵

کم گرم۔ یہاں تک کہ بعض آگیں ایسی ہوتی ہیں کہ لوگ ننگے پاؤں صرف پاؤں کو کیچڑ لگا کر اُن کے اُوپر سے گذر جاتے ہیں اور اُنہیں کوئلوں کی گرمی محسوس نہیں ہوتی۔ مگر فرماتا ہے کہ وہ آگ جس میں مخالفین داخل ہونگے وہ نَارًا حَامِیَۃً ہوگی یعنی ایسی آگ جو اپنی تیزی اور اپنی گرمی میں انتہاء پر پہنچ چکی ہوگی۔

**تفسیر۔** فرماتا ہے یہ مخالفت چاہے انفرادی ہو یا قومی مخالفین کی تباہی کا موجب ہوگی اور بجائے اس کے کہ مخالف لوگ امن و آرام پائیں یا اُنہیں عزت اور کامیابی حاصل ہو یہ اُس آگ میں داخل ہوں گے جو سخت گرم ہوگی اور بھڑکنے میں تیز ہوگی یعنی مسلمان ترقی کر جائیں گے اور مخالفین اپنے منصوبوں میں ناکام و نامراد رہیں گے اور آگ میں جلیں گے۔

**۵۵ حل لغات۔** عَیْنٌ کے عربی زبان میں بہت سے معنے ہیں ان معنوں میں سے ایک چشمہ کے ہیں اور دوسرے معنے بادل کے ہیں (اقرب) اس آیت میں چونکہ تُسْقٰی کا لفظ استعمال ہُوا ہے اس لئے عَیْنٌ سے مراد چشمہ یا بادل ہی ہوسکتا ہے۔

اٰنِیَۃٌ: اَنٰی (یَاْنِیْ اَنْیًا وَاِنًی وَاَنَاءً) سے ہے اور اَنٰی کے معنے ہوتے ہیں دَنٰی وَقَرُبَ وَحَضَرَ۔ وہ قریب ہوگیا اور سامنے آگیا۔ جب پانی کے متعلق یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس کے معنے ہوتے ہیں اِنْتَہٰی حَرُّہٗ۔ کہ پانی سخت گرم ہوگیا (اقرب)۔ جیسے آگ کے متعلق کہتے ہیں حَمِیَتِ النَّارُ یعنی آگ سخت بھڑک اُٹھی۔ اسی طرح پانی کے لئے جب یہ لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں وہ تیز گرم ہوگیا پس تُسْقٰی مِنْ عَیْنٍ اٰنِیَۃٍ کے یہ معنے ہوئے کہ اُنہیں ایسے چشمے سے پانی پلایا جائے گا جو نہایت تیز گرم ہوگا یا ایسے بادلوں سے اُن پر پانی برسے گا جو نہایت شدید گرم ہوں گے اور اُن کو جُھلس کر رکھ دیں گے۔

**تفسیر۔** انسان پانی پیتا ہے تو اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ پیاس بجھے اور پیاس ہمیشہ ٹھنڈا پانی بجھاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ ذکر ہے کہ اُن کو سخت کھولتا ہُوا گرم پانی پلایا جائے گا۔ گرم پانی انسان دو ہی حالتوں میں پیتا ہے یا تو اُس وقت جب بیمار ہو اور علاج کیلئے اُسے گرم پانی پینا پڑے اور یا پھر اُس وقت جب ٹھنڈا پانی اُسے میسر نہ آتے اور مجبورًا گرم پانی پینا پڑے۔ (گو اس زمانہ میں لوگوں میں چائے کا طریق مروج ہوگیا ہے جو گرم بھی ہوتی ہے اور پیاس بجھانے کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے مگر وہ درحقیقت ایک غذا ہے پانی کا قائم مقام نہیں) پس گرم پانی پینے کا ذکر فرما کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ ہر آرام سے محروم ہوجائیں گے یا یہ کہ اُن کی روحانی امراض کو دُور کرنے کے لئے اُنہیں ابتلاؤں میں ڈالا جائے گا اور ایسے گرم چشمہ سے اُن کو پانی پلایا جائے گا جس کی گرمی انتہاء درجہ تک پہنچی ہوئی ہوگی۔ یعنی پانی پینے کی جو اصل غرض ہوتی ہے کہ انسانی جسم پر تر و تازگی آئے وہ اُن کو حاصل نہیں ہوگی۔ دنیا میں دو قسم کی چیزیں ہیں۔ ایک تو ایسی ہیں جو نضارت اور تر و تازگی پیدا کرتی ہیں اور ایک ایسی ہیں جو موٹاپا پیدا کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک مقصد غذا سے اور دوسرا مقصد پانی سے حاصل ہوجاتا ہے۔ پانی پینے سے تر و تازگی حاصل ہوتی ہے اور غذا کھانے سے بھوک دُور ہوتی اور جسم فربہ ہوتا ہے۔ کفار کے متعلق بتایا کہ اُن کو یہ دونوں باتیں حاصل نہیں ہونگی۔

تَصْلٰی نَارًا حَامِیَۃً میں مخالفین کی ناکامی کی پیشگوئی

عَیْنٌ

اٰنِیَۃٌ

نہ اُن کے اندر تازگی پائی جائے گی اور نہ اُن کے جسم پر گوشت چڑھے گا یعنی اُن کے دل بھی مرجھا جائیں گے اور اُن کے جسم بھی مرجھا جائیں گے۔

کھولتے ہوئے چشمہ سے پانی پینے کی مراد[1]

کھولتا ہُوا چشمہ آخرت میں تو ہو گا ہی۔ دنیا میں کھولتے ہوئے چشمہ سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس سے دل کو آگ لگ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کو ایسے مصائب پہنچیں گے اور ایسے حالات میں سے وہ گذریں گے کہ اُن کے دل جل جائیں گے۔ یہ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ہی تھا کہ اُن کی اولادیں مسلمان ہو گئیں اور جس مذہب کو مٹانے کے لئے وہ کھڑے ہوئے تھے اسی مذہب میں اُن کے بیٹے شامل ہو گئے۔ جب وہ اپنی اولادوں کو اسلام میں شامل ہوتے دیکھتے ہوں گے تو کس طرح اُن کے دل جلتے ہوں گے کہ ہم کیا چاہتے تھے اور کیا ہو گیا۔ ہمارے ہاں بھی محاورہ کے طور پر کہا جاتا ہے کہ میں تو غم کے گھونٹ پی رہا ہوں۔ گویا غم کی چیزوں کو بھی پینے سے مشابہت دی جاتی ہے۔ عربی زبان میں بھی غم کے گھونٹ پینا محاورہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پس فرماتا ہے اُن کو گرم اور تیز گھونٹ پلائے جائیں گے یعنی ایک طرف اُن کی اولادیں اور دوسری طرف غلام مسلمان ہونے لگ جائیں گے جس کا اُن کو شدید صدمہ پہنچے گا۔ قرآن کریم میں اس حقیقت کو دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (الرعد ع ۶) یعنی یہ لوگ

کفار کے تلخ گھونٹ پینے کے بعض واقعات[2]

جو کہتے ہیں کہ ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم پر غالب آ جائیں گے۔ آپؐ کے دین کو مٹا دیں گے اور مسلمانوں کو شکست دے دیں گے کیا ان اندھوں کو یہ بات نظر نہیں آتی کہ ہم زمین کو اُس کے کناروں سے چھوٹا کرتے چلے آ رہے ہیں اِدھر غلام اسلام میں داخل ہو رہے ہیں اور اُدھر نوجوان اسلام کو قبول کر رہے ہیں جب غلام اور نوجوان دونوں اسلام میں داخل ہو گئے تو پیچھے سوائے بڈھوں کے کون رہ جائے گا۔ یہ بڈھے چند سالوں میں مر کر فنا ہو جائیں گے اور ان کی نسلیں اسلام میں شامل ہو جائیں گی۔ دنیا میں طاقت کے یہی دو ذرائع ہوتے ہیں ایک غلام جو ہاتھ ہوتے ہیں اور دوسری آئندہ نسلیں جو جڑ ہوتی ہیں۔ جب ان کے پاس نہ ہاتھ رہے گا نہ جڑ تو درمیان کا ٹُنڈ کیا کرے گا۔

غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ اسلام کی ترقی کی خبر دیتے ہوئے فرماتا ہے ان کفار کو عَيْنٍ اٰنِيَةٍ یعنی گرم چشمہ سے گھونٹ پینے پڑیں گے اور یہ ایسی خبریں سنیں گے جن سے ان کے سینے جلنے لگ جائیں گے ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ میں اگر کوئی شخص کسی مذہب کو سچے دل سے قبول کرتا ہے تو اس کی اولاد کا اس سے پھرنا اس کے لئے انتہائی طور پر دُکھ کا موجب ہوتا ہے عقلی طور پر اگر اولاد مذہب سے منحرف ہو جاتی ہے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں، مذہب کے معاملہ میں جبر سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا اگر اُن کا مخالف ہو سکتا ہے تو دوسرے لوگوں کی اولادیں بھی اپنے باپ دادا کے مذہب سے انحراف اختیار کر سکتی ہیں مگر جہاں کوئی اور قائم مقام نہ ہو اور وہ اولاد جس سے انسان کی امیدیں وابستہ ہوں اپنے باپ دادا کے مذہب کو ترک کر دے تو یہ ایک ایسا تلخ گھونٹ ہے جس کا پینا انسانی طاقت برداشت سے بالکل باہر ہوتا ہے۔

حدیبیہ کے مقام پر جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کفار سے صلح کی شرائط طے کرنے لگے تو اُس وقت کفار کی طرف سے سہیل ابن عمرو نمائندہ تھے۔ اسی اثناء میں کہ ابھی شرائط صلح طے ہی ہو رہی تھیں کہ اس کا بیٹا ابوجندل ایسی حالت میں وہاں آ پہنچا کہ اس کے پاؤں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں (ابن ہشام) اور اُس نے آتے ہی کہا یا رسول اللہ میں مسلمان ہوں اور آپ پر ایمان لا چکا ہوں۔ گھر میں تو اُس کا باپ اُسے مار پیٹ کر غصہ نکال لیتا ہو گا

مگر اُس وقت جب اُسی کا لڑکا جسے اُس نے زنجیروں میں جکڑ کر گھر میں قید کیا ہُوا تھا لڑکھڑاتا اور گرتا پڑتا وہاں پہنچا ہوگا اور اُس نے کہا ہوگا کہ یا رسول اللہ میں آپ پر ایمان لا چکا ہوں تو اُس وقت اُس کا کیا حال ہُوا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں اُس کے لئے اُٹھنا مشکل ہو گیا ہوگا اور وہ کہتا ہوگا کاش اس وقت زمین پھٹ جائے تو میں اس میں سما جاؤں۔ ایسے نازک وقت میں اُس کے اپنے بیٹے کا کفر سے اسی طرح برأت کا اظہار کرنا اُس کے لئے کتنا تلخ گھونٹ تھا جو اُسے پینا پڑا۔

اسی طرح ابوجہل کا واقعہ میں نے کئی دفعہ بیان کیا ہے۔ وہ جنگ بدر میں دو نوجوان لڑکوں کے ہاتھ سے مارا گیا اور آخری وقت اُس نے یہی کہا کہ مجھے اور تو کوئی صدمہ نہیں مگر افسوس ہے تو یہ کہ میں دو انصاری لڑکوں کے ہاتھ سے مارا گیا ہوں۔

غرض اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفار ایسے حالات میں سے گذریں گے کہ اُن کو بڑے بڑے تلخ گھونٹ پینے پڑیں گے۔

میں نے شروع میں بتایا ہے کہ یہ سُورۃ دونوں زمانوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ کے ساتھ بھی اور موجودہ زمانہ کے ساتھ بھی۔ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ آنِيَةٍ میں کفار کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خبر دی گئی تھی وہ اس زمانہ میں بھی بڑی صفائی کے ساتھ پوری ہوئی ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شدید مخالف تھے اور اُن کی ساری عمر آپ کی مخالفت کرتے گذر گئی۔ انہوں نے ایک دفعہ بڑی تعلّی کے ساتھ کہا تھا کہ میں نے ہی مرزا صاحب کو اونچا کیا تھا اور اب میں ہی اُن کو نیچے گراؤں گا۔ مگر اس کے بعد انہوں نے حضرت مرزا صاحب کو کیا گرانا تھا خود ہی ذلیل ہوتے گئے یہاں تک کہ اُن کے دو بیٹے بھاگ کر قادیان میں میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ ہمارا باپ اتنا بے غیرت ہے کہ وہ ہمیں کہتا ہے ہم کسی یتیم خانہ میں داخل ہو جائیں۔ وہ ہمیں ہر وقت مارتا پیٹتا ہے اور ہم سے ذلیل کام لیتا ہے ہم اب اُس کے پاس نہیں رہنا چاہتے۔ میں نے اُن دونوں کا وظیفہ لگا دیا اور انہیں قادیان میں تعلیم دلائی۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ اس میں میری بڑی ذلّت ہے اُن کو قادیان سے نکال دیں۔ مگر میں نے کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ میرے پاس مدد کے لئے آئیں اور میں اُن کو نکال دوں۔ اس کے بعد وہ دونوں احمدی ہو گئے۔ اور آخر مولوی صاحب زور دے کر اُن کو واپس لے گئے مگر پھر بھی اُن سے ایسا سلوک کیا کہ اُن میں سے ایک تو مر گیا ہے مگر دوسرا عیسائی ہو گیا اور اب تک زندہ ہے اور ریاست میسور میں کاروبار کرتا ہے وہ کہتا ہے میں دل سے تو احمدی ہوں مگر روزی کے لئے مذہب تبدیل کیا ہُوا ہے۔ یہ کتنا تلخ گھونٹ تھا جو مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کو پینا پڑا۔ وہ شخص جس نے کہا تھا کہ میں نے ہی مرزا صاحب کو اونچا کیا تھا اور اب میں ہی اُن کو نیچے گراؤں گا اُس کے اپنے لڑکے ہمارے پاس مدد کے لئے آئے۔ اور انہوں نے کہا کہ ہمارا باپ ہم کو مارتا پیٹتا ہے اور کھانے کے لئے روٹی تک نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ یتیم خانے میں داخل ہو جاؤ میرے پاس تمہارے لئے کچھ نہیں۔ چنانچہ ہم نے اُن کی مدد کی اور اپنے مدرسہ میں رکھ کر تعلیم دلائی پس یہ واقعہ مولوی محمد حسین صاحب کے لئے کتنا تلخ گھونٹ تھا جو اُن کو پینا پڑا۔

حضرت مسیح موعودؑ کے مخالفین کیلئے تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ آنِيَةٍ کا نظارہ

اسی طرح ایک اور مشہور مخالف جو ہمارے شدید مخالفوں کا سردار ہے اُس کے بیٹے پر ایک مقدمہ دائر ہُوا۔ جس مجسٹریٹ کے پاس وہ مقدمہ گیا اتفاق سے وہ احمدی تھا۔ وہ احمدی مجسٹریٹ مجھ سے ملنے کیلئے آئے

تو انہوں نے ذکر کیا کہ فلاں مخالف کے لڑکے کا مقدمہ میرے پاس ہے اور وہ اس کے متعلق بڑی سفارشیں بجوا رہا ہے کہ اُسے چھوڑ دیا جائے۔ میں نے انہیں کہا کہ اگر آپ اُسے جائز طور پر چھوڑ سکتے ہیں تو ضرور چھوڑ دیں تاکہ اُس کے باپ کو شرم محسوس ہو کہ میں تو جماعت احمدیہ کی مخالفت کرتا رہا مگر احمدی مجسٹریٹ نے میرے بچے کو رہا کر دیا۔ یہ ایسا احسان ہوگا جو ساری عمر اُس کی آنکھیں نیچی رکھے گا۔ اس لئے جائز طور پر اور قانون کی مناسب تشریح سے اگر آپ اسکو چھوڑ سکتے ہوں تو ضرور چھوڑ دیں۔

اسی طرح میں جب حج کے لئے گیا تو ہمارے ایک رشتہ دار جو ہمارے نانا جان مرحوم کی ہمشیرہ کے بیٹے تھے اور اس لحاظ سے ہمارے ماموں تھے اور بھوپال کے رہنے والے تھے انہوں نے اور اُن کے ساتھ ہی ایک اور شخص نے جو بھوپال کے رہنے والے تھے اور نواب جمال الدین خاں صاحب کے نواسے تھے اور جن کا نام خالد تھا ہمارے خلاف سخت شورش شروع کر دی اور لوگوں کو یہ کہکر بھڑکانا شروع کر دیا کہ یہ لوگ کفر پھیلاتے ہیں اور ساتھ ہی مولوی ابراہیم صاحب سیالکوٹی کو (جو اس سال حج کو گئے تھے) مباحثہ کے لئے آمادہ کرنا شروع کیا اور ان کی غرض یہ تھی کہ اس طرح اُن کا اعلان کثرت سے ہوگا اور مباحثہ ہُوا تو لوگ جوش میں آکر انہیں قتل کر دیں گے گورنمنٹ کو انہوں نے یا اُن کے ساتھیوں نے توجہ دلائی کہ ان کے خلاف فوری کارروائی کرے اور اس فتنہ کو بڑھنے سے روکے لیکن ہمیں انکی اس اشتعال انگیزی کا کوئی علم نہ تھا۔ میں ایک دن ایک عرب عالم مولانا عبدالستار کیتی کو جو شریف مکّہ کے بیٹوں کے اُستاد تھے تبلیغ کرنے کے لئے گیا۔ وہ بہت ہی شریف الطبع آدمی تھے عقیدۃً وہابی تھے مگر اپنے آپ کو وہابی ظاہر نہیں کرتے تھے بلکہ حنبلی ظاہر کرتے تھے انہوں نے باتوں باتوں میں اپنے متعلق خود ہی بتایا کہ میں ہوں تو اہلحدیث لیکن یہاں اہلحدیثوں کو چونکہ لوگ سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لئے میں اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتا۔ تعلیم کا کام بھی میں مفت اس لئے کرتا ہوں تاکہ شریف کے خاندان کی امداد حاصل رہے۔ اس پوزیشن میں ہونے کی وجہ سے کوئی شخص میرے خلاف شرارت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آدمی بڑے شریف تھے میں اُن کو کافی دیر تک تبلیغ کرتا رہا۔ جاتی دفعہ حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ نے مجھے ایک کتاب کے متعلق فرمایا تھا کہ اُس کا عرب ممالک سے پتہ لگانا۔ انہیں بھی کتابوں کا شوق تھا میں نے اُن سے اس کتاب کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ کتاب میرے پاس تو نہیں لیکن حلب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ جب میں تبلیغ سے فارغ ہُوا تو وہ کہنے لگے آپ نے مجھے تو تبلیغ کر لی ہے اور آپ کی باتیں بھی معقول ہیں لیکن میرے سوا اور کسی کو آپ تبلیغ نہ کریں ورنہ آپ کی جان کی خیر نہیں۔ لوگ بہت جوش میں ہیں اگر آپ نے تبلیغ کی تو خطرہ ہے کہ آپ پر کوئی شخص حملہ نہ کر بیٹھے یا حکومت ہی آپ کو قید نہ کر دے۔ میں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کو معلوم نہیں آپ کے خلاف بعض لوگوں نے یہاں اشتہار شائع کیا ہے اور لوگ سخت جوش میں بھرے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کس نے وہ اشتہار شائع کروایا ہے؟ تو انہوں نے کہا ایک تو اس اشتہار کے محرک فلاں مولوی صاحب ہیں۔ میں نے کہا وہ تو میرے ماموں ہیں۔ اور کون صاحب ہیں؟ انہوں نے کہا دوسرے بھوپال کے ایک رئیس ہیں جن کا نام خالد ہے۔ اِن دونوں نے آپ کے خلاف اشتہار دیا ہے یا دلوایا ہے اور لکھا ہے کہ اگر انہیں اپنے دعاوی کی صداقت پر یقین ہے تو مولوی ابراہیم صاحب سیالکوٹی سے مباحثہ کر لیں۔ مولوی ابراہیم صاحب سیالکوٹی بھی

اُن دنوں وہیں تھے اور ہمارے ماموں کا یہ خیال تھا کہ مکّہ میں چونکہ باقاعدہ حکومت کوئی نہیں اس لئے اگر مباحثہ ہُوا تو لوگ انہیں مار ڈالیں گے اور اس طرح ایک کانٹا نکل جائے گا۔ مولانا عبدالستار صاحب کہتے فرمانے لگے میں نے مولوی ابراہیم صاحب سیالکوٹی سے کہا ہے کہ کہیں جوش میں مباحثہ نہ کر بیٹھنا کیونکہ یہاں احمدیوں کی اتنی مخالفت نہیں جتنی وہابیوں کی ہے اس لئے لوگوں کو کیوں خواہ مخواہ اپنے خلاف اشتعال دلاتے ہو۔ احمدیوں کے خلاف کسی کو اشتعال آیا یا نہ آیا تمہارے خلاف تو لوگ ضرور بھڑک اٹھیں گے اس لئے وہ تو شاید اس ڈر سے مقابلہ نہ کریں کہ کہیں شورش زیادہ نہ ہو جائے مگر آپ کسی اور کو اب تبلیغ نہ کریں ایسا نہ ہو کہ آپ کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ میں نے کہا آپ کس کی طرف سے زیادہ خطرہ سمجھتے ہیں؟ انہوں نے ایک عالم کا نام لیا کہ اُسے تو بالکل تبلیغ نہ کرنا۔ میں نے کہا میں تو اُسے ایک گھنٹہ تبلیغ کرکے آرہا ہوں۔ وہ حیران ہو کر بولے پھر کیا ہُوا؟ میں نے کہا تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ غصہ اور جوش کی حالت میں کہہ دیتے تھے کہ نہ ہوئی تلوار ہمارے قبضہ میں ورنہ تمہارا سر اُڑا دیتا۔ غرض وہ ہمارے ماموں اور بھوپال کے رئیس ہمارے خلاف لوگوں کو خوب بھڑکاتے رہے لیکن ادھر حج ختم ہُوا اور اُدھر مکّہ میں ہیضہ پھوٹ پڑا جو اتنا شدید تھا کہ لوگ گلیوں میں مُردوں کو پھینک دیتے تھے دفن کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا تھا یہ دیکھ کر نانا جان گھبرا گئے اور انہوں نے کہا کہ ہمیں جلدی واپس چلنا چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے واپسی کی تیاری شروع کر دی اور آخری ملاقات کے لئے نانا جان صاحب مرحوم اپنی بہن اور بھانجے سے ملنے کے لئے اُن کے مکان پر گئے میں بھی ساتھ تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک جنازہ پڑا ہے لوگ جمع ہیں اور تدفین کی تیاری ہو رہی ہے۔ نانا جان نے ان لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے؟ لوگوں نے ہمارے ماموں کا نام لیا کہ اُن کا انتقال ہوگیا ہے۔ منیٰ سے واپس آئے تھے کہ ہیضہ کا حملہ ہوگیا اور تھوڑی دیر میں ہی فوت ہوگئے۔ ایک کا تو یہ حال ہُوا۔

جب ہم جدہ پہنچے تو جدہ کے انگریزی قنصل خانہ میں بھی ہمارے ننھیال کے ایک رشتہ دار ہیڈ کلرک تھے۔ بھوپال کے جس رشتہ دار کا میں نے ذکر کیا ہے وہ تو نانا جان مرحوم کے رشتہ داروں میں سے تھے اور یہ نانی اماں صاحبہ مرحومہ کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہمارے جتنے رشتہ دار نانا جان مرحوم کی طرف سے تھے وہ بالعموم مخالف تھے اور جتنے نانی اماں کی طرف سے تھے وہ بالعموم محبت کرنے والے تھے (مگر اب حالات وہ نہیں رہے) یہ غالباً اُن کی خالہ کے لڑکے تھے اور ہم سے بہت محبت کرتے تھے۔ جہاز چونکہ کم تھے اور لوگ جلدی واپس ہونا چاہتے تھے اس لئے ٹکٹ ملنے میں سخت دشواری تھی۔ ہم نے اُن سے کہا کہ ٹکٹوں کا جلدی انتظام کر دیں تاکہ ہم پہلے جہاز میں واپس ہو سکیں۔ انہوں نے جہاز ران کمپنی کے دفتر میں مجھے بٹھا دیا اور میں اس کی کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا یہ کھڑکی بہت اونچی تھی اور وہاں ہاتھ بمشکل اونچا کرکے پہنچ سکتا تھا۔ اتنے میں ایک نوجوان جو دُبلے پتلے سفید رنگ کے تھے اُس کھڑکی کے نیچے آئے انہوں نے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھ کر خیال کیا کہ شاید میں کمپنی کا ملازم ہوں چنانچہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ مَیں نے کہا آپ کا اس سے کیا مطلب؟ انہوں نے کہا میرا مقصد یہ ہے کہ کیا آپ کمپنی میں کام کرتے ہیں؟ مَیں نے کہا مَیں تو کمپنی میں کام نہیں کرتا۔ کہنے لگے تو کیا کمپنی سے کوئی اور تعلق ہے؟ میں نے کہا میرا کمپنی سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ وہ کہنے لگے پھر آپ کمپنی کے دفتر میں بیٹھے کیوں ہیں؟ مَیں نے کہا میرے ایک عزیز مجھے یہاں بٹھا گئے ہیں اور وہ خود ٹکٹوں کی خرید کا انتظام کر رہے ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا

کہ ہمارا قافلہ تیس بتیس عورتوں اور مردوں پر مشتمل ہے اور اس وقت سخت مصیبت کا سامنا ہے مگر ہمیں سب سے زیادہ فکر عورتوں کا ہے ہیضہ کی وجہ سے عورتیں تو پاگل ہو رہی ہیں اگر آپ دس بارہ ٹکٹ خرید دیں تو ہم عورتوں کو یہاں سے نکال دیں مردوں کے ساتھ جو گذریگی گذر جائیگی۔ میں نے کہا عورتیں اکیلی کس طرح جائیں گی؟ اس پر وہ کہنے لگے اگر آپ دو چار اور ٹکٹ لے دیں تو کچھ مرد بھی ان کے ساتھ جا سکیں گے اور آپ کی یہ بڑی مہربانی ہوگی۔ مَیں نے کہا ٹکٹوں کی خرید کے ساتھ میرا کوئی تعلق تو نہیں مگر مَیں کوشش کرتا ہوں۔ وہ فوراً پیچھے پلٹ کر گئے اور واپس آکر ایک تھیلی روپوں کی انہوں نے مجھے پکڑا دی۔ جب میرے وہ عزیز اس کمرہ میں آئے تو میں نے اُن سے کہا ماموں ان لوگوں کی حالت بہت قابل رحم ہے آپ انکو بھی ٹکٹ لا دیں۔ وہ اُس وقت کسی بات پر چڑے ہوئے تھے کہنے لگے کیا میں کوئی ایجنٹ ہوں کہ ٹکٹ لاتا پھروں۔ مَیں نے کہا یہ رحم کا معاملہ ہے آپ ضرور کوشش کریں اور اگر اُن کے لئے نہیں تو کم از کم میری خاطر ہی کچھ ٹکٹ لا دیں وُہ بڑبڑاتے ہوئے واپس دفتر میں چلے گئے اور میں نے سمجھا کہ یہ کچھ مدد نہ کر سکیں گے مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ غالباً سترہ ٹکٹ لے کر واپس آئے اور میرے ہاتھ میں ٹکٹ پکڑا دئے۔ میں نے وہ ٹکٹ اور باقی روپے کھڑکی میں سے اُن صاحب کو پکڑا دئے اور وہ لے کر چلے گئے شاید دوسرے ہی دن جب مَیں جہاز پر سوار ہونے کے لئے گیا تو مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی جہاز چلنے ہی والا تھا وُہ نوجوان جہاز کے دروازہ پر ہی مجھے ملے اور کہنے لگے آپ نے اتنی دیر لگا دی جلدی کریں جہاز تو چلنے والا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مزدوروں پر زور دے کر جلد جلد میرا اسباب جہاز میں رکھوایا اور پھر بڑی ممنونیت کا اظہار کیا کہ آپ نے بڑا احسان کیا جو ہمیں ٹکٹ لے دئے ورنہ ہمارا سوار ہونا بالکل ناممکن تھا۔ میں نے کہا آپکی تعریف؟ کہنے لگے میرا نام خالد ہے اور میں نواب جمال الدین خانصاحب کا نواسہ ہوں۔ اب سوچو کہ وہ صاحب جو مجھے کئی میں بحث مباحثہ میں ڈال کر مروانے کے موجب ہو رہے تھے جب انہیں میرے نام کا پتہ لگا ہوگا تو وہ کس قدر شرمندہ ہوئے ہوں گے۔ کہ میں نے اُن سے کیا سلوک کرنا چاہا تھا اور انہوں نے مجھ سے کیا سلوک کیا۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے جہاز پر کبھی مخالفت نہیں کی بلکہ بھوپال کی جماعت کی یہ رپورٹ ہے کہ وہ جماعت کے دوستوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد سارے سفر میں وہ میرے ممنون احسان رہے اور اصرار کرتے رہتے تھے کہ اُن کے ساتھ کھانا کھایا جائے یا چائے پی جائے۔ تو اللہ تعالیٰ ایسے ہی حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے تم کو ایسے ایسے مواقع ملیں گے کہ ان کفار کو گرم گرم پانی کے گھونٹ پینے پڑیں گے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کفار مکہ نے یہ کہلا کر بھیجا ہوگا کہ آپ ہمارے لئے دُعا کریں کہ قحط دُور ہو جائے یا جب آپ ایک فاتح کی صورت میں مکہ میں داخل ہوئے اور آپ نے کفار سے کہا کہ بتاؤ اب تم سے کیا سلوک کیا جائے اور انہوں نے کہا کہ ہم سے وہی سلوک کیا جائے جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ تو اُس وقت اُن کو کتنا تلخ گھونٹ پینا پڑا ہوگا۔ میں تو سمجھتا ہوں اُن کی زبانیں خشک ہو ہو کر تالُو سے لگ جاتی ہوں گی کہ ہمیں کیسا ذلیل ہونا پڑا اور کس طرح اسلام کی فوقیت کا اعتراف کرنا پڑا۔

---

# لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِن ضَرِيعٍ ۝ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِن جُوعٍ ۝

انہیں سوکھے شبرق گھاس کے سوا اور کوئی کھانا نہیں ملے گا ۔ وہ نہ تو انہیں موٹا کریگا اور نہ بھوک (کی تکلیف) سے بچائے گا ۵۶

۵۶ **حل لغات** ۔ اَلضَّرِیْعُ: اَلضَّرِیْعُ نَبَاتٌ رَطْبُهٗ یُسَمّٰی شِبْرِقًا وَ یَابِسُهٗ ضَرِیْعًا لَا تَقْرَبُهٗ دَابَّةٌ لِخُبْثِهٖ ۔ یعنی ضریع گھاس کی ایک قسم ہوتی ہے جب تک وہ گھاس تازہ رہے اُسے شبرق کہتے ہیں اور جب سوکھ جائے تو ضریع کہتے ہیں ضریع ایسی گندی چیز ہوتی ہے کہ جانور بھی اس کو نہیں کھاتے ۔ اسی طرح ضریع ایسی گھاس کو بھی کہتے ہیں جو سمندر کے کنارے اُگ آتا ہے مگر چونکہ نہایت گندہ اور بدبودار ہوتا ہے لوگ اسے کاٹ کر پانی میں بہا دیتے ہیں ۔ اسی طرح ہر درخت کی سُوکھی ٹہنی یا سُوکھے پتّوں کو بھی ضریع کہتے ہیں ۔ اسی طرح سڑے ہوئے پانی میں ایک بوٹی ہوتی ہے اس کو بھی ضریع کہتے ہیں ۔ (اقرب) لغت والوں نے اِس کی جو تشریح کی ہے اُس سے میں سمجھتا ہوں کہ غالباً اس سے کائی مراد ہے کیونکہ وہ لکھتے ہیں نَبَاتٌ فِی الْمَآءِ الْاٰجِنِ لَهٗ عُرُوْقٌ لَا تَصِلُ اِلَی الْاَرْضِ ۔ سڑے ہوئے پانی میں ایک بُوٹی ہوتی ہے جس کی جڑیں زمین میں نہیں جاتیں پانی میں ہی رہتی ہیں یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جنہیں کوئی غذائیت نہیں ہوتی اور جنہیں انسان چھوڑ جانور بھی نہیں کھاتے پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ کہ اُن کو سوائے ضریع کے اور کوئی کھانا نہیں ملیگا ۔

**تفسیر** ۔ علامہ زمخشری لکھتے ہیں اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ ان کو کوئی کھانا نہیں ملیگا کیونکہ ضریع کوئی کھانا نہیں ہے لیکن بحرِ محیط والوں نے اس پر بڑی عمدہ جرح کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ یہ درست نہیں ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ ۔ ضریع اَلضَّرِیْعُ کھانا ہو یا نہ ہو مگر جس کو کھانے کے لئے کچھ نہیں ملتا وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کھا ہی لیتا ہے خواہ عام حالات میں وہ چیز کھانے کے ناقابل ہی کیوں نہ ہو ۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد صاف طور پر فرما دیا ہے کہ لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ تو یہ کیوں کہتے ہو کہ اُن کو کھانا نہیں ملیگا ۔ قرآن کریم کا اسلوبِ بیان اور اُس کے الفاظ واضح کر رہے ہیں کہ انکو کھانے کے لئے ضریع دیا جائے گا یعنی وہ ایسے ذلیل ہو جائیں گے کہ ایسی چیزیں کھانے پر مجبور ہوں گے جن کو جانور بھی نہیں کھاتے ۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو ایسی ایسی ذلّتیں اور رسوائیاں پہنچیں گی کہ جن کو ادنیٰ ادنیٰ انسان بھی برداشت نہیں کر سکتے ۔ فتح مکّہ کے بعد کئی آدمی جنگل میں بھاگ کر چلے گئے تھے اور وہیں مر گئے ۔ پھر بعض لوگ تھے جو بڑی بڑی تلخیاں برداشت کرنے کے بعد مکّہ میں واپس آئے اور انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے معافی مانگی جس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کو معاف فرما دیا ۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکّہ فتح کر لیا تو وہ لوگ جو کہا کرتے تھے کہ ہم مسلمانوں کو تباہ کر دیں گے ۔ اُن کو کچل کر رکھ دیں گے ۔ اُن کو مٹا دیں گے جب اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوں گے کہ مسلمان غلام اُن کے حاکم اور سردار بنے ہوئے ہیں تو خواہ وہ اعلیٰ درجہ کا کھانا ہی کیوں نہ کھا تے ہوں مگر وہ انہیں ضریع سے کم محسوس نہیں ہوتا ہوگا [illegible]

اُن کے انگ نہیں لگتا ہوگا۔ یہ ضروری نہیں کہ ضریع سے مراد یہاں حقیقتاً شبرق گھاس ہی ہو بلکہ آگے جو تشریح کی گئی ہے کہ لَا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ۔ وہ کھانا نہ اُن کو موٹا کرے گا اور نہ اُن کی بھوک کو دُور کرے گا یہ اُن کی بدحواسی کی حالت کو ظاہر کر رہا ہے۔ پس بالکل قرینِ قیاس ہے کہ ضریع کا ذکر استعارۃً ہے۔

وہ روزانہ دیکھتے تھے کہ مسلمان ترقی کر رہے ہیں اور ہم شکست کھاتے جا رہے ہیں۔ پھر ہر لڑائی میں اُنہیں خبریں پہنچتی تھیں کہ آج فلاں رئیس مر گیا ہے۔ آج فلاں سردار مر گیا ہے یا آج فلاں قوم مسلمانوں سے مل گئی ہے اور فلاں قوم نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے۔

لَیْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا ... اور تُسْقٰی مِنْ عَیْنٍ اٰنِیَةٍ میں اسلام کی ترقی اور کفار کے تنزل کی پیشگوئی

یہ خبریں اُن کے لئے اس قدر پریشان کن۔ اس قدر تکلیف دِہ اور اس قدر غم والم میں مبتلا کرنیوالی تھیں کہ واقعہ میں اچھی سے اچھی غذائیں کھا کر بھی وہ اُن کے انگ نہیں لگ سکتی تھیں۔ الغرض لَیْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ لَا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ اور اسی طرح تُسْقٰی مِنْ عَیْنٍ اٰنِیَةٍ میں اسلام کی ترقیات کے متعلق زبردست پیشگوئی کی گئی ہے۔

عیسائی مصنف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سورۃ ابتدائی ایام کی ہے جبکہ ابھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دعوٰیٔ نبوت پر صرف تین چار سال گذرے تھے یہ کتنا بڑا نشان ہے کہ اُن ابتدائی ایام میں ہی اللہ تعالےٰ نے بتا دیا کہ ان کفار سے جنگ ہوگی۔ قحط کی صورت میں اُن پر عذاب نازل ہوگا۔ وہ انفرادی کوششیں بھی اسلام کو مٹانے کے لئے کریں گے اور اجتماعی کوششیں بھی اسلام کے خلاف صرف کریں گے چنانچہ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ میں اسلام کی طرف سے مخالفینِ اسلام کو اسی رنگ میں چیلنج دیا گیا تھا جس رنگ میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے دشمنوں کو دیا کہ یٰقَوْمِ اِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْکُمْ مَّقَامِیْ وَتَذْکِیْرِیْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَعَلَی اللّٰهِ تَوَکَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَکُمْ وَشُرَکَآءَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُنْ اَمْرُکُمْ عَلَیْکُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَیَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ (یونس ع۱۲) یعنی اے میری قوم اگر تمہیں میرا مرتبہ اور اللہ تعالےٰ کے نشانوں کے ذریعہ تمہیں فرائض کی ادائیگی کی طرف توجہ دلانا ناگوار گذرتا ہے تو پھر بیشک میرے مقابلہ میں نکل آؤ۔ اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر لو اور ہر لحاظ سے مجھے مٹانے کے لئے متحد ہو جاؤ پھر دیکھو کہ کون ہے جو کامیاب ہوتا ہے اور کون ہے جو ناکامی کا منہ دیکھتا ہے۔ بالکل اسی رنگ میں اللہ تعالےٰ اس جگہ فرماتا ہے کہ کفار اپنی تمام طاقتوں کو مجتمع کر لیں گے وہ افسر اور کمانڈر مقرر کر کے مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کریں گے مگر نہ اُن کے کمانڈر اُن کے کام آئیں گے، نہ اُن کے جیوش اُن کو فتح دلائیں گے، نہ اُن کے افسر انکو کامیابی تک پہنچائیں گے اور نہ اُن کے منصوبے مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکیں گے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ وہ بڑے بڑے ماہر اور تجربہ کار افسر چُن چُن کر مقرر کیا کرتے تھے وُہ افسر مسلمانوں کے مقابلہ میں ہمیشہ شکست کھا کر واپس آتے۔

غور کرو اور سوچو کہ کیسے نازک وقت میں اسلام کی ترقی کی یہ عظیم الشان خبر دی گئی تھی کہ یہ لوگ تو الگ رہے ان کے سردار بھی مسلمانوں کے مقابلہ میں کچھ نہیں کر سکتے۔ اُس وقت ظاہری حالات کے لحاظ سے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مسلمان اپنے گھروں سے باہر نکل کر نمازیں بھی پڑھ سکیں گے فتح وغلبہ تو دُور کی بات ہے مگر ایسی حالت میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے خبر دی گئی کہ مسلمان کامیاب ہوں گے۔ دشمن ناکام ہوگا اور اُنہیں تیز گرم پانی کے گھونٹ بار بار پینے پڑیں گے۔ مسلمانوں کی مظلومیت اور اُن کی کمزوری اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ جنگِ احزاب تک یہ حالت تھی جس کا حدیثوں میں ذکر آتا ہے اور قرآن کریم میں بھی اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ منافق مسلمانوں کو طعنے دیتے تھے کہ تمہیں پاخانہ پھرنے کو تو جگہ نہیں ملتی اور فتح کی

خبریں سُنائی جارہی ہیں۔ یہ غلبہ کی پیشگوئی چوتھے سال بعد نبوت میں کی گئی ہے اور ہجرت کے پانچویں سال تک مسلمانوں کی کمزوری کی یہ حالت تھی جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔

پس اتنا لمبا عرصہ پہلے اسلام کے غلبہ اور مسلمانوں کی شان و شوکت کے متعلق خبر دے دینا یقیناً کسی انسان کا کام نہیں ہوسکتا۔

غرض لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ میں بتایا گیا ہے کہ اُن کا کھانا اور اُن کا پانی اُن کے لئے عذاب بن جائے گا اور غم اور مصیبت اُن پر نازل ہوگی۔ گویا استعارۃً یہ ویسا ہی کلام ہے جیسے ایک شاعر کہتا ہے ؎

خونِ دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو
یہ غذا ملتی ہے لیلیٰ تیرے دیوانے کو

پانی پئیں گے اور وہ آگ معلوم ہوگا خواہ ٹھنڈا پانی پئیں لیکن وہ اُن کے گلے میں پھنسے گا اور انہیں جلائیگا جیسے غم اور مصیبت میں لوگ پانی پیتے ہیں تو وہ اُن کے گلے میں پھنستا ہے۔ دُودھ دے دو۔ عمدہ سے عمدہ کھانا دے دو۔ اچھی سے اچھی غذائیں کھلاتے جاؤ اُن کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ غم سے انسان اور زیادہ دُبلا ہوتا جاتا ہے پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مخالفینِ اسلام پر اس قدر مصائب و مشکلات آئیں گی۔ اس قدر اُن کی عزتوں پر حملے ہوں گے سیاسی حملے ہوں گے۔ خاندانی حملے ہونگے کہ اُن کو تلخی کے گھونٹ پینے پڑیں گے اور لختِ جگر کھانے کو ملیں گے۔ ٹھنڈا پانی پئیں گے لیکن وہ اُن کے منہ میں آبلے ڈال دے گا۔ عمدہ سے عمدہ کھانے کھائینگے لیکن وہ اُنہیں اتنا نفع بھی نہیں دیں گے جتنا خشک پتے یا شبرق گھاس اونٹ کو نفع دیتے ہیں۔

روایتوں میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مخالفین نے کہا کہ ہمارے اونٹ تو ضریع کھا کر موٹے ہوتے ہیں اس پر بعض مفسرین کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ضریع اُونٹ کا کھانا تھا اور وہ اُس کے کھانے سے موٹا ہوتا تھا دوسرے مفسّروں نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یا تو اُن کی یہ بات غلط تھی اور یا پھر خدا نے لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ میں ایک قید لگا دی ہے کہ اُن کو ایسا ضریع ملے گا جو نہ موٹا کرے اور نہ بھوک کو دُور کرے گا وہ ضریع اُن کے اونٹوں کو موٹا کرتا ہوگا لیکن کفار کو وہ ضریع ملے گا جو لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ کا مصداق ہوگا۔

۲۰۱ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ کے متعلق مفسّرین کی ایک فضول بحث

مجھے تعجب آتا ہے کہ مفسّرین اس بحث میں پڑے ہی کیوں ہیں۔ اگر تو اس آیت میں یہ ذکر آتا کہ لَيْسَ لِجِمَالِهِمْ یا لَيْسَ لِاَبَالِهِمْ کہ اُن کے اونٹوں کو سوائے اس کے کوئی کھانا نہیں ملے گا تب تو یہ بحث بھی ہوتی کہ ضریع جانور کو موٹا کرتا ہے یا نہیں لیکن یہاں تو آدمیوں کا ذکر ہے اونٹوں کا ذکر نہیں ہے اگر کوئی جابر بادشاہ سزا کے طور پر کسی مجرم کے متعلق کہے کہ فلاں شخص کے آگے بھوسہ ڈالو تو کیا وہ شخص اور اُس کے دوست خوش ہونگے اور کہیں گے کہ بھوسہ کھانے سے تو بیل موٹا ہوجاتا ہے اگر اس کے آگے بھوسہ ڈالا گیا ہے تو کیا حرج ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ بھوسہ بیل کو موٹا کرتا ہے کسی انسان کے متعلق اگر یہ کہا جائے گا کہ اُس کے آگے بھوسہ ڈالو تو اِس میں اُس کی ذلت ہوگی عزت افزائی نہیں ہوگی اور نہ کوئی یہ کہیگا کہ اسے وہ غذا دی گئی ہے جو موٹا کرتی ہے۔

شہاب الدین غوری نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو ایک جنگ میں پرتھوی راج کے مقابلہ میں اُس کے لشکر کے بعض سپاہی بھاگ اُٹھے۔ شہاب الدین غوری نے بھاگنے والوں کے متعلق حکم دیا کہ اُن کے مُنہ پر توبڑا باندھ کر اور اُس میں چنے ڈال کر اُن سے کہا جائے کہ یہ چنے کھاؤ۔ چنانچہ اُن کے مُنہ پر توبڑے باندھے گئے اور اُن میں چنے ڈال دئے گئے یہ بتانے کے لئے کہ یہ لوگ جانوروں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اب کیا کوئی معقول آدمی کہہ سکتا ہے

# وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَۃٌ ؀

پکچھ (اور) چہرے اُس دن خوش بخوش ہونگے ؀

کہ وہ سپاہی اس پر بڑے خوش ہوتے ہونگے اور کہتے ہوں گے کہ دانا تو اچھے گھوڑے یا اچھے گدھے کو ڈالا جاتا ہے اگر ہمیں بھی دانہ ڈال دیا گیا ہے تو کیا ہُوا۔ پس میں تو سمجھ ہی نہیں سکا کہ اس بحث کے معنے ہی کیا ہوتے۔ پھر یہ بحث بھی بالکل لغو ہے کہ ضریع اونٹ کو فائدہ دیتا ہے یا نہیں۔ اوّل تو لغت والے لکھتے ہیں کہ لَا تَقْرُبُہٗ دَابَّۃٌ لِخُبْثِہٖ۔ اُس کے گند اور خرابی کی وجہ سے جانور بھی اُس کو نہیں کھاتا۔ لیکن اگر وُہ کھاتا بھی ہے تب بھی مکہ والوں نے اگر یہ بات کہی تو یقیناً انہوں نے اپنے جانور ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

نَاعِمَۃٌ

کفار کے مقابل پر مومنوں کی حالت کا نقشہ

اگر کسی آدمی کو یہ کہا جائے کہ تمہیں جانور کا کھانا ملیگا تو کیا وہ یہ کہے گا کہ مجھے بے شک دے دو کیونکہ جانور اس کے کھانے سے موٹا ہوتا ہے۔ پس مفسرین کا اس بحث میں پڑ جانا کہ ضریع اُونٹ کو موٹا کرتا ہے یا نہیں بالکل لغو بات ہے۔ قرآن نے ابوجہل اور عتبہ اور شیبہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے کہ ان کو ضریع ملے گا اونٹوں کا ذکر نہیں کیا کہ یہ بحث کی جائے کہ اونٹ تو اس کے کھانے سے موٹے ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی کے ہاں کوئی چوڑھا بھی بطور مہمان آئے اور وہ اُس کے سامنے بھوسہ ڈالدے یا تازہ بتازہ گھاس لاکر رکھ دے جس کے کھانے سے بیل اور بھینسیں موٹی ہوتی ہیں تو وہ خوش نہیں ہوگا بلکہ اُسے اپنی انتہائی ہتک سمجھے گا۔ اسی طرح جب اللہ تعالےٰ یہاں آدمیوں کا ذکر کر رہا ہے تو اس بحث کا مطلب ہی کیا ہُوا کہ ضریع اُونٹ کو موٹا کر دیتا ہے۔ میں بادب ان مفسرین سے کہتا ہوں کہ یہاں آدمیوں کی بات ہو رہی ہے جانوروں کی نہیں۔ اگر مکہ والوں نے ایسا کہا تھا تو یقیناً انہوں نے اپنے جانور ہونے کا ثبوت دیا تھا آپ کو اُن کا جواب دینے کی فکر نہ کرنی چاہیئے۔

**حل لغات۔** نَاعِمَۃٌ نَعِمَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے اور نَعِمَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں رَفِہَ۔ وہ خوشحال اور آسودہ حال ہوگیا۔ اور جب نَعِمَ عَیْشُہٗ کہیں تو معنے ہوتے ہیں طَابَ وَلَانَ وَاتَّسَعَ۔ یعنی اس کی زندگی عمدہ ہوگئی اور کسی تکلیف کا سامنا اُسے نہ کرنا پڑا۔ اور ہر چیز اُسے بافراغت ملنے لگی (اقرب) بحرمحیط کے مصنف نے نَاعِمَۃٌ کے معنے حسن و نضارت والے کے کئے ہیں اور پھر لکھا ہے کہ نَاعِمَۃٌ کے معنے مُتَنَعِّمَۃ کے بھی ہوتے ہیں یعنی یہ معنے بھی ہیں کہ اُن میں حُسن اور نضارت اور تازگی پائی جائے گی اور اُن کے چہرے خوبصورت ہوں گے اور یہ بھی معنے ہیں کہ انہیں بڑی بڑی نعمتیں حاصل ہوں گی (محیط)

**تفسیر۔** پہلی آیت میں اُن وُجُوْہ کا ذکر تھا جن کی صفت یہ تھی کہ وہ عَامِلَۃ اور نَاصِبَۃ تھے یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں یا آنیوالے مامور وں کے مقابلہ میں خوب عمل کرنے والے اور تھکا دینے والی محنت کرنے والے تھے انفرادی رنگ میں بھی اور اجتماعی رنگ میں بھی۔ مگر اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ باوجود اُن کے انفرادی اور اجتماعی مقابلوں کے یہ نہیں ہوگا کہ خدا کا رسول دب جائے یا اکیلا رہ جائے بلکہ اُس کی جماعت بڑھتی چلی جائے گی اور وہ جماعت ایسی ہوگی جو دنیا میں عزت اور کامیابی حاصل کرنے والی ہوگی چنانچہ انہی کا ذکر وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَۃٌ میں کیا گیا ہے۔

سردارانِ کفار کو وُجُوْہ اس لئے کہا گیا تھا کہ وہ ابتداء میں وُجُوہ تھے گو بعد میں وہ خَاشِعَۃ ہوگئے اور جو لوگ گر جائیں۔ لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہو جائیں اُنکی

آواز میں کوئی اثر نہ رہے اور وہ غم والم کی آگ میں ہر وقت جلتے رہیں وہ وُجُوْہ نہیں رہتے۔ پس اُن کا نام وُجُوْہ اُن کی ابتدائی حالت کی وجہ سے رکھا گیا تھا کیونکہ شروع میں وہ واقعہ میں سرداران قوم میں سے تھے بڑی عزت اور وجاہت رکھتے تھے۔ مگر مسلمانوں کا نام وُجُوْہٌ اُن کی انتہاء کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کام وہی اچھا ہوتا ہے جس کا انجام اچھا ہو کافر وُجُوْہ بن کر اُٹھے اور خَاشِعَۃ بن کر رہ گئے مگر مومن گری ہوئی حالت سے اُٹھے اور وُجُوْہٌ بن گئے۔ ہر قسم کی عزت، رُتبے اور درجے اُن کو حاصل ہو گئے چنانچہ دیکھ لو کفار کی کیا حالت ہوئی اور مومن کس حالت کو پہنچ گئے۔ ابوجہل بڑا ذوالوجاہت تھا مگر مرا کس حالت میں؟ ایسی حالت میں کہ پندرہ پندرہ برس کے دو انصاری لڑکوں نے اُس کو جنگِ بدر میں مار گرایا۔ اس کے مقابلہ میں حضرت ابوبکرؓ مکّہ کے ایک معمولی تاجر تھے مگر جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اُنہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا تو مکّہ میں بھی کسی نے یہ خبر پہنچا دی۔ ایک مجلس میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد بھی اُس میں موجود تھے کہ کسی نے کہا مدینہ سے خبر آئی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فوت ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا پھر کیا ہُوا؟ اُس نے بتایا کہ مسلمانوں نے ایک شخص کو خلیفہ مقرر کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ انہوں نے پوچھا کس کے ہاتھ پر بیعت کی گئی ہے؟ اُس نے جواب دیا ابوبکرؓ کے ہاتھ پر۔ حضرت ابوبکرؓ کے والد جو اسی مجلس میں بیٹھے تھے یہ سُن کر کہنے لگے کس ابوبکر کے ہاتھ پر؟ یعنی اُن کے ذہن میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا کہ میرے بیٹے ابوبکرؓ کو بادشاہ تسلیم کر لیا جائے گا اُس نے کہا ابن ابی قحافہ۔ یعنی تمہارے بیٹے کے ہاتھ پر بیعت کی گئی ہے۔ انہوں نے ایک ایک خاندان اور قبیلہ کا نام لے کر پوچھنا شروع کیا کہ کیا انہوں نے بھی بیعت کر لی ہے؟ اور اُس نے جواب دیا کہ ہاں۔ تب بے اختیار ہو کر وہ بولے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ حالانکہ وہ پہلے ہی مسلمان تھے اُن کے کلمہ طیبہ کے پڑھنے کے معنے ہی یہ تھے کہ یہ بھی ثبوت ہے اس بات کا کہ اسلام سچّا ہے۔ ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ ابوقحافہ کے بیٹے کے ہاتھ پر تمام قبائلِ عرب بیعت کر لیتے۔ غرض اسلام کی بدولت ایک شخص ادنیٰ حالت سے ترقی کرتا ہے اور اِس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ باپ کو یقین نہیں آتا کہ اُسے یہ مقام حاصل ہو گیا ہے حالانکہ لوگ اپنے بیٹوں کے متعلق بڑے وسیع اندازے لگایا کرتے ہیں۔ کئی لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہمارا بیٹا بڑا لائق ہے اور جب پوچھا جائے کیا لیاقت ہے؟ تو کہتے ہیں کتاب فرفر پڑھ لیتا ہے۔ اُن کے نزدیک ایک معمولی کتاب کو پڑھ لینا بھی بہت بڑے علم کا ثبوت ہوتا ہے خواہ وہ اپنی زبان کے اشعار ہی ہوں یا خواہ فرفر بھی نہ پڑھتا ہو وہ کہیں گے یہی کہ ہمارا بیٹا بڑا لائق ہے کتاب کو فرفر پڑھ لیتا ہے۔ پس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے باپ کے نزدیک اُن کے بیٹے کی سب سے زیادہ قدر ہونی چاہیئے تھی مگر اُن کے باپ کی یہ حالت ہے کہ اُنہیں یقین تک نہ آیا کہ اُن کے ہاتھ پر مسلمانوں نے بیعت کر لی ہے۔ پس ابوجہل بڑا ہو کر چھوٹا ہو گیا اور ابوبکر چھوٹا ہو کر بڑا بن گیا۔ یہی مفہوم ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس الہام میں ادا کیا گیا ہے کہ "کئی چھوٹے ہیں جو بڑے کئے جائیں گے اور کئی بڑے ہیں جو چھوٹے کئے جائیں گے"۔ (تذکرہ صفحہ ۲۹۶) گویا ایک کی ابتداء بڑے ہونے سے ہوئی اور انتہاء چھوٹے ہونے پر ہوئی اور ایک کی ابتداء چھوٹے ہونے سے ہوئی اور انتہاء بڑے ہونے پر ہوئی۔ ایک کا وُجُوْہٌ نام رکھا گیا ہے ابتداء کی وجہ سے اور دوسرے کا

وُجُوْہٌ نام رکھا گیا ہے انتہاء کی وجہ سے ورنہ ایک ملک کے وہ دونوں سردار نہیں ہو سکتے تھے وہ تو ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔ پس اس جگہ یہی بتایا گیا ہے کہ اے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کرنے والو! تم آج وُجُوْہٌ ہو کل خَاشِعَۃٌ ہو جاؤ گے۔ مسلمان آج گرے ہوئے ہیں کل وُجُوْہٌ بن جائیں گے۔

پھر وُجُوْہٌ کے ساتھ نَاعِمَۃٌ کا لفظ بڑھا دیا اور نَاعِمَۃٌ کے دو معنے بتائے جاچکے ہیں۔ حُسن و نضارت والے اور یہ بھی کہ وہ مُتَنَعِّمَۃٌ ہوں گے یعنی بڑی بڑی نعمتیں اُن کو حاصل ہوں گی۔ ذاتی طور پر بھی وہ کمال رکھیں گے اور ماحول کے لحاظ سے بھی کمال رکھینگے جہاں اُن کو ذاتی طور پر نعمتیں حاصل ہونگی وہاں اللہ تعالیٰ اُن کو بیرونی نعمتیں بھی عطا کرے گا۔ ظاہری معنوں کے لحاظ سے یہ مراد ہوگی کہ وہ حسین۔ خوبصورت اور صاحب اموال ہوں گے اور روحانی لحاظ سے یہ معنے ہوں گے کہ وہ متقی اور صاحب علوم ہوں گے یعنی متقی بھی ہونگے اور علوم روحانیہ بھی اُن کو حاصل ہوں گے۔ اپنی ذات میں بھی کامل عرفان اور استغناء اُن کو حاصل ہوگا اور اُن کے پاس ایسے علوم اور اموال بھی ہوں گے جو دوسروں کو سکھا سکیں اور دے سکیں۔ حُسن ایک ذاتی چیز ہے اور مال ایسی چیز ہے جو دوسرے کو دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح تقویٰ ایسی چیز ہے جو انسان کسی کو نہیں دے سکتا لیکن علم ایسی چیز ہے جو دوسرے کو دے سکتا ہے پس بتایا کہ جیسے ظاہری لحاظ سے حُسن اور مال دونوں نعمتیں ان کو حاصل ہوں گی اسی طرح باطنی لحاظ سے تقوےٰ بھی اُن میں پایا جائے گا اور علم بھی اُن کو عطا ہوگا۔ ظاہری لحاظ سے وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَۃٌ کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ اُس دن بڑے حسین نظر آ رہے ہوں گے بظاہر یہ سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص وقت کوئی شخص حسین کس طرح ہو جائے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس کے ساتھ محبت کا تعلق ہو وہ بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتا ہے اور اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے کہ بوجہ ذاتی تقویٰ اور احسان کے وہ لوگوں کے محبوب ہو جائیں گے اور خواہ اُن کی شکل کیسی ہی ہو وہ لوگوں کو حسین نظر آئیں گے جیسے ہر باپ کو اپنا بیٹا اور ہر بیٹے کو اپنا باپ حسین نظر آتا ہے۔

وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَۃٌ کے روحانی لحاظ سے معنے

حضرت عمرو بن العاصؓ مسلمان ہونے سے پہلے اسلام کے شدید مخالف تھے جب وہ وفات پانے لگے تو سخت گھبرا رہے تھے کہ میں اللہ تعالےٰ کو کیا مُنہ دکھاؤں گا۔ اُن کے بیٹے نے کہا کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ کو تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں بڑی بڑی خدمتوں کے مواقع ملے ہیں انہوں نے کہا ہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں بیشک خدمتوں کے مواقع ملے تھے مگر آپ کے بعد جن حالات میں سے ہم گذرے ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے ڈر آتا ہے کہ نہ معلوم اللہ تعالےٰ ہم سے کیا معاملہ کرے۔ پھر کہنے لگے رسول کریم صلے اللہ علیہ کا اگر کوئی حُلیہ مجھ سے پوچھے تو میں نہیں بتا سکتا آپ کے متعلق مجھ پر دو زمانے گذرے ہیں ایک وقت تو وہ تھا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ کیا اور مجھے اس دعویٰ سے اس قدر نفرت پیدا ہوئی کہ میں نے اُس دن کے بعد آپ کی شکل کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ پہلے تو آپ سے کوئی زیادہ واقفیت ہی نہیں تھی کہ شکل یاد ہوتی۔ دعویٰ کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ آپ سامنے سے آ رہے ہوتے تو میں اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا کہ نعوذ باللہ آپ کی شکل کو میں نہ دیکھ لوں۔ اس کے بعد جب مجھے ایمان نصیب ہُوا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا مجھے وہ جلال، وہ حُسن اور وہ نور نظر آیا کہ اس کے بعد مجھے جرأت ہی نہیں ہوئی کہ میں آپ کے چہرہ پر نظر ڈال سکوں۔ چنانچہ آج اگر مجھ سے کوئی شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا حُلیہ دریافت کرے تو مَیں اُسے نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ

# لِّسَعْیِهَا رَاضِیَةٌ ۝

اپنی (سابقہ) کوششوں پر مطمئن ہوں گے ۵۸

کفر کی حالت میں آپ کی شکل سے زیادہ بدصورت مجھے کوئی اور شکل نظر نہیں آتی تھی اور ایمان کی حالت میں آپ کی شکل سے زیادہ خوبصورت مجھے کوئی اور شکل نظر نہیں آتی تھی اس لئے دونوں حالتوں میں مَیں آپ کو دیکھ نہ سکا۔ گویا کفر کی حالت میں انتہائی نفرت کی وجہ سے نہ دیکھ سکے اور ایمان کی حالت میں آپ کے جلال اور آپ کے حُسن کو برداشت کرنے کی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے نہ دیکھ سکے۔

حقیقت یہی ہے کہ ایک ہی چیز کو انسان بعض حالت میں اچھا اور بعض حالات میں بُرا سمجھنے لگ جاتا ہے اور محبت یا نفرت کی وجہ سے شکلیں بھی بدل جاتی ہیں۔ ہم نے بیسیوں میاں بیوی کی لڑائیاں دیکھی ہیں پہلے وہ ایک دوسرے کے عاشق زار ہوتے ہیں اور میاں سمجھتا ہے کہ خدا نے مجھے دنیا کی حسین ترین بیوی عطا فرمائی ہے مگر جب لڑائی ہو جاتی ہے تو خاوند کہتا ہے کہ اس کی شکل ہی اتنی بُری ہے کہ دیکھنے کے قابل ہی نہیں۔ غرض نَاعِمَةٌ کے اگر ظاہری معنے لئے جائیں تو وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَاعِمَةٌ کا مفہوم یہ ہوگا کہ وُہ ایسے مقبولِ جہاں ہو جائیں گے کہ لوگوں کو حسین نظر آنے لگ جائیں گے۔ یہ ضروری نہیں کہ اُن کی شکلیں بھی حسین ہوں بلکہ وہ دُنیا کو حسین اور خوبصورت معلوم ہونے لگ جائیں گے جب وہ دنیا کے محسن ہونگے، جب وہ خدمتِ خلق کرنے والے ہوں گے، جب وہ یتامیٰ سے حُسنِ سلوک کرنے والے ہوں گے، جب وہ غریبوں سے ہمدردی کرنے والے ہوں گے، جب وہ گرے ہوئے لوگوں کو اُٹھانے والے ہونگے تو وہ لوگ دُنیا کو تمام دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ خوبصورت اور اچھے نظر آنے لگ جائینگے اور دوسرے لوگوں کے چہرے اُن کے مقابلہ میں اُنہیں حسین نظر نہیں آئیں گے۔ پس اگر ہم اس کے ظاہری معنے لیں تب بھی وہ صحیح ہوں گے مگر اس طرح نہیں کہ اُن کی شکلیں خوبصورت ہو جائیں گی بلکہ جیسے محاورہ کے طور پر کہتے ہیں پرنالہ چلتا ہے اور مراد یہ ہوتا ہے کہ پرنالہ میں پانی چلتا ہے اسی طرح اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ اپنے احسان کی وجہ سے حسین نظر آنے لگ جائیں گے۔ جب اُن میں احسان کا مادہ ہوگا، جب اُن میں نیکی ہوگی، جب اُن میں عفت ہوگی، جب اُن میں حُسنِ سلوک کا جذبہ ہوگا تو وُہ لوگوں کو بے انتہاء پیارے لگنے لگ جائیں گے پس وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ میں صحابہ کے یا مومنوں کے اخلاق فاضلہ کی طرف اشارہ ہے یعنی ایسے اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور حسنِ سلوک کی خدا اُن کو توفیق عطا فرمائے گا کہ وہ دنیا کی نگاہ میں بڑے خوبصورت اور حسین نظر آئیں گے اور اگر اس سے تقویٰ اور علم مراد ہو تو وہ ظاہر ہی ہے اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَاعِمَةٌ کے ظاہری معنے

**۵۸ تفسیر** - دنیا میں بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان دوسرے سے حسن سلوک کرتا ہے مگر وُہ اپنے کئے پر خوش نہیں ہوتا جیسے ریاء والا ہوتا ہے کہ وہ بعض دفعہ ہزاروں لاکھوں روپیہ بھی چندہ میں دے دیتا ہے اور لوگ اسے دیکھ کر کہتے ہیں سبحان اللہ واہ واہ اس نے کتنی بڑی قربانی کا نمونہ دکھایا مگر اس کا دل اندر سے خون ہو رہا ہوتا ہے یا وہ دکھاوے کے لئے صدقہ کرتا ہے تو لوگ اُس کی تعریف کرتے ہیں مگر اُس کی جان اندر سے ہلکان ہو رہی ہوتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اپنے روپے کو ضائع کیا ہے۔ تو صرف ظاہر میں تعریف کا ہو جانا اور لوگوں کی نگاہ میں حسین بن جانا کافی نہیں ہوتا بلکہ اپنی نگاہ میں بھی حسین بننا ضروری ہوتی

لوگوں کی نگاہ میں تو ایک ریاکار بھی حسین ہو جاتا ہے مگر وہ اپنے دل میں جل رہا ہوتا ہے کہ میں تباہ ہو گیا۔ لیکن فرماتا ہے وہ ایسے کامل وجود ہوں گے کہ اُن میں یہ نقص نہ ہوگا۔ چنانچہ وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَۃٌ لِّسَعْیِھَا رَاضِیَۃٌ کا اگر ہم معنوی لحاظ سے ترجمہ کریں تو یُوں ہوگا کہ کچھ چہرے ایسے ہوں گے یا کچھ افراد ایسے ہوں گے کہ ایک دن آئے گا جبکہ وہ دنیا کی نگاہ میں حسین ہو جائیں گے لِسَعْیِھَا رَاضِیَۃٌ اور اپنی نگاہ میں بھی حسین ہوں گے اور وہ اپنے کئے پر خوش ہوں گے اُن میں یہ احساس نہیں ہوگا کہ ہم نے لوگوں کے لئے قربانی کرکے اپنے اُوپر ظلم کیا ہے بلکہ وہ جس قدر خدمات سرانجام دیں گے جس قدر قربانیاں کریں گے جس قدر احسانات کریں گے اُن کے دل اور زیادہ خوش ہوں گے۔ گویا ایمان اور اخلاص اور محبت باللہ سے اُن کے قلوب اس طرح پُر ہوں گے کہ صرف لوگ ہی اُن کو دیکھ کر خوش نہیں ہوں گے بلکہ وہ خود بھی اپنے کاموں کو دیکھکر خوش ہوں گے۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے محاورہ کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر مجھے پھر موقع ملے تو مَیں پھر بھی یہی کام کروں گا۔ بعض دفعہ ایک انسان ایک کام تو کر لیتا ہے مگر بعد میں اپنے کئے پر نادم اور پشیمان ہوتا ہے اور اس کی ضمیر اُسے ملامت کرتی ہے چنانچہ جب اُسے کہا جائے کہ کیا اب جبکہ تم وہ کام کر چکے ہو اور وہ موقع گذر چکا ہے کیا تمہارے دل کو اطمینان ہے کہ تم نے جو کچھ کیا تھا درست کیا تھا؟ تو وہ بسا اوقات کہتا ہے کہ نہیں۔ میں اپنے کام پر نادم ہوں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں نے درست کام نہیں کیا۔ لیکن اگر اُس کے ضمیر کو تسلی ہوتی ہے اور وہ اپنے بیان میں سچ سے بھی کام لیتا ہے تو وہ کہتا ہے اگر میں پھر انہی حالات میں ڈالا جاؤں تو میں پھر بھی یہی کام کروں گا یعنی باوجود اس کے کہ زمانہ گذر چکا ہے میرے دل کو اس قدر اطمینان ہے کہ اگر پھر ویسے ہی حالات پیدا ہوں تو میں پھر بھی وہی کام کروں گا۔

دنیا میں ہر چیز کو دو نقطہ ہائے نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بعض دفعہ ماضی سے استقبال کی طرف دیکھا جاتا ہے اور بعض دفعہ حال سے ماضی کی طرف دیکھا جاتا ہے۔ یہ الگ الگ نقطہ ہائے نگاہ ہوتے ہیں۔ کبھی ہم ماضی سے مستقبل کی طرف دیکھتے ہیں تو ایک چیز ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہے مگر جب وہ استقبال ماضی میں بدل جاتا ہے اور ہم غور کرتے ہیں تو وہ فعل ہمیں بُرا محسوس ہونے لگتا ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم ماضی سے مستقبل کے نتیجہ کو دیکھتے ہیں اُسوقت بھی وہ ہمیں اچھا معلوم ہوتا ہے اور جب وہ وقت گذر جاتا ہے نتائج روشن ہو جاتے ہیں اور ہم حال سے ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تب بھی وہ کام ہمیں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ جو کام اعلیٰ درجے کا ہو اُس کی علامت یہی ہے کہ اُسے ماضی سے استقبال کے نقطہ نگاہ سے دیکھیں تب بھی وہ اچھا معلوم دے اور جب حال سے ماضی کی طرف دیکھا جائے تب بھی وہ اچھا معلوم دے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے لِسَعْیِھَا رَاضِیَۃٌ مسلمان ماضی کے مقام پر کھڑے ہو کر جب استقبال کی طرف دیکھیں گے تب بھی اُن کو وہ اعمال جن کے کرنیکا انہوں نے تہیّہ کیا ہے خوبصورت نظر آئیں گے اور جب وُہ اِن کاموں کو کر چکیں گے اور مستقبل کے مقام پر کھڑے ہو کر ماضی کی طرف دیکھیں گے تب بھی اُن کو وہ اعمال خوبصورت نظر آئیں گے گویا آگے اور پیچھے دونوں طرف اُن کے حُسن ہی حُسن ہوگا۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گھوڑا خریدنے والے کبھی اس کو سامنے کی طرف سے دیکھتے ہیں اور کبھی اس کو پیچھے کی طرف سے دیکھتے ہیں۔ بعض جانور سامنے سے تو خوبصورت معلوم ہوتے ہیں مگر وہ پیچھے سے بدصورت نظر آتے ہیں اور بعض پیچھے کیطرف سے خوبصورت نظر آتے

# فِی جَنَّۃٍ عَالِیَۃٍ ۝

بلند (و بالا) جنت میں (رہ رہے) ہونگے ۹؎

ہیں اور سامنے سے بدصورت نظر آتے ہیں۔ اچھا جانور وہی ہوتا ہے جو سامنے سے بھی اچھا نظر آئے اور پیچھے کی طرف سے بھی اچھا نظر آئے۔ انسانی اعمال کی بھی یہ دو حالتیں ہوتی ہیں بعض دفعہ ایک کام کرنے سے پہلے بھی اچھا معلوم ہوتا ہے اور کرنے کے بعد بھی اچھا معلوم ہوتا ہے اور بعض دفعہ ایک کام کرنے سے پہلے خوبصورت نظر آتا ہے اور کرنے کے بعد بُرا معلوم ہوتا ہے اور بعض دفعہ ایک کام کرنے سے پہلے بُرا معلوم ہوتا ہے اور کرنے کے بعد اچھا۔ اگر کوئی کام کرنے سے پہلے بھی اچھا نظر آتے اور کرنے کے بعد بھی اچھا نظر آتے تو وہی کام قابلِ قدر ہوتا ہے جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی جنگ میں شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے خوش ہو کر فرمایا جو کچھ مجھ سے مانگنا چاہتے ہو مانگو میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اگر انہوں نے علیٰ وجہ البصیرت شہادت کو قبول نہ کیا ہوتا تو وہ کہتے کہ خدایا میری خواہش یہ ہے کہ تُو مجھے زندہ کر دے میں نے بیوقوفی کی جو جنگ میں شامل ہوا اور مارا گیا اب تُو مجھے پھر زندہ کر دے تاکہ میں اپنے بیوی بچوں کے پاس جاؤں مگر انہوں نے یہ نہیں کہا کیونکہ انہوں نے جب شہادت کو مستقبل کے اُفق میں دیکھا تھا تب بھی یہ نتیجہ نکالا تھا کہ یہ اچھی چیز ہے اور جب اس درجہ کو پا لیا اور ماضی کی طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے اپنی شہادت کو دیکھا تو اس وقت بھی انہوں نے یہی نتیجہ نکالا کہ یہ اچھی چیز ہے چنانچہ انہوں نے کہا یا اللہ میرا دل یہ چاہتا ہے کہ تُو مجھے زندہ کر دے تاکہ میں پھر تیری راہ میں شہید ہو جاؤں (ترمذی ابواب التفسیر) گویا مرنے کے بعد بھی انہوں نے اپنی شہادت کو اچھی نگاہ سے دیکھا۔ تو کام کو شروع کرنے سے پہلے اور اُس کے ختم ہونے کے بعد دونوں نقطہ ہائے نگاہ سے دیکھنے کے نتیجہ میں ہی کسی کام کی حقیقی خوبی ظاہر ہوتی ہے اور لِسَعْیِهَا رَاضِیَۃٌ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے جہاں لوگ اُن کو حسین پائیں گے وہ اپنے آپ کو بھی حسین پائیں گے یہ نہیں ہوگا کہ وہ بعد میں کہیں ہم نے بہت بُرا کیا بلکہ کام کرنے سے پہلے بھی وہ اپنے اعمال کو اچھا سمجھتے ہوں گے اور کام کرنے کے بعد بھی اُن کو اپنے اعمال خوبصورت نظر آئیں گے۔ اپنے آپ کو حسین پانے کے معنے اس متکبرانہ خیال کے نہیں جو ہر بے وقوف میں پایا جاتا ہے کہ ہم چو من دیگرے نیست کی مرض میں مبتلا ہوتا ہے یہ حالت تو نہایت خراب اور دل کی بیماری پر دلالت کرتی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچے غور اور فکر اور نتائج اعمال دیکھ کر بھی وہ اپنے اعمال کو اچھا پائیں گے اور یہ مقام کامل کا مقام ہوتا ہے۔

**۹؎ تفسیر۔** فرماتا ہے جب وہ لوگوں کی نگاہوں میں خوبصورت ہو جائیں گے اور اپنی نظروں میں بھی وہ حسین دکھائی دیں گے۔ جب وہ ماضی سے استقبال کی طرف دیکھیں گے تب بھی وہ ان افعال پر خوش اور مطمئن ہوں گے جن کے کرنے کا انہوں نے ارادہ کیا ہے اور جب وہ حال سے ماضی کی طرف نگاہ دوڑائیں گے تب بھی انہیں اپنے افعال پر اطمینان ہوگا۔ پس دنیا کی رائے بھی اُن کے متعلق اچھی ہوگی اور اُن کی اپنی رائے بھی اپنے متعلق اچھی ہوگی بلکہ یوں کہو کہ انعامات چونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ملتے ہیں اور سب تعریفیں اُسی کی طرف سے آتی ہیں۔ اس لئے خدا کی رائے بھی اُن کے متعلق اچھی ہوگی پبلک کی رائے بھی اُن کے متعلق اچھی ہوگی اور اُن کی اپنی

# لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ○

وہ اس میں کوئی لغو بات نہ سنیں گے سلہ

رائے بھی اپنے متعلق اچھی ہوگی اور یہی انسانی اعمال کے تین اہم ترین حصے ہیں یعنی انسان کا اپنی ذات سے معاملہ انسان کا بنی نوع انسان سے معاملہ اور انسان کا خدا تعالیٰ سے معاملہ۔ اپنی ذات سے اُن کا معاملہ ایسا ہوگا کہ اُن کی اپنی رائے اپنے متعلق اچھی ہوگی۔ بنی نوع انسان سے اُن کا معاملہ ایسا ہوگا کہ پبلک کی رائے اُن کے متعلق اچھی ہوگی اور خدا تعالیٰ سے اُن کا معاملہ ایسا ہوگا کہ خدا تعالیٰ کی رائے اُن کے متعلق اچھی ہوگی۔ جب یہ تینوں تعریفیں کسی کو حاصل ہو جائیں تو اس میں کیا شبہ ہے کہ وہ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ کا مصداق ہوتا ہے۔ لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جہاں جاتا ہے لوگ اُسے اپنی آنکھوں پر بٹھاتے ہیں خواہ مالی لحاظ سے اُس کے پاس ایک پیسہ تک نہ ہو۔ اُس کے کپڑے پھٹے پُرانے ہوں لیکن وہ خود اپنے نفس میں بھی اپنے آپ کو بلند پاتا ہے دنی نہیں پاتا بلکہ سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اخلاقی لحاظ سے مجھے بلند مرتبہ دیا ہے ذلیل لوگوں میں مجھے شامل نہیں کیا۔ اور لوگ بھی اس کی عزت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

۲۶۱
جَنَّةٌ عَالِيَةٌ سے مراد ایسے باغات جو اونچی جگہ ہوں

پُرانے زمانہ میں شاید جَنَّةٍ عَالِيَةٍ کا مفہوم پوری طرح نہ سمجھا جاتا ہو مگر اس زمانہ میں اس کا مفہوم سمجھنا بالکل آسان ہے کیونکہ ہینگنگ گارڈنز ( HANGING GARDENS ) دنیا میں پائے جاتے ہیں اور بمبئی میں بھی ایسے کئی باغات ہیں میں اوائل عمر میں ایک دفعہ بمبئی گیا وہاں مجھے بتایا گیا کہ یہاں ہینگنگ گارڈنز ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید کھمبوں میں گملے لٹکا کر باغات بنائے گئے ہوں گے یا کسی چٹان پر جو آگے بڑھی ہوئی اور ہوا میں معلق نظر آتی ہوگی۔ مگر جب مجھے کوئی ایسا باغ وہاں نظر نہ آیا تو میں نے کسی سے پوچھا کہ لوگ تو کہتے تھے یہاں ہینگنگ گارڈنز ہوتے ہیں مگر مجھے تو کوئی نظر نہیں آیا۔ اِس پر اُس نے بتایا کہ ہینگنگ گارڈنز تو ابھی آپ دیکھ کر آئے ہیں تب مجھے پتہ لگا کہ ہینگنگ گارڈن کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لٹکا ہوا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اونچی چوٹی پر ہے اور چونکہ لوگ نیچے ہوتے ہیں اور باغات چوٹی پر ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کو ہینگنگ گارڈنز کہا جاتا ہے یعنی بلند اور اونچے باغات۔ اسی طرح فرماتا ہے مومن ایسے باغات میں ہوں گے جو اونچے اور بلند ہوں گے۔ جَنَّت کے معنے سایہ دار جگہ کے ہیں اور عَالِیَہ کے معنے بلند کے ہیں۔ جو چیز سایہ دار ہو اُس کی اندر کی چیزیں لوگوں کو نظر نہیں آتیں اور جو چیز بلندی پر ہو اُس پر دھوپ پڑتی ہے سایہ دار نہیں رہ سکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جن باغات کا ہم ذکر کرتے ہیں اُن کے اندر دونوں قسم کی خوبیاں پائی جائیں گی جہاں تک شہرت اور عزت کا سوال ہے وہ عَالِیَہ ہوں گے اور جہاں تک اُن کی نیکیوں اور خوبیوں کا سوال ہے وہ سایہ دار ہوں گے یعنی لوگوں کی نظریں بھی اُن کی طرف اُٹھیں گی اور پھر وہ تمازت اور دھوپ کا شکار بھی نہیں ہوں گے بلکہ ہر وقت سایۂ رحمتِ الٰہی کے نیچے رہیں گے ورنہ اکثر لوگ بلندی پر پہنچ کر ننگے ہو جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے فضل کا سورج بجائے اُن کے لئے نفع مند ہونے کے اُن کے جلانے کا موجب ہو جاتا ہے۔

۲۶۲
لَاغِيَةً

**سلہ حل لغات۔** لَاغِيَةً کے معنے ہیں اَللَّغْوُ یعنی لغو اور بیہودہ بات۔ کہتے ہیں كَلِمَةٌ لَاغِيَةٌ اَیْ فَاحِشَةٌ۔ كَلِمَةٌ لَاغِيَةٌ ایسے کلمہ کو

کہتے ہیں جو فحش اور بُرا ہو وَمِنْہُ لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً اَیْ كَلِمَةً ذَاتَ لَغْوٍ اور لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً کے یہ معنے ہیں کہ تُو اُس میں کوئی فحش اور بُری بات نہیں سنیگا یا وہ چہرے اس میں کوئی لغویات نہ سنیں گے (اقرب)

**تفسیر**۔ دنیا میں انسان دو ہی طرح بُری باتیں سُنتا ہے یا تو اس طرح کہ وہ خود کج رَو ہوتا ہے اور لوگوں سے لڑتا رہتا ہے اس کے نتیجہ میں لازمی طور پر اُسے لَاغِيَةً سُننا پڑتا ہے مثلاً جب وہ دوسرے کو خبیث کہے گا تو خبیث کا لفظ اُس کے اپنے کان میں بھی پڑیگا اور اس طرح اُسے لَاغِيَةً سُننا پڑے گا اور یا پھر دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس سے لڑتے ہیں اور وہ لَاغِيَةً سنتا ہے۔ اپنا کہا انسان تب سنتا ہے جب وہ لوگوں سے خوش نہ ہو اور لوگوں سے لَاغِيَةً تب سُنتا ہے جب لوگ اُس سے خوش نہ ہوں مگر فرماتا ہے وہ لوگ ایسے ہوں گے کہ لَاغِيَةً نہیں سنیں گے یعنی وہ لوگوں سے خوش ہوں گے اور لوگ اُن سے خوش ہوں گے اُن میں رحم ہوگا، اُن میں ہمدردی ہوگی، اُن میں پردہ پوشی کی عادت ہوگی، اُن میں حسنِ سلوک کا جذبہ ہوگا اُن میں محبت ہوگی، اُن میں خلوص ہوگا اور اس وجہ سے وہ لوگوں سے لڑیں گے نہیں اور نہ اُن کو گالیاں دیں گے جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ آپ نہ سبّاب تھے اور نہ لعّان۔ نہ گالیاں دیتے تھے اور نہ لوگوں پر لعنتیں ڈالتے تھے۔ جب انسان کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے یا وہ بخیل اور ضدی ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے لڑتا اور گالی گلوچ دیتا ہے چنانچہ بعض لوگوں میں یہ نقص ہوتا ہے کہ کسی کام کے لئے لوگ اُن کے پاس جائیں تو وہ شور مچا دیتے ہیں کہ یہ بدبخت ہر وقت پیچھے پڑے رہتے ہیں کسی وقت چھوڑتے بھی نہیں۔ لیکن اگر کوئی سخی ہوتا ہے، حُسنِ سلوک کرتا ہے۔ لوگوں سے محبت کے ساتھ پیش آتا ہے تو اپنے مُنہ سے لغو نہیں سُنتا اور اگر وہ حُسنِ سلوک میں کامل ہو اور اس کے ساتھ ہی اُسے طاقت اور غلبہ بھی حاصل ہو تو وہ اور لوگوں سے بھی لَاغِيَةً نہیں سنتا۔

لاغیہ نہ سننے کی دو وجوہات اور مومنوں کا اُن سے پاک ہونا

درحقیقت دوسروں سے لَاغِيَةً نہ سننے میں مسلمانوں کی طاقت اور اُن کی قوت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ دنیا میں ایسے کمینے لوگ بھی پائے جاتے ہیں کہ خواہ اُن سے کس قدر حسنِ سلوک کیا جائے وہ بُرا بھلا کہنے سے باز نہیں آتے۔ ہماری جماعت کو ہی دیکھ لو۔ ہم کس قدر لوگوں سے حسنِ سلوک کرتے اور انکی بہتری کی کوششیں کرتے ہیں مگر سب سے زیادہ گالیاں ہمیں ہی ملتی ہیں۔ تو بعض لوگ ایسے گندے ہو جاتے ہیں کہ کسی حالت میں بھی نیش زنی سے باز نہیں آتے۔ جس طرح عقرب کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ نیش زنی کرتا ہے اسی طرح بعض لوگ شیطان کے ورغلانے سے اتنے گندے ہو جاتے ہیں کہ اپنے نفع اور نقصان کو بھی نہیں دیکھتے اور خدا تعالےٰ کی طرف سے آنے والے پیغام کی پوری مخالفت کرتے ہیں خواہ اس پیغام کو پیش کرنیوالے کتنی ہمدردی اور محبت سے کام لے رہے ہوں۔ لیکن اگر الٰہی جماعت کو حکومت اور غلبہ میسّر آجائے تو پھر وہی لوگ بوٹ چاٹنے لگ جاتے ہیں۔ پس لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً میں مسلمانوں کی حکومت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ایسا غلبہ حاصل ہو جائے گا کہ اُن کے مقابلہ میں کوئی شخص بُری باتیں کہنے کی جرأت نہیں کرے گا اسی طرح لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً میں مسلمانوں کے اخلاق کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جس طرح لِسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ میں تین باتوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کا اپنے نفس سے سلوک، مسلمانوں کا بنی نوع انسان سے سلوک اور مسلمانوں کا خدا تعالےٰ سے سلوک۔ اور بتایا گیا تھا کہ وہ تینوں لحاظ سے کامل ہوں گے۔ اِسی طرح لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً میں اوّل اُن کے اخلاق

# فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝

اس میں ایک بہتا ہوا چشمہ ہوگا [۱۱]

کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ بخیل اور حریص نہیں ہوں گے کہ اگر انہیں لوگوں سے حسن سلوک کرنا پڑے تو وہ گالیاں دینے پر اتر آئیں یا ان کے مزاج میں چڑچڑاپن نہیں ہوگا کہ لوگ انہیں برا کہیں بلکہ وہ لوگوں کے محسن ہوں گے، منعم ہونگے، معلم ہوں گے اور لوگ ان کی تعریف کریں گے۔ لیکن کمینے انسان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ دونوں حالتوں میں لڑتا ہے اس پر احسان کرو تب بھی لڑتا ہے نہ کرو تب بھی لڑتا ہے گویا اس کی حالت کتے کی طرح ہوتی ہے کہ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ (اعراف ع ۲۲) دونوں حالتوں میں زبان نکالے کتے کی طرح پیچھے پڑا رہتا ہے۔ ایسا انسان اسی صورت میں خاموش ہوتا ہے جب اس کے مدمقابل کو حکومت اور غلبہ میسر آجائے۔ پس فرماتا ہے مسلمانوں کو غلبہ مل جائے گا اور کوئی صورت لَاغِيَةً سننے کی نہیں رہے گی دشمنانِ دین جو احسان فراموش ہیں وہ غلبہ کی وجہ سے تعریف کریں گے اور جو شرافت رکھتے ہیں وہ احسان کی وجہ سے تعریف کریں گے اور یہ خود نیک طبیعت ہونے کی وجہ سے کسی سے بدگوئی نہیں کریں گے اس لئے لغو ان کو سنائی ہی نہیں دے گا۔

[۱۱] **تفسیر**۔ مومن جس جنت میں رہیں گے اس میں ایک جاری چشمہ ہوگا۔ اگلے جہان میں تو یہ ہوگا ہی۔ اس کے متعلق کسی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ نہ میں نے اسے دیکھا ہے اور نہ کسی اور نے یہ ایک ایمانی معاملہ ہے۔ لیکن دنیا کے لحاظ سے یہ معنے ہیں کہ وہ ایسے علوم اپنے ورثہ میں چھوڑیں گے اور ایسے سلوک بنی نوعِ انسان سے کریں گے جن کا اثر عرصۂ دراز تک چلتا چلا جائے گا۔ کچھ لوگوں کا احسان صرف وقتی ہوتا ہے لیکن کچھ لوگوں کا احسان صدقۂ جاریہ کا رنگ اپنے اندر رکھتا ہے مثلاً کسی غریب کو ایک پیسہ دے دینا یہ بھی احسان ہے مگر جب وہ اس پیسے سے روٹی خرید کر کھا لیتا ہے تو اس احسان کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے لیکن ایک احسان یہ ہے کہ کسی کو دین کی باتیں سکھائی جائیں یا اخلاقی لحاظ سے اعلیٰ تربیت دی جائے یہ احسان بڑا وسیع ہے یا مثلاً کسی کو کوئی پیشہ سکھا دینا یا کسی کو پیشہ چلانے کے لئے مدد دے دینا یا اسے اپنے پیشہ کے چلانے کے لئے ہتھیار خرید دینا یہ احسان اپنے اندر بہت بڑی وسعت رکھتا ہے۔ روٹی دے دینا اور قسم کا احسان ہے اور پیشہ سکھا دینا یا پیشہ کے چلانے کے لئے روپیہ سے امداد کرنا یا ہتھیار وغیرہ خرید دینا یہ اور قسم کا احسان ہے پہلی قسم کا صدقہ ختم ہو گیا مگر یہ صدقہ صدقۂ جاریہ ہے فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ سے یہی مراد ہے کہ ان کے صدقات صدقاتِ جاریہ ہوں گے اور ان کے احسان بنی نوعِ انسان محدود نہیں ہوں گے یا معمولی اور چھوٹے درجہ کے نہیں ہونگے۔ بلکہ ایسے ہوں گے جو عرصۂ دراز تک چلتے چلے جائیں گے۔ جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحابہؓ نے علم لیا۔ اور پھر اسے دنیا میں اس طرح پھیلایا کہ عَنْ فُلَانٍ عَنْ فُلَانٍ کے ایک لمبے سلسلہ کے ماتحت وہ اگلی نسلوں تک پہنچ گئے۔ اگلوں نے اگلوں تک اور پھر اگلوں نے اگلوں تک یہاں تک کہ وہ سارے علوم ہم تک پہنچ گئے۔ اللہ تعالےٰ نے صحابہ کرام میں یہ خوبی بدرجۂ اتم رکھی ہوئی تھی کہ وہ علوم کے خزانے صرف اپنے تک محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ دوسروں تک عَيْنٌ جَارِيَةٌ بن کر پہنچا دیتے تھے۔ لوگوں کے پاس علم ہوتا ہے تو وہ اس کو بند کر لیتے ہیں مگر صحابہؓ کی یہ حالت تھی

عَيْنٌ جَارِيَةٌ سے مراد ایسا کام جو ہمیشہ ہمیش کیلئے چلتا چلا جائے

# فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ○

(اور) اس میں اونچے تخت (بھی) رکھے ہونگے ۱۳

کہ ایک صحابیؓ سے ایک دفعہ کسی نے کوئی بات پوچھی۔ اُس نے جواب دیا کہ مجھے تو یہ بات معلوم نہیں لیکن اگر مجھے معلوم ہوتی اور میری گردن پر کوئی شخص تلوار رکھ کر کہتا کہ اب میں تجھے قتل کرنے لگا ہوں تو میں اس کی تلوار چلنے سے پہلے جلدی جلدی بتا دیتا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے میں نے فلاں فلاں بات سُنی ہوئی ہے یہ عَيْنٌ جَارِيَةٌ ہی تھے کہ کسی جگہ رُکتے نہیں تھے بلکہ بہتے چلے جاتے تھے۔ پھر عَيْنٌ جَارِيَةٌ میں یہ خبر بھی دی گئی تھی کہ صحابہؓ اور اُن کے شاگرد دُور دُور تک نکل جائیں گے صرف عرب میں محدود نہیں رہیں گے۔ چنانچہ دیکھ لو مسلمان عرب سے نکلے اور دنیا کے دُور دراز ممالک تک پھیل گئے یہاں تک کہ وہ چین بھی گئے اور انہوں نے اسلام پھیلایا۔ انڈونیشیا میں بھی گئے اور اسلام پھیلایا۔ سپین میں بھی گئے اور اسلام پھیلایا۔ غرض وہ دنیا کے کناروں تک نکل گئے اور دنیا میں علوم کے دریا انہوں نے بہا دئے جس طرح جاری چشمہ کا پانی دُور دُور کی زمین کو سیراب کر دیتا ہے اسی طرح مسلمان ٹھہرتے نہیں تھے بلکہ اپنے علوم سے دنیا کو مستفیض کرتے چلے جاتے تھے۔ یہی خوبیاں ہیں جو جیتنے والی اقوام سے مخصوص ہیں۔ ہماری جماعت کو سوچنا چاہیئے کہ کیا ہم میں بھی یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ حکومت کا حصہ تو اپنے وقت پر آئے گا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا باقی خوبیاں ہم نے اپنے اندر پیدا کر لی ہیں؟ کیا ہم اپنی نظر میں، لوگوں کی نظر میں اور پھر خدا تعالےٰ کی نظر میں ہر قسم کے نقائص سے پاک ہیں؟ کیا ہمارے اخلاق اس قسم کے ہیں کہ ہم نہ اپنی زبان سے لَاغِيَةً سنتے ہیں اور نہ لوگوں کی زبان سے لَاغِيَةً سنتے ہیں؟ اور کیا ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ عَيْنٌ جَارِيَةٌ کی طرح ہم جو بات بھی سُنیں اُسے دوسرے لوگوں تک پہنچا دیں یا ہم صرف واہ واہ اور سبحان اللہ کہنے کے لئے سنتے ہیں؟ صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ وہ رات اور دن تعلیم میں لگے رہتے تھے اور پھر جو کچھ سیکھتے اسے اپنے سینوں میں ہی نہ رکھتے بلکہ لوگوں تک پہنچا دیتے۔ گویا وہ ایک جاری چشمہ تھا جو دنیا کو سیراب کر رہا تھا۔ کتنی زبردست خواہش دوسروں تک علوم پہنچانے کی ہے جو اُس صحابی کے دل میں پائی جاتی تھی جس نے کہا کہ اگر تلوار میری گردن پر چل رہی ہو تو اُس وقت میری آخری خواہش یہ ہوگی کہ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کوئی بات بیان کرنی مجھ سے رہ گئی ہو تو میں اُسے جلدی جلدی بیان کر دوں۔ یہی خوبی ہماری جماعت کو اپنے اندر پیدا کرنی چاہیئے اور اپنے آپ کو علوم کے لحاظ سے عَيْنٌ جَارِيَةٌ ثابت کرنا چاہیئے۔

عَيْنٌ جَارِيَةٌ کے ماتحت مسلمانوں کا مختلف ممالک میں پھیل جانا

## ۱۳ حل لغات۔

سُرُرٌ: سَرِيْرٌ کی جمع ہے اور سُرُرٌ کی بجائے اَسِرَّةٌ بھی جمع کے طور پر استعمال ہوتا ہے اس کے معنے تخت کے ہوتے ہیں خصوصاً یہ لفظ بادشاہ کے تخت کے لئے بولا جاتا ہے چنانچہ کہتے ہیں زَالَ عَنْ سَرِيْرِہٖ وہ اپنے سریر سے ہٹ گیا اور مراد یہ ہوتی ہے کہ ذَهَبَ عِزُّهٗ وَ نِعْمَتُهٗ اُس کی عزت اور دولت جاتی رہی سُمِّيَ بِهٖ لِاَنَّ مَنْ جَلَسَ عَلَيْهِ مِنْ اَهْلِ الرِّفْعَةِ وَالْجَاهِ يَكُوْنُ مَسْرُوْرًا۔ سریر کا لفظ اس لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ مالدار اور جاہ و جلال کے مالک لوگ تخت پر بیٹھتے ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ پس چونکہ اس مقام کا حصول دل میں سرور پیدا کرتا ہے اس لئے تخت کا نام ہی سریر رکھ دیا گیا (اقرب)

سُرُرٌ

مَرْفُوْعَةٌ: رَفَعَ سے ہے اور رَفَعَہٗ کے معنے

مَرْفُوْعَةٌ

ہوتے ہیں اُس نے کسی چیز کو بلند کیا (اقرب) یہ بلندی خواہ اونچا بنانے کے لحاظ سے ہو جیسے کہتے ہیں مینار اونچا بنایا گیا اور خواہ اونچا کرنے کے لحاظ سے ہو جیسے کسی چیز کو اُٹھا کر اونچا کیا جاتا ہے۔ دونوں رنگ میں اس لفظ کا استعمال ہو جاتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں دیوار اونچی ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ لمبی چلی جاتی ہے اور قامت کے اعتبار سے بلند ہے یا کہتے ہیں چھت اونچی ہے اور مراد یہ ہوتی ہے کہ زمین اور چھت میں فاصلہ زیادہ ہے گویا قامت کی بلندی ہو یا فاصلہ کی زیادتی دونوں پر رفع کا لفظ اطلاق پاتا ہے۔ پس مَرْفُوْعَۃٌ کے معنے ہوں گے اُونچے کئے ہوئے۔ بلند کئے ہوئے۔

۳۶۱ سُرُرٌ مَّرْفُوْعَۃٌ کے دو معنے

**تفسیر**۔ اس آیت کے ایک معنے یہ ہیں کہ وہ بلند شان والے ہوں گے۔ کیونکہ سُرُرٌ کے ساتھ مَرْفُوْعَۃٌ ہونا زیادہ شان اور عزت پر دلالت کرتا ہے لیکن اس کے یہ بھی معنے ہیں کہ وہ بلند رکھے گئے ہوں گے گویا دونوں قسم کی خوبیاں اُن میں پائی جاتی ہوں گی۔ مومنوں کی یہ شان بھی ہوگی کہ وہ نیک اعمال میں ترقی کرتے جائیں گے اور دوسروں سے نیکی میں بلند قامت ہونے کی کوشش کریں گے اور وہ اس لحاظ سے بھی مَرْفُوْعَۃ ہوں گے کہ خدا تعالیٰ اُن کو اپنی طرف اٹھائے جائے گا۔ گویا جہاں تک اُن کا انسانوں سے واسطہ ہے وہ دوسرے بنی نوع انسان سے بلند قامت ہوں گے اور نیکی اور تقویٰ کے لحاظ سے اس قدر فائق ہوں گے کہ اُن میں اور عام لوگوں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہوگی اور جہاں تک خدا تعالےٰ کا تعلق ہے وہ باقی انسانوں کے مقابل پر اُن سے الگ قسم کا سلوک کرے گا اور وہ انہیں اپنا مقرب بنائے گا۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو جو بادشاہتیں ملیں گی وہ بالکل الگ قسم کی ہوں گی وہ اس جہان کی بادشاہتوں کی طرح نہیں ہونگی بلکہ مَرْفُوْعَۃ ہوں گی۔ اُن کے تخت آسمان پر رکھے جائیں گے چنانچہ دیکھ لو مسلمان بادشاہ تو ہوئے مگر انہوں نے دنیوی طور پر بادشاہت سے کیا فائدہ اُٹھایا؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تمام عالم اسلامی کے بادشاہ تھے مگر اُنکو کیا ملتا تھا۔ پبلک کے روپیہ کے وہ محافظ تو تھے مگر خود اس روپیہ پر کوئی تصرف نہیں رکھتے تھے۔ بے شک حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بڑے تاجر تھے مگر چونکہ اُنکو کثرت سے یہ عادت تھی کہ جو بھی روپیہ آیا خدا تعالیٰ کی راہ میں دے دیا اس لئے ایسا اتفاق ہوا کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور آپ خلیفہ ہوئے تو اس وقت آپ کے پاس نقد روپیہ نہیں تھا خلافت کے دوسرے ہی دن آپ نے کپڑوں کی گٹھڑی اُٹھائی اور اُسے بیچنے کے لئے چل پڑے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رستہ میں ملے تو پوچھا کیا کرنے لگے ہیں؟ انہوں نے کہا آخر میں نے کچھ کھانا تو ہوا اگر میں کپڑے نہیں بیچوں گا تو کھاؤں گا کہاں سے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یہ تو نہیں ہو سکتا اگر آپ کپڑے بیچتے رہے تو خلافت کا کام کون کرے گا؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اگر میں یہ کام نہیں کروں گا تو پھر گذارہ کس طرح ہوگا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ بیت المال سے وظیفہ لے لیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا کہ میں یہ تو برداشت نہیں کر سکتا۔ بیت المال پر میرا کیا حق ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا جب قرآن کریم نے اجازت دی ہے کہ دینی کام کرنیوالوں پر بھی بیت المال کا روپیہ صرف ہو سکتا ہے تو آپ کیوں نہیں لے سکتے۔ چنانچہ اس کے بعد بیت المال سے اُن کا وظیفہ مقرر ہو گیا مگر اُس وقت کے لحاظ سے وہ وظیفہ صرف اتنا تھا جس سے روٹی کپڑے کی ضرورت پوری ہو سکے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اُن کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بالکل سادہ طور پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ خلفاء میں سے صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس دولت تھی مگر آپ چونکہ بہت سخی تھے اس لئے جو کچھ پاس ہوتا بالعموم تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ لوگ اُن پر اعتراض بھی کرتے کہ آپ نے

# وَّ اَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۙ

اور آبخورے دھرے ہوں گے ۱۳

فلاں کو مال دیا ہے - فلاں کو مال دیا ہے آپ جواب دیتے کہ تم کو اس سے کیا۔ میرا اپنا روپیہ ہے میں جہاں چاہوں خرچ کروں تم اس میں دخل دینے والے کون ہو - تو کوئی فائدہ بھی خلفاء نے بیت المال سے نہیں اُٹھایا بلکہ تمام کا تمام روپیہ انہوں نے لوگوں کے فائدہ کے لئے اپنی نگرانی میں صرف کیا۔

غرض مسلمانوں کے تخت دوسروں کی نسبت بلند تھے۔ دنیا کے بادشاہ قومی خزانہ کو اپنا خزانہ سمجھتے ہیں اور وہ اس پر پورا پورا تصرف رکھتے ہیں آج پبلک اور بادشاہتوں میں بھی جنگ جاری ہے کہ لوگ کہتے ہیں تم روپیہ رعایا کے لئے خرچ کرو اور وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارا روپیہ ہے ہم جس طرح چاہیں گے خرچ کریں گے۔

پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اسلامی حکومت کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ اُن کے تخت مَرْفُوْعَة ہوں گے وہ لوگوں کے فائدہ کے لئے حکومت کریں گے گویا نام کے بادشاہ ہوں گے مگر حقیقتاً زمین کے بادشاہوں سے بہت بلند مقام پر ہوں گے۔ وہ خزانوں کو اپنے خزانے نہیں سمجھیں گے بلکہ ملک اور قوم کی ملک تصور کریں گے۔ یہی اسلامی حکومت کے معنے ہیں کہ اُس میں خزانہ کسی فرد کا نہیں ہوتا بلکہ قوم بحیثیت مجموعی اُس خزانہ کی مالک ہوتی ہے میں نے دیکھا ہے بعض غیر احمدی جو ہماری جماعت کو بھی عام پیروں فقیروں کی جماعتوں کی طرح سمجھتے ہیں مجھے خط لکھتے ہیں کہ آپ بڑے مالدار ہیں آپ ہمیں اتنے ہزار یا اتنے لاکھ روپے دے دیں۔ میں انہیں جواب دیتا ہوں کہ میرے پاس جو مال آتا ہے وہ میرا نہیں سلسلہ کا ہوتا ہے میں اسے اپنی مرضی کے مطابق تقسیم کرنے کا حق نہیں رکھتا غرض وہ لوگ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ میں بھی کسی قانون کے ماتحت ہوں اور اُس قانون کو توڑ کر بیت المال کے روپیہ کو خرچ کرنے کا حق نہیں رکھتا اُنہیں بہت سمجھایا جاتا ہے کہ مجھے خزانہ پر کلی اختیار نہیں بلکہ خدا تعالیٰ نے نے مجھے بھی بعض قوانین کے ماتحت رکھا ہے مگر انکی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی اور وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ میں بخل کی وجہ سے اُن کی مدد نہیں کرتا۔ یہ حالت بتاتی ہے کہ مسلمان اسلامی تعلیم سے آج کل کس قدر دُور چلے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان امراء مغضوب ہیں جبکہ گزشتہ ایام میں مسلمان امراء اور بادشاہ نہ صرف اپنوں کے محبوب تھے بلکہ غیروں کے بھی محبوب تھے۔ کیونکہ وہ حکومت کے روپیہ کو ملک اور خصوصاً غرباء کی ترقی کے لئے خرچ کرتے تھے اور امراء بھی اپنے اموال کو ایک الٰہی امانت سمجھتے تھے اور اُسے عیاشی پر نہیں بلکہ رفاہِ عام کے کاموں پر خرچ کرتے تھے۔

۲ اَكْوَابٌ

**۱۳ حل لغات۔** اَكْوَابٌ: آبخوروں کو کہتے ہیں اور مَوْضُوْعَةٌ وَضَعَ سے ہے جس کے معنے رکھنے کے ہوتے ہیں لیکن اس میں اور حَطَّ میں فرق ہے حَطَّ کے معنے محض رکھنے کے ہوتے ہیں اور وَضَعَ کے معنے مناسب طور پر رکھنے کے ہوتے ہیں قرآن کریم میں ہے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (رحمٰن ع۱) اس کے معنے یہ ہیں کہ زمین کو اس طرح بنایا کہ چارپایوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اسی طرح فرمایا یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (نساء ع۷) یعنی مناسب محل سے بدل کر دوسری جگہ رکھ دیتے ہیں۔

**تفسیر۔** اَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ کے تین معنے ہو سکتے ہیں۔ ۱۔ آبخورے مومنوں کے پاس رکھے جائیں گے چونکہ آبخورے کا کسی کے پاس رکھا جانا پینے کے لئے ہوتا ہے اس لئے ان معنوں سے یہ استنباط بھی ہو گا کہ وہ بھرے ہوئے ہوں گے۔

# وَّ نَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ۙ

اور سہارا لینے والے تکئے قطاروں میں رکھے ہوئے ہونگے ۱۶؎

دوسرے اس کے یہ معنے ہیں کہ آبخورے اُن کے پاس ہی دھرے ہوں گے۔ تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ آبخورے چشموں کے پاس دھرے ہوں گے۔

اس آیت میں مسلمانوں کے قرب الٰہی اور انکی سخاوت اور فیاضی کا ذکر کیا گیا ہے۔ "آبخورے اُن کے پاس رکھے جائیں گے" کا ایک اشارہ اُن کے بھرے ہوئے ہونے کی طرف ہے پس اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنے انعامات کا جام لبالب پلاتے گا اور ہر وقت پلائیگا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ مومن فضل و احسان کے جام بھر کر اپنے پاس رکھیں گے تا جو آئے اُسے پلائیں۔ وہ علوم آسمانی کے جام بھر بھر کر لوگوں کے سامنے پیش کریں گے اور کہیں گے لوجی یہ آبخورے پی لو۔ دوسرے معنے اس کے یہ نکلتے ہیں کہ آبخورے مومنوں کے پاس ہی رکھے ہوں گے یعنی علومِ آسمانی کا حصول ان کے لئے آسان کر دیا جائیگا اور اپنی کوشش سے وہ رُوح کی پیاس بجھا سکیں گے تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ آبخورے چشموں کے پاس دھرے ہوں گے یعنی دعوتِ عامہ ہوگی جو چاہے پیئے۔ گویا۔

اوّل۔ اُن کے سینوں کو علومِ آسمانی سے پُر کیا جائیگا۔

دوم۔ اُن کا علم اور عرفان لوگوں کے لئے اسقدر وسیع ہوگا کہ کسی کو مانگنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

سوم۔ وہ آبخوروں کو بھر بھر کر رکھتے چلے جائینگے اور لوگوں سے کہیں گے آؤ اور پی لو۔

چہارم۔ اُن کے لئے آسمانی علوم کا حصول آسان کر دیا جائے گا۔

پنجم۔ اُن کے فیوض کا دروازہ ہر ایک کے لئے کُھلا ہوگا جو چاہے اس سے فائدہ اُٹھائے۔

نَمَارِقُ ۱۶؎ **حل لغات**۔ نَمَارِق: نُمْرُقٌ اور نُمْرُقَة کی جمع ہے اور یہ لفظ تینوں طرح آجاتا ہے نُمْرُقٌ۔ نَمْرُقٌ اور نِمْرِقٌ۔ نَمَارِق اُن چھوٹے چھوٹے تکیوں کو کہا جاتا ہے جو ٹیک لگانے کے لئے پیچھے رکھے جاتے ہیں (اقرب) ایک گاؤ تکیہ ہوتا ہے جو متمدن ممالک میں صرف وہاں لگاتے ہیں جہاں قوم کا سردار بیٹھا ہو لیکن نَمَارِق اُن چھوٹے چھوٹے تکیوں کو کہتے ہیں جو دیوار کے ساتھ ساتھ تمام اہل مجلس کے لئے رکھے جاتے ہیں اور جو بھی آتا ہے اُس تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔

**تفسیر**۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمان سارے کے سارے معزز ہوں گے یہ نہیں کہ اُن میں سے صرف ایک شخص کے پیچھے گاؤ تکیہ ہو اور باقی تکیوں کے بغیر ہوں بلکہ ہر شخص کے پیچھے ایک ایک تکیہ ہوگا یعنی اللہ تعالےٰ تمام کی قوم کو معزز اور باعظمت بنا دے گا یہ خوبی اگر کامل طور پر ملی ہے تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھیوں کو۔ افسوس ہے کہ ابھی ہمارے اندر بھی کئی لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جن کو دینی علوم حاصل کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ جو قرآن کریم کے علوم سے بہت حد تک ناواقف ہیں اور جن کے دلوں میں یہ احساس بھی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ قرآن کریم کو سمجھیں اور اسکے علوم کو سیکھنے کی کوشش کریں۔ قادیان میں سینکڑوں ایسے آدمی ہیں جو کبھی اُس مجلس میں باقاعدگی کے ساتھ نہیں آتے جس میں میں بیٹھتا ہوں۔ اگر آئیں تو وہ باتوں کو یاد رکھنے کی کوشش نہیں کرتے اور اگر وہ خود یاد رکھیں تو دوسروں کو سنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی تھی جن کو ایسی باکمال جماعت ملی جس نے آپ کی باتوں کو سُنا، اُن پر عمل کیا اور پھر اُسے دوسرے لوگوں تک پہنچایا۔ اس میں کوئی

# وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ۝

اور فرش بچھے ہوئے ہوں گے ۱۵ھ

شبہ نہیں کہ ہماری جماعت میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جو صحابہؓ کی طرح دین کی ہر بات کو سیکھنے اس پر عمل کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہاں سب کے سب ایسے تھے یہ ایک ایسی خوبی اور ایسا کمال ہے جس پر ہر قوم کو رشک کرنا چاہیئے اور اپنے آپ کو اُن جیسا بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اسی خوبی کا اللہ تعالیٰ نے زیرِ تفسیر آیت میں ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں میں یہ نہیں ہوگا کہ ایک شخص گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھا ہوا ہو اور باقی لوگ اُس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں بلکہ تمام افراد کو عزت حاصل ہوگی، تمام افراد کو وجاہت حاصل ہوگی، تمام افراد کو عظمت حاصل ہوگی اور تکیے سب کے پیچھے ہوں گے کسی ایک فرد کے پیچھے بڑا سا تکیہ نہیں رکھا ہوگا۔

**۱۵ھ حل لغات۔** زَرَابِیُّ کے معنے نَمَارِق کے بھی ہوتے ہیں اور فرش کے بھی۔ زَرَابِیُّ کا واحد زَرْبِیٌّ بھی ہوتا ہے اور زَرْبِیَّۃٌ بھی (اقرب)

مَبْثُوْثَۃٌ: بَثَّ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور بَثَّ کے معنے ہیں کسی چیز کو پھیلایا (مفردات) اور مَبْثُوْثَۃٌ کے معنے ہوں گے پھیلائے ہوئے۔

**تفسیر۔** زَرَابِیُّ مَبْثُوْثَۃٌ کے یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہر ملک میں عزت بخشیگا اور ہر قوم کے لوگ اُن کو اپنی آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ نَمَارِقُ مَصْفُوْفَۃٌ کے معنے تو یہ تھے کہ اُن کے ہر فرد کو عزت کے مقام پر بٹھایا جائے گا یعنی ساری کی ساری قوم معزز ہوگی یہ نہیں ہوگا کہ کوئی ایک فرد معزز ہو اور باقی لوگ ذلیل ہوں بلکہ ہر ایک کے پیچھے تکیہ لگا ہوا ہوگا۔ اب زَرَابِیُّ مَبْثُوْثَۃٌ میں یہ بتاتا ہے کہ اُن کی دُنیا کے کونہ کونہ اور زمین کے گوشہ گوشہ میں عزت کی جائے گی۔ زَرْبِیَّۃ کے معنے جیسا کہ بتائے جا چکے ہیں فرش کے ہوتے ہیں پس زَرَابِیُّ مَبْثُوْثَۃٌ کے یہ معنے ہوں گے کہ مسلمانوں کے لئے ہر جگہ فرش بچھے ہوئے ہوں گے۔ دنیا کے ہر کونہ میں وہ معزز ہوں گے اللہ تعالیٰ اُن کو ہر جگہ عزت دے گا اور ہر مقام پر اُن کی وجاہت کا لوگوں پر اثر پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نَمَارِق کے لئے مَصْفُوْفَۃ کا لفظ استعمال کیا تھا اور زَرَابِیُّ کے لئے مَبْثُوْثَۃ کا لفظ استعمال کیا ہے مَصْفُوْفَۃ کے معنے ہوتے ہیں صف میں رکھے ہوئے اور مَصْفُوْفَۃ کہنے سے مطلب یہ تھا کہ جب مسلمان مجالس میں حاضر ہوں گے سب کے سب عزت کے مقام پر بیٹھیں گے ان میں سے کوئی ذلیل نہ ہوگا۔ لیکن زَرَابِیُّ میں کسی خاص مجلس کا ذکر نہیں بلکہ عام ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ جہاں جائیں گے لوگ اُن کے رستہ میں فرش بچھائیں گے۔ اُن کا استقبال کریں گے۔ اُن سے عزت کے ساتھ پیش آئیں گے اور چاہیں گے کہ وہ اُن کے گھروں میں رہیں اور اس طرح اُن کے لئے برکت کا باعث بنیں۔

زَرَابِیُّ

لوگ عموماً ظاہر پر مرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ استقبال وہی ہوتا ہے جب بڑی بڑی قالینیں بچھائی جائیں، شاندار دروازے بنائے جائیں، رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگائی جائیں اور ظاہری لحاظ سے نمائش کی جائے حالانکہ اصل استقبال قالین بچھانا نہیں بلکہ آنکھوں کا فرش راہ کرنا ہے۔ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

زَرَابِیُّ مَبْثُوْثَۃٌ سے مراد

حضرتِ واعظ جو آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ

پس لوگوں کے دیدہ و دل کا فرشِ راہ ہونا ہی اصل عزت کی علامت ہے اور اسی کی طرف زَرَابِیُّ مَبْثُوْثَۃ میں

اشارہ کیا گیا ہے اس سے مراد ظاہری زَرَابِیّ نہیں۔ ان ظاہری زَرَابِیّ کی تو صحابہ کو پرواہ بھی نہیں تھی۔

جب ایران کے بادشاہ کے دربار میں صحابہؓ گئے تو وہ اپنے نیزوں کی اَنی اُس کے بڑے بڑے قیمتی قالینوں میں چبھوتے چلے جاتے تھے ایرانی دلوں میں کہتے تھے کہ یہ کیسے بدتہذیب ہیں کہ انہوں نے ہزاروں روپیہ کی قالینیں نیزے مار مار کر خراب کر دیں مگر اُنہیں اسکی کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔ جب بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے تو اُس نے صحابہؓ سے کہا کہ تم کیا جانو کہ سیاست کیا چیز ہوتی ہے بہتر یہ ہے کہ روپیہ لے لو اور واپس چلے جاؤ ناحق اپنی جانوں کو کیوں ضائع کرتے ہو۔ اُس کا خیال تھا کہ عرب روپے لے کر خوش ہو جائیں گے اور لڑائی کا خیال ترک کر دیں گے۔ اُس نے اُن کی جو قیمت لگائی اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بیرونی اقوام اہلِ عرب کے متعلق کیسے ذلیل اندازے لگایا کرتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے عرب اُس زمانہ میں ایسے ہی لالچی اور حریص ہوتے ہوں گے ورنہ اُن کے متعلق وہ ایسا اندازہ کیوں لگاتا۔ اُس نے حکم دیا کہ ہر سپاہی کو ایک ایک اشرفی اور ہر سردار کو دو دو اشرفی دی جائے۔ صحابہؓ نے اُسے کہا اب تو دو صورتوں میں سے ایک ہی صورت ہے یا ہماری موت یا تمہاری موت۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اسلام جنگ شروع ہو جانے کے بعد کفر سے صلح کرے۔ یہ سُن کر بادشاہ کو سخت غصہ آیا۔ اُس نے مٹی کا ایک بورا بھروایا اور مسلمانوں کے سردار سے کہا کہ آگے آؤ۔ وہ آگے آئے تو اُس نے وُہ بورا اُن کی پیٹھ پر لدوا دیا اور کہا اِس مٹی کے بورے کے سوا اب تمہیں کچھ نہیں مل سکتا۔ ساتھی صحابہؓ کا خیال تھا کہ اُن کا سردار مٹی کے اُس بورے کو اُٹھانے سے انکار کر دے گا اور کہے گا میں اس ہتک کو برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر انہوں نے آگے بڑھ کر مٹی کا بورا اپنی پیٹھ پر رکھوا لیا جو اُن کے ساتھیوں کو بہت بُرا لگا مگر انہوں نے اس بات کی کوئی پرواہ نہ کی بورا اُٹھایا اور زور سے ایک نعرہ لگا کر اپنے ساتھیوں سے کہا آجاؤ بادشاہ نے خود ایران کی زمین ہمارے حوالے کر دی ہے۔ مشرک تو ہوتا ہی وہمی ہے یہ سنتے ہی بادشاہ کا رنگ زرد ہو گیا اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اُس نے درباریوں سے کہا جلدی جاؤ اور اُن کو پکڑ کر لے آؤ مگر وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر اُس وقت تک دُور نکل چکے تھے اس لئے وہ ناکام واپس آئے۔ دیکھو یہ کیسی لطیف اور بامو قع بات اُس صحابیؓ کو سوجھی باقی صحابہؓ کو اس کا خیال نہیں آیا وہ یہی سمجھتے رہے کہ ہمارے سردار نے اچھا نہیں کیا جو مٹی کا بورا اٹھا لیا مگر جب اُس نے نعرہ لگا کر حقیقت ظاہر کی تب اُنہیں پتہ لگا کہ یہ کیسی لطیف بات تھی۔ پھر دیکھو صحابہؓ جس جگہ بھی گئے لوگوں نے اُن کا عزت سے استقبال کیا۔ یروشلم کا واقعہ ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے پہلے مسلمانوں نے اُسے فتح کر لیا مگر کچھ عرصہ کے بعد دشمن نے بڑے لشکروں سے اُس پر حملہ کر دیا اور مسلمانوں کو یوروشلم چھوڑ کر پیچھے ہٹنا پڑا جب مسلمان لشکر واپس آنے لگا تو یوروشلم کے عیسائی روتے تھے حالانکہ اُس وقت مسلمانوں کا عیسائیوں سے مقابلہ تھا اور عیسائیوں کا اپنا ہم مذہب بادشاہ یوروشلم پر قابض ہو رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ مسلمان لشکر کو شہر کے باہر تک چھوڑنے کے لئے آئے اور ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے تھے کہ خدا تم کو پھر ہمارے ملک میں واپس لائے۔ تو دیکھو اُنکا اپنا ملک تھا۔ اپنی قوم مسلمانوں سے برسرِ جنگ تھی۔ مگر اُنہیں اپنے مذہب کی بادشاہت کے مقابلہ میں ایک غیر قوم کی حکومت اچھی لگتی تھی اور وہ دعائیں کرتے تھے کہ خدا مسلمانوں کو پھر ہمارے شہر میں واپس لائے۔

غرض بتایا کہ مسلمان جہاں جائیں گے لوگ اپنی آنکھیں فرشِ راہ کریں گے اور کہیں گے آئیے اور تشریف رکھئے۔ آخر وہ کونسی چیز تھی جسکی وجہ سے اسلام کو فتح حاصل ہوئی۔

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَإِلَى

کیا وہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کئے گئے ہیں۔ اور آسمان کو

السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝

(نہیں دیکھتے کہ) کس طرح اونچا کیا گیا ہے ۱۶؎

اور مسلمان جہاں گئے پھیلتے چلے گئے اس کی وجہ یہی تھی کہ مسلمان منصف مزاج تھے اور وہ لوگوں کے حقوق کو غصب نہیں کرتے تھے۔ غصّہ سے انسان تب لڑتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ میرا نقصان ہو رہا ہے لیکن جب وہ سمجھتا ہو کہ ہمارے اپنے بادشاہ ظلم کرتے ہیں مسلمان آئے تو انصاف کریں گے اُس وقت وہ دل سے نہیں لڑ سکتا بلکہ عزت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ پس فرماتا ہے مسلمانوں کی حالت یہ ہوگی کہ وہ جدھر جائیں گے لوگ اپنی آنکھیں اُن کی راہ میں بچھائیں گے جس جگہ ٹھہریں گے لوگ تکئے لگائیں گے۔ اُن کے قدموں میں قالینیں بچھائیں گے جیسے گورنروں یا حاکموں کے استقبال کے موقع پر ہوتا ہے اور کہیں گے کہ ہمارے ہاں ہی ٹھہریئے اور آگے نہ جایئے۔

**۱۶؎ حل لغات۔** اِبِلٌ: کے معنے اونٹوں کے ہوتے ہیں لیکن بعض علماء ادب نے اس کے معنے بادل کے بھی کئے ہیں۔ امام راغب نے اپنی کتاب مفردات میں لکھا ہے کہ اس کے معنے اگر بادل کے ہیں تو بھی استعارہ کے طور پر ہیں لُغت میں یہ معنے نہیں ہیں۔ گو بعض ائمہ نے حتیٰ کہ کسائی تک نے کہا ہے کہ اس کے معنے بادل کے ہیں۔ جیسا کہ صاحب محیط کہتے ہیں وَرُوِيَتْ عَنْ أَبِي عَمْرٍو وَأَبِي جَعْفَرٍ وَالْكِسَائِيِّ وَقَالُوا إِنَّهَا السَّحَابُ عَنْ قَوْمٍ مِنْ أَهْلِ اللُّغَةِ۔ لیکن لُغت کی کتب لکھنے والوں نے ان معنوں کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ لغت کے لحاظ سے اس کے حقیقی معنے اونٹوں کے ہی ہیں۔ مَیں بھی پہلے اس آیت میں اِبِل کے معنے اونٹوں کی بجائے بادل کے کیا کرتا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر اِبِل کے معنے یہاں اونٹوں کے ہی کئے جائیں تو پھر اِبِل اور سَمَاء میں جوڑ کیا ہُوا۔ اُس وقت بادل کے معنے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتے تھے لیکن اب جو میں نے غور کیا تو یہی بات ٹھیک نکلی کہ اس آیت میں اِبِل کے معنے اُونٹوں کے ہی ہیں۔ پہلے میں اس آیت پر صرف اِسی آیت کو سامنے رکھ کر غور کرتا رہا ہوں لیکن اب جو میں نے ترتیب آیات کے لحاظ سے غور کیا تو مجھے معلوم ہُوا کہ اُونٹوں کا سماء کے ساتھ تو جوڑ نظر آتا ہے مگر بادل کا کوئی جوڑ نہیں جیسا کہ مفردات والوں اور صاحبِ کشّاف نے لکھا ہے یہ درست معلوم ہوتا ہے کہ اِبِل کے معنے جن لوگوں نے بادل کے کئے ہیں فَعَلیٰ تَشْبِيهِ السَّحَابِ یعنی وہ اس وجہ سے کئے ہیں کہ اونٹ اس طرح اونچے نیچے چلتے ہیں۔ جس طرح بادل چلتا ہے۔ پس چونکہ اِبِل کو چلنے کے لحاظ سے بادلوں سے مشابہت ہوتی ہے اس لئے محاورہ میں اِبِل کا لفظ بادل کے لئے استعمال کیا جانے لگا ورنہ اِبِل کے اصل معنے بادل کے نہیں ہیں۔

اِبِلٌ

**تفسیر۔** أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ میں مضمون نیچے سے اُوپر گیا ہے اور اگلی آیت یعنی وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ میں مضمون اوپر سے نیچے آیا ہے۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہاں دو الگ الگ مضمون بیان ہوئے ہیں۔ ایک مضمون میں نیچے سے اُوپر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور دوسرے مضمون میں

اُوپر سے نیچے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اگر ان آیات میں دو الگ الگ مضمون تسلیم نہ کئے جائیں تو پھر اِبل سماء۔ جبال اور ارض میں کوئی بھی ترتیب نظر نہیں آتی۔ ترتیب کے لحاظ سے مدارج دو ہی طرح بیان کئے جا سکتے ہیں یا نیچے سے اُوپر کی طرف مضمون کو لے جایا جائے یا اُوپر سے نیچے کی طرف۔ اب اس آیت میں پہلے اُونٹوں کا ذکر ہے پھر سماء کا۔ یہاں تک تو ترتیب درست ہے یعنی نیچے سے اوپر کی طرف مضمون لے جایا گیا ہے مگر اس کے بعد پہاڑوں کا ذکر ہے جو نہ سماء سے اُونچے ہیں نہ اُن کے برابر۔ اور اس کے بعد زمین کا ذکر ہے جو پہاڑوں سے اونچی نہیں ہوتی۔

دوسری ترتیب یہ ہوتی ہے کہ اُوپر سے نیچے کی طرف آیا جائے مگر اس لحاظ سے بھی بات نہیں بنتی کیونکہ اونٹ جو چھوٹی چیز ہے اُس کا پہلے ذکر کر دیا گیا ہے اور سماء جو بلند چیز ہے اُس کا بعد میں ذکر کیا گیا ہے گویا نہ یہ ترتیب بنتی ہے کہ اونٹ سب سے نیچا ہو۔ اُس سے اونچا آسمان ہو۔ اُس سے اونچا پہاڑ ہو اور اُس سے اونچی زمین ہو اور نہ یہ ترتیب بنتی ہے کہ اونٹ سب سے اونچا ہو۔ آسمان اُس سے نیچا ہو۔ پہاڑ اُس سے نیچے ہوں اور زمین اُن سے نیچی ہو۔

کبھی کبھی ایک اور رنگ بھی ترتیب کے بیان میں استعمال کر لیا جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ پہلے درمیانی چیز کا ذکر کر دیا جاتا ہے پھر اُن اشیاء کا ذکر کر دیا جاتا ہے جو اُس کے دائیں بائیں ہوں مگر یہاں اِبل کے بعد آسمان کا ذکر دیا گیا ہے۔ آسمان کے بعد پہاڑوں کا اور پہاڑوں کے بعد زمین کا۔ اگر چھوٹی کی چیز کو پہلے بیان کر دیا جاتا اور اس کے بعد ایسی چیزوں کا نام لیا جاتا جو اُس سے کم اونچی ہیں تو خیر کوئی بات بھی تھی مگر بظاہر اس جگہ کوئی اصل بھی مدنظر نہیں رکھا گیا۔ نہ نیچے سے اوپر مضمون گیا ہے نہ اوپر سے نیچے کو مضمون گیا ہے اور نہ درمیان کی کسی چیز کا پہلے ذکر کر کے اس سے تعلق رکھنے والی چیزوں کا بعد میں ذکر کیا گیا ہے۔ پس یا تو ان آیات کو بے ترتیب قرار دینا پڑے گا جو قرآن کریم کی شان کے خلاف ہے یا ان آیات کو دو الگ الگ مثالوں پر مشتمل قرار دینا ہوگا۔ جن میں سے ایک میں نیچے سے اوپر کی طرف مضمون لے جایا گیا ہے اور دوسری میں اوپر سے نیچے کی طرف۔ ایک مثال کے ذریعہ اِبل اور سماء کی آپس میں کوئی نسبت بتائی ہے اور دوسری مثال کے ذریعہ جبال اور ارض کی آپس میں کوئی نسبت بتائی ہے۔ اور میرے نزدیک اِن آیات میں یہی آخری طریق استعمال ہوا ہے۔ اِبل کے معنے اس جگہ اُونٹوں ہی کے ہیں لیکن سماء کے معنے اس جگہ آسمان کے نہیں بلکہ بادل کے ہیں جیسا کہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (الطارق) میں سماء کے معنے بادل کے ہیں۔

۲۔ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ میں کفارِ مکہ کی ذہنیت اِبل سے

اہل مکہ کا طریق تھا کہ وہ ہمیشہ فخر و مباہات سے کام لیا کرتے تھے اور تکبر میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اپنی شان اور وجاہت کا بار بار ذکر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ہم ایسی شان والے۔ ہم اتنا بلند مرتبہ رکھنے والے۔ ہم ایسے اور ہم ویسے مسلمان بھلا ہمارے مقابلہ میں جیت سکتے ہیں۔ اس کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم اپنی شانیں تو بیان کرتے ہو مگر تمہاری حالت بالکل اونٹوں کی سی ہے۔ اونٹ بے شک اونچا ہوتا ہے مگر جانتے ہو وہ ہمیشہ دوسرے کی سواری کے ہی کام آتا ہے بے شک اُس کی کوہان اونچی ہوتی ہے، اس کا قد اونچا ہوتا ہے، اس کی ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں، اُس کا جسم بڑا ہوتا ہے مگر اس کے باوجود وہ ہمیشہ دوسروں کے نیچے رہتا ہے۔ اسی طرح تم خواہ اپنی کس قدر شانیں بیان کرتے رہو تمہیں وہ قویٰ ہی نہیں دئے گئے کہ تم حکومت کر سکو۔ تم ہمیشہ اسی قابل رہو گے کہ لوگ تمہاری گردنوں پر سوار ہوں جیسے اونٹ بے شک اونچا ہوتا ہے مگر اونچا ہونے کے باوجود اُسے نیچا ہونا پڑتا ہے اور ایک دوسرا شخص اس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے۔ پس تم اپنی خوبیاں خواہ کتنی گنتے جاؤ

وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَإِلَى الْأَرْضِ

اور پہاڑوں کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح گاڑے ہوتے ہیں اور زمین کو (نہیں دیکھتے)

كَيْفَ سُطِحَتْ ۝

کہ کس طرح ہموار کی ہوئی ہے ۱۷ھ

تم اِبِل کے مشابہ ہو اور اونٹ ہمیشہ سواری ہی دیتے ہیں اُوپر چلنے والے بادل ہوتے ہیں اُونٹ نہیں ہوتے تم اونٹوں کی طرح ہمیشہ دوسروں کی سواری کے کام آتے رہے ہو کبھی دنیا پر تم نے حکومت نہیں کی۔ لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہؓ سحاب ہیں پس تمہاری اور ان کی آپس میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ یہ بادلوں کی طرح دنیا پر چھا جانے والے ہیں اور تم خواہ کتنے اونچے ہو جاؤ بہرحال تمہاری پیٹھ پر دوسرے لوگ سوار ہوں گے چنانچہ عربوں کو دیکھ لو انہوں نے کئی صدیوں تک دنیا پر حکومت نہیں کی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے اُن کی تاریخ محفوظ ہے اور اس سے پتہ لگتا ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کے محکوم چلے آتے تھے کسی قسم کا غلبہ اُن کو حاصل نہیں ہُوا تھا لیکن وہی قوم جو پچیس سو[۲۵۰۰] سال سے بالکل ذلیل چلی آتی تھی جس کو ہر لحاظ سے ادنیٰ قرار دیا جاتا تھا۔ جسے دنیا میں کہیں غلبہ حاصل نہ تھا اور جس کے افراد کو حکومت کا کوئی شعور نہیں تھا جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں آئی اور آپ کے دامن کو اس نے چھوُا تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے کہیں کہ کہیں جا پہنچی اور دنیا کی فاتح اور حکمران بن گئی اور بادلوں کی طرح دنیا پر چھا گئی پس آیت میں کفار کو اونٹوں سے مشابہت دی ہے کہ باوجود اونچا ہونے کے سواری کے کام آتے ہیں اور مسلمانوں کو بادلوں سے مشابہت دی ہے کہ نظر نہ آنے والے ذرّوں سے بنتا ہے اور آخر بلند ہو کر دنیا پر چھا جاتا اور اُسے سیراب کر دیتا ہے۔

**۱۷ھ تفسیر**۔ اس آیت میں دوسری مثال بیان کی گئی ہے جس کا مضمون اوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے فرماتا ہے تم پہاڑوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح زمین میں گڑے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ پہاڑوں کا فائدہ اللہ تعالےٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ (الانبیاء ع ۲) ہم نے پہاڑ اس لئے بنائے ہیں کہ زمین ہل نہ جائے اور لوگ تباہ نہ ہو جائیں۔ زمین کی غیر ضروری حرکت کو پہاڑوں نے ہی روکا ہوا ہے ورنہ بنی نوع انسان کا زمین میں قیام بالکل ناممکن ہو جاتا۔ اللہ تعالےٰ گزشتہ مضمون کے تسلسل میں کفار کو توجہ دلاتا ہے کہ تم اپنے دلوں میں خیال کرتے ہو کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ مسلمان غالب آجائیں اور ہم مغلوب ہو جائیں۔ ہم طاقتور اور بڑی عزت اور شان رکھنے والے ہیں یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہم قوم اور ہمارے ہم مذہب ہم کو چھوڑ کر ان کے پیچھے دوڑنے لگ جائیں۔ مگر تمہارا یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ تم بے شک اچھے ہوگے مگر تمہاری اور مسلمانوں کی حالت میں جو کچھ فرق ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو ہم نے اپنی مشیت کے ماتحت پہاڑ بنایا ہے اور تم کو زمین بنایا ہے۔ زمین پہاڑوں کے ذریعہ ہی قائم رہتی ہے اگر پہاڑ نہ ہوں تو زمین بھی اس حالت میں نہ رہے۔ پس بے شک تم میں خوبیاں ہیں اس سے ہم انکار نہیں کرتے۔ جس طرح زمین میں بھی خوبیاں پائی جاتی ہیں اور کوئی شخص اُن خوبیوں سے انکار نہیں کر سکتا مگر زمین یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ اُسے پہاڑوں کی ضرورت نہیں

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ۝

پس نصیحت کر کہ تُو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے شلہ تُو اِن (لوگوں) پر داروغہ (کے طور پر) مقرر نہیں ہے

إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ۝

مگر جس نے پیٹھ پھیر لی اور کفر کا مرتکب ہُوا ۱۹ھ

یا پہاڑوں کے بغیر بھی اُس کی زندگی قائم رہ سکتی ہے۔ زمین کی زندگی پہاڑوں کے بغیر قطعی طور پر ناممکن ہے۔ اسی طرح اب جبکہ مسلمانوں کو اللہ تعالےٰ نے پہاڑ بنا دیا ہے تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ زمین کی طرح اُن کے مقابلہ میں نیچے جاؤ۔ جس طرح زمین پہاڑ کے مقابلہ میں نیچے رہ کر ہی فائدہ اٹھاتی ہے اس کے بغیر نہیں اسی طرح تمہارا فائدہ بھی اسی میں ہے کہ تم مسلمانوں کے مقابلہ میں کھڑے نہ ہو۔

مسلمانوں کی مثال پہاڑوں سے اور کفار کی مثال زمین سے

اگر پہاڑ کی اونچائی کے لحاظ سے اس مثال کو مسلمانوں پر چسپاں کیا جائے تو پھر معنے یہ ہوں گے کہ مسلمانوں کی مثال پہاڑوں کی طرح ہے اور تمہاری مثال زمین کی طرح۔ ان مسلمانوں کے ذریعہ ہی اب دنیا سے فتنہ وفساد دُور ہوگی۔ بے شک زمین سرسبز وشاداب ہوتی ہے اور کئی قسم کی روئیدگیاں اس میں پیدا ہوتی ہیں مگر انہی پہاڑوں کے ذریعہ۔ کیونکہ وہی بادلوں کے برسنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور وہی دریاؤں کا منبع ہیں پس اب تمہاری ترقی مسلمانوں کے ساتھ وابستہ ہے اِن سے جدا ہو کر تم کچھ نہیں پا سکتے۔

**۱۸ھ تفسیر۔** فرماتا ہے جبکہ تمام ترقیات اور فوائد مسلمانوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں شامل ہو کر ہی ہر قسم کی برکات کا حصول انسان کے لئے ممکن ہے خدا نے اُن کو بادلوں کی طرح دنیا پر چھا جانے والا اور پہاڑوں کی طرح زمین کے فتنہ وفساد کو دور کرنے والے اور ہر قسم کے فوائد لوگوں کو پہنچانے والے بنایا ہے تو پھر اے مسلمانو! تمہارا بھی فرض ہے کہ تم مخالفین اسلام کو سمجھاؤ اور اُنہیں کہو کہ وہ بھی اسلام کو قبول کرلیں اُونٹ بن کر انہوں نے کیا لینا ہے۔ اگر بننا ہے تو بادل بنیں اور پہاڑوں کی طرح دنیا کو فائدہ پہنچائیں اور زمین کی طرح دوسری اقوام کے پاؤں تلے روندے نہ جائیں:

**۱۹ھ حل لغات۔** اَلْمُصَيْطِرُ سین سے بھی لکھا جاتا ہے اور صاد سے بھی ہے۔ اور اَلْمُصَيْطِرُ بھی ہے اور اَلْمُتَصَيْطِرُ بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنے ہیں اَلرَّقِيْبُ۔ اَلْحَافِظُ وَالْمُتَسَلِّطُ عَلَى الشَّيْءِ يُشْرِفُ عَلَيْهِ وَيَتَعَهَّدُ اَحْوَالَهُ وَيَكْتُبُ عَمَلَهُ وہ شخص جو کسی کی پوری نگرانی کرے اُس کے حالات کو دیکھتا رہے اور اُس کے اعمال کو لکھتا رہے (اقرب) پس لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ کے یہ معنے ہوئے کہ خدا نے تمہیں اُن پر مُصَيْطِر نہیں بنایا اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ سوائے اُس کے جو تولّی اختیار کرتا اور کفر میں مبتلا رہتا ہے۔ یہاں اِلَّا استثناء منقطع کے معنے دیتا ہے متصل کے نہیں۔ یعنی تُو کسی کا مصیطر نہیں اُن کا بھی نہیں جو تولّی اور کفر اختیار کریں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جو تولّی کریں گے اور باوجود سمجھانے کے کفر میں مبتلا رہیں گے اُن سے بھی تیرا واسطہ نہیں ہے۔ جن کے دلوں میں سعادت ہے انہی لوگوں نے تجھے ماننا ہے مگر نہ تجھے ماننے والوں پر مصیطر بنایا گیا ہے اور نہ انکار کرنیوالوں پر اور تولّی اور کفر اختیار کرنیوالوں پر مصیطر بنایا گیا ہے تیرا اُن سے کوئی واسطہ نہیں وہ اگر نہیں مانتے تو نہ مانیں اُن کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔

**تفسیر۔** رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مصیطر نہ ہونا دونوں لحاظ سے ہے مومنوں کے لحاظ سے بھی اور

کافروں کے لحاظ سے بھی۔ یعنی آپ نہ مومنوں کیلئے مُصَیْطِر ہیں اور نہ کفار کے لئے مُصَیْطِر ہیں۔ کفار کو اگر جبراً مذہب میں شامل بھی کیا جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ظاہر میں تو مذہب قبول کرلیں گے لیکن دل میں منافق رہیں گے اس لئے اللہ تعالیٰ نے لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ کہکر غیر مذاہب والوں کو جبراً اسلام میں شامل کرنے کی ممانعت فرمادی ہے اور بتایا ہے کہ ہم نے تمہیں اُنکا داروغہ مقرر نہیں کیا۔ اگر تم جبر سے کام لوگے تو اس سے نہ مومن کو فائدہ ہوگا نہ کافر کو۔ کافر کو تو اس لحاظ سے فائدہ نہیں ہوگا کہ اگر وہ تلوار کے ڈر سے مسلمان ہو بھی جائے تو بہرحال وہ منافق مسلمان ہوگا اور منافق کافر سے بدتر ہوتا ہے۔ مومنوں کو اس لئے فائدہ نہ ہوگا کہ منافق اُن کی طاقت کو کمزور کرنے والے ہوں گے بڑھانے والے نہیں۔ مومنوں پر مصیطر اس لئے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضاء ایسے ہی اعمال کے نتیجہ میں انسان کو حاصل ہو سکتی ہے جو دلی شوق اور رغبت سے کئے جائیں۔ جس شخص کے دل میں ذاتی طور پر خدا تعالیٰ کی محبت کا کوئی جوش نہیں، اُس کے احکام پر عمل کرنے کا ولولہ اس کے سینہ میں نہیں پایا جاتا وہ معرفت اور اخلاص کی راہوں سے بیگانہ ہے۔ وہ اگر جبر کے ماتحت کوئی نیک کام کرے گا بھی تو اُس کی رُوح کو پاکیزگی حاصل نہیں ہوگی اور خدا تعالیٰ کے حضور اُس کے وہ اعمال قبولیت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جائیں گے اس لئے فرمایا کہ تمہیں لوگوں کا مصیطر بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ جو شخص کفر کرے اور باوجود سمجھانے کے اپنے بد اعمال سے باز نہ آئے اُسے ہمارے سپرد کرو و تمہارے جبر سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور جو مسلمان ہے اُسے شوق اور رغبت کے ذریعہ سے نیکی میں بڑھاؤ تاکہ اُسے ایمان کا نفع حاصل ہو۔

یہاں بھی دیکھ لو اسلام اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کی کیسے کھلے لفظوں میں پیشگوئی کی گئی ہے۔ مکی زندگی میں جبکہ ابھی اسلام کا ابتداء تھا اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اسلام بہت بڑی طاقت حاصل کریگا یہاں تک کہ کفار کی گردنیں مسلمانوں کے قبضہ میں ہوں گی اور وہ اختیار رکھتے ہوں گے کہ اُن سے جو سلوک چاہیں کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ۔ یہ صاف بات ہے کہ مکہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی ایسی طاقت حاصل نہیں تھی کہ آپ کو یہ کہا جاتا کہ تجھے ہم نے مصیطر بنا کر نہیں بھیجا۔ یہ آئندہ کے متعلق پیشگوئی کی گئی تھی اور اسلام کے غلبہ کی خبر دی گئی تھی ورنہ وہ لوگ جن کو مکہ میں کھلے بندوں نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی اُن کو یہ کہنا کہ تمہیں زبردستی کسی کو مسلمان بنانے کی اجازت نہیں ایک مضحکہ خیز بات ہو جاتی ہے۔ یہ فقرہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ دن آنے والا ہے جبکہ مسلمانوں کو اتنی طاقت حاصل ہو جائے گی کہ وہ اگر چاہیں تو زبردستی لوگوں کو مسلمان بنا سکیں گے مگر پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے بطور نصیحت فرمادیا کہ تم ایسا نہ کرنا۔

لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ میں غلبۂ اسلام کی پیشگوئی

غرض لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ ۝ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی وَ کَفَرَ میں غلبۂ اسلام کی پیشگوئی پائی جاتی ہے اور یہ بات ایسی ہے کہ عیسائی مصنفین کو بھی کھٹکی ہے چنانچہ ویری اس آیت کے ماتحت لکھتا ہے آپؐ کے دل میں شروع سے ہی حکومت کے خیالات اُٹھ رہے تھے چنانچہ ابتدائی زمانہ میں ہی اس قسم کی آیات مکہ والوں کو سُنانا بتا رہا ہے کہ انہوں نے شروع سے ہی حکومت کا نقشہ اپنے ذہن میں جمایا ہُوا تھا اور ویسے ہی خیالات دل میں پیدا ہوتے رہتے تھے مگر سوال یہ ہے کہ حکومت کے خیالات آخر کسی وجہ سے پیدا ہُوا کرتے ہیں بغیر کسی وجہ کے پیدا نہیں ہو سکتے۔ وہ شخص جو ماریں کھا رہا ہو، جو لوگوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا ہُوا ہو، جو اتنی طاقت بھی نہ رکھتا ہو کہ باہر نکل کر خدا تعالیٰ کی عبادت کر سکے اُس کے دل میں حکومت کے خیالات پیدا ہی کس طرح ہو سکتے ہیں اور پھر خود ساختہ خیالات پورے کس طرح ہو گئے۔

فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ۝ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۝

اس کے نتیجہ میں اللہ اُسے سب سے بڑا عذاب دے گا ۲۰؎ یقیناً انہیں ہماری ہی طرف لوٹنا ہے

ع ۱ ۱۳

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝

پھر اُن سے حساب لینا بھی یقیناً ہمارا ہی کام ہے ۲۱؎

درحقیقت یہ ایک پیشگوئی تھی اور اللہ تعالےٰ نے بتایا تھا کہ گو اس وقت تمہاری کوئی حیثیت نہیں مگر ایک زمانہ میں تم کو ایسا غلبہ حاصل ہونے والا ہے کہ تم جو چاہو گے کر سکو گے مگر دیکھنا جب تمہیں غلبہ میسر آئے اُس وقت اِن لوگوں پر جبر نہ کرنا بلکہ اِن کو اپنے حال پر چھوڑ دینا جو شخص ایمان لے آئے اُسے اپنے اندر شامل کر لینا اور جو تولّی اور کفر کرے اس کی پرواہ نہ کرنا۔

۲۰؎ **تفسیر**۔ تولّی اور کفر کرنے والوں کو بہت بڑا عذاب دئے جانیکی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک بڑی ہدایت کا انکار کیا۔ سزا ہمیشہ جرم کے مطابق دی جاتی ہے معمولی قصور ہو تو معمولی سزا دی جاتی ہے اور زیادہ قصور ہو تو زیادہ سزا دی جاتی ہے۔ ان کا جرم چونکہ معمولی نہیں ہو گا اس لئے اُنہیں سزا بھی غیر معمولی دی جائیگی کیونکہ انہوں نے اُس رسول کا انکار کیا جو تمام رسولوں سے بڑا تھا اور جس کی شریعت تمام شریعتوں سے بڑی تھی۔

۲۱؎ **حل لغات**۔ اِیَابٌ: اٰبَ کا مصدر ہے اور اٰبَ کے معنے ہیں۔ لوٹا (اقرب) پس اِیَابٌ کے معنے ہوں گے۔ لوٹنا۔

اِیَابٌ

**تفسیر**۔ اس آیت سے اس مضمون کو ختم کیا گیا ہے جو سورۃ الاعلیٰ سے شروع کیا گیا تھا اور بتایا گیا ہے کہ مومن و کافر اپنے اپنے کام پورے کر کے مومن تسبیح کو بلند کر کے اور کافر کفر کی اشاعت کر کے آخر اللہ تعالےٰ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور دنیوی نتائج دیکھکر اُخروی نتائج دیکھنے کے لئے خدا تعالےٰ کے حضور میں حاضر ہوں گے۔

سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ دونوں کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ان کا آپس میں گہرا ربط ہے اس کا ایک ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ احادیث میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى پڑھتے تو فرماتے سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى اور جب سورۃ الغاشیہ کی تلاوت کرتے کرتے اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ پر پہنچتے تو فرماتے اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَّسِيْرًا۔ ایک سورۃ کے شروع میں ایک فقرہ کا دُہرانا اور دوسری سورۃ کے آخر میں دوسرے فقرہ کا دُہرانا صاف طور پر بتا رہا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ دونوں سورتیں مضمون کے اعتبار سے آپس میں جوڑ رکھتی ہیں اسی لئے ایک سورۃ کے ابتداء میں اور دوسری سورۃ کے انتہاء میں ایک فقرہ یہ بتانے کے لئے دُہرانے کہ جو مضمون سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى سے شروع ہوا تھا وہ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ پر آ کر ختم ہو گیا ہے ؛

# سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ

سورۃ فجر۔ یہ سورۃ مکی ہے[1]

## وَهِيَ ثَلٰثُوْنَ اٰيَةً دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور بسم اللہ کے علاوہ اسکی تیس آیتیں ہیں اور ایک رکوع ہے

[1] یہ سورۃ مکی ہے فتح البیان والے لکھتے ہیں ھِیَ مَکِّیَّۃٌ بِلَاخِلَافٍ فِیْ قَوْلِ الْجَمْھُوْرِ۔ جمہور علماء کے نزدیک اسکے مکی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابن عباسؓ۔ ابن زبیرؓ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہی مروی ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۃ الاعلیٰ۔ سورۃ الغاشیہ سورۃ الفجر اور اسی قسم کی بعض اور سورتوں کو عام طور پر فرض نمازوں میں پڑھنا زیادہ پسند فرمایا کرتے تھے۔ نسائی نے جابرؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ ایک دفعہ نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک آدمی اُن کے ساتھ پیچھے سے آکر شامل ہوا حضرت معاذؓ نے نماز لمبی شروع کر دی بعض روایتوں میں آتا ہے کہ انہوں نے سورۃ آل عمران یا سورۃ نساء کی تلاوت شروع کر دی تھی۔ جب نماز لمبی ہوگئی تو اُس نے نماز توڑ کر ایک دوسرے کونہ میں جا کر علیحدہ نماز شروع کر دی اور فارغ ہو کر چلا گیا۔ نماز کے بعد کسی شخص نے حضرت معاذؓ سے اس واقعہ کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے آپ کے ساتھ نماز شروع کی مگر جب آپ نے نماز میں دیر لگا دی۔ تو وہ نماز توڑ کر علیحدہ ہوگیا اور ایک کونے میں نماز پڑھ کر چلا گیا۔ حضرت معاذؓ نے کہا وہ منافق ہوگا پھر انہوں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی اس واقعہ کا ذکر کر دیا اور کہا یا رسول اللہ! میں نماز پڑھا رہا تھا کہ پیچھے فلاں شخص آکر شامل ہوا مگر جب نماز لمبی ہوگئی تو وہ نماز توڑ کر الگ ہوگیا اور علیحدہ نماز پڑھ کر چلا گیا۔ جب اُس شخص کو معلوم ہوا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس میری شکایت کی گئی ہے تو وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے کہا یا رسول اللہ میں آیا تو یہ نماز پڑھا رہے تھے میں اِن کے ساتھ نماز میں شامل ہوگیا مگر انہوں نے نماز لمبی کر دی۔ آخر ہم کام کرنے والے آدمی ہیں میری اونٹنی بغیر چارہ کے کھڑی تھی میں نے نماز توڑ کر مسجد کے ایک کونے میں اپنی نماز ختم کر لی اور پھر گھر جا کر اپنی اونٹنی کو چارہ ڈالا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سنکر حضرت معاذؓ پر ناراض ہوئے اور اُن سے فرمایا معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالتے ہو تمہیں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى اور وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا اور وَالْفَجْرِ اور وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى کے پڑھنے میں کیا تکلیف ہوتی تھی تم نے یہ سورتیں کیوں نہ پڑھیں اور لمبی سورتیں کیوں شروع کر دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن سُورتوں کو اوسط سورتوں میں قرار دیا ہے۔ خاص اوقات میں انسان بے شک لمبی سورتیں پڑھے یا تکلیف اور بیماری کی صورت میں چھوٹی سورتیں پڑھ لے لیکن اوسط سورتیں یہی ہیں جن کو عام طور پر بالجہر نمازوں میں پڑھنا چاہیئے۔

**سورۃ الفجر مکی ہے**

**سورۃ الفجر کا زمانہ نزول**

اس سورۃ کی نسبت یوروپین مفسرین کا خیال ہے کہ یہ ابتدائی سالوں کی ہے اور میرے نزدیک یہی درست ہے۔ نولڈکے جرمن محقق اِسے سورۃ الغاشیہ کے مابعد کی قرار دیتا ہے اور غاشیہ کی نسبت یوروپین مفسرین کی رائے میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ اسے تیسرے اور چوتھے سال کے ملتے ہوئے حصّوں کی قرار دیتے ہیں یعنی اُن کے نزدیک یہ سورۃ یا تیسرے سال کے آخری نصف میں نازل ہوئی ہے یا چوتھے سال کے پہلے نصف میں نازل ہوئی ہے اور یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان سورتوں میں مخالفت کی ابتداء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے منظم اور تفصیلی مخالفت کا اس میں

ذکر نہیں بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ مخالفت ہونے والی ہے اور یہ وہی زمانہ تھا جو تیسرے سال کا آخری یا چوتھے سال کا شروع تھا۔ وہ تفصیلی مخالفت جس کا ذکر اُن سورتوں میں ہے جو مخالفت کے بعد اُتریں اُن کا ذکر یہاں نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں کفار کے وہ عیوب گنائے گئے ہیں جو اخلاقی، شرعی اور دینی ہوتے ہیں مثلاً یتامیٰ کی خبرگیری کیوں نہیں کرتے، مساکین کو کھانا کیوں نہیں کھلاتے۔ اس قسم کے عیوب ہر زمانہ میں ہی گنائے جاتے ہیں لیکن جب نبوت کی کھلی مخالفت شروع ہو اُس وقت زیادہ زور انکارِ نبوت کے جرم پر دیا جاتا ہے اور اس جرم کو باقی تمام جرائم کی اساس اور بنیاد سمجھا جاتا ہے اُس وقت تفصیلی جرائم کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ جب تک لوگ نبی کی مخالفت نہیں کرتے اُس وقت تک اُن کے اور نقائص پر زور دیا جاتا ہے مثلاً انہیں کہا جاتا ہے کہ تم یتامیٰ سے حسنِ سلوک نہیں کرتے، بیواؤں کی خبرگیری نہیں کرتے، مساکین کے ساتھ ہمدردی کے ساتھ پیش نہیں آتے، اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے۔ لیکن جب وہ مامور کی مخالفت کرتے ہیں تو سارا زور اس بات پر صرف کر دیا جاتا ہے کہ سب سے بڑا عیب تم میں یہ ہے کہ تم ایک نبی کے منکر ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان بالرسالت تمام اعمالِ صالحہ کے لئے ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ جب لوگ نبی کو ماننے لگ جاتے ہیں تو ان کی اخلاقی اصلاح آپ ہی آپ ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ کفار جب نبی کی مخالفت اُس کے دعویٰ کے متعلق زور شور سے شروع کر دیتے ہیں تو اُن کا یہ جرم باقی تمام جرائم سے بڑھ جاتا ہے کیونکہ سب نیکیاں نبیوں سے شروع ہوتی ہیں نبی کے انکار کا جرم سب نیکیوں کے انکار کا موجب ہوتا ہے اس لئے اُس وقت زیادہ زور اسی انکارِ نبوت کے جرم پر دیا جاتا ہے کیونکہ اس کی اصلاح باقی سب باتوں میں اصلاح کر واسکتی ہے۔ مگر اس سے پہلے کے عرصہ میں جب دعویٰ کا ابتداء ہوتا ہے تفصیلی نقائص کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ بعد میں تفصیلات کا ذکر نہیں ہوتا۔ ذکر تو ہوتا ہے لیکن اُن پر زور کم کر دیا جاتا ہے کیونکہ ایک ہی اصلاح کے ساتھ سب امور کی اصلاح وابستہ ہونے سے تفصیلات کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

ہم نے دیکھا ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر لوگ ہمیشہ یہ اعتراض کیا کرتے تھے کہ آپ اِن باتوں پر تو زیادہ زور دیتے ہیں کہ مجھے یہ الہام ہوا ہے وہ الہام ہوا ہے مگر اور امور کی طرف توجہ نہیں کرتے آپ اس کے جواب میں فرمایا کرتے تھے کہ سارے نقائص اور عیوب خدا تعالےٰ سے بُعد کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر لوگوں کو خدا تعالےٰ کی ذات کے متعلق کامل یقین پیدا ہو جائے تو اُن سے گناہ سرزد نہ ہوں۔ میں لوگوں کے سامنے خدا تعالےٰ کے تازہ بتازہ الہامات اور اس کے نشانات و معجزات کو بار بار اس لئے پیش کرتا ہوں کہ اُن کے دلوں میں خدا تعالےٰ کے متعلق یقین پیدا ہو جائے جس دن اُن کے دلوں میں سچا یقین پیدا ہوا اور انہوں نے مجھے مان لیا یہ عیوب آپ ہی آپ دُور ہو جائیں گے۔ غرض جب تک لوگ نبوت کی کھلی مخالفت نہیں کرتے جزئیات کی طرف زیادہ توجہ دلائی جاتی ہے اور انہیں کہا جاتا ہے کہ تم میں یہ بھی نقص ہے وہ بھی نقص ہے۔ مگر جب وہ کھلے بندوں نبی کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں جب وہ کہتے ہیں ہم اس نبی کو اور اس نبی کے ماننے والوں کو کچل کر رکھ دیں گے اُس وقت اُن کے اُس نقص کو جو بنیادی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام پر ایمان میں کمی، اُسے سامنے رکھ کر اسکی اصلاح پر زور دیا جاتا ہے اور اسی میں باقی تمام جزئیات کی اصلاح آجاتی ہے۔

اس سورۃ میں بھی کفار کے تفصیلی گناہوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ یتامیٰ کی طرف

توجہ نہیں کرتے، مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے، اُن کے دلوں میں یہ حرص پائی جاتی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ مال اپنے پاس جمع کر لیں۔ یہ نقائص اُن کے ایمان کی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں اس کی اصلاح ہونی چاہیئے۔ اِن تفصیلات سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ سورۃ اُس وقت کی ہے جب ابھی قومی طور پر مخالفت شروع نہیں ہوئی تھی اسی لئے اِس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے انکار پر اتنا زور نہیں جتنا اعمال کی جزئیات پر زور ہے بالخصوص ایسے گناہوں پر جو اسلام کے مقابلہ کے وقت اسلام کی شوکت اور اُن کی تباہی کا موجب ہونے والے تھے پس یہ سورۃ یقیناً ابتدائی ایام کی ہے اور چونکہ اس میں اشارۃً یہ ذکر آتا ہے کہ اب منظم مخالفت ہونے والی ہے اس لئے یہ سورۃ تیسرے سال کے آخر یا چوتھے سال کے بالکل ابتدائی حصہ کی ہے۔

**ترتیبِ سُورۃ** ابوحیان کہتے ہیں کہ سورۃ غاشیہ میں وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ میں کچھ لوگوں کے متعلق ذکر کیا گیا تھا کہ وہ ذلیل اور رُسوا ہوں گے۔ اب اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو یتامیٰ کی خبرگیری نہیں کرتے۔ مساکین کی طرف توجہ نہیں کرتے اور حریص اور لالچی ہیں۔ اسی طرح وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ میں ایک اور گروہ کا ذکر کیا گیا تھا جو اللہ تعالےٰ کے حضور عزت پانے والا تھا اس سورۃ میں اُس کا ذکر يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کے ذریعہ کیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں ذکر اس سورۃ میں موجود ہیں اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان دونوں سوروں میں سے ایک کا تعلق وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ سے ہے اور دوسرے کا تعلق وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ سے ہے مگر یہ صرف قریبی تعلق ہے یعنی پہلی سورۃ کے بعض مضامین سے اس سُورۃ کے بعض مضامین کا باہمی رابطہ ملتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر مضمون کا وہ تسلسل جو ایک زنجیر کی طرح دونوں میں پایا جانا چاہیئے وہ انہوں نے نہیں بتایا۔ جہاں تک قریبی تعلق کا سوال ہے ابوحیان نے خوب کام کیا ہے اور وہ اکثر تعلقاتِ سور کے بارہ میں بڑی نگاہ رکھنے والے انسان ہیں بلکہ اس امر میں تمام پُرانے مفسروں سے منفرد ہیں اور ممتاز بھی۔ مگر اس قریبی تعلق کے علاوہ قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں میں ایک مسلسل زنجیر بھی معلوم ہوتی ہے جو دُور دُور تک مضامین کی لڑی پروتی چلی جاتی ہے اور بالآخر سارے قرآن کریم کو ایک ہی ہار بنا کر رکھ دیتی ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وحی کی مثال صَلْصَلَةُ الْجَرَسِ سے دی ہے جس میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ جس طرح گھنٹی کی جھنکار میں ایک تسلسل ہوتا ہے اسی طرح وحی ایک مربُوط اور مسلسل الٰہی کلام ہوتا ہے اور چونکہ قرآن کریم وہ کلام ہے جو تمام الٰہی کلاموں میں سے افضل ہے اس لئے وحی الٰہی کی صَلْصَلَةُ الْجَرَسِ سے تشبیہ دے کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ قرآن کریم کو بے ترتیب نہ سمجھنا یہ خدا تعالیٰ کی وحی ہے اور اس کا ہر حصہ دوسرے حصہ سے پرویا ہوا ہے۔ اس وسیع اور لمبے سلسلہ کی طرف علامہ ابوحیان کی نظر نہیں گئی مگر پھر بھی اُن کی خدمت ترتیبِ قرآن کریم کے بارہ میں بہت قابلِ قدر اور قابلِ ستائش ہے جَزَاهُ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ

جیسا کہ میں نے اُوپر بتایا ہے سورتوں کے باہمی تعلق دو قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ ایک قریبی تعلق جس میں یہ مدنظر رکھا جاتا ہے کہ ایک سورۃ کی آخری آیت کا مضمون دوسری سورۃ کی پہلی آیت سے ملا دیا جائے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے سورۃ فاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کہہ کر ہدایت کے متعلق دعا مانگی گئی تھی اس کے بعد سورۃ بقرہ شروع ہوئی تو ابتداء میں ہی کہہ دیا گیا کہ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ گویا سورۃ فاتحہ

میں جو ہدایت طلب کی گئی تھی سورۃ بقرہ کے شروع میں اُس ہدایت کی نسبت بتا دیا کہ جو کچھ تم مانگ رہے تھے وہ یہ ہے اِس قسم کے تعلقات جو باہم سورتوں میں پائے جاتے ہیں قریبی تعلق کہلاتے ہیں۔ لیکن سورتوں کا ایک تعلق سارے مضمون کے لحاظ سے ہوتا ہے اور مسلسل ایک قسم کا مضمون کئی سورتوں میں چلتا چلا جاتا ہے۔ اس تعلق کے لحاظ سے اگر سورتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض جگہ پانچ پانچ اور بعض جگہ دس دس سورتوں کا ایک گروپ ہوتا ہے اور اُن کا مضمون زنجیر کے تسلسل کی طرح آپس میں ملتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ جو مضمون اس سورۃ کو چند پچھلی سورتوں کے مجموعہ کا ایک فرد بنا دیتا ہے اس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ان چند سورتوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت دو زمانوں کے لحاظ سے بیان کی جا رہی ہے یہ مضامین سورۃ تکویر سے شروع ہیں اور ان میں بتایا جا رہا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے محض اس زمانہ میں ہی ثبوت مہیا نہیں ہوں گے بلکہ جب بھی اسلام کمزور ہوگا اس صداقت کے ثبوت اللہ تعالےٰ کی طرف سے مہیا کئے جائیں گے۔ اسی تسلسل میں سورۃ بروج میں بتایا گیا تھا کہ آخری زمانہ میں دنیا کی خرابی کے وقت ایک بدر پیدا ہوگا مگر چونکہ اس سے یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ نورِ محمدی کو دنیا کو فائدہ دے گا مگر رہے گا اوجھل اور براہِ راست نظر نہ آئے گا اس لئے اس شبہ کا ازالہ سورۃ طارق میں کیا اور بتایا کہ آنے والا موعود دو الگ الگ نام رکھے گا بدر بھی اور طارق بھی۔ یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جلال کو وہ براہِ راست ظاہر کرے گا یہ نہیں ہوگا کہ لوگ صرف سُن کر ایمان لائیں گے بلکہ وہ ایسی جماعت پیدا کرے گا جس کا خدا تعالےٰ سے براہِ راست تعلق ہوگا اور وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے انوار اور آپ کی برکات اپنی ذات میں مشاہدہ کریں گے۔ گویا سورۃ بروج میں مسیحیت موعودہ کی پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اور سورۃ طارق میں مہدویت مبشرہ کی پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ پھر میں نے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى اور سورۃ الغاشیہ کا آپس میں تعلق بتاتے ہوئے ذکر کیا تھا کہ یہ دونوں سورتیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں بالالتزام پڑھا کرتے تھے اور یہ دونوں سورتیں ایسی ہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ترقی اور آنے والے موعود کی خبر یکجائی طور پر اپنے اندر رکھتی ہیں یا اگر ایک ٹکڑہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکر آتا ہے تو بعد کے ٹکڑہ میں آنے والے موعود کا ذکر کیا گیا ہے۔ یا مثال تو ایک ہی دی ہے مگر وہ مثال ایسی ہے جو وہاں بھی چسپاں ہو جاتی ہے اور یہاں بھی چسپاں ہو جاتی ہے گویا دو دھاری تلوار ہے جس سے رسول کریم صلے اللہ وسلم کے زمانہ کے مخالفین پر بھی حجت تمام ہو جاتی ہے اور بعد میں پیدا ہونے والے مخالفین پر بھی حجت تمام ہو جاتی ہے۔ اسی سلسلہ میں مَیں نے بتایا تھا کہ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى میں بھی آنے والے موعود کی ضرورت بیان کی گئی ہے اور خبر دی گئی ہے کہ اس زمانہ میں قرآن کریم کا ظاہر تو باقی ہوگا مگر اُس کا مغز نہیں ہوگا۔ تب اُس موعود کے ذریعہ اللہ تعالیٰ قرآنی علوم کو دنیا میں پھر زندہ کرے گا اور پھر اُس کے مغز کو دنیا میں واپس لائے گا۔ اسی طرح وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ میں دونوں زمانوں کی مخالفت اور اسلام کی ترقی کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جب بھی اسلام پر کمزوری کا زمانہ آئے گا اللہ تعالےٰ کی طرف سے اُس کمزوری کو دور کرنے کا سامان کیا جائے گا۔ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی اگر ہو سکتی ہے تو اِسی ذریعہ سے، اس کے بغیر اُن کی ترقی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ مضمون ہے جو مسلسل کئی سورتوں سے چلا آرہا ہے اور جس کی وجہ سے ہر سورۃ اپنے سے پہلی سورۃ سے بالکل مربوط نظر آتی ہے۔

دوسرا تعلق جو اس سورۃ کو پہلی سورۃ سے حاصل ہے

یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں بتایا گیا تھا کہ اسلام کا مقابلہ کفارِ مکہّ کریں گے اور ہر قسم کی تدابیر اسلام کے خلاف کرینگے لیکن کامیاب نہ ہوں گے بلکہ اُن کے مقابل پر مسلمان کامیاب ہوں گے۔ دوسرے یہ بتایا تھا کہ آئندہ بھی اسلام پر جب کبھی خطرناک وقت آئے گا خدا تعالےٰ اسلام کی مدد کریگا اور اُس کے مخالف آخر شکست کھائیں گے۔ اس سورۃ میں اِس مضمون کی مزید وضاحت کی گئی ہے اور تفصیل بھی بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ وُجُوۡہٌ جو خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ کے مصداق ہوں گے کس طرح عمل اور محنت کریں گے اور کس طرح اللہ تعالےٰ اُن وُجُوہ کو دنیا میں پیدا کرے گا جو نَّاعِمَةٌ لِّسَعۡيِهَا رَاضِيَةٌ کے مصداق ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ نبوت کے تیسرے سال میں تو یہ دونوں وُجُوۡہ پوشیدہ تھے نہ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ اور نہ نَّاصِبَةٌ پائے جاتے تھے کیونکہ منظم مخالفت ابھی کفارِ مکہّ نے شروع نہیں کی تھی اور نہ یہ پتہ تھا کہ نَّاعِمَةٌ وُجُوۡہ کون ہوں گے اور کہاں سے آئیں گے کیونکہ مومنوں کی تعداد گنتی کے چند افراد پر مشتمل تھی۔ ایسے وقت میں اللہ تعالےٰ اس سورۃ میں پیشگوئی فرماتا ہے کہ کفار کی مخالفت کیسا شدید رنگ اختیار کرے گی اور کس طرح مسلمانوں کی ترقی اور رفعت ہوگی۔ اسی طرح بعد میں جب خود مسلمان بگڑیں گے اور اسلام سے دور ہو جائیں گے تو اُس وقت خدا تعالےٰ کس رنگ میں اپنی نصرت ظاہر کریگا۔

مَیں اس مقام پر اللہ تعالےٰ کی تائید کے ایک تازہ واقعہ کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قرآن کریم کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں مضامین ایسے ہیں جو اللہ تعالےٰ نے اپنے خاص فضل سے القاء اور الہام کے طور پر مجھے سمجھائے ہیں اور میں اس بارہ میں اللہ تعالےٰ کے انعامات کا جس قدر بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ اُس نے کئی ایسی آیات جو مجھ پر واضح نہیں تھیں اُن کے معانی بطور وحی یا القاء میرے دل پر نازل کئے اور اس طرح اپنے خاص علوم سے اُس نے مجھے بہرہ ور کیا۔ مثال کے طور پر میں سورۂ بقرہ کی ترتیب کو پیش کرتا ہوں۔ میں ایک دن بیٹھا ہُوا تھا کہ یکدم مجھے القاء ہُوا کہ فلاں آیت اس کی کُنجی ہے اور جب میں نے غور کیا تو اس کی تمام ترتیب مجھ پر روشن ہو گئی۔ اِسی طرح سورۂ فاتحہ کے مضامین مجھے القاءً اور الہاماً اللہ تعالےٰ کی طرف سے رویاء میں بتائے گئے تھے۔ اس کے بعد خدا تعالےٰ نے میرا سینہ سورۂ فاتحہ کے حقائق سے لبریز فرما دیا۔ قرآن کریم کی ترتیبیں بیسیوں آیات کے متعلق خدا تعالےٰ کی طرف سے بطور القاء مجھے سمجھائی گئی ہیں مثلاً سورۂ بروج اور سورۂ طارق کا یہ جوڑ کہ ان میں سے ایک سورۃ میں مسیحیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور دوسری سورۃ میں مہدویت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ بھی اُن مضامین میں سے ہے جو لوگوں کی نگاہ سے مخفی تھے مگر اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ اُن کو ظاہر فرمایا اور مجھے وہ دلائل دئے جن سے میں اپنے اس استدلال کو پوری قوت کے ساتھ ثابت کر سکتا ہوں اور کوئی منصف مزاج اُن دلائل کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ عقلی طور پر اُسے بہرحال ماننا پڑے گا کہ میرا دعویٰ دلائل پر مبنی ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ کہدے کہ میں اِن دلائل کو تسلیم نہیں کرتا لیکن اُسے یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ میں نے جو دعویٰ کیا ہے اُس کے دلائل اور وجوہ موجود ہیں۔

سورۃ الفجر کا تعلق پہلی سورۃ سے

غرض قرآن کریم کی کئی مشکل آیات کے معانی اللہ تعالےٰ نے اپنے القاء اور الہام کے ذریعہ مجھ پر منکشف فرمائے ہیں اور اس قسم کی بہت سی مثالیں میری زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ اُنہی مشکل آیات میں سے میرے لئے ایک یہ سورۃ بھی تھی۔ میں جب بھی سوچتا اور غور کرتا مجھے اس کے معانی کے متعلق تسلّی نہیں ہوتی تھی بلکہ ہمیشہ دل میں ایک خلش سی پائی جاتی تھی اور مجھے بار بار یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ جو معانی بتائے جاتے ہیں وہ قلب کو مطمئن کرنے والے نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مفسرین نے

بہت سے معانی کئے ہیں جو لوگوں کی نگاہ میں اس سورۃ کو حل کر دیتے ہیں مگر میری اپنی نگاہ میں وہ اطمینان بخش معانی نہیں تھے اور اس لئے ہمیشہ ایک بے چینی سی میرے اندر پائی جاتی تھی میں سوچتا اور غور کرتا مگر جو بھی معنے میرے ذہن میں آتے جن کو مزید غور کے بعد میں خود ہی رد کر دیتا کہ کہتا کہ یہ درست نہیں ہیں آخر بڑی مدتوں کے بعد ایک دفعہ جب میں عورتوں میں قرآن کریم کے آخری پارہ کا درس دینے لگا تو اس کا ایک حصہ حل ہو گیا مگر پھر بھی جو حل ہوا وہ صرف ایک حصہ ہی تھا مکمل مضمون نہیں تھا جو معنے مجھ پر اُس وقت روشن ہوئے اُن سے چاروں کھونٹے قائم نہیں ہوتے تھے دو تو بن جاتے تھے مگر دو رہ جاتے تھے یہ حالت چلتی چلی گئی اور مجھے کامل طور پر اس کے معانی کے متعلق اطمینان حاصل نہ ہوا۔

اب جو میں نے درس دینا شروع کیا تو پھر یہ سورۃ میرے سامنے آگئی اور میں نے اس پر غور کرنا شروع کر دیا۔ میں نے آخری پارے کا درس جولائی ۱۹۴۲ء میں شروع کیا تھا اور ڈلہوزی میں اس کی ابتداء کی تھی اُس وقت سے لیکر اب تک کئی دفعہ میں نے اِس سورۃ پر نظر ڈالی اور مجھے سخت فکر ہوا کہ اس سورۃ کا درس تو قریب آ رہا ہے مگر ابھی اس کے معانی ترتیبِ سُور کے لحاظ سے مجھ پر روشن نہیں ہوئے۔ بار بار میں اس سورۃ کو دیکھتا۔ اس کے مطالب پر غور کرتا اور کوئی مضمون میرے ذہن میں بھی آ جاتا مگر پھر سوچتے سوچتے میں اُس کو ناکافی قرار دے دیتا غرض بیسیوں دفعہ میں نے اس سورۃ پر نگاہ دوڑائی مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی یہاں تک کہ سورۃ الغاشیہ کے درس کا وقت آ گیا اور میں اُس کے نوٹ لکھنے لگا مگر اُس وقت بجائے غاشیہ پر نگاہ ڈالنے کے میری نظر بار بار آگے کی طرف نکل جاتی اور سورۃ الفجر میرے سامنے آ جاتی۔ غاشیہ کے متعلق میں سمجھتا کہ یہ تو حل شدہ ہی ہے اور اگر کوئی مشکل آیت بھی ہوئی تو ترتیب میں آ کر وہ خود بخود حل ہو جائیگی۔

جس طرح ایک انسان جب گیند پھینکتا ہے تو اُسے پتہ ہوتا ہے کہ یہ گیند اتنی دُور جائے گا۔ اسی طرح جو شخص قرآن کریم کی تفسیر ترتیب آیات اور ترتیبِ سُور کو مدنظر رکھ کر کرتا ہے وہ سمجھ جاتا ہے کہ اس ترتیب کے مطابق فلاں آیت کے فلاں معنے بنیں گے مگر اس بات کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی عمر اس فن میں صرف کر دی ہو۔ وہی جانتا ہے کہ نہر کا رُخ کس طرف ہے اور پانی کا بہاؤ کدھر ہے دوسرا شخص جسے قرآن پر اس رنگ میں غور کرنیکا موقع نہ ملا ہو وہ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ جب میں سورۂ کہف کی تفسیر لکھ رہا تھا تو وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (الکھف ع ۱۲) کے معنے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے مگر تفسیر لکھتے وقت میں نے سمجھا کہ میں صحیح ترتیب پر چل رہا ہوں جب میں اس آیت پر پہنچوں گا تو دیکھوں گا کہ اس کے کیا معنے بنتے ہیں چنانچہ ترتیب آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں تفسیر کرتا چلا گیا یہاں تک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا تو اُس وقت یہ آیت اپنے معانی کے لحاظ سے یوں واضح ہو گئی کہ میں نے سمجھ لیا کہ اس کے سوا اس آیت کے اور کوئی معنے ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ پہلی آیتیں مجبور کر کے اُن معنوں کی طرف لے جا رہی تھیں۔ لطیفہ یہ ہوا کہ انگریزی ترجمۃ القرآن کے سلسلہ میں مولوی شیر علی صاحب کے نوٹ جب میرے پاس آئے تو اُن میں وہی معنے لکھے ہوئے تھے مگر وہ نوٹ انہوں نے یہاں نہیں لکھے تھے بلکہ ولایت میں لکھے تھے میں نے ملک غلام فرید صاحب سے پوچھا کہ مولوی صاحب نے یہ نوٹ اب ٹھیک کئے ہیں یا پہلے سے اسی طرح لکھے ہوئے تھے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ ولایت کے لکھے ہوئے ہیں میں نے کہا اگر یہ ولایت کے نوٹ ہیں تو پھر اس آیت کے یہ معنے ولایت میں کس طرح پہنچ گئے؟ میں تو اس آیت پر بڑا غور کرتا رہا تھا مگر اس کے معنے پندرھویں پارہ کی تفسیر لکھتے ہوتے میری سمجھ میں آئے تھے۔ اس پر انہوں نے بتایا کہ آپ نے

جو درس ۱۹۲۲ء میں دیا تھا اُس میں یہی معنے بیان کئے تھے اور اُسی وقت کے نوٹوں سے مولوی صاحب نے یہ معنے درج کئے ہیں۔معلوم ہوتا ہے ۱۹۲۲ء کا درس دیتے وقت جب میں اس آیت پر پہنچا تو خود بخود یہ آیت حل ہوگئی مگر چونکہ عین وقت پر حل ہوئی اس لئے میرے قرآن کریم کے حاشیہ پر وہ معنے نہ لکھے گئے اور کچھ عرصہ بعد مجھے بھول گئے۔اب گو اُن معنوں کو میں بھول چکا تھا مگر جب ترتیب آیات کے لحاظ سے غور کرتے ہوئے میں اُس آیت پر پہنچا تو فوراً وہی معنے پھر ذہن میں آگئے۔ تو ترتیب کے لحاظ سے جو شخص آیات کے معنے کرنے کا عادی ہو وہ اِدھر اُدھر جا ہی نہیں سکتا۔ وہ اُسی رَو اور اُسی نالی میں بہ رہا ہوتا ہے جس کی طرف مضمون زبانِ حال سے اشارہ کر رہا ہوتا ہے۔

غرض جوں جوں سورۃ فجر کا درس نزدیک آتا گیا میرا اضطراب بھی بڑھتا چلا گیا۔ میں نے کہا جب اس سورۃ کے متعلق میری اپنی تسلی ہی نہیں ہوئی تو میں دوسروں کو کیسے مطمئن کر سکتا ہوں۔مفسرین نے جو معنے بیان کئے ہیں وہ میں بیان کر سکتا تھا مگر جو ترتیب گذشتہ سورتوں کی میں بتاتا آرہا ہوں اُس کے لحاظ سے چاروں کھونٹے قائم نہیں ہوتے تھے۔ پہلے خیال آیا کہ میں دوسروں کے معانی ہی نقل کر دوں کیونکہ یہ درس اب جلد کتابی صورت میں چھپنے والا ہے کب تک میں اِن معانی کا انتظار کروں جو ترتیب کے مطابق ہوں شاید ترتیب کے مطابق معنے اللہ تعالےٰ پھر کسی وقت کھول دے۔ آخر پُرانے مفسروں نے کوئی نہ کوئی معنے اِن آیات کے کئے ہی ہیں۔رازی نے بھی ان کے معنے لکھے ہیں۔بحر محیط والوں نے بھی معنے لکھے ہیں حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے بھی معنے کئے ہوئے ہیں اور اُن تمام معانی کو ملحوظ رکھ کر کچھ نہ کچھ بات بن ہی جاتی ہے مگر چونکہ میرا دل کہتا تھا کہ ترتیب آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ معانی پوری طرح باہم منطبق نہیں ہوتے مجھے اطمینان نہ تھا۔ یہاں تک کہ ۷ا ر صلح ۱۳۲۴ ہش مطابق ۷ا ر جنوری ۱۹۴۵ء بروز بدھ میں سورۃ غاشیہ کا درس دینے کے لئے مسجد مبارک میں آیا۔ میں نے درس سورۃ غاشیہ کا دینا تھا مگر میں غور سورۃ فجر پر کر رہا تھا اِسی ذہنی کشمکش میں میں نے عصر کی نماز پڑھانی شروع کی اور میرے دل پر ایک بوجھ تھا لیکن خدا تعالےٰ کی قدرت ہے کہ جب میں عصر کی نماز کے آخری سجدہ سے سر اُٹھا رہا تھا تو ابھی سر زمین سے ایک بالشت بھر اونچا آیا ہو گا کہ ایک آن میں یہ سورت مجھ پر حل ہوگئی۔ پہلے بھی کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ سجدہ کے وقت خصوصاً نماز کے آخری سجدہ کی حالت میں اللہ تعالےٰ نے بعض آیات کو مجھ پر حل کر دیا۔ مگر اس دفعہ بہت ہی زبردست تفہیم تھی کیونکہ وہ ایک نہایت مشکل اور نہایت وسیع مضمون پر حاوی تھی چنانچہ جب میں نے عصر کی نماز کا سلام پھیرا تو بے تحاشا میری زبان سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے الفاظ بلند آواز سے نکل گئے۔

---

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَالْفَجْرِ ○ وَلَیَالٍ عَشْرٍ ○ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ○

(مجھے قسم ہے ایک آنے والی) فجر کی اور دس راتوں کی اور ایک جفت کی اور ایک وتر کی

وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ ○

اور (مذکورہ بالا دس راتوں کے بعد آنیوالی) رات کی جب وہ چل پڑے ۔ ۵؎

۵؎ **حل لغات**۔ یَسْرِ: سَرَا کا مضارع ہے اور سَرٰی کے معنے ہیں۔ رات کو چلا (اقرب) پس وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ کے معنے ہونگے۔ رات جب چل پڑے۔

**تفسیر**۔ پیشتر اس کے کہ میں وہ معانی بتاؤں جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے الہامی طور پر مجھے سمجھائے گئے ہیں میں پہلے دوسرے لوگوں کے بیان کردہ معنے بتانا چاہتا ہوں تاکہ میری مشکلات کا دوستوں کو پتہ لگ جائے اور اُن کو معلوم ہو کہ میری مشکلات حقیقی مشکلات تھیں۔ اگر میں شرح صدر کے بغیر جو مجھے اب حاصل ہے اس کے معنے بتا دیتا تو میں اپنے نفس میں تسلی نہیں پا سکتا تھا یہ مضمون میں چار آیات کے متعلق مشترک طور پر بیان کر رہا ہوں۔ یہ آیات یہ ہیں (۱) وَالْفَجْرِ (۲) وَلَیَالٍ عَشْرٍ (۳) وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۴) وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ

ان آیات میں چار قسمیں کھائی گئی ہیں اور قسم کے معنے شہادت کے ہوتے ہیں یہ مضمون تفصیل کے ساتھ پہلے آچکا ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں فجر کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں اسی طرح میں دس عظیم الشان راتوں کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں نیز میں شفع اور وتر کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ شفع اور وتر کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ ان میں سے کوئی چیز طاق ہے اور کوئی چیز جفت ہے کیونکہ وَتر طاق کو کہتے ہیں اور شفع جفت کو۔ اسی طرح فرماتا ہے میں رات کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں جب وہ چلی جائے گی۔

اس جگہ چار قسمیں کھائی گئی ہیں سوال یہ ہے کہ ان سے مراد کیا ہے اور کس چیز کو کس چیز کی شہادت کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ فجر کیا چیز ہے اور وہ کس امر کی شہادت دے رہی ہے۔ لَیَالٍ عَشْرٍ کیا چیز ہیں اور کونسی دس راتیں یہاں مراد ہیں اور وہ کس امر کے ثبوت کے لئے بطور شاہد پیش کی گئی ہیں۔ شفع اور وتر کیا چیز ہیں اور انہیں کس بات کے ثبوت کے لئے پیش کیا گیا ہے اسی طرح رات جو جانے والی ہے کونسی ہے اور اُسے کس بات کے ثبوت کے لئے پیش کیا گیا ہے؟

**الفجر** حضرت علیؓ۔ ابن عباسؓ۔ عکرمہ۔ مجاہد اور سدی کا قول ہے کہ فجر سے مراد وہ معروف صبح ہے جو رات کے بعد آتی ہے (ابن کثیر) مسروق اور محمد بن کعب کا قول ہے کہ اس سے مراد یوم نحر کی صبح ہے (ابن کثیر) گویا صبح سے وہ صبح ہی مراد لیتے ہیں مگر کہتے ہیں اس سے ہر صبح مراد نہیں بلکہ قربانی کے دن کی پہلے جو صبح آتی ہے وہ مراد ہے اور وہ دس راتوں کی آخری فجر ہے کیونکہ عید دسویں تاریخ کو ہوتی ہے پس اُن کے نزدیک فجر سے مراد ذوالحجہ مہینہ کی دس راتوں کی آخری فجر کی۔

عکرمہ کہتے ہیں کہ فجر سے مراد وہ صبح کی نماز ہے جو دسویں ذوالحجہ کو پڑھی جاتی ہے یعنی عید کے دن کی صبح کی نماز۔ گویا یہ بھی انہی معنوں کی طرف گئے ہیں جو مسروق اور محمد بن کعب نے کئے ہیں صرف فرق یہ ہے کہ وہ اس کی ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کی فجر مراد لیتے ہیں اور یہ فجر کی نماز مراد لیتے ہیں یا کہتے ہیں کہ فجر سے تہجد کی نماز بھی مراد ہو سکتی ہے اور ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ فجر سے مراد سارا دن بھی ہو سکتا ہے ان معنوں کے رُو سے بھی ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے صرف یہ فرق ہے کہ فجر کی پو پھٹنے سے لیکر سورج نکلنے تک کا وقت مراد نہیں لیا گیا۔ بلکہ پَو پھٹنے سے لے کر شام تک عید کا سارا دن مراد لیا گیا ہے یعنی عید کا سارا دن۔

**لَيَالٍ عَشْرٍ** دوسرا سوال یہ ہے کہ دس راتوں سے کیا مراد ہے ابن عباس کا قول ہے کہ دس راتوں سے مراد ذوالحجہ کی راتیں ہیں عید سے پہلے کی۔ عبداللہ بن زبیرؓ۔ مجاہد اور کئی علماء سلف نے یہی بات کہی ہے۔ اسی طرح بہت سے بعد کے علماء کا بھی یہی قول ہے۔

ترمذی میں حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ مَا مِنْ اَيَّامٍ اَلْعَمَلُ الصَّالِحُ فِيْهِنَّ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْاَيَّامِ الْعَشْرِ (یعنی ذی الحجۃ (ترمذی جلد اوّل ابواب الصوم باب ماجاء فی العمل فی ایام العشر) یعنی عمل صالح کے لحاظ سے یوں تو جس دن بھی کوئی شخص نیکی کرے اللہ تعالیٰ کی رضاء اور اُس کا قرب حاصل کر سکتا ہے مگر وہ ایام جن میں نیکی کی خاص طور پر قدر کی جاتی ہے اور جن میں عمل صالح کرنا اللہ تعالیٰ کو خاص طور پر پسند آتا ہے اُن میں سے کوئی بھی دن اللہ تعالیٰ کو اتنا محبوب نہیں جتنا ان دس دنوں یعنی عشرہ ذی الحجہ میں نیک اعمال بجالانا اُس کو پسند ہے۔ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَا الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ؟ فَقَالَ وَلَا الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ لوگوں نے کہا کہ کیا جہاد فی سبیل اللہ بھی ان دنوں کے اعمال سے اچھا نہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ جہاد فی سبیل اللہ بھی ان دنوں کے اعمال سے زیادہ اچھا نہیں۔ اِلَّا رَجُلًا خَرَجَ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْجِعْ بِذَالِكَ مِنْ شَيْءٍ (ابن کثیر و ترمذی حوالہ مذکور) سوائے اس کے کہ کوئی شخص اپنی جان اور اپنا مال لے کر خدا تعالیٰ کی راہ میں نکلے اور پھر مارا بھی جائے اور اس کا سارا مال بھی ضائع ہو جائے اُس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس نے ایسا نیک عمل کیا جو ان ایام کے اعمال صالحہ کے برابر ہے ورنہ اور کوئی عمل ان دس ایام کے اعمال کے برابر نہیں ہو سکتا۔

ابو جعفر ابن جریر کہتے ہیں کہ دس راتوں سے مراد محرم کی پہلی راتیں ہیں۔ ابو ظبیان حضرت ابن عباسؓ سے سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے مراد رمضان کی پہلی دس راتیں ہیں گویا لَيَالٍ عَشْرٍ کے متعلق تین خیالات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ذوالحجہ کی عید سے پہلے کی دس راتیں ہیں۔

۲۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد محرم کی پہلی دس راتیں ہیں۔

۳۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد رمضان کی پہلی دس راتیں ہیں۔

ابن الزبیر جابرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ دس سے مراد قربانی کے مہینہ کی دس راتیں ہیں (گویا یہ روایت انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دی کہ لَيَالٍ عَشْرٍ سے ذوالحجہ کی دس راتیں مراد ہیں) اور وتر یوم عرفہ ہے (کیونکہ وہ نویں دن ہوتا ہے) اور شفع یوم نحر ہے یعنی عید کا دن۔ یہ روایت امام احمد سے ابن کثیر نے نقل کی ہے۔ نسائی نے بھی یہ روایت محمد بن رافع اور

عبدۃ بن عبد اللہ سے نقل کی ہے جن دونوں نے زید بن
الحباب سے سنا ہے۔ یہ وہی راوی ہیں جن کو براہ راست
امام احمد نے روایت کی ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم کی
روایات بھی زید بن الحباب تک پہنچتی ہیں گویا چاروں کتب احادیث
میں زید بن الحباب کی طرف یہ روایت منسوب ہے گویا نیچے
کے راوی خواہ مختلف ہوں زید بن الحباب پر پہنچکر روایت
کا سلسلہ ایک ہو جاتا ہے اس لئے یہ روایت احاد میں کو
ہے۔ ابن کثیر جو حدیث کے بہت بڑے عالم ہیں وہ اس
روایت کو درج کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ میرے نزدیک اس
حدیث کو مرفوع قرار دینے میں مجھے شبہ ہے یعنی اس
روایت کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچانا یقینی
معلوم نہیں ہوتا۔

**شفع اور وتر** ابن عباس کا قول ہے کہ وتر
یوم عرفہ ہے یعنی ذوالحجہ کا نواں دن جو
حج کا دن ہے اور طاق ہے اور شفع یوم النحر ہے یعنی
قربانی کا دن جو دسواں ہے اور جُفت ہے۔ عکرمہ اور ضحاک
کا بھی یہی قول ہے اور ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ واصل
بن سائب کہتے ہیں میں نے عطاء سے پوچھا کیا شفع والوتر سے
مراد ہماری نماز وتر ہے؟ انہوں نے کہا وتر کی نماز مراد نہیں
بلکہ شفع سے مراد یوم العرفہ ہے (کہ وہ نواں اور طاق ہے
نہ کہ جُفت) اور وتر سے مراد یوم الاضحیہ کی رات ہے (اور
یہ رات دسویں اور جُفت ہے نہ کہ طاق یہ معلوم ہوتا ہے کہ
راوی سے اس میں غلطی ہو گئی ہے یا ابن کثیر سے نقل کرتے
ہوئے غلطی ہوئی ہے۔

ابن ابی حاتم روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے محمد بن عامر
بن ابراہیم الاصبہانی نے روایت کی انہوں نے اپنے باپ
ابراہیم الاصبہانی سے روایت کی انہوں نے النعمان یعنے
ابن عبد السلام سے روایت کی کہ اُن سے کہا میں سعید بن
عوف نے روایت کی میں نے ایک دفعہ عبد اللہ بن زبیر
کو تقریر کرتے سُنا (آپ کے ایام خلافت میں مکہ مکرمہ کے
مقام پر) تقریر کے دوران میں ایک شخص کھڑا ہوا اور اُس
نے کہا اے امیر المومنین (یزید کے وقت میں حضرت عبد اللہ
بن زبیر نے اس کی بیعت سے انکار کر دیا تھا اور مکہ میں اپنی
خلافت کا اعلان کر دیا تھا یہ اُس وقت کی بات ہے عبد اللہ
بن زبیر حضرت ابوبکر کے نواسے اور حضرت زبیر بن العوام کے
فرزند تھے) شفع اور وتر کے متعلق مجھے کچھ سمجھائیے۔ حضرت
عبد اللہ بن زبیر نے جو علاوہ صحابی ہونیکے بہت عبادت گذار
بزرگ تھے اور بہت سے لوگوں نے اُن کو پہلا مجدد قرار دیا
ہے اور بعض نے مہدی۔ انہوں نے جواب میں فرمایا۔ شفع
سے مراد فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ہے
اور وتر سے مراد وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ہے یعنی
قرآن کریم میں جو یہ ذکر آتا ہے کہ جب تم حج کر چکو تو چاہے
دو دن ٹھہر کر آجاؤ یا تین دن۔ اس میں دو دن ٹھہر کر آنا
شفع ہوا۔ اور یہ جو فرمایا کہ اگر کوئی شخص تیسرے دن بھی
ٹھہرنا چاہے تو اُسے اجازت ہے یہ تیسرا دن وتر ہے۔
ابن جریر نے بھی یہ روایت حضرت عبد اللہ بن زبیر سے نقل کی ہے۔

بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ ابوھریرہ رض
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ
کے ننانوے نام ہیں یعنی سو میں سے ایک کم جو شخص اُنکو
خوب گن رکھے وہ جنت میں داخل ہوگا اور اللہ وتر ہے
وتر کو پسند کرتا ہے یعنی اللہ تعالےٰ بھی ایک ہے اور اُس
نے اپنے نام بھی ننانوے ہی رکھے ہیں۔ اس حدیث کا اصل
مطلب یہ ہے کہ صفاتِ الٰہیہ کا گہرا مطالعہ انسان کو حقیقی
متقی بناتا ہے تقویٰ کے معنے بھی یہی ہوتے ہیں کہ انسان
اللہ تعالےٰ کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرے جو شخص اللہ تعالےٰ
کی ساری صفات کو اپنے مدنظر رکھیگا وہ کسی خوبی کو نظرانداز
نہیں کر سکتا اور جو شخص ہر خوبی کو اپنے سامنے رکھیگا اور
ہر نیکی پر عمل کرے گا اُس کے یقینی جنتی ہونے میں شبہ
ہی کیا ہو سکتا ہے۔

حسن بصری اور زید بن اسلم کہتے ہیں کہ تمام مخلوق یا

شفع ہے یا وتر۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے یہاں مخلوق کی قسم کھائی ہے۔ مجاہد سے بھی یہی مروی ہے اور وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ شفع اور وتر سے مخلوق مراد ہے کیونکہ کوئی جوڑا ہوتا ہے اور کوئی اکیلا۔ ابن عباسؓ سے عوفی نے روایت کی ہے کہ اللہ وتر ہے اور تم لوگ شفع ہو کیونکہ تم نر و مادہ ہوتے ہو اور خدا اکیلا ہے اس لئے تم تو شفع ہو اور خدا وتر ہے بعض نے کہا ہے کہ شفع سے مراد صبح کی نماز ہے اور وتر سے مراد شام کی نماز۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ شفع سے مراد جوڑا ہے اور وتر اللہ تعالےٰ ہے یعنی یہ جو اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى (النجم ع۳) اسی کی طرف شفع میں اشارہ کیا گیا ہے

ابو عبد اللہ مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ وتر ہے اور مخلوق شفع ہے کیونکہ وہ ذکر و انثیٰ ہوتی ہے۔ ابن ابی نجیح مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے جوڑا ہے اور اس سے آپ نے اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (الذاریات ع۳) چونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر مخلوق کو جوڑے کی صورت میں پیدا کیا گیا ہے اس لئے شفع سے مراد مخلوق اور وتر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

قتادہ حسن بصری سے روایت کرتے ہیں کہ شفع اور وتر سے مراد عدد ہیں کہ وہ شفع اور وتر ہوتے ہیں مثلاً ایک وتر ہے دو شفع ہے تین وتر ہے چار شفع ہے اسی طرح جس قدر عدد گنتے چلے جاؤ اُن میں سے ایک شفع ہوگا اور ایک وتر۔ پس اُن کے نزدیک شفع اور وتر میں اعداد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ابن جریر نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ عبد اللہ بن زبیر جابر سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا کہ اَلشَّفْعُ الْيَوْمَانِ وَالْوِتْرُ الْيَوْمُ الثَّالِثُ۔ یعنی وہی جو ابن زبیر نے بیان کیا تھا کہ شفع میں فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کی طرف اشارہ ہے اور وتر میں وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کی طرف۔ وہی بات اس روایت میں بیان کی گئی ہے۔ مگر یہ روایت خود اُن کی پہلی روایت کے خلاف ہے جس میں وہ یہ بیان کر چکے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ شفع یوم نحر ہے اور وتر یوم عرفہ۔

ابو العالیہ اور ربیع بن انس کہتے ہیں کہ اس سے مراد نماز ہے کہ اُس میں سے کوئی شفع ہوتی ہے اور کوئی وتر ہوتی ہے۔ مغرب کی فرض نماز وتر ہے اسی طرح وتر کی نماز اس میں شامل ہے لیکن باقی سب نمازیں شفع ہیں کیونکہ اُن میں سے کسی کی دو دو رکعت ہوتی ہیں اور کسی کی چار چار۔

امام احمد عمران بن حصین سے روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ھِیَ الصَّلٰوۃُ بَعْضُهَا شَفْعٌ وَبَعْضُهَا وِتْرٌ۔ اس سے مراد نماز ہے کیونکہ کوئی نماز شفع ہوتی ہے اور کوئی وتر۔ یہ تیسری روایت ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی ہے مگر یہ تیسری روایت بھی پہلی دونوں روایتوں کے خلاف ہے۔ یہی روایت ترمذی اور ابن جریر نے بھی دوسرے سلسلہ سے بیان کی ہے اسی طرح ابو داؤد نے بھی یہی روایت کی ہے (ابن کثیر)

۵ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ کی تشریح سابق مفسرین کے نزدیک

**وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ** ابن عباسؓ کہتے ہیں اس کے معنے یہ ہیں کہ جب رات چلی جائے۔ اور ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب رات آئے اس طرح اقبال النہار اور ادبار اللیل کی قسم ہو گئی۔ گویا ابن عباس کے نزدیک تو اس میں رات کے جانے کا ذکر ہے مگر ابن کثیر کے نزدیک اس میں رات کے آنے کا ذکر ہے۔ رات کے جانے کا ذکر والفجر میں ہو چکا ہے۔ اُن کا مطلب یہ ہے کہ جب فجر کا ذکر پہلے آ چکا ہے اور فجر ہمیشہ رات کے جانے پر ہی ہوتی ہے تو پھر اسی بات کو

وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ کہہ کر کیوں دُہرایا گیا ہے۔ چونکہ بلاوجہ
کسی بات کو دُہرا دینا لغو ہوتا ہے اور لغو بات قرآن کریم
کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی اس لئے وہ کہتے ہیں کہ یَسْرِ
سے مراد اس جگہ جانے کے نہیں بلکہ آنے کے ہیں۔ یَسْرِ
کے معنے درحقیقت چلنے کے ہوتے ہیں اور اس میں آنے
کا مفہوم بھی شامل ہے اور جانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔
مگر ہم قرآن کریم کی طرف کیوں ایسی بات منسوب کریں جو لغو
ہو۔ جب وَالْفَجْرِ میں رات کے جانے کی طرف اشارہ
کر دیا گیا ہے تو وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ میں پھر انہی معنوں
کا تکرار درست نہیں ہو سکتا۔ پس اس کے معنے رات کے
جانے کے نہیں بلکہ آنے کے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں قرآن کریم
نے خود دوسری جگہ فرمایا ہے وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ
وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (التکویر) اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ لیل اور صبح دونوں کی قسم کھانا جائز ہے چنانچہ وَالْفَجْرِ
میں رات کے جانے کی طرف اشارہ کر دیا اور وَالَّیْلِ اِذَا
یَسْرِ میں رات کے آنے کا ذکر کر دیا۔ ضحاک کے قول کا بھی
یہی خلاصہ ہے وہ کہتے ہیں وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ اَیْ یَجْرِیْ۔
(نوٹ:۔ متذکرہ بالا تمام حوالجات ابن کثیر سے ماخوذ ہیں)

یہ وہ مختلف بیانات ہیں جو ان آیات کے متعلق تفاسیر میں
نظر آتے ہیں ان میں سے تین بیان رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کی طرف بھی منسوب کئے گئے ہیں۔

شفع اور وتر کے متعلق دو مختلف بیانات جو آنحضرت صلعم کی طرف منسوب کئے گئے ہیں

اوّل یہ کہ شفع اور وتر سے ذی الحجہ کے ایام عرفہ اور
نحر مراد ہیں۔

دوم یہ کہ شفع اور وتر سے حج کے بعد منیٰ سے واپسی کے
ایام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ واپس آنا دوسرے دن
بھی جائز ہے اور تیسرے دن بھی۔

سوم یہ کہ شفع اور وتر سے نماز مراد ہے کہ کوئی نماز
شفع ہوتی ہے اور کوئی وتر۔

تینوں روایتوں کا یہ اختلاف بتاتا ہے کہ ان روایتوں
کو مرفوع کہنا بالکل غلط ہے آخر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
شفع اور وتر کی تشریح میں یہ تینوں مختلف باتیں کس طرح
کہہ سکتے تھے معلوم ہوتا ہے یہ رُواۃ کی اپنی رائے ہے۔
انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعض ذوالوجوہ
حدیثوں سے یہ خیال کر لیا کہ شاید رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
نے شفع اور وتر سے یہ مراد لی ہے چنانچہ کسی نے کوئی
استنباط کر لیا اور کسی نے کوئی۔ پس یہ رُواۃ کی اپنی رائے
ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف قطعی طور پر
کسی مفہوم کو منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس کا
ثبوت حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت سے بھی ملتا ہے۔
مسند احمد۔ نسائی اور حاکم میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ ذکر
کرتے ہیں کہ میں اور ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن حج میں ایک دفعہ
حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس گئے انہوں نے ہمیں کہا کہ
یوم عرفہ کی دوپہر کا کھانا ہمارے ہاں کھانا۔ میں نے اُن
سے کہا جناب یہ دن جو ذوالحجہ کے ہیں یہی لَیَالٍ عَشْرٍ
ہیں۔ انہوں نے کہا تم کو کس نے بتایا۔ میں نے کہا بتانے
کی کیا ضرورت ہے مجھے خود یقین ہے کہ اس سے مراد یہی
دن ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا اگر تمہیں یقین ہے
تو کسی وقت میرے پاس آنا میں تمہارے یقین کو شک میں
بدل دُوں گا۔ اس سے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ
سمجھتے تھے کہ ہم ان آیات کی تشریح میں جو کچھ کہتے ہیں یہ
ہماری ذاتی رائے ہے۔ کسی رائے پر حتمی طور پر یقین کر لینا
درست نہیں ورنہ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی
کوئی حدیث اس بارہ میں ہوتی تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے مضمون کی نسبت یہ
کیوں کہتے کہ میرے پاس آنا میں تمہارے یقین کو شک
سے بدل دُوں گا۔

واقعہ یہی ہے کہ ذوالحجہ کے دس دنوں کی فضیلت
کے متعلق کئی حدیثیں آئی ہیں مگر ایسی کوئی حدیث نہیں
جس سے یہ ثابت ہو کہ قرآن کریم میں لَیَالٍ عَشْرٍ کا جو ذکر
آتا ہے اُس سے مراد یہی دن ہیں۔ ان دنوں کی فضیلت سے

ہم انکار نہیں کرتے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دنوں کو بہت مبارک اور بہت بڑی اہمیت رکھنے والا قرار دیا ہے۔ مگر یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ کسی حدیث میں یہ ذکر آتا ہو کہ لَیَالٍ عَشْرٍ سے مراد یہی ایام ذوالحجہ ہیں۔

اب رہے لوگوں کے خیالات سو لَیَالٍ عَشْرٍ کے متعلق چار خیالات لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔

۱۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے ذوالحجہ کی دس راتیں مراد ہیں۔

۲۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے محرم کی دس راتیں مراد ہیں۔

۳۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے رمضان کی پہلی دس راتیں مراد ہیں۔

۴۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے رمضان کی آخری دس راتیں مراد ہیں۔

شفع اور وتر میں بھی بہت کچھ اختلاف ہے کچھ لوگ اس سے نماز مراد لیتے ہیں تو کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد عدد ہیں۔ اگر شفع اور وتر سے نماز مراد لی جائے یا اعداد مراد لئے جائیں تو اُن کے ساتھ کوئی دس راتیں مخصوص نہیں ہو سکتیں حالانکہ یہاں شفع اور وتر سے پہلے دس راتوں کا ذکر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی اُس روایت سے استدلال کرکے جسے میں نے آخر میں بیان کیا ہے ایک حال کے مفسر نے وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ کے معنے لیلۃ القدر اور دوسری راتوں کے کئے ہیں یا رمضان کی ان دس راتوں میں سے پہلی رات کے۔ ان آراء پر نظر ڈالنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں کوئی امر ثابت نہیں۔ دوسرے خود صحابہؓ میں بھی سخت اختلاف ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ صرف اجتہاد پر تفسیر کی بنیاد رکھی گئی ہے صاحب شریعت سے کوئی امر ثابت نہیں اور پھر صحابہ کا اجتہاد بھی یقینی نہیں۔ ایک ایک صحابی نے دو دو تین تین ایسے معنے کئے ہیں جو آپس میں بالکل متضاد ہیں۔ کسی آیت کے دو دو بلکہ چار چار سو معنے کر لینا بھی بشرطیکہ وہ معنے ایک دوسرے کے متضاد نہ ہوں بلکہ مصدق ہوں بالکل جائز اور درست ہوتا ہے۔ لیکن ایسے معنے کرنا کہ اگر ایک معنے مانے جائیں تو دوسرے معنے رد کرنے پڑیں۔ دوسرے معنے تسلیم کئے جائیں تو تیسرے معنوں کو ناقابل قبول قرار دینا پڑے یہ اس امر کا ثبوت ہوتا ہے کہ خود معنے کرنے والے کے دل کو اطمینان نہیں ہوتا کبھی اس کا رجحان ایک معنوں کی طرف چلا جاتا ہے اور کبھی دوسرے معنوں کی طرف۔ کبھی وہ سمجھتا ہے کہ یہ معنے درست معلوم ہوتے ہیں اور کبھی خیال کرتا ہے کہ وہ معنے درست معلوم ہوتے ہیں۔ اسے اطمینان اور شرح صدر حاصل نہیں۔ پس صحابہؓ نے اس بارہ میں جو کچھ اجتہاد کیا وہ قطعی نہیں۔ چنانچہ ابن عمرؓ کا قول اس کا مصدق ہے۔ آخر وہ بھی اس آیت کے کوئی معنے کرتے ہوں گے انہوں نے جب سُنا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ یقینی اور قطعی طور پر لَیَالٍ عَشْرٍ سے مراد ذوالحجہ کی دس راتیں ہیں تو انہیں حیرت ہوئی کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے اور کس بناء پر اس مفہوم کو یقینی سمجھ رہا ہے گو بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ اکثر علماء سلف کا یہی قول تھا کہ لَیَالٍ عَشْرٍ سے ذوالحجہ کی دس راتوں کے سوا اور کوئی رات مراد نہیں مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا طلحہ بن عبداللہ سے یہ کہنا کہ میرے پاس آنا میں تمہیں شک ڈال دوں گا بتاتا ہے کہ اس بارہ میں جو کچھ کہا جا رہا تھا محض اجتہاد تک محدود تھا۔ آخر حضرت عبداللہ بن عمرؓ دین کے منکر تو نہیں تھے کہ انہوں نے اُسے یہ کہا ہو کہ میں اسلام کی صداقت کے متعلق تمہیں شکوک میں مبتلا کر دوں گا۔ اُن کا مطلب یہی تھا کہ تم جو یہ خیال کر رہے ہو کہ لَیَالٍ عَشْرٍ سے قرآن کریم نے یقینی طور پر ذوالحجہ کی دس راتوں کی طرف ہی اشارہ کیا ہے یہ درست نہیں۔ اگر تمہیں اتنا ہی کامل یقین ہے تو میرے پاس آنا میں تمہیں شبہ ڈال دوں گا۔ غرض ابن عمرؓ کا قول اس امر کا مصدق ہے

لَیَالٍ عَشْرٍ کے متعلق مفسرین کی رائے

سورۂ فجر کی پہلی چار آیات کی پہلے مفسرین کی تفسیر قبول نہ کئے جانے کی وجہ

کہ صرف اجتہاد پر اس آیت کی تفسیر کی بنیاد رکھی گئی تھی اسی طرح خود صحابہؓ اور تابعین کے شدید اختلافات بھی اس امر پر شاہد ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم نے مان لیا اس بارہ میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں مگر تم ان میں سے کسی ایک بات کو ترجیح دے دو اور اس جھگڑے کو نپٹا دو۔ آخر جب ہم نے اجتہاد سے ہی اس آیت کی تفسیر کرنی ہے تو ہم ان مختلف بیانات میں سے کسی ایک کو جس کی طرف لوگوں کا زیادہ میلان پایا جاتا ہے کیوں درست تسلیم نہیں کر لیتے اور کیوں سب کو ناقابلِ قبول سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ بے شک اختلافات ہیں لیکن اس اختلاف کو دور کرنے کا طریق یہ ہے کہ کسی ایک قول کو ترجیح دے دی جائے۔

میرے نزدیک بھی یہ صورت بالکل ممکن تھی کہ باوجود اختلاف کے ہم کسی ایک قول کو ترجیح دے دیتے اور دوسروں کو رد کر دیتے مگر مشکل یہ ہے کہ اس طرح بھی قرآن کریم کی یہ آیات حل نہیں ہوتیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ سب سے زیادہ زور ذی الحجہ کی دس راتوں پر دیا گیا ہے مگر اس تاویل کے ساتھ فجر کی کوئی معقول تفسیر بیان نہیں کی گئی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے صرف دس راتوں کا ذکر کیا ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اس سے مراد ذی الحجہ کی دس راتیں ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے دس راتوں کے ساتھ ایک فجر کا بھی ذکر کیا ہے جو ان سے پہلے ہے۔ وہ فرماتا ہے وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ۔ ہم شہادت کے طور پر فجر کو پیش کرتے ہیں اور ہم شہادت کے طور پر اُس فجر کے ساتھ دس راتوں کو پیش کرتے ہیں اگر ان دس راتوں سے مراد ذی الحجہ کی دس راتیں ہیں تو سوال یہ ہے کہ پھر فجر سے کونسی فجر مراد ہے اگر دس راتوں کی آخری فجر مراد ہے تو اُس میں کس بات کی شہادت مخفی ہے کونسا اہم امر شریعت سے تعلق رکھنے والا ایسا ہے جو ذی الحجہ کی دسویں رات کی صبح کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے اور وہ صبح خدا تعالیٰ کی قدرت یا اُس کے دین کی صداقت کی شہادت دیتی ہے۔ اور پھر اس میں کیا حکمت تھی کہ صبح آئی تو دس راتوں کے بعد لیکن اس کا ذکر دس راتوں سے پہلے کر دیا گیا۔ اگر صرف دس راتوں کا ذکر ہوتا تو ہمیں اُن کی بات تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں تھا ہم سمجھتے کہ ان دس راتوں کا خدا تعالیٰ نے اِسلئے ذکر کیا ہے کہ یہ راتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اُن سے ایک وعدہ کیا تھا جسے اُس نے پورا کیا اُس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کو زندگی بخشی اور اُس کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے دنیا میں ایک نشان قائم کر دیا یہ واقعہ میں ایک بڑا بھاری نشان تھا اور اس نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں سے جو وعدے کیا کرتا ہے مخالف حالات کے باوجود وہ ان وعدوں کو پورا کرتا اور انہیں دنیا میں عزت اور کامیابی عطا کرتا ہے۔ ابراہیمؑ نے خدا تعالیٰ پر توکل کیا اور اُس نے اپنے بیٹے کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایک بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑ دیا۔ بظاہر اُس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خطرہ میں تھا مگر اللہ تعالیٰ نے پیش از وقت بتا دیا کہ یہ قربانی ضائع نہیں جائے گی۔ مکہ مرجع خلائق بنے گا اور خدا تعالیٰ کے اس نشان کو قیامت تک یاد رکھا جائے گا۔ اگر اس واقعہ کی یادگار منائی جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ایک زبردست ثبوت کی یادگار ہوگی اور اگر یہ واقعہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تو کوئی احمق ہی ہوگا جو اس کا انکار کرے اور کہے کہ اس سے خدا تعالیٰ کا جلال ظاہر نہیں ہوتا۔ پس اگر خالی لَيَالٍ عَشْرٍ کا ذکر ہوتا تو میرے لئے یہ بات حل شدہ تھی اور میں بغیر کسی جھجک کے کہہ سکتا تھا کہ ان سے مراد ذی الحجہ کی دس راتیں ہی ہیں کیونکہ یہ راتیں اس عظیم الشان قربانی کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کی لیکن مشکل یہ ہے کہ یہاں لَيَالٍ عَشْرٍ کے ساتھ وَالْفَجْرِ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اگر کہو کہ اس سے مراد

کوئی اور فجر ہے تو پھر بتانا چاہیئے کہ وہ کونسی فجر ہے اور اگر کہو کہ لَیَالٍ عَشْرٍ میں سے آخری رات کی فجر مراد ہے تو سوال یہ ہے کہ اس فجر میں کیا خصوصیت ہے کہ اس کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے اور پھر اس کا راتوں سے پہلے کیوں ذکر کیا گیا ہے۔ دس دنوں کی فضیلت تو سمجھ میں آسکتی تھی کیونکہ انسان پہلے قربانی کا ارادہ کرتا ہے پھر اُس ارادہ کے مطابق سامان مہیا کرتا ہے اور آخر وہ وقت آتا ہے جب وہ اُس قربانی کو ادا کر دیتا ہے اس نقطۂ نگاہ کے ماتحت بجائے یوم النحر کے اگر سب کے سب دنوں کو مبارک کہہ دیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان دس راتوں کی آخری فجر میں کونسی ایسی خاص بات پائی جاتی ہے جسے ہم کفار کے سامنے پیش کر سکیں اور اُن سے منوا سکیں کہ یہ فجر بھی خدا تعالیٰ کی قدرتوں کا ایک زبردست نشان ہے مگر یہ بات نہ مفسرین نے بیان کی ہے اور نہ ہی میری سمجھ میں آتی ہے لَیَالٍ عَشْرٍ میں تو یقیناً ایسا نشان ہے جسے بادلائل کفار کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے اور انہیں خدا تعالیٰ کی قدرت کا قائل کیا جا سکتا ہے مگر لَیَالٍ عَشْرٍ کے ساتھ فجر کا کوئی جوڑ نظر نہیں آتا۔

اسی طرح مفسرین نے لَیَالٍ عَشْرٍ کی تفسیر تو بیان کر دی مگر یہ نہیں بیان کیا کہ اُن کے ساتھ وہ کونسے شفع اور وتر ہیں جو ایک نشان کا کام دیتے ہیں اور جنکو اللہ تعالیٰ شہادت کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ آخر شفع اور وتر میں کونسی ایسی دلیل ہے جس سے خدا تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت ملتا ہے یا جسے کسی نشان کی شہادت کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا کہ دو دن پہلے چلے جاؤ یا تیسرے دن چلے جاؤ یہ ایک حکم تو ہے مگر نشان اور معجزہ تو نہیں یا اس سے خدا تعالیٰ کی کسی قدرت کا تو ثبوت نہیں ملتا اور محض حکم سے ایک کافر کیونکر سبق حاصل کر سکتا ہے یا کافر پر اس بات سے کیا حجت ہو سکتی ہے کہ ہم نے کہہ دیا ہے کہ چاہو تو دو دن ٹھہرو اور چاہو تو تین دن ٹھہرو۔ میں سمجھتا ہوں ایک بیوقوف سے بیوقوف کے سامنے بھی یہ بات بیان کی جائے تو وہ ہنس پڑے گا اور کہے گا کہ اس میں خدا تعالیٰ کی ہستی یا اُس کی قدرت کا کیا ثبوت ہے۔ آپ ہی کہہ دیا کہ دو دن ٹھہر کر آجاؤ اور آپ ہی کہہ دیا کہ اگر چاہو تو تین دن ٹھہر کر آجاؤ۔ اس میں کونسی ایسی خاص بات ہے جس کی بناء پر قسم کھا کر اس کا ذکر کیا گیا ہے یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے معمولی طور پر شفع اور وتر کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ فرمایا ہے میں قسم کھاتا ہوں شفع کی اور میں قسم کھاتا ہوں وتر کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شفع ہے جو کفار پر حجت تمام کرتا ہے اور کوئی وتر بھی ہے جس سے الگ طور پر کفار پر حجت تمام ہوتی ہے یا شفع اور وتر دونوں مل کر حجت پوری کرتے ہیں مگر یہ تینوں باتیں ذوالحجہ کے کسی شفع یا وتر میں نہیں پائی جاتیں۔

پھر ایک اور اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ مفسرین جو معنے کرتے ہیں اور جن میں سے بعض رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تک بھی پہنچائے جاتے ہیں اُن میں وتر کا پہلے ذکر آتا ہے اور شفع کا بعد میں۔ لیکن قرآن کریم میں شفع کا پہلے ذکر آتا ہے اور وتر کا بعد میں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ کہ میں شفع کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں اور میں وتر کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ اور شفع کے معنے کئے گئے ہیں دسویں ذی الحجہ کے اور وتر کے معنے کئے گئے ہیں نویں ذی الحجہ کے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ نَو پہلے ہوتا ہے اور دس بعد میں ہوتا ہے یعنی وتر پہلے ہے اور شفع بعد میں۔ مگر قرآن نے شفع کا ذکر پہلے کیا ہے اور وتر کا ذکر بعد میں کیا ہے اگر وَالْوَتْرِ وَالشَّفْعِ ہوتا تو یہ بات بن جاتی کہ وتر سے نویں ذی الحجہ مراد ہے اور شفع سے دسویں ذی الحجہ۔ مگر قرآن کریم نے شفع کا پہلے اور وتر کا بعد میں ذکر کیا ہے اور اس جگہ

کوئی ایسی وجہ بھی نہیں بتائی گئی جس کی بناء پر ہم اس ذکر کو آگے پیچھے کر سکیں اور کہہ سکیں کہ فلاں وجہ سے دسویں رات کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور نویں رات کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ وزن ملانے کے لئے ایسا کیا گیا ہے مگر ہم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ قرآن کریم صرف وزن کی خاطر الفاظ کو آگے پیچھے کر دیتا ہے۔ اگر یہاں شفع اور وتر کا آگے پیچھے ذکر ہے تو ضرور اس کی وجہ ہونی چاہیئے اور وہ دلیل دینی چاہیئے جس کی بناء پر شفع کا پہلے اور وتر کا بعد میں ذکر کیا گیا ہے مگر ایسی کوئی دلیل مفسرین کی طرف سے پیش نہیں کی گئی۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوال ہے کہ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ سے کیا مراد ہے۔ اگر دس راتوں سے ذی الحجہ کی دس راتیں ہی مراد ہیں تو پھر یہ کونسی رات ہے جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ چلی گئی۔ لیل سے مراد شام سے صبح تک کا وقت ہوتا ہے۔ جب لَيَالٍ عَشْرٍ میں ساری دس راتیں آ چکی تھیں تو یہ کون سی نئی رات ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ چلی گئی یا کون سی نئی رات ہے جو آ گئی۔ چلی گئی کہہ لو یا آ گئی کہہ لو دونوں صورتوں میں سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ کونسی لیل ہے جس کا ذکر کیا جا رہا ہے یا دس راتوں میں سے کس خاص رات کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے اور جب یہ دسوں راتوں میں سے ہی ایک رات تھی تو کیوں وَلَيَالٍ عَشْرٍ کے بعد شفع اور وتر کا ذکر کر کے اس رات کا ذکر کیا گیا ہے شفع اور وتر کو درمیان میں لا کر اُسے ان دس راتوں سے جن کا یہ حصہ ہے الگ کیوں کر دیا گیا ہے؟

پھر سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے دس راتوں کا ذکر کیا تھا تو اُن دس راتوں کے چلے جانے کا مضمون اُس میں خود بخود آ گیا تھا بلکہ فجر کا لفظ بھی آ چکا تھا جو اِن راتوں کے گذر جانے کی طرف اشارہ کر رہا تھا اس قدر وضاحت کے بعد دوبارہ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ کہنے کا کیا مطلب ہوا۔ [illegible] ہو کر اس کے معنے رات کے جانے کے نہیں بلکہ آنے کے ہیں تو یہ اور بھی لطیفہ ہے کہ دس راتیں آئیں اور گذر بھی گئیں مگر ان کا ذکر مکمل کر چکنے کے بعد بلکہ ان کے بعد شفع اور وتر کے الفاظ کہہ کر ایامِ منیٰ کا ذکر کر دینے کے بعد پھر ان دس میں سے پہلی رات کے آنے کا دوبارہ ذکر کرنا شروع کر دیا گیا۔ اگر اس پہلی رات کے آنے میں کوئی نشان تھا تو وہ تو دس راتوں کے ذکر میں بیان ہو چکا اور اگر دس راتوں میں کوئی نشان تھا تو شفع اور وتر کا ذکر شروع کر کے اس نشان کے بیان کو ختم کر دیا گیا پھر نئے سرے سے پہلی رات کے ذکر کے کیا معنے ہوئے اگر کہا جائے کہ وہی فجر کا مضمون اس جگہ دُہرایا گیا ہے تو یہ بھی بتانا چاہیئے کہ وَالْفَجْرِ میں کونسی کمی رہ گئی تھی جسے وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ میں بیان کیا گیا ہے۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس سے ذی الحجہ کی پہلی رات مراد ہے تو پہلی رات کی فجر کیا ثابت کرتی ہے؟ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے آخری رات کی فجر مراد ہے لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں پہلی رات کی فجر مراد ہو یا آخری رات کی۔ سوال یہ ہے کہ اُس رات کی خصوصیت کیا ہے جس کی وجہ سے اُس کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے اور ذوالحجہ کی پہلی یا آخری رات کی فجر میں کونسی ایسی بات پائی جاتی ہے جس سے کفار پر حجت تمام ہو سکتی ہو یا اللہ تعالیٰ کی قدرت اُن پر ظاہر ہو سکتی ہے؟ جب قسم شہادت کیلئے ہوتی ہے تو پہلی رات یا آخری رات کی فجر کس امر کی شہادت دیتی ہے اور دس راتیں کس امر کی شہادت دیتی ہیں؟ میں بتا چکا ہوں کہ اگر حج کی وجہ سے ان راتوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سچائی کا ثبوت قرار دیا جائے تو یہ ایک معقول بات ہوگی مگر پھر بھی سوال پیدا ہوگا کہ یہ تو مان لیا کہ یہ راتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صداقت کا ثبوت ہیں مگر پہلی رات کی فجر کس امر کا ثبوت دیتی ہے اور پھر آخری رات کس خاص امر کی شہادت دیتی ہے یا کس مضمون کو مکمل کرتی ہے؟ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ کسی کُل کے

ذکر پر اس کے ہر ٹکڑے کا مستقل طور پر الگ الگ شہادت دینا ضروری نہیں مگر جب کُل کے ذکر کے بعد یا پہلے بعض ٹکڑوں کا الگ ذکر کیا جائے تو پھر لازماً ان ٹکڑوں کے ذکر سے کوئی مزید شہادت کا حاصل ہونا ضروری ہوگا۔ لیکن وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ کی کوئی خاص شہادت ان مفسرین نے بیان نہیں کی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ چاروں مضمون الگ الگ شہادت نہیں رکھتے بلکہ مل کر ایک شہادت بنتے ہیں تو ہم اس کو بھی ماننے کے لئے تیار ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ حج کے ساتھ فجر اور شفع اور وتر اور وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ مل کر کیا شہادت پیدا کرتے ہیں۔ اگر لَيَالٍ عَشْرٍ کے ساتھ فجر کو نہ ملایا جاتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے پورا ہونے میں کیا کمی رہ جاتی۔ اگر شفع اور وتر کا ذکر نہ کیا جاتا تو کونسا امر مخفی رہ جاتا یا وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ کا ذکر اگر نہ ہوتا تو دس راتوں کی شہادت اور اُن کے معجزہ میں کونسا نقص رہ جاتا؟

ہم مانتے ہیں کہ بعض دفعہ دلیل کو نمایاں کرنے کے لئے اُس کے مختلف حصے کر دیئے جاتے ہیں مگر ایسا تبھی کیا جاتا ہے جب اُن مختلف حصوں پر زیادہ زور دے کر دلیل کو نمایاں اور روشن کرنا مقصود ہو۔ بلا وجہ ایک دلیل کے مختلف حصے نہیں کئے جاتے۔ اگر فجر اور شفع اور وتر اور وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ کے مفہوم میں لَيَالٍ عَشْرٍ کی بعض خصوصیات کا ذکر کیا جاتا تو ہمیں اس کو تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔ ہم سمجھتے کہ گو فجر اور شفع اور وتر اور وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ کا دس راتوں سے جن کا وہ حصہ ہیں علیحدہ طور پر بھی ذکر کیا گیا ہے مگر اس ذکر کی غرض ان امور کی اہمیت کی طرف اشارہ کرنا ہے اور ان پر زور دینے کے لئے الگ بیان کیا گیا ہے ورنہ اصولاً یہ تمام حصے دس راتوں میں ہی شامل ہیں اور ہر حصہ اُس دلیل کا ایک مفید اور ضروری حصہ ہے مگر افسوس

تو یہ ہے کہ مفسرین کی طرف سے لَيَالٍ عَشْرٍ کے جو معنے کئے جاتے ہیں اُن میں نہ فجر کا ذکر دلیل کا کوئی حصہ بنتا ہے نہ شفع اور وتر کا ذکر کوئی معنے رکھتا ہے اور نہ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ کا کوئی مفہوم ثابت ہوتا ہے گویا ایسے معنے کئے جاتے ہیں جو کسی صورت میں بھی آیاتِ قرآنیہ سے مطابقت نہیں رکھتے۔

دوسری توجیہ محرم کی راتوں کی ہے۔ اس میں بھی اگر تو صرف اتنا ہوتا کہ وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ توجیہ چسپاں ہو جاتی اور ہمیں اس تفسیر کو درست تسلیم کرنا پڑتا کیونکہ حدیثوں میں آتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یہ وہ دن ہیں جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون پر غلبہ ملا اور سمندر سے نجات حاصل ہوئی۔ اور اسی طرح کا ایک واقعہ میری اُمت میں بھی آئندہ زمانہ میں ہوگا (ترمذی ابواب الصوم باب ما قیل فی یوم عاشوراء) پس جس طرح حضرت ابراہیم السلام کی قربانی کا واقعہ ذوالحجہ کی دس راتوں پر چسپاں ہو سکتا ہے اسی طرح اگر وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس عظیم الشان واقعہ کی طرف اشارہ سمجھا جائے تو کوئی بڑے سے بڑا معترض بھی اس کی عظمت اور اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس صورت میں وَالْفَجْرِ سے محرم کی دسویں رات کی صبح مراد لے لی جائے گی اور لَيَالٍ عَشْرٍ سے محرم کی ابتدائی دس راتیں۔ کیونکہ ان دس راتوں میں سے کچھ وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کو بحث کرنے میں گذرا ہوگا۔ کچھ وقت سامانِ سفر کو درست کرنے میں صرف ہُوا ہوگا اور اس لحاظ سے ان تمام راتوں کو ہی خدا تعالیٰ کا ایک نشان قرار دینا پڑے گا۔ بہرحال اگر صرف وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ تک ہی آیت ہوتی تو ہم تسلیم کر لیتے کہ فجر سے مراد وہ فجر ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر

نکلے اور فرعون سمندر میں غرق ہوا۔ اور لَيَالٍ عَشْرٍ سے مراد محرم کی ابتدائی دس راتیں ہیں کیونکہ وہ سب کی سب خدا تعالیٰ کے اس نشان کی مظہر ہیں کہ بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کی پیروی میں فرعون کے مظالم سے نجات حاصل کی۔ مگر اس موقعہ پر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ کا اس واقعہ سے کیا جوڑ ہوا یہ بالکل تشنۂ تفسیر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی طرف اس میں اشارہ ہے تو وَالَّيْلِ إِذَا يَسْرِ کے کیا معنے ہوئے اور محرم کی دس راتوں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے اس رات کا جوڑ کیا ہے؟ اگر صرف فجر اور دس راتوں کا ذکر ہوتا تو عقلی طور پر ہمیں اس توجیہ کو تسلیم کرنے میں ہرگز کوئی عذر نہیں تھا جس طرح عقلی طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے واقعہ پر ذوالحجہ کی دس راتیں یا یوم النحر کی فجر چسپاں ہو سکتی ہے اسی طرح عقلی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ بھی چسپاں ہو سکتا ہے۔ پس اگر صرف اتنی ہی آیت ہوتی تو کوئی شخص اس واقعہ کی اہمیت کا انکار نہیں کر سکتا تھا بلکہ ہر شخص کے نزدیک یہ شہادت ایک اہم شہادت ہوتی۔ ایک اہم قسم ہوتی اور عرفان بخش قسم ہوتی مگر اگلی دو آیتیں ہمیں اس طرف بھی جانے نہیں دیتیں۔

تیسری توجیہ رمضان کی دس راتوں کی ہے اس میں اول تو اختلاف ہے بعض روایات میں پہلی دس اور بعض میں آخری دس راتوں کو ان کا مصداق قرار دیا گیا ہے مگر پہلی ہوں یا پچھلی سوال یہ ہے کہ رمضان کی راتیں کس امر کی شہادت دیتی ہیں۔ یہ سورۃ ابتدائی سالوں کی ہے اور اس پر قریباً سب کا جو کوئی رائے رکھ سکتے ہیں اتفاق ہے لیکن رمضان کے روزے فرض ہوتے ہیں مدینہ میں۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لاتے ہیں تو اُس وقت تک رمضان کے روزے فرض نہیں ہوئے تھے دوسرا ماہ رمضان جو مدینہ میں آیا اُس وقت یہ روزے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہوئے (طبری) اب بتاؤ کہ کیا کوئی بھی معقول انسان اس توجیہ کو مان سکتا ہے خواہ زمانۂ حال کا کوئی مفسر ہو یا ماضی کا مجھے بتائے کہ کیا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی قدرت کی کوئی دلیل ہے کہ لوگوں سے کہا جائے ہم صداقت کے ثبوت کے طور پر یہ بات پیش کرتے ہیں کہ آج سے بارہ سال کے بعد ہم اپنے ساتھیوں سے کہیں گے کہ وہ رمضان کے روزے رکھا کریں۔ روزہ رکھنے کا حکم دینا تو انسان کے اپنے اختیار کی بات ہے ایک مفتری بھی اگر چاہے تو ایسا حکم اپنے ماننے والوں کو دے سکتا ہے مسیلمہ کذاب بھی ایک جھوٹی شریعت بنا سکتا تھا۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ آیا جو بات پیش کی جا رہی ہے وہ کافروں کے لئے بھی حجت ہے یا نہیں؟

پھر عجیب بات یہ ہے کہ اس توجیہ کو درست تسلیم کرنے کی صورت میں کفار کے سامنے حجت کے طور پر رمضان کی راتوں کو پیش کیا گیا ہے مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ آپ اُن دنوں محرم کے پہلے دس دنوں کے روزے رکھا کرتے تھے کیونکہ ان ایام میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نجات دی تھی چونکہ اس واقعہ کی یادگار کے طور پر یہودی لوگ یہ روزے رکھا کرتے تھے اس لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی یہ روزے رکھتے تھے۔ جب رمضان کے روزوں کے احکام نازل ہو گئے تو آپ نے یہ روزے چھوڑ دئے۔ پس سوال یہ ہے کہ جو روزے ابھی فرض ہی نہیں ہوئے تھے اور جن کو نہ مسلمان جانتے تھے اور نہ کفار جانتے تھے اُن کے ذکر سے مسلمانوں نے کیا سمجھا۔ یا کافروں نے کیا سمجھا ہو گا۔ جب یہ روزے سورۃ الفجر کے نزول کے وقت فرض ہی نہیں تھے تو ان کی شہادت کیا اثر رکھ سکتی تھی اور ان کی کفار پر کیا حجت ہو سکتی تھی۔

ممکن ہے کوئی شخص کہہ دے کہ بیشک رمضان کے روزے

بارہ سال بعد مدینہ منورہ میں جا کر فرض ہوئے ہیں مگر اُن کا قبل از وقت ذکر کرنا یا رمضان کی راتوں کی قسم کھانا قابلِ اعتراض امر نہیں قرآن کریم نے خود متعدد مقامات پر آئندہ زمانوں میں ہونے والے واقعات کی قسم کھائی ہے مثلاً قرآن کریم نے یہ کہا ہے یا نہیں کہ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ۔ ایک زمانہ آئے گا جب سورج کو لپیٹ دیا جائے گا یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی متابعت کو ترک کر دیا جائے گا یا انوارِ محمدیہ کا نزول بند ہو جائے گا یا سورج اور چاند کو گرہن لگیگا۔ پھر کیا یہ واقعات رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی رونما ہو گئے تھے؟ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ پیشگوئیاں بعد میں پوری ہوئیں لیکن اللہ تعالےٰ نے اِن بعد میں رونما ہونے والے واقعات کی خود قسم کھائی ہے۔ اسی طرح وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ ایک زمانہ میں ریل تار اور ریڈیو وغیرہ سے باہمی تعلقات ایسے ہو جائینگے کہ گویا پاس بیٹھے ہیں۔ مگر یہ پیشگوئیاں ایک لمبا عرصہ گذرنے کے بعد پوری ہوئیں۔ اسی طرح خواہ رمضان کے روزے بارہ سال بعد فرض ہوئے مگر اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ اور اِذَا النُّجُوْمُ زُوِّجَتْ اور اسی قسم کی اور متعدد پیشگوئیوں کی طرح رمضان کی راتوں کی بھی قسم کھائی جا سکتی تھی۔

اس سوال کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بیشک آئندہ امور کی قسم قرآن کریم میں موجود ہے مگر وہ تمام واقعات ایسے ہیں جن سے علم غیب وابستہ تھا۔ درحقیقت وہ پیشگوئیاں ہیں جو آئندہ زمانہ کے متعلق کی گئی تھیں اور پیشگوئی ایسی چیز ہے جو بندے کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ لیکن ایک پیر کا اپنے مرید کو کوئی حکم دیدینا اُس کے اپنے اختیار کی بات ہے اور اس میں ہرگز علمِ غیب کا کوئی حصہ نہیں۔ مثلاً تحریکِ جدید کا ہماری جماعت میں ۱۹۳۴ء سے آغاز ہوا ہے اگر میں اس تحریک کو شروع کرنے سے دو سال پہلے اعلان کر دیتا کہ ۱۹۳۴ء میں میں تحریک جدید جاری کروں گا اور جب ۱۹۳۴ء آتا تو تحریک جدید کو جاری کر کے کہتا کہ دیکھو یہ خدا تعالےٰ کا کتنا بڑا نشان ہے میں نے دو سال پہلے جو بات کہی تھی وہ پوری ہو گئی۔ تو ہر شخص ہنسنے لگ جاتا کہ اس میں نشان کی کونسی بات ہے۔ یہ تو اپنے اختیار کی چیز تھی کہ جب چاہا اپنے مریدوں کو حکم دے دیا اور جب چاہا نہ دیا۔ یا مثلاً میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ فلاں وقت میں سات روزے رکھنے کے متعلق اعلان کروں گا اور جب بھی وہ وقت آیا میں نے روزوں کے متعلق جماعت میں اعلان کر دیا۔ اب کیا میرا قبل از وقت یہ کہنا کہ میں فلاں مہینہ میں روزے رکھنے کا حکم دوں گا اور پھر اُس مہینہ کے آنے پر روزوں کا اعلان کر دینا اپنے اندر کوئی نشان رکھتا ہے کیا میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک معجزہ ہے جو ظاہر ہوا یا یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے خدا کی ہستی کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی طرح اگر رمضان کے روزوں کے متعلق کہہ دیا گیا تھا تو اس میں کونسی ایسی بات ہو گئی جس سے کافروں پر حجت تمام کی جا سکتی ہے۔ یہ تو ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم میں جو کچھ لکھا ہے اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے مگر کافر تو اس بات کو نہیں مانتا وہ تو کہتا ہے کہ یہ سب باتیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی طرف سے بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کی ہیں اور جبکہ کفار قرآن کریم کو خدا تعالیٰ کا کلام مانتے ہی نہیں تو اُن کے سامنے یہ بات بطور حجت کس طرح پیش کی جا سکتی ہے کہ بارہ سال بعد رمضان کے روزے فرض کئے جائیں گے اور اُس کی دس راتیں بڑی اہمیت رکھیں گی۔ ایک مخالف کہہ سکتا ہے کہ خود ہی بارہ سال پہلے ایک سکیم پیش کر دی گئی اور پھر خود ہی اس کے مطابق اعلان کر کے کہہ دیا کہ یہ خدا کا نشان ظاہر ہو گیا ہے۔ اس میں نشان کی کونسی بات ہے ایسا تو ہر شخص کر سکتا ہے۔

پس یہ بالکل غلط ہے کہ جس رنگ میں قرآن کریم نے آئندہ زمانہ میں رُونما ہونے والے واقعات کی قسم کھائی ہے اُسی رنگ میں رمضان کی راتوں کی قسم سمجھی جا سکتی ہے۔ رمضان کے روزوں کا حکم دینا بندے کا اختیاری فعل ہے چند سال پہلے ہی اپنی کسی سکیم کا اعلان کر دینا اپنے اندر کوئی نشان نہیں رکھتا لیکن آئندہ زمانوں میں رُونما ہونے والے واقعات کی خبر دینا جو انسان کے اختیار میں نہ ہوں یہ کام یقیناً کسی انسان کا نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی قسم کھائی گئی ہے وہاں ایسے ہی واقعات کے متعلق قسم کھائی گئی ہے جو آئندہ زمانوں میں رونما ہونیوالے تھے اور جن پر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یا آپ کی اُمت کو نہ کوئی اختیار حاصل تھا نہ اختیار حاصل ہونا ممکن ہو سکتا تھا اور جو خدا تعالےٰ کی ہستی اور اُسکی قدرت اور اس کے علم کا ایک زبردست نشان تھے مثلاً یہ کہا گیا کہ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ۔ ایک زمانہ آئیگا جب سورج اور چاند کو گرہن لگے گا۔ اب بتاؤ کہ کیا سورج اور چاند کو گرہن لگانا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طاقت میں تھا؟ یا اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ میں جب ریل اور تار اور ڈاک کی ایجاد کی خبر دی گئی تھی تو کیا ان چیزوں کی ایجاد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اختیار میں تھی؟ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ خبریں ایسی تھیں جن کو پورا کرنا کسی انسانی طاقت کا کام نہیں تھا بلکہ اللہ تعالےٰ ہی ان کو پورا کر سکتا تھا اسی لئے اِن واقعات کو اللہ تعالےٰ کی ہستی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

غرض قسمیں اُنہی امور کے متعلق کھائی جاتی ہیں جو مستقبل سے تعلق رکھنے والے ہوں یا ہوں تو زمانۂ ماضی کے مگر اُن سے اللہ تعالےٰ کی طاقت اور اس کی قدرت کا اظہار ہوتا ہو۔

زمانۂ حال کے ایک مفسّر نے لکھا ہے کہ رمضان کی آخری دس راتوں کو بطور شہادت اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ ان میں روزے رکھ کر انسان کے تقویٰ اور اس کی روحانیت میں خاص طور پر ترقی ہوتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا کافر بھی یہ مانتا ہے کہ روزہ سے تقویٰ بڑھتا ہے یا روحانیت میں اضافہ ہوتا ہے؟ وہ دس روزوں کا ہی نہیں بلکہ سارے روزوں کا بھی یہ نتیجہ تسلیم نہیں کرتا۔ سارے کیا اگر کوئی شخص پچاس سال بھی متواتر روزے رکھتا چلا جائے تو وہ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ان روزوں سے اُس کی روحانیت میں اضافہ ہُوا ہوگا پس جس بات کو وہ مانتا ہی نہیں اُسے بطور شہادت اُس کے سامنے کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے؟ وہ تو یہی کہے گا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے روزوں سے روحانیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ پس قسمیں اُنہی واقعات کے متعلق کھائی جا سکتی ہیں جو مستقبل سے تعلق رکھتے ہوں اور جن سے اللہ تعالےٰ کی ایسی قدرت کا اظہار ہوتا ہو جو دشمنانِ دین کے لئے حجت ہو سکے اور یا پھر اُن واقعات پر قسمیں کھائی جاتی ہیں جو گو زمانۂ ماضی سے تعلق رکھتے ہوں مگر اللہ تعالےٰ کی ہستی اور اُس کی قدرت کا نشان اُن سے ظاہر ہو چکا ہو۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی۔ آپ کے ساتھ اللہ تعالےٰ کے وعدے اور اللہ تعالےٰ کا ان وعدوں کو پورا کرنا یہ سب زمانۂ ماضی سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں مگر چونکہ تاریخی طور پر یہ باتیں ثابت ہیں دشمن ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے انہیں دشمن کے سامنے بطور حجت پیش کیا جا سکتا ہے لیکن روحانی ترقی تو ایک ایسی چیز ہے جو دوست کو بھی نظر نہیں آتی کجا یہ کہ اُسے دشمن کے سامنے پیش کیا جائے۔ پس یہ بات یہاں چسپاں ہی نہیں ہو سکتی کہ جس طرح آئندہ زمانہ میں ہونے والے واقعات کی قرآن کریم نے قسم کھائی ہے اسی طرح رمضان کی کھائی ہے قرآن کریم میں قسم اُن واقعات کی کھائی گئی ہے جن سے علم غیب وابستہ تھا مثلاً سورج گرہن۔ عوام کی بیداری۔

بادشاہتوں کی تباہی۔ ان امور کے متعلق قبل از وقت خبر یقیناً خدا تعالےٰ کی قدرت کا ایک زبردست ثبوت ہے مگر رمضان کے روزے تو علم غیب اپنے اندر نہیں رکھتے ہر شخص اپنی جماعت کو ایک حکم دے سکتا ہے اور ایسا حکم اس کی سچائی کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ کفار کے نزدیک وہ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا فعل تھا اور عبادت کے طور پر اُس کی خبر مکہ والوں کو پہلے دینے میں کوئی فائدہ نہیں تھا۔

غرض خدا تعالےٰ کی قدرت اور اس کے نشان کے طور پر وہی بات پیش کی جا سکتی ہے جو علم غیب اپنے اندر رکھتی ہو جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زلزلۃ الساعۃ کی خبر دی۔ اب یہ ایسی خبر ہے جس کو پورا کرنا کسی انسان کے اختیار کی بات نہیں۔ اس خبر کو اگر خدا تعالےٰ کی ہستی اور اس کی قدرت کا ثبوت قرار دیا جائے تو یہ بالکل درست ہوگا لیکن احکام کی قسم کھانے سے اس کی قدرت کا کچھ بھی اظہار نہیں ہوتا پس رمضان کی راتوں کی قسم چونکہ اپنے اندر کوئی علم غیب یا ایسا اظہارِ قدرت اپنے اندر نہیں رکھتی جیسے کہ مثلاً وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ کی قسمیں رکھتی ہیں۔ کہ ہیں تو ماضی کے امور۔ آئندہ کا علم غیب اُن میں نہیں مگر ماضی کے علم غیب کے ظہور کا ثبوت ان میں موجود ہے جس کا دشمن انکار نہیں کر سکتا۔ یا مثلاً اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ وغیرہ پیشگوئیاں ہیں کہ یہ سب کی سب اپنے اندر علم غیب رکھتی ہیں اور خدا تعالےٰ کی قدرت کا ثبوت ہیں اس لئے وہ قسم فضول ہے اور قرآن کریم ایسی فضول قسموں سے بالا ہے۔

غرض لَيَالٍ عَشْرٍ میں واقعۂ ابراہیمی کی طرف اشارہ یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نجات کی طرف تو ایک معقول بات بن سکتی ہے لیکن رمضان کی پہلی یا پچھلی راتوں کا ذکر ان آیات سے نکالنا اپنے اندر کوئی حکمت کی بات نہیں رکھتا۔ غیب کی خبریں خواہ ماضی میں پوری ہو چکی ہوں یا آئندہ پیدا ہونے والی ہوں بے شک ایمان افزا ہوتی ہیں مثلاً خدا تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا کہ میں تجھے اور بنی اسرائیل کو فرعون پر غلبہ دونگا اور پھر خدا تعالےٰ نے اپنے اس وعدہ کو پورا کر کے فرعون کو غرق کر دیا اور بنی اسرائیل کو اُس کے مظالم سے نجات دی۔ اب گو یہ زمانۂ ماضی کا ایک واقعہ ہے مگر تاریخ میں یہ واقعہ محفوظ ہے اور اسے دشمن کے سامنے بطور حجت پیش کیا جا سکتا ہے۔ آج بھی جب یہ واقعہ کسی کے سامنے بیان کیا جائے گا خدا تعالیٰ کی ہستی کا ایک نیا ثبوت اُسے نظر آنے لگ جائے گا۔ بے شک حضرت موسیٰؑ فوت ہو گئے فلسطین پر جو حکومت قابض تھی وہ جاتی رہی۔ مگر باوجود اس کے آج بھی جب کسی ہندو یا سکھ کے سامنے ان واقعات کو پیش کیا جائے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ کہیگا خواہ موسیٰؑ مر گئے فلسطین سے یہود کی حکومت مٹ گئی مگر اس کے باوجود یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور تاریخ اس کی سچائی پر شاہد ہے کہ موسیٰ نہایت ادنیٰ اور کمزور حالت میں تھے۔ بنی اسرائیل کی فرعون کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی وہ جس طرح چاہتا اُن سے سلوک کرتا۔ ایسی کمزور اور ذلیل حالت میں اللہ تعالےٰ نے موسیٰؑ سے وعدہ کیا کہ میں تجھے کامیاب کروں گا۔ واقعات اُن کی کامیابی کے خلاف تھے مگر خدا نے اپنے وعدہ کو پورا کیا۔ فرعون اپنی ساری طاقت اور اپنے سارے لشکر اور اپنے سارے ساز و سامان کے باوجود ناکام ہوا۔ ناکام و نامراد ہونے کی حالت میں مرا اور موسیٰؑ اپنے ساتھیوں سمیت خدا تعالےٰ کے وعدہ کے مطابق کامیاب ہو گیا۔ یہ واقعہ خواہ ماضی کا ہے مگر تاریخی شہادت اس ماضی کو ایسا شاندار بنا دیتی ہے کہ آج بھی اس واقعہ کو پڑھکر اللہ تعالےٰ کی قدرت کا نقشہ انسانی آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اسی طرح ابراہیمؑ فوت ہو چکے

جو پیشگوئیاں انہوں نے کی تھیں وہ قصۂ ماضی بن چکیں مگر اس کے باوجود اُس ماضی کا بھی ایک ماضی تاریخ میں محفوظ ہے جب ہم اس گذشتہ ماضی میں جا کر اس واقعہ کو مستقبل کی نظر سے دیکھتے ہیں تو ہمیں خدا تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز اور عجیب نشان نظر آتا ہے ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو زمانۂ حاضر میں کھڑے ہو کر نہیں دیکھتے بلکہ ابراہیمؑ کے وقت کی تاریخ میں دیکھتے ہیں اور ہم سوچتے ہیں کہ کیا اس قسم کی پیشگوئی کرنا ابراہیمؑ کے لئے ممکن تھا اُس وقت جب ہم تاریخ کی نلکی میں سے جھانکتے ہوئے ابراہیمؑ کے زمانہ تک پہنچتے ہیں۔ جب ہم ماضی سے مستقبل کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں یہ ایک زبردست پیشگوئی نظر آتی ہے اور ہمارا دل اس یقین سے پُر ہو جاتا ہے کہ یہ خدا کا ایک زندہ نشان ہے جو ابراہیمؑ کے ذریعہ ظاہر ہُوا۔ تو بعض ماضی بھی خدا تعالےٰ کی قدرت کا ثبوت ہوتے ہیں کیونکہ اس ماضی کا بھی ایک ماضی تھا جب ہم گذشتہ ماضی میں کھڑے ہو کر مستقبل کو دیکھتے ہیں تو یہ ماضی ہمارے لئے ایک نشان بن جاتا ہے اور مستقبل تو ظاہر ہی ہے۔ جب ایک پیشگوئی پوری ہو جاتی ہے تو وہ ایک زندہ ثبوت ہوتی ہے خدا تعالےٰ کی ہستی اور اسکی قدرت اور اس کے جلال اور اس کی عظمت کا۔ مگر رمضان کے روزوں کی جو ابھی نازل نہیں ہوئے تھے قسم کھانے سے ان فوائد میں سے جو قرآنی قسموں میں ہیں ایک فائدہ بھی پایا نہیں جاتا۔

اس اصولی سوال کو نظر انداز کر دو تو پھر بھی سوال ہے کہ رمضان کی پہلی راتوں میں سے فجر کس امر کی شہادت دیتی ہے کہ اسے الگ کر کے بیان کیا ہے؟ پھر اس میں شفع اور وتر کا کیا سوال ہے کہ ان کا ذکر کیا گیا ہے؟ پھر وہ کونسی رات ہے جسے اِذَا یَسْرِ کہا گیا ہے اور اس رات سے کیا شہادت نکلتی ہے؟ اور اگر آخری راتیں مراد ہیں پھر اَلْفَجْرِ سے کیا مراد ہے یعنی اگر پہلی دس راتیں مراد ہیں تو اَلْفَجْرِ سے کیا مراد ہے اور اگر آخری دس راتیں مراد ہیں تو اَلْفَجْرِ سے کیا مراد ہے؟ اور اَلْفَجْرِ میں پہلی راتوں کی کسی فجر کا ذکر ہے یا آخری راتوں کی کسی فجر کا ذکر کیا ہے؟ آخری یا پہلی راتیں مراد لینا تو پھر بھی ایک معقول بات ہے۔ کیونکہ پہلی راتیں رمضان کے شروع کی ہیں اور دوسری راتیں رمضان کے اختتام کی۔ ایک کی یہ عظمت بیان کیجا سکتی ہے کہ اُن سے رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہوتا ہے اور دوسری راتوں کی یہ عظمت بیان کی جا سکتی ہے کہ اُن پر رمضان کا اختتام ہوتا ہے اور اس وجہ سے وہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان راتوں کی کونسی فجر ایسی خصوصیت رکھتی ہے کہ اُس کی قسم کھائی گئی ہے اور جس سے دشمن پر حجت تمام کی جا سکتی ہے اور اُسے خدا تعالیٰ کی قدرت کا قائل کیا جا سکتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس جگہ فجر سے لیلۃ القدر کی فجر مراد ہے کیونکہ اللہ فرماتا ہے ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (سورۃ القدر ع) لیلۃ القدر مطلع فجر تک ہوتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ لیلۃ القدر مبارک ہوتی ہے نہ کہ اس کی فجر۔ فجر کو تو وہ برکات ختم ہو جاتی ہیں پھر اُس وقت کی قسم کیوں کھائی گئی ہے؟ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ جو مبارک چیز تھی یعنی لیلۃ القدر اس کا تو ذکر ہی نہیں کیا اور جس میں کوئی خاص بات نہ تھی یعنی فجر اُسے بیان کر دیا حالانکہ اس سے کسی خاص مبارک وقت کی طرف اشارہ پایا ہی نہیں جاتا۔ پھر سوال یہ ہے کہ ان دس راتوں میں سے وتر کس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے اور شفع کس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ وتر سے مراد یہاں لیلۃ القدر ہے کیونکہ لیلۃ القدر وتر رات میں آتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں وتر کے ساتھ شفع کا بھی ذکر آتا ہے۔ یہاں صرف یہ نہیں کہا گیا کہ ہم ایک وتر کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں بلکہ وتر اور شفع دونوں کو اکٹھا بطور شہادت پیش کیا گیا ہے اگر وتر سے مراد رمضان کے آخری عشرہ کی وتر راتیں مراد ہیں اور شفع سے مراد آخری

عشرہ کی جفت راتیں۔ تو شفع کے لحاظ سے پانچ راتیں مبارک ہوں گی اور وتر کے لحاظ سے بھی پانچ مبارک ہوں گی یا کبھی دس کی بجائے صرف نَو راتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ بہرحال جب دس راتوں میں سے پانچ شفع اور پانچ وتر ہیں یا چار شفع اور پانچ وتر ہیں۔ تو یا تو شفع اور وتر سے ساری راتیں مراد ہوں گی اور یا پھر اُن میں سے کوئی ایک وتر اور ایک شفع مراد ہوگی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وتر سے مراد صرف ایک وتر رات مراد ہے جو لیلۃ القدر ہوتی ہے تو شفع سے مراد بھی کوئی ایک ایسی جفت رات ہونی چاہیئے جو خاص حیثیت رکھنے والی ہو مگر شفع کے معنے کرتے وقت تو اُن پانچوں راتوں کو لے لینا جو جفت ہوں یا چار راتوں کو لے لینا جو جفت ہوں اور وتر سے مراد صرف ایک رات لینا یہ کوئی معقول بات نہیں ہے۔

پھر یہ سوال بھی ہے کہ لیلۃ القدر تو وتر راتوں میں سے ایک ہے لیکن وتر راتیں تو دس راتوں میں کئی آتی ہیں اُن کی قسم کیوں کھائی ہے یا کس قرینہ سے لیلۃ القدر کے سوا دوسری وتر راتوں کو خارج سمجھا جائے اور پھر شفع کی قسم کی کیا وجہ ہے اگر شفع بھی مبارک ہیں اور وتر بھی تو الگ بیان کرنے کی وجہ کیا تھی؟ لَيَالٍ عَشْرٍ میں ان ساری راتوں کا ذکر آچکا تھا۔ آخر شفع اور وتر سے یہی مراد لیا جائے گا کہ پانچ طاق راتیں اور پانچ جفت راتیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ ذکر تو لَيَالٍ عَشْرٍ میں پہلے ہی آچکا ہے شفع اور وتر کے ساتھ جفت اور طاق راتوں کا الگ الگ ذکر کیوں کیا گیا ہے جب اللہ تعالیٰ نے دس راتوں کی قسم کھائی تھی تو اُن میں وتر راتیں بھی آگئی تھیں اور جفت بھی اُن کا ذکر علیحدہ کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ پھر سب سے آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ کیا شئے ہے لَيَالٍ عَشْرٍ میں تو دس راتیں سب آگئی تھیں جو در اصل نو ہوتی ہیں دس ہوتی ہی نہیں لیکن یہاں ایک گیارھویں رات کا بھی ذکر ہے۔ اگر اعتکاف مراد لو تو اُس کی بھی گیارہ راتیں کسی صورت میں نہیں ہوتیں یا دس بنیں گی یا نَو۔ ہاں بعض دفعہ گیارہ دن ہوجاتے ہیں۔ غرض کوئی معنے آیاتِ قرآنیہ سے مطابقت نہیں کھاتے اور ہر ایک پر متعدد اور شدید اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

سورۂ فجر کی پہلی چار آیات کی خدا تعالیٰ کی بتائی ہوئی تفسیر

اب میں اپنے معانی بیان کرتا ہوں جو مجھے اللہ تعالیٰ نے یکدم سجدۂ آخری سے اُٹھتے ہوئے عصر کی نماز میں بدھ کے دن سمجھائے۔

ان آیات میں چار باتیں بیان ہوئی ہیں۔
اوّل وَالْفَجْرِ دوم وَلَيَالٍ عَشْرٍ سوم وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ چہارم وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ۔

ان چاروں کی قسم دو طرح ہوسکتی ہے یا یہ سارے امور ایک ہی واقعہ کے چار اہم جزو ہیں۔ یعنی یا تو یہ کہنا پڑے گا کہ ان آیات میں صرف ایک واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے مگر اس ایک واقعہ کے چار اہم جزو الگ الگ بیان کر دئے گئے ہیں اور یہ صورت بالکل جائز ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مفسرین کے بیان کردہ معنوں کو ہم مان سکتے تھے بشرطیکہ چاروں باتیں آپس میں منطبق ہوجاتیں مگر چونکہ اُن کے پیش کردہ معانی پر تمام آیات پوری نہیں اُترتیں اس لئے ہم اُن کو تسلیم نہیں کرسکتے۔ بہرحال ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ کے چار اہم جزو ہوں اور یا پھر یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ چاروں الگ الگ واقعات ہیں اگر ثابت ہوجائے کہ وَالْفَجْرِ سے اور واقعہ کی طرف اشارہ ہے وَلَيَالٍ عَشْرٍ سے اور واقعہ کی طرف۔ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ سے اور واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ سے اور واقعہ کی طرف۔ تو یہ بھی ایک معقول توجیہ ہوسکتی ہے اور ہم اسے تسلیم کرسکتے ہیں بشرطیکہ یہ چاروں اہم واقعات سے تعلق رکھنے والے امور ہوں اور آپس میں کوئی جوڑ اور تعلق رکھتے ہوں اور یا پھر ان کے متعلق یہ صورت تسلیم کی جاسکتی ہے کہ یہ

دو یا تین مجموعے ہیں جن کو بیان کیا گیا ہے مثلاً ثابت کیا جائے کہ فلاں فلاں دو باتیں الگ بیان کی گئی ہیں اور فلاں فلاں دو باتیں الگ بیان کی گئی ہیں اور یہ چار الگ الگ واقعات نہیں بلکہ دو مختلف مجموعے ہیں۔ یا مثلاً ثابت کیا جائے کہ وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ میں دوسرا اور وَاللَّيْلِ اِذَا يَسْرِ میں تیسرا۔ تو یہ بھی درست ہو سکتا ہے غرض یہ تینوں صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ سارے امور ایک ہی واقعہ کے چار اہم جزو ہیں یا چاروں الگ الگ واقعات ہیں یا دو یا تین مجموعے ہیں۔ سابق مفسرین نے ان کو ایک ہی واقعہ کے مختلف حصے قرار دیا ہے اور انہوں نے کوشش کی ہے کہ ایک ہی واقعہ پر لَيَالٍ عَشْرٍ کو چسپاں کریں۔ اُسی کو شفع کا مصداق قرار دیں اور اسی کو وتر قرار دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذہن اس طرف گیا ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ کے مختلف حصے ہیں جیسے محرم کی راتیں اور اُس کی فجر اور اس کی نمازیں یا ذی الحجہ کے ایام اُسکی راتیں اور بعض دن اور فجر۔ یا رمضان کی راتیں اُسکی کوئی فجر اور بعض راتیں۔ غرض اس امر میں اتفاق ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ کے مختلف پہلو ہیں۔ مگر جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں بیان کردہ تفسیریں سارے پہلوؤں پر مشتمل ثابت نہیں ہوتیں اور کوئی حقیقت باہرہ اُن سے ظاہر نہیں ہوتی۔

میرے نزدیک فجر چونکہ ایک بیان ہوئی ہے اور راتیں دس بیان ہوئی ہیں حالانکہ دس راتوں کی دس فجریں ہوتی ہیں اور راتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے دس راتوں کا ذکر ہے درمیان میں شفع اور وتر کا ذکر ہے اور آخر میں پھر ایک رات کا ذکر ہے اس لئے میرے نزدیک صحیح مضمون پر پہنچنے کے لئے ہمیں سب سے زیادہ اس امر پر غور کرنے سے مدد مل سکتی ہے کہ یہاں فجر ایک بیان ہوئی ہے اور راتیں دس بیان کی گئی ہیں۔ پھر اِن دس راتوں کے بعد کوئی واقعہ شفع اور وتر کا ہے پھر کسی اور رات کا ذکر کیا گیا ہے جو چلی گئی۔ گویا دو فجروں کا ذکر کیا گیا ہے ایک فجر وہ ہے جس کا دس راتوں کے ساتھ تعلق ہے پھر شفع اور وتر کا کوئی واقعہ ہے اور پھر ایک رات کا ذکر ہے جو دُور ہو گئی یعنی اس کے بعد پھر ایک اور فجر کا طلوع ہو گیا۔ اگر ہمیں کسی ایسے واقعہ کا علم حاصل ہو جائے جس میں یہ سب باتیں پائی جائیں اور وہ واقعہ ایسا ہو کہ ان تمام حصوں پر پوری طرح چسپاں ہو جاتا ہو تو دوست اور دشمن کوئی بھی اس کی صحت سے انکار نہیں کر سکتا پس ان آیات میں پہلے دس راتیں بیان ہوئی ہیں جن کے ساتھ فجر کا تعلق ہے۔ پھر شفع اور وتر کا ذکر ہے اور پھر ایک رات کے چلے جانے کا۔ جس کے یہ معنے ہیں کہ یہاں رات پر زور دینا مدنظر نہیں بلکہ رات کے دُور ہو جانے پر زور دینا مدنظر ہے لَيَالٍ عَشْرٍ میں رات پر زور دینا مقصود تھا۔ مگر وَاللَّيْلِ اِذَا يَسْرِ میں رات کے چلے جانے پر زور دینا مقصود ہے۔

چونکہ دنیا میں کوئی دس راتیں ایسی نہیں ہوتیں جن کی ایک فجر ہو اور کوئی دس راتیں ایسی نہیں ہوتیں جن کے بعد شفع اور وتر کا کوئی واقعہ ہو اور کوئی شفع اور وتر کا واقعہ ایسا نہیں ہوتا جس کے بعد ایک رات ہو اس لئے لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس جگہ جن راتوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کا مادی سورج کے چڑھنے اور ڈوبنے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور ایک رات سے مراد بھی کوئی ایسی رات نہیں جس میں سورج ایک طرف سے چڑھتا اور دوسری طرف نکل جاتا ہے کیونکہ دس راتوں کے بعد ایک فجر نہیں ہوتی۔ اور نہ دس راتوں اور ایک رات کے درمیان کوئی شفع اور وتر ہوتا ہے پس یہاں ظاہری راتیں کسی صورت میں مراد ہی نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ عقلاً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس جگہ رات اور فجر کے الفاظ استعارۃً استعمال ہوئے ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں۔ کیونکہ کوئی ظاہری دس راتیں ایسی نہیں ہوتیں جن کے بعد ایک فجر ہو۔ کوئی ظاہری دس راتیں ایسی نہیں

ہوتیں جن کے بعد شفع اور وتر کا کوئی واقعہ ہو۔ اور کوئی ظاہری ایک رات ایسی نہیں ہوتی جس کے بعد فجر ہی فجر ہے۔

پھر راتوں کے ذکر میں یہ فرق پایا جاتا ہے کہ لَیَالٍ عَشْرٍ میں تورات کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے مگر ایک رات کے ذکر میں اُس رات کے جانے اور دن کے نکل آنے پر زور دیا گیا ہے۔

الغرض میرے نزدیک اس آیت کی ترتیب یوں ہے۔ دس راتیں[۱] پھر ایک فجر[۲] اور اس کے بعد شفع[۳] اور وتر کا کوئی واقعہ اور پھر ایک رات[۴] اور پھر ایک طویل فجر۔ گویا اس واقعہ میں دس راتوں کے بعد ایک فجر اور اس کے بعد ایک شفع و وتر کا واقعہ اور اس کے بعد ایک رات اور ایک لمبی فجر کا ذکر ہے۔ پہلی فجر کو دس راتوں سے پہلے اس لئے بیان کیا گیا ہے (حالانکہ فجر رات کے بعد ہوتی ہے) کہ یہ امر واضح تھا کہ رات سے پہلے فجر نہیں ہوتی بلکہ بعد میں ہوتی ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ فجر کا ذکر پہلے اور راتوں کا ذکر بعد میں کرنے کی وجہ کیا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ فجر کے لفظ میں ایک خوشخبری تھی اور دنیا میں یہ ایک عام طریق ہے کہ جب ہم اپنے دوست سے کسی ایسے واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جو تکلیف دہ ہو لیکن اُس کا انجام اچھا ہو تو ہم اُس کے خوش انجام کا ذکر پہلے کر دیتے ہیں اور غم انگیز حصہ کو بعد میں بیان کرتے ہیں تا اُسے زیادہ صدمہ نہ ہو۔ مثلاً اگر ہمارا کوئی دوست بیمار ہو اور کوئی شخص اس کی تیمارداری کے لئے جائے اور اُس بیمار کی حالت پہلے سے اچھی ہو اور وہ آکر پہلے بیماری کی تفاصیل نہیں شروع کر دے گا بلکہ مثلاً یوں کہے گا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب اچھے ہیں بیچ میں تو خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ پہلے تفصیلی حالات بیماری کی تکالیف کے سنانے لگ جائے اور اس کی خیریت کے متعلق بعد میں جا کر خبر دے۔

سورۂ فجر کی پہلی چار آیات میں واقعاتی ترتیب

چنانچہ اُحد کے موقعہ پر جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر لوگوں میں مشہور ہوئی اور مدینہ سے عورتوں اور بچوں کا ایک گروہ اُحد کے میدان کی طرف چل پڑا تو اُس وقت اسلامی لشکر واپس آ رہا تھا ایک عورت بے تابانہ آگے بڑھی اور اس نے ایک مسلمان سپاہی سے دریافت کیا بتاؤ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کیا حال ہے؟ اُس نے بجائے اس کے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت کی خبر اُسے دے یہ جواب دیا کہ تمہارا خاوند اس جنگ میں مارا گیا ہے۔ اُس نے کہا میں تم سے اپنے خاوند کی خبر دریافت نہیں کر رہی پہلے یہ بتاؤ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ اور جب اُس نے کہا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خیریت سے ہیں تو عورت خوشی سے بول اٹھی کہ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم خیریت سے ہیں تو پھر مجھے اپنے کسی غم کی پروا نہیں ہے تو دیکھو اُس عورت نے خوشی کی خبر پہلے سننی چاہی اور غم کی بعد میں۔ اس نے سمجھا کہ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو میرا دل اس خوشی کی خبر کی وجہ سے اور صدمات کو برداشت کر سکتا ہے لیکن اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم زندہ نہیں تو پھر میرا دل کسی صدمہ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تو قاعدہ یہی ہے کہ جب خوشی اور غم کسی خبر کا جزو ہوں تو پہلے خوشی کی خبر سنائی جاتی ہے تاکہ غم کی خبر زیادہ تکلیف نہ دے۔ پس چونکہ خوشی کی خبر پہلے بیان کی جاتی تبشیر کے موقع پر زیادہ مناسب ہوتی ہے اس لئے بجائے یوں کہنے کے کہ ہم دس راتوں اور اُن کے بعد کی فجر کو بطور شہادت بیان کرتے ہیں یہ فرمایا کہ ہم فجر اور اُس سے پہلے آنے والی دس راتوں کو بطور شہادت بیان کرتے ہیں۔ اگر پہلے ہی دس راتوں کا ذکر کر دیا جاتا تو مسلمان اس خبر کو سُن کر کانپ اُٹھتے، انکے دل لرز جاتے اور وہ سخت فکر اور غم میں مبتلا ہو جاتے کہ نہ معلوم اب کیا بننے والا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بجائے یہ فرمانے کے کہ

ہم دس راتوں اور اُن کے بعد کی فجر کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں یہ کہہ دیا کہ ہم فجر اور اُس سے پہلے آنیوالی دس راتوں کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں اور اس کے بعد ہونے والے ایک شفع اور وتر کے واقعہ کو اور پھر اس کے بعد ایک رات کے چلے جانے یعنی صبح کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں گویا بات تو وہی رہی مگر مومنوں کے دل کو تسلّی ہوگئی کہ کسی خاص فکر کی ضرورت نہیں آخر نتیجہ ہمارے حق میں ہی نکلے گا چنانچہ اس خبر کو لَيَالٍ عَشْرٍ سے شروع کرنے کی بجائے وَالْفَجْرِ سے شروع کیا اور مسلمانوں کو بتایا کہ اب جو خبر آ رہی ہے اس سے یہ نہ سمجھنا کہ آخری نتیجہ تمہارے حق میں خراب نکلے گا۔ آخری نتیجہ بہرحال اچھا ہوگا اور اس کو ہم اُن راتوں کے ذکر سے پہلے ہی بیان کر دیتے ہیں تاکہ تمہارے دل مطمئن رہیں اور اس خبر سے پریشان نہ ہوں۔

سورۃ فجر میں دس راتوں سے مراد مسلمانوں کی مخالفت کے دس سال

پس یہاں رات کا لفظ حقیقی معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ استعارۃً استعمال کیا گیا ہے کیونکہ کوئی ظاہری دس راتیں ایسی نہیں ہوتیں جن کی ایک فجر ہو ہاں استعارۃً دس راتوں کی ایک فجر ہو سکتی ہے۔ بہرحال یہ چار واقعات ہیں جن کا سورۃ الفجر کی ان چار آیات میں ذکر آتا ہے۔ پہلے یہ خبر دی گئی ہے کہ دس راتیں آئینگی پھر یہ خبر دی گئی ہے کہ ان دس راتوں کے بعد فجر آئیگی پھر یہ خبر دی گئی ہے کہ ایک شفع اور وتر کا واقعہ ہوگا اور پھر یہ خبر دی گئی ہے کہ ایک رات ہے جو چلی جائیگی۔

ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ کونسے واقعات ہیں جن کا ان آیات میں ذکر آتا ہے۔ اگر ہم قیاسات سے کام لیں اور محض عقلی ڈھکوسلوں تک اپنے آپ کو محدود رکھیں تو یقیناً ہم کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے اور ہم اُسی رَو میں بہتے چلے جائیں گے جس رَو میں سابق مفسّرین بہ گئے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان واقعات کو قرآن کریم سے ثابت کریں۔ ہم ان واقعات کو اسلامی تاریخ سے ثابت کریں۔ ہم ان واقعات کو مہتم بالشان واقعات سے ثابت کریں اور ہم علیٰ وجہ البصیرت اس بات کو بیان کر سکیں کہ یہ وہ واقعات ہیں جن کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے جو اسلام کی سچائی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، جن میں قرآنی ترتیب پوری طرح پائی جاتی ہے اور جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے لئے بطور ثبوت اور حجت کفار کے سامنے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اگر ایسے واقعات ہمیں قرآن کریم سے مل جائیں، اسلامی تاریخ سے مل جائیں، ترتیب آیات پر وہ پورے اُتریں اور پھر اسلام اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صداقت کا بھی زندہ ثبوت ہوں تو یقیناً انہی واقعات کی طرف ان آیات میں اشارہ سمجھا جائے گا۔

مَیں نے اس سورۃ پر سوچا اور سوچا مگر آخر معًا بطور القاء اس کا حل مجھے ملا۔

مَیں یہ بتا چکا ہوں کہ دس راتوں کا ذکر محلًّا پہلے ہے گو ذکراً دوسرے نمبر پہ ہے اور میں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ یہ دس راتیں عام راتیں نہیں بلکہ استعارۃً انکو راتیں کہا گیا ہے۔ پھر مَیں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ یہ سورۃ تیسرے سال کے آخر میں نازل ہوئی ہے جب ابھی منظّم مخالفت اسلام کی شروع نہیں ہوئی تھی۔ جب ابھی مسلمانوں کو کچلنے اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے اجتماعی طور پر کفار نے شروع نہیں کئے تھے۔ وہ انفرادی طور پر تو اذیت پہنچانے کی کوشش کرتے تھے مگر اکثر ایسے تھے جو اسلام کو مذاق میں اڑا دیتے تھے۔ وہ مسلمانوں کو پاگل اور مجنون کہکر خاموش ہو جاتے اور سمجھتے کہ یہ چند سر پھرے لوگ ہیں انہوں نے ہمارا کیا بگاڑ لینا ہے خود ہی چند دنوں تک خاموش ہو جائیں گے۔ عملی مخالفت جو انہوں نے بعد میں ایک تنظیم کے ماتحت کی اور جس میں مسلمانوں کو بڑے بڑے دُکھ پہنچائے گئے وہ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی قریباً تین سال رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعویٰ نبوت پر

گذر چکے تھے کہ اُس وقت خدا تعالےٰ نے اس سورۃ کو نازل کیا اور مسلمانوں کو بتایا کہ اب تمہاری شدید ترین مخالفت ہونے والی ہے۔ مصائب اور تکالیف کی بھیانک راتیں تم پر چھا جانے والی ہیں۔ ایک کے بعد ایک رات آئے گی مگر کامیابی کی کوئی شعاع تمہیں نظر نہیں آئے گی اور یہ سلسلہ ممتد ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ پورے دس سال تمہیں ان مصائب اور مشکلات کا تختۂ مشق بننا پڑے گا۔ اب غور کرو یہ بات کس حیرت انگیز طور پر پوری ہوئی۔ تیسرے سال کے آخر میں یہ سورۃ نازل ہوتی ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال تک مکہ میں رہے ہیں۔ پہلے تین سال مخالفت نہیں ہوئی لیکن اس کے بعد مکہ والوں نے شدید ترین مخالفت شروع کر دی۔ تیرہ[۱۳] میں سے تین[۳] سال نکال دو تو باقی ٹھیک دس سال رہ جاتے ہیں جن میں مسلمان کفار کا تختۂ مشق بنے رہے اور یہی وہ دس سال تھے جنکی لَیَالٍ عَشْرٍ میں خبر دی گئی تھی اور جن مشکلات اور مصائب کے ہجوم کی وجہ سے استعارۃً رات قرار دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہم نے جو تمہیں عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ میں خبر دی تھی کہ اب یہ لوگ منظم مخالفت شروع کرنے والے ہیں وہ وقت اب آ پہنچا ہے۔ مصائب کا ایک شدید دَور تم پر اور تمہارے ساتھیوں پر آنے والا ہے، تاریک ترین راتیں، انتہائی بھیانک راتیں، جسم کو کپکپا دینے والی راتیں، لرزہ براندام کر دینے والی راتیں، ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں، مسلسل دس راتیں آئیں گی اور تم کو اور تمہاری قوم کو سخت مصیبت دیکھنی پڑے گی مگر اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پیشتر اس کے کہ ہم ان تاریک راتوں کی خبر دیں پہلے ہی تمہیں یہ خوشخبری سُنا دیتے ہیں کہ ان راتوں کے بعد فجر آنے والی ہے۔ بیشک مخالفت ہوگی اور شدید ہوگی مگر انجام بہرحال اچھا ہوگا۔ اسلام پھیلے گا، مسلمان غالب آئیں گے، اور مشکلات کے بادل دس سال گذرنے کے بعد پھٹ جائیں گے اور فجر ظاہر ہو جائے گی۔

چنانچہ ٹھیک چوتھے سال مکہ والوں نے اسلام اور مسلمانوں کی منظم مخالفت شروع کر دی اور مسلمانوں پر تاریک راتیں چھا گئیں۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ یہ سورۃ تیسرے سال کے آخر یا چوتھے سال کے شروع کی ہے اور مکہ والوں کی طرف سے منظم مخالفت چوتھے سال میں شروع ہوئی ہے اسلامی تاریخ اس پر متفق ہے اور یورپین مصنف بھی گو اسلام کے دشمن ہیں مگر تاریخی اعتبار سے یہ گواہی دینے پر مجبور ہوتے ہیں چنانچہ میور لکھتا ہے:۔

۳۰۱ اس بات کا ثبوت کہ مسلمانوں کی اصل مخالفت دعوٰی نبوت کے چوتھے سال شروع ہوئی

"It was not however till three or four years of his ministry had elapsed that any general opposition to Mohammad was organised."

یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت آپ کے دعوٰی کے تین چار سال بعد تک منظم صورت میں ظاہر نہیں ہوئی۔ آرگنائزڈ اور منظم مخالفت جس میں تمام قوم آپ کے خلاف کھڑی ہوگئی اور چھوٹوں بڑوں سب نے مل کر اسلام کو مٹانا چاہا وہ دعوٰی کے ابتدائی تین چار سالہ دَور میں نظر نہیں آتی۔

آرگنائزڈ مخالفت جیسا کہ نَاصِبَةٌ کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے یہ ہوتی ہے کہ باقاعدہ افسر مقرر کئے جاتے ہیں۔ مختلف لیڈر کھڑے کئے جاتے ہیں اور اُن سب سے کہا جاتا ہے کہ تم نے مل کر حملہ کرنا ہے اس قسم کی منظم مخالفت میور کے نزدیک ابتدائی تین چار سالوں میں شروع نہیں ہوتی۔

پھر لکھتا ہے:۔

Even after he had begun publicly to summon his fallow citizens to the faith, and his followers had multiplied the people did not gainsay his doctrine.

" اس وقت کے بعد بھی کہ آپ نے علانیہ اہلِ شہر کو دعوتِ اسلام دینی شروع کی اور باوجود اس کے کہ آپ پر ایمان لانے والے بڑھنے لگ گئے تھے لوگ آپکی بات کی تردید کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔"

یہ خیال ہوسکتا تھا کہ جب چند آدمی آپ کو مان چکے تھے اور آپ کے دعوٰی کو تسلیم کر چکے تھے تو بہرحال لوگوں میں آپ کے خلاف جوش پیدا ہوچکا ہوگا بالخصوص اس وجہ سے کہ آپ نے لوگوں میں وعظ شروع کر دیا تھا اور لوگوں کو اپنے مذہب کی تلقین شروع کر دی تھی۔ مگر میور لکھتا ہے یہ خیال درست نہیں باوجود اس کے کہ انہوں نے لوگوں کو علانیہ اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کر دی تھی اور اُن کے ماننے والوں کی تعداد بھی بڑھنے لگ گئی تھی لوگ یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم ان کو کچل دیں گے یا انکے مذہب کو مٹا دیں گے۔ بلکہ

They would only point at him slightingly as he passed and say there goeth the fellow from among the children of Abdul Muttalib to speak unto the people about the heavens.

وہ ان کی طرف حقارت اور نفرت سے دیکھتے ہوئے کہتے دیکھو وہ عبدالمطلب کی اولاد میں سے ایک شخص جا رہا ہے جو آسمان کی خبریں لوگوں کو سُناتا ہے۔ مگر تیسرے سال کے آخر یا چوتھے سال کے شروع میں انہوں نے اسلام کی آرگنائزڈ مخالفت کا فیصلہ کیا۔

ریورنڈ ویری لکھتے ہیں :-

This would be as Noeldeke has it about the fourth year of his ministry at Mekkah.

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کھلی اور منظم مخالفت جو مکہ میں ہوئی وہ جیسا کہ نولڈکے کا خیال ہے تیسرے سال کے آخر یا چوتھے سال کے شروع میں ہوئی ہے۔

پھر دیکھو وہ سورۂ فجر کی نسبت لکھتے ہیں :-

He (Noeldeke) however regards it as early Mekkan and in his chronological table places it immediately after Chapter LXXX VIII.

یعنی نولڈکے اس سورۃ کو ابتدائی مکی سورتوں میں شمار کرتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ غاشیہ کے معًا بعد نازل ہوئی ہے اور غاشیہ کے متعلق یہ بتایا جا چکا ہے کہ اس کا نزول چوتھے سال کے قریب ہوا ہے جبکہ مسلمانوں پر کفار مکہ کے مظالم شروع ہونے والے تھے۔

غرض یوروپین اور مسلمان مؤرخ سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ سورۃ چوتھے سال کے قریب نازل ہوئی ہے اور یہی وہ سال ہے جس میں کفار مکہ کی طرف سے منظم مخالفت کا آغاز ہوا اور انہوں نے مسلمانوں کو شدید ترین مصائب میں مبتلا کرنا شروع کر دیا۔ میور تسلیم کرتا ہے کہ ابتدائی تین سالوں میں مسلمانوں کی کوئی قابلِ ذکر مخالفت نہیں تھی۔

وہ مسلمانوں کو دیکھتے تو تمسخر اور استہزاء سے کام لے کر گذر جاتے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ کرتے دیکھتے تو حقارت سے کہتے یہ ایک پاگل ہے جو لوگوں کو آسمان کی باتیں سُنا رہا ہے۔ مگر چوتھے سال کے شروع میں جیسا کہ وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَۃٌ عَامِلَۃٌ نَّاصِبَۃٌ میں خبر دی گئی تھی انہوں نے کھلی اور منظم مخالفت شروع کر دی۔ اسلام کو مٹانے کے لئے اُن کے چھوٹے اور بڑے سب متحد ہو گئے اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیں گے۔

غرض تاریخی شہادتیں اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمانوں پر منظم ظلم چوتھے سال میں شروع ہُوا ہے یعنی ہجرت سے دس سال پہلے۔ اور یہ سورۃ اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہے۔ پس دس راتوں میں ظلم و تعدّی کے اُن دس سالوں کی خبر دی گئی ہے جن میں انسانیت اور شرافت کا مکّہ والوں نے جنازہ نکال دیا تھا اور منظم ظلم کے شروع ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالےٰ نے بتا دیا تھا کہ اب مکّہ والے عَامِلَۃٌ نَّاصِبَۃٌ بننے والے ہیں، اُن کی طرف سے ظلم و ستم کا بازار گرم ہونے والا ہے اور وہ اسلام کے خلاف اپنا پورا زور صرف کرنے والے ہیں۔ انفرادی طور پر بھی اور جماعتی طور پر بھی۔ اور یہ مظالم برابر دس سال تک چلے جائیں گے کہ ہر ایک سال ایک رات کی طرح ہوگا جس میں امید کی کوئی شعاع لوگوں کو نظر نہیں آئے گی مگر آخر ان دس راتوں کے گذرنے کے بعد جو انتہائی دکھ اور تکلیف کی راتیں ہونگی اللہ تعالےٰ فجر کا طلوع کر دے گا یعنی مصائب اور تکالیف کی یہ راتیں کٹ جائیں گی اور ایک نیا دَور مسلمانوں کی ترقی کا شروع ہو جائے گا

یہ فجر اس طرح ہوئی کہ اللہ تعالےٰ نے کسی نہ کسی رنگ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر مدینہ میں پہنچا دی۔ یہودی لوگ مشرکین سے کہا کرتے تھے کہ ہماری کتابوں میں ایک آنے والے موعود کی خبر پائی جاتی ہے اور آثار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عنقریب آنیوالا ہے جب وہ آئے گا تو دنیا میں خدا تعالےٰ کی بادشاہت کو قائم کرے گا۔ وہ لوگ اس کے معنے یہودیت کی حکومت کے سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ اُس موعود کے آنے پر ہمیں حکومت حاصل ہو جائے گی کیونکہ خدا تعالےٰ کے منشاء کا اُن کو علم نہیں تھا۔ چونکہ مشرکین یہود سے بالعموم اس قسم کی باتیں سنتے رہتے تھے اور یہود اُن سے تعلیم اور مال میں بھی زیادہ تھے گو تعداد کے لحاظ سے مشرکین زیادہ تھے اس لئے جب اُن کے کان میں یہ خبر پہنچی کہ مکّہ میں ایک شخص ظاہر ہُوا ہے جو کہتا ہے کہ اللہ تعالےٰ مجھ سے باتیں کرتا ہے تو اُن کے دلوں میں یہ خیال گذرا کہ اگر وہ سچا ہُوا اور وہی ہُوا جس کا یہود ذکر کیا کرتے ہیں تو پھر کیا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ یہود اُس پر ایمان لاکر ہم سے سبقت لے جائیں اور حکومت پر قبضہ کر لیں۔ یہودی اُن سے کہا کرتے تھے کہ ہم اُس موعود کے آنے پر جب بادشاہت حاصل کرلینگے تو تمہاری خوب خبر لیں گے۔ ان باتوں کو سنتے رہنے کی وجہ سے قبائل مدینہ کو آنے والے کا خاص خیال رہتا تھا جب انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر سُنی تو فوراً خیال آیا کہ اگر یہ مدعی سچا ہے تو ایسا نہ ہو یہود اُسے ہم سے پہلے مان لیں۔ اُن میں سے بعض لوگ مکّہ حج کیلئے گئے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ملے آپ کی باتیں سُنکر آپ کی صداقت کا انہیں یقین ہو گیا اور وہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلام میں داخل ہو گئے۔ پھر اَور لوگ آئے۔ پھر اَور لوگ آئے یہاں تک کہ ایک کافی تعداد مدینہ کے لوگوں کی اسلام میں داخل ہو گئی۔ اس پر بعض نے کہا کہ مکّہ والے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قدر نہیں کرتے کیوں نہ ہم آپ کو اپنے پاس بُلوا لیں۔ چنانچہ انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں اپنا وفد بھیجا اور عرض کیا کہ آپ ہمارے ہاں تشریف لے آئیں ہماری قوم قریباً سب کی سب مسلمان ہونے کے لئے تیار ہے۔

آپ نے فرمایا اگر خدا تعالےٰ نے مجھے اجازت دے گا تو مَیں ہجرت کرکے آجاؤں گا۔ اس پر بعض نے کہا کہ ایسا نہ ہو اللہ تعالےٰ جب آپ کو غلبہ عطا فرمائے تو آپ واپس اپنے وطن میں آجائیں۔ آپ نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا۔ آخر خدا تعالےٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہجرت کی اجازت دی اور آپ مدینہ تشریف لے گئے۔ یہ ہجرت وہی فجر ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں کیا گیا ہے اور جس سے اسلام کے سورج کا طلوع ہُوا اور جس سے اسلامی سال آج تک چل رہا ہے اور قیامت تک چلے گا۔ اسی ہجرت کا ذکر اللہ تعالےٰ نے دوسری جگہ یوں فرمایا ہے ترب

فجر کے طلوع سے مراد آنحضرت صلعم کی ہجرت

اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (بنی اسرائیل ع۹) دیکھو یہاں ہجرت سے زیادہ خوشخبری یعنی داخلۂ مکّہ کا ذکر پہلے کیا ہے اور ہجرت کا ذکر جو زمانًا مقدم ہے بعد میں کیا ہے۔ اسی طرح مکّہ والوں کے دس سالہ مظالم کے مقابلہ پر ہجرت ایک نعمت تھی اُس کا ذکر پہلے کیا ہے اور دس راتوں کا جو زمانًا مقدم تھیں بعد میں ذکر کیا ہے۔ ہجرت کا ذکر قرآن کریم میں کئی جگہ کیا گیا ہے۔ جس طرح وہ دس تکالیف کے سال اسلامی تاریخ میں ایک اہم جگہ رکھتے ہیں اسی طرح ہجرت بھی ایک اہم جگہ رکھتی ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ یُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝ وَ اِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ ؕ وَ یَمْكُرُوْنَ وَ یَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ۝ (الانفال ع۴) فرماتا ہے اے مومنو! اللہ تعالےٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اگر تم تقویٰ اختیار کروگے تو وہ تمہاری کامیابی کے جیسیوں رستے پیدا کر دے گا۔ تمہاری کوتاہیوں کو دور کر دے گا اور تمہاری کمزوریوں پر پردہ ڈال دے گا اور

اللہ بڑے فضلوں والا ہے۔ چنانچہ ہم تمہارے سامنے اس کی ایک مثال پیش کرتے ہیں تاکہ تمہیں یہ خیال نہ ہو کہ یہ محض قیاسی بات ہے کہ اللہ تعالےٰ بڑے فضلوں والا ہے سوائے ہمارے رسول تم بھی یاد کرو اور لوگوں کے سامنے بھی اس واقعہ کو پیش کرو کہ ہمارا خدا کیسا وفادار خدا ہے۔ کتنی بڑی طاقتوں اور قدرتوں کا مالک خدا ہے۔ جب تمہارے متعلق کفار نے مختلف منصوبے شروع کر دئے تھے اور اُن منصوبوں سے اُن کی غرض یہ تھی کہ اے ہمارے رسول! تجھے قید کر دیں یا تجھے قتل کر دیں یا تجھے اپنے گھر سے باہر نکال دیں۔ یہ تین تدبیریں تھیں جن کا تیرے خلاف انتظام کیا جارہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ تجھے قید کر دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ تجھے قتل کر دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ تجھے اپنے شہر سے نکال دیں۔ یہ مطلب نہیں کہ بیک وقت وُہ ان تینوں تدبیروں پر عمل کرنا چاہتے تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن میں سے بعض ایسے تھے جنہوں نے دورانِ مشورہ میں یہ رائے دی کہ اس شخص کا معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے اور مدینہ کے لوگ بھی اس پر ایمان لانے لگ گئے ہیں اگر یہ اسی طرح ترقی کرتا چلا گیا تو ہمارے لئے یہ بات نہایت خطرناک ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ اسے قید کر دیا جائے تاکہ نہ یہ لوگوں کو مل سکے اور نہ اپنی تبلیغ کو پھیلا سکے۔ دوسروں نے کہا کہ یہ مناسب نہیں اگر ہم نے اسے قید کر دیا تو اس کے رشتہ دار وا اور ملنے والوں کو جب اس کا پتہ چلا تو وُہ جوش میں آکر لڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے اور اس طرح قوم میں فساد ہوگا اس لئے ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ اسکو قتل کر دیا جائے تاکہ یہ جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور اس کے رشتہ دار بھی یہ سمجھ کر کہ اب تو ہمارا عزیز مارا ہی جا چکا ہے اب قوم سے لڑائی مول لینے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ تو واپس آ نہیں سکتا۔ صبر سے کام لیں بعض اور لوگوں نے کہا کہ قتل کرنا مناسب نہیں اس کے قتل پر شور مچ جائیگا اور بالکل ممکن ہے کہ بنو ہاشم بدلہ لینے کیلئے

ہم سے لڑائی شروع کر دیں اور جیساکہ بعض دوسروں کا
کا خیال ہے کہ صبر کر کے بیٹھ جائیں واقع میں ایسا نہ
ہو پس بہتر یہ ہے کہ اسے مکہ سے نکال دیا جائے۔ وہ
لوگ جو اخراج کی تدبیر کے خلاف تھے انہوں نے کہا کہ یہ
کوئی اچھی تجویز نہیں۔ ہمارا مقصد تو اس کے مشن کو ناکام
کرنا ہے اگر یہ باہر جاکر اپنی باتوں کو پھیلانے لگ گیا تو
تمام عرب تمہارے خلاف ہو جائے گا۔ غرض مختلف تجاویز
پیش ہوئیں کسی پر کوئی اعتراض ہوتا اور کسی پر کوئی۔
مگر آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اصل علاج یہی ہے کہ
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیا جائے پس
چونکہ انہوں نے تین تجویزیں کی تھیں اس لئے قرآن کریم
نے بھی ان تینوں تجویزوں کا ذکر کر دیا۔ پہلے تثبیت کا
ذکر کیا پھر قتل کا ذکر کیا پھر اخراج کا ذکر کیا۔

دیکھو اس جگہ قتل جو بڑی چیز تھی اللہ تعالیٰ نے اس کا درمیان
میں ذکر کیا ہے اور قید اور جلاوطنی جو اس سے کم درجہ
کی چیزیں تھیں اُن کو دائیں بائیں رکھ دیا ہے۔ یہ وہی
ترتیب ہے جس کا میں اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ
کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝
کی تفسیر میں ذکر کر چکا ہوں کہ بعض دفعہ ایک بڑی چیز کو
درمیان میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس سے چھوٹی چیزوں کو
دائیں بائیں۔ گو یا یہ کلام مثلث کی شکل کا ہوتا ہے دو
مشورے جو ادنیٰ تھے اُن کو خدا تعالیٰ نے دائیں بائیں بیان
کر دیا اور جو زیادہ سخت اور چوٹی کا مشورہ تھا اُسے درمیان
میں رکھ دیا۔ بہرحال آخری فیصلہ انہوں نے یہی کیا کہ آپ کو
قتل کر دیا جائے۔ قید کرنا یا آپ کو مکہ سے باہر نکال
دینا مناسب نہیں اس میں زیادہ خطرات ہیں اگر جھگڑا ختم
کرنا ہے تو اس کا طریق یہی ہے کہ حملہ کر کے آپ کو مار
ڈالا جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن کا آخری فیصلہ قتل
کا ہی تھا مگر قرآن کریم نے اُن کے تینوں مشوروں کا ذکر
کیا ہے جس کی حکمت میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ اللہ تعالیٰ
اُن کے تینوں مشوروں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے
وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ
الْمٰکِرِیْنَ۔ انہوں نے تین منصوبے کئے خواہ آخر میں
قتل پر ہی متفق ہو گئے اور میں نے بھی اُنکے مقابلہ میں تین
تدبیریں کیں۔ بعض نے کہا تھا کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم
کو قید کر دینا چاہیئے۔ بعض نے کہا تھا کہ
محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کر دینا چاہیئے اور
بعض نے کہا تھا کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جلاوطن
کر دینا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ نے اُن کی تدبیروں کو سُنا
اور اُس نے کہا بہت اچھا میں تم سے یہ تینوں کام کرواؤنگا
اور پھر تمہیں ان تینوں کاموں میں ناکام و نامراد کر کے
دکھا دوں گا۔ تم قتل کا منصوبہ کرو گے اور ذلیل و رسوا
ہو گے۔ تم محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو قید کرو گے اور
ذلیل و رسوا ہو گے تم محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے باہر
نکال دو گے اور ذلیل و رسوا ہو گے۔ فرض کرو وہ
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ کرتے اور
اس میں کامیاب ہو جاتے گو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تو
قتل نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ آپ شرعی نبی تھے اور
اللہ تعالیٰ کی حفاظت آپ کے ساتھ تھی لیکن بفرض محال
اگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے اور اس
کے بعد بنو ہاشم بدلہ لینے کے لئے جنگ شروع کر دیتے
اور کفار میں سے بڑے بڑے لوگ مارے جاتے تو وہ
لوگ جنہوں نے قید یا جلاوطن کرنے کا مشورہ دیا تھا
خوش ہوتے اور کہتے ہم نے نہیں کہا تھا کہ تم اسے قتل
نہ کرو تم نے ہمارا مشورہ نہ مانا اور یہ نقصان اٹھایا۔ یا
فرض کرو وہ آپ کو مکہ سے نکال دیتے اور آپ تمام عرب
کو مسلمان بنا لیتے تو وہ لوگ جنہوں نے کہا تھا کہ آپکو
جلاوطنی نہیں کرنا چاہیئے خوش ہوتے اور کہتے ہم نے
نہیں کہا تھا کہ اس کو جلاوطن نہ کیا جائے یہ لوگوں کو

اپنی جادو بیانی سے متاثر کرے گا تم نے ہماری بات نہ مانی اور نقصان اُٹھایا۔ یا فرض کرو وہ آپ کو قید کر دیتے اور آپ کے رشتہ دار اور متبع آپ کو رہا کرانے کے لئے خانہ جنگی شروع کر دیتے اور کسی طرح چھڑا لیتے تو جو اس تجویز کے خلاف تھے خوش ہوتے اور کہتے ہم نے نہیں کہا تھا کہ تم اسے قید نہ کرو تم نے اسے قید کیا اور نقصان اُٹھایا۔ پس چونکہ ہر شخص اپنی اپنی تدبیر کی کامیابی کے متعلق بعد میں دعویٰ کر سکتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کا ذکر کر دیا اور فرمایا ہم نے تم سے یہ تینوں کام کروا دئے تا کہ تم میں سے کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ اس کا مشورہ صحیح تھا، اس کی رائے صائب تھی اور اس کی تجویز درست تھی۔ ہم نے ان تینوں تجاویز پر تم سے عمل کروا کے یہ ثابت کر دیا کہ تم ان تینوں باتوں میں جھوٹے تھے۔ چنانچہ قتل کی تدبیر میں وہ اس طرح ناکام ہوئے کہ جب وہ اس فیصلہ کے بعد رات کو آپ کے مکان کے ارد گرد جمع ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ نشان دکھایا کہ باوجود اس کے کہ آپ کے قتل کے لئے آپ کے دروازہ پر مختلف قبائل کے مسلح نوجوان کھڑے تھے اور انہوں نے فیصلہ یہ کیا تھا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک آدمی اس قتل میں شریک ہو تا کہ یہ خون قریش کے متفرق قبائل پر پھیل جائے اور بنو ہاشم کو یہ جرأت نہ ہو کہ وہ ساری قوم کے ساتھ لڑیں پھر بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کر دئے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم رات کے وقت اُن کے پاس سے نکل گئے اور انہیں خبر تک نہ ہوئی کہ جس شخص کے قتل کے لئے وہ اکٹھے ہوئے ہیں وہ گھر سے جا چکا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے گھر سے نکلتے وقت حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا دیا تھا (چارپائی کا رواج اُن دنوں نہیں تھا بلکہ اب تک بھی مکہ میں چارپائی کا عام رواج نہیں بعض روایات میں غلطی سے یوں بیان ہوا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو اپنی چارپائی پر لٹا دیا) جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم رات کے وقت اُن لوگوں کے پاس سے گزرے تو اُن میں سے بعض نے آپ کو دیکھا بھی مگر انہوں نے خیال کر لیا کہ یہ کوئی اور شخص ہے جو شاید آپ سے ملنے کے لئے آیا ہوگا اور اب واپس جا رہا ہے اس کی وجہ یہی تھی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت دلیری کے ساتھ باہر نکلے تھے اور آپ کی طبیعت پر ذرا بھی خوف نہیں تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ اتنی دلیری سے آپ اس وقت باہر نکلنے کی جرأت کہاں کر سکتے ہیں یہ ضرور کوئی اور آدمی ہے جو آپ سے ملنے کے لئے آیا ہوگا۔ اس کے بعد انہوں نے دروازہ کی دراڑیں سے اندر جھانکا یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ کہیں آپ باہر تو نہیں نکل گئے تو انہوں نے ایک آدمی کو سویا ہوا دیکھا اور خیال کیا کہ یہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ غرض ساری رات وہ آپؐ کے مکان کا پہرہ دیتے رہے پھر جب مناسب وقت سمجھا تو اندر داخل ہوئے اور شاید انہیں جسم سے شک پڑ گیا کہ یہ جسم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں انہوں نے منہ پر سے کپڑا اٹھا کر دیکھا یا شاید منہ ننگا تھا۔ بہرحال انہیں معلوم ہوا کہ سونیوالے شخص حضرت علیؓ ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہیں تب انہیں معلوم ہوا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سلامتی کے ساتھ جا چکے ہیں اور اُن کے لئے اب سوائے ناکامی کے کچھ باقی نہیں رہا۔

غرض انہوں نے آپ کے قتل کا منصوبہ کیا مگر معجزانہ طور پر انہیں ناکام و نامراد ہونا پڑا۔ اُس وقت یقیناً وہ لوگ جو کہتے تھے کہ انہیں قید کرو کہتے ہوں گے کہ ہم نہ کہتے تھے چوری قتل کا خیال چھوڑ دو باقاعدہ مکہ کی مجلس میں فیصلہ کر کے اسے قید کر دو یہ زیادہ اچھا ہے تم نے ہماری بات نہ مانی اور یہ نتیجہ دیکھا۔ ضرور ہے کہ قتل کو ناپسند کرتے ہوئے اس کے کسی رشتہ دار نے انہیں

خبر کر دی ہوگی اور وہ بچ نکلے۔ کچھ اور لوگ کہتے ہونگے ہم نے جو کہا تھا اسے جلا وطن کر دو۔ قتل کا منصوبہ نہ کرو، تم نے ہمارے مشورہ کو رد کیا اور یہ دن دیکھا کہ سارے قبائل کو شرمندہ اور ناکام ہونا پڑا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۖ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ۔ وہ اگر یہ تدابیر کر رہے تھے تو ہم بھی خاموش نہیں تھے ہم نے بھی فیصلہ کر دیا تھا کہ ایک ایک تدبیر میں ہم ان کفار کو ناکام کریں گے۔ چنانچہ قتل کی تدبیر کر کے انہوں نے دیکھ لیا وہ ناکام ہوئے۔ اُن کی تدابیر سب باطل ثابت ہوئیں اور خدا تعالیٰ کا فیصلہ غالب آیا۔

یہ وہ فجر تھی جس کا دس تاریک راتوں کے بعد طلوع ہُوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہجرت کی اجازت دے دی اور باوجود اس کے کہ کفار آپ کے دروازے پر قتل کے لئے کھڑے تھے آپ نے خدا تعالیٰ کی حفاظت میں مکہ کو چھوڑا اور مدینہ تشریف لے گئے اور یہ قتل کا منصوبہ آپ کو نقصان پہنچانے کی بجائے آپ کے لئے ایک معجزہ کے ظہور کا موجب ہُوا۔ یہ پہلی خبر تھی جس سے مسلمانوں کے دل خوش ہوتے ورنہ اُن کے دل کفار کے مظالم کو دیکھ دیکھ کر ہر وقت دُکھتے رہتے تھے اور بسا اوقات وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض بھی کرتے کہ یا رسول اللہ آپ یہاں سے ہجرت کر کے کہیں اَور تشریف لے جائیں۔ مگر آپ یہی فرماتے کہ جب تک خدا تعالیٰ کا حکم نہ ملے میں اس بارہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن کئی اَور مسلمان ان راتوں کے مصائب سے تنگ آکر مکہ چھوڑ کر چلے گئے بعض حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور بعض مدینہ منورہ میں چلے گئے اور گو اُن کو حبشہ اور مدینہ میں آرام میسر آ گیا تھا اور کفار کے مظالم سے وہ بچ گئے تھے مگر اُن کے دل ہر وقت دُکھتے رہتے تھے کہ نہ معلوم ہمارا آقا کس حال میں ہوگا اور دشمن آپ سے کیا سلوک کر رہا ہوگا۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی خبر انکو پہنچی تو وہ پہلی رات آرام کی نیند سوئے اور اُن کے دل مطمئن ہوئے کہ اب ہمارا آقا دشمن کے حملوں سے محفوظ ہو گیا ہے۔ یہ ہجرت طلوعِ آفتاب کی ایک شعاع تھی جسے قرآن کریم میں فجر کے لفظ سے بیان کیا گیا تھا اور جو ظاہر کر رہی تھی کہ اب عنقریب کوئی آسمانی تغیّر ہونے والا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا ان دس راتوں کی فجر کے بعد شفع اور وتر کا بھی کوئی واقعہ ہُوا ہے یا نہیں۔ اِس غرض کے لئے جب ہم قرآن کریم پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک شفع اور وتر کے واقعہ کا بھی اس میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مدینہ کے کمزور مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (التوبہ ع ۶) فرماتا ہے اگر تم ہمارے رسول کی مدد نہ کرو گے تو اس کا نقصان تمہیں خود ہی ہوگا۔ ہمارا رسول تو ہماری حفاظت میں ہے اور ہم خود اُس کی ہر موقع پر نصرت اور تائید کرنے والے ہیں کیا تمہیں اس واقعہ کا علم نہیں جب کافروں نے اُسے مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور جب وہ اکیلا نہیں بلکہ اپنے ساتھ ایک اور شخص کو لے کر مکہ میں سے نکلا اور غار میں آکر چھپ گیا اور جب اُس نے دیکھا کہ میرا ساتھی گھبرا رہا ہے اس لئے نہیں کہ اُسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے بلکہ اس لئے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے تو اُس نے اُسے تسلی دی اور کہا

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا

کہ غم مت کر ہم دو نہیں بلکہ ایک وتر بھی موجود ہے۔ وتر
کی تشریح بھی خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کر دی
ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰہَ وِتْرٌ یُحِبُّ
الْوِتْرَ۔ خدا تعالےٰ وتر ہے اور وتر کو ہی پسند کرتا ہے
پس شفع کون تھا؟ شفع محمد صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اور
حضرت ابو بکرؓ تھے اور وتر کون تھا؟ وتر خدا تعالےٰ
تھا جو ان دو کے ساتھ تھا۔

غرض خدا تعالےٰ نے یہ خبر دی تھی کہ اسلام اور
مسلمانوں پر دس تاریک راتیں آئیں گی جن کے گذرنے
پر ہم فجر کا طلوع کریں گے اور پھر اُس فجر کے واقعہ
کے ساتھ ہی ایک اور معجزہ دکھائیں گے جس کے ساتھ
ایک شفع اور ایک وتر کا تعلق ہوگا یہ وہ معجزہ تھا جو
غار ثور میں ظاہر ہوا اور جس نے یَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰہُ
وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ کی صداقت کو آفتاب نصف النہار کی
طرح روشن کر دیا۔ یہ امر بتایا جا چکا ہے کہ کفار نے ایک
تدبیر یہ کی تھی کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو قید کر لیا جائے
قتل کی تدبیر میں تو وہ ناکام ہو چکے تھے مگر جن لوگوں
نے قید کا مشورہ دیا تھا وہ ضرور اپنے مشورہ پر فخر کرتے
ہوں گے اور کہتے ہوں گے اگر قید کر لیتے تو یہ ناکامی تمہیں
نہ دیکھنی پڑتی۔ اللہ تعالےٰ نے کہا بہت اچھا تم قید کر کے
بھی دیکھ لو پھر بھی خدا تعالےٰ تمہیں ناکام کرے گا چنانچہ
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ دونوں جب
مکہ میں سے نکلے تو غار ثور میں جا کر چھپ گئے۔ کفار کو جب
علم ہوا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کہیں باہر چلے
گئے ہیں تو وہ تعاقب کرتے ہوئے غار ثور کے منہ پر پہنچ
گئے اور وہاں انہوں نے ڈیرہ ڈال دیا۔ کھوجی اُن کے ساتھ
تھا اُس نے کہا کہ بس یہیں تک نشانات پہنچتے ہیں۔
اب یا تو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) یہیں کہیں چھپا ہوا ہے
اور اگر یہاں نہیں تو پھر وہ آسمان پر چڑھ گیا ہے۔

عرب لوگ کھوجیوں کی بات پر بڑا اعتبار کیا کرتے تھے
اور وہاں کے کھوجی اپنے فن میں بہت ماہر ہوا کرتے
تھے۔ ہمارے ملک میں بھی ایسے کھوجی ہوتے ہیں جو
بعض دفعہ چوری کا سُراغ لگا لیتے ہیں مگر ہمارے کھوجی
بہت ادنیٰ ہوتے ہیں۔ عرب کے کھوجی وہاں کے خاص
حالات کے ماتحت بہت اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتے تھے چنانچہ
وہ کھوجی جسے مکہ والے ساتھ لے گئے تھے اُس نے صاف
صاف کہہ دیا کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اسی جگہ معلوم ہوتے
ہیں۔ لوگوں نے کہا یہاں چھپنے کی کونسی جگہ ہے؟ اُس نے
کہا اگر یہاں نہیں ہیں تو پھر آسمان پر چلے گئے ہیں۔ اُس
کی یہ بات سُنکر سب ہنسنے لگ گئے اور کہنے لگے کہ ہمارا کھوجی
تو آج پاگل ہو گیا ہے کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ بھلا
یہ بھی کوئی چھپنے کی جگہ ہے اس غار کے مُنہ پر درخت کی
شاخیں جھکی ہوئی ہیں اور ان پر مکڑی کا جالا تنا ہوا
ہے اگر وہ اندر جاتے تو جالا نہ ٹوٹ جاتا؟ یہ اللہ تعالےٰ
کا ایک نشان تھا جو اس نے دکھایا۔ مکڑی منٹوں میں جالا
تن لیتی ہے میں نے خود اُسے ایک بڑا جالا دو تین منٹ
میں بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ایسا سامان کیا
کہ مکڑی نے شاخوں پر جالا بن دیا اور ان لوگوں کا ذہن
ادھر نہ گیا کہ یہ جالا تھوڑی دیر میں بھی بنایا جا سکتا ہے۔

غرض کفار تو آپس میں یہ گفتگو کر رہے تھے اور ادھر
چند گز کے فاصلہ پر ابو بکرؓ غار ثور میں گھبرا رہے تھے
اس لئے نہیں کہ اُن کو اپنی زندگی کا خطرہ تھا بلکہ اس لئے کہ
انہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق فکر لاحق ہو گیا
تھا ورنہ یہ خیال درست نہیں کہ انہیں اس وجہ سے فکر ہوا کہ
کہیں میں پکڑا نہ جاؤں۔ حدیثوں میں ذکر آتا ہے انہوں
نے خود اُس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے
عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر میں مارا گیا تو دنیا میں صرف ایک
آدمی مارا جائے گا اس سے زیادہ میری موت کی کوئی اہمیت
نہیں ہوگی لیکن یا رسول اللہ اگر آپ مارے گئے تو اسلام

مارا جائے گا۔ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو یہ گھبراہٹ
پیدا ہوئی تو اُس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے فرمایا

"لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا"

غم مت کر خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم
نے صرف یہ نہیں فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ مَعِیَ۔ آپ نے یہ بھی
نہیں کیا کہ صرف اتنا کہہ دیتے کہ لَا تَحْزَنْ فکر کی کوئی
بات نہیں بلکہ آپ نے ابو بکرؓ کو اپنے ساتھ شامل کیا
اور فرمایا خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے پس ثَانِیَ
اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے
سورۂ فجر کے اِسی شفع اور وتر والے واقعہ کی طرف
اشارہ کر دیا اور بتا دیا کہ وہ جو ہم نے خبر دی تھی کہ کوئی
دوؔ ہوں گے اور تیسرا وتر اُن کے ساتھ ہوگا وہ وعدہ
ہم نے اُس وقت پورا کر دیا تھا اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ
اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا
جب وہ دونوں غار میں چھپے بیٹھے تھے اور جب ہمارا
رسول اپنے ساتھی سے یہ کہہ رہا تھا کہ غم مت کر۔ ہم
صرف دوؔ نہیں بلکہ ایک خدا جو وتر ہے ہمارے ساتھ ہے
ورنہ ثَانِیَ اثْنَیْنِ کہنے کی اپنی ذات میں کوئی ضرورت
نہیں تھی اس کے بغیر بھی یہ مضمون بیان ہو سکتا تھا کہ اگر
تم مدد نہ کرو گے تو ہم اس کی مدد کریں گے۔ چنانچہ دیکھو
غار ثور میں ہم نے اُس کی مدد کی یا نہیں۔ مضمون کو بیان
کرنے کے لئے صرف اسی قدر ذکر کافی تھا ثَانِیَ اثْنَیْنِ
اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن
اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ اس لئے استعمال فرمائے تا دنیا
کو یہ بتائے کہ ہم نے وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ لکھکر سورۂ فجر
میں جو پیشگوئی کی تھی کہ طلوع فجر کے بعد یعنی مکہ سے ہجرت
کرنے کے بعد ایک شفع اور وتر کا واقعہ ظاہر ہوگا وہ
پیشگوئی ہماری پوری ہو چکی ہے فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَکِیْنَتَهٗ
عَلَیْهِ۔ جب وہ دو سے تین ہو گئے اور ابو بکرؓ کو پتہ لگا
کہ ہم صرف دو نہیں بلکہ ایک تیسرا وتر بھی ہمارے ساتھ
ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل پر سکینت نازل کی۔
وَاَیَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا۔ بادشاہ اکیلا نہیں
ہوتا بلکہ لشکر اُس کے ساتھ ہوتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
بھی عالم روحانی کے بادشاہ تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے
آپ کے لئے وہ لشکر بھیجے جن کو دنیا کے لوگ نہیں دیکھ سکتے
تھے۔ وَجَعَلَ کَلِمَةَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا السُّفْلٰی۔
کفار نے کہا تھا کہ اگر محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو قید کر لیا جاتا۔
اگر اس کو محبوس و محصور کر لیا جاتا تو یہ ناکامی نہ دیکھنی پڑتی۔
مگر خدا تعالیٰ نے اس تدبیر میں بھی اُن کو ناکام کیا۔ باوجود
اس کے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غار ثور میں بند
تھے کفار وہاں پہنچ چکے تھے پھر بھی کفار کا کلمہ ہی ذلیل ہوا۔
اُن کو ہی ناکام و نامراد واپس لوٹنا پڑا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا
کلمہ اونچا ہوا۔ دیکھو یہ کتنا بڑا معجزہ ہے جو خدا تعالیٰ نے
ظاہر کیا اور کتنا عظیم الشان نشان ہے جو اللہ تعالیٰ
نے دکھایا کہ کفار نے تو یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم
محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو قید کر کے اُن کی آواز کو دبا دیں گے
اُن کے کلمہ کو نیچا کر دیں گے مگر خدا تعالیٰ نے اس قید
کے نتیجہ میں اُن کی آواز کو اور بھی اونچا کر دیا۔ وہ قید
کر کے آپ کی آواز کو بند کرنا چاہتے تھے خدا تعالیٰ
نے قید میں ڈال کر آپ کی آواز کو اور بھی بلند کر دیا اور
اِس قید کے واقعہ میں ایک ایسا معجزہ دکھایا جو قتل کے
منصوبے کو ناکام کرنے والے معجزہ کی طرح ہمیشہ کے لئے
اسلام کی صداقت اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے
دعویٰ کے ثبوت میں پیش ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔
اور غار ثور کی قید محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذلت کا
موجب نہیں بلکہ ہمیشہ آپ کے کلمہ کے اعلاء کا موجب
ہوتی رہے گی۔

دوؔ تدبیروں میں تو کفار کو ناکامی ہو چکی لیکن ابھی
ایک تدبیر باقی تھی وہ لوگ جنہوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے باہر نکال دیا جائے کہہ سکتے تھے کہ ہمارے مشورے پر عمل نہ کیا گیا ورنہ اسلام کا خاتمہ ہو جاتا۔ خدا تعالےٰ نے نہ چاہا کہ یہ حسرت بھی اُن کے دلوں میں باقی نہ رہ جائے وہ آپ کو صحیح سلامت مکہ سے مدینہ لے گیا اور اس طرح اُس تیسرے گروہ کی بات بھی پوری ہو گئی کہ صحیح علاج یہ ہے کہ انہیں جلا وطن کر دیا جائے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے تو کفار نے ارد گرد کے قبائل کو اُکسانا اور بھڑکانا شروع کر دیا۔ کبھی خود چھاپے مارتے اور اس طرح مسلمانوں کو دق کرتے رہتے گویا ابھی ایک لیل مسلمانوں کے لئے باقی تھی۔ مدینہ میں مسلمانوں کو یہ تسلی تو ہو گئی تھی کہ ہمارا رسول محفوظ ہو گیا ہے لیکن ابھی کفار کے مظالم بند نہ ہوئے تھے بلکہ نئے سرے سے انہوں نے عرب قبائل کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا تھا۔ اللہ تعالےٰ اسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ گو دس راتوں کے گذرنے کے بعد روشنی کی ایک شعاع ظاہر ہو گئی ہے۔ ہجرت ہو چکی ہے اور شفع اور وتر کا واقعہ بھی رونما ہو چکا ہے مگر ابھی ایک رات باقی ہے۔ مشکلات کا ایک سال ابھی رہتا ہے اس ایک سال کے گذرنے کے بعد مسلمانوں کے لئے دوسری فجر چڑھا دی جائے گی۔ چنانچہ اس کا ذکر قرآن کریم میں یُوں آتا ہے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ (الانفال ع ۵)

اِن آیات قرآنیہ میں جنگِ بدر کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ نے اُسے فرقان قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس جنگ کے ذریعہ ہم نے مسلمانوں کی مشکلات کا خاتمہ کر دیا۔ اُن کی آخری رات کو بھی جو اُن پر چھائی ہوئی تھی دُور کر دیا اور اُن کے لئے روشن صبح کا طلوع ہو گیا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ میں رات کے جانے کی خبر دی گئی تھی جس کے معنے یہ تھے کہ اس ایک رات کے گذرنے پر فجر ظاہر ہو جائے گی۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر کا فرقان نام رکھا ہے اور فرقان کے متعلق لغت میں لکھا ہے کہ اس کے معنے ہیں اَلصُّبْحُ۔ اَلسَّحَرُ (اقرب) پس وہ فتح کا دن جس کا وعدہ سورۃ فجر کی آیت وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ میں کیا گیا تھا کہ طلوع فجر کے بعد بھی ایک گیارہویں رات ابھی باقی رہ جائے گی جو آخر دور کر دی جائیگی آخر کار اللہ تعالیٰ نے اُس وعدہ کو جنگ بدر میں پورا کر دیا۔ اور کفار کی طاقت کو اُس نے ہمیشہ کے لئے توڑ کر رکھ دیا۔ اب کفار میں سے کوئی شخص بھی یہ کہنے کی طاقت نہیں رکھتا کہ اگر میرے مشورہ پر عمل کیا جاتا تو فائدہ رہتا کیونکہ وہ تینوں تدابیر جو اسلام کو کچلنے کے لئے کی گئی تھیں اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کا باعث بن گئیں۔

یہ ایک عجیب فجر تھی جو مسلمانوں کے لئے ظاہر ہوئی پہلی فجر تو وہ تھی جو دس راتوں کے بعد ظاہر ہوئی اور جس میں نور کی ایک شعاع مسلمانوں کو نظر آنے لگ گئی تھی مگر ابھی فجر کی صرف ایک لَو پیدا ہوئی تھی کیونکہ ایک رات ابھی باقی تھی۔ جب وہ رات بھی گذر گئی اور گیارہ راتیں آچکیں تو

اللہ تعالےٰ نے یوم الفرقان ظاہر کر دیا جس میں عرب کی طاقت کو بالکل کچل دیا گیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں پر اس کے بعد بھی مظالم ہوتے رہے اور انہیں کفار سے کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جنگ بدر نے کفار کی طاقت کو بالکل توڑ دیا تھا اور مسلمانوں کی شوکت اُن پر ظاہر ہو گئی تھی۔

جنگ بدر جسے قرآن کریم نے فرقان قرار دیا ہے اس کے متعلق بائبل میں بھی پیشگوئی پائی جاتی ہے چنانچہ یسعیاہ باب ۲۱ آیت ۱۳ تا ۱۷ میں لکھا ہے "۔ **عرب کی بابت الہامی کلام** ۔ عرب کے صحرا میں تم رات کو کاٹو گے، اے ددانیوں کے قافلو، پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ، اے تیما کی سرزمین کے باشندو، روٹی لے کے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو کیونکہ وے تلواروں کے سامنے سے، ننگی تلوار سے اور کھینچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیراندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا "۔

یسعیاہ نبی کے اس کلام میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ ہجرت کے زمانہ پر ٹھیک ایک سال گذرنے کے بعد عرب میں ایک ایسی جنگ ہوگی جس میں قیدار کی ساری حشمت خاک میں مل جائے گی اور وہ جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر بھاگ جانے کا الزام لگاتے تھے اپنے لاؤ لشکر کی موجودگی میں پیٹھ دکھائیں گے اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ کمانڈر اور ان کے جرنیلوں کی لاشیں میدانِ جنگ میں پڑی رہ جائیں گی۔ اور آخر وادیٔ مکہ اپنے جرنیلوں کو کھو کر اپنی اس شوکت کو بالکل کھو بیٹھے گی جو اس سے پہلے سے حاصل تھی۔ اسی طرح قرآن کریم نے ایک گیارھویں رات کی خبر دے کر یہ پیشگوئی کی تھی کہ ہجرت کے پورے ایک سال کے بعد کفار کی ساری طاقت ٹوٹ جائے گی اور مسلمانوں کے لئے فتح اور کامرانی کی صبح ظاہر ہو جائے گی۔ چنانچہ عین ایک سال کے بعد جنگِ بدر ہوئی جس میں کفار کے بڑے بڑے لیڈر مارے گئے اور مسلمانوں کو اُن پر نمایاں غلبہ حاصل ہوا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کے لئے دعویٰ نبوت کے تیرھویں سال ربیع الاول کے مہینہ میں نکلے تھے قاعدہ یہ ہے کہ سال کا بقیہ حصہ اُسی سال میں شمار ہوتا ہے نئے سال میں شمار نہیں ہوتا اس لحاظ سے بقیہ چھ ماہ تیرہ سالہ مدت میں ہی شامل کرنے پڑیں گے۔ ورنہ در اصل مکہ میں مسلمانوں پر منظم حملوں کا عرصہ ساڑھے نو سال بنتا ہے۔ دسویں سال ربیع الاول میں آپ ہجرت کے لئے چل پڑے تھے مگر عام معروف قاعدہ کے مطابق بقیہ نصف سال اسی مکی زندگی کے تیرہ سالہ دور میں شمار ہوگا اور نئے سال کا رمضان سے آغاز سمجھا جائے گا۔ کیونکہ رمضان سے ہی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا سال شروع ہوتا ہے۔ اب دیکھ لو مدینہ میں آنے کے بعد پہلے رمضان تک اس پیشگوئی پر دس سال پورے ہوئے تھے اور رمضان سے گیارھویں سال کا آغاز ہوا تھا۔ اس ایک سال کے گذرنے پر دوسرے سال ۱۷ رمضان کو بدر کی جنگ ہوئی جس میں بڑے بڑے کفار مارے گئے اور اُن کے ظالمانہ حملوں کا خاتمہ ہو گیا گویا وہ گیارھویں لیل جو مسلمانوں پر آئی ہوئی تھی ٹھیک ایک سال گذرنے کے بعد دور ہو گئی۔ اور مسلمانوں نے فتح و کامرانی کی صبح کو اللہ تعالےٰ کے فضل اور اس کی تائید اور نصرت کے ساتھ دیکھ لیا۔

یہ ہے وہ مفہوم جو ان آیات قرآنیہ کا اللہ تعالےٰ نے مجھے سمجھایا اور جس کا ایک ایک ٹکڑہ اسلامی تاریخ اور قرآنی حوالوں سے ثابت ہے کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں پر دس تاریک راتیں آئیں اور پھر اُن تاریک راتوں کے گذرنے پر ہجرت کی صورت میں فجر کی

ایک شعاع ظاہر ہوئی اس کے بعد شفع اور وتر کا واقعہ ہُوا اور آخر میں پھر ایک گیارھویں رات آئی جو اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق پورے ایک سال کے بعد گذر گئی اور قیدار کی ساری حشمت خاک میں ملا دی گئی اِسکے بعد بے شک جنگیں ہوئی ہیں مگر جنگِ بدر کے بعد کفار کا رعب بالکل مٹ گیا تھا اور اب وہ مسلمانوں کو تر نوالہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس حقیقت کا برملا اظہار کرتے تھے کہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنا آسان بات نہیں۔

پس اس پیشگوئی میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آئندہ حالات بیان کئے گئے ہیں اور وہ سارے واقعات جن کا اس جگہ پر ذکر ہے قرآن کریم میں نام لے لیکر بیان کر دئے گئے ہیں بلکہ آخری تین حصّے وَ الشَّفْعِ وَالْوَتْرِ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ تو اکٹھے ایک ہی جگہ وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ میں بیان کئے گئے ہیں۔

میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ ترتیب تین قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ ترتیب ہوتی ہے جس میں مضمون نیچے سے اوپر کو جاتا ہے۔ دوسری ترتیب وہ ہوتی ہے جس میں مضمون اوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے اور تیسری ترتیب مثلّث کی سی ہوتی ہے کہ چوٹی کی بات کو درمیان میں بیان کر دیا جاتا ہے اور اس سے چھوٹی باتوں کو دائیں بائیں رکھ دیا جاتا ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ میں بھی مثلّث کی ترتیب پائی جاتی ہے کہ قتل جو سب سے اہم چیز تھی اُس کا اللہ تعالیٰ نے درمیان میں ذکر کر دیا اور اثبات اور اخراج جو اس سے ادنیٰ درجہ کی چیزیں تھیں اُن کو دائیں بائیں بیان کر دیا لیکن اس کے علاوہ مندرجہ بالا آیت میں ایک اور ترتیب بھی ہے جو سیدھی چلی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس جگہ کفار کے مشوروں کے لحاظ سے اثبات، قتل اور اخراج کا ذکر نہیں یعنی یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے پہلے قید کا مشورہ کیا ہو پھر قتل کا اور سب سے آخر میں اخراج کا کیونکہ انکا آخری فیصلہ قتل پر ہُوا تھا نہ کہ اخراج پر۔ بلکہ ان امور کا ذکر وقوعہ کی ترتیب کے لحاظ سے ہُوا ہے۔ مثلاً سب سے پہلے کفار رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مکان پر گئے اور انہوں نے رات کے وقت اُس کے ارد گرد گھیرا ڈال لیا اور اپنے نقطۂ نگاہ سے انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو قید کر لیا۔ اِس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اثبات یعنی قید کا ذکر پہلے فرمایا ہے اِس کے بعد جب آپ ہجرت کے ارادہ سے اپنے مکان میں سے نکلے اور اُن کے پاس سے گذرے تو اُن کے لئے موقع تھا کہ وہ آپ کو قتل کر دیتے کیونکہ وہ اِسی نیت اور اسی ارادہ کے ماتحت اکٹھے ہوئے تھے پس واقعات کے لحاظ سے چونکہ دوسرا نمبر قتل کے امکان کا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اثبات کے بعد قتل کا ذکر کر دیا اور بتایا کہ باوجود قتل کا ارادہ رکھنے کے وہ ناکام رہے اور آپ کو قتل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد اخراج کا واقعہ ہُوا اور گو یہ اُن کے مظالم کی وجہ سے ہی ہُوا مگر جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے کہ كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ (الانفال ع۱) یعنی آپ کو نکالنے والا درحقیقت خدا تعالیٰ تھا۔ اس لئے کہ اگر آپ اُس وقت نہ نکلتے تو دوسرے وقت آپ کی جان محفوظ نہ ہوتی۔ آپ گئے اور غار ثور میں پناہ گزیں ہو گئے اُس وقت جب کفار تعاقب کرتے ہوئے غار ثور تک پہنچے تو اُن کا ارادہ یہی تھا کہ آپ کو ڈھونڈھ کر نکالا جائے مگر آپ وہاں سے بھی بچ کر نکل گئے اور اس طرح اثبات، قتل اور اخراج تینوں تدابیر میں اُن کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ دوسرے معنے دوسرے درجہ پر ہیں ورنہ میں ترجیح پہلے معنوں ہی کو دیتا ہوں۔

اب پیشتر اس کے کہ میں اس پیشگوئی کے دوسرے ظہور کو بیان کروں ایک سوال کا جواب دے دیتا ہوں جو بعض لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ یہ معنے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی صحابہؓ پر کیوں نہ کھل گئے تاکہ اس زمانہ کے کفار پر حجت تمام ہو جاتی؟

اس سوال کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ جہاں تک حجت کا سوال ہے آج بھی ان معنوں کو پیش کرکے منکرین اسلام پر حجت تمام کی جا سکتی ہے اور انہیں اسلام اور قرآن کی صداقت کا قائل کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کسی ایک زمانہ کے لئے نہیں بلکہ ہر زمانہ کے لئے ہے۔ آج دنیا میں جو لوگ اسلام کے مخالف پائے جاتے ہیں جو پیشگوئیوں کے قائل نہیں۔ جو اسلام کو جھوٹا مذہب تصور کرتے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا انکار کرتے ہیں اُن کے سامنے بھی اگر ان پیشگوئیوں کو رکھا جائے تو یقیناً یہ پیشگوئیاں اُن پر حجت ہوں گی اور اگر وہ انصاف اور دیانتداری سے کام لیں گے تو انہیں اسلام کی صداقت کا قائل ہونا پڑے گا۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ معنے پہلے کیوں نہ کھلے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر زمانہ کے لحاظ سے مختلف قسم کے ہتھیار کام آیا کرتے ہیں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جو ہتھیار اس زمانہ میں کام آرہا ہو اُس کے متعلق یہ اصول قرار دے دیا جائے کہ وہ پہلے زمانہ میں بھی ہونا چاہیئے تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کی کامیابی اپنی ذات میں اتنا بڑا نشان تھا کہ صحابہؓ کو کسی اور طرف توجہ ہی نہیں ہوتی تھی چنانچہ تاریخی شواہد اس بارہ میں موجود ہیں۔ جب مکہ فتح ہُوا تو ہند (زوجہ ابوسفیان) کے خلاف سزا کا اعلان تھا۔ لیکن وہ چوری چھپے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئی اور آپکی بیعت میں شامل ہو گئی۔ وہ چادر اوڑھ کر اور دوسری عورتوں میں شامل ہو کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیعت کیلئے آگئی تھی بیعت لیتے لیتے جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر فرمایا کہ کہو ہم شرک نہیں کریں گی تو ہند (زوجہ ابوسفیان) اس کو برداشت نہ کر سکی اُسکی طبیعت تیز تھی وہ فوراً بول اٹھی کہ یا رسول اللہ کیا ہم اب بھی شرک کریں گی۔ آپ اکیلے تھے اور ہم سب کے سب اکٹھے آپ کے مقابلہ میں کھڑے تھے اگر ان بتوں میں کوئی بھی طاقت ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ باوجود اس کے کہ ساری قوم ہمارے ساتھ تھی پھر بھی ہمیں ذلیل ہونا پڑتا اور آپ سب کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاتے۔ آپ کی اس کامیابی کو دیکھنے کے بعد اب کوئی شخص شرک کر ہی کس طرح سکتا ہے کہ آپ یہ اقرار لے رہے ہیں کہ ہم شرک نہیں کریں گی۔ تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے غلبہ اور آپ کی کامیابی کا اُس وقت اتنا اثر تھا کہ دوسری باتوں کی طرف لوگوں کو توجہ ہی نہ ہوتی تھی۔ قرآن کریم تو ہر زمانہ کے لئے ہے اور یہ لازمی بات ہے کہ جب وہ ہر زمانہ کے لئے ہے تو ہر زمانہ میں اُس سے نئے سے نئے معارف نکلتے آئیں گے۔ یہی موٹی بات لے لو کہ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَاءِيلَ (الاحقاف ع۱) کے ماتحت بعد کے مفسرین تورات کی اُن پیشگوئیوں کو بیان کرتے ہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق اُس میں موجود تھیں مگر خود صحابہؓ کا خیال اس طرف نہیں گیا۔ وہ سمجھتے تھے ہمیں گذشتہ پیشگوئیوں کی ضرورت نہیں ہمارے لئے یہی دلیل آپ کی سچائی کی کافی ہے کہ آپ اکیلے اُٹھے بے سروسامانی کی حالت میں اُٹھے، مخالف حالات میں اٹھے اور پھر ساری دنیا پر غالب آگئے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا وہ نشان جو پہلے لوگوں کے دلوں کو مطمئن کر دیا کرتے تھے کافی نہ رہے اور ضرورت محسوس ہوئی کہ نئے نشانات کو قرآن کریم میں سے تلاش کیا جائے چنانچہ نئے نشانات تلاش کئے گئے اور پھر اُن پر زیادہ زور دیا جاتا رہا۔

۲۱۱ — سورۂ فجر کی پہلی آیات کی کی ہوئی تفسیر کے متعلق دو اعتراضات کا جواب

پس بات یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو اس قسم کے دلائل کی ضرورت ہی نہیں تھی گو قرآن کریم میں ان کا ذکر موجود تھا لیکن چونکہ ہمیں اس بات کی ضرورت تھی کہ ہم اپنے زمانہ کے لوگوں کے لئے قرآن کریم میں سے نشانات تلاش کریں۔ اِس لئے جب ہم نے اس نقطۂ نگاہ سے قرآن کریم پر غور کیا تو ہم پر نئے مطالب کھل گئے گویا پہلے لوگوں کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک بیّن اور ظاہر

اور واضح نشان یہ تھا کہ لوگوں نے آپ کو مارنا چاہا مگر مار نہ سکے، انہوں نے کچلنا چاہا مگر کچل نہ سکے، انہوں نے آپ کو مغلوب کرنا چاہا مگر آپ غالب آ گئے۔ اس عظیم الشان نشان کے بعد انہیں آپ کی صداقت کے متعلق کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح اسلام کی تعلیم یہودیت، مسیحیت، مجوسیت وغیرہ کے مقابلہ میں اتنی واضح اور اتنی شاندار تھی کہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ جس قسم کے انصاف اور عدل اور محبت اور بدیوں سے بچنے کے احکام اسلام میں پائے جاتے ہیں اور کسی مذہب میں نہیں پائے جاتے اس لئے وہ ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے کہ اور باتوں کی طرف توجہ کریں یا اسلام کی صداقت کے متعلق گذشتہ مذاہب کی پیشگوئیوں کو تلاش کریں۔ مفسرین نے یہ پیشگوئیاں لکھی ہیں مگر اُسی وقت جب اسلام عیسائی ممالک میں پہنچا۔ چونکہ اُس وقت وہ دلائل جو مشرکین کے لئے بیان کئے جاتے تھے عیسائیوں کے لئے کافی نہیں تھے اس لئے انہوں نے کتب سابقہ سے پیشگوئیاں تلاش کرنی شروع کر دیں۔ اسی طرح قرآن کریم پر غور کر کے انہوں نے نئے نئے دلائل پیدا کئے چنانچہ بعد کی تفسیروں میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اسی ضرورت کے ماتحت ظاہر ہوا ہے۔ بے شک کان موجود تھی مگر پہلے جس چیز کی ضرورت نہیں تھی وہ حکمت الٰہی کے ماتحت پوشیدہ رہی اور اُس وقت ظاہر ہوئی جب زمانہ کو اس کی ضرورت تھی۔

علوم کی ترقی میں ہمیشہ ایک قدم کے بعد دوسرا قدم اُٹھتا ہے اور وہ دوسرا قدم ہمیشہ آگے کی طرف اُٹھتا ہے پیچھے کی طرف نہیں جاتا۔ ایک ماں بچے کو اٹھا کر دس میل چلتی ہے لیکن باوجود اس کے کہ ماں طاقتور ہوتی ہے اور بچہ کمزور، ماں کے پاؤں میں چلتے چلتے چھالے پڑ جاتے ہیں پھر بھی اگر دس میل کے بعد بچہ دو قدم بھی چلے گا تو آگے ہی جائے گا پیچھے نہیں جائے گا۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ماں سے بڑھ گیا۔ اسی طرح بعض دفعہ کم علم والا پہلوں سے زیادہ دلائل اخذ کر لیتا ہے کیونکہ علم ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے اور قرآن کریم میں سے نئے سے نئے معارف ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق نکلتے رہتے ہیں۔ پس یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر یہ معنے کیوں کھلے۔

یہ سوال بھی بعض لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتا ہے کہ لَیَالٍ عَشْرٍ کو نکرہ کے طور پر کیوں بیان کیا گیا ہے۔ یہ بحث ایسی ہے جو پُرانے مفسرین نے بھی اٹھائی ہے کہ یہاں وَلَیَالٍ عَشْرٍ کی بجائے وَاللَّیَالِی الْعَشْرِ کہنا چاہیئے تھا اسے نکرہ کیوں بیان کیا ہے۔ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے جو بالکل درست ہے کہ خدا تعالیٰ نے اسے نکرہ کے طور پر اس لئے بیان کیا ہے تا کہ اُن لیالی کی عظمت کی طرف اشارہ کیا جائے۔ عربی زبان میں تنوین کئی اغراض کے لئے آتی ہے۔ بعض دفعہ تنوین تنکیر کیلئے استعمال کی جاتی ہے اور بعض دفعہ کسی چیز کی عظمت بیان کرنے کے لئے۔ عظمت سے یہ مراد نہیں کہ وہ چیز ضرور اچھی ہو بلکہ اچھی یا بُری جس شق میں بھی کوئی چیز بڑی ہو اُس کیلئے تنوین آ جائے گی۔ مثلاً ظلم بڑا ہو یا انعام بڑا ہو تو دونوں کا تنوین سے ذکر کیا جائے گا۔ انہوں نے رمضان یا ذی الحجہ کی راتیں اس سے مراد لی ہیں کیونکہ وہ بڑی عظمت اور شان رکھنے والی ہیں لیکن جیسا کہ میں ثابت کر چکا ہوں اس سے یہ مراد نہیں بلکہ اس سے ظلم کے وہ دس مکی سال مراد ہیں جن کا احادیث سے بھی پتہ لگتا ہے اور تاریخ بھی گواہ ہے کہ ان دس سالوں میں مسلمانوں پر بڑے بڑے مظالم کئے گئے اور انہیں طرح طرح کے دُکھ دیئے گئے یہاں تک کہ دو دفعہ صحابہؓ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گئے اور ایک دفعہ انہوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ گویا علاقوں کے لحاظ سے دو اور تعداد کے لحاظ سے تین ہجرتیں اُنہیں کرنی پڑیں۔ پس چونکہ ان دس راتوں میں کفار مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر شدید مظالم ہونے والے تھے اس لئے اُن کا نکرہ کے طور پر

ذکر کیا گیا یہ بتانے کیلئے کہ ان میں انتہاء درجہ کا ظلم ہوگا۔

## موجودہ زمانہ کے متعلق پیشگوئی

میں نے بتایا تھا کہ گذشتہ کئی سورتوں میں اکٹھی پیشگوئیاں چل رہی ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثتِ اولیٰ کے متعلق بھی اور آپ کی بعثتِ ثانیہ کے متعلق بھی۔ سورۃ الفجر بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے اور جس طرح سورۃ غاشیہ اور بعض دوسری سورتوں میں اکٹھے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اولیٰ کے بھی اور آپ کی بعثتِ ثانیہ کے بھی۔ اسی طرح اس سورۃ میں دونوں زمانوں کے حالات اکٹھے بیان کردئے گئے ہیں۔ پس یہ پیشگوئی صرف ایک زمانہ کے متعلق نہیں بلکہ دو زمانوں کے متعلق ہے اور اس زمانہ کا پتہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخبار سے بھی ملتا ہے اور قرآن کریم کی آیت الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (رعد ع۱) میں بھی اس کے متعلق اشارہ پایا جاتا ہے۔

ابن اسحاق نے اور بخاری نے اپنی تاریخ میں نیز ابن جریر نے ابن عباس سے اور انہوں نے جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات تلاوت کر رہے تھے کہ ایک یہودی ابو یاسر اپنے ساتھیوں سمیت آپ کے پاس سے گذرا اور اُس نے سورۃ بقرہ کی ان آیات کو سُنا۔ وہ یہود کے علماء میں سے تھا ان آیات کو سنتے ہی وہ سیدھا گھر کی طرف روانہ ہوا تاکہ وہ اپنے بھائی حُیَیّ بن اخطب کو یہ واقعہ بتائے۔ تب اس نے اپنے بھائی سے کہا کہ یہ یہ آیتیں میں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنی ہیں اُس نے کہا کہ کیا تم نے خود اپنے کانوں سے سُنی ہیں یا کسی اور شخص سے؟ وہ کہنے لگا میں نے اپنے کانوں سے یہ آیتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے سُنا ہے۔ اُس نے کہا اچھا تم ابھی میرے ساتھ چلو۔ چنانچہ وہ سب کے سب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئے اور حُیَیّ نے عرض کیا کہ میرا بھائی کہتا ہے کہ یہ یہ آیتیں آپ کو الہام ہوئی ہیں میں یہ دریافت کرنے آیا ہوں کہ کیا یہ درست ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ پر یہ آیات نازل کی ہیں؟ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں یہ آیتیں مجھ پر اللہ تعالےٰ نے ہی نازل کی ہیں۔ انہوں نے کہا اگر یہ بات ہے تو پھر معاملہ آسان ہوگیا آپ کا الہام ہے الٓمّٓ سو ابجد کے لحاظ سے

سورۃ فجر کی پہلی چار آیات میں موجودہ زمانہ کے متعلق پیشگوئی

الف کا ایک
لام کے ۳۰
میم کے ۴۰

کل ۷۱ سال بنے بالفرض اگر آپ کو غلبہ بھی ہوا تو صرف ۷۱ سال رہے گا۔ اس عرصہ میں اگر ہمیں آپ کی غلامی کرنی پڑی تو معمولی بات ہے ۷۱ سال تک ہم تکلیفیں برداشت کرلیں گے اس کے بعد آپ کا غلبہ نہیں رہ سکتا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے ایک اور الہام بھی ہوا ہے۔ انہوں نے کہا۔ کیا؟ آپنے فرمایا الٓمّٓصٓ وہ کہنے لگے تو پھر بھی کیا ہوا۔

الف کا ایک
لام کے ۳۰
م کے ۴۰
ص کے ۹۰

کل ۱۶۱ سال بنے یہ بھی کوئی بڑی مدت نہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے الٓرٰ بھی الہام ہوا ہے۔ یہ سن کر وہ پھر حساب لگانے لگے اور کہا کہ

الف کا ۱
لام کے ۳۰
ر کے ۲۰۰

کل ۲۳۱ سال بنے یہ بھی کوئی زیادہ میعاد نہیں ہے

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مجھے الٓمّٓرٰ
بھی الہام ہُوا ہے یہ سُن کر وہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ
چلو یہاں سے یہ معاملہ تو کچھ مشتبہ ہو گیا ہے (فتح البیان مصری)
اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے اُن کی تردید نہیں کی بلکہ ان کی باتوں کی تصدیق کرتے چلے
گئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف مقطعات میں علاوہ
دوسری باتوں کے ایک یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ اُن میں
بعض ایسے واقعات کا بطور پیشگوئی ذکر ہے جو اسلام کو
پیش آنے والے تھے خواہ وہ اچھے تھے یا بُرے۔ چنانچہ
ہم دیکھتے ہیں سورۂ رعد جو نہایت خطرناک خبروں پر مشتمل
ہے اُس کی ابتداء الٓمّٓرٰ سے کی گئی ہے جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ اسلام کی ترقی کا زمانہ ۲۷۱ سال تک جانیوالا
تھا اور ۲۷۱ھ سے اسلام میں کوئی خاص تنزّل واقعہ
ہونے والا تھا کیونکہ الٓمّٓرٰ کے اعداد ابجد کے لحاظ سے
۲۷۱ ہیں الف کا ۱
لام کے ۳۰
م کے ۴۰
ر کے ۲۰۰

چنانچہ میں نے جب اس حدیث کو دیکھا اور سورۂ رعد پر
بھی غور کیا تو میں نے یہ تحقیق شروع کی کہ آیا ۲۷۱ھ میں یا
اس کے قریب قریب کوئی خاص اور اہم واقعہ جس کا تعلق
اسلامی تنزّل کے ساتھ ہو رونما ہُوا ہے یا نہیں کیونکہ بعض
دفعہ کوئی واقعہ رونما تو کسی سال ہوتا ہے مگر اس کی بنیاد
ایک ایک دو دو سال پہلے سے پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کے تنزّل کی تاریخ

اس لحاظ سے میں نے غور کیا کہ آیا ۲۷۰ھ سے ۲۸۰ھ تک
کوئی واقعہ ایسا ہُوا ہے یا نہیں جسے اسلامی تنزّل کی بنیاد
قرار دیا جا سکے۔ جب میں نے غور کیا اور اسلامی تاریخ کو دیکھا
تو میری حیرت کی کوئی انتہاء نہ رہی جب ۲۷۰ھ یا ۲۷۲ھ
یا ۲۷۳ھ یا ۲۷۴ھ میں نہیں بلکہ عین ۲۷۱ھ میں سپین کے
کے بادشاہ نے پوپ سے معاہدہ کیا کہ وہ بغداد کی حکومت کو
تباہ کرنے کے لئے اس کا ساتھ دے گا۔ گویا ایک مسلمان
بادشاہ نے ایک عیسائی بادشاہ سے معاہدہ کیا کہ وہ اُس
کے ساتھ مل کر اسلامی بادشاہ کا مقابلہ کرے گا اور اس کی
حکومت کو تباہ کرے گا۔ اس کے بعد بغداد رہ گیا تھا میں
نے اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا تو معلوم ہُوا کہ ۲۷۲ھ یا
۲۷۳ھ میں بغداد کی حکومت نے قیصر روم سے معاہدہ کیا
کہ وہ اس کے ساتھ مل کر سپین کی حکومت کو تباہ کریگا۔

یہ دو واقعات ایسے خطرناک ہوئے جنہوں نے اسلام
کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے کمزور کر دیا اور اسلامی ترقی کا دَور
اپنی شان اور عظمت کو کھو بیٹھا۔ اس سے پہلے مسلمانوں کے
اتحاد کی یہ حالت تھی کہ قیصر روم نے جب حضرت علیؓ اور معاویہ
کو آپس میں جنگ کرتے دیکھا تو اُس نے ارادہ کیا کہ میں
مسلمانوں پر حملہ کر دوں۔ چونکہ رستہ میں معاویہ کی حکومت تھی
اور بعد میں حضرت علیؓ کی حکومت آتی تھی۔ اس لئے جب
حضرت معاویہ نے یہ بات سُنی تو انہوں نے قیصر روم کو کہلا
بھیجا کہ ہماری آپس کی لڑائی سے تمہیں کسی غلط فہمی میں مبتلا
نہیں ہونا چاہیئے یاد رکھو اگر تمہارا لشکر آیا تو سب سے پہلا
جرنیل جو علیؓ کی طرف سے تمہارے مقابلہ کے لئے نکلے گا
وُہ مَیں ہوں گا یعنی صرف یہی نہیں کہ سب سے پہلے مَیں
تمہارے ساتھ لڑوں گا بلکہ اُسی وقت میں اپنے ہتھیار
ڈال دوں گا اور علیؓ کے ماتحت ہو جاؤں گا۔ قیصر روم نے
جب یہ بات سُنی تو وہ ڈر گیا اور اُس نے مسلمانوں پر حملے
کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب یا تو مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ وہ
باوجود آپس میں برسرِ پیکار ہونے کے دشمن کے مقابلہ میں
متحد ہو جاتے تھے اور یا یہ زمانہ آیا کہ ۲۷۱ھ میں ایک
اسلامی حکومت پاپائے روم سے اور دوسری اسلامی
حکومت قیصر قسطنطنیہ سے اس لئے معاہدہ کرتی ہے کہ دوسری
اسلامی حکومت کو وہ عیسائیوں کے ساتھ مل کر مٹا دے اور
اس کی طاقت کو کچل دے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ گویا
انتہاء درجہ کے تنزّل کی بنیاد ۲۷۱ھ میں پڑی۔ تب میں نے

سمجھا کہ وہ نظریہ جو یہود کا تھا اور جس کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تردید نہیں کی تھی وہ بھی اپنے اندر حقیقت رکھتا تھا۔

پھر ہم دیکھتے ہیں قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (سجدہ ع۱) جس طرح خدا تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہ سنت چلی آتی ہے کہ وہ آسمان سے لوگوں کی ہدایت کا انتظام کرکے اُسے دنیا میں بھیجتا اور اپنا ایک سلسلہ قائم فرماتا ہے اسی طرح وہ اب بھی کرے گا اور اسلام کو دنیا میں قائم کرے گا مگر پھر وہ سلسلہ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ قائم ہوگا آسمان پر اُٹھنا شروع ہوگا ایک ایسے دن میں جو ہزار سال کے برابر ہوگا۔ اس آیت میں تنزل اسلام کے ایک ہزار سالہ دَور کی خبر دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس دوران میں ایمان اور اسلام آسمان پر اُٹھ جائے گا اور لوگوں میں بے دینی پھیل جائے گی پس ان پہلے معنوں کے رُو سے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے اعتبار سے کئے گئے ہیں لَیْل سے مراد ایک سال کا عرصہ تھا مگر دوسرے معنوں کے رُو سے لَیْل سے مراد ایک صدی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام پر دس تاریک راتیں آئیں گی جن میں سے ہر رات ایک ایک سو سال کی ہوگی اور یہ سلسلہ برابر دس راتوں یعنی ایک ہزار سال تک چلتا چلا جائیگا۔

دیکھو یہ کیسی لطیف مشابہت ہے کہ جس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تین سال کے بعد ظلم و تعدّی کا ایک دَور آیا جو دس سال تک چلتا چلا گیا اسی طرح یہاں تین صدیوں کے بعد ایک اسلامی تنزّل کے دَور کی خبر دی گئی، اور بتایا گیا کہ وہ دَور دس صدیوں یعنی ایکہزار سال تک چلا جائے گا اور چونکہ یہ دَور ۲۷۱ سال سے شروع ہوا ہے اس لئے ایک ہزار سال میں اگر ان ۲۷۱ سالوں کو ملایا جائے تو یہ ۱۲۷۱ سال بن جاتے ہیں یعنی قریبًا تیرہ صدیاں۔ پس تیرہ سو سال کے ایک زمانہ کا ذکر قرآن کریم سے ثابت ہوگیا جن میں سے ۲۷۱ سال یا قریبًا تین صدیاں اسلامی ترقی کی ہیں اور دس سو سال رات سے مشابہت رکھتے ہیں۔ پھر جس طرح وہاں دس راتوں کے بعد ایک فجر کے طلوع کی بشارت دی گئی تھی اسی طرح قرآن کریم میں ان دس تاریک راتوں کے بعد جن میں سے ہر رات سو سو سال کی بتائی گئی ہے ایک فجر کے ظاہر ہونے کی بھی خبر دی گئی ہے۔ اسی مضمون کی طرف سورۂ سبا کی اِس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ قُلْ لَّكُمْ مِّیْعَادُ یَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ○ (سبا ع۳)

۲۷۱ اسلام کے دوبارہ احیاء کی تاریخ کی تعین۔

اس آیت کی تشریح سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ سورۂ احزاب میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا دعویٰ لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ آئندہ تمام فیوض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے ہی بنی نوع انسان حاصل کرسکیں گے براہ راست بغیر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی کے وہ اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل نہیں کرسکتے۔ یہ مضمون جو سورۂ احزاب میں تھا اُسی کا سورۂ سبا میں ذکر آتا ہے۔ اور اس امر کا ثبوت دیا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا میں ایک مستقل نظام قائم کیا جائے گا۔ خاتم کے معنے یہ تھے کہ آپ سے الگ ہوکر کوئی فیضان نہیں ملے گا بلکہ آپ کی اطاعت اور غلامی میں رہ کر انسان الٰہی برکات اور فیوض سے متمتع ہوسکے گا۔ اس پر سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ نظامِ روحانی میں آپ نے لوگوں کو اعلیٰ مقامات کے حصول سے روک دیا ہے؟ اسی کا جواب سورۂ سبا میں اللہ تعالےٰ نے یہ دیا کہ آپ نے نظامِ روحانی میں لوگوں کو اعلیٰ مقامات کے حصول سے نہیں روکا اور اس کا

ثبوت یہ ہے کہ ہمیشہ ایسے نبی آتے رہیں گے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خدام اور آپ کے غلاموں میں سے ہونگے چنانچہ فرمایا اے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تیری نبوت ختم ہونے والی نہیں بلکہ قیامت تک جاری رہے گی۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تُو قیامت تک لوگوں کے لئے بشیر و نذیر ہے جیسے کہ فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا۔ ہم نے تجھے تمام انسانوں کے لئے خواہ وہ عرب ہوں، شامی ہوں فلسطینی ہوں یا اور کسی قوم کے ہوں۔ اِس صدی کے ہوں یا اگلی صدی کے سب کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ یوں تو ہر نبی جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے کھڑا ہو اُس کو ماننا پڑتا ہے۔ موسےٰ علیہ السلام گو ساری دُنیا کے لئے مامور نہیں تھے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ماننے والوں کو اُن پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے لیکن فرماتا ہے ہم نے تجھے خالی اس لئے نہیں بھیجا کہ لوگ تجھ پر ایمان لائیں بلکہ تُو قیامت تک ہر زمانہ میں بشیر و نذیر ہوگا۔ موسیٰ بے شک نبی ہیں مگر وہ آج کوئی بشارت اور انذار نہیں کر رہے اُن کے کوئی ایسے احکام نہیں چل رہے جن کے انکار کی وجہ سے لوگوں پر عذاب نازل ہو یا جن کو ماننے کی وجہ سے وہ خدا تعالےٰ کے فضل اور اس کے انعامات کے مورد ہوں۔ ماننے کی وجہ سے فضل نازل ہونا اور انکار پر عذاب نازل ہونا اُسی نبی کی وجہ سے ہوتا ہے جس کی نبوت جاری ہو۔ پس فرماتا ہے ہم نے تجھے تمام لوگوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے مبعوث فرمایا ہے ایسی صورت میں کہ صرف تیری نبوت پر اُن کیلئے ایمان لانا ضروری نہیں بلکہ تُو اُن کے لئے بشیر و نذیر بھی ہوگا۔ جو لوگ تجھے مانیں گے اُن پر خدا تعالےٰ کے فضل نازل ہوں گے اور جو انکار کریں گے اُن پر خدا تعالےٰ کا عذاب نازل ہوگا۔ پھر فرماتا ہے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ لیکن اکثر لوگ اِس سے واقف نہیں۔ اِس سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ لوگ ایمان نہیں لا رہے کیونکہ یہ تو صاف بات ہے کہ وہ ایمان نہیں لا رہے تھے اِس کے ذکر کا کوئی خاص فائدہ نہیں تھا اسکے معنے درحقیقت یہ ہیں کہ ہم نے یہ ایک ایسی بات کہی ہے جس سے لوگ پہلے واقف نہیں تھے۔ پہلے لوگ صرف قومی اور وقتی نبیوں کے قائل تھے سوائے عیسائیوں کے ایک فرقہ کے جو ساری دُنیا کے لئے اور ہمیشہ کے لئے روحانی بادشاہت کا قائل تھا۔ لیکن باقی لوگوں میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں تھا۔ کیونکہ نبی آتے رہے اور اُن کی تعلیمیں منسوخ ہوتی رہیں۔ پس فرمایا کہ ہم تیرے متعلق ایک ایسا دعوےٰ کر رہے ہیں جس سے لوگ واقف نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ایک نبی کے بعد جب بھی دوسرا نبی آتا ہے وہ پہلے نبی کی نبوت کو منسوخ کر دیتا ہے۔ ساری دُنیا کی طرف ایک نبی کا ہونا اور پھر ہر زمانہ کے لئے ہونا یہ دو باتیں پہلے کسی نبی میں جمع نہیں ہوئیں۔ ہندو وید کو ہمیشہ کے لئے مانتے ہیں مگر وہ ساری دُنیا کیلئے نہیں مانتے۔ شودروں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر وہ وید کو سُن لیں تو سیسہ پگھلا کر اُن کے کان میں ڈالا جائے۔ زرتشتی خاموش ہیں۔ مگر اتنی بات بالکل واضح ہے کہ اُن کا مذہب ساری دُنیا کے لئے نہیں۔ یہودی ہیں وہ گو اب کہتے ہیں کہ اُن کی شریعت ہمیشہ کے لئے ہے۔ مگر یہ خیال آخری زمانہ میں اُن میں پیدا ہوا ہے۔ پہلے اُن کا یہی خیال تھا کہ ایک اور شریعت آنے والی ہے۔ جیسا کہ استثنا ۱۸/۱۸ اور ۳۳/۲ سے ظاہر ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے وہ بھی ساری دُنیا کے لئے نہیں تھے۔ مگر چونکہ وہ ایک ایسے زمانہ میں آئے ہیں جب وہ وقت بالکل قریب آ رہا تھا جبکہ ساری دُنیا کے لئے ایک نبی بھیجا جائے اور حالات میں جلد جلد تغیر پیدا ہو رہا تھا اس لئے عیسائیوں نے غلطی سے حضرت عیسےٰ

علیہ السلام کے متعلق یہ سمجھ لیا کہ وہی تمام دُنیا کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ لیکن عیسائی اکثر الناس نہیں ہیں اور خدا تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۔ یعنی دُنیا کا اکثر حصہ ایسا ہے جو اس عقیدے کا قائل ہی نہیں۔ وہ یہ مانتا ہی نہیں کہ ساری دُنیا کے لئے شریعت ہو اور پھر وہ شریعت ہمیشہ کے لئے ہو۔ یہ دونوں فرق چلتے چلے جاتے ہیں۔ اور سوائے عیسائیوں کے دُنیا میں جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں اُن میں سے اکثر اس کے قائل نہیں۔ اور جو لوگ قائل ہیں وہ بہت ہی تھوڑے ہیں۔ اِسکے بعد فرماتا ہے وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔ یعنی وہ لوگ پوچھتے ہیں کہ جب یہ کہا گیا کہ آنحضرتؐ ہر زمانہ کے لئے ہیں اور ہر زمانہ کے لئے وہ بشیر اور نذیر ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ پھر بھی ایسے زمانے آتے رہیں گے جب دُنیا میں خرابی پیدا ہوگی اور آنحضرتؐ بحیثیت بشیر اور نذیر کے دُنیا میں ظاہر ہوں گے۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ ایسا زمانہ کب آئے گا اور کب بحیثیت بشیر اور نذیر کے آنحضرتؐ دُنیا میں ظاہر ہونگے۔

یہ امر ظاہر ہے کہ قیامت تک بشیر و نذیر ہونے کے یہ معنے تو نہیں ہوسکتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر زمانہ میں اپنے جسدِ عنصری کے ساتھ واپس آئیں گے اور تبشیر و انذار کا کام سرانجام دیں گے بلکہ اس کے معنے یہ تھے کہ آپکے اظلال دُنیا میں پیدا ہوتے رہیں گے اور جب بھی کوئی خرابی واقع ہوگی آپ کے اظلال بشیر و نذیر بن کر کھڑے ہو جائینگے اور اس طرح برابر آپ کا وجود دُنیا میں ظاہر ہوتا رہیگا۔ اللہ تعالیٰ یہی جواب اس موقعہ پر پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے قُلْ لَّکُمْ مِّیْعَادُ یَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْہُ سَاعَۃً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ۔ ہم اس کے لئے ایک دن کی میعاد سورۃ سجدہ میں مقرر کر چکے ہیں۔ یعنی ایک ہزار سالہ خرابی کا دَور گذرنے کے بعد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوگا۔ اور آپ دوبارہ بشیر و نذیر بن کر دُنیا میں آ جائیں گے۔ پس قُلْ لَّکُمْ مِّیْعَادُ یَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْہُ سَاعَۃً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ میں اُنہی دس تاریک راتوں کی طرف اشارہ ہے جو اسلام کے قریباً تین سو سالہ دَورِ ترقی کے بعد مسلمانوں پر آئیں جو ایک ہزار سال تک ممتد چلی گئیں اور جن کا ذکر سورۃ سجدہ میں اِن الفاظ میں پایا جاتا ہے کہ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗٓ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۔

غرض تیرہ سو سال کے ایک زمانہ کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ جن میں سے دس سو سال کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ رات کے مشابہ ہونگے اور ہر رات ایک ایک سو سال کی ہوگی اور اس طرح دس راتیں یکے بعد دیگرے مسلمانوں پر آئیں گی۔

اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (الانشقاق ع۱) جس طرح تم کہتے ہو اُس طرح نہیں بلکہ مَیں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں شفق کو۔ پھر مَیں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں رات کو اور اُس کو جسے وہ اپنے اندر جمع کر لیتی ہے اور پھر مَیں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں چاند کو جب وہ تیرھویں رات کا ہو جاتا ہے۔ اِتِّسَاق کے معنے ہوتے ہیں تیرھویں رات کا چاند پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ یہ بات نہیں جو تم کہتے ہو۔ مَیں شہادت کے طور پر شفق کو پیش کرتا ہوں۔ جب سورج تو ڈوب جاتا ہے لیکن اُس کی سُرخی رہ جاتی ہے۔ اس میں کفار کو بتایا کہ اِس وقت اسلام کو مغلوب کرنے کی کوششیں بالکل عبث ہیں اسلام غالب آئے گا اور تم اسکے مقابلہ میں خواہ کتنی کوششیں کرو کبھی کامیاب نہیں ہوسکو گے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام ہمیشہ طاقتور

رہے گا۔ جس طرح سورج ایک وقتِ مقررہ کے بعد ڈوب جاتا ہے اسی طرح اسلام پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب اس میں تنزّل کے آثار پیدا ہو جائیں گے۔ لیکن ابھی شفق کی سُرخی اس میں باقی ہو گی۔ بیشک دن کی روشنی نہیں رہے گی مگر رات کی تاریکی بھی اُس وقت نہیں ہو گی۔ ایک ملی جُلی کیفیت ہو گی۔ مسلمانوں کا غلبہ بھی ہو گا اور اُن میں ضُعف اور اضمحلال بھی پیدا ہو چکا ہو گا۔ لیکن پھر اس کے بعد ہم رات کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور اُن سب چیزوں کو جنہیں رات اپنے اندر جمع کر لیتی ہے یعنی جو جو مصائب اور مشکلات رات کے اندر پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب اُس رات میں اکٹھی ہو جائیں گی اور وہ تمام تاریکیوں کو جمع کر کے ایک بھیانک صورت اختیار کر لے گی۔ وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ اس کے بعد ہم ایک چاند کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو تیرہویں رات کا ہو گا۔ یہ قرینہ صاف طور پر بتا رہا ہے کہ یہاں رات سے حقیقی رات مراد نہیں بلکہ استعارۃً رات کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ تیرہویں یا چودھویں رات کے چاند انتہائی تاریک رات کے بعد نہیں نکلتے بلکہ تاریک راتوں کے شروع ہونے سے پہلے یہ چاند نکلا کرتے ہیں پس اگر لیل سے مراد یہاں اصلی رات ہوتی تو وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ کے بعد قمر کا کوئی ذکر ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ مادی دُنیا میں اِس قسم کی تاریک رات کے بعد کبھی تیرہویں یا چودھویں کا چاند نہیں نکلا کرتا۔ یہ قرینہ بتا رہا ہے کہ اِس جگہ ظاہری رات کا ذکر نہیں ہو رہا بلکہ ایسی رات کا ذکر کیا جا رہا ہے جس کے انتہائی طور پر تاریک ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے قمر ظاہر ہوا کرتا ہے۔

اِتِّسَاق کے معنے جیسا کہ اِس سورۃ کی تفسیر میں بتایا جا چکا ہے تیرہویں، چودھویں، پندرہویں اور سولہویں رات کے چاند کے ہوتے ہیں۔ پس اِس آیت میں یہ خبر دی گئی ہے کہ جس طرح دن غائب ہوتا ہے اسی طرح اسلام کا حال ہو گا۔ اُس کا تنزّل ایک دم نہ ہو گا بلکہ آہستہ آہستہ وہ تنزّل کی طرف جائے گا۔ یہاں تک کہ اسلام کا سورج لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا مگر اُس کی شفق باقی رہ جائے گی۔ اِس کے بعد شفق بھی جاتی رہے گی اور کامل تاریکی مسلمانوں پر چھا جائے گی۔ اس کے بعد ایک چاند نکلے گا جو تیرہویں رات میں ظاہر ہو گا اور سولہویں رات تک جائے گا۔ اور وہ تیرہویں تاریخ کا چاند اسلام کے تمام مصائب کا خاتمہ کر دے گا۔ اور یہ ترقی کا سلسلہ سولہویں صدی تک چلتا چلا جائے گا خدا تعالیٰ نے اس حقیقت کے اظہار کے لئے اِتِّسَاق کا لفظ بھی عجیب رکھا ہے۔ لغت میں لکھا ہے اِس کے معنے اُس چاند کے ہیں جو تیرہویں، چودھویں، پندرہویں اور سولہویں تاریخ کا ہو۔ اگر تیرہویں اور چودھویں رات کو ابتداء سمجھا جائے تو پندرہویں اور سولہویں رات اس چاند کے ظہور کی انتہائی راتیں سمجھی جائیں گی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے گو اسلام پر تنزّل کا زمانہ آئے گا مگر تیرہویں صدی میں چاند کا ظہور ہو جائے گا اور یہ تکلیف دہ زمانہ دُور ہو جائے گا۔ چنانچہ آگے فرماتا ہے لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ تم طبق بہ طبق اور درجہ بدرجہ ان ساری حالتوں میں سے گذرو گے تم پر تاریکی کے دَور بھی آئیں گے اور روشنی کے بھی۔ غلبہ کے ایام بھی آئیں گے اور تنزّل کے بھی۔ ابتداء میں تمہاری حالت شفق کے مشابہ ہو گی اِس کے بعد رات اپنی تمام تاریکیوں کو جمع کر کے بھیانک صورت اختیار کر لے گی۔ پھر اِس کے بعد چاند نکلے گا جو تمام تاریکیوں کو پھاڑ دے گا اور اسلام کی مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اِس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہاں ظاہری راتیں مراد نہیں بلکہ باطنی راتیں مراد ہیں اور مسلمانوں کے تنزّل اور پھر اُن کی دوبارہ ترقی کا

اِن آیات میں نقشہ کھینچا گیا ہے۔

اِسی طرح سورۂ بروج میں فرماتا ہے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ۔ یعنی ہم آسمان کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو بروج والا ہے ۔ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ اور ہم شہادت کے طور پر یومِ موعود کو بھی پیش کرتے ہیں۔ علمِ ہیئت کے ماہرین بارہ ستاروں کے لئے بارہ بُرج قرار دیتے ہیں اِس لحاظ سے ذَاتُ الْبُرُوْجِ سے مراد وہ آسمان ہوگا جو بارہ بُرجوں والا ہے اور آیت کے یہ معنے ہونگے کہ ہم آسمان کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو بارہ بُرجوں والا ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی یومِ موعود کو بھی پیش کرتے ہیں یعنی تیرہویں زمانہ کو۔ تیرہویں صدی میں اسلام کے احیاء کے لئے اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک مقدس انسان مبعوث ہونے والا ہے جس کی تشریح اگلی آیت میں ہی اِن الفاظ میں فرمائی کہ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ وہ وجود گواہ بن کر آئے گا ایک اور وجود کے لئے جو مشہود ہوگا اور جس کی صداقت کی گواہی دی جائے گی۔ یعنی مسیح موعودؑ مبعوث ہوگا تاکہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صداقت اور قرآن مجید کی سچائی کا گواہ ہو۔ اور اسلام کا زوال روبہ ترقی ہو۔ اِس آیت سے بھی تیرہویں صدی میں ایک شاہد کے ظہور کا ثبوت ملتا ہے۔

اِسی طرح احادیث میں آتا ہے خَيْرُكُمْ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ يَكُوْنُ بَعْدَهُمْ قَوْمٌ يَشْهَدُوْنَ وَلَا يُسْتَشْهَدُوْنَ وَيَخُوْنُوْنَ وَلَا يُؤْتَمَنُوْنَ وَيَنْذُرُوْنَ وَلَا يَفُوْنَ وَيَظْهَرُ فِيْهِمُ السِّمَنُ۔ (بخاری جلد ۴ کتاب الرقاق باب ما یحذر من زھرۃ الدنیا والتنافس فیھا) یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں سب سے بہتر میری صدی ہے پھر بعد کی صدی اور پھر اُس سے بعد کی صدی مگر اِس کے بعد ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے جو گواہی دیں گے تو لوگ کہیں گے تمہاری گواہی کا کیا اعتبار تم تو جھوٹ بولنے کے عادی ہو۔ کوئی شخص اُن کے پاس امانت رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ سخت خائن اور بددیانت ہوں گے۔ اِسی طرح اُن کا حال یہ ہوگا کہ وہ نذریں مانیں گے تو اُن کو پورا نہیں کریں گے اور کھا کھا کر خوب موٹے ہو جائیں گے۔ دین کی رغبت اور قربانی کا جذبہ اُنکے دلوں میں نہیں رہیگا۔

اِن سب آیات اور پیشگوئیوں کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تین صدی تک اسلام کی ترقی کا زمانہ ہوگا اس کے بعد دس صدیوں کا لمبا زمانہ اُس پر تنزّل کا آئیگا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وقت مقررہ پورے کا پورا ہی شمار ہو جب تک کہ کوئی خاص قرینہ نہ ہو بلکہ ایک سال کا اکثر حصہ ایک سال اور دن کا ایک کثیر حصہ ایک دن اور صدی کا ایک کثیر حصہ ایک صدی کہلا سکتا ہے۔ پس حدیث کی مقرر کردہ تین صدیوں کو جن کے بعد فتنہ فساد پھیل جاتا ہے قرآن کریم کے دوسَو اکہتر (۲۷۱) سالوں سے اختلاف نہیں۔ بلکہ ایک جگہ عرصہ زیادہ معیّن کر دیا گیا ہے اور دوسری جگہ عرفی الفاظ استعمال کر دیئے گئے ہیں۔ الغرض اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ کہ ہم اُس فجر کی اور اُن دس راتوں کی قسم کھاتے ہیں جو اُس فجر سے پہلے آئیں گی اور اِس سے مراد وہ ہزار سالہ دَورِ تنزّل اور دَورِ ضُعف ہے جو اسلام پر پہلی تین صدیوں کے بعد آیا اور ہر رنگ میں تنزّل آنا شروع ہوا یہانتک کہ ساری تاریکیاں جمع ہوگئیں گویا جس طرح پہلے دَور کے متعلق ایک رات ایک سال کی قائم مقام تھی دوسری پیشگوئی میں ایک رات ایک صدی کی قائم مقام ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ اِن تاریک راتوں کے بعد فجر کا زمانہ آئیگا اور تاریکی و ظلمت کے بادل آسمانِ روحانیت پر سے پھٹ جائینگے۔ چنانچہ اِسی مناسبت سے مسیح موعودؑ کا ایک نام طارق رکھا گیا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی پہلا الہام وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ہوا۔ اور یہ الہام آپ کو آپ کے والد کی وفات کے وقت ہوا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

لئے اِس کے معنے اُن کی وفات کے کئے ہیں کیونکہ اُنکی وفات رات کو ہوئی مگر اِس کے معنے صبح کے ستارہ کے بھی ہوتے ہیں اور والد کی وفات کے وقت جب آپ کو فکر ہوئی کہ والد فوت ہو جائیں گے تو کیا ہوگا تو اللہ تعالےٰ نے بتایا کہ تم تو طارق ہو اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نور کو ظاہر کرنیوالے ہو۔ پس تمہارے والد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اِس دُنیوی والد کی وفات کا تم کو کیا غم ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ الٓمّٓرٰ کے ابجدی اعداد کو اگر فیج اعوج کے ہزار سال سے ملایا جائے اور پھر اِس سارے حساب کو عیسوی بنانے کے لئے اس میں ۶۲۱ سال وہ شامل کئے جائیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے زمانہ تک سنہ عیسوی کے لحاظ سے بنتے ہیں تو عین وہ سنِ عیسوی نکل آتا ہے جس میں فجر کا طلوع ہوا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دُنیا کے سامنے اپنا دعویٰ پیش فرمایا۔ الٓمّٓرٰ کے اعداد ۲۷۱ ہیں اِس میں دس صدیاں شامل کیجائیں تو ۱۲۷۱ بن جاتا ہے پھر ۱۲۷۱ میں ۶۲۱ سال پہلے شامل کئے جائیں تو ۱۸۹۲ بن جاتے ہیں۔ اب اس میں سے دو یا تین سال ہمیں بہرحال نکالنے پڑینگے کیونکہ الٓمّٓرٰ سورۂ رعد میں آتا ہے جو مکی سورۃ ہے اور ہجرت سے دو تین سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ اب اگر دو سال نکال دیں تو ۱۸۹۰ رہ جاتے ہیں اور یہ وہی سال ہے جس میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعویٰ کیا۔ اور اگر تین سال نکال دیں تو ۱۸۸۹ رہ جاتے ہیں اور یہ وہ سال ہے جس میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لوگوں سے بیعت لی۔

حضرت مسیح موعودؑ کے دعوے کی تاریخ کا بیان

اِسی طرح اگر ہم ہجری سنہ کا حساب کریں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تین صدیوں کو لَیَالٍ عَشْرٍ میں شامل کریں تو یہ ۱۳۰۰ بن جاتا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسکے بالکل قریب یعنی سنہ ۱۳۰۸ ہجری میں دعویٰ فرمایا ہے۔ اور سات یا آٹھ ایسا چھوٹا دَور کا ہے کہ تیرہ صدیوں کے ذکر میں انکو شمار ہی نہ سمجھا جائیگا۔

پھر اگر ہم ایک اور لحاظ سے دیکھیں تو اس سے براہین احمدیہ کی پیشگوئی نکل آتی ہے۔ براہین احمدیہ سنہ ۱۲۹۷ھ میں لکھی گئی اور سنہ ۱۳۰۱ ہجری میں شائع ہوئی ہے اور یہ وہی سال ہے جس میں قرآنی پیشگوئی کے مطابق فجر کا طلوع مقدر تھا۔ گویا شمسی اور قمری دونوں لحاظ سے یہ پیشگوئی پوری ہوئی اور رات کی تاریکیوں کو دُور کرنے کے لئے اُفقِ آسمان پر الطارق کا ظہور ہو گیا۔

یہ کتنی زبردست پیشگوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے طلوع فجر کی تاریخیں تک بتا دی گئیں اور سینکڑوں سال پہلے اُن کا ذکر کر دیا گیا اور پھر اُس کے مصداق کو عین اُنہی تاریخوں میں اللہ تعالےٰ نے دُنیا کی ہدایت کیلئے کھڑا کیا جو قرآن اور احادیث میں اُسکے ظہور کیلئے مقرر کی گئی تھیں۔ یہ خدا تعالےٰ کا ایسا عظیم الشان نشان ہے جس پر غور کرنے سے اسکی ہستی اور قدرت پر زندہ ایمان پیدا ہوتا ہے اور ہر شخص جو تعصب سے خالی ہو اُسے اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اسلام خدا تعالےٰ کا سچا مذہب ہے۔

شفع اور وتر کا مطلب اسلام کے دوبارہ احیاء کے اعتبار سے

اب رہا پیشگوئی کا تیسرا حصہ یعنی وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ اِسکے دو معنے ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ شفع اور وتر کا جو معاملہ ہوگا اُسے ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس آیت میں بعد کے واؤ عطف کے ہیں اور مراد یہ ہے کہ ہم اِسکی بھی قسم کھاتے ہیں اور اُسکی بھی قسم کھاتے ہیں لیکن وَالْفَجْرِ میں واؤ قسم کے لئے آیا ہے کیونکہ اِس سے پہلے کوئی اور مضمون نہیں کہ ہم اُس واؤ کو عاطفہ قرار دے سکیں۔ وَالْفَجْرِ دراصل اُقْسِمُ بِالْفَجْرِ ہے اور واؤ کو اُقْسِمُ کا قائم مقام بنایا گیا ہے لیکن اس کے بعد جتنے واؤ ہیں سب اَلْفَجْرِ کے بعد جو امور مذکور ہوئے ہیں انہیں معطوف بنانے کے لئے آئے ہیں۔ اِس لحاظ سے وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ کے یہ معنے ہونگے کہ "اور ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اس معاملہ کو جو شفع اور وتر کا ہے"۔ جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب غار ثور میں گئے تھے اور حضرت ابو بکرؓ آپ کے ساتھ تھے تو آپؐ نے فرمایا تھا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ غم مت کر خدا ہمارے ساتھ ہے اِسی طرح جب شاہد و مشہود جمع

ہو جائیں گے یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم دوبارہ ظاہر ہوں گے اور آپؐ کا ایک خادم بھی جو آپؐ کا بروز ہوگا ظاہر ہوگا تو وہ وقت بھی اسلام کے لئے نہایت سخت ہوگا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے تمام جمعیت کو یا محصور ہو جائیں گے تب وَتر یعنی اللہ تعالےٰ پھر اس بات کو ثابت کرے گا کہ وہ اُن کے ساتھ ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا الہام ہے :-

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پناہ گزیں ہوئے قلعۂ ہند میں۔"

(تذکرہ صفحہ ۲۶ )

یعنی جس طرح پہلے کفار کے حملہ سے بچنے کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے غارِ ثور میں پناہ لی اور حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے ساتھ تھے اسی طرح آخری زمانہ میں آپؐ کی روحانیت کفر سے بچنے کے لئے قلعۂ ہند میں پناہ گزیں ہوئی ہے۔ اِس الہامِ الٰہی نے صاف بتا دیا کہ دوسری غارِ ثور ہندوستان میں ہونے والی ہے۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم غارِ ثور میں پناہ لیں گے۔ پھر آپؐ کے ساتھ آپؐ کا ایک ساتھی ہوگا، اور پھر آپؐ اُسے فرمائیں گے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے یعنی اللہ تعالےٰ کی مدد اور اُس کی نصرت سے وہ قید ہی کامیابی کا ذریعہ ہو جائے گی۔ پس وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح پہلے غارِ ثور میں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پناہ گزیں ہوئے تھے اِس آخری دور میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مسیح موعود کے ساتھ پناہ گزیں ہوں گے مگر اِس دفعہ غارِ ثور میں نہیں بلکہ قلعۂ ہند میں پناہ گزیں ہوں گے اور پھر خدا تعالیٰ اپنی معیّت کے لئے اپنے فرشتوں کی فوج کے ساتھ اترے گا جس طرح کہ غارِ ثور کے وقت اُترا تھا۔

علاوہ ازیں وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ کے ایک اور معنے بھی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ درمیانی عطف کو الفجر کی طرف منسوب نہ کیا جائے بلکہ شفع کی طرف پھیرا جائے اس صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم قسم کھاتے ہیں شفع کی اور ہم قسم کھاتے ہیں وَتر کی بلکہ اِس کے معنے یہ لئے جائیں گے کہ ہم قسم کھاتے ہیں شفع کی اور اُسکے ساتھ تعلق رکھنے والے وَتر کی۔ گویا وَتر کی علیحدہ قسم نہیں کھائی بلکہ شفع اور وَتر کو ملا کر اُن کی قسم کھائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایسے وجود کو ہم بطور شاہد پیش کرتے ہیں جو اپنی ذات میں شفع بھی ہے اور وَتر بھی ہے۔ اس صورت میں اِس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ مَیں اُس شفع کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں جو ساتھ ہی وَتر بھی ہے۔ یعنی ایک جہت سے وہ شفع ہے اور ایک جہت سے وَتر ہے۔ اور یہ مطلب ہوگا کہ لَیَالٍ عَشْرٍ کے بعد جو فجر ظاہر ہوگی وہ ایسے وجود کے ذریعہ سے ظاہر ہوگی۔ جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا غیر ہوتے ہوئے پھر غیر کہلانے کا مستحق نہیں ہوگا۔ بظاہر وہ دوسرا ہوگا اور شفع کہلائیگا لیکن باوجود ایک دوسرا شخص ہونے کے اُس کے آنے سے دو نبی نہیں ہو جائیں گے دو امام نہیں ہو جائیں گے بلکہ وہ ایسا فنا فی الرسول ہوگا کہ باوجود اُس کے آنے کے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک کے ایک ہی رہیں گے۔ یعنی وہ یہ کہیگا کہ ؎

وہ ہے مَیں چیز کیا ہوں بس فیصلہ یہی ہے

اور وہ کہے گا کہ مَنْ فَرَّقَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ الْمُصْطَفٰی فَمَا عَرَفَنِیْ وَمَا رَاٰی۔ جس نے کہا کہ مَیں محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے علیحدہ وجود ہوں وہ الگ ہیں اور مَیں الگ فَمَا عَرَفَنِیْ وَمَا رَاٰی اُس نے مجھے نہیں پہچانا بلکہ وہ تو گمراہ ہو گیا۔

مجھے ایک دفعہ یہی مضمون خواب میں دکھایا گیا تھا۔ مقبرہ بہشتی کی طرف جاتے ہوئے مدرسہ احمدیہ اور بورڈنگ کے درمیان سے جو گلی گذرتی ہے۔ اور جس کے آگے کنواں آ جاتا ہے یہاں پہلے ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ اب تو وہاں کمرے بن چکے ہیں۔

میں نے رویا میں دیکھا کہ اِس میدان میں ایک کرسی بچھائی گئی ہے اور کسی نے کہا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں۔ اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ ایک طرف سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں۔ جب دوسری طرف مَیں نے نگاہ اٹھائی تو مَیں نے دیکھا اُس طرف سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لا رہے ہیں اور دونوں کے مُنہ اُس کُرسی کی طرف ہیں۔ خواب میں مَیں سخت گھبراتا ہوں کہ یہ کیسی خطرناک غلطی ہوئی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لا رہے ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی تشریف لا رہے ہیں لیکن کُرسی ایک ہے یہ تو بڑی ہتک آمیز بات ہے مگر اُس وقت نہ مجھ سے اُٹھا جاتا ہے کہ مَیں دَوڑ کر کوئی اور کُرسی لے آؤں اور نہ کسی اور کو یہ خیال آیا۔ اُس وقت میرا دل خوف سے دھڑک رہا ہے اور جوں جوں وہ قریب آ رہے ہیں میرا اضطراب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہانتک کہ وہ دونوں کُرسی کے قریب پہنچ گئے۔ اُس وقت مجھے خیال آیا کہ اب شاید حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پیچھے ہٹ جائیں گے مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پیچھے نہ ہٹے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی آگے کی طرف بڑھے۔ اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی مگر تھوڑی دیر کے بعد ہی مَیں نے دیکھا کہ دونوں نے اپنے اپنے جسم کو ذرا سا ٹیڑھا کر کے کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کی۔ اور اِس کے بعد اُن کے دھڑ ایک دوسرے میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ اور جب وہ کُرسی پر بیٹھ گئے تو دَو نہیں بلکہ ایک ہی وجود نظر آنے لگا۔

یہی حقیقت اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ۔ ہم تمہارے سامنے اُس شفع کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو شفع کے ساتھ وَتر بھی ہوگا۔ بظاہر وہ دَو ہونگے لیکن درحقیقت وہ دَو نہیں بلکہ ایک ہی وجود ہوگا۔

دوسرے اِس کے یہ معنے ہوں گے کہ ایسا وجود ظاہر ہوگا جسے لوگ دَو سمجھتے ہوں گے یعنی مہدی اور عیسےٰ۔ لیکن وہ وَتر ہوگا یعنی ایک ہی وجود کے یہ دونوں نام ہوں گے۔ اور باوجود شفع سمجھے جانے کے جب وہ ظاہر ہوگا تو وَتر ثابت ہوگا۔ مَیں سمجھتا ہوں اِس قسم کی مثال پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔ کہ لوگ دو مدعیوں کے امیدوار ہوں لیکن جب وقت آئے تو وہ دو موعود ایک ہی موعود ثابت ہوں۔ صرف یہی ایک زمانہ ہے جس میں لوگ کہتے تھے کہ ایک مسیح ہوگا اور ایک مہدی ہوگا۔ مگر جب وہ آیا تو وَتر تھا یعنی پیشگوئیوں کے لحاظ سے دَو کی خبر دی گئی تھی مگر حقیقت کے لحاظ سے وہ دَو نہیں تھے بلکہ ایک ہی وجود کے دَو مختلف نام تھے۔ یہی بات اِس آیت میں بیان کی گئی تھی کہ یہ دونوں نام ایک ہی وجود کے ہوں گے۔ اور باوجود شفع سمجھے جانے کے جب وہ ظاہر ہوگا تو وتر معلوم ہوگا۔ غرض اِس صورت میں وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ میں یہ بتایا گیا ہے کہ آنے والے کی دو حقیقتیں ہوں گی۔ ایک حقیقتِ شفع اور ایک حقیقتِ وَتر۔ وہ ایک علیحدہ وجود ہوگا اسلئے بظاہر اسلام میں دَو نبی نظر آئیں گے مگر چونکہ وہ فنا فی الرسول ہو کر یہ درجہ پائے گا اور اسلام پر ہی عمل کرے گا اور اسی پر عمل کرائے گا۔ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھے گا اور وہی لوگوں سے پڑھوائے گا اس لئے دُوئی کوئی پیدا نہ ہوگی بلکہ اسلام میں ایک ہی نبی رہے گا دَو نہ ہوں گے۔ کیونکہ دَو تو اختلاف سے ہوتے ہیں۔ اتحاد سے دَو ایک ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ دَو کاموں کی وجہ سے اُسے دو عہدے ملیں گے مگر درحقیقت وہ ایک ہی وجود ہوگا۔

پھر فرماتا ہے وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ۔ اِس

حصہ آیت میں پھر ایک اور صدی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو دس تاریک راتوں کے بعد کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُن کے معاً بعد اسلام کی ترقی نہ ہوگی وہ فجر تو اُن کے بعد ظاہر ہو جائے گی، شعاعِ نور نظر آجائیگی اور لوگوں کی امیدیں بندھ جائیں گی مگر ابھی رات نہ جائے گی بلکہ ایک صدی کا ابھی وقفہ ہوگا۔ اب اگر ۱۸۹۰ کو فجر لے لو تو یہ صدی ۱۹۹۰ تک چلتی ہے۔ آجکل ۱۹۴۵ء ہے اِس لحاظ سے چھیالیس سال ابھی اِس لیل میں باقی رہتے ہیں۔ اور اگر ہجری سال لے لو اور ۱۲۷۱ کو دس تاریک راتوں کا آخری سال قرار دیدو تو یہ صدی ۱۳۷۱ میں ختم ہوتی ہے۔ گویا اِس لحاظ سے لیل کے ختم ہونے میں صرف ۸ سال باقی رہتے ہیں۔ اور اگر صدی کا سر مراد لو اور سنہ ۱۴۰۰ھ میں اِس لیل کا اختتام سمجھو تو اِس میں ۳۷ سال باقی رہتے ہیں۔ یہ تین مدتیں ہیں جو تین مختلف جہتوں سے پیدا ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اِن میں سے کونسی جہت حقیقی ہے اور کونسی غیر حقیقی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تینوں جہتیں ہی حقیقی ہوں جیسے دس راتوں کی پیشگوئی کے بارہ میں مَیں نے بتایا تھا کہ آپ کے دعوے کے لحاظ سے ایک رنگ میں پیشگوئی پوری ہو جاتی ہے۔ بیعت کے لحاظ سے دوسرے رنگ میں اور براہین احمدیہ کی اشاعت کے لحاظ سے تیسرے رنگ میں۔ اِسی طرح ممکن ہے کہ جانے والی ایک رات کا ایک ظہور آٹھ سال بعد ہو یعنی سنہ ۱۹۵۲ء میں، ایک ظہور ۳۷ سال بعد ہو یعنی سنہ ۱۹۸۱ء میں۔ ایک ظہور چھیالیس سال بعد ہو یعنی سنہ ۱۹۹۰ء میں۔ قمری لحاظ سے چونکہ ایک صدی میں تین سال کی کمی آجاتی ہے اس لئے ۳۷ سالہ میعاد میں سے اگر تین سال نکال دیئے جائیں تو ۳۴ سال رہ جاتے ہیں۔ اِس لحاظ سے یہ لیل سنہ ۱۳۹۷ھ ہجری میں ختم ہوگی۔ گویا تین کی بجائے چار جہتیں ہوگئیں۔

چونکہ ابھی یہ پیشگوئی پوری نہیں ہوئی اس لئے جتنے نقطۂ نگاہ سے بھی تعیین کی جاسکے ہمیں اُن سب کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ ایک نقطۂ نگاہ سے اِس لیل کے جانے میں صرف آٹھ سال باقی رہتے ہیں۔ ایک نقطۂ نگاہ سے ۳۴ سال باقی رہتے ہیں۔ ایک نقطۂ نگاہ سے ۳۷ سال باقی رہتے ہیں اور ایک نقطۂ نگاہ سے ۴۶ سال باقی رہتے ہیں۔ اِس عرصہ میں یقیناً دوبارہ اللہ تعالیٰ کے کسی مبعوث کے ساتھ یوم الفرقان ظاہر ہوگا اور کسی خاص نشان کے ذریعہ احمدیت کو تقویت حاصل ہوگی۔ گو جیساکہ بدر کی جنگ آخری جنگ نہیں تھی اس کے بعد بھی لڑائیاں ہوتی رہیں۔

۲۱۱ اسلام کے دوبارہ غلبہ کے سالوں کا ذکر۔

اسی طرح اِس کے بعد بھی مخالفین سے ہماری لڑائیاں جاری رہیں گی۔ مگر بہرحال احمدیت کو اُس وقت تک ایسے رنگ میں غلبہ میسر آجائے گا کہ دشمن اُس کو محسوس کرنے لگ جائے گا۔ اسلام اور احمدیت کی کامل فتح تو جیساکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تحریر فرمایا ہے قریباً تین سو سال کے عرصہ میں ہوگی۔ اِس کے بعد جو قومیں احمدیت میں شامل نہیں ہوں گی اُن کی حیثیت بالکل ایسی ہی رہ جائے گی جیسے آجکل یہود کی ہے۔ بہرحال وہ آخری ترقی خواہ کچھ لمبے عرصہ کے بعد ہو احمدیت کی ایک فتح یا آج سے آٹھ سال بعد ہوگی یا آج سے ۳۴ سال بعد ہوگی یا آج سے ۳۷ سال بعد ہوگی یا آج سے ۴۶ سال بعد ہوگی۔ یا اِن سالوں کے لگ بھگ وہ فتح ظاہر ہو جائے گی کیونکہ پیشگوئیوں میں دن نہیں گنے جاتے بلکہ ایک موٹا اندازہ بتایا جاتا ہے۔ اور جیساکہ مَیں نے بتایا ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِن چاروں اوقات میں چار مختلف قسم کی فتوحات ظاہر ہوں۔ پس اِن سب سالوں میں یا اِن سالوں کے

# هَلْ فِیْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ ۝

کیا اس میں عقلمند کے لئے کوئی قسم ہے! (یا نہیں) ۳ہ

لگ بھگ ضرور کسی نہ کسی رنگ میں احمدیت کو فتح حاصل ہو جائے گی۔

فتح و نصرت کے نشانات قریب قریب عرصہ میں ظاہر ہونے سے یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ مومنوں کے ایمان ساتھ کے ساتھ تازہ ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے گھر سے بہ خیریت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سلامتی کے ساتھ نکل آئے تو مومنوں کو ایک خوشی پہنچی۔ جب غارِ ثور میں دشمنوں کے حملے سے بچ گئے تو دوسری خوشی پہنچی۔ مدینہ پہنچے تو تیسری خوشی حاصل ہوئی۔ بدر کی جنگ میں کفار کو شکست ہوئی تو چوتھی خوشی پہنچی۔ اسی طرح ممکن ہے اللہ تعالیٰ اِن چاروں مدّتوں میں سے ہر مدت کے اختتام پر فجر کی ایک ایک لو ظاہر کرتا رہے۔ اور اس طرح مومنوں کے ایمانوں کو تقویت دیتا رہے۔ اسی رات کی نسبت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے اشعار میں فرمایا ہے ؎

دن چڑھا ہے دشمنانِ دیں کا ہم پر رات ہے
اے مرے سورج نکل باہر کہ میں ہوں بے قرار

۳ہ **حل لغات**۔ حِجْرٌ کے معنے عقل کے ہیں (اقرب) اور ذِیْ حِجْرٍ کے معنے ہوئے عقلمند انسان۔

**تفسیر**۔ هَلْ فِیْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ کے لفظی معنے تو یہ ہیں کہ کیا اس میں قسم ہے عقلمند انسان کے لئے۔ یا کیا اس میں شہادت ہے عقلمند انسان کے لئے۔ مگر هَلْ سے یہ مراد نہیں کہ قسم ہے یا نہیں بلکہ هَلْ کا سوال لفظ عربی زبان میں تصدیق کے لئے آتا ہے جیسے اُردو میں کہتے ہیں کہ کیوں ایسا ہو گیا یا نہیں اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسا ضرور ہو گیا ہے۔ پس چونکہ اس جگہ هَلْ کے لفظ سے سوال کیا گیا ہے اس کے یہ معنے نہیں کہ لوگو بتاؤ کہ اس میں عقلمند کے لئے قسم ہے یا نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ اس میں عقلمند کے لئے قسم ہے۔ اور ہر عقلمند انسان کو اسلام اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے سچا ہونے کی شہادت اِس دلیل میں مل جانی چاہیئے۔

لِذِیْ حِجْرٍ کے الفاظ کا استعمال صاف بتا رہا ہے کہ گذشتہ عظیم الشان نشانات کو پیش کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ اب تو عقلمند انسان کی سمجھ میں یہ آ جانا چاہیئے کہ جو کچھ دعوےٰ کیا جا رہا ہے اُس کے دلائل بیّنہ اور براہین قاطعہ موجود ہیں اور جب یہ ظاہر ہوں گے اُس وقت تمہیں ماننا پڑے گا کہ واقعہ میں خدا تعالیٰ نے عظیم الشان غیب کی خبریں دی ہیں۔ یہ کہہ دینا کہ مرزا صاحبؑ نے یونہی ایک دعوےٰ کر دیا ہے اور بات ہے مگر سوال یہ ہے کہ ایسے شخص کے دل میں یہ خیال کس طرح پیدا ہو گیا کہ وہ ۱۸۹۰ء میں ہی دعوےٰ کرے یا آپؑ سے پہلے کسی کے دل میں یہ خیال کیوں پیدا نہ ہوا کہ وہ ۱۸۸۰ء میں یہ دعویٰ کر دے۔ یہ تعداد اور سال بہرحال ایک مدت تک مخفی تھے۔ پھر پہلے لوگوں کے دلوں میں ان کا خیال کیوں پیدا نہ ہوا اور کیوں آپؑ نے ہی اُس وقت دعویٰ کیا جس وقت پیشگوئیوں کے مطابق مدعی کا کھڑا ہونا ضروری تھا۔ پھر سوال یہ ہے کہ باقی لوگ کیوں کامیاب نہیں ہوئے اور آپ کیوں کامیاب ہو گئے۔ مہدی کا دعویٰ حضرت مرزا صاحبؑ سے پہلے اور بھی سینکڑوں لوگ کر چکے تھے پھر وجہ کیا ہے کہ وہ تو مٹ گئے اور جس نے ۱۸۹۰ء میں دعویٰ کیا اُسے خدا نے طاقت عطا فرمائی۔ کیا یہ اِس بات کا ثبوت نہیں کہ اُس کا دعویٰ خدا تعالیٰ کی طرف سے تھا اتفاقی نہیں تھا۔ اگر اتفاقی

ہوتا اور آپؑ کی کامیابی ظاہری جدوجہد کا نتیجہ ہوتی تو بعض مدعی مہدویت ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے ملک فتح کئے اور حکومت قائم کی اور گو وہ بعد میں تباہ ہو گئے مگر بہرحال اُنکے لئے ترقی پانے کے زیادہ مواقع تھے لیکن اسکے باوجود ایک عارضی کامیابی کے بعد انہوں نے شکست کھائی اور اُن کا نام ہمیشہ کیلئے مٹ گیا۔ اِس کے مقابل میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کامیابی حاصل کرنے کے کوئی مواقع میسر نہیں تھے لیکن اسکے باوجود آپؑ نے دُنیا پر فتح پائی۔

پھر ایک اور فرق یہ ہے کہ آپؑ نے اُنہی تاریخوں پر دعوےٰ کیا جن تاریخوں کی قرآن کریم اور احادیث میں خبر دی گئی تھی مگر باقی لوگوں میں سے کسی نے آگے دعویٰ کر دیا اور کسی نے پیچھے۔ گویا وہ سب کے سب مِس فائر کر گئے اور صرف آپؑ ہی ایسے ثابت ہوئے جنہوں نے ٹھیک وقت پر لوگوں کے سامنے اپنا دعویٰ پیش کیا۔ باؔب نے دعوےٰ کیا مگر اُس نے بہت پہلے دعویٰ کر دیا۔ اسکے بعد بہاء اللہ نے دعویٰ کیا مگر اس کا دعویٰ بھی پیسے ہوا اور گو اُس نے کچھ زمانہ ایسا پایا جس سے یہ امر مشتبہ ہو سکتا تھا۔ مگر عین اس سے پہلے جبکہ مہدی کی مخصوص علامت چاند اور سورج گرہن نے ظاہر ہونا تھا وہ اِس دُنیا سے چل بسا۔ گویا سب مدعی شہادت کے مواقع سے یا پہلے گذر گئے یا بعد میں پیدا ہوئے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسے وقت میں دعویٰ فرمایا جب قرآن اور احادیث کی تمام پیشگوئیاں تقاضا کر رہی تھیں کہ کوئی مدعی اللہ تعالےٰ کی طرف سے کھڑا ہو اور وہ لوگوں کی اصلاح کا فرض سرانجام دے۔ لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ حضرت مرزا صاحبؑ کو کونسی ترقی ایسی حاصل ہوئی ہے جس کی بناء پر ہم یہ یقین کرلیں کہ آپؑ اپنے دعوے میں سچے تھے۔ اِسکا جواب یہ ہے کہ اوّل کوئی موعود ایسا نہیں گذرا جس کی ہر ملک میں جماعت ہو۔ ہماری جماعت ایسے ایسے ممالک میں قائم ہے جہاں آج سے چند سال پہلے ایک احمدی بھی نہیں تھا اور جہاں اسلام کا نام بھی نہیں پہنچا تھا۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ احمدیوں کو وہاں وہاں کام کرنیکا موقعہ ملا ہے جہاں دوسرے مدعیوں کا ایک فرد بھی نہیں پہنچا۔ مثلاً مغربی افریقہ ہے اِس ملک کے رہنے والے لوگ ننگے پھرتے تھے علم سے بے بہرہ تھے اور تہذیب و تمدّن سے قطعی طور پر ناآشنا تھے۔ جب احمدی مبلّغین وہاں تبلیغ کیلئے گئے تو اُن کی وجہ سے ہزارہا لوگ انسانیت کے دائرہ میں شامل ہوئے اور انہوں نے بھی متمدّن زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ درحقیقت اِس قسم کے عملی کاموں سے ہی کسی قوم کی زندگی کا پتہ لگ سکتا ہے ورنہ خالی ٹریکٹ شائع کر دینے سے کچھ نہیں بنتا۔ ہماری جماعت کو خدا تعالےٰ کے فضل سے اِس قسم کا کام کرنیکی توفیق ملی ہے جس قسم کا کام کرنیکی دوسرے مدعیوں کی جماعتیں قطعاً کوئی مثال پیش نہیں کر سکتیں۔

ترقی کی ایک اور علامت جو قرآن کریم سے ثابت ہوتی ہے اور جو خدا تعالےٰ کے فضل سے ہم میں پائی جاتی ہے لیکن دوسرے مدعیوں کی جماعتیں اس سے محروم ہیں وہ قوم کا ایک مرکز پر مجتمع ہونا ہے تاکہ اُس کا شیرازہ منتشر نہ ہو اور وہ متحدہ طاقت سے دُنیا میں تبلیغ کرنیکا پروگرام جاری رکھ سکے۔ مثلاً بہائیوں کا اِسوقت تک کوئی مرکز نہیں لیکن جماعت احمدیہ کا قادیان مرکز ہے جہاں ہر سال ہزاروں لوگ آتے اور علمی اور روحانی لحاظ سے فائدہ اُٹھا کر اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔ یہ وہ مرکز ہے جسکی نسبت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو الہام ہوا کہ يَأْتِيْكَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ۔ يَأْتُوْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (تذکرہ صفحہ ۴۹،۴۳) تیری طرف دُور دُور سے اور اِس کثرت سے لوگ آئیں گے کہ سڑکوں میں گڑھے پڑ جائینگے۔ پھر آپؑ نے رؤیا میں قادیان کی ترقی کو دیکھا اور فرمایا:-

"ہمنے کشف میں دیکھا کہ قادیان ایک بڑا عظیم الشان شہر بن گیا اور انتہائی نظر سے بھی پرے تک بازار نکل گئے۔ اونچی اونچی دومنزلی یا چومنزلی یا اس سے بھی زیادہ اونچے اونچے چبوتروں والی دوکانیں عمدہ عمارت کی بنی ہوئی ہیں اور موٹے موٹے سیٹھ

بڑے بڑے پیٹ والے جن سے بازار کو رونق ہوتی ہے بیٹھے ہیں اور اُن کے آگے جواہرات اور لعل اور موتیوں اور ہیروں روپوں اور اشرفیوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں اور قسما قسم کی دوکانیں خوبصورت اسباب سے جگمگا رہی ہیں۔ یکے بگھیاں، ٹم ٹم، فٹن، پالکیاں، گھوڑے، شکرمیں، پیدل اس قدر بازار میں آتے جاتے ہیں کہ مونڈھے سے مونڈھا بھڑ کر چلتا ہے اور راستہ بمشکل ملتا ہے۔"

(تذکرہ ص۲۹۵ و ص۲۹۶)

یہ پیشگوئی ہے جو قادیان کی ترقی کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمائی۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ نے آپ کو یہ خبر دی کہ لوگ اپنے وطنوں کو چھوڑ کر قادیان میں ہجرت کرکے آجائیں گے (تذکرہ ص۸۴۰ ایڈیشن چہارم) ان پیشگوئیوں کے مطابق قادیان خدا تعالےٰ کے فضل سے روز بروز بڑھ رہا ہے اور ہزارہا لوگ قادیان میں ہجرت کرکے آچکے ہیں۔ اپنے وطن کو چھوڑ دینا اور مال و املاک کو ترک کرکے ایک دوسرے شہر میں محض خدا کی رضا کیلئے ہجرت کرکے چلے جانا بڑی بھاری قربانی کی علامت ہوتی ہے۔ اور جس قوم میں یہ قربانی پائی جاتی ہو وہ کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اس کے مقابلہ میں عکہ اور بہجہ میں جا کر دیکھ لو بہائی لوگ بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہیں اور کوئی شخص بجز دنجات سے اُن کے پاس نہیں آتا۔ ہمارے آدمی سفر یورپ کے موقع پر وہاں گئے تو بہائی لوگ اُن کے پیچھے پڑ گئے کہ بہاء اللہ کی قبر کے انگور لے جاؤ۔ یہ بڑی برکت والے ہیں۔ گویا اُن کی حالت بالکل مجاوروں کی سی ہے اور وہی مشرکانہ رسوم وہاں پائی جاتی ہیں جو ہندوستان میں بعض قبروں پر پائی جاتی ہیں۔ پھر وہاں اُنکی ترقی کی جو حالت ہے اُسکا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ہم عکہ گئے تو جس سے بھی پوچھیں کہ بہائیوں کا مرکز کہاں ہے تو وہ کہتے کہ ہمیں تو علم نہیں۔ اس پر ہمیں بڑی حیرت ہوئی کہ ہم عکہ میں بھی پہنچ گئے ہیں اور بہائیوں کے مرکز کا بھی ہمیں پتہ نہیں لگتا۔ آخر بڑی دیر کے بعد ایک شخص نے بتایا کہ آپ غلط سوال کر رہے ہیں بہائی اس علاقہ میں بہائیت کے نام سے نہیں بلکہ عجمیت کے نام سے مشہور ہیں اور اُنکو سب لوگ یہاں عجمی کہتے ہیں۔ آپ عجمی کہکر دریافت کرتے تو کسی کو علم بھی ہوتا کہ آپ کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ پھر اُس نے بتایا کہ یہ عجمی بھی عکہ میں نہیں رہتے بلکہ تین چار میل پرے ایک جگہ بہجہ ہے وہ وہاں رہتے ہیں۔ چنانچہ ہم موٹر لیکر وہاں پہنچے اور بہائیوں کے حالات کا مشاہدہ کیا۔ اُس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ چونکہ بعض پیشگوئیوں میں عکہ کا لفظ آتا تھا اسلئے انہوں نے عکہ کو اپنا مرکز لکھنا شروع کر دیا حالانکہ وہ عکہ میں نہیں بلکہ اس سے بھی چار پانچ میل دُور رہتے تھے اور پھر باوجود اس کے کہ سالہا سال سے باب اور بہاء اللہ کا دعویٰ تھا پھر بھی اُنکی حالت یہ تھی کہ چار پانچ میل تک بھی لوگ اُنکو نہیں جانتے تھے اور یہاں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی برکت سے یہ حالت ہے کہ کوئی شخص آپ کا نام لے دے فوراً لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ مرزا صاحبؑ کے ماننے والوں میں سے ہے بلکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام پر احمدی بھی مرزائی کہلانے لگ گئے ہیں اور یا پھر لوگ ہماری جماعت کے دوستوں کو مولوی کہتے ہیں جس کے معنے ہیں علم والے مگر عجمی کا لفظ عرب میں ہمیشہ تحقیر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور عربی زبان میں اسکے معنے ہوتے ہیں اَن پڑھ اور جاہل لوگ۔ پس اُنہیں تو اپنے علاقہ میں اَن پڑھ اور جاہل کہا جاتا ہے اور یہاں احمدیوں کو مولوی کہا جاتا ہے جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ علم والے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ترقی کا صحیح مقام ابھی ہماری جماعت کو حاصل نہیں ہوا اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے ساری دُنیا فتح کر لی ہے مگر "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" ہمارا ایک مرکز ہونا، ہماری جماعت کا دُنیا کے مختلف ممالک میں پھیل جانا، ہزاروں آدمیوں کا اپنے وطنوں کو چھوڑ کر قادیان میں ہجرت کرکے آجانا اور ہمارا اپنی تعداد اور اپنے علم میں روز بروز

بڑھتے جانا یہ اس بات کی علامات ہیں کہ ہم ایک دن ساری دُنیا کو انشاء اللہ فتح کر لیں گے۔ اِس وقت اگر قادیان کے محلوں اور اُس کی پُرانی اور نئی آبادی کا جائزہ لیا جائے تو سوائے ہمارے کہ ہم قادیان کے اصل باشندے ہیں اور سوائے محلہ ارائیاں میں رہنے والے چند لوگوں کے کہ جنکی مجموعی تعداد کسی صورت میں بھی دو تین سو سے زیادہ نہیں ہوگی باقی سب کے سب وہ لوگ ہیں جو باہر سے ہجرت کر کے قادیان آئے۔ مَیں سمجھتا ہوں سَو احمدیوں میں سے صرف ڈیڑھ فیصدی قادیان کے اصل باشندے ہیں باقی سب کے سب وہ لوگ ہیں جو باہر سے آئے ہیں۔ پھر اِن باہر سے آنے والوں میں کوئی افغانستان سے آیا ہے کوئی برما سے آیا ہے کوئی مالابار سے آیا ہے کوئی سیلون سے آیا ہے کوئی سندھ سے آیا ہے کوئی بنگال سے آیا ہے۔ اسی طرح اور بیسیوں علاقے ہیں جہاں کے رہنے والے قادیان میں پائے جاتے ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں اگر یہ دیکھا جائے کہ قادیان میں کہاں کہاں سے لوگ آئے ہوئے ہیں تو اتنے مختلف مقامات سے آئے ہوئے لوگ ثابت ہوں گے کہ لاہور میں بھی اتنے مختلف مقامات کے لوگ موجود نہیں ہوں گے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ بہت بڑی بات ہے اور اس الہام کی صداقت کا ایک زبردست ثبوت ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہوا کہ يَأْتِيكَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۔ يَأْتُونَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ (تذکرہ صفحہ ۲۹۰) لوگ تیرے پاس دُور دراز سے آئیں گے۔ پھر خدا تعالیٰ نے جماعت احمدیہ کو شاخ در شاخ اِس طرح پھیلا دیا ہے کہ ہر قسم کے کارکن ہماری جماعت میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ایک طرف زمیندار طبقہ ہماری جماعت میں پایا جاتا ہے تو دوسری طرف تاجروں کا بھی ایک کثیر حصہ ہماری جماعت میں موجود ہے۔ اسی طرح انگریزی دان ہماری جماعت میں کثرت سے پائے جاتے ہیں تو انگریزی دان لوگوں کی بھی ہماری جماعت میں کمی نہیں ہے۔ غرض ہر طبقہ اور ہر شعبہ میں ہماری جماعت پھیل رہی ہے۔ اور ہر قسم کے کارکن ہماری جماعت کو میسّر آرہے ہیں مگر بہائیوں کو یہ بات نصیب نہیں۔ اُن میں چند خاص قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ اُن میں نہیں پائے جاتے جو اِس بات کی علامت ہے کہ اُن کی جماعت کو وہ وسعت حاصل نہیں جو دُنیا پر چھا جانیوالی جماعتوں کو حاصل ہوا کرتی ہے۔ چند علمی رنگ میں بحثیں کرنیوالے آدمیوں کا پیدا ہو جانا کسی جماعت کی زندگی کے لئے کافی نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ قربانی اور ایثار کا مادہ اُن میں زیادہ سے زیادہ پایا جاتا ہو۔ وہ مرکز سے وابستگی رکھتے ہوں۔ اپنی تعلیم کی اشاعت کے لئے ہر مشکل کو برداشت کرنے والے ہوں اور یہ جذبہ اپنے دلوں میں رکھتے ہوں کہ ہم مر جائیں گے مگر اُس تعلیم کو نہیں چھوڑیں گے جسکو لیکر ہم کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ جذبۂ قربانی اور ایثار و استقلال کا یہ مادہ ہماری جماعت میں تو پایا جاتا ہے مگر بہائیوں میں اس قسم کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔

پھر جس قسم کی اشاعت کی توفیق ہماری جماعت کے مبلغوں کو ملی ہے اُنکو نہیں ملی۔ ہماری جماعت کے مبلغ سارے جہان میں پھرتے اور لوگوں کو اسلام اور احمدیت میں داخل کرتے ہیں مگر اُن کے اندر کوئی باقاعدہ تبلیغی نظام نہیں نہ اُن کے مبلغ غیر ممالک میں جاتے ہیں اور نہ تبلیغی جذبہ اُنکے اندر پایا جاتا ہے۔ اِسی طرح جس قسم کا کام ہماری جماعت کر رہی ہے اُس قسم کے کام کی کوئی مثال بہائی اپنی جماعت کی طرف سے پیش نہیں کر سکتے۔ ہماری جماعت نے پسماندہ اقوام کو اُبھارنے اور ادنیٰ اقوام کو اونچا کرنے اور اُن میں تعلیم کو رائج کرنے اور انہیں مہذب اور متمدن بنانے کیلئے جس قدر کوششیں کی ہیں اُن کا عشر عشیر بھی بہائیوں میں نہیں پایا جاتا۔

پھر تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اُن کی ہمارے مقابل میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے ہماری جماعت

چالیس سال پہلے کام شروع کیا تھا پھر بھی ابتک صرف چند امراء کیوجہ سے اُنکو شہرت حاصل ہوئی ہے جو اُن کی جماعت میں شامل ہوئے۔ لوگوں کی اکثریت نے اُنکی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اور اِن چند امراء کا بہائیت کی طرف میلان بھی کسی قربانی کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ اس وجہ سے ہوا کہ امراء مذہبی پابندیوں کو سخت مصیبت سمجھتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا طریق نکل آئے کہ مذہب بھی رہے اور آزادی بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ اس خیال کے ماتحت اگر انہیں کسی مذہب میں آسانی نظر آتی ہے تو وہ اُس میں شوق سے شامل ہو جاتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہم مذہب کے بھی پابند رہیں گے اور ہر قسم کے تعیش سے بھی کام لیتے رہیں گے۔ بہائیت میں اس قسم کی کوئی پابندیاں نہیں وہ کہتے ہیں نماز جسکے پیچھے چاہو پڑھو۔ جو چاہو کرو تمہیں کوئی بازپُرس نہیں ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جو بیک وقت مذہب اور آزادی سے ہمکنار رہنا چاہتے ہیں وہ ایسے مذہب میں شامل ہو جاتے ہیں۔

مَیں جب ولایت گیا تو ایک انگریز بہائی عورت مجھ سے ملنے کے لئے آئی اور کہنے لگی آپ بہاءاللہ کو کیوں نہیں مانتے مَیں نے کہا تم قرآن میں کوئی نقص بتا دو تو پھر یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ میں کسی اور مذہب کی طرف رجوع کروں ورنہ جب تک قرآن کریم میں کوئی نقص ثابت نہیں ہوتا مجھے کسی اور مذہب کی تعلیم کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے وہ کہنے لگی دیکھئے! قرآن میں یہ کتنا بڑا نقص ہے کہ اُس نے ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دی ہے۔ مَیں نے کہا بہاءاللہ نے خود ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دی ہے، وہ کہنے لگی یہ بات بالکل غلط ہے بہاءاللہ نے قطعاً ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت نہیں دی۔ اُسکے ساتھ ایک اور عورت بھی تھی جو ایرانن تھی اور چھ ماہ کے قریب مرزا عباس علی کے پاس رہ آئی تھی۔ مَیں نے اُس انگریز عورت سے کہا کہ تم اپنے ساتھ والی عورت سے پُوچھو کہ کیا یہ درست ہے یا نہیں۔ اُس نے پُوچھا تو وہ جواب دینے میں کچھ شرارت کر گئی۔ کہنے لگی دوؔ شادیوں کا ذکر تو آتا ہے مگر بہاءاللہ نے لکھا تھا کہ میرے کلام کی جو تشریح مرزا عباس علی کریں وہی درست ہوگی اور انہوں نے یہی تشریح کی ہے کہ ایک ہی شادی کرنی چاہیئے۔ مَیں نے کہا یہ بھی کوئی معقول بات ہے کہ دوؔ شادیوں کا ذکر ہو اور کہا جائے کہ اِس سے مراد ایک ہی شادی ہے۔ انگریز عورت کہنے لگی جواب تو درست ہے کہ جب مرزا عباس علی نے تشریح کر دی اور کہدیا کہ ایک ہی شادی کرنی چاہیئے تو معاملہ ختم ہو گیا۔ مَیں نے کہا اچھا یہ بتاؤ بہاءاللہ نے عباس علی کو کہا تھا یا نہیں کہ تم لڑکے کی خاطر دوسری بیوی کر لو۔ اُس انگریز عورت نے کہا یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ مَیں نے کہا اپنے ساتھ والی سے پُوچھو۔ اُس سے پُوچھا گیا تو وہ کہنے لگی کہا تو تھا مگر اُس نے مانا نہیں۔ مَیں نے کہا اُس نے بات نہیں مانی تو وہ نافرمان تھا اُس پر الزام عائد ہوتا ہے۔ کہ اُس نے اپنے باپ کے حکم کی جو مظہرِ خدا تھا خلاف ورزی کی۔ اُس انگریز عورت نے کہا کہ نہیں جب اُس نے انکار کر دیا تو بات صاف ہو گئی۔ بہاءاللہ نے خواہ کچھ لکھا ہو اُس نے انکار کر دیا تو پتہ لگ گیا کہ دوسری شادی جائز نہیں۔ مَیں نے کہا اچھا یہ بتاؤ بہاءاللہ کی اپنی دوؔ بیویاں تھیں یا نہیں۔ انگریز عورت نے پھر کہا کہ ہرگز نہیں۔ مَیں نے کہا اپنی ایرانن بہن سے پُوچھو۔ اُس سے پُوچھا گیا تو اُس نے کہا مجھ سے کیوں پُوچھتے ہیں۔ مَیں نے کہا آخر تم وہاں رہ آئی ہو اور تمہاری ساتھن ناواقف ہے تمہارا اتنا بتا دینے میں کیا حرج ہے کہ بہاءاللہ کی دوؔ بیویاں تھیں یا نہیں۔ اُس نے کہا اصل بات یہ ہے کہ دعویٰ سے پہلے اُس کی دوؔ بیویاں تھیں لیکن دعوے کے بعد اُس نے ایک بیوی کو بہن قرار دیدیا تھا۔ انگریز عورت یہ سُنکر اچھل پڑی اور کہنے لگی دیکھیئے دیکھیئے!! جواب ہو گیا۔ مَیں نے کہا تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ بہاءاللہ خدائی کے مقام پر تھا اور بچپن سے اُسے علمِ غیب حاصل تھا، اگر بہاءاللہ کو علم تھا کہ مجھے اپنی ایک بیوی کو بہن قرار دینا پڑے گا تو اُس نے دوسری شادی ہی کیوں کی۔ انگریز عورت کہنے لگی نہیں جب اُس نے ایک کو

# اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝

کیا تجھے معلوم ہے کہ تیرے رب نے عاد سے کیا (معاملہ) کیا ۵۴

بہن قرار دیا تھا تو یہ کافی تھا۔ مَیں نے کہا اچھا اِس ایرانی بہن سے پوچھو کہ کیا بہن سے بچّے پیدا کرنے بھی بہائی مذہب میں جائز ہیں۔ اگر نہیں تو دعویٰ کے بعد اُس بہن کے بطن سے بہاء اللہ کے ہاں اولاد کیوں پیدا ہوئی تھی۔ اِس پر وہ انگریز عورت جوش سے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی آپ تو گالیاں دینے لگ گئے ہیں۔ مَیں نے کہا یہ گالیاں نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار ہے۔ تم اِس سے پوچھو کہ کیا دعوے کے بعد بہاء اللہ کے ہاں اُس دوسری عورت سے اولاد ہوئی ہے یا نہیں۔ اِس دفعہ ایرانن بہت دیر تک خاموش رہی مگر آخر اُسے تسلیم کرنا پڑا کہ دوسری بیوی سے دعویٰ کے بعد بھی اُنکے ہاں اولاد ہوئی تھی۔ مَیں نے کہا اب آپ خود فیصلہ کر لیں کہ ہم قرآن کو کیوں مانتے ہیں اور بہاء اللہ کو اپنے دعویٰ میں کیوں سچّا تسلیم نہیں کرتے۔ بہاء اللہ کو ہم اُسی صورت میں مان سکتے تھے جب قرآن کریم کے ذریعہ ہماری دینی ضروریات پوری نہ ہو سکتیں اور بہاء اللہ اِس ضرورت کو پُورا کر دیتے لیکن اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے اور اِدھر کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں ہے جسے اسلامی شریعت نے پُورا نہ کیا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ قرآنی شریعت کو ترک کیا جائے اور بہائی شریعت کو قابلِ قبول قرار دیا جائے۔

غرض بہائی شریعتِ اسلامیہ کو منسوخ قرار دیتے اور ایک نئی شریعت دُنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام دُنیا میں اسلئے مبعوث ہوئے ہیں کہ آپؑ اسلام کو زندہ کریں اور شریعت کو دُنیا میں قائم کریں۔ اللہ تعالیٰ نے خود آپؑ کو الہاماً فرمایا کہ يُحْيِ الدِّيْنَ وَيُقِيْمُ الشَّرِيْعَةَ (تذکرہ ص۱۹)۔ مسیح موعودؑ اسلئے آیا ہے تاکہ وہ اسلام کو زندہ کرے اور شریعت کو دوبارہ دُنیا میں قائم کرے۔ آپؑ اِس مقصد کو لیکر کھڑے ہوئے اور لاکھوں لوگوں کو اپنے ارد گرد اکٹھا کر لیا۔ بہاء اللہ نے یہی کیا کہ اسلامی شریعت میں سے بہت سی باتوں کو یا منسوخ کر دیا یا اُن میں آسانیاں پیدا کر دیں۔ مگر پھر بھی لوگوں نے اُسکو نہ مانا۔ بہائیوں کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے اُردو میں کہتے ہیں "شافعی سب کچھ معافی" اُن کا مذہب بھی اِسی قسم کا ہے۔ اِس قسم کی تحریک کو دُنیا میں چلانا اور بات ہے اور ساری دُنیا کی مخالفت کے باوجود بنی نوع انسان کی ساری زندگی بدلنا، اُن کی صبح بدلنا اُن کی شام بدلنا، اُنکا دن بدلنا اُن کی رات بدلنا، اُنکا اوڑھنا بدلنا اُنکا بچھونا بدلنا، اُنکا کھانا بدلنا اُنکا پینا بدلنا، اُنکا ظاہر بدلنا اُنکا باطن بدلنا، اُنکا مذہب بدلنا اُنکی سیاست بدلنا، اُنکی تعلیم بدلنا اور اُنکا تمدّن بدلنا یہ وہ کام ہے جسے حقیقی کام کہا جا سکتا ہے اور یہ وہ کام ہے جو گذشتہ دو ہزار سال میں یا تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا یا اب اُن کے شاگرد حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیا ہے۔ پس ترقی کے جو آثار ہیں وہ صرف حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جماعت میں پائے جاتے ہیں۔ آپؑ ہی دُنیا کے مسیح اور مہدی ہیں۔ آپؑ ہی اُن کے نجات دہندہ ہیں اور آپؑ ہی وہ موعود ہیں جو اُن تاریخوں میں ظاہر ہوئے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دی تھیں یا قرآن کریم میں اُن کا ذکر آتا تھا۔

۲ اَلَمْ تَرَ کا مطلب

**۵۴ تفسیر۔** اَلَمْ تَرَ قرآن کریم کا ایک محاورہ ہے اِس سے رؤیتِ قلبی یا رؤیتِ علمی مراد ہوتی ہے رؤیتِ عین مراد نہیں ہوتی جیسے قرآن کریم میں ہی ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (سورۃ الفیل ع۱) کیا تُو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالےٰ نے اصحاب الفیل کے ساتھ کیسا سلوک کیا حالانکہ اصحاب الفیل کے واقعہ کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے اُس کے حالات آپؐ نے دیکھے نہیں تھے۔ پس معنے یہی ہیں کہ کیا تمہیں معلوم ہے اللہ تعالےٰ نے اصحاب الفیل

سے کیا کیا۔ اِسی طرح اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ میں بھی رؤیتِ علمی مراد ہے رؤیتِ عین مراد نہیں مطلب یہ ہے کہ کیا تجھے معلوم نہیں اللہ تعالیٰ نے عاد سے کیا کیا اور کیا تو اُن حالات سے نصیحت حاصل نہیں کر سکتا۔ یہاں تُو سے مراد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ ہر انسان مخاطب ہے۔ بعض جگہ خطاب واحد کے صیغہ سے ہوتا ہے لیکن مراد ایک جماعت ہوتی ہے۔ یہاں بھی اَلَمْ تَرَ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ سارے مسلمان اور پھر ساری دُنیا ہے۔ عاد ایک قبیلے کا نام تھا اس کا ذکر تفصیلی طور پر تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۲۰۲ نوٹ صفحہ ۵ میں آچکا ہے یورپین لوگ کہتے ہیں کہ اِس قبیلے کا وجود آثارِ قدیمہ سے نہیں ملتا۔ چنانچہ عرب کے جس قدر کھنڈرات کھودے گئے ہیں اور جس قدر آثارِ قدیمہ کا سُراغ لگایا گیا ہے اُن میں عاد کا وجود کسی جگہ نہیں ملا۔ لیکن اُن کی یہ بات ثبوت اور دلیل کے طور پر تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

عاد کے وجود کے متعلق بعض لوگوں کا اعتراض اور اس کا جواب

اوّل تو اِس لئے کہ اُن کا پُرانے کھنڈرات کو تلاش کرنا یہ معنے نہیں رکھتا کہ عرب کے سارے کھنڈرات انہوں نے تلاش کر لئے ہیں۔ عرب میں انگریزوں کو تو کوئی جانے ہی نہیں دیتا۔ باہر کے علاقوں میں جہاں اُن کا قبضہ ہے انہوں نے کچھ کھنڈرات بے شک تلاش کئے ہیں۔ لیکن اُن کھنڈرات میں عاد کے نشانات کا نہ ملنا یہ معنے نہیں رکھتا کہ انہوں نے سارے کھنڈرات کھود لئے ہیں اور اب کوئی بھی ایسا کھنڈر باقی نہیں رہا جسے تلاش کیا جا سکے۔ ہندوستان میں انگریز تین سو سال سے حکومت کر رہے ہیں۔ مگر ہندوستان کے سارے کھنڈرات وہ اب تک نہیں نکال سکے۔ تیس چالیس سال کی بات ہے کہ ٹیکسلا میں اشوکا کا شہر نکلا جو ہندوستان کے بہت بڑے بادشاہوں میں سے تھا اور اب تک پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس کا مقام کہاں تھا۔ تیس چالیس سال ہوئے وہاں ایک مقام کو جو "شاہ دی ڈھیری" کہلاتا تھا کھودا گیا تو اشوکا کے محلّات اور اُس کا شہر نکل آیا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ اشوکا کا صدر مقام کبھی بنگال میں بتاتے تھے۔ کبھی بہار میں اور کبھی کسی اور جگہ۔ گویا اُس کے حالات اتنے مخفی تھے کہ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں رہتا تھا۔ اتفاقیہ طور پر ایک مقام کو کھودا گیا تو اُس میں سے اشوکا کے محلّات وغیرہ نکل آئے۔ حالانکہ وہ ایک زمانہ میں سارے ہندوستان کا بادشاہ تھا۔

اسی طرح سندھ میں مَنجو دھارو کے مقام پر جسے سندھی زبان میں "موہنجو ڈیرو" کہتے ہیں ایسے آثارِ قدیمہ برآمد ہوئے ہیں جن سے سندھ کی پُرانی تہذیب کا پتہ چلتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اشوکا کی تہذیب سے بھی پُرانی ہے سندھیوں کو اِس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اتفاقاً وہ جگہ کھودی گئی تو نیچے سے ایسے آثار نکل آئے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آج سے دس بارہ ہزار سال پہلے کے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ جو بھی جگہ نکلے اُس کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ سب سے قدیم تہذیب کے آثار ہیں۔ تھوڑے ہی دن ہوئے جیکب آباد میں ایک جگہ نکلی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اس سے بھی پُرانی ہے۔ پس ایک ایسی جگہ میں بھی جہاں صدیوں سے انگریزوں کی حکومت ہے جب وہ ابھی تک مکمل کھُدائی نہیں کر سکے تو عرب کے متعلق یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہاں انہوں نے پورے طور پر کھُدائی کر لی ہے۔ پس اوّل تو یہ دعویٰ کہ کھُدائی میں عاد کا نام نہیں نکلا اگر صحیح ہو تو اس سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ جن کھنڈرات کی یورپین نے کھُدائی کی ہے اُن میں عاد کا نام نہیں نکلا نہ یہ کہ عاد کا وجود تھا ہی نہیں۔ اگر چین میں بیٹھا ہوا ایک شخص یہ کہدے کہ افریقہ کوئی نہیں تو اِسکے معنے صرف اتنے ہی ہوں گے کہ اُس نے افریقہ کو نہیں دیکھا نہ یہ کہ افریقہ کا کوئی وجود ہی نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم نے جب عادِ ارم فرمایا ہے تو اس سے پتہ لگتا ہے کہ عاد کسی ایک قبیلے کا نام نہیں بلکہ مجموعہ قبائل کا نام تھا اور کئی قسم کے عاد تھے اور جبکہ عاد مجموعۂ قبائل کا نام تھا تو جس قبیلے کی بھی حکومت ہوگی وہ اپنا نام لکھتا ہوگا مجموعے کا نہیں لکھتا ہوگا اس وجہ سے یہ خیال کر لینا کہ پرانے آثار میں عادِ ارم کا نام نہیں ایک مغالطہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو نام بھی کسی پرانے عرب قبیلے کا نکلے گا اُسے عاد کے قبائل میں سے ہی قرار دینا پڑے گا۔ کیونکہ عربوں کے نزدیک ان کی پرانی تہذیب عاد قوم کی مرہونِ منت تھی۔

تیسرا قطعی ثبوت یہ ہے کہ یونانی جغرافیوں میں لکھا ہے کہ یمن میں زمانہ مسیح سے قبل ایک قبیلہ حاکم تھا جس کا نام "ایڈرامی ٹائی" تھا۔ اور یہ لفظ صاف بتا رہا ہے کہ عادِ ارم بنا ہوا ہے۔ یوروپین مصنفوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس سے مراد عاد نہیں بلکہ حضرموت ہے مگر یہ خیال غلط ہے۔ اوّل تو اس لئے کہ "ایڈرامی ٹائی" ایک قبیلے کا نام بتایا گیا ہے اور حضرموت شہر کا نام ہے دوسرے حضرموت کے لئے یونانی جغرافیوں میں ہی ایک علیحدہ لفظ موجود ہے۔ چنانچہ جس جغرافیہ میں "ایڈرامی ٹائی" کا ذکر آتا ہے اُسی جغرافیہ میں حضرموت کا نام "ایڈراموٹی ٹائی" (ADRAMOTITAI) لکھا ہے اور حضرموت کا نام یونانی اور لاطینی دونوں کتب میں مذکور ہے معلوم نہیں یوروپین مصنفین نے ان دو فرقوں کے ہوتے ہوئے جبکہ ایک نام شہر کا ہے اور ایک قوم کا۔ اور ایک کے ہجے اَور ہیں اور دوسرے کے اَور۔ دونوں کو ایک کس طرح قرار دے دیا۔ "ایڈرامی ٹائی" کا لفظ جو عادِ ارم کے متعلق آتا ہے اصل میں ایڈرامی ٹائی ہے۔ ٹائی جو آخر میں آتا ہے وہ یونانی میں نام کی علامت ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایڈ عاد ہے اور رامی ارم ہے اور اس نام سے ملتا ہُوا کوئی قبیلہ عرب کا سوائے عادِ ارم کے نہیں ہے

ایک مشہور عیسائی مؤرخ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ عاد کے متعلق مؤرخوں کی سینکڑوں صفحوں کی کتابیں اُس سے زیادہ معلومات بیان نہیں کر سکیں جتنے معلومات قرآن کریم نے اپنے چند الفاظ میں بیان کر دئے ہیں۔ جس قدر قدیم روایات اس سلسلہ میں بیان کی جاتی ہیں اُن کو دیکھنے بعد انسان صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ پرانی تاریخوں میں عادِ ارم کے متعلق جس قدر باتیں بیان کی گئی ہیں وہ سب کی سب لغو اور فضول ہیں سوائے اُس حصہ کے جو قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ یہ عیسائی مؤرخ شدید دشمنِ اسلام ہے مگر عادِ ارم کی تاریخ کے متعلق قرآن کریم کی فضیلت کا اقرار کرنے پر مجبور ہو گیا ہے (دیکھو العرب قبل الاسلام مصنفہ جرجی زیدان)

قرآن مجید میں عاد کے حالات

قرآن کریم سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبیلہ بہت طاقتور تھا چنانچہ اگلی آیت میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ اس زمانہ تک اتنی طاقت کی کوئی قوم دنیا میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔

قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ احقاف میں رہتے تھے۔ احقاف کے عرب میں دو علاقے ہیں۔ ایک وہ علاقہ ہے جو جنوبی احقاف کہلاتا ہے۔ یہ یمن سے شروع ہو کر صنعاء کے نیچے نیچے عدن سے اوپر مشرق کی طرف کو چلا گیا ہے پھر وہاں سے پھیلتا ہُوا شمال کی جانب کو نکل گیا ہے۔ دوسرا علاقہ شمالی احقاف ہے جو بصریٰ کے نیچے کی طرف عراق کے بیابان کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے۔

غرض احقاف نے عرب کو گھیرا ہوا ہے ایک نیچے کے احقاف ہیں اور ایک اوپر کے درمیان میں نجد اور حجاز کے علاقے ہیں۔

احقاف اُن ریت کے ٹیلوں کو کہتے ہیں جو اونچے نیچے خم کھاتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ یہ لوگ وہاں رہتے تھے جہاں اب احقاف ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ

بِالْاَحْقَافِ (الاحقاف ع ۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا زور شمالی اور جنوبی عرب میں تھا یا وہ علاقے جو شمالی اور جنوبی احقاف کہلاتے ہیں اُن میں ان لوگوں کا زور تھا۔ تاریخوں میں جو مختلف روایات آتی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ جنوب سے پھیل کر شمال میں چلے گئے تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ثمود قوم جو عاد کا ایک قبیلہ تھی اس کے آخری دَور میں اس کی حکومت شمالی عرب اور جنوبی فلسطین میں تھی اور یہیں اس کے آثار ملتے ہیں۔ چنانچہ حجر بھی اُن کا ایک شہر ہے جو مدینہ منورہ اور تبوک کے درمیان ہے۔

یہ قوم حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہوئی ہے چنانچہ قرآن کریم میں اُن کے نبی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (الاعراف ع ۹) یعنی یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے تم کو نوحؑ کی قوم کے بعد دنیا میں غلبہ عطا کیا۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوحؑ کے ساتھ براہِ راست جس قوم کا تعلق تھا اور جس نے قوم نوحؑ کے بعد عرب میں غلبہ حاصل کیا وہ عاد لوگ تھے۔

عاد کے متعلق قرآن مجید کی پیشگوئی اور اس کا ظہور

تورات میں جو بابل کی تباہی کا ذکر ہے اور جو قوم نوحؑ کی تباہی تھی معلوم ہوتا ہے اس تباہی کے بعد جو اقوام بابل سے نکل کر پھیلیں اُن میں سے ایک قبیلہ جس نے بعد میں ترقی کی اس کا نام عاد تھا۔ یہ قبیلہ نسلاً بڑا مضبوط اور جلد جلد پھیلنے والا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں حضرت ہود علیہ السلام اُن کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً (الاعراف ع ۹) یہاں پیدائش کے معنے نسل کے بھی ہیں اور جسم کی بناوٹ کے بھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ قد آور جوان تھے اور اُن کی نسل خوب ترقی کرتی تھی۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عمالقہ کی نسلیں جو عرب کے شمال میں تھیں وہ انہی لوگوں کے بقایا میں سے تھیں۔

پھر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس قبیلہ میں شرک کا مرض بھی کثرت سے تھا۔ چنانچہ حضرت ہود علیہ السلام کہتے ہیں يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (الاعراف ع ۹) اے میری قوم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم شرک میں مبتلا تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم بھی چونکہ شرک میں مبتلا تھی اس لئے معلوم ہوتا ہے وہی روایات ان میں بھی آگئیں۔

پھر یہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں بناتے تھے چنانچہ اسی سورۂ فجر میں ان کو ذات العماد کہا گیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ لوگ بڑی بڑی اونچی عمارتیں بنانے والے تھے۔ پھر قرآن کریم میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اُن کی تباہی ایک آندھی سے ہوئی تھی جو سات راتیں اور آٹھ دن متواتر اُن پر چلتی رہی۔ اور پھر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ اس طرح تباہ و برباد کر دئے گئے کہ قومی طور پر اُن کا کوئی نشان باقی نہیں رہا چنانچہ فرماتا ہے فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ (احقاف ع ۳) ان کی قوم کا نشان بالکل مٹ گیا ہے صرف اُن کی بڑی بڑی عمارتوں کے آثار باقی رہ گئے ہیں۔

دیکھو یہ بھی کیسی زبردست پیشگوئی ہے جو پوری ہوئی۔ یوروپین مورخ اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں عاد کا کہیں نام نہیں ملتا اور وہ اتنا نہیں سوچتے کہ قرآن کریم نے تو خود کہہ دیا تھا کہ فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ صرف عمارتیں نظر آئیں گی۔ اُن کا نام نظر نہیں آئے گا کیونکہ ہم نے اُن کا نام بالکل مٹا دیا ہے پس اگر انہوں نے یہ نئی تحقیق کی ہے کہ عاد کا نام آثار قدیمہ میں نہیں ملتا تو ہم کہتے ہیں اس سے بھی قرآن کریم کی صداقت ہی ثابت ہوتی ہے کیونکہ قرآن کریم نے خود کہا تھا کہ آثار قدیمہ کی تلاش و جستجو کے بعد اُن کی عمارتیں تو ٹوٹی پھوٹی تمہیں مل جائیں گی مگر اُن کا نام نہیں ملے گا۔ پس یہ جملہ قرآن کریم

# اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۙ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا

یعنی (عاد) ارم سے جو بڑی بڑی عمارتوں والے تھے ۵۵ وہ جن کی مثل (قوم) ان ملکوں میں پیدا ہی نہ

# فِی الْبِلَادِ ۙ

کی گئی تھی ۵۶

کی صداقت کو باطل ثابت کرنے والا نہیں بلکہ اس کی اور بھی تائید کرنے والا ہے۔ عاد قوم کے نبی حضرت ہودؑ تھے ان کا ذکر قرآن کریم ستّرہ جگہ پر آیا ہے۔

(۱) ہود۔ اس میں چار جگہ نام آتا ہے (۲) شعراء۔ (۳) قمر (۴) فُصِّلَتْ (۵) اعراف (۶) فجر (۷) ذاریات (۸) ص (۹) ق (۱۰) توبہ (۱۱) ابراہیم (۱۲) حج (۱۳) مومن (۱۴) نجم (۱۵) فرقان (۱۶) عنکبوت (۱۷) احقاف۔ سورۂ فُصِّلت میں دو دفعہ اور ہود میں چار دفعہ ذکر آتا ہے اس طرح سارے قرآن میں ان کا ۲۱ دفعہ ذکر ہو گیا۔

میں ان قرآنی حالات کے متعلق ایک عیسائی مؤرخ کا قول پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ان حالات سے زیادہ مکمل اور صحیح حالات ہمیں دنیا کی اور کسی تاریخ سے نہیں مل سکتے۔

**۵۵ حل لغات۔** اَلْعِمَادُ: کے معنے ہیں اَلْاَبْنِیَۃُ الرَّفِیْعَۃُ۔ اونچی عمارتیں۔ اس کا مفرد عِمَادَۃٌ آتا ہے (اقرب) پس ذَاتُ الْعِمَادِ کے معنے ہوئے: بلند اور اونچی عمارتوں والا قبیلہ۔

**تفسیر۔** اِرم عطفِ بیان ہے عاد کے بعد اِرم کے متعلق تین مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ارم قبیلے کا نام ہے اور یہاں ارم قبیلہ سے تعلق رکھنے والے عاد کا ہی ذکر کیا گیا ہے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ قبیلے کا نام نہیں بلکہ ایک شہر کا نام ہے۔ وہ لوگ بِعَادٍ اِرَمَ کی بجائے بِعَادِ اِرَمَ پڑھتے ہیں یعنی وہ عاد جو ارم جگہ کے رہنے والے تھے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ہے تو شہر کا نام مگر مراد ہے اِرَمَ صَاحِبِ ذَاتِ الْعِمَادِ یعنی ارم جو بڑی عمارتوں والے تھے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قبیلہ کے لوگ بڑی بڑی عمارتیں بنایا کرتے تھے چنانچہ سورۂ شعراء میں حضرت ہودؑ اُن کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں اَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَۃً تَعْبَثُوْنَ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ (الشعراء ع ۷) یعنی تم لوگ ہر پہاڑی پر شاندار عمارتیں بناتے ہو اور بڑے بڑے کارخانے تیار کرتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ تم حوادثِ روزگار سے ہمیشہ محفوظ رہو گے اور کبھی دنیا سے مٹ نہیں سکو گے۔ یہ اس قبیلہ کی ایک امتیازی خصوصیت تھی جس کا قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے۔

**۵۶ تفسیر۔** لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ سے مراد یہ ہے کہ اس قوم سے پہلے اور کوئی قوم اس جیسی طاقتور نہیں گذری۔ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر مختلف رنگ میں اس قسم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کو دیکھ کر بعض لوگ اعتراض کر دیا کرتے ہیں کہ ساری قوموں یا سارے لوگوں کے متعلق یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی کوئی مثال نہیں پائی جاتی۔ ایک قوم تو ایسی ہو سکتی ہے جو بے مثال ہو لیکن ہر قوم کے متعلق یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اُس جیسی پہلے کوئی قوم نہیں گذری۔ اس اعتراض کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ طاقت و قوت میں مقابلہ کبھی ایک ملک سے ہوتا ہے اور کبھی ایک قوم سے۔ اور کبھی ساری دنیا سے۔ اگر بالکل ابتدائی زمانہ ہو اور اس وقت کسی قوم کے متعلق یہ کہا جائے کہ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا

اَلْعِمَادُ

لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ کا مطلب

فِی الۡبِلَادِ تو اس سے مراد صرف یہ ہوگی کہ اُس سے پہلے اور کوئی قوم اتنی بڑی طاقت حاصل نہیں کر سکی اور اگر مختلف قومیں دنیا میں پھیل چکی ہوں اور مختلف ممالک میں مختلف قومیں حکومتیں کر رہی ہوں تو اُس وقت اس قسم کے الفاظ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں اس سے بڑی طاقت اور کوئی نہیں تھی گویا یہ الفاظ محض نسبتی ہوتے ہیں کلی فضیلت مراد نہیں ہوتی۔ انسان کا اپنا فرض ہوتا ہے کہ وہ عقل سے کام لے اور صحیح معنوں کی تعیین کرے۔ ہاں ایمانیات کا معاملہ اس سے مختلف ہے وہاں ایسے قرائن بھی رکھ دیئے جاتے ہیں جن سے اس نتیجہ پر پہنچنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ کسی جزوی فضیلت کا ذکر کیا جا رہا ہے یا کلی فضیلت کا۔ مثلاً محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سارے زمانوں کے لئے ہیں اور آپ قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے مطاع اور پیشوا ہیں یہ بات چونکہ ایمانیات سے تعلق رکھتی تھی اور ہر وہ شخص جو آپ کی اس فضیلت پر ایمان نہ لاتا روحانی لحاظ سے سخت مجرم اور گنہگار سمجھا جاتا۔ اس لئے جہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عالمگیر بعثت کا ذکر کیا گیا وہاں ایسے قرائن بھی رکھ دیئے گئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ سارے زمانوں اور سارے ملکوں کے لئے ہیں آپ کی نبوت سابق انبیاء کی طرح مختص الزمان نہیں ہے لیکن جہاں کسی قوم کی صرف ظاہری طاقت اور شوکت کا اظہار ہو وہاں ہر معقول انسان کا فرض ہے کہ وہ خود اندازہ لگائے اور سوچے کہ یہ نسبتی الفاظ ہیں یا کلی جیسے قرآن کریم ہمیشہ ذو معانی الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن عقلمند انسان دیکھ لیتا ہے کہ اس عبارت میں کونسے معنے چسپاں ہوتے ہیں اور کون سے نہیں۔ بسا اوقات چار میں سے دو معنے چسپاں ہوتے ہیں اور دو نہیں ہوتے۔ اُس وقت انسان خود ہی فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہ یہ معنے یہاں چسپاں ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم صرف اُسی جگہ قرائن مرجح رکھتا ہے جہاں معنوں میں ادنیٰ غلطی ایمان میں خرابی پیدا کر دیتی ہو۔ جیسے فرمایا تھا وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ۔ اب طارق کے لفظ سے ایک شبہ پیدا ہو سکتا تھا جس کا وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الطَّارِقُ کہہ کر ازالہ کیا۔ کیونکہ طارق کے دو معنے ہیں ایک معنے ہیں رات میں آنے والا اور دوسرے معنے ہیں صبح کا ستارا۔ چونکہ گذشتہ سورتوں سے ایک نبی کے آنے کی پیشگوئی بیان ہو رہی تھی اس لئے ضروری تھا کہ اس کی حیثیت پر روشنی ڈالی جاتی اور بتایا جاتا کہ اُس کی حیثیت رات میں آنے والے کی سی ہے یا صبح کے ستارے کی سی۔ سو اس کے بعد وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الطَّارِقُ النَّجۡمُ الثَّاقِبُ کہہ کر بتا دیا کہ یہاں کوئی اَور معنے مراد نہیں بلکہ صرف اَلنَّجۡمُ الثَّاقِبُ والے معنے مراد ہیں۔ یہ قرآن کریم کا دستور ہے کہ وہ جہاں معنوں کی تعیین کرنا چاہتا ہے مَآ اَدۡرٰىكَ کے الفاظ لے آتا ہے لیکن دوسرے مقامات پر انسان کو مختلف معنوں کی اجازت ہوتی ہے۔ اللہ تعالےٰ کہتا ہے ہم تمہاری عقل پر اعتبار کرتے ہیں عقل سے کام لو اور صحیح معنے کرو۔ پس جہاں مختلف معانی سے کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا اللہ تعالےٰ بھی کوئی تعیین نہیں کرتا لیکن جہاں کسی خلل کا امکان ہو وہاں اللہ تعالےٰ اپنے مخصوص معنے بتا دیتا ہے جیسے اَلۡقَارِعَةُ مَا الۡقَارِعَةُ کے بعد وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ کہہ کر بتا دیا کہ قارعہ کے اگرچہ لغت میں کئی معنے ہیں لیکن ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ اس جگہ اُن کئی معنوں میں سے صرف فلاں معنے مراد ہیں دوسرے معنے کرنے جائز نہیں ہیں۔ غرض جہاں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی یا ایمانیات میں کوئی نقص واقعہ ہونے کا احتمال نہیں ہوتا قرآن کریم آیات کے معانی کو محاورۂ زبان اور عقل صحیح پر چھوڑ دیتا ہے۔

لَمۡ يُخۡلَقۡ مِثۡلُهَا فِي الۡبِلَادِ میں بھی کوئی ایسی بات نہیں جس کی کسی خاص پیشگوئی یا ایمانیات پر زد پڑتی ہو اس لئے قرآن کریم نے عمومیت کے رنگ میں یہ ذکر کر دیا ہے کہ وہ لوگ بڑی طاقت والے تھے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ

# وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝

اور کیا ثمود کے متعلق بھی تجھے معلوم ہے جو وادی (القریٰ) میں پہاڑیوں کو کھودتے تھے ؎

ہم اپنی عقل اور تاریخی معلومات کی بناء پر فیصلہ کریں کہ یہ بات اُس وقت کے زمانہ کے لحاظ سے کہی گئی ہے یا ساری دنیا کے لحاظ سے۔ عاد چونکہ بالکل ابتدائی زمانہ میں ہوئے ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ساری دنیا کے مقابلہ میں انکی فوقیت کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اپنے زمانہ کے لحاظ سے یا عرب کے لحاظ سے اُن جیسی طاقتور قوم اور کوئی نہ تھی۔ یہ قرآن کریم کی ایک خاص خوبی ہے کہ اس میں کئی تشریحات کو انسانی عقل پر چھوڑا گیا ہے تاکہ دماغی انحطاط واقعہ نہ ہو۔ قرآن کریم لوگوں کو جاہل نہیں بناتا بلکہ جہاں کسی شبہ کا امکان ہو صرف اس کا ازالہ کرتا ہے اور جہاں ایمانیات میں کسی خطرہ کا امکان ہو اس کو پوری طرح ظاہر کر دیتا ہے تاکہ لوگ ٹھوکر نہ کھائیں اور اُن کا ایمان محفوظ رہے۔

**؎ حل لغات۔** جَابُوْا: جَابَ سے جمع کا صیغہ ہے اور جَابَ الثَّوْبَ (يَجُوْبُهٗ جَوْبًا) کے معنے ہوتے ہیں قَطَعَهٗ۔ اس نے کپڑے کو پھاڑا۔ اور جَابَ الصَّخْرَةَ کے معنے ہوتے ہیں خَرَقَهَا۔ اس نے پتھر کو کھودا۔ وَمِنْهُ فِي الْقُرْاٰنِ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ اَيْ قَطَعُوْهُ وَاتَّخَذُوْهُ مَنَازِلَ یعنی قرآن کریم میں جو یہ آتا ہے کہ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (اقرب) اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ پتھروں کو تراش کر یا ان کو کاٹ کاٹ کر عمارتیں بناتے تھے گویا اس آیت کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر پتھر لاتے اور اپنے لئے پتھروں کی عمارتیں بناتے اور یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ وہ پتھریلی چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر ان میں عمارتیں تیار کیا کرتے تھے۔

اَلصَّخْرُ: اَلصَّخْرَةُ کی جمع ہے اور اَلصَّخْرَةُ کے معنے ہیں اَلْحَجَرُ الْعَظِيْمُ الصُّلْبُ۔ ایسا بڑا پتھر جو سخت بھی ہو (اقرب) پس اَلَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ کے معنے ہوئے وہ لوگ جنہوں نے پہاڑ کاٹ کر اور پتھر اکٹھے کر کے وادی میں اپنے مکان بنائے یا پہاڑی وادی میں انہوں نے پہاڑوں کو تراش تراش کر عمارتیں بنائیں۔

ثمود قوم کی خصوصیت

**تفسیر۔** ثمود قوم کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر اپنے لئے عمارتیں بنایا کرتی تھی۔ اس قوم کا دارالحکومت حجر تھا جو مدینہ منورہ اور تبوک کے درمیان ہے اور اس وادی کو جس میں حجر واقعہ ہے وادیٔ قریٰ کہا جاتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ تبوک پر جا رہے تھے اور ہزاروں صحابہؓ آپ کے ساتھ تھے۔ چلتے چلتے راستہ میں حجر شہر آیا اور وہاں تھوڑی دیر کے لئے آپ نے پڑاؤ کیا۔ صحابہؓ نے یہ دیکھا تو انہوں نے اپنے آٹے نکالے اور گوندھ کر کھانا پکانے لگ گئے۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں خدا تعالےٰ کا عذاب نازل ہوا تھا اس لئے یہاں کا پانی کوئی نہ پیئے اور نہ کسی اور مصرف میں لائے چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

جابو ¹

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا نَزَلَ الْحِجْرَ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ اَمَرَهُمْ اَنْ لَا يَشْرَبُوْا مِنْ بِئْرِهَا وَلَا يَسْتَقُوْا مِنْهَا فَقَالُوْا قَدْ عَجَنَّا مِنْهَا وَاسْتَقَيْنَا فَاَمَرَهُمْ اَنْ يَطْرَحُوْا ذٰلِكَ الْعَجِيْنَ وَيُهْرِيْقُوْا ذٰلِكَ الْمَاءَ (بخاری کتاب الانبیاء) یعنی جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کو جاتے ہوئے حجر مقام پر اُترے تو آپ نے صحابہ کو حکم دیا کہ نہ تو وہاں کے کنوؤں کا پانی خود پئیں اور نہ پینے کے لئے ساتھ لیں۔ تو لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

الصخر ¹

---

لہ نوٹ: ترجمہ میں کیا تجھے معلوم ہے کے الفاظ حسب قاعدہ بریکٹ میں نہیں لکھے گئے بلکہ باہر ہی لکھے گئے ہیں کیونکہ ان کے بغیر اردو میں مفہوم واضح نہیں ہو سکتا تھا

عرض کیا کہ ہم نے تو اس پانی سے آٹے گوندھ لئے ہیں اور پانی بھی لے لیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گوندھے ہوئے آٹے کو پھینکوانے اور جمع شدہ پانی کو گرانے کا حکم دے دیا۔

دیکھو اللہ تعالیٰ کے انبیاء خدا تعالیٰ کے غضب سے کس قدر ڈرا کرتے ہیں۔ کہ باوجود اس کے کہ وہ لوگ مر گئے جن پر غضب نازل ہوا تھا، وہ شہر اجڑ گیا جو اُن غضب کا نشانہ بنا تھا۔ سالوں کے بعد سال اور صدیوں کے بعد صدیاں گذرتی چلی گئیں مگر اس قدر مدت دراز گذرنے کے باوجود رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ وہ آج بھی اس مقام پر خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہوتے دیکھ رہے تھے آج بھی اس مقام پر خدا تعالیٰ کے فرشتوں کو لعنت کرتے دیکھ رہے تھے آپ نے اتنا بھی پسند نہ کیا کہ اُس جگہ کے پانی سے گندھا ہوا آٹا صحابہ استعمال کریں۔ آپ نے فوراً حکم دیا کہ اپنے گندھے ہوئے آٹے کو پھینک دو، سواریوں پر چڑھ جاؤ اور فوراً اس مقام سے نکل جاؤ کہ یہ وہ مقام ہے جو خدا تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنا تھا۔ اسی طرح جہاں خدا تعالیٰ کی رحمت کا کوئی نشان نازل ہو انبیاء ان مقامات کا نہایت ادب کرتے ہیں اور جب بھی ان جگہوں میں جاتے ہیں ان کے دلوں پر خدا تعالیٰ کی خشیت طاری ہو جاتی ہے اور سوائے خدا تعالیٰ کی ذات کے وہ کسی اور طرف توجہ نہیں کرتے۔ اس کے مقابلہ میں لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ خدا تعالیٰ کے غضب کے نشانات اُن کے دلوں کو نرم کرتے ہیں اور نہ اُس کی رحمت کے نشانات اُن کے دلوں میں اُس کی محبت پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً مساجد خدا کا گھر کہلاتی ہیں اور مساجد وہ مقام ہیں جو خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے مخصوص ہیں مگر لوگ جب مساجد میں آتے ہیں تو وہ ہزار قسم کی بکواس کرتے ہیں، آپس میں دنیوی معاملات پر لڑتے جھگڑتے ہیں، ایک دوسرے کو جوش میں گالیاں بھی دے دیتے ہیں، غیبت بھی کر لیتے ہیں اور انہیں ذرا بھی یہ احساس نہیں ہوتا

آنحضرتؐ کا خود ... کے مقام پر اترنا

کہ وہ خدا کے گھر میں بیٹھ کر کس قسم کی شرمناک حرکات کر رہے ہیں۔ انہیں تو چاہیئے تھا کہ وہ جب تک مساجد میں رہتے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اُن کی زبانیں تر رہتیں مگر وہ بجائے ذکر الٰہی کرنے کے دنیوی امور میں اپنے قیمتی وقت کو ضائع کر کے خدا تعالیٰ کی ناراضگی کے مرتکب بن جاتے ہیں۔ تم رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دیکھو اور غور کرو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا تعالیٰ کے غضب کے مقام کو کتنا بُرا جانا اور کس طرح اُس سے نفرت کا اظہار کیا کہ گندھا ہوا آٹا پھینکوا دیا۔ اور یہ پسند نہ کیا کہ اُس آٹے کا ایک لقمہ تک کسی صحابی کے اندر جائے حالانکہ وہ ایام سخت تنگی کے تھے صحابہ کی مالی اور اقتصادی حالت سخت کمزور تھی۔ خود صحابہ بیان کرتے ہیں کہ ہم بعض دفعہ کھجوروں کی گٹھلیاں کھا کھا کر گذارہ کیا کرتے تھے۔ اس تنگی کے باوجود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے منوں آٹا پھینکوا دیا اور اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہ کی کہ لشکر کا کیا بنے گا۔ اس غزوہ میں تین ہزار صحابی آپ کے ساتھ تھا۔ اگر فی کس ایک پاؤ آٹے کا بھی اندازہ لگایا جائے تو قریباً آٹھ سو سیر یا بیس من کے قریب آٹا ایسے زمانہ میں جبکہ اُن کے پاس کھانے پینے کے وافر سامان نہیں ہوا کرتے تھے حکماً پھینکوا دیا گیا۔

یہ ہے وہ خشیت جو لوگوں کے دلوں میں ہونی چاہیئے اور جس کا اسلام ہر مومن سے تقاضا کرتا ہے۔ مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ خود ہماری جماعت میں سے بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جب وہ مقبرہ بہشتی میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مزار پر دعا کرنے کیلئے جاتے ہیں تو اُن میں سے بعض درختوں کا پھل توڑ کر کھانے لگ جاتے ہیں۔ گویا بجائے اس کے کہ مقبرہ بہشتی میں جا کر اُن کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہو اور دعا پر وہ زور دیں کھانے پینے کا خیال اُن کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مساجد میں اس قسم کی باتیں ہوتی ہیں اور اس قدر شور بعض لوگوں نے مچایا ہوا ہوتا ہے کہ تعجب آتا ہے کیوں ابھی تک

لوگوں کو اتنی موٹی بات بھی معلوم نہیں ہوئی کہ انہیں مساجد کا احترام کرنا چاہیئے اور لغو باتوں کی بجائے ذکر الٰہی میں اپنا وقت گزارنا چاہیئے۔

مومن کے ایمان کی سچی علامت یہی ہے کہ جب وہ کسی ایسے مقام سے گذرے جو خدا تعالیٰ کے کسی عذاب کو یاد دلانے والا ہو تو وہاں اُس کے اعضاء اور جوارح سے کسی قسم کی بیباکی ظاہر نہ ہوتی ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کا خوف اور اسکی خشیت اُس دل پر طاری ہو اور وہ اُس عذاب کو اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھ رہا ہو جس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حجر میں اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوتے دیکھا۔ اسی طرح جب وہ مسجد میں آئے یا کسی ایسی جگہ جائے جہاں خدا تعالیٰ نے اپنا کوئی نشان ظاہر کیا ہو تو وہاں فضول اور لغو باتیں نہ کرے بلکہ ذکر الٰہی اور خدا تعالیٰ کی یاد کرے۔ نمازیں پڑھے دعاؤں میں مشغول رہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کو زیادہ سے زیادہ جذب کرنے کی کوشش کرے یا اگر باتیں ہی کرنی ہوں تو دین کی باتیں کرے۔ جیسے ہم اپنی مساجد میں جب بیٹھتے ہیں تو ہمیشہ دین کی باتیں کرتے ہیں یا ایسی دنیوی باتیں بھی کر لیتے ہیں جو دین سے تعلق رکھتی ہیں مگر یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ مساجد میں بیٹھ کر سود اسلف کی باتیں شروع کر دی جائیں یا گھر کے جھگڑے بیان ہونے لگ جائیں یا ایک دوسرے کی غیبت شروع ہو جائے یہ ساری باتیں سخت معیوب ہیں اور انسان کو خدا تعالیٰ کی نظر میں گنہگار بنا دیتی ہیں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس نمونہ کو ہر وقت اپنے سامنے رکھو کہ آپ حجر مقام پر اُترے مگر تھوڑی دیر کے بعد گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور اپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ چلو یہاں سے یہ وہ مقام ہے جہاں خدا کا عذاب نازل ہُوا تھا۔

ثمود قوم کے نبی حضرت صالحؑ تھے۔ صالح عربی زبان کا لفظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالحؑ عرب کے ہی ایک نبی تھے۔ قرآن کریم سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ یہ لوگ عاد کے بعد ہوئے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے وَاذْكُرُوْٓا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ (الاعراف ع۱۰) اُس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں عاد کے بعد اُن کا قائم مقام بنایا۔ اس سے یہ بھی استدلال ہوتا ہے کہ عاد بھی عرب ہی تھے۔

ثمود کے متعلق کتبوں کی دستیابی

آثار قدیمہ کی تلاش و جستجو کے سلسلہ میں قوم ثمود کے کتبے بھی دستیاب ہوتے ہیں اور یوروپین لوگوں نے ان کتبوں کو تسلیم کیا ہے یہ کتبے عرب کے شمالی حصوں سے ملے ہیں جس سے اُن عرب جغرافیہ نویسوں کی تائید ہوتی ہے جن کا یہ خیال ہے کہ ثمود قوم جنوب سے ہجرت کر کے شمال کی طرف آئی تھی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کچھ مصر کی طرف بھی بڑھے تھے۔ بہرحال قوم ثمود عاد کے بعد ہوئی ہے اور جب کہ عاد کو نوحؑ کی قوم کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حضرت نوحؑ بھی عرب کے کسی علاقہ میں ہی مبعوث ہوئے تھے اور پھر اس سے عربی زبان کے ام الالسنہ ہونے کا بھی ایک ثبوت مل گیا۔

عربی کے ام الالسنہ ہونے کا ایک ثبوت

قرآن کریم دعویٰ کرتا ہے کہ ابتدائی زبان عربی تھی اور یہی زبان باقی تمام زبانوں کی اُم ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی شخص اس بات کو تسلیم نہ کرے لیکن قرآن کریم یہی کہتا ہے کہ ابتدائی نسل کی زبان عربی تھی۔ اس کا ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ قرآن کریم حضرت نوحؑ کو آدمؑ کے معًا بعد قرار دیتا ہے۔ اب اگر نوحؑ تک یہ سلسلہ پہنچ جائے اور ثابت ہو جائے کہ حضرت نوحؑ عربی نسل سے تعلق رکھتے تھے تو ساتھ ہی عربی زبان کے ام الالسنہ ہونے کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

ثمود قوم کے نبی

یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ قوم ثمود، عاد کی قائم مقام تھی اور عاد، نوحؑ کی قوم کی قائم مقام تھی اور چونکہ ثمود اور عاد دونوں عربی اقوام ہیں اس لئے معلوم ہُوا کہ حضرت نوحؑ بھی عرب کے کسی علاقہ میں ہی مبعوث ہوئے تھے اور تاریخ سے بھی حضرت نوحؑ کا مقام عراق میں ہی ثابت ہوتا ہے۔ جب حضرت نوحؑ تک یہ زبان پہنچ گئی تو نوحؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ وہ آدمؑ کے معًا بعد ہوئے بتاتا ہے کہ ابتدائے عالم

# وَفِرْعَوْنَ ذِى الْاَوْتَادِ ۙ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِى الْبِلَادِ ۙ

اور فرعون (کے متعلق بھی تجھے کچھ معلوم ہے) جو پہاڑوں کا مالک تھا۔ (کیا تجھے) ان سب لوگوں کا (حال معلوم ہے) جنہوں نے شہروں میں سرکشی کر رکھی تھی ؎۸

کی زبان عربی تھی کیونکہ جب نسل انسانی کا آغاز عرب سے مانا جائے تو لازماً اس ملک کی زبان کو بھی اُم الالسنہ تسلیم کرنا پڑیگا بہرحال عرب اور اس کے متعلقہ علاقہ سے ابتدائے تہذیب کے وابستہ ہونے کا دعویٰ ان آیات سے مستنبط ہوتا ہے اور تاریخی واقعات اس دعویٰ کی تائید کرتے ہیں۔

ثمود کا ذکر قرآن کریم میں ۲۱ جگہ آیا ہے۔

(۱) ہود (۲) شعراء (۳) قمر (۴) حاقہ (۵) شمس (۶) ہل اتیٰل (۷) اعراف (۸) نمل (۹) فصلت (۱۰) ذاریات (۱۱) توبہ (۱۲) ابراہیم (۱۳) حج (۱۴) مومن (۱۵) ص (۱۶) فرقان (۱۷) عنکبوت (۱۸) ق (۱۹) فجر (۲۰) بروج (۲۱) نجم۔

(ثمود اور صالحؑ اور اُن کے واقعہ کے لئے دیکھئے تفسیر کبیر جلد سوم صفحہ ۲۱۱ تا صفحہ ۲۱۷ نوٹ نمبر ۶۰ تا ۶۵)

**؎۸ حل لغات** ۔ اَوْتَادٌ وَتَدٌ کی جمع ہے اور وَتَدٌ اس کھونٹے یا لکڑی کے اُس کیلے کو کہتے جو دیوار یا زمین میں گاڑا جاتا ہے اَوْتَادُ الْاَرْضِ پہاڑوں کو کہتے ہیں۔ اَوْتَادَ الْبِلَادِ کے معنے رؤساء کے ہوتے ہیں اور اَوْتَادُ الْفَمِ دانتوں کو کہا جاتا ہے (اقرب) اس لحاظ سے آیت کے کئی معنے ہو جائیں گے یہ بھی کہ وہ فرعون جو خیموں والا تھا۔ یا یہ کہ وہ فرعون جو پہاڑوں والا تھا یا بڑی بڑی عمارتوں والا تھا (بلند و بالا اور اونچی عمارت پر بھی وَتَد کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد زمین میں نہایت گہری کھودی جاتی ہے)

طَغَوْا : طَغٰی سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ اور طَغٰی کے معنے ہوتے ہیں اَسْرَفَ فِی الْمَعَاصِی وَالظُّلْمِ ۔ کہ ظلم اور گناہوں میں حد سے بڑھ گیا (اقرب) پس طَغَوْا کے معنے ہوتے وہ ظلم اور گناہوں میں حد سے بڑھ گئے۔

**تفسیر** ۔ اس آیت میں فرعون اور اس کی قوم کے تمدن کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس قوم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ بڑی بڑی اونچی عمارتیں بنایا کرتی تھی۔ یہ لازمی بات ہے کہ جو بھی اونچی عمارت بنائی جائیگی اس کی بنیاد باقی عمارات کی نسبت بہت گہری رکھنی پڑے گی چنانچہ قدیم مصری عمارتیں بہت ہیں اہرام مصر اپنی بلندی اور شان میں دنیا میں اپنی نظیر آپ ہیں۔

دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ خیموں والا تھا۔ مراد یہ ہے کہ وہ ایک متمدن ملک کا بادشاہ تھا اُس میں آمدورفت کے لئے بڑی بڑی سڑکیں تھیں اور کشتیوں کے ذریعہ دُور دُور سفر ہو سکتا تھا اس وجہ سے بادشاہ ہمیشہ ملک میں دَورہ کرتا رہتا تھا۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ فرعون مصر کے وقت میں ملک بہت متمدن ہو گیا تھا۔ وہاں ہر قسم کی سہولتیں لوگوں کو میسر تھیں اور ان کی طرز رہائش بادیہ نشین لوگوں کی طرح نہیں رہی تھی بلکہ وہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں بناتے تھے سڑکیں تیار کرتے تھے اور بادشاہ دورہ کر کے ملک کے حالات دیکھتا رہتا تھا۔ جن ملکوں میں عمارتوں کا رواج نہ ہو۔ اگر ان کے بادشاہ کی نسبت کہا جائے کہ وہ ذِی الْاَوْتَاد تھا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ گو وہ بادیہ نشین تھا مگر بڑی طاقت والا تھا۔ لیکن جب کسی شہری قوم کے متعلق ہم یہ لفظ استعمال کریں گے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ قوم متمدن تھی۔ آمدورفت کے لئے ملک میں بڑی بڑی سڑکیں تھیں۔ اسی طرح دریا کے راستے کھلے تھے اور بادشاہ اور مختلف حکام کشتیوں کے ذریعہ دورے کرتے رہتے تھے۔

پھر اَوْتَاد کے معنے رؤساء کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ صرف بادشاہ ہی نہیں تھا بلکہ شہنشاہ تھا۔ بڑے بڑے بادشاہ اور نواب

# فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝

جس کے نتیجہ میں انہوں نے ان (شہروں) میں بے حد فساد پیدا کر دیا تھا ۹ ؎

اس کے ماتحت تھے اور وہ اپنی اپنی جگہ بادشاہ سمجھے جاتے تھے اور لوگوں پر ان کو حکومت حاصل تھی۔

ذِی الْاَوْتَادِ کے ایک معنے جبل حکومت کے بھی ہیں اور فِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ کہہ کر بتایا گیا ہے کہ اَوْتَادُ الْاَرْضِ یعنی جبال بھی اس کے ماتحت تھے یعنی اُس کے زمانہ میں مصر کا پھیلاؤ بہت زیادہ تھا۔ یہاں تک کہ خرطوم وغیرہ کے علاقے یا ایسے سینیل کے کچھ علاقے جو اب مصر سے باہر ہیں وہ بھی اس کے ماتحت ہوتے تھے۔ چنانچہ پُرانے آثار اب اس کی تصدیق کر رہے ہیں کہ مصری حکومت کا دائرہ بہت وسیع تھا اور بعض پہاڑی علاقے بھی اُس کے اندر شامل تھے۔

**۹ ؎ تفسیر۔** یوں تو ہر بُرائی قابل نفرت ہے مگر دو وجوہ سے بُرائیاں نہایت بھیانک شکل اختیار کر لیتی ہیں ایک اپنی کثرت کی وجہ سے۔ دوسرے بڑے بڑے جرائم پر مشتمل ہونے کی وجہ سے۔ جب کسی قوم میں کثرت سے جرائم پائے جائیں اور پھر وہ جرائم ایسے ہوں جو نہایت سنگین ہوں اور بڑی بڑی خطرناک بُرائیوں پر مشتمل ہوں تو اس قوم کی تباہی اور بربادی کی ساعت تو بالکل ہی قریب آجاتی ہے۔

اَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ کی آیت کو صرف فرعون اور اُس کی قوم پر بھی چسپاں کیا جاسکتا ہے اور عاد اور ثمود اور فرعون تینوں پر بھی اس کو چسپاں کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ مناسب یہی ہے کہ اَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ کو تینوں قوموں کے ساتھ لگایا جائے گو صرف فرعون اور اس کی قوم کے ساتھ بھی لگ سکتا ہے۔

فساد بڑے جرائم کے لئے بولا جاتا ہے اور اَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ کہہ کر اس آیت میں بتایا ہے کہ ان لوگوں نے بڑے بڑے جرم بھی کئے اور پھر کثرت سے کئے مثلاً ان قوموں میں شرک کی خطرناک وبا تھی اور پھر کثرت سے شرک پھیلا ہوا تھا اور اگر شرک کے علاوہ اور جرائم بھی لئے جائیں تو معنے یہ ہوں گے کہ وہ شرک بھی کرتے تھے اور دوسری خرابیاں بھی اُن میں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً ظلم کر لینا یا دوسروں کا حق مار لینا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے انہوں نے فساد کو انتہاء تک پہنچا دیا تھا۔

ذی الاوتاد کے تین معنے

یہاں تین قوموں کو مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے عادؑ۔ ثمودؑ اور فرعونؑ کی قوم کو۔ عاد اور ثمود یہ دونوں قومیں عرب کی تھیں اور فرعون کی قوم مصر سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ تین مثالیں اللہ تعالیٰ نے بلا وجہ بیان نہیں کیں بلکہ اس لئے بیان کی ہیں کہ یہاں دو زمانوں کی خبر دی گئی تھی۔ ایک اس زمانہ کی جس میں مکہ والوں کے مظالم کی وجہ سے مسلمانوں پر دس تاریک راتیں آنے والی تھیں اور ایک زمانہ مسیح موعودؑ کی۔ پہلی لیالی کا موجب چونکہ عرب لوگ تھے اور عاد اور ثمود اُن کے وطن کے لوگ تھے اس لئے اللہ تعالیٰ انکی مثال اُن کے سامنے پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے تمہارے ملک میں دو بڑی بڑی حکومتیں گذر چکی ہیں ایک تمہارے جنوب میں تھی اور دوسری تمہارے شمال میں تھی۔ ان دونوں کے حالات پر غور کرو اور سوچو کہ جب ان لوگوں نے انبیاء کا مقابلہ کیا اور فسادات کو انتہاء تک پہنچا دیا تو اللہ تعالیٰ نے کس طرح اُن کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ باوجود اس کے کہ یہ قومیں بڑی طاقت رکھتی تھیں پھر بھی جب انبیاء کے مقابلہ میں کھڑی ہوئیں خدا تعالیٰ نے ان کو تباہ و برباد کر دیا اور انکی طاقت اُن کے کچھ بھی کام نہ آئی۔ تمہاری تو اُن کے مقابلہ میں کوئی نسبت ہی نہیں پھر کیوں تم اُن کے حالات سے عبرت نہیں پکڑتے اور کیوں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کر رہے ہو۔ اگر تم نے یہی طریق جاری رکھا تو جو سلوک ہم نے

عاد و ثمودؑ کی تباہی کے ساتھ فرعون کی تباہی کا ذکر کرنے میں حکمت

عاد اور ثمود سے کیا تھا وہی تمہارے ساتھ کریں گے۔ تم مت سمجھو کہ ان مظالم کے نتیجہ میں تم کامیاب ہو جاؤ گے جس طرح آج مسلمانوں پر تم مختلف قسم کے مظالم ڈھا رہے ہو اور تم نے اُن کے دنوں کو بھی رات بنا دیا ہے۔ اسی طرح عاد اور ثمود نے بھی بڑی بڑی شرارتیں کی تھیں اور پھر حد سے زیادہ شرارتیں کی تھیں مگر پھر بھی وہ ناکام رہے

فرعون کی تباہی کے ذکر میں مسیح موعودؑ کے زمانہ میں ایسے ہی واقعہ ہونے کی پیشگوئی

حدیثوں سے پتہ لگتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے بڑا جرم کسی نبی کو قتل کرنا ہے ان لوگوں نے بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا جیسا کہ فرماتا ہے وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَ يَمْكُرُوْنَ وَ يَمْكُرُ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (انفال ع۴) پھر مکّہ والے شرک میں بھی مبتلا تھے اور شرک وہ گناہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ظلم عظیم قرار دیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان ع۲)

پھر اَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ کے دوسرے معنوں کے مطابق کفار مکہ نے نہ صرف بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کیا بلکہ مظالم کو انتہاء تک پہنچا دیا۔ جو شخص بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا انہوں نے اس کو دُکھ دینا شروع کر دیا بلکہ وہ تلاش کر کر کے مسلمانوں کو پکڑتے اور ان کو بڑی بے دردی سے مارتے پیٹتے اور مختلف رنگوں میں عذاب دیتے یہاں تک کہ کئی مسلمان بھاگ کر ایبے سینیا چلے گئے مگر اُن کا جوش پھر بھی نہ تھما اور وہ حبشہ تک محض اس لئے گئے کہ مسلمانوں کو پکڑ کر واپس لائیں۔ اور اُن کو اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنائے رکھیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے مکّہ والو! پہلی قومیں بھی تمہارے ملک میں ایسی گذر چکی ہیں جنہوں نے فسادات کو انتہاء تک پہنچا دیا تھا۔ تم یہ نہ سمجھو کہ تمہاری یہ سرکشی اور ظلم تمہارے حق میں مفید ہوگا۔ وہ قومیں بھی اسی خیال میں مبتلا رہی تھیں کہ ہم خوب ظلم ڈھا رہی ہیں مگر آخر ایک دن آیا کہ وہ تباہ و برباد کر دی گئیں۔ اسی طرح تم ایک دن خدا تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بن جاؤ گے اور عاد اور ثمود کی طرح دنیا سے مٹ جاؤ گے۔

اس کے بعد فرعون کا ذکر کیا۔ میرے نزدیک اس میں مسیح موعودؑ کے زمانہ کی خبر ہے۔ میں ابھی تک تفصیل سے نہیں بتا سکتا کہ کیوں؟ مگر دو باتیں میں بیان کر دیتا ہوں جن کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ اس مثال کا مسیح موعودؑ کے زمانہ کے ساتھ تعلق ہے اور وہ دو باتیں یہ ہیں۔ کہ اوّل رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ محرم کی دسویں رات ایک خاص شان اور عظمت رکھتی ہے کیونکہ اس دن میں خدا تعالیٰ نے موسیٰؑ کو فرعون سے نجات دی اور میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی ایسا ہی معاملہ میری اُمت میں ایک دفعہ ہوگا اور میری اُمت کو اُس دن ایک عذاب سے نجات ملے گی۔ گو بظاہر یہاں فرعون اور اس کے مظالم سے نجات کے الفاظ ہیں مگر ان میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس رنگ کا کوئی واقعہ آئندہ ہونے والا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں میں نے

"دیکھا کہ میں مصر کے دریائے نیل پر کھڑا ہوں اور میرے ساتھ بہت سے بنی اسرائیل ہیں اور میں اپنے آپ کو موسیٰ سمجھتا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھاگے چلے آتے ہیں نظر اٹھا کر پیچھے دیکھا تو معلوم ہوا کہ فرعون ایک لشکر کثیر کے ساتھ ہمارے تعاقب میں ہے اور اس کے ساتھ بہت سامان مثل گھوڑے گاڑیوں رتھوں وغیرہ کے ہے اور وہ ہمارے بہت قریب آ گیا ہے۔ میرے ساتھی بنی اسرائیل بہت گھبرائے ہوئے ہیں اور اکثر ان میں سے بے دل ہو گئے ہیں اور بلند آواز سے چلّاتے ہیں کہ اے موسیٰ ہم پکڑے گئے تو میں نے بلند آواز سے کہا

كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ

اتنے میں میں بیدار ہو گیا اور زبان پر یہی الفاظ جاری تھے (تذکرہ ص۴۲۹)"

# فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ۚۙ

اس پر تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا ۔ ـــلہ

اسی طرح آپ کا ایک یہ بھی الہام ہے :-

يَأْتِيْ عَلَيْكَ زَمَنٌ كَمِثْلِ زَمَنِ مُوْسٰى (تذکرہ)

کہ تجھ پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جو موسیٰؑ کے زمانہ کی طرح ہوگا۔ پس جبکہ حدیث میں یہ اشارہ ہے کہ موسیٰؑ کی طرح کا ایک واقعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت میں ہونے والا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ اب تک کوئی ایسا واقعہ نہیں ہُوا۔ دوسری طرف خدا تعالےٰ کا وہ مامور جو موجودہ زمانہ میں آیا، اُسے بتایا گیا کہ وہ موسیٰؑ ہے فرعون اُس کا پیچھا کرے گا اس کے ساتھی گھبرا جائیں گے اور کہیں گے کہ اے موسیٰ ہم پکڑے گئے اُس وقت موسیٰ بلند آواز سے کہے گا کہ كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا خدا میرے ساتھ ہے۔

اِن دو الہامات کے ساتھ اگر میرے اس رویا کو بھی ملا لیا جائے جو الفضل میں شائع ہو چکا ہے کہ میں ایک مکان میں ٹھہرا ہُوا ہوں۔

"اُس وقت میرے دل میں خیال آتا ہے کہ جس مکان میں میں ٹھہرا ہُوا ہوں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اسی میں پناہ لی تھی۔" (الفضل جلد ۳۲ ﻧﻤﺒﺮ ۱۴۲ صفحہ ۱ مورخہ ۲۰ جون ۱۹۴۴ء)

تو صاف [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ یہ آئندہ کے متعلق ایک پیشگوئی ہے جو لَيَالٍ عَشْرٍ کے دوسرے ظہور میں گیارھویں رات یعنی انیسویں صدی میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ پوری ہوگی اور موسیٰؑ کی مصر سے نجات کی قسم کا کوئی واقعہ جماعت احمدیہ کو پیش آئے گا۔

پس چونکہ یہاں مسیح موعود کا بھی ذکر تھا اس لئے جہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں کے لئے عاد اور ثمود کی مثال دی وہاں مسیح موعود کے دشمنوں کے لئے فرعون کا واقعہ بطور مثال پیش کیا گیا۔

صَبَّ

ـــلہ **حل لغات**۔ صَبَّ، صَبَّ الْمَآءَ کے معنے ہوتے ہیں۔ اُس نے پانی کو بہا دیا۔ صَبَّ لازم بھی ہے اور متعدی بھی یعنی صَبَّ کے معنے بہانے کے بھی ہیں اور بہنے کے بھی ہیں۔

سَوْطٌ

سَوْطٌ: کوڑے کو بھی کہتے ہیں اور سَوْطٌ کے معنے حصہ کے بھی ہوتے ہیں اور سَوْطٌ کے معنے سختی کے بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح سَوْطٌ جوہڑ کو بھی کہتے ہیں یعنی اُس نشیب دار زمین کو بھی سَوْطٌ کہا جاتا ہے جہاں پانی جمع ہو جاتا ہے (اقرب)

فصب علیھم ربك سوط عذاب کے ترمعنی

**تفسیر**۔ اگر سَوْطٌ کے معنے کوڑے کے لئے جائیں تو فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ کے یہ معنے ہوں گے کہ خدا تعالےٰ نے اُن کے اُوپر عذاب کے کوڑے برسا دئے۔ ہمارے ملک میں بھی کوڑوں کے متعلق برسانے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہی محاورہ یہاں استعمال کیا گیا ہے کہ اُن پر تیرے رب نے عذاب کے کوڑے برسانے شروع کر دئے جس طرح قطرہ کے بعد قطرہ گرتا ہے اسی طرح اُن پر عذاب کے بعد عذاب نازل ہوگا۔ اور انہیں ہوش ہی نہیں آئے گا۔ یہاں تک کہ وہ تباہ ہو جائیں گے۔

اگر سَوْط کے معنے حصہ کے کئے جائیں تو اِس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ اس قوم کا عذاب الٰہی میں جو حصہ مقدر تھا اس کے متعلق اُسے کہا جائے گا کہ لو اپنا سارا حصہ عذاب کا لے لو۔ تم نے ہمارے نبیوں کو دُکھ دیا تھا انہوں نے اپنا حصہ دکھوں میں سے لے لیا اور تم اپنا حصہ لو۔

اگر سَوْط کے معنے جوہڑ کے کئے جائیں تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ عذاب کا جوہڑ سارے کا سارا اُن پر

# إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ؕ

تیرا رب یقیناً گھات میں (لگا ہوا) ہے ۱۱ے

الٹادیا جائے گا۔ چونکہ سَوْط اُس نشیب دار زمین کو کہتے ہیں جس میں پانی جمع ہو جاتا ہے اس لئے سَوْط کہکر اس طرف بھی اشارہ کیا کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے عذاب کے احکام نازل ہو کر اُن کا ذخیرہ جمع ہوتا رہتا ہے ۔ اُن کی ہر شرارت پر عذاب نازل نہیں ہوگا بلکہ وہ عذاب جمع ہوتا رہے گا یہاں تک کہ ایک دن سارے کا سارا جوہڑ اُن پر اُلٹا دیا جائے گا۔

**۱۱ے تفسیر**۔ فرماتا ہے تیرا رب مجرموں کی گھات میں رہتا ہے جب وہ اُن کو پکڑتا ہے تو اکٹھا پکڑتا ہے ۔ کہتے ہیں سَو سُنار کی اور ایک لوہار کی ۔ اسی طرح خدا تعالےٰ کا قاعدہ ہے کہ وہ ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے اور مجرم انسان سمجھتا ہے کہ مجھے میرے بُرے کاموں کی کوئی سزا نہ ملیگی مگر آخر ایک دن ایسا آتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اُسے اپنی گرفت میں لے لیتا اور اُسے تباہ اور برباد کر دیتا ہے ۔ یہی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دشمنوں کے ساتھ سلوک ہوگا ۔ ہم اُن کو ڈھیل دیں گے اور گیارہ[11] سال تک دیتے چلے جائیں گے مگر آخر ایک دن آئیگا جب قیدار کی ساری حشمت کو خاک میں ملا دیا جائے گا اور مومنوں کے دکھ کو خوشی میں بدل دیا جائے گا ۔ اسی طرح اس پیشگوئی کے دوسرے ظہور کے وقت انیسویں[11] صدی میں کوئی فرعون اتنا خطرناک ظلم کرے گا کہ جماعت پکار اُٹھے گی ۔ یٰمُوْسٰی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ ۔ اے موسیٰ اب تو ہماری تباہی سر پر آپہنچی ۔ اب ہم کسی طرح اس فرعون کے پنجۂ ظلم سے بچ نہیں سکتے اُس وقت جماعت کا جو بھی لیڈر ہوگا وہ موسیٰؑ کی طرح اپنے ساتھیوں سے کہے گا کَلَّا یہ بالکل غلط بات ہے کہ دشمن تمہیں تباہ اور برباد کر دے گا ۔ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ ۔ میرے ساتھ میرا رب ہے اور وہ مجھے ہدایت دے دیگا۔

میں نے وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا تھا کہ جب کفار غار ثور کے مُنہ پر پہنچ گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو گھبراہٹ طاری ہوئی تو اُس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان الفاظ میں اُن کو تسلی دی کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ۔ یعنی غم مت کر ایک وتر بھی ہمارے ساتھ ہے ۔ اسی طرح جب جماعت احمدیہ کسی فرعون کے مظالم کی وجہ سے سخت گھبرا اُٹھے گی اس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام جماعت احمدیہ کو روحانی طور پر اُس کے خلیفہ اور امام کی زبان سے کیونکہ وہ دو نہیں بلکہ ایک ہی وجود ہونگے! جبکہ وہ غم و ہم کے تمثیلی سمندر کے کنارے پر کھڑا ہوگا ۔ یا ممکن ہے کہ مصر یا اور کسی ملک میں ایسے ہی حالات پیدا ہونے پر ۔ اور واقعہ میں دریائے نیل کے کنارے پر یا اور کسی دریا کے کنارے پر بڑے جاہ و جلال کے ساتھ فرمائیں گے کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ کَلَّا کے معنے یہی ہیں کہ لَا تَحْزَنْ غم مت کرو اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ میرے ساتھ میرا رب ہے یعنی ایک وتر بھی ہمارے ساتھ ہے اور وہ اس مشکل میں سے ہمیں نکال کرلے جائے گا۔

---

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ

پس (ذرا دیکھو تو) انسان کی حالت (کو جو یہ ہے۔ کہ جب اس کا رب اسے آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اور اس کی عزت کرتا ہے۔ اور اس پر نعمت کرتا ہے

فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ؕ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ

تو وہ کہتا ہے کہ دیکھو میں ایسا ذی شان ہوں) میرے رب نے (بھی) میری عزت کی۔ اور جب اسے آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اور اس کے رزق کو تنگ

رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۚ

کر دیتا ہے۔ تو وہ کہتا ہے میرے رب نے میری (بلا وجہ) بے عزتی کی [۱۲]

**[۱۲] حل لغات۔** اِبْتَلَاہُ: کے معنے ہوتے ہیں اِخْتَبَرَہٗ۔ اس کی حقیقت کو ظاہر کیا اور اِبْتَلَی الْاَمْرَ کے معنے ہوتے ہیں عَرَفَہٗ۔ اس کو جان لیا۔ اصل میں یہ لفظ بَلِیَ یَبْلٰی ہے اور بَلَاہُ یَبْلُوْہُ (بَلْوًا) بھی استعمال کیا جاتا ہے بَلِیَ الثَّوْبُ کے معنے ہوتے ہیں خَلُقَ کپڑا پرانا ہوگیا اور گھس گیا۔ اور بَلَاہُ (یَبْلُوْہُ بَلْوًا) کے معنے ہیں جَرَّبَہٗ وَاخْتَبَرَہٗ۔ اس کا تجربہ کیا۔ اُس کی حقیقت کو ظاہر کیا اور اس کے اندرونہ کو معلوم کیا۔ مفردات والے لکھتے ہیں کہ بَلَوْتُہٗ کے معنے اِخْتَبَرْتُہٗ کے اس لئے ہیں کہ خواہ یہ لفظ بَلِیَ یَبْلٰی سے ہو یا بَلَاہُ یَبْلُوْہُ بَلْوًا سے دونوں صورتوں میں اس میں پرانے ہونے کی حقیقت پائی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں بَلَوْتُہٗ: اِخْتَبَرْتُہٗ کَاَنِّیْ اَخْلَقْتُہٗ مِنْ کَثْرَۃِ اِخْتِبَارِیْ لَہٗ یعنی بَلَوْتُہٗ کے معنے اِخْتَبَرْتُہٗ اس لئے کئے جاتے ہیں کہ اس میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ میں نے اُسے بار بار دیکھ کر پرانا کر دیا ہے۔ اسی لئے ابتلاء کا لفظ ایسے امر کے متعلق استعمال کیا جاتا ہے جس کی انسان پوری طرح تحقیق کرے۔ جیسے انسان کپڑا خرید کر لاتا ہے تو عورتیں اس کپڑے کو ہاتھوں سے گھستی ہیں یہ دیکھنے کے لئے کہ اُس کی بافت کیسی ہے یا اُس کا رنگ اُترے گا کہ نہیں۔ یہ بار بار دیکھنا اسلئے ہوتا ہے تاکہ رائے پختہ ہو جائے۔ اس بار بار کے فعل سے چونکہ چیز پرانی ہوتی ہے اس لئے بَلِیَ کا لفظ اسی حقیقت کے استعمال کی وجہ سے بولا جاتا ہے (پنجابی میں بھی محاورہ ہے کہ یہ چیز تو میری منڈائی ہوئی ہے یعنی کثرت سے اس کے ساتھ میرا معاملہ پڑا ہے اور میں اس کی حقیقت سے واقف ہوں) اسی طرح تَبْلُوْا کُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ کے معنے ہیں تَعْرِفُ حَقِیْقَۃَ مَا عَمِلَتْ یعنی ہر شخص اپنے عمل کی حقیقت کو جان لے گا۔ وَسُمِّیَ الْغَمُّ بَلَاءً مِنْ حَیْثُ اَنَّہٗ یُبْلِی الْجِسْمَ۔ غم کو بھی اسی لئے بَلَاء کہتے ہیں کہ وہ جسم کو دبلا کر دیتا ہے۔ اور اس کی طاقت کو کمزور کر دیتا ہے اسی طرح صاحب مفردات لکھتے ہیں کہ سُمِّیَ التَّکْلِیْفُ بَلَاءً مِنْ اَوْجُہٍ۔ تکلیف کو بھی عربی زبان میں بلاء کہتے ہیں اور اس کی کئی وجوہ ہیں اَحَدُھَا اَنَّ التَّکَالِیْفَ کُلَّھَا مَشَاقٌّ عَلَی الْاَبْدَانِ۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جب تکلیفیں آتی ہیں انسان پر ایک بوجھل کام آپڑتا ہے اور اُن تکالیف کا اس کے جسم پر اثر پڑتا ہے اس لئے اس کو بلا کہتے ہیں وَالثَّانِیْ اَنَّھَا اِخْتِبَارَاتٌ۔ دوسرے اس لئے کہ جب انسان پر بوجھ پڑتا ہے تبھی اس کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ شخص جسے کسی بڑی جنگ میں شامل ہونے کا موقعہ نہیں ملا اُس کی بہادری کا کس طرح پتہ چل سکتا ہے یا جسے متواتر بوجھ اٹھانے کا موقعہ نہیں ملا اس کا استقلال

ابتلاء

کس طرح نظر آسکتا ہے۔ یوں تو ہر شخص اپنے متعلق سمجھ لیتا ہے کہ میں بڑا واقف اور ماہر ہوں۔ لیکن اس کی واقفیت یا مہارت تب معلوم ہوتی ہے جب اُس پر کوئی بڑا بوجھ آکر پڑتا ہے اسی لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ (محمد ع) یعنی ہم تمہیں تکلیفوں میں ڈالینگے یہاں تک کہ تم میں سے مجاہدوں اور صابروں کو ممتاز کرکے دکھا دیں۔ وَالثَّالِثُ اَنَّ اخْتِبَارَ اللّٰهِ تَعَالٰى لِلْعِبَادِ تَارَةً بِالْمَسَارِّ لِيَشْكُرُوْا وَتَارَةً بِالْمَضَارِّ لِيَصْبِرُوْا۔ تیسری وجہ مفردات کے مصنف یہ بتلاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بندے کی حقیقت کو اس طرح ظاہر کیا جاتا ہے کہ کبھی اس کو خوشیاں پہنچائی جاتی ہیں تاکہ یہ دیکھا جائے کہ اُس میں شکر کا مادہ ہے یا نہیں اور کبھی اس کو تکالیف میں ڈالا جاتا ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ اس میں صبر کا مادہ ہے یا نہیں فَصَارَتِ الْمِحْنَةُ وَالْمِنْحَةُ جَمِيْعًا بَلَاءً فَالْمِحْنَةُ مُقْتَضِيَةٌ لِلصَّبْرِ وَالْمِنْحَةُ مُقْتَضِيَةٌ لِلشُّكْرِ پس ابتلاء اور تکالیف صبر ظاہر کرنے کا موجب بن جاتی ہیں اور انعامات اس کے جذبۂ شکر کو ظاہر کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی انعام نازل ہوتا ہے اُس وقت انعام کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان شکر کرے اور جب اُسے کوئی ٹھوکر لگے تو اُس وقت مصیبت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان صبر کرے وَالْقِيَامُ بِحُقُوْقِ الصَّبْرِ اَيْسَرُ مِنَ الْقِيَامِ بِحُقُوْقِ الشُّكْرِ۔ وہ کہتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کی طرف سے امتحان بذریعہ صبر لیا جاتا ہے اور انسان پر مختلف تکالیف اور مصیبتیں آتی ہیں تو یہ زیادہ آسان ہوتا ہے۔ مصیبتیں آتی ہیں تو وہ سمجھتا ہے اب تو یہ سر پر آ ہی پڑی ہیں ان کو برداشت کرنا چاہیئے اور کہتا ہے کہ جو مصیبت پڑ گئی سو پڑ گئی اور اس وجہ سے وہ صبر سے کام لے لیتا ہے۔ لیکن جو شکر کے ذریعہ ابتلاء آتا ہے وہ نہایت خطرناک ہوتا ہے کیونکہ انسان کہتا ہے جو چیز میرے قبضہ میں آگئی ہے اُس سے مَیں پوری طرح حظ اُٹھا لوں اس طرح وہ خدا کو بھول جاتا ہے۔ صبر کے ساتھ ماضی کا تعلق ہے اور ماضی کو انسان بُھلا سکتا ہے لیکن انعام کا مستقبل کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور مستقبل کو بھلانا بڑا مشکل ہوتا ہے اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ اصل ابتلاء وہ ہے جو انعام کے رنگ میں آتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کسی کو دولت دیتا ہے، کسی کو صحت دیتا ہے، کسی کو عزت دیتا ہے، کسی کو طاقت دیتا ہے، کسی کو حکومت دیتا ہے۔ یہ مختلف انعامات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کئے جاتے ہیں لیکن بسا اوقات انسان دولت اور عزت کے ملنے پر خدا تعالیٰ کو بالکل بھول جاتا ہے۔ طاقت کے ملنے پر تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تجارت اور صنعت و حرفت یا زمیندارہ کے کام میں ترقی حاصل ہونے پر اپنے اموال کا غلط استعمال کرتا ہے، مقدمات میں روپیہ برباد کرتا ہے، غریبوں کی حق تلفی کرتا ہے، اسی طرح اپنے ہاتھوں اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں وغیرہ کا ناجائز استعمال کرتا ہے پس اس ابتلاء میں کامیاب اُترنا زیادہ مشکل ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی شخص مر جائے تو دوسرا سن کر کہہ دے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ جب کسی شخص کو خدا تعالیٰ کی طرف سے دولت ملتی ہے تو اُس کا اپنے نفس کو عیاشی سے روکنا، اچھے کھانے اور اچھے پہننے سے روکنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ ابتلاء انعامی زیادہ مشکل ہوتے ہیں اور ان میں بہت کم لوگ کامیاب ہوا کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا ایک قول بھی انہی معنوں میں پایا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں بُلِيْنَا بِالضَّرَّاءِ فَصَبَرْنَا کہ ہماری اُمت پر اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی مصیبتیں ڈالیں لیکن ہم نے صبر سے کام لیا اور کوئی شخص ہم میں سے اُن مصیبتوں پر نہیں گھبرایا۔ وَبُلِيْنَا بِالسَّرَّاءِ فَلَمْ نَصْبِرْ۔ لیکن پھر ہم پر خدا تعالیٰ نے انعامات والے ابتلاء وارد کئے۔ جب انعامی ابتلاء ما اللہ تعالیٰ

نے ہم پر ڈالا تو کئی لوگ ہم میں سے صبر نہ کر سکے چنانچہ دیکھ لو صحابہؓ کی تکلیفوں کے زمانہ میں اُن میں سے ایک شخص بھی اپنے مذہب سے منحرف نہیں ہُوا۔ لیکن انعام کے زمانہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے معاً بعد بادشاہت اور خلافت کے جھگڑے میں سارا عرب مرتد ہو گیا سوائے مکہ اور مدینہ کے ان لوگوں کے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں رہے تھے گو وہ مرتد ہونے والے صحابی نہ تھے لیکن بہرحال وہ قریب کے مسلمان تھے اور انہوں نے خدا تعالےٰ کی تائیدات اور اس کی نصرتوں کے نشانات دیکھے ہوئے تھے۔ لیکن باوجود اس کے کہ انہوں نے تازہ بتازہ نشانات دیکھے تھے سب کے سب مرتد ہو گئے۔ حدیثوں میں آتا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صرف مکہ اور مدینہ میں ہی باجماعت نماز ہُوا کرتی تھی باقی ہر جگہ ارتداد کی وبا پھیلی ہوئی تھی سو حضرت عمرؓ فرماتے ہیں بُلِيْنَا بِالضَّرَّاءِ فَصَبَرْنَا۔ ہم پر مصائب آئے۔ بڑی بڑی مشکلات آئیں مگر ہم نے جرأت دکھلائی، ہمت کا مظاہرہ کیا اور اُن مصائب سے ذرا بھی نہ گھبرائے وَبُلِيْنَا بِالسَّرَّاءِ فَلَمْ نَصْبِرْ لیکن جب خدا تعالےٰ نے انعام پر انعام۔ فتح پر فتح۔ نصرت پر نصرت اور دولت پر دولت دی تو ہماری جماعت سونی صدی اس امتحان میں پاس نہ ہو سکی جس طرح پہلے پاس ہوئی تھی وَلِهٰذَا قَالَ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اسی بناء پر امیر المومنین کہتے ہیں (یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ محاورہ میں امیر المومنین سے مراد صرف حضرت علیؓ ہوتے ہیں گو تمام خلفاء ہی امیر المومنین ہیں لیکن بعض اسلامی مصنفین میں چونکہ تفضیلی رنگ پایا جاتا تھا اور وہ حضرت علیؓ کو اپنے درجہ میں باقی تمام خلفاء سے بڑا سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے یہ محاورہ بنا دیا کہ جب وہ امیر المومنین کا لفظ استعمال کرتے تو اس سے مراد محض حضرت علیؓ ہی ہوتے۔ اس جگہ بھی غالباً حضرت علیؓ ہی مراد ہیں۔ وہ فرماتے ہیں) مَنْ وُسِّعَ عَلَيْهِ دُنْيَاهُ فَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّهٗ قَدْ مُكِرَ بِهٖ فَهُوَ مَخْدُوْعٌ عَنْ عَقْلِهٖ یعنی جس کے لئے اُس کی دنیا وسیع ہو جائے، اُسے ہر قسم کی آسائشیں اور سامان میسر آجائیں، اُسے کثرت سے دولت مل جائے فَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّهٗ قَدْ مُكِرَ بِهٖ اور اُسے یہ پتہ نہ لگے کہ اُسے ابتلاء میں ڈالا جا رہا ہے گویا دولت بڑھنے، اور آسائش کے سامانوں میں زیادتی ہونے سے اُس کے دل میں یہ احساس پیدا نہ ہو کہ میرے لئے یہ آرام کی صورت نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ اس ذریعہ سے میرا امتحان لے رہا ہے تو فَهُوَ مَخْدُوْعٌ عَنْ عَقْلِهٖ ایسا شخص یقیناً پاگل ہے۔ درحقیقت صحیح الدماغ انسان وہی ہے کہ جب مصائب و مشکلات آئیں تب بھی وہ سمجھے کہ خدا تعالےٰ میرا امتحان لے رہا ہے اور اگر اُسے انعامات ملیں یا دولت کی فراوانی اُسے حاصل ہو جائے تب بھی وہ یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ میرا امتحان لے رہا ہے قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (الانبیاء ع ۳) ہم تمہارے ایمان کو آزمانے کے لئے کبھی ترقی دیں گے اور کبھی دکھ دیں گے۔ گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا وہ قرآن کریم سے ہی ماخوذ تھا۔ قرآن کریم میں یہی مضمون بیان کیا گیا ہے کہ ابتلاء کے معنے عذاب کے ہی نہیں یعنی یہی نہیں کہ اگر کوئی موت واقع ہو جائے یا کوئی مالی نقصان پہنچ جائے تو یہ ابتلاء ہے بلکہ کسی کو مال و دولت کا مل جانا بھی ایک ابتلاء ہے۔ اور یہ بھی ویسا ہی خطرناک ہے جیسے ابتلاءِ تکلیف خطرناک ہے اور دولت و عزت کی فراوانی کا حاصل ہونا بھی ویسا ہی ڈر کا مقام ہے جیسے دولت و عزت کا چھینا جانا ڈر کا مقام ہے۔ اگر آج کسی شخص کی بھینس مر جائے، کل اُس کے گھر میں چوری ہو جائے، پرسوں اُس کا کُتا مر جائے، اترسوں اس کا گھوڑا ہلاک ہو جائے، اگلے روز کسی عزیز کی موت ہو جائے تو اُس وقت اُس کے دل میں کتنی سخت گھبراہٹ

پیدا ہو گی۔ کئی کم ایمان والے بھی یہ حالت دیکھ کر سمجھنے لگ جائیں گے کہ اب ہمیں خدا تعالیٰ کی طرف سے گناہوں کی سزا مل رہی ہے لیکن اگر آج کسی کو سو روپیہ مل جائے، دوسرے دن دو سو روپیہ مل جائے، تیسرے دن تین سو روپیہ مل جائے، چوتھے دن ایک مربع زمین مل جائے، پانچویں دن ایک گھوڑا انعام میں مل جائے، چھٹے دن گورنمنٹ کی طرف سے کوئی خطاب مل جائے تو اس کے دل کے کسی گوشہ میں بھی یہ خیال نہیں آئے گا کہ میں کہیں ہلاک ہو جاؤں کہیں یہ چیزیں میری بربادی کا باعث نہ بن جائیں حالانکہ جس طرح مصائب کے ہجوم کے وقت اُس کی ہلاکت اور گرنے کا امکان ہوتا ہے اسی طرح نعمتوں کے ملنے پر اُس کی ہلاکت اور گرنے کا امکان ہوتا ہے۔ جس طرح وہ چیزیں خدا تعالیٰ کے عذاب کو قریب کر کے دکھلانے لگ جاتی ہیں اسی طرح بسا اوقات یہ چیزیں انسان کو اس لئے ملتی ہیں کہ پتہ لگایا جاتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے کیسا تعلق رکھتا ہے۔ درحقیقت دولت کمانا منع نہیں بشرطیکہ وہ دین میں حارج نہ ہو۔ صرف دولت کے ساتھ محبت کرنا یا اس کا ناجائز استعمال منع ہے ورنہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ کے پاس ویسی ہی دولتیں تھیں جیسے آج کل بڑے بڑے امراء کے پاس ہوتی ہیں۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے متعلق تاریخوں میں آتا ہے کہ اُن کی وفات کے بعد اڑھائی کروڑ روپیہ کے برابر اُن کی جائیداد نکلی۔ اُس وقت کا اڑھائی کروڑ روپیہ آجکل کے تیس چالیس کروڑ روپیہ کے برابر بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُن کا کھانا پینا ویسا ہی تھا جیسے عام مسلمانوں کا تھا وہ اپنی آمدنی کے متعلق کوشش کرتے تھے کہ اُسے خدا تعالیٰ کے رستہ میں صرف کر دیں۔ اُن کی اولاد نے آگے ایسا کیا یا نہیں یہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے لیکن وہ اپنی زندگی میں بلا دریغ خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنا روپیہ خرچ کرتے رہتے تھے۔ تو کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کا ملنا بھی ایک آزمائش ہوتی ہے۔

پھر صاحب مفردات لکھتے ہیں وَاِذَا قِیْلَ اُبْتُلِیَ فُلَانٌ کَذَا اَوْ اَبْلَاہُ فَذَالِکَ یَتَضَمَّنُ اَمْرَیْنِ یعنی جب یہ کہا جائے کہ فلاں شخص نے فلاں کا اس اس رنگ میں امتحان لیا تو اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ اَحَدُھُمَا تَعَرُّفُ حَالِہٖ وَالْوُقُوْفُ عَلٰی مَا یُجْھَلُ مِنْ اَمْرِہٖ۔ ایک تو یہ کہ اُس کا اندرونہ معلوم کیا اور جو حقیقت پوشیدہ تھی وہ ظاہر کی۔ وَالثَّانِیْ ظُھُوْرُ جَوْدَتِہٖ وَرِدَاْءَتِہٖ۔ دوسرے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اُس کے اندرونہ کو دنیا پر ظاہر کیا جائے خُبث ہو تو اُس کا خبث ظاہر ہو جائے اور اگر نیکی ہو تو نیکی ظاہر ہو جائے۔ گویا ایک تو جاننے کا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ہمیں خود کسی چیز کی حقیقت کا علم ہو جائے۔ مگر ایک معنے یہ ہوتے ہیں کہ کسی دبی ہوئی چیز کو اُبھار دیا جائے اور اس کی جودت یعنی اس کی خوبی اور اس کے حُسن کو یا اُس چیز کی رداْءت کو ظاہر کر دیا جائے وَرُبَّمَا قُصِدَ بِہٖ الْاَمْرَانِ۔ اور کبھی کبھی یہ دونوں باتیں مدنظر ہوتی ہیں یعنی ابتلاء کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ مخفی حالات جاننا اور یہ بھی معنے ہوتے ہیں کہ مخفی حالات کو ظاہر کرنے کا موقع دینا وَرُبَّمَا یُقْصَدُ بِہٖ اَحَدُھُمَا۔ اور کبھی صرف ایک ہی مراد ہوتی ہے یعنی کبھی صرف جاننا مراد ہوتا ہے اور کبھی صرف اس کا ظہور مراد ہوتا ہے فَاِذَا قِیْلَ فِی اللّٰہِ تَعَالٰی بَلٰی کَذَا اَوْ اَبْلَاہُ فَلَیْسَ الْمُرَادُ مِنْہُ اِلَّا ظُھُوْرُ جَوْدَتِہٖ وَرِدَاْءَتِہٖ۔ یعنی جب خدا تعالیٰ کے متعلق یہ لفظ بولا جائے اور کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے ابتلاء میں ڈالا تو اس کے معنے جاننے کے نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے اندرونہ کو ظاہر ہونے کا موقعہ دیا۔ اگر گند تھا تو اُس گند کے ظاہر ہونے کا موقعہ پیدا کر دیا اور اگر اچھائی تھی تو اس کی خوبی کے ظاہر ہونے کا موقعہ پیدا کر دیا دُوْنَ التَّعَرُّفِ لِحَالِہٖ

وَالسُّوْقُوْفِ عَلٰی مَا یُجْهَلُ مِنْ اَمْرِہٖ - اس کے
حال کو جاننے کے معنے نہیں ہوتے اور اس کے پوشیدہ
امر پر واقف ہونے کے معنے بھی نہیں ہوتے اِذْ کَانَ
اللّٰہُ عَلَّامَ الْغُیُوْبِ - کیونکہ اللہ تعالیٰ غیبوں کو جاننے
والا ہے۔ اور اسے مزید جاننے کی ضرورت نہیں ۔

ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے آیت اِذَا مَا ابْتَلٰهُ
رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ
کا یہ مفہوم ہوگا کہ انسان کی یہ حالت ہے کہ جب اس کا رب
اس کے اخلاق کی یا اس کے خیالات کی یا اس کے افکار
کی یا اس کی طاقتوں کی اچھائی یا برائی کو ظاہر کرنا چاہتا ہے
اس ذریعہ سے کہ اس کا اکرام کرتا ہے اور اسے نعمتیں دیتا
ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے میرا اکرام کیا۔

خدا تعالیٰ کا طریق یہ ہے کہ جب وہ بندے کے
اندرونی ایمان اور اس کے عقیدہ اور اس کے اخلاص کو ظاہر
کرنا چاہتا ہے تا اس شخص کو خود بھی پتہ لگ جائے اور
دوسرے لوگوں کو بھی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کو تو پتہ ہی ہوتا ہے
تو وہ ایک تو اس کا امتحان اس ذریعہ سے لیتا ہے کہ اس کا
اکرام کرتا ہے اور اسے نعمتوں پر نعمتیں دیتا چلا جاتا ہے۔
اسے کہیں سے روپیہ مل جاتا ہے، کسی تجارت میں نفع حاصل
ہو جاتا ہے، کہیں دو دو بچے ایک ایک جانور دے دیتا
ہے، کہیں اس کی زمین کی پیداوار میں ترقی ہو جاتی ہے
کہیں اسے گورنمنٹ کی طرف سے کوئی خطاب یا عہدہ مل
جاتا ہے۔ اس وقت وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت
دی لیکن وہ یہ جو کچھ کہتا ہے اس میں حقیقت نہیں ہوتی۔ منہ
سے تو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے لیکن حقیقت
موجود نہیں ہوتی۔ اگر اس میں کوئی حقیقت ہوتی تو ہر جگہ ظاہر
ہوتی۔ جیسے لمبے قد کا آدمی ایران میں پھرے گا تب بھی وہ
لمبا ہوگا، چین میں پھرے گا تب بھی وہ لمبا ہوگا لیکن اگر
وہ کسی جگہ لمبا نظر آتا ہے اور کسی جگہ چھوٹا۔ تو دو صورتوں میں
سے ایک صورت ضرور ہوگی۔ یا تو دوسرے موقعہ پر کوئی اور
آدمی ہوگا اور یا وہ کبھی اونچی ایڑی کا بوٹ پہن لیتا ہوگا
اور کبھی اسے اتار دیتا ہوگا۔ بہر حال حالتِ مستقلہ ہی انسان
کی اصل حالت ہوتی ہے۔ اگر حالتِ مستقلہ نہ ہو تو وہ بناوٹی
اور مصنوعی طور پر اختیار کی ہوئی ہوتی ہے چنانچہ بندے کے
شکر کے مصنوعی ہونے کا ثبوت یہ ہوتا ہے وَاَمَّآ اِذَا
مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ
اَهَانَنِ - اور جب وہ دوسرے رنگ میں اسے ابتلاء میں
ڈالتا اور اس کے اندرونہ کو ظاہر کرتا اور اس غرض کو پورا
کرنے کے لئے اس کے رزق کو تنگ کر دیتا ہے (قَدَرَ
عَلٰی عِیَالِہٖ کے معنے ہوتے ہیں ضَیَّقَ اس نے عیال کا
گذارہ تنگ کر دیا) اور اسے کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے
تو اس وقت بجائے اس کے کہ تقویٰ سے کام لے وہ
نیکی کو خدا کی طرف منسوب کرتا اور نقصان کو اپنی طرف۔
جب اس پر کوئی بلا اور مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتا ہے میرے
رب نے میری اہانت کی اور اس نے مجھے ذلیل کر دیا۔ یہ
ثبوت ہوتا ہے اس بات کا کہ انعام کے وقت اس نے
جو کچھ کہا تھا وہ بھی صرف اس کے منہ کی ہی ایک بات تھی۔
حقیقت اس میں نہیں تھی۔ اسی لئے قرآن کریم نے وہاں
صرف یَقُوْلُ کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔

یاد رکھو کفر کی بات منہ سے نکلی ہوئی ایک جرم ہے
لیکن نیکی کی بات جب دل سے کہی گئی ہو قطعاً کوئی جرم نہیں
مگر اس لئے کہ یہ شخص نیکی کی بات منافقت سے کہتا ہے
اس کی پہلی بات بھی جرم بن جاتی ہے اور کفر کی بات چونکہ
دل سے نکلی ہوئی ہوتی ہے اس لئے وہ تو جرم ہوتی ہی ہے

**تفسیر**۔ اس آیت میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جب
اللہ تعالیٰ انسان کو اپنی نعمتوں سے نوازتا اور اس پر
اپنے ابر کرم کی بارش برساتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے
رب نے میرا اکرام کیا اور اگر وہ اپنی مشیت کے ماتحت اس
پر تنگی کے اوقات لے آئے اور اس کے وسائل معاش کھلے
نہ رہیں تو وہ کہتا ہے میرے رب نے میری تذلیل کی۔ گویا

نیکی اور بدی دونوں کو وہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کہتا ہے میرے ساتھ اچھا سلوک بھی میرے اللہ نے کیا اور میرے ساتھ بُرا سلوک بھی میرے اللہ نے کیا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسا کہنا سخت غلطی ہے تم یہ مت کہو کہ عزت بھی خدا کی طرف سے ملتی ہے اور ذلت بھی خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ نیک نتائج بھی وہی پیدا کرتا ہے اور بُرے نتائج بھی وہی پیدا کرتا ہے۔

خیر و شر کے منجانب اللہ ہونے کے متعلق قرآن مجید کا بیان

لیکن دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝ (النساء ع۱۱) یعنی جب ان کو کوئی خوشی کی خبر پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے یہ ویسی ہی بات ہے جیسے کہا گیا تھا کہ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ۔ لیکن جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے نہیں ہو سکتی بندوں کی کارروائیوں کی وجہ سے ہے۔ اور چونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم مسلمانوں کے حاکم ہیں اور وہی کفر کے مقابلہ میں تدابیر اختیار کرتے رہتے ہیں اس لئے نقصان ان کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ خرابی نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بے تدبیری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے فرماتا ہے۔ قُلْ۔ تو ان لوگوں سے کہہ دے كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ تم بالکل جھوٹ بولتے ہو انعام بھی خدا کی طرف سے آتا ہے اور سزا بھی خدا کی طرف سے آتی ہے۔ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا۔ اس قوم کو کیا ہو گیا کہ یہ اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتی کہ جو کچھ کرتا ہے خدا تعالیٰ کرتا ہے اس لئے تم یہ کہو کہ انعام بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے اور سزا بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔

اب عجیب بات ہے کہ کافروں نے بھی تو یہی کہا تھا کہ عزت اور ذلت دونوں خدا کی طرف سے آتی ہیں۔ چنانچہ خود قرآن کریم نے اِن الفاظ میں اُن کے خیالات کا ذکر کیا کہ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ۔ جب اُس پر انعامات نازل ہوتے ہیں تو کہتا ہے رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ۔ میرے رب نے میری عزت کی اور جب اُس پر ایسی صورت میں ابتلاء وارد کرتا ہے کہ اُس کا رزق تنگ ہو جاتا ہے تو وہ کہتا ہے رَبِّيْٓ اَهَانَنِ میرے رب نے میری اہانت کی۔ اب یہ بات تو وہی ہے جو سورہ نساء میں بیان کی گئی ہے۔ مگر آیت زیر تفسیر میں تو یہ فرمایا ہے کہ تم ایسا مت کہو کہ نیکی بھی خدا کی طرف سے ہے اور بدی بھی خدا کی طرف سے ہے۔ مگر دوسرے مقام پر جب بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ نیکی خدا کی طرف سے ہے اور بدی بندے کی طرف سے۔ تو اُن کو ڈانٹ دیا کہ یہ بڑی خطرناک بات ہے جو تم نے کہی حقیقت یہ ہے کہ نیکی بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور بدی بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ گویا دونوں آیتوں میں ایک نمایاں تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ نیکی اور بدی دونوں کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا غلط قرار دیا گیا ہے اور دوسری جگہ نیکی اور بدی دونوں کا انتساب اللہ تعالیٰ کی طرف کیا گیا ہے۔

تیسری جگہ فرماتا ہے مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (النساء ع۱۱) جو نیکی تجھ کو پہنچے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ اور جو تکلیف تجھ کو پہنچے وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے۔ حالانکہ سورۂ نساء کی پہلی آیت میں یہی

بات کفار نے کہی تھی کہ نیکی کا ظہور خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے اور تکلیف محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے۔ اور اس پر انہیں تنبیہ کی گئی تھی لیکن اس دوسری آیت میں فرماتا ہے کہ نیکی خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے اور بدی تمہاری طرف سے۔

(۴) پھر فرماتا ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (حٰمٓ سجدہ ع) نیکی بھی انسان کے لئے اس کے نفس کی طرف سے آتی ہے اور بدی بھی اُسی کی طرف سے پیدا ہوتی اور اُس کی سزا اُسے مل جاتی ہے وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۔ تیرا رب لوگوں پر ظلم کرنے والا نہیں جو کچھ کرتے ہیں لوگ خود کرتے ہیں۔ اس جگہ بُرائی اور بھلائی دونوں کو بندہ کی طرف منسوب کردیا ہے۔

(۵) اسی طرح قارون جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں گذرا ہے اس کے متعلق سورۂ قصص میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ اس نے دعویٰ کیا اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (قصص ع) میں نے اپنے علم کے مطابق کام کیا اور مجھے اس کا نتیجہ مل گیا مگر اللہ تعالیٰ نے اُسے توبیخ کی اور فرمایا کہ وہ جھوٹ بولتا اور خدا تو پر افتراء سے کام لے رہا ہے۔ اب یہاں بظاہر ساری ہی باتیں اُلٹ گئیں اور جو کچھ بیان کیا گیا تھا اُن سب کی تردید کردی گئی۔ جب بندے نے کہا کہ نیکی اور بدی دونوں خدا تعالےٰ کی طرف سے آتی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے کہا نہیں یہ بات بالکل غلط ہے۔ جب بندے نے کہا کہ نیکی خدا کی طرف سے اور بدی بندے کی طرف سے آتی ہے تو اللہ تعالےٰ نے کہا یہ بالکل غلط ہے۔ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ہر بات اللہ تعالےٰ کی طرف سے آتی ہے، نیکی بھی اُسی کی طرف سے آتی ہے اور بدی بھی اُسی کی طرف سے آتی ہے۔ مگر پھر ان دونوں کے خلاف یہ بات بیان کردی کہ نیکی خدا کی طرف سے اور بدی بندے کی طرف سے آتی ہے اور آخر میں کہہ دیا کہ نیکی اور بدی دونوں بندے کی طرف سے پیدا ہوتی ہیں۔ سورۂ فجر میں تو فرمایا کہ عزت اور ذلت دونوں تم نے اللہ تعالےٰ کی طرف کیوں منسوب کیں اور سورۂ نساء میں فرمادیا کہ عزت اور ذلت دونوں اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہیں۔ ایک کو خدا تعالےٰ کی طرف منسوب کرنا اور دوسری کو نہ کرنا درست نہیں۔ تیسرے سورۂ نساء کی اگلی آیت میں ہی فرمادیا کہ عزت خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے اور ذلت اپنے نفس سے۔ چوتھے سورۂ حٰمٓ سجدہ میں فرمایا کہ دونوں ہی انسان کی طرف سے ہیں۔ اب بظاہر یہ چار اختلاف ہیں اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر صحیح کیا ہے؟ آخر چار ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(۱) یا تو نیکی اور بدی دونوں خدا تعالےٰ کی طرف سے ہوں۔

(۲) یا نیکی اور بدی دونوں انسان کی طرف سے ہوں۔

(۳) یا خیر خدا تعالےٰ کی طرف سے ہو اور شر انسان کی طرف سے۔

(۴) یا شر خدا تعالےٰ کی طرف سے ہو اور خیر انسان کی طرف سے۔ پانچویں بات تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ قرآن کریم نے اس امر کو بھی ردّ کیا کہ دونوں خدا تعالےٰ کی طرف سے ہیں اور اس امر کو بھی ردّ کیا ہے کہ دونوں انسان کی طرف سے ہیں اور اس امر کو بھی کہ خیر خدا تعالیٰ کی طرف سے اور شر بندہ کی طرف سے ہے اور اسے بھی ردّ کیا ہے کہ شر خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے اور خیر بندہ کی طرف سے۔ اس کا حل یہ ہے کہ یہ سب امور الگ الگ زاویہ اور الگ الگ نقطۂ نگاہ کے ماتحت بیان کئے گئے ہیں اور ان میں جو اختلاف نظر آرہا ہے وہ صرف زاویہ نگاہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ جہاں کسی بات کو بیان کرکے اُس کی تردید کی گئی ہے وہاں

خیر و شر سے متعلق چار نظریے

اَور زاویۂ نگاہ ہے اور جہاں اُس بات کی تصدیق کی گئی ہے وہاں اَور زاویۂ نگاہ ہے اور زاویۂ نگاہ کے اختلاف اور نقطۂ نگاہ کے تغیّر سے بہت کچھ تبدیلی ہو جایا کرتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے مجھے نبی جو کچھ کہے گا وہ میں کرونگا یا خلیفۂ وقت جو کچھ کہے گا اس پر عمل کروں گا یا امیر اور پریذیڈنٹ جو کچھ کہے گا وہی کروں گا۔ اب بظاہر یہ بڑی معقول بات ہے اور جو بھی سُنے گا اُسے درست قرار دے گا لیکن اگر گھر میں بیٹھے ہوئے کسی شخص کے سامنے روٹی رکھی جائے اور وہ کہے کہ میں اُس وقت تک روٹی نہیں کھاؤں گا جب تک نبی یا خلیفہ یا امیر یا پریذیڈنٹ مجھے آکر نہ کہے تو گو بات وہی ہوگی۔ مگر نقطۂ نگاہ کے بدل جانے اور اُس کے محل میں تبدیلی آجانے کی وجہ سے ہم اُس کی ایک بات کو غلط کہیں گے اور دوسری بات کو ٹھیک کہیں گے یا اگر ایک شخص ہنگامی طور پر کسی چندے کی تحریک کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ فلاں غرض کے لئے روپیہ دو اور وہ آگے کہتے ہیں کہ جب تک ہمارا امیر اس چندے میں حصہ لینے کی اجازت نہ دے یا جب تک مرکز کی طرف سے اس بارہ میں باقاعدہ اجازت حاصل نہ کر لی جائے ہم چندہ نہیں دے سکتے تو یہ بالکل صحیح بات ہوگی۔ اگر اس طرح لوگوں کو چندے لینے کی اجازت دے دی جائے تو مرکزی تحریکات کے لئے لوگوں کے پاس روپیہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر ایک شخص کے پاس سکرٹری مال یا تحریکِ جدید کا سکرٹری چندہ کی وصولی کے لئے جائے اور وہ کہے کہ جب تک خلیفۃ المسیح کا میرے نام خط نہ لاؤ گے یا جب تک بیت المال مجھے نہ لکھیگا میں تمہیں چندہ نہیں دے سکتا تو ہر شخص اس کی بات کو غلط قرار دیگا۔ اگرچہ پہلے اسی بات کو صحیح سمجھا جا چکا ہوگا۔ وہ فقرہ ایک اَور نقطۂ نگاہ کے ماتحت کہا گیا تھا اور یہ فقرہ ایک اَور نقطۂ نگاہ کے ماتحت کہا گیا ہے۔ چونکہ زاویۂ نگاہ بدل گیا ہے اس لئے دونوں میں سے ایک بات کو ہم درست قرار دیں گے اور دوسری کو غلط۔ غرض زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے بہت بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

مثلاً باپ کو جُوتی مارنا کتنا خطرناک جرم ہے لیکن فرض کرو باپ آگے بیٹھا ہے اور بیٹا پیچھے ہے اور بیٹے نے یہ دیکھا کہ ایک سانپ اس کے باپ کے کوٹ یا قمیص پر چڑھتا جا رہا ہے اور وہ عین اس کی گردن تک پہنچ گیا ہے وہ سمجھتا ہے اگر میں نے ایک منٹ کی بھی دیر کی تو سانپ اُسے کاٹ لے گا۔ ایسی صورت میں اگر وہ سانپ کو اپنے ہاتھ سے ہٹاتا ہے تو اُسے خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں سانپ ہوشیار ہو کر میرے باپ کو کاٹ نہ لے۔ وہ اس کا علاج صرف یہی سمجھتا ہے کہ کسی جھٹکے کے ذریعہ اسے الگ کیا جائے اُس وقت جب وہ اپنے دائیں بائیں دیکھتا ہے تو اُسے سوائے بُوٹ کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اُس وقت وہ یہ نہیں سوچے گا کہ میں اپنے ابا جان کو بوٹ کس طرح ماروں بلکہ اگر اُسے بُوٹ ملے گا تو بُوٹ اور اگر جُوتی ملے گی تو جُوتی سانپ پر زور سے مارے گا اور سمجھے گا کہ اگر میں نے بُوٹ یا جُوتی نہ ماری تو میرے باپ کو زیادہ نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ اب دیکھو اس جگہ اُس نے اپنے باپ کو جُوتی ماری ہوگی مگر لوگ اُسے ملامت نہیں کریں گے کہ بڑا خبیث تھا اپنے باپ کو اُس نے جُوتی مار دی بلکہ ہر شخص اُس کی تعریف کرے گا اور کہے گا کہ بڑا عقلمند بیٹا تھا جس نے اپنے باپ کی جان بچا لی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو سانپ اُس کے باپ کو ضرور ڈس لیتا گویا ایک ہی فعل ایک جہت سے تو قابلِ مذمت ہوتا ہے اور دوسری جہت سے قابلِ تعریف ہوتا ہے۔ فرض کرو کسی جگہ آگ لگی ہوئی ہو اور ایک شخص مصلّٰی بچھا کر نماز پڑھنے لگ جائے لوگ شور مچا رہے ہوں کہ پانی لاؤ، پانی لاؤ اور یہ بیٹھا تسبیح ہاتھ میں لئے ذکرِ الٰہی کر رہا ہو تو لوگ یہ نہیں کہینگے

کہ یہ بڑا نمازی ہے خدا سے بڑی محبت رکھنے والا ہے بلکہ ہر شخص اس کی مذمت کرے گا حالانکہ نماز بڑی اچھی چیز ہے۔

غرض نقطۂ نگاہ اور محل کے بدلنے سے انسانی اقوال اور افعال کی حیثیت بھی بدل جاتی ہے۔

یہ بات کہ شر خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے اور خیر بندے کی طرف سے، اس کو تو قرآن کریم نے کلّی طور پر ردّ کر دیا ہے۔ یہ جائز ہی نہیں کہ کوئی شخص یہ کہے کہ نیکی بندے کی طرف سے آتی ہے اور بدی خدا تعالےٰ کی طرف سے۔ یہ ہر زاویۂ نگاہ سے بُری بات ہے اور اس کی کوئی نیک توجیہ ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ کہ خیر خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے اور شر بندہ کی طرف سے، اس کی تردید قرآن کریم نہیں کرتا بلکہ تائید کرتا ہے جیسا کہ سورۂ نساء میں فرماتا ہے مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (نساء ع۱۱) جو تجھے نیکی پہنچے وہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ہے اور جو شر پہنچے وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے اِس کی تردید قرآن کریم نے کسی جگہ نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ اس کی تائید کی ہے اور جو بظاہر تردید معلوم ہوتی ہے وہ بھی تردید نہیں بلکہ تائید ہے۔ چنانچہ اس سے پہلی آیت میں جو کہا گیا ہے کہ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (النساء ع۱۱) جب بھلائی آتی ہے تو کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے اور جب بُرائی آتی ہے تو کہتے ہیں یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے حالانکہ دونوں خدا کی طرف سے ہیں۔ اس کا وہ مفہوم نہیں جو مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ کا ہے بلکہ اس کا مفہوم بالکل اور ہے۔ درحقیقت اس آیت میں منافقین کی اس شرارت کی تردید کی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جس کوشش کا نیک نتیجہ نکلے وہ کہتے تھے کہ یہ تو اتفاقاً ہے اس میں کسی الٰہی تائید یا آپ کی کسی اعلیٰ تدبیر کا دخل نہیں۔ مگر وہ الفاظ یہ استعمال کرتے تھے کہ هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ دراصل یہ ایک محاورہ ہے جو اُن لوگوں نے جن کے دلوں میں خدا تعالےٰ پر کامل ایمان نہیں ہوتا اتفاقی امور کے لئے ایجاد کیا ہُوا ہے اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اُنہیں خدا تعالےٰ کی ذات پر یقین ہے اور وہ اس کام کو خدا کی تائید کا نتیجہ سمجھتے ہیں بلکہ یہ محض رسمی رنگ کے الفاظ ہوتے ہیں جو ایمان پر دلالت نہیں کرتے بلکہ اس غرض کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں کہ اُسے اتفاق قرار دیا جائے۔ ہمارے ملک میں بھی اتفاقی امور کے متعلق اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں چنانچہ جب کوئی واقعہ ہو تو لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ کام "رب سببی" ہوگیا یا "رب سببوں" فلاں چیز مل گئی ہے حالانکہ اُن کے دل میں ذرا بھی خدا تعالےٰ کا خوف اور اس کی خشیت نہیں ہوتی۔ ذرا بھی اُن کو اس بات پر یقین نہیں ہوتا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل سے اُن کو کامیابی عطا فرمائی ہے۔ محض رسمی رنگ میں یہ الفاظ اُن کی زبان سے نکل جاتے ہیں۔ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اتفاقیہ طور پر یہ کام ہوگیا ہے۔ پس یہ الفاظ اُن کے کسی ایمان پر دلالت نہیں کرتے بلکہ یہ ایک محاورہ ہے جو لوگوں کی زبان پر چڑھا ہُوا ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک مومن جب یہ الفاظ استعمال کرتا ہے تو اس کی مراد حقیقتاً یہ ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے مجھ سے یہ نیک معاملہ کیا ہے لیکن ایک کافر یا منافق جب ان الفاظ کو استعمال کرتا ہے تو اس کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ کام محض اتفاق سے ہوگیا۔ اس سے زیادہ یہ الفاظ اس کے نزدیک اپنے اندر کوئی معنے

نہیں رکھتے یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمائی ہے کہ منافقین کی حالت یہ ہے کہ جب انہیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ "رب سببی" یہ بات ہو گئی ہے یعنی اتفاقی طور پر ایسا ہو گیا ہے پس یہ محض رسمی الفاظ ہیں اُن کے ایمان پر دلالت کرنے والے الفاظ نہیں ہیں۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ نقصان کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کرتے تھے جو بے ایمانی کی علامت تھی۔ اگر وہ نقصان کو اپنی طرف منسوب کرتے تو اور بات ہوتی مگر وہ نقصان کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جو صاف طور پر انکی بے ایمانی کی علامت ہے۔ اگر کہو کہ وہ نتائج کے لحاظ سے ہر کام کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا پسند کرتے تھے تو پھر سوال یہ ہے کہ نتائج تو سب کے سب خدا تعالیٰ ہی نکالتا ہے پھر وہ یہ کیوں کہتے ہیں کہ نیک نتائج خدا نکالتا ہے اور بُرے نتائج محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نکالتے ہیں پس اگر انہوں نے نتائج کے اعتبار سے ایسا کہا تب بھی غلط ہے کیونکہ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ اچھے نتائج بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں اور بُرے نتائج بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں اس صورت میں انہیں اچھے اور بُرے دونوں نتائج خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے چاہیئے تھے مگر وہ اچھے نتائج خدا تعالیٰ کی طرف اور بُرے نتائج محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے تھے اور اگر انہوں نے اچھے اور بُرے نتائج کو بندے کے عمل کی طرف منسوب کرنا تھا اور اُن کا یہ دعویٰ تھا کہ بندہ اچھے عمل کرتا ہے تو اچھے نتائج پیدا ہوتے ہیں، بُرا عمل کرتا ہے تو بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں تو اس صورت میں اچھے اور بُرے دونوں نتائج محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے چاہیئے تھے۔ اگر اُحد میں کسی غلطی کی وجہ سے بہت سے مسلمان مارے گئے تو آخر بدر میں مٹھی بھر صحابہؓ کے ساتھ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کفار کے ایک بہت بڑے لشکر پر فتح بھی تو پائی تھی اگر وہ بندے کے فعل کو دیکھ رہے تھے اور اسی نقطۂ نگاہ سے یہ بات کہہ رہے تھے تو وہ کہتے کہ نیکی بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے اور بدی بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے۔ اور اگر وہ نتائج کے اعتبار کو ملحوظ رکھ کر بات کرتے تو کہتے کہ نیکی بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور بدی بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے مگر وہ ان دونوں نقطہ ہائے نگاہ کے خلاف یہ کہتے ہیں کہ نیکی خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور بدی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ منافقین ایسا کر ہی نہیں سکتے کہ نیکی اور بدی دونوں کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیں یا نیکی اور بدی دونوں کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کر دیں کیونکہ اُن کی غرض تو یہ تھی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عزت دلوں سے کم کریں اگر وہ کہتے کہ نیک نتائج بھی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں اور بُرے نتائج بھی آپ کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں تو لوگوں کے دلوں میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت بدظنی پیدا نہ ہو سکتی کیونکہ زیادہ اچھے نتائج نکلتے تھے اور بہت کم خراب نکلتے تھے۔ سو میں سے اٹھانوے نتائج بہتر ہوتے اور صرف دو نتائج خراب نکلا کرتے تھے۔ پس اگر وہ ایسا کہتے تو اُن کا کام نہ بنتا۔ لوگ کہتے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بڑے عقلمند لیڈر ہیں کہ انہوں نے لڑائیوں میں اتنی دفعہ فتح پائی، اتنی دفعہ مالِ غنیمت لیا، اتنے لوگوں کو قید کیا، صرف ایک دو دفعہ اگر لڑائی میں مسلمانوں کو نسبتاً زیادہ نقصان پہنچ گیا تو یہ معمولی بات ہے ورنہ چالیس پچاس غزوات میں ہر جگہ ایسا ہی ہوا کہ اگر آپ کا ایک آدمی مارا گیا تو دشمن کے

دس آدمی مارے گئے۔ پس اگر وہ اچھے اور بُرے دونوں نتائج کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے تو یہ بات آپ کے درجہ اور شان کو بلند کرنے والی ہوتی اور ہر جگہ آپ کی تعریف ہوتی اور اگر وہ جتنا ئج کو خدا تعالےٰ کی طرف منسوب کرتے اور کہتے کہ نیکی بھی خدا کی طرف سے ہے اور بدی بھی خدا کی طرف سے ہے تب بھی ان کا کام نہ بنتا اور وہ لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ پس چونکہ ان کی غرض لوگوں کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈالنا تھی اس لئے وہ نہ روحانی نقطۂ نگاہ بیتے تھے نہ مادی نقطۂ نگاہ۔ بلکہ اگر بھلائی آتی تو کہتے یہ اتفاق کی بات ہے اور اگر نقصان پہنچتا تو کہتے یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہُوا ہے۔ فلاں موقع پر بھی نقصان ہُوا تھا مگر محمد رسول اللہ صلعم پھر بھی نہ سمجھے اور قوم کو دوبارہ نقصان برداشت کرنا پڑا۔ پس اُن کا یہ اعتراض کسی فلسفہ پر مبنی نہیں تھا بلکہ محض شرارت اور فتنہ وفساد پر اس کی بنیاد تھی اسی لئے خدا تعالےٰ نے اس کی تردید کی ہے ورنہ یہ صحیح ہے کہ خرابی بندے کی غلطی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے اور انعام خدا تعالےٰ کی طرف سے آتا ہے مگر بندے سے مراد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ عام مسلمان ہیں جہاں جہاں مسلمانوں کو نقصان پہنچا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کسی غلطی کی وجہ سے نہیں پہنچا بلکہ بعض جگہ مسلمانوں کے غلط اجتہاد کی وجہ سے جیسے اُحد کی جنگ میں اور بعض جگہ کافروں اور کمزور مسلمانوں کی بُزدلی کی وجہ سے جیسے غزوۂ حنین میں۔ لیکن منافق نہ روحانی نقطۂ نگاہ سے یہ بات کہتے تھے نہ مادی نقطۂ نگاہ سے۔ صرف شرارت سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے کے لئے ایسا کہتے تھے اس لئے اللہ تعالےٰ نے اُنکے قول کی تردید کر دی۔

اگر کہو کہ ادب کے مقام پر خیر خدا تعالیٰ کی طرف اور شر بندے کی طرف منسوب ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اُن کے دلوں میں ادب ہوتا تو اس صورت میں ان کو شر اپنی طرف یا اتفاق کی طرف منسوب کرنا چاہیئے تھا اور اُنہیں یوں کہنا چاہیئے تھا کہ ہم سے غلطی ہوئی جس کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف وہ بدی کو منسوب نہ کرتے۔ ادب یہی ہوتا ہے کہ انسان غلطی اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور خوبی اپنے افسر کی طرف۔ مگر وہ خوبی خدا تعالےٰ کی طرف اور بدی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب کے طور پر وہ ایسا نہیں کہہ رہے تھے بلکہ محض شرارت اور فساد کی نیت سے ایسا کہتے تھے۔

اب رہا خیر کو اللہ تعالےٰ کی طرف اور شر کو اپنی طرف منسوب کرنا۔ اس دعوے کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہر چیز انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کی ہے آگے کبھی اپنے فعل کی وجہ سے اور کبھی دشمن کے فعل کی وجہ سے وہ انسان کے لئے بُری بن جاتی ہے۔ مثلاً خدا تعالےٰ نے سنکھیا اس لئے پیدا کیا ہے کہ اگر انسان کو بخار چڑھے تو وہ اس سے فائدہ اُٹھائے یا کسی کو خون کے دست آ رہے ہوں تو ہومیوپیتھک ڈوز میں اُسے آرسنک دیا جائے تا کہ اُس کی پیچش دُور ہو جائے اور خون آنا بند ہو جائے یا سنکھیا خدا تعالےٰ نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ اگر کوئی کمزور شخص ہو اُس کے جسم میں خون کی کمی ہو۔ تو وہ سنکھیا استعمال کر کے اپنی کمیٔ خون اور جسم کی کمزوری کو دُور کر لے یا اگر اعصاب میں کمزوری پیدا ہو چکی ہو تو سنکھیا استعمال کر کے اعصاب کو مضبوط بنا لیا جائے اسی طرح اور بیسیوں فوائد ہیں جن کے لئے سنکھیا استعمال کیا جاتا ہے مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان خودکشی کرنے کے لئے سنکھیا کھا لیتا ہے۔ کبھی جہالت سے بغیر ضرورت اور بغیر ڈاکٹری مشورہ کے ایسی چیزیں استعمال کر لیتا ہے جن میں سنکھیا پڑا ہوتا ہوتا ہے، کبھی دشمن اسے زہر دے دیتا ہے اور اس طرح وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ اب سنکھیا تو خدا تعالیٰ نے خیر کیلئے

ہی پیدا کیا تھا مگر اُس کے اپنے غلط استعمال کی وجہ سے یا معالج کی بے احتیاطی کی وجہ سے یا دشمن کی شرارت کی وجہ سے وہ خیر اُس کے لئے شر بن جاتی ہے یا مثلاً خدا نے لوہا اس لئے بنایا ہے کہ لوگ گنڈاسے بنائیں اور اُس سے چارہ کتریں، چاقو تیار کریں اور اُس سے قلمیں اور پنسلیں تراشیں، چھرے بنائیں اور اُن سے بکرے ذبح کریں، کسیاں بنائیں اور اُن سے زمین کھودیں، کُدالیں بنائیں اور اُن سے سخت پتھریلی زمینیں توڑیں، اسی طرح آرے تیار کریں اور لکڑیوں کو چیریں مگر ایک اَور شخص لوہا لے کر اپنے سر پر مارتا ہے اور مرجاتا ہے اب یہ فعل اس کا اپنا ہے اللہ تعالیٰ کا نہیں۔ اُس نے تو بہرحال انسان کے فائدہ کے لئے لوہے کو پیدا کیا تھا اس لئے نہیں پیدا کیا تھا کہ وہ نقصان اُٹھائے یا اپنے آپکو ہلاک کرے۔ پس چونکہ خدا تعالیٰ نے ہر چیز انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کی ہے اگر وہ نقصان اُٹھاتا ہے تو اپنی غلطی کی وجہ سے۔ اس لئے ہر نیکی خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے اور ہر بدی بندے کی طرف منسوب ہوتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جہاں تک نتائج کا سوال ہے یہ امر خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے کیونکہ نتیجۂ شر بھی خدا تعالیٰ پیدا کرتا ہے اور نتیجۂ خیر بھی خدا تعالیٰ ہی پیدا کرتا ہے مگر الزام خدا تعالیٰ پر نہیں آتا اس لئے کہ وہ فعل خدا تعالیٰ نے نہیں کیا بلکہ انسان نے کیا ہے۔ مثلاً فرض کرو ایک شخص نے مینار سے چھلانگ لگائی اور وہ مرگیا۔ اب بے شک خدا تعالیٰ نے اُس کا گوشت پوست ایسا بنایا تھا کہ اگر وہ اونچی جگہ سے گرے تو مرجائے۔ اُس کے پھیپھڑے اُس نے ایسے بنائے تھے کہ اگر اُن پر چوٹ آئے تو وہ زخمی ہوجائیں مگر اس کے باوجود خدا تعالیٰ نے اُسے گرایا نہیں بلکہ وہ خود گرا ہے۔ پس جہاں تک نتائج کا سوال ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہونگے یہ کہا جائے گا کہ خدا تعالیٰ نے اُس کا گوشت پوست ایسا ہی بنایا تھا کہ اتنی اونچی جگہ سے چھلانگ لگانے کے نتیجہ میں وہ مرجاتا مگر یہ نہیں کہا جائے گا کہ مینار سے اُسے خدا تعالیٰ نے گرایا ہے یا اس کا گوشت پوست اس لئے بنایا تھا کہ مینار سے چھلانگ لگائے اُس کا گوشت پوست کسی اور غرض کے لئے بنایا گیا تھا مگر بہرحال خدا تعالیٰ نے ایسا ہی گوشت پوست اُسے بخشا تھا جو بلند جگہ سے گرنے کے نتیجہ میں کچلا جائے اور انسان ہلاک ہوجائے مگر اس کے باوجود خدا تعالیٰ پر یہ الزام نہیں آئے گا کہ اُس نے ہلاک کیا۔ غرض جہاں تک نتائج کا سوال ہے اچھے اور بُرے دونوں خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہونگے لیکن جہاں تک شر کے الزام کا سوال ہے وہ بندے پر عائد ہوگا لیکن فعلِ بد اور فعلِ خیر دونوں بندے کی طرف منسوب ہوں گے اچھا فعل بھی اُسی کی طرف منسوب ہوگا اور بُرا فعل بھی اُسی کی طرف منسوب ہوگا۔ اور جہاں تک نتائج کا سوال ہے شر بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور خیر بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ جب ہم نتائج کے لحاظ سے کوئی بات کریں گے تو کہیں گے خدا تعالیٰ کی طرف سے خیر بھی آتی ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے شر بھی آتی ہے لیکن جب یہ کہا جائے گا کہ بُرے اور اچھے کام کون کرتا ہے تو ہم کہیں گے چوری بھی بندہ کرتا ہے اور نماز بھی بندہ پڑھتا ہے اور جہاں تک سامانوں کے بالقوۃ یا بالفعل ظہور کا سوال ہے یعنی یہ سوال کہ انسان کے اندر قوتیں کس مقصد کے لئے رکھی گئی ہیں؟ اُس وقت جب بالقوۃ طاقتوں کا سوال ہوگا تو ہم کہیں گے کہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور جب اُن قوتوں کے بالفعل ظہور کا سوال ہو تو ہم کہیں گے کہ یہ بندے کی طرف سے ہیں اس لئے کہ جہاں تک طاقتوں اور قوتوں کا سوال ہے وہ خیر ہی خیر ہیں۔ اس لئے ہم کہیں گے کہ وہ سب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں لیکن جہاں تک اُن قوتوں کے استعمال کا سوال ہے چونکہ بندے بُرے کام بھی کر لیتے ہیں اور

اچھے بھی۔ اس لئے اگر انسان اُن قوتوں کا بُرا استعمال کرے گا تو شر بندے کی طرف منسوب ہوگا اور اگر وہ اُن قوتوں کا نیک استعمال کرے گا تو چونکہ خدا تعالیٰ نے ہی اُن قوتوں کو نیکی کے لئے پیدا کیا ہے اس لئے وہ خیر خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا۔ پس نتائج کے اعتبار سے خیر اور شر دونوں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ عمل کے لحاظ سے خیر اور شر دونوں بندے کی طرف سے ہیں بالقوہ طاقتوں کے لحاظ سے خیر خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا اور شر نہیں کیونکہ اُس نے کوئی چیز بُرے استعمال کے لئے پیدا ہی نہیں کی اور بالفعل ظہور کے لحاظ سے خیر خدا تعالیٰ کی طرف اور شر بندے کی طرف منسوب ہوگا کیونکہ خدا تعالیٰ نے اُن قوتوں کو کسی شر کے لئے پیدا نہیں کیا تھا۔ غرض دونوں باتیں خدا تعالیٰ کرتا ہے اور دونوں باتیں بندہ کرتا ہے مگر اس کے باوجود شر بندے کی طرف منسوب ہوتا ہے اور خیر خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ یہاں انکار اُنہی معنوں میں کیا گیا ہے جو بُرے ہیں فرماتا ہے فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ کہ جب انسان پر اس کی حقیقت کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ اکرام و انعام کی بارش نازل فرماتا ہے تو وہ اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خدا نے میرا اکرام کیا یعنی میں ایسا ہی تھا کہ خدا تعالیٰ مجھ سے یہ سلوک کرتا۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں مجھے اس لئے دی ہیں تا ان کے ذریعہ میرا گند یا میری خوبی دنیا پر ظاہر کرے یا مجھے اس لئے دولت دی ہے تاکہ لوگوں کو دکھائے کہ میرا ایمان اتنا مضبوط ہے یا نہیں کہ باوجود دولت ملنے کے میں تکبر میں مبتلا نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کے حقوق کو پوری دیانتداری کے ساتھ ادا کرتا رہتا ہوں بلکہ وہ سمجھتا ہے خدا مجھ پر عاشق ہوگیا ہے کہ اتنے بڑے انعام مجھے عطا کرتا جا رہا ہے گویا وہ خدا تعالیٰ کے اکرام اور اس کے انعام سے ایک غلط نتیجہ نکال لیتا ہے۔

وَ اَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ۔ اور اگر خدا تعالیٰ کسی وقت رزق کی تنگی سے اس کی آزمائش کرتا ہے تو وہ یہ نہیں سمجھتا کہ خدا تعالیٰ اس ابتلاء کے ذریعہ میرے اندرونہ کو ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ دنیا کو یا خود مجھے یہ دکھانا چاہتا ہے کہ مشکلات کو کس حد تک برداشت کرنے کی میرے اندر قوت پائی جاتی ہے اور قومی ضرورتوں کے وقت میں اچھا سپاہی ثابت ہو سکتا ہوں یا نہیں۔ وہ ان حکمتوں میں سے کسی حکمت کو نہیں سمجھتا بلکہ یہ شور مچانا شروع کر دیتا ہے کہ خدا نے مجھے بے عزت کر دیا گویا دونوں موقعوں پر وہ ایک غلط نقطۂ نگاہ اختیار کر لیتا ہے اس لئے اُسکی دونوں باتیں غلط ہوتی ہیں ورنہ حقیقت کے لحاظ سے یہ دونوں باتیں صحیح ہیں کہ کبھی اللہ تعالیٰ انسان کی اس رنگ میں آزمائش کرتا ہے کہ اس پر انعام و اکرام نازل کرتا ہے اور کبھی اس رنگ میں آزمائش کرتا ہے کہ اُسے مشکلات اور مصائب اور تنگیٔ رزق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک سچا مومن دونوں حالتوں میں ثابت قدم رہتا ہے مگر کافر کی یہ حالت ہوتی ہے کہ انعام و اکرام کے وقت وہ کہتا ہے رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ خدا نے میرا اکرام کیا حالانکہ خدا تعالیٰ اس ذریعہ سے اس کا امتحان لے رہا ہوتا ہے اور تنگیٔ رزق کے وقت وہ کہتا ہے رَبِّيْٓ اَهَانَنِ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا حالانکہ اس ذریعہ سے وہ اُس کے اندرونہ کو بے نقاب کر رہا ہوتا ہے۔ گویا یہ دونوں ابتلائی مقام ہوتے ہیں جزاء و سزاء کے مقام نہیں ہوتے۔ جب اس پر انعامات کے رنگ میں بارش نازل ہو رہی ہوتی ہے اُس وقت بھی وہ ابتلاء کے نیچے ہوتا ہے اور جب اُس پر تنگیٔ رزق کا دور ہوتا ہے اُس وقت بھی وہ ایک ابتلاء کے نیچے ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ انعامات اُسے کسی اعلیٰ درجہ کے کام کی جزاء کے طور پر دئے جا رہے ہوں یا تنگیٔ رزق کسی جرم کی سزا کے طور پر اُس پر حاوی ہو دونوں حالتیں ابتلائی ہوتی ہیں اور دونوں حالتوں میں اُس کی حقیقت کو خود اُس کے نفس پر

اور دوسرے لوگوں پر ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔
اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اسکی طرف سے آنیوالی تکالیف کے سلسلہ میں دو قسم کے مقام ہوتے ہیں ایک مقام ابتلائی ہوتا ہے اور ایک مقام جزا و سزا ہوتا ہے یعنی کبھی ابتلاء کے طور پر انعامات نازل ہوتے ہیں اور کبھی جزائے خیر کے طور پر انعامات نازل ہوتے ہیں۔ اسی طرح کبھی ابتلاء کے طور پر دُکھ وارد ہوتے ہیں اور کبھی سزا کے طور پر مختلف تکالیف کے دَور آتے ہیں۔ اس جگہ صرف ابتلائی مقامات کا ہی ذکر کیا جا رہا ہے جزا و سزا والے مقام کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ انسان کو مجرم قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے ہم اس کا امتحان لینے کے لئے اُسے انعامات دیتے ہیں تو وہ کہتا ہے میرے رب نے میرا اکرام کیا۔ گویا ان انعامات پر اس کا حق تھا اور خدا تعالیٰ کو بھی چاہیئے تھا کہ اس کا اکرام کرتا۔ وہ نہیں سمجھتا کہ میں نے تو کوئی نیک کام کیا نہیں اور یہ کہ یہ نعمتیں تو اس کے امتحان کا کا ایک ذریعہ ہیں۔ اس کے مقابلہ میں جب تکالیف کے ذریعہ اس کا امتحان لیا جاتا ہے تو وہ کہہ دیتا ہے رَبِّیْ اَھَانَنِ میرے رب نے میری ہتک کر دی۔ میرے مقام کو اُس نے نظر انداز کر کے اُس نے مجھے بے عزت کر دیا۔ اگر وہ یہ کہتا کہ میرے جرموں کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھے یہ سزا ملی ہے یا بجائے اَھَانَنِ کہنے کے وہ کہتا کہ عَذَّبَنِیْ میرے رب نے میرے گناہوں کی پاداش میں مجھے عذاب میں مبتلا کر دیا تو خواہ ابتلائی مقام ہونے کی وجہ سے اُس کی یہ بات بھی غلط ہی ہوتی مگر پھر بھی وہ مجرم نہ بنتا مگر وہ تو یہ کہتا ہے رَبِّیْ اَھَانَنِ میں اس بات کا مستحق تھا کہ مجھے عزت دی جاتی مگر میرے رب نے مجھے رسوا کر دیا۔

اصل بات یہ ہے کہ ابتلائی صورتیں اور رنگ کی ہوتی ہیں اور جزا و سزا کی صورتیں اور رنگ کی ہوتی ہیں مثلاً ہر نبی کو خدا تعالیٰ عزت دیتا اور اُس کے مقاصد میں اُسے کامیابی عطا کرتا ہے اور کئی ایسے انبیاء ہیں جنہیں اُس نے علاوہ روحانی حکومت کے جسمانی بادشاہت بھی عطا کی۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ میں بادشاہت آئی مگر یہ بادشاہت ابتلاء کے طور پر نہیں تھی بلکہ انعام کے طور پر اُن کے کام کو تقویت پہنچانے کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی۔ یا مثلاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بادشاہت نہ ملتی تو آپ قرآنی شریعت کو عملی رنگ میں کس طرح رائج کرتے پس آپ کو اور بعض دوسرے انبیاء کو جو حکومت ملی وہ ایک ہتھیار کے طور پر تھی اور ضمنی چیز تھی ابتلاء نہیں تھا۔ ابتلاء ہمیشہ اس لئے آتا ہے تا کہ انسان کے اخلاق ظاہر کئے جائیں مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق تو پہلے ہی ظاہر تھے آپ نے سَرّاء میں بھی خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو حاصل کیا اور ضَرّاء میں بھی اس کی رضامندی کی راہوں کو اختیار کیا۔ آپ کے پاس دولت آئی تو وہ آپ نے سب کی سب بنی نوع انسان کے فوائد کے لئے لُٹا دی اور خود اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اس کے مقابلہ میں آپ پر مصائب بھی آئے۔ کئی قسم کے دُکھ بھی آپ کو برداشت کرنے پڑے مگر ہمیشہ آپ نے صبر سے کام لیا ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان کے پاس سے گذر رہے تھے کہ آپ نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ ایک قبر پر کھڑی رو رہی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بی بی صبر کر۔ اُس نے کہا اگر تیرے بچے مرتے تو میں دیکھتی کہ تو کس طرح صبر کرتا۔ صبر کی نصیحت تو اسی لئے کر رہا ہے کہ یہ میرا بچہ تھا تیرا بچہ نہیں تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا۔ اے عورت میرے سات مر چکے ہیں مگر میں نے ہر بچے کی وفات پر صبر سے کام لیا ہے۔ یہ کہہ کر آپ چل پڑے بعد میں کسی نے اُسے بتایا کہ بد بخت تجھے پتہ بھی ہے تجھے یہ بات کہنے والا کون تھا؟ اُس نے کہا مجھے تو پتہ نہیں۔ اُس نے کہا یہ تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تھے یہ سنتے ہی وہ آپ کے مکان پر آئی اور کہنے لگی یا رسول اللہ میں نے صبر کیا۔ آپ نے فرمایا اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَۃِ الْاُوْلٰی بی بی صبر تو ابتدائی حالت میں ہوتا ہے بعد میں تو

رو دھو کر صبر آ ہی جاتا ہے۔ غرض وہ حالتیں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر آئیں جن میں انسان جزع فزع کرنے لگ جاتا ہے مگر آپ نے اُن حالات میں بھی صبر کیا اور یہی کہا کہ ہم اس کی مشیت پر راضی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ابراہیم جب فوت ہونے لگا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس وقت پاس موجود تھے اُس کی تکلیف اور کرب کو دیکھ کر آپکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کسی نے کہا یا رسول اللہ آپ بھی روتے ہیں آپ نے فرمایا آنکھ کا آنسو بہانا اَور ہے ورنہ ہمیں خدا تعالیٰ کے فعل پر کوئی اعتراض نہیں ہم سمجھتے ہیں کہ اُس نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔

تو ابتلاء اَور ہوتے ہیں اور جزاء اَور ہوتی ہے اور بعض جزائیں تو ایسی ہوتی ہیں جو اعلیٰ درجہ کے روحانی مقامات حاصل کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے انعام کے طور پر ملتی ہیں۔ جیسے حضرت سید عبد القادر صاحب جیلانی فرماتے ہیں کہ میں اُس وقت تک کھانا نہیں کھاتا جب تک خدا مجھے نہیں کہتا کہ اے عبد القادر تجھے میری ذات ہی کی قسم کہ یہ کھانا کھا اور میں کپڑا نہیں پہنتا جب تک مجھے خدا نہیں کہتا کہ اے عبد القادر تجھے میری ذات ہی کی قسم کہ یہ کپڑا پہن - یہ ابتلاء والا مقام نہیں بلکہ ایک روحانی عہدہ حاصل کرنے کا انعام ہے۔ ان لوگوں کو سَرَّآء اور ضَرَّآء میں سے گذار کر اللہ تعالیٰ اُن کے اخلاق اور اُن کے اندرونہ کو دنیا پر اچھی طرح ظاہر کر دیتا ہے اس لئے یہ ضرورت نہیں رہتی کہ اُن پر ابتلاء وارد کئے جائیں لیکن عام لوگوں کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ اُن کے دل پر پچھلے گناہوں کی وجہ سے اتنا زنگ لگ جاتا ہے کہ نہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آنیوالی فراخی کا اُن پر کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ اس کی طرف سے آنیوالی مشکلات اُن میں کوئی تغیر پیدا کرتی ہیں۔ وہ اندھے پیدا ہوتے اور اندھے ہونیکی حالت میں ہی اس جہان سے گذر جاتے ہیں۔ ایسی ہی روحانی نابینائی رکھنے والوں کا اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض دفعہ ابتلاء کے طور پر انہیں فراخی دیتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں خدا نے ہماری قدر کی حالانکہ اُن کے اعمال ایسے نہیں ہوتے کہ اللہ تعالےٰ اُن پر انعام کرے۔ بسا اوقات وہی دولت اور عزت انکو جہنم میں لے جانے کا باعث بن جاتی ہے اسی طرح جب اُن پر تنگیٔ رزق کا دَور آئے تو کہنے لگ جاتے ہیں خدا نے ہمیں بے عزت کر دیا گویا دونوں حالتوں میں وہ اُس کی حکمتوں سے آنکھ بند رکھتے اور روحانی موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں ان لوگوں کی اصل کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے فرماتا ہے وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰہُ اَطْعَمَہٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (یٰسٓ ع ۳) یعنی جب اُن سے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دئے ہوئے سے دوسرے مستحقین پر خرچ کرو تو وہ مومنوں سے کہتے ہیں کہ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم انہیں کھانا کھلائیں جنہیں خدا نے کھانا نہیں کھلایا حالانکہ وہ چاہتا تو انہیں خود رزق دے سکتا تھا بس ہمیں یہ نصیحت کر کے کہ ہم ان کو دیں جن کو خدا تعالےٰ نہیں دینا چاہتا تم ثابت کر رہے ہو کہ تم بڑے ہی گمراہ ہو۔

اس آیت نے آیت زیر بحث کی تشریح کر دی ہے ان کفار کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ہم مستحق انعامات ہیں اس لئے اللہ تعالےٰ ہمیں دیتا ہے اور دوسرے لوگ مستحق نہیں اس لئے انہیں نہیں دیتا اور چونکہ خدا تعالےٰ کے فعل نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ مستحق انعام نہیں اس لئے ہمارا بھی فرض ہے کہ انہیں نہ دیں - یہ ظاہر ہے کہ جس کا یہ نقطۂ نگاہ ہو اُس کے دل میں انعام پر اللہ تعالےٰ کا شکر پیدا نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی تکلیف آئے گی تو شکوہ پیدا ہوگا کہ خدا تعالےٰ نے ہمارا مناسب اعزاز نہیں کیا اور ہمارے درجہ کا خیال نہیں رکھا ؛

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ

(۱۸) ہرگز نہیں بلکہ تم (قصوروار ہو کہ) یتیم کی عزت نہیں کرتے۔ اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ایک دوسرے کو

طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ۝

ترغیب نہیں دیتے ۱۸؎ اور ورثہ کا مال سب کا سب (عیش میں) اڑا جاتے ہو ۱۹؎

تَحَاضُّوْنَ

۱۸؎ **حل لغات**۔ تَحَاضُّوْنَ، حَاضَّ سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور حَاضَّهٗ عَلَيْهِ کے معنے ہوتے ہیں حَثَّ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا صَاحِبَهٗ۔ دونوں میں سے ہرایک نے دوسرے کو کسی کام کے کرنیکی رغبت دلائی (اقرب) پس لَا تَحَاضُّوْنَ کے معنے ہونگے تم رغبت نہیں دلاتے۔

**تفسیر**۔ فرماتا ہے کَلَّا یوں نہیں جو تم خیال کرتے ہو کہ تم خاص طور پر دولت کے مستحق تھے اس لئے تمکو دولت ملی تھی اور خدا تعالےٰ کی دوسری مخلوق مستحق نہیں تھی اس لئے اُسے نہیں ملی اور یہ کہ جب تم کو ابتلاء تکلیف آتا ہے تو وہ خدا تعالےٰ کی طرف سے تمہارے حق میں بے انصافی ہوتی ہے بلکہ بات یہ ہے کہ تم کو دولت ملی تھی کہ تم غرباء پر خرچ کرو اور اس طرح ایک نیک برادری دنیا میں قائم ہو مگر بجائے اس کے تم نے تکبر شروع کیا اور غریبوں کی خبرگیری ہی سے غفلت نہیں برتی بلکہ انکو ذلیل بھی کیا کہ تم اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مستحق نہیں ہو اور یتیموں کی عزت نہ کی بلکہ انہیں ذلیل سمجھا اس لئے خدا تعالیٰ نے بھی تم کو ذلیل کیا اگر تم دولت ملنے پر یہ سمجھتے کہ خدا تعالےٰ نے یہ دولت اس لئے دی ہے کہ وہ دیکھے کہ تم یتیموں کی خبرگیری کرتے ہو یا نہیں اور تم ایک دوسرے سے کہتے ہو یا نہیں کہ خدا نے جب ہمیں روپیہ دیا ہے تو آؤ ہم غرباء کی خبرگیری کریں۔ ہم بھوکوں کو کھانا کھلائیں ہم ننگوں کا سردیوں میں ننگ ڈھانکیں۔ مگر جب اُس نے تمہیں نعمتیں دیں تو بجائے اس کے کہ تم یہ سمجھتے کہ خدا تعالےٰ نے یہ نعمتیں ہمیں اس لئے دی ہیں کہ لوگوں پر خرچ کی جائیں انکی ضروریات کو پورا کریں اور اُن کے دکھوں کو دور کریں تم نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ رَبِّیْٓ اَکْرَمَنِ خدا کا ہمارے ساتھ کوئی خاص جوڑ ہے کہ اُس نے یہ نعمتیں ہمیں دی ہیں اوروں کو نہیں دیں۔ تم نے یتیموں اور مسکینوں کی ذرا بھی پروا نہ کی اور تم نے اپنے متعلق یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ ہم خدا کے خاص محبوب اور پیارے ہیں۔ کہ اُس نے ہمیں تو ان انعامات سے نوازا مگر دوسروں کو محروم رکھا بجائے اس کے کہ تم یہ سمجھتے کہ تمہیں یتیموں کی پرورش اور مساکین کی خبرگیری کے لئے یہ نعمتیں دی گئی ہیں تم نے ان نعمتوں کو اپنا حق قرار دیکر انکی طرف سے اپنی آنکھیں بالکل موند لیں اور انکی ضروریات کیلئے ایک پیسہ خرچ کرنا بھی روا نہ رکھا۔ تمہارے سامنے کتنے یتیم بچے بھوک سے مرتے رہے، کتنے مساکین بھیک مانگتے اور دربدر ٹھوکریں کھاتے رہے مگر تم نے انکی طرف ذرا بھی توجہ نہ کی بلکہ اسی خیال میں مست رہے کہ ہم بڑے آدمی ہیں۔

تُرَاثٌ

۱۹؎ **حل لغات**۔ تُرَاثٌ، وَرِثَ کا مصدر ہے نیز اس کے معنے ہیں مَا يَخْلُفُهُ الرَّجُلُ لِوَرَثَتِهٖ وہ مال جو آدمی اپنے وارثوں کیلئے چھوڑ جاتا ہے (اقرب)

لَمًّا

لَمًّا: قَالَ الْفَرَّاءُ اَیْ شَدِيْدًا وَفِي الصِّحَاحِ اَیْ نَصِيْبَهٗ وَنَصِيْبَ صَاحِبِهٖ۔ فراء کہتے ہیں کہ لَمًّا کے معنے شدید کے ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم سارے کا سارا مال کھا جاتے ہو یا وہ مال تمہارے قبضہ میں آتا ہے تو تم اُسے بالکل چٹ کر جاتے ہو اُس میں سے کچھ باقی نہیں رہنے دیتے لیکن صحاح میں یہ لکھا ہے کہ لَمًّا کے معنے یہ ہیں کہ تم اپنا حصہ بھی کھا جاتے ہو اور دوسروں کا حصہ بھی ہضم کر جاتے ہو (اقرب) گویا یہی نہیں کہ تم صرف اپنا حصہ لینے پر اکتفا کرو بلکہ تم اپنا حصہ بھی چٹ کر جاتے ہو اور یتامیٰ و مساکین یا دوسرے بھائیوں کا جو حصہ ہو وہ بھی کھا جاتے ہو ؎

نوٹ:۔ طَعَامُ الْمِسْكِيْنِ میں طَعَام۔ اِطْعَام کے مصدر کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اسی لئے اسکے معنے کھانا کھلانے کے کئے گئے ہیں۔

# وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝

اور تم مال سے بے انتہا محبت کرتے ہو ۔

**تفسیر** - فرماتا ہے تم اپنے اعمال کی طرف دیکھو کہ تمہاری شامت اعمال تمہارے لئے کیا کیا رنگ پیدا کر رہی ہے۔ تم میں بجائے اس کے کہ کوئی نیک خلق پیدا ہوتا اور تم یتامےٰ اور مساکین کی خبر گیری کرتے تم نے دولت ملنے پر اسراف سے کام لینا شروع کر دیا اور اپنے روپیہ کو بالکل برباد کر دیا اس کے بعد بجائے اس کے کہ تم یہ سمجھتے کہ ہم اپنے گندے اعمال کی وجہ سے اس غربت کو پہنچے ہیں اور خدا نے اس ذریعہ سے ہمیں ہوشیار کیا ہے اور آئندہ کے لئے نصیحت کر دی ہے کہ تمہیں اسراف نہیں کرنا چاہیئے بلکہ روپیہ کو محفوظ رکھنا چاہیئے تم نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ رَبِّیْٓ اَھَانَنِ ہماری تو عزت ہونی چاہیئے تھی مگر خدا تعالیٰ نے ہمیں رسوا کر دیا حالانکہ خدا تو تمہیں سبق دینا چاہتا تھا ورنہ تم نے ایسے کون سے کام کئے تھے کہ خدا تعالیٰ تمہیں عزت دیتا۔ یہ خدا تعالیٰ کا احسان تھا کہ اُس نے تمہیں نعمتیں دیں اور اس لئے دیں کہ تم غریبوں پر خرچ کرو مگر تم نے روپوں کو اپنی جیب میں ڈالا یتامیٰ و مساکین کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور شراب اور ناچ گانوں میں اپنی دولت کو برباد کرنا شروع کر دیا اور جب تمہاری دولت سب برباد ہو گئی تم یہ شور مچانے لگ گئے کہ خدا نے ہمیں رسوا کر دیا۔ بجائے اس کے کہ ان تمام حالات کو تم اصل روشنی میں دیکھتے تم نے اُلٹا اُسے غلط رنگ دے دیا۔ کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تمہاری حالت کس قدر گر چکی ہے۔ کتنی کمینگی اور بےحیائی تم میں پیدا ہو چکی ہے تم یتیموں کا مال لیتے ہو اور اُسے شیر مادر کی طرح ہضم کر جاتے ہو تمہیں ورثہ میں بڑی بڑی جائدادیں ملتی ہیں، زمینیں ملتی ہیں، کوٹھیاں ملتی ہیں، روپیہ ملتا ہے مگر تم وہ تمام جائداد عیاشی میں برباد کر دیتے ہو۔ باپ روپیہ کما کما کر تھک جاتا ہے اور تم صاحبزادے بنکر اُس کا سب مال اُڑا دیتے ہو اور پھر یہ کہتے ہو لوگ ہماری عزت نہیں کرتے۔ وہ تمہاری کیوں عزت کریں۔ جانتے ہیں کہ تمہارا بُرا حال ہے۔ بجائے اپنی جائداد کو بڑھانے کے اور بجائے غریبوں کی خبر گیری کرنے کے تم میں سے کوئی اچھے کھانے کھانے لگ جاتا ہے، کوئی اچھے لباسوں پر اپنا روپیہ برباد کر دیتا ہے، کوئی شراب میں مشغول ہو جاتا ہے، کوئی ناچ گانوں میں اپنی عمر ضائع کر دیتا ہے، کوئی عیاشی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر زبانوں پر یہ شکوہ ہوتا ہے کہ لوگ ہماری عزت نہیں کرتے۔ ہم اتنے بڑے تھے، اتنے بڑے خاندان میں سے تھے، معلوم نہیں کیا ہو گیا۔ وہ حیران ہوتے ہیں اور پھر خود ہی کہتے ہیں کہ ”کچھ اللہ دِتوں وگ گئی اے“ یعنی خدا کی طرف سے اُس کی لعنت کی مار ہم پر آ پڑی ہے ورنہ ہماری عزت میں کیا شبہ تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تمہارا باپ مالدار تھا تو تمہیں اس سے بھی اونچی سیڑھی پر چڑھنا چاہیئے تھا اگر اُس نے ایک ہزار روپیہ کمایا تھا تو چاہیئے تھا کہ تم دس ہزار روپیہ کماتے اور بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے خرچ کرتے نہ یہ کہ اس روپیہ کو تعیش میں برباد کر دیتے اور بھیک مانگنے لگ جاتے۔ تم نے خود اپنے نفس کی اہانت کی اور اپنے آپکو لوگوں کی نگاہ میں گرا دیا اس لئے تم خدا تعالیٰ کی نظر سے بھی گر گئے اور اسکے بندوں کی نظر سے بھی گر گئے۔ یا اگر تم پر تکلیف کی بعض گھڑیاں آئی تھیں تو اس لئے کہ تم ہوشیار ہو جاؤ اور اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرلو۔ مگر تم اور بھی نیچے پھسلتے چلے گئے۔

چونکہ لَمًّا کے معنے دوسرے کا حصہ لے لینے کے بھی ہیں اس لئے اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کو جو دولت ملتی ہے وہ صرف اُسی کا حصہ نہیں ہوتا اس میں دوسرے بنی نوع انسان کا بھی حصہ ہوتا ہے لیکن بعض لوگ اس دولت کو صرف اپنے نفس پر خرچ کر دیتے ہیں اور دوسروں کا حق کھا جاتے ہیں۔

**۱۵ حل لغات** - جَمًّا : اَلْجَمُّ کے معنے ہیں جَمًّا

اَلْکَثِیْرُ مِنْ کُلِّ شَیْئٍ بہت سی چیز (اقرب) نیز کہتے ہیں جَاءُوْا جَمًّا غَفِیْرًا اور معنے یہ ہوتے ہیں جَاؤُا بِجَمَاعَتِہِمْ اَلشَّرِیْفُ وَالْوَضِیْعُ وَلَمْ یَتَخَلَّفْ اَحَدٌ وَکَانَ فِیْہِمْ کَثْرَۃٌ یعنی سب لوگ اکٹھے ہو کر آ گئے چھوٹے بھی اور بڑے بھی۔ کوئی بھی پیچھے نہ رہا اور اسی طرح لوگوں کی کثرت ہو گئی (اقرب)

**تفسیر**۔ فرماتا ہے تمہاری حالت یہ ہے کہ تم مال کو لپیٹ کر بیٹھ جاتے ہو خدا تعالیٰ نے تو تمہیں اس لئے مال دیا تھا کہ تم اِسے تجارت میں لگاؤ یا صنعت و حرفت کو فروغ دو یا غریبوں کی خبر گیری کرو مگر تم اُسے بند کر کے بیٹھ جاتے ہو۔

اسی طرح اس کے یہ بھی معنے ہیں کہ تم مال سے ایسی محبت کرتے ہو کہ اچھے اور بُرے کی تمیز تم میں باقی نہیں رہی۔ تمہارے پاس حرام مال آتا ہے تو تم حرام لے لیتے ہو حلال آتا ہے تو حلال لے لیتے ہو۔ ادنیٰ چیز آتی ہے تو ادنیٰ لے لیتے ہو اعلیٰ چیز آئے تو اعلیٰ لے لیتے ہو۔ تمہیں صرف مال سے غرض ہوتی ہے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ وہ مال تمہیں ملا کہاں سے اور کس طرح سے۔

اوپر کی آیات میں چار امور بیان کئے گئے ہیں جو کفار میں پائے جاتے تھے اور یہی چار امور ایسے ہیں جن کی قومیں تباہ ہوتی ہیں۔

اوّل یتامیٰ کی خبر گیری نہ کرنا۔ فرماتا ہے ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جب انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی انعام ملتا ہے تو کہتے ہیں ہم خدا کے حضور خاص شان رکھتے ہیں اور جب اُن پر اس رنگ میں ابتلاء وارد ہوتا ہے کہ انکی مالی حالت ناقص ہو جاتی ہے اور اُن پر تنگدستی کے ایام آ جاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں خدا نے ہماری اہانت کر دی۔ گویا دونوں صورتوں میں وہ عزت اپنی طرف منسوب کرتے ہیں۔ عزت آتی ہے تو کہتے ہیں ہمارا اکرام ہونا ہی چاہیئے تھا اور اگر اہانت آتی ہے تو کہتے ہیں ہماری تو عزت ہونی چاہیئے تھی خدا نے غلطی سے ہمیں ذلیل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان امور کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ بات درست نہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ تمہاری تباہی کے سامان تمہارے اندر ہی موجود ہیں اور اُنہی کے ذریعہ سَوطِ عذاب نازل ہُوا کرتا ہے یعنی اندرونی طور پر بعض ایسی قوتیں ہوتی ہیں جو انسان کو تباہی کی طرف لے جاتی ہیں اور تباہی کے وہ سب موجبات تم میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر تم پر تباہی نہ آئے تو اور کس پر آئے۔ چنانچہ قومی تباہی کے چار بڑے بڑے اسباب بیان کئے گئے ہیں جن میں سے پہلا اور اہم سبب یتامیٰ کی خبر گیری نہ کرنا ہے۔ بظاہر یہ ایک روحانی اور دینی کام معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قومی ترقی اور اس کے تنزّل کے ساتھ اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اگر یتامیٰ کی خبر گیری نہ کی جائے، اُن کی پرورش کو نظر انداز کر دیا جائے اور انکو دربدر دھکّے کھانے پر مجبور کیا جائے تو دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ دنیا میں بڑے سے بڑے کام قربانی چاہتے ہیں اور جب تک بڑی بڑی قربانیاں نہ ہوں اُس وقت تک بڑے بڑے کام بھی نہیں ہوتے۔ اور بڑی بڑی قربانیاں دو ہی قسم کی ہوتی ہیں یا مالی یا جانی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں انسان اپنے لئے تو تکلیف برداشت کر لیتا ہے لیکن جب اُسے خیال آتا ہے کہ میرے بال بچوں کا کیا بنیگا تو بہت سے لوگ بُزدل بن جاتے ہیں اور قربانی کے میدان سے اپنے قدم کو پیچھے ہٹا لیتے ہیں۔ اگر کسی قوم میں یتامیٰ کی خبر گیری پوری طرح پائی جاتی ہو تو یہ ممکن ہی نہیں کہ جانی اور مالی قربانیوں کے وقت اس قوم کا کوئی ایک فرد بھی پیچھے رہے اور اپنے آپکو قربانی کے لئے پیش نہ کرے بلکہ وہ ہنستا ہوا آگے بڑھے گا اور ہر قسم کے شدائد کو خوشی سے برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائیگا۔ اگر لوگ روزانہ اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھیں کہ فلاں شخص مر گیا تو اُس کے یتیم بچوں کو فلاں لے گیا اور اُس نے اپنے بچوں کی طرح اپنے گھر میں رکھ لیا وہ اُن میں اور اپنے بچوں میں کوئی فرق نہیں کرتا، وہ اُنہیں تعلیم دلا رہا ہے، اُنہیں اچھے سے اچھا کھانا کھلا رہا ہے، اُنہیں اچھے سے اچھا لباس پہنا رہا ہے تو جب بھی قربانی کا سوال پیدا ہو گا ہر شخص آگے بڑھیگا۔

اور کہیگا اگر میری جان بھی جاتی ہے تو بے شک جائے مجھے اس کی پروا نہیں۔ فلاں شخص مرگیا تھا تو اُس کے بچے فلاں قومی بھائی لے گیا اور اُس نے اُنہیں اپنے بچوں کی طرح پالنا شروع کر دیا۔ فلاں شخص مرگیا تو اُس کے بچوں کو فلاں شخص لے گیا اور اُن کے اخراجات کا متکفل ہوگیا اگر میں بھی مرگیا تو کیا ہُوا میرے بچوں کی قوم نگران ہوگی اور وہ مجھ سے زیادہ بہتر رنگ میں انکی تربیت کا فرض سرانجام دیگی۔ یہ احساس اگر ہر فرد کے دل میں پیدا ہو جائے اور یتامیٰ کی خبرگیری قومی طور پر کسی جماعت میں پائی جائے تو وہ جماعت کبھی مٹ نہیں سکتی۔ وہ جماعت کبھی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرسکتی۔ قربانیوں سے ہچکچاہٹ محض اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم مرگئے تو ہمارے بچے خاک میں مل جائینگے اُن کا کوئی نگران نہیں ہوگا، اُن کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوگا، لوگ انہیں ڈانٹیں گے، اُن سے نوکروں کی طرح کام لیں گے، اُن کو بُوٹ کی ٹھوکروں سے مارینگے، اُنہیں کھانے کے لئے سُوکھے ٹکڑے اور پہننے کے لئے پھٹے پُرانے کپڑے دیں گے، اُن کے سروں پر محبت کا ہاتھ نہیں رکھیں گے، اُن کو پیار کی نگاہوں کر نہیں دیکھیں گے، اُنہیں بات بات پر جھڑکیں گے، وہ روئیں گے تو انہیں چپ کرانے کی کوشش نہیں کرینگے، اُنہیں ضرورتیں پیش آئیں گی تو وہ انکو پورا نہیں کریں گے۔ یہ خیالات جب کسی شخص کے دل اور دماغ پر حاوی ہوتے ہیں تو اُس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، اُس کا بدن کپکپا جاتا ہے اور وہ جان دینے سے گھبراتا ہے اور اس میدان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح مالی قربانی کا وقت آئے تو وہ گھبرا جاتا ہے اور اُسے اپنے بچوں کی پرورش کا خیال روپیہ بلا دریغ خرچ کرنے نہیں دیتا۔ اپنی زندگی تک تو اُسے پروا نہیں ہوتی سمجھتا ہے جس طرح بھی ہوگا میں اپنے بچوں کی پرورش کر لوں گا۔ لیکن ساتھ ہی اُس کے دل میں یہ خیال بھی آجاتا ہے کہ اگر مال لٹانے کے بعد میں مرگیا اور میرے بچوں کے لئے کوئی چیز باقی نہ رہی تو اُن کا بعد میں کیا حال ہوگا۔ اُس وقت اگر وہ سمجھتا ہے کہ قوم نے میرے بچوں کی پرورش نہیں کرنی تو وہ بُزدل بن جاتا ہے اور قربانی کیلئے تیار نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ ڈر انسان کو اپنی موت کا نہیں ہوتا بلکہ سب سے زیادہ ڈر اُسے اِس بات کا ہوتا ہے کہ میری موت کے بعد میرے بچوں کا کیا حال ہوگا۔ یہ ایک جذباتی سوال ہے جو اس کے اندر ایک کشمکش اور ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ اُس کے ارادوں میں تعطّل اور اُس کی خواہشات میں جمود کی کیفیت رونما ہو جاتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ قوم کے کئی بچے یتیم ہیں مگر ان کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دروازوں پر جا جا کر اپنے لئے آٹا مانگتے پھرتے ہیں یہ دیکھ کر وہ سمجھتا ہے اگر میں مرگیا تو میرا بچہ بھی کل اسی طرح بھیک مانگنے پر مجبور ہوگا۔ پھر وہ ایک اور نظارہ دیکھتا ہے تو اُس کا قلب اور بھی سہم جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ چند یتیم آٹا مانگنے کے لئے کسی کے دروازہ پر آئے انہوں نے دستک دی اور کہا ہمیں آٹا دیا جائے۔ گھر والا اُن کی آواز کو سنتا ہے تو بڑبڑا کر کہنے لگ جاتا ہے اِن لوگوں نے تو ہمارے کان کھالئے ہیں۔ روز آٹا روز آٹا۔ وہ یہ فقرہ سنتا ہے تو اُس میں اور زیادہ بُزدلی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے اگر میں مرگیا تو میرا بچہ اوّل تو بھیک مانگنے پر مجبور ہوگا اور پھر لوگوں کا سلوک اُس سے یہ ہوگا کہ وہ تو آٹا مانگیگا اور لوگ اُسے کہیں گے تُو نے ہمارے کان کھالئے۔ پھر وہ دیکھتا ہے کہ فلاں شخص مرگیا ہے تو اس کے یتیم بچے آج فلاں گھر میں برتن مانجھ مانجھ کر گذارہ کر رہے ہیں۔ وہ اپنی نظر کو وسیع کرتا اور اپنی قوتِ فکریہ پر زور ڈالتا ہے۔ تو کہتا ہے جب میں مرجاؤں گا میرے بچوں سے بھی اسی قسم کا کام لیا جائے گا۔ اِس پر اُس کی بُزدلی کا پارہ اور زیادہ اُوپر چڑھ جاتا ہے بلکہ اگر کوئی خود ہی یتیم پر ظلم کر رہا ہو تو بھی اُس میں بُزدلی آجاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے جو سلوک آج میں دوسروں کے یتیم بچوں سے کر رہا ہوں وہی سلوک میرے مرنے کے بعد لوگ میرے بچوں کے ساتھ کریں گے۔ پس یاد رکھو یتیم کی خبرگیری کرنا صرف نیکی اور تقویٰ ہی نہیں بلکہ قوم کے کیرکٹر کو بلند کرنا اور اُسے قربانیوں پر زیادہ سے زیادہ دلیر بنانا ہے۔

جو قوم یتامیٰ سے حسن سلوک نہیں کرتی وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

میں نے ایک دفعہ گھر میں نصیحت کی کہ یتامیٰ سے ایسا ہی سلوک کرنا چاہیئے جیسے اپنے بچوں سے کیا جاتا ہے۔ اگر اس رنگ میں اُن سے سلوک نہیں کیا جاتا تو قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تم نے کسی یتیم کی پرورش کی ہے میں نے کہا میں بعض یتامیٰ کا خرچ خود دیتا ہوں مگر پھر بھی میری بعض بیویاں اُن سے اس طرح کام لیتی ہیں جس طرح نوکروں سے کام لیا جاتا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ اُن سے بالکل کام نہ لیا جائے اگر اُن سے کام نہیں لیا جائے گا تو وہ آوارہ ہو جائیں گے میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اُن سے ایسا ہی کام لیا جائے جو اپنے بچوں سے بھی لے لیا جاتا ہے اور اگر کوئی کام ایسا ہو جو ہم اپنے بچوں سے کروانے کے لئے تیار نہ ہوں تو ہمیں وہ کام کسی یتیم سے بھی نہیں لینا چاہیئے۔ بہرحال میں نے گھر میں نصیحت کی کہ روپیہ تو میں دے دیتا ہوں مگر کام کی ذمہ داری تم پر ہے تمہیں چاہیئے کہ ایسے رنگ میں اُن سے کام مت لو گویا وہ تمہارے نوکر ہیں۔ میری اس نصیحت کے بعد اُمِ طاہر مرحومہ نے ایک یتیم بچہ پالا بعد میں تو اُس کی حالت ایسی اچھی ثابت نہیں ہوئی مگر بہرحال انہوں نے اُس بچے کو اُسی طرح پالا جس طرح وہ اپنے بچوں کو پالتی تھیں اور انہوں نے کسی قسم کا فرق پیدا نہ ہونے دیا۔

اس بارہ میں نہایت ہی اعلیٰ نمونہ عزیزم مرزا ظفر احمد نے دکھایا ہے جو میرے بھتیجے ہیں۔ بنگال کے وہ فاقہ زدہ لوگ جو لاکھوں کی تعداد میں وہاں ہلاک ہوئے ہیں اُن میں سے ایک کی یتیم بچی لے کر انہوں نے اُس کی پرورش شروع کی ہے اور اس عمدگی اور خوبی کے ساتھ وہ اُس کی پرورش کر رہے ہیں کہ اُس میں اور اُن کی اپنی لڑکی میں کوئی بھی فرق نظر نہیں آتا۔ وہ اُس کو مار پیٹ لیتی ہے اور یہ اُس کو مار پیٹ لیتی ہے، دونوں کے بالکل ایک جیسے کپڑے ہوتے ہیں، ایک جیسا دونوں کو کھانا کھلاتے ہیں، ایک جیسی دونوں کو تعلیم دلاتے ہیں اور ایک جیسی دونوں کی نگرانی رکھتے ہیں۔ . . . . . . . . . . . . . . . . . .

. . . . . ان کی لڑکی اُس لڑکی کو باجی کہتی اور اُس کا احترام کرتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے یتیم کا پالنا کہتے ہیں۔ یتیم کا پالنا یہ نہیں کہ کسی کو گھر میں نوکر کے طور پر رکھ لیا، سارا دن اُس سے کام لیتے رہے، کھانے کو اُسے روکھی سوکھی روٹی دیدی، پہننے کے لئے پھٹا پُرانا کپڑا دیدیا، ذرا غلطی ہوئی تو گالیاں دینے لگ گئے یا تھپڑوں سے اُس کی مرمت شروع کر دی اور پھر یہ خیال کر لیا کہ ہم یتیم کی پرورش کر رہے ہیں اِسے اسلامی اصطلاح میں قطعاً یتیم پروری نہیں کہا جاتا۔ یتیم پروری یہ ہے کہ انسان اپنے بچوں کی طرح دوسرے کے یتیم بچہ کو رکھے اور اپنے سلوک میں ذرا بھی فرق نہ آنے دے۔ محض کسی کو روٹی کھلا دینا اور بات ہے اور یتیم پروری اور چیز ہے۔ قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ۔ اے لوگو! تم یتیم کا اکرام نہیں کرتے تھے۔ یہ نہیں کہا کہ لَا تُطْعِمُوْنَ الْيَتِيْمَ اے لوگو! تم یتیم کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اگر محض کھانے کا ذکر ہوتا تو یہاں اکرام کا لفظ نہ ہوتا بلکہ اِطْعَام کا لفظ ہوتا۔ اکرام کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رکھا جانا صاف بتا رہا ہے کہ الٰہی منشاء یہ ہے کہ یتیموں کی ایسے رنگ میں پرورش کی جائے کہ اُن کا احترام مدنظر ہو یہ نہ ہو کہ صدقہ کے طور پر اُن کو روٹی دی جا رہی ہو۔

میں نے قادیان میں ایک دفعہ یتیم خانہ بنایا تو تھوڑے دنوں کے بعد ہی مجھے پتہ لگا کہ اُن یتیموں سے سارا سارا دن کام لیا جاتا ہے۔ کام لینا منع نہیں لیکن ہمیں اُن سے اُتنا ہی کام لینا چاہیئے جتنا ہم اپنے بیٹے سے کام لیتے ہیں یہ نہ ہو کہ ہمارا بیٹا تو آرام سے بیٹھا رہے اور کام کا بوجھ یتیم پر ڈال دیا جائے محض اس لئے کہ اُس کا باپ زندہ نہیں اُس کی ماں زندہ نہیں اور وہ اب دوسرے لوگوں کے رحم پر ہے اُسے بیٹوں کی طرح رکھا جائے، بیٹوں کی طرح اُس سے کام لیا جائے اور پھر اگر اُس میں اور اپنے بیٹوں میں کبھی لڑائی ہو جائے

تو بے شک یہ اُس کو مار پیٹ لیں اور وہ ان کو مار پیٹ لے اس وقت ماں اُسے یہ نہ کہے کہ خبردار میرے بیٹے پر ہاتھ اٹھایا تو تجھے مار مار کر سیدھا کردوں گی۔ اگر اس طرح کسی یتیم کو رکھا جائے تو بیشک کسی غلطی پر اُسے مار بھی لیا جائے اس میں کوئی حرج نہیں آخر ہم اپنے بچے کو بھی بعض دفعہ مار لیتے ہیں۔ پھر اگر کسی یتیم کو اس کی کسی غلطی پر بالکل اسی طرح جس طرح ہم اپنے بچوں کی اصلاح کیلئے انہیں مارتے ہیں اگر کبھی ماریں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں مگر بہرحال اس کی عزت نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے۔

قرآن کریم صرف یتامیٰ کو کھانا کھلانا ضروری نہیں سمجھتا بلکہ فرماتا ہے قومی ترقی کے لئے یہ نہایت ضروری امر ہے کہ یتیم کو عزت سے رکھا جائے اگر یتامیٰ کا اکرام قوم میں نہیں پایا جاتا تو خواہ تم ہزار بار لوگوں سے کہو کہ جاؤ اور خدا کی راہ میں مر جاؤ۔ جاؤ اور اپنی جانیں قربان کردو۔ وہ کہیں گے ہم چلے تو جائیں مگر ایسا نہ ہو کہ ہم مر جائیں اور ہمارے بچوں کو تکلیف اٹھانی پڑے لیکن اگر وہ یہ دیکھیں کہ ہماری زندگی اور ہماری موت بچوں کی پرورش کے لحاظ سے برابر ہے ہمارے مرنے کے بعد بھی یہ اسی طرح رہیں گے بلکہ موجودہ حالت سے بھی ہزار گنا بڑھ کر ان کی پرورش کے سامان ہوں گے تو بیشک تم قوم کے ایک ایک فرد کو کٹواتے جاؤ ایک ایک فرد کو مرواتے جاؤ کوئی ایک شخص بھی اپنے قدم کو پیچھے نہیں ہٹائیگا اور خوشی سے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کر دے گا۔ غرض یہ ایک نہایت ہی عظیم الشان مسئلہ ہے اور جب تک کسی قوم کے افراد اس کو پوری طرح نہ سمجھ لیں وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔

دوسری بات خدا تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ وَلَا تَحَاضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ تم آپس میں ایک دوسرے کو رغبت نہیں دلاتے کہ غریب آدمی کو کھانا کھلایا جائے۔ اگر غرباء کی خبر گیری نہ ہو تو قومی جنگوں میں کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی اور سپاہی بہت کم ملتے ہیں کیونکہ دنیا میں غرباء زیادہ ہوتے ہیں اگر سپاہیوں اور لڑنے والوں کے ذہن میں یہ ہو کہ ہماری قوم ہماری محسن ہے۔ ہم بیمار ہوئے تو اُس نے ہمارا علاج کیا۔ ہمارے پاس کپڑے نہ تھے تو اُس نے ہمارے لئے کپڑے مہیا کئے۔ ہم بھوکے تھے تو اُس نے ہمارے لئے غلّہ مہیا کیا۔ ہم حاجتمند تھے تو اُس نے ہماری حاجات کو پورا کیا۔ تو گو کمینے اور رذیل لوگ بھی ہر قوم میں پائے جاتے ہیں مگر بہرحال جو شریف ہونگے اور یہی طبقہ زیادہ ہوتا ہے وہ کہینگے جب قوم نے ہمارے ساتھ یہ احسان کیا ہے وہ احسان کیا ہے تو آج ہم قومی ضرورت کے وقت کیوں پیچھے ہٹیں ہم آگے بڑھیں گے اور قوم کے لئے اپنی جانوں کو قربان کردیں گے لیکن اگر وہ یہ سمجھتے ہوں کہ ہم بھوکے مرتے رہے مگر ہمیں کسی نے نہ پوچھا، ہم ننگے پھرتے رہے مگر کسی نے ہمارا ننگ نہ ڈھانکا، ہم بیمار ہوئے مگر کسی نے ہمارا علاج نہ کیا، ہم محتاج ہوئے مگر کسی نے ہماری احتیاج کو رفع نہ کیا۔ تو وہ کہیں گے ہمارے لئے قوم نے کیا کیا تھا کہ آج ہم اُس کے لئے قربانی کریں۔ وہ ہم سے بے اعتنائی کرتی رہی ہے آج ہم اُس سے بے اعتنائی کرینگے پس غرباء کی خبر نہ کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قربانی کا مادہ لوگوں کے دلوں میں سے کم ہو جاتا ہے اور قومی جنگوں میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

میں نے قادیان میں دیکھا ہے ہم کوشش کرتے ہیں کہ غرباء کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ ہم ان کے لئے کپڑے مہیا کرتے ہیں، اُن کے لئے غلّہ کا انتظام کرتے ہیں، انکی روپیہ سے امداد کرتے ہیں، انکو طبی امداد بہم پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور حتی الامکان اُنکی تکالیف کو زیادہ سے زیادہ کم کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد بھی گو کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو باوجود اس سارے انتظام کے جماعت پر اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں لوگوں کا کام صرف یہی ہے کہ اُن پر روپیہ خرچ کرتے چلے جائیں اُن پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ پھر بھی کثرت ایسی ہے جو محسوس کرتی ہے کہ یہ جماعت ہمارے لئے قربانی کر رہی ہے اس لئے قومی ضرورتوں کے وقت ہمیں بھی دوسروں سے زیادہ قربانی کرنی چاہیئے۔ چنانچہ وہ لوگ خود بھوکے ہوتے ہیں مگر جب کسی چندہ کی تحریک ہو مزدوری کر کے بھی اس میں ضرور حصہ لیتے ہیں اور

گو وہ اُس تحریک کے مخاطب نہیں ہوتے اور اُن پر کسی قسم کی ذمہ واری بھی نہیں ہوتی مگر چونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ قوم ہمارے لئے قربانی کرتی ہے اور وہ ہماری ضروریات کا خیال رکھتی ہے اس لئے وہ بھی قربانی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ قومی تحریکات میں حصہ دار بن جائیں۔ پس غرباء کی خبر گیری کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر قومی جنگ ہو جائے تو چونکہ قوم کی اکثریت غرباء پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے قوم کو کثرت سے کام کرنے والے مل جاتے ہیں۔ ایک کروڑ پتی کی تلوار صرف ایک تلوار کا کام دے سکتی ہے لیکن جنگوں میں ایک تلوار نہیں کروڑوں تلواروں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کروڑوں تلواریں اس وقت تک مہیا نہیں ہو سکتیں جب تک کروڑوں غرباء کے حقوق کا خیال نہ رکھا جائے اور انکو پوری طرح مطمئن نہ کیا جائے۔ اگر مساکین کے کھانے پینے کا خیال رکھا جائے تو یہ لازمی بات ہے کہ جب قوم پر کوئی مصیبت آئیگی شریف الطبع لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ قوم نے ہم پر احسان کیا تھا اب اُس پر مصیبت آئی ہے تو ہم اس کی مدد کریں۔ جیسے انگلستان امریکہ روس اور جرمنی وغیرہ ممالک میں موجودہ جنگ میں لاکھوں آدمی کام آئے اور انہوں نے اپنے آپکو قوم کیلئے قربان کر دیا۔ اس کی وجہ درحقیقت یہی ہے کہ ان قوموں میں غرباء کی پرورش کا احساس بہت زیادہ پایا جاتا ہے ہندوستان میں جو لوگ فوجی بنتے ہیں وہ یا تو اس لئے فوج میں بھرتی ہوتے ہیں کہ ان کے باپ دادا فوج میں کام کر چکے ہوتے ہیں اور یا پھر اس لئے جاتے ہیں کہ انکو بعد میں مربعے مل جائیں۔ قومی احساس ہندوستانیوں میں بہت کم ہوتا ہے۔

پھر اگر غرباء کے کھانے پینے کا خیال رکھا جائے تو اُن کے دلوں میں یہ احساس رہتا ہے کہ جو لوگ اپنے اموال میں ہماری ضروریات کا خیال رکھتے ہیں وہ فتوحات میں بھی ہمارا ضرور خیال رکھیں گے اور یہ بھی قوم کی ترقی کا ایک ذریعہ ہوتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ قومی اموال کی ترقی صرف امراء کو ہی نہیں بلکہ ہمیں بھی فائدہ پہنچائیگی۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اموال میں غرباء کے حقوق اس لئے بیان کئے ہیں كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (الحشر ع۱) تاکہ تم روپیہ کو اس طرح استعمال نہ کرو کہ وہ دولتمندوں میں ہی چکر لگانے لگے بلکہ غرباء کو بھی روپیہ ملے۔ پس غرباء کی خبر گیری کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں جتنی قوم ترقی کریگی اتنا ہی ہمارا حصہ بڑھتا چلا جائے گا لیکن اگر انکو حصہ نہ دیا جائے تو وہ کہتے ہیں ہمیں تو حصہ ملنا نہیں قومی اموال کی ترقی امراء کو ہی فائدہ دیگی اس لئے ہم اپنی جانوں کو کیوں ضائع کریں۔

تیسری چیز جس کا ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے وہ اَكْلِ تُرَاث ہے جو اسراف کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ جب کسی قوم میں اسراف پیدا ہو جائے تو وہ بھی یقینی طور پر تباہ و برباد ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا کہ تمہیں باپ دادا سے مال ملا مگر بجائے اس کے کہ تم اُسے ترقی دیتے اور اُسے بڑھانے کی کوشش کرتے تم نے اُسے تباہ کرنا شروع کر دیا۔ غرض اسراف بھی قومی تنزل کی ایک بہت بڑی علامت ہے اور اس کے دو بڑے نقصان ہوتے ہیں۔

اوّل یہ کہ انسان میں نکماپن پیدا ہو جاتا ہے۔ باپ دادا کی طرح اگر وہ کام کرتا تو نکماپن اس میں پیدا نہ ہوتا مگر وہ محنت کو صرف روٹی کمانے کا ایک ذریعہ سمجھ لیتا ہے اور جب اُسے باپ دادا کی جائداد پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے روٹی مل جاتی ہے تو وہ کوئی کام نہیں کرتا۔ جس قوم میں ایسے آدمی پیدا ہو جائیں کہ وہ کوئی کام نہ کریں وہ اس جونک کی طرح ہوتے ہیں جو جسم کا خون چوس لیتی ہے اور اس قابل ہوتے ہیں کہ انکی زیادہ سے زیادہ مذمت کی جائے۔ اگر کسی قوم میں ہزار لعل لوگ بھی کروڑ پتی ہوں لیکن وہ سب کے سب کام کر رہے ہوں اور اُن میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ ہو جس کے اندر نکماپن پایا جاتا ہو تو وہ قوم کبھی تباہ نہیں ہوتی۔ لیکن اگر ایک کروڑ پتی بھی ایسا ہے جو باپ دادا کی جائداد لیکر بیٹھ گیا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب مجھے کسی کام یا کسی محنت کی ضرورت نہیں محنت تو اس لئے کی جاتی ہے کہ روٹی ملے میرے پاس روٹی کا کافی سامان ہے میں کیوں محنت کروں تو اُس قوم کی تباہی کی بنیادی اینٹ وہ شخص اپنے ہاتھ سے

رکھنے والا ہوتا ہے۔ پس محض کسی کروڑپتی کا قوم میں پایا جانا اس کی بربادی کی علامت نہیں کیونکہ گو وہ کروڑپتی ہوگا مگر نکما نہیں ہوگا بلکہ کام کر رہا ہوگا۔ نکما وہ ہے جو کہتا ہے کہ باپ کا ایک کروڑ روپیہ میرے پاس ہے مجھے اب محنت کی ضرورت نہیں۔ مجھے اب کام کی ضرورت نہیں میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ باپ کے روپیہ پر تصرف رکھوں اور جس طرح جی میں آئے کروں۔ یوں تو انگلستان میں بھی کروڑپتی پائے جاتے ہیں مگر وہ لوگ ایسے ہیں کہ باوجود کروڑپتی ہونے کے محنت کرتے ہیں اور اپنے روپیہ کو برباد کرنے کی بجائے اُس سے کوئی نہ کوئی کارخانہ جاری کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پچاس، سو، دوسو یا ہزار دو ہزار آدمیوں کو مزدوری مل جاتی ہے اور وہ روپیہ قوم کی ترقی کے کام آتا رہتا ہے۔ بے شک وہاں بھی بعض ایسے لوگ ہیں جو بنکوں میں اپنا روپیہ جمع کر دیتے ہیں مگر زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو اپنے روپیہ سے کارخانے جاری کر دیتے ہیں یا بنکوں میں روپیہ جمع کر کے خود کسی سوسائٹی کے پریذیڈنٹ یا سیکرٹری بن جاتے ہیں اور اس طرح آنریری طور پر قومی خدمات سرانجام دیتے ہیں اس لئے وہ قوم تباہ نہیں ہوتی۔ اس جگہ ایسے لوگوں کا ذکر نہیں بلکہ نکمے امراء کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنے باپ دادا کے روپیہ کو کھاتے رہتے ہو اور خود ساری عمر نکماپن میں گذار دیتے ہو جس قوم میں ایسے منحوس لوگ پیدا ہو جائیں وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ دوسرے خواہ تم اچھا کہو یا بُرا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں وہ قوم میں ضرور عزت حاصل کر لیتے ہیں اور اس وجہ سے اُن سے اُتر کر اُن کی اولاد کو بھی کچھ نہ کچھ عزت قوم میں حاصل ہو جاتی ہے خواہ دنیا میں کتنی بغاوت ہو جائے، لوگ بالشوزم کے قائل ہو جائیں پھر بھی یہ بات کبھی مٹ نہیں سکتی کہ جب کوئی شخص قوم میں کوئی خاص اعزاز حاصل کر لیتا ہے تو کچھ نہ کچھ عزت اُس کی اولاد کو بھی مل جاتی ہے۔ یہ ایک فطرتی چیز ہے جس کو کوئی شخص بدل نہیں سکتا۔ جس نے کوئی نمایاں کام کیا ہوتا ہے اُس کی اولاد خواہ مستحق ہو یا نہ ہو مگر بہرحال اُس عزت کا کچھ نہ کچھ حصہ اولاد کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اب یہ لازمی بات ہے کہ جب ایسے لوگوں میں سستی پیدا ہو جائیگی تو چونکہ بڑے خاندان ہی لیڈر ہوتے ہیں اُن کی سُستی کا قوم پر یہ اثر پڑے گا کہ اس کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا جب وہ لوگ جنہیں قوم میں عزت حاصل ہو جن کے ہاتھ میں لیڈری کی باگ ڈور ہو، باپ دادا کی جائداد پر بیٹھے روٹیاں توڑ رہے ہوں تو یہ قدرتی بات ہے کہ اُس قوم میں لیڈر کم ہو جائیں گے۔ بے شک کچھ نئے لیڈر بھی بن جاتے ہیں مگر کچھ باپ دادا کی عزت اور خاندانی وجاہت کی وجہ سے لیڈر سمجھے جاتے ہیں اگر اُن میں اس قسم کی سُستی پیدا ہو جائے تو ایک قسم کے لیڈر ہی رہ جائیں گے دوسری قسم کے لیڈر نہیں رہیں گے اور اس طرح قوم کے راہنما محدود ہو جائیں گے

چوتھی چیز محبتِ مال ہے۔ مال کی محبت حلال و حرام کا امتیاز اُڑا کر انسان کو ظلم کی طرف مائل کر دیتی ہے جس شخص کے دل میں انتہائی طور پر مال کی محبت ہوگی وہ حلال اور حرام میں کوئی امتیاز نہیں کرے گا۔ حلال ذریعہ سے مال آئے گا تو اُسے بھی لے لیگا، حرام ذریعہ سے مال آئے گا تو اُسے بھی لے لیگا اور جس شخص میں حلال و حرام کا امتیاز نہ رہے وہ ظلم پر آمادہ ہو جاتا ہے اور جس قوم میں ظالم پیدا ہو جائیں اُس کا شیرازہ کبھی متحد نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک لازمی اور طبعی بات ہے کہ جب انتہائی طور پر مال کی محبت پیدا ہوگی حلال و حرام کی تمیز جاتی رہے گی اور جب حلال و حرام کی تمیز نہ رہے گی تو انسان ظلم سے بھی دریغ نہیں کرے گا اور جب قوم میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جن کو دوسروں کو لُوٹنے میں مزا آتا ہو تو وہ قوم کبھی پنپ نہیں سکتی۔

دوسرے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم صنعتی ترقی سے محروم رہ جاتی ہے۔ جس شخص کے دل میں مال کی شدید محبت ہو

وہ بعض دفعہ روپیہ کو کام پر لگانے سے ڈرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ شاید تجارت یا صنعت میں نقصان نہ ہو جائے بہتر یہی ہے کہ میں اس کو اپنے پاس محفوظ رکھوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کا مال بھی نہیں بڑھتا اور غرباء کے حقوق کا بھی اتلاف ہوتا ہے۔ فرض کرو دس ہزار روپیہ سے یہ ایک کارخانہ جاری کرتا اور بیس پچیس مزدور اُس کارخانہ میں کام کرنیوالا ہوتا تو بیس پچیس خاندان اُس کے روپیہ سے پرورش پانے لگ جاتے۔ آگے ایک خاندان میں اگر پانچ پانچ آدمی بھی فرض کر لئے جائیں تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ اُس نے دس ہزار روپیہ خرچ کر کے سَو سوا سَو لوگوں کے لئے مزدوری مہیا کی لیکن اگر وہ روپیہ خزانہ میں بند کر دیتا ہے تو سَو سوا سَو آدمیوں کی روٹی ماری جاتی ہے۔ اسی طرح اگر قوم میں دس ہزار مالدار ہوں اور وہ اپنے روپیہ کو خزانہ میں محفوظ رکھیں تو لاکھوں لوگوں کی مزدوری ماری جائیگی اور صنعتی لحاظ سے قوم کو شدید نقصان پہنچیگا۔ پس دوسرا نقصان مال کی محبت کا یہ ہے کہ قوم صنعتی لحاظ سے ترقی سے محروم رہ جاتی ہے۔

تیسرا نقصان یہ ہے کہ حُبِّ مال کی وجہ سے قومی چندوں میں کمی آجاتی ہے۔ جب بھی کوئی تحریک ہو مال کی محبت غالب آجاتی ہے اور قومی تحریکات میں حصہ لینے کے لئے انسان تیار نہیں ہوتا۔

چوتھے اس کا یہ بھی نتیجہ ہوتا ہے کہ جن کے دلوں میں مال کی محبت ہوتی ہے وہ قومی ایثار کے وقت دشمن کے غلبہ سے ڈر کر غدار بن جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (آل عمران ع ۱۴) لڑائی میں کبھی ایک کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے اور کبھی دوسرے کا۔ اونچ نیچ ضرور ہوتی رہتی ہے ایسی حالت میں وہ شخص جس کے دل میں مال کی محبت ہوتی ہے اگر اُسے ذرا بھی یہ پتہ لگے کہ دشمن غالب آنیوالا ہے تو وہ چوری چھپے دشمن کے ساتھ سازباز شروع کر دیتا ہے اور اپنی قوم سے غداری کرتا ہے محض اس لئے کہ اس کا مال محفوظ رہے۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ انگریز سُود لے کر بھی لُوٹتے ہیں اور سُود دے کر بھی لُوٹتے ہیں پھر اس کے متعلق ایک واقعہ سُنایا کرتے تھے۔ آپ فرماتے اودھ کی اسلامی حکومت اس طرح تباہ ہوئی کہ پہلے انگریزوں نے لوگوں میں یہ تحریک شروع کر دی کہ اگر تم ہمارے بنک میں اپنا روپیہ جمع کرو تو تمہیں اڑھائی فیصدی نفع دیا جائے گا۔ یہ لالچ اتنا بڑا تھا کہ لوگوں نے اپنا تمام روپیہ کلکتہ کے انگریزی بنک میں جمع کرا دیا۔ عورتوں نے اپنے زیورات تک بیچ ڈالے اور روپیہ انگریزوں کے حوالے کر دیا کیونکہ اُنہیں آئندہ کے متعلق بڑی بڑی امیدیں دلائی گئی تھیں۔ اُنہیں کہا گیا تھا کہ اگر تمہارا دس لاکھ روپیہ جمع ہوا تو تمہیں پچیس ہزار روپیہ سود دیا جائے گا اور پھر تمہارا اصل مال بھی بالکل محفوظ رہے گا جب تم مانگوگے روپیہ واپس دے دیا جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا سارے کا سارا روپیہ کلکتہ کے انگریزی بنک میں جمع ہو گیا اسکے بعد انگریزی فوج نے حملہ کر دیا۔ لکھنؤ جو اودھ کی حکومت کا دارالسلطنت تھا وہاں کے بڑے بڑے سرداروں کو انگریزوں نے کہہ دیا کہ خبردار! تم میں سے کوئی شخص بادشاہ کو یہ خبر نہ پہنچائے کہ انگریزی فوج حملہ کے لئے آرہی ہے اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا جو روپیہ بنک میں جمع ہے وہ ضبط ہو جائیگا۔ اُن غدار افسروں نے ایسا ہی کیا۔ بادشاہ مرغ لڑوا رہا تھا اور کنچنیوں کے ناچ گانے میں مشغول تھا کہ ایک شخص بول اُٹھا اور کہنے لگا کہ حضور سنا ہے انگریزی فوج آرہی ہے وہ افسر جو اندرونی طور پر انگریزوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے اُنہوں نے اُس کو ڈانٹنا شروع کر دیا اور بادشاہ سے کہا حضور کے اقبال کے سامنے انگریزوں کی کیا مجال ہو سکتی ہے یہ ایک بیوقوف شخص یونہی بول پڑا ہے۔ یہ حضور کے آرام اور مزے کا وقت تھا مگر اس نے سارا مزا خراب کر دیا انگریزوں کی کیا مجال ہے کہ وہ حضور کی شاہی کو کوئی نقصان پہنچا سکیں۔

غرض بادشاہ کو انہوں نے ناچ گانوں اور مرغوں کے

لڑوانے میں ہی مشغول رکھا اور انگریزی فوج
لکھنؤ کے اندر داخل ہوگئی الغرض محبتِ مال قوم میں غداری
پیدا کر دیتی ہے اس لئے اگر کوئی قوم ترقی کرنا چاہے
تو اُسے اپنے افراد کے قلوب میں سے مال کی محبت کو
مٹا دینا چاہیئے اس کے بغیر وہ حقیقی اور پائدار ترقی
حاصل نہیں کر سکتی۔

چونکہ یہاں کفار کا ذکر تھا اور اُنہیں یہ بتایا
جا رہا تھا کہ تم تباہ ہو جاؤ گے اس لئے اللہ تعالیٰ نے
ان آیات میں یہ مضمون بیان کیا کہ تمہاری تباہی کے
سامان کہیں باہر سے نہیں آئیں گے بلکہ تمہارے اندر
ہی تمہاری بربادی کے سامان موجود ہیں۔ لیکن
محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قوم کا ہر فرد
جانتا ہے کہ اگر میں لڑائی میں مارا گیا تو مجھ سے بڑھکر
شفیق باپ میرے بچوں کے لئے موجود ہے۔ بیکس جانتا
ہے کہ اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو طاقت
ملی تو مجھے کھانا ملے گا، مجھے کپڑا ملے گا، مجھے بیماری کے
وقت علاج میسر آئے گا اور مجھے فتوحات میں برابر کا
حصہ ملے گا۔ باپ دادا سے ورثہ حاصل کرنے والا جانتا
ہے کہ میں نے اپنے مال کو تلف نہیں کرنا بلکہ اُسے
قومی کاموں پر صرف کرنا اور اُسے پہلے سے بھی زیادہ
بڑھانا ہے تاکہ قوم کا قدم ترقی کی طرف بڑھے
تنزل کی طرف نہ جھکے۔ اور اگر کسی کے پاس مال ہے
تو وہ اس سے محبت نہیں رکھتا۔ چندے کے وقت سارے
کا سارا مال لے آتا ہے اور پھر اس بات کی احتیاط
رکھتا ہے کہ اُس کے مال میں کوئی حرام پیسہ نہ آجائے
جب ترقی کی تمام علامات محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
اور آپ کے ساتھیوں میں پائی جاتی ہیں اور تنزل
کی تمام علامات تم میں موجود ہیں تو تم یہ خیال ہی کس
طرح کر سکتے ہو کہ تم غالب آجاؤ گے اور مسلمان مغلوب
ہو جائیں گے۔ بے شک تعداد کے لحاظ سے تم زیادہ ہو
مگر بہت سی چڑیاں باز پر فتح حاصل نہیں کر سکتیں۔
تم میں سے ہر شخص وہ ہے جو یتامیٰ کی خبرگیری
نہیں کرتا اور اس لئے وہ انتہائی طور پر بزدل اور
ڈرپوک ہے۔ تم میں سے ہر شخص وہ ہے جو غرباء کی
اعانت نہیں کرتا اس لئے تمہیں قومی جنگوں کے وقت
کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ تم میں سے ہر شخص وہ ہے
جسے اپنے باپ دادا سے جب ورثہ میں روپیہ ملتا ہے تو وہ
اُسے عیاشی میں برباد کر دیتا ہے۔ تم میں سے ہر شخص وہ
ہے جس کے دل میں مال کی انتہائی محبت پائی جاتی ہے
اور اس وجہ سے جب قوم کے لئے مال کی ضرورت
ہو تم میں سے کوئی شخص روپیہ خرچ کرنے کے لئے
تیار نہیں ہوتا۔ جب تمہاری یہ حالت ہے اور مسلمانوں
کی وہ حالت تو یہ لازمی بات ہے کہ مسلمان جیتیں گے
اور تم ہارو گے۔

یہی چیز ہے جو ہماری جماعت کے افراد کو اپنے
مدنظر رکھنی چاہیئے۔ اگر ہماری جماعت ترقی کرنا چاہتی ہے
تو ضروری ہے کہ وہ یہ چار باتیں اپنے اندر پیدا کرلے
اور پوری مضبوطی کے ساتھ ان پر قائم رہے۔ اگر ہمارے
مبلغ اور ہمارے معلّم اور ہمارے صدر اس بات کو مدنظر
رکھیں کہ ہم نے یتامیٰ کی خبرگیری کرنی ہے ہم نے انکو صرف
کھانا ہی نہیں کھلانا بلکہ اُن کا اکرام کرنا ہے، اگر وہ سمجھیں
کہ ہم نے مساکین کو کھانے پینے کے لحاظ سے ہر قسم کی
تکالیف سے محفوظ رکھنا ہے، اگر وہ خیال رکھیں کہ ہم نے
لوگوں میں کام کرنیکی عادت پیدا کرنی ہے یہ نہیں ہو سکتا
کہ ہم میں سے کوئی شخص اپنے باپ دادا کی جائداد لے کر بیٹھ
جائے اور خود کوئی کام نہ کرے اگر ایک شخص کروڑپتی بھی ہو
مگر وہ صرف اپنے باپ دادا کی جائداد پر بیٹھا ہوا ہے خود
کوئی کام نہیں کرتا تو قوم کو اس کی ذرا بھی عزت نہیں کرنی
چاہیئے اُس کے متعلق یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ وہ بڑا رئیس
ہے بلکہ اُسے چوہڑوں اور چماروں سے بھی زیادہ ذلیل اور

كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ

خبردار! جب زمین ہلا کر ہموار کر دی جائے گی اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے اُس

صَفًّا صَفًّا ۝ وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ

کے ساتھ صف باندھے ہونگے ۱۵؎ اور اُس دن جہنم (قریب) لائی جائے گی اُس دن

يَّتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ۝

انسان نصیحت حاصل کرے گا مگر اب اُس کیلئے (نفع مند) نصیحت کہاں ۱۶؎

بدتر سمجھنا چاہیئے۔ اسی طرح اگر قوم میں کوئی شخص ایسا ہو جو مال سے محبت رکھتا ہو تو جماعت کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ وہ شخص ہے جو کسی وقت ہمارے لئے غدار ثابت ہو گا اور جب بھی اسے موقع ملیگا روپیہ کے ڈر کے مارے دشمن سے مل جائے گا۔ اگر یہ چار باتیں تم اپنے اندر پیدا کر لو تو چاہے تمہارے دشمن لاکھ ہوں، کروڑ ہوں، دس کروڑ ہوں وہ کروڑ یا دس کروڑ چڑیاں ہونگی اور تم اُن کے مقابلہ میں باز ہوگے۔

۱۵؎ **حل لغات** ۔ دُكَّتْ ۔ دَكَّ سے مجہول مؤنث کا صیغہ ہے اور دَكَّ الْأَرْضَ کے معنے ہیں سَوّٰى صُعُوْدَهَا وَهُبُوْطَهَا وَكَسَرَ حُفَرَتَهَا بِالتُّرَابِ وَسَوَّاهَا یعنی زمین کے اونچے نیچے کو برابر کر دیا (اقرب) پس دُكَّتِ الْأَرْضُ کے معنے ہوں گے جب زمین ہموار کر دی جائے گی۔

**تفسیر** ۔ فرماتا ہے كَلَّا تم میں یہ باتیں نہیں ہیں لیکن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپکی جماعت میں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں۔ تم خوب یاد رکھو جب زمین کو ہلایا جائیگا اور وہ وقت آئے گا جسکی اِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا (الزلزال) میں خبر دی گئی ہے اور خدائی فیصلے کا دن آجائے گا۔ اُس دن خدا اپنے فرشتوں کی صفوں کے ساتھ آئے گا یا خدا آئے گا اور فرشتے صفیں باندھے کھڑے ہوں گے۔ دونوں معنے ہوسکتے ہیں یہ بھی کہ فرشتے صفیں باندھے کھڑے ہوں گے اور یہ بھی کہ خدا فرشتوں کی صفوں کے ساتھ آئے گا۔

۱۶؎ **تفسیر** ۔ اَلْإِنْسَانُ سے مراد وہ انسان ہے جس کا اُوپر ذکر آچکا ہے اور جس کے متعلق بتایا جاچکا ہے کہ وہ یتامٰی کی خبرگیری نہیں کرتا۔ مساکین کو کھانا نہیں کھلاتا۔ باپ دادا کا مال برباد کر دیتا ہے اور مال سے بے جا محبت کرتا ہے فرماتا ہے اُس دن وہ انسان جس میں یہ چار خصلتیں پائی جاتی ہوں گی وہ چاہے گا کہ اپنی اصلاح کرے اپنی قوم کو منظم کرے۔ اپنے شیرازہ کو متحد کرے اور قومی تباہی سے محفوظ رہے مگر اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى قومی کیرکٹر سالہا سال کی محنت کے بعد پیدا ہوتے ہیں کس طرح ہوسکتا ہے کہ اِدھر خیال آئے اور اُدھر قومی کیریکٹر کا رُخ بدل جائے۔ اکرام یتیم کی عادت کسی جماعت میں ایک دن میں پیدا نہیں ہوسکتی بلکہ چالیس پچاس بلکہ سو سال کی جد و جہد کے بعد قومی طور پر جماعت کا ہر فرد اِس کیریکٹر کا مالک بنتا ہے۔ اسی طرح مساکین کی خبرگیری کا قومی طور پر احساس سالوں کی جد و جہد کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ یہی حال محبتِ مال کا ہے کہ وہ ایک دن میں نہیں جاتی بلکہ مدتوں کی کوششیں صفائی قلب کا موجب بنتی ہیں۔ پس فرماتا ہے اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى۔ اب اصلاح کا کہاں موقعہ ہے یہ چیزیں تو ایک لمبے عرصہ میں پیدا ہوتی ہیں اور تمہارا وہ عرصہ گذر گیا اب تو تم ہلاکت کے کنارے پر کھڑے ہو اب اصلاح اور درستیٔ احوال کا کونسا موقع ہے۔

دُكَّتْ

يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ۚ﴿۲۵﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ

وہ کہے گا کاش میں نے اپنی (اس) زندگی کیلئے کچھ آگے بھیجا ہوتا ۱۷ پس اُس دن اُس (یعنی خدا) کے عذاب جیسا

عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ۙ﴿۲۶﴾ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ۙ﴿۲۷﴾ يٰٓاَيَّتُهَا

کوئی عذاب نہ دے گا اور نہ اُس کی گرفت جیسی کوئی گرفت کرے گا ۱۸ اے

النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ﴿۲۸﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۚ﴿۲۹﴾

نفس مطمئنہ اپنے رب کیطرف لوٹ آ (اس حال میں کہ تو اُسے) پسند کرنیوالا بھی (ہے) اور اس کا پسندیدہ بھی (ہے) ۱۹

**۱۷ تفسیر** - اُس دن اُسے اِس امر پر افسوس ہوگا کہ کاش میں اعلیٰ اخلاق پیدا کرکے اپنی جماعت کو مضبوط کرتا مگر اُس دن کی خواہش نفع نہیں بخش سکتی وہ وقت تو اُسکی تباہی کا ہوگا۔

**۱۸ حل لغات** - يُوْثِقُ: اَوْثَقَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور اَوْثَقَهٗ فِی الْوَثَاقِ کے معنے ہوتے ہیں شَدَّهٗ بِهٖ اس کو رسّہ میں یا کسی اور باندھنے والی چیز میں جکڑ دیا (اقرب) پس لَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ کے معنے ہوں گے اُس جیسا کوئی نہیں باندھے گا۔

**تفسیر** - فرماتا ہے جس طرح تم نے ایسے ایسے عذاب ہماری جماعت کو دئے جنکی مثال نہیں ملتی اِسی طرح ہم تمہیں بھی اُس دن ایسا عذاب دیں گے جس کی مثال نہیں ملتی اور جس طرح تم نے مومنوں کو کئی قسم کی قیدوں میں ڈالا تھا اُسی طرح ہم بھی تمہیں قیدوں میں ڈالیں گے۔ قید سے مراد یہاں صرف قید ہی نہیں بلکہ کاموں سے الگ کر دینا یا اور کئی رنگ میں اُن کو جکڑ کر تکلیف پہنچانا بھی اس میں شامل ہے۔ فرماتا ہے جس طرح تم نے ہمارے مامور کی جماعت کو باندھ باندھ کر دُکھ دئے تھے اسی طرح ہم بھی تم کو ایسا باندھیں گے کہ کبھی کسی کو نہ باندھا ہوگا۔

**۱۹ تفسیر** - نفس مطمئنہ سے مراد وہ نفس ہے جس میں اوپر کی بیان کردہ چاروں خوبیاں پائی جاتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ جس قوم میں یہ چار خوبیاں پیدا ہو جائیں وہ ہر قسم کے تنزل اور ادبار کے خوف سے مطمئن ہو جاتی ہے۔ جب یتیم پروری کا مادہ قوم کے ہر فرد کے دل میں پیدا ہو جائے انہیں اپنی موت کا کیا گھبراہٹ پیدا ہو سکتی ہے یا جب مساکین کی خبرگیری کا احساس ہر شخص کے دل میں پیدا ہو جائے اور وہ ایک دوسرے کو اس کی تحریک کرتے رہتے ہوں تو قومی جنگوں کے وقت انہیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ مساکین جن کا بوجھ قوم اٹھا رہی ہوگی آگے بڑھیں گے اور ہر قسم کی تکلیف کو خوشی سے برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے وہ سمجھیں گے کہ جب قوم ہمارا خیال رکھتی ہے، ہمارے لئے کھانا مہیا کرتی ہے، ہمیں کپڑے پہناتی ہے، ہماری ضروریات کو پورا کرتی ہے تو اب ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم قومی مصیبت میں اُس کا ہاتھ بٹائیں اور اس کی عزت کو برقرار رکھنے میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ یا جب اسراف کی عادت قوم کے کسی فرد کو نہیں ہوگی تو نکما پن اُن میں کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اُن کو خواہ لاکھوں کی جائداد مل جائے انہیں محنت سے کوئی عار نہیں ہوگی اور جن لوگوں کو محنت سے عار نہ ہو جو کروڑپتی ہونے کے باوجود خود کما کر کھانے کے عادی ہوں یا روپیہ کو قومی ضروریات پر صرف کرتے ہوں اُن کا وجود قوم کیلئے ترقی کا ہی باعث ہو سکتا ہے تنزل کا باعث نہیں ہو سکتا یا جب اُن کے دلوں میں مال کی محبت نہیں ہوگی تو غدّاری کرنے والے لوگ اُن میں کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں اور اُنہیں اپنے متعلق کیا گھبراہٹ ہو سکتی ہے وہ قوم یقیناً مطمئن

يُوْثِقُ

ع ۱
۱۴

فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝

پھر (تمہارا رب تمہیں کہتا ہے کہ) میرے (خاص) بندوں میں داخل ہوجا ۝۲۰ اور (آ) میری جنت میں بھی داخل ہوجا ۝۲۱

ہوگی جان کی قربانی کا سوال آئیگا تو لوگ کہیں گے ہمیں اپنی جانوں کی پرواہ نہیں۔ ہماری قوم یتیموں کی پرورش کرے گی۔ اگر مال کی قربانی کا سوال آئے گا تو لوگ کہینگے ہمیں اپنے مالوں کی پرواہ نہیں۔ ہماری قوم وہ ہے جو اپنے مساکین کا خیال رکھتی ہے اس لئے ہم ہر خطرہ سے بے نیاز ہوکر قربانی کی آگ میں اپنے آپ کو جھونکنے کے لئے تیار ہیں اور ہمیں اپنے عواقب سے پوری طرح اطمینان ہے۔

قومی ترقی کا یہی نکتہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ اے نفس مطمئنہ یعنی پہلا انسان تو وہ تھا جس میں یہ چار خصلتیں مفقود تھیں مگر تُو وہ ہے جس میں یہ چاروں خوبیاں پائی جاتی ہیں اس لئے تجھے نفس مطمئنہ حاصل ہوا ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ اے میرے بندے تونے دنیا میں رہ کر وہ کام کر لیا جس کے لئے میں نے تجھے پیدا کیا تھا اس لئے تُو بھی خوش ہے کہ میں نے کام کرلیا اور ہم بھی خوش ہیں کہ تُونے کام کر لیا۔ تُو ہم سے خوش ہے اور ہم تجھ سے خوش ہیں۔

**۲۰ تفسیر**۔ فرماتا ہے اب تو ہمارے بندوں میں داخل ہوجا یعنی جس طرح انسان اپنے ماتحت افراد یا اپنی مملوکہ اشیاء کی حفاظت کرتا ہے اسی طرح اب تجھ پر حملہ کرنا مجھ پر حملہ کرنا ہے۔ تجھے دُکھ دینا میری غیرت کو بھڑکانا ہے۔ تو میرے غلاموں میں داخل ہوگیا ہے اب کسی کی مجال نہیں کہ وہ تجھ پر ہاتھ ڈال سکے۔ اگر اس کے بعد بھی کسی شخص نے تجھ کو غلام بنانا چاہا تو چونکہ تُو میرا غلام ہے اس لئے میں خود اُس سے لڑوں گا اور اُسے اس اہانت کی سزا دوں گا۔

**۲۱ تفسیر**۔ دنیا میں لوگ غلاموں سے بڑی بڑی خدمتیں لیتے اور اُنہیں کئی قسم کے عذابوں میں مبتلا رکھتے ہیں مگر فرماتا ہے جو میرا غلام بن جائے میں اُسے اپنی جنت میں لے جاتا ہوں۔ تو چونکہ میرا غلام بن گیا ہے اس لئے اے میرے بندے آ اور میری جنت میں داخل ہوجا۔

# سُوْرَۃُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ

سورة البلد یہ سورة مکی ہے [۱]

## وَهِيَ عِشْرُوْنَ اٰيَةً دُوْنَ الْبَسْمَلَةِ وَفِيْهَا رُكُوْعٌ وَّاحِدٌ

اور اس کی بسم اللہ کے علاوہ بیس آیات ہیں اور ایک رکوع ہے۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

[۱] سورة البلد کے متعلق حضرت ابن عباس رض اور ابن زبیر رض کہتے ہیں کہ یہ سورة مکی ہے۔ لطف یہ ہے کہ مسیحی مصنفین میں سے پادری ویری تک کہتے ہیں۔ تغلیط کے خطرہ بغیر اس اطمینان اور یقین کے ساتھ کہ ہم کبھی غلطی کا ارتکاب نہیں کر رہے۔ نہ تاریخی واقعات کے خلاف ہم کسی رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ پہلے سال کی ہے۔ گویا وہ اس کے ابتدائی ہونے پر اتنے مصر ہیں کہ اسے نہ صرف ابتدائی مکی سورتوں میں شمار کرتے ہیں۔ بلکہ پہلے سال کی نازل شدہ بتاتے ہیں۔ اگر ایسا ہو۔ تو اس کا مضمون اور بھی معجزانہ ہے۔ مگر میرے نزدیک اس سورة کا ان مضامین سے تعلق ہے جن مضامین کی پہلے تین سورتیں گذر چکی ہیں اور جو تیسرے یا چوتھے سال بعد نبوت کی ہیں۔ اس بناء پر یہ سورة بھی میرے نزدیک تیسرے سال کے آخر یا چوتھے سال کے پہلے چند ماہ کی ہے اور پہلی سورتوں کے زمانہ کی ہی ہے۔

اس سورة کا تعلق پہلی سورتوں سے یہ ہے کہ پہلی سورتوں میں ظلم کے ابتدائی خبر دی گئی تھی۔ اور یہ بتایا گیا تھا کہ مسلمانوں کے خلاف کفار کی طرف سے منظم کوششیں شروع ہونے والی ہیں۔ پھر یہ بتایا تھا کہ وہ کوششیں بڑی تکلیف دہ ہونگی۔ اور ایک لمبے عرصہ تک (جو دس سال تک ممتد ہوگا۔) یہ کوششیں جاری رہیں گی۔ پھر اس کے ازالہ کی صورت پیدا ہوگی۔ اس کے بعد پھر کچھ تکلیف ہوگی مگر صرف کچھ عرصہ تک رہیگی۔ اس کے بعد فجر کا طلوع شروع ہوجائیگا۔ اب اس سورة میں اللہ تعالیٰ ظلم کے مقام کو واضح کرتا ہے۔ اسی طرح ظلم کی بعض اور تفصیلات کو بیان کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ یہ ظلم مکہ میں ہی شروع ہوگا۔ ہوسکتا تھا کہ چونکہ اسوقت تک مسلمانوں پر ظلم نہیں ہوا تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ رض کے رشتہ دار مکہ میں موجود تھے۔ یہ خیال کرلیا جاتا۔ کہ لیالی عشر کی پیشگوئی کا جو ظہور ہونے والا ہے ممکن ہے اس رنگ میں ہو۔ کہ بعض اور علاقوں میں اسلام پھیلے اور وہاں مسلمانوں پر مظالم شروع ہوجائیں۔ اس خیال کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ مکہ سے باہر بھی اکے دکے لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کردیا تھا۔ اور ذہن اس طرف جاسکتا تھا کہ ممکن ہے عرب کا کوئی اور حصہ ہو جس میں ان مظالم کا آغاز ہونے والا ہو۔ یا کوئی اور لوگ ہوں جن کو مصائب وآلام کا تختۂ مشق بنایا جانے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورة میں ایسے شبہات کی تردید کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ تمہارا یہ خیال صحیح نہیں۔ یہی مکہ جس میں تم رہتے ہو۔ جس میں تمہارے عزیز اور رشتہ دار موجود ہیں۔ اور جس میں کفار کی طرف سے مظالم شروع ہونے کا تمہارے دلوں میں خیال تک بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی مکہ

سورة البلد مکی ہے [۱]

سورة البلد کا تعلق پہلی سورتوں سے [۱]

# لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝

نہیں نہیں ایسا نہیں جیسا تم سمجھتے ہو) مَیں تو قسم کھاتا ہوں اس شہر کی ؎[2]

میں ان کی طرف سے یہ افعال ہونگے۔ اور اسی شہر میں تم پر مظالم کے تیر برسائے جائینگے ؂

لا اقسم [2]

؎[2] **تفسیر** لا کے متعلق نحوی لکھتے ہیں کہ فِیْہِ وَجْھَانِ اَحَدُھُمَا ھِیَ زَائِدَۃٌ کَمَا فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی لِئَلَّا یَعْلَمَ یعنی اس آیت میں جو لا آتا ہے۔ اس کے متعلق دو باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ زائدہ ہے جیسے قرآن کریم میں ہی آتا ہے لِئَلَّا یَعْلَمَ تاکہ وُہ نہ جانے اور مراد یہ ہے کہ وُہ جان لے۔

اِس جگہ یاد رکھنا چاہیئے کہ زائدہ سے اردو والا زائد مراد نہیں۔ اردو میں زائد کے اور معنی ہوتے ہیں۔ اور عربی میں نحویوں کے نزدیک زائد بالکل اور معنی رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک زائد کے معنی صرف اتنے ہوتے ہیں۔ کہ یہ لفظ اپنے لغوی معنوں میں استعمال نہیں ہوُا۔ بلکہ صرف مضمون کی تاکید کے معنی دیتا ہے۔ پس نحوی جب کسی لفظ کے متعلق یہ کہیں کہ وُہ زائد ہے تو اس سے ان کی مراد صرف اتنی ہوتی ہے۔ کہ لغت کے لحاظ سے جن معنوں میں عام طور پر یہ لفظ استعمال ہوُا کرتا ہے۔ ان معنوں میں یہ استعمال نہیں ہوُا بلکہ تاکید کے معنی دیتا ہے۔ عربی زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ وُہ کئی قسم کے فلسفیانہ نکتے اپنے اندر رکھتی ہے۔ چنانچہ یہ قاعدہ ایک فلسفیانہ اصل کے ماتحت بنایا گیا ہے انسانی فطرت میں یہ داخل ہے۔ کہ جب عام رسم ورواج کے خلاف کوئی بات کہی جائے۔ تو انسان کی توجہ ادھر پھر جاتی ہے۔ مثلاً بچے کو بعض دفعہ باتوں باتوں میں انسان کہہ دیتا ہے۔ "او شریر" اب ہر شخص جانتا ہے۔ کہ اس وقت اسے گالی دینا مدنظر نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف اس کی چالاکی کا اظہار مدنظر ہوتا ہے۔ مگر اس کے لئے شریر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کے معنے صرف اتنے ہوتے ہیں کہ تیرے افعال میں ایک حدت اور تیزی پائی جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وُہ حدت اور تیزی اعلیٰ اخلاق یا صحیح مذاق کے خلاف ہو۔ اسی طرح ماں کے سامنے بعض دفعہ بچہ ایسے انداز سے آتا ہے۔ کہ وُہ سمجھتی ہے اب یہ ضرور مجھ سے کوئی چیز مانگیگا وہ اسے دیکھتی ہے اور مسکراتے ہوئے کہتی ہے "شریر" اب اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ تُو بہت بُرا ہے۔ بلکہ اس کے معنی صرف اتنے ہوتے ہیں کہ مَیں جانتی ہوں۔ تم میری محبت کو کھینچ رہے ہو۔ اور چاہتے ہو کہ میرے جذبات میں ہیجان پیدا کرکے چیز حاصل کرسکو۔ اور یہ بات بُری نہیں بلکہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ انسان روزانہ دعائیں مانگتا ہے۔ اور عجیب عجیب رنگ میں خدا تعالےٰ کے فضل اور اس کے رحم کو حرکت میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے خدایا میں نے فلاں کام محض تیری رضا کے لئے کیا تھا۔ اگر وُہ کام تیری نگاہ میں پسندیدہ ہے۔ اور تو جانتا ہے کہ میری نیت اور ارادہ اس کام کو کرنے سے محض یہ تھا۔ کہ تیری رضا اور خوشنودی مجھے حاصل ہو جائے۔ کوئی اور غرض میرے سامنے نہیں تھی۔ تو اے میرے رب اس نیکی کے عوض میری فلاں حاجت کو پُورا فرما دے۔ کبھی خیال کرتا ہے۔ کہ اگر میں اپنی مسکنت اور غربت خدا تعالےٰ کے سامنے پیش کرونگا۔ تو اس کا رحم جوش میں آجائیگا۔ اور اس کا فضل میری مشکل کشائی کا موجب بن جائیگا۔ چنانچہ اس خیال کے آنے پر وُہ اپنے عجز اور اپنی بیکسی کو خدا تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور کہتا ہے خدایا میرا تو تیرے سوا کوئی والی اور مددگار نہیں۔ میں اکیلا ہوں۔ میں بے کس اور بے بس ہوں۔ میری تیرے سوا اور کسی پر نظر نہیں۔ اگر تو مجھ پر رحم نہیں کریگا۔ تو اور کون کریگا۔ تو میری مدد فرما۔ اور میری مشکلات کو دُور کر۔ کیونکہ تیرے سوا میرا کوئی نامراد

مددگار نہیں۔ اب یہ چالاکی نہیں ہے۔ نہ اسے شرارت اور بددیانتی کہتے ہیں۔ بلکہ ہر شخص جانتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کو کھینچنے اور اس کے رحم کو جوش میں لانے کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال اثر رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک ماں جب اپنے بچہ کو شریر کہتی ہے۔ اس وقت اسے غضب نہیں آتا۔ بلکہ مزا آتا ہے۔ اور اس کا جی چاہتا ہے۔ کہ وہ اسے جتائے۔ کہ یہ کتنا ہوشیار ہے۔ اور اس نے اپنے مقصد کو کس ڈھنگ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تو فطرت انسانی میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ کہ کبھی کوئی بُری بات بظاہر متضاد کہی جاتی ہے۔ اور اس سے مراد دوسرے کی توجہ کو کھینچنا ہوتا ہے۔

پنجابی زبان میں بھی بعض دفعہ ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ جن کا مفہوم ان کے ظاہر کے خلاف ہوتا ہے۔ مثلاً بعض دفعہ باتیں کرتے ہوئے ایک شخص دوسرے سے کہہ دیتا ہے "چھڈ دی" یعنی مجھے چھوڑ دیں۔ حالانکہ اس نے اسے پکڑا نہیں ہوتا۔ نہ اس کا خود یہ مطلب ہوتا ہے۔ کہ تُو نے مجھے کیوں پکڑ رکھا ہے۔ مجھے چھوڑ دتا کہ میں جاؤں بلکہ یہ ایک طریق ہے۔ جو شدت سے دُوسرے کو کسی بات سے روکنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح نحوی کہتے ہیں کہ جب کسی بات کی طرف دوسروں کی توجہ کو مبذول کرنا ہو۔ اور منشا یہ ہو کہ تاکید کی جائے۔ تو الٹ بات کہدی جاتی ہے۔ حالانکہ مفہوم اور ہوتا ہے۔ جیسے ماں بعض دفعہ اپنے بچہ کو شریر کہہ دیتی ہے۔ مگر اس کا منشا یہ نہیں ہوتا کہ کسی ناراضگی کا اظہار کرے۔ بلکہ وُہ اپنی محبت کے اظہار کے لئے یہ لفظ استعمال کرتی ہے۔ اور وُہ جانتی ہے۔ کہ جتنی محبت "شریر" کہہ کر ظاہر ہو سکتی ہے۔ اتنی محبت کسی پیار کے لفظ سے ظاہر نہیں ہو سکتی۔ گو وُہ اسے کہتی "شریر" ہے۔ مگر اس کے چہرے کی بناوٹ۔ اس کے ہونٹوں کی حرکت اور اس کی آنکھوں کی چمک ظاہر کر رہی ہوتی ہے۔ کہ وہ محبت میں گھلی جا رہی ہے۔

غرض لَا کے متعلق نحوی کہتے ہیں۔ کہ یہ زائدہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اصل معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ محض مضمون کی تاکید کے لئے استعمال ہُوا ہے۔ بلکہ اور معنوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا "نہیں نہیں" یہ الفاظ ایسے ہیں کہ انسان ان کو سنتے ہی حیران ہو جاتا ہے۔ اور فوراً اس کی توجہ پھر جاتی ہے۔ کہ یہ "نہیں نہیں" کیوں کہا جا رہا ہے۔ اگر صرف اُقْسِمُ سے آیت کا آغاز کیا جاتا ہے اور لَا کا استعمال نہ کیا جاتا۔ تو اُقْسِمُ کے بعد لوگوں کو توجہ پیدا ہوتی۔ اور وُہ سمجھتے کہ ان کے سامنے کونسی شہادت رکھی جا رہی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی فرما دیا کہ لَا - "نہیں نہیں" اور باتوں کو چھوڑ اور جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اسے سنو۔ اس "نہیں نہیں" کو سنتے ہی ہر شخص فوراً متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور وُہ چاہتا ہے کہ میں معلوم کروں کہ کیا بات ہے اور "نہیں نہیں" کس بات پر کہا جا رہا ہے۔ گویا لوگوں کی توجہ کو جذب کرنے اور ان پر اصل حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے اُقْسِمُ کی بجائے لَا سے اس سورۃ کا آغاز کیا۔ تا کہ اُقْسِمُ کے بعد توجہ پیدا نہ ہو۔ بلکہ اس سے پہلے لَا کے سنتے ہی ہر شخص متوجہ ہو جائے۔ بعض نحویوں نے کہا ہے کہ یہ لَا زائدہ نہیں بلکہ معنی رکھتا ہے۔ اور پھر وہ اس کی دو قسمیں کرتے ہیں اَحَدُهُمَا هِيَ نَفْيٌ لِلْقَسَمِ بِهَا کچھ لوگ تو کہتے ہیں۔ کہ یہ نفیٔ قسم کے معنوں میں ہے۔ یعنی لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے معنی یہ ہیں۔ کہ ہم اس شہر کی قسم نہیں کھاتے۔ مگر چونکہ سوال پیدا ہوتا تھا۔ کہ قسم کی نفی یہاں کیوں کی گئی ہے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ یہاں قسم کی نفی اس لئے کی گئی ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ہم جو بات کہتے ہیں وُہ اتنی صاف اور واضح ہے۔ کہ اس کے لئے کسی قسم کی ضرورت نہیں۔ وَالثَّانِي اَنَّ لَا رَدٌّ لِكَلَامٍ مُقَدَّرٍ۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ لَا ایک کلام مقدر کا رد ہے۔ یعنی کوئی اعتراض ہے جس

۲۱؎ لَا اقسم بھذا البلد میں لفظ لَا کے لانے کی غاصلی

کلّا کے ذریعہ رد کیا گیا ہے۔ یہ مقدر کلام دو طرح نکلتا ہے۔ ایک آیت کے مفہوم سے اور ایک پہلی سورۃ کے مضمون سے یعنی یا تو یہ مقدر کلام آیت کے مفہوم سے نکلیگا۔ اور یا پھر مقدر کلام وہ ہوگا۔ جس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ چنانچہ اس سورۃ میں انہوں نے مقدر کلام پہلی سورۃ کے مضامین سے اخذ کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کلّا کا مفہوم یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں جو باتیں تمہاری طرف سے پیش کی گئی ہیں وہ بالکل غلط ہیں اصل بات اور ہے۔ اور یا ہماری طرف سے بیان کردہ پہلی باتوں کے خلاف جو لوگ اعتراضات کر رہے ہیں۔ وہ غلط ہیں۔ اور ہم انکی تردید کرتے ہیں۔ بہرحال انہوں نے کلّا کو ایک کلام مقدر کا رَدّ قرار دیا ہے۔ اور کلام مقدر انہوں نے اس جگہ اَنْتَ مُفْتَرٍ نکالا ہے۔ یعنی ان لوگوں کا قول یہ ہے۔ کہ وہ کفار جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہا کرتے تھے۔ کہ تو مفتری ہے۔ ان کا رَدّ اس جگہ کیا گیا ہے۔ اور اصل آیت یوں ہے کلّا۔ اَنْتَ لَیْسَ بِمُفْتَرٍ نہیں نہیں یہ بات بالکل غلط ہے کہ تو مفتری ہے۔ تو مفتری نہیں بلکہ ہمارا سچا رسول ہے۔ اور ہم اس بات کی شہادت کے طور پر اس کو شہر کو پیش کرتے ہیں۔

میرے نزدیک کلّا۔ اَنْتَ مُفْتَرٍ کے جواب میں نہیں بلکہ اسی مضمون کے جواب میں ہے۔ جو پہلی سورتوں کے جواب میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی مخالفین نے اپنے ذہن میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی جماعت کی تباہی کے منصوبے سوچنے شروع کردئیے تھے۔ اور گو ابھی تک انہوں نے ان منصوبوں کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ مگر انکے اذہان میں یہ بات بڑھتی جارہی تھی۔ کہ اب اسلام کو کچلنے اور اس کی ترقی کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور چونکہ انہوں نے مخفی منصوبے کئے تھے میرے نزدیک ان کے ان مخفی خیالات کو قرآن کریم نے بھی ایک اخفا کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اور کلّا کہہ کر ایسے رنگ میں ان کو ظاہر کیا ہے۔ کہ کفار کو اشاروں اشاروں میں بتا دیا جائے کہ ہمیں تمہارے ان منصوبوں کا علم ہے۔ مگر تم یاد رکھو کہ اپنے ان منصوبوں میں تم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ یہ طریق اللہ تعالیٰ نے سورۃ الغاشیہ سے ہی اختیار کیا ہے۔ چنانچہ پہلے یہ خبر دی۔ کہ کچھ لوگ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ بننے والے ہیں۔ پھر سورۃ الفجر میں خبر دی۔ کہ مسلمانوں پر دس تاریک راتیں آنے والی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اس جگہ ابھی کفار کے ارادوں کو ظاہر نہیں کرتا۔ صرف اشاروں اشاروں میں ان کا ذکر کرتا ہے۔ ظاہر اس لئے نہیں کرتا۔ کہ دشمنوں نے بھی ابھی کھلم کھلا مخالفت شروع نہیں کی تھی۔ صرف مخفی منصوبے اسلام کے خلاف کر رہے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی مخفی رنگ میں ان کے منصوبوں کا ذکر کر دیا۔ اگر ان باتوں کو ظاہر کیا جاتا۔ تو سمجھا جاتا۔ کہ مسلمانوں نے ابتدا کی ہے۔ اور انہوں نے خود کفار کو برانگیختہ کیا ہے۔ پس چونکہ اللہ تعالیٰ ابھی کفار کے منصوبوں کو کھلے طور پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے کہہ دیا کلّا نہیں نہیں۔ یعنی میں بتاتا تو نہیں۔ مگر تمہارے دل میں جو کچھ ہے۔ میں اس کی نفی کرتا ہوں۔ اور تمہیں بتاتا ہوں کہ ویسا نہیں ہوگا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اشاروں اشاروں میں وہ بات بھی بیان کردی۔ مگر ایسی زبان میں کہ جسے ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔ تا اشتعال بھی پیدا نہ ہو۔ اور تا بعد میں کوئی شخص یہ بھی نہ کہہ دے۔ کہ قرآن کریم نے یونہی کہہ دیا تھا کہ ہم سمجھ گئے ہیں۔ کیونکہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ انسان ایک بات کو نہیں سمجھتا مگر کہہ دیتا ہے۔ کہ میں سمجھ گیا ہوں۔ مگر واقعہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ سمجھا نہیں ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی تشریح کردی۔ اور بتا دیا۔ کہ ہم کیا سمجھے ہیں۔ لیکن ایسی عبارت میں اس کو بیان کیا۔ کہ بات بھی ہو جائے۔ اور وہ یہ بھی نہ کہہ سکیں۔ کہ قرآن کریم نے ان کو اشتعال دلایا ہے۔ یا انگیخت کی ہے۔ اور پہلے ہی کہنا شروع کر دیا ہے۔ کہ کفار مسلمانوں کے متعلق بد ارادے رکھتے ہیں۔ اس بات کا ثبوت کہ کفار کے ارادوں کا ہمیں پتہ

# وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝

اس حال میں کہ تو اس شہر میں (ایک فاتح کی صورت میں) اترنے والا ہے ۳؎

لگ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آیت کے اگلے حصہ میں دیا ہے جس کی تشریح اپنے موقعہ پر آئیگی۔

لَآ اُقْسِمُ قرآن کریم میں آٹھ جگہ استعمال ہوا ہے۔ (۱-۲) سورۂ قیامۃ میں دو جگہ (۳) بلد (۴) واقعہ (۵) حاقہ (۶) معارج (۷) تکویر (۸) انشقاق میں اور یہ سب کی سب مکی سورتیں ہیں۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ وہاں عموماً واؤ سے قسم کھائی ہے۔ اور جہاں لَآ استعمال کیا ہے۔ وہاں اُقْسِمُ کا لفظ ظاہر کیا ہے۔ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۔ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ وغیرہ میں واؤ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اُقْسِمُ کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ لیکن جہاں لَآ کے استعمال کے بعد غیر اللہ کی قسم کھائی گئی ہے۔ وہاں لَآ کے بعد اُقْسِمُ کا لفظ آیا ہے واؤ سے قسم نہیں کھائی۔ جیسا کہ اوپر کی سورتوں میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ صرف ایک جگہ ہے جہاں لَآ آیا ہے مگر اُقْسِمُ کا لفظ ظاہر نہیں کیا گیا۔ بلکہ واؤ سے ہی قسم کھائی ہے۔ اور وہ آیت یہ ہے فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء ع) اس جگہ لَا وَرَبِّكَ فرمایا ہے اُقْسِمُ نہیں فرمایا۔ لیکن اس آیت کا فرق دوسری اس قسم کی آیتوں سے یہ ہے کہ ان میں قسم غیر اللہ کی کھائی گئی تھی۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُقْسِمُ زور دینے کے لئے اور لَآ کے معنوں کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے جب خدا تعالیٰ کا نام لیا گیا جیسا کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ میں آتا ہے۔ تو اس جگہ واؤ کافی سمجھی گئی اور اُقْسِمُ کو ظاہر نہیں کیا۔ لیکن جہاں خدا تعالیٰ کا نام نہیں لایا گیا۔ وہاں اُقْسِمُ کا لفظ ضرور لایا گیا ہے۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ کے نام کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے۔ کہ اس کی قسم کھائی جاتی ہے۔ لیکن غیر اللہ کے متعلق نہیں جانتا۔ کہ اس کی قسم کھائی جاتی ہے۔ پس لَآ سے چونکہ نفی ہوتی تھی اُقْسِمُ کو ظاہر کر دیا گیا۔ تا قسم کی نفی نہ سمجھ لی جائے۔

**۳؎ حل لغات۔** حِلٌّ کے معنی ایک تو اس علاقہ کے ہیں مَا جَاوَزَ الْحَرَمَ مِنْ اَرْضِ مَكَّةَ جو حرم سے باہر کا ہے مکہ مکرمہ حرم کہلاتا ہے۔ اور وہاں کسی شکار کا مارنا یا درخت کا کاٹنا بالکل منع ہے۔ لیکن چند میلوں کے بعد یہ چیزیں جائز ہو جاتی ہیں۔ یا مثلاً لڑائی حرم میں منع ہے لیکن حرم سے باہر منع نہیں۔ غرض جو علاقہ مکہ کے اردگرد کی مقررہ حدود کے اندر کا ہے۔ وہ حرم کہلاتا ہے۔ اور اس میں جنگ شکار اور درختوں کا کاٹنا منع ہے۔ لیکن حرم سے باہر یہ چیزیں جائز ہیں۔ اسی وجہ سے بیرونی علاقہ کو حِلّ کہتے ہیں۔ اور اندرونی علاقہ کو حرم۔ اسی طرح اس کے ایک معنی حلال کے بھی ہیں۔ یعنی یہ حرام کی ضد بھی ہوتی ہے۔ وَالْحِلُّ : اَلْغَرَضُ الَّذِيْ يُرْمٰى اِلَيْهِ۔ اور حِلّ اس ہدف کو بھی کہتے ہیں۔ جس کی طرف تیر پھینکے جاتے ہیں وَالْاِسْمُ مِنْ تَحْلِيْلِ الْيَمِيْنِ۔ اور حِل تحلیل یمین کا اسم بھی ہے۔ یعنی قسم کو کسی ذریعہ سے کفارہ دیکر توڑ دینا۔ چنانچہ حدیثوں میں آتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک عورت سے جس نے یہ قسم کھائی تھی۔ کہ میں اپنے غلام کو آزاد نہیں کرونگی۔ فرمایا حِلًّا اُمَّ فُلَانٍ اَىْ تَحَلَّلِيْ يَمِيْنَكِ۔ اے عورت

حِلّ

تو کفارہ دے دے۔ اور قسم پر قائم نہ رہ۔ کیونکہ یہ بُری قسم ہے۔ وَالْحِلُّ النَّازِلُ بِالْمَكَانِ اور کسی مکان میں عارضی طور پر اترنے والے کو بھی حِلٌّ کہتے ہیں قَالَ الْحَرِيرِيُّ مَا دُمْتُ حِلًّا بِهٰذَا الْبَلَدِ اَبْغِ نَارًا اور حریری کہتے ہیں۔ کہ مَا دُمْتُ حِلًّا کے معنی یہ ہیں۔ کہ جب تک میں اس شہر میں ہوں (اترا ہوا) گویا حِلٌّ کے پانچ معنی ہوئے اول وہ علاقہ جو حرم سے باہر کا ہے دوم۔ حلال۔ سوم۔ ہدف۔ چہارم قسم کو کفارہ کے ذریعہ توڑنا۔ پنجم کسی جگہ پر اترنا

حِلٌّ کے چار معنے

**تفسیر۔** اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے متعلق علامہ زمخشری لکھتے ہیں۔ کہ یہ جملہ معترضہ ہے جو درمیان میں آگیا ہے لیکن بحر محیط والے کہتے ہیں۔ کہ یہ جملہ حالیہ ہے۔ میرے نزدیک جہاں تک متبادر الی الذہن معنوں کا سوال ہے۔ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں واؤ حالیہ ہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس حال میں تو مکہ شہادت ہے۔ لیکن اس کے بغیر کسی روحانی امر کی شہادت مکہ مکرمہ پیش نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی حال تو اس قسم کا ہوتا ہے۔ کہ وہ کسی مزید شہادت کا موجب نہیں ہوتا۔ لیکن بعض جگہ حال اس شہادت کو دوہرا رنگ دے دیتا ہے۔ اور ایک ہی چیز دو یا دو سے زائد باتوں کے لئے بطور شہادت پیش ہو جاتی ہے۔ گویا پہلے تو وہ صرف ایک چیز کی شہادت کا موجب ہوتی ہے۔ مگر اس حال کے ساتھ مل کر دوہری شہادت کا موجب بن جاتی ہے۔ پس بِهٰذَا الْبَلَدِ کا حال وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ کو قرار دینا گویا یہ معنی رکھتا ہے۔ کہ شہادت کے طور پر مکہ کو اس حال میں پیش کیا جاتا ہے۔ جو یہاں بیان کیا گیا ہے مگر اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں۔ کہ دوسری صورت میں وہ کوئی نشان نہیں۔ بلکہ یہ حال مزید شہادت کا موجب ہے۔ ورنہ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مکہ وہ شہر ہے۔ جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی بنیادیں استوار کیں۔ اور اس نشان عظیم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے تمام عرب کا مرجع بنا دیا۔ پھر مکہ مکرمہ وہ شہر ہے۔ جس میں رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیدائش سے بھی پہلے اللہ تعالیٰ نے عظیم الشان نشان دکھایا۔ کہ ابرہہ اپنے لشکر سمیت اس پر حملہ آور ہوا۔ تو خدا تعالیٰ نے اسے اور اسکے لشکر کو تباہ و برباد کر دیا۔ اسی طرح چاہ زمزم خدا تعالیٰ کا ایک بہت بڑا نشان تھا۔ جو مکہ مکرمہ میں پایا جاتا تھا۔ پھر صفا اور مروہ خدا تعالیٰ کے ایک بہت بڑے نشان کی زندہ یادگاریں تھیں۔ جن کو دیکھ کر انسان کا ایمان تازہ ہوتا تھا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھتا تھا۔ جو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کی اولاد کے بڑھنے کے متعلق کئے۔ غرض مکہ مکرمہ اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے بغیر بھی اپنی ذات میں خدا تعالیٰ کا ایک بہت بڑا نشان تھا جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ہر وہ شخص جس کے دل میں ایک ذرہ بھر بھی ایمان ہو۔ جو خدا تعالیٰ کی قدرتوں کو دیکھنے والی آنکھ رکھتا ہو۔ جو روحانی نابینائی سے محفوظ ہو وہ سمجھ سکتا ہے۔ کہ مکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ابراہیمی نشانات کی وجہ سے ایک ممتاز مقام تھا۔ اور وہ اپنی ذات میں خدا تعالیٰ کے وجود کا ایک زندہ گواہ تھا۔ پس لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ اس حال کے بغیر مکہ کوئی نشان نہیں تھا۔ یا وہ خدا تعالیٰ کی ہستی کی کوئی شہادت اپنے اندر نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ اس حال کے معنی یہ ہیں۔ کہ یہ وہ مقدس مقام ہے۔ جس میں علاوہ اور نشانات کے یہ بھی ایک عظیم الشان نشان پایا جاتا ہے۔ کہ اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔ تو اس شہر میں حِلٌّ ہے۔ جب تک مکہ اس حال سے متصف نہیں ہوا تھا۔ اس کا نشان اپنی ذات میں اتنا اہم نہیں تھا جتنا اب ہو جائیگا۔ اس لئے کہ پہلے مکہ مکرمہ اور بات کے ثبوت کے لئے تھا۔ اور اب مکہ مکرمہ اور بات کے ثبوت کے لئے پیش ہونے والا ہے۔ پہلے مکہ مکرمہ

ثبوت تھا اِس بات کا کہ حضرت ابراہیمؑ خدا کے نبی تھے۔ یا حضرت اسمٰعیلؑ خدا کے نبی تھے۔ لیکن اب یہ ثبوت ہوگا اِس بات کا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے نبی ہیں اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے بغیر مکّہ مکرمہ ان نشانات کا شاہد تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ وابستہ تھے۔ لیکن اب یہ ان نشانات کا بھی شاہد ہوگا۔ جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کے ساتھ وابستہ ہونگے۔ پس اِس حال نے مکّہ کو نیا رنگ دے دیا ہے۔ پہلے مکّہ صرف ابراہیمؑ یا اسمٰعیلؑ کی صداقت کا ثبوت تھا۔ اور اب یہ ثبوت ہوگا اِس بات کا کہ محمد رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا تعالےٰ کے سچے رسول ہیں۔ اور دُنیا کی کوئی طاقت ان کو اپنے مقصد میں ناکام نہیں کرسکتی۔ پس اِس حال کا یہ مطلب نہیں کہ مکّہ صرف اِس حال میں شہادت ہے۔ پہلے بطور شہادت اسے پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ کہہ کر اِس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ہم اِس وقت اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں۔

اگر اِس نقطۂ نگاہ کو لیا جائے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو کچھ نشانات دکھائے خدا تعالےٰ کی تائید اور اس کی نصرت سے دکھائے تھے۔ اِس وجہ سے مکّہ مکرمہ خدا کے وجود کا ایک ثبوت تھا۔ تو پھر یہ اکٹھا ثبوت بن جائیگا یعنی مکّہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی صداقت کا بھی ثبوت ہوگا۔ اور مکّہ اِس بات کا بھی ثبوت ہوگا۔ کہ خدا موجود ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیمؑ یا حضرت اسمٰعیلؑ نے جو کچھ کیا خدا تعالےٰ کے حکم سے کیا۔ اور جو کچھ ان کے ہاتھ پر ظاہر ہوا خدا تعالیٰ نے ظاہر کیا۔ پس جہاں نشانات اور پیشگوئیوں نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی صداقت کا ثبوت دُنیا کے سامنے پیش کیا [illegible] خدا تعالےٰ کی ہستی کا ایک زندہ ثبوت بھی لوگوں کے سامنے پیش کر دیا اِس لحاظ سے وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے یہ معنی ہونگے۔ کہ مکّہ مکرمہ پہلے بھی خدا تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت تھا۔ مگر اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اب تیرے آنے سے یہ ثبوت اور بھی نمایاں ہوگا۔ کیونکہ تیرے آنے سے خدا تعالیٰ کی طاقتوں اور اس کی قدرتوں کا دنیا میں غیر معمولی ظہور ہوگا۔ اور ایسے ایسے نشانات ظاہر ہونگے۔ جو دنیا نے اِس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔

حِلٌّ کے مختلف معانی جو اوپر بیان کئے جا چکے ہیں۔ وانت حلٌّ بھذا البلد کی تفسیر حلٌّ ان کے لحاظ سے پہلے معنی وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے یہ ہوئے کہ ہم اِس شہر کو پہلے بیان کردہ مضمون کی تائید کے لئے ایسی حالت میں شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ کہ اِس شہر کے لحاظ سے تجھ کو حلال سمجھا گیا ہے۔ یا سمجھا جانے والا ہے۔ یعنی مکّہ مکرمہ کو حرم سمجھا جاتا ہے۔ اور جو کام باہر جائز ہیں وہ یہاں جائز نہیں۔ اور جو باہر ناجائز ہیں وہ یہاں اور بھی شدت سے ناجائز ہیں۔ لیکن اے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے جو کہا تھا کہ لیالی عشر آنے والی ہیں۔ اس کے متعلق ہم مزید تجھے یہ خبر دیتے ہیں۔ کہ یہ دس تاریک راتیں مکّہ مکرمہ میں ہی آنے والی ہیں۔ پہلے صحابہؓ سمجھتے ہونگے۔ کہ خواہ مشرکین مکّہ اسلام کے کس قدر خلاف ہوں۔ اور توحید سے کتنی ہی منافرت کیوں نہ رکھتے ہوں۔ بہرحال وہ مکہ میں ہمیں کوئی دکھ نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ ان کا اپنا مذہب یہی ہے۔ کہ باہر تو منع ہے ہی مگر حرم میں قتل و خونریزی اور دنگا و فساد اور بھی سختی سے منع ہے۔ مگر اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ کہہ کر اللہ تعالےٰ نے بتا دیا۔ کہ باوجود اس کے کہ مکّہ والوں کا مذہب یہی ہے کہ مکّہ میں لڑائی جائز نہیں۔ مکّہ والوں کا مذہب یہی ہے کہ مکّہ میں فساد جائز نہیں۔ مکّہ والوں کا مذہب یہی ہے۔ کہ مکّہ میں فتنہ برپا کرنا اور لوگوں کو تکالیف میں مبتلا کرنا جائز نہیں پھر بھی اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ مکّہ کی حرمت تیری اور تیرے ساتھیوں کی حفاظت نہیں کرسکیگی۔ وہ حرمت تمہیں ان کے حملوں سے بچا نہیں سکیگی۔ بلکہ تم اِس جگہ حلال سمجھے

جاؤگے۔ بے شک یہاں ہر شے کا مارنا ناجائز سمجھا جاتا ہے یہاں تک کہ شکار تک کا مارنا جائز نہیں۔ مگر اسی مکہ میں اسی شہر کے رہنے والے اور مکہ کی حرمت اور اس کی تقدیس کا عقیدہ رکھنے والے تجھے اور تیرے مریدوں کو اب ہر قسم کی ایذا دینگے۔ اور حرم اور اس کی حرمت کا کچھ بھی پاس نہیں کرینگے۔

اَنْتَ حِلٌّ کی تفسیر حِلّ کے دوسرے معنے کے اعتبار سے

دوسرے معنوں کے لحاظ سے وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے یہ معنی ہونگے۔ کہ تو اس میں ہر تیر کا نشانہ بننے والا ہے یعنی یہی نہیں کہ تمہاری عزت یا تمہارا مال ان کے ہاتھ میں محفوظ نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر قسم کے مظالم تم پر توڑے جائیں گے۔ ایک ہوتا ہے ظلم اور ایک ہوتا ہے ہر قسم کا ظلم۔ ظلم اپنی ذات میں ہی بُری چیز ہے۔ لیکن ہر قسم کا ظلم جو شخص اختیار کرلے۔ اور تمام قسم کی برائیوں کے ارتکاب پر کمربستہ ہوجائے۔ اس سے زیادہ بُرا اور کون شخص ہوسکتا ہے۔ اس جگہ نہ صرف مشرکین مکہ کے مظالم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ وہ ہر قسم کے مظالم کا ہدف مسلمانوں کو بنائیں گے۔ اور جو بھی تیر ان کے ہاتھوں سے چھوٹیگا۔ اس کا اولین نشانہ مسلمانوں کے سینے ہونگے۔ حِلّ کے معنی جیسا کہ حل لغات میں بتایا جاچکا ہے اس ہدف کے ہوتے ہیں۔ جو تیروں کے نشانہ کے لئے بنایا جاتا ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ اب تم ہر قسم کے تیروں کا ہدف بن جاؤ گے۔ جو بھی تیر آئیگا تمہاری طرف آئیگا۔ جیسے ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہمارے سلسلہ سے پہلے بھی علماء کو کفر بازی کا شوق تھا۔ اور ہمیشہ ان کے اندر یہ مشغلہ پایا جاتا تھا۔ کہ کبھی

اَنْتَ حِلٌّ کی تفسیر حِلّ کے تیسرے معنے کے رو سے

سنیوں نے وہابیوں پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ اور کبھی وہابیوں نے سنیوں کو کافر قرار دے دیا۔ کبھی اہلحدیث دیوبندیوں کے خلاف اٹھے اور ان پر کفر کا فتویٰ عائد کردیا۔ اور کبھی دیوبندیوں نے دوسرے مسلمان فرقوں کو کافر اور مرتد کہہ کر اپنے دل کو خوش کرلیا۔ مگر جب سے اللہ تعالیٰ نے احمدیت کو قائم کیا ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے جو بھی تیر آتا ہے احمدیوں کی طرف آتا ہے۔ نہ سنی شیعوں پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ نہ شیعہ سنیوں کو ملحد اور زندیق کہتے ہیں۔ بلکہ سب کے سب خواہ وہ سنی ہوں شیعہ ہوں۔ اہلحدیث ہوں احمدیت کے خلاف متفقہ طور پر کھڑے ہیں۔ اور انہوں نے ہر تیر کا نشانہ ہماری جماعت کو بنایا ہوا ہے۔ درحقیقت جس شخص کے متعلق قوم میں یہ احساس پیدا ہو جائے۔ کہ یہ طاقت پکڑتا جارہا ہے۔ اور ایک دن یہ ہمارے زور کو کچل دیگا۔ اس کے خلاف ساری قومیں اپنے اختلاف کو بھول کر متحد ہوجاتی ہیں اور متحدہ عزائم سے اس کو مٹانے کی کوشش میں مصروف ہوجاتی ہیں۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمائی ہے کہ اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ہر قسم کے مظالم جو پہلے مکہ والوں نے کبھی نہ کئے ہونگے۔ اور جو مکہ نے کبھی دیکھے بھی نہ ہونگے۔ وہ اب تم پر اور تمہاری جماعت پر نازل ہونگے۔ بے شک مکہ والوں میں اختلاف بھی ہے پارٹیاں بھی ہیں جتھے بھی ہیں۔ مگر تیری مخالفت کی وجہ سے ان کی تمام جتھہ بندیاں ختم ہوجائینگی۔ وہ سب کے سب اکٹھے ہوجائینگے آپس کے اختلافات کو بھولکر متحد ہوجائینگے۔ اور اس ایک مقصد پر سب متفق ہوجائینگے کہ تجھ پر اور تیرے ساتھیوں پر مظالم کے تیر برسائے جائیں۔ اور ہر قسم کی تکالیف جو وہ پہنچا سکتے ہوں پہنچائیں۔ یہ بھی کتنی زبردست پیشگوئی ہے۔ کہ نہ صرف مظالم کی طرف بلکہ ان مظالم کے انواع کی طرف بھی اشارہ کردیا گیا ہے۔

تیسرے معنی اس آیت کے یہ ہونگے۔ کہ تو اس مقام پر عارضی طور پر اترنے والا ہے۔ یعنی اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہم نے لیالی عشر کی پیشگوئی میں مکہ والوں کے جن مظالم کی خبر دی ہے۔ ان کے نتیجہ میں تجھ کو یہاں سے ہجرت کرنی پڑیگی۔ اور پھر اس کے بعد فاتح کی صورت میں تو اس جگہ واپس آئیگا۔ مگر یہاں رہیگا نہیں بلکہ عارضی قیام کے بعد واپس چلا جائیگا۔ گویا لیالی عشر اور وَالْفَجْرِ دونوں کی یہاں تشریح کردی۔ اور پھر گیارھویں رات

کے بعد کی فجر کیطرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ یہ قرآن کریم کا کیسا کمال ہے۔ کہ اس نے ایک مختصر سے فقرہ میں دو زبردست پیشگوئیاں بیان کر دیں۔ ۱۔ ہجرت کی۔ ۲۔ فتح مکہ کی۔ اور جس طرح اَنْتَ حِلٌّ کے الفاظ میں لیالی عشر کی تشریح کر دی تھی۔ اسی طرح اَنْتَ حِلٌّ کے الفاظ نے ہی گیارھویں رات کے بعد کی فجر کو بھی واضح کر دیا اور بتا دیا۔ کہ ہم ان مصائب و مشکلات کے نتیجہ میں تجھ کو مکہ سے لے جائینگے۔ مگر پھر تجھے کامیاب وکامران حالت میں اس شہر میں واپس لائینگے۔

چوتھے معنی اس آیت کے یہ ہیں کہ تیرے لئے اس مقام میں حلت کی صورت پیدا کی جانے والی ہے۔ یعنی مکہ کا احترام ایسا تھا۔ جیسا کہ کوئی شخص کسی کام کے نہ کرنے پر قسم کھا لیتا ہے۔ لیکن جس طرح ایک جائز بات اگر حرام ہو جائے۔ تو قسم کا کفارہ دیکر اس کام کو کر لینا جائز ہے۔ اسی طرح چونکہ مکہ والوں نے اپنی شرارتوں سے اپنے آپ کو عذاب کا مستحق بنالیا ہے۔ اس لئے ہم بھی تجھے قسم کا کفارہ دینے والے کی طرح اس ممنوع بات کی اجازت دینے والے ہیں۔ اور اس حرام امر کو تیرے لئے حلال کرنے والے ہیں پس تو اللہ تعالےٰ کی اجازت سے مکہ پر حملہ کریگا گویا یہ بتایا ہے۔ کہ تجھے اور تیرے ساتھیوں کو مکہ میں حلال سمجھنے کے نتیجہ میں اب ان پر بھی حملہ کرنے کی اجازت دی جائیگی۔ اگر یہ ظلم نہ کرتے۔ تو ہم شاید محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صلحاً اس شہر میں لاتے مگر چونکہ انہوں نے بلد اللہ الحرام کو حلال بنالیا۔ اس لئے کچھ وقت کے لئے ہم بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس شہر کو حلال کر دینگے۔ اور پھر جو انکو ذلت و رسوائی ہوگی۔ اس کے ذمہ دار یہ لوگ خود ہونگے۔ گویا صرف یہی نشان نہیں ہوگا۔ کہ تو اس شہر میں کامیاب وکامران واپس آئیگا۔ بلکہ تیرے لئے کچھ وقت تک مکہ کو حلال کر دیا جائیگا۔ اور اہل مکہ کو ان کے مظالم کی وجہ سے شدید رسوائی کا سامنا کرنا پڑیگا۔

اَنْتَ حِلٌّ کے چوتھے معنی

پانچویں معنے اس آیت کے یہ ہیں۔ کہ تو اس میں مقصود ہے۔ مراد ہ کا کیونکہ مجازاً بلد کا لفظ مقصود کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اور استعارۃً اس کے ایک معنی امیدوں کا مرجع ہونے کے بھی ہیں۔ جیسے رمی کے معنی تیر پھینکنے کے ہیں۔ اسی طرح رمی کا لفظ استعارہ کے طور پر ان اشاروں کے لئے بھی بولتے ہیں۔ جو کسی مامور کے ظہور سے پہلے کئے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کے یہ معنی ہونگے۔ کہ اس شہر کی تقدیس کے لئے جو حالات ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ جیسے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا مکہ میں آنا۔ عربوں کا غیر معمولی رجوع۔ مکہ کا شہر بن جانا۔ اس کو فتنوں سے پاک رکھنا۔ اسے دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنا۔ اسے غیر مذاہب کے اثر سے بچانا۔ یہ سب باتیں اس شہر کو اس لئے حاصل تھیں۔ کہ تو اس شہر میں ظاہر ہونے والا تھا۔ مگر مکہ والوں کی عجیب حالت ہے۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ مکہ کو عظمت حاصل ہے۔ مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ جس غرض کے لئے مکہ کو عزت دی گئی ہے۔ وہ کیا ہے۔ اور اسی کی وہ مخالفت کر رہے ہیں۔ بے شک مکہ بڑی عظمت کی چیز ہے۔ مگر اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ ہم مکہ کو ہی اس بات کی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ کہ تو ہی اس شہر کا مقصود ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے لیکر آج تک جو انگلی بھی اٹھ رہی تھی۔ وہ تیری طرف ہی اٹھ رہی تھی۔ واقعات کا ہر اشارہ تیری طرف تھا۔ اور ہر نشان تیری طرف ہی بنی نوع انسان کی راہنمائی کر رہا تھا۔ مگر تو جو اس شہر کا مقصود ہے۔ جب ظاہر ہو گیا۔ تو مکہ والے تیرے مخالف ہو گئے۔ حالانکہ تو ہی وہ شخص تھا۔ جس کے لئے واقعات کا ایک لمبا سلسلہ ہم نے پیدا کیا۔

اب اس آیت کے تفصیلی طور پر یوں معنے ہونگے۔ کہ ہم مکہ کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جس میں کئی قسم کے دردناک مظالم مسلمانوں پر ہونے والے ہیں۔ یعنی ہم نے جو ظلم اور منظم سازشوں کے ذکر کئے ہیں۔ خود یہ مکہ ہی اس بات کا ثبوت دیدیگا۔ اور باوجود اس کے کہ مکہ والوں کا یہ عقیدہ ہے۔

کہ حرم میں شکار تک کو مارنا جائز نہیں۔ حرم میں کسی انسان کو قتل کرنا جائز نہیں۔ حرم میں دنگا فساد جائز نہیں۔ پھر بھی وہ تجھے اور تیرے مریدوں کو اس مکہ میں ہر قسم کی ایذائیں دینگے اور انہیں حرم اور اس کی تقدیس کا کچھ بھی خیال نہیں رہیگا۔ یہ واقعہ میں ایک حیرت انگیز چیز تھی۔ جو صحابہؓ کو دیکھنی پڑی صحابہؓ کے لئے کفار کی مار پیٹ اتنی حیرت انگیز نہیں تھی جتنی حیرت انگیز ان کے لئے یہ بات تھی۔ کہ ہمیں مکہ میں مارا جاتا ہے۔ یہ بات انسانی فطرت میں داخل ہے۔ کہ جب اسے غیر متوقع طور پر کسی کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے۔ تو وہ اسے غیر معمولی طور پر محسوس کرتا ہے۔ اور اس تکلیف سے بہت زیادہ اذیت پاتا ہے۔ قصہ مشہور ہے کہ منصور کے متعلق بادشاہ نے حکم دے دیا۔ کہ انہیں سنگسار کیا جائے۔ لوگ انہیں پتھر مارنے لگ گئے۔ مگر منصور بالکل خاموش رہے۔ اور انہوں نے اس سخت تکلیف کے باوجود اف تک نہ کی۔ اسی دوران میں شبلی وہاں سے گزرے جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ منصور کو پتھر مار رہے ہیں۔ تو انہوں نے گلاب کا ایک پھول اٹھایا۔ اور منصور کو مارا۔ جب گلاب کا پھول ان کے جسم سے لگا۔ تو وہ چلا اٹھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ عجیب بات ہے ہمارے پتھروں سے تو آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اور آپ خاموش رہے۔ لیکن شبلی نے گلاب کا ایک پھول مارا۔ تو آپ چلا اٹھے۔ یہ کیا بات ہے انہوں نے کہا تمہارے پتھر مجھے پھول معلوم ہوتے تھے لیکن شبلی کا پھول مجھے پتھر معلوم ہوا۔ یعنی اس سے مجھے امید نہیں تھی۔ کہ وہ مجھے ماریگا۔ اور گو اس نے مجھے پھول ہی مارا مگر چونکہ غیر متوقع طور پر اس کی طرف سے ایسا فعل سرزد ہوا اس لئے اس کا پھول مجھے پتھر کی طرح آکر چبھا اور اس نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی۔ اسی طرح مکہ وہ مقام تھا۔ جہاں کے رہنے والوں کا عقیدہ یہ تھا۔ کہ یہاں کسی پر ظلم کرنا سخت گناہ ہے۔ کسی کو مارنا سخت گناہ ہے۔ کسی کو پیٹنا سخت گناہ ہے کسی سے لڑائی کرنا جائز نہیں۔ مکہ ایک مقدس مقام ہے۔ اس کی تقدیس اس بات کا تقاضہ کرتی ہے۔ کہ یہاں ہر قسم کی وحشیانہ حرکات کا قطعاً ارتکاب نہ کیا جائے۔ چنانچہ سالہا سال سے اس عقیدہ پر ان کا عمل تھا۔ مکہ کی عظمت اور اس کی حرمت کو پوری طرح ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ لڑائی اور قتل و خونریزی کو حدود حرم میں قطعاً جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ قبائل جو حرم کی حدود سے باہر آپس میں دست و گریبان رہا کرتے تھے۔ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے تھے۔ جو تلواروں سے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ رہے ہوتے تھے۔ وہ بھی جب حرم کی حدود میں آتے۔ تو ان کی لڑائیاں ختم ہو جاتیں۔ وہ ایک دوسرے کے دشمن ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے والے شانہ بشانہ اور کندھا بکندھا لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ کہتے ہوئے مکہ کا طواف کرتے۔ اور اس کے گلی کوچوں میں گھومتے ہوئے نظر آتے۔ کسی کی مجال نہیں تھی۔ کہ وہ حرم میں کسی کو غضب آلود نگاہوں سے دیکھ سکے۔ مگر اس مکہ میں اسی حرم کی حدود میں یہی عقیدہ رکھنے والے ایک دن اسلام اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اس قدر جوش اور غیظ و غضب سے بھر گئے کہ انہوں نے اپنی تلواریں سونت لیں۔ اپنے عقائد کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور انہوں نے متحدہ طور پر یہ فیصلہ کر لیا۔ کہ مسلمانوں کو قتل کر دو۔ ان پر عرصہ حیات تنگ کر دو۔ ان کو دکھ دے دے کر اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرو۔ اور اس بات کو نظر انداز کر دو۔ کہ یہ حرم ہے۔ یا حرم سے باہر کا علاقہ ہے۔ مکہ والوں کا حدود حرم میں مسلمانوں کے متعلق یہ فیصلہ ان کے لئے ایسا ہی حیرت انگیز تھا۔ جیسے منصور کے لئے شبلی کا پھول حیرت انگیز تھا۔ وہ ان پتھروں کی امید تو کرتے ہی تھے۔ مگر ان کے واہمہ اور گمان میں بھی یہ نہیں آسکتا تھا۔ کہ شبلی ایک پھول بھی ان پر پھینکنے کی جرأت کریگا۔ اس لئے جب شبلی نے پھول مارا۔ تو گو وہ گلاب کا ایک پھول تھا۔ ان کو پتھروں کی بوچھاڑ سے زیادہ سخت معلوم ہوا۔ اور اس کی اذیت نے ان کو پریشان کر دیا۔ اسی طرح اگر طائف وغیرہ میں مسلمانوں کو مارا جاتا۔ یا ان کو مختلف

قسم کے دکھوں میں مبتلا کیا جاتا۔ تو مسلمانوں کے لئے یہ بات ہرگز قابل تعجب نہ ہوتی۔ وہ سمجھتے۔ کہ یہ باتیں تو انبیاء کی جماعتوں کو پیش آیا ہی کرتی ہیں۔ مگر وہ سمجھتے تھے کہ کفار کے عقیدہ کے مطابق مکہ مکرمہ میں ایسی بات نہیں ہو سکتی۔ اس لئے انہیں سخت حیرت ہوئی۔ کہ مکہ ہی میں کفار نے مسلمانوں کو مظالم کا تختۂ مشق بنانا شروع کر دیا۔ حالانکہ مکہ والے براہیمؑ کے زمانہ سے مکہ کی تقدیس اور اس کی حرمت کے قائل چلے آتے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا درمیانی عرصہ چھ سو سال کا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا درمیانی زمانہ ۱۳ سو سال کا ہے۔ یہ ۱۹ سو سال ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی چھ سو سال پہلے ہوئے ہیں۔ انیس سو سال یہ اور چھ سو سال وہ ۲۵ سو سال ہوگئے۔ گویا اڑھائی ہزار سال سے یہ اعتقاد ان کے اندر قائم چلا آرہا تھا۔ کہ یہاں کسی کو مارنا پیٹنا سخت گناہ ہے۔ کسی کی جان لینا سخت گناہ ہے۔ کسی پر ظلم کرنا سخت گناہ ہے۔ اتنے لمبے عرصہ کے عقیدہ کے بعد کس کو یہ امید ہو سکتی تھی۔ کہ یہ قوم ایک دن مسلمانوں پر یکدم ٹوٹ پڑیگی۔ اور ان کی عورتوں اور ان کے بچوں۔ ان کے غلاموں اور ان کے آزادوں پر دانت پیستے ہوئے انہیں حدود حرم میں ہی مظالم کا نشانہ بنانا شروع کر دیگی۔ یہ امید کسی شخص کو بھی نہیں تھی۔ مگر ہوا یہی کہ مکہ والوں نے اپنے تمام اعتقادات کو پس پشت ڈال دیا۔ اور مسلمانوں کو مکہ میں اپنے مظالم کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں۔ کہ تو اس شہر میں ہر تیر کا نشانہ بنے گا۔ یعنی ہر قسم کے مظالم تم پر اور تمہاری جماعت پر توڑے جائیں گے۔ یوں تو دنیا میں کبھی کبھی لوگ بھی جوش میں آکر دوسرے کو سزا دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی جوش پیدا ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر انسان کسی وحشیانہ حرکت کا بھی ارتکاب کر لیتا ہے۔ لیکن لمبی تعذیب جو مارنے سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس کا امکان ایسے لوگوں سے جو ۲۵ سو سال سے ایک خاص قسم کا عقیدہ رکھتے چلے آرہے ہوں بہت ہی بعید اور دور از قیاس تھی اور کوئی شخص یہ امید بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہ مکہ والوں کی طرف سے ہر قسم کے مظالم کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جائیگا مگر اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت فرما دیا۔ کہ تم مت خیال کرو۔ کہ یہ قوم تم پر ظلم نہیں کریگی۔ یا تمہیں معمولی تکالیف دینے پر اکتفا کریگی۔ یہ وہ قوم ہے۔ جو ہر قسم کے مظالم کا دروازہ تم پر کھول دیگی۔ اور ہر قسم کے تیروں کا تمہیں ہدف بنا لیگی۔ جو تیر بھی اٹھیگا۔ اس کا نشانہ مسلمانوں کے سینے ہونگے۔ اور جو ظلم بھی توڑا جائیگا مسلمانوں پر توڑا جائیگا۔ چنانچہ اس پیشگوئی کی صداقت کفار مکہ نے اپنے مظالم کے ذریعہ روز روشن کیطرح ظاہر کر دی۔

دنیا میں ظلم ہوتے ہیں مگر دشمنوں کی طرف سے۔ اگر مذہبی بنا پر کوئی مخالفت ہو۔ تو زیادہ تر علماء مخالف ہوتے ہیں۔ ماں باپ اور بھائی وغیرہ مذہبی اختلاف کے وقت زیادہ مخالفت نہیں کرتے۔ بلکہ اگر کسی کا بچہ کسی اور مذہب میں شامل ہو جائے تو ماں باپ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس کی بھی ایک رائے ہے۔ اور ہماری بھی ایک رائے ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ سچ کیا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہدیتے ہیں۔ کہ ہمارے بچے کی یہ غلطی ہے۔ کہ اس نے دوسرا مذہب اختیار کر لیا۔ لیکن غلطیاں دنیا میں کس سے نہیں ہوتیں۔ گویا عام طور پر مذہبی اختلاف پر مظالم ڈھانے کی بجائے لوگ اپنے بچوں اور اپنے بھائیوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور ان کی طرف سے کئی قسم کے معذرات اور حیلے بہانے پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں فرمایا کہ ہر قسم کے تیر تم پر چلائے جائینگے۔ یعنی ماں تمہاری ماں نہیں رہیگی باپ تمہارا باپ نہیں رہیگا۔ اور تمہیں ہر قسم کے مظالم کا نشانہ بنایا جائیگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمانوں پر صرف دینی علماء نے ظلم نہیں کئے۔ کاہنوں نے ظلم نہیں کئے۔ بتوں کے پجاریوں نے ظلم نہیں کئے۔ بلکہ ہر

ایک نے ظلم کئے ہیں جتنی کہ ماں باپ نے بھی ظلم کئے ہیں

ایک نوجوان جو ابھی پوری طرح بالغ بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا۔ ماں نے غصہ میں آکر اس کے برتن الگ کر دیئے۔ اور کچھ مدت تک دیکھا۔ کہ اس پر کوئی اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اسے ماں باپ نے بہتیرا سمجھایا۔ اور جب وہ زبانی سمجھانے سے باز نہ آیا۔ تو اسے مارا پیٹا۔ مگر اس نے اسلام کو ترک کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا۔ آخر ایک دن اسے ماں باپ نے کہہ دیا۔ کہ تو ہمارے گھر سے نکل جا۔ وہ نوجوان گھر سے نکلا۔ اور چند دن مکہ میں کئی قسم کی تکالیف اٹھانے کے بعد حبشہ کی طرف ہجرت کر کے چلا گیا۔ جب سورۂ نجم والے واقعہ کی خبر حبشہ میں پہنچی۔ یا جیسا کہ میری تحقیق ہے۔ سورہ نجم والے واقعہ کا منصوبہ بنا کر مکہ والوں نے اس کی خبر حبشہ میں پہنچائی۔ تو کئی مسلمان یہ خبر سنکر حبشہ سے واپس آگئے۔ انہی میں وہ نوجوان صحابی بھی تھا۔ وہ اپنے گھر گیا۔ اور اس نے سمجھا۔ کہ شائد اب ان کا غصہ ختم ہو چکا ہوگا۔ اس کے ماں باپ نے بڑے جوش سے اس کا استقبال کیا۔ اُسے اپنے گلے سے لگایا اور پیار کیا اور سمجھا۔ کہ اب جو یہ ہمارے گھر آیا ہے۔ تو شائد اسلام سے توبہ کر کے آیا ہے۔ اور اس نوجوان نے خیال کیا۔ کہ میری کئی مہینوں کی جدائی اور مکہ کو چھوڑ کر چلے جانے کا میرے ماں باپ پر یہ اثر ہوا ہے۔ کہ ان کے دل نرم ہو گئے ہیں۔ اور ان میں بھی رحم کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ ماں نے اُسے کہا شکر ہے۔ کہ تیری بھی آنکھیں کھلیں۔ اور تجھے معلوم ہوا۔ کہ تو نے اس صابی (نعوذ باللہ من ذالک) سے تعلق پیدا کر کے اچھا کام نہیں کیا تھا۔ اب میری یہی نصیحت ہے کہ اُس صابی (نعوذ باللہ من ذالک) کے پاس کبھی نہ جانا۔ وہ لڑکا اسی وقت کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے کہا اے میری ماں تو میری ماں ہے۔ اور اے میرے باپ تو میرا باپ ہے۔ لیکن محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے میں ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار ہوں اور اس راہ میں کسی بڑی سے بڑی مشکل کی بھی میں پروا نہیں کر سکتا اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق پھر کوئی ایسا لفظ تم نے اپنی زبان سے نکالا۔ تو نہ تم میری ماں ہو نہ تم میرے باپ ہو۔ انہوں نے کہا اچھا اگر یہ بات ہے تو پھر تو بھی ہمارا بیٹا نہیں۔ یہ سنتے ہی وہ اپنے گھر سے باہر نکل گیا۔ اور پھر ساری عمر اس نے اپنے ماں باپ کی صورت نہیں دیکھی۔ اب دیکھو یہ تیر تو چلے پر کہاں سے؟ اس جگہ سے تیر چلے۔ جہاں سے انسان آخری وقت میں بھی تیر چلنے کی امید نہیں رکھتا۔ اور ان ہاتھوں سے چلے جو عام طور پر تیر چلانے کی بجائے دوسروں کے تیر اپنے ہاتھوں پر لیا کرتے ہیں اور چلنے والے تیروں کے درمیان خود آکر کھڑے ہو جایا کرتے ہیں

یہ تو ماں باپ کے سلوک کا ایک نظارہ تھا۔ اب چچا کے سلوک کا ایک نظارہ دیکھ لو۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ایک چچا ابولہب تھا۔ اور بھی آپ کے بعض چچا تھے مگر بجائے اس کے کہ وہ آپ کی مشکلات میں آپ کا ساتھ دیتے وہ خود دوسروں کو انگیخت کیا کرتے۔ اور ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اکساتے رہتے تھے۔ اور تیر تو الگ رہے۔ یہی تیر کیا کم ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو بیٹیاں رقیہ اور ام کلثوم رضؓ آپ کے چچا ابولہب کے دو بیٹوں سے بیاہی ہوئی تھیں۔ دعوئی نبوت کے بعد اس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی وجہ سے اپنے بیٹوں کو بلایا۔ اور ان سے کہا اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو۔ تو اپنی بیویوں کو طلاق دے دو۔ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دونوں بیٹیوں کو طلاق دے دی۔ گویا نازک سے نازک جذبات کو توڑنے کی بھی آپ کے رشتہ داروں نے کوئی پروا نہ کی۔ وہ بھی ایک چچا ہی تھا۔ جس نے آپ کو پالا۔ اور آپ کی پرورش کی۔ اور وہ بھی ایک چچا ہی

تھا۔ جس نے آپ کا مقابلہ کیا۔ اور آپ کو شدید سے
شدید دکھ دیا۔ یہاں تک کہ آپ کی دو لڑکیوں کو بلا وجہ
طلاق دلادی۔ پھر دوست ہوتے ہیں۔ اور ان میں بڑی گہری
دوستی ہوتی ہے۔ مگر جس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے تمام
دوست اس سے بچھڑ گئے۔ عرب لوگ دوستیوں کو بہت
نباہنے والے تھے۔ اور وہ ضرورت پر ایک دوسرے کے
لئے جانیں بھی قربان کر دیا کرتے تھے۔ مگر محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف اتنا بغض مکہ والوں کے دلوں
میں پیدا ہو گیا تھا کہ انہوں نے اپنی تمام دوستیوں کو قطع کر کے رکھ دیا
اور بڑے بڑے گہرے دوست ایک دوسرے کے جانی
دشمن بن گئے۔ عثمان بن مظعون مکہ کے ایک رئیس کے لڑکے
تھے۔ اسلام لانے پر طرح طرح کے مظالم ان پر ہوئے۔ آخر
ہجرت کے ارادہ سے گھر سے نکلے۔ راستہ میں ان کے والد
کا ایک گہرا دوست ملا۔ اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو۔
عثمان نے کہا مکہ والوں کے ظلم سے تنگ آ کر ہجرت کر رہا ہوں۔
اس رئیس کی آنکھوں میں یہ سنکر آنسو آ گئے۔ عثمان کو گلے
لگا لیا اور کہا کہ میرے دوست کا بیٹا مکہ چھوڑے۔ نہیں
ہو سکتا۔ تو آج سے میری پناہ میں ہے۔ چنانچہ واپس آ کر خانہ
کعبہ میں اپنی حفاظت کا اعلان کر دیا۔ مکہ والے ایک دوسرے
کی پناہ کا بڑا لحاظ کرتے تھے لوگوں نے اس رئیس کی وجہ سے
عثمان کو دکھ دینا چھوڑ دیا۔ اس سال حج کے موقعہ پر تمام عرب
کے لوگ منیٰ میں جمع ہوئے۔ لبید شاعر اپنے شعر سنا رہے تھے
کہ انہوں نے ایک شعر پڑھا۔

أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلُ

عثمان نے یہ سن کر صَدَقْتَ کے لفظ کہے یعنی تو نے سچ کہا
ہے۔ لبید جو اس وقت عرب کے سب سے بڑے شاعر
سمجھے جاتے تھے۔ ایک نوجوان سے اپنے کلام کی تصدیق
سنکر آگ بگولا ہو گئے۔ اور کہا کہ کیا لبید کو ایک بچہ سے
اپنے شعر کی تصدیق کروانے کی ضرورت ہے۔ مکہ والو تمہارے
اخلاق کو کیا ہو گیا۔ اس پر لوگ غصہ سے عثمان کی طرف لپکے۔
اور انہیں بولنے سے سختی سے منع کیا۔ اس کے بعد لبید نے دوسرا
مصرعہ پڑھا۔

وَكُلُّ نَعِيمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلُ

یعنی ہر نعمت ضرور زائل ہو جائیگی۔ عثمان نے کہا كَذَبْتَ
نَعِيمُ الْجَنَّةِ لَا يَزُوْلُ۔ یعنی تو غلط کہتا ہے جنت کی
نعمتیں زائل نہ ہونگی۔ اس پر تو لبید سخت غصہ میں آ گئے۔ اور
کہا کہ اب میں شعر نہیں پڑھتا۔ اس پر نوجوان عثمان کی طرف
لپکے۔ ایک شخص نے شدت غیظ سے ایک گھونسا تان کر عثمان
کی آنکھ میں مارا۔ کہ ڈھیلے کا پانی بہہ گیا۔ اور آپ کانے
ہو گئے۔ وہ رئیس جس نے پناہ دی تھی اٹھا اور کہا کہ بیوقوف
تو نے کیا کیا کہ اپنی آنکھ ضائع کر والی۔ عثمان نے کہا۔ کہ
تو اپنی پناہ گھر رکھ۔ تو کہتا ہے کہ میں نے ایک آنکھ ضائع
کر دی۔ میری دوسری آنکھ بھی خدا تعالےٰ کی راہ میں جانے کو
بے تاب ہے۔ اب دیکھو کس طرح مکہ میں دوستیاں دھری کی
دھری رہ گئیں۔ اور اسلام کے جرم میں کوئی دوست بھی کسی
مسلمان کے کام نہ آیا۔ بلکہ وہ سالے رشتہ دار دوست اور قریبی تعلقات
رکھنے والے جن سے انسان کو ہمیشہ مہر و وفا کی امید ہوتی ہے جن سے محبت
اور پیار کی امید ہوتی ہے جن سے دکھ اور مصیبت کی گھڑیوں میں حسن سلوک اور ہمدردی
کی امید ہوتی ہے۔ انہی لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے اسلام
کی مخالفت میں اپنے عزیزوں پر تیر چلائے۔ یہاں تک کہ بعض
جگہ خاوندوں نے اپنی بیویوں کو چھوڑ دیا۔ اور بیویاں اپنے
خاوندوں سے الگ ہو گئیں۔ ماں باپ نے اپنے بچوں سے
قطع تعلق کر لیا۔ اور بچوں نے اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیا۔ پھر
یہ نہیں کہ صرف ایک رنگ کا عذاب ان کو دیا گیا ہو۔ بلکہ ہر
نوعیت اور ہر قسم کے مظالم ان پر توڑے گئے۔ پتھروں پر
ان کو گھسیٹا گیا۔ جلتی ہوئی ریت پر ان کو لٹایا گیا۔ مکہ کی
گلیوں میں جہاں بڑے بڑے کھردرے اور نوکدار پتھر
ہوتے تھے۔ ان کی ٹانگوں میں رسیاں باندھ کر اس طرح گھسیٹا
جاتا جیسے کسی مردہ جانور کو گھسیٹا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کا
تمام جسم لہو لہان ہو جاتا۔ پھر بسا اوقات ان کو زدو کوب کیا

جاتا۔ ان کے سینہ پر بڑے بڑے وزنی پتھر رکھ کر انہیں مجبور کیا جاتا۔ کہ وہ توحید سے منحرف ہو جائیں۔ کئی لوگ ایسے تھے جن کو نیزے مار مار کر ہلاک کیا گیا۔ یہاں تک کہ بعض مسلمان عورتوں کی شرمگاہوں میں انہوں نے نیزے مار کر ان کو ہلاک کیا۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں انہیں گندی سے گندی اور غلیظ سے غلیظ گالیاں دی گئیں ان کو ملک سے نکالا گیا۔ اور ان کو ہلاک کرنے کے لئے نہایت ظالمانہ اور گندے طریقوں کو اختیار کیا گیا۔ بعض دفعہ مسلمان مردوں کی ایک ٹانگ ایک اونٹ سے اور دوسری ٹانگ دوسرے اونٹ سے باندھ دیتے۔ اور پھر ان اونٹوں کو مخالف اطراف میں دوڑا دیتے۔ اور اس طرح انکو ہلاک کر کے اپنے دلوں کو خوش کرتے۔ غرض کوئی نوعیت ظلم کی ایسی نہیں تھی۔ جس سے مکہ والوں نے کام نہ لیا ہو۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِھٰذَا الْبَلَدِ کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اس مکہ میں ہر قسم کے تیروں کا ہدف بنیگا۔ ہر ہاتھ خواہ وہ باپ کا ہو یا ماں کا ہو یا چچا کا ہو یا کسی اور عزیز رشتہ دار کا ہو۔ تیرے مقابلہ میں اٹھنے والا ہے۔ اور ہر قسم کا تیر ان کی طرف سے چلنے والا ہے۔

پھر یہ بھی کتنی عظیم الشان پیشگوئی ہے۔ اور کتنی لطیف تفسیر ایک مختصر سے فقرہ میں لیالی عشر کی فرما دی۔ کہ ایک دن آنے والا ہے۔ جبکہ تو اس مقام پر اتریگا۔ جو اسی وقت ممکن ہو سکتا تھا۔ کہ آپ پہلے مکہ چھوڑ کر جائیں پس اتریگا کا مختصر لفظ استعمال کر کے ہجرت کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ اور بتایا کہ ظلموں کے بعد تجھے اس شہر سے ہجرت کرنی پڑیگی اس زمانہ کے لحاظ سے یہ بھی کتنی عجیب اور حیرت انگیز بات تھی۔ مکہ کے لوگوں کی معاش کا ذریعہ صرف باہر سے آنیوالے لوگوں کی آمد پر تھا۔ اور وہ محض مجاوروں کا ایک شہر تھا۔ ان کا کام یہ تھا۔ کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف بلائیں۔ ان کا یہ کام نہیں تھا۔ کہ وہ مکہ سے لوگوں کو نکالیں۔ اس زمانہ میں کون کہہ سکتا تھا۔ کہ یہ مجاور ایک دن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو مکہ سے نکال دینگے۔ یقیناً جہاں تک انسانی قیاسات کا سوال ہے کسی شخص کے وہم اور گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی۔ کہ مکہ والے جو مجاوروں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جن کی زندگی کا تعلق ہی اس بات سے ہے کہ باہر سے لوگ مکہ میں آتے رہیں۔ وہ ایک دن اسلام کی مخالفت میں اس قدر اندھے ہو جائینگے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو اس امر پر مجبور کر دینگے۔ کہ وہ مکہ کو چھوڑ دیں۔ اور کسی اور شہر میں چلے جائیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت بتا دیا۔ کہ گو آج یہ حالات تمہیں ناممکن دکھائی دیتے ہیں۔ اور تم سمجھتے ہو۔ کہ مکہ والے ایسا کہاں کر سکتے ہیں۔ مگر یقیناً سمجھو کہ وہ دن آنے والا ہے۔ جب تمہیں مکہ کو چھوڑنا پڑیگا۔ مگر صرف اسی قدر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ہم تمہیں یہ بھی خبر دیتے ہیں۔ کہ اس کے بعد ایک دن وہ بھی آئیگا۔ جب پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شہر میں آجائینگے۔ اور اس مکہ کو جس میں سے وہ صرف اپنے ایک ساتھی کے ساتھ نکلے تھے دس ہزار صحابہ سمیت فتح کرینگے چنانچہ فرمایا وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِھٰذَا الْبَلَدِ کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو اس شہر میں اترنے والا ہے۔ یہ لازمی بات ہے کہ آپ اس شہر میں اسی صورت میں اتر سکتے تھے۔ جب آپکو پہلے اس شہر سے نکالا جاتا۔ گویا ایک ہی فقرہ میں ہجرت کی بھی خبر دے دی۔ اور فتح مکہ کی بھی خبر دے دی۔ اس طلوع فجر کی بھی پیشگوئی کر دی۔ جو لیالی عشر کے بعد ظاہر ہونے والی تھی۔ اور اس دوسری فجر کی بھی پیشگوئی کر دی۔ جو گیارھویں رات کے بعد ظاہر ہونے والی تھی۔ اور جس کا آغاز بدر سے ہوا۔ اور جس کا اتمام فتح مکہ پر ہوا۔

پھر یہ بتایا گیا ہے۔ کہ ان کے ظلموں کا نتیجہ ان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ کیونکہ اگر یہ ظلم نہ کرتے۔ تو شاید رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہم صلح کے ساتھ اس شہر میں لاتے۔ مگر چونکہ انہوں نے ظلم کیا ہے۔ اور بلد اللہ الحرام کو حلال کر لیا ہے اس لئے کچھ وقت کے لئے ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

کو تلوار کے زور سے اس شہر میں داخل ہونے کی اجازت دیگے۔ اور پھر جو ان کی ذلت و رسوائی ہوگی۔ اس کے وہ خود ذمہ دار ہونگے۔

پھر یہ بتایا کہ تُو اس شہر کا مقصود ہے۔ یعنی پیشگوئیاں شروع دن سے جب سے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے خانہ کعبہ کی بنیاد ڈالی تیری طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ اور اسی وقت سے یہ خبر دے دی گئی تھی۔ کہ ایک عظیم الشان نبی آنے والا ہے جس کا کام یہ ہوگا۔ کہ وہ تلاوت آیات کریگا۔ اور تزکیہ نفوس کریگا۔ اور کتاب اور حکمت سکھائیگا۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کی خانہ کعبہ کی بنیاد اونچی کرنے کے وقت کی دعا سے معلوم ہوتا ہے۔ جو سورۂ بقرع ۱۵ میں ان الفاظ میں ذکر کی گئی ہے۔ کہ وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔ یعنی اے خدا مکّہ کے رہنے والوں میں رسول مبعوث فرما۔ جو تیری آیات ان لوگوں پر پڑھے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھائے۔ اور انہیں پاک کرے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ہی پیشگوئی تھی۔ اور آپ ہی اس شہر کے مقصود تھے۔ اس لئے فرمایا کہ جب اس شہر کی بنیاد محض تیرے لئے رکھی گئی تھی۔ تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ وہ مقصد پورا نہ ہو۔ جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کارخانۂ عالم کو قائم کیا تھا۔ اس مقصد کا پورا ہونا تو نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ شروع سے ہی جب یہ بنیاد ابھی ظاہر بھی نہیں ہوئی تھی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا مکّہ میں آنا۔ عربوں کا رجوع۔ اس شہر کا فتنوں سے پاک رکھنا اور غیر مذاہب کے اثرات سے اس کا محفوظ رہنا یہ ساری باتیں آخر کس لئے تھیں۔ اسی لئے تو تھیں کہ تُو اس شہر کا مقصود تھا۔ اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ دُنیا میں تیری بعثت ہو۔ مکّہ ایک بے آب و گیاہ وادی میں تھا۔ کوئی مہذب قوم اس کے ارد گرد نہیں رہتی تھی۔ بلکہ وہ ظالم اور ڈاکو جو کسی قانون کے ماتحت نہیں تھے۔ اس کے چاروں طرف بستے تھے۔ ان کا دن رات کام یہی تھا۔ کہ وہ آپس میں لڑتے رہیں۔ اور کشت و خون کا بازار گرم رکھیں۔ مگر ایسے ظالم اور ڈاکو بھی جب لڑتے ہوئے مکّہ کے سامنے آتے۔ تو ان کی تلواریں جھک جاتیں اور وہ کہتے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں لڑائی جائز نہیں۔ پھر عرب لوگ وہ تھے۔ جو اپنا گزارہ نہایت تنگی سے کرتے۔ انہیں کھانے پینے کے سامانوں کے لحاظ سے کسی قسم کی آسائش اور سہولت میسر نہیں تھی۔ مگر جب ذی الحجہ کے دن آتے۔ تو وہ اپنے اونٹوں پر کجاوے کستے اور بے آب و گیاہ میدانوں اور بیابانوں میں اپنے اونٹوں کو ایڑیاں مارتے ہوئے مکّہ میں آتے۔ اور حج بیت اللہ کے فرض کو سرانجام دیتے۔ پھر مکّہ وہ شہر تھا جسے خدا نے ہر قسم کی آفات سے بچایا۔ اور جب بھی کوئی دشمن اس پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا اللہ تعالیٰ نے اس کو ناکام کیا۔ ابرہہ آیا۔ اور وہ اس ارادہ سے آیا۔ کہ وہ اس شہر کو تباہ کردیگا۔ وہ خانہ کعبہ کو گرا دیگا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے تمام ارادوں اور اس کی تدابیر کو خاک میں ملا یا۔ اور آسمانی عذاب کا اسے نشانہ بنادیا۔ یہ خدا تعالیٰ کا کیسا زبردست نشان ہے۔ جو اس نے مکّہ کی حفاظت کے سلسلہ میں دکھایا۔ اور دُنیا پر ثابت کردیا۔ کہ بیت اللہ کا میں محافظ ہوں کوئی اور محافظ نہیں ہے۔ ابرہہ یمن کا گورنر تھا۔ اور حبشہ کے بادشاہ کی طرف سے مقرر تھا۔ عرب میں اگر کوئی آباد اور اچھا علاقہ ہے تو وہ یمن کا ہی ہے۔ بڑا زرخیز علاقہ ہے۔ زراعت بھی اچھی ہوتی ہے۔ اور پھل بھی وہاں کثرت سے ہوتے ہیں۔ ایسے آباد علاقہ اور سب سے طاقتور علاقہ کا گورنر جو بہت بڑی فوجوں کا مالک تھا دس ہزار لشکر کے ساتھ آیا اور اس ارادہ اور نیت سے آیا۔ کہ میں مکّہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دونگا۔ مگر خدا تعالیٰ نے اس کے لشکر میں چیچک کی وبا پیدا کردی۔ اور حبشی جو اس کی فوج میں شامل تھے۔ وہ ایک ایک کرکے ہلاک ہونے لگ گئے۔ حبشی لوگوں میں چیچک کا مرض نہایت مہلک ہوا کرتا ہے۔ اگر کسی حبشی کو یہ مرض ہو جائے۔

تو اس کی موت یقینی ہوتی ہے۔ دنیا میں مختلف امراض مختلف قوموں سے تعلق رکھتی ہیں۔ چیچک کا مرض حبشیوں کے لئے نہائت خطرناک ہوتا ہے۔ اور ڈیسنٹری کا مرض یورپین لوگوں کے لئے نہائت خطرناک ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ ایک شخص اچھا بھلا ہوتا ہو ہل ہاتھ میں لئے اپنی زمین کیطرف جارہا ہوتا ہے۔ کہ راستہ میں اسے کوئی دوست ملتا ہے۔ اور اس سے پوچھتا ہے۔ سناؤ کیسا حال ہے وہ کہتا ہے اچھا ہے۔ صرف کچھ پیچش لگ گئی ہے۔ لیکن انگریز کو ذرا بھی پیچش ہو فوراً اس کا دل ڈر جاتا ہے۔ اور وہ خیال کر لیتا ہے۔ کہ اب میری موت قریب آ پہونچی ہے۔ غرض مختلف امراض کا صرف افراد سے ہی نہیں بلکہ مختلف قوموں سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ اور جب کسی قوم میں اس کا مخصوص مرض پیدا ہو جائے۔ تو وہ قوم تباہ ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ حبشیوں کے لئے چیچک بڑا جان لیوا مرض ہے۔ وہ اس کا نام بھی سن لیں۔ تو اُن کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کئے۔ کہ ابرہہ کے لشکر میں چیچک کا مرض پیدا ہو گیا۔ اور سب میں ایک کھلبلی پیدا ہو گئی۔ یوں مکہ کو فتح کرنا ان کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ وہ ساز و سامان اور اسلحہ سے آراستہ تھے۔ اور مکہ والے بالکل نہتے تھے۔ وہ ایک باقاعدہ فوج کا مقابلہ کس طرح کر سکتے تھے۔ مگر خدا تعالےٰ نے ان میں وہ مرض پیدا کر دیا۔ جس کے نام سے ہی حبشیوں کی جان نکل جاتی ہے۔ چنانچہ ادھر مرض پیدا ہوا۔ اور ادھر انہوں نے سمجھ رکھ دیئے۔ کہ اب ہمارا خاتمہ قریب ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ان میں موتیں شروع ہو گئیں۔ اور سارے لشکر میں بھاگڑ مچ گئی۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جب ایک شخص بھاگتا ہے۔ تو دوسرے کے دل میں بھی کمزوری پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے جب لشکر کا ایک حصہ سراسیمہ اور پریشان ہو کر بھاگا۔ تو دوسرے حصہ کے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اور اس نے بھی بھاگنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یمن پہونچنے سے پہلے پہلے اس کے لشکر کا بہت بڑا حصہ برباد ہو گیا۔ اور جس مقصد کے لئے وہ مکہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ خدا تعالےٰ نے اس میں اسے خائب و خاسر اور ناکام و نامراد رکھا:

اللہ تعالےٰ ان تمام واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ کہ لوگوں کو سوچنا چاہیئے۔ کہ آخر ہم یہ باتیں کیوں کر رہے تھے۔ ہم اس دُعا کو پُورا کرنے کے لئے یہ سب باتیں کر رہے تھے۔ جو ابراہیمؑ نے کی۔ کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ؕ (البقرہ ع ۱۵) اب یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ جو اس شہر کا اصل مقصود تھا۔ جس کے لئے اڑھائی ہزار سال سے مکہ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ جب وہ ظاہر ہو جائے۔ تو خدا اس کی طرف توجہ نہ کرے۔ پس فرماتا ہے۔ لَا أُقْسِمُ بِهَٰذَا الْبَلَدِ وَأَنتَ حِلٌّ بِهَٰذَا الْبَلَدِ ہم شہادت کے طور پر اس شہر کو پیش کرتے ہیں۔ اس حالت میں جبکہ تو مکہ کی بنیاد کا مقصود ہے۔ تیرے مقصود ہونے کی صورت میں مکہ کی جو قیمت ہے۔ وہ تیرے غیر مقصود ہونے کی صورت میں ہرگز نہیں۔ مکہ کی عظمت اور اس کا جلال محض تیری وجہ سے ہے۔

پس اس آیت کے معنے یوں ہونگے۔ کہ

(۱) ہم مکہ کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جس میں مسلمانوں پر کئی قسم کے مظالم ہونے والے ہیں۔ یعنی ہم نے گزشتہ سورتوں میں مخالفین اسلام کی جن منظم سازشوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ مکہ خود ان سازشوں کا ثبوت بہم پہنچا دیگا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ مخالفت تو قیاسی امر ہے۔ جو مدعی بھی کھڑا ہوتا ہے۔ لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ تو نہیں ہوتا۔ کہ اس کی باتوں کو سنتے ہی لوگ فوراً ایمان لے آئیں۔ اور کسی قسم کی مخالفت نہ کریں جب بھی کوئی ایسا مدعی کھڑا ہوتا ہے۔ جو دوسروں کے عقائد کے خلاف کوئی بات پیش کرتا ہے۔ لوگ اس کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ میری مخالفت ہوگی۔ اور مسلمانوں کو تکالیف پہنچائی جائینگی۔ یہ پیشگوئی کسطرح بن گئی

یہ تو ایک قیاسی امر تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قیاس کر لیا ہوگا۔ کہ چونکہ مکہ والوں کے سامنے میں نے ایک نئی بات پیش کی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مکہ والے مخالفت بھی کریں۔ اب اس کو پیشگوئی کس لحاظ سے قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے۔ کہ اول تو ہر مدعی کو مخالفت نصیب نہیں ہوتی۔ دنیا کے متعلق انسانی ارادے بے شک مخالفت پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر الہام کے نازل ہونے کا دعویٰ کرنا یہ کوئی ایسی چیز نہیں۔ جو ضرور مخالفت پیدا کرے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اس ارادہ سے کھڑا ہو جائے کہ وہ دوسرے کے گھر پر قبضہ کر لیگا۔ تو دوسرا شخص اس سے ضرور لڑیگا۔ لیکن اگر وہ یہ کہیگا۔ کہ مجھے الہام ہوتا ہے۔ تو دوسرے کو کوئی غصہ نہیں آئیگا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی سمجھیگا۔ کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جو ایسی باتیں کہتا ہے۔ تو یہ بات بالکل غلط ہے کہ جو بھی مدعی الہام دنیا میں کھڑا ہو۔ ضرور اس کی مخالفت ہوتی ہے۔ مجھے ایک دفعہ ظہیر الدین اروپی نے جو مصلح موعود ہونے کا مدعی تھا بڑے جوش سے لکھا۔ کہ میں اتنے عرصہ سے آپ کے خلاف اشتہار اور ٹریکٹ وغیرہ شائع کر رہا ہوں۔ مگر آپ ان میں سے کسی کا جواب ہی نہیں دیتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ مجھے مان لیں۔ مگر یہ کیا بات ہے۔ کہ آپ بالکل خاموش بیٹھے ہیں۔ اور مخالفت بھی نہیں کرتے۔ اگر آپ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ تو کم از کم مخالفت ہی کریں خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔ میں نے اسے جواب میں لکھا۔ کہ مخالفت بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے نصیب ہوتی ہے۔ اور یہ بھی سچائی کی ایک علامت ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے نہیں چاہا۔ کہ تمہارے اندر یہ علامت بھی پائی جائے۔ اس لئے خواہ تم کتنی ہی خواہش رکھو۔ کہ لوگ تمہاری مخالفت کریں۔ تمہیں یہ مخالفت بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جو مدعی بھی کھڑا ہو۔ لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ مخالفت بھی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ بھی خدا تعالیٰ کے فضل کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے چنانچہ دیکھ لو احمدیت کی مخالفت ہر ملک میں ہوئی لیکن بہائیت کی مخالفت اس طرح نہیں ہوئی۔ صرف بابیوں کی مخالفت ایران میں ان کی سیاسی چالوں کی وجہ سے ہوئی۔ حالانکہ وہ لوگ قرآن کو منسوخ قرار دیتے اور بہاء اللہ کی شریعت اس کی بجائے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مسلمان یہ سب باتیں دیکھتے اور جانتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ بہائیوں کی کوئی مخالفت نہیں کرتے۔ بلکہ ان کو اپنے گلے سے لگاتے ہیں۔ لیکن جہاں احمدیت کا ذکر آ جائے۔ وہاں فوراً مخالفت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پس اول تو یہ بات ہی غلط ہے۔ کہ مخالفت ایک قیاسی امر تھا۔ اور ضروری تھا۔ کہ لوگ آنحضرت کو اور آپ کے ساتھیوں کو تکالیف میں مبتلا کرتے۔ دوسرے سوال یہ ہے۔ کہ اگر یہ قیاس ہی تھا۔ تو نبوت کے دعوے کے تین سال کے بعد کیوں پیدا ہوا۔ شروع شروع میں ہی یہ قیاس کیوں نہ کر لیا گیا۔ کہ مکہ والوں کی طرف سے اسلام کی شدید مخالفت ہوگی ؞

پھر ایک اور بات یہ ہے کہ ایک مخالفت وہ ہوتی ہے جو انسان خود کرواتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے ارادہ کیا۔ کہ وہ دوسرے کی بھینس چوری کرے۔ یا اس نے ارادہ کیا۔ کہ وہ دوسرے کے گھر پر قبضہ کرے۔ اب اگر وہ اپنے ارادہ کا علم رکھتے ہوئے دوسرے کو قبل از وقت خبر دے دے۔ کہ فلاں شخص فلاں دن مجھ سے لڑیگا۔ تو یہ ہرگز پیشگوئی نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ فساد اس کے نفس کی طرف سے ہے۔ اور وہ اپنے ارادوں کو جانتے ہوئے کہہ سکتا ہے۔ کہ فلاں فلاں شخص میرے ساتھ لڑائی کرینگے۔ لیکن اگر اس کی طرف سے صلح کے سامان ہو رہے ہوں محبت اور پیار کی تعلیم دی جا رہی ہو۔ تو ایسی حالت میں کسی مخالفت کے متعلق قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ پس مخالفت خود اکسا کر لانا اور شے ہے۔ اور امن پسند ہونے کے باوجود لوگوں کا مخالفت کرنا اور امر ہے۔ کسی کے گھر پر تم قبضہ کر لو۔ تو وہ ضرور لڑیگا۔ اور اس فساد کی تم اپنے ارادہ کو جانتے ہوئے قبل از وقت خبر بھی دے سکتے ہو۔ مگر تم اپنے گھر میں بیٹھے ہو۔ اور کوئی دوسرا

شخص تمہارے گھر پر آکر قبضہ کرے۔ تو تم کو اس کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے دشمنوں کا معاملہ ایسا ہی تھا۔ آپ صلح و آشتی کا پیغام دیتے تھے۔ اور مخالفین مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے تھے۔

آخر وہ کونسی چیز تھی۔ جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعویٰ کے تین سال بعد مسلمانوں میں زائد طور پر پیدا ہو گئی تھی۔ اور جس کی بناء پر انہوں نے مخالفت کرنا ضروری سمجھا۔ نماز وہ پہلے بھی پڑھا کرتے تھے۔ نیکی اور تقوے کی وہ پہلے بھی ترغیب دیا کرتے تھے۔ وہ پہلے بھی یہی کہا کرتے تھے۔ کہ خدا ایک ہے۔ اور وہی انسانوں کا مددگار ہے۔ اسی پر بنی نوع انسان کو توکل رکھنا چاہیئے۔ اور اسی سے اپنی حاجات مانگنی چاہئیں۔ وہ پہلے بھی یہی کہا کرتے تھے۔ کہ کفر بُری چیز ہے اور اسلام سچا مذہب ہے۔ پس کونسی وہ زائد بات تھی جس پر مکہ والوں کو جوش آ سکتا تھا یا انہیں جوش میں آنا چاہیئے تھا۔ یقیناً جہاں تک اعتقادات کا سوال ہے مسلمانوں میں کوئی زائد چیز ایسی پیدا نہیں ہوئی۔ جس پر ان کو تین سال کے بعد غصہ پیدا ہوتا اور انہوں نے مسلمانوں کو مبتلائے آلام کرنا شروع کر دیا پس تین سال کے بعد اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں کو مخالفت کی خبر دینا اس لئے نہیں تھا۔ کہ مسلمانوں کے مذہب یا ان کے اعتقادات کا کفار مکہ کو پہلے علم نہیں تھا۔ بلکہ اس لئے تھا۔ کہ اب مسلمانوں کو ایسی ترقی حاصل ہو رہی تھی۔ کہ کفار یہ سمجھنے لگ گئے تھے۔ کہ اب ہمارے لئے یہ ایک مستقل خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور اس کا ازالہ ضروری ہے۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کو ایسی طاقت دے دینا جس سے کفار کو اپنے لئے حقیقی خطرہ نظر آنے لگ گیا۔ یہ کس کا کام تھا۔ اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں۔ کہ یہ خدا تعالیٰ کا کام تھا کسی انسان کا کام نہیں تھا۔ پس کفار مکہ کی مخالفت کی خبر دینا کوئی قیاسی امر نہیں تھا۔ بلکہ ایک آسمانی خبر تھی۔ جو علم غیب پر مشتمل تھی۔ اور جس کی صداقت کی انہوں نے اپنے عمل سے تصدیق کر دی۔

دوسرے معنوں کے رُو سے شہادت یہ ہوگی۔ کہ تُو اس میں ہر تیر کا نشانہ بنے گا۔ اب یہ ایک مبالغہ آمیز امر نہیں۔ بلکہ جیسا کہ میں نے بتایا ہے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ہر قسم کے ظلم ہوئے (۱) آپ کو عبادت سے روکا گیا (۲) مارا پیٹا گیا۔ (۳) گالیاں دی گئیں (۴) تعلقات باہمی سے روکا گیا۔ (۵) غذا سے روکا گیا (۶) تبلیغ سے روکا گیا (۷) صحابہؓ کو پتھروں پر گھسیٹا گیا (۸) ہجرت سے روکا گیا۔ لوگ مارتے ہیں تو کہتے ہیں نکل جاؤ۔ مگر یہاں مارتے بھی تھے۔ اور نکلنے بھی نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ بعض صحابہ جب ان مظالم سے تنگ آکر چوری چھپے حبشہ کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے۔ تو مکہ کے بعض بڑے بڑے رؤسا نجاشی کے پاس پہنچے اور کہا کہ یہ ہمارے غلام ہیں۔ جو ہمارے ملک سے بھاگ کر یہاں آ گئے ہیں انکو واپس کیا جائے گویا ان کی سکیم یہی تھی۔ کہ ہم مسلمانوں کو نہ مکہ میں آرام سے رہنے دینگے۔ اور نہ ان کو باہر جانے دینگے۔ (۹) عورتوں کو شرمناک طریقوں سے مارا گیا (۱۰) جھوٹے الزامات لگائے گئے کبھی پاگل کہا گیا کبھی خود غرض کہا گیا کبھی جھوٹا کہا گیا۔ کبھی عزت کا متلاشی کہا گیا۔ کبھی کاہن اور کبھی دوسری کتب سے چرا کر مضمون بنانے والا کہا گیا۔ غرض کوئی تیر نہ تھا۔ جو مکہ والوں نے آپ پر نہ چلایا ہو۔

تیسرے معنے یہ تھے کہ تو اس شہر میں سے جا کر پھر اترنے والا ہے۔ یعنی یہ شہر دو زبردست ثبوت اسلام کی صداقت کے پیش کریگا۔ اوّل محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کا۔ اور پھر آپ کے واپس آنے کا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ محال تھے۔ مکہ والے اس سورۃ کے نزول کے وقت میں یا آپ کو ناقابل التفات سمجھتے تھے۔ یا آپ کو ایک قابل احترام وجود سمجھتے تھے۔ دونوں حالتوں میں آپ کے اخراج کا کوئی خیال بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا نکالا جانا اس قدر ناممکن نظر آتا تھا۔ کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلا الہام ہوا۔ اور آپ گھبراہٹ اور اضطراب کی حالت میں گھر تشریف لائے۔ تو آپ نے حضرت

خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ وہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ جو ان کے چچا زاد بھائی اور بائبل کے بہت بڑے عالم تھے اُن سے ان الہامات کا ذکر کیا۔ ورقہ بن نوفل نے خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی حالات دریافت کئے۔ اور آپ نے وہ تمام واقعہ تفصیل کے ساتھ سنایا۔ جو غارِ حرا میں آپ کے ساتھ گزرا تھا۔ ورقہ بن نوفل آپ کی گفتگو سننے کے بعد کہنے لگے۔ اس پر تو وہی فرشتہ نازل ہوا ہے۔ جو موسےٰ پر نازل ہوا تھا۔

اس جگہ ضمنی طور پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ ورقہ بن نوفل عیسائی تھے اور وہ صحف مقدسہ کا اکثر مطالعہ رکھا کرتے تھے۔ اگر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی کسی ویسی ہی شریعت کا بانی سمجھتے جس قسم کی شریعت کے بانی حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔ تو وہ قطعاً یہ نہ کہتے کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسےٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ بلکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیتے۔ اور کہتے یہ وہ فرشتہ ہے جو عیسےٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ یا یہ کہتے کہ تم پر تو کوئی فرشتہ نازل ہی نہیں ہو سکتا۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام آچکے۔ اور وہی دنیا کے آخری نجات دہندہ تھے۔ اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا مگر وہ سنتے ہیں تو یہ کہتے ہیں۔ هَـٰذَا النَّامُوسُ الَّذِي أُنْزِلَ عَلَىٰ مُوسَىٰ۔ یعنی یہ تو وہی فرشتہ ہے جو موسےٰ نبی پر وحی آسمانی لایا تھا۔ پھر انہوں نے کہا يَا لَيْتَنِي كُنْتُ جَذَعًا إِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ کاش میں اس وقت قوی اور طاقتور ہوتا جب تیری قوم تجھ کو مکہ میں سے نکال دیگی۔ اگر مجھ میں ہمت اور طاقت رہی۔ اور اگر میں اس وقت زندہ ہوا۔ تو أَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا۔ میں اپنی پوری ہمت اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ تیری مدد کرونگا۔ ورقہ بن نوفل کی یہ بات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اتنی عجیب تھی۔ کہ آپ اس کو سنکر حیران رہ گئے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ آپ کو الہام ہو چکا تھا۔ آپ نے حیرت سے کہا أَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ۔ کیا مکہ کے لوگ مجھ کو نکال دینگے۔ یعنی میرے جیسا پُر امن اور صلح پسند انسان جو ہر قسم کے حقوق کو ادا کرنے والا ہے۔ اسے مکہ کے لوگ کس طرح نکال سکتے ہیں۔ میری ان سے کوئی دشمنی نہیں۔ میں ان کا کبھی بدخواہ نہیں ہوا۔ میری ان سے کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ پھر اسی مکہ میں میرے رشتہ دار اور دوست موجود ہیں۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے مکہ میں سے نکال دیں۔ دنیا میں لوگ اگر کسی کو نکالتے ہیں تو دشمنی کی وجہ سے مگر میری تو کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ کیا میرے جیسے پُر امن کو بھی یہ لوگ نکال دینگے۔ اور اگر نکالینگے تو کیا جرم ہوگا۔ اور کونسا قصور ہوگا۔ جس کی وجہ سے میں اس مکہ سے نکالا جاؤنگا۔ کتنے مختصر مگر کتنے گہرے معانی رکھنے والے وہ الفاظ ہیں۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقعہ پر استعمال فرمائے۔

أَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ بظاہر ایک چھوٹا سا فقرہ ہے مگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قلبی کیفیات کی ایک وسیع دنیا ان الفاظ میں آباد ہے۔ اگر ایک طرف ان الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل کس قدر صلح اور آشتی اور محبت کے جذبات سے لبریز تھا۔ تو دوسری طرف ان الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود خود مکہ والوں کی نگاہ میں اس قدر محبوب تھا کہ ظاہری حالات کے لحاظ سے یہ بالکل ناممکن نظر آتا تھا کہ وہ آپ جیسے انسان کو مکہ میں سے نکال سکینگے۔ مگر پھر ہوا یہی کہ انہوں نے باوجود آپ کی صلح پسندی کے اور باوجود آپ کے پُر امن ہونے کے آپ کو مکہ میں سے نکالدیا۔ اور خدا کی بات پوری ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ مخالف حالات کو دیکھ کر بعض دفعہ قبل از وقت ایک رائے کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کا نام پیشگوئی رکھ لیا جاتا ہے۔ میں ایسے لوگوں سے کہتا ہوں۔ وہ اس پیشگوئی پر غور کریں۔ اور سوچیں کہ کیا عالم الغیب خدا کے سوا کوئی انسان اپنی طرف سے یہ بات کہہ سکتا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک دن مکہ میں سے ہجرت

کرنی پڑیگی۔ اور لوگوں کو تو جانے دو۔ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہیں سمجھتے تھے۔ اور آپ حیران ہوتے تھے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ مَیں مکّہ میں سے نکالا جاؤں۔ اور جس امر کو آپ نہ سمجھ سکتے تھے۔ اسے کوئی دُوسرا کیا سمجھ سکتا تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ آپ کی اپنی نگاہ میں یہ بات ناممکن تھی۔ مگر مکّہ والوں کے حالات کے لحاظ سے یہ بات ناممکن نظر آتی تھی۔ پھر بھی خدا کی بات پُوری ہوئی۔ اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک لمبے عرصہ کے شدید مظالم کے نتیجہ میں مکّہ سے ہجرت کرنی پڑی۔

اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مکّہ میں واپس آنا کیسا ناممکن نظر آتا تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس وقت کون شخص خیال بھی کر سکتا تھا؟ کہ رات کی تاریکی میں مکّہ سے دو بھاگنے والے ایک دن دس ہزار کا لشکر جرار اپنے ساتھ لئے فاتحانہ حیثیت سے مکّہ میں داخل ہونگے۔ اور مکّہ کے بڑے بڑے سردار مسلمانوں کے رحم وکرم پر ہونگے۔ کہ وہ جیسا چاہیں ان سے سلوک کریں۔ اس وقت کون ان باتوں کو اپنے وہم وگمان میں بھی لا سکتا تھا۔ اور کون کہہ سکتا تھا۔ کہ وہ کفار جو آج خوش ہو رہے ہیں۔ جو اس خیال سے پھولے نہیں سماتے۔ کہ وہ اسلام کی شوکت کو مٹانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے صرف چند سال کے عرصہ کے اندر اندر وہی شخص جسے مکّہ سے نکالا گیا تھا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکّہ میں واپس آئیگا۔ اور بڑے جاہ وجلال کے ساتھ فرمائیگا۔ کہ اے مکّہ والو بتاؤ۔ اب مَیں تم سے کیا سلوک کروں۔ اور وہ یہ جواب دینگے۔ کہ وہی سلوک کریں۔ جو یوسف نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ ہجرت کے وقت زیادہ سے زیادہ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا۔ کہ افسوس ہم آپ کو مار نہ سکے۔ اور بعض لوگ سمجھتے ہونگے۔ کہ چلو اچھا ہوا خس کم جہاں پاک (نعوذ باللہ من ذالک) ہماری نگاہوں سے تو وہ اوجھل ہوا۔ اب ہمیں اس سے کیا غرض کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ ہم نے اسے اپنے شہر سے تو نکال دیا۔ اس وقت کون خیال کر سکتا تھا۔ کہ وہی لوگ جو آج یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ چلو اچھا ہوا ہمیں چھٹی مل گئی۔ ایک بلا اور مصیبت سے چھٹکارا ہوا۔ انہی لوگوں میں وہ ایک فاتح جرنیل کی حیثیت میں واپس آئیگا۔ اور پھر کون یہ خیال بھی کر سکتا تھا۔ کہ وہ اتنی جلدی واپس آئیگا۔ کہ لوگوں کے لئے نہ صرف اس کی واپسی بلکہ اس قدر جلد واپسی حیرت انگیز ہوگی۔ واقعہ میں اگر غور کیا جائے۔ تو یہ ایک ایسا عظیم الشان نشان ہے جس سے خداتعالیٰ کی ہستی اور اس کی طاقت وجبروت کا نقشہ انسانی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مکّہ سے رات کی تاریکی میں دو بھاگنے والے بھاگے اور اس حالت میں بھاگے کہ انہیں اپنی جان خطرہ میں گھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اور کفار نے یہ ارادہ کیا ہوا تھا۔ کہ ان کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ مگر پھر آٹھ سال کے بعد اسی مکّہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک فاتح کی حیثیت میں واپس آئے۔ آٹھ سال میں تو ایک ڈاکو بھی پُوری طرح تیار نہیں ہوتا۔ مگر یہاں یہ خبر دی گئی تھی۔ کہ آٹھ سال کے اندر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو صرف ایک ساتھی کے ساتھ مکّہ سے رات کے وقت بھاگے تھے۔ اور جن کو زندہ یا مردہ پکڑ لانے پر انعام مقرر تھا۔ وہ آٹھویں سال مکّہ میں داخل ہونگے۔ ایک فاتح جرنیل کی حیثیت میں داخل ہونگے۔ اور ایسی حالت میں داخل ہونگے۔ کہ قیدار کی ساری حشمت تباہ ہو چکی ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور آپ اللہ تعالےٰ کی تائید اور اس کی نصرت کے ساتھ اسلام کی فتح کا جھنڈا اڑاتے ہوئے مکّہ میں داخل ہوئے۔ اور یہ پیشگوئی بڑی شان کے ساتھ پوری ہوئی۔ کہ اَنْتَ حِلٌّ بِھٰذَا الْبَلَدِ (اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ)

دیکھو یہاں کس طرح ابتدائی زمانہ میں ہی فجر کے معنی بھی کر دیئے یعنی ہجرت اور ایک ہی وقت میں دُوسری کامل فجر جو بدر سے شروع ہوئی۔ اور فتح مکّہ پر مکمل ہوئی۔ اس کا بھی ذکر کر دیا۔ کہ دوسرا ثبوت مکّہ ہماری باتوں کی درستی کا اس طرح دیگا۔ کہ تُو اس شہر میں پھر نازل ہوگا۔ اور پھر اللہ تعالےٰ کا جلال اور اس کی قدرت کا ایک

عظیم الشان نشان تیرے ذریعہ سے مکہ میں نظر آنے لگ جائیگا۔

پھر اللہ تعالیٰ اس بات کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہے کہ یہ مکہ ایک لمبے عرصہ سے محفوظ چلا آتا تھا۔ جب لوگ بت پرست اور دین سے غافل تھے۔ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے ابرہہ سے اس کی حفاظت کی۔ مگر اب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں سے قہراً فتح ہوگا۔ اور نہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا داخلہ آپ کی سچائی کا ثبوت ہوگا۔ بلکہ قہراً داخلہ دوسری دلیل مہیا کریگا کہ اگر خدا تعالیٰ ان کے ساتھ نہیں۔ تو ان کو مکہ میں قہراً داخل ہونے کی اس نے کیوں اجازت دی۔ گویا علاوہ داخلہ کی پیشگوئی کے پورا ہونے کے یہ مزید دلیل ہوگی۔ اس امر کی کہ آپ سچے ہیں۔ جو بات ابرہہ کو نصیب نہ ہوئی۔ وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نصیب ہوگئی۔ ابرہہ آیا تو خدا تعالیٰ نے اسے اپنے عظیم الشان لشکر سمیت تباہ کردیا اور اسے مکہ میں داخل نہ ہونے دیا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار کا لشکر لے کر مکہ کی طرف آئے۔ تو خدا نے آپ کو اپنے لشکر سمیت مکہ میں داخل کردیا۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نہ صرف مکہ میں داخلہ ایک پیشگوئی کو پورا کرنے والا ہے۔ بلکہ آپ کا تلوار کے زور سے مکہ میں داخل ہونا ایک دوسری پیشگوئی کو پورا کرنے والا ہے۔ اگر بالفرض مکہ والے آپ سے کہتے کہ آپ اپنے شہر میں واپس آجائیں۔ اور آپ واپس آجاتے تو اس سے صرف ایک پیشگوئی پوری ہوتی۔ مگر آپ کا داخلہ دو پیشگوئیوں کو پورا کرنے کا موجب بنا۔ یعنی نہ صرف آپ مکہ میں داخل ہوئے۔ بلکہ الٰہی پیشگوئی کے مطابق مکہ کی حرمت کو توڑتے ہوئے اس میں داخل ہوئے دنیا کی گذشتہ ۲۵ سو سال کی تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی۔ کہ کوئی شخص تلوار کے زور سے مکہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔ ابرہہ آیا۔ اور اس نے تلوار کے زور سے مکہ میں داخل ہونا چاہا۔ مگر خدا نے اُسے تباہ کردیا۔ لیکن فرماتا ہے اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا

الْبَلَدِ۔ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم تیرے لئے اس شہر کو حلال کردیا جائیگا۔ اور تیرے ذریعہ اس شہر کو تلوار کے زور سے فتح کیا جائیگا۔ مکہ والوں کا یقین ہے کہ کوئی شخص تلوار کے زور سے ہمارے شہر کو فتح نہیں کرسکتا۔ مگر ہمارا تجھ سے نہ صرف یہ وعدہ ہے کہ ہم تجھے واپس لائینگے۔ بلکہ یہ بھی وعدہ ہے کہ ہم تلوار کے زور سے واپس لائینگے تاکہ مکہ والوں کا جو یہ عقیدہ ہے کہ کوئی شخص تلوار سے مکہ کو فتح نہیں کرسکتا وہ تیرے ذریعہ سے باطل کردیا جائے۔ مگر نہ اسلئے کہ مکہ کو حفاظت حاصل نہیں بلکہ اسلئے کہ جس نے مکہ کی حفاظت کی تھی۔ وہ بھی میں تھا۔ اور جو تلوار کے زور سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شہر میں لایا وہ بھی میں ہی ہوں۔

پانچویں یہ بتایا کہ اس شہر کو ہم اوپر کی باتوں کے لئے بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ جبکہ تو اس شہر کی بنیاد کا مقصود ہے یعنی ایسی حالت میں کہ مکہ کا مقصود تو ہے۔ ہم اسے شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور دُنیا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جبکہ شروع دن سے ظہور محمدی مکہ مکرمہ کے قیام کا موجب تھا۔ تو اب یہ لوگ کس طرح خیال کرسکتے ہیں۔ کہ صدیوں سے ایک مقصد کی طرف دنیا کو لاتے ہوئے عین جب اس مقصد کے پورا کرنے کا وقت آیا۔ تو اللہ تعالیٰ اسے بھلا دیگا۔ اور اس مقصود کا ساتھ چھوڑ دیگا۔ اگر خدا نے اس وقت مکہ کو لوگوں کا مرجع بنا دیا۔ جب مکہ کا تاج اس کے سر پر نہیں تھا۔ اگر خدا نے اس وقت مکہ کو ہر طرف سے رزق مہیا کیا۔ جب مکہ کا تاج اس کے سر پر نہیں تھا۔ اگر خدا نے اس وقت مکہ کو بڑا شہر بنایا۔ جب مکہ کا تاج اس کے سر پر نہیں تھا۔ اور اگر خدا نے اس وقت مکہ کو ہر قسم کی لڑائیوں سے محفوظ رکھا۔ جبکہ مکہ کا تاج اس کے سر پر نہیں تھا۔ تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو جو مکہ کا مقصود اور سرتاج ہے تیرے آنے کے بعد اب یہ نشانات کس طرح مٹ سکتے ہیں۔ یہ نشانات اور بھی ظاہر ہونگے۔ اور آئندہ پیدا ہونے والی پیشگوئیاں نہ صرف تیری صداقت کا ایک زندہ نشان ہونگی۔ بلکہ خود مکہ ان پیشگوئیوں کے ذریعہ اور زیادہ عزت پائیگا۔ اور خدا تعالیٰ کے کلام کے لئے دنیا کے سامنے ایک زبردست شہادت مہیا کریگا۔ کیونکہ تو مقصود ہے مکہ کا۔ تو سرتاج ہے مکہ کا۔ اور تیری طرف ہی ہزاروں سال کے تاریخی واقعات کی انگلی اشارہ کر رہی تھی۔ اب تیرے

# وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝

اور باپ کی بھی اور بیٹے کی بھی قسم کھاتا ہوں[۷]

آنے کے بعد خدا تعالیٰ کے نشانات کا ایسا ظہور ہوگا۔ جو دنیا میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ غرض ایک مختصر سے فقرہ میں اللہ تعالیٰ نے لَيَالٍ عَشْرٍ کی بھی تشریح کردی لَيَالٍ عَشْرٍ کے بعد ظاہر ہونے والی پہلی فجر کی بھی تشریح کردی اور پھر اس دوسری فجر کی بھی تشریح کردی جو گیارھویں رات کے اختتام پر جنگ بدر سے شروع ہوئی اور جس کا انتہا فتح مکہ پر ہوا۔ ان لوگوں کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کا مکہ کی فتح کے لئے آنا کتنی حیرت و استعجاب کی بات تھی۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ مکہ کے لوگ اس امید میں بیٹھے تھے۔ کہ ابوسفیان محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک نیا معاہدہ کرکے آرہا ہے۔ وہ رات کو اس امید میں سوئے کہ ابوسفیان ہمارے لئے امن کا پیغام لارہا ہے۔ مگر آدھی رات کے وقت جبکہ وہ میٹھی نیند سو رہے تھے۔ ابوسفیان گھوڑا دوڑاتے ہوئے مکہ میں داخل ہوا۔ اور بلند آواز سے پکارنا شروع کردیا۔ کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دس ہزار صحابہ سمیت مکہ کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ مگر میں ان سے یہ رعایت لے کر آیا ہوں۔ کہ جو شخص اپنے گھر کے دروازے بند کرلیگا اور ان کے مقابلہ کے لئے باہر نہیں نکلیگا۔ اسے کچھ نہیں کہا جائیگا۔ لیکن جو شخص گلیوں میں پھریگا۔ یا تلوار لے کر مقابلہ کے لئے کھڑا ہوگا۔ وہ اپنی جان کا آپ ذمہ دار ہوگا۔ اب کجا تو یہ حالت تھی۔ کہ وہ مکہ والوں کی طرف سے صلح کا سفیر بن کر گیا تھا۔ اور کجا یہ حالت ہے۔ کہ جب وہ واپس آیا۔ تو ایسی حالت میں کہ اس نے اپنی قوم سے کہا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لشکر فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہو رہا ہے۔ میں تمہیں بشارت دیتا ہوں۔ کہ تمہارے لئے میں بعض مراعات لے کر آیا ہوں۔ اور پھر اس نے ان مراعات کا ان الفاظ میں اعلان کیا۔ کہ جو شخص اپنے گھر کے دروازے بند کرکے بیٹھ رہیگا۔ اس کی جان بخشی کی جائیگی۔ لیکن اگر کوئی باہر نکلا۔ یا اس نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ تو وہ اپنی جان کا آپ ذمہ وار ہوگا۔ چنانچہ ایک طرف سے خالدؓ اپنی فوجوں سمیت مکہ میں داخل ہوئے۔ دوسری طرف سے زبیر اور سعد بن عبادہ اپنے دستے لے کر بڑھے۔ اور تیسری طرف سے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بغیر کسی لشکر کے بغیر کسی جاہ و حشم کے اکیلے مکہ میں داخل ہوئے۔ آپ کا اکیلے مکہ میں داخل ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ مکہ والے جانتے تھے۔ کہ یہ اکیلا داخلہ لشکر سمیت داخلہ سے ہزارہا گنا زیادہ شاندار ہے۔ کیونکہ گو آپ اکیلے تھے۔ مگر زبانِ حال سے مکہ والوں کو کہہ رہے تھے۔ کہ دیکھو گو میں لشکر کے بغیر مکہ میں داخل ہو رہا ہوں۔ مگر آج مجھے نظر بد سے دیکھنے کی تم میں جرأت نہیں ہے۔ میرے دائیں اور بائیں خدا تعالیٰ کے فرشتے حفاظت کے لئے کھڑے ہیں۔ اور میں توبہ کا پیغام لیکر تمہاری طرف آرہا ہوں۔ اب چاہو تو توبہ کو قبول کرکے خدا تعالیٰ کی فوج میں شامل ہوجاؤ۔ اور چاہو۔ تو ان فرشتوں کی تلوار کا شکار ہوجاؤ۔ جو دائیں طرف سے بھی مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اور بائیں طرف سے بھی مکہ میں داخل ہو رہے ہیں

[۷] **تفسیر**۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے۔ کہ وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ سے مراد سب جاندار ہیں۔ یعنی میں اِس بلد کو بھی پیش کرتا ہوں۔ اور تمام جانداروں کو بھی بطور شہادت پیش کرتا ہوں مجاہد کہتے ہیں۔ کہ اس سے مراد آدم اور ان کی ساری اولاد ہے یعنی میں اس بلد کو بھی پیش کرتا ہوں۔ اور میں تمام دنیا کے باپ اور اس کی اولاد یعنی تمام بنی نوع انسان کو بھی بطور ثبوت پیش کرتا ہوں۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ اس سے مراد تمام صلحا اور ان کی اولادیں ہیں۔ یعنی میں اس بلد الحرام کو بھی جس کا مقصود تو ہے۔ یا جس میں تو ہر تیر کا نشانہ بننے والا ہے۔ یا جس میں تو اترنے والا ہے۔ یا جسے تیرے لئے حلال کیا جانے والا ہے

ہیں کو بھی بطور شہادت پیش کرتا ہوں۔ اور تمام صلحاء اور ان کی اولادوں کو بھی بطور شہادت پیش کرتا ہوں۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ اس سے نوحؑ اور ان کی اولاد مراد ہے۔ ابو عمران الجونی کہتے ہیں۔ کہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی سب اولاد مراد ہے۔ طبری اور ماوردی کا قول ہے۔ کہ وَالِدٍ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اور وَمَا وَلَدَ سے مراد آپ کی امت ہے۔ کیونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَۃِ الْوَالِدِ میرا تعلق تم سے ایسا ہی ہے۔ جیسے باپ کا اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّھٰتُھُمْ (احزاب ع۱) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں۔ جب وہ مائیں ہوئیں تو وہ شخص جس کے تعلق کی وجہ سے وہ ہماری مائیں بنی ہیں بدرجہ اولیٰ ہمارا باپ ہوا۔ پس قرآن کریم نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو والد قرار دیا ہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بھی فرماتے ہیں۔ کہ اَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَۃِ الْوَالِدِ۔ میرا تعلق تم سے ایسا ہی ہے۔ جیسے باپ کا اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔

بحر محیط والے لکھتے ہیں۔ کہ آپ کے مقام کی قسم کھانے کے بعد آپ کی اور آپ کی امت کی قسم اظہار شرف کے لئے کھائی گئی ہے[1] میں قسم کے بارے میں بار بار بتا چکا ہوں۔ کہ قسم سے مراد محض شہادت ہوتی ہے۔ اور غرض اس کی یہ ہوتی ہے۔ کہ ان چیزوں کو ان مخصوص حالات میں یا عام حالات میں ہم بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ بعض دفعہ عام حالات مراد ہوتے ہیں۔ اور مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ ان چیزوں کے حالات سے جو سبق ملتا ہے۔ اُسے ہم بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ کہ ہمارا دعوےٰ صحیح ہے۔ لیکن کبھی ان چیزوں کے مخصوص حالات مراد ہوتے ہیں۔ جیسے یہاں فرمایا کہ ہم اس مکہ کو بطور شہادت تو پیش کرتے ہیں۔ مگر ایسے حال میں کہ اَنْتَ حِلٌّ بِھٰذَا الْبَلَدِ یہ کہنا کہ قسم اکرام کے لئے کھائی گئی ہے۔ یہ بالکل عبث بات ہے۔ دنیا میں کبھی کوئی شخص عزت کے لئے قسم نہیں کھاتا۔ کیا یہ بھی کوئی کہا کرتا ہے۔ کہ چونکہ میرے دل میں تمہاری عزت ہے۔ اس لئے میں تمہاری قسم کھاتا ہوں۔ یہ نہ عربی کا محاورہ ہے۔ اور نہ کسی اور زبان کا۔ صرف اس لئے کہ مفسرین کی سمجھ میں قسم کی حقیقت نہیں آئی۔ انہوں نے یہ کہہ دیا۔ کہ قسم اکرام کے لئے کھائی گئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ قرآن کریم میں جس کا بھی ذکر آئیگا۔ خواہ وہ ذکر کسی شہادت کے لئے آئے یا کسی کی نیکیوں کی یادگار کے طور پر آئے۔ اس کا اکرام ہو جائیگا مگر یہ ایک ضمنی بات ہے۔ قسم اکرام کے لئے نہیں کھائی جاتی۔ ہاں جب قسم کھائی جاتی ہے۔ تو اگر وہ اچھی بات کے لئے ہو۔ تو اس چیز کا اکرام بھی ہو جاتا ہے۔ مگر مقصد اکرام نہیں ہوتا۔ اکرام اس کا ایک طبعی نتیجہ ہوتا ہے۔

ووالدٍ و ما ولد کا صحیح مفہوم

میرے نزدیک وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ کے معنی (اول) حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے ہیں۔ قرآن کریم سے ہمیں پتہ لگتا ہے۔ کہ خانۂ کعبہ اور مکہ مکرمہ کا تعلق خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ علیہما السلام کے ساتھ ہے۔ اور جب ایک چیز کو بغیر تعیین کے بیان کیا گیا ہو۔ تو لازماً سب سے مقدم حق انہی وجودوں کا ہے۔ جن کا تعلق اس مضمون سے ہو۔ جو وہاں بیان ہو رہا ہو۔ چونکہ وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ سے پہلے ذکر مکہ مکرمہ کا ہے۔ اس لئے لازماً ہمیں ایسے ہی وَالِد اور مَوْلُوْد کی تلاش کرنی ہوگی۔ جن کا مکہ سے خاص تعلق ہو۔ اب ہمیں خود قرآن کریم سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے خانۂ کعبہ کی بنیاد رکھی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ میں لاکر بسایا۔ اور خدا تعالیٰ سے دُعا کی۔ کہ وہ اسے ایک شہر بنا دے۔ یہاں دُور دُور سے لوگ کھچے چلے آئیں۔ ان کو رزق میسر آئے۔ پھر یہ شہر امن والا ہو۔ اور خدا تعالیٰ کا ذکر کرنے والے اور اس کے نام پر اپنی زندگیاں قربان کرنے والے اس شہر میں پیدا ہوں۔ یہ دُعا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر کی۔ پھر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے جوان ہونے سے پہلے جب وہ ابھی بچے ہی تھے

[1] نوٹ:۔ یہ تمام حوالہ جات بحر محیط کے ہیں۔

ان کو مکہ مکرمہ میں لاکر چھوڑ دیا۔ اور ایسی حالت میں چھوڑا۔ جبکہ وہاں کھانے پینے کا کوئی سامان نہ تھا۔ محض خدا تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اور اس کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے انہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ایک بے آب و گیاہ وادی میں لاکر بسا دیا۔ پس اگر کوئی وَالِد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانۂ بعثت سے پہلے کا مکہ سے تعلق رکھنے والوں میں سے لوگوں کے ذہن میں آسکتا ہے۔ تو وہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانۂ بعثت سے پہلے اگر کسی وَلد کی طرف انسانی ذہن منتقل ہو سکتا ہے۔ تو وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں۔ یہ ایک ایسا کھلا اور بیّن امر ہے۔ کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کا منکر ہو۔ تو وہ بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت سے پہلے اگر کوئی باپ اور بیٹا مکہ مکرمہ سے خاص طور پر تعلق رکھتے تھے تو وہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام ہی تھے اور جب یہ ایسی نمایاں بات ہے تو جس باپ اور بیٹے کا یہاں ذکر ہے۔ ان کی تعیین کرنے میں ہمارے لئے کیا مشکل ہے؟

جب بغیر کسی تعیین کے ایک لفظ بولا جاتا ہے۔ تو اس کے دو ہی مفہوم ہوتے ہیں۔ یا تو وہ کلی طور پر عام ہوتا ہے۔ اور یا اتنا نمایاں ہوتا ہے۔ کہ اس کے لئے کسی تعیین کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ مثلاً جب ہم دن کا لفظ استعمال کریں گے۔ تو اس سے یا تو ہر دن مراد ہوگا۔ اور یا ایسا دن مراد ہوگا۔ جو ہماری زندگیوں پر ایسا نمایاں اثر رکھتا ہو۔ کہ خود بخود انسانی ذہن اس دن کی طرف چلا جاتا ہو۔ ہر فصیح زبان میں یہی طریق رائج ہے۔ کہ جب نکرہ استعمال کیا جائے۔ یا تو اس سے مراد وہ تمام افراد ہوں گے جو اس میں آسکتے ہوں اور یا ان افراد میں سے وہ خاص وجود جو اتنا خاص ہو کہ اس کے لئے کسی تعیین کی ضرورت نہ ہو۔ اس کے لئے نکرہ آئیگا۔ اس کے خلاف کوئی اور معنی کرنے کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ملک کی عورتیں تک جب اپنی زندگی کے خاص دن کا ذکر کریں۔ تو بغیر تعیین کے کہدیتی ہیں۔ او دن نہیں بھلدا۔ یعنی وہ دن نہیں بھولتا۔ اور مراد یہی ہوتی ہے۔ کہ وہ دن میری زندگی میں اتنا اہم ہے۔ کہ میرے سب جاننے والے صرف اشارہ سے اسے سمجھ سکتے ہیں۔

پس میرے نزدیک وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ کے یہ معنی کرنے کہ اس سے صلحا اور ان کی اولاد مراد ہے۔ یا نوح اور ان کی اولاد مراد ہے۔ یہ سب عقل کے خلاف معنے ہیں۔ اور ایک نکرہ کا وجود ان کی برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن جہاں تک حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے کا تعلق ہے (میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ساری اولاد مراد نہیں لیتا۔ بلکہ مَا وَلَدَ سے صرف حضرت اسمٰعیل علیہ السلام مراد لیتا ہوں۔) اس حد تک کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ مکہ کی بنیاد انہوں نے رکھی۔ پس جنہوں نے مکہ کو بنایا ہے۔ جنہوں نے خانہ کعبہ کی بنیادوں کو استوار کیا ہے۔ اگر ہم ان کا نام نہیں لیتے اور بغیر تعیین کے مکہ کے ذکر میں باپ بیٹے کے الفاظ سے ان کا ذکر کر دیتے ہیں۔ تو ہر عقلمند انسان سوائے ابراہیمؑ اور اسمٰعیل کے کسی اور شخص کا نام اپنے ذہن میں لا ہی نہیں سکتا۔ ہمارے ملک میں عام لوگ کہہ دیا کرتے ہیں۔ کہ "او مدینے والیا" اب جہاں تک مدینے میں رہنے والوں کا سوال ہے۔ اس میں لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگ اس وقت تک بس چکے ہیں۔ اور ان الفاظ سے یہ تعیین نہیں ہوتی۔ کہ کہنے والے نے کس کا ذکر کیا ہے۔ آیا اس سے مدینہ کا ہر شخص مراد ہے۔ یا مدینہ کا کوئی خاص شخص مراد ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ الفاظ میں کسی کی تعیین نہیں ہوتی جب کوئی شخص یہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ کہ "او مدینے والیا" "او مدینے والے" تو ہر شخص کا ذہن فوری طور پر اس امر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ کہ اس سے مراد مدینہ کا ہر شخص نہیں۔ بلکہ اس سے مراد مدینہ کا وہ مقدس انسان ہے۔ جس سے مدینہ کو عزت حاصل ہوئی۔ اب دیکھ لو۔ یہ الفاظ ہمارے ملک میں روزانہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ پنجابی شعرا جب نعت کہتے ہیں۔ تو انہی الفاظ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مخاطب کرتے

ہیں۔ مگر کبھی ان الفاظ کے متعلق کسی شخص کے دل میں شبہ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کبھی نہیں کہتا کہ یہ تو نکرہ ہے۔ اور اس سے مدینے کا ہر شخص مراد ہو سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ گو یہ نکرہ ہے۔ مگر اس سے مراد وہ معرفہ ہے۔ جس سے زیادہ مدینے کے ذکر میں اور کسی کو تعیین حاصل نہیں۔ پس جس طرح روزانہ کہا جاتا ہے۔ "او مدینے والیا" اور اس سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہوتی ہے۔ اسی طرح مکہ کے ساتھ جب بھی ایک باپ اور بیٹے کا ذکر آئیگا لازماً اس سے مراد حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام ہی ہونگے۔ اور کوئی نہیں ہوگا۔ پھر یہ بھی ایک غور کرنے والی بات ہے۔ کہ یہاں باپ اور بیٹے کو ملا کر ان کو اکٹھا ذکر کرنے کے کیا معنے تھے۔ خالی باپ یا خالی بیٹے کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ اسی لئے کہ ایک باپ اور ایک بیٹا دونوں وجود ایسے تھے جنہوں نے ملکر خانہ کعبہ بنایا۔ اس کی تعمیر کی۔ اور پھر ان دونوں سے آئندہ کے لئے ایک سلسلہ ہدایت قائم ہوا۔ وہ خالی باپ کا فعل نہیں تھا۔ خالی بیٹے کا فعل نہیں تھا۔ بلکہ ایک باپ اور ایک بیٹے کا مشترکہ فعل تھا۔ جو انہوں نے ملکر سرانجام دیا۔ اسی لئے قرآن کریم نے صرف باپ یا صرف بیٹے کا ذکر نہیں کیا بلکہ باپ اور بیٹے دونوں کا ذکر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جو واقعہ اپنی تمام جزئیات کے ساتھ اس آیت پر چسپاں ہوتا ہو ہمیں تفسیر کرتے ہوئے پہلا حق اسی کو دینا چاہیئے

اس لحاظ سے آیت کے یہ معنے ہونگے کہ ہم اس شہر کو اس حالت میں کہ تو اس میں حِلٌّ ہے شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور اسی طرح اس شہر کی بنیاد رکھنے والے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو بھی بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ کس امر کی شہادت کی؟ یا وہ دونوں کیا شہادت دیتے ہیں؟ اس کے متعلق مفسرین لکھتے ہیں۔ کہ قسم کا جواب لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ میں بیان ہوا ہے۔ جو آگے آئیگا۔ کہ ہم نے انسان کو کبد میں پیدا کیا ہے میرے نزدیک یہ درست ہے۔ اور جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ۔ ایک بڑا قطعی اور یقینی جواب اس قسم کا ہے۔ لیکن جہاں تک ساری آیات کا تعلق ہے۔ میرے نزدیک دوسرا جواب ہے۔ پہلا جواب وہی ہے جو پہلی سورتوں میں بیان ہوا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قسم سے پہلے لَا کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور جب لَا کا لفظ استعمال کیا جائے۔ تو اس کا کوئی نہ کوئی قرینہ ہونا چاہیئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ لا کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ اظہار نہیں کیا کہ کس چیز کا انکار کیا گیا ہے۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ فصیح کلام میں لا کے اظہار کے لئے ضرور کوئی قرینہ ہونا چاہیئے۔ اور قریبی قرینہ یہی ہوتا ہے۔ کہ ماسبق کی طرف اشارہ سمجھا جائے۔ پس جس کی طرف لَا کا اشارہ سمجھا جائیگا۔ اسی کی طرف قسم کا بھی اشارہ سمجھا جائیگا۔ میرے نزدیک لَا اُقْسِمُ کے لحاظ سے ایک جواب قسم محذوف ہے۔ اور دوسرا جواب جو اس کے ساتھ تعلق رکھنے والا ہے۔ اور جسے تائیدی طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ ہے۔ گویا یہ جواب قسم تو ہے مگر ثانوی جواب ہے۔ اصل جواب نہیں۔ اصل جواب وہی ہے۔ جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اور چونکہ وہ بیان ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حذف کر دیا۔ اس لحاظ سے معنی یہ ہونگے۔ کہ ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اس شہر کو ایسی حالت میں جبکہ تو اس میں حِلٌّ ہے۔ اور ہم وَالِدٍ ابراہیمؑ اور وَلَدٍ اسمٰعیل کو بھی اس بات کی شہادت کے طور پیش کرتے ہیں۔ کہ ہم نے پہلی آیتوں میں جو یہ باتیں بیان کی ہیں۔ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخت مخالفت ہوگی۔ یہاں تک کہ اسے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا جائیگا۔ مگر آخر وہ کامیاب ہو جائیگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس شہر میں اس کو واپس لائیگا۔ یہ ساری باتیں ہو کر رہیں گی۔ اسی طرح یہ بھی ہماری قسم کا جواب ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ۔ ہم نے انسان کو کبد میں پیدا کیا ہے۔

(آگے جب مضمون آئیگا۔ تو اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائیگا) پس یہ مزید عقلی دلیل ہوگی جو سابق شہادت کے لئے بطور تائیدی گواہ کے سمجھی جائیگی۔ لیکن اگر اسی کو جواب قسم سمجھا جائے۔ تو پھر ہم کو یہ سمجھنا ہوگا۔ کہ اللہ نے اس دعویٰ کو رد کیا ہے۔ جس کا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ سے استنباط ہوتا ہے۔ کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں ہم کو سہولت اور آرام سے بغیر کسی قسم کی قربانی کے ہر ترقی مل جائیگی۔ اور ہمیں کچھ کرنا نہیں پڑیگا۔ جیسا کہ عدم اکرام ضیف اور عدم تحضون علیٰ طعام المسکین وغیرہ حالات سے معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو رد کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ یہ بات درست نہیں۔ کہ سہولت اور آرام سے قومی ترقی حاصل ہوجائیگی۔ اور تمہیں کچھ کرنا نہیں پڑیگا۔ اخلاقی اور مذہبی اور سیاسی ذمہ داریوں سے مونہہ موڑ کر ترقی نہیں ملتی بلکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی اس طرح کیا ہے کہ وہ محنت اور مشقت سے ترقی کرتا ہے۔ چنانچہ ہم اس بات کی دلیل کے طور پر مکہ کو پیش کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں کہ تو اس میں حِلٌّ ہے۔ اور ہم ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو بھی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

ان آیات کے ایک حصہ کی تشریح اوپر گزر چکی ہے۔ اور بتایا جاچکا ہے۔ کہ لغت کے لحاظ سے حِلٌّ کے کئی معنے ہیں۔ ان سب معنوں کے لحاظ سے مکہ اس بات کا ایک یقینی ثبوت ہے۔ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خدا تعالیٰ نے اس زمانہ کی اصلاح کے لئے مبعوث کیا ہے۔ اسی طرح لَيَالٍ عَشْرٍ کی تشریح کرتے ہوئے بتایا جاچکا ہے۔ کہ مشرکین مکہ کی تکالیف کی کیا نوعیت ہوگی۔ اور وہ کس کس رنگ میں مسلمانوں کو مبتلائے آلام کرنے کی کوشش کرینگے۔ یہ بات بھی بتائی جاچکی ہے۔ کہ فجر کا ظہور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کس رنگ میں ہوگا۔ اور کس طرح کفار کی طاقت کو توڑا جائے گا۔ ان تمام واقعات سے جواب قسم خود بخود نکل آیا۔ کہ مکہ والوں کے ظلم اور ان کی تعدی اس بات کی متقاضی ہے کہ خدا تعالیٰ مکہ سے محمد رسول اللہ صلعم کو پہلے نکال لے جائے اور پھر فاتح کی حیثیت سے واپس لائے۔ اور اس طرح ثابت کرے۔ کہ ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ وہ ہماری طرف سے ہے اور وہ ضرور جیت کر رہیگا۔ اب اس کے بعد فرماتا ہے وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ۔ ہم ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو بھی شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کی شہادت اس لحاظ سے ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کی بنیاد رکھتے وقت جبکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ یہ دعا کی تھی۔ کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (البقرہ ع ۱۵) گو ولد کی شہادت کا یہاں ذکر نہیں۔ مگر یہ صاف ظاہر ہے۔ کہ جب دونوں ملکر کام کر رہے تھے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر رہے تھے۔ تو لازماً اس دعا کے وقت وہ اکیلے نہیں تھے۔ بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ جیسا کہ رَبَّنَا کے لفظ سے بھی ظاہر ہے۔ پھر اس لحاظ سے بھی یہ بات واضح ہے۔ کہ جب انہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ ملکر خانہ کعبہ کی تعمیر کی اور اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ سے بڑی بڑی دعائیں کیں۔ تو ان دعاؤں کے معنے یہی تھے۔ کہ انہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد کے متعلق دعائیں کی ہیں۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں۔ رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (ابراہیم ع ۶) یعنی اے میرے رب میں نے اپنی اولاد کو ایک وادی غیر ذی زرع میں لاکر بسایا ہے۔ محض اس لئے کہ وہ تیری عبادت کریں۔ اور تیرے دین کی خدمت میں اپنی عمر بسر کردیں تو اپنے فضل سے لوگوں کے قلوب کو ان کی طرف پھیر دے اور انہیں اپنے پاس سے رزق دے۔ تاکہ یہ تیرے شکرگزار بندے

نہیں۔ پس اول تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک رسول کی بعثت کے متعلق جو دعائیں کیں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ان دعاؤں میں شامل تھے۔ کیونکہ انہوں نے اکٹھے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ دوسرے وہ ان دعاؤں میں اس لحاظ سے بھی شریک تھے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسمٰعیلؑ کی نسل سے ہی ان وعدوں کے پورا ہونے کی دعا کی تھی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وَالِد اور وَلَد دونوں کی اکٹھی شہادت کا اللہ تعالےٰ نے اس جگہ ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا ہے۔ کہ ہم اس بات کی شہادت کے طور پر کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا تعالےٰ کے سچے رسول ہیں۔ والد اور ولد کو تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تم جانتے ہو۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل کی نسل میں سے ایک رسول کی بعثت کے متعلق اللہ تعالےٰ سے دعائیں کی تھیں۔ اگر وہ دعائیں اب تک پوری نہیں ہوئیں۔ تو بتاؤ ابراہیم تمہارے نزدیک جھوٹا ہوا یا نہیں۔ پھر اسمٰعیل کیطرف دیکھو کہ اس نے ایک بہت بڑی قربانی کی۔ اس نے کہا کہ میں اللہ تعالےٰ کے حکم کے مطابق وادیٔ غیر ذی زرع میں بس کر اپنی جان کو ہلاک کرنے کے لئے تیار رہوں۔ وہ خدا کی خاطر مرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے اپنے اوپر ایک بہت بڑی موت وارد کر لی۔ محض اس لئے کہ خدا کے وعدے اس متبرک مقام کی نسبت اس کی نسل کے ذریعہ سے پورے ہو جائیں۔ اب اگر وہ شخص پیدا نہیں ہوا۔ جو اس مکہ کا مقصود ہے۔ تو بتاؤ اسمٰعیل جھوٹا ہوا یا نہیں۔ جھوٹی قربانی ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتی۔ ورنہ سچی قربانی اپنا پھل ضرور پیدا کیا کرتی ہے۔ پس اگر اسمٰعیل نے سچی قربانی کی تھی۔ اور تم بھی اس قربانی کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتے۔ تو تمہیں اس بات کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ اس قربانی کے نتیجہ میں ضرور ایک کامل انسان پیدا ہونا چاہیئے اسی طرح اگر تم ایک ایسے کامل انسان کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہو۔ جو ابراہیمی دعا کے نتیجہ میں اسمٰعیلی نسل میں سے پیدا ہوا ہے۔ تو اس کے معنے یہ ہیں۔ کہ تمہارے نزدیک ابراہیمؑ کی قربانی بھی نعوذ باللہ غیر مقبول تھی۔ اور اسمٰعیل کی قربانی بھی نعوذ باللہ مردود تھی۔ اگر اس کے اندر قربانی کرتے وقت تقویٰ ہوتا۔ تو کس طرح ممکن تھا۔ کہ اللہ تعالےٰ اس کے تقوے کو ضائع کرتا۔ اور اس کی قربانی کو رد کر دیتا۔ بہرحال دونوں میں سے ایک بات ضروری ہے۔ یا تم تسلیم کرو کہ ابراہیمؑ کی دعا نعوذ باللہ ضائع چلی گئی۔ اور اسمٰعیلؑ کی قربانی دنیا میں کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکی۔ اور یا پھر یہ تسلیم کرو۔ کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ دونوں نے سچی قربانی کی تھی۔ اور دونوں کی قربانی جس پھل کا تقاضا کرتی تھی۔ وہ دنیا میں پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس طویل عرصہ کے بعد وہی اس مقام کا دعویدار ہے۔

پہلی بات کو تسلیم کرنے کی صورت میں تمہیں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل دونوں کو جھوٹا قرار دینا پڑتا ہے۔ لیکن اگر دوسری بات مان لو۔ تو پھر بے شک تم ان کے سچے ہونے کا دعوےٰ کر سکتے ہو۔ مگر تمہاری تو یہ حالت ہے۔ کہ تم ان کو سچا بھی کہتے ہو۔ اور پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی جھٹلاتے ہو۔ جو اس دعا کا نتیجہ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی۔ اور اس قربانی کا پھل ہیں جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے کی۔ اگر تم ان کو جھوٹا کہتے ہو۔ تو تمہیں ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو بھی جھوٹا کہنا پڑیگا۔ اور اگر تم ابراہیمؑ اور اسمٰعیل کو سچا مانو۔ تو پھر تمہیں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت پر بھی ایمان لانا پڑیگا۔ بہرحال یہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم باتیں ہیں۔ اگر محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سچے ثابت ہوں۔ تو ابراہیمؑ بھی سچے ثابت ہوتے ہیں۔ اور اگر محمد صلے اللہ علیہ وسلم سچے ثابت نہ ہوں۔ تو ابراہیمؑ بھی سچے ثابت نہیں ہوتے۔ اور اسمٰعیلؑ بھی سچے ثابت نہیں ہوتے۔ جب اسمٰعیل نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا۔ اس وقت خدا نے کہا تھا۔ کہ چونکہ اس نے میرے حکم پر اپنے آپ کو مرنے کے لئے پیش کر دیا ہے۔ اس لئے

میں اسے وہ روحانی اولاد عطا کرونگا. جو ساری دنیا کو زندہ کر دیگی. اور میں اس ایک موت کے بدلے اس کے سارے خاندان کو حیاتِ ابدی بخشوں گا۔ اب اگر فاطر نیت اور ارادہ سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنے آپ کو پہلے ظاہر میں قربان ہونے کے لئے پیش نہیں کیا. اور پھر مکہ میں بسائے جانے کے وقت پیش نہیں کیا. تو ان کی نسل میں اس قسم کا بچہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا. لیکن اگر انہوں نے یہی قربانی کی تھی۔ تو ضرور تھا کہ ان کی نسل سے وہ سلسلہ چلتا. جو دنیا کو زندگی بخشتا پس بہر حال محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی کے ساتھ ابراہیمؑ اور اسمٰعیل کی سچائی وابستہ ہے. اور یہی حقیقت اللہ تعالےٰ ان الفاظ میں کفار مکہ کے سامنے وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ کے الفاظ میں رکھتا ہے. کہ تم ابراہیمؑ کو بھی سچا مانتے ہو. اور اسمٰعیل کو بھی. مگر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تم اس شخص کو جھٹلا رہے ہو. جس کی سچائی کے ساتھ ابراہیمؑ اور اسمٰعیل کی سچائی وابستہ ہے. تم یہ تو مانتے ہو کہ ابراہیمؑ نے ایک رسول کے لئے دُعا کی تھی. مگر جب اس دُعا کے نتیجہ میں وہ رسول تم میں مبعوث ہو گیا ہے. تو تم اس کو جھٹلا رہے ہو. تم یہ تو مانتے ہو. کہ اسمٰعیلؑ نے جب قربانی کی. تو خدا تعالےٰ نے اس کی اولاد کے بارہ میں ابراہیمؑ سے وعدے کئے. اور کہا. کہ اس کی نسل سے ایک ایسا انسان پیدا ہوگا. جو دنیا کا مزکی ہوگا. مگر جب وہ روحانی فرزند ظاہر ہو گیا. تو تم نے اس کا انکار کر دیا. اب بظاہر تم نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کیا ہے. لیکن حقیقت یہ ہے. کہ تم نے ابراہیمؑ کا بھی انکار کیا. اور تم نے اسمٰعیل کا بھی انکار کیا. کیونکہ یہ وہ شخص ہے. جس کی صداقت پر یہ دونوں انبیاء گواہ ہیں. ابراہیم گواہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سچے ہیں. اور اسمٰعیل گواہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سچے ہیں. اور تم نے جو طریق اس کی مخالفت میں اختیار کر رکھا ہے. وہ اس مقصد کے بالکل خلاف ہے. جس کو پُورا کرنے کے لئے ابراہیمؑ نے دعائیں کیں. اور جس کے ظہور کے لئے اسمٰعیل نے قربانی کی۔

ممکن ہے اس موقعہ پر کسی شخص کے دل میں یہ سوال پیدا ہو. کہ مکہ والے اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرتے تھے. تو اس لئے نہیں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے مقصد کا پورا ہونا پسند نہیں کرتے تھے. بلکہ ان کی مخالفت صرف اس لئے تھی. کہ وہ اپنے متعلق یہ یقین رکھتے تھے. کہ ہم نے اپنے وجود کے ذریعہ ابراہیمی دُعا کو پُورا کر دیا ہے. یا ہم نے اپنے وجود کے ذریعہ اسمٰعیل قربانی کو بے نتیجہ نہیں رہنے دیا. ہم لات منات اور عزیٰ کی پرستش اس لئے کرتے ہیں. کہ یہی ابراہیمؑ کا مقصد تھا. اور یہی اسمٰعیل کا مقصد تھا. یا ہم اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرتے ہیں تو اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں ابراہیمؑ نے اپنی دُعا میں اللہ تعالےٰ سے جن باتوں کی خواہش ظاہر کی تھی. وہ ساری کی ساری باتیں ہمارے ذریعہ سے پوری ہو چکی ہیں. اس لئے اب یہ ضرورت نہیں. کہ کوئی اور شخص آئے. اور اپنے آپکو ابراہیمی دُعا کا نتیجہ یا اسمٰعیل قربانی کا مقصود قرار دے۔ ابراہیم نے جو دُعائیں کیں. وہ ہمارے ذریعہ سے پوری ہو چکی ہیں اور اسمٰعیل نے جس مقصد کے لئے قربانی کی تھی. وہ بھی ہمارے وجود کے ذریعہ حاصل ہو چکا ہے. ہم اس مقصد کی طرف جا رہے ہیں. جو ابراہیم اور اسمٰعیل کا مقصد تھا اور انہی عقائد کو ہم نے اختیار کیا ہوا ہے. جو ان کے عقائد تھے. اس لئے گو یہ عقائد بُرے نظر آئیں. تمہیں لات اور منات اور عزّیٰ کی پرستش بُری دکھائی دے. مگر ہمارے نزدیک جب ابراہیم اور اسمٰعیل دونوں کی یہی تعلیم تھی. یہی مقصد بعثت تھا. تو ہم پر اس بات کا کیا اثر ہو سکتا ہے. کہ ہم نے ابراہیمی دُعا کو عبث قرار دے دیا ہے. یا اسمٰعیلی قربانی کے مقصد کو نظر انداز کر دیا ہے.

اس اعتراض کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے دو

جواب ہیں۔ پہلا جواب تو یہ ہے۔ کہ یہ ایک عجیب بات ہے، کہ مکہ کے لوگ لات اور مناۃ اور عزیٰ وغیرہ کی پرستش کرتے تھے۔ مگر ان میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا۔ جو یہ کہتا ہو کہ ابراہیمؑ بتوں کی پرستش کرتا تھا۔ یا اسمٰعیلؑ بتوں کی پرستش کرتا تھا۔ یہ خدا نے ایک عجیب ثبوت رکھا ہُوا تھا۔ کہ ان کو کبھی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی۔ کہ وہ ابراہیم اور اسمٰعیل کو بھی شرک میں ملوث کریں اور چونکہ وُہ خود اپنے عقائد کے رُو سے یہ باتیں ان کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے۔ اس لئے وہ مسلمانوں کے سامنے اس بات کو پیش ہی نہیں کرسکتے تھے۔ کہ ہم جس تعلیم پر قائم ہیں وہ ابراہیمی اور اسمٰعیلی مقصد کو پُورا کرنے والی ہے۔ کیونکہ وُہ خود ان کو شرک میں ملوث نہیں سمجھتے تھے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ بے شک مذہب ایک ایسی چیز ہے۔ جو زیر بحث ہوتی ہے۔ اور اس میں بہت کچھ اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اور مذہبی اختلافات کو نظر کرتے ہوئے اس حقیقت سے بھی کبھی اغماض نہیں کیا جاسکتا۔ کہ وُہ لوگ اس بات کے قائل تھے۔ کہ خانہ کعبہ کی بنیاد کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک دُعا کی تھی اور وُہ دعا بہرحال پوری ہونی چاہئیے۔ مگر جو کچھ اس وقت مکہ کی حالت تھی۔ اس کے لحاظ سے وُہ قطعی طور پر ایک منٹ کے لئے بھی یہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ کہ مکہ کا وجود ابراہیمی دُعا کا مصداق ہے۔ کیونکہ دُعا یہ تھی۔ کہ خدا مکہ کو ساری دنیا کا مرجع بنادے۔ وہ مذہبی لحاظ سے تو کہہ سکتے تھے۔ کہ ہم سچے ہیں۔ وُہ یہ بھی کہہ سکتے تھے۔ کہ ہم اگر شرک کرتے ہیں۔ اگر لات اور مناۃ اور عزیٰ کی پرستش کرتے ہیں۔ تو اچھا کرتے ہیں۔ مگر کیا مکہ والے یہ بھی کہہ سکتے تھے۔ کہ عرب ساری دُنیا کا مرکز ہے۔ لوُہ ابراہیمؑ کی دُعا پوری ہو چکی ہے۔ ان کو نظر آرہا تھا کہ یہ خانہ ابھی خالی ہے۔ اور مکہ کو ابھی تک وُہ اعزاز حاصل نہیں ہُوا۔ جس کے لئے ابراہیمؑ نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت دعا کی تھی۔ وہ دنیاوی طور پر معمولی حیثیت کے لوگ جنکو عرب میں بھی کوئی خاص عزت حاصل نہیں تھی۔ کجا یہ کہ بیرونی دنیا کی نگاہ میں ان کو کوئی خاص اعزاز حاصل ہوتا ان کا اپنے آپ کو ابراہیم اور اسمٰعیل کی دُعا کا مصداق قرار دینا تو بڑی بات ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ عرب پر ہی انہیں کوئی دبدبہ اور حکومت حاصل ہے پس انہیں یہ تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ کہ روحانی لحاظ سے ابھی مکہ کی عظمت اور اس کی شان و شوکت میں اضافہ ہونے والا ہے ابھی ایک خلا باقی ہے۔ جس نے پُر ہونا ہے۔ ابھی اس نے دنیا جہان کا مرکز بننا ہے۔ ابھی اسے یہ اعزاز حاصل ہونا ہے کہ دنیا کے چاروں طرف سے لوگ یہاں آئیں۔ یہ عظمت مکہ کو پہلے کہاں حاصل تھی۔ بے شک عرب لوگ حج کے لئے مکہ میں آتے تھے۔ مگر دنیا کے چاروں اطراف سے ہر ملک اور ہر علاقہ کے لوگ مکہ میں نہیں آتے تھے۔ وُہ ایک ملک کا مرکز تو کہلا سکتا تھا۔ مگر ساری دنیا کا مرکز نہیں تھا حالانکہ ابراہیمی دُعا یہ تھی۔ کہ خدا اسے دنیا کا مرکز بنائے۔ خدا اس میں تمام عالم کے اطراف سے لوگوں کو کھینچ کھینچ کر لائے اب کجا مکہ کی وُہ حالت اور کجا ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعا صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ ابھی مکہ اپنے اصل اعزاز سے بہت پیچھے تھا۔ ابراہیمؑ کی دُعا ابھی پُوری ہونے والی تھی اسمٰعیلؑ کی قربانی ابھی اپنا پھل دینے والی تھی۔ اور مکہ کو ابھی وُہ طاقت حاصل ہونے والی تھی۔ جب اسے ساری دنیا کا مرکز قرار دیا جانے والا تھا۔ پس مکہ والے یہ کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔ کہ ابراہیمؑ کی دُعا پوری ہو چکی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ بے شک حج کے لئے عرب لوگ مکہ میں آجاتے ہیں مگر بیرونی دنیا کی نگاہ میں انہیں کوئی اعزاز حاصل نہیں چنانچہ اس کے متعلق خود تاریخی شہادات بھی موجود ہیں۔ جس سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ عرب والوں کو کیسی تحقیر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا :

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیصر کو تبلیغی خط لکھا۔ اور وُہ اسے پہونچا۔ تو وہ اس خط کو پڑھ کر خاص طور پر متاثر ہوا۔ اور اس نے درباریوں سے کہا۔ کہ اس خط کا لکھنے والا بڑا دلیر انسان معلوم ہوتا ہے۔ لوگوں سے پتہ لگانا چاہیئے۔ کہ یہ کون ہے کیا دعوےٰ کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ کیا کیا واقعات گزر رہے ہیں۔ اگر مکّہ کے کوئی آدمی یہاں آئے ہوئے ہوں۔ تو ان کو میرے دربار میں پیش کیا جائے۔ تاکہ مَیں ان سے اس خط کے لکھنے والے کے حالات دریافت کروں۔ اتفاق کی بات ہے۔ اللہ تعالےٰ نے چونکہ مکّہ والوں پر حجت تمام کرنی تھی۔ ابوسفیان ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ لوگوں نے اسے بادشاہ کے دربار میں پیش کر دیا۔ ابوسفیان وُہ شخص تھا جو مکّہ کا کمانڈر تھا اہلِ مکہ کا سردار تھا۔ وہ قیصر کے دربار میں پیش کیا گیا۔ مگر اس طور پر نہیں کہ مقابل کی حکومت کا کوئی بادشاہ آیا ہو۔ اس طور پر بھی نہیں۔ کہ کسی چھوٹی حکومت کا کوئی سردار آیا ہو۔ اس طور پر بھی نہیں۔ کہ مقابل کی کسی حکومت کا کوئی جرنیل آیا ہو۔ بلکہ اس طور پر اسے قیصر کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس طرح ایک مجرم کو کسی بادشاہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ابوسفیان پیش ہوا تو بادشاہ نے بعض دُوسرے لوگوں سے جو اس کے ساتھ تھے کہا کہ میں اس سے بعض سوالات کرونگا۔ اگر یہ ان سوالات کا سچ سچ جواب دے۔ تو تم چپ رہنا لیکن اگر کسی بات کا جواب دیتے ہوئے جھوٹ بولے۔ تو فوراً مجھے بتانا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ کیسی ذلت ہے۔ جو قیصر کے دربار میں پہنچتے ہی ابوسفیان کو پہونچی یہ وُہ شخص ہے جو اپنے آپ کو مکّہ کا بادشاہ سمجھتا تھا۔ یہ وُہ شخص ہے جسے قوم نے منتخب کرکے اپنا لیڈر بنایا ہوا تھا۔ یہ وُہ شخص ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں اپنی قوم کے لیڈر کے طور پر پیش ہوتا تھا۔ یہ وُہ شخص ہے جسکو مکّہ سے تعلق رکھنے والے عربوں نے اکٹھے ہو کر اپنا رئیس منتخب کیا ہُوا تھا۔ یہ قیصر کے دربار میں پیش ہوتا ہے۔ تو وُہ یہ تسلیم نہیں کرتا۔ کہ یہ کسی بالمقابل حکومت کا بادشاہ ہے۔ قیصر یہ بھی تسلیم نہیں کرتا۔ کہ یہ کسی ریاست کا مالک ہے۔ قیصر یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ یہ کسی فوج کا کمانڈر ہے۔ کیونکہ وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ عرب کوئی بالمقابل حکومت ہے۔ وُہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ کہ عرب کوئی ریاست ہے۔ وہ یہ ماننے کیلئے تیار نہیں تھا کہ عرب کوئی منظم قوم ہے جسکا کمانڈر ابوسفیان ہے وہ اسے تخت پر نہیں بٹھاتا۔ وہ اسے کرسی پر نہیں بٹھاتا۔ اسے کسی چیز پر بھی بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ اسے اپنے سامنے کھڑا ہونے کا حکم دیتا ہے۔ اور وہ اسے صرف ایک معمولی تاجر کی حیثیت دیتا ہے۔ یہ تو قیصر کا ابوسفیان اور اس شہر کے متعلق فیصلہ ہے جس کا وُہ نمائندہ تھا۔ مگر ابوسفیان کا اپنا فیصلہ اس سے بھی عجیب تر ہے۔ جب ابوسفیان سے یہ مجرموں والا سلوک ہُوا۔ تو اس نے ایک لفظ بھی بطور احتجاج کے نہیں کہا۔ اگر وُہ مکہ کو ایک حکومت قرار دیتا۔ اور اپنے آپ کو واقعی ایک حکومت کا سردار کہتا۔ تو وہ احتجاج کرتا۔ اور کہتا میں ایک حکومت کا رئیس ہوں۔ مجھے اپنے برابر جگہ دو۔ مگر وہ خاموشی سے اس ذلت کو برداشت کر لیتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم دیکھتے ہیں کہ جب قیصر کے دربار میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط پیش ہُوا۔ اور اس نے لوگوں کو بتایا کہ مجھے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھا ہے۔ کہ میں اس پر ایمان لے آؤں۔ بتاؤ اس بارہ میں تمہاری کیا رائے ہے۔ تو ابوسفیان محض اس خط کے لکھنے سے ہی مرعوب ہو گیا اور اس نے ساتھیوں سے کہا لَقَدْ اَمِرَ اَمْرُ ابْنِ اَبِیْ کَبْشَۃَ کہ محمد (رسول اللہ) تو بہت بڑا ہو گیا ہے اس نے قیصر کو خط لکھ دیا ہے۔ اور وہ اس خط کی طرف توجہ دے رہا ہے۔ یہ اس کی حیثیت ہے۔ کہ وُہ ایک قوم کا بادشاہ ہے۔ اور پھر اس بات پر حیران ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قیصر کو خط لکھ دیا۔ اگر حقیقی بادشاہ ہوتا۔ تو

اس کے لئے اس میں تعجب کی کونسی بات تھی۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیصر کو خط لکھ دیا ہے۔ اگر کہو کہ اس نے خط لکھنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے یہ الفاظ کہے تھے۔ کہ قیصر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط سے متاثر ہُوا تھا۔ تو بہرحال اس سے بھی پتہ لگ سکتا ہے۔ کہ مکہ والے اپنی کیا شان سمجھتے تھے۔ اگر تو وُہ خط لکھنے سے متاثر ہُوا ہے۔ تو یہ بہت ہی گھٹیا بات ہے۔ اور اگر وہ اس بات سے متاثر ہُوا ہے۔ کہ ہم تو بالکل معمولی تھے۔ ہماری دنیا کی نگاہ میں کوئی عزت نہیں تھی۔ اب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسا شخص پیدا ہوگیا ہے۔ جس کی وجہ سے قیصر بھی مرعوب ہونے لگ گیا ہے۔ تو یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ مکہ والے تسلیم کرتے تھے۔ کہ ابھی ابراہیمی دُعا پوری نہیں ہوئی۔ اگر ابراہیم کی دُعا پُوری ہو چکی ہوتی۔ اور اگر عرب ماننے کہ مکہ ساری دنیا کی نگاہ میں ایک غیر معمولی عظمت رکھتا ہے۔ تو کیا ابراہیمؑ اور اسمٰعیل کی دُعا پوری ہو جانے کا وہ یہی ثبوت پیش کرتے۔ کہ ہمارا بادشاہ ابوسفیان قیصر کے دربار میں پیش ہُوا۔ اور اس سے یہ سلوک ہُوا۔ یا کیا عتبہ اور شیبہ اور دوسرے بڑے بڑے عمائد اپنی عزت اور اقتدار کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے تھے۔

اہلِ عرب کو دنیا کی نگاہ میں جو عزت حاصل تھی۔ اس کا اندازہ تو اسی سے ہو جاتا ہے۔ کہ ایران کے بادشاہ نے مسلمانوں کے حملہ کے وقت اسلامی لشکر کو یہ پیشکش کی تھی۔ کہ ایک ایک اشرفی لے لو اور واپس چلے جاؤ۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ عرب کے لوگ ایسے ذلیل ہیں کہ ایک ایک اشرفی دے کر ان کو خریدا جا سکتا ہے۔ یہ ایران کے بادشاہ کے عربوں کے متعلق مکہ والوں کے اخلاق کو دیکھ کر اندازہ تھا۔ اور قیصر کا جو سلوک تھا وہ ابوسفیان والے واقعہ سے ظاہر ہے۔ وہ قیصر کے دربار میں پیش ہُوا۔ تو اس نے ایک تاجر سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہ سمجھی۔ جسے ضرورت کے

موقعہ پر جھوٹ بولنے سے بھی عار نہیں ہوتا۔ بلکہ ابوسفیان کی حیثیت تو اتنی بھی ثابت نہیں ہوئی۔ جتنی مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کی۔ اس نے تو مسٹر ڈگلس سے عدالت میں کہا تھا۔ کہ مجھے کرسی ملنی چاہیئے۔ مگر ابوسفیان کے مونہہ سے اتنا بھی نہ نکلا۔ کہ مجھے کرسی دو۔ کیونکہ وُہ جانتا تھا۔ کہ اگر میں نے کرسی کا مطالبہ کیا۔ تو مجھے جوتیاں مار کر نکال دیا جائیگا اب بتاؤ۔ کیا وہ ان واقعات کو پیش کرکے کہہ سکتے تھے۔ کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیل کی دُعا کا یہ ظہور ہے۔ وُہ جانتے تھے کہ یہ دُعا ابھی پُوری ہونے والی ہے۔ اور مکہ کو ابھی وہ اعزاز حاصل نہیں ہُوا۔ جس کا ابراہیمی دعا میں ذکر آتا ہے۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ہم ابراہیمؑ اور اسمٰعیل کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کی ایک دُعا تھی جسکو تم بھی تسلیم کرتے ہو۔ تم بتاؤ کہ آخر وہ دُعا گئی کہاں۔ اس دُعا کے مطابق جو اس وقت مدعی کھڑا ہُوا ہے۔ تم اس کے متعلق کہتے ہو کہ وُہ جھوٹا ہے۔ اگر یہ بھی جھوٹا ہے۔ تو پھر اس دُعا کو پورا کون کریگا۔ اور وُہ کون ہوگا۔ جو والد اور ولد کی عادل کا مصداق ہوگا۔ تم اس کے سوا اور کوئی وجود ایسا پیش نہیں کر سکتے۔ جو ان دعاؤں کے نتیجہ میں ظاہر ہونے کا اعلان کر رہا ہو۔ پس ابراہیمؑ اور اسمٰعیل کی دُعائیں بڑا بھاری ثبوت ہیں اس بات کا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا تعالےٰ کے سچے اور راستباز رسول ہیں۔

دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ ہم گزشتہ زمانہ کے ایک واقعہ کو بطور شہادت کے پیش کرتے ہیں۔ اور وہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے کا واقعہ ہے۔ تم اس واقعہ پر غور کرو۔ اور دیکھو کہ اس کو کس طرح ایک بے آب و گیاہ جنگل میں خدا تعالےٰ کے حکم کے ماتحت پھینک دیا گیا تھا۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے اسے بچایا۔ اور پروان چڑھایا۔ اور ایک بڑی نسل کا باپ بنایا۔ اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اگر آپ کے رشتہ دار مکہ سے نکال دینگے تو اللہ تعالےٰ آپ کی اسی طرح مدد کریگا۔ جس طرح

اسمٰعیل علیہ السلام کی اس نے مدد کی تھی۔

وہ لوگ جو بائیبل کا مطالعہ رکھتے ہیں جانتے ہیں کہ بائیبل اس نظریہ کو پیش کرتی ہے۔ کہ حضرت ہاجرہ جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ تھیں۔ ان سے سارہ کی لڑائی ہوئی۔ اور اس نے ناراض ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مطالبہ کیا۔ کہ ہاجرہ اور اس کے بیٹے اسمٰعیل کو اپنے گھر سے نکال دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے الٰہی اشارات اس کی تائید میں پائے۔ چنانچہ ماں اور بیٹے دونوں کو گھر سے نکال کر مکہ کی وادی میں لا کر چھوڑ گئے۔ وہ جگہ جہاں ان کو رکھا گیا۔ وہاں کھانے کا کوئی سامان نہ تھا۔ پینے کا کوئی سامان نہ تھا۔ رہائش کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہاں ایک دوسرے سے ملنے کے لئے کوئی آبادی نہیں تھی۔ ایک سنسان اور ویران جنگل میں جہاں نہ پانی کا ایک قطرہ تھا۔ اور نہ غذا کا ایک دانہ کھلے آسمان کے نیچے خدا پر توکل کرتے ہوئے وہ دو کمزور اور ضعیف و ناتوان جانوں کو چھوڑ گئے۔ اور اس لئے چھوڑ گئے۔ کہ خدا نے ان سے کہا تھا۔ کہ وہ ایسا کریں۔ جب انہوں نے خدا کے لئے یہ قربانی کی۔ تو خدا نے بھی آسمان پر ان کی اس قربانی کو قبول فرمایا۔ اور اس نے رفتہ رفتہ وہاں ایک شہر آباد کر دیا۔ پھر خدا نے اس مقام کو یہ عظمت دی۔ کہ وہ لوگوں کا مرجع بن گیا۔ بیت اللہ کی اس میں تعمیر ہوئی۔ اور اسے ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ یہ شرف بخشا گیا۔ کہ اسے امن و امان کا مرکز قرار دیا گیا۔ اس واقعہ کو پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک دن تم بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر میں سے اسی طرح نکال دو گے جس طرح سارہ نے ہاجرہ اور اسمٰعیل کو نکالا تھا۔ مگر ہم کو بھی قسم ہے ابراہیمؑ اور اس کے بیٹے اسمٰعیل کی۔ کہ جس طرح وہاں ایک ویران اور سنسان جنگل کو ہم نے ایک عظیم الشان شہر کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور پھر ہم نے اسے یہاں تک عظمت دی۔ کہ اسے بلد الحرام قرار دے دیا۔ اسی طرح جس گاؤں میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہجرت کر کے جائینگے اس گاؤں کو بھی ہم شہر بنا دینگے۔ اور پھر اس شہر کو بھی یہ عظمت دینگے۔ کہ اسے مکہ کی طرح بلد الحرام قرار دینگے پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مجھے اس باپ کی قسم ہے۔ جس نے اپنی بیوی کے کہنے پر اپنے بیٹے کو نکالا۔ وہ بیٹا ایسی حالت میں نکلا۔ جبکہ وہ بے کس بے زر اور بے پر تھا۔ کوئی اس کا یار اور مددگار نہیں تھا۔ مگر خدا نے اسے رفتہ رفتہ بہت بڑی طاقت کا مالک بنا دیا۔ تم بے شک محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر میں سے نکال دو۔ مگر یاد رکھو پھر مکہ منفرد عزت رکھنے والا شہر نہیں رہیگا۔ بلکہ اسی قسم کی عزت والا ایک اور شہر اس کے مقابل میں کھڑا کر دیا جائیگا چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مکہ میں سے نکالا گیا۔ مگر آخر آپ کو وہ عظمت حاصل ہوئی۔ کہ آپ نے ایک دن سب لوگوں کو جمع کیا۔ اور فرمایا اے لوگو جس طرح ابراہیمؑ کے ذریعہ مکہ مکرمہ کو ایک خاص اعزاز بخشا گیا تھا میرے ذریعہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے مدینہ کو بھی وہی اعزاز عطا کیا گیا ہے۔ جس طرح مکہ میں جان کی عزت کی جاتی ہے۔ اسی طرح مدینہ میں جان کی عزت کی جائے۔ جس طرح وہاں درخت کاٹنے جائز نہیں۔ اسی طرح مدینہ میں بھی درختوں کا کاٹنا جائز نہیں۔ جس طرح وہاں فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی کی سخت ممانعت ہے۔ اسی طرح مدینہ میں بھی فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی کی سخت ممانعت ہے۔ غرض وہ تمام باتیں جو مکہ کے متعلق تھیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ منورہ پر بھی عائد کر دیں۔

آخر یہ بھی غور کرنے والی بات ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مدینہ کو حرم بنانے کا اختیار کس نے دیا تھا۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہوئے کہہ دیا کرتے ہیں۔ کہ ایسا حکم دینا خدا کا کام تھا۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ اختیار نہیں تھا۔

کہ خود بخود ایسا حکم دے دیتے۔ ان نادانوں کو یہ معلوم نہیں۔ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن کریم کا وہ گہرا علم بخشا گیا تھا۔ جو دُنیا میں اور کسی شخص کو عطا نہیں کیا گیا۔ آپ نے مدینہ منورہ کے متعلق جو حکم دیا۔ وہ اسی آیت سے ماخوذ تھا۔ کہ لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِھٰذَا الْبَلَدِ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ۔ میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔ میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کو بسانے والے کی۔ اور میں قسم کھاتا ہوں اس بیٹے کی جو اس شہر میں آکر بسا تھا۔ بے شک تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس شہر میں سے نکال دو۔ مگر یاد رکھو جس شہر میں وہ جائیگا۔ اس شہر کو مکہ کا قائمقام بنا دیا جائیگا۔ اور اُسے وہی عزتیں دی جائینگی جو اس شہر کو حاصل ہیں۔ مکہ اپنے اس اعزاز میں منفرد نہیں رہیگا۔

تیسرے معنے اس کے یہ بھی ہیں کہ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ سے مراد رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپکی امت ہے۔ اور یہ فرمایا گیا ہے۔ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی جماعت اس بات پر شاہد ہے کہ خدا تعالےٰ اسلام کو ترقی دینے والا ہے۔ جس طرح بلد الحرام سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکلنا اور پھر بڑی شان و شوکت کیساتھ اس میں واپس آنا اس بات کا ثبوت ہوگا۔ کہ جو باتیں اس کی طرف سے پیش کیجاتی ہیں بالکل درست ہیں۔ اسی طرح خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپکی امت اپنی ذات میں اس بات کا ثبوت ہوگی۔ کہ ان لوگوں کو کوئی قوم مٹا نہیں سکتی۔ دنیا میں دو قسم کی شہادت ہوتی ہے۔ ایک اندرونی اور ایک بیرونی۔ بیرونی شہادت پھر دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک مادی اور ایک روحانی۔ مادی شہادت تو یہ ہے۔ کہ ایک شخص کے ساتھ کئی ہزار کا لشکر ہو۔ لڑائی کا سازوسامان ان کے پاس موجود ہو۔ اطاعت کا مادہ سب میں بدرجہ اتم پایاجاتا ہو۔ ایسے انسان کو دیکھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے۔ کہ یہ ضرور جیت جائیگا۔ کیونکہ کامیابی کے لئے جس قدر سامانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سب اس کے پاس موجود ہیں۔ روحانی شہادت یہ ہوتی ہے۔ کہ ایک شخص خدا تعالےٰ کی طرف سے کھڑا ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی کامیابی کے متعلق اللہ تعالےٰ سے علم پاکر پیشگوئیاں کرتا ہے۔ جو لوگ مومن ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ یہ شخص بہرحال جیت جائیگا۔ کیونکہ خدائی وعدے اس کے ساتھ ہیں۔ لیکن ایک شہادت اندرونی ہوتی ہے۔ جسے انگریزی میں اِن ٹرن زِک ویلیو INTRINSIC VALUE کہا جاتا ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہتے ہیں "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" بظاہر کمزور اور بے حقیقت نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے اندر ایسے اوصاف اور ایسی قابلیتیں پائی جاتی ہیں۔ اور ان کی اخلاقی طاقت ایسی زبردست ہوتی ہے۔ کہ باوجود ان کے کمزور ہونے کے لوگ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کہ ان لوگوں کے مقابل پر کوئی قوم ٹھہر نہیں سکتی۔ اس جگہ اللہ تعالےٰ نے ایک طرف تو اسلام کی ترقی کے متعلق پیشگوئیاں بیان کیں اور فرمایا کہ تم خواہ کچھ کہو۔ لیکن ہم یوں کہتے ہیں۔ یا ابراہیمؑ نے یہ پیشگوئی کی تھی۔ جو بہرحال پوری ہوگی۔ اور دوسری طرف فرمایا ہم نہ صرف ان پیشگوئیوں کو پیش کرتے ہیں جو لیال عشر میں اور ان لیالی کے گذرنے کے بعد پوری ہوکر اس بات کا ثبوت ہونگی کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دعوےٰ سچا ہے۔ بلکہ ہم اس کی صداقت اور راستبازی کا اور اس کے دنیا پر ایک دن غالب آجانیکا تمہارے سامنے ایک اندرونی ثبوت بھی پیش کرتے ہیں۔ کہ تم محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اتباع کو دیکھ لو ان کے اندر جو اوصاف پائے جاتے ہیں کیا یہ ہارنے والے لوگوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔ یا غالب آنے والے لوگوں کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ گویا وَالِد اور مَا وَلَد میں اللہ تعالےٰ نے

نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی جماعت کے کیرکٹر کو پیش کیا ہے۔ اور فرمایا ہے تم ان لوگوں کے کیرکٹر سے اپنا کیریکٹر ملا کر دیکھو۔ تمہارا کیرکٹر تو وہ ہے جو ان الفاظ میں بتایا گیا ہے۔ کہ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا. اور یہ بات واضح ہے۔ کہ اس کیریکٹر والے کبھی جیت نہیں سکتے۔ اب بتاتا ہے۔ کہ اس وَالِدٍ اور مَا وَلَدَ کے اندر جو کیریکٹر پائے جاتے ہیں۔ اس کیرکٹر کے مالک کبھی ہار نہیں سکتے۔ تمہارا کیرکٹر تو یہ تھا کہ یتیم کو پوچھنا نہیں۔ مسکین کو کھانا نہیں کھلانا۔ جائدادیں آئیں۔ تو ان کو لٹا دینا۔ یا مال سے اتنی محبت رکھنا کہ ضرورت پر بھی اس کو خرچ نہ کرنا اور انتہائی بخل سے کام لینا۔ یعنی ایک طرف تو تمہارے بعض حصۂ قوم میں اتنا اسراف پایا جاتا ہے۔ کہ باپ دادا کی جائدادیں آتی ہیں۔ تو وہ ان کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف تم میں سے کچھ لوگوں کے اندر ایسا بخل پایا جاتا ہے۔ کہ مال آئے تو اسے بند کر کے رکھ لیتے ہیں۔ گویا کچھ تو ایسے ہیں جو اپنے مال کو بے مصرف خرچ کرتے ہیں۔ اور کچھ وہ افراد ہیں۔ جو بامقصد بھی صرف نہیں کرتے یہ چار قسم کی صفات جس قوم میں ہوں۔ تم خود ہی غور کرو۔ کہ آیا وہ قوم کبھی جیت سکتی ہے۔ اس کے مقابل میں تم اس باپ اور اس کے بیٹوں کو دیکھو۔ یہاں گو نام بنام ایک ایک صفت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ مگر تقابل سے صاف ظاہر ہے۔ کہ جن برائیوں کا ذکر دشمنوں کے بارہ میں کیا گیا ہے۔ انہی کے مقابل کی نیکیاں ان لوگوں میں پائے جانے کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ چونکہ کفار کی برائیاں یہ بیان کی تھیں۔ کہ وہ یتامے کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے۔ اسراف میں مبتلا رہتے ہیں۔ یا اتنے بخل سے کام لیتے ہیں۔ کہ ضرورت حقہ پر بھی روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس جگہ انہی چار عیبوں کے مقابل کی خوبیوں کے متعلق دعوے کیا گیا ہے۔ کہ وہ اس باپ اور اس کی اولاد میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں اکرام یتیم بھی پایا جاتا ہے۔ ان میں مساکین کی پرورش کا جذبہ بھی موجود ہے۔ وہ اسراف بھی نہیں کرتے۔ اور ضرورت پر اپنے مالوں کو خدا تعالےٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے دریغ بھی نہیں کرتے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ گھبرائے۔ کہ یہ کہیں میرا امتحان نہ ہو۔ تو اسی حالت میں آپ حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے اور ان سے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ مجھے تو اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے۔ حضرت خدیجہ نے یہ سنتے ہی بلا تکلف بغیر سوچے اور بغیر کسی فکر و تردد کے کام لینے کے نہایت اطمینان کے ساتھ کہا۔ كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ (بخاری باب کیف کان بدء الوحی) خدا کی قسم۔ خدا آپ کو کبھی ذلیل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آپ وہ ہیں جو صلہ رحمی کرتے ہیں۔ آپ وہ ہیں جو سچائی سے کام لیتے ہیں۔ آپ وہ ہیں۔ جو لوگوں کے بوجھ بٹاتے ہیں۔ آپ وہ ہیں جنہوں نے تمام معدوم اخلاق کو اپنے اندر پیدا کیا ہوا ہے۔ آپ وہ ہیں جو مہمان نوازی کرتے ہیں۔ اور آپ وہ ہیں۔ جو حق کی راہ میں لوگوں کے مددگار بنتے ہیں۔ آپ جیسے انسان کو اللہ تعالےٰ کس طرح ضائع کر سکتا ہے۔ اب دیکھو حضرت خدیجہ نے جو باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان سب میں وہ اخلاق آ گئے۔ جو کفار کے اندر موجود نہیں تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ تَقْرِي الضَّيْفَ۔ آپ مہمان نوازی کرتے ہیں۔ اس میں یہ بات آ گئی۔ آپ کے اندر مال کی ایسی محبت نہیں تھی۔ کہ آپ اسے بند کر کے بیٹھ رہتے۔ بلکہ ہر جائز ضرورت پر آپ اسے خرچ کر دیتے تھے۔ پھر انہوں نے ایک خوبی ان الفاظ میں

بیان فرمائی۔ کہ تَحْمِلُ الْكَلَّ۔ آپ لوگوں کے بوجھ بٹاتے ہیں۔ اس میں یتامے اور مساکین بھی شامل ہیں۔ کیونکہ جو شخص کسی کام کے قابل نہ ہو۔ وہ دوسروں کے لئے ایک بوجھ ہوتا ہے۔ یتیم کسی کام کے قابل نہیں ہوتا بوجہ اپنی کم سنی کے اور مسکین بھی کسی کام کے قابل نہیں ہوتا بوجہ فقدان روپیہ کے بے شک اس میں اور باتیں بھی شامل ہیں۔ مگر اکرام یتیم اور مساکین پروری دونوں بہرحال تَحْمِلُ الْكَلَّ میں شامل ہیں۔ پھر جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کی ضروریات کے لئے روپیہ خرچ کیا کرتے تھے۔ تو یہ لازمی بات ہے۔ کہ جو شخص روپیہ خرچ کرنے والا ہو وہ کنجوس نہیں ہو سکتا پس بخل کی بھی نفی آگئی۔ پھر اسراف بھی جاتا رہا۔ کیونکہ حضرت خدیجہ فرماتی ہیں۔ تَكْسِبُ الْمَعْدُومَ۔ وہ اخلاق جو قوم میں سے مٹ چکے ہیں۔ ان کو دوبارہ اپنی قوم میں واپس لا رہے ہیں۔ گویا وہ سب اخلاق جن کو آپ کی قوم کھو چکی تھی۔ وہ آپ کے ذریعہ دوبارہ حاصل ہو رہے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا۔ کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مسرف نہیں تھے۔ پس حضرت خدیجہؓ کی گواہی اپنی ذات میں اس بات کا ایک قطعی اور یقینی ثبوت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر وہ سب اوصاف و کمالات پائے جاتے تھے۔ جو ایک ترقی کرنے والے وجود کے اندر پائے جانے ضروری ہیں۔

وَالِدٍ کے بعد وَلَدَ کا ذکر آتا ہے۔ ان کے اخلاق اور ان کی قربانیوں کو بھی جب دیکھا جاتا ہے۔ تو حیرت آتی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا۔ کہ وطن کی قربانی یتامے کی خبر گیری۔ مساکین کی پرورش۔ دینی ضروریات کے لئے روپیہ صرف کرنا یہ سب خوبیاں ان کے اندر اپنی پوری شان کے ساتھ موجود تھیں۔ چنانچہ ان کے اخلاق اور ان کی قربانیوں کا یہ ایک زندہ ثبوت موجود ہے۔ کہ انہوں نے خدا تعالےٰ کے لئے اپنے وطنوں کو قربان کر دیا۔ اپنے رشتہ داروں سے قطع تعلق کر لیا۔ اور ہر قسم کی موت کو اپنے اوپر خوشی سے وارد کر لیا۔ غرض اس مقام پر اللہ تعالےٰ والد اور مَا وَلَدَ دونوں پیش کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ ان اوصاف کی موجودگی میں تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو۔ کہ یہ لوگ نہیں جیتیں گے پیشگوئیوں کے متعلق تو تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جب وہ پوری ہونگی تو دیکھا جائیگا۔ مگر یہ چیز تو تمہارے سامنے موجود ہے۔ تم ہر وقت دیکھ سکتے ہو۔ کہ تم میں کیسے اخلاق پائے جاتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں کس قسم کے اخلاق پائے جاتے ہیں۔ تمہارے اخلاق اس بات کا ثبوت ہیں کہ تم لوگ ہارنے والے ہو۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی جماعت کے اخلاق اس بات کا ثبوت ہیں۔ کہ وہ لوگ جیتنے والے ہیں۔

بطور تنزل اس آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَ سے آدم اور اس کی تمام اولاد مراد لی جائے۔ اور آیت کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کے ثبوت میں تمام بنی نوع انسان کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ تم دیکھ لو کہ نوع انسانی میں سے کچھ لوگ عزت پانے والے ہوتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ذلت پانے والے ہوتے ہیں۔ عزت پانے والوں میں جو خوبیاں موجود ہوتی ہیں وہ سب کی سب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے ساتھیوں میں پائی جاتی ہیں۔ اور ذلت پانے والوں میں جو برائیاں موجود ہوتی ہیں۔ وہ سب کی سب تم میں پائی جاتی ہیں۔ اب تم خود ہی سوچ سکتے ہو کہ ذلت کس کے حصہ میں آئیگی۔ اور فتح کس کے حصہ میں۔ اس صورت میں وَالِدٍ کو مَا وَلَدَ سے مراد دنیا کے تمام باپ اور دنیا کی تمام اولادیں ہونگی۔ یعنی تم اس دنیا پر غور کرو۔ لوگوں کے حالات پر تدبر کرو۔ ترقی و تنزل کے وجوہ پر نظر غائر ڈالو۔ تمہیں معلوم ہوگا۔ کہ بعض خرابیاں باپ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور بعض خرابیاں اولاد سے پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی جماعت میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتیں۔ نہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم میں وہ خرابیاں ہیں جو باپ میں موجود ہوتی ہیں۔ اور آئندہ نسل کو تباہ کر دیتی ہیں۔ نہ ان کے صحابہؓ میں وہ خرابیاں ہیں جو اولاد میں موجود ہوتی ہیں۔ اور وُہ باپ دادا کے نام کو ڈبو دیتی ہیں۔

پھر دنیا میں ترقی و تنزل کے حالات پر غور کرنے سے ان کی چار وجوہ معلوم ہوتی ہیں۔ یا تو باپ قابل ہوتا ہے لیکن بیٹا ناقابل ہوتا ہے۔ یا باپ ناقابل ہوتا ہے۔ اور بیٹا قابل ہوتا ہے۔ یا باپ اور بیٹا دونوں ناقابل ہوتے ہیں یا باپ اور بیٹا دونوں قابل ہوتے ہیں۔ گویا یا تو دونوں قابل ہونگے۔ یا دونوں ناقابل ہونگے۔ یا بیٹا قابل ہوگا۔ اور باپ ناقابل۔ یا باپ قابل ہوگا اور بیٹا ناقابل۔ ان چاروں صورتوں میں سے جب بیٹا قابل ہوتا ہے اور باپ ناقابل ہوتا ہے۔ تو کبھی بیٹا اپنے باپ کے اثر کو قبول کر لیتا ہے اور کبھی نہیں کرتا۔ اور آگے نکل جاتا ہے۔ کبھی باپ تو قابل ہوتا ہے۔ لیکن بیٹا ناقابل ہوتا ہے ایسی صورت میں کبھی باپ کو ناکامی ہوتی ہے۔ اور کبھی تربیت سے وہ اپنے بیٹے کو درست کر لیتا ہے لیکن کبھی دونوں ناقابل ہوتے ہیں۔ اور کبھی دونوں قابل ہوتے ہیں۔ جب باپ قابل ہو۔ اور بیٹا ناقابل تو تربیت سے اس کے نقص کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ گو بعض دفعہ یہ نقص دُور نہیں بھی ہوتا۔ جب باپ ناقابل ہو اور بیٹا قابل۔ تو وہ کبھی باپ کے اثر کو مٹا کر کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کسی پیدا کردہ الجھنوں میں دب کر خود بھی ہلاک ہو جاتا ہے۔ لیکن جب دونوں ناقابل ہوں۔ تو اس وقت ترقی کا کوئی راستہ نہیں کھلتا۔ لیکن جب دونوں قابل ہوں۔ تو اس وقت ان کا ترقی سے محروم رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور انکے ساتھیوں کو دیکھ لو۔ باپ وُہ ہے جو اپنے اندر ساری خوبیاں جمع رکھتا ہے۔ اور بیٹے وہ ہیں جو ہر وقت اس کی اطاعت میں مشغول رہتے ہیں۔ اور جو بھی حکم ملے۔ اس پر فوری طور پر عمل کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ تکالیف برداشت کرتے ہیں مشکلات میں سے گزرتے ہیں۔ مگر یہ پسند نہیں کرتے۔ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مونہہ سے کوئی بات نکلے۔ تو وُہ اس کے سننے سے محروم رہیں۔ اور اس پر عمل کرنے میں پیچھے رہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ اس کی ایک شاندار مثال ہے۔ انہوں نے بہت بعد میں اسلام قبول کیا تھا۔ بیس سال رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعوے پر گزر چکے تھے۔ کہ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت میں شامل ہوئے۔ اور اس کے تین سال بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات پا گئے۔ وُہ چونکہ جانتے تھے۔ کہ بیس سال گزر چکے ہیں۔ اور مجھے اسلام میں داخل ہونے کی بہت بعد میں توفیق ملی ہے۔ اس لئے جب انہوں نے بیعت کی تو اپنے دل میں یہ عہد کر لیا۔ کہ اب میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دروازہ سے ہٹونگا نہیں سب لوگ اپنی اپنی جھولیاں بھر چکے ہیں۔ صرف میں خالی ہاتھ ہوں۔ اگر میں نے ان ایام کو بھی ضائع کر دیا۔ تو مجھے کیا ملے گا۔ چنانچہ اس عہد کے بعد وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دروازہ پر بیٹھ گئے اور کچھ ایسے بیٹھے کہ ایک منٹ کے لئے بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں سے اوجھل ہونا انہیں ایک بلا اور عذاب معلوم ہوتا۔ وہ ہر وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے رہتے۔ سوائے اس کے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم گھر میں چلے جائیں۔ کیونکہ وہاں پردہ ہوا کرتا تھا۔ چونکہ وہ ہر وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دروازہ پر ہی بیٹھے رہتے تھے۔ اور وُہ ڈرتے تھے۔ کہ اگر میں ادھر ادھر ہوا تو ایسا نہ ہو۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مونہہ سے کوئی بات نکلے۔ اور میں اسے سن نہ سکوں۔ اس لئے بسا اوقات انہیں کئی کئی دن کا فاقہ آ جاتا۔ اور پھر شدت بھوک اور ضعف سے یہاں تک حالت

# لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ۝

ہم نے یقیناً انسان کو رہینِ محنت بنایا ہے ؎

ہو جاتی کہ بیہوش ہو کر زمین پر گر جاتے۔ لوگ سمجھتے کہ ان کو مرگی کا دورہ ہو گیا ہے۔ اور وہ عرب کے دستور کے مطابق اس کے علاج کے لئے ان کے سر پر جوتیاں مارنے لگ جاتے۔ جب اسلامی فوجوں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے کسریٰ کو شکست دی۔ تو وہ رومال جس کو کسریٰ اپنے ہاتھ میں لے کر دربار شاہی میں تخت پر بیٹھا کرتا تھا۔ مالِ غنیمت میں تقسیم ہو کر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آیا۔ ایک دفعہ وہ رومال ان کے ہاتھ میں تھا کہ انہیں کھانسی اٹھی بلغم آیا۔ اور انہوں نے اسی رومال میں اس بلغم کو تھوک دیا۔ اور پھر کہا بَخٍ بَخٍ اَبُوْ ھُرَیْرَۃَ واہ واہ ابو ہریرہ تیری بھی عجیب شان ہے۔ کہ کسریٰ کا رومال تیرے ہاتھ میں ہے اور تو اس میں بلغم تھوک رہا ہے۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ کا اس سے کیا مطلب۔ اس پر انہوں نے اپنا واقعہ سنایا۔ اور بتایا کہ جب میں نے اسلام قبول کیا۔ تو میں نے یہ عہد کر لیا۔ کہ چونکہ میں بہت بعد میں شامل ہوا ہوں۔ اس لئے اب میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت کو چھوڑوں گا نہیں۔ اور آپ کے دروازہ پر ہی بیٹھا رہوں گا۔ خواہ مجھے کتنی تکلیف ہو۔ چنانچہ خدا نے مجھے اس عہد پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ مگر میری حالت یہ تھی۔ کہ بعض دفعہ مجھ پر سات سات وقت کا فاقہ آ جاتا۔ اور پھر ضعف کی وجہ سے مجھے غشی کا دورہ ہو جاتا۔ صحابہؓ سمجھتے کہ مجھے مرگی ہو گئی ہے۔ عربوں میں رواج تھا۔ کہ جب کسی کو مرگی کا دورہ ہوتا۔ تو وہ اس کے سر پر جوتیاں مارتے اور سمجھتے کہ یہ اس مرض کا علاج ہے۔ اور اس طرح مریض کو ہوش آ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں جب میں بے ہوش ہوتا تو میرے سر پر بھی اس خیال کے ماتحت جوتیاں ماری جاتیں۔ حالانکہ مجھے اندر سے ہوش ہوتا تھا۔ لیکن ضعف اس قدر غالب ہوتا تھا۔ کہ بول نہیں سکتا تھا۔ مگر آج یہ حالت ہے۔ کہ کسریٰ کا رومال میرے ہاتھ میں ہے۔ اور میں اس میں اپنا بلغم تھوک رہا ہوں۔

اس واقعہ پر غور کرو اور دیکھو کہ کیسی تربیت یافتہ کیسی بااخلاق کیسی سمجھدار اور کیسی قربانی کرنے والی اولاد اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کی تھی۔ اور ان میں علم سیکھنے کا مادہ کس قدر انتہائی طور پر پایا جاتا تھا۔

غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کامیابی کے اصول کے جتنے راستے دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ وہ سب کے سب اس باپ اور اس کے بیٹوں کو حاصل ہیں۔ اس لئے تمہیں اس بات میں کبھی شبہ ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ تمہاری شکست اور ان لوگوں کی فتح بالکل قطعی اور یقینی ہے۔

؎ حل لغات: اَلْکَبَدُ: اَلشِّدَّۃُ وَالْمَشَقَّۃُ یعنی کبد سختی اور مشقت کو کہتے ہیں۔ اسی طرح کَبَدٌ۔ وَسَطُ الرَّمْلِ یعنی ٹیلے کے درمیانی حصہ کو بھی کہتے ہیں اور کَبَدٌ کے معنے وَسَطُ السَّمَآءِ کے بھی ہیں۔ یعنی آسمان کے درمیان کو بھی کبد کہتے ہیں۔ اسی طرح کَبَدَ الرَّجُلُ کَبَدًا کے معنے ہوتے ہیں۔ اِشْتَکٰی وَجْعَ کَبِدِہٖ۔ وہ دردِ جگر میں مبتلا ہو گیا (اقرب)

اَلْکَبَدُ ۲

تفسیر: فرماتا ہے ہم نے انسان کو کبد میں بنایا ہے۔ محاورہ کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے۔ کہ ہم نے انسان کو ایسا بنایا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ تکلیف اور مشقت سے کام کرتا ہے۔ اس طرح اس کے یہ بھی معنے ہیں کہ ہم نے انسان کو وسطِ سما میں بنایا ہے۔

پہلے معنوں کے رو سے اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو ایسا بنایا ہے۔ کہ وہ محنت کرنے پر مجبور ہے

یہ گویا ایک لازمی بات ہے۔ جس سے کوئی مفر نہیں۔ قدرت کا جو بھی کارخانہ ہے۔ یا ہماری طرف سے جو قوتیں بھی بنی نوع انسان کو دی گئی ہیں۔ وہ لازمی طور پر اس بات کو ظاہر کرتی ہیں۔ کہ ہم نے انسان کو محنت و کوشش کے لئے پیدا کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ دوسرا جواب قسم ہے یعنی محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی اور انکی راستبازی کا ثبوت صرف وہی نہیں جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں بلکہ اس کے ساتھ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کا ایک یہ بھی ثبوت ہے۔ کہ ہم نے انسان کو کبد میں پیدا کیا ہے۔ یعنی ہم نے انسان کو ایسا بنایا ہے۔ کہ وہ محنت کرتا ہے۔ اور محنت کرنے پر مجبور ہے یا وہ خدا کا ہو کر رہے گا یا دُنیا کا۔ درمیان میں وہ لٹک نہیں سکتا۔ اور نہ درمیانی انسان کبھی کامیاب ہو سکتا ہے۔ کامیابی یا عزت دو ہی طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ یا تو انسان دنیا کا ہو رہے۔ اگر خدا بھول گیا ہے۔ تو دنیوی لحاظ سے محنت کرے۔ کوشش کرے۔ علم حاصل کرے۔ قربان کرے۔ اور اس طرح دنیا میں عزت حاصل کرے اور یا پھر یہ طریق ہے۔ کہ وہ خدا کا ہو جائے۔ اور دنیا کی محبت اپنے دل سے بالکل مٹا دے۔ اور دین کے لئے جد وجہد میں لگ جائے۔ درمیانی راستہ اور کوئی نہیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ۔ بغیر محنت دینی یا محنت دنیوی کے کوئی انسان عزت حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے۔ کہ ہمارے زمانہ میں تمام عزت خدا نے ہمارے ساتھ وابستہ کر دی ہے۔ اب عزت پانے والے یا ہمارے مرید ہونگے۔ یا ہمارے مخالف ہونگے چنانچہ فرماتے تھے مولوی ثناء اللہ صاحب کو دیکھ لو۔ وہ کوئی بڑے مولوی نہیں۔ ان جیسے ہزاروں مولوی پنجاب اور ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ ان کو اگر اعزاز حاصل ہے تو محض ہماری مخالفت کی وجہ سے۔ وہ لوگ خواہ اس امر

لقد خلقنا الانسان فی کبد ۔ ۵ ۔ ۲۱ دو نخخ

کا اقرار کریں یا نہ کریں مگر واقعہ یہی ہے۔ کہ آج ہماری مخالفت میں عزت ہے یا ہماری تائید میں گویا اصل مرکزی وجود ہمارا ہی ہے اور مخالفین کو بھی اگر عزت حاصل ہوتی ہے تو ہماری وجہ سے۔

چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ہم نے شہادت کے طور پر جن چیزوں کو پیش کیا ہے۔ ان کا وجود اس بات کا ایک اہم ثبوت ہے۔ کہ ہم نے انسان کو محنت و مشقت سے کام لینے والا بنایا ہے۔ یہ مکہ جس میں تو رہتا ہے جس میں تجھے حلال سمجھا جانے والا ہے۔ جس میں تجھے ہر تیر کا نشانہ بنایا جانیوالا ہے جس میں تیری ایذا دہی کی ہر ممکن کوشش ہونیوالی ہے۔ اور جس میں تیری جان کی کوئی قدر وقیمت نہیں سمجھی جائیگی۔ یہ ہمارے اس دعوےٰ کا ثبوت ہے، اس لئے کہ تجھے مارنے اور تباہ کرنے کی وہ جتنی بھی کوشش کرینگے۔ ان میں انہیں ناکامی و نامرادی حاصل ہوگی۔ اور انہیں آخر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑیگا۔ کہ انکی کوشش اور کارنامے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئے۔ ان کی یہ ناکامی اپنی ذات میں اس بات کا ایک ثبوت ہوگی۔ کہ انسان کو ہم نے ایسا ہی بنایا ہے۔ کہ سچی محنت کے بغیر وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ان کی مخالفتیں بالکل سطحی ہیں۔ اور ان کی کوششیں بالکل عبث۔ کیونکہ وہ حقیقی قربانی سے کام نہیں لے رہے وہ سمجھتے ہیں جو بڑا بننے والا ہو اس کو مار دینا چاہیئے حالانکہ مارنے سے کیا بنتا ہے۔ بڑا انسان تب بنتا ہے۔ جب وہ قربانی سے کام لے۔ مگر تمہاری یہ حالت ہے۔ تم یتیموں کو پوچھتے نہیں۔ تم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے۔ تم اپنے مالوں کو قومی اور ملی مفاد کے لئے قربان نہیں کرتے تمہیں جائداد ملتی ہیں تو تم انہیں تباہ برباد کر دیتے ہو۔ گویا جس قدر بنیادی کام ہیں۔ اور جو محنت و مشقت اور قربانی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو تو تم سرانجام نہیں دیتے۔ اور جو شخص ان کاموں کو کرنے لگے۔ اسے مارنے کے لئے دوڑ پڑتے ہو اس سے کیا بن سکتا ہے۔ تم یاد رکھو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواہ تم مارنے کی کتنی بھی کوشش

# اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝ يَقُوْلُ

کیا وہ یہ گمان کرتا ہے۔ کہ اس پر کسی کا زور نہ چلیگا ۵ وہ کہتا ہے۔

# اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝

کہ میں نے تو ڈھیروں ڈھیر مال لٹا دیا ہے ۶

کرو وہ کبھی نہیں مریگا۔ بلکہ تم ہی مروگے۔ اور یہ ثبوت ہوگا اس بات کا کہ اللہ تعالےٰ نے تمام تر عزت قربانی میں رکھی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے جگر کا خون کرکے آگے بڑھنا چاہے۔ تو اللہ تعالےٰ اسے عزت دے دیتا ہے۔ لیکن وہ سہل ترین راستہ پر چلنے کی کوشش کریں جو قربانیوں میں حصہ لینے سے دل چرائیں۔ وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ پس فرمایا تم اپنا روشن مستقبل کس طرح مانتے ہو جبکہ تم میں کبد والی حالت ہی نہیں۔ کبد والی حالت تو تقاضا کرتی ہے کہ انسان یا خدا کا ہو کر رہے۔ یا دنیا کا۔ مگر تم نہ خدا کے ہو نہ دنیا کے۔ نہ تم میں مذہب ہے نہ قومی اخلاق ہیں۔ اور جب حالت یہ ہے۔ تو تمہارا مستقبل کس طرح روشن ہوسکتا ہے۔

اس آیت کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں۔ کہ ہم نے انسان کو وسط سماء میں پیدا کیا ہے۔ سماء سے مراد وہ بلند اخلاق ہونگے۔ جو انسان کے روحانی ارتقا کے لئے ضروری ہیں۔ اور وسط کے معنی تو ہر شخص جانتا ہی ہے۔ پس لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ کے معنے یہ ہوئے کہ کامل انسان وہی ہوتا ہے۔ اور با اخلاق وہی کہلا سکتا ہے جس کے اندر اعتدال موجود ہو۔ اور وسطی اخلاق اس کے اندر پائے جائیں۔ گویا اول اس کا سماء سے تعلق ہو۔ اور پھر اس کے اخلاق وسطی رنگ کے ہوں وہ ایک طرف جھکا ہوا نہ ہو۔ وسط سماء میں پیدا کرنے کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں۔ کہ جب تک اس کا شرعی اور قدرتی قواعد سے تعلق نہ ہوگا۔ کامیاب نہیں ہوسکتا۔

دونوں کا پورا کرنا ضروری ہے۔ یعنی جب تک اس میں اعتدال نہ ہوگا۔ کامیاب نہیں ہوسکیگا۔

۶ **تفسیر** یہاں وہ انسان مراد نہیں جسے خدا تعالےٰ نے کبد والی حالت میں پیدا کیا ہے۔ بلکہ یہاں انسان سے مراد اس کا ناقص وجود ہے۔ فرماتا ہے کیا گمان کرتا ہے وہ شخص جو ظاہر میں تو انسان کہلاتا ہے۔ مگر حقیقت میں انسانیت سے بہت دور اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابل میں کھڑا ہے۔ کہ خواہ وہ کبد کے مقام کو چھوڑ بیٹھے۔ اور شرعی اور دنیوی دونوں قواعد سے بے نیاز ہو کر کام کرے۔ پھر بھی اس پر کوئی تنگی نہیں آئیگی۔ یہ بالکل غلط ہے ہم نے انسان کو فی کبد کے مقام پر پیدا کیا ہے۔ مگر وہ اول تو اخلاق کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ اور پھر اگر اس میں کوئی پہلو اخلاق نما پایا بھی جاتا ہے۔ تو وہ غلو کی صورت اختیار کرکے ایک بدی بن جاتا ہے مثلاً ضرورت حقہ پر مال خرچ کرنا۔ یتامےٰ و مساکین کی خبرگیری کرنا یہ اخلاق سے تعلق رکھنے والے افعال ہیں۔ مگر وہ اس رنگ میں مال خرچ نہیں کرتا۔ بلکہ جو کچھ آتا ہے اسراف سے کام لیکر تباہ برباد کر دیتا ہے۔ اس مقام پر کھڑے ہو کر بھی کیا وہ سمجھتا ہے کہ میرے اوپر خدا تعالےٰ کیطرف سے کوئی تنگی نہیں آسکتی۔ کوئی تباہی اور بربادی مجھ پر مسلط نہیں ہوسکتی۔ جو شخص ایک غلط مقام پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور جس مقام کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا۔ اسے بھول جاتا ہے۔ وہ کسطرح سمجھ سکتا ہے کہ الٰہی گرفت سے وہ بچ جائیگا۔ آخر وہ اپنی اس بے اعتدالی کے نتیجہ میں ایک دن تکلیف میں مبتلا ہوگا مصیبت میں گرفتار ہوگا۔ اور خدا کے فضل کی بجائے اسکا عذاب اپنے اوپر نازل ہوتے دیکھیگا۔

۶ **حل لغات**۔ لُبَدٌ کے معنے ہوتے ہیں۔ کَثِیْرٌ لُبَدٌ

# أَيَحْسَبُ أَنْ لَمْ يَرَهُ أَحَدٌ ۝

کیا وُہ سمجھتا ہے۔ کہ اسے کوئی دیکھنے والا نہیں ہے ۵

لَا يَخَافُ فَنَادُهُ كَأَنَّهُ اَلسَّبَدَ بَعْضُهُ عَلٰى بَعْضٍ۔ اتنا زیادہ مال کہ اس کے ختم ہونے کا خوف نہ ہو۔ گویا وہ ایک ڈھیر کے اوپر دوسرا ڈھیر ہے (اقرب) گویا لبد کے معنے ہیں ڈھیروں ڈھیر مال۔

تفسیر۔ کہتا ہے تم یہ کیا کہتے ہو کہ میں نے مال خرچ نہیں کیا۔ میں نے تو ڈھیروں ڈھیر مال خرچ کیا ہے۔ لوگ اس بات پر گواہ ہیں مگر تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں نے کوئی مال خرچ ہی نہیں کیا۔

۵ تفسیر۔ فرماتا ہے۔ کیا وُہ خیال کرتا ہے۔ کہ نہ اوپر خدا اس کے افعال کو دیکھنے والا ہے۔ نہ بندے اس کے اعمال پر نظر رکھتے ہیں۔ اور وُہ جو کچھ کہیگا اسے درست تسلیم کر لیا جائیگا۔ خدا تو انسان کا دل دیکھتا ہے۔ کیونکہ دل کی درستی ہی ترقی کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ میں نے ڈھیروں ڈھیر مال خرچ کیا ہے۔ مگر کیا خدا نہیں جانتا۔ کہ اس نے یہ ڈھیروں ڈھیر مال کیوں خرچ کیا ہے۔ یا کیا بندے نہیں جانتے۔ کہ اس نے اتنا روپیہ کیوں صرف کیا ہے۔ فرماتا ہے تو نے بیشک اپنا مال خرچ کیا ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے۔ کہ تو نے اپنا مال کس جگہ پر خرچ کیا ہے۔ ہم مان لیتے ہیں۔ کہ تم نے اپنا سارا مال لٹا دیا ہے۔ لیکن اگر تم ان لوگوں میں سے ہو۔ جو تَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا کے مصداق ہیں۔ تو بتاؤ تم اللہ تعالےٰ کے حضور کونسی فضیلت پا سکتے ہو۔ یا کم از کم بنی نوع انسان کی نگاہ میں ہی تمہیں کونسا مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ نہ خدا تم کو فضیلت دیگا اور نہ بندے تمہارا ادب کرینگے کیونکہ خدا بھی جانتا ہے۔ اور اس کے بندے بھی جانتے ہیں۔ کہ تم نے محض نام آوری کے لئے محض جاہ طلبی اور شہرت کے حصول کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ تمہیں بعض دفعہ جوش آ جاتا۔ تو تم سو سو اونٹ ایک ایک دن میں ذبح کر دیتے مگر سوال یہ ہے کہ ان اونٹوں کے ذبح کرنے کا کیا فائدہ تھا۔ جبکہ یتیم بھوکے مرتے رہے۔ اور تم نے انہیں کھانا نہ کھلایا۔ مساکین ننگے پھرتے رہے۔ اور تم نے انہیں کپڑا نہ پہنایا۔ حاجت مند پریشان رہے۔ اور تم نے ان کی حاجات کو پورا نہ کیا۔ اگر تمہارے دل میں بنی نوع انسان کی کچھ بھی محبت ہوتی۔ اور اگر ان کے فقر و فاقہ کی مصیبت تمہارے دل کو کچھ بھی متاثر کرتی۔ تو بجائے اس کے کہ ایک ایک دن میں تم سو سو اونٹ ذبح کر دیتے۔ تم ان کی امداد کے لئے یہ طریق اختیار کرتے۔ کہ ایک اونٹ ذبح کیا۔ اور ان کو کھلا دیا۔ پھر کوئی اونٹ ذبح کیا۔ اور ان کو کھلا دیا۔ اس طرح تم تین بلکہ چھ ماہ تک اپنے اس امداد کے سلسلہ کو ممتد کر دیتے۔ مگر تمہارے مد نظر تو یہ بات تھی کہ لوگوں میں تمہاری شہرت ہو۔ لوگ دور دور سے اونٹوں پر سوار ہو کر تمہاری دعوت میں شریک ہونے کے لئے آئیں اور جب لوگ ان سے پوچھیں کہ آج تم کہاں جا رہے ہو تو وہ بتائیں کہ فلاں امیر کے ہاں دعوت ہے۔ اس نے آج سو اونٹ ذبح کئے ہیں۔ اس دعوت میں شمولیت کے لئے ہم جا رہے ہیں۔ جب تمہارے مد نظر محض جاہ طلبی اور لوگوں میں اپنی عزت کو بڑھانا۔ اور دور دور تک مشہور ہونا تھا۔ تو بتاؤ خدا تمہاری کیوں قدر کرے۔ یا بنی نوع انسان تمہارا کیوں احترام کریں۔ کیا لوگ اندھے ہیں کہ وُہ اتنی موٹی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ کہ تم نے جو کچھ کیا ہے۔ ان کی خاطر نہیں کیا بلکہ اپنے نفسوں کی خاطر کیا ہے۔ یا کیا خدا تمہارے دلوں کی نیتوں سے آگاہ نہیں۔ اور وہ نہیں جانتا کہ تمہارے پیش نظر کیا مقصد تھا۔ پس فرمایا أَيَحْسَبُ أَنْ لَمْ

# اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۙ

کیا ہم نے اس کے لئے دو آنکھیں نہیں پیدا کیں۔ اور زبان بھی اور دو ہونٹ بھی ۔ ۹

یَرَہٗٓ اَحَدٌ کیا یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ نہیں نہ خدا دیکھتا ہے۔ اور نہ اس کے بندے دیکھتے ہیں۔ ۔ وہ مال تو عزت طلبی کے لئے خرچ کر رہا ہے۔ شہرت کے حصول کے لئے برباد کر رہا ہے۔ اور توقع یہ رکھتا ہے۔ کہ لوگ مجھے اپنا محسن سمجھیں۔ آخر لوگ اسے کیوں سمجھیں کیا وہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے دنیا کیلئے کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ مال اس طرح خرچ نہیں کرتا۔ کہ اس کے خرچ سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔ اور جب واقعہ یہی ہے۔ تو پھر خدا اور اس کے بندوں کی نگاہ میں اس کی کیا عزت ہو سکتی ہے۔

۹ **تفسیر**۔ فرماتا ہے اس امر کو اچھی طرح یاد رکھو۔ کہ تمہارا معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔ اور خدا تعالیٰ سچے عذر کو ضرور قبول کر لیا کرتا ہے۔ اگر تمہارا سچا عذر ہوتا تو اللہ تعالیٰ تمہیں یقیناً تباہ نہ کرتا۔ اور وہ سچا عذر یہی ہوتا ہے کہ انسان کی آنکھیں نہ ہوں۔ اور اسے کچھ دکھائی نہ دیتا ہو۔ یہ لازمی بات ہے۔ کہ جس کی آنکھوں میں بینائی نہیں ہوگی۔ اس کے سامنے اگر کوئی گڑھا آئے گا۔ تو وہ ضرور اس میں گر جائے گا۔ مگر کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا۔ جو اسے یہ کہے۔ کہ خبیث کیوں تو اس گڑھے سے بچ کر نہ چلا۔ ہر شخص کہے گا کہ جب اس کی آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ تو اگر یہ گڑھے میں گر گیا ہے۔ تو معذور ہے۔ یا اگر ایک شخص راستہ بھول گیا ہے مگر وہ گونگا ہے لوگوں سے یہ دریافت نہیں کر سکتا۔ کہ سیدھا راستہ کونسا ہے۔ تو کوئی شخص اسے ملامت نہیں کرے گا کہ تو راستہ لوگوں سے پوچھ کر کیوں نہ چلا۔ ہر شخص سمجھے گا۔ کہ یہ معذور تھا۔ یہ کسی سے راستہ پوچھ نہ سکتا تھا۔ یا اگر کسی کی آنکھیں بھی ہوں۔ زبان بھی موجود ہو۔ مگر کوئی راستہ بتلانے والا نہ ہو۔ اور وہ چلتے چلتے شیروں کی کچھار میں پہونچ جائے۔ یا ہاتھیوں کی وادی میں چلا جائے۔ اور شیر اس کو پھاڑ ڈالیں۔ یا ہاتھی اس کو مسل ڈالیں۔ تب بھی وہ معذور سمجھا جائیگا۔ لوگ کہیں گے۔ کہ اس کی آنکھیں تو تھیں جن سے راستہ دیکھ سکتا۔ زبان بھی تھی۔ جس سے کام لے کر لوگوں سے رستہ دریافت کر سکتا مگر چونکہ اسے کوئی صحیح رستہ بتلانے والا نہیں ملا۔ اس لئے وہ ٹھوکر کھا کر کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ بہرحال وہ معذور اسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے۔ جب وہ بوجہ آنکھیں اور زبان نہ ہونے کے رستہ دیکھنے یا دریافت کرنے سے معذور ہو۔ یا رستہ بتانے والا کوئی شخص موجود نہ ہو۔ مگر ان تمام جائز اور صحیح اور معقول عذرات کے باوجود دنیا کا قانون اسے عواقب سے بچا نہیں سکتا۔ ایک انسان اندھا ہوتا ہے۔ اور وہ دن کے وقت یا رات کی تاریکی میں کسی گڑھے میں گر جاتا ہے۔ وہ اس گرنے میں معذور ہوتا ہے۔ مگر کوئی مادی قانون اسے گڑھے میں گرنے سے بچاتا نہیں۔ یا ایک گونگا ہوتا ہے۔ اور وہ راستہ پوچھ نہیں سکتا۔ اس کے نتیجہ میں وہ ایک غلط راستہ پر چل پڑتا ہے۔ وہ اپنی اس غلطی میں قطعی طور پر معذور ہوتا ہے۔ مگر مادی دنیا کا قانون اسے راستہ بھولنے کی سزا سے نہیں بچا سکتا یا ایک شخص کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔ اس کی زبان بھی موجود ہوتی ہے۔ مگر اسے کوئی راستہ بتانے والا نظر نہیں آتا۔ اور وہ ٹھوکر کھا کر شیروں کی کچھار

میں پہونچ جاتا ہے۔ اب بے شک وُہ اپنے اس فعل میں معذور ہوتا ہے۔ مگر نیچر کا قانون اسے تکلیف سے نہیں بچا سکتا۔ یہ نہیں ہوتا۔ کہ نیچر اُسے شیروں کی کچھار سے پرے پھینک دے۔ یا دھکے دے کر ہاتھیوں کے حملے سے اسے بچائے لیکن فرمایا روحانی معاملہ اور رنگ کا ہوتا ہے۔ اس میں عذر قبول کیا جاتا ہے۔ ایک اندھا گرتا ہے۔ تو باوجود معذور ہونے کے وُہ گڑھے میں گرنے کی تکلیف سے نہیں بچتا۔ ایک گونگا راستہ نہیں پائے گا۔ تو باوجود معذور ہونے کے وُہ راستہ میں ٹھوکریں کھانے کی تکلیف سے نہیں بچتا۔ ایک شخص آنکھیں بھی رکھتا ہے۔ اور زبان بھی۔ مگر چونکہ اسے راستہ بتانے والا کوئی نہیں ملتا۔ وُہ شیروں کی کچھار میں پہونچ جاتا ہے۔ اور باوجود معذور ہونے کے اس کی یہ معذوری اُسے موت کے پنجہ سے نہیں بچا سکتی۔ لیکن فرمایا ہم اس قسم کے تمام حقیقی عذرات کو قبول کر لیا کرتے ہیں۔ اگر لوگ روحانی آنکھوں سے معذور ہوتے۔ تو ہم کہتے کہ وُہ معذور رہتے انہیں کوئی سزا نہ دی جائے۔ اگر لوگ رُوحانی امور میں گویائی کی طاقت نہ رکھتے تو ہم بھی قرار دیتے۔ کہ وُہ معذور ہیں انہیں عذاب نہ دیا جائے۔ اگر کوئی ہادی نہ آتا۔ تب بھی ہم لوگوں کو معذور قرار دیتے۔ پس اے مکّہ والو اگر تم میں کوئی ایسا قانون موجود نہ ہوتا۔ جو تمہیں ہدائت اور راستی کی طرف لاتا۔ اور تم ادھر ادھر ویسے ہی بھٹک رہے ہوتے۔ جیسے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آنے سے پہلے بھٹک رہے تھے تو ہم کہتے مکّہ بلد الحرام ہے۔ اس کے رہنے والے ہماری نگاہ میں معذور ہیں۔ ان کو ہماری طرف سے کوئی ہدایت نہیں ملی۔ ان کو کوئی سزا نہ دی جائے۔ مگر

تمہاری حالت تو یہ ہے۔ کہ تمہاری آنکھیں بھی موجود ہیں۔ تمہاری زبان بھی موجود ہے۔ تمہارے سامنے ایک ترقی کا راستہ بھی موجود ہے۔ تمہیں اس ترقی کے راستہ پر چلانے والا بھی موجود ہے۔ اور تم پھر بھی گمراہی کو اختیار کئے ہوئے ہو۔ ان حالات میں تم خود ہی غور کرو۔ کہ تم عذاب الہٰی سے کس طرح بچ سکتے ہو ؛

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے ہلاکت سے بچنے کے تین ذرائع بتائے ہیں۔ اوّل آنکھیں دیکھنے کے لئے دوم۔ زبان اور ہونٹ پوچھنے کے لئے سوم ترقی کا راستہ یعنی کامیابی کے لئے۔ یہ تین چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔ مقصد صحیح ہو۔ اور ترقی کا موجب بن سکے آنکھوں سے دیکھ کر کام کرے۔ اور نہ معلوم ہو سکے تو پوچھے۔ پھر ان کے لئے کیا مشکل تھا۔ کہ ترقی کر جاتے۔ آنکھیں خدا تعالےٰ نے دیکھنے کو دی تھیں زبان خدا تعالےٰ نے پوچھنے کو دی تھی۔ صرف راستہ غائب تھا۔ سو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وُہ راستہ جو اوپر لے جاتا ہے دکھا دیا۔ اس کے بعد ان کا کیا عذر رہ جاتا ہے۔

زبان کے ساتھ ہونٹوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اسلئے کیا ہے۔ کہ ہونٹ ہوا کو روکتے ہیں۔ اور انسانی آواز کو بلند کرتے ہیں۔ جس شخص کے دانت نکل جائیں۔ وہ اونچی آواز سے نہیں بول سکتا۔ میرا صرف ایک دانت نکلا ہوا ہے۔ مگر جب میں تقریر کر رہا ہوتا ہوں۔ تو مجھے بعض دفعہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ اس خلا میں سے پھونک نکل جاتی ہے۔ اور کسی کسی لفظ کا تلفظ صحیح طور پر ادا نہیں ہوتا۔ حضرت خلیفۂ اول رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ لوگ موٹے ہونٹوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ مگر میرے لئے تو موٹے ہونٹ خدا تعالےٰ کی ایک بہت بڑی رحمت کا موجب بن گئے ہیں۔ میرے دانت سب

# وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝

اور (پھر) ہم نے اسے (دینی و دنیوی) دونوں رستے بھی تو بتا دیئے ہیں ؎

گر چکے ہیں۔ مگر موٹے ہونٹوں کی وجہ سے میں اب بھی خوب اونچی آواز سے بول سکتا ہوں۔ تو فرمایا ہم نے انسان کو بولنے کے لئے زبان دی۔ اور پھر ہم نے اُسے ہونٹ بھی دیئے۔ تاکہ اگر سامع اس کے قریب نہ ہو۔ تو وہ دُور تک اپنی آواز پہنچا سکے۔

؎ تفسیر "نجد" کے معنے پہاڑی راستے کے ہوتے ہیں۔ لیکن مفسرین نے اس سے بُرائی اور بھلائی کا راستہ مراد لیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضؓ اور ابن مسعود رضؓ دونوں نے کہا ہے۔ کہ اس جگہ نجدین سے خیر اور شر دو راستے مراد ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہم نے انسان کو بھلائی کا راستہ بھی بتادیا۔ اور بُرائی کا راستہ بھی بتادیا۔ مگر اُس نے اچھے راستے کو اختیار نہیں کیا۔

میری رائے یہ ہے کہ یہاں نجدین سے بھلائی اور بُرائی کے راستے مراد نہیں۔ بلکہ دینی اور دنیوی ترقی کے راستے مراد ہیں۔ شر کا راستہ اونچا نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ نہ اس کے اختیار کرنے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ اور نہ اس راستہ پر چل کر کوئی عزت ملتی ہے۔ اور راستہ اونچا انہی دو سبب سے کہلاتا ہے۔ اس پر چڑھنے میں تکلیف ہو۔ یا اس پر چڑھ کر صحیح عزت ملے۔ پس یہاں نجدین سے خیر اور شر مراد نہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے۔ کہ ہم نے انسان کی ترقی کے لئے دونوں قسم کے راستے کھول دیئے ہیں اس کی دینی ترقی کے راستے بھی کھولے ہوئے ہیں اور اس کی دنیوی ترقی کے راستے بھی کھولے ہوئے ہیں۔ اور یہ دونوں راستے ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ کھولے ہیں۔ جو لوگ آپ پر سچے دل سے ایمان لائیں گے۔ اور اسلام کے تمام احکام کی خلوص دل کے ساتھ اتباع کریں گے۔ انہیں نہ صرف روحانی ترقی حاصل ہوگی۔ اور اعلےٰ اخلاق کی وجہ سے خدا تعالےٰ ان سے خوش ہوگا۔ بلکہ اللہ تعالےٰ انہیں دنیوی نعماء سے بھی متمتع فرمائیگا چنانچہ دیکھ لو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ رضؓ کو صرف دین ہی نہیں ملا۔ بلکہ دنیا بھی ملی۔ اور آخر حکومت کی باگ ڈور اللہ تعالےٰ نے ان کے ہاتھ میں دے دی۔ یہی بات اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے۔ کہ آج تم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو دیکھتے ہو۔ تو حقارت کی ہنسی ہنستے ہوئے کہتے ہو۔ کہ چند بے وقوف نوجوان ہیں۔ جو اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ مگر تم نہیں جانتے۔ کہ یہی نوجوان جن کو تم بے وقوف قرار دے رہے ہو۔ جن کو تم نہایت ذلیل اور حقیر وجود سمجھتے ہو۔ ایک دن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کی برکت سے دُنیا کے بادشاہ بن جائیں گے۔ اور دینی اور دنیوی دونوں ترقیات کے راستے ان کے لئے کھل جائینگے۔ چنانچہ ایک دن آیا۔ کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے اس وعدہ کے مطابق صحابہؓ کو بادشاہت دے دی۔ اور اس طرح دونوں نجد ان کو مل گئے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے تمہارے لئے بھی اسلام کی اتباع میں دینی اور دنیوی دونوں ترقیات تھیں۔ اخلاقی راستہ پر چل کر خدا تعالےٰ کا خوش ہونا اور

نَجْدٌ

نجدین سے مراد بھلائی اور برائی کے دو راستے

# فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝

(مگر) وہ پھر بھی چوٹی پر نہ چڑھا[11]

قومکی خدمت کی وجہ سے شیرازہ بندی اور ریاست کی مضبوطی کا حاصل ہونا دونوں قطعی اور یقینی امور تھے۔ مگر باوجود اس کے کہ ہم نے تمہیں آنکھیں دی تھیں۔ تمہیں زبان دی تھی۔ تمہارے سامنے اسلام کے ذریعہ دینی اور دنیوی ترقیات کا ایک بہت بڑا میدان تیار کیا تھا۔ پھر بھی تم نے اس راستہ کو اختیار نہ کیا۔ جو تمہیں کامیابی کی منزل کی طرف لے جاتا۔ بلکہ تم اسی راستہ کی طرف جھکے رہے۔ جو ہلاکت و تباہی و بربادی کا تھا؛

[11] **حل لغات۔** اِقْتِحَامٌ کے معنے نتائج سے بے فکر ہوکر اور عواقب کو نظر انداز کرکے کسی کام میں مشغول ہوجانے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے۔ اِقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ: رَمٰى نَفْسَهٗ فِيْهَا بِشِدَّةٍ وَّمَشَقَّةٍ۔ کسی گھاٹی میں داخل ہونے کے لئے یا کسی معاملہ میں اپنے آپ کو سختی سے ڈال دیا۔ اسی طرح تَقَحَّمَ فِی الْاَمْرِ کے معنے ہوتے ہیں۔ رَمٰى بِنَفْسِهٖ فِيْهِ فَجْأَةً بِلَا رَوِيَّةٍ۔ بغیر سوچے کے جس طرح پروانہ شمع پر جاگرتا ہے۔ اسی طرح مقصد کے حصول کے لئے وہ دیوانہ وار کھڑا ہوگیا (اقرب)

اَلْعَقَبَةُ: مَرْقًى صَعْبٌ مِنَ الْجِبَالِ۔ وَالطَّرِيْقُ فِيْ اَعْلَاهَا۔ عقبہ کے معنے گھاٹی کے ہوتے ہیں۔ نیز اسکے معنی اس راستہ کے بھی ہوتے ہیں جو پہاڑ کی چوٹی پر ہو۔ (اقرب)

اِقْتِحَامٌ

**تفسیر۔** فرماتا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے ذریعہ ہم نے عرب کی ترقی کے ایسے سامان پیدا کردیئے تھے۔ کہ نہ صرف انہیں خدا مل جاتا۔ بلکہ وصالِ صنم بھی میسر آجاتا۔ اگر ایک طرف خدا تعالےٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل کرکے وہ روحانی مدارج کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتے۔ تو دوسری طرف اپنی شیرازہ بندی اور سیاست کی مضبوطی کی وجہ سے حکومت بھی حاصل کرلیتے۔ ان کو تو چاہیئے تھا۔ کہ جس طرح پروانے شمع پر گرکر نثار ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح وہ شمع محمدی پر اپنی جانیں قربان کردیتے۔ اور خدا تعالےٰ کے حضور سجدات شکر بجالاتے۔ کہ اس نے کتنا بڑا احسان کیا۔ کتنا بڑا انعام نازل کیا۔ کس طرح زمین سے اٹھاکر انہیں عرش پر پہونچادیا۔ وہ اگر سوچتے اور غور کرتے۔ تو ان کی زبانیں اللہ تعالےٰ کے احسانات اور اس کے انعامات کے ذکر سے تر رہتیں اور وہ یہ تصور کرکے ہی اپنے بخت بیدار پر پھولے نہ سماتے۔ کہ اللہ اللہ پچیس سو سال سے جس موعود کا انتظار کیا جارہا تھا۔ جس کے انتظار میں گن گن کر گھڑیاں گزاری جاتی رہی تھیں جو اس مکہ کی بنیاد کا مقصود اور ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ دعاؤں کا پھل تھا۔ وہ آج ہماری آنکھوں کے سامنے رونما ہوگیا ہے اب ہمارا فرض ہے کہ ہم عواقب کو نظر انداز کرکے دیوانہ وار کھڑے ہوجائیں۔ اور اس کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کے لئے تیار ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے۔ تو انہیں دین بھی مل جاتا۔ اور انہیں دنیا بھی مل جاتی۔ وہ روحانی مملکت کے بھی حصہ دار بنتے۔ اور جسمانی بادشاہت بھی ان کے قدموں پر آگرتی۔ مگر افسوس کہ وہ چوٹی کی چڑھائی سے ڈر گئے

# وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝

اور تجھے کس نے بتایا ہے۔ کہ چوٹی کیا (اور کس چیز کا نام) ہے۔ (چوٹی پر چڑھنا) غلام کی گردن چھڑانا ہے ۱۲

جس طرح ایک کمزور اور نحیف انسان پہاڑ کی بلندی پر چڑھنے سے گھبراتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے چڑھنے کی کوشش کی۔ تو مجھے تھکان ہو جائے گی۔ میرا سانس پھول جائے گا اور وہ ڈر کر نیچے ہی بیٹھ جاتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ بھی ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ اور اس ترقی کی طرف نہ دیکھا۔ جو اوپر لے جاتی تھی۔ صرف چڑھائی کے خطرہ سے ڈر گئے۔ اور محنت و مشقت کرنے سے اجتناب کیا۔ اور عیاشی کا راستہ جو سہل نظر آیا۔ اُسے اختیار کر لیا۔

اب اگلی آیت میں بتاتے ہیں۔ کہ ہم نے جو یہ کہا ہے۔ کہ انہیں بلندی کا ایک راستہ بتایا گیا تھا۔ مگر یہ اس کی چوٹی پر نہ چڑھے۔ اس سے ہمارا کیا مطلب ہے۔

**۱۱ حل لغات۔** فَكٌّ کے معنے کھول دینے کے ہوتے ہیں۔ اور رَقَبَةٌ کے معنے گردن کے ہیں۔ پس فَكُّ رَقَبَةٍ کے معنے ہوئے گردن آزاد کرنا۔ یعنی کسی غلام کو آزاد کرانے میں مدد دینی۔

**تفسیر۔** اس آیت کے دو معنے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہیں چاہیئے تھا وہ غلام آزاد کروانے کی کوشش کرتے۔ اگر یہ ان غلاموں کو جو ان کے پاس ہیں آزاد کروانے کی کوشش کرتے تو یہ خود بھی قومی لحاظ سے آزادی حاصل کر سکتے تھے۔ مگر یہ الٹا غلامی کو اور بھی رائج کرنے لگیں گے۔ اور مسلمان غلاموں پر ظلم ڈھانے لگ جائیں گے۔ درحقیقت غلاموں کی آزادی کا اسلام نے شروع سے ہی اس لئے حکم دیا ہے۔ کہ قومی ترقی کے لئے غلاموں کا آزاد کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ مساوات قائم کئے بغیر اور چھوٹوں بڑوں کا امتیاز مٹائے بغیر دنیا میں کبھی کوئی قوم ترقی نہیں کیا کرتی۔ جب تک یہ امتیاز دنیا میں نظر آتا رہے گا۔ کہ ایک چھوٹا ہے۔ اور ایک بڑا۔ اس وقت تک دنیا حقیقی ترقی نہیں کر سکتی۔ کبھی کوئی پائدار امن قائم نہیں ہو سکتا۔ جب تک دنیا میں یہ نقشے موجود رہیں گے۔ اور جب تک ان کے انسداد کے لئے متحدہ مساعی عمل میں نہیں لائی جائینگی۔ اس وقت تک ترقی کی تمام تدابیر بیکار ثابت ہونگی۔ اسی امتیاز کا نتیجہ غلامی ہے۔ جس کی بیخ کنی اسلام کا اوّلین مقصد ہے۔ اور جس کے خلاف وہ شروع دن سے اپنی آواز کو بلند کر رہا ہے۔ اگر ان امتیازات کو قائم رہنے دیا جائے۔ تو بڑے آدمی اپنے لئے اور عزت چاہتے ہیں۔ پھر اور عزت کے طلبگار رہتے ہیں۔ پھر اور عزت کا حصول ان کو بے قرار رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن ایسا آتا ہے۔ جب وہ اپنے سوا کسی اور کو بڑا سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔

ص۱۱ فَكُّ رَقَبَةٍ

مَیں نے دیکھا ہے ہندوستان کے ایک بہت بڑے لیڈر ہیں۔ مَیں ان کا نام نہیں لیتا۔ ان کے دماغ میں یہ خیال سمایا ہوا ہے۔ کہ ان سے بڑا لیڈر اور کوئی نہیں۔ یہی دُھن انہیں آٹھوں پہر رہتی ہے۔ اور اپنی بڑائی اور اعزاز کا خیال انہیں ہر وقت دامنگیر رہتا ہے۔ ایک دفعہ شملہ میں ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں کی ایک مجلس منعقد ہوئی۔ مجھے بھی تار دے کر بلایا گیا۔ گاندھی جی نے اس وقت

مرن برت رکھا ہوا تھا۔ اور انہوں نے کہا تھا۔
کہ اگر ہندو مسلم اتحاد نہ ہوا۔ تو میں بھوکا مرجاؤں گا
چونکہ یہ بڑا بھاری مسئلہ تھا۔ سارے ہندوستان
سے مختلف اقوام کے لیڈر شملہ میں جمع ہوئے۔
میں سمجھتا ہوں۔ ان کی تعداد سو ڈیڑھ سو کے قریب
ہوگی۔ کوئی بمبئی سے آیا۔ کوئی مدراس سے۔ کوئی
سی پی سے۔ کوئی بنگال سے۔ کوئی بہار سے کوئی
اڑیسہ سے۔ کوئی سرحد سے۔ کوئی ریاستوں سے۔
غرض ایک اچھا خاصہ اجتماع ہندوستان کے تمام
لیڈروں کا شملہ میں جمع ہوگیا۔ جب ان لیڈر صاحب
نے اتنا بڑا مجمع دیکھا۔ تو چونکہ انہیں صرف اپنی
لیڈری ہی ظاہر کرنے کی عادت تھی۔ کسی اور لیڈر کو
لیڈر سمجھنا وہ اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ اس لئے جب
وہ تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو میں نے دیکھا۔
کہ وہ بار بار کہتے کہ ایسے اہم مسائل کے متعلق بھی
ہجوم فیصلہ نہیں کیا کرتے۔

WE LEADERS OF LEADERS

جو کچھ کہیں گے وہی آخری اور قطعی فیصلہ ہوگا۔
یعنی ہم جو راہنماؤں کے راہنما ہیں اصل کام ہمارا
ہے۔ اتنے زیادہ لیڈروں کا کام نہیں کہ اکٹھے
ہوکر فیصلہ کردیں۔

غرض میں نے دیکھا کہ ان پر یہ امر بڑا گراں
گزرا۔ کہ اتنی تعداد میں لوگوں کو کیوں لیڈر قرار
دیا گیا۔ حالانکہ وہاں کسی ایک قوم کے لیڈر جمع
نہیں تھے۔ بلکہ ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں سب
کے نمائندے تھے۔ جس طرح افراد کا دماغ بعض
دفعہ اس رنگ میں بگڑ جاتا ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ
قوموں میں بڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ اور پھر ان
کی تسلی نہیں ہوتی۔ جب تک کہ تمام قوموں کو اپنے
مقابلہ میں غلام اور اچھوتوں سے بھی بدتر قرار نہ
دے لیں۔

ابھی چند دن ہوئے اخبارات میں بڑا شور اٹھا
کہ پہلے تو اقبال جیسے لوگوں کو علامہ لکھا جاتا تھا۔
مگر اب یہ حالت ہے کہ ہر وہ آدمی جو اردو بھی
صحیح پڑھ نہیں سکتا۔ اس کے نام کے ساتھ علامہ
لکھ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ لدھیانہ میں ایک جلسہ ہوا
تو ہر مقرر کے نام کے ساتھ لکھا گیا کہ یہ فلاں علامہ تھے
اور وہ فلاں علامہ تھے۔ حالانکہ حالت یہ تھی کہ
وہ صحیح طور پر اردو بھی نہیں جانتے تھے۔ اس قسم
کی وبا کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ جو لوگ واقعہ میں علامہ
ہوتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی اور لفظ تجویز کیا جاتا
ہے۔ اور دوسروں کو ان کے مقابل میں گرانے کی
کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس طرح نہ صرف منافرت
کی ایک وسیع خلیج چھوٹوں اور بڑوں میں حائل ہو جاتی
ہے۔ بلکہ ذہنیتیں اس قسم کی ہو جاتی ہیں۔ کہ کچھ لوگ
یہ سمجھنے لگتے ہیں۔ کہ ہم بڑے ہیں۔ اور باقی لوگ
ہمارے غلام ہیں۔

ہم جب بچے تھے۔ تو میں نے اور میر محمد اسحق
صاحب مرحوم نے حضرت خلیفۃ اول رضی اللہ عنہ
سے پڑھنا شروع کیا۔ استادوں کا یوں بھی دلوں میں
زیادہ اعزاز ہوتا ہے۔ مگر حضرت خلیفۃ اول رضی اللہ
عنہ کو تو جماعت میں بھی ایک خاص پوزیشن حاصل تھی
اس وقت جب بھی یہ بات کہی جاتی۔ کہ مولوی صاحب
نے یہ کہا ہے۔ تو اس سے مراد یا حضرت خلیفۃ اول
ہوا کرتے تھے۔ یا حضرت مولوی عبدالکریم صاحب
مراد ہوا کرتے تھے۔ جب بھی کسی نے کہنا مولوی
صاحب نے یہ بات کہی ہے۔ تو سننے والا کہتا
کون مولوی صاحب۔ اور وہ کہتا حضرت خلیفۃ اول رض۔
یا کہتا مولوی صاحب نے یہ بات کہی ہے۔ اور سننے
والا کہتا کہ کون مولوی صاحب۔ تو وہ کہتا مولوی عبدالکریم صاحب۔

# أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝

یا بھوک کے دن کھانا کھلانا ہے ۱۳

چند دن تک تو میر محمد اسحٰق صاحب یہ سنتے رہے۔ مگر ایک دن ان کو بڑا غصہ آیا۔ کہ یہ کیا بات ہے کہ یہ بھی مولوی صاحب اور وہ بھی مولوی صاحب ان کا نام آئے۔ تب بھی لوگ کہتے ہیں مولوی صاحب نے یہ کہا۔ اور اُن کا نام آئے تب بھی لوگ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب نے یہ کہا۔ یہ بالکل غلط طریق ہے۔ آئندہ مولوی عبدالکریم صاحب کی کوئی بات ہوگی۔ تو میں کہونگا مولوی صاحب نے یہ کہا ہے۔ اور خلیفہ اول رض کی کوئی بات ہوگی۔ تو میں کہوں گا جولوی صاحب نے یہ کہا ہے۔ گویا انہوں نے امتیاز کا یہ نرالا طریق نکالا۔ کہ ایک کو مولوی صاحب کہا جائے۔ اور دوسرے کو جولوی صاحب کہا جائے یہ ہے تو بچپن کی ایک حماقت۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ جب کسی کو کوئی خاص اعزاز حاصل ہو جائے۔ تو اس کے مقابل میں دوسروں کو کہا جاتا ہے کہ تم چھوٹے درجے کے ہو۔ پھر ان کو اور چھوٹا کیا جاتا ہے۔ پھر اور چھوٹا کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے وہ مکمل غلام بن جاتے ہیں۔ پس غلام کی آزادی درحقیقت قوم کی آزادی ہے۔ یہ دس یا بارہ آدمیوں کا سوال نہیں۔ بلکہ قوم کا کیریکٹر تبھی بلند ہوتا ہے۔ جب غلط اصول پر قائم شدہ امتیازات کو مٹا دیا جائے۔ اسی طرح خدا کی خوشنودی بھی اسی وقت حاصل ہوتی ہے۔ جب غلاموں کو آزاد کیا جائے۔ یا غلاموں کو آزاد کرانے کی سرگرم کوشش کی جائے۔

فَكُّ رَقَبَةٍ کے دُوسرے معنی غلط عقائد کی اصلاح اور رسم و رواج کی پابندیوں کو توڑنے کے بھی ہیں۔ اللہ تعالےٰ کفار کی نسبت فرماتا ہے أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ (رعد ع۱) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کا کفر کیا۔ اور جن کی گردنوں میں اغلال پڑے ہوئے ہیں۔ اس جگہ کفر و شرک کے معنوں میں اغلال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور بتایا گیا ہے۔ کہ یہ وہ طوق ہیں جنہوں نے ان کی گردنوں کو خم کیا ہوا ہے۔ اسی طرح یہود کی نسبت فرماتا ہے۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف ع۱۹) ہمارا یہ رسول ان کے اِصر کو دور کرتا۔ اور ان کے اغلال کو کاٹتا ہے۔ ان ہردو آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فَكُّ رَقَبَةٍ کے معنے جہاں غلام آزاد کرنے کے ہیں۔ وہاں غلط عقائد رسم و رواج کی سختیاں۔ جھوٹے نظام جو ظالم سرداروں کو سر پر بٹھا دیں۔ جیسے اجارہ دار بادشاہ جن کی وجہ سے قوم اپنی گردن اوپر نہ اٹھا سکے۔ وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ پس فَكُّ رَقَبَةٍ کے معنے یہ ہوئے کہ ہم تو ان کو غلامی سے آزاد کرانے لگے تھے۔ مگر ان کو اپنے اغلال توڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔ انہوں نے غلاموں کو آزاد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے قوم کے ادنیٰ طبقہ کو ابھارنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے رسم و رواج کو چھوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے جھوٹے عقائد کو ترک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور اس طرح وہ تباہی و بربادی کے گڑھے میں ہی گرے رہے۔

۱۳ حل لغات۔ سَغَبَ الرَّجُلُ سَغْبًا وَسُغُوبًا وَسَغَبًا وَسَغَابَةً وَمَسْغَبَةً (باب ن) کے معنے

مَسْغَبَةٌ

# يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ

یتیم کو جو قریبی ہو ۱۴

میں جَاعَ وُہ بھوکا ہوا (الترب) پس مَسْغَبَۃ کے معنے بھوکے رہنے کے ہوئے۔

**تفسیر** - فرماتا ہے اگر اس کے اندر یتامے ومساکین کی حقیقی محبت ہوتی۔ اور وُہ ان کی تکالیف کو دُور کرنے کا صحیح احساس اپنے اندر رکھتا۔ تو اس کا فرض تھا۔ کہ وُہ بھوک والے دن ان کو کھانا کھلاتا۔ یعنی قحط میں ان کی خبرگیری کرتا یا فقرو فاقہ میں ان کے لئے غلہ وغیرہ مہیا کرتا۔ یہ مان لیا۔ کہ وہ سو سو اونٹ ایک ایک دن میں ذبح کرتا رہا ہے۔ مگر ہم تو یہ کہتے ہیں۔ وہ بے موقعہ ذبح کرتا رہا ہے۔ اور ان کو ذبح کرنے کا موقعہ یہ تھا۔ کہ وُہ یتامے ومساکین کے لئے ان کو ذبح کرتا۔ اور ان کا گوشت ان میں تقسیم کر دیتا۔ یا خود پکا کر ان کو دعوت دے کر ان کی بھوک کو دُور کرتا۔ یہاں فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَۃٍ کے الفاظ اسی حکمت کے ماتحت لائے گئے ہیں۔ کہ پہلے یہ ذکر آچکا تھا۔ کہ وُہ نام ونمود کے لئے جاہ طلبی اور شہرت کے حصول کے لئے اپنا روپیہ صرف کر دیتا ہے۔ اس سے خیال پیدا ہو سکتا تھا۔ کہ ممکن ہے وہ یتامے ومساکین کو بھی کھلا دیتا ہو۔ اللہ تعالےٰ نے اس شبہ کا ازالہ کیا ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ وُہ روپیہ تو خرچ کرتا تھا۔ اپنے اونٹوں کو بھی ذبح کرتا تھا۔ مگر بھوک والے دن نہیں۔ یعنی جب بھوکوں کو ضرورت ہوتی تھی۔ وُہ ان کو ذبح نہیں کرتا تھا۔ بلکہ جب اپنی شہرت کا جنون اس کے سر پر سوار ہو جاتا۔ تو سو سو اونٹ ایک ایک دن میں ذبح کر دیتا۔ حالانکہ اگر حقیقی ضرورت کو مدِنظر رکھ کر وُہ کام کرتا۔ تو دوستوں کی دعوت کے لئے صرف ایک اونٹ ذبح کرتا۔ اور ننانوے اونٹ یتامے ومساکین کے لئے رکھ لیتا۔ تاکہ ان کو فاقہ کی مصیبت پیش نہ آتی۔ پس چونکہ اس نے قومی ضرورت کو مدنظر نہیں رکھا۔ اور اپنے مال کو بے موقعہ خرچ کرکے ضائع کر دیا۔ اس لئے ہماری نگاہ میں وُہ کسی تعریف کا مستحق نہیں۔ نہ اس قابل ہے۔ کہ لوگ اس کو احترام کی نظر سے دیکھیں۔

یتیم کے ساتھ ذا مقربۃ کے الفاظ لانے کی وجہ

۱۴ **تفسیر** - یہاں یتیم کے ساتھ ذَا مَقْرَبَہ کے الفاظ کا اضافہ اس لئے کیا گیا ہے۔ کہ قرابت والا یتیم بہرحال انسان کو اپنے پاس رکھنا پڑتا ہے۔ اور اس کے خورونوش کی ذمہ داری یا تعلیم اور لباس وغیرہ کے اخراجات انسان کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ یہ الگ امر ہے۔ کہ کوئی شخص ان اخراجات کو طوعاً برداشت کرے۔ یا کرہاً مگر بہرحال خاندانی ذمہ داریاں تقاضہ کرتی ہیں۔ کہ انسان اپنے قرابت دار یتیم کا خیال رکھے۔ مگر فرمایا تمہاری تو یہ حالت ہے۔ کہ تم ایسے یتیم کو بھی کھانا نہیں کھلاتے۔ جو تمہارا قریبی رشتہ دار ہوتا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہاری حالت خطرناک حد تک گر چکی ہے۔

اس آیت کے یہ معنے نہیں۔ کہ قریبی یتیم کو تو کھانا کھلانا چاہیئے۔ مگر دُوسرے کو نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی اور یتیم کی پرورش تو الگ رہی۔ تم سے تو اس بات کی بھی امید نہیں کی جا سکتی۔ کہ تم اپنے قریبی یتیموں کی خبرگیری کرو گے۔ اور ان کی ضروریات کا خیال رکھو گے۔ جب ایک قریبی ذمہ داری سے تم اس قدر لاپروا ہو۔ تو دُور کی ذمہ داری کے پُورا کرنے کی

## اَوْمِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝

یا مسکین کو جو زمین پر گرا ہوا ہو[14]

## ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

پھر (چوٹی پر چڑھنا یہ تھا۔ کہ ان کاموں کے علاوہ) یہ ان میں سے بن جاتا جو ایمان لائے۔ اور

## وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝

(جنہوں نے) ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔ اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی نصیحت کی[15]

کی طرف تمہاری توجہ ہی کہاں ہوسکتی ہے۔

[14] تفسیر۔ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ کے لفظی معنے تو یہ ہیں۔ کہ وہ مسکین جو خاک آلود ہو مگر اس کے مفہوم دو ہیں۔

اوّل۔ ایسا غریب جو مالی لحاظ سے بالکل ادنیٰ اور ذلیل حالت میں ہو۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں۔ فلاں شخص تو مٹی میں مل گیا ہے۔ یعنی اس کی نہایت ہی قابل رحم حالت ہے۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے۔ کہ ایسا مسکین جو مالی کمزوری کے ساتھ جسمانی طور پر بھی ایسا کمزور اور بیمار ہو کہ وہ چل پھر نہ سکتا ہو۔ گویا اس میں اتنی طاقت بھی نہیں رہتی۔ کہ وہ امیروں کے دروازہ تک پہونچ کر سوال کرسکے۔ کمزوری اس قدر بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ کہ وہ زمین پر لیٹا ہوا ہوتا ہے۔ اور کوئی اس کا پرسان حال نہیں ہوتا۔ یا اتنا کمزور ہوجاتا ہے۔ کہ مانگنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا۔ جس شخص کے دل میں ایسے مساکین کے متعلق بھی رحم کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ جو بالکل کنگال ہوچکے ہوں یا ساتھ ایسے بیمار بھی ہوں۔ کہ مانگنے کی سکت بھی نہ رکھتے ہوں۔ وہ خدا سے کیا فضل مانگ سکتا ہے۔ اور بندے اس کی کیا عزت کرسکتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشکلات کے وقت ان لوگوں سے بھی کام کی امید کی جاتی ہے۔ جو عام طور پر معذور سمجھے جاتے ہوں۔ مگر پھر بھی کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں۔ جن کا بوجھ انسان کو اٹھانا پڑتا ہے۔ جیسے اپنے توبی یتیم اور بالکل ناکارہ انسان جن سے کمائی کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ مگر یہ ان لوگوں کی پرورش سے بھی مصائب کے وقت غافل ہوتا ہے۔ حالانکہ مصائب کے وقت ہی انسانی اخلاق کا تجربہ ہوتا ہے۔

[15] تفسیر ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر بتایا ہے۔ کہ خالی نیک اعمال کافی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ اس کے ساتھ ایمان بھی ہو۔ اور قوم میں نیکی پیدا کرنے کا جذبہ بھی ہو۔ اس جگہ ایمان سے عام ایمان مراد نہیں۔ بلکہ ان اعمال خیر کے متعلق ایمان مراد ہے۔ جن کا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ اور مراد یہ ہے۔ کہ ان اعمال پر کاربند ہونے کے علاوہ دل میں یہ یقین ہو کہ

یہ اعمال ضروری ہیں۔ منافقانہ رنگ میں ان پر عمل نہ کرتا ہو۔ کیونکہ منافقانہ عمل میں ایسا جوش کبھی پیدا نہیں ہوتا۔ کہ کما حقہ ان کو بجالا سکے۔ سچی بشاشت اسی عمل کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ جس کے ضروری اور درست ہونے پر انسان کو یقین بھی ہو۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں۔ کہ اگر خلوص سے یہ لوگ اُن اعمال کو بجالاتے تو انہیں تقوے نصیب ہوتا۔ اور اس کے نتیجہ میں اُن کو ایمان بھی نصیب ہو جاتا۔ گویا ثُمَّ کے معنے "اسکے ساتھ ہی" کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اور پھر کے بھی۔ اور یہ دونوں معنے لغت کے لحاظ سے ثابت ہیں۔ ساتھ ہی کے لحاظ سے یہ معنے ہوں گے۔ کہ یہ نیک اعمال بھی کرتے اور ساتھ ہی مومن بھی ہوتے۔ یعنی بغیر اس عمل کے اچھا ہونے پر یقین ہونے کے عمل کامل نہیں ہوتا۔ منافقت جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ اور اگر ثُمَّ کے معنے "اس کے بعد" کے کئے جائیں تو اس کے یہ معنے ہوں گے۔ کہ یہ نیک اعمال کرتے۔ اور ان کے بعد مومن بن جاتے۔ یعنی ان اعمال کا نتیجہ یقیناً یہ نکلتا۔ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان بھی ان کو مل جاتا۔ کیونکہ نیک نیتی کے ساتھ کیا ہوا عمل ایمان کی طرف لے جاتا ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حکیم بن حزام نے جو نبوت کے دعوے سے پہلے آپؐ کے دوست تھے۔ آپؐ سے پوچھا۔ کہ کفر میں جو صدقہ و خیرات میں نے کیا تھا کیا وہ ضائع گیا؟ تو آپ نے فرمایا اَسْلَمْتَ عَلٰی مَا سَلَفَ مِنْ خَیْرٍ (بخاری جلد چہارم کتاب الادب باب من وصل رحمۃ فی الشرک) ضائع کیوں گیا۔ اسی عمل کے نتیجہ میں تو تم کو دولت اسلام حاصل ہوئی۔

پھر فرماتا ہے وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ۔ پہلے معنوں کے مطابق اس جملہ کے یہ معنے ہوں گے۔ کہ اگر ان اعمال کے ساتھ ساتھ انہیں ان اعمال کی خوبیوں پر ایمان بھی نصیب ہوتا۔ اور یہ لوگ خود بھی وہ اعمال نہ بجالاتے۔ بلکہ دوسروں کو بھی اُن کے استقلال کے ساتھ بجالانے کا حکم دیتے۔ اور رحم کرنے کی تلقین کرتے رہتے۔ تو ان کے لئے بابرکت ہوتا۔ تَوَاصَوْا کے معنے بار بار تاکید کرنے کے ہیں۔ اور صبر کے معنے اس جگہ استقلال سے کام کرنے کے ہیں۔ اور مَرْحَمَة کے معنے رحم کے ہیں۔

دوسرے معنوں کے رُو سے اس جملہ کے یہ معنے ہوں گے کہ ان نیک اعمال کے بعد انہیں ضرور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کی توفیق ملتی۔ اور نیکی کا جذبہ اتنا قوی ہو جاتا۔ کہ اب تو یہ لوگ ظلم کرتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاکر یہ خود ظلم شوق سے برداشت کرتے۔ اور دوسروں کو ظلم کو صبر سے برداشت کرنے کی تلقین کرتے رہتے۔ باوجود ظلموں کو برداشت کرنے کے اپنے دشمنوں پر بھی رحم کرتے۔ اور دوسرے دوستوں کو بھی نصیحت کرتے کہ دشمن کے ظلم پر غصہ میں نہ آؤ۔ بلکہ باوجود اس کے ظلم کے پھر بھی رحم سے کام لو۔

# أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝

یہی لوگ تو برکت والے ہوں گے [۱۶]

# وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ أَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝

اور جنہوں نے ہماری آیتوں کا کفر کیا وُہ نحوست والے ہوں گے [۱۷]

# عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝

ع ۱ ۱۵

ان پر بھٹی کی آگ (کی سزا) نازل ہوگی [۱۸]

[۱۶] تفسیر۔ مَیْمَنَۃ کے معنے برکت کے بھی ہیں اور مَیْمَنَۃ کے معنے دائیں کے بھی ہوتے ہیں۔ (اقرب) قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ قیامت کے دن جن لوگوں کے دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال دیا جائے گا۔ وُہ عزت پائینگے اور جنت کے حقدار ہوں گے۔ اِس مناسبت سے اَصْحَابُ الْمَیْمَنَۃ کے دونوں معنے ہوسکتے ہیں۔ یہ بھی کہ وُہ لوگ جن میں اوپر کی باتیں پائی جائیں۔ اور وُہ احکام الٰہی پر عمل کریں۔ وہ قیامت کے دن ان لوگوں میں شامل ہونگے۔ جنکے دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال دیا جائیگا۔ اور یہ بھی معنے ہوسکتے ہیں۔ کہ ایسے لوگ ہی اللہ تعالےٰ کی برکات کو حاصل کرتے ہیں۔ جو احکام الٰہیہ کی متابعت کو خوشی سے قبول کرتے ہیں ؛

[۱۷] حل لغات۔ مَشْئَمَۃ کے معنی بائیں کے بھی ہوتے ہیں۔ اور مَشْئَمَۃ نحوست کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ پہلی آیت کی طرح اس آیت کا بھی ایک تو یہ مفہوم ہے۔ کہ جو لوگ احکام الٰہیہ کا انکار کرینگے۔ وُہ قیامت کے دن ان لوگوں کی صف میں کھڑے کئے جائیں گے۔ جن کے بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال دیا جائے گا۔ اور ایک معنے یہ ہیں کہ ایسے لوگ اپنے نفس اور اپنی قوم کے لئے سخت منحوس ہیں۔ ناکامی ان کے شامل حال رہے گی ؛

[۱۸] حل لغات۔ اَلْمُؤْصَدۃ کے معنے ہیں۔ اَلْمُطْبَقُ وَ الْمُغْلَقُ بند کی ہوئی چیز (اقرب) پس نَارٌ مُّؤْصَدَۃٌ کے معنے ہونگے۔ ایسی آگ جو بند کی گئی ہو۔

تفسیر۔ پہلے لوگ شائد نَارٌ مُّؤْصَدَۃٌ کی حقیقت کو پُوری طرح نہ سمجھتے ہوں۔ مگر موجودہ زمانہ کے لوگوں کے لئے اس کی حقیقت کو سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ کیونکہ نئے علوم نے واضح کر دیا ہے۔ کہ سخت ترین آگ وُہ ہوتی ہے۔ جس پر چاروں طرف سے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ بھٹی کی آگ اسی لئے

حاشیہ: [۱] اصحاب المیمنۃ کے دو معنے — [۲] المؤصدۃ — [۱] مشئمۃ

تیز ہوتی ہے۔ کہ اُسے چاروں طرف سے بند کر کے صرف ایک چھوٹا سا سوراخ رکھ لیا جاتا ہے جو آگ اس طرح بھڑکائی جائے وہ اس قدر تیز ہوتی ہے۔ کہ سب کچھ جلا کر بھسم کر دیتی ہے اللہ تعالٰے اس آیت میں کفار کے انجام کا ذکر کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے۔ کہ آج تو یہ لوگ اسلام کے مقابل میں کھڑے ہیں۔ اور مسلمانوں کو سخت سے سخت اذیتیں پہنچانے کے درپے ہیں۔ مگر وہ یاد رکھیں ایک دن وہ ایسی آگ میں ڈالے جائیں گے۔ جو چاروں طرف سے بند ہو گی۔ اور جو انہیں جلا کر راکھ کر دے گی۔ یعنی اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار مکہ ایسے تباہ ہوں گے۔ کہ ان کا نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ دیکھ لو۔ وہ کیسے تباہ ہوئے کہ لات اور منات اور عزیٰ کی پرستش کرنے والا آج ساری دنیا میں کوئی ایک وجود بھی نظر نہیں آتا۔ خدا نے ان کو اپنے عذاب کی چکی میں اس طرح پیسا اور اپنے غضب کا ان کو ایسا نشانہ بنایا۔ کہ دُنیا میں ان کا کچھ بھی باقی نہیں رہا ؛

# کلیدِ مضامین

○

اشاریہ



○


مرتبہ

سید عبدالحی

# اشاریہ مضامین

## جلد ہشتم

غلبہ کے بارے میں پیشگوئیاں



غلبہ دَورِ اوّل



غلبہ کی مدّت



اسلام کی نشأۃ ثانیہ

**تنزّل**



**دوسرے مذاہب سے موازنہ**



**مخالفت**

پیشگوئی



ژ

قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیاں

عیسائیت کے متعلق



مخالفت کے متعلق



قرآن کریم کے متعلق

### اُمّت کے متعلق



### فتوحات و غلبہ کے متعلق



### تنزّل کے متعلق

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئیاں



## ت

### تبلیغ



### تجارت



### تسبیح

# ج

ن

ذ

## ص

## ط

## ع

تعلیم اور عقاید



انجیل



خصوصیات

# غ

## م

# م

## ن

# اسماء

## جلد ہشتم

آ



ا

## د



## ر



## ز

### مقام



### فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم



### آپ کے وہ الہامات جو اس جلد میں مذکور ہیں

## مقام

## خُلقِ عظیم



## صداقت

واقعات



تعلیم



تبلیغ



مخالفت

## و

# مقامات

## ب

# حَل اللّغات

# کتابیات

# BIBLIOGRAPHY


## تفسیر

الاتقان للسیوطی ۲۷۳

تفسیر ابن کثیر ۵، ۳۴، ۳۵، ۳۸، ۲۱۲، ۲۱۵
۲۵۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۳۱۰، ۳۴۳، ۳۵۷
۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۹

البحر المحیط لابی حیان ۳۸۶، ۴۲۸، ۴۷۳، ۵۹۹

رُوح البیان ۲۵۷

رُوح المعانی ۱۴۹، ۱۸۹، ۲۱۵، ۲۱۷، ۲۲۱، ۳۵۴

فتح البیان ۳۹، ۴۰، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۱۲۹، ۱۴۸
۱۸۳، ۱۹۵، ۲۸۸، ۲۴۴، ۳۵۴، ۴۷۹، ۵۲۰

الکشاف للزمخشری
۸۵، ۱۴۸، ۲۵۵، ۲۸۹، ۳۴۲، ۴۲۸

کمنٹری آن دی قرآن ریورنڈ وہیری ۱

THE KURAN SIR WILLIAM MUIR ۴۲۱

مآخذِ قرآن مصنّفہ پادری ٹسڈل ۳۰۱

## حدیث

جامع صحیح بخاری ۳۳، ۳۸، ۴۶، ۴۹، ۵۰، ۹۶، ۱۰۹
۱۵۳، ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۱۴، ۲۲۳، ۲۲۸، ۲۳۴، ۳۳۱
۳۴۶: ۴۴۴، ۵۴۱، ۶۱۰، ۶۲۶

صحیح مُسلم ۴۹، ۸۳، ۹۵، ۹۶، ۱۳۵

جامع صحیح ترمذی
۱۵۵، ۱۹۳، ۴۶۳، ۴۸۷، ۴۹۵

شمائلِ ترمذی ۵۲

سنن ابی داؤد ۲۱۵، ۳۵۶

## کُتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام و

### خلفاء سلسلہ و علماء جماعت



## سیرت و تاریخ



## اسلامیات



## کُتب اہلِ کتاب



☆

انڈیکس کی تیاری میں معاونت

۱۔ فضل کریم صاحب تبسم شاہد

۲۔ طاہر محمود احمد صاحب شاہد